پہلا ایڈیشن

حصہ چہارم

تاریخِ اُمّتِ مُسلمہ

سلاطینِ اسلام

پانچویں تا دسویں صدی ہجری (دسویں تا پندرہویں صدی عیسوی)

تاریخ صقلیہ، صلیبی جنگیں، اتابک امراء، ایوبی حکمران، سلطنتِ خوارزم شاہی، یورشِ تاتار، خلافت عباسیہ مصر، مملوک سلاطین، تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام، سلطنت عثمانیہ دورِ تاسیس تا دورِ عروج

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب

مقدمہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ

کاوش

مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی

تاریخ امت مسلمہ

سلاطینِ اسلام

پانچویں تا دسویں صدی ہجری

(دسویں تا پندرہویں صدی عیسوی)

تاریخ صقلیہ، صلیبی جنگیں،

اتابک امراء، ایوبی حکمران،

سلطنت خوارزم شاہی، یورش تاتار، خلافت عباسیہ مصر، مملوک سلاطین،

تاتاریوں میں اشاعت اسلام، سلطنت عثمانیہ دور تاسیس تا دورِ عروج

حصہ چہارم

تحقیق

مورخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

بلاک A-1، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

0321-3135009 | 0321-2000870

www.almanhalpublisher.com

almanhalpublisher@gmail.com

تاریخِ اُمتِ مسلمہ

تحقیق

مورخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

فہرست مضامین

تاریخ امت مسلمہ

ذاتی اوصاف

چغتائی سلطنت میں اشاعتِ اسلام

اُورخان

تعمیراتی کام اور نظام مملکت کی تشکیل نو

محمد چلپی (محمد اوّل)

سلطان مراد ثانی

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین سے چند باتیں

تاریخ اُمتِ مسلمہ کے تین حصوں کو اللہ تعالیٰ نے مصنف اور ناشر کی توقع سے بہت بڑھ کر مقبولیت نصیب فرمائی اور بہت کم وقت میں کئی ایڈیشن نکل گئے۔ اکابر اور صفِ اوّل کے علماء نے اسے انتہائی پسند کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ چوتھا حصہ جلد از جلد شایع ہونا چاہیے۔ راقم ان تین حصوں کی اشاعت سے پہلے چوتھے حصے پر کام شروع کر چکا تھا مگر قارئین کی طرف سے پیہم اصرار نے اس کام کی اہمیت کا مزید شدت کے ساتھ احساس دلایا۔ چنانچہ راقم کے شب و روز کی سب سے بڑی مصروفیت گزشتہ تین سال سے یہی تھی کہ کسی طرح چوتھے حصے کی تکمیل ہو جائے۔ اس کوشش کا حاصل اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

گزشتہ تین حصوں میں آپ نے سیرتِ نبویہ، خلافتِ راشدہ، خلافت بنو امیہ، خلافتِ بنو عباس، اور بنو عباس کی متوازی حکومتوں کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس حصے میں ہم ان نامور سلاطین کی طرف متوجہ ہیں جو خلافتِ عباسیہ کے دورِ زوال میں تاریخ کے اُفق پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے روئے زمین پر اپنی سطوت و عظمت اور سیاست و شجاعت کی نہ مٹنے والی یادگاریں قائم کر گئے۔ تاریخ کے یہ ابواب نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں اور ان کا ہر ورق جدوجہد، سرفروشی، قربانی اور عزیمت و استقامت کا شہ پارہ ہے۔

اس دوران قارئین جس چیز کو سب سے زیادہ نمایاں دیکھیں گے وہ اسلامی جہاد کا احیاء ہے جو ایک مدت سے فراموش ہو گیا تھا۔ شاید اُمت کو یہ سبق دوبارہ ہرگز یاد نہ آتا، اگر انہیں صقلیہ کے سقوط، بیت المقدس پر نصرانیوں کے قبضے، صلیبی جنگوں اور تاتاریوں کی زلزلہ خیز یورش سے پالانہ پڑتا۔ مسلمان اس دور میں جس تباہی سے گزرے ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مگر اسی کس مپرسی، زوال اور پستی نے ان کی غیرت وحمیت کو جھنجھوڑا، انہیں اللہ کے فرامین اور سیرتِ نبویہ پر از سرِ نو غور کرنے کا موقع دیا۔ انہوں نے اپنے اسلاف کی تاریخ سے درسِ شجاعت لیا۔ جس کے نتیجے میں ان میں عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، جلال الدین خوارزم شاہ، سیف الدین قطز اور سلطان رکن الدین بیبرس رحمہم اللہ جیسے مجاہد پیدا ہوئے اور یوں اُمت جاں بلبی کی کیفیت سے نکل کر ایک بار عروج کی

طرف گامزن ہوئی۔ پھر اسی اسلامی شوکت وسطوت کا مظاہرہ ترکانِ عثمان کی عظیم الشان سلطنت کی شکل میں ہوا جس نے اگلی صدیوں میں خلافت کی ذمہ داری بھی سنبھال لی اور غیر مسلم طاقتوں کی تمام تر ریشہ دوانیوں کے باجود گزشتہ صدی تک اس فرض کفایہ کو ادا کیا۔ یہ حصہ اسلام کے انہی نامور فرزندوں اور ان کی سلطنتوں کے حالات پر مبنی ہے۔

اس حصے کی ترتیب کچھ یوں رہے گی۔

پہلا باب: تاریخ صقلیہ

دوسرا باب: صلیبی جنگیں اور اتابک حکمران

تیسرا باب: صلیبی جنگیں اور ایوبی حکمران

چوتھا باب: خوارزم شاہی حکمران اور یورش تاتار

پانچواں باب: سقوطِ بغداد

چھٹا باب: مملوک سلاطین اور خلفائے بنو عباس قاہرہ

ساتواں باب: منگول سلطنت اور دعوتِ اسلام

آٹھواں باب: سلطنتِ عثمانیہ۔ دورِ تاسیس تا دورِ عروج

کہنے کو تو یہ آٹھ ابواب ہیں مگر در حقیقت یہ تاریخی واقعات کے آٹھ خزانے ہیں جن میں ہزار ہا روایات کا خلاصہ آ گیا ہے۔ اس کے لیے راقم کو کتب تاریخ کو جو طویل ورق گردانی اور روایات کی جس طرح تحقیق وتفتیش کرنا پڑی، وہ ایک تھکا دینے والا سفر تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں حیرت، دلچسپی، معلومات اور عبرتوں کی ایک ایسی دُنیا آباد تھی جہاں جا کر انسان اپنی ہستی سے بے گانہ اور شب وروز گزرنے کے احساس سے عاری ہو جاتا ہے۔

الغرض بہت سے کٹھن اور مشکل مراحل طے کرنے اور طویل محنت اور عرق ریزی کے بعد راقم یہ اوراق قارئین کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی ہمت وتوفیق عنایت فرمائے۔

محمد اسماعیل ریحان

۲۹ ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ۔ ۲۰ اگست ۲۰۲۰ء

ادارہ علوم القرآن، تحصیل حسن ابدال، ضلع اٹک

❁❁❁

پہلا باب

دولتِ اسلامیہ صِقلّیہ

۲۱۳ ہجری تا ۴۸۴ ہجری

۸۲۸ عیسوی تا ۱۰۹۱ عیسوی

تاریخِ صِقلّیہ

صقلیہ (سسلی) بحیرۂ روم کا سب سے وسیع و عریض جزیرہ ہے، یہاں مسلمانوں نے تیسری صدی ہجری کے آغاز میں حکومت قائم کر لی تھی جو ۲۱۳ھ (۸۲۸ء) سے ۴۸۴ھ (۱۰۹۱ء) تک رہی۔ اس 271 سالہ طویل دور میں مسلمان صقلیہ کو اس مشرکانہ تہذیب و ثقافت کی زنجیروں اور اس فرسودہ تمدن کی تاریکیوں سے باہر نکالنے میں کامیاب رہے جن کے پیچھے رومیوں کا روایت پسندانہ جذبہ اور دیومالائی کہانیوں کا نشہ کارفرما تھا۔ ایک اللہ کو ماننے والوں نے اس خطے کو پس ماندگی اور جہالت سے نکال کر علم و فضل، خوشحالی اور دولت و ثروت کا مرکز بنا دیا۔

صِقلیہ کا جغرافیہ:

صِقلیہ اٹلی کے جنوب اور تیونس کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ پچیس ہزار سات سو مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل اس جزیرے کی شکل مثلث نما ہے۔ اس سرسبز و شاداب سرزمین میں درجنوں شہر اور سینکڑوں دیہات ہیں۔ پہاڑ، دریا اور جنگلات بھی بکثرت ہیں۔ اس جزیرے کے تینوں کونوں پر تین اہم ترین شہر ہیں جن میں سے ہر ایک تین اطراف سے پانی میں گھرا ہونے کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر شمار ہوتا ہے۔ جنوب مشرقی کونے پر "سرقوسہ" ہے، جو ناقابلِ تسخیر قلعے اور فصیل کی وجہ سے اہم ترین جنگی مرکز تھا۔ یہاں علماء و فضلاء کی کثرت تھی۔

شمالی ساحل پر واقع "بلرم" (Palermo) کو قدیم دور سے ملک کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ مسلمانوں کا بھی پایۂ تخت تھا۔ علوم و فنون اور شان و شوکت میں اسے قرطبہ کے ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔

شمال مشرقی کونے پر "مسینہ" ہے جسے ایک چھوٹی سی خلیج اٹلی سے جدا کرتی ہے۔ یہ بلرم کے بعد ملک کا دوسرا بڑا شہر اور اہم ترین بندرگاہ شمار ہوتا تھا۔

جنوب مغربی ساحل پر "جرجنت" ساحل سے تین میل کے فاصلے پر نہایت پرفضا اور خوبصورت شہر ہے۔

مغرب کی جانب "مازر" (Mazzara) ہے جو صِقلیہ میں مسلمانوں کا پہلا شہر تھا۔ افریقہ سے آنے والے مسلمان پہلے یہیں پہنچتے تھے۔ یہ اسلامی فاتحین کی پہلی گزرگاہ رہا ہے۔

"قصر یانہ" رومیوں کا قدیم اور تاریخی شہر تھا۔

"طبرمین" خاصی مدت بعد ۲۸۹ھ میں فتح ہوا تھا۔ آتش فشاں پہاڑوں کے دامن میں آباد یہ شہر سونے کی کانوں سے مالامال تھا۔

"قطانیہ" اہم تجارتی شہر تھا۔ "لیغنی" سمندر سے چھ میل دور ایک پر فضا اور خوبصورت شہر تھا۔ [1]

صِقلّیہ مسلمانوں سے پہلے:

قدیم دور میں یہاں کبھی یونانیوں اور کبھی شاہانِ قرطاجنہ کی حکومت رہی۔ ۵۰۸ قبل از مسیح میں اٹلی کی ریاستِ روما نے جمہوری شکل اختیار کی اور دو صدیوں میں ایک عظیم مملکت بن گئی، جس کے بعد صِقلّیہ بھی اس کی توسیعی مہمات کے دائرے میں شامل ہوگیا۔ آخر کار ۲۱۲ قبل از مسیح میں صِقلّیہ پوری طرح روما کا حصہ بن گیا۔

۱۰۰ قبل از مسیح میں روما کا مشہور ہیرو "سیزر" پیدا ہوا جس نے روم میں جمہوریت کی جگہ شہنشاہیت کی بنیاد رکھی۔ روما کی عظیم سلطنت زوال پذیر ہوئی تو صِقلّیہ بھی سیاسی بحران کا شکار ہوگیا۔ ۶۶۸ء میں شاہ قُسطنطِین دوئم کے قتل کے بعد اس کا بیٹا "مرٹیس" صِقلّیہ کا حاکم بن گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بحیرۂ روم میں مسلمانوں کی پیش قدمی شروع ہوئی اور صِقلّیہ بھی اس کی زد میں آیا جو بازنطینی رومیوں کا اہم بحری مرکز تھا۔ [2]

صِقلّیہ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ بنو امیہ میں:

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ۳۳ھ (۶۵۴ء) میں صِقلّیہ پر پہلا حملہ ہوا۔ [3] حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ۴۶ھ (۶۶۶ء) میں یہاں عبداللہ بن قیس کی سرکردگی میں دوسرا حملہ ہوا جس میں دو سو جنگی جہازوں نے حصہ لیا۔ [4] اس کے بعد مختلف اموی خلفاء کے دور میں یہاں حملے ہوئے اور مسلمان حریف کو نقصان پہنچاتے رہے۔ عبدالملک بن مروان کے دور میں موسیٰ بن نصیر رحمہ اللہ نے ۸۶ھ (۷۰۵ء) میں یہاں فوج اتار کر پہلی بار ایک ساحلی شہر "اولویہ" فتح کیا۔ تاہم جزیرے پر باقاعدہ قبضہ نہ ہوسکا۔ [5]

بنو اغلب کا دورِ حکومت

صِقلّیہ کی فتح درحقیقت بنو اغلب کا کارنامہ ہے۔ اس خاندان کا بانی ابراہیم بن اغلب، خلفائے بنو عباس کی طرف سے شمالی افریقہ کے ملک تیونس کا گورنر تھا۔ ۱۸۱ھ (۷۹۷ء) میں اس نے خلیفہ ہارون الرشید سے خودمختاری کا پروانہ لے لیا، تاہم خلفائے بنو عباس کی سرپرستی باقی رہی اور انہیں اختیار تھا کہ ضرورت پڑنے پر اپنا فیصلہ نافذ کرسکیں۔ اس مفاہمت کے ساتھ ایک سو بارہ سال تک شمالی افریقہ میں بنو اغلب کی حکومت رہی۔ اس خاندان نے بحیرۂ روم میں مسلمانوں کی بحری طاقت کو عروج تک پہنچادیا۔ انہی بحری مہمات کے نتیجے میں صِقلّیہ پر حملے شروع کیے گئے۔

---

① نهاية الارب فی فنون الادب للنويری: ۱/ ۲۳۴، ط دار الكتب والوثائق القومية ؛ موسوعة العربية العالمية، تحت: صقليه

② المسلمون فی صقلية از احمد توفيق المدنی، ص ۲۰ تا ۴۱، ط: المطبعة العربية الجزائر، نشر سنة ۱۳۶۵ھ ؛ تاريخ صقليه از مولانا رياست علی ندوی: ۱/ ۱۹ تا ۳۰، ۵۳ تا ۶۸، ط دار المصنفين اعظم گڑھ

③ تاريخ صقليه: ۱/ ۷۴ تا ۸۰ مع حاشيه

④ نهاية الارب: ۲۴/ ۲۱ تا ۵۷

⑤ تاريخ خليفة بن خياط، ص ۲۹۲

بنو اغلب کے امیر زیادۃ اللہ نے ربیع الاول ۲۱۲ھ (جون ۸۲۷ء) میں قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ کو لشکر کا سپہ سالار بنا کر صِقلّیہ کی فتح کے لیے بھیجا۔ وہ دس ہزار مجاہدین لے کر بحری جہازوں کے ذریعے صِقلّیہ پہنچے۔ رومی حکمران مائیکل ڈیڑھ لاکھ سپاہی لے کر مقابلے پر آیا مگر اسے شکستِ فاش ہوئی۔ قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ نے کئی معرکوں میں حریف کو پسپا کر کے صِقلّیہ کے کئی شہر فتح کیے اور انہیں مسلمانوں کی مضبوط چھاؤنیوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ مہم جاری تھی کہ ربیع الآخر ۲۱۳ھ (جولائی ۸۲۸ء) میں قاضی صاحب وفات پا گئے اور صِقلّیہ ہی میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد بھی رومیوں سے معرکے جاری رہے۔

۲۱۴ھ (۸۲۹ء) کی مہمات میں اندلس کے اموی حکمران عبدالرحمٰن ثانی نے بھی بنو اغلب کی بھرپور مدد کی اور تین سو بحری جہازوں پر مجاہدین کو یہاں بھیجا جو جہاد میں شامل ہوئے۔ فتوحات کا دائرہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

صِقلّیہ بہت بڑا جزیرہ تھا جس میں درجنوں شہر تھے۔ ''بلرم'' یہاں کا پایۂ تخت تھا۔ اس کے علاوہ جنوبی اٹلی کے بعض شہر بھی صِقلّیہ کے ساتھ ملحق تھے۔ اٹلی سے قریب ہونے کے باعث یہاں رومیوں کو ہر وقت کمک اور رسد ملتی رہتی تھی اس لیے پورے جزیرے پر قبضہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا تاہم بنو اغلب کا ہر حکمران صِقلّیہ کو مکمل فتح کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ۲۱۵ھ (۸۳۰ء) میں دارالحکومت بلرم کا محاصرہ شروع ہوا۔ پانچ سال کے محاصرے کے بعد ۲۲۰ھ (۸۳۵ء) میں اسے فتح کر لیا گیا۔ ۲۳۴ھ (۸۴۹ء) میں احمد بن اغلب کی قیادت میں سرقوسہ بھی سر کر لیا گیا۔ اس جنگ میں چار ہزار سے زائد نصرانی مارے گئے۔ ۲۴۴ھ (۸۵۸ء) میں رومیوں کا پایۂ تخت قَصْر یانہ بھی مسخر ہو گیا۔ ①

صقلیہ میں مسلمانوں کا علمی ماحول:

صقلیہ یونانی اور رومی دور میں اگرچہ فلسفیوں، شاعروں اور طبیبوں کا خطہ رہا تھا مگر مسلمانوں کی آمد سے قبل، یہ ادبی وفنی آثار پیوندِ خاک ہو چکے تھے اور سوائے قدیم عمارتوں اور کھنڈروں کے یہاں کوئی شے قابلِ دید نہ تھی۔ حکمران اور مذہبی اشرافیہ اپنی بالادستی کے لیے عوام کو جاہل رکھنا ناگزیر سمجھتے تھے۔ اذہان پر جمود طاری تھا اور فکر ونظر پر پہرے لگے تھے۔ بنو اغلب کے دور میں مسلمانوں کے قدم اس جزیرے میں جہاں جہاں پڑے، وہاں علوم وفنون کی بہار آ گئی۔ فاتحین کے ساتھ سینکڑوں علماء یہاں آ کر بس گئے، جابجا مساجد ومدارس قائم ہو گئے، جن سے متصل کتب خانوں اور حجروں میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ دین، تاریخ اور شعر وادب پر قابلِ قدر کام ہوتا رہا۔ یہاں کی اکثریت اہلِ سنت اور فقہِ مالکی کی پیروکار تھی۔ ②

فتوحاتِ صِقلّیہ کی تکمیل:

علمی میدان میں ان کامیابیوں کے باوجود بنو اغلب کی فتوحات کا دھارا، ایک حد پر پہنچ کر رُک گیا۔ یہاں

---

① نهاية الارب: ۲۴/۱۱۵ تا ۱۲۸، ص ۳۵۳ تا ۳۶۲، ط دار الكتب قاهره

② المسلمون في صقلية، ص ۲۲۲ تا ۲۳۰

مسلمانوں کی آمد کو ایک صدی بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ محلاتی سازشوں نے سیاسی انتشار کے آثار پیدا کر دیے۔ مقامی امراء کسی گورنر کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ وہ بہت جلد معزول یا قتل ہو جاتا تھا اور افریقہ کی مرکزی حکومت کو ہر دوسرے تیسرے سال کسی نئے گورنر کا تقرر کرنا پڑتا۔ بعض اوقات ایک ہی سال میں ایک سے زائد گورنر تبدیل ہوئے۔ ان وجوہ سے جزیرے کی پوری طرح تسخیر میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ اسی دوران رومیوں نے جزیرۂ مالٹا سمیت جنوبی اٹلی کے بعض شہر مسلمانوں سے چھین لیے۔

تیونس میں بنواغلب کا عمر رسیدہ حکمران ابراہیم بن احمد اس صورتحال سے بہت پریشان تھا۔ آخر اس نے اپنے ادھیڑ عمر بیٹے ابوالعباس کو ۲۸۷ھ (۹۰۰ء) میں صِقلّیہ کا گورنر بنا دیا۔ ابوالعباس بڑا دلیر اور تجربہ کار انسان تھا۔ اس نے شورش پسندوں کا قلع قمع کر دکھایا۔ اس نے جنوبی اٹلی پر بھی یلغار کی اور کئی شہر فتح کرنے کے بعد پوپ کے شہر روم کی فصیل تک پہنچ گیا۔ پوپ یوحنا نے سالانہ خراج دینا منظور کر کے بڑی مشکل سے مسلمانوں کو منایا۔

ابوالعباس کی مہمات جاری تھیں کہ دارالحکومت تیونس میں اس کے والد ابراہیم کو دماغی بیماری لاحق ہوگئی اور اسی حالت میں اس نے کچھ بے قصور افراد کو قتل کرا دیا۔ اس کے عجیب وغریب فیصلوں سے امرائے تیونس سخت مضطرب رہنے لگے اور انہوں نے عباسی خلیفہ معتضد باللہ کو جسے اغلبی خانوادہ اپنا سرپرست مانتا تھا، یہ اطلاعات پہنچا دیں۔[1]

ان دنوں مغربی افریقہ میں اسماعیلی داعی ابوعبداللہ یمنی کا فتنہ تیزی سے سر ابھار کر مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایسے میں تیونس پر ایک مخبوط الحواس حکمران کی موجودگی اس سلطنت کو کھونے کے مترادف تھی، اس لیے خلیفہ معتضد باللہ نے ابراہیم بن احمد کو تیونس کا تاج وتخت چھوڑ دینے کا حکم دیا۔

ابراہیم نے حکم کی تعمیل کی اور صِقلّیہ کے محاذ پر مصروف اپنے بیٹے ابوالعباس کو واپس بلا کر اپنی جگہ بٹھا دیا۔ پھر اس نے اپنا علاج کرایا اور بہت جلد اسے شفا نصیب ہوگئی۔ وہ غائب دماغی کی حالت میں کیے گئے غلط فیصلوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے درویش بن گیا اور باقی زندگی جہاد کے لیے وقف کرنے کا عزم کر لیا۔ وہ صوفیوں کے لباس میں صِقلّیہ پہنچا اور جہاد کی ادھوری مہم کی تکمیل کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اس کا پوتا (ابوالعباس کا بیٹا) ابومضر زیادۃ اللہ بھی اس مہم میں اس کے ساتھ ہوگیا۔ سابق بادشاہ کی لشکر میں آمد نے مجاہدین کے حوصلے بہت بڑھا دیے۔ زبردست تیاری کے ساتھ رومیوں سے جنگیں شروع ہوئیں اور ہر جگہ فتح ونصرت نے قدم چومے۔[2]

آخر کار ۲۸۹ھ (۹۰۲ء) میں صِقلّیہ کا آخری شہر ''طبرمین'' بھی فتح کر لیا گیا۔ یوں صِقلّیہ کی وہ مہم جو ۳۳ھ میں شروع ہوئی تھی، وہ ۲۵۶ سال بعد ابراہیم بن احمد اغلبی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی جس پر رومیوں کے ہاں ماتم برپا ہوگیا۔ اُدھر بوڑھا ابراہیم ان جاں توڑ مہمات کی وجہ سے بیمار پڑ گیا اور ۱۹ ذوالقعدہ ۲۸۹ھ (۲۴ اکتوبر ۹۰۲ء) کو اس

---

① نہایۃ الارب: ۱۳۰/۲۴ تا ۱۳۶؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۸۷ھ تا ۲۸۹ھ

② بحوالہ بالا

نے جان جاں آفرین کے سپرد کر دی۔ وفات سے پہلے اس نے اپنے پوتے ابو مضر زیادۃ اللہ کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔[1]

پورا صقلیہ ۲۸۹ھ کے اواخر میں فتح ہوا۔ اے کاش کہ اقبال مندی کا یہ ستارہ کم از کم ایک صدی تک تو چمک پاتا۔ مگر افسوس کہ یہ جزیرہ جس کی فتوحات کی تکمیل ۷۶ سال تک جہاد کر کے ہوئی تھی، ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ زوال کی آندھیوں کا شکار ہو گیا اور مسلمانانِ صقلیہ ایسے انتشار میں مبتلا ہوئے جس نے رفتہ رفتہ انہیں ختم کر دیا۔

صِقلّیہ میں مسلمانوں کا زوال:

سلسلۂ اسبابِ زوال اصولِ موروثیت کے تحت ایک نااہل نوجوان کو گورنری سونپنے سے شروع ہوا۔ ابو مضر زیادۃ اللہ نے گورنری کی مسند پر بیٹھنے کے بعد فتوحات یا ملکی انتظام میں کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ اس کے باپ ابو العباس کو جب اس کی رنگ رلیوں کی اطلاع ملی تو اسے معزول کر کے تیونس بلایا اور جیل میں پھینکوا دیا۔ پھر اس کی جگہ محمد ابن سرقوسی کو صِقلّیہ کا والی بنا دیا۔ مگر ابو مضر نے جیل خانے ہی میں کچھ غلاموں کو ساتھ ملا کر سازش کی اور شعبان ۲۹۰ھ (مئی ۹۰۳ء) میں اپنے باپ کو قتل کرا کے اس کی جگہ تیونس کی مسندِ حکومت پر مسلط ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے جو کچھ کیا، وہ تیونس کی اغلبی حکومت اور مسلم صِقلّیہ دونوں کے لیے پیامِ موت ثابت ہوا۔

اس نے ظلم و ستم کی انتہاء کرتے ہوئے اپنے سیاسی حریفوں ہی کو نہیں بلکہ اپنے دوستوں اور خیر خواہوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس کی راتیں عیش و نشاط میں اور دن جبر و تشدد پر مبنی حکم جاری کرتے ہوئے گزرتے۔

اس نے صِقلّیہ کے حاکم محمد ابن سرقوسی کو معزول کر کے علی بن محمد ابو الفوارس کو گورنر بنا دیا۔ کچھ دنوں بعد اسے بھی ہٹا کر احمد بن ابو الحسین بن رباح کو یہ منصب سونپ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صِقلّیہ میں ابو الفوارس اور ابن رباح میں تنازعہ شروع ہو گیا۔ ان حالات میں تیونس اور صِقلّیہ کے تمام امراء بنو اغلب کے مخالف بن گئے۔ اسماعیلی داعی عبداللہ یمنی نے حالات کو سازگار دیکھ کر اپنے آقا جعلی مہدی کو افریقہ بلا لیا۔ اس "روحانی شخصیت" کے گرد جمع ہو کر بربروں کا جوش و خروش آسمان تک پہنچ گیا اور وہ دیگر شہروں کو فتح کرتے ہوئے آناً فاناً تیونس پہنچ گئے۔

آرام پسند ابو مضر اس طوفان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ تمام خزانے اونٹوں پر لاد کر افریقہ سے نکل گیا اور کوچ در کوچ کرتا ہوا "رملہ" پہنچ گیا اور جمادی الاخریٰ ۲۹۶ھ (مارچ ۹۰۹ء) میں وہیں گمنامی کی حالت میں مر گیا۔

ان حالات میں صِقلّیہ بھی بے یار و مددگار ہو گیا۔ وہاں کے والی احمد بن ابی الحسین نے حالات کی باگ تھامنے کی پوری کوشش کی مگر سابق گورنر ابو الفوارس نے اسے معاف نہ کیا اور اس کی دشمنی میں عبید اللہ المہدی سے ساز باز کر لی۔

---

[1] نهاية الارب: ۲۳/ ۱۳۰ تا ۱۳۶؛ الکامل فی التاریخ: سنہ ۲۸۷ھ تا ۲۸۹ھ

ابراہیم بن احمد اغلبی کی عمر ۵۲ سال تھی۔ اس نے ۲۸ سال حکومت کی تھی۔ شروع کے سات سال اس نے بہت اچھی حکومت کی مگر پھر رفتہ رفتہ وہ مال جمع کرنے کا حریص ہو گیا۔ پھر دن بدن اس کا مزاج متغیر ہوتا گیا، یہاں تک کہ وہ دماغی مریض بن گیا اور اس کے ہاتھوں بہت سے لوگ بے گناہ مارے گئے۔ (البیان المغرب: ۱/ ص ۱۳۲، ۱۳۳) تاہم بیماری سے شفایاب ہو کر اس نے جہاد کے لیے زندگی وقف کر کے بڑی حد تک تلافی مافات کر دی تھی۔

گیارہ رجب ۲۹۶ھ (۵ اپریل ۹۰۹ء) کو ابوالفوارس نے احمد بن ابی الحسین کے گھر کو نرغے میں لے کر اسے گرفتار کرلیا اور اسے مہدی کے پاس افریقہ بھیج دیا۔ یوں صِقلّیہ دولتِ بنوعبید کا ایک صوبہ بن گیا۔ ①

❁❁❁

صِقلّیہ میں بنوعبید کی حکومت

''صِقلّیہ'' اپنی مکمل تسخیر کے صرف سات برس بعد اہلِ سنت کے ہاتھ سے نکل کر اسماعیلی رافضی حکومت میں شامل ہوگیا۔ اس کایا پلٹ میں علی بن محمد ابوالفوارس کی غداری کا بڑا ہاتھ تھا، لہٰذا اس کی درخواست پر اسی کو صقلیہ کا پہلا اسماعیلی گورنر مقرر کیا گیا۔ مگر کچھ عرصے بعد اسے معزول کر کے، اپنے خاص گماشتے حسن بن احمد کا تقرر کیا گیا جو ابن ابی خنزیر کی کنیت سے مشہور تھا۔ اس نے ''اسماعیلیت'' کو صقلیہ کا سرکاری مذہب بنا دیا۔ ②

ابن قرہب کی تحریکِ حریت:

ابن ابی خنزیر کی زیادتیوں کو صِقلّیہ کے مسلمانوں نے سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور صرف دو سال بعد ۲۹۸ھ (۹۱۱ء) میں وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ بغاوت تو فرو کردی گئی مگر اس کے بعد ۲۹۹ھ (۹۱۲ء) میں عبیداللہ المہدی نے ابن ابی خنزیر کو ہٹا کر علی بن عمر البلوی کو یہاں کا حاکم بنا دیا۔ اس کے باوجود، ابن ابی خنزیر یہاں سنی شیعہ تفرقہ بازی کی جو آگ لگا چکا تھا، وہ کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوسکی۔ مسلمانانِ صِقلّیہ نے علانیہ بغاوت کر کے اسماعیلی عبیدی عملے کو صِقلّیہ سے بھگا دیا اور اغلبی خاندان کے ایک شہزادے احمد بن زیادۃ اللہ کو جو ''ابن قُرہَب'' کی کنیت سے مشہور تھا، والی مان لیا۔ ابنِ قُرہَب نے خلیفہ مقتدر عباسی کا نام خطبے میں شامل کر کے اس سے صِقلّیہ کا پروانۂ حکومت حاصل کرلیا۔ جلد ہی اس نے طاقت پکڑ کر صِقلّیہ کے خاصے حصے پر تسلط جما لیا اور اٹلی پر بھی کامیاب تاخت و تاراج کی۔

عبیداللہ المہدی اس تحریک سے خوفزدہ ہوگیا اور اس نے ۳۰۱ھ میں ابن ابی خنزیر کی قیادت میں بحری فوج صِقلّیہ روانہ کردی تاہم ابن قُرہَب نے کھلے سمندر میں اس بحری بیڑے کو شکست دی اور ابن ابی خنزیر کو قتل کردیا۔

مگر اس فتح کے بعد ابن قرہب نے جلد بازی کر کے بنوعبید کے خلاف افریقہ پر حملہ کردیا جو ناکام رہا اور صقلیہ کا بحری بیڑا چھن گیا۔ اس شکست نے امرائے صقلیہ کو ابن قرہب سے بددل کردیا۔ وہ بنوعبید کی دھمکیوں سے بھی خوفزدہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے ابن قُرہَب کی بجائے ایک رئیس ابوالغفار کو اپنا حکمران بنا لیا جس نے ابن قرہب کو گرفتار کر کے عبیداللہ المہدی کے پاس بھیج دیا۔ وہاں محرم ۳۰۴ھ میں اسے ہاتھ پیر کٹوا کر ابن ابی خنزیر کی قبر پر قتل کردیا گیا۔ یوں تین سال گیارہ ماہ تک صِقلّیہ پر قابض اس آخری اغلبی امیر کا انجام بہت دردناک ہوا۔

---

① نهاية الارب: ۱۴۶/۲۴ تا ۱۵۳؛ الكامل في التاريخ: سنة ۲۹۰ھ تا ۲۹۶ھ

② نهاية الارب: ۳۶۶/۲۴؛ المسلمون في صقلية: ص ۱۲۹، ۱۳۰

صِقِلّیہ کے مسلمان سمجھتے تھے کہ وہ ابوالغفار کی قیادت میں اب ایک آزاد ریاست کے طور پر رہیں گے اور اسماعیلی حکومت ابن قرہب کو انتقام کا نشانہ بنانے کے بعد مطمئن ہو چکی ہوگی اور ان پر دوبارہ فوج کشی نہیں کرے گی۔ مگر اسماعیلیوں کے پیشوا عبیداللہ نے ان کی امید پر پانی پھیر دیا اور ابوسعید موسیٰ بن احمد کو ایک لشکرِ جرار دے کر صِقِلّیہ بھیج دیا۔ اس فوج کشی کے نتیجے میں ابوالغفار کی حکومت ختم ہوگئی اور صِقِلّیہ پر ایک بار پھر اسماعیلی شیعوں کا تسلط ہوگیا۔ ①

ان ظالموں نے مسلمانوں پر سخت ترین مظالم ڈھائے، معصوموں کے قتلِ عام اور عورتوں کی عصمت دری سے بھی دریغ نہ کیا۔ ہزاروں مسلمان قیدیوں کو افریقہ بھیجنے کے بہانے بحری جہازوں میں سوار کیا گیا اور پھر ان جہازوں کو بیچ سمندر میں ڈبو دیا گیا۔ بُری طرح پامال ہونے کے بعد صِقِلّیہ کے مسلمان حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ②

بنوعبید کی فتوحات اور نئی مزاحمتی تحریک:

ابوسعید موسیٰ کی فاتحانہ واپسی کے بعد ۳۰۵ھ میں سالم بن ابی راشد کو صِقِلّیہ کا گورنر بنایا گیا جس کی گورنری کے ابتدائی سال نرم پالیسی کی وجہ سے پُرامن گزرے۔ اس دوران عبیداللہ المہدی کے حکم پر بنوعبید کے مختلف جرنیلوں نے ۳۱۰ھ (۹۲۲ء) سے ۳۱۷ھ (۹۲۹ء) تک اٹلی کے خلاف کئی مہمات انجام دیں۔ ''جنیوا'' پر بھی حملہ ہوا۔ اہم ترین ہدف، جنوبی اٹلی کا شہر ''قلوریہ'' تھا جس نے آخرکار جزیہ دینا قبول کرلیا۔

اُدھر سالم بن راشد چند سال بعد سختی اور جبر و تشدد پر اُتر آیا۔ اس کے مظالم نے عوام کو مشتعل کر دیا اور جا بجا آزادی کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''جرجنت'' کے حاکم اور ''بلوط'' کے قلعہ دار کو نکال باہر کیا گیا۔ سالم اس تحریک کو کچلنے کے لیے فوج لے کر نکلا مگر مقابلے میں بُری طرح شکست کھائی۔ اُدھر پایۂ تخت بلرم میں بھی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، جن پر قابو پانے کے لیے سالم کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ اسی دوران ۳۲۲ھ (۹۳۴ء) میں بنوعبید کے پیشوا عبیداللہ المہدی کی موت واقع ہو چکی تھی اور اس کا بیٹا القائم مرکز میں اس کا جانشین تھا۔ مزاحمتی گروہ کے ایک رہنما اسحٰق بستانی نے القائم کو لکھ بھیجا کہ وہ سالم کے مظالم کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے تھے، مرکزی حکومت اگر اس ظالم کو برطرف کردے تو وہ اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ القائم نے اس قضیے کو نمٹانے کے لیے یہی بہتر سمجھا کہ سالم کو معزول کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی جگہ خلیل بن اسحٰق کو یہ عہدہ دے دیا گیا۔ یہ ۳۲۵ھ (۹۳۷ء) کا واقعہ ہے۔ ③

خلیل نے یہاں تعمیراتی کام کرائے اور ساحلِ سمندر پر ایک نیا شہر ''خالصہ'' بنوایا۔ مگر اس کے اور سابق گورنر سالم کے مابین بڑھتی ہوئی کشیدگی نے صِقِلّیہ کے عوام کا جینا دوبھر کر دیا۔ اس زرخیز ملک میں بدانتظامی کی وجہ سے ایسا قحط پڑا کہ لوگ فاقوں سے مرنے لگے۔ ان حالات میں انہوں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر قُسطَنطِینیہ کے قیصر سے مدد مانگی۔ قیصر نے غلے سے بھرے ہوئے بحری جہاز سپاہیوں سمیت صِقِلّیہ روانہ کیے مگر گورنر خلیل بن اسحٰق نے مقابلہ کر کے

---

① المسلمون فی صقلیة، ص ۱۳۰ تا ۱۳۴؛ الکامل فی التاریخ، سنة ۳۰۰ھ

② المسلمون فی صقلیة، ص ۱۳۳، ۱۳۴

③ المسلمون فی صقلیة، ص ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۳۹

انہیں بندرگاہ پر نہ اترنے دیا۔ اس کے بعد وہ بیرونی مدد طلب کرنے والے امراء اور عوام کی طرف متوجہ ہوا۔ چار سال تک یہ کارروائیاں جاری رہیں جس میں خلیل نے دس لاکھ افراد قتل کرائے۔ آخر کار افریقی پایۂ تخت سے خلیل کی واپسی کا حکم آ گیا۔[1] جاتے جاتے بھی اس ظالم نے یہ حرکت کی کہ ہزاروں مسلمان شرفاء کو جہازوں میں بھر کر ساتھ لے چلا۔ مگر یہ بے چارے کبھی افریقہ نہ پہنچ سکے کیوں کہ خلیل نے ان جہازوں کو گہرے سمندر میں غرق کرا دیا تھا۔[2]

ابو عطاف محمد بن اشعث الازدی:

۳۲۹ھ (۹۴۱ء) میں ابو عطاف محمد ابن اشعث الازدی صِقِلّیہ کا گورنر مقرر ہوا۔ وہ ایک مدبر شخص تھا جس نے امن و امان کو بحال کر دیا۔ تاہم آخر میں اسے بھی پایۂ تخت بلرم میں بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اس پر قابو نہ پا سکا۔[3]

بنو کلب کی نیم خود مختار حکومت

۳۳۴ھ (۹۴۶ء) میں عبیدی حکمران القائم کی موت پر المنصور اس کا جانشین بنا۔ اس نے ابو عطاف کو بلرم کی بغاوت پر قابو پانے میں ناکام دیکھ کر صِقِلّیہ کے لیے کسی قابل شخص کا انتخاب ضروری سمجھا۔ آخر قرعۂ فال حسن بن علی کلبی کے نام نکلا جو ایک دلیر، ذہین اور ہوشیار شخص تھا اور اسے سیاسی و عسکری معاملات کا بڑا تجربہ تھا۔[4]

حسن بن علی کلبی:

حسن بن علی کلبی شمالی افریقہ میں خارجی سردار ابو یزید کی بغاوت فرو کرنے میں نمایاں کارکردگی دکھا چکا تھا، چنانچہ اسے صِقِلّیہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ جلد ہی یہ گورنری ایک قسم کی خود مختاری میں بدل گئی اور صِقِلّیہ سے بنو عبید کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ اس صورتحال نے حسن بن علی کو بڑا فائدہ پہنچایا کیوں کہ صِقِلّیہ میں اب بھی اکثریت سُنی مسلمانوں کی تھی جو بنو عبید سے نالاں تھے۔ حسن بن علی نے سیاسی جوڑ توڑ اور حکمتِ عملی سے کام لے کر مقامی امراء کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور انصاف پسندی کے ذریعے مقامی باشندوں کا اعتماد بھی حاصل کر لیا۔ یوں اس نے ۳۳۶ھ (۹۴۷ء) سے ۳۴۳ھ (۹۵۴ء) تک بڑی شان اور اطمینان سے حکومت کی۔ اس دوران اس نے رومیوں سے کئی جنگیں لڑیں اور صِقِلّیہ کے آخری کونے اور گوشے بھی فتح کر ڈالے۔ نیز اس نے جنوبی اٹلی کے بعض قلعوں اور بستیوں کو بھی مسخر کر لیا۔[5]

احمد بن حسن بن علی:

حسن بن علی کو ۳۴۲ھ میں بعض ناگزیر امور انجام دینے کے لیے افریقہ واپس جانا پڑا، جب واپسی میں تاخیر ہوئی تو اس نے بنو عبید سے اپنے بیٹے احمد کے لیے صِقِلّیہ کی ولایت منظور کرا لی۔ یوں ۳۴۳ھ میں احمد بن حسن صِقِلّیہ کا نیا گورنر بن گیا اور صِقِلّیہ کی امارت اس خانوادے کے لیے مخصوص کر دی گئی۔[6]

---

(1) المسلمون فی صقلیۃ، ص ۱۳۹ تا ۱۴۱ (2) الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۲۷ھ
(3) تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۲۶۶، الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۳۶ھ، نهایۃ الارب للنویری: ۲۴/ ۳۶۹، تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۳۷ تا ۳۳۹
(4) بحوالہ بالا (5) تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۴۱ تا ۳۵۱ (6) تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۵۱، ۳۵۲

معرکۂ رمطہ:

اسی زمانے میں شاہِ جرمنی اوتھو اعظم نے اٹلی پر حملہ کر کے پوپ کے عزل و نصب کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اس نے اٹلی کی ان جنوبی آبادیوں پر قبضہ کر لیا جو صِقِلّیہ کے زیرِ نگین تھیں۔ ان خبروں سے صِقِلّیہ کے عیسائی بھی جوش میں آئے اور انہوں نے ''طبرمین'' جو ان کا سب سے بڑا مرکز تھا، بغاوت کر دی۔ احمد بن حسن نے ۳۵۱ھ میں یہاں فوج کشی کی اور باغیوں کا سر کچل ڈالا۔ ۳۵۲ھ میں اس نے ایک بہادر سالار حسن بن عمار کو نصرانیوں کے ایک دوسرے مستحکم مورچے ''رمطہ'' کی تسخیر کے لیے بھیج دیا۔ حسن بن عمار نے رجب ۳۵۲ھ میں شہر کا محاصرہ کر لیا مگر شہر کے دفاعی انتظامات بہت مستحکم تھے، اس لیے محاصرہ طویل ہوتا چلا گیا۔ یہ اطلاعات رومیوں تک پہنچیں تو بازنطینی بادشاہ قیصر نقفور[1] نے اپنے جرنیل منوئیل کو چالیس ہزار سپاہی دے کر صِقِلّیہ کے عیسائیوں کی مدد کے لیے روانہ کر دیا۔

اب ایک بڑا معرکہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ احمد بن حسن کا باپ حسن بن علی کلبی یہ خبریں سن کر افریقہ سے صِقِلّیہ آ گیا تا کہ بیٹے کی راہنمائی کرے۔ شوال ۳۵۳ھ میں رومیوں کا بحری بیڑا صِقِلّیہ پہنچا اور اس نے رمطہ سے نو (9) میل دور واقع ''مسینا'' کی بندرگاہ کو اپنا مرکز بنایا۔ منوئیل نے مقامی عیسائیوں کو جوش دلا کر لشکر میں بھرتی کیا۔ یوں اس کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ مسلمانوں نے اس لشکر کی پیش قدمی کے چار ممکنہ راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی مگر منوئیل کو یہ اطلاعات مل گئیں اور وہ اس طرح آگے بڑھا کہ مسلمانوں کی حکمتِ عملی ناکام ہو گئی۔ آخر رومی لشکر ''رمطہ'' کے قریب آ گیا جہاں مسلمانوں کی فوج جمع ہو رہی تھی۔ رومی لشکر نے تین اطراف سے مسلمانوں کو گھیر لیا اور صبح کی روشنی پھیلتے ہی نہایت شدید جنگ چھڑ گئی۔ اس دوران اچانک رمطہ کے محصور عیسائی پشت سے مسلمانوں پر حملے کے لیے نکل آئے اور مجبوراً مسلمانوں کو ایک دائرے کی شکل بنا کر دفاعی جنگ کرنا پڑی تاہم چند گھنٹوں بعد رومیوں کے دباؤ کے سامنے ان کے قدم اکھڑ گئے۔ پشت پر رمطہ کے عیسائیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، اس لیے اکثر مسلمان اسی طرف پسپا ہوئے اور انہیں تتر بتر کر کے اپنے خیموں تک پہنچ گئے۔ مگر سپہ سالار حسن بن عمار اپنی جگہ ثابت قدم رہا اور اپنے خاص دستے کو لے کر سیدھا منوئیل کے دستے سے جا ٹکرایا۔ ان مٹھی بھر افراد کو سامنے دیکھ کر منوئیل نے کچھ حقارت آمیز فقرے کسے جن سے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو مزید جوش آ گیا۔ ابن عمار اپنے ساتھیوں سمیت رومیوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی ہمت و شجاعت نے باقی فوج کو بھی حوصلہ دیا اور پسپا ہونے والے مسلمان تیزی سے پلٹنے لگے۔ منوئیل نے یہ دیکھ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نیزہ تھام کر خود مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ چند مسلمان جانبازوں نے موقع غنیمت جانا اور اسے گھیر لیا مگر ان کی تلواریں اس کے آہنی خود اور زرہ بکتر پر لگ کر اچٹ جاتی تھیں۔ آخر مسلمانوں نے اس کے گھوڑے کو مار گرایا اور پھر اس پر جھپٹ کر اس کا سر قلم کر دیا۔[2]

---

[1] یہ وہی قیصر نقفور ہے جو اس زمانے میں شام کے ساحلوں پر حملے کر رہا تھا اور بنو حمدان کا حکمران، متنبی کا ممدوح سیف الدولہ اس کا مقابلہ کر رہا تھا۔

[2] نہایۃ الارب للنویری: ۲۴/۳۷۰ تا ۳۷۲؛ تاریخ صقلیہ: ۱/۳۵۵ تا ۳۶۲

منوئیل کے قتل سے رومیوں میں ہل چل مچ گئی۔ ان کے بڑے بڑے نواب اور نائٹ جوشِ انتقام میں آگے بڑھے مگر گاجر مولی کی طرح کٹ گئے۔ باقی جرنیلوں نے فوج کو سنبھال کر دوبارہ قدم جمانے کی کوشش کی مگر اس دوران آسمان پر بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ مجاہدین کے نعروں اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے ساتھ بادلوں کی گرج نے عجب سماں پیدا کر دیا اور شمشیر وسناں کی بجلیوں کے ساتھ برقِ آسمانی کی چمک نے ماحول کو نہایت خوفناک بنا دیا۔ اس حالت میں یہ معرکہ عصر تک جاری رہا۔ آخر کار نصرانی نہایت خستہ اور شکستہ حالت میں میدانِ جنگ سے فرار ہوئے مگر عقب میں واقع ایک گہری خندق ان کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ اس سے نکلنے کے لیے ان میں باہم تلواریں چلنے لگیں جب کہ اس دوران مزید مفرورین اس خندق میں گرتے جا رہے تھے۔ آخر خندق بھر گئی اور باقی مفرورین اپنے ہم مذہبوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔ مسلمانوں نے تعاقب نہ چھوڑا اور انہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر قتل کرتے رہے یہاں تک کہ مطلع بالکل صاف ہوگیا۔ مسلمانوں کو بے پناہ مالِ غنیمت حاصل ہوا جس میں تاریخی حیثیت رکھنے والی ایک تلوار بھی تھی جو کسی صحابی کی تھی۔ [1] اس کے دستے پر یہ الفاظ کندہ تھے:

هذا سيف هندی وزنه مائة وسبعون مثقالاً ، طالما ضرب بين يديه رسول الله ﷺ "

"یہ ایک سو ستر مثقال وزن کی ہندوستانی ساختہ تلوار ہے جو کئی بار رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں استعمال ہوئی۔"

اس جنگ کے بعد "رمطہ" زیادہ مزاحمت نہ کر سکا اور چند دنوں بعد مسخر ہوگیا۔ [2]

وقعۃ المجاز:

اُدھر رومیوں کی باقی ماندہ فوج اور ان سے تعاون کرنے والے صِقِلّیہ کے نصرانی باغیوں نے اٹلی کی بندرگاہ "ریُو" میں جا کر پناہ لی حالانکہ "ریُو" کے عمائد کے ساتھ صِقِلّیہ کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ ان کے دشمنوں کو پناہ نہیں دیں گے۔ چنانچہ احمد بن حسن نے کسی تاخیر کے بغیر ایک بحری بیڑہ مرتب کر کے "ریُو" کا رخ کیا۔ یہ فوج عین اس وقت "ریُو" پہنچی جب رومی اور ان کے معاون باغی اپنے بیڑے میں بیٹھ کر کہیں اور فرار ہو رہے تھے۔ اب دونوں بیڑوں کے مابین زبردست جنگ شروع ہوگئی۔ اس دوران کچھ غوطہ خور مجاہدین نے نصرانیوں کے جہازوں کے نیچے جا کر انہیں چھید ڈالا اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے جہاز غرق ہوگئے۔ جنگ جاری رہی یہاں تک کہ سمندر رومیوں کے خون سے سرخ ہوگیا۔ جو دشمن زندہ بچ کر نکل سکے، ان کو ایک دوسرے کی کوئی خبر نہ تھی۔ قیدیوں میں ایک ہزار نواب، جرنیل اور نائٹ شامل تھے جبکہ ایک سو بڑے مذہبی رہنما تھے۔ یہ جنگ "وقعۃ المجاز" کہلاتی ہے جس نے رومیوں کی طاقت پر نہایت کاری ضرب لگائی اور دنیائے نصرانیت ایک طویل مدت تک کے لیے صِقِلّیہ کی بازیافت سے مایوس ہوگئی۔ [3]

---

① غالباً یہ تلوار شام کی جنگوں یا قسطنطنیہ پر ابتدائی حملوں کے دوران رومیوں کے ہاتھ لگ گئی ہوگی۔

② نهاية الارب للنويری: ۲۴ / ۳۷۲، ۳۷۳؛ تاریخ صقلیہ: ۱ / ۳۶۳ تا ۳۶۵

③ المسلمون فی صقلية: ۱ / ۱۴۸ تا ۱۵۰؛ تاریخ صقلیہ: ۱ / ۳۶۵ تا ۳۶۷

ان دنوں قیصرِ نقفور کا لشکر شام کے ساحلی شہر ''مصیصہ'' کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ یہ خبر سنتے ہی نقفور نے محاصرہ ختم کر کے واپسی کا حکم دیا اور مسلمانانِ شام کو ایک بڑی مصیبت سے عارضی چھٹکارا مل گیا۔ [1]

اس فتح کی خبر نے مسلمانانِ صِقِلّیہ کو نہال کر دیا۔ جب عیسائی امراء قیدی بنا کر وہاں لائے گئے تو حسن بن علی پر شادیٔ مرگ کی حالت طاری ہوگئی اور ۱۸ ذوالقعدہ ۳۵۳ھ کو وہ ۵۳ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ [2]

احمد بن حسن کی معزولی:

۳۵۸ھ میں قیصرِ روم اور بنوعبید کے مابین صلح ہوگئی اور عبیدی حکمران المُعِزّ نے اظہارِ دوستی کے لیے صِقِلّیہ کے دو شہر ''طبرمین'' اور ''رمطہ'' ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ احمد بن حسن کو یہ ناگوار گزرا اور اس نے یہ شہر رومیوں کے حوالے کرنے سے پہلے نذرِ آتش کرا دیے۔ اس پر المُعِزّ نے اسے معزول کر کے افریقہ بلا لیا اور حسن بن علی کے ایک آزاد کردہ غلام یعیش کو صِقِلّیہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ یعیش کے تقرر کا تجربہ ناکام رہا اور جلد ہی ''بلرم'' میں اس کے خلاف بغاوت ہوگئی جو جنگل کی آگ کی طرح سرقوسہ تک پھیل گئی۔ بلوائیوں نے زیادہ تر غصہ مقامی نصرانیوں پر نکالا کیوں کہ ان کے خیال میں المُعِزّ نے انہی کو خوش کرنے کے لیے احمد بن حسن کو معزول کیا تھا۔ آخر بنوعبید نے مجبور ہو کر ۳۵۹ھ میں احمد بن حسن کو بحال کر دیا۔ اس نے اپنے بھائی ابوالقاسم کو صِقِلّیہ میں بطورِ نائب روانہ کر دیا۔ وہ خود افریقہ میں ہی تھا کہ بیمار پڑ گیا اور صِقِلّیہ روانگی سے قبل ۳۵۹ھ کے آخر میں وفات پا گیا۔ [3]

ابوالقاسم کلبی:

حسن کلبی کا دوسرا بیٹا ابوالقاسم جو شعبان ۳۵۹ھ (۹۷۱ء) میں یہاں نائب گورنر کی حیثیت سے پہنچا تھا، اب مستقل گورنر بن گیا۔ اس نے بارہ سال حکومت کی۔ اس کے دور میں صِقِلّیہ کی حکومت بڑی حد تک خود مختار ہوگئی ابوالقاسم مذہبی تعصب سے بالاتر اور عوام دوست انسان تھا۔ اس کا ذہن یہ تھا کہ عوام کو حکمران کے دین و ایمان سے اتنی غرض نہیں ہوتی جتنی عدل وانصاف سے۔ اگر انہیں پورے پورے حقوق دیے جائیں تو وہ کسی غیر مذہب والے کی حکومت بھی قبول کر لیتے ہیں لیکن اگر ان کی حق تلفی کی جاتی رہے تو وہ اپنے ہم مذہب سے بھی بغاوت کر دیتے ہیں۔ اس ذہن کو سامنے رکھ کر اس نے پوری توجہ خود کو ایک نیک سیرت، عادل اور عوام پرور حکمران کی شکل دینے پر مرکوز کیے رکھی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ بردبار، امن پسند اور منصف مزاج تھا۔ علماء اور اہلِ علم وفضل کی قدر دانی کرتا تھا۔ اس نے رومیوں سے کئی معرکے لڑے اور آخر ایک جنگ میں ہی اس نے اپنی جان دے دی۔ یہ ۳۷۲ھ (۹۸۲ء) کا واقعہ ہے۔ سُنّی مؤرخین بھی اسے صِقِلّیہ کے بہترین حکمرانوں میں شمار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس نے پس ماندگان کے لیے کوئی نقدی نہیں چھوڑی تھی۔ تمام دراہم ودینار زندگی ہی میں وہ صدقہ وخیرات کر چکا تھا۔ اسی لیے اہلِ صقلیہ کو اس کی موت کا سخت دکھ ہوا۔ [4]

---

[1] نہایۃ الارب للنویری: ۲۲/ ۳۷۳ [2] تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۶۶ تا ۳۶۸ [3] تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۶۸ تا ۳۷۳

[4] نہایۃ الارب للنویری: ۲۲/ ۳۷۵؛ المسلمون فی صقلیۃ، ص ۱۵۲ تا ۱۶۰؛ تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۷۳ تا ۳۸۵

ابوالقاسم کلبی کے جانشین:

ابوالقاسم کا بیٹا جابر اس کا جانشین ہوا جو بالکل نااہل تھا۔ وہ ایک سال بعد معزول کر دیا گیا۔ ۳۷۳ھ (۹۸۳ء) میں اس کی جگہ اس کا چچازاد جعفر بن محمد کلبی یہاں کا امیر بنا۔ وہ ایک قابل آدمی تھا جو دو سال بعد ۳۷۵ھ (۹۸۵ء) میں وفات پا گیا۔ پھر اس کا بھائی عبداللہ بن محمد کلبی آیا اور چار برس حکومت کر کے ۳۷۹ھ (۹۸۹ء) میں فوت ہو گیا۔

اس کے بیٹے ابوالفتوح نے ثقۃ الدولہ کا لقب اختیار کر کے نو سال حکومت کی۔ اس کا دربار مجلس علم وفضل اور بزم شعر و ادب مانا جاتا تھا۔ ۳۸۸ھ (۹۹۸ء) میں اس نے فالج کی وجہ سے زندگی میں ہی اپنے بیٹے جعفر کو گدی سونپ دی جس نے تاج الدولہ اور سیف الملۃ کے لقب کے ساتھ حکومت سنبھالی۔

جعفر کی حکومت کے سولہ سال پُرامن گزرے مگر پھر اس کے بھائی علی نے بربر قبائل کو ساتھ ملا کر حالات خراب کر دیے۔ اگرچہ علی پر قابو پا لیا گیا مگر امن قائم نہ ہو سکا جس کی ایک بڑی وجہ وزیراعظم حسن محمد بانائی کے مظالم تھے جن سے عوام جاں بلب ہو چکے تھے۔ ایسے میں عوام کی فریاد پر مفلوج ابوالفتوح حرکت میں آیا اور اس نے تخت نشین بیٹے جعفر کو معزول کر کے دوسرے بیٹے احمد الاکحل کو حکومت دے دی۔ احمد الاکحل ۴۱۰ھ (۱۰۱۹ء) میں تائید الدولہ کا لقب اختیار کر کے مسند نشین ہوا۔ وہ ایک کمزور حکمران تھا۔ اس کے دور میں دولتِ بنوکلب زوال پذیر ہو گئی۔ [1]

نارمنوں کا ظہور

یہی وہ ایام تھے جب ایک نئی قوت ظاہر ہوئی۔ یہ نارمن قزاق تھے جنہوں نے بحیرۂ روم پر اجارہ داری قائم کر کے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ نارمن اصل میں ناروے کے برفانی علاقے کے باسی تھے جنہیں تہذیب وتمدن سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کی بے رحمی اور درندگی سے یورا یورپ پناہ مانگتا تھا۔ ایک مدت تک یورپ کے سرحدی دیہاتوں پر تاخت وتاراج کے بعد انہوں نے فرانس پر حملہ کیا اور کچھ علاقے پر قابض ہو گئے۔ فرانس کے حکام نے عاجز آ کر ایک باج گزار ریاست کے طور پر ان کا استحقاق تسلیم کر لیا اور یہ علاقہ نارمنڈی کہلانے لگا۔ اہل یورپ سے میل جول سے نارمنوں نے نصرانیت قبول کر لی۔ ان کی حیثیت اس وقت مزید بڑھ گئی جب نارمن سردار ایڈلف کے نکاح میں شاہی خاندان کی ایک لڑکی آ گئی۔ جلد ہی نارمنوں نے اٹلی کا بھی کچھ علاقہ فتح کر کے اسے اپنا مرکز بنا لیا۔ اب یورپی حکمران نارمنوں کو خطرناک بحری مہمات کے لیے استعمال کرنے لگے۔ [2]

صقلیہ کے حکمران تائید الدولہ کے دور میں نارمن پہلی بار اس جزیرے پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے ۴۱۶ھ (۱۰۲۵ء) میں قلوریہ پر قبضہ کر کے وہاں کی مسلم آبادی کو بالکل تہ تیغ کر ڈالا اور تائید الدولہ ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ [3]

---

① الکامل فی التاریخ: ۸/ ۳۲۵؛ نهاية الارب للنويری: ۲۴/ ۳۷۵ تا ۳۸۱؛ المسلمون فی صقلية، ص ۱۶۰ تا ۱۶۷

② تاریخ صقلیہ: ۱/ ۲۲۵ تا ۲۲۷؛ نهاية الارب للنويری: ۲۴/ ۳۸۱

③ الکامل فی التاریخ: سنة ۴۱۶ھ

افریقہ سے بنوزیری کی مدد:

صقلیہ کے مسلمان بنوکلب کے نااہل حکمرانوں کی مایوس کن کارکردگی اور کفار کے مقابلے میں ان کی بے ہمتی سے تنگ آ چکے تھے۔ قلوریہ کے سقوط کو انہوں نے مسلم صقلیہ کے خاتمے کا پیش خیمہ سمجھا۔ بنوکلب کے سرپرست افریقہ کے بنوعبید اس وقت بڑے عروج پر تھے اور انہیں دنیا کی صفِ اول کی حکومتوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ مگر ان سے خیر کی کوئی امید نہ تھی۔ ایسے میں صقلیہ کے مسلمانوں نے الجزائر کے حکمران خاندان بنوزیری سے مدد طلب کی اور انہیں صاف صاف لکھ دیا کہ وہ صقلیہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں ورنہ ہم خود یہ جزیرہ رومیوں کے حوالے کر دیں گے۔

اس پیغام پر حاکم الجزائر معز بن بادیس نے اپنے بیٹے عبداللہ کی قیادت میں افریقی فوج صقلیہ بھیج دی جس نے تائید الدولہ احمد الاکحل کلبی سے حکومت چھین لی اور اسے قتل کر دیا۔ یہ ۴۲۷ھ (۱۰۳۶ء) کا واقعہ ہے۔ صقلیہ کے لوگ تائید الدولہ کو قتل کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ناراض ہو کر افریقی فوج سے لڑنے پر تیار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر عبداللہ الجزائر واپس چلا گیا۔ یاد رہے کہ صقلیہ کے حاکم کو معزول اور قتل کرنے والی یہ افریقی فوج، صرف چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی یعنی صقلیہ کا حکمران طبقہ اس وقت اتنا کمزور تھا کہ اسے مغلوب کرنے کے لیے چھوٹی سی فوج بھی کافی تھی۔ [1]

صقلیہ میں طوائف الملوکی اور دولتِ کلبیہ کا خاتمہ:

افریقی فوج کی واپسی پر صقلیہ کے امراء نے مقتول حاکم کے چھوٹے بھائی صمصام الدولہ کلبی کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر وہ حالات پر قابو نہ پا سکا اور اس ایک جزیرے میں کئی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں، جو باہم دست و گریبان تھیں۔ عبداللہ بن منکوت ''مازر''، ''طرابنش''، ''شاقہ'' اور ''مرسی علی'' پر قابض تھا۔ ابن حواس ''قصریانہ''، ''جرجنت'' اور ''قصر نوبو'' کا حاکم تھا۔ ''قطانیہ'' پر ابن کلابی اور ''سرقوسہ'' پر ابن ثمنہ کا تسلط تھا۔ پایۂ تخت بلرم میں ایک مجلسِ شوریٰ کی حکومت تھی۔ اٹلی کے حکمران کب سے ایسے ہی وقت کے منتظر تھے۔ قیصرِ روم میکائیل چہارم نے اپنے بہترین کپتان جنرل جارج مینکس کی قیادت میں ایک فوج صقلیہ بھیج دی جس نے ''مسینا'' پر قبضہ کر لیا۔ یہ ۴۲۹ھ (۱۰۳۸ء) کا واقعہ ہے۔

اس شکست نے دولتِ کلبیہ کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی۔ ۴۳۱ھ (۱۰۴۰ء) میں صمصام الدولہ کو پہلے معزول اور پھر قتل کر دیا گیا۔ یوں ۹۶ برس تک اقتدار کا مزہ لوٹنے والے بنوکلب قصۂ پارینہ بن گئے۔ بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی نے صقلیہ کی چولیں ہلا ڈالنے کے ساتھ ساتھ رومیوں کو مزید مداخلت پر اُکسایا۔ جنرل جارج مینکس شمال سے حملے کرتا رہا اور خود صقلیہ کے بعض خود مختار امراء اپنے مخالفین کے مقابلے میں اس کی مدد کرتے رہے۔ [2]

گھر پھونک تماشا:

ان طالع آزماؤں میں ابن ثمنہ سب سے زیادہ عیار و مکار تھا۔ ایک دوسرا رئیس ابن حواس اس کا حریف تھا مگر آخر

---

① الکامل فی التاریخ: ۳۴۳/۸، ط دار الکتاب العربی بیروت؛ نہایۃ الارب للنویری: ۳۷۹،۳۷۸/۲۴، ط دار الکتب قاہرہ

② الکامل فی التاریخ: ۳۴۷/۸، ط دار الکتاب العربی؛ تاریخ صقلیہ، ص ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۹ تا ۳۲۲

میں ابن ثمنہ نے اسے چرب زبانی کے ذریعے رام کرلیا اور اس کی بہن میمونہ سے نکاح کر کے اپنی سیاسی حیثیت مزید مستحکم کرلی۔ کچھ ہی عرصے بعد میاں بیوی میں کوئی تلخ کلامی ہوئی جس پر ابن ثمنہ نے آگ بگولا ہو کر اس کی دونوں کلائیوں پر نشتر چلا دیے۔ سوتیلے بیٹے نے آکر ماں کی جان بچائی اور طبیب کے ذریعے زخموں کی مرہم پٹی کرائی۔

میمونہ مرتے مرتے بچی اور سانس بحال ہوتے ہی اپنے بھائی ابن حواس کے پاس جا پہنچی۔ اس نے بہن کا یہ حال دیکھ کر ابن ثمنہ کے خلاف فوج کشی کردی۔ ابن ثمنہ کو شکست ہوئی اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلا۔

یہاں سے صِقلّیہ کی تاریخ کا آخری باب شروع ہوتا ہے۔ ابن ثمنہ نے حکومت سے بے دخل ہونے کے بعد صِقلّیہ کی حال ہی میں آزاد ہونے والی نصرانی ریاست مسینا میں پناہ لی۔ مسینا کے نواب نے ابن ثمنہ کو اپنا دوست قرار دیتے ہوئے مسلمانانِ صِقلّیہ کے خلاف نارمنوں سے مدد لینے کا فیصلہ کرلیا۔ نارمنوں کے لیے صِقلّیہ پر حملے کی دعوت نہایت مسرت انگیز تھی۔ ان کا رئیس راجر، ابن ثمنہ کی راہنمائی میں اپنا بحری بیڑہ لے کر رجب ۴۴۴ھ (نومبر ۱۰۵۲ء) میں صِقلّیہ پہنچ گیا جہاں مسلمان نہایت منتشر تھے اور نصرانی راجر کی مدد کے لیے متحد۔ دیکھتے ہی دیکھتے راجر نے شمالی صِقلّیہ پر قبضہ کرلیا اور وہاں کے بے شمار مسلمان جن میں بڑے بڑے علماء وفضلاء اور مشائخ وصالحین شامل تھے، نقل مکانی کر کے افریقہ چلے گئے۔[1]

اسلامی صِقلّیہ کو بچانے کی آخری کوشش:

جنوبی صِقلّیہ کے مسلمانوں نے اپنا انجام سامنے دیکھ کر ایک بار پھر افریقہ کے صنہاجی حکمران مُعِز بن بادیس سے مدد مانگی۔ اس نے اسلامی اخوت کا ثبوت دیتے ہوئے، بلا تاخیر اپنا بحری بیڑہ روانہ کردیا، مگر تقدیر غالب آئی اور یہ پورا بیڑہ سمندری طوفان کا شکار ہو کر بحیرۂ روم کی موجوں میں ڈوب گیا۔ اس حادثے سے الجزائر کی بحری طاقت فنا ہوگئی۔ مُعِز کوئی نئی مہم شروع کرنے کی بجائے ان عرب قبائل کی یلغار روکنے میں مشغول ہوگیا جو بنوعبید کی شہ پر اٹھے تھے اور بحری بیڑے کی غرقابی کے بعد انہیں یقین تھا کہ اب دولتِ بنوزیری پر قبضہ بہت آسان ہے۔ مُعِز بن بادیس کو انہیں روکنے میں اپنی ساری توانائی صرف کرنا پڑی۔ ان حالات میں صِقلّیہ کے مسلمان بالکل بے یار ومددگار رہ گئے۔[2]

علامہ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ بیڑے کی تباہی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے بعد فرنگی بلا روک ٹوک صقلیہ کے اکثر شہروں پر قابض ہونے لگے جن کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کیوں کہ افریقہ کا حکمران (المعز) عربوں سے برسرپیکار ہوگیا اور ۴۵۳ھ میں وفات پا گیا۔''[3]

راجر کے بھائی رابرٹ کی آمد:

یہی وہ سال تھا جب اٹلی سے دوسرا نارمن رئیس رابرٹ گوسکارڈ، تازہ دم فوج لے کر صِقلّیہ پہنچا۔ وہ راجر کا بھائی اور

---

① الکامل فی التاریخ: ۳۲۷/۸، ۳۲۸، ط دار الکتاب العربی ؛ نهایة الارب للنویری: ۳۸۱/۲۴ ؛ تاریخ صقلیه: ۳۲۲/۱ تا ۳۲۴

② الکامل فی التاریخ: ۳۲۸/۸ ؛ نهایة الارب للنویری: ۳۸۱/۲۴، ط دار الکتب قاهره ③ الکامل فی التاریخ: ۳۲۸/۸

نہایت تجربہ کار جنگجو تھا۔ وہ آتے ہی کئی چھوٹے بڑے قلعوں پر قابض ہوگیا۔ دارالحکومت بلرم کے علاوہ اب مسلمانوں کے پاس باقی رہنے والے اہم شہر فقط یہ تھے: ''جرجنت، قصریانہ، سرقوسہ، مازر، طرابلش، ارغوس، نوطس''۔[1]

صنہاجیوں کی مدد اور اہلِ صقلیہ کی ناقدری:

اُدھر الجزائر کے نئے حکمران تمیم بن معز نے یہ حالات دیکھ کر ایک بار پھر کمرِ ہمت باندھی اور اپنے دو بیٹوں کو فوج دے کر مسلمانانِ صِقلّیہ کے دفاع کے لیے بھیجا مگر بدقسمتی سے وہاں کا سب سے بڑا رئیس ابن حواس مسلمانوں کی مدد کے لیے آنے والے ان مہمانوں کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھ کر ان سے برسرِ پیکار ہوگیا۔

اس لڑائی میں اگرچہ افریقی مجاہدین غالب آئے اور ابن حواس مارا گیا، مگر اس کے بعد بھی صِقلّیہ کے مسلم امراء افریقی مجاہدین کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ جلد ہی مقامی لوگوں اور بیرونی مددگاروں کے مابین جھگڑے شروع ہوگئے۔ آخر کار ۴۶۱ھ میں صِقلّیہ کے یہ آخری مددگار واپس الجزائر چلے آئے۔ صِقلّیہ کے مسلمانوں نے بھی نوشتۂ تقدیر پڑھ کر ہجرت شروع کردی۔ کچھ ہی مدت میں بے شمار لوگ افریقہ پہنچ گئے۔[2]

ابن بعباع کی تحریکِ جہاد اور بنوعبید کی ملت فروشی:

کچھ مسلمان اب بھی صِقلّیہ کے دفاع کے لیے آخر دم تک لڑنا چاہتے تھے۔ ایک دلیر امیر ابن بعباع اس تحریک کا رہنما تھا۔ مسلمان اس کی قیادت میں جگہ جگہ نارمنوں سے برسرِ پیکار رہے اور کئی معرکوں میں انہوں نے اپنی روایتی شجاعت کا سکہ جما دیا۔ اُدھر مصر کی دولتِ بنوعبید نے ابن بعباع کو کامیابی کی طرف گامزن دیکھتے ہوئے اسے دھمکی آمیز پیغام بھیجا کہ وہ بھی اسی طرح بنوعبید کو خراج بھیجے جیسا کہ صِقلّیہ کے گزشتہ فرمانروا بنوعبید کو خراج بھیجا کرتے تھے۔

ابن بعباع ایک آزاد رہنما تھا، اس نے بنوعبید کا پیغام ٹھکرا دیا۔ کاش کہ وہ اس وقت مصلحت بینی سے کام لیتا اور نارمنوں کو شکست دینے تک بنوعبید سے کھلی لڑائی مول نہ لیتا۔ ابن بعباع کے انکار کے بعد بنوعبید نے صِقلّیہ کے اس آخری محافظ کے خلاف محاذ بنالیا۔ انہوں نے نارمن سرداروں سے اتحاد کرتے ہوئے انہیں پیغام بھیجا کہ جس طرح بھی ہو سکے ابن بعباع کو صِقلّیہ سے بے دخل کردو، ہماری طرف سے پورا صِقلّیہ تمہارے نام کیا جاتا ہے۔

بنوعبید کے اس سیاہ کارنامے پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ اس پیغام پر نصرانی حملہ آوروں کو یقین ہوگیا کہ صِقلّیہ کے مسلمانوں کا اب کوئی بیرونی مددگار نہیں رہا۔ وہ یورپ کے طول وعرض سے جمع ہوکر، اس جزیرے میں گھس گئے۔ یکے بعد دیگرے متعدد شہر فتح کرتے ہوئے انہوں نے دارالحکومت ''بلرم'' کا محاصرہ کرلیا۔ ابن بعباع نہایت دلیری سے شہر کا دفاع کرتا رہا۔[3]

سقوطِ بلرم:

پانچ ماہ کی محصورانہ جنگ میں مسلمانوں نے حملہ آوروں کو اتنے سخت نقصانات پہنچائے کہ وہ فتح کو خواب وخیال

---

(1) تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۳۴ (2) الکامل فی التاریخ: ۳۳۸/۸، ط دار الکتاب العربی (3) تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۳۷ تا ۴۴۰

سمجھ کر واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ مگر اتنے میں مقامی نصرانیوں نے غداری کر کے حملہ آوروں کو فصیل کے کمزور حصوں کا پتا بتا دیا۔ اس کے بعد نارمنوں نے پوری قوت اس رُخ پر جھونک دی اور قریب تھا کہ شہر بزورِ شمشیر سر کر لیا جاتا، مگر مسلمانوں نے صلح کی شرائط پیش کر کے مذاکرات شروع کر دیے۔ مسلمانوں کی شرائط یہ تھیں:

❶ مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی دی جائے گی۔
❷ بلرم کی تمام مساجد باقی رکھی جائیں گی۔
❸ مسلمانوں کے لیے اسلامی قوانین نافذ رہیں گے۔
❹ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ مسلمان قاضی کرے گا۔

نارمنوں نے شرائط منظور کر لیں جس کے بعد بلرم کے دروازے فاتحین کے لیے کھول دیے گئے۔ سقوطِ بلرم کا سانحہ ربیع الاوّل ۴۶۳ھ (جنوری ۱۰۷۱ء) میں پیش آیا۔[1]

یورپی مؤرخین فتحِ بلرم کو ایک عظیم کامیابی شمار کرتے ہیں۔ یہ شہر مسلم تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔ اس میں دو سو سے زائد مساجد تھیں۔ تعلیم وتدریس کا کام زوروں پر تھا۔ کم از کم تین سو معلم اور مدرس اس شہر میں مصروفِ کار تھے۔

سقوطِ بلرم کے فوراً بعد ''مازَر'' اور ''طَرَابنِش'' کے حاکم عبداللہ بن منکوت نے اپنے دونوں شہر میثاقِ بلرم کی شرائط پر راجر کے حوالے کر دیے۔[2]

مزاحمت کی آخری چنگاریاں:

راجراب صِقِلّیہ کا حکمران تھا۔ تاہم مسلمانوں کا جذبۂ مقاومت ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا اور مضبوط فصیلوں والے بعض شہر اب تک ان کے پاس تھے۔ مگر نارمنوں نے مزید فوج کشی تقریباً پندرہ سال کے لیے ملتوی رکھی، اس دوران وہ اپنے اندرونی اختلافات نمٹانے اور مفتوحہ علاقوں کے نظم ونسق میں مصروف رہے۔

۴۷۸ھ میں راجر باقی ماندہ مسلم آبادیوں کی تسخیر کے لیے نکلا۔ ۴۷۹ھ میں اس نے شمالی صِقِلّیہ کے دو مستحکم اسلامی شہروں: طبرمین اور سرقوسہ کو وہاں کے مسلمانوں کی بے مثال مزاحمت کے باوجود فتح کر لیا۔ ۴۸۱ھ (۱۰۸۸ء) میں جُرجَنت کو بھی ایک طویل محاصرے کے بعد سرنگوں کر لیا گیا۔ قصر یانہ سب سے سخت محاذ ثابت ہوا۔ تاہم تین سال کے محاصرے کے بعد ۴۸۴ھ (۱۰۹۱ء) میں یہ شہر بھی سر کر لیا گیا۔ آخر میں ''رَغُوس'' اور ''نُوطَس'' پر قبضہ ہوا۔ اس طرح پورے صِقِلّیہ پر عیسائی قابض ہو گئے اور وہاں کے مسلمان نارمنوں کی رعایا بن گئے۔[3]

❁❁❁

---

① تاریخ صقلیہ: ۳۳۱،۳۳۰/۱
② العرب فی صقلیہ للدکتور احسان عباس(م ۱۴۲۳ھ): ص۸۸، ۸۹، ط دار الثقافة بیروت لبنان: سنة نشر: ۱۹۷۵ء
③ تاریخ صقلیہ: ۳۳۳،۳۳۲/۱

مسلمانانِ صِقلّیہ نارمنوں کے دورِ حکومت میں

صقلیہ میں مسلم حکمرانی کا دور ختم ہو چکا تھا، اسلامی پرچم کی جگہ اب یہاں نارمنوں کے علم لہرا رہے تھے۔ مگر مسلمان باقی تھے۔ نارمنوں کے صِقلّیہ میں مسلمان کن کن مراحل سے گزرے؟ آیئے اس پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

راجر اوّل: ۴۸۴ھ تا ۴۹۳ھ (۱۰۹۱ء تا ۱۱۰۱ء)

نارمن حکمران راجر اوّل نے صِقلّیہ پر قبضے کے بعد ابتداء میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی دیے رکھی مگر یہ سہولت جنوبی شہروں مثلاً: بلرم، جرجنت اور نُوطس تک محدود تھی۔ شمالی شہروں: قصریانہ، مسینا اور سرقوسہ وغیرہ میں ان کی زندگی دوبھر تھی۔ ایک ایسی پالیسی اپنائی جا رہی تھی کہ مسلمان رفتہ رفتہ اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ راجر نے اس سلسلے میں درج ذیل اقدامات کیے تھے:

1. ناروے اور جنوبی اٹلی سے نارمنوں اور دوسری نسل کے نصرانیوں کو بڑی تعداد میں یہاں لاکر بسایا گیا تاکہ یہ نصرانی اکثریتی علاقہ بن جائے۔
2. اسلام کی اشاعت پر پابندی لگادی گئی۔
3. صنعت و حرفت، تجارت اور معاش کے معزز شعبوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کردیے گئے۔
4. مسلم زمین داروں سے تمام اراضی غصب کرلی گئیں۔ مسلمانوں کو صرف مزدور اور کاشت کار بنادیا گیا۔[1]

صلیبی جنگوں کو بھڑکانے میں نارمنوں کا حصہ:

صِقلّیہ پر قبضے نے عیسائی دنیا کے حوصلوں کو مہمیز دی اور وہ جلد از جلد باقی عالم اسلام پر دھاوا بولنے کے لیے پر تولنے لگے۔ سب سے پہلے ان کی نگاہ اندلس اور شمالی افریقہ کے مسلم ممالک پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ شام اور فلسطین کو فتح کر کے یروشلم کی بازیابی کے خواب بھی دیکھنے لگے۔ یہ کوششیں صِقلّیہ کے مرکز ''بلرم'' کی فتح کے فوراً بعد شروع ہو گئیں اور اس دوران باقی صِقلّیہ کی تسخیر چند سالوں کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی۔

یہی دن تھے جب ۴۶۴ھ (۱۰۷۱ء) میں شمالی اندلس کے عیسائی حکمران الفانسو نے وسطی اور جنوبی اندلس کے مسلم علاقوں پر یلغار شروع کی جس کے باعث ۴۷۸ھ میں اندلس کا مرکزی شہر ''طُلَیطلہ'' ہاتھ سے نکل گیا۔

۴۸۰ھ میں جزیرہ قوصرہ سے نارمنوں کا ایک زبردست بحری بیڑا ''الجزائر'' کے پایۂ تخت مہدیہ پر حملہ آور ہوا۔

---

[1] تاریخ صقلیہ: ۱/۲٦۷، ۲٦۸؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۸۴ھ

مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ہوزیری (صنہاجیوں) کا یہ پایۂ تخت کچھ دنوں کے لیے نارمنوں کے قبضے میں آ گیا۔
ہوزیری نے مہدیہ کی بازیابی کے لیے ذلت آمیز شرائط پر نارمنوں سے صلح کر لی جس کے بعد نارمنوں کو یہ خطرہ نہ رہا کہ صقلیہ کے مسلمانوں کو اب بیرونی دنیا سے کوئی مدد میسر آ سکے گی۔ چنانچہ اس کے بعد صقلیہ کے باقی ماندہ مسلم قلعوں کو بڑی تیزی سے مسخر کر لیا گیا یہاں تک کہ ۴۸۴ھ میں پورا صقلیہ نارمنوں کے قبضے میں آ گیا۔
اب وہاں نصرانی زعماء کا ایک تاریخی خفیہ اجلاس ہوا جس میں عالمِ اسلام کو زیرِ نگین کرنے کے عزائم تازہ کیے گئے۔ مندوبین نے راجر کو مشورہ دیا: ''انجیل کی قسم! ہمارے اور مسلمانوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ تمام اسلامی ممالک عیسائی ممالک بن جائیں۔ مطلب یہ تھا کہ سب نصرانی حکام مل کر اسلامی ممالک پر حملہ کریں تاکہ مسلمان بشارتِ مسیح کے مستحق بن جائیں۔
مگر راجر جانتا تھا کہ مسلمانوں کو یکدم ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مہم مختلف میدانوں میں تدریجاً جاری رہ کر ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس نے عیسائی مندوبین کو تجویز دی کہ دوسرے عیسائی ممالک مل کر شام اور بیت المقدس پر حملہ کریں جبکہ صقلیہ کے نصرانیوں کو شمالی افریقہ کے لیے فارغ رہنے دیں۔ اس نے کہا:
جب تم نے مسلمانوں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو بہتر ہے کہ تم بیت المقدس پر قبضہ کرو اور اس شہر کو ظالموں سے یک قابلِ فخر مقام حاصل کرو کیوں کہ ابھی ہمارے اور افریقی ممالک کے مابین عہد و پیمان ہو چکے ہیں۔''
س کے بعد راجر اور اس کے جانشینوں نے شمالی افریقہ کو اپنی جولان گاہ بنا لیا جہاں دولتِ ہوزیری بیرونی دباؤ اور داخلی انتشار کا شکار ہو چکی تھی اور اس کے امراء یکے بعد دیگرے ساحلی علاقوں پر خود مختار حکومتیں قائم کر رہے تھے۔[1]
سائمن: ۴۹۳ھ تا ۴۹۹ھ (۱۱۰۱ء تا ۱۱۰۵ء)
راجر کی موت کے بعد اس کا بیٹا سائمن تخت نشین ہوا۔ اس نے فقط چار برس حکومت کی اور باپ کی پالیسیوں میں کوئی تبدیلی نہ کی۔[2] مسلمانوں پر عرصۂ حیات بدستور تنگ رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے صقلیہ کو جو فقط ایک زرخیز زمین تھی، اپنے خون پسینے سے سینچ کر گل و گلزار بنایا تھا۔ یہاں کی زرعی، صنعتی اور تجارتی ترقی ان کی ہنرمندی اور تجربے کے مرہونِ منت تھی۔ نارمن تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بہت پس ماندہ تھے۔ نیز انہوں نے یورپ سے جن نصرانی قوموں کو یہاں لا کر بسایا تھا، وہ بھی غیر متمدن تھیں۔ جبکہ مسلمان صقلیہ کو ایک ترقی یافتہ مملکت بنا چکے تھے جس کے زرعی، تجارتی، سیاسی اور عدالتی شعبوں کو چلانا اناڑیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو دیوار سے لگانے کی پالیسی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔[3]
راجر دوئم: ۴۹۹ھ تا ۵۴۹ھ (۱۱۰۵ء تا ۱۱۵۴ء)
سائمن کے مرنے پر اس کا بھائی راجر دوئم حکمران بنا جس نے نصف صدی تک حکومت کی۔ اسے یورپ کے نامور

---
[1] تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۵۱، ۳۵۲ [2] تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۷۱ [3] تاریخ صقلیہ: ۱/ ۳۷۰

بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے باپ راجر اوّل نے مسلم دشمنی کے باوجود جب بیٹے کو ایک مہذب شہزادے کے روپ میں دیکھنا چاہا تو اسے مسلمان حکماء سے تعلیم دلوانے پر مجبور ہو گیا کیوں کہ پادری تعلیمی لحاظ سے کسی شمار میں نہ تھے۔ اس تعلیم وتربیت کے باعث راجر دوئم عربی ادب، ریاضی، جغرافیہ اور اسلام سے خاصا واقف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو دبانے کی پالیسی درحقیقت ملک کو مفلس بنانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ تخت نشین ہو کر اس نے مسلمانوں کو دوبارہ تجارت وصنعت سمیت تمام شعبوں میں شرکت کی اجازت دے دی۔ اس طرح مسلمانانِ صقلیہ کی سانسیں بحال ہوگئیں۔ مسلمانوں کے اشتراکِ عمل نے صقلیہ کو دوبارہ ایک خوشحال مملکت بنا دیا اور یورپی طاقتیں اس پر رشک کرنے لگیں۔ اس سے قبل صقلیہ کی نارمن حکومت اور کلیسائے روم کے مابین کشیدگی چلی آرہی تھی مگر اب راجر دوئم کا مقام اس قدر بلند ہوا کہ ۵۲۴ھ میں اسے شہنشاہِ صقلیہ واٹلی کا خطاب مل گیا۔ کلیسائے روم کی جانب سے اس کی تاج پوشی ہوئی اور اسے یورپ کا سب سے معزز حکمران مانا گیا۔ ①

راجر دوئم کی دورُخی پالیسی:

اگرچہ راجر دوئم نے سیاسی مصلحتوں کے تحت اندرونی طور پر مسلمانوں سے ایک خاص حد تک رواداری برتی تھی مگر بیرونی دنیا میں وہ اپنے باپ کی طرح مسلمانوں کی سیاسی وعسکری طاقت کو مٹانے کا ذہن رکھتا تھا۔ اس لیے اس کے پورے دور میں ہمسایہ مسلم ریاستوں کے خلاف سازشیں، جنگیں یا فریب آمیز مصالحتیں جاری رہیں۔

راجر دوئم کے اس کردار نے اسے دنیائے نصرانیت کا مددگار مشہور کر دیا اور اسی بناء پر کلیسائے روم کی جانب سے اس کی تاج پوشی ہوئی۔ یہیں سے پہلی بار نارمنوں کی حکومت کا کلیسائے روم کے ساتھ اشتراک ہوا جس نے جلد ہی صقلیہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت کی دبی ہوئی چنگاریاں سلگا دیں۔

راجر دوئم کے آخری ایام میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے صقلیہ میں متعصب پادریوں کے اثر ورسوخ کو بہت بڑھا دیا۔ ہوا یہ کہ ۵۴۸ھ میں صقلیہ کے ایک بحری افسر فلپ نے بونہ پر حملہ کیا اور عام لوگوں کو قتل اور گرفتار کرنے کے باوجود کچھ مسلمان علماء ومشائخ کے ساتھ عزت سے پیش آیا اور انہیں وہیں آبادیوں میں ہجرت کی اجازت دے دی۔ پادریوں نے اس پر ہنگامہ کر دیا اور فلپ پر الزام لگایا کہ اس نے مسلمانوں سے نرمی برتی ہے اور خود بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ مقدمہ راجر دوئم کے سامنے پیش ہوا اور پادریوں نے اپنی بات منوا کر فلپ کو زندہ نذرِ آتش کرا دیا۔ اس کے بعد صقلیہ میں پادریوں کا اثر ورسوخ دن بدن بڑھتا گیا اور مسلمانوں کا قافیہ تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا گیا۔ ②

شمالی افریقہ پر حملے:

راجر دوئم اپنے دورِ حکومت میں شمالی افریقہ کی ایسی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں پر جارحانہ حملے کرتا رہا جو بنوزیری

---

① تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۷۱ تا ۴۷۵

② الکامل فی التاریخ: سنة ۵۴۸ھ

(دولتِ صنہاجیہ) سے الگ ہوگئی تھیں۔ جب بنوزیری باہمی معاہدے کا حوالہ دے کران حملوں پر اعتراض کرتے تو راجر جواب دیتا کہ یہ نئی ریاستیں اس معاہدے میں داخل نہ تھیں۔ دوسری طرف راجر حسبِ موقع ان آزاد ریاستوں کو بھی بنوزیری کے مقابلے میں خفیہ مدد دیتا رہتا تھا۔ ۵۱۱ھ میں علی بن یحییٰ بن تمیم پر یہ گٹھ جوڑ ظاہر ہوگیا جس کے جواب میں اس نے مرابطین کے امیر علی بن یوسف بن تاشفین سے رابطہ کر کے صقلیہ پر ایک متحدہ حملے کا منصوبہ بنایا مگر اپنے ارادے پر عمل سے پہلے علی بن یحییٰ کی اچانک وفات ہوگئی۔

۵۱۶ھ میں علی بن یوسف بن تاشفین نے صِقلیہ پر ایک انتہائی حملہ کر کے ایک شہر ''نقوطرہ'' پر قبضہ کرلیا مگر نارمنوں کی طاقت میں کوئی فرق نہ پڑا بلکہ اگلے ہی برس انہوں نے مہدیہ پر قبضے کے لیے ایک عظیم بحری بیڑا بھیجا مگر خوش قسمتی سے طوفانی ہواؤں نے نارمن بیڑے کو رُخ بدلنے پر مجبور کردیا۔ نارمن جزیرہ قوصرہ پر اتر گئے جہاں پہلے سے ان کا قبضہ تھا مگر آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ نارمنوں نے اپنی ناکامی کا غصہ اتارنے کے لیے وہاں ایسا قتل عام کیا کہ معصوم بچوں تک کو نہ چھوڑا۔

نارمن اس کے فوراً بعد مہدیہ سے دور ایک دوسرے قلعے ''دیماس'' پر حملہ آور ہوئے تاہم مہدیہ کی افواج بروقت مدد کے لیے پہنچ گئیں اور نارمنوں کو مدتوں بعد ایک ذلت آمیز شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ یہ ۵۱۷ھ کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد بھی راجر باز نہ آیا، وہ بظاہر دولت بنوزیری کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا مگر پسِ پردہ بنوزیری سے باغی ہونے والی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کو مضبوط کر کے بنوزیری کو کمزور کرتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ان آزاد مسلم امراء نے نارمنوں کی باج گزار ریاستوں کی شکل اختیار کرلی۔ یہی لوگ شمالی افریقہ میں راجر کی فتوحات کا باعث بننے لگے۔ ۵۲۹ھ (۱۱۳۴ء) میں راجر نے جربہ پر قبضہ کرلیا جس کے بعد اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔

بدقسمتی سے ۵۳۶ھ میں افریقہ میں سخت قحط پڑ گیا اور بنوزیری کو بھی مجبوراً غلے کے حصول کے لیے راجر سے دوستانہ معاہدہ کرنا پڑا جس کے بعد شمالی افریقہ کی ریاستوں کے امراء کھلم کھلا راجر کے حامی ہو گئے۔ راجر ایک کو ساتھ ملا کر دوسرے کی گردن کاٹتا گیا اور مسلم ریاستوں پر قبضہ جماتا رہا۔ ۵۳۹ھ (۱۱۴۴ء) میں برشک، بجایہ اور سفاقس، ۵۴۱ھ (۱۱۴۶ء) میں طرابلس الغرب (ٹریپولی) اور ۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء) میں وہ قابس پر قابض ہوگیا۔ بحیرۂ روم کے مسلم جزائر بھی نارمنوں کے قبضے میں جاتے رہے۔ ۵۴۰ھ (۱۱۴۵ء) میں قرقنہ بھی ان کے قبضے میں چلا گیا۔ ان مقبوضہ مسلم علاقوں میں شہریوں کا قتل عام کیا گیا، خون کی ندیاں بہائی گئیں اور تمام مال و اسباب لوٹ کر صِقلیہ پہنچا دیا گیا۔ ①

افریقہ کی مسلم قیدی خواتین کی آزادی میں مسلمانانِ صقلیہ کا حصہ:

ان مہمات میں گرفتار کی گئی دوشیزاؤں کو باندیاں بنا کر صِقلیہ میں فروخت کردیا جاتا تھا۔ فقط جزیرہ جربہ سے گرفتار کی گئی مستورات کی تعداد آٹھ ہزار تھی جنہیں صِقلیہ میں لا کر باندیاں بنایا گیا۔ وہاں کے مسلمان اگرچہ خود مجبور و مقہور

① تاریخ صقلیہ: ۱/ ۲۵۶، ۲۵۷

تھے مگران کی حمیت پر آفرین ہے کہ اس کے باوجود اپنی جمع پونجی لٹا کر ان مسلم بہنوں کو آزاد کراتے تھے۔۵۳۹ھ میں برشک کی گرفتار شدہ عورتوں کو آزادی دلانے میں صقلی مسلمانوں نے بڑی بھاری رقوم ادا کیں۔ ①

اُدھر نارمنوں کا سیلاب آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ ۵۴۳ھ میں راجر دوئم نے بنو زیری کے پایۂ تخت مہدیہ پر بھی قبضہ کر لیا اور اس مرکز اسلام پر صلیبی پرچم لہرانے لگا۔ یوں نارمنوں کی وہ یلغار جو ۴۱۶ھ میں قلوریہ پر قبضے سے شروع ہوئی تھی، ۱۳۸ برس کی مدت میں مہدیہ تک جا پہنچی۔ جس ترتیب سے مسلمان شمالی افریقہ سے صقلیہ اور اٹلی تک پہنچے تھے، اس کے بالعکس ترتیب سے نصرانی اٹلی سے پیش قدمی کرتے ہوئے شمالی افریقہ میں گھس گئے۔

مہدیہ کے بعد نارمن مصر اور شام پر قبضہ کرنا چاہتے تھے مگر اسی زمانے میں راجر دوئم اور شاہِ قسطنطینیہ میں اختلافات پیدا ہو گئے اور جنگ کی نوبت آ گئی جس کے باعث نارمنوں کی یلغار چند برسوں کے لیے رک گئی۔ ②

ولیم اوّل: ۵۴۹ھ تا ۵۶۱ھ (۱۱۵۴ء تا ۱۱۶۶ء)

راجر دوئم بڑھاپے کے باعث اپنے بیٹے ولیم کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا جو "ولیم بدنفس" کے لقب سے مشہور ہوا۔ شروع میں وہ اپنے باپ کی طرح مقامی مسلمانوں سے نرم روش برتتا رہا۔ مگر پوپ ایڈرن چہارم اسے برداشت نہ کر سکا، اس نے مقامی امراء کو بہکا کر ولیم کا تختہ الٹنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان حالات میں ولیم نے تنگ آ کر ۵۵۱ھ (۱۱۵۶ء) میں پوپ کے ساتھ صلح کر لی اور اپنی مسلمانوں کے لیے نرم داخلہ پالیسی بدل ڈالی۔ مگر یہ کام اس نے تدریجاً کیا کیوں کہ وہ دیکھ چکا تھا کہ راجر اوّل کے دور میں مسلمانوں کو یکدم تمام شعبوں سے نکالنا ملک کو کس قدر مہنگا پڑ گیا تھا، اس لیے ولیم نے مسلمانوں کو زندگی کے تمام شعبوں میں شامل رہنے دیا۔

تاہم اس نے پادریوں کو کھلی آزادی دے دی کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اس طرح صقلیہ میں بیک وقت زندگی دو دھاروں میں بہنے لگی۔ ایک طرف مسلمان سرکاری عہدوں اور نجی شعبوں میں سرگرم تھے جہاں عام نصرانی اور حکومتی اہلکاران سے بظاہر تعصب نہیں برتتے تھے مگر دوسری طرف پادریوں کی طرف سے کھلم کھلا اسلام دشمن مہم بھی جاری تھی جو عام عیسائی شہریوں کو رفتہ رفتہ متعصب بناتی جا رہی تھی۔ ③

ولیم کے زمانے میں شمالی افریقہ نارمنوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس انقلاب کی ابتداء شمالی افریقہ کے شہر سفاقس کے والی عمر بن حسین کے ہاتھوں ہوئی جو نارمنوں کا باج گزار تھا۔ نارمنوں نے اس کو دبوچنے کے لیے اس کے باپ حسین کو صقلیہ میں یرغمال بنا کر رکھا تھا مگر ایک بار حسین نے موقع پا کر قید خانے سے اپنے بیٹے کو خفیہ پیغام بھیجا:

"میں چراغِ سحری ہوں۔ تم موقع کے منتظر رہو۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ تم وطن کی آزادی پر میری جان قربان کر دو۔"

---

① تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۵۷

② تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۷۷ تا ۴۷۹

③ تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۵۸،۴۵۷

عمر بن حسین نے یہ خفیہ پیغام یاد رکھا اور ۵۵۲ھ میں موقع ملتے ہی نارمنوں سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ نارمن سفیر اسے دھمکانے آئے تو اس نے ایک فرضی جنازہ تیار کر کے سفیر کو دکھایا، اس کے سامنے اس فرضی میت کی تدفین کرائی اور کہا: ''اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ میرا باپ مر چکا ہے۔ سمجھو کہ یہ میرے باپ کا جنازہ ہے۔ میں نے وطن کی آزادی اس کے سر کے عوض خرید لی ہے۔''

سفیر نے واپس آ کر ولیم کو یہ روداد سنائی، اس نے حسین کو جیل سے نکال کر سزائے موت کا حکم دیا۔ وہ بندۂ خدا خوشی خوشی تختۂ دار پر چڑھ گیا کیوں کہ اس کے بدلے اسے اپنے وطن کی آزادی کا یقین تھا۔ ایسا ہی ہوا۔ سفاقس کے بعد طرابلس میں ابو یحییٰ بن مطروح نے اور قابس میں محمد بن رشید نے آزادی کا پرچم بلند کر دیا۔

یہی زمانہ تھا جب اللہ نے مسلمانوں کی امداد کے لیے شام میں نور الدین زنگی اور مرّاکش میں موحدین کے سربراہ عبدالمؤمن کو کھڑا کر دیا تھا۔ نور الدین زنگی نے شام پر صلیبیوں کے قبضے کی کوششیں ناکام بنا دیں جبکہ عبدالمؤمن نے شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے مرّاکش سے یلغار کی اور نارمنوں کو مختلف محاذوں پر شکست دیتے ہوئے ۵۵۴ھ میں مہدیہ کو بھی آزاد کرا لیا۔ صنہاجیوں کا آخری حکمران حسن جو سقوطِ مہدیہ کے بعد دربدر پھر رہا تھا، عبدالمؤمن کے کہنے پر ایک بار پھر مہدیہ کے عظیم الشان قصر میں رہائش پذیر ہو گیا۔ یوں شمالی افریقہ کو نارمنوں کے استعمار سے نجات مل گئی۔[1]

ولیم دی گُڈ: ۵۶۱ھ تا ۵۸۵ھ (۱۱۶۶ء تا ۱۱۸۹ء)

ولیم کی موت کے بعد اس کا بیٹا ولیم دوئم تیرہ برس کی عمر میں برسرِ اقتدار آیا۔ اس کی پرورش میں مسلمان خدام اور امراء شریک تھے، اس لیے وہ مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا۔

مگر یہ نرمی اسی حد تک تھی کہ اس نے مشرقی و عربی تہذیب و تمدن کو ایک خوبصورت فیشن کے طور پر اختیار کیا ہوا تھا اور تعمیراتی، دفتری اور صنعتی کاموں کے لیے وہ مسلمانوں کی خدمات حاصل کیے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو بعض محدود مذہبی آزادیاں حاصل تھیں، مثلاً وہ مساجد تعمیر کر سکتے تھے، بلند آواز سے اذان دی جا سکتی تھی، ''پرسنل لاء'' کے دائرے میں آنے والے تنازعات کو وہ مسلمان قاضی کے پاس لے جا سکتے تھے۔

مگر یہی ولیم دوسری طرف ایک کٹر نصرانی حکمران تھا۔ اس کے کلیسائے روم سے گہرے تعلقات تھے۔ پادریوں کو حسبِ سابق کھلی چھوٹ تھی۔ دریدہ دہن نصرانی حضور اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں کھلی گستاخیاں کرتے تھے اور حکومت ذرا بھی روک ٹوک نہیں کرتی تھی۔ حکومت عام طور پر لوگوں کو جبراً عیسائی نہیں بنا رہی تھی مگر عیسائیت قبول کرنے کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی۔ حسین مسلمان لڑکیوں کو اغواء کر کے شاہی محلات میں جبراً بھی عیسائی بنا کر رکھا جاتا تھا۔ یوں مسلمانوں کا ایمان قدم قدم پر خطرے میں تھا۔ ان کے لیے مشکلات دن بدن بڑھائی جا رہی تھیں

[1] تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۵۹ تا ۴۶۱، حاشیہ بھی دیکھیے۔

جس کے نتیجے میں کمزور دل لوگ چاہے ظاہری طور پر ہی سہی، عیسائی ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔[1]

صِقلیہ میں ابن جبیر اندلسی کے مشاہدات و تاثرات:

مشہور مسلم سیاح ابن جبیر اندلسی اسی دور میں صِقلیہ کی سیر کے لیے آئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ولیم دوئم مسلمانوں کو ملازم رکھتا اور ان پر اعتماد کرتا ہے۔ اس کے ہاں مسلمان باندیاں بکثرت ہیں جو فرنگی باندیوں کو بھی خفیہ طور دعوت دے کر مسلمان کر لیتی ہیں۔ جزیرے میں بکثرت زلزلے آتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ولیم تمام ملازموں کو کہتا ہے کہ وہ اپنے اپنے معبود کو پکاریں، اکثر ملازمین ایسے میں اللہ کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ روزے بھی رکھتے ہیں اور چھپ کر صدقہ وخیرات نکالتے رہتے ہیں۔ باورچی خانے کا نگران بھی مسلمان ہے، نیز بہت سے حبشی مسلمان غلام اس کے پاس رہتے ہیں۔ تاہم مسلمانوں کو مذہب کی تبلیغ کی آزادی نہیں ہے۔

مگر ابن جبیر نے یہ الم انگیز حقیقت بھی لکھی ہے کہ بہت سے مسلمان اب عیسائی ہونے کو ترجیح دے چکے ہیں۔ حکومت ارتداد کی اس قدر حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ اگر کسی گھر میں باپ اپنی اولاد کو مار پیٹ دے تو بعض اوقات اولاد سیدھا گرجے میں جا کر عیسائی ہو جاتی ہے اور حکومت اسے اپنے سایے میں لے کر فارغ البال کر دیتی ہے۔

ابن جبیر بتاتے ہیں کہ صِقلیہ کے عام نصرانی مسلمانوں سے اچھی طرح پیش آتے ہیں مگر ان کا جاہل طبقہ اسلام، مسلمانوں اور پوری اُمت مسلمہ کے سخت خلاف ہے۔ بہت سے مسلمانوں نے عیسائیوں جیسے نام رکھے ہوئے ہیں، مگر دل سے اہلِ ایمان ہیں۔ ابن جبیر صِقلیہ کے سب سے بااثر مسلمان رئیس ابوالقاسم ابن حمود سے بھی ملے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابن حمود نے اس جزیرے کے مسلمانوں کی اندرونی دل خراش حالت تفصیل سے بیان کی اور کہا:

''کاش میں اور میرے خاندان کے لوگ فروخت کر دیے جاتے مگر ہم مسلمانوں کے ملک میں پہنچ جاتے۔''

ابن حمود نے یہ بھی کہا: ''اگر میں اسلام پر قائم نہ رہتا تو اس جزیرے کے باقی تمام مسلمان بھی عیسائی ہو جاتے۔''

ایک جگہ ابن جبیر کو عبدالمسیح نامی ایک عیسائی ملا۔ اس نے تنہائی کا موقع حاصل کر کے ابن جبیر کو بتایا کہ وہ مسلمان ہے مگر اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا:

''تم علانیہ مسلمان ہو۔ جو کرنا چاہو، آزادی سے کر سکتے ہو۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ اپنے عقیدے کو چھپانے پر مجبور ہیں۔ ہمیں جان کا خوف رہتا ہے۔ عبادت چھپ کر ادا کرتے ہیں۔ غلامی کا طوق ہمارے گلے میں ہے۔''

ابن جبیر لکھتے ہیں: ''مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر ہم پر رقت طاری ہو گئی۔''[2]

❁❁❁

---

[1] تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۷۹ تا ۴۸۲

[2] رحلۃ ابن جبیر، ص ۲۹۸ تا ۳۰۸، ط دار بیروت

جرمن امپائر کے دور میں

ولیم ثانی ۵۸۵ھ میں فوت ہوگیا۔ اس کے بیٹے صِقلِیہ کی حفاظت نہ کرسکے اور شاہِ جرمنی فریڈرک اوّل کے لڑکے ہنری ششم نے ۵۹۱ھ (۱۱۹۴ء) میں صِقلِیہ پر قبضہ کرلیا۔ یوں نارمنوں کا دور اختتام پذیر ہوگیا۔

مسلمانانِ صِقلِیہ حالات کی متلاطم موجوں کی زد میں رہے۔ ان کی حیثیت شکستہ جہاز سے سمندر میں گرنے والے مسافروں کی سی تھی۔ آہستہ آہستہ صِقلِیہ کے پادریوں اور نصرانی عوام کا مزاج ان کے بارے میں سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ مشرق میں چھڑی ہوئی صلیبی جنگیں ماحول میں اس شدت کا بڑا سبب تھیں۔ اُدھر پاپائے روم کے بھڑکانے پر صِقلِیہ کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف مسلح مہم شروع کردی۔ نتیجے میں مسلمانوں نے بھی مزاحمت کی۔ اس کشت وخون میں ہزاروں انسان کٹ گئے۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں مسلمانوں کی بڑی تعداد بلرم سے نکل کر پہاڑی علاقوں اور جنگلوں میں مورچہ بند ہوگئی اور اس نے نصرانیوں کے خلاف وقتاً فوقتاً گوریلا جنگ جاری رکھی۔ [1]

لواسیرا میں پڑاؤ:

ساتویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں فریڈرک دوئم کی حکومت کے دوران ایک بار پھر عیسائیوں نے مسلم نسل کشی کی مہم شروع کی، جس میں فوج پوری طرح شریک تھی۔ جنگلوں اور پہاڑوں کو گھیر کر ان کا چپہ چپہ چھانا گیا اور مسلمانوں کا ہر مورچہ اور قلعہ تباہ کردیا گیا۔ باقی ماندہ مسلمانوں نے ۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) میں مذاکرات کرکے ہتھیار ڈال دیے۔ معاہدے کے مطابق ان میں سے بعض کو صِقلِیہ میں ایک خاص قطعہ اراضی دے دیا گیا اور باقی کو جنوبی اٹلی کے علاقے ''لواسیرا'' میں آباد کردیا گیا۔ انہیں عام شہریوں جیسے حقوق حاصل نہ تھے۔ وہ کہیں اور آباد نہیں ہوسکتے تھے۔ [2]

سلطان ابوزکریا یحییٰ، آخری امید:

تاہم ۶۲۵ھ (۱۲۲۷ء) میں شمالی افریقہ میں سلطان ابوزکریا یحییٰ کی حکومت قائم ہوئی [3] جس نے تیونس سے

---

① تاریخ صقلیہ: ۱/ ۴۹۷ تا ۵۰۲ ② تاریخ صقلیہ: ۱/ ۵۰۳، ۵۰۳

③ سلطان ابوزکریا یحییٰ کا باپ شیخ ابوحفص عمر ہنتانی دولتِ موحدین کی جانب سے تیونس کا گورنر تھا۔ وہ بربر قبیلے کی شاخ مصمودہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد جب سلطان ابوزکریا کو گورنری ملی تو اس وقت موحدین زوال کا شکار ہوچکے تھے، اس لیے سلطان ابوزکریا نے تیونس پر خود مختار حکومت قائم کرلی اور اسے خاصا وسیع کردیا جبکہ موحدین اپنے باہمی تنازعات میں الجھنے کے باعث اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے۔

سلطان ابوزکریا کی شرافت اور سخاوت مشہور تھی۔ یہ اللہ کا بندہ راتوں کو چھپ کر رعایا کے حالات معلوم کرتا، مستحقین کو تلاش کرتا اور انہیں گھر پر صدقہ وخیرات کے اموال پہنچا کر آتا تھا۔ سلطان کے ہاں روزانہ محل میں تین الگ الگ مقامات پر دربار لگتا تھا۔ پہلے دربار میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے معاملات پر گفتگو ہوتی۔ دوسرے دربار میں ماہرینِ مالیات، فقہاء، ادباء اور طبیب ہوتے جس میں خاص مسائل پر مشورہ ہوتا۔ تیسرا دربار نجی قسم کا ہوتا جس میں محل کے اندر کے معاملات زیر بحث آتے۔ ہفتے کے دن ایک الگ گنبد کے نیچے کھلی کچہری لگتی اور قاضیوں کی موجودگی میں عوام کو انصاف بہم پہنچایا جاتا۔ سلطان کی حس نہایت تیز تھی، ایک بار آشوب چشم کی ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ آنکھیں کھولنا مشکل ہوگیا، خواص عیادت کے لیے آئے، ان کے پیچھے محل کا ایک اور ملازم بھی چلا آیا۔ سلطان نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے کہا: کیا آپ مجھے دیکھ سکتے ہیں، سلطان نے کہا: نہیں، میں نے تمہاری بُو محسوس کرکے تمہیں پہچانا ہے۔ سلطان کو جہاد کا بڑا ولولہ تھا۔ ۶۴۷ھ میں اس کی وفات ہوئی، اس وقت وہ ساحلی شہر بونہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ (فوات الوفیات لابن شاکر صلاح الدین: ۴/ ۲۹۳، ط دار صادر)

الجزائر تک ایک وسیع مملکت بنا کر نصرانیوں کو خوفزدہ کردیا۔ چنانچہ فریڈرک دوئم نے مجبوراً اس سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور اسی ضمن میں ''نواسیرا'' میں آباد مسلمانوں کو مساوی شہری حقوق دے دیے، چنانچہ وہ بلرم واپس چلے آئے۔
مسلمانانِ صقلیہ کے ان باقی ماندہ نفوس نے دو عشرے قدرے سکون سے گزار لیے مگر ۶۴۷ھ (۱۲۴۹ء) میں سلطان ابوزکریا یحییٰ کی وفات ہوتے ہی فریڈرک دوئم نے اپنے چہرے سے مسلم دوستی کا نقاب اتار دیا۔ بلرم کے نصرانی ایک بار پھر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں فرار ہو کر جنگلوں میں پناہ لینا پڑی۔ انہوں نے بنو عبس کے ایک سپاہی کو اپنا امیر بنا کر ایک مدت تک فریڈرک کی افواج سے جنگِ چپاول جاری رکھی۔ [1]

نواسیرا میں پڑاؤ:

اس کش مکش کی انتہاء ایک معاہدے پر ہوئی جس کے مطابق مسلمانوں کو ایک شہر ''نواسیرا'' میں آباد کر دیا گیا۔ ان مسلمانوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ جزیرہ مالٹا میں ابھی تک کچھ مسلمان آباد تھے۔ انہیں بھی گھر بار سے محروم کر کے اسی شہر میں لا پھینکا گیا۔ یہ شہر اٹلی کے صوبے سلرنو میں کوہ نیپلز سے ۲۳ میل دور واقع ہے۔ جرمنوں کی پوپ سے عداوت چلی آ رہی تھی، اس لیے فریڈرک دوئم نے مسلمانوں کو یہاں ایک سرحدی فوجی طاقت کے طور پر آباد کیا تھا تاکہ پوپ کو دباؤ میں رکھا جا سکے۔ پوپ بھی تاک میں تھا کہ کسی طرح یہاں سے جرمنوں کی حکومت ختم کرا دی جائے۔
۶۴۸ھ (۱۲۵۰ء) میں فریڈرک دوئم کی وفات ہو گئی اور پوپ نے اس کے جانشینوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اس نے فرانس کو صِقلِّیہ کے تاج وتخت کی پیش کش کر دی جس پر شاہِ فرانس لوئیس نہم کے بھائی چارلس آف انجو نے فوج کشی کر کے ۶۶۵ھ (۱۲۶۶ء) میں جرمنوں کو شکست دی اور ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یوں صِقلِّیہ فرانس کا ایک صوبہ بن گیا اور ''نواسیرا'' کے مسلمان بھی فرانسیسیوں کی رعیت بن گئے۔ [2]

❁❁❁

فرانسیسی استعمار کا دور۔ مسلمانوں کا خاتمہ

۶۸۷ھ (۱۲۸۸ء) میں صِقلِّیہ کی حکومت چارلس دوئم کے پاس آ گئی جس نے سابقہ تمام حکمرانوں سے بڑھ کر مسلم دشمنی کا ثبوت دیا۔ وہ صِقلِّیہ اور اٹلی کا مشترکہ حکمران تھا۔ اس نے نواسیرا کے مسلمانوں کو دو اختیار دیے: عیسائیت قبول کر لو یا موت کو گلے لگا لو۔ اس طرح ان مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنا دیا گیا۔ جنہوں نے انکار کیا، وہ ختم کر دیے گئے۔
غرض ساتویں صدی ہجری کے اختتام تک مسلمانانِ صِقلِّیہ کا ذکر صرف کتب تاریخ میں باقی رہ گیا تھا۔ [1]
وہ جزیرہ جس کی مہمات ۳۳ھ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقدس خون سے شروع ہوئی تھیں اور جس کی فتح کے لیے قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ جیسے بزرگوں نے بڑھاپے کی پروانہ کرتے ہوئے جہاد کر کے رتبۂ شہادت پایا تھا اور جہاں

---

[1] تاریخ صقلیہ: ۵۰۶،۵۰۵/۱   [2] تاریخ صقلیہ: ۵۱۳ تا ۵۰۶/۱

مسلمان تقریباً پانچ صدیوں تک کسی نہ کسی شکل میں آباد رہے، اُمتِ مسلمہ کے لیے اجنبی بن کر رہ گیا۔

❁❁❁

صِقلّیہ کے علماء وفضلاء

صِقلّیہ میں بنواغلب کے دور میں مالکی اور حنفی علماء وفقہاء کا غلبہ تھا، جبکہ بنوعبید اور بنوکلب کے عہد میں اسماعیلی شیعوں کی اجارہ داری تھی۔ تاہم عوام وخواص کی اکثریت شروع سے آخر تک اہلِ سنت رہی۔ کچھ لوگ یقیناً اسماعیلیوں کی دعوت سے متاثر ہوئے، اور کچھ نے تبدیلیِ مذہب پر مراعات، ترقی اور تحفظ کی توقع میں سنت کا راستہ چھوڑ دیا تاہم اس کے باوجود شیعیت ایوانِ اقتدار، اعلیٰ عہدوں، عدالتوں اور سرکاری شعبوں تک محدود رہی۔

شیعہ حکام نے پوری کوشش کی کہ یہ ملک تشیع کے رنگ میں رنگ جائے مگر اس کے باوجود شہریوں میں اسماعیلیت کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ وجہ یہ تھی کہ علماء ومشائخِ اہلِ سنت خصوصاً مالکی فقہاء، لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ ان کا اثر ورسوخ ختم کرنا ممکن نہیں تھا۔ [1] اسلامی صِقلّیہ کے ان علماء وفقہاء اور اہل فنون کی فہرست اتنی طویل ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہم اختصار کے پیشِ نظر صرف چند ناموں پر اکتفا کر رہے ہیں:

ابن کحالہ: (م ۲۸۱ھ):

ابن کحالہ رحمہ اللہ صِقلّیہ کے نامور قاضیوں میں سے ایک تھے۔ فقہِ مالکی کے ائمہ میں سے تھے۔ امام سحنون رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ [2]

ابن ظفر: (م ۴۵۵ھ):

ابن ظفر رحمہ اللہ اتنے بڑے عالم تھے کہ انہیں حجۃ الدین کہا جاتا تھا۔ تفسیر میں ''الینبوع'' لکھی جو ایک ضخیم مجموعہ تھا۔ مقاماتِ حریری کی دو شروح بھی لکھیں، ایک مختصر، دوسری مفصل۔ [3]

ابن مغلوب، میمون بن عمر المغربی: (م ۳۱۰ھ)

ابن مغلوب رحمہ اللہ پہلے قیروان اور پھر صقلیہ کے قاضی بنے۔ بہت بلند پایہ مالکی فقیہ تھے۔ امام مالک بن انس رحمہ اللہ کے شاگردِ رشید قاضی سحنون رحمہ اللہ کے اوّلین تلامذہ میں سے ایک تھے۔ [4]

صاعد الربعی: (م ۴۱۷ھ)

صاعد الربعی اندلس کے نامور ادیب اور شاعر تھے۔ قرطبہ کے حکمران ابن ابی عامر المنصور کے مقرب تھے۔ ان کا ادبی کام المنصور کو بہت پسند تھا۔ اندلس میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو یہ صِقلّیہ آگئے اور باقی عمر یہیں علمی خدمات میں

---

[1] تاریخ صقلیہ: ۱/۵۱۴، ۵۱۵

[2] الاعلام للزرکلی: ۳/۱۲۵

[3] وفیات الاعیان لابن خلکان: ۴/۳۹۵ تا ۳۹۷

[4] سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۳۵۵، ط الرسالۃ

مشغول رہ کر وفات پائی۔[1]

ابو سعید البراذعی: (م بعد از ۴۳۰ھ)

موصوف صقلیہ کے نامور محقق اور مصنف تھے۔ ایوانِ اقتدار میں انہیں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے مؤطا کی شرح "المدونہ" کا اختصار مرتب کیا جو "التہذیب" کے نام سے مشہور ہوا۔[2]

محمد بن علی ابو عبداللہ تمیمی: (م ۵۳۶ھ)

ابو عبداللہ تمیمی رحمہ اللہ صقلیہ کے نامور ائمہ میں سے ایک تھے۔ شیخ تمیمی نے مسلم کی ایک بہترین شرح "المعلم بفوائد شرح مسلم" کے عنوان سے لکھی۔ اصول میں "ایضاح المحصول فی الاصول" ان کا عظیم علمی شاہکار ہے۔ شیخ عبدالوہاب کی "التلقین" کی شرح انہوں نے دس جلدوں میں لکھی۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ جیسے بزرگ علماء ان کے شاگرد تھے جنہوں نے اپنے استاد کی شرحِ مسلم کی تکمیل "اکمال المعلم بشرح صحیح مسلم" کے نام سے لکھی۔

شیخ تمیمی رحمہ اللہ کی اسلامی حمیت کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ وہ ایک یہودی طبیب سے علاج کراتے تھے۔ ایک بار سخت بیمار پڑے، اسی یہودی کے علاج سے افاقہ ہوا۔ یہودی نے کہہ دیا: "اگر میں نے یہ مہارت حاصل نہ کی ہوتی تو مسلمان آپ سے محروم ہو جاتے۔" یہ سن کر شیخ تمیمی رحمہ اللہ کے دل پر چوٹ لگی کہ صقلیہ کے مسلمانوں میں ایسا طبیب کیوں نہیں۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے وہ خود طب سیکھنے بیٹھ گئے۔ کچھ مدت میں وہ اتنے بڑے طبیب بن گئے کہ دور دراز کے معالج ان سے طبی مسائل پوچھنے حاضر ہونے لگے۔[3]

ابن قطاع الصقلی: (م ۵۱۵ھ)

یہ نامور عالم، ادیب، لغوی تھے۔ ۴۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ "کتاب الافعال" اور "ابنیۃ الاسماء" ان کی مشہور ترین تالیفات ہیں۔ اس کے علاوہ علم عروض اور شاعروں کے حالات پر بھی تصنیفی کام کیا۔ ۴۶۰ھ میں صقلیہ پر نارمنوں کے قبضے کے بعد وہاں سے ہجرت کرنے والے علماء میں یہ بھی شامل تھے۔ جب یہ مصر پہنچے تو وہاں کے علماء نے جو کہ ان کے علمی کاموں کے قدردان اور ان کی شہرت سے متاثر تھے، ایک تقریب منعقد کر کے ان کا استقبال کیا۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر ۲۷ سال تھی۔ ابن قطاع رحمہ اللہ نے باقی زندگی مصر میں گزاری اور ۸۲ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔[4]

عبدالحق محمد بن ہارون السہمی الصقلی: (م ۴۶۶ھ)

انہوں نے صقلیہ میں تعلیم حاصل کی، پھر مصر اور حجاز کے اسفار کیے۔ امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ سے ان کی بعض نازک مسائل میں ابحاث ہوئیں۔ "النکت والفروق فی مسائل المدونۃ" اور "تہذیب المطالب" ان کی تحریری کاوشیں ہیں۔[5]

---

[1] الاعلام للزرکلی: ۱۸۶/۳، ط دار العلم للملایین

[2] سیر اعلام النبلاء: ۲۳۵/۱۷، ط الرسالۃ

[3] تاریخ الاسلام للذہبی: ۴۲۵/۳۶، ت تدمری (۱۱/۶۶۱، ت بشار)

[4] سیر اعلام النبلاء: ۴۳۵/۱۹، ط الرسالۃ

[5] تاریخ الاسلام للذہبی: ۲۰۱/۳۱، ۲۰۲، ت تدمری (۱۰/ص ۲۳۳، ت بشار)

ابن رُشیق: (۳۹۰ھ تا ۴۶۳ھ)

اس نامور ادیب وشاعر کا تعلق تیونس کے شہر قیروان سے تھا مگر زیادہ عمر صقلیہ کے شہر مازر میں گزاری۔ ابن رُشیق فقہ، تاریخ، لغت، ادب اور فنِ شعر کے ماہر تھے۔ فقہ وحدیث میں ''شرح مؤطا مالک'' اور لغت میں ''الشذوذ فی اللغۃ'' ان کے علمی شاہکار تھے۔ ''انموذج الزمان فی شعراء قیروان'' کے عنوان سے انہوں نے قیروان کے شعراء کا منتخب کلام پیش کیا ہے۔ ''العمدۃ فی محاسن الشعر وآدابہ'' جس میں شعر گوئی کے اصول، آداب اور گُر سمجھائے گئے ہیں۔

ابن رُشیق رحمہ اللہ نے تاریخ پر بھی کام کیا ہے۔ انہوں نے ''تاریخ القیروان'' کے نام سے اپنے وطن کی مستند تاریخ لکھی اور ''میزان العمل فی تاریخ الدول'' کے عنوان سے مختلف ممالک اور شاہی خانوادوں کے حالات جمع کیے۔ [1]

ابن رواحہ:

آخر میں ایک ایسے عظیم عالم دین کا ذکر کیا جاتا ہے جو صقلیہ کے دورِ غلامی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت صقلیہ سے مسلمانوں کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا۔ بچے کھچے لوگوں کو نصرانی بنانے کی مہم عروج پر تھی۔ انکار کی کم از کم سزا قید وبند تھی۔ ایسے میں مسینہ کے ایک عالم حسین بن عبداللہ نامی کو بھی ان کی بیوی سمیت گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ ۵۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی بیوی امید سے تھی۔ ایک مدت تک دونوں سزائیں جھیلتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کو رہائی نصیب فرما دی۔ بچے کی ولادت ہوئی تو اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ والدین کو اس کی جان اور ایمان کی فکر لاحق تھی۔ کئی سال بعد اللہ نے انہیں اس اندھیر نگری سے نکلنے کا موقع دے دیا۔

اس طرح ۵۷۰ھ میں وہ مصر آگئے۔ جہاں سلطان صلاح الدین ایوبی کی حکومت تھی۔ یہاں اس بچے نے ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے دور کے عظیم ترین محدث ابوطاہر سلفی رحمہ اللہ سے علم حدیث میں مہارت حاصل کی۔ جب یہ بچہ عالم بنا تو دنیا اسے ''ابن رواحہ'' کی کنیت سے جاننے لگی۔ ان کی وفات ۶۴۶ھ میں ہوئی اور حماہ میں مدفون ہوئے۔ [2]

صقلیہ پر اقبال کا مرثیہ:

صقلیہ اسلامی تاریخ کا پہلا ملک تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلا۔ اس کے فوراً بعد عیسائیوں نے جری ہو کر ایک طرف شمالی افریقہ اور اندلس پر حملے شروع کیے اور دوسری جانب شام میں صلیبی جنگوں کا آغاز کر دیا۔ شمالی افریقہ میں مؤحدین اور شام میں ایوبیوں نے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیا مگر اندلس اس انقلاب سے اتنا متاثر ہوا کہ دوبارہ پہلے کی طرح مستحکم نہ ہو سکا اور پانچ صدیوں بعد وہاں اسلام کا نام ونشان مٹ گیا۔ اس المیے کی پہلی کڑی صقلیہ کا سقوط تھا جہاں آج ڈھونڈے سے بھی مسلمانوں کا کوئی محلہ نہیں ملتا۔

صقلیہ سے اسلام کے خاتمے کے سات سو سال بعد شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کا اس جزیرے سے گزر

---

① وفیات الاعیان لابن خلکان: ۲/۸۵، ط دار صادر۔ نوٹ: ابن رشیق کی کتاب ''محاسن الشعر وآدابہ'' مکتبہ دار الجیل نے کچھ عرصہ قبل شائع کی ہے۔

② سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۲۶۱، ط الرسالۃ

ہوا تو ان کا دل بھر آیا اور انہوں نے فراموش شدہ دولتِ اسلامیہ صقلیہ کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا:

✿✿✿

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرانشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مُردہ عالم، زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہوا

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحرِ پیما کو رہے

ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تُو اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اُس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

والیانِ دولتِ اسلامیہ صِقلّیہ

نمبر	حکمران	دور	خاص بات
		بنو اغلب کے ماتحت گورنر	
۱	قاضی اسد بن فرات	۲۱۳ھ (۸۲۸ء)	امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد۔ فاتح صِقلّیہ
۲	محمد بن ابی الجواری	۲۱۳ھ تا ۲۱۴ھ (۸۲۸ء تا ۸۲۹ء)	کم سن تھا، معزول کر دیا گیا۔
۳	زہیر بن غوث	۲۱۴ھ (۸۲۹ء)	سلطنت کا استحکام، مثالی حکمرانی
۴	محمد بن عبداللہ الاغلب	۲۱۵ھ تا ۲۲۱ھ (۸۳۰ء تا ۸۳۶ء)	نااہل اور آرام پسند
۵	ابراہیم بن عبداللہ ابوالاغلب	۲۲۱ھ تا ۲۳۶ھ (۸۳۶ء تا ۸۵۱ء)	سولہ سال حکومت کی، اچھا منتظم، مجاہد اور فاتح تھا۔
۶	عباس بن فضل	۲۳۶ھ تا ۲۴۷ھ ......(۸۵۱ء تا ۸۶۱ء)	رومیوں کے متعدد قلعے فتح کیے۔
۷	احمد بن یعقوب	۲۴۷ھ (۸۶۱ء)	مختصر دور
۸	عباس بن فضل	۲۴۸ھ (۸۶۲ء)	نااہل، صرف پانچ مہینے کی گورنری
۹	خفاجہ بن سفیان	جمادی الاولیٰ ۲۴۸ھ تا یکم رجب ۲۵۵ھ (جولائی ۸۶۲ء تا جون ۸۶۹ء)	مسلسل جہاد کرتا رہا۔ امراء کی باہمی سازش میں قتل ہوا۔
۱۰	محمد بن خفاجہ	رجب ۲۵۵ھ تا رجب ۲۵۷ھ (جون ۸۶۹ء تا جون ۸۷۱ء)	رومیوں نے جزیرہ مالٹا چھین لیا۔ اپنے خدام کے ہاتھوں قتل ہوا۔
۱۱	رباح بن یعقوب	رجب ۲۵۷ھ تا ربیع الاول ۲۵۸ھ (جون ۸۷۱ء تا فروری ۸۷۲ء)	مختصر دور
۱۲	حسین بن رباح	۲۵۸ھ (۸۷۲ء)	مختصر دور

۱۳	عبداللہ بن محمد	۲۵۹ھ (۸۷۳ء)	مختصر دور
۱۴	احمد بن عمر حبشی	۲۶۰ھ تا ۲۶۴ھ (۸۷۴ء تا ۸۷۸ء)	ناکام فوجی مہمات کی وجہ سے معزول ہوا۔
۱۵	جعفر بن محمد	۲۶۴ھ (۸۷۸ء)	سرقوسہ کی مہم میں رومیوں پر فتح پائی۔ محلاتی سازش میں قتل ہوا۔
۱۶	اغلب بن محمد حظلب	۲۶۴ھ تا محرم ۲۶۵ھ (ستمبر ۸۷۸ء)	سرقوسہ فتح کیا۔
۱۷	ابوالاغلب بن ابراہیم	۲۶۵ھ (۸۷۹ء)	عوامی شورش کی وجہ سے معزول ہوا۔
۱۸	حسین بن رباح (دوبارہ)	۲۶۶ھ (۸۸۰ء)	رومیوں سے شکست کی بناء پر معزول ہوا۔
۱۹	حسن بن عباس	۲۶۷ھ (۸۸۱ء)	رومیوں سے شکست کے باعث معزول کیا گیا۔
۲۰	ابوالحسین محمد بن فضل	۲۶۸ھ تا ۲۷۰ھ (۸۸۲ء تا ۸۸۳ء)	صقلیہ میں رومیوں کا زیر تعمیر نیا پایۂ تخت فتح کرلیا۔
۲۱	علی بن محمد بن ابی الفوارس	۲۷۰ھ (۸۸۳ء)	
۲۲	حسین بن احمد	۲۷۰ھ تا شعبان ۲۷۱ھ (۸۸۳ء تا فروری ۸۸۵ء)	بیمار پڑ کر فوت ہوا۔
۲۳	سوادہ بن محمد	۲۷۱ھ تا ۲۷۲ھ (۸۸۵ء)	
۲۴	ابوالعباس علی	۲۷۳ھ (۸۸۶ء)	جنوبی اٹلی کے دو شہر: سیرینہ اور منیسا دوبارہ رومیوں کے قبضے میں چلے گئے۔

۲۵	احمد بن عمر حبشی	صفر ۲۷۴ھ تا ۲۷۸ء (جولائی ۸۸۷ء تا ۸۹۱ء)	
۲۶	ابو الحسین احمد بن فضل	صفر ۲۷۹ھ تا ۲۸۳ھ (جون ۸۹۲ء تا ۸۹۷ء)	
۲۷	حسن بن احمد بن نافذ	۲۸۵ھ (۸۹۸ء)	
۲۸	ابو مالک احمد بن عمر حبشی	۲۸۶ھ (۸۹۹ء)	
۲۹	ابو العباس بن ابراہیم اغلبی	۲۸۷ھ تا ۲۸۹ھ (۸۹۹ء تا ۶ نومبر ۹۰۲ء)	نامور فاتح۔ جنوبی اٹلی سمیت پورے صقلیہ کو فتح کیا۔
۳۰	ابو مضر سرقوسی	۲۸۹ھ (۹۰۲ء)	لہو ولعب میں مشغولی کی وجہ سے معزول ہوا۔
۳۱	محمد بن سرقوسی	۲۹۰ھ (۹۰۳ء)	ابو مضر کی جگہ صقلیہ کا والی بنا۔
		بنو عبید کے ماتحت گورنر	
۱	علی بن محمد بن ابی الفوارس	شعبان ۲۹۰ھ (جولائی ۹۰۳ء)	
۲	احمد بن ابی حسین بن رباح	۲۹۱ھ تا ۲۹۶ھ (۹۰۴ء تا ۹۰۹ء)	
۳	ابن ابی خنزیر۔ پہلی بار	۲۹۷ھ تا ۲۹۹ھ (۹۱۰ء تا ۹۱۲ء)	صقلیہ کا پہلا شیعہ گورنر
۴	علی بن عمر البلوی	۲۹۹ھ (۹۱۲ء)	
		طوائف الملوکی کا دور	
۱	احمد بن قرہب	محرم ۳۰۰ھ تا ذوالقعدہ ۳۰۳ھ (ستمبر ۹۱۲ء تا جون ۹۱۶ء)	اغلبی اقتدار کی بحالی کی کوشش کی۔
۲	ابو الغفار	اواخر ۳۰۳ھ تا اوائل ۳۰۴ھ (۹۱۶ء) چند ماہ	ابو سعید شیعی کے ہاتھوں مغلوب

		بنوعبید کے ماتحت گورنروں کا دوسرا دور	
۱	سالم بن ابی راشد	۳۰۴ھ تا ۳۲۴ھ(۹۱۶ء تا ۹۳۶ء)	طویل حکومت کی۔
۲	خلیل بن اسحٰق	۳۲۵ھ تا ۳۲۹ھ(۹۳۷ء تا ۹۴۱ء)	ملک میں بدامنی، قحط سالی
۳	ابوعطاف، الازدی	۳۲۹ھ تا ۳۳۶ھ(۹۴۱ء تا ۹۴۸ء)	
		بنو کلب کے حکمران	
۱	حسن بن علی کلبی	۳۳۶ھ تا ۳۴۳ھ(۹۴۸ء تا ۹۵۴ء)	بانیٔ دولتِ بنو کلاب صقلیہ
	احمد بن حسن بن علی	۳۴۳ھ تا ۳۵۸ھ(۹۵۴ء تا ۹۶۹ء)	
	یعیش مولیٰ حسن	۳۵۸ھ تا ۳۵۹ھ(۹۶۹ء تا ۹۷۰ء)	
	احمد بن حسن۔ دوبارہ	۳۵۹ھ(۹۷۰ء) چند ماہ	
۲	ابوالقاسم بن حسن کلبی	۳۶۰ھ تا ۳۷۲ھ(۹۷۱ء تا ۹۸۲ء)	عادل اور عوام دوست
۳	جابر بن ابوالقاسم	۳۷۲ھ تا ۳۷۳ھ(۹۸۲ء تا ۹۸۳ء)	نااہل
۴	جعفر بن محمد کلبی	۳۷۳ھ تا ۳۷۵ھ(۹۸۳ء تا ۹۸۵ء)	منصف مزاج، علم پرور
۵	عبداللہ بن محمد کلبی	۳۷۵ھ تا ۳۷۹ھ(۹۸۵ء تا ۹۸۹ء)	رعایا پرور، علم و فضل کا سرپرست
۶	ابوالفتوح	۳۷۹ھ تا ۳۸۸ھ(۹۸۹ء تا ۹۹۸ء)	قابل تعریف حکمرانی، فالج کی وجہ سے ازخود مستعفی۔
۷	جعفر بن ابوالفتوح	۳۸۸ھ تا ۴۱۰ھ(۹۹۸ء تا ۱۰۱۹ء)	خوشحالی کا دور۔ اپنے بھائی علی کی بغاوت سے نبرد آزما۔ آخر میں باپ کے حکم سے معزول۔
۸	احمد الاکحل کلبی	۴۱۰ھ تا ۴۲۷ھ(۱۰۱۹ء تا ۱۰۳۶ء)	نارمنوں کا حملہ۔ سقوطِ قلوریہ
۹	حسین بن ابوالفتوح	۴۲۷ھ تا ۴۳۱ھ(۱۰۳۶ء تا ۱۰۴۰ء)	دورِ زوال اور سقوطِ دولتِ کلبیہ
		نارمنوں کے حملوں کے دوران مسلم حکمران	
۱	ابن حواس، ابن ثمنہ، عبداللہ بن منعوت، ابن بعباع	۴۳۱ھ تا ۴۶۴ھ (۱۰۴۰ء تا ۱۰۷۲ء)	

دوسرا باب

صلیبی جنگیں اور اتابک حکمران

۴۸۸ہجری تا ۵۶۹ ہجری

نومبر۱۰۹۵ءعیسوی تا ۱۱۷۴ءعیسوی

پہلی صلیبی جنگ

دورِ خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں نے قیصر کو شکست دے کر نصرانیت کو بحیرۂ روم کے پار دھکیل دیا تھا۔ تب سے فلسطین کے مقاماتِ مقدسہ مسلمانوں کی تحویل میں تھے۔ القدس ہی میں نصرانیوں کی فرضی مرقدِ مسیح بھی تھی جسے ان کے سب سے مقدس مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے نصرانیوں کی ان مذہبی یادگاروں کو ان کے حال پر رہنے دیا تھا۔ نصرانیوں کو مسلم معاشرے میں کوئی تکلیف لاحق نہیں تھی۔ مسلم امراء کے ہاں کسی فن میں مہارت رکھنے والے عیسائی افراد کو باعزت مناصب بھی دیے جاتے تھے۔ ہارون الرشید کے دور میں عیسائی بادشاہ شارلیمن کے ساتھ القدس کے آنے والے عیسائی زائرین کے حوالے سے جو معاہدہ کیا گیا تھا، مسلمان اس کی بھی پابندی کرتے رہے۔ مگر عیسائی زائرین اپنے مذہبی مرکز کو مسلمانوں کے پاس دیکھ کر کڑھتے تھے۔ مسلمانوں کی خوشحالی سے بھی انہیں حسد ہوتا تھا اور وہ یہ جذبہ لے کر اپنے وطن کو لوٹتے تھے کہ کسی طرح یہاں کے وسائل پر قابض ہو جائیں۔ یہی حسد اور ہوسِ ملک و مال صلیبی جنگوں کے اصل محرکات تھے۔

صلیبی جنگوں کے باقاعدہ آغاز سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل مسلمانوں اور رومیوں میں شدید تناؤ کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ چوتھی صدی ہجری میں عباسی خلافت بے اختیار ہو کر بویہی شیعہ امراء کے زیرِ اثر آ چکی تھی [1] اور اس کی ماتحت ریاستیں خود مختار اور منتشر ہو چکی تھیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قیصرِ روم کا سالار دمستق شام کے ساحل پر قابض ہو گیا۔ سیف الدولہ نامی ایک دلیر حاکم اس سے لڑتا رہا مگر ۳۵۶ھ (۹۶۷ء) میں اس کی وفات کے بعد نصرانیوں کی ہمت بڑھ گئی اور ۳۶۱ھ (۹۷۲ء) میں وہ دیارِ بکر تک قابض ہو گئے۔ یہ لڑائیاں صلیبی جنگیں نہیں مگر ان کی تمہید مانی جاتی ہیں۔ نصرانیوں کی یہ فتوحات پائیدار ثابت نہ ہوئیں اور سلجوقیوں نے یہ علاقے کچھ مدت بعد آزاد کرا لیے۔

اس دوران عیسائی زائرین کی بیت المقدس آمد جاری تھی۔ ان کے قافلے جن میں بڑی تعداد بدکاروں اور غنڈوں کی ہوتی تھی، راستے کے اسلامی شہروں کی انتظامیہ اور عوام کو تنگ کرتے اور ناچتے گاتے القدس میں داخل ہوتے تھے۔ جب ان کی خرمستیاں حد سے بڑھ گئیں تو مسلم حکمرانوں نے انہیں مسلم آبادیوں اور القدس کے ادب و احترام پر مجبور کیا۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ سختی بھی کی گئی۔ اس رویے کو عیسائی زائروں نے جبر و تشدد کا نام دے دیا۔ [2]

---

[1] بویہی شیعہ امراء ۳۳۴ھ سے ۴۴۷ھ تک خلفائے بنو عباس اور عراق و ایران پر مسلط رہے۔ جس کی تفصیل حصہ سوئم میں گزر چکی ہے۔

[2] حیاتِ صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد، ص ۱۰ تا ۱۵، ط الفیصل لاہور؛ الحروب الصلیبیہ للعروسی المطوی، ص ۴۵

اس دوران قُسطَنطِینیہ کو سلجوقیوں سے سخت خطرہ لاحق تھا۔ جب ۴۶۳ھ میں نامور سلجوقی حکمران الپ ارسلان نے قُسطَنطِینیہ کے قیصر ارمانوس دیوجانس کو شکستِ فاش دے کر گرفتار کیا تو اس کے بعد سے قُسطَنطِینیہ کے ہر حکمران کو سلجوقیوں کے حملے کا خدشہ لاحق رہنے لگا۔ ۴۷۹ھ (۱۰۸۶ء) میں مَرّاکش کے حکمران یوسف بن تاشفین نے اسپین میں نصرانیوں کو عبرتناک شکست دی جس کا بدلہ لینے کے لیے عیسائی موقعے کی تاک میں رہنے لگے۔ ۴۸۴ھ میں انہوں نے صِقلیہ پر قبضہ کر لیا اور انہیں مسلمانوں کو ایشیا میں شکست دینے کی بھی امید ہوگئی۔ [1]

پطرس راہب کی اشتعال انگیزی:

صِقلیہ پر قبضے کے بعد وہاں کے فاتح راجر اوّل نے ایک مجلسِ مشاورت میں نصرانیوں کو القدس پر قبضے کا مشورہ دیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ [2] اُدھر اسی سال فرانس کا ایک جنونی مزاج راہب پطرس (پیٹر دی ہرمٹ) راہبوں کی ایک جماعت کے ساتھ القدس کی زیارت کے لیے گیا۔ اس نے القدس میں زائرین پر عائد پابندیوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ القدس کے بشپ (بڑے پادری) نے اسے مسلمانوں کے مظالم کے فرضی قصے سنا کر مزید مشتعل کر دیا اور کہا کہ یورپی تاجدار ہی آکر ہمیں نجات دے سکتے ہیں۔

پیٹر نے شاہانِ یورپ کو جھنجھوڑنے کی ذمہ داری قبول کی اور بشپ نے اسے یورپی بادشاہوں کے نام خطوط دیے جن میں انہیں شام پر حملے کی دعوت دی گئی تھی۔ پیٹر یہ خطوط لے کر اٹلی کے دارالحکومت روم میں کلیسا کے سربراہ پوپ سے ملا۔ صدیوں سے کلیسا دو حصوں میں تقسیم تھا: ایک مشرقی کلیسا تھا جس کا مرکز قُسطَنطِینیہ تھا۔ دوسرا مغربی کلیسا تھا جس کا مرکز روم تھا۔ پیٹر راہب روم کے پوپ اربن ثانی سے ملا جس نے القدس کی بازیابی کے خیال کو بڑی دلچسپی سے سنا اور پیٹر کو گلے لگا کر اسے یہ مہم سونپی کہ وہ یورپ کے کونے کونے میں جا کر عوام و حکام کو شام پر حملے کی دعوت دے۔ پیٹر فوراً یورپ کے دورے پر نکل گیا اور اس نے عوام و خواص کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کر دیا۔ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اسے یروشلم میں یسوع کی قبر سے یہ پکار سنائی دی تھی:

> ''اٹھ، میرے پیروکاروں کے مصائب کا چرچا کر، یہ وقت ہے کہ میرے خدا کی نصرت ہو اور مقدس مقامات آزاد ہوں۔''

ادھر شوال ۴۸۵ھ میں ملک شاہ سلجوقی کی دنیا سے رحلت کے بعد شام کی سلجوقی حکومت کئی ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی۔ قیصر ''ایلکسی اس'' نے اسے بہترین موقع تصور کرتے ہوئے پوپ اور یورپی حکمرانوں کو خطوط لکھ کر انہیں جلد از جلد شام پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی اور خطرہ ظاہر کیا کہ اگر یورپ ایشیا کے نصرانیوں کی مدد کو نہ آیا تو ترک قُسطَنطِینیہ پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ اس کے ساتھ اس نے اپنے ملک کی دوشیزاؤں کے حسن و جمال کی تصویر کشی کرتے ہوئے یورپی جنگجوؤں کو امید دلائی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کر کے ان حسیناؤں کے نہ صرف دل جیت سکتے ہیں بلکہ ان کے

[1] حیاتِ صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد، ص ۱۰ تا ۱۵؛ الحروب الصلیبیه للعروسی المطوی، ص ۴۵، ط دار الغرب الاسلامی

جسم بھی انعام میں پاسکتے ہیں۔ اس مہم میں اہلِ یورپ کو دھکیلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کلیسا کی بے جا سختیوں کی وجہ سے نصرانیوں میں مذہب سے بیزاری پیدا ہو چکی تھی۔ یورپ کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے محسوس کیا کہ اگر وہ لوگوں کی توجہات کا رخ ایک ''مقدس جنگ'' کی طرف پھیر دیں تو مذہب کی اندرونی کمزوریاں فراموش ہو جائیں گی۔

عیسائی رؤساء کی اس مہم جوئی میں شرکت کا ایک سبب یہ تھا کہ انہیں نئی جاگیروں کے لیے نوآبادیات کی تلاش تھی۔ یورپی تاجر نئی منڈیوں کی فکر میں تھے۔ مسلمانوں کے خلاف جنگوں کا سلسلہ ان مقاصد کے حصول کا اچھا بہانہ بن سکتا تھا۔ عام عیسائی پادریوں کے بھڑکانے کی وجہ سے اس مہم میں شرکت پر آمادہ ہوئے۔ عیسائیت میں ''پیدائشی گناہ'' کے عقیدے نے اس مذہب کے ہر پیروکار میں احساسِ جرم پیدا کر رکھا تھا۔ پادریوں نے جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے اعلان کر دیا کہ اس جنگ میں شرکت سے آدمی گناہوں سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اس طرح صلیبی قائدین اپنے اصل سیاسی و مادی مقاصد کو اوجھل رکھ کر جنگوں کو مذہبی لبادہ اوڑھاتے ہوئے عوام کو مشتعل کر رہے تھے۔ [1]

صلیبی جنگ جوؤں کا حوصلہ بڑھنے کا ایک بڑا محرک مسلمانوں کا سیاسی انتشار تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں جب صلیبی جنگیں چھڑیں تو عالمِ اسلام تین بڑے ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا: ایک حصہ وہ تھا جہاں بغداد کے عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس میں حجاز، ایشیائے کوچک، عراق، ایران، خراسان اور ہندوستان کی درجنوں خود مختار ریاستیں شامل تھیں جن میں سلجوقیوں کو سب سے طاقتور مانا جاتا تھا۔ دوسرا حصہ شمالی افریقہ اور مصر کا تھا جہاں بنوعبید نے دولتِ فاطمیہ کے نام سے الگ خلافت قائم کی ہوئی تھی۔ تیسرا حصہ مراکش اور اسپین پر مشتمل تھا جہاں مرابطین کی حکومت تھی۔ یہاں عباسی خلفاء کا خطبہ تو پڑھا جاتا تھا مگر عملاً اس علاقے کو باقی عالمِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجموعی طور پر عالمِ اسلام کے ان تینوں بڑے حصوں میں کوئی ربط وضبط نہیں تھا۔ مسلمانوں کا یہ انتشار یورپی طاقتوں کی صلیبی جنگوں میں پُرامیدی اہم سبب تھا۔

ان جنگوں کا دوسرا بڑا محرک مصر کے عبیدی خلفاء کا رویہ تھا جنہیں خطرہ تھا کہ کہیں سلجوقی ان سے مصر نہ چھین لیں کیوں کہ سلجوقی شام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی لیے عبیدی حکمران مستنصر نے ۴۶۲ھ میں صلیبیوں کو شام پر حملے کی دعوت دے ڈالی تاکہ اس کے مخالف سلجوقی کمزور پڑ جائیں۔ مستنصر کو یہ بھی امید تھی کہ صلیبی شام پر قابض ہو کر اس کے اور سلجوقیوں کے درمیان حائل ہو جائیں گے اور مصر سلجوقیوں کی یلغار کے خطرات سے محفوظ ہو جائے گا۔ تاہم یورپی طاقتوں کو اس وقت یلغار کی ہمت نہ ہوئی اور اس دوران سلجوقی شام میں داخل ہو گئے۔

ملک شاہ نے شام کی مہمات اپنے بھائی تاج الدولہ تتش کے سپرد کر دی تھیں کہ وہ جتنا بھی علاقہ فتح کرے گا وہ اسی کا شمار ہوگا چنانچہ تتش نے ۴۷۱ھ تک حلب اور دمشق سمیت شام کے بیشتر علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے ردعمل میں مصری وزیراعظم بدر جمالی نے فوج کشی کر کے سلجوقیوں کو شام سے نکالنے کی کوشش کی مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

---

(1) الحروب الصلیبیہ للعروسی المطوی، ص ۲۹ تا ۳۵؛ الکامل فی التاریخ سنۃ ۴۸۰ھ تا ۴۸۵ھ

۴۸۵ھ میں تتش نے حمص پر بھی قبضہ کرلیا۔ القدس بھی اسی کے پاس تھا اور اس کی جانب سے امیر ارتق یہاں کا حاکم تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ پیٹر راہب القدس کی زیارت کر کے واپس جا چکا تھا۔ ادھر قضا و قدر نے مسلمانوں کو ایک ابتلائے عظیم میں ڈال ناطے کر دیا تھا۔ ۴۸۴ھ میں صقلیہ کا سقوط ہوا اور ۴۸۵ھ میں سلجوقیوں کے عظیم بادشاہ ملک شاہ کا انتقال ہوگیا جس کے فوراً بعد اس کے بیٹوں: محمود، برکیارق اور محمد میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ اس سے یورپی فرنگیوں اور مصر کے عبیدیوں دونوں کو اپنی اپنی جگہ فلسطین پر قبضے کی امنگ پیدا ہوگئی۔ تین سال ہی گزرے تھے کہ عبیدیوں کا خلیفہ مستنصر بھی جس نے ساٹھ سال تک مصر پر حکومت کی تھی، ۴۸۷ھ میں فوت ہوگیا تھا۔ اس طرح مصر کی حکومت بھی کمزور پڑ کر صلیبیوں سے اپنے ملک کا دفاع کرنے کے قابل نہ رہی۔ مستنصر جس نے خود فرنگیوں کو شام پر حملے کی دعوت دی تھی، یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ اس کی اولاد کو بہت جلد اس کی حماقت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور جب صلیبی شام کے ساحلوں پر اتریں گے تو مصر کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

جب شام اور فلسطین میں ملک شاہ کے وارث ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے، ذوالقعدہ ۴۸۸ھ (نومبر ۱۰۹۵ء) میں فرانس کے شہر کلر ماؤنٹ میں ایک عظیم مذہبی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی دعوت پوپ اربن ثانی نے دی تھی۔ اجلاس کی آخری نشست میں پیٹر ڈی ہرمٹ نے بڑی اشتعال انگیز تقریر کر کے حاضرین کو شعلہ جوالا بنا دیا۔ پھر پوپ اربن ثانی نے خطاب کر کے امرائے یورپ کو القدس کی بازیابی پر ابھارا۔ حاضرین یروشلم کی بازیابی کے لیے اس قدر پرجوش ہوئے کہ سب کے منہ سے نکلا:

"یہ خدا کی مرضی ہے۔"

پوپ نے کہا: "ہاں بے شک خدا کی یہی مرضی ہے۔ اسی نے تم کو یہ الفاظ سکھائے ہیں، تم ان کو اپنا جنگی نعرہ بنالو۔" جب پوپ نے بائبل میں مذکور مسیح کے ایک فقرے کو استعمال کرتے ہوئے کہا: "جو اس جنگ میں صلیب اٹھا کر ساتھ نہیں ہوگا وہ میرا پیروکار نہیں رہے گا۔" تو حاضرین میں کہرام مچ گیا۔

اس جنگ کو کروسیڈ (صلیبی جنگ) کا نام دے دیا گیا۔ لوگوں نے اپنے کپڑوں کو سرخ صلیب سے سجالیا۔[1]

صلیبی جنگوں کا مطلب کیا ہے؟

یہاں یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کی نصرانیوں سے سینکڑوں جنگیں ہو چکی تھیں مگر ہر جنگ کو صلیبی جنگ نہیں کہا جاتا تھا۔ اصطلاح میں صلیبی جنگیں صرف ان جنگوں کو کہا جاتا ہے جن کی دعوت نصرانیوں کے مذہبی پیشوا اور پادریوں نے دی ہو اور جو صلیب کے نام پر لڑی گئی ہوں۔ یہ جنگیں باقاعدہ طور پر سن ۴۸۹ھ میں شروع ہوئیں اور ان کا اختتام ۶۹۰ھ میں ہوا۔ اس طرح یہ دو صدیوں پر محیط ہیں۔

---

[1] حیات صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد، ص ۲۱، بحوالہ تاریخ جہاد ؛ الحروب الصلیبیۃ للعروسی المطوی، ص ۴۳ تا ۴۷ ؛ تاریخ اسلام معین الدین ندوی: ۱۲۳/۴، بحوالہ تاریخ یورپ اے جے گرانٹ، ص ۳۵۵

سلاجقۂ روم سے معرکے:

یلغار کے پہلے مرحلے میں پیٹر راہب تیرہ لاکھ افراد کا مجمع لے کر روانہ ہوا مگر اتنی بڑی فوج سامانِ رسد کی کمی کے سبب راستے ہی میں ابتری کا شکار ہوگئی اور بڑی کسمپرسی کے عالم میں قُسطنطینیّہ پہنچی۔ ①

صلیبی لشکر آبنائے باسفورس عبور کر کے ایشیائے کوچک پہنچا اور سلاجقۂ روم کے علاقے میں مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہاء کردی۔ فرانسیسی مؤرخ مجاڈ ''تاریخ حروبِ صلیبیہ'' میں لکھتا ہے:

''انہوں نے صلیب کے نیچے ایسے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا کہ فطرت ان کے تصور سے کانپ اٹھتی ہے۔''

وہ مزید لکھتا ہے:

''صلیبیوں نے منیسا کے نواح میں بھیانک مظالم ڈھائے، بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور بوٹی بوٹی کر کے سیخوں پر چڑھایا۔'' ②

آخر سلجوقیوں نے جوابی حملہ کیا اور صلیبیوں کو پسپا کر کے تمام سرحدی علاقوں کو خالی کرالیا۔ پیٹر باقی ماندہ افراد کے ساتھ بڑی مشکل سے جان بچا کر یورپ لوٹنے میں کامیاب ہوا۔ ③

کلرمونٹ کانفرنس کے آٹھ ماہ بعد نواب گاڈ فرے ڈی بولین ۸۰ ہزار پیادوں اور دس ہزار گھڑ سوار لے کر پابہ رکاب ہوا۔ اٹلی اور فرانس کی ٹڈی دل افواج بھی نکل پڑیں۔ اس فوج کی مجموعی تعداد پانچ لاکھ پیادوں اور ایک لاکھ سواروں تک پہنچ گئی۔ ④

انطاکیہ پر لشکرِ صلیب کا قبضہ:

صلیبی لشکر ۱۲ ذوالقعدہ ۴۹۰ھ (۲۱ اکتوبر ۱۰۹۷ء) کو انطاکیہ پہنچا۔ مقامی مسلمانوں نے سات ماہ تک شہر کا دفاع کیا۔ اس دوران صلیبیوں نے طرطوس اور پھر اڈیسہ (الرُّہا) پر قبضہ کرلیا۔ اُدھر مصر کا حکمران مستعلی عبیدی موقع دیکھ کر ربیع الاول ۴۹۰ھ (مارچ ۱۰۹۷ء) میں ''صور'' اور شعبان (جولائی) میں ''القدس'' پر قابض ہوگیا۔ پھر اس نے صلیبی قائدین کو پیغام دیا:

''صلیبیوں نے جو فتوحات آلِ علی کے دشمن سنی ترکوں کے خلاف حاصل کی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ آپ کو خدا ہی نے ایشیا میں بھیجا ہے تاکہ آپ انصاف کا وسیلہ بنیں۔ ہم جانتے ہیں کہ صلیبیوں کی سب سے بڑی خواہش القدس کی زیارت ہے۔ پس ہم آپ کو ایک ماہ کا وقت دیتے ہیں کہ آپ بغیر ہتھیاروں کے القدس میں جائیں اور پوری آزادی سے زیارت اور عبادت کی رسوم بجالائیں۔ اس صورت میں آپ کو خلیفہ کا پورا پورا تعاون میسر رہے گا۔''

---

① الحروب الصلیبیہ، ص ۴۷ تا ۵۱ ② حیاتِ صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد، ص ۲۳، بحوالہ مجاڈ ص ۷۳

③ بحوالہ بالا ④ الحروب الصلیبیہ، ص ۵۰، ۵۱

مگر اسے جواب ملا:

''ہم قسم کھا چکے ہیں کہ ہم یروشلم کو مسیح کے منکروں سے آزاد کرائیں گے۔ اپنے آقا کو بتادو کے جو صلیبی انطاکیہ کے پاس خیمہ زن ہیں وہ مصر کی حکومت سے ڈرتے ہیں نہ بغداد کے خلیفہ سے۔''

سلجوقی سلطان اور دوسرے شہروں کے حکام نے اہل انطاکیہ کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج روانہ کی مگر ادھر انطاکیہ کے ایک امیر نے صلیبیوں کو شہر میں داخل ہونے کا موقع دے دیا۔ یوں رجب ۴۹۱ھ (جون ۱۰۹۸ء) میں انطاکیہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سلجوقی فوج انطاکیہ کی بازیابی کے لیے پہنچی تو نصرانی خوفزدہ ہو گئے مگر ایک راہب نے اپنی فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے چپکے سے ایک پرانا نیزہ زمین میں دفن کر دیا اور فوج کے امراء سے کہا:

''سنا ہے کہ یسوع مسیح کا ایک نیزہ انطاکیہ میں دفن ہے، اسے تلاش کرو۔ اگر مل گیا تو فتح ہمارا مقدر ہے۔ اگر نہ ملا تو ہلاکت طے ہے۔''

راہب کے کہنے پر امرائے فوج نے تین دن تک روزے رکھ کر دعائیں کیں، پھر راہب کے کہنے پر کھدائی کی گئی تو ایک جگہ سے وہ نیزہ نکل آیا۔ اس سے صلیبیوں میں ایک جوش پھیل گیا اور وہ مقابلے کے لیے کمربستہ ہو کر کھلے میدان میں نکل آئے۔ جنگ میں سلجوقیوں کو شکست ہوئی اور فلسطین تک صلیبیوں کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ [1]

بیت المقدس کا سقوط، فرنگیوں کے لرزہ خیز مظالم:

صلیبی البیرہ، معرہ، طرطوس اور عکا میں ایک لاکھ سے زائد افراد کا خون بہا کر وہاں قابض ہوئے اور پھر پیش قدمی کر کے ۶ جون ۱۰۹۹ء کو القدس کے سامنے پہنچ گئے۔ بیالیس دن کے محاصرے کے بعد ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ (۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء) کو وہ بیت المقدس میں گھس گئے اور خون کی ندیاں بہا دیں۔ [2]

فرانسیسی مورخ ''میشو'' کا بیان ہے:

''صلیبیوں نے ایسے تعصب کا ثبوت دیا جس کی مثال نہیں ملتی، عربوں کو اونچے اونچے برجوں اور مکانوں کی چھتوں سے گرایا گیا، آگ میں زندہ جلایا گیا، گھروں سے نکال کر میدانوں میں جانوروں کی طرح گھسیٹا گیا، صلیبی جنگجو مسلمانوں کو مقتول مسلمانوں کی لاشوں پر لے جا کر قتل کرتے، کئی ہفتوں تک قتل عام کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ستر ہزار سے زائد مسلمان صرف مسجد اقصیٰ میں تہ تیغ کیے گئے۔''

میچاڈ لکھتا ہے:

''گلیوں اور گھروں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ شکست خوردہ مسلمانوں کے لیے یروشلم میں کوئی جگہ نہیں تھی۔''

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۹۰ھ، ۴۹۱ھ، ۴۹۲ھ

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۹۲ھ

نیز وہ کہتا ہے:

''جب عیسائی مسجد عمر رضی اللہ عنہ پر قابض ہوئے جہاں مسلمانوں نے تھوڑی دیر کے لیے پناہ لی تھی تو خونریزی اور قتل عام کا منظر دہرایا گیا۔ سوار اور پیادہ صلیبی مسجد میں گھس کر مسلمانوں میں گڈمڈ ہوگئے۔ اس ہیبت ناک ہنگامے میں گریہ وزاری اور موت کی چیخ وپکار کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ فاتحین بھاگنے کی کوشش کرنے والوں کا تعاقب کرکے لاشوں کے ڈھیروں کو پامال کررہے تھے۔ ریمنڈ ڈی اگلیس کا چشم دید بیان ہے کہ مسجد کے اندر اور صحن میں مقتولین کا بہتا ہوا خون ہمارے گھوڑوں کی لگاموں تک پہنچ گیا تھا۔''[1]

فرانسیسی مؤرخ لیبان کا بیان ہے:

''ہمارے لوگ بچوں کے ٹکڑے کررہے تھے، جوانوں اور بوڑھوں کو قتل کررہے تھے۔ کسی جاندار کو زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ جلد فارغ ہونے کے لیے ایک ہی رسّی میں کئی کئی افراد کو لٹکا رہے تھے۔''

''شہر کے راستوں میں خون کے دریا بہہ رہے تھے اور چاروں طرف لاشیں پھیلی ہوئی تھیں۔''

''یروشلم کے راستوں اور ہر جگہ پر سروں اور ہاتھ پیروں کے انبار تھے۔ مگر جو کچھ وقوع پذیر ہوا اس کے مقابلے میں یہ (میرا یہ بیان) بہت کم ہے۔ ہیکل سلیمانی میں اس قدر خون بہا کہ اس میں لاشیں تیرتی پھرتی تھیں۔''

عیسائی کمانڈروں نے فتح کے بعد پوپ کو خوشخبری کا پیغام بھجوایا اور اس میں لکھا:

''اگر آپ دشمنوں کے ساتھ ہمارا سلوک معلوم کرنا چاہیں تو مختصراً اتنا لکھنا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی ہیکلِ سلیمانی (مسجد عمر رضی اللہ عنہ) میں داخل ہوئے تو ان کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔''[2]

مگر یہ قتل عام بھی صلیبیوں کے غیظ وغضب کو سرد نہ کرسکا۔ تیسرے دن صلیبی قائدین نے ایک مجلس مشاورت منعقد کرکے فیصلہ کیا کہ یروشلم کے تمام باقی ماندہ مسلمانوں اور یہودیوں کو بھی قتل کردیا جائے، چنانچہ مزید ایک ہفتے تک مقامی باشندوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ایک چشم دید شاہد البرٹ ڈی ایکس کے بیان کے مطابق نہ صرف محلّوں، مسجدوں اور گلیوں میں لاشیں بکھری ہوئی تھیں بلکہ ویران مقامات پر بھی ان کے انبار لگ رہے تھے۔[3]

مسجدِ اقصیٰ کے چھن جانے پر مسلمانوں کا غم وغصہ:

ستر ہزار سے زائد مسلمانوں کی مظلومانہ شہادت اور قبلہ اول پر کفار کے قبضے سے عالم اسلام میں صف ماتم بچھ گئی، شعراء نے اشک انگیز مرثیے کہے۔ دمشق کے قاضی نے خلیفۂ بغداد کے دربار میں اپنی ڈاڑھی نوچ ڈالی اور تمام حاضرینِ دربار زاروقطار روئے۔ مگر یہ نالہ وشیون بے فائدہ تھا۔ اس حادثے نے مسلم حکمرانوں کو وقتی طور پر جھنجھوڑا تو سہی مگر وہ وقتی جوش وخروش کے بعد پھر ٹھنڈے پڑ گئے اور عملی طور پر کچھ کرنے سے گریزاں رہے۔ خلافتِ بغداد

---

① تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی بحوالہ تاریخ یورپ، اے جے گرانٹ، ص، ۲۵۷

② بحوالہ بالا

③ بحوالہ بالا

نے سلطان برکیارق اور دوسرے سلجوقی شہزادوں کو متحد ہو کر القدس کی بازیابی کے لیے افواج تیار کرنے کی تاکید کی مگر یہ حکمران باہمی مناقشوں میں الجھے رہے اور اس قومی فریضے پر توجہ دینے سے قاصر رہے۔

عبیدی حکمران نے اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے افضل بن بدر جمالی کو ایک فوج دے کر القدس کی طرف بھیجا مگر یہ ناتجربہ کار فوج راستے ہی میں صلیبیوں سے بری طرح شکست کھا کر پسپا ہوگئی۔[1]

شام کی عیسائی نوآبادیات

بیت المقدس کے سقوط کے بعد مسیحی اقوام نے مقبوضہ شام و فلسطین کو تقسیم کر کے القدس، الرُّحا، طرابلس، انطاکیہ، اور یافا کی پانچ مستقل صلیبی ریاستیں قائم کرلیں۔ یہ ریاستیں اگلے چند عشروں میں مزید پھیلتی گئیں۔ شام کی تقریباً تمام اہم بندرگاہیں جو بحیرۂ روم کے ساتھ لگتی تھیں، یورپ کے ہاتھ آگئیں۔ غزہ سے لے کر انطاکیہ کے شمال تک تمام ساحل ان کے پاس چلے گئے۔ مختلف یورپی بادشاہوں کے نائبین اپنے مفتوحہ علاقوں کے خود مختار حاکم تھے۔

صلیبی ریاستوں کے حکام القدس کے فرمانروا کو اپنا قائد تسلیم کرتے تھے اور یورپ سے تازہ بتازہ کمک کے ذریعے آئے دن کسی نہ کسی سرحدی قلعے پر حملے کرتے رہتے تھے۔ لین پول اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

"صلیبی اسلامی علاقوں میں اس طرح گھس گئے تھے جیسے لکڑی میں پچّڑ ٹھونک دی جائے۔ کچھ عرصے تک یوں لگتا تھا کہ یہ پچّڑ اسلامی سلطنت کے درخت کے پرخچے اڑا دے گی۔"[2]

یروشلم کے عیسائی نواب:

القدس پر قبضے کے بعد نصرانیوں نے اسے سلطنتِ یروشلم کا نام دے دیا۔ نواب گاڈفرے ڈی بوئیلن جو بالڈون اوّل کے لقب سے مشہور ہوا، اس سلطنت کا پہلا تاجدار تھا۔ اس نے ارسوف پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ ساحل کے دیگر شہر: عکا، قیساریہ اور عسقلان کے حکام اسے خراج دیا کرتے تھے۔ بالڈون اوّل کو زیادہ مدت حکومت کا موقع نہ ملا اور شعبان ۴۹۳ھ (جولائی ۱۱۰۰ء) میں وہ فوت ہوگیا۔

اس کی جگہ اس کا چھوٹا بھائی جو اڈیسا کا حاکم تھا، تخت نشین ہوا۔ اس نے ۴۹۷ھ میں عکا کو فتح کر کے مسلمانوں کو بڑی اذیتیں پہنچائیں۔ ۵۱۲ھ (۱۱۱۸ء) میں مصر پر حملہ کر کے واپس آتے ہوئے وہ بیمار پڑ کر مر گیا۔

اس کے بعد اس کا چچیرا بھائی بالڈون ڈی بورگ بالڈون دوئم کے لقب سے یروشلم کا تاجدار بنا۔ اس نے شام کے مسلمانوں پر بے پناہ ستم ڈھائے۔ اس نے مسلمانوں کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر سلطنتِ یروشلم کو مزید وسیع اور مستحکم کرلیا۔ صور جیسے مضبوط اسلامی مرکز پر بھی اسی نے قبضہ کیا۔ اس کے دور میں ٹمپلرز اور ہاسپٹلرز کے عیسائی فرقوں کو عروج

---

[1] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۹۲ھ تا ۴۹۵ھ [2] صلاح الدین، لین پول، ص ۲۳

پچّڑ: (پچ چَر) میخ، کھونٹی، لکڑی کا چھوٹا ٹکڑا جو لکڑی چیرتے وقت درز کھلی رکھنے کے لیے لگایا جائے۔ (فیروز اللغات جامع، ص ۲۸۱)

ملا اور ان کی طاقت نے مسلمان حکام کو عاجز کر دیا۔ بالڈون دوئم رمضان ۵۲۵ھ (اگست ۱۱۳۱ء) میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا داماد فلپ کاؤنٹ آف انجو بادشاہ بنا۔ ربیع الآخر ۵۳۸ھ (نومبر ۱۱۴۳ء) میں اس کا انتقال ہوا۔

فلپ کے بعد اس کا بڑا بیٹا بالڈون صرف تیرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اسے بالڈون ثالث کا لقب ملا۔ اسی کے دور میں دوسری صلیبی جنگ چھڑی۔ بالڈون ثالث نے اس وقت غیر ملکی بادشاہوں اور افواج کی میزبانی کی اور انہیں لے کر دمشق پر چڑھائی کی جو ناکام رہی۔ ۵۴۸ھ (۱۱۵۳ء) میں اس نے عسقلان پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ذوالقعدہ ۵۵۶ھ (نومبر ۱۱۶۱ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد اس کا بھائی ایملرک تخت نشین ہوا، جسے عرب مؤرخین "مری" یا "اماری" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ بھی مصر اور شام پر مسلسل حملے کرتا رہا۔ ذوالحجہ ۵۶۹ھ (جولائی ۱۱۷۴ء) میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

ایملرک کے بعد اس کا تیرہ سالہ لڑکا بالڈون چہارم کے لقب سے تخت نشین ہوا، یہ جذام کا مریض تھا، اس لیے عرب اسے "الملک المجذوم" کہا کرتے تھے۔ وہ بڑا جنگجو انسان تھا۔ عمر بھر مسلم حکمرانوں سے برسرِ پیکار رہا۔ چونکہ وہ لاولد تھا اس لیے ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں اپنے آٹھ سالہ بھانجے بالڈون پنجم کو وارث نامزد کر کے فوت ہو گیا۔

امراء نے بالڈون پنجم کی کم عمری کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک تجربہ کار رئیس ریمنڈ کو اس کا سرپرست قرار دیا جو طرابلس اور گیلیلی (طبریہ) کا حاکم تھا۔[1] کم سن بالڈون پنجم کچھ دن حکومت کر کے اچانک مر گیا اور اس کی جگہ اس کے سوتیلے باپ گائی کو جو یروشلم کا ناظم الامور تھا، بادشاہت مل گئی۔[2]

نصرانی ریاستوں اور حکمرانوں کا یہ مختصر [illegible] اسی لیے لکھا گیا ہے تاکہ آگے کے سیاسی منظرنامے کو سمجھنے میں کوئی دِقت نہ ہو کیوں کہ یہ تمام حکمران عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی سے نبرد آزما رہے۔ اب ہم دوبارہ عالم اسلام کا جائزہ لیتے ہوئے دولتِ اتابکیہ کے حالات اور کارناموں پر ایک نظر ڈالیں گے جو صلیبی طوفان کے سامنے پہلا دفاعی حصار بن کر ابھری۔

دولتِ اتابکیہ

بیت المقدس پر نصرانیوں کے قبضے کے بعد فقط دمشق کا حاکم طغ تکین ان سے نبرد آزما رہا جبکہ سلجوقی حکمران سلطان مسعود اور سلطان محمود نہ ختم ہونے والی خانہ جنگیوں میں مشغول رہے۔ ۵۲۵ھ (۱۱۳۱ء) میں سلطان محمود دنیا سے رخصت ہوا تو سلطان مسعود اپنے چچا سلطان سنجر سلجوق کے مقابل آ گیا۔ خلیفہ مسترشد باللہ بھی اس کش مکش کا فریق رہا۔ چالیس سال تک عالم اسلام پر سکتے کی کیفیت طاری رہی۔ پھر اچانک عماد الدین زنگی کی شکل میں ایک رہنما ابھرا

---

① عرب ریمنڈ کو قومص ابن قومص کہا کرتے تھے۔ قومص یا ریمنڈ نام نہیں بلکہ لقب تھا جو اس علاقے کے حکمران کے لیے مخصوص تھا جہاں ریمنڈ کی حکومت تھی۔

② انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا: ۶۲۳/۷، سلطنت یروشلم

جس نے مسلمانوں کی قوتِ مدافعت کو بیدار کر کے صلیبیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور ان کے ذہن سے پوری اسلامی دنیا کو زیرِ نگین کرنے کا خیال نکال دیا۔ صلیبی قوتیں اب اپنے دفاع ہی کو غنیمت سمجھنے لگیں۔

عماد الدین زنگی:

عماد الدین زنگی کی ولادت ۴۷۸ھ میں ہوئی۔ اس کا باپ آق سنقر ملک شاہ سلجوقی کا معتمد غلام تھا۔ ملک شاہ نے اسے حلب کا حاکم بنایا تو اس کے عدل وانصاف کی ہر طرف تعریف ہوئی۔ ۴۸۸ھ (۱۰۹۵ء) میں وہ بادشاہ سے وفاداری کرتے ہوئے قتل ہو گیا۔ اس وقت اس کا بیٹا عماد الدین دس سال کا تھا۔ آق سنقر کے دوست "کربوقا" نے جو موصل کا حاکم تھا، اس یتیم بچے کی پرورش کی۔ آخر یہ بچہ کڑیل جوان بن کر موصل کی فوج میں بہادری کے جوہر دکھانے لگا۔ اس کی غیر معمولی قابلیت کی خوب شہرت ہوئی۔ کربوقا کے بعد موصل کے جتنے بھی حاکم آئے، سب نے عماد الدین زنگی کی جرأت کو سراہا۔ پھر وہ سلطان محمود سلجوقی کے دربار سے وابستہ ہو گیا جس نے اس کی اہلیت دیکھتے ہوئے ۵۱۸ھ (۱۱۲۴ء) میں اسے واسط اور بصرہ کا جاگیردار بنا دیا۔ یہاں ایک سردار کی حیثیت سے اس نے خوب شہرت حاصل کی۔

پھر سلطان نے اسے اپنے شہزادوں کا خاص استاد مقرر کر دیا جسے "اتالیق" یا "اتابک" کہا جاتا تھا، یوں عماد الدین "اتابک" کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ [1] یہ لقب ایسا چسپاں ہوا کہ اس کا پورا خاندان ہی "اتابک" کہلانے لگا۔

عماد الدین زنگی نے سلجوقی بادشاہ کی خدمات انجام دیتے ہوئے حیرتناک کارنامے انجام دیے۔ ۵۲۰ھ (۱۱۲۶ء) میں سلطان کی عباسی خلیفہ مسترشد سے چپقلش کے دوران عماد الدین زنگی نے بغداد کی افواج سے واسط کو بڑی خوبی کے ساتھ بچایا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اتنی شاندار فوج لے کر بغداد آیا کہ خلیفہ مصالحت پر آمادہ ہو گیا۔ اس واقعے نے سلطان کی نظر میں زنگی کا رتبہ بہت بڑھایا۔ سلطان نے اسے بغداد کا منتظمِ اعلیٰ بنا دیا۔ ۵۲۱ھ (۱۱۲۷ء) میں سلجوقی باشاہ کے ماتحت موصل کا حاکم امیر برسقی فوت ہوا تو سلطان محمود کو عماد الدین اس عہدے کے لیے موزوں لگا۔ چنانچہ اسے موصل اور دیگر علاقوں کا حاکم بنا دیا گیا۔ یہ موصل کی دولت اتابکیہ کا آغاز تھا۔ [2]

دولتِ زنگیہ میدانِ جہاد میں:

زنگی نے موصل کو مضبوط کر کے ان منتشر مسلم ریاستوں کا رخ کیا جن کی طاقت باہم لڑنے میں ضایع ہو رہی تھی۔ اس نے نصیبین، سنجار اور خابور پر قبضہ کر کے اپنی عملداری شامی سرحد سے ملا دی۔ ۵۲۳ھ (۱۱۲۹ء) میں وہ دریائے فرات عبور کر کے عیسائی مقبوضات کی راہ میں حائل مسلم ریاستوں کی طرف بڑھا۔ حصن بزاعہ، حماۃ، حلب اور حمص جیسے اہم شہر اس کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے گئے۔ یوں ریاستِ اتابکیہ موصل کی سرحدیں عیسائی مقبوضات سے جا ملیں۔

---

[1] "اتابک" یا "اتابیگ" ترکی لفظ ہے۔ اصل میں یہ "اطا" (والد) اور "بیگ" (سردار) کا مرکب ہے۔ طا کو تا اور گاف کو کاف سے بدل دیا گیا۔ یہ لفظ "بڑے سردار"، "نائب سلطنت" یا "کم عمر بادشاہ کے سرپرست" کے لیے مستعمل رہا ہے۔ (فیروز اللغات فارسی اردو، ص ۲۳، ۱۵۹؛ معجم متن اللغۃ: ۱/۱۳۰)

[2] وفیات الاعیان: ۲/۳۲۷، ۳۲۸، ط دار صادر

۵۲۴ھ (۱۱۳۰ء) میں اس نے فرنگیوں کے مضبوط ترین قلعے ''حصن اثارب'' پر حملہ کر دیا اور ایک خوں ریز جنگ کے بعد فرنگیوں کو شکست فاش دے کر قلعے کو منہدم کرا دیا تا کہ آئندہ نصرانیوں کو یہاں قدم جمانے کا موقع نہ ملے۔

نصرانیوں کا دوسرا اہم قلعہ حارم تھا جس کے والی نے صلح کی درخواست کی تھی۔ عماد الدین کی فوج تھک چکی تھی۔ اس لیے اس نے حارم کی سالانہ نصف آمدنی وصول کرنے کے معاہدے پر صلح قبول کر لی۔ عماد الدین کی ان فتوحات سے حلب، حماۃ اور گرد و نواح کے بہت سے شہر نصرانیوں کے مظالم سے محفوظ ہو گئے اور ان علاقوں کے عوام نے مدتوں بعد سکھ کا سانس لیا۔ عماد الدین زنگی نے اپنا نظام حکومت اس خوبی سے چلایا کہ نظام الملک طوسی کے دور کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس کے فرنگیوں کے خلاف جہادی کارنامے لوگوں میں مشہور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے برسوں بعد عالم اسلام کو جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا تھا۔ نصرانیوں کی وہ طاقت جسے مسلمانوں کے انتشار نے ناقابل شکست بنا دیا تھا، عماد الدین زنگی کے پے در پے حملوں سے اپنا سابقہ رعب و دبدبہ کھونے لگی تھی۔

عماد الدین کی ان مہمات کے بعد اس کے آقائے ولی نعمت سلطان محمود سلجوقی کا انتقال ہو گیا اور اس کے دوسرے بھائیوں میں خانہ جنگی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں عماد الدین زنگی کو بھی حصہ دار بننا پڑا۔ اور اس کے کئی سال انہی مصروفیات میں گزرے۔ سلطان محمود سلجوقی کی موت کے بعد ۵۲۶ھ (۱۱۳۲ء) میں عراق و خراسان کی سیاست پر سلطان سنجر سلجوقی پوری طرح چھا گیا۔ اس نے سلطان مسعود کو شکست دے دی اور بغداد کو تابع رکھنے کے لیے عماد الدین زنگی کو دعوت دی کہ وہ بغداد کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے وہاں پہنچے۔ چوں کہ یہ سب خلیفہ مسترشد باللہ کی مرضی کے خلاف تھا لہٰذا اس نے عماد الدین زنگی کو روکنے کی تیاری کر لی۔ ۲۷ رجب ۵۲۶ھ (۱۳ جون ۱۱۳۲ء) کو عماد الدین زنگی اور بغدادی افواج میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ عماد الدین زنگی کے ساتھ بنو اسد کے سردار دبیس بن صدقہ کے جنگجو لشکر کا اہم حصہ تھے۔ جنگ زوروں پر تھی کہ دبیس بن صدقہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس کے بعد زنگی کو بھی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ بعد میں زنگی نے خلیفہ سے صلح کر لی اور مرکز خلافت کا حسب سابق احترام کرنے لگا۔

ایک مدت تک عماد الدین کو فرنگیوں کے مقابلے کے لیے کوئی نئی مہم شروع کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ وہ کردستان میں اپنی سرحدوں کو وسیع کرتا رہا اور ۵۲۸ھ (۱۱۳۴ء) میں کردوں کے کئی قلعوں پر قابض ہو گیا۔

دمشق کا حاکم اسماعیل بن بوری شمس الملوک اپنی حکومت کی کمزوری کے باعث فرنگیوں سے خوفزدہ تھا۔ اس نے زنگی کو از خود دمشق پر قبضے کی دعوت دی۔ چنانچہ زنگی نے دمشق کا رخ کیا مگر شمس الملوک کے درباریوں نے دمشق کو زنگی کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ شمس الملوک اپنے درباریوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ نئے حاکم کے نائب معین الدین انز نے شہر کا دفاع شروع کر دیا۔ زنگی محاصرہ کیے رہا مگر پھر خلیفہ مسترشد باللہ کی جانب سے صلح کا حکم آ جانے پر اس نے یہ مہم ترک کر دی۔ [1]

---

[1] تاریخ ابن خلدون: ۲۶۳/۵ تا ۲۷۵، ط دار الفکر بیروت

فتح الفتوح:

چند سال بعد جب زنگی الجھے ہوئے اندرونی مسائل سے فارغ ہوا تو اس کے سامنے سب سے پہلا ہدف اڈیسہ کی عیسائی سلطنت تھی جو شام سے لے کر ایشیائے کوچک اور عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔ عماد الدین زنگی نے اڈیسہ کے مرکز رُہا پر حملہ کیا اور شہر کا سختی سے محاصرہ کرنے کے بعد اٹھائیسویں دن منجنیقوں کے ذریعے فصیل کو توڑ دیا۔ اسلامی فوج رہا میں داخل ہوگئی اور شدید جنگ کے بعد اس پر قابض ہوگئی۔ عماد الدین زنگی نے شہر والوں سے نہایت فیاضانہ سلوک کیا۔ یہ شاندار فتح ۶ جمادی الآخرہ ۵۳۹ھ (۲۳ دسمبر ۱۱۴۴ء) کو ہوئی تھی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر مسلم مؤرخین اسے ''فتح الفتوح'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عالم اسلام میں اس فتح پر خوشیاں منائی گئیں اور عماد الدین زنگی کا نام خلیفۂ بغداد نے خطبے میں داخل کر لیا۔ ①

رہا کے ہاتھ سے نکل جانے پر عیسائی دنیا ششدر رہ گئی تھی۔ عیسائی مورخین نے اسے شام کی صلیبی سلطنت کے زوال کا پہلا قدم قرار دیا ہے۔ مچاڈ لکھتا ہے:

> ''یروشلم اور دوسرے شہروں کے نصرانیوں نے عزاز کی فتح اور تباہی کی خبر سن کر مایوسی کے اشک بہائے۔ دریائے فرات کے کناروں سے آنے والی منحوس خبروں نے انہیں اور بھی ڈرا دیا۔ حضرت مسیح کی قبر اور پہاڑ سے ان پر بجلی بھی گری۔ ایک دم دار ستارہ نظر آیا اور شدید خوف و ہراس پھیلا۔ مشرق کے نصرانیوں نے یقین کر لیا کہ آسمان ان کا مخالف ہو گیا ہے اور ان پر ہیبت ناک مصائب آنے کو ہیں۔''

اس شکست سے مضطرب ہو کر پادریوں نے ایک نئی صلیبی جنگ برپا کرنے کے لیے جوشیلی تقریریں شروع کر دیں۔ شاہانِ یورپ نے بڑی بڑی قربانیاں دینے کے دعوے کیے مگر فوری طور پر وہ کچھ نہ کر سکے۔ ②

عماد الدین زنگی کا قتل:

اس فتح کے دو سال بعد زنگی جعبر کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ اچانک چند غلاموں نے اس کے خیمے میں داخل ہو کر اسے شہید کر دیا۔ یہ ۵ ربیع الآخر ۵۴۱ھ (۱۴ ستمبر ۱۱۴۶ء) کی شام کا واقعہ ہے۔ اس سازش کی قلعی کبھی نہ کھل سکی۔

مچاڈ لکھتا ہے:

> ''اس کی موت کی خبر سے نصرانیوں نے اپنی شکستوں کا غم دور کیا اور اس قدر خوشی کا اظہار کیا گویا مسلمانوں کی ساری طاقت یک بارگی زمین بوس ہوگئی ہے۔'' ③

اس کی وفات کے بعد کسی اللہ والے نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا: ''کیا گزری؟''

زنگی نے جواب دیا: ''اللہ نے رُہا کی فتح کے بدلے مجھے بخش دیا۔'' ④

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۳۹ھ
② حیاتِ صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد، ص ۳۶
③ حیاتِ صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد: ص: ۵۵، بحوالہ مچاڈ
④ الکامل فی التاریخ، سنۃ: ۵۴۱ھ

عماد الدین زنگی کی سیرت ایک نگاہ میں:

عماد الدین زنگی بڑا بہادر، شریف اور جنگجو انسان تھا۔ اس کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن ایک سپاہی اپنی ذمہ داری سے غافل ہو کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو زنگی کو سر پر کھڑے پایا۔ جونہی اس کی نگاہیں اس شیرِ نر سے چار ہوئیں، خوف کے مارے وہیں دم توڑ دیا۔ زنگی نہ صرف اپنی اولاد کے لیے ایک وسیع ملک چھوڑ گیا بلکہ مسلمانوں کے لیے القدس کی آزادی کی راہ بھی ہموار کر دی۔ ①

علامہ ابن اثیر الجزری جو خود موصل کے رہنے والے تھے، فرماتے ہیں:

''وہ خوبصورت، گندمی رنگت اور پُرکشش آنکھوں والا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی۔ اس کی تدفین رقہ میں ہوئی۔ اپنی فوج اور رعایا پر اس کی سخت ہیبت قائم تھی۔ وہ ایک عظیم سیاست دان تھا۔ اس کے ہاں کوئی طاقتور کسی کمزور پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے شہر حکام کے ظلم، ان کی بار بار تبدیلیوں اور فرنگیوں کی قربت کی وجہ سے اجڑے ہوئے تھے۔ اس نے ان شہروں کو تعمیر کر کے انہیں لوگوں سے بھر دیا۔ میرے والد بتاتے ہیں کہ پہلے موصل کا اکثر حصہ ویران تھا۔ آدمی کوچۂ طبابین کے پاس کھڑا ہوتا تو قدیم جامع مسجد، اس کا میدان اور شاہی قلعہ صاف دکھائی دیتے تھے۔ درمیان میں کوئی عمارت نہ تھی۔ کسی شخص کو جامع مسجد تک جانا ہوتا تو وہ کسی محافظ کو ساتھ لے کر جاتا تھا کیوں کہ جامع مسجد آبادی سے دور تھی۔ مگر اب یہی جامع مسجد آبادی کے وسط میں ہے۔''

علامہ ابن اثیر مزید تحریر فرماتے ہیں:

''وہ عورتوں کے معاملے میں نہایت غیور تھا اور اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ دلیر تھا۔ اس کے شہر دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے، ہر ایک نے اسے ہدف بنایا ہوا تھا اور اس کے علاقے غصب کرنا چاہتا تھا مگر زنگی فقط اپنے علاقوں کے دفاع پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ ہر سال دشمن کے شہر فتح کرتا رہتا تھا۔'' ②

عماد الدین زنگی کے جانشین:

عماد الدین زنگی کی موت کے بعد اس کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی: حلب سمیت شام کے صوبے اس کے چھوٹے بیٹے نور الدین محمود زنگی کے پاس آ گئے جبکہ موصل میں اس کا بڑا بیٹا سیف الدین غازی مستقل حکومت کا دعوے دار بن گیا۔ دو عشروں بعد موصل کے قریب واقع ''سنجار'' بھی اتابکوں کی ایک الگ خود مختار ریاست بن گئی۔ ③

❁❁❁

① البدایة والنهایة: سنة ۵۴۱ھ

② الکامل فی التاریخ: ۹/ ۱۴۲، ۱۴۳، ط دار الکتاب العربی بیروت

③ تاریخ ابن خلدون: ۵/ ۲۷۹ تا ۲۸۲، ط دار الفکر

نورالدین زنگی

عمادالدین زنگی کے جانشینوں میں نورالدین محمود زنگی اپنی ذہانت، شجاعت اور دینداری کے باعث ممتاز تھا۔
نورالدین ۵۴۱ھ میں اپنی تخت نشینی سے لے کر اپنی موت تک مسلسل نصرانیوں سے معرکوں میں مشغول رہا۔ ①

رُہا کے سابق حاکم کاؤنٹ جوسلین دوئم نے عمادالدین زنگی کی موت کے بعد موقع پا کر جمادی الاولی ۵۴۱ھ (نومبر ۱۱۴۶ء) میں دوبارہ رُہا پر قبضہ کر لیا تھا۔ نورالدین نے یہ اطلاع پاتے ہی حلب سے رُہا کی طرف پیش قدمی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ نصرانیوں نے جان بچانے کے لیے شہر کے دروازے کھول دیے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے مگر نورالدین کے لشکر نے بھی انہیں گھیر گھیر کر مارا، تاہم کاؤنٹ جوسلین جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

رُہا کی فتح کی خوشی اس وقت دوبالا ہو گئی جب نورالدین کے بھائی سیف الدین غازی نے شام آ کر اس سے ملاقات کی اور اسے گلے لگا کر نصرانیوں کے خلاف متحد رہنے کا اعلان کیا۔ ②

دوسری صلیبی جنگ: ۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء)

شام کے عیسائی پادریوں نے یورپ پہنچ کر پوپ کو مسلمانوں کی ان فتوحات کی داستان سنائی تو یورپ میں ایک آگ سی لگ گئی۔ مجاڈ لکھتا ہے:

> "نصرانیوں کی سفارت کا بیان سن کر پوپ کے آنسو نکل آئے۔ رُہا کی مصیبتوں اور یروشلم پر آنے والے خطرات کے احساس نے سب میں رنج اور ڈر پیدا کر دیا۔ تمام یورپ میں خوف و دہشت کی پکار مچ گئی۔"

ایک پادری سینٹ برنارڈ نے عوام کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۵۴۱ھ (۱۱۴۶ء) میں فرانس کے شہر ویلزلی کے مقام پر منعقدہ کانفرنس میں سینٹ برنارڈ کی جوشیلی تقریر نے ایک کہرام مچا دیا۔ شاہ فرانس لوئی ہفتم اور جرمنی کے بادشاہ کونراڈ ثالث نے سینٹ کے ہاتھ سے صلیبیں لے کر افواج کو تیار کیا اور ان گنت لوگ صلیبی جنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مجاڈ لکھتا ہے:

> "دیہات ویران اور قلعے خالی ہو گئے۔ سوائے یتیموں اور بیواؤں کے کوئی باقی نہ رہا۔" ③

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲۷۹/۵، ط دار الفکر
② مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب لابن واصل: ۱۱۱/۱، ط الامیریۃ قاہرۃ
③ حیاتِ صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد، ص ۷۸

دمشق کا محاصرہ:

۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء) میں چار لاکھ فرانسیسی سپاہی شاہ فرانس لوئی ہفتم کی قیادت میں یورپ سے ایشیائے کوچک پہنچے اور شام کی طرف بڑھنے لگے۔ ادھر شاہِ جرمنی کونراڈ ثالث قسطنطنیہ سے بحری راستہ اختیار کر کے شام کے ساحلی شہر عکہ پہنچ گیا۔ یہ دونوں بادشاہ یروشلم میں آ کر اکٹھے ہوئے۔ اب جنگ کی منصوبہ بندی شروع ہوئی۔ شاہانِ یورپ نے شاہِ یروشلم بالڈون ثانی کے ساتھ مشورہ کر کے سب سے پہلے دمشق کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔

دمشق کے امراء کا نصرانیوں سے صلح کا معاہدہ تھا مگر صلیبی لشکر نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ شہر کی فصیل جو مٹی کی تھی گزشتہ صلیبی حملوں سے خاصی شکستہ ہو رہی تھی۔ تاہم شہر کے باغوں کی گنجانی نے اسے ایک طرف سے محفوظ بنا رکھا تھا۔ اس نازک موقع پر امرائے دمشق نے بڑے تدبّر کا مظاہرہ کیا۔ دمشق کے نائب حاکم معین الدین انز نے اپنے شہر کی مدافعت کے لیے سیف الدین غازی کو مدد کے لیے بلا لیا، سیف الدین غازی حلب سے نور الدین زنگی کو ساتھ لیتا ہوا حمص پہنچا اور صلیبی افواج سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

صلیبی حکمران مسلمانوں کے اس اتحاد، زبردست مزاحمت اور حاکمِ دمشق کی سیاسی چالوں سے کچھ ایسا سٹپٹائے کہ ایک مدت کے محاصرے اور جھڑپوں کے بعد ناکام واپس لوٹ گئے۔ ①

صلیبی جنگجوؤں کی واپسی کے بعد بھی نور الدین زنگی کی یلغار رکنے میں نہ آئی۔ محرم ۵۴۵ھ (مئی ۱۱۵۰ء) میں سلطان نے حلب کے شمال میں کاؤنٹ جوسلین کے اہم قلعے عزاز کو بھی فتح کر لیا۔ اس مہم میں جوسلین خود بھی گرفتار ہوا اور نو سال قید رہنے کے بعد جیل ہی میں راہیٔ عدم ہوا۔ ②

دمشق پر نور الدین کا قبضہ:

موصل میں نور الدین زنگی کا بھائی سیف الدین غازی جمادی الآخرہ ۵۴۴ھ (اکتوبر ۱۱۴۹ء) میں وفات پا گیا تھا اور اس کی جگہ قطب الدین مودود برسرِ اقتدار تھا۔ نور الدین اور مودود میں کچھ دنوں تک سیاسی چپقلش چلی تھی مگر اب دونوں کے تعلقات بہتر ہو گئے تھے۔ لہٰذا نور الدین کو دمشق پر قبضے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔

دمشق کی حکومت ان دنوں اتنی کمزور تھی کہ عیسائی کسی بھی وقت شہر پر حملہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ ضابطے کے طور پر دمشق کے حاکم نے اپنے بچاؤ کے لیے فرنگیوں سے صلح کر رکھی تھی مگر اس کے باوجود آس پاس کے علاقوں پر ان کی لوٹ مار کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ حالات دیکھ کر صفر ۵۴۹ھ (اپریل ۱۱۵۴ء) میں نور الدین زنگی نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ حاکمِ دمشق مجیر الدین میں مزاحمت کی طاقت نہیں رہی تھی اس کا نائب معین انز جو نہایت ہوشیاری سے نظامِ حکومت چلا تا رہا تھا، پانچ سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اس لیے دمشق پر نور الدین زنگی کا آسانی سے قبضہ ہو گیا۔ ③

---

① کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین لابی شامۃ المقدسی (م ۶۶۵ھ): سنۃ ۵۴۲ھ، ط الرسالۃ

② کتاب الروضتین: سنۃ ۵۴۵ھ؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۴۴ھ، ۵۴۵ھ ③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۴۴ھ، ۵۴۹ھ

نورالدین زنگی اور مصر کی عبیدی حکومت:

مصر اس وقت بنوعبید کے قبضے میں تھا۔ یہ خاندان اڑھائی سو سال سے وہاں حکومت کر رہا تھا۔ اس کے بانی عبیداللہ نے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں شمالی افریقہ کے بہت بڑے علاقے میں اپنے ہم نواؤں کا جال پھیلا دیا تھا، اس کی دعوت نے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ اس نے مہدی ہونے کا دعویٰ کر کے ۲۹۷ھ (۹۱۰ء) میں فاطمی خلافت کے نام سے ایک نئی خلافت کی بنیاد ڈالی جو اہل سنت والجماعت کے عقائد سے متصادم عقائد کی حامل ہونے کے علاوہ مسلمانوں کی متفقہ خلافت عباسیہ کے متوازی بلکہ اس کی ضد تھی۔ بنوعبید نے ابتداء ہی میں جبر وتشدد کے ذریعے اپنے ہر مخالف کو بری طرح کچل دیا، بے شمار سنی فقہاء اور علماء کو قتل کرایا اور عوام کے جذبہ مقاومت کو بالکل دبا دیا۔ دو صدیوں تک ان کا رعب و دبدبہ لوگوں پر چھایا رہا۔ پھر راحت و آسائش، بے پناہ ثروت اور فارغ البالی نے رفتہ رفتہ بنوعبید کو سست اور آرام پسند بنا دیا اور آخر کار عبیدی خلفاء تمام کاروبار حکومت وزراء کے کاندھوں پر ڈال کر خود محض عیش وعشرت کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ وزراء کی من مانیوں نے کچھ ہی عرصہ میں حکومت کو کمزور تر کر دیا۔[1]

پانچویں صدی ہجری کے وسط کے اس نازک زمانے میں ہم چار طاقتوں کو مشرق وسطیٰ کے سنگم پر آمنے سامنے دیکھتے ہیں: ایک طرف ساحل شام اور القدس پر قابض عیسائی تھے، دوسری طرف قُسطَنطِینِیَّہ کا قیصر، تیسری جانب شام کا جواں حوصلہ حکمران نورالدین زنگی تھا۔ چوتھی طاقت مصر کی تھی جو اس وقت ان دونوں کی بہ نسبت عسکری لحاظ سے کمزور تر اور مالی اعتبار سے بالاتر تھی۔

نورالدین زنگی کے سامنے پہلا ہدف ساحلِ شام اور بیت المقدس کو نصرانیوں سے پاک کرنا تھا۔ اس لیے وہ قیصر روم سے الجھنا فی الحال خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس مردِ مجاہد نے قیصرِ روم کے حملوں کی روک تھام کے لیے ایک عجیب سیاسی حکمتِ عملی اختیار کی۔ قُسطَنطِینِیَّہ سے شام کی سرحدوں کی طرف آنے والا ہر راستہ ارمنوں کی نصرانی ریاست سے ہو کر آتا تھا۔ نورالدین نے ارمنی حکمران کو اپنا باج گزار بنا کر نصرانی اکثریت کے یہ علاقے اسے بخش دیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ قیصر کو اب شام پر چڑھائی کے لیے ارمنوں سے لڑنا ناگزیر ہو گیا۔ جب دربارِ حلب کی اس پالیسی پر اعتراض کیا گیا تو زنگی نے جواب دیا: ''میں اسے اسی کی قوم کے خلاف استعمال کر رہا ہوں تاکہ اپنی فوج کو فارغ رکھ کر دوسرے محاذوں پر کام میں لاؤں اور اپنے علاقوں کو رومیوں کے حملوں سے بچاؤں۔''

یہ پالیسی نہایت کامیاب رہی۔ ۵۶۸ھ (۱۱۷۳ء) میں قیصر نے شام پر حملے کے لیے یلغار کی تو سب سے پہلے ارمنی حکمران ملیح بن لاؤن ہی نے اس کا سامنا کیا۔ اس کے ساتھ نورالدین زنگی کے سپاہی بھی تھے۔ اس مشترکہ فوج نے قیصر کو بری طرح شکست دے کر مار بھگایا۔ اس کے بعد قیصرِ روم کو عالم اسلام کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔[2]

---

(1) بنوعبید کی حکومت کے مفصل حالات مکمل حوالوں کے ساتھ ''تاریخ اُمت مسلمہ حصہ سوئم'' میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔
(2) الکامل فی التاریخ: سنة ۵۶۸ھ

قیصر کے حملوں کی روک تھام کا یہ مستقل انتظام کرنے کے بعد نورالدین کی اصل نگاہ شام کے فرنگیوں پر تھی اور ان دونوں متحارب طاقتوں کی ہار یا جیت کا دارومدار مصر پر تھا۔ نورالدین زنگی اور شام کے نصرانی دونوں یہ جانتے تھے۔ جس نے مصر پر پہلے قبضہ کر لیا وہی پورے شام کا مالک ہوگا۔ اُدھر خود مصر کے عبیدی حکمران جو کہ اس وقت اپنے وزراء کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے تھے، کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اس لیے وہ نت نئی چالوں سے کبھی فرنگیوں اور کبھی نورالدین زنگی کو فریب دیتے رہے۔

ان دنوں مصر کا خلیفہ عاضد نامی ایک نوجوان تھا جبکہ شاور سعدی نامی ایک ہوشیار عرب امیر سارے نظام حکومت پر حاوی تھا۔ ۵۵۸ھ (۱۱۶۳ء) میں اس کی وزیر سلطنت زریک بن طلائع سے چپقلش شروع ہوئی جس کا انجام یہ ہوا کہ شاور نے وزیر کو قتل کر کے خود مصر کا قلمدانِ وزارت سنبھال لیا۔ اس صورتحال سے شاور کے سیاسی مخالفین انگاروں پر لوٹنے لگے۔ انہوں نے ''برقیہ'' کے نام سے ایک مسلح گروہ بنایا جس کا لیڈر ضرغام نامی ایک سالار تھا۔ ضرغام نے چند ماہ بعد دارالوزارت پر بزورِ شمشیر قبضہ کر کے شاور کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ضرغام دولت بنو عبید سے اتنا متنفر تھا کہ اس نے امراء اور عمائد کو چن چن کر قتل کر دیا۔ اب وہ کہنے کو مصر کا وزیر اور در حقیقت اس ملک کا مطلق العنان حکمران تھا۔

شاور اپنی جان بچا کر مصر سے بھاگا تو اسے نورالدین زنگی کے سوا کہیں جائے پناہ دکھائی نہ دی۔ اس نے نورالدین زنگی سے درخواست کی کہ اسے مصر کی وزارت واپس دلوائی جائے۔ وہ اس مہم کے سارے اخراجات برداشت کرے گا اور ہر سال مصر کی تہائی آمدنی دربارِ زنگی میں پیش کرتا رہے گا۔ اُدھر نورالدین کو معلوم ہوا تھا کہ مصر کے نئے آمر ضرغام نے القدس کے نئے بادشاہ کو بھاری خراج ادا کرنے کے وعدے پر اس سے دفاعی معاہدہ کر لیا ہے۔

نورالدین کے لیے مصر اور عیسائی حکمرانوں کا اتحاد کسی طرح بھی قابلِ برداشت نہ تھا کیوں کہ یہ اتحاد در حقیقت مملکتِ شام کے خلاف تشکیل دیا گیا تھا۔ چنانچہ زنگی نے شاور کی پیش کش قبول کر لی اور اپنے معتمد جرنیل اسدالدین شیرکوہ کو تیر کمانوں کا ایک لشکر دے کر مصر روانہ کر دیا۔[1]

شیرکوہ کی مصر میں پہلی مہم:

جمادی الاولی ۵۵۹ھ (اپریل ۱۱۶۴ء) میں اسدالدین شیرکوہ مصر کی طرف روانہ ہوا۔ پہلے وہ بلبیس پہنچا جہاں ضرغام کے بھائی ناصرالدین نے اس سے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر قاہرہ کی طرف بھاگا۔ جمادی الآخرہ کی آخری تاریخوں میں اسدالدین شیرکوہ قاہرہ کی فصیلوں کے سامنے تھا۔ ضرغام مجبور ہو کر مقابلے کے لیے نکلا اور ایک معمولی مقابلے کے بعد قتل ہو گیا۔ شیرکوہ نے یکم رجب کو شاور کو دوبارہ مصر کا وزیر سلطنت بنا دیا۔ شیرکوہ چند دن قاہرہ سے باہر پڑاؤ ڈالے رہا تاکہ شاور حکومت شام کو تہائی آمدنی کا خراج دینے کا وعدہ پورا کرے مگر شاور نے اس احسان کے بدلے یروشلم کے بادشاہ اَمَلرک کو اسدالدین شیرکوہ کے خلاف لشکر کشی کے لیے مصر بلوا لیا۔

---

[1] الكامل في التاريخ: ۹ / ۳۰۵، ط دار الكتاب العربي بيروت

املرک ایک بڑا لشکر لے کر مصر کی طرف روانہ ہوگیا۔ شیر کوہ کو نصرانیوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ قاہرہ کے نواح سے کوچ کرکے "بلبیس" کے قلعے میں مورچہ بند ہوگیا اور املرک نے اس قلعے کو گھیر لیا۔

نورالدین زنگی کو یہ اطلاع ملی تو اس نے فرنگیوں کو مصر سے واپسی پر مجبور کرنے کے لیے شام میں ان کے سب سے مستحکم قلعے حارم کا محاصرہ کرلیا۔ تین مہینے کی زبردست جنگ کے بعد آخر رمضان ۵۵۹ھ (اگست ۱۱۶۴ء) میں حارم فتح ہوگیا۔ اس معرکے میں دس ہزار عیسائی قتل اور سینکڑوں نائٹ گرفتار ہوئے۔ یہ نصرانیوں کی بہت بڑی شکست تھی۔ نورالدین زنگی نے اس کے فوراً بعد بانیاس کا محاصرہ کرلیا۔[1]

ان خبروں نے بلبیس میں شیر کوہ کا محاصرہ کرنے والے نصرانیوں کی ہمت توڑ دی اور انہوں نے شیر کوہ سے صلح کرکے طے کیا کہ مصر کو مصریوں کے لیے چھوڑ دیا جائے، نہ اس پر عیسائی قبضہ کریں نہ اہلِ شام۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ جائیں۔ شیر کوہ نے پیش کش قبول کرکے قلعہ خالی کردیا۔ انخلاء کے وقت ایک یورپی افسر نے اس سے پوچھا: "آپ کو خوف محسوس نہیں ہوتا کہ نصرانی آپ سے عہد شکنی کریں اور آپ پر ٹوٹ پڑیں۔"

شیر کوہ نے بے باکی کے ساتھ کہا: "کاش کہ وہ ایسا کر گزرتے، ان کی طرف سے وعدہ خلافی کی ابتدا ہوتی...... پھر میں ان کا وہ حشر کرتا جو دنیا دیکھتی۔ اللہ کی قسم! میں تلوار لے کر پل پڑتا، ہمارا کوئی آدمی ان کے کئی کئی آدمیوں کو قتل کیے بغیر نہ مرتا۔ اللہ کی قسم! میرے یہ سپاہی مجھے منع کرتے رہے ورنہ میں تو پہلے ہی دن تم سب سے نمٹ لیتا۔"

یورپی افسر گھبرا کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگا اور پھر بولا: "میں شام کے نصرانیوں کو آپ کے بارے میں حیرت انگیز باتیں کرتا اور انہیں آپ سے ڈرتا دیکھ کر تشویش میں پڑ گیا تھا کہ کہیں یہ مبالغہ نہ ہو۔ مگر اب میں جان گیا ہوں کہ وہ درست کہتے ہیں۔"

شیر کوہ صحیح سلامت شام پہنچ گیا۔ اس دوران سلطان نورالدین نے نصرانیوں کے قلعے بانیاس پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔[2]

مصر کی دوسری مہم:

مصر سے لوٹنے کے بعد شیر کوہ سلطان نورالدین زنگی سے بار بار درخواست کرتا رہا کہ مصری وزیر شاور کو بدعہدی اور نصرانیوں سے دوستی کی سزا دینے کے لیے وہاں فوج کشی کی جائے۔ آخر وہ سلطان کو منانے میں کامیاب ہوگیا۔

ربیع الآخر ۵۶۲ھ (فروری ۱۱۶۷ء) میں شیر کوہ دو ہزار شہ سواروں کی فوج لے کر مصر روانہ ہوا۔ اس دوران شاور فرنگیوں سے مدد طلب کرچکا تھا، چنانچہ شاہ یروشلم املرک اپنی فوج لے کر دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر آ پہنچا۔ بنوعبید کی فوجیں بھی اس سے آن ملیں۔ ۲۶ جمادی الآخرہ ۵۶۲ء (۱۸ اپریل ۱۱۶۷ء) کو دونوں فوجوں کا ایک کھلے میدان میں ٹکراؤ ہوا۔ شیر کوہ نے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ دو ملکوں کی مشترکہ فوجوں کو ایسی شکست فاش دی کہ رزمگاہ

---

[1] تاریخ ابن خلدون: ۲۸۹/۵، ط دار الفکر

[2] الکامل فی التاریخ، سنة ۵۵۹ھ، کتاب الروضتین: سنة ۵۵۹ھ

میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔اس جنگ میں شیر کوہ کے بھتیجے صلاح الدین یوسف کی لیاقت اور بیدار مغزی کا بھی بڑا حصہ تھا جو شامی فوج کا نائب سالار تھا۔

شیر کوہ نے اس کے بعد اسکندریہ پر قبضہ کیا جہاں لوگ مصری حکومت کی زیادتیوں سے نالاں اور فرنگیوں کے ان بحری بیڑوں سے خوفزدہ تھے جو کسی بھی وقت اسکندریہ کے ساحلوں پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔شیر کوہ اسکندریہ میں صلاح الدین کو نائب مقرر کر کے خود بالائی مصر چلا گیا۔اس کی غیر موجودگی میں مصری اور عیسائی فوجوں نے از سرِ نو تیاری کر کے اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا۔لیکن صلاح الدین نے بڑی پامردی سے شہر کا دفاع کیا اور اڑھائی ماہ گزر جانے کے باوجود ہتھیار نہ ڈالے۔آخر شیر کوہ صلاح الدین کی مدد کے لیے پہنچ گیا جس سے ایلمر ک اور اس کے مصری اتحادی مرعوب ہو گئے اور انہوں نے صلح کر لی۔صلح نامے کے مطابق ایلمر ک نے شیر کوہ کو پچاس ہزار دینار ادا کیے۔

اس کے بعد فرنگی اور شامی افواج مصر اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلی گئیں مگر فرنگیوں نے بہت جلد معاہدے کی خلاف ورزی کی اور مصر میں اپنے افسران بھیج کر بنو عبید کو باج گزار بنا لیا۔اب گنتی کے چند عیسائی افسران اور سپاہی پورے مصر کو لاٹھی سے ہانک رہے تھے۔ان کے مظالم کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ [1]

مصر کی تیسری مہم:

مصریوں کو بے بس دیکھ کر محرم ۵۶۴ھ (اکتوبر ۱۱۶۸ء) میں ایلمر ک نے مصر پر باقاعدہ حملہ کیا۔اس نے بَلبِیس کی پوری آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر قاہرہ کا رخ کیا۔مصری وزیرِ سلطنت نے ایلمر ک کو روکنے کے لیے قاہرہ کے بالمقابل آباد قدیم اسلامی شہر فسطاط کو خالی کرا کے مکمل طور پر نذرِ آتش کر دیا تا کہ ایلمر ک وہاں مورچے نہ بنا سکے۔۵۴ دن تک وہاں دھویں کے بادل چھائے رہے۔جب آگ کے شعلے ٹھنڈے ہوئے تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بسایا ہوا شہر خاکستر ہو چکا تھا۔شاور کی یہ احمقانہ تدبیر ایلمر ک کو نہ روک سکی اور وہ قاہرہ تک پہنچ گیا۔

نصرانیوں کو قاہرہ کا محاصرہ کرتے دیکھ کر عبیدی حکمران عاضد نے اپنی عورتوں کے کچھ نوچے ہوئے بال نور الدین زنگی کے پاس حلب روانہ کر دیے اور فریاد کی: ''میری مدد کرو، میری عورتوں کو فرنگیوں سے بچاؤ۔یہ شاہی محل کی خواتین کے بال ہیں جو تمہیں مدد کے لیے پکارتی ہیں۔''

وزیر شاور بھی نور الدین زنگی سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گیا۔اس نے دہائی دی کہ اگر اہلِ شام نے مدد نہ کی تو مصر کفار کے پاس چلا جائے گا۔نور الدین زنگی نے ایک بار پھر شیر کوہ کو لشکر دے کر مصر روانہ کیا۔صلاح الدین یوسف اس بار بھی لشکر میں شامل تھا مگر وہ بادلِ نخواستہ جا رہا تھا۔اس نے اپنے چچا شیر کوہ سے کہا تھا:

''چچا جان! اللہ کی قسم اگر مجھے مصر کی بادشاہت بھی دی جائے تب بھی میں مصر نہیں جاؤں گا۔میں نے اسکندریہ کے محاصرے میں جو تکالیف جھیلی ہیں، وہ میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔''

---

[1] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۶۲ھ

مگر نورالدین زنگی نے تاکیدی حکم دے کر صلاح الدین کو ساتھ بھیجا۔ آنے والے وقت نے بتادیا کہ سلطان نورالدین کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ صلاح الدین جس سفر کو عبث تصور کر رہا تھا وہی اس کی اقبال مندی اور مسلمانوں کی سعادت کا بہت بڑا سبب بنا۔

شامی فوج کی آمد کی خبر سن کر ایلمرک اپنے بزدل سپاہیوں سمیت رفو چکر ہوگیا۔ اپنا مطلب نکالنے کے بعد مصری وزیر شاور نے ایک بار پھر احسان فراموشی کا ثبوت دیتے ہوئے شامی امراء کو ایک دعوت میں مدعو کر کے اچانک قتل کرنے کا منصوبہ طے کرلیا۔ خوش قسمتی سے شاور کے بیٹے کو جو مسلمانوں کے اتحاد کا بڑا حامی تھا، بھنک پڑ گئی اور اس نے اپنے باپ کو سختی کے ساتھ منع کرتے ہوئے کہا: ''اگر آپ ایسا کرنے سے باز نہ آئے تو میں پہلے ہی شیر کوہ کو سب کچھ بتادوں گا۔'' شاور مجبوراً اس منحوس ارادے سے باز آ گیا۔

مگر اس دوران شیر کوہ پر شاور کی بدنیتی ظاہر ہو چکی تھی۔ اس لیے ایک دن صلاح الدین نے ایک شامی امیر جوردیک کے ساتھ مل کر شاور کو گھڑ دوڑ کی پیش کش کی۔ تینوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور بہت دور نکل گئے۔ اب شاور تنہا تھا۔ صلاح الدین اور جوردیک نے اسے پکڑ کر زمین پر گرادیا اور حراست میں لے لیا۔ اس دوران عاضد کو یہ اطلاع مل گئی۔ وہ شاور سے اتنا تنگ تھا کہ شیر کوہ سے اصرار کیا کہ شاور کا سر کاٹ کر اسے پیش کردیا جائے۔ شیر کوہ نے ایسا ہی کیا۔ یہ واقعہ ۷ اجمادی الآخرہ ۵۶۴ھ (۱۸ مارچ ۱۱۶۹ء) کا ہے۔ اس واقعے پر عوام نے خوشی منائی کیوں کہ وہ نہ صرف شاور کے واسطے سے نصرانیوں کو ناقابل برداشت ٹیکسوں کی ادائیگی سے تنگ تھے بلکہ شاور کے ہاتھوں فسطاط کی آتش زدگی سے بھی بے حد برہم تھے۔[۱]

شیر کوہ کی وزارت اور وفات:

عاضد نے شاور کی جگہ شیر کوہ کو اپنا وزیر مقرر کردیا اور ''الملک المنصور'' کے لقب سے نوازا۔ لیکن اسے مصر پر حکومت کے صرف دو ماہ نصیب ہوئے۔ ہفتہ ۲۲ جمادی الآخرہ ۵۶۴ھ (۲۳ مارچ ۱۱۶۹ء) کو یہ نامور سپہ سالار ایک ناگہانی بیماری میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔[۲]

صلاح الدین ایوبی کی مصر میں حکومت:

عاضد، شیر کوہ کی موت کے بعد وزارتِ مصر اس کے کسی ساتھی کو دینے کا پابند تھا۔ عاضد ذاتی طور پر صلاح الدین یوسف کی قابلیت اور سمجھ بوجھ سے زیادہ متاثر تھا۔ اس کے علاوہ اس کے درباریوں نے بھی اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا: ''اگر آپ یوسف کو وزیر بنادیں تو وہ ہمارا ہر لحاظ سے فرماں بردار ہوگا، کیوں کہ شامی امراء میں سے وہ سب سے کم عمر ہے۔''

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۶۴ھ

② المنتظم لابن الجوزی: سنۃ ۵۶۴ھ

اس مشورے کے بعد عاضد نے صلاح الدین کو وزیر مقرر کر کے "الملک الناصر" کا لقب دے دیا۔ ①

یہاں سے صلاح الدین کے اس اقتدار کا دور شروع ہوتا ہے جو روز بروز ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ اللہ نے بیت المقدس کی آزادی اور تیسری صلیبی جنگ میں یورپی طاقتوں سے عالم اسلام کے دفاع کا کام اسی مردِ مجاہد سے لیا۔

نور الدین زنگی کی وفات:

سلطان نور الدین محمود زنگی جنہوں نے شریعت اور سنت کے چمن کی آبیاری کر کے ایک بار پھر عہدِ گزشتہ کے مثالی مسلم حکمرانوں کی یاد تازہ کر دی تھی، کئی ماہ تک خناق کی موذی بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد آخر کار ۱۲ شوال ۵۶۹ھ کو دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ ②

نور الدین زنگی کی سیرت کے کچھ ایمان افروز پہلو:

موت سے صرف دس دن پہلے وہ ایک وفادار امیر سے زندگی کی بے ثباتی اور موت کی حقیقت پر بات چیت کر رہے تھے۔ امیر نے عرض کیا: "معلوم نہیں ہم اگلے سال پھر مل پائیں گے یا نہیں؟"

سلطان زنگی نے کہا: "یوں نہ کہو۔ پاک ہے وہ ذات جسے علم ہے کہ ہم اگلے ماہ بھی مل پائیں گے یا نہیں۔"

اس گفتگو کے گیارہویں روز سلطان زنگی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ③

سوزِ قلب کا یہ عالم تھا کہ نصرانیوں کے ناقابلِ تسخیر مرکز حارم پر حملے کے دوران وہ بے چین ہو کر اکیلے ایک ٹیلے پر چڑھ گئے تھے۔ یہاں سجدے میں سر رکھ مضطربانہ انداز میں چہرہ مٹی پر رگڑتے رہے۔ زبان سے کہہ رہے تھے:

"یا اللہ! یہ ہے تیرا بندہ اور یہ ہیں تیرے دوست۔ یا اللہ! یہ ہے تیرا بندہ اور وہ ہیں تیرے دشمن۔ بس تو اپنے دوستوں کی اپنے دشمنوں کے خلاف مدد کر۔ یہ فضول محمود بیچ میں کہاں سے آگیا۔ الٰہی! چاہے محمود کی مدد نہ کر لیکن اپنے دین کی تو نصرت کر۔ بھلا محمود کُتے کی کیا حیثیت کہ اس کی مدد کی جائے۔"

مطلب یہ تھا کہ اگر میں اپنے اعمال کی وجہ سے نصرت کا حق دار نہیں تو میری وجہ سے مسلمانوں کو محروم مت فرما۔ ④

جب فرنگیوں نے مصر کے شہر دمیاط پر حملہ کیا تھا تو شام میں نور الدین کی بے تابی انتہاء کو پہنچ گئی تھی۔ جب صلاح الدین ایوبی نے دشمن کو پسپا کر دیا تو اسی رات دمشق کے ایک امام مسجد نے خواب میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "نور الدین کو بتا دو کہ آج رات فرنگی دمیاط سے واپس ہو گئے ہیں۔"

امام نے خواب ہی میں عرض کیا: "اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسی نشانی بتا دیجیے جس سے وہ میری بات پر یقین کر سکیں۔" حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نشانی یہ ہے کہ وہ حارم کے ٹیلے پر سجدہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: الٰہی! محمود کی مدد نہ کر لیکن اپنے دین کی نصرت کر۔ بھلا محمود کُتے کی کیا حیثیت کہ اس کی مدد کی جائے۔"

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۵۶۴ھ
② الکامل فی التاریخ: سنة ۵۶۹ھ
③ الکامل فی التاریخ: سنة ۵۶۹ھ
④ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: ۲۲۰،۲۱۹/۱، ط مؤسسة الرسالة

یہ تہجد کا وقت تھا۔امامِ صاحب نیند سے بیدار ہوکر سیدھے مسجد چلے آئے۔نورالدین زنگی روزانہ اس وقت مسجد آ کر صبح صادق تک نوافل ادا کرتے تھے۔کچھ دیر بعد وہ آ گئے۔امام صاحب نے خواب کہہ سنایا مگر اس میں کتے کا لفظ دہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔تب زنگی نے کہا:''مجھے پوری بات سناؤ۔''امام صاحب پس وپیش کرتے رہے لیکن پھر زنگی کے شدید اصرار پر پورے الفاظ دہرا دیے اور نورالدین کے آنسو بہہ نکلے۔ [1]

سلطان زنگی عالم اسلام کے ان گنے چنے رہنماؤں میں سے ایک تھے جن کے کردار میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی جھلک نمایاں تھی۔ بلاشبہ وہ دن کے شہسوار اور شب کے عبادت گذار تھے۔دراز قامت،سانولی رنگت،کشادہ پیشانی اور دلکش نقوش والا یہ مجاہد پیکرِ شرافت ومروت تھا۔اس کی نگاہوں میں کسی فاتح کا قہرتھا نہ تاثرات میں کسی کشور کشا کا تکبر۔دیکھنے والوں کو ان کے رویئے میں شفقت اور مٹھاس گھلی دکھائی دیتی۔

چہرہ قدرتی طور پر تقریباً بے ریش تھا۔صرف تھوڑی پر چند بال تھے جو وقار وحلم کے اس مجسمے پر بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔مگر اس کے باوجود رعب کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے امراء دربار میں گنگ رہتے تھے۔دشمن سینکڑوں کوسوں پر ہوتا تب بھی زنگی کے نام سے تھرتھراتا تھا۔

اس دور میں سلطان زنگی کی سلطنت چند بڑی اسلامی سلطنتوں میں سے ایک تھی۔شام کے علاوہ حرمین شریفین کے خطبوں میں بھی سلطان کا نام لیا جاتا۔آخری سال میں یمن پر توران شاہ کے قبضے کے بعد جب وہاں عباسی خلفاء کا خطبہ شروع ہوا تو سلطان کا نام بھی شامل کرلیا گیا۔حقیقت میں یہ درویش منش حکمران تمام مسلمانوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ ہر مسجد اور ہر گھر میں اس کے لیے دن رات دعائیں کی جاتی تھیں۔دلیری کا یہ عالم تھا کہ جنگوں میں خود بڑھ چڑھ کر شریک ہونے اور دست بدست لڑنے سے بھی گریز نہ تھا۔یہ فرزندِ اسلام دو کمانیں ہاتھ میں لے کر اور دو ترکش کمر میں باندھ کر دشمن پر تیروں کا مینہ برساتا چلا جاتا تھا۔ [2]

علامہ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ نے سلطان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا ہے:

''میں نے گذشتہ بادشاہوں میں خلفائے راشدین اور عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ کسی حکمران کو نورالدین محمود سے زیادہ اچھی سیرت کا حامل اور عدل وانصاف کے قیام کے لیے کوشاں نہیں پایا۔''

نیز علامہ ابنِ اثیر فرماتے ہیں:

''وہ رات کو کثرت سے نوافل پڑھا کرتے تھے۔اس میں اذکار و وظائف کا اہتمام کرتے ...... وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق فقہ سے اچھی طرح واقف تھے...... حدیث پاک دوسروں سے سنتے اور ثواب کی نیت سے خود بھی سناتے تھے۔'' [3]

---

[1] مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب: ۱۸۲/۱،ط الامیریۃ

[2] الکامل فی التاریخ:سنۃ ۵۶۹ھ [3] الکامل فی التاریخ:سنۃ ۵۶۹ھ

سلطان مرحوم کے زہد کا یہ عالم تھا کہ بیت المال سے صرف ضرورت کے مطابق وظیفہ لیتے تھے۔ان کی اہلیہ رَضیع خاتون نے خرچ کی تنگی کی شکایت کی تو حمص میں اپنی ملکیت کی تین دکانیں اس کے نام کر دیں جن سے سالانہ بیس دینار ملنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد بیوی نے اس پر بھی حالات کی تنگی کا شکوہ کیا تو سلطان نے کہا:

''میرے پاس یہی کچھ ہے۔ باقی جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے مسلمانوں کا ہے، میں صرف اس کا خزانچی ہوں۔ تمہاری خاطر خیانت کر کے جہنم کی آگ میں نہیں جلنا چاہتا۔''

اس مرتبے اور ان کمالات کے باوجود جہاد میں اپنی جان کے بے قیمت ہونے کا احساس اتنا جاگزیں تھا کہ بلاتردد حریف کی صفوں میں گھس جاتے۔ایک دن فقیہ قطب نشاوی نے کہا: ''خدا کا واسطہ! اپنے آپ کو خطرے میں مت ڈالا کریں۔آپ کو کچھ ہو گیا تو مسلمانوں کو دشمن کی تلوار سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

یہ سن کر سلطان نور الدین محمود نے تلخ لہجے میں کہا: ''محمود کی کیا حیثیت جو اس قسم کی باتیں کی جارہی ہیں۔میرے ذریعے ان شہروں اور اسلامی شعائر کی حفاظت کون کر رہا ہے؟ صرف وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

اسلام کے اس سپوت نے ۵۸ برس عمر پائی اور ۱۲ شوال ۵۶۹ھ کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ①

نور الدین زنگی کے بعد مصر میں اتابک خانوادے کے نائب حاکم صلاح الدین ایوبی نے جہاد کی مشعل کو روشن رکھنے کا بیڑا اُٹھایا اور شام و مصر کو متحد کر کے صلیبیوں کے خلاف ایک بڑی طاقت فراہم کرنے پر توجہ مرکوز کر دی۔ ②

الملک الصالح اسماعیل:

نور الدین زنگی کی وصیت کے مطابق ان کا نوعمر بیٹا الملک الصالح اسماعیل تخت نشین ہوا مگر وہ ناتجربہ کار اور کمزور تھا۔شامی امراء اسے کھلونے کی طرح استعمال کر کے اپنے مفادات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔انہوں نے الملک الصالح کو سلطان صلاح الدین ایوبی کے خلاف ورغلا کر شام اور مصر کی حکومتوں کو آمنے سامنے کھڑا کر دیا۔کئی سال تک جاری اس کش مکش میں سلطان صلاح الدین ایوبی کو فتح ہوئی اور الملک الصالح اسماعیل کی حکومت مزید کمزور ہو گئی۔

الملک الصالح شدید بیمار ہو کر ۲۵ رجب ۵۷۷ھ (۴ دسمبر ۱۱۸۱ء) کو دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔یہ بیس سالہ نوجوان اہل حلب کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔حلب کے شہریوں کی اس سے محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی خاطر سلطان صلاح الدین سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔مؤرخین یہ گواہی دیتے ہیں کہ وہ شراب، بے حیائی اور بدکاری سے بہت دور تھا۔علامہ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ کا بیان ہے:

''وہ بردبار اور سخی تھا، کسی پر دست درازی، عصمت دری اور بدگوئی سے پاک تھا۔'' ③

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۵۶۹ھ ؛ البدایة والنهایة: سنة ۵۶۹ھ ؛ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: سنة ۵۶۹ھ

② صلاح الدین ایوبی کے مستقل حالات آگے سلطنتِ ایوبیہ کے تحت آئیں گے۔ ③ الکامل فی التاریخ: سنة ۵۷۷ھ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

وہ ان بادشاہوں میں سے تھا جو نہایت پاکباز شمار ہوتے ہیں، کوئی اپنے باپ جیسے اخلاق سے آراستہ ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔"[1]

الملک الصالح کی وفات کے بعد موصل کا حاکم عزالدین مسعود حلب کا نیا حکمران بن گیا۔ اس کی نیابت میں یہاں عمادالدین ثانی حکومت کرنے لگا۔[2]

زنگی خاندان کے حکمران ایک نگاہ میں:

اتابک خاندان کو اصل شہرت صلیبیوں کے خلاف عمادالدین زنگی اور نورالدین زنگی کے جہاد کی وجہ سے ملی۔ نورالدین زنگی کے بعد جہاد کی قیادت سلطان صلاح الدین ایوبی اور ان کے جانشینوں کے پاس چلی گئی، اگرچہ اتابک خانوادہ اس کے بعد موصل، سنجار اور الجزیرہ کے بعض شہروں پر ساتویں صدی ہجری تک حکومت کرتا رہا مگر اس کی سیاسی اہمیت بہت کم رہ گئی تھی۔

---

① البدایة والنهایة: سنة ۵۷۷ھ

نوٹ: مصنف "داستان ایمان فروشوں کی" نے اس پاکباز انسان کو شرابی اور زانی باور کرایا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کی موت کا سبب بھی شراب نوشی بیان کیا ہے جبکہ اس متقی نوجوان نے ایک قطرہ شراب پینے پر موت کو ترجیح دی تھی۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"جب اس کا مرض بڑھ گیا تو طبیبوں نے دوا کے طور پر شراب تجویز کی، اس نے کہا: جب تک علماء سے فتویٰ نہ لے لوں نہیں پیوں گا۔ ایک فقیہ نے ایسی حالت میں جواز کا فتویٰ دے دیا، جب اس نے فقیہ سے کہا: بتایئے اگر موت طے ہو چکی ہے تو کیا شراب سے ٹل جائے گی، اس نے کہا نہیں۔ الملک الصالح نے کہا تو میں حرام شے استعمال کر کے اللہ سبحانہٗ سے نہیں ملنا چاہتا۔" (الکامل فی التاریخ: سنة ۵۷۷ھ)

پس الملک الصالح پر اس طرح بہتان طرازی کا کوئی جواز نہیں۔

② تاریخ ابن خلدون: ۵ ص ۳۰۳، ط دار الفکر

اتابک حکمرانوں کی فہرست

	نام حکمران	آغازِ حکومت	اختتام	مرکزی علاقہ	خاص بات
	امرائے موصل وحلب				
۱	عمادالدین زنگی	۵۲۱ھ	۵۴۱ھ	موصل، حلب	اتابک حکومت کی بنیاد رکھی، صلیبیوں سے جہاد شروع کیا۔
	امرائے حلب				
۱	نورالدین زنگی بن عمادالدین	۵۴۱ھ	۵۶۹ھ	حلب، دمشق	صلیبیوں سے جہاد کو جاری رکھا، نئے علاقے فتح کیے۔
۲	الملک الصالح بن نورالدین	۵۶۹ھ	۵۷۷ھ	حلب	صلاح الدین ایوبی سے کش مکش
	امرائے موصل				
۱	سیف الدین غازی بن عمادالدین	۵۴۱ھ	۵۴۴ھ	موصل	دوسری صلیبی جنگ میں اپنے بھائی نورالدین زنگی کا ساتھ دیا۔
۲	قطب الدین مودود بن عمادالدین	۵۴۴ھ	۵۶۵ھ	موصل	ابتداء میں اپنے بھائی نورالدین کا حریف پھر حلیف
۳	سیف الدین غازی دوئم	۵۶۵ھ	۵۷۶ھ	موصل	سلطان ایوبی کا حریف
۴	عزالدین مسعود بن مودود	۵۷۶ھ	۵۸۹ھ	موصل، حلب	ابتداء میں صلاح الدین ایوبی کا حریف، پھر حلیف
۵	نورالدین ارسلان شاہ	۵۸۹ھ	۶۰۷ھ	موصل	

نمبر	نام	آغاز	اختتام	مرکز	تبصرہ
۶	عزالدین مسعود ثانی	۶۰۷ھ	۶۱۵ھ	موصل	
۷	نورالدین ارسلان شاہ ثانی	۶۱۵ھ	۶۱۶ھ	موصل	
۸	نورالدین محمود	۶۱۶ھ	۶۳۱ھ	موصل	اتابکانِ موصل کا آخری حکمران
۹	بدرالدین لؤلؤ	۶۳۱ھ	۶۵۷ھ	موصل	اتابکانِ موصل کی حکومت ختم کر کے اقتدار حاصل کیا۔ ہوشیار اور ذہین سیاست دان
۱۰	الصالح اسماعیل بن لؤلؤ	۶۵۷ھ	۶۶۰ھ	موصل	تاتاریوں کے ہاتھوں خاتمہ
	امرائے سنجار				
۱	عمادالدین ثانی بن مودود بن عماد الدین زنگی	۵۶۶ھ	۵۹۴ھ	حلب، سنجار	ابتداء میں صلاح الدین ایوبی کا حریف، بعد میں حلیف
۲	قطب الدین محمد بن عمادالدین ثانی	۵۹۴ھ	۶۱۶ھ	سنجار	
۳	عمادالدین شاہنشاہ بن قطب الدین	۶۱۶ھ	۶۱۷ھ	سنجار	
۴	محمود بن قطب الدین	۶۱۷ھ		سنجار	الملک الاشرف ایوبی بن الملک العادل کے ہاتھوں خاتمہ

تیسرا باب

ایوبی حکمران اور صلیبی جنگیں

۵۶۷ھ تا ۶۴۸ھ

۱۱۷۱ء تا ۱۲۵۰ء

سلطان صلاح الدین ایوبی

۵۶۷ھ (۱۱۷۱ء) تا ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء)

صلاح الدین کا آبائی علاقہ کردستان تھا۔ ان کے دادا شاذی بن مروان کردستان کے شہر ''دوین'' سے بغداد آئے تھے۔ بغداد کا منتظم اعلیٰ ''مجاہد الدین بہروز'' شاذی کا دوست تھا۔ اس نے شاذی کو تکریت کا قلعہ دار مقرر کردیا تھا۔ شاذی کی وفات پر یہ قلعہ داری اس کے بڑے بیٹے نجم الدین ایوب کو ملی۔ ۵۳۲ھ (۱۱۳۸ء) میں اسی نجم الدین ایوب کے ہاں صلاح الدین ایوبی نے جنم لیا جس کا نام اس وقت یوسف رکھا گیا۔

صلاح الدین کی ولادت کے دن نجم الدین ایوب اور اس کے بھائی شیر کوہ کو سرکاری ملازمت سے برطرف کردیا گیا تھا اور یہ پورا خاندان تکریت سے کسی نامعلوم ٹھکانے کی طرف روانگی کی تیاری کررہا تھا۔ نجم الدین نے اس حالت میں بچے کو اپنے لیے منحوس تصور کیا جس کی آمد پر اسے اپنے گھر سے بے گھر ہونا پڑ رہا تھا۔ مگر اس کے کاتب نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''آپ اس بچے کی ولادت کو نامبارک تصور کررہے ہیں مگر اس میں بچے کا کیا گناہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بچہ کل کو ایک بہت بڑا مشہور بادشاہ بن جائے۔''

تکریت سے نکل کر نجم الدین ایوب عماد الدین زنگی کے ہاں موصل پہنچا تو وہاں اس کی بڑی قدر کی گئی کیوں کہ ایک بار نجم الدین ایوب نے عماد الدین زنگی کو ''تکریت'' کے قلعے میں پناہ دی تھی اور اس کی بڑی خاطر مدارات کی تھی۔ عماد الدین زنگی نے جب ۵۳۳ھ (۱۱۳۷ء) میں بعلبک فتح کیا تو نجم الدین ہی کو وہاں کا قلعہ دار مقرر کیا۔[1]

عماد الدین کی وفات کے بعد نجم الدین ایوب کا بھائی شیر کوہ نور الدین زنگی کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ نور الدین زنگی مردم شناس بھی تھا اور بہادروں کا قدردان بھی اس لیے شیر کوہ بہت جلد ترقی کرکے سپہ سالار بن گیا۔ صلاح الدین نے بھی ایک مدت نور الدین زنگی کے دربار میں بسر کی تھی اور اس کی تربیت میں نور الدین زنگی کا بڑا حصہ تھا۔[2]

نور الدین زنگی نے شیر کوہ کو مصر بھیجا تو صلاح الدین کو بھی مجبوراً ہم رکاب ہونا پڑا۔ شیر کوہ کے بعد صلاح الدین نے مصر کے عبیدی حکمران عاضد کا وزیر بن کر خود کو اس منصب کا صحیح حق دار ثابت کیا۔ اگرچہ عاضد متعصب اسماعیلی شیعہ تھا مگر صلاح الدین نے اسے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کھلے دل سے عوام پر مال ودولت خرچ کیا، ان کی فریادرسی

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین النوریة والصلاحیة لابی شامة المقدسی: سنة ۵۶۸ھ، ط مؤسسة الرسالة بیروت

[2] النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة، لجمال الدین یوسف بن تغری بردی (م ۸۷۴ھ): ۳ص ۱۵ تا ۲۰، ط دار الکتب مصر

کی، خواص کو انعام واکرام اور عزت واحترام کے ساتھ اپنا ہم نوا بنایا۔ اگرچہ مصر میں سوا دوصدیوں تک عبیدی حکومت کے اثرات نے عوام میں شیعیت کے رجحانات پیدا کردیے تھے مگر اس کے باوجود سُنی مسلمان اب بھی مصر کی آبادی کا غالب حصہ تھے۔ بہت سے لوگ صرف سرکاری دباؤ کے باعث اظہارِ تشیع کرتے تھے۔ صلاح الدین نے نہایت سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی تفریق کے بغیر ہر طبقے اور نظریے کے لوگوں سے فراخ دلانہ سلوک کیا جس سے سب کو نئے وزیرِ سلطنت کی وسعت ظرفی کا یقین ہوگیا اور عوام میں اس کی حمایت بڑھنے لگی۔

صلاح الدین نے اس سے پہلے لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کی طرف توجہ دی اور نظریاتی محنت کو فروغ دیا۔ دوصدیوں سے مصر پر حکومت کرنے والے بنوعبید کے مذہب نے عوام کو بھی متاثر کیا تھا، لوگ شعائرِ سنت کی جگہ بدعات کے عادی ہوچکے تھے۔ ان کی ذہنی تطہیر کے لیے صلاح الدین ایوبی نے جگہ جگہ دینی مدارس قائم کیے۔

قاہرہ اور فسطاط میں کسی سابق ناظمِ شہر نے دو قید خانے تعمیر کرائے تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے وہاں فقہ شافعی کے دو مدارس قائم کردیے۔ ایسا ہی ایک اور بڑا مدرسہ ''دارالعدل'' کے نام سے تعمیر کیا۔ ایوبی کے بھتیجے تقی الدین عمر نے بھی قاہرہ میں کچھ مکانات خرید کر ایک شافعی مدرسہ کھولا اور اس کی آمدن کے لیے جائیداد بھی وقف کردی۔ عوام کے دل جیتنے اور ان کی ذہنی تربیت کرنے کے بعد عدالتوں میں بھی اہل سنت علماء کو قاضی مقرر کردیا گیا۔ [1]

بنوعبید کے بعض امراء کو ایک سنی وزیر کا مصر پر تسلط گوارا نہیں تھا اس لیے انہوں نے نصرانیوں کو مصر پر چڑھائی کی دعوت دینے اور خود اندرونی طور پر بغاوت کرنے کا منصوبہ بنایا مگر صلاح الدین کو اطلاع مل گئی اور انہوں نے منصوبے کے بانی ''طواشی'' کو جو دربارِ مصر کا ایک نامور حبشی رکن تھا، خفیہ اہلکاروں کے ذریعے قتل کرادیا۔ قاہرہ کے حبشیوں نے اپنے سردار کے قتل پر بغاوت کی مگر صلاح الدین نے بہت جلد ان پر قابو پالیا۔ یہ ۵۶۴ھ (۱۱۶۹ء) کا واقعہ ہے۔ [2]

دمیاط پر فرنگیوں کا حملہ:

مصر پر صلاح الدین کا اقتدار شام کے فرنگیوں کے لیے بھی قابلِ برداشت نہ تھا۔ اس لیے شاہِ یروشلم ایلمرک نے ۵۶۵ھ (۱۱۶۹ء) کے آغاز میں مصر کے ساحلی شہر دمیاط پر بہت سخت حملہ کیا۔ اس کی مدد کے لیے صِقِلّیہ کی افواج بھی آگئیں۔ سلطان نورالدین زنگی کو یہ اطلاع ملی تو انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی فوجیں مصر روانہ کردیں تاکہ وہ فرنگیوں کے مقابل مسلمانوں کی مدد کریں۔ دوسری طرف انہوں نے خود اپنی فوج کے منتخب دستوں کے ساتھ شام کے عیسائی مقبوضات پر چھاپہ مار حملے شروع کردیے۔

دمیاط کا محاصرہ کم وبیش پچاس دن جاری رہا تھا۔ اس دوران اس محاذ پر لڑنے والی فوج کے لیے صلاح الدین ایوبی نے بے اندازہ دولت خرچ کی۔ مجاہدین کی ثابت قدمی کے بعد نصرتِ خداوندی غزوۂ احزاب کی طرح موسم کی تبدیلی

---

(1) الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۶۶ھ

(2) الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۶۴ھ

کی شکل میں نازل ہوئی تو کفار کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ ①

یورپی بیڑہ جو ایلمرک کا اتحادی بن کر اس جنگ میں شرکت کے لیے آیا تھا، جس انجام سے دوچار ہوا تھا اس کے بارے میں لین پول لکھتا ہے:

"طوفانی بارش اور آندھی سے تقریباً پورا یونانی بحری بیڑا تباہ ہو گیا اور اس ساحل پر جسے وہ فتح کرنے آیا تھا، یونانیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔" ②

اس دوران ایلمرک کو اپنے علاقوں میں سلطان نورالدین کے حملے کی اطلاع بھی مل گئی تھی۔ اس نے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھا لیا اور وہ القدس واپس روانہ ہو گیا۔ جنگ کے انجام کے بارے میں علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فرنگی ناکام واپس شام لوٹ گئے، انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، جب وہ اپنے شہروں میں پہنچے تو انہیں (سلطان نورالدین زنگی کے ہاتھوں) ویران پایا، ان کے لوگ قتل ہو چکے تھے یا گرفتار کر لیے گئے تھے۔ ان پر یہ مثل صادق آئی کہ "خرجت النعامة تطلب القرنین فرجع بلااذنین" (شتر مرغ سینگوں کی تلاش میں نکلا مگر جب واپس آیا تو اس کے دونوں کان بھی غائب تھے) ③

۵۶۶ھ (نومبر ۱۱۷۰ء) میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے شام کے فرنگیوں پر جارحانہ حملوں کا آغاز کر دیا۔ یہ چھاپہ مار حملے تھے جو عسقلان، رملہ اور غزہ پر ہوئے۔ ایلمرک اپنے شہروں کو بچانے کے لیے نکلا مگر اسے شکست ہوئی۔ وہ خود گرفتار ہوتے ہوتے بچا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ کچھ دنوں بعد صلاح الدین نے خلیج عقبہ کے سرے پر واقع نصرانیوں کی اہم عسکری و تجارتی بندرگاہ ایلہ پر حملہ کیا۔ اس مقصد کے لیے صلاح الدین ایوبی نے انجینئروں کو ایسے بحری جہاز تیار کرنے کا حکم دیا جو کئی ٹکڑوں میں ہوں اور انہیں جوڑا اور کھولا جا سکے۔ ان جہازوں کو اونٹوں پر لدوا کر خشکی کے راستے خلیج عقبہ پہنچایا گیا۔ یہاں ساحل پر ٹکڑوں کو جوڑ کر جہازوں میں تبدیل کر دیا گیا اور بری و بحری دونوں طرف سے حملہ کر کے ایلہ جیسے محفوظ ترین شہر کو بہت جلد فتح کر لیا۔ ④

مصر سے دولتِ بنو عبید کا خاتمہ:

شرعی قوانین کے نفاذ اور دینی مدارس کے قیام کے بعد صلاح الدین کے لیے یہ ذرا بھی مشکل نہ تھا کہ وہ مصر سے عبیدیوں کے اقتدار کو ختم کر دیں۔ عباسی خلیفہ مستضی اور سلطان نورالدین زنگی کی پُرزور تاکید پر محرم ۵۶۷ھ (ستمبر ۱۱۷۱ء) کے پہلے جمعہ کو صلاح الدین ایوبی نے بنو عبید کا خطبہ منسوخ کر کے عباسی خلفاء کے خطبے کا اجراء کر دیا۔ عالم اسلام میں اس خبر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بغداد میں باقاعدہ چراغاں ہوا۔ سلطان نورالدین زنگی، صلاح الدین

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۶۵ھ
② صلاح الدین لین پول: ص ۵۵
③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۶۵ھ
④ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۶۶ھ

اور مصر کی جامع مساجد کے خطیبوں کے لیے خلعتیں اور سیاہ عمامے روانہ کیے گئے۔

اس واقعے کے چند دن بعد دس محرم کو بنوعبید کا آخری حکمران عاضد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرنے سے چند دن پہلے اس نے صلاح الدین ایوبی کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اس وقت اس نے اپنے بچوں کو جو نابالغ تھے، مستقبل کے اس فاتح اعظم کے حوالے کرتے ہوئے ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی وصیت کی۔ صلاح الدین ایوبی نے ایک ایماندار مسلمان کی طرح اس وعدے کو نبھایا اور عاضد کی اولاد کا ہمیشہ خاص خیال رکھا۔

عاضد کی موت پر صلاح الدین ایوبی نے مملکت کے والی کی حیثیت سے تعزیتی رسم ادا کی، اور حسرتناک لہجے میں کہا: ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس بیماری میں مرجائے گا تو اس کی زندگی میں اس کا خطبہ بند نہ کراتا۔''

الغرض ذوالحجہ ۲۹۷ھ میں مَرَّاکش کے شہر سِجِلْمَاسَہ سے ظہور پذیر ہونے والی عبیدی حکومت اپنے اقتدار کے ۲۷۰ سال مکمل کر کے محرم ۵۶۷ھ میں ایک تاریخی داستان بن چکی تھی۔ [1]

طرابلس الغرب (لیبیا) کی بازیابی:

نارمنوں نے ۵۴۱ھ میں شمالی افریقہ کے مشہور شہر طرابلس الغرب کو آلِ زیری سے چھین لیا تھا۔ تاہم ۵۵۴ھ میں مَرَّاکش کے حکمران عبدالمؤمن نے پورے شمالی افریقہ سے نارمنوں کو مار بھگایا تھا جس کے نتیجے میں طرابلس بھی مسلمانوں کو واپس مل گیا تھا۔ اب یہ ایک آزاد ریاست کی شکل میں تھا جسے صِقِلِّیَہ کے نارمنوں کے خلاف نہایت مضبوط مورچہ بنایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ صلاح الدین ایوبی کے جرنیل تقی الدین عمر نے اپنے غلام قراقوش کو اسے فتح کرنے کی مہم سونپی۔ قراقوش ۵۶۸ھ (۱۱۷۳ء) میں اس مہم پر نکلا۔ اس نے تیونس میں آباد عرب قبائل کو ساتھ ملا کر ایک زبردست فوج بنالی اور آخرکار طرابلس پر قبضہ کر کے اسے مصر کی عملداری میں شامل کر لیا۔ [2]

ایک اور ناکام بغاوت:

بنوعبید کے وفادار امراء سنی حکومت کو ختم کر کے ایک بار پھر شیعی خلافت کا احیاء چاہتے تھے۔ ان میں عبیدیوں کا داعی الدعاۃ ابن عبدالقوی، بنوعبید کا قاضی القضاۃ ابن کامل اور عُمارۃ نامی ایک یمنی شاعر پیش پیش تھے۔

انہوں نے شام کی عیسائی ریاستوں اور صِقِلِّیَہ کے حکمران کو مصر پر فوج کشی کی دعوت دی اور طے کیا کہ جب سرکاری لشکر قاہرہ سے باہر جائے گا تو باغی سالار اپنے سپاہیوں کے ساتھ صلاح الدین کو گھیر کر قتل کر دیں گے۔

مگر خوش قسمتی سے صلاح الدین کو اس سازش کا پتا چل گیا اور تمام باغی سرداروں کو حراست میں لے کر سزائے موت دے دی گئی۔ یہ واقعہ رمضان ۵۶۹ھ (مئی ۱۱۷۴ء) کا ہے۔ [3]

---

[1] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۶۷ھ

[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۶۸ھ

[3] کتاب الروضتین: ۲۸۲/۲ تا ۲۸۴، ط الرسالة ؛ البدایة والنهایة سنة ۵۶۹ھ

صلاح الدین ایوبی کی زندگی میں انقلاب:

صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ اب عملی لحاظ سے مصر کے خود مختار حکمران تھے۔ وہ مال و دولت کے اتنے انبار کسی روک ٹوک کے بغیر سمیٹ سکتے تھے جو ان کی سات پشتوں کے لیے کافی ہوتے۔ مگر حیرت انگیز طور پر جوں ہی وہ مصر کی حکومت کے مالک بنے ان کی طبیعت میں دنیا سے زہد اور بے رغبتی کا رجحان پیدا ہو گیا۔

صلاح الدین ایوبی کی زندگی میں یہ تبدیلی بلاشبہ ایک حیران کن چیز تھی۔ حکومت اپنے ساتھ عیش وعشرت کے ایسے اسباب لاتی ہے جن کی کشش سے اچھے اچھوں کا پیمانۂ ضبط جھلک اٹھتا ہے۔ اس لحاظ سے صلاح الدین ایوبی کی طبیعت کا یہ انقلاب تاریخ کے نادر واقعات میں سے ہے۔ اس سے پہلے ایسی مثال ہمیں قرنِ اوّل میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی زندگی میں نظر آتی ہے جنہوں نے خلیفہ بنتے ہی عیش و تنعم چھوڑ کر فقر و فاقہ کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

ان کے سوانح نگار قاضی بہاؤ الدین شداد رحمہ اللہ تحریر کرتے ہیں:

> ”حکومت مصر کی زمام ہاتھ میں لینے کے بعد ان کی نگاہ میں دنیا ہیچ ہو گئی۔ تشکر کے جذبات نے ان کے دل میں تلاطم پیدا کیا۔ انہوں نے نا ؤ نوش سے توبہ کی، عیش وآرام اور تفریحات سے منہ پھیر لیا، ایک سنجیدہ اور سخت کوش زندگی اپنالی، جس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا۔“[1]

صلاح الدین ایوبی میں یہ تبدیلی کیسے آئی؟ اس کی اصل وجہ تو مشیتِ خداوندی تھی جسے پورا ہونا تھا۔ مگر ظاہری اسباب میں اس کی بڑی وجہ وہ سوچ اور فکر تھی جو مسندِ حکومت پر بیٹھ کر ان کے قلب وذہن پر حاوی ہو گئی۔ انہیں اس طرح غیر متوقع طور پر حکومت ملی تھی کہ انہیں وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ وہ جو کہ طبعی شرافت اور مروت کے جواہر سے آراستہ تھے، اس نعمت غیر مترقبہ پر شکر کے جذبات سے سرشار ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے کہ اتنی بڑی نعمت کا شکر کیسے ادا کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت، خلفائے راشدین کے حالات اور سلف صالحین کی زندگیاں ایک کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھیں۔

اسلام کے اس فرزند نے محسوس کیا کہ ان کی کامیابی انہی کامیاب لوگوں کی مکمل پیروی میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں یقین ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت کسی خاص مقصد کے تحت انہیں عطا کی ہے اور اس اہم مقصد کے حصول کے لیے غیر معمولی ایثار و قربانی اور مجاہدے کی ضرورت ہوگی۔

وہ شروع ہی سے ایک دلیر اور غیرت مند انسان تھے، القدس پر صلیبیوں کے تسلط، شام کے ساحلوں پر ان کے قبضے اور اسلامی شہروں میں ان کی غارت گری کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اب جبکہ قدرتِ خداوندی نے انہیں منصبِ قیادت عطا کر دیا تھا انہوں نے اُمّت کی امیدوں پر پورا اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بڑی ناگواری کے ساتھ مصر آئے تھے مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تخت حکمرانی تیار کر رکھا تھا۔

---

[1] النوادر السلطانیہ والمحاسن الیوسفیة، لابن شداد، ص ۸۱، ط مکتبة الخانجی مصر

اپنے مقصدِ حیات کی پہچان:

برسوں بعد اسلام کے اس عظیم فاتح نے اپنے ساتھیوں کو اپنے مصر آنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا:

''جب میرے چچا شیر کوہ نے مجھے کہا کہ مصر چلنے کی تیاری کرو تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل میں ایک خنجر اتار دیا گیا ہے۔''[1]

اسی طرح انہوں نے قاضی بہاؤالدین شداد رحمہ اللہ سے کہا:

''میرا مصر آنا قطعاً میری رضامندی سے نہیں تھا، میرا معاملہ بالکل ایسا ہے جیسے قرآن مجید میں یوں کہا گیا ہے:

وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

(ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو)''[2]

صلاح الدین ایوبی پر جلد ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ قدرتِ الٰہیہ نے انہیں کس مقصد کے لیے مصر بلا کر اقتدار سونپا ہے۔ یہ کام تھا: ''القدس اور دیگر اسلامی علاقوں کو نصرانیوں کے ناجائز تسلط سے آزاد کرانا''

انہوں نے خود کہا: ''جب اللہ تعالیٰ نے مجھے مصر کی حکومت عطا کی تو میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فلسطین بھی مجھے دینے کا ارادہ کیا ہے۔''[3]

یہ تھا وہ جذبہ اور عزم جس کے ساتھ اسلام کے اس جانباز کی حکومت کا آغاز ہوا۔ صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کی حکومت جس کی بنیاد جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے پر رکھی گئی تھی، ایک ایسا ''شجرہ طوبیٰ'' ثابت ہوئی جسے بڑے بڑے طوفان اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔

نورالدین زنگی کے بعد:

سلطان نورالدین کی وفات کے بعد ان کے کم سن بیٹے الملک الصالح اسماعیل کو دمشق میں امرائے سلطنت کے ایک اجلاس میں نیا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مگر امرائے شام نے الملک الصالح کی کم عمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر پر پرزے نکالنے شروع کر دیے، ہر ایک خود کو الملک الصالح کا سرپرست یعنی اصل حکمران بنانا چاہتا تھا۔ ادھر سے فرنگیوں نے سرحدوں پر حملوں کا آغاز کر دیا اور امرائے شام کو دب کر ان سے ذلت آمیز صلح کرنا پڑی۔ ان حالات میں صلاح الدین ایوبی نے شام کو فرنگیوں سے بچانا اپنی ذمہ داری تصور کیا۔ انہوں نے شامی امراء کو مراسلے لکھ کر فرنگیوں سے صلح پر احتجاج کیا۔ ساتھ ہی الملک الصالح کو یقین دلایا کہ اگر مصری افواج کو موقع دیا جائے تو وہ عیسائیوں کی قوت وشوکت کا زور توڑ کر رکھ دیں گی۔[4]

---

[1] کتاب الروضتین: ۵۲/۲، ط الرسالۃ

[2] النوادر السلطانیہ، ص ۸۱

[3] النوادر السلطانیہ، ص ۸۱

[4] کتاب الروضتین: سنۃ ۵۶۹ھ، ۵۷۰ھ

اسکندریہ کا معرکہ:

صلاح الدین ایوبی دمشق روانگی کے بارے میں سوچ بچار کر رہے تھے۔ مگر انہی دنوں انہیں نصرانیوں کے تازہ حملے سے پالا پڑ گیا جو بحیرۂ روم کی جانب سے ہوا تھا۔ کچھ مدت پہلے مصر کے جن باغی سرداروں کو قتل کیا گیا تھا وہ شام اور صِقلّیہ کے عیسائی حکمرانوں کو مصر پر حملہ کی دعوت دے چکے تھے۔ سازش کا بھانڈا پھوٹنے کی اطلاع شام کے نصرانیوں کو بروقت مل گئی تھی لہٰذا وہ محتاط ہو گئے اور مقابلے پر نہ نکلے مگر صِقلّیہ کے بادشاہ کو اس کی اطلاع نہ مل سکی۔ وہ دو سو بحری جہازوں میں ۵۰ ہزار سپاہی لے کر ذوالحجہ ۵۶۹ھ (جولائی ۱۱۷۴ء) کو اسکندریہ پر حملہ آور ہوا۔ صلاح الدین ایوبی نے خود محاذ پر پہنچ کر دشمن کا مقابلہ کیا اور صِقلّیہ کے سورماؤں کو عبرتناک شکست دی۔ [1]

شام کی مہمات:

جنگ سے فارغ ہو کر ۵۷۰ھ میں صلاح الدین ایوبی نے شام کا رخ کیا اور وہاں امرائے شام کے اتحاد و اتفاق کے ساتھ الملک الصالح کی حکومت مضبوط کرنے کی کوشش کی مگر امرائے شام نے الملک الصالح کو ایسا ورغلایا کہ وہ صلاح الدین ہی کے خلاف ہو گیا۔ ان حالات میں صلاح الدین نے شام کی سیاست کو سدھارنے اور اسے نقائص سے پاک کرنے کے لیے وہاں منتشر اور رُو بہ زوال اتابکی سلطنت کی جگہ ایک نئی مضبوط حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ اس کے بغیر عیسائیوں کی طاقت کا سامنا ممکن نہیں تھا۔

اہلِ شام کی اکثریت صلاح الدین ایوبی کو چاہتی تھی، اس لیے دمشق میں امراء نے صلاح الدین کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ حمص، حماۃ اور کئی شہروں کے امراء ان کے ساتھ ہو گئے۔ [2]

جمادی الآخرہ ۵۷۰ھ (جنوری ۱۱۷۵ء) کو صلاح الدین ایوبی کا لشکر حلب پہنچا مگر الملک الصالح نے کسی قسم کی بات چیت پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ اہلِ حلب نے زبردست مقابلہ کیا اور مصری فوج کو شہر کی فصیل کے قریب نہ آنے دیا۔

اس دوران حلب کے بعض امراء نے باطنی پیشوا سنان کو بھاری معاوضہ دے کر صلاح الدین ایوبی پر قاتلانہ حملہ کرایا جو خوش قسمتی سے کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد امرائے حلب نے فرنگیوں کو مدد کے لیے بلوا لیا جس کی وجہ سے صلاح الدین کو حلب سے کوچ کرنا پڑا۔ صلاح الدین ایوبی نے یہ دیکھ لینے کے بعد کہ الملک الصالح ایک عضوِ معطل ہے جو بے حمیت امراء اور اغراض پرست درباریوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے، خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کا سکہ جاری کر کے باقاعدہ سلطان کی حیثیت اختیار کر لی۔

اب الملک الصالح کے حامی امراء اور صلاح الدین ایوبی میں ٹھن گئی۔ موصل کا حاکم سیف الدین غازی ثانی بھی الملک الصالح سے جا ملا۔ رمضان ۵۷۰ھ (اپریل ۱۱۷۵ء) کو قرونِ حماۃ کی وادی میں اتحادی افواج اور صلاح الدین

---

[1] کتاب الروضتین، ۲/ ۳۳۴ تا ۳۳۷، ط الرسالۃ

[2] کتاب الروضتین، ۲/ ۳۴۲ تا ۳۴۶، ط الرسالۃ

ایوبی کے مابین پہلی جنگ ہوئی جس میں اتحادی الملک الصالح کے چچازاد عزالدین مسعود کی کمان میں تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ اتحادیوں کو پسپائی پر مجبور کردیا اور قیدیوں سے بڑی فیاضی کا برتاؤ کیا۔ ①

اس کے بعد صلاح الدین نے ایک بار پھر حلب کا رخ کیا جہاں فریقین کے مذاکرات ہوئے اور اس نکتے پر صلح ہوگئی کہ ہر ایک اپنے اپنے موجودہ مقبوضہ علاقوں کا مالک ہوگا۔ ②

مگر اہلِ حلب نے معاہدہ صرف وقت ٹالنے کے لیے کیا تھا۔ اس لیے سلطان کے واپس جاتے ہی انہوں نے نہ صرف موصل بلکہ شام کے فرنگیوں سے بھی رابطے کر کے صلاح الدین کے خلاف اتحاد بنالیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شوال ۵۷۱ھ (اپریل ۱۱۷۶ء) میں جباب الترکمان کے مقام پر ایک اور جنگ ہوئی جس میں اتحادیوں کی کمان سیف الدین غازی کررہا تھا۔ اس بار بھی صلاح الدین ایوبی کو فتح نصیب ہوئی۔ سلطان نے قیدیوں پر کوئی سختی نہ کی بلکہ نہایت فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں خلعتوں سے نواز کر آزاد کردیا۔ ③

حلب پر حملہ ایک بار پھر ناگزیر ہوگیا تھا۔ مگر سلطان صلاح الدین نے پہلے ''عزاز'' کا رخ کیا جو حلب کے شمال میں عیسائی ریاستوں کی سرحد پر شام کے مسلمانوں کا آخری بڑا مورچہ تھا۔ اس پر قبضے کے بعد حلب کو اپنے عیسائی حلیفوں کی امداد نہیں پہنچ سکتی تھی۔ عزاز کے محاصرے کے دوران امرائے حلب کے اکسانے پر باطنی خنجر زنوں نے ایک بار پھر سلطان پر قاتلانہ حملہ کیا۔ سلطان نے خود بھی بڑی دلیری سے اپنا دفاع کیا اور ان کے جاں نثار بھی بروقت پہنچ گئے۔ سلطان کو زخم آئے مگر اللہ نے جان بچالی اور تمام باطنی قتل کردیے گئے۔ عزاز پر قبضے سے فارغ ہوتے ہی سلطان کی فوج حلب کے سامنے جا پہنچی۔ ایک بار پھر صلح کا معاہدہ ہوا اور سلطان نے نہ صرف واپسی اختیار کرلی بلکہ الملک الصالح کی کم سن بہن کی فرمائش پر عزاز کا قلعہ بھی واپس کردیا۔

اگلے چند سالوں میں سلطان کا قیام کبھی مصر میں ہوتا اور کبھی شام میں۔ ان کا دارالحکومت قاہرہ ہی تھا مگر شام کی مہمات انہیں بار بار اپنی طرف متوجہ کرلیتی تھیں۔ ان کے مصر جاتے ہی کبھی شامی امراء بغاوت کردیتے کبھی فرنگی سرحدوں پر تاخت وتاراج شروع کردیتے۔ سلطان نے بعض اوقات فرنگیوں سے جنگ بندی کے معاہدے بھی کیے مگر ہر بار یہ معاہدے توڑ دیے گئے۔ ④

رملہ میں شکست اور اس کا بدلہ:

جمادی الاولیٰ ۵۷۳ھ (اکتوبر ۱۱۷۷ء) میں سلطان نے مصر سے کوچ کر کے غزہ اور عسقلان پر چھاپہ مار حملے شروع کیے۔ اس دوران رملہ کے قریب نصرانیوں کی ایک بڑی فوج نے انہیں اچانک گھیرلیا۔ سلطان کے ساتھ بہت کم

① کتاب الروضتین: ۲/ ۳۵۵ تا ۳۸۴، ط الرسالة
② كتاب الروضتين فی اخبار الدولتين: سنة ۵۷۰ھ
③ كتاب الروضتين: سنة ۵۷۱ھ؛ البداية والنهاية: سنة ۵۷۱ھ
④ البداية والنهاية: سنة ۵۷۱ھ، ۵۷۲ھ، ۵۷۳ھ؛ الكامل فی التاريخ: سنة ۵۷۱ھ، ۵۷۲ھ، ۵۷۳ھ؛ كتاب الروضتين: ۲/ ۴۱۹ تا ۴۲۵

سپاہی تھے جن میں سے اپنے آقا کی حفاظت کرتے ہوئے بعض شہید اور بعض گرفتار ہوگئے۔سلطان چند ساتھیوں سمیت نرغے سے بچ نکلے اور دشوار گزار صحرائی سفر کے بعد قاہرہ پہنچ گئے۔اس حادثے میں سلطان کا بچ جانا ایک کرامت سے کم نہ تھا۔سلطان نے اپنے بھائی توران شاہ کو اس معرکے کی روداد بتاتے ہوئے کہا:

''ہم اس معرکے میں بار بار ہلاک ہوتے ہوتے بچے۔اللہ نے ہمیں اس موقع پر یقیناً اس لیے زندہ رکھا کہ وہ ہم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔''[1]

رملہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کو پسپائی پر مجبور کرنے کے بعد فرنگیوں نے حماۃ اور حارم جیسے اسلامی شہروں کو حملوں کا نشانہ بنایا۔شاہِ یروشلم بالڈون نے دمشق کی شاہراہ پر ایک نیا قلعہ ''حصن الاحزان'' تعمیر کرانا شروع کر دیا۔ان حالات میں سلطان نے الملک العادل کو مصر میں نائب بنا کر شوال ۵۷۳ھ (مارچ ۱۱۷۸ء) میں پھر شام کا رخ کیا۔

ذوالقعدہ ۵۷۴ھ (اپریل ۱۱۸۰ء) میں شاہِ یروشلم نے دمشق کے نواح میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔اس فوج میں بالڈون کے پرچم تلے نصرانیوں کے درجنوں نامی گرامی امراء جمع تھے جن میں توران کا حاکم ہنفری بھی تھا جو اپنی سفاکی کے باعث ہر طرف مشہور تھا۔اس فوج کا سلطان کے سالار فرخ شاہ کے دستے سے اچانک تصادم ہوگیا۔فرخ شاہ کے سپاہیوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم تھی مگر اس نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس شدت سے لڑا کہ فرنگیوں کے چھکے چھڑا دیے۔شاہِ یروشلم زخمی ہو کر فرار ہوا اور ہنفری جان سے مارا گیا۔اس غیر معمولی کارنامے کے باعث فرخ شاہ کا نام تاریخ میں محفوظ ہوگیا۔علامہ شہاب الدین المقدسی فرماتے ہیں:

''فرنگی بڑی رسوائی کے ساتھ واپس لوٹے،ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو زخمی نہ ہو۔روزانہ ان کے کسی نہ کسی زخمی افسر کی موت کی خبر مسلمانوں تک پہنچ رہی تھی۔''[2]

کچھ دنوں بعد بانیاس کے میدانی علاقے میں فرخ شاہ کے دستے کا دشمن سے ایک اور خونریز معرکہ ہوا۔حریف فوج دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جس کی کمان شاہ یروشلم بالڈون کے ہاتھ میں تھی جو شکست کا انتقام لینے کے لیے دیوانہ ہو رہا تھا۔مسلمان جان ہتھیلی پر رکھ کر پوری ثابت قدمی سے لڑے۔اس دوران سلطان صلاح الدین اپنے وفاداروں کا امدادی دستہ لیے آن پہنچے اور گھمسان کی جنگ کے بعد دشمن کو عبرت ناک شکست دینے میں کامیاب ہوگئے۔۷۰ کے لگ بھگ بڑے بڑے عیسائی حاکم،نائٹ اور نواب گرفتار ہوئے تھے جن میں حاکم طرابلس ریمنڈ، ابلین کا حاکم بالیان اور رملہ و نابلس کا حاکم ابن بیرزان بھی شامل تھا البتہ شاہِ یروشلم ایک بار پھر زخمی ہونے کے باوجود فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ربیع الآخر ۵۷۵ھ (ستمبر ۱۱۷۹ء) میں سلطان نے شاہ یروشلم کے نئے تعمیر کردہ قلعے حصن الاحزان کا محاصرہ کیا اور فتح کے بعد اسے بالکل مسمار کرا دیا۔[3] ان پے در پے فتوحات کے ذریعے رملہ کی شکست کا بدلہ بخوبی لے لیا گیا۔

---

① الکامل فی التاریخ:۵۷۳ھ ② کتاب الروضتین سنۃ:۵۷۴ھ ③ کتاب الروضتین سنۃ:۵۷۵ھ

خلیفہ مستضیئ کی وفات، الناصر کی خلافت:

۲ ذوالقعدہ ۵۷۵ھ (۳۰ مارچ ۱۱۸۰ء) کو عالم اسلام کے روحانی سرپرست عباسی خلیفہ مُسْتَضِیُٔ بامراللہ کی وفات ہوگئی۔ مؤرخین اُسے ایک عادل حکمران اور خداترس انسان بتاتے ہیں۔ اُس کا جانشین خلیفہ ناصرلدین اللہ ہوا۔ عباسی خلافت میں سب سے طویل دورِ حکومت خلیفہ ناصر نے پایا جس نے اہل تشیع کے نظریات اپنا لیے اور اہل سنت کے لیے متعدد آزمائشوں اور عالم اسلام کے لیے کئی فتنوں کا سبب بنا۔ ①

سلطان صلاح الدین ایوبی کی فیصلہ کن حیثیت کا استحکام:

سلطان صلاح الدین کو شام، مصر، عراق اور ایشیائے کوچک کی سیاست میں اب ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوچکی تھی۔ اردگرد کے چھوٹے بڑے حکمران باہمی جھگڑوں میں انہی سے فیصلہ لینے لگے تھے۔ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۵۷۶ھ (۱۲ اکتوبر ۱۱۸۰ء) کو دریائے سنجہ کے کنارے ایک معاہدہ ہوا جس میں سلطان اور ایشیائے کوچک کے سلطان قلج ارسلان کے علاوہ موصل اور دیار بکر کے حکام بھی شامل تھے۔ اس طرح ایشیائے کوچک، کیفا، دیار بکر، حلب اور دیگر قریبی ریاستوں میں سلطان صلاح الدین کی فیصلہ کن سیاسی حیثیت مستحکم ہوگئی۔ ②

الملک الصالح کی وفات اور حلب کی نئی حکومت:

سلطان نورالدین زنگی کا جانشین الملک الصالح شدید بیمار ہوکر رجب ۵۷۷ھ (دسمبر ۱۱۸۱ء) میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کے بعد موصل کا حاکم عزالدین مسعود نئے حکمران کی حیثیت سے وہاں پہنچ گیا جسے سیف الدین غازی مرتے ہوئے موصل کا حاکم بنا گیا تھا اور الملک الصالح نے حلب اس کے نام کردیا تھا۔ اس طرح حلب سے موصل تک وسیع عمل داری حاصل کرکے عزالدین مسعود کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ ③

صلاح الدین ایوبی کی عزالدین مسعود سے کش مکش:

اس سے قبل شعبان ۵۷۶ھ (جنوری ۱۱۸۱ء) میں سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ مصر پہنچ چکے تھے۔ تقریباً سوا سال تک وہاں کے انتظامات کو بہتر بنانے کے بعد محرم ۵۷۸ھ (جون ۱۱۸۲ء) میں انہوں نے ایک بار پھر مصر سے شام کی طرف کوچ کیا۔ اس کے بعد انہیں دوبارہ کبھی مصر آنا نصیب نہیں ہوا۔

سلطان نے جلد ہی فرنگیوں کے علاقوں پر حملے شروع کردیے۔ سالہا سال چھاپہ مار لڑائیاں جاری رہیں۔ اس دوران حاکم موصل وحلب عزالدین مسعود سلطان کا ایک طاقتور حریف بن کر ابھرا۔ دیگر کئی امراء بھی اس سے مل گئے، لہٰذا سلطان کو کئی سالوں تک شام، الجزیرہ اور عراق کے حکمرانوں سے بادلِ نخواستہ لڑنا پڑا۔ اس دوران انہوں نے

---

① الکامل فی التاریخ: ۵۷۵ھ

② النوادر السلطانیہ، ص ۹۹؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۵۷۶ھ

③ النوادر السلطانیہ، ص ۴۲

بار بار جنگ کو ٹال کر مذاکرات سے معاملات طے کرنے کی کوششیں کیں۔ کہیں بھی اپنے کلمہ گو حریفوں سے جانی دشمن جیسا سلوک نہیں کیا بلکہ ان سے انتہائی فراخ دلانہ رویہ رکھا۔

رجب ۵۷۸ھ (نومبر ۱۱۸۲ء) میں صلاح الدین ایوبی نے عزالدین مسعود کے مرکز موصل کو جا گھیرا۔ مگر پھر خلیفۂ بغداد کی سفارش پر یہ مہم ترک کر دی۔ اس کے فوراً بعد سلطان نے سنجار فتح کر کے الجزیرہ پر گرفت مضبوط کر لی۔ ①

ریجی نالڈ کا حجاز پر ناکام حملہ:

اُدھر کرک کا شیطان ریجی نالڈ (ارناط برنس) مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ کرک کے جہاز سازی کے کارخانوں میں کئی جہاز ٹکڑوں کی شکل میں تیار کیے گئے جنہیں بار برداری کے جانوروں کے ذریعے ایلہ کے ساحل تک پہنچا دیا گیا۔ یہ بیڑہ بحیرۂ احمر میں اتارا گیا اور فرنگی شوال ۵۷۸ھ (فروری ۱۱۸۳ء) میں حجاز کے قریب پہنچ گئے۔ اگر فرنگیوں کا لشکر مکہ معظمہ پہنچ جاتا تو بڑی ہولناک صورتحال درپیش ہو سکتی تھی۔ اس موقع پر سلطان کا امیر البحر حسام الدین لؤلؤ تیزی سے حرکت میں آیا اور رابغ کے قریب جہاں سے حجاز کی ساحلی پٹی کا آغاز ہوتا ہے، ریجی نالڈ کے بیڑے کو سمندر کی سمت سے گھیر لیا۔ ریجی نالڈ خود تو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کے اکثر ساتھی قتل کر دیے گئے باقی گرفتار ہو گئے۔ اکثر قیدیوں کو قاہرہ میں قتل کرایا گیا جبکہ کچھ کو منیٰ کے میدان میں دس ذوالحجہ کو حاجیوں کی موجودگی میں عین اسی وقت ذبح کرایا گیا جب حجاج کرام قربانیاں کر رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ مقامات مقدسہ کی طرف بری نگاہ ڈالنے والے دشمنوں کو عبرت حاصل ہو۔ ②

سلطان کے مخالفین کا باہم گٹھ جوڑ اور متحدہ لشکر کشی:

۵۷۸ھ کے آخری ایام میں حاکم موصل وحلب عزالدین مسعود نے خلاط اور ماردین کے حکام کو ساتھ ملا کر ایک متحدہ لشکر ترتیب دیا۔ یہ سن کر سلطان نے فوراً مقابلے کے لیے پیش قدمی کی، جس سے اتحادی دم بخود رہ گئے اور جنگ کیے بغیر پسپا ہو گئے۔ سلطان نے محرم ۵۷۹ھ (مئی ۱۱۸۳ء) میں آمد کا ناقابلِ تسخیر قلعہ فتح کیا جہاں سے دس لاکھ چالیس ہزار کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ ہاتھ لگا۔ سلطان نے یہ سب کتب اپنے وزیر قاضی فاضل کو دے دیں۔ ③

حلب کی فتح:

سلطان نے صفر ۵۷۹ھ (جون ۱۱۸۳ء) میں زنگیوں کے مرکزی شہر حلب کا محاصرہ کیا اور حاکمِ شہر عماد الدین سے مذاکرات کر کے یہ شہر حاصل کر لیا۔ اسے بدلے میں سنجار کی ولایت دے دی۔ عماد الدین کا یہ فیصلہ نہ صرف اُمتِ مسلمہ بلکہ خود اس کے حق میں بھی مفید ثابت ہوا، ورنہ حلب ایک مستقل محاذ بن جاتا جہاں دونوں حکمرانوں کی طاقت ضائع

---

① النوادر السلطانیہ، ص ۴۲ تا ۴۴
② کتاب الروضتین: سنۃ ۵۷۸ھ
③ کتاب الروضتین: سنۃ ۵۷۹ھ

ہوتی رہتی۔اب عماد الدین کو سنجار پر عزت کے ساتھ حکومت کرنے اور جہاد میں سلطان کا ساتھ دینے کا موقع ملا جس میں خیر ہی خیر تھی۔ [1]

گستاخ نصرانیوں کو سزا دینے کی مہم

ان فتوحات کے بعد سلطان نے اپنے امراء اور حلیفوں کو خطوط روانہ کیے کہ وہ جہاد کی تیاریاں شروع کر دیں تا کہ گستاخ نصرانیوں کو عبرتناک سزا دی جائے۔سلطان کی تیاریوں سے عیسائی ریاستوں میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی تھی۔انطاکیہ کے حاکم نے گھبرا کر سلطان سے صلح کے معاہدے کی تجدید کر لی۔

۵۷۹ھ (۱۱۸۳ء) میں سلطان نے فرنگیوں کے مقبوضات پر دھاوے جاری رکھے، سلطان کو روکنے کے لیے صفوریہ میں پندرہ ہزار عیسائی سپاہی جمع ہو کر فولہ (بالفور) کی طرف بڑھنے لگے۔جمادی الآخرہ ۵۷۹ھ (اکتوبر ۱۱۸۳ء) میں فولہ سے کچھ فاصلے پر دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں نصرانیوں کو پسپا ہونا پڑا۔

سلطان صلاح الدین نے کرک کے گستاخ ریجی نالڈ کو سزا دینے کے لیے پہلے رجب ۵۷۹ھ اور پھر جمادی الاولیٰ ۵۸۰ھ میں اس قلعے کا یکے بعد دیگرے محاصرہ کیا تاہم کامیابی نہ ہوئی۔ [2]

موصل کا آخری محاصرہ:

ربیع الآخر ۵۸۱ھ (جولائی ۱۱۸۵ء) میں سلطان نے ایک بار پھر موصل کا محاصرہ کیا مگر اس بار بھی یہ مہم ناکام رہی۔

شعبان ۵۸۱ھ (اکتوبر) میں تیسری بار موصل کا محاصرہ کیا۔حاکم موصل عز الدین مسعود نے صلح کی بات شروع کی جو ابھی جاری تھی کہ اچانک سلطان کی شدید بیماری نے اس سلسلے کو روک دیا۔بیماری زیادہ شدید ہوئی تو ماہ رمضان کے آخر میں اچانک موصل کا محاصرہ اٹھا لیا گیا۔حران پہنچ کر بیماری اتنی شدت اختیار کر گئی کہ وہ بستر سے لگ گئے۔اس دوران سلطان نے اپنا محاسبہ کیا اور محسوس کیا کہ ان کے اوقات اور وسائل کا ایک بڑا حصہ اپنے معاصر مسلمان حکمرانوں سے تنازعات اور معرکوں میں صرف ہو رہا ہے۔ان کے وزیر قاضی فاضل رحمہ اللہ کا مشورہ بھی یہی تھا۔انہوں نے کہا:

> ''اس وقت سب سے بڑی نیکی یہ ہوگی کہ مسلمانوں سے قتل و قتال کو مکمل طور پر ترک کر کے اہل کفر و شرک سے جہاد کی طرف پوری توجہ دی جائے۔القدس کو آزاد کرانے اور گستاخِ رسالت نصرانی امراء کو سزا دینے سے بڑھ کر خیر کا کام اور کوئی نہیں ہو سکتا لہٰذا سلطان کو اس کی نذر مان لینی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے ان نیک اعمال کی تکمیل کا پختہ وعدہ کرنا چاہیے۔''

سلطان نے فوراً اللہ تعالیٰ سے عہد کر لیا کہ وہ آئندہ کسی مسلمان حکمران سے جنگ و جدال نہیں کریں گے اور صرف فرنگیوں سے جہاد کے لیے وقف رہیں گے۔سلطان نے اس موقع پر یہ قسم بھی کھائی تھی کہ وہ کرک کے حاکم ریجی نالڈ

---

[1] کتاب الروضتین: سنۃ ۵۷۹ھ

[2] کتاب الروضتین: سنۃ ۵۷۹ھ، ۵۸۰ھ

کو ضرور قتل کریں گے جس نے حاجیوں کو قتل کرنے سے پہلے حضور اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کرتے ہوئے ان سے کہا تھا: ''تمہارا محمد کہاں ہے؟ اسے بلاؤ کہ تمہاری مدد کرے۔''

ذوالحجہ ۵۸۱ھ (مارچ ۱۱۸۶ء) کے پہلے عشرے میں سلطان کی طبیعت سنبھلنے لگی اور ہر طرف مسرت و شادمانی کا سماں ہو گیا۔ سلطان نے بیماری سے ذرا افاقہ پاتے ہی موصل کے وفد کو باریابی کا موقع دیا اور حاکم موصل عزالدین مسعود سے اس شرط پر صلح کر لی کہ اہل موصل ضرورت پڑنے پر سلطان کو فوج مہیا کریں گے۔

نصرتِ خداوندی نے جلد ہی سلطان صلاح الدین کو نصرانیوں پر بھرپور ضرب لگانے کا موقع فراہم کر دیا۔ یروشلم کا تاجدار بالڈون پنجم مر گیا اور اس کی جانشینی کے مسئلے پر شام کے نصرانی امراء دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ امراء سابق بادشاہ کے سوتیلے باپ گائی کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے اور کچھ حاکمِ طرابلس ریمنڈ کو۔

عیسائی ریاستوں کا یہ سیاسی بحران مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے محسوس کیا کہ القدس کے دروازے تک پہنچنے کے لیے بہتر موقع شاید پھر کبھی نہ مل سکے۔ چنانچہ انہوں نے القدس کی طرف بڑھنے کے لیے حتمی منصوبہ بندی کر لی۔ [1]

جنگِ حطین

۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) میں سلطان نے القدس کی آزادی کے لیے فیصلہ کن جنگ لڑنے کا اعلان کر دیا۔ پیشہ ور افواج کے علاوہ رضا کار مجاہدین کی جماعتیں بڑی تعداد میں سلطان کے معسکر پہنچ گئیں۔ سلطان نے صفر ۵۸۳ھ (مئی ۱۱۸۷ء) میں جنوب کا رخ کیا اور کرک اور شوبک پر چند حملے کر کے فوراً فلسطین کی طرف پلٹ آئے اور طبریہ کے آس پاس اپنے چھاپہ مار پھیلا دیے۔ ان چھاپہ مار کارروائیوں کے دوران سلطان کے بیٹے الملک الافضل نے جنگجو عیسائی گروہوں ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے ایک دستے کو اس طرح تہ تیغ کیا کہ سارے نصرانی امراء بلبلا اٹھے اور انہوں نے سلطان کے خلاف ایک بہت بڑا مشترکہ لشکر ترتیب دے ڈالا۔ حاکم طرابلس و طبریہ ریمنڈ سلطان سے صلح کر چکا تھا مگر پادریوں نے اسے بھی عار دلا کر اس متحدہ محاذ میں شامل کر لیا۔ ان سب نے پہلی بار گائی کے یروشلم کے بادشاہ ہونے پر بھی اتفاق کر لیا۔ [2]

نصرانیوں کا لشکر اپنے سب سے مقدس مذہبی نشان ''صلیب الصلبوت'' کو لے کر میدان میں نکلا جو فتح کی علامت تھی کہ ان کے نزدیک اسی صلیب پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی تھی۔ طبریہ سے تقریباً ۱۸ کلومیٹر مغرب کی سمت عیونِ صفوریہ کے میدان پر نصرانی لشکر خیمہ زن ہوا۔ شاہ یروشلم گائی اور حاکم طبریہ ریمنڈ سمیت ہاسپٹلرز اور اور ٹیمپلرز

---

[1] البدایة والنهایة: سنة ۵۸۰ھ
[2] البدایة والنهایة: سنة ۵۸۳ھ

کے جنگجو اور درجنوں دیگر عیسائی امراء اپنی جمعیتوں کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ گستاخ رسالت ریجی نالڈ بھی کرک کے مورچے سے نکل کر یہاں آ گیا۔ اس طرح نصرانیوں کی مجموعی تعداد ۶۳ ہزار کے لگ بھگ ہو گئی۔

اسلامی فوج ۲۱ ربیع الآخر ۵۸۳ھ (۳۰ جون ۱۱۸۷ء) کو بحیرۂ طبریہ کے مغرب میں ایک سرسبز و شاداب اور بلند سطح مرتفع پر خیمہ زن ہوئی، سامنے تقریباً ۱۶ میل لمبا چٹیل میدان تھا جس کے دوسرے سرے پر فرنگی جنگ کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان کے پاس سلطان کے کیمپ تک پہنچنے کے لیے اس میدان کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اس میدان میں کوئی چشمہ یا تالاب نہیں تھا۔ اس کے کناروں پر ٹیلوں اور گھنی جھاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا جن کی اوٹ سے نصرانیوں پر بھرپور تیراندازی کی جا سکتی تھی۔ دونوں حریف نہایت محتاط اور ہوشیار تھے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ دوسرا پیش قدمی شروع کرے۔ عیسائی منتظر تھے کہ مسلمان اکتا کر خود شام واپس چلے جائیں۔ آخر سلطان ایوبی نے انہیں یلغار پر برانگیختہ کرنے کے لیے ریمنڈ کے شہر طبریہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ خبر سن کر عیسائی امراء مشتعل ہو گئے، انہوں نے ایک دوسرے کو شرم دلائی اور ریمنڈ کے منع کرنے کے باوجود آگے بڑھ کر سلطان پر ٹوٹ پڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

۲۳ ربیع الآخر ۵۸۳ھ (۲ جولائی ۱۱۸۷ء) کی صبح عیسائی لشکر نے طبریہ کی جانب کوچ کا آغاز کیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ شام تک طبریہ کے چشموں تک پہنچ جائیں گے مگر مجاہدین دائیں بائیں سے نصرانی لشکر کو مسلسل تیروں کا نشانہ بناتے رہے، چنانچہ فرنگیوں کی پیش قدمی اتنی سست رہی کہ وہ شام تک بمشکل پانچ میل طے کر پائے۔

جمعہ ۲۴ ربیع الآخر ۵۸۳ھ (۳ جولائی) کو انہوں نے پھر سفر شروع کیا۔ سلطان کے سپاہی ان پر تیراندازی کرتے رہے۔ گرمی کی شدت سے بے حال نصرانیوں نے اس دن شام تک اپنے ساتھ موجود پانی ختم کر دیا۔ اس دن بھی وہ پانچ چھ میل آگے بڑھ پائے۔ شام تک ان کا دم خم بالکل ختم ہو چکا تھا۔

۲۵ ربیع الآخر (۴ جولائی) کی صبح فیصلہ کن جنگ کا آغاز ہوا۔ عیسائی اپنی پیاس بجھانے کے لیے چشموں تک پہنچنا چاہتے تھے مگر سلطان نے بھاری نفری تعینات کر کے یہ راستے بند کر دیے تھے۔ سلطان کے حکم سے میدان کی خشک گھاس کو آگ لگا دی گئی جس سے نصرانیوں کے گھوڑے بدک کر ادھر ادھر بھاگنے لگے اور صفوں میں بدنظمی پیدا ہو گئی۔ تب سلطان نے نعرۂ تکبیر بلند کر کے یک بارگی بھرپور حملے کا حکم دیا۔

سہ پہر تک شدید جنگ ہوتی رہی۔ آخر نصرانیوں کی ہمت جواب دے گئی۔ ان کا سب سے کہنہ مشق جرنیل ریمنڈ زخمی ہو کر اپنی فوج سمیت فرار ہو گیا۔ اس کے بعد صیدا کا شہزادہ بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ نکل بھاگا۔ پادریوں نے صلیب اعظم کا واسطہ دے کر باقی امراء کو بھاگنے سے روکا۔ دیر تک خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ زوال کے وقت عیسائی پیاس سے بے دم ہو رہے تھے۔ آخر میں عیسائی بادشاہ گائی نے ریجی نالڈ، ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے دستوں سمیت ایک ٹیلے پر پناہ لی مگر سلطان نے انہیں گھیر کر پے در پے حملوں سے روند ڈالا۔ صلیب الصلبوت گرا دی گئی اس کے ساتھ ہی باقی ماندہ نصرانیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ بڑے بڑے حکمران، شہزادے، نواب، نائٹ اور سردار سر جھکائے قیدیوں

میں شامل تھے۔عام قیدیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مسلمان انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے جا رہے تھے۔
دوسری طرف ان کے مقتولین سے میدان پٹا پڑا تھا، جگہ جگہ لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔
اس دور کے ایک مؤرخ کا کہنا ہے:

''مقتولین اتنے زیادہ تھے کہ انہیں دیکھنے والا باور نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمانوں نے کسی کو قیدی بنانے کے لیے زندہ چھوڑ دیا ہوگا اور قیدی اتنے زیادہ تھے کہ انہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ مسلمانوں نے کسی کو قتل بھی کیا ہوگا۔''

القدس پر نصرانیوں کے قبضے کے بعد یہ ان کی سب سے بڑی شکست تھی جس نے مسلمانوں کے لیے اگلی تمام فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔[1]

ریجی نالڈ کا انجام:

جنگ کا ہنگامہ تھمتے ہی سلطان صلاح الدین ایوبی کی خدمت میں یروشلم کے سابق بادشاہ گائی، اس کا بھائی اور ریجی نالڈ حاضر کیے گئے۔سلطان نے گائی کو قریب بٹھایا اور برف ملا ٹھنڈا مشروب منگوا کر اسے پلوایا۔گائی نے پیالے میں بچا ہوا مشروب ریجی نالڈ کو دے دیا۔اہل عرب کے ہاں قیدی کو پانی پلانا جان کی امان کے مترادف سمجھا جاتا تھا اس لیے ریجی نالڈ سمجھا وہ سزائے موت سے بچ جائے گا مگر سلطان نے ترجمان کے ذریعے گائی سے کہا: ''میں خود اسے ہرگز پانی نہ پلاتا۔تم نے بلا اجازت اس شخص کو خود پانی پلایا ہے، لہٰذا اسے امان نہیں ملے گی۔''

پھر سلطان نے ریجی نالڈ کو خلوت گاہ میں طلب کر کے اس کے جرائم گنوائے اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی مگر وہ نہ مانا۔چوں کہ اس نے حاجیوں پر حملے کے دوران حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اپنے محمد سے کہو آ کر تمہیں چھڑا لے۔(نعوذ باللہ) اس لیے سلطان نے اسے اس کا وہ بے ہودہ جملہ یاد دلاتے ہوئے کہا: ''اچھا تو لے! میں تجھ سے محمد ﷺ کا انتقام لیتا ہوں، میں حضور ﷺ کا نمائندہ بن کر ان کی طرف سے ان کی امت کا بدلہ لے رہا ہوں۔''

یہ کہتے ہی سلطان نے تلوار کے ایک ہی وار میں ریجی نالڈ کو کاندھے سے سینے تک چیر کر رکھ دیا۔سلطان کے خادموں نے مزید وار کر کے اسے قتل کر دیا اور لاش باہر پھینک دی۔

گائی اس خوفناک منظر کو دیکھ کر لرز رہا تھا۔سلطان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''بادشاہوں کی روایت نہیں کہ وہ بادشاہوں کو قتل کریں۔مگر اس شخص کی حرکتیں ہر حد سے متجاوز ہو چکی تھیں، اس لیے اس کے ساتھ جو ہوا سو ہوا۔''

ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز کے سردار اور جنگجو بھی کسی رعایت کے بغیر قتل کر دیے گئے کیوں کہ یہ لوگ ہر جنگ میں پیش پیش رہے تھے۔گائی اور دیگر اہم قیدیوں سے بہر حال اچھا برتاؤ کیا گیا اور انہیں دمشق کے قید خانے بھیج دیا گیا۔

حطین کی جنگ میں ایک عجیب لطیفہ یہ ہوا کہ سلطان کے ایک غریب سپاہی کے حصے میں ایک قیدی آیا، اس سپاہی کو

[1] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۵۸۳ھ ، الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۸۳ھ، کتاب الروضتین: سنۃ ۵۸۳ھ

جوتوں کی ضرورت تھی، اس نے کسی سے جوتے خریدے اور قیمت کے طور پر قیدی اسے دے دیا۔ لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ قیدی اتنا سستا کیوں دے دیا؟ وہ بولا:

''میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ نصرانیوں کی ذلت کی مثال بن کر یاد کیا جاتا رہے۔''

صلیب کو قاضی ابن عصرون کے حوالے کر دیا گیا، وہ اسے لے کر دمشق میں داخل ہوئے تو عوام کا ایک سیلاب اس تاریخی منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہوگیا۔ یہ صلیب دمشق کے مقام ''قنطاریہ'' میں ایک عرصے تک اوندھی لٹکی رہی اور مسلمانوں کو توحید کی شاندار فتح اور تثلیث کی عبرتناک شکست کی یاددلاتی رہی۔ [1]

غازیان اسلام کی سیلابی فتوحات:

سلطان نے حطین کے بعد مغرب کی طرف پیش قدمی کر کے ساحل تک دھاوا بولا تاکہ نصرانیوں کے کمک ورسد کی لائن منقطع ہو جائے۔ اس طرح یکم جمادی الاولیٰ ۵۸۳ھ (۹ جولائی ۱۱۸۷ء) کو ساحلی شہر ''عکا'' کو فتح کر لیا۔

اس کے بعد سلطان کی افواج کئی حصوں میں بٹ کر ایک سیلاب کی طرح شام اور فلسطین میں پھیل گئیں۔ سلطان کے بھائی الملک العادل نے مجدل یابا اور ساحلی شہر یافا پر قبضہ کیا۔ دوسرے سالاروں نے بیسان، دبوریہ، جنین، طور، زرعین، اللجون، القیمون، الزیب، معلیا، الفولہ، منواث، ناصرہ اور اسکندرونہ جیسے قلعے دیکھتے ہی دیکھتے فتح کر لیے۔ تقی الدین عمر نے ''صور'' کی ناکہ بندی کر کے وہاں سے فرنگیوں کی کمک اور رسد کا راستہ مسدود کر دیا۔ نابلس، تبنین، قیساریہ، جبیل، حیفا، صیدا، بیروت اور ارسوف جیسے اہم مورچے بھی سرنگوں ہو گئے۔ یہ تمام فتوحات ایک ماہ کی مختصر مدت میں نصیب ہوئیں۔ اس کے بعد ۲۹ جمادی الآخرہ ۵۸۳ھ (۵ ستمبر ۱۱۸۷ء) کو عسقلان بھی فتح کر لیا گیا جسے بیت المقدس کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ ان علاقوں میں مسلمان بھی آباد تھے۔ سقوط القدس کے بعد ان کی تیسری نسل نصرانیوں کی غلامی میں تھی۔ سلطان کی فاتحانہ آمد پر ان بے کسوں کی مسرت وسرشاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک طویل مدت بعد یہاں ایک بار پھر اذانیں گونجیں اور اسلامی شعائر زندہ ہوئے۔ [2]

بیت المقدس کی فتح

ان فتوحات کے بعد سلطان نے بڑے اہتمام سے بیت المقدس کا رخ کیا جہاں شام کے نصرانیوں کی تمام باقی ماندہ قوتیں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ ان میں پیشہ ور سپاہی بھی تھے اور زائرین بھی، تارک الدنیا راہب بھی تھے اور مذہبی پیشوا بھی۔ خود مقامی باشندوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی جو القدس کو اپنا مذہبی ورثہ تصور کرتے تھے اور اس سے کسی قیمت پر دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ نصرانیوں کے متعصب جنگجو گروہوں ٹیمپلرز، ہاسپٹلرز اور ہاروبیہ کے لوگ بھی یہاں

---

(۱) کتاب الروضتین: ۳/ ۲۸۵ تا ۲۹۹، ط الرسالۃ، الکامل فی التاریخ سنۃ ۵۸۳ھ

(۲) کتاب الروضتین: ۳/ ۳۰۸ تا ۳۲۶، ط الرسالۃ، الکامل فی التاریخ سنۃ ۵۸۳ھ

بکثرت تھے۔ سلطان کے حملے کے خوف کے باوجود ان میں لڑنے کا زبردست جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ یروشلم کے سب سے بڑے پادری ''بطریق اعظم'' کی موجودگی ان کے حوصلے بلند کر رہی تھی۔ پھر قلعہ ابلین کے حاکم بالیان بن بارزان کی شکل میں انہیں ایک نیا عسکری قائد بھی مل گیا تھا۔

ادھر سلطان صلاح الدین ایوبی اپنے جانبازوں کے ساتھ القدس کی جانب چلے تو فتح بیت المقدس کا شرف حاصل کرنے کے لیے شام اور مصر کے علماء، فقہاء اور مشائخ کی بہت بڑی تعداد بھی اس لشکر میں شامل ہوگئی۔ کوچ سے پہلے سلطان ایوبی نے خلافِ معمول ایک طویل خطبہ دے کر مسلمانوں کی ہمت وغیرت کو ابھارا۔ انہوں نے کہا:

''اگر اللہ اپنے دشمنوں کو بیت المقدس سے نکال باہر کرنے کی توفیق ہمیں عطا کرے تو اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ۹۱ برس ہو گئے کہ بیت المقدس کافروں کے قبضے میں ہے۔ اس تمام مدت میں ایک لمحے کے لیے بھی یہاں خدائے واحد کی عبادت نہیں ہوئی۔ مسلم بادشاہوں کی توجہ اس کے سوا دوسری مہمات میں صرف ہوتی رہی، اس سے غفلت میں کئی نسلیں گزر گئیں اور فرنگی اس کے مالک بنے رہے۔ ہمیں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی فتح کے لیے دل وجان سے کوشش کرنا ہوگی۔''[1]

۱۵ رجب ۵۸۳ھ (۲۰ ستمبر ۱۱۸۷ء) کو اسلامی لشکر القدس کے سامنے پہنچا۔ کئی دن تک شہر کی فصیل کے سامنے خونریز جنگ ہوتی رہی۔ آخر مسلمانوں کی منجنیقوں نے فصیل کا ایک حصہ گرادیا۔ لین پول اس وقت شہر کی اندرونی حالت بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ شہر میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی، چرچ لوگوں سے بھر گئے تھے، دعائیں ہو رہی تھیں، لوگ پادریوں کے سامنے اپنے اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے تھے اور خود کو اذیتیں دے کر خدا سے رحم کی فریادیں کرتے تھے۔ شہر کو آغوشِ رحمت میں لانے کی خاطر پادریوں اور راہبوں نے انجیل اور صلیب کے ساتھ مناجات گاتے ہوئے شہر میں جلوس نکالا مگر (خود لین پول کے الفاظ میں) ''خدا اس شہر کی بدکاری اور شہوت پرستی سے نالاں ہو چکا تھا، گناہوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی دعائیں اس کی دربار میں قبول نہ ہوئیں۔''[2]

فصیل شکستہ ہونے کے بعد عیسائیوں کے پاس دو ہی صورتیں تھیں: وہ ہتھیار ڈال دیتے یا لڑتے لڑتے مر جاتے۔ آخر شہر کے سرکردہ افراد پر مشتمل ایک وفد سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارکانِ وفد نے مقدس شہر سلطان کے حوالے کر دینے پر رضامندی ظاہر کی اور اس کے بدلے سلطان سے جان ومال کی امان طلب کی مگر سلطان کو خوب یاد تھا کہ ان صلیبیوں نے القدس پر قبضے کے وقت بے گناہ مسلمانوں پر کیسے لرزہ خیز مظالم ڈھائے تھے۔ انہوں نے کہا:

''میں بیت المقدس کو تم سے اسی طرح چھینوں گا جیسے اکانوے برس پہلے تم نے مسلمانوں سے چھینا تھا۔ تب صلیبیوں نے قتلِ عام کو روا سمجھا تھا اور کسی جان کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ پس اب میں صلیبیوں کے مردوں کو قتل کر کے فنا کر ڈالوں گا اور ان کی عورتوں کو باندیاں بنالوں گا۔ برائی کا بدلہ اس کی مثل ہی ہوتا ہے۔''

---

[1] کتاب الروضتین: سنۃ ۵۸۳ھ
[2] صلاح الدین لین پول، ص ۲۰۱

سلطان نے اس جواب کے ذریعے اپنے اختیار کو واضح کر دیا تھا۔ تاہم فتح القدس کے بعد انہوں نے مقامی لوگوں سے جو انتہائی فراخ دلانہ سلوک کیا، اسے سامنے رکھیں تو صاف محسوس ہوتا ہے سلطان نے اس وقت وفد پر اسلام کی برتری اور اپنے اختیار کا سکہ جمانے کے لیے یہ سخت فیصلہ سنایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے مسلمانوں کے قہر اور شوکت کا رعب طاری کر کے دشمن کے غرور و تکبر کا بت پاش پاش کر دیا جائے اور فتح کے بعد انہیں خلافِ توقع احسانات کرتے ہوئے ممنون کیا جائے۔ سلطان کے اعلان نے نصرانیوں کو لرزا دیا۔ جب وفد کے ارکان واپس پہنچے تو القدس میں ایک کہرام مچ گیا۔ تب شہر کا عارضی حاکم بالیان آخری کوشش کے طور پر خود سلطان کے پاس آیا اور بڑی منت وزاری کے ساتھ اہل شہر کے لیے امان کی درخواست کی مگر سلطان کا جواب تھا:

''تمہارے لیے کوئی امن ہے نہ امان۔ اب ذلت ہی تمہارا اوڑھنا بچھونا ہے۔''

آخر بارزان نے مایوسی اور غصے کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا:

''ٹھیک ہے، جب ہم آپ کی امان سے مایوس اور آپ کے احسان سے محروم کر دیے گئے ہیں تو ہم لڑتے لڑتے مرجائیں گے۔ اپنی عورتوں اور بچوں کو خود قتل کر دیں گے، مال و دولت اور ساز و سامان کے ذخیروں کو نذرِ آتش کر دیں گے۔ گنبد صخرہ اور مسجد اقصیٰ کو منہدم کر دیں گے۔ ہمارے پاس آپ کے پانچ ہزار مسلمان قیدی ہیں۔ ان سب کو قتل کر دیں گے۔ بتائیے پھر اس فتح سے آپ کو کیا حاصل ہوگا؟''

سلطان نے جب دیکھا کہ نصرانی مایوسی و اشتعال کی انتہاء میں مسجدِ اقصیٰ تک کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں تو انہوں نے مذاکرات کی پیش کش قبول کر لی۔ ویسے بھی سلطان چاہتے تھے کہ اسلام کی قوت کا سکہ جما کر نصرانیوں کو گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیں اور یہ مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ طے ہوا کہ اہل شہر کو جان کی امان دی جائے گی۔ تاہم وہ قیدی تصور کیے جائیں گے، مسلمان انہیں طے شدہ نرخ یا زرِ فدیہ کے مطابق رہا کرتے جائیں گے۔ بارزان، پادری، ہاسپٹلرز، ٹیمپلرز اور دیگر جنگجو گروہوں کے افراد، پیشہ ور سپاہی، نائٹ، یروشلم کے اسیر بادشاہ گائی کی ملکہ اور تمام خواص بھی معاہدے میں شامل سمجھے گئے۔ سلطان نے کسی سخت سے سخت دشمن کا بھی استثنا کر کے اس کا خون بہانے پر اصرار نہیں کیا۔ معاہدے پر ۲۷ رجب ۵۸۳ھ (اکتوبر ۱۱۸۷ء) کو دستخط کیے گئے اور شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ ایک ناقابلِ فراموش دن تھا۔ ارضِ مقدس اس دن فاتحین اسلام کی قدم بوسی کر رہی تھی، مسلمانوں کے چہروں پر خوشی، نشاط اور بشاشت کا ایسا عالم تھا جو کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ القدس کے قلعے، فصیل اور برجوں سے صلیبیں ہٹائی جارہی تھیں، ان کی جگہ سرخ ہلالی پرچم نصب کیے جارہے تھے۔ گنبدِ صخرہ پر نصب صلیب اتاری گئی تو ایک طرف مسلمانوں کی تکبیر و تہلیل کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور دوسری طرف نصرانی آہ وزاری کر رہے تھے۔

نصرانیوں نے مسجد اقصیٰ کی پاکیزگی اور دلکشی کو پامال کرتے ہوئے گنبد صخرہ اور مسجد اقصیٰ کی اصل شکل کو مسخ کر دیا تھا۔ محرابِ مسجد کو دیوار چن کر چھپا دیا گیا تھا۔ گنبد صخرہ کے نیچے چرچ اور قربان گاہ بنا کر وہاں بے ہودہ تصاویر کی بھرمار

کردی گئی تھی۔ وہاں موجود مقدس چٹان ''صخرہ شریفہ'' پر خنزیر کی شبیہیں بنادی گئی تھیں اور صخرہ کو سنگ مرمر کی سلوں سے اس طرح ڈھانپ دیا گیا تھا کہ اسے دیکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے حکم کے مطابق نصرانیوں کی ان تمام تعمیرات کو منہدم کر دیا گیا، محراب مسجد کو کھول دیا گیا، صخرہ شریف سے سنگ مرمر کی سلوں کو ہٹا دیا گیا، مورتیاں توڑ دی گئیں، تصاویر اور صلیبیں مٹادی گئیں۔ گنبد صخرہ اور مسجد کو مکمل طور پر پاک وصاف کر دیا گیا۔

مسجد اقصیٰ میں پہلا جمعہ پڑھانے کا شرف دمشق کے قاضی القضاۃ محی الدین ابوالمعالی کو نصیب ہوا۔ انہوں نے نماز سے پہلے فصیح وبلیغ عربی میں ایسا شاندار خطبہ دیا کہ لوگ جھوم اٹھے۔ انہوں نے انتہائی مؤثر پیرائے میں ایک تقریر کی جس میں اظہارِ مسرت بھی تھا اور احساسِ تشکر بھی۔ جوش بھی تھا اور سنجیدگی بھی، حوصلہ افزائی بھی تھی اور تنبیہ ونصیحت بھی۔ تقریر کے دوران حاضرین کے دل موم کی طرح پگھل رہے تھے، آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی اور دل شکر وامتنان کے جذبات سے لبریز تھے۔

اس کے بعد قاضی القضاۃ نے آہوں اور سسکیوں کی گونج میں یہ بے تابانہ دعا کی!!

''یا اللہ! اس بادشاہ کی حکومت کو باقی رکھ جو تیری ہیبت کے آگے جھکا ہوا بندہ ہے، تیری نعمتوں کا معترف اور تیری عطا کا شکر گزار ہے، جو تیری شمشیرِ آبدار ہے، جو تیرا چمکتا شعلہ ہے۔ تیرے دین کا محافظ ہے۔ تیری حدود کا نگران ہے۔ تیرے احکام کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔

اے اللہ! حضرت محمد ﷺ کی جدوجہد کو مشکور فرما، ان کے اوامر ونواہی کو مشرق تا مغرب ساری دنیا میں نافذ فرما۔ یا اللہ! آپ ﷺ کی برکت سے شہروں کے مراکز کو بھی اچھا کر دے اور مضافات کو بھی۔ ملک کے اضلاع کو بھی درست کر دے اور سرحدوں کو بھی۔ اے اللہ! ان کے طفیل کفار کے مسخ چہروں کو رسوا کر دے اور سرکشوں کی ناک نیچی کر دے۔''[1]

سلطان کا مفتوحین کے ساتھ حسنِ سلوک:

القدس کے غیر مسلم معاہدے کے مطابق چالیس دن کے اندر اندر فدیے کی رقم ادا کر کے ارضِ مقدس چھوڑ دینے کے پابند تھے۔ زرِ فدیہ کی وصولی اور عیسائی آبادی کا انخلاء ایک بہت بڑا اور پیچیدہ کام تھا مگر سلطان صلاح الدین نے اسے پوری خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ہر مرد دس دینار، ہر عورت پانچ دینار اور ہر بچہ یا بچی دو دینار ادا کر کے شہر سے نکل رہے تھے۔ جو لوگ زرِ فدیہ ادا کرتے جا رہے تھے وہ صور جانے والے قافلوں میں شامل ہو رہے تھے۔ قافلوں کو صور تک بحفاظت لے جانا بھی سلطان کے سپاہیوں کی ذمہ داری تھی۔ انخلاء کے عمل میں سلطان کی خوش تدبیری کا یہ عالم تھا کہ مقامی لوگوں سے ناروا سلوک کا کوئی ایک واقعہ بھی رونما نہیں ہوا۔

خود یورپی مؤرخین نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور سلطان کے اس بے مثال حسن سلوک اور حسن انتظام کی

---

① کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: سنة ۵۸۳ھ، الکامل فی التاریخ: سنة ۵۸۳ھ

تعریف کی ہے۔

سلطان نے فدیے سے حاصل شدہ اس رقم کو جو مجموعی طور پر ایک لاکھ دینار تھی، بلا تکلف امرائے سلطنت، علماء، فقہاء، صوفیاء، مہمانوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ اس میں سے ایک دینار بھی پاس نہ رکھا۔ آخر میں صرف وہی نصرانی باقی رہ گئے جو زرِ فدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ معاہدے کے تحت یہ سب غلام تھے مگر سلطان نے یہاں بھی پوری فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ بطریق (بڑے پادری) اور سابق حاکم بالیان نے سلطان سے درخواست کی کہ ایک ایک ہزار افراد انہیں عطا کر دیے جائیں تو سلطان نے فوراً ان کی خواہش پوری کر دی۔ سلطان نے تمام بوڑھے لوگوں کو خود آزاد کر دیا۔ سلطان کے کئی امراء نے اس طرح ہزاروں مرد و زن سلطان سے مانگ مانگ کر آزاد کیے۔ [1]

صلیبی جنگوں کے ایک مشہور کردار ارنول نے سلطان کے حسن سلوک کے یہ واقعات بچشم خود ملاحظہ کیے تھے، اس کا بیان ہے کہ سلطان نے صلیبی جنگوں کے مقتول اور گرفتار نائٹوں کی بیویوں سے بڑا شریفانہ برتاؤ کیا، جب ان خواتین نے سلطان کے سامنے اپنی بدحالی کی فریاد کی تو سلطان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان خواتین کے شوہروں میں سے جو گرفتار تھے، وہ فوراً رہا کر دیے گئے۔ جن عورتوں کے خاوند قتل ہو چکے تھے انہیں ان کے مرتبے کے مطابق مال و دولت دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا گیا اور ہر طرح ان کی تشفی اور دلداری کی گئی۔ وہ سلطان کے اس احسان سے اتنی متاثر ہوئیں کہ ہمیشہ ان کی سخاوت کا ذکر ممنون لہجے میں کیا کرتی تھیں۔ [2]

سلطان کی مہربانی، لین پول کی زبانی:

اس موقع پر لین پول پہلی صلیبی جنگ میں القدس پر نصرانیوں کے قبضے کے دوران مسلمانوں پر توڑے گئے مظالم کو یاد کر کے سلطان صلاح الدین کے رحم و کرم کو داد دیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ وہ کہتا ہے:

> ''جب ہم سلطان کے ان احسانات کو یاد کرتے ہیں تو ہمیں وہ وحشیانہ حرکات یاد آتی ہیں جو صلیبیوں نے بیت المقدس فتح کرتے وقت کی تھیں۔ جب گاڈ فرے اور ٹنکرڈ یروشلم کے بازار سے گزر رہے تھے اور وہاں مسلمانوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور زخمی جاں بلب ہو کر تڑپ رہے تھے۔ جب صلیبیوں نے بے قصور اور بے کس مسلمانوں کو شدید اذیتیں دے دے کر قتل کیا تھا اور انسانوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ جب مسلمان القدس کی چھت پر پناہ کی تلاش میں چڑھے تھے اور نصرانیوں نے انہیں وہیں سے تیروں سے چھلنی کر کے نیچے گرا دیا تھا۔ ان کے اس قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا، انہوں نے اس مقدس شہر کو ظلم اور بدنامی کے رنگ میں رنگ دیا جہاں مسیح نے رحم و محبت کا وعظ سنایا تھا اور فرمایا تھا: مبارک ہیں وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں کیوں کہ ان پر بھی رحم کیا جائے گا۔ یہ عیسائی اس پاک اور مقدس شہر کو مسلمانوں کے خون سے مقتل بناتے ہوئے اس کلام کو بھول گئے تھے۔ یہ بے رحم نصرانیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین نے ان کے ساتھ لطف و مہربانی کا سلوک کیا۔

[1] صلاح الدین، از لین پول، ص ۲۰۲

اگر صلاح الدین کے کارناموں میں سے صرف یہی ایک کام دنیا میں مذکور ہوتا کہ اس نے کس انداز سے یروشلم کو واپس لیا تو ایک یہی کارنامہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانے کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی ہمت انسان تھا جو شان و مرتبے میں تنہا اور بے نظیر تھا۔''[1]

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس شہر کو دوبارہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بنا دیا۔ پورے بیت المقدس کے لیے حفاظ، قراء، علماء، صالحین اور صوفیاء کی جماعتیں تشکیل دیں جو یہاں ہمیشہ ذکر و عبادت اور تلاوت میں مشغول رہتی تھیں۔ القدس کے انتظامات کے مصارف کے لیے بڑی بڑی جائیدادیں وقف کر دی گئیں۔ یہاں دینی مدارس کھلوائے، خانقاہیں اور سرائیں بنوائیں۔ سلطان نور الدین زنگی نے حلب میں بیت المقدس کے لیے ایسا منبر تیار کرایا تھا جس کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ سلطان نے فوراً حلب سے وہ منبر منگوا کر مسجد اقصیٰ میں نصب کرا دیا۔ علامہ ابن اثیر کہتے ہیں کہ منبر کی تیاری اور اسے القدس میں نصب کرنے کے درمیان ۲۰ برس سے زائد عرصہ گزر گیا تھا۔ یہ نور الدین زنگی کی کرامت اور ان کی حسن نیت کا اثر تھا کہ وفات کے بعد بھی ان کی محنت بار آور ہوئی۔[2]

❁❁❁

تیسری صلیبی جنگ

بیت المقدس کی فتح کے کچھ دنوں بعد سلطان نے ساحلی شہر صور کا رخ کیا جہاں یورپ سے آیا ہوا ایک نصرانی نواب کونرڈ مارکوئیس سپاہیوں کی بڑی تعداد کے ساتھ مورچہ زن ہو چکا تھا۔ اس جزیرہ نما شہر کی تین سمتیں سمندر کی وجہ سے پہلے ہی بری حملے سے محفوظ تھیں۔ سلطان صلاح الدین ۹ رمضان ۵۸۳ھ (۱۲ نومبر ۱۱۸۷ء) کو صور پہنچ گئے۔ شہر پر پے در پے حملوں اور بار بار نقصان اٹھانے کے بعد سلطان نے بحری فوج کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

سلطان کے پیغام پر مصری بحری فوج کا کمانڈر عبدالسلام مغربی اپنے جنگی جہاز صور کے بحری جہازوں کے مقابلے پر لے آیا، یوں صور کی فوج کی مدافعت کمزور پڑ گئی۔ فتح و نصرت چند گام پر تھی کہ ایک معمولی سی غلطی نے جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔ ایک رات بحری فوج کے پہرہ داروں کی آنکھ لگ گئی اور فرنگی بڑی خاموشی سے کشتیوں کے ذریعے مسلمانوں کے جہازوں تک پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے پوری کوشش کی کہ اپنے جہازوں کو نکال کر لے جائیں مگر فرنگی تعاقب کرتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔ راستہ مسدود دیکھ کر مسلمانوں نے جہازوں کا رخ ساحل کی طرف کر دیا اور انہیں ریت میں دھنسا کر ناکارہ کر دیا تاکہ وہ دشمن کے ہاتھ نہ لگیں۔ اس کے بعد بحری طاقت نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی کامیابی کے امکانات بعید ہو گئے۔[3]

---

[1] صلاح الدین، لین پول، ص ۲۰۲، ۲۰۵

[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۸۳ھ ، کتاب الروضتین: سنة ۵۸۳ھ ، النوادر السلطانیہ، ص ۵۵ [3] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۸۳ھ

وسطی شام کے نصرانیوں کے خلاف مہمات:

آخر سلطان نے محاصرہ اٹھا کر شمالی شام کے دوسرے شہروں کا رخ کیا۔ یہاں انہوں نے سال بھر مہم جوئی کی اور یکے بعد دیگرے جبلہ، لاذقیہ، طرطوس، صہیون، بغراس، سرمینیہ اور برزیہ کے ناقابل تسخیر قلعے فتح کیے یوں انطاکیہ تک سارا ساحلی علاقہ ان کے قبضے میں آگیا اور مملکت کے وسط میں واقع نصرانی بیرونی امداد سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد سلطان نے وسطی شام کے قلعوں پر قبضہ کیا جن میں صفد اور حصن کوکب قابلِ ذکر ہیں۔ ①

اس دوران مارگریٹ نامی ایک یورپی نواب بحری بیڑہ لے کر ساحل کے نصرانیوں کی مدد کے لیے پہنچا مگر اس کی فوجیں اترنے سے پہلے سلطان نے اکثر شہر فتح کر لیے تھے۔ یہ دیکھ کر مارگریٹ نے سلطان سے ملاقات کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا سلطان کو اس پر آمادہ کر لیا جائے کہ نصرانیوں کے شہر سابقہ حکمرانوں کو واپس کر دیے جائیں۔ اس نے حاضر ہو کر سلطان کو مقبوضہ عیسائی علاقوں کے بارے میں پالیسی تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا:

''آپ بہت بڑے بادشاہ ہیں، رحم دل حکمران ہیں، آپ کے عدل و احسان کے چرچے ہر طرف ہیں۔ آپ نے نصرانیوں کی جو گت بنائی سو بنائی۔ اب وہ مجبور و بے بس ہو چکے ہیں۔ کیا خوب ہوگا کہ ساحل شام کے عیسائی حکمرانوں کو اپنی سرپرستی میں رکھتے ہوئے، احسان و انعام کے ساتھ ان کے شہر واپس کر دیں۔ اس طرح وہ آپ کے فرماں بردار غلام بن جائیں گے۔ آپ دور ہوں یا نزدیک وہ آپ کے تابع دار رہیں گے۔''

سلطان نے اس تجویز کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا تو مارگریٹ نے سنگین نتائج سے خبردار کرتے ہوئے کہا:

''اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو سمندر پار کے تمام ملکوں کے لشکر قطار در قطار آپ پر چڑھ دوڑیں گے اور موج در موج ساحل پر چھا جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ یہاں کے مقامی عیسائی حکمرانوں کا پیچھا چھوڑ دیں اور ان سے درگزر کریں۔''

سلطان نے اس دھمکی سے خائف ہوئے بغیر جواب دیا:

'ہمیں اللہ تعالیٰ نے زمین کو مسخر کرنے کا حکم دیا ہے، ہم اس کی اطاعت کے پابند ہیں اور اسے فرض سمجھتے ہیں، جہاد میں سرگرمی ہم پر لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے ہمیں شہروں کی فتح کی توفیق دی ہے۔ اگر زمین کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ساری مخلوق بھی ہمارے خلاف جمع ہو جائے تب بھی ہم مقابلے میں اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ ہمیں دشمنوں کی تعداد کی کوئی پروا نہیں۔'' ②

تیسری صلیبی جنگ بھڑکانے کے لیے نصاریٰ کی حیلہ سازیاں:

بیت المقدس پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے قبضے کی خبروں نے سارے یورپ میں بے چینی کی ایک لہر دوڑا دی

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۵۸۴ھ

② النوادر السلطانیه، ص ۲۳

تھی۔ القدس کا لاٹ پادری ولیم صوری راہبوں، مذہبی پیشواؤں اور امراء کے ایک وفد کے ہمراہ سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس، روم پہنچا اور پاپائے اعظم کی سرپرستی میں پورے یورپ کا دورہ کیا۔ اس نے مسلمانوں کے مظالم کے فرضی افسانوں کے ذریعے یخ بستہ یورپ کو ایک دہکتے آتش فشاں میں تبدیل کر دیا۔

کونرڈ نے یورپ کے سادہ لوح عوام کو مشتعل کرنے کے لیے یہ مشہور کر دیا کہ مسلمان مزارِ مسیح کی بدترین توہین کر رہے ہیں۔ اس نے ایک بہت بڑی تصویر بنوائی جس میں ایک مسلم گھڑ سوار کو قبر مسیح گھوڑوں کے سموں سے پامال کرتے اور گھوڑے کو قبر پر پیشاب کرتے دکھایا گیا تھا۔ یہ دیوہیکل تصویر یورپ کے کونے کونے میں گھمائی گئی اور بڑے بڑے جلسوں میں دکھائی گئی۔ پادری مصوروں سے ایسی تصاویر بھی بنواتے تھے جن میں ایک عربی شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لڑتے دکھایا جاتا تھا، بعض تصاویر میں یہ منظر پیش کیا جاتا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اس عربی شخص کے ہاتھوں پٹ کر زمین پر گر چکے ہیں اور ان کے بدن سے خون جاری ہے۔ لوگ یہ دہشت ناک تصاویر دیکھ کر پادریوں سے پوچھتے: "یہ کون ہے جو یسوع مسیح کو مار رہا ہے؟"

پادری جواب دیتے: "یہ عرب کا نبی ہے، جو یسوع مسیح کو مار رہا ہے، دیکھو انہیں کتنے زخم لگا چکا ہے۔ اور یہ دیکھو! مسیح اس کے ہاتھوں مر گیا ہے۔"

یہ سن کر لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے۔ یورپ کے حکمرانوں نے بھی اس اضطراب اور ہل چل کا رخ ایک نئی مذہبی جنگ کی تیاریوں کی طرف موڑنے میں دیر نہ کی اور سمندر پار کر کے عالم اسلام کو تہ وبالا کر دینے کے جذبات نے متحارب یورپی حکومتوں کو ایک ہدف پر جمع کر دیا۔ ①

پاپائے اعظم نے صلیبیوں کی ہمتیں بلند کرنے کے لیے یہ اعلان کر دیا کہ مقدس جنگ میں شرکت کرنے والے لوگوں کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس میں حصہ نہ لینے والوں کا نکاح کرنا اور کھانا حرام ہوگا۔ جنگی اخراجات پورے کرنے کے لیے "صلاح الدین عشر" (Saladintenth) کے نام سے یورپ میں ایک نیا ٹیکس عائد کر دیا گیا جس کے مطابق ہر شخص کو اپنی دولت کا دسواں حصہ صلیبی جنگ کے لیے دینا لازم تھا۔ پادری کہہ رہے تھے کہ جو شخص اس ٹیکس کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا وہ دینِ مسیح سے خارج مانا جائے گا۔ برطانوی بادشاہ رچرڈ نے انہی دنوں تخت سنبھالا تھا۔ اس نے سب سے پہلے صلیب اٹھا کر مسیحیت کے غلبے کی خاطر سردھڑ کی بازی لگانے کا اعلان کیا۔ پھر فرانس کا بادشاہ فلپ آگسٹس، جرمنی کا حکمران فریڈرک باربروسا اور صقلیہ کا فرمانروا ولیم دی گڈ بھی اسی جوش وجذبے کے ساتھ عالم اسلام پر چڑھائی کے لیے تیار ہو گئے۔ ②

عورتیں بھی اس جنگ میں شرکت کے لیے بری طرح بے تاب تھیں چنانچہ اَن گنت عورتیں لشکر میں شامل ہوئیں۔

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۵۸۵ھ

② حیاتِ صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد، ص ۱۴۹ بحوالہ: مجاہد، ص ۴۴۲

لاکھوں ماؤں نے اپنی اولاد کو اس جنگ کی نذر کر دیا۔ جو لوگ جسمانی معذوری یا کسی اور سبب سے اس جنگ میں شرکت نہیں کر سکتے تھے انہوں نے اپنی جگہ دوسرے افراد کو تیار کر کے بھیجا۔ بہت سے لوگوں نے لڑنے والوں کو سرمایہ اور اسلحہ فراہم کر کے اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی۔

صلیبی جنگ کی یہ تیاریاں القدس پر سلطان ایوبی کے قبضے کے چند ماہ بعد شروع ہو گئی تھیں مگر افواج کی باقاعدہ روانگی کا عمل تاخیر کا شکار ہوتا گیا۔ آخر کار ربیع الآخر ۵۸۵ھ (مئی ۱۱۸۹ء) میں جرمنی کے بادشاہ فریڈرک باربروسا نے اڑھائی لاکھ سپاہیوں کے لشکرِ جرار کے ساتھ سب سے پہلے کوچ کر دیا۔ مغربی مؤرخین کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ باربروسا نے روانگی سے قبل سلطان ایوبی کو ایک دھمکی آمیز خط بھی لکھا تھا جس میں نہایت غرور و تکبر کے ساتھ کہا گیا تھا: ''پتا چلا ہے کہ آپ نے ارضِ مقدس کو ناپاک کر دیا ہے اور ایک مجرمانہ دلیری کی جسارت کی ہے، ہم شہنشاہِ دائمی اور محافظِ فلسطین کی حیثیت واختیارات کے ساتھ آپ کو بارہ ماہ کی مہلت دیتے ہیں کہ آپ سرزمین مقدس کو خالی کر کے نصرانیوں کو مطمئن کر دیں ورنہ ہم جنگ کے لیے آرہے ہیں۔''

اس خط میں اس نے اپنے بارے میں بے سروپا شیخیاں بھگارنے کے بعد اپنے معاون نوابوں اور حکام کی فہرست دے کر سلطان کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو ان باتوں سے کہاں دبایا جاسکتا تھا۔ انہوں نے اس خط کا دوٹوک جواب دیا اور مسلمانوں کی طاقت کا اظہار کرنے اور اپنے معاونین کے نام شمار کرانے کے بعد کھلے لفظوں میں لکھا: ''عیسائی اگر اپنی خیریت چاہتے ہیں تو جو شہر ان کے پاس باقی رہ گئے ہیں انہیں چھوڑ کر واپس چلے جائیں ورنہ وہ شہر بھی ہم اسی طرح بزورِ قوت فتح کر کے دکھائیں گے۔''[1]

تیسری صلیبی جنگ اور عکا کا محاذ:

سلطان صلاح الدین نے حطین کے تاریخی معرکے میں شاہِ یروشلم گائی کو گرفتار کر کے بعد میں اس وعدے کے ساتھ آزاد کر دیا کہ وہ آئندہ مسلمانوں سے نہیں لڑے گا۔ مگر گائی رہائی کے بعد مسلمانوں سے جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے شکست خوردہ اور بکھرے ہوئے عیسائی سپاہیوں اور رضا کاروں کی بہت بڑی جمعیت کو اپنے گرد اکھٹا کر لیا۔ پھر اس نے شام کے ساحلی شہر صور جا کر کونرڈ مارکوئیس سے اتحاد کر لیا۔ جمادی الاولیٰ ۵۸۵ھ (جولائی ۱۱۸۹ء) میں گائی اپنی فوج لے کر صور سے عکا کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس دوران کئی یورپی نواب اور پھر کونرڈ مارکوئیس بھی اپنی افواج لے کر سمندر کی طرف سے اس کے پاس آن پہنچے اور عکا کا خشکی اور تری دونوں طرف سے محاصرہ کر لیا گیا۔ فرنگیوں کا مقصد یہ تھا کہ ساحلی شہروں کو فتح کر کے انہیں بیت المقدس پر حملے کے لیے چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا جائے۔

عکا کا تاریخی شہر خشکی کی ایک لمبی اور پتلی پٹی پر آباد تھا جو زمین سے الگ ہو کر سمندر کے اندر دور تک چلی گئی تھی۔ یہ

---

[1] حیاتِ صلاح الدین ایوبی از سراج دین احمد، ص ۱۵۰

پنی چاروں طرف سے بلند فصیل میں گھری ہوئی تھی۔ شہر کی فصیل دوہری تھی اور حفاظتی انتظامات بڑے مضبوط تھے۔ فرنگیوں نے شہر کے سامنے مٹی کی دیواروں میں گھری ایک چھاؤنی بنا کر عکا کو شمال سے جنوب تک کمان کی مانند گھیر لیا اور شہر پر زوردار حملے شروع کردیے۔ یورپی سپاہیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ سلطان صلاح الدین کو عالم اسلام کے دفاع کی سخت فکر لاحق تھی۔ بہاؤ الدین ابن شداد رحمۃ اللہ کے بقول سلطان کی کیفیت ان دنوں اُس ماں کی طرح تھی جس کا بچہ گم ہوگیا ہو۔ سلطانی افواج نے تقریباً پانچ میل کے فاصلے سے عکا کو گھیرنے والے فرنگیوں کے گرد حلقہ بنالیا۔ اس حالت میں یہاں دو سال تک جنگ جاری رہی۔ ہزاروں مسلمان شہید ہوئے مگر مسلمانوں نے فرنگیوں کو عکا سے بیت المقدس کی طرف نہ بڑھنے دیا۔ [1]

۲۱ شعبان ۵۸۵ھ (۴ اُکتوبر ۱۱۸۹ء) کو عکا کے سامنے وہ تاریخی لڑائی ہوئی جسے معرکہ کبریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ عکا کے محاذ کی سخت ترین لڑائی تھی جس میں فریقین نے اپنی ساری توانائی جھونک دی تھی۔ اس خون ریز لڑائی میں کئی بار مسلمانوں نے عیسائیوں کو دھکیلا اور کئی بار عیسائی انہیں پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوگئے۔

جنگ کے فیصلہ کن مرحلے میں اچانک مسلمانوں کے قلب کے قدم اکھڑ گئے۔ عیسائی گھڑ سواروں نے مسلمانوں کی صفوں کو دھکیلتے ہوئے دائیں بائیں الٹ دیا۔ قلب کے اکثر سپاہی فرار ہوگئے۔ اس نازک ترین صورتحال میں بھی سلطان صلاح الدین مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں ثابت قدم رہے۔ انہوں نے بکھرے ہوئے سپاہیوں کو منظم کرکے آناً فاناً نئی صف بندی کی اور اپنی جوابی چالوں سے فرنگیوں کو پسپائی پر مجبور کردیا۔ [2]

اس محاذ پر سردی کے ایام بہت شدید تھے۔ ایسے موسم میں امراض پھیل جاتے اور جنگ وقتی طور پر تھم جاتی مگر چھوٹی موٹی جھڑپیں جاری رہتیں۔ اس دوران شاہِ جرمنی ایک لشکر جرار کے ساتھ قُسطَنطِینِیّہ اور ایشیائے کوچک کے راستے اڑھائی لاکھ سپاہیوں کے ساتھ شام کے قریب آن پہنچا۔ سلطان نے حلب اور شمالی شہروں کے سپاہیوں کو چھاپہ مار حملوں کے ذریعے جرمنوں کا راستہ روکنے کا حکم دیا۔ ایسے میں شام اور فلسطین ہی نہیں الجزیرہ اور عراق کے لوگ بھی خود کو خطرے کی زد پر محسوس کررہے تھے۔ علامہ ابن اثیر اس خوف و دہشت کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کا حال ویسا ہی تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا"

(جب کفار نے تم پر اوپر سے چڑھائی کی اور نیچے سے بھی اور جب نگاہیں پھرنے لگیں اور دل حلق میں آن پہنچے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔)" [3]

---

① کتاب الروضتین: سنة ۵۸۵ھ، النوادر السلطانیہ، ص ۱۶۳ تا ۱۶۹

② کتاب الروضتین: سنة ۵۸۵ھ، النوادر السلطانیہ، ص ۱۷۰ تا ۱۷۶

③ الکامل فی التاریخ، سنة: ۵۸۶ھ، النوادر السلطانیة، ص ۱۹۰

مگر اللہ نے مسلمانوں کی مدد کی۔ جرمنوں کی بڑی تعداد موسم کی سختی اور بیماریوں کا شکار ہو کر راستے میں ختم ہوگئی۔ خود شاہِ جرمن راستے کی ایک ندی میں ڈوب کر مر گیا۔ باقی فوج کو سلطان کے چھاپہ ماروں نے اپنی زد پر لے لیا۔ بمشکل دو اڑھائی ہزار جرمن محاذ پر پہنچ سکے۔

صلیبیوں نے عکا کو فتح کرنے کے لیے نت نئے حربے استعمال کیے۔ انہوں نے کئی دیو ہیکل دبابے تیار کیے جو لوہے اور لکڑی کے متحرک مینار تھے۔ ان پر آگ بھی اثر نہیں کرتی تھی۔ ان کے ذریعے صلیبی عکا کی بلند بالا فصیل پھلانگ سکتے تھے مگر سلطان کی فوج کے ایک نوجوان علی بن عریف نے ایک نیا کیمیائی محلول تیار کیا۔ ۲۸ ربیع الاول ۵۸۶ھ (۵ مئی ۱۱۹۰ء) کو ابن عریف نے اپنا یہ عجیب و غریب مرکب استعمال کیا اور دبابوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ فرنگیوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے کہ شاہِ فرانس کا بھتیجا ہنری کاؤنٹ آف شیمپئن بہت بڑی کمک لے کر آن پہنچا۔ صلیبیوں نے ایک بار پھر کھلے میدان میں نکل کر پیش قدمی کی اور یوں وہ خوں ریز معرکہ ہوا جس کے پہلے دن کی لڑائی کو "معرکہ مرج عکا" اور دوسرے دن کی لڑائی کو "نوبۃ الخر" یا "دریائے عکا کا معرکہ" کہا جاتا ہے۔ یہ لڑائی تین دن تک جاری رہی تھی۔ اس موقع پر سلطان نے شدید بیماری اور ناقابل برداشت تکلیف کے باوجود جس ہمت و استقلال اور صبر و تحمل کے ساتھ لشکر اسلام کی قیادت کی، اس کو سلطان کی کرامت ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت سلطان کی بیماری کس شدت کی تھی، اس بارے میں ابن شداد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> "میں نے سلطان کو مرج عکا کے محاذ پر دیکھا کہ وہ شدید بیمار تھے۔ جسم پر کمر سے لے کر گھٹنوں تک بکثرت پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ صحیح طرح بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ جب خیمے میں ہوتے تو ایک پہلو پر سہارا لے کر نیم دراز ہو جاتے۔ بیٹھنے سے معذوری کے سبب ان کے لئے سامنے رکھے ہوئے کھانے تک ہاتھ بڑھانا بھی ممکن نہ تھا۔ کھانا لایا جاتا تو فرماتے کہ لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر اس کے باوجود وہ صبح سے لے کر ظہر کی نماز تک اور عصر سے لے کر نماز مغرب تک گھوڑے پر سوار، مسلسل صفوں میں چکر لگاتے رہتے اور تکلیف کی شدت اور پھنسیوں کی اذیت کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے رہتے جس پر ہم تعجب کا اظہار کیا کرتے تھے مگر وہ جواب میں فرماتے: "جب میں گھوڑے پر سوار ہوتا ہوں تو یہ تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ جوں ہی نیچے اترتا ہوں، یہ تکلیف عود کر آتی ہے۔"[1]

معرکے کی شروعات ۱۱ شوال ۵۸۶ھ (۱۱ نومبر ۱۱۹۰ء) کو ہوئیں۔ دشمن آگے بڑھتا آرہا تھا۔ سلطان کی ہدایات کے مطابق تیر اندازوں کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے تیزی سے آگے بڑھ کر دشمن پر تیروں کی بوچھاڑ کرتیں اور پھر ٹیلوں کے نشیب و فراز میں غائب ہو جاتیں۔ جب فرنگی آگے نکل گئے تو سلطان ایوبی نے اپنی فوج کے ایک حصے کو نیم دائرے کی شکل میں گھما کر فرنگیوں کے عقب میں تعینات کر دیا۔ اس طرح فرنگیوں کی واپسی کا راستہ مسدود ہو گیا، ان

[1] النوادر السلطانیہ، ص ۔

کے اوران کی چھاؤنی ٹوروں کے درمیان مسلمانوں کے دستے کھڑے ہوگئے۔

اگلے دن دونوں فریق اپنی پوری قوت کے ساتھ آمنے سامنے تھے۔ دوپہر ساڑھے بارہ بجے غیر روایتی انداز کی یہ جنگ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ لشکرِ اسلام سے تکبیر وتہلیل کی صدائیں گونج رہی تھیں، تیروں کی سنسناہٹ سے فضا مرتعش ہورہی تھی۔ نصرانی بگل اور باجے بجا بجا کر اپنے جوانوں کو جوش دلا رہے تھے۔ سلطان مسلسل تازہ دم سپاہ کو آگے بھیج کر فرنگیوں کی پختہ صف بندی کو توڑنے کی کوشش کررہے تھے۔ انہوں نے اس دن اپنی پوری افرادی قوت دشمن کے خلاف استعمال کرڈالی یہاں تک کہ اپنے بیٹوں کو بھی گھمسان کی جنگ میں جھونک دیا۔ آخر میں سلطان کے پاس قاضی بہاؤالدین، شاہی طبیب اور چند غلام رہ گئے جن کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے پرچم لہرارہے تھے۔ دور سے دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سلطان ایک بڑے لشکر کے ساتھ پہاڑ پر کھڑے ہیں حالانکہ یہاں سلطان کا حفاظتی دستہ تک موجود نہ تھا۔ اگر فرنگیوں کا کوئی چھوٹا سا دستہ بھی اس طرف آنکلتا تو سلطان کا بچ نکلنا مشکل ہوجاتا۔ ①

سلطان کی طبیعت اتنی ناساز تھی کہ وہ نقل وحرکت کے قابل بھی نہیں تھے۔ قاضی بہاؤالدین ابن شداد رحمہ اللہ بتاتے ہیں کہ لڑائی کے بعض شدید مواقع پر سلطان اس احساس سے بے اختیار رو پڑے کہ وہ آگے بڑھ کر معرکے میں شریک نہیں ہوسکتے۔ اس دوران ایک امیر نے سلطان سے عرض کیا: ”دونوں لشکروں کے بکثرت افراد ہلاک ہورہے ہیں۔“

جواب میں سلطان نے درد بھرے لہجے میں ایک عرب شاعر کا یہ مصرعہ پڑھا:

اُقْتُلانِیْ وَ مَالِكًا وَاقْتُلا مَالِكًا مَعِي

(مجھے مالک سمیت قتل کردو اور مالک کو میرے ساتھ قتل کردو۔) ②

آخر فرنگی پسپا ہوتے ہوتے دوبارہ اپنی چھاؤنی میں گھس گئے۔ اس دن کی لڑائی پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی ابن شداد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”مسلمانوں نے اس دن زبردست جنگ کی اور جہاد کا حق ادا کردیا۔“ ③

شاہِ فرانس اور شاہِ انگلستان کی آمد:

صلیبیوں کو ملنے والی کمک ان کے گرتے ہوئے حوصلے بحال کرتی رہی۔ ربیع الآخر ۵۸۷ھ (مئی ۱۱۹۱ء) میں شاہِ فرانس فلپ آگسٹس اور پھر شاہِ برطانیہ رچرڈ اپنی ٹڈی دل افواج کے ساتھ عکا کے ساحل پر اترے اور ایک بار پھر

---

① النوادر السلطانیہ، ص ۲۲۲ تا ۲۲۷؛ کتاب الروضتین: سنۃ ۵۸۶ھ

② النوادر السلطانیہ، ص ۲۲۷ ...... مطلب یہ تھا کہ اگر ہمارے ساتھ یہ دشمنانِ اسلام ختم ہوجائیں تو مجھے اپنی جان کا سودا خوشی سے منظور ہے۔

نوٹ: سلطان سے یہ مصرعہ ”اُقتلانی“ بصیغہ تثنیہ منقول ہے جبکہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے یہ صیغہ جمع کے ساتھ ”اُقتلونی“ نقل کیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ مصرعہ جنگ جمل میں مالک بن حارث عرف اشتر نخعی سے لڑتے ہوئے پڑھا تھا۔ دونوں لڑتے لڑتے نیچے گر پڑے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یہ مصرعہ پڑھ کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کررہے تھے کہ وہ حملہ کریں تاکہ مالک قتل ہوجائے چاہے میں بھی اس کے ساتھ مارا جاؤں مگر لوگ اشتر کو اس کے اصل نام ”مالک“ سے نہیں جانتے تھے، اس لیے حیران تھے کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کس مالک کی بات کررہے ہیں۔ (تاریخ طبری: ۴/۵۱۹، ۵۲۰) ایک روایت کے مطابق یہ مصرعہ عبدالرحمٰن بن عتاب بن اسید نے اشتر نخعی سے لڑتے ہوئے پڑھا تھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۰۹، ۳۷۷۵۷) یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ درحقیقت کس شاعر کا کلام ہے۔

③ النوادر السلطانیہ، ص ۲۲۷

شدید لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ اب صلیبیوں کی زیادہ توجہ عکا کی فصیل سر کرنے پر تھی۔ [1]

ایک یورپی خاتون کی فریادرسی:

انہی دنوں کسی مسلمان نے ایک کارروائی میں فرنگیوں کے ایک خیمے سے کوئی شیر خوار بچہ اٹھالیا۔ بچے کی ماں اس صدمے سے بے حال ہوگئی، وہ روتی پیٹتی صلیبی قائدین کے پاس گئی۔ انہوں نے عورت کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

''مسلمانوں کا بادشاہ بڑا رحم دل ہے، تم اس سے اپنا بچہ طلب کرو۔''

عورت دوڑتی ہوئی مسلمانوں کے معسکر کی طرف نکلی۔ ایک مملوک افسر اسے ساتھ لے کر سلطان کے پاس آیا۔ عورت نے اپنا دکھ درد بیان کیا تو سلطان پر رقت طاری ہوگئی، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، حکم دیا بچے کو فوراً تلاش کر کے لایا جائے۔ کارندے ہر طرف دوڑ پڑے۔ آخر بچے کا پتا چل گیا۔ بچہ عورت کی گود میں ڈال دیا گیا اور وہ اپنے لختِ جگر کو سینے سے چمٹا کر دودھ پلانے لگی۔ سلطان کی ہدایت پر اس خاتون کو ایک گھوڑے پر سوار کر کے عزت و احترام سے اس کے خیمے تک پہنچا دیا گیا۔ سلطان اس قضیے کے ختم ہونے تک وہیں کھڑے رہے۔ حالتِ جنگ میں بھی دشمنوں سے ایسا فراخ دلانہ سلوک سلطان صلاح الدین ایوبی کے اعلیٰ اخلاق کی کھلی شہادت ہے۔ [2]

سقوطِ عکا:

آخر کار صلیبیوں نے رات دن کی محنت سے عکا کی خندق کو پاٹ دیا اور فصیل پر براہِ راست حملے کرنے لگے۔ سنگ باری سے عکا کی فصیلوں میں شگاف پڑ گئے۔ جمادی الاولیٰ ۵۸۷ھ (جون ۱۱۹۱ء) میں رچرڈ نے بیرونی فصیل کے مضبوط ترین مورچے ''برج قتال'' کو سرنگیں لگا کر منہدم کرا دیا۔ جب بھی فرنگی عکا پر حملہ کرتے، اہلِ عکا نقارے بجا کر سلطان کی فوج کو خبردار کرتے۔ سلطان پشت سے فرنگیوں پر دھاوا بول دیتے اور فرنگی دو حصوں میں تقسیم ہو کر لڑتے: ایک حصہ سلطان کی فوج کو روکتا اور دوسرا عکا کی فصیل سر کرنے کی کوشش کرتا۔

ان تمام کوششوں کے باوجود آخر ۱۷ جمادی الآخرہ ۵۸۷ھ، (۱۱ جولائی ۱۱۹۱ء) کو شہر کے امیر سیف الدین مشطوب نے بازی ہاتھ سے نکلتی دیکھ کر اہلِ شہر کو جان کی امان دینے کے وعدے پر ہتھیار ڈال دیے۔ [3]

ساحل کی جنگ:

عکا پر قبضے کے بعد صلیبی حملہ آور رچرڈ کی قیادت میں ساحل کے ساتھ ساتھ القدس کی طرف روانہ ہوئے۔ سلطان نے پہاڑوں کی اوٹ میں ایک متوازی راستے پر پیش قدمی جاری رکھی اور چھاپہ مار حملوں کے ذریعے ان کی یلغار روکنے اور انہیں کھلے میدان میں لڑنے پر ابھارنے کی کوشش جاری رکھی۔ آخر ۱۴ شعبان ۵۸۷ھ (۴ ستمبر ۱۱۹۱ء) کو ارسوف کے میدان میں فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کے پے در پے حملوں سے دشمن کا عقب روندا گیا تھا۔

---

[1] النوادر السلطانیہ، ص ۲۳۶، ۲۳۸　[2] النوادر السلطانیہ، ص ۲۴۰

[3] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: سنۃ ۵۸۷ھ؛ النوادر السلطانیۃ، ۱۵۵ تا ۲۸۲؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۸۷ھ

اس موقع پر رچرڈ نے صلیبیوں کو منظم کر کے اتنا زوردار جوابی حملہ کیا کہ مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان کا نقشہ بدل گیا۔ ارسوف کا یہ معرکہ سلطان کی زندگی کی خطرناک ترین لڑائیوں میں سے ایک تھا۔ جب مسلمان تتر بتر ہو کر بھاگ رہے تھے تو لگتا تھا کہ اب بیت المقدس تک نصرانیوں کے ٹڈی دل کو روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مگر سلطان نے مثالی استقامت اور حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے لشکر کو مکمل تباہی سے بچالیا اور چند دستوں کے ساتھ دوبارہ قدم جما کر لڑائی چھیڑ دی۔ مسلمانوں کو دوبارہ صف بستہ دیکھ رچرڈ نے محتاط رویہ اختیار کیا اور جنگ روک کر پڑاؤ ڈال دیا۔ سلطان صلاح الدین نے اپنی عسکری ہیئت بحال کرنے اور دوبارہ صف بندی میں چوبیس گھنٹے بھی نہ لگائے اور اگلے ہی دن دوبارہ میدان میں نکل کر حریف کو جنگ کے لیے للکارا۔ صلیبیوں کو جوابی صف بندی کی ہمت نہ ہوئی بلکہ رچرڈ فوج کو آرام دینے کے بعد تیزی سے عسقلان کی طرف روانہ ہوگیا۔

سلطان صلاح الدین افواج کی کمی کے باعث عسقلان کا فوری دفاع نہ کر سکتے تھے "عسقلان" کی فصیل نہایت بلند اور قلعہ بڑا مستحکم تھا۔ اگر رچرڈ عسقلان پر قابض ہو جاتا تو بیت المقدس پر حملے کے لیے اسے ایک مضبوط چھاؤنی اور یورپ سے کمک ورسد کے لیے ایک بہترین بندرگاہ ہاتھ آجاتی۔ سلطان صلاح الدین کے پاس وقت کم تھا۔ ان کے افسران نے بیت المقدس کو بچانے کے لیے یہ عجیب مشورہ دیا کہ عسقلان کو خالی کر کے تباہ کر دیا جائے۔ سلطان پہلے اس پر راضی نہ ہوئے مگر استخارے کے بعد انہوں نے یہ مشورہ مان لیا اور کہا:

> "اللہ کی قسم! اس شہر کا ایک بھی پتھر اکھاڑنا میرے لیے اپنی تمام اولاد کی ہلاکت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔
> مگر جب مشیتِ الٰہیہ کا فیصلہ یہی ہے اور اس نے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے اسے ناگزیر بنا دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں!!"

ان کے حکم سے عسقلان کی آبادی کو وہاں سے منتقل کر دیا گیا اور فصیل شہر، قلعہ، دیگر عمارتوں اور بندرگاہ کو تباہ و برباد کر کے مٹی کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ جب رچرڈ کی فوجیں وہاں پہنچیں تو ان کو آڑ میں لینے والی کوئی دیوار اور ان پر سایہ کرنے والی کوئی چھت تک وہاں نہ بچی تھی، رچرڈ کو سخت مایوسی ہوئی اور وہ وہاں کوئی مورچہ نہ بنا سکا۔ آخر اس نے رملہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔[1]

معرکہ القدس:

سلطان ایوبی اب اپنے خواص کے ساتھ سیدھا بیت المقدس پہنچ گئے اور دفاعی انتظامات کے استحکام کے ایک جامع منصوبے پر کام کا آغاز کر دیا۔ سلطان خود ان تمام تعمیراتی کاموں کی نگرانی کے لیے متحرک رہتے اور معماروں کے ساتھ کام کراتے۔ انہیں دیکھ کر بڑے بڑے نامی گرامی لوگ بھی تعمیراتی مشقت میں حصہ لے رہے تھے۔ سلطان کے لڑکے، شام و مصر کے امراء، فوجی و سول افسران، علماء و مشائخ اور قضاۃ و فقہاء بھی اس کام کو سعادت سمجھ کر شریک تھے۔ مسلمانوں میں القدس کی حفاظت، اس شہر کی خدمت اور تعمیراتی محنت و مشقت کے لیے ایسا ایمانی جوش نظر آتا تھا

[1] النوادر السلطانیۃ، ۲۷۸ تا ۲۹۸

جس سے قرونِ اولیٰ کی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ سلطان صلاح الدین خود گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے اور بذاتِ خود دور دراز کے علاقوں سے اپنی سواری پر پتھر ڈھو کر لاتے۔ یہ دیکھ کر لشکری بھی ان کی پیروی کرتے۔

اس دوران شوال ۵۸۷ھ (نومبر ۱۱۹۱ء) میں رچرڈ نے بیت المقدس پر حملے کے لیے پیش قدمی کی مگر شدید بارش اور سخت سردی نے اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ فرنگیوں کا سامانِ خورد و نوش ضائع ہو گیا، خیمے اکھڑ گئے، گھوڑے اور دوسرے مویشی تلف ہو گئے۔ گیارہ ذوالحجہ ۵۸۷ھ (دس جنوری ۱۱۹۲ء) کو صلیبی لشکر رملہ کی طرف واپس ہو گیا۔ رچرڈ نے فوج کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے عسقلان کا رخ کیا اور اسے از سرِ نو تعمیر کرانا شروع کر دیا۔

عسقلان کی تعمیر سے فارغ ہو کر جمادی الاولیٰ ۵۸۸ھ (جون ۱۱۹۲ء) میں رچرڈ نے القدس کی طرف یلغار کی اور بیت نوبہ تک پہنچ گیا جہاں سے القدس صرف ایک دن کی مسافت پر تھا۔ اس نے قاصد دوڑا دیے تاکہ جلد از جلد صور، عکا اور طرابلس کے نصرانی اس محاذ پر پہنچیں اور القدس کو ایک صدی قبل کی سی شان و شوکت کے ساتھ دوبارہ فتح کیا جا سکے۔ اس دوران رچرڈ نے مصر سے آنے والا خوراک کا ایک بہت بڑا قافلہ لوٹ کر مسلمانوں کو سخت زک پہنچائی۔

لیکن اُدھر سلطان نے مقدس شہر کی حفاظت کی ہر ممکن تیاری کر لی تھی اور دشمن کے حوصلے پست کرنے کی تدابیر پر مسلسل غور کر رہے تھے۔ صلیبیوں کی خوشیاں اس وقت دھری کی دھری رہ گئیں جب مخبروں نے آکر رچرڈ کو یہ خبر سنائی کہ سلطان نے القدس کے ارد گرد دور دور تک تمام تالاب تڑوا دیے ہیں، چشمے اور پانی کے ذخائر زہر آلود کر دیے ہیں، ہر کنواں مٹی سے پاٹ دیا گیا ہے۔ وادیٔ القدس میں اب کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں پانی دستیاب ہو۔ شدید گرمی کے موسم میں فوج پانی سے محروم رہتی تو جنگ کا نتیجہ وہی نکلتا جو حطین میں ہوا تھا۔ اس لیے رچرڈ نے مایوس ہو کر واپسی کا فیصلہ کیا اور صلیبیوں نے ساحل کی طرف کوچ کر دیا۔

رچرڈ کو اب انگلستان واپسی کی جلدی تھی۔ وہ عسقلان میں بھی نہ رکا اور سیدھا عکا جا کر دم لیا۔ ہیرلڈ لیمب کے بقول "وہ عکا کی طرف اس طرح لوٹا جیسے کسی بڑی مصیبت سے جان بچا کر بھاگا ہو۔"

رچرڈ نے اس دوران واحد کامیابی یہ حاصل کی کہ یافا پر اپنا قبضہ برقرار رکھا اور سلطان کی فوجیں اس شہر میں داخل ہو کر بھی اسے فتح نہ کر سکیں، کیوں کہ رچرڈ عکا سے بحری فوج لے کر وہاں آن پہنچا اور شہر کو بچانے میں کامیاب رہا۔ [1]

مذاکرات اور صلح نامۂ رملہ:

اگلے چند ہفتوں میں رچرڈ کی طرف سے صلح کی بابت کئی پیغامات آئے۔ جن میں سے کسی میں دوستی کا اظہار تھا اور کسی میں بین السطور دھمکیاں دی گئی تھیں۔ رچرڈ صلح بھی کرنا چاہتا تھا مگر اپنی برتری کا سکہ جما کر، اس لیے وہ چاہتا تھا کہ مسلمان عسقلان اسی کے پاس رہنے دیں۔ رچرڈ کے الجھے ہوئے پیغامات کے جواب میں سلطان نے اسے ایک مراسلہ روانہ کیا جس کی ہر سطر سے مردِ مومن کا یقین جھلکتا ہے۔ سلطان نے لکھا:

---

[1] النوادر السلطانیۃ، ص ۳۰۳ تا ۳۲۳

"عسقلان سے ہمارے دست بردار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں آپ کے لئے موسم سرما یہاں گزارنا ضروری ہے کیوں کہ آپ نے ان ساحلی شہروں پر قبضہ تو کرلیا ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ آپ کے جاتے ہی ہم ان شہروں کو چھین لیں گے بلکہ آپ کی موجودگی میں بھی اللہ نے چاہا تو ہم یہ شہر دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں۔ جب آپ اپنے گھر سے دور اور اپنے وطن سے دو ماہ کی مسافت پر موسمِ سرما کی سختیاں برداشت کرسکتے ہیں حالانکہ یہ آپ کی بھرپور جوانی کا زمانہ اور عیش وعشرت کے ایام ہیں، تو بھلا مجھے محاذ پر سردی یا گرمی کا موسم گزارنے میں کیا دِقت ہوسکتی ہے جبکہ میں اپنے ملک میں ہوں، میرے بچے اور میرے گھر والے میرے ساتھ ہیں۔ ویسے بھی میں بوڑھا آدمی ہوں، لذاتِ دنیا کو ترک کرچکا ہوں، میرا دل ان سے بھر گیا ہے، میرے پاس سردیوں کے لئے الگ اور گرمیوں کے لئے الگ فوج کا انتظام ہے۔ جہاد کے بارے میں میرا ایمان ہے کہ میں سب سے بڑی عبادت میں مصروف ہوں۔ میں جہاد ہمیشہ جاری رکھوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے فتح یاب کردے۔"

سلطان کا یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہر طرح کے جانی ومالی بحران کو برداشت کرتے ہوئے آخر دم تک لڑنے کے لئے تیار تھے۔ ہاں اگر وہ صلح چاہتے تھے تو القدس کے تحفظ کی ضمانت پر۔ آخر رچرڈ نے عسقلان کی ضد چھوڑ دی اور صلح کی ایک بار پھر پیش کش قبول کی۔ سلطان نے اپنے بھائی الملک العادل سے مشورہ کرکے یہ پیش کش قبول کرلی کیوں کہ سپاہی لڑلڑ کر بے حال ہوچکے تھے، اسلحہ ختم ہونے کو تھا اور خزانہ خالی ہوچکا تھا۔ جنگ نے سینکڑوں مربع میل پر پھیلے ہوئے باغات اور کھیتوں کو اجاڑ دیا تھا اور عوام کے لئے زندگی مشکل تر ہورہی تھی۔

غرض ۲۴ شعبان ۵۸۸ھ (۳ ستمبر ۱۱۹۲ء) کو صلح نامے پر دستخط ہوگئے اور صلیبی افواج واپس ہوگئیں۔ [1]

صلیبیوں نے کیا کھویا کیا پایا؟

۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) سے ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) تک جاری رہنے والی اس پنج سالہ جنگ میں یورپ نے اپنی افرادی قوت، مالی وسائل، ذرائع نقل وحمل، معیشت وتجارت اور امن وسکون سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ یورپ کا شاید ہی کوئی شہزادہ، نواب یا جاگیردار ایسا ہوگا جس نے کسی نہ کسی انداز میں صلیبی جنگ میں حصہ نہ ڈالا ہو۔ ان کے کئی چوٹی کے بڑے بڑے بادشاہ اس جنگ کی قیادت کرنے آئے تھے جن میں جرمنی کے فریڈرک باربروسا، فرانس کے فلپ آگسٹس اور برطانیہ کے رچرڈ جیسے تاجدار شامل تھے جن کی مشترکہ طاقت پورے ایشیا کو زیرنگین کرنے کے لئے کافی تھی۔ چھوٹے موٹے درجنوں غیر معروف حکمرانوں کی افواج ان کے علاوہ تھیں جو اس پوری جنگ کے دوران ایک تسلسل سے ساحل پر اترتی رہیں۔ پھر جاگیرداروں، نوابوں اور نائٹوں کا کوئی شمار ہی نہ تھا جو ہر حکمران کے پیچھے صفیں باندھے چلے آتے تھے۔ تاریخ یورپ میں اس قدر متنوع نسلوں اور مختلف زبانوں پر مشتمل لشکرکشی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ صلیبیوں کی خیمہ گاہ میں فرانس، جرمنی، آسٹریا، اسکنڈے نیویا، جنیوا، پیزا، اٹلی، وینس، صِقلیہ، ڈنمارک، ہالینڈ

[1] النوادر السلطانیة، ص ۳۲۸ تا ۳۴۴

اور فریز لینڈ سمیت بیسیوں ریاستوں اور قوموں کے افراد یکجا نظر آتے تھے۔ مرد ہی نہیں عورتیں بھی اس لڑائی میں شریک تھیں۔ یورپ کی کئی شہزادیاں اور نواب زادیاں تھیں جو عیش و آرام قربان کر کے اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھانے اس لشکر کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ ہزاروں عام عورتیں اور فاحشائیں ان کے سوا تھیں۔

اس تمام تر تباہی کے بدلے اگر فرنگیوں کو کچھ ملا تھا تو وہ ساحل کا ایک چھوٹا سا علاقہ تھا جسے مسلمان صلح کی میعاد ختم ہوتے ہی فتح کر سکتے تھے۔ جنگِ حطین کے بعد فلسطین، اردن اور ساحل شام کے جو وسیع و عریض علاقے سلطان صلاح الدین نے آزاد کرائے تھے، ان میں زیادہ تر علاقہ اب بھی مسلمانوں ہی کے پاس تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بیت المقدس جس کے لئے پانچ سال تک یہ ہولناک جنگ برپا رہی، بدستور مسلمانوں کی حفاظت میں تھا۔

سلطان کی وصیت:

سلطان ایوبی کی بعض باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے قاصدِ اجل کی خاموش چاپ سن لی تھی۔ ایک شب انہوں نے اپنے چہیتے بیٹے الملک الظاہر کو کوچ کے لئے الوداع کہہ دینے کے بعد دوبارہ خیمے میں بلوالیا اور وصیت کے انداز میں گویا ہوئے:

"میں تمہیں اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں؟ یہ ہر بھلائی کی جڑ ہے۔ تمہیں اللہ کے احکام پر عمل کرتے رہنے کا حکم دیتا ہوں کہ یہی تمہاری نجات کا سبب ہوگا۔

میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ قتلِ ناحق اور خون ریزی سے بچتے رہنا کیوں کہ ناحق بہنے والا خون رنگ لاکر رہتا ہے۔ میری وصیت ہے کہ رعایا کی دل گیری کا خیال رکھنا۔ ان کے حالات پر نظر رکھنا کیوں کہ تم میری طرف سے بھی اور اللہ کی جانب سے بھی ان لوگوں کے امین ہو۔

میں تمہیں یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ امرائے سلطنت، اربابِ حکومت اور بڑوں کی دل جوئی اور ان کا احترام کرتے رہنا۔ دیکھو میں نے بھی جو مرتبہ پایا ہے وہ لوگوں کی دل جوئی کی وجہ ہی سے پایا ہے۔ اور دیکھو! کسی سے حسد مت کرنا کیوں کہ آخر کار سب نے ہی مرنا ہے۔ اپنے اور لوگوں کے حقوق و معاملات میں بہت احتیاط سے کام لینا کیوں کہ اگر ان کا کوئی حق باقی رہ گیا تو بروزِ حشر ان کو راضی کیے بغیر مغفرت نہیں ہوگی۔ ہاں اگر تم پر اللہ کا کوئی حق باقی رہ گیا ہو تو وہ اس کی بارگاہ میں توبہ کرنے سے معاف ہو جائے گا کیوں کہ وہ بہت کرم نواز ہے۔"[1]

سلطان صلاح الدین کی وفات:

صلیبی جنگ کے ابتدائی دو سالوں میں سلطان کو رمضان کے روزے چھوڑنے پڑے تھے مگر آخری سال سلطان نے مئی جون کی شدید گرمی میں یہ دو سالہ روزے قضا کیے تھے۔ طبیب انہیں منع کرتا رہا مگر سلطان نے پروانہ کی۔ ہر بار ان کا جواب یہی ہوتا تھا: "معلوم نہیں آئندہ کیا ہوگا، پھر موقع ملے گا یا نہیں۔"

---

[1] النوادر السلطانیہ، ص ۳۵۳

اس کے بعد ماہِ رمضان آیا تو سلطان نے اس کے روزے بھی رکھے۔ اپنی صحت کی پروا کیے بغیر حالتِ جنگ میں تین ماہ تک روزوں کے تسلسل کے باعث سلطان کے جسم میں نقاہت اور طبیعت میں کمزوری پیدا ہوگئی جس کا اثر آخر تک رہا۔ ۱۵ صفر ۵۸۹ھ کو سلطان حجاج کرام کا استقبال کرنے دمشق سے باہر نکلے۔ گھر واپس آکر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ امراء، شہزادے، خاص درباری اور علماء وفقہاء تیمار داری کے لیے صبح وشام حاضر ہوتے رہے۔ آخر طبیبوں نے باہمی مشورہ کر کے سلطان کو فصد لگانے کا فیصلہ کیا۔ بیماری کے چوتھے دن فصد لگایا گیا مگر اس سے سلطان کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔

مرض کے چھٹے دن قاضی ابن شداد رحمہ اللہ، قاضی فاضل رحمہ اللہ اور دوسرے خواص حاضر خدمت تھے۔ سلطان کو سہارا دے کر تکیے کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ ہلکا گرم پانی پینا چاہتے تھے تاکہ طبیعت کو سکون محسوس ہو۔ ایک خادم پانی لے کر آیا۔ سلطان نے پیالہ منہ سے لگایا اور یکدم ہٹا کر کہا: ''پانی کی حرارت ناقابلِ برداشت ہے۔''

یہ کہہ کر قدرے ٹھنڈا پانی منگوایا۔ دوبارہ پانی لایا گیا۔ سلطان نے اسے پینا چاہا مگر یہ بہت ٹھنڈا محسوس ہوا۔ سلطان نے نرمی سے صرف اتنا کہا: ''سبحان اللہ! کیا کسی کو یہ توفیق نہیں ہوسکتی کہ پانی معتدل کر کے لے آئے۔''

قاضی فاضل اور ابن شداد رحمہما اللہ یہ منظر دیکھ کر باہر نکلے تو روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ قاضی فاضل رحمہ اللہ کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! اگر ایسا معاملہ کسی عام آدمی کے ساتھ بھی ہوتا تو وہ پیالہ پانی لانے والے کے سر پر دے مارتا۔''

سلطان کی حالت کا سن کر عوام وخواص کا اضطراب ناقابلِ بیان تھا۔ بازاروں میں ہو کا عالم تھا۔ خرید وفروخت بند ہوگئی تھی۔ تاجر منڈی سے سامان اٹھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ زندگی کی آخری شب شیخ ابوجعفر رحمہ اللہ سلطان کے پاس بیٹھ کر تلاوت کررہے تھے۔ صبح صادق کے قریب وہ سورۃ الحشر کی آیات پڑھ رہے تھے:

لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝

(برابر نہیں ہیں جنت والے اور جہنم والے...... یہ جنت والے ہی اپنی منزل مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ اگر ہم اس قرآن کو نازل کر دیتے کسی پہاڑ پر...... تو یقیناً تم دیکھتے اس پہاڑ کو...... کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور وفکر کریں۔ وہ اللہ ایسی ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ہر چھپی بات اور ظاہر بات کو جاننے والا ہے۔ نہایت مہربان، بے حد رحم فرمانے والا ہے۔)

جب شیخ تلاوت کرتے ہوئے ''عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ'' پر پہنچے تو سلطان کو ایک لمحے کے لیے ہوش آگیا۔ ان کے منہ سے نکلا: ''سچ ہے۔''[1]

① النوادر السلطانیہ، ص ۳۶۰ تا ۳۶۴

ادھر صبح کا اجالا پھیل رہا تھا، اُدھر سلطان کی حیاتِ فانی کا دورانیہ پورا ہو رہا تھا۔ ان کے سرہانے تلاوتِ قرآن جاری تھی، شیخ ابوجعفر کے لبوں پر سورۃ التوبہ کی آخری آیت کا یہ ٹکڑا تھا: ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ''

کلامِ الٰہی کے یہ الفاظ سن کر سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہونٹوں پر ایک تبسم ابھرا اور انہوں نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ [1] انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

جوں جوں سلطان کی وفات کی خبر شہر میں پھیلی، ہر طرف آہ وفغاں کا عالم طاری ہو گیا۔ لوگ آہیں بھرتے ہوئے قلعے کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ سلطان کے چھوٹے بچے بھی روتے چلاتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔ یہ حزن انگیز منظر دیکھ کر لوگوں کے دل پارہ پارہ ہوئے جا رہے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد تک آہ وبکا کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ قاضی ابن شداد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''اس دن ایسی کیفیت تھی کہ کتنے ہی لوگوں کو میں نے یہ کہتے سنا کہ کاش! سلطان کی جگہ وہ مر جاتے۔ اس دن سے پہلے میں کسی کے بدلے اپنی جان دینے کو ایک محاورہ ہی تصور کرتا تھا مگر اس روز خود میری یہ کیفیت تھی کہ اگر میرے بدلے سلطان کی جان بچ سکتی تو میں بخوشی جان دے دیتا۔'' [2]

ظہر کی نماز کے بعد سلطان کا جسد ایک تابوت میں رکھ کر باہر لایا گیا۔ جنازے پر نگاہ پڑتے ہی لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لوگ رو رو کر بے ہوش ہو رہے تھے۔ عماد اصفہانی کے بقول:

''گریہ وزاری کا یہ عالم تھا کہ لگتا تھا ساری دنیا ایک ہی آواز میں مل کر رو رہی ہے۔'' [3]

سلطان کی تدفین کے وقت وزیرِ سلطنت قاضی فاضل عسقلانی رحمہ اللہ نے سلطان ایوبی کی وہ مشہورِ زمانہ شمشیر منگوائی جس نے صلیبی افواج کے تار و پود بکھیر دیے تھے، شمشیر سلطان کے ساتھ ہی قبر میں رکھ دی گئی۔ قاضی فاضل رحمہ اللہ نے کہا: ''سلطان قیامت کے دن اسی تلوار پر سہارا لے کر اٹھیں گے۔'' [4]

سلطان کا سانحۂ وفات ۲۷ صفر ۵۸۹ھ (۳ مارچ ۱۱۹۳ء) کو پیش آیا۔ [5]

اسی رات ایک اللہ والے نے خواب میں ہاتفِ غیبی کی آواز سنی تھی:

''آج یوسف نے قید سے رہائی پالی۔'' [6]

شیخ عماد اصفہانی کو یہ خواب بتایا گیا تو انہوں نے کہا:

''بلاشبہ ہمارا یوسف آخرت کی نعمتوں کے لحاظ سے اس دنیا میں رہ کر ایک قید ہی میں تو تھا۔'' [7]

❁❁❁

---

① النوادر السلطانیہ، ص ۳۶۴ ② النوادر السلطانیہ، ص ۳۶۴ ③ کتاب الروضتین: ۳۶۵/۴، ط الرسالۃ

④ کتاب الروضتین: ۳۶۹/۴، ط الرسالۃ ⑤ الکامل فی التاریخ سنۃ ۵۸۹ھ

⑥ یہ اس حدیث کی طرف اشارہ تھا: الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر ''دنیا مؤمن کے لیے جیل اور کافر کے لیے جنت ہے۔'' (سنن الترمذی، ح: ۲۳۲۴)

⑦ کتاب الروضتین: ۳۶۹/۴، ۳۷۰، ط الرسالۃ

سلطان صلاح الدین ایوبی کی سیرت کے کچھ گوشے

یوسف بن ایوب سلطان صلاح الدین ایوبی کی ذات اعلیٰ اوصاف اور بلند اخلاق کا مجموعہ تھی۔ ان کا حوصلہ پہاڑوں کی طرح اٹل اور طبیعت پھول کی طرح نرم تھی۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ مردِ مومن کی تمام خوبیاں ان میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

عقیدہ ونظریہ:

سلطان صحیح العقیدہ پختہ فکر مسلمان تھے۔ ان کا عقیدہ ونظریہ اہل سنت والجماعت کے عین مطابق تھا۔ اصول وفروع میں فقہ شافعی کے پابند تھے۔ [1]

وہ نجومیوں کی باتوں کو لغو تصور کرتے تھے۔ بدشگونی، بدفالی اور ہر قسم کے توہمات سے کوسوں دور رہتے تھے۔ جب بھی کوئی اہم مسئلہ در پیش ہوتا تو شریعت کو پیش نظر رکھتے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے فیصلہ کر دیتے۔ [2]

انہیں علماء کی طرح کتابوں کی عبارتیں تو ازبر نہ تھیں مگر جب کبھی کسی عقیدے سے متعلق بات چل پڑتی تو سلطان اچھی خاصی مدلل گفتگو کیا کرتے تھے۔ نامور عالم دین شیخ قطب الدین نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان کو عقائد سے متعلق ایک جامع کتاب لکھ کر دی تھی۔ سلطان اپنے چھوٹے بچوں کو بڑے اہتمام سے یہ کتاب زبانی یاد کراتے تھے۔ [3]

سلطان ایوبی فلسفیوں اور دہریوں کے نظریات سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ان کے ہاں قرآن وحدیث اور فقہ ہی حرفِ آخر تھے۔ شہاب سہروردی نامی فلسفی نے ملحدانہ خیالات کا پرچار کیا تو سلطان نے اسے قتل کرا کے لاش کئی دنوں تک سولی پر لٹکی رہنے دی تاکہ دنیا کو عبرت حاصل ہو۔ [4]

عدل وانصاف:

سلطان عادل اور انصاف پرور تھے۔ ہر پیر اور جمعرات کو کھلا دربار لگاتے جس میں ہر کوئی حاضر ہو کر فریاد کر سکتا تھا۔ دربار میں قاضیوں کے علاوہ فقہاء اور علماء بھی موجود ہوتے جن کی مدد سے فوری طور پر فیصلے کیے جاتے۔ سفر ہو یا حضر، امن ہو یا جنگ، عدالت کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ عام دربار کے علاوہ بھی فریادی حاضر ہوتے رہتے تھے۔ سلطان سب کام موقوف کر کے، اطمینان سے ان کی بات سنتے اور مناسب فیصلہ صادر کرتے۔ کسی کو مایوس نہ کرتے، روزانہ درجنوں درخواستیں پیش ہوتیں، سلطان اپنے کاتب کے ساتھ عرضیوں کا مطالعہ کرتے۔ کسی درخواست کو نظر انداز نہ ہونے دیتے۔ راستے میں بھی کوئی شخص فریاد کرتا تو اس کی بات سنے بغیر آگے نہ بڑھتے۔ [5]

---

(1) النوادر السلطانیہ، ص ۳۸۔ کتاب الروضتین: ۳/ ۳۸۰، ۳۸۱، ط الرسالۃ

(2) کتاب الروضتین: ۳/ ۳۸۰، ط الرسالۃ

(3) النوادر السلطانیہ، ص ۳۸

(4) النوادر السلطانیہ، ص ۳۸

 النوادر السلطانیہ، ص ۵

زہد وقناعت:

سلطان نے بلاشبہ اپنی زندگی میں لاکھوں درہم ودینار خرچ کیے مگر کبھی کچھ جمع کر کے نہ رکھا۔ آمدن کم نہیں تھی مگر آمدن سے زیادہ دوسروں پر خرچ کرنے کے عادی تھے۔ لوگوں کو انعام واکرام سے نواز کر اور اس کے لیے قرضے لے لے کر مقروض ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وفات ہوئی تو ان کے اپنے خزانے میں ۴۷ درہموں اور ایک اشرفی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کوئی محل تھا نہ گھر۔ باغ تھا نہ کھیت۔ ①

ابن شداد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ سلطان کی عادت تھی کہ مالی تنگی کے دوران بھی اسی طرح خرچ کرتے تھے جیسے کشادگی اور فراخی کے دور میں۔ ایک بار سلطان بیت المقدس سے دمشق کے لیے روانہ ہونے لگے تو وفود کو ہدایا اور زادِ راہ دینے کے لیے خزانے میں کچھ نہ تھا۔ آخر سلطان نے بیت المال کی جاگیر سے ایک دیہات فروخت کرایا اور وہ ساری رقم خرچ کر کے وفود کی توقعات کو پورا کیا۔ ایک درہم بھی اپنے پاس نہ رکھا۔

سلطان کے امراء اور خزانچی کچھ نہ کچھ مال ان سے چھپا کر رکھتے تھے کہ سلطان کو پتا چل گیا تو وہ اسے بھی کسی کارِ خیر میں فوراً خرچ کر ڈالیں گے اور ہنگامی ضروریات کے وقت پریشانی ہوگی۔ ②

اتنی داد ودہش کے ساتھ سلطان پر کبھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی۔ قاضی ابن شداد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے وہ سلطان پر مرتے دم تک واجب نہیں ہوئی کیوں کہ انہوں نے کبھی (سال بھر) اتنا جمع کر کے رکھا ہی نہیں کہ زکوٰۃ واجب ہوتی۔ نفلی صدقات وخیرات اس قدر کرتے رہے کہ ان کا تمام مال ودولت اس میں ختم ہو گیا تھا۔" ③

اخلاق:

سلطان کے اخلاق کے بارے میں قاضی ابن شداد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وہ خوش مزاج، خوش اخلاق اور نیک خو تھے۔ عربوں کے انساب، تاریخی واقعات، جنگوں کے قصے اور ماضی کے حالات کے حافظ تھے۔ عربوں کے گھوڑوں کے نسب بھی یاد تھے۔ دنیا کے عجیب حالات، حوادث اور انقلابات سے اچھی طرح باخبر تھے۔ ان کی مجلس میں بیٹھنے والا ان سے ایسی معلومات پاتا تھا جو کسی اور سے میسر نہیں آسکتی تھیں۔ حسن اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک سے اس کی صحت، بیماری اور علاج معالجے، کھانے پینے اور مصروفیات کا پوچھا کرتے تھے۔ ان کی محفل بڑی پاکیزہ ہوتی تھی۔ ان کے سامنے کسی کا ذکر خیر کے سوا نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ کانوں کو برائی سننے سے پاک رکھتے تھے۔ انہیں پسند نہیں تھا کہ کسی کے بارے میں بھلائی کے سوا کچھ سنیں۔ ان کی زبان بھی پاک صاف تھی۔ کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کسی کو گالی دی ہو۔ قلم کی پاکیزگی کا بھی خیال رکھتے تھے۔ کبھی اپنے قلم سے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے کسی مسلمان کو اذیت پہنچے۔

① النوادر السلطانیہ، ص ۲۹ ② النوادر السلطانیہ، ص ۴۸ ③ النوادر السلطانیہ، ص ۲۹

وہ وعدے کے پابند اور وفادار انسان تھے۔ جب بھی کسی یتیم کو ان کے پاس لایا جاتا تو رحم کا معاملہ فرماتے۔ اس کی دل داری کرتے۔ اسے خرچہ دیتے۔ اگر اس کے خاندان میں کوئی بڑا ہوتا تو اسے اس کی پرورش کا ذمہ دار بنا دیتے، بصورتِ دیگر خود اس کی ضروریات کا خرچہ طے کر دیتے اور اسے کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیتے جو اس کی پرورش اور تربیت کر سکے۔ بوڑھوں اور بزرگوں سے ملتے تو نرم دلی کا مظاہرہ کرتے، انہیں عطیات دیتے اور عمدہ سلوک کرتے۔ سلطان کے یہ اخلاق مرتے دم تک ان کے ساتھ رہے۔[1]

شریعت کی پابندی:

سلطان ایوبی کبیرہ اور صغیرہ ہر قسم کے گناہوں سے حتی الامکان مکمل اجتناب کرتے تھے تاہم دوسروں کے لیے سلطان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ کبیرہ گناہوں پر سختی سے روک ٹوک کرتے تھے جبکہ صغیرہ گناہوں سے چشم پوشی کرتے تھے اور توقع کرتے تھے کہ لوگ اس بارے میں خود احتیاط سے کام لینے لگیں گے۔ وہ اپنے رفقاء کو راہِ راست کی تلقین کرتے رہتے تھے اور صراطِ مستقیم پر کار بند رہنے کا حکم دیتے تھے۔ سلطان کی اس تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے امراء، خواص اور افسران سب شریعت کی پابندی اور تعلق مع اللہ کا خوب اہتمام کرتے تھے۔ کاتب عماد اصفہانی کہتے ہیں:

''سلطان کے تمام غلام، خواص بلکہ افسران اور سپاہی بھی عابدوں اور زاہدوں سے زیادہ پرہیزگار تھے۔ سلطان کی تنہائیاں پاکیزگی کا مقدس منظر پیش کرتی تھیں اور ان کی مجالس فضول گوئی اور مذاق سے بالکل پاک ہوتی تھیں۔ ان کی محفلوں میں اہل علم وفضل کا مجمع ہوتا تھا۔ میں نے ان کو کبھی کوئی گرا ہوا لفظ کہتے نہیں سنا۔ ان کے منہ سے کبھی بے ہودہ جملہ نہیں نکلا۔ وہ کفار اور بے دین لوگوں کے لیے نہایت سخت تھے، اہل ایمان اور پرہیزگاروں کے لیے بڑے نرم...... سلطان کے ساتھ مجالس میں شریک ہونے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی بادشاہ کی محفل میں ہے بلکہ اسے لگتا کہ وہ اپنے کسی بھائی کے پاس بیٹھا ہے۔''[2]

نماز کی پابندی:

سلطان نمازیں مستحب اوقات میں ادا کرنے کے عادی تھے۔ سنن ونوافل کا بھی اہتمام کرتے۔ فرض نمازیں ہمیشہ جماعت سے ادا کرتے۔ علامہ عماد اصفہانی رحمہ اللہ جو برسوں سفر وحضر اور جنگی مہمات میں ان کے ساتھ رہے، کہتے ہیں:

''میں نے کبھی سلطان کو جماعت کے بغیر نماز ادا کرتے نہیں دیکھا حالانکہ ایسا نہ تھا کہ سلطان کے انتظار کے باعث جماعت میں ذرا بھی دیر کی جاتی ہو۔ سلطان خود وقت پر جماعت میں شریک ہونے کا اہتمام کرتے۔ چوں کہ سلطان اکثر وبیشتر سفر میں رہتے تھے، اس لیے نماز پڑھانے کے لیے کسی عالم دین کو امام مقرر کر لیتے تھے جو ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے امام صاحب بروقت تشریف نہ لاتے تو اس وقت وہاں موجود اہل علم میں سے جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوتے، سلطان ان سے نماز پڑھانے کی درخواست کرتے۔''[3]

---

① النوادر السلطانیہ، ص ۷۰ ② کتاب الروضتین: ۳/ ۳۷۷، ط الرسالۃ ③ کتاب الروضتین: ۳/ ۳۸۰، ط الرسالۃ

قاضی ابن شداد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''وہ نماز باجماعت کے نہایت پابند تھے یہاں تک کہ کہا جاتا ہے سالہا سال سے سلطان نے کوئی نماز جماعت کے بغیر نہیں پڑھی۔ وہ بیمار ہوتے تب بھی اپنے لیے امام کو بلواتے اور اس کے ساتھ بمشکل کھڑے ہو کر نماز باجماعت ادا کرتے۔ سنن و نوافل کی پابندی کرتے تھے۔ انہوں نے کچھ رکعات (تہجد کے لیے) طے کی ہوئی تھیں کہ رات کو اگر درمیان میں آنکھ کھل جاتی تو ادا کر لیتے۔ اگر آنکھ نہ کھلتی تو (صبح صادق سے قبل) نماز فجر سے پہلے پڑھ لیتے۔ جب تک سلطان ہوش و حواس میں رہے، کبھی نماز ترک نہ کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مرض موت میں بھی نماز کھڑے ہو کر ہی ادا کر رہے تھے۔ صرف زندگی کے آخری تین دنوں میں جب کہ ان پر بے ہوشی طاری تھی، ان کی نمازیں چھوٹی تھیں۔ دورانِ سفر بھی نماز کا وقت آتا تو سواری سے اتر کر نماز ادا کرتے۔''[۱]

قرآن مجید کا شوق

سلطان ایوبی کو قرآن مجید کی تلاوت سے بہت شغف تھا۔ حافظِ قرآن نہیں تھے مگر سماعت کا والہانہ شوق رکھتے تھے۔ قرآن مجید سننے کے لیے عمدہ سے عمدہ قاری تلاش کیا کرتے تھے۔ اپنی امامت کے لیے بھی ایسا شخص تلاش کرتے جو علوم قرآن اور قرآت کا خوب ماہر ہو۔ اپنی عام مجلس میں بھی تلاوت کرواتے اور عموماً ایک سے بیس تک آیات سنتے۔ رات کو دو تین یا چار پارے سنا کرتے تھے۔ تلاوت سنتے وقت ان پر اکثر رقت طاری ہو جاتی تھی اور آنسو نکل پڑتے تھے۔ ایک بار کہیں سے گزر رہے تھے کہ ایک بچے کو دیکھا جو اپنے باپ کے سامنے بیٹھا بہت خوبصورت انداز میں تلاوت کر رہا تھا۔ سلطان بہت خوش ہوئے، اسے اپنے دستر خوان کا کھانا پیش کیا، انعام و اکرام سے نوازا اور ایک زرعی رقبہ اس کے والد کے نام کر دیا۔[۲]

شوق حدیث:

احادیث سننے کا بھی بے حد اشتیاق رکھتے تھے۔ جب کسی عالم کے بارے میں سنتے کہ اسے روایت حدیث میں ملکہ حاصل ہے تو اس سے استفادے کی کوشش کرتے۔ اگر وہ عالم دربار میں آنا پسند کرتے تو انہیں اعزاز و اکرام سے بلا بھیجتے اور تمام درباریوں، امیروں اور شہزادوں کو باادب بٹھا کر حدیث کی سماعت کرتے۔[۳]

عین حالتِ جنگ میں درسِ حدیث:

بہادری اور ذہنی یکسوئی کا یہ عالم تھا کہ جنگ کے دوران بھی قرآن مجید کی تلاوت اور سماع حدیث کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک جنگ کے دوران جبکہ صفیں بندھ چکی تھیں، دشمن سامنے صف بنائے ہوئے تھا اور سلطان اپنے سپاہیوں کے ساتھ کبھی آگے بڑھ رہے تھے، کبھی پیچھے ہٹ رہے تھے، قاضی ابن شداد رحمہ اللہ نے عرض کیا:

---

۱. النوادر السلطانیہ، ص ۲۹ ۲. النوادر السلطانیہ، ص ۳۱

۳. النوادر السلطانیہ، ص ۳۱

''ہر محترم اور مبارک مقام پر حدیث کی سماعت ہوئی ہے مگر دوران جہاد حدیث کی مجلس آراستہ نہیں ہوئی، اگر آپ پسند کریں تو اس وقت ''حدیث'' سنی جائے۔''

سلطان نے دلچسپی ظاہر کی اور حدیث کا مجموعہ منگوایا۔ ابن شداد رحمہ اللہ نے انہیں اور دوسرے امراء کو جو موقع پر موجود تھے، کئی احادیث کی قرأت کر کے سنائی۔ اس طرح گھوڑوں کی پشت پر بیٹھے بیٹھے دوران جنگ حدیث کی سماعت کا شرف حاصل کیا گیا۔[1]

شجاعت:

سلطان صلاح الدین ایوبی کی شجاعت و بسالت کے بارے میں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہ امت کا وہ سپوت ہے جس کی بہادری ضرب المثل بن چکی ہے۔ سلطان کی زندگی کا ہر لمحہ جرأت اور دلیری کا ایک نیا سبق دیتا ہے۔ ابن شداد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''سلطان رحمہ اللہ بہت بہادر اور مضبوط دل گردے کے مالک تھے۔ جنگ آزما اور انتہائی ثابت قدم تھے۔ کوئی خطرہ انہیں حواس باختہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ فرنگیوں کے لشکرِ عظیم کے مقابلے میں ڈٹے رہے، دشمن کو متواتر کمک مل رہی تھی اور ان کی امدادی افواج پے در پے آ رہی تھیں مگر سلطان کی ہمت اور قوت ارادی میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ ایک دن عصر سے مغرب تک فرنگیوں کی کمک کے لگ بھگ اسی (۸۰) جہاز عکا پہنچے۔ میں انہیں گنتا رہا مگر سلطان کو دیکھا تو وہ اسی طرح جواں عزم اور باحوصلہ تھے۔''[2]

قاضی بہاؤالدین ابن شداد رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

''وہ لڑائی کی شدت کے دوران اپنی اور دشمن کی صفوں کے درمیان سے اس طرح گزرتے تھے کہ ان کے ساتھ صرف ایک خادم لڑکا ہوتا تھا۔ اس دوران کبھی وہ سپاہیوں کو دائیں پہلو سے بائیں بازو کی طرف بھیجتے، کبھی دستوں کو مرتب کرتے اور انہیں آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کا حکم دیتے۔ بسا اوقات وہ دشمن کی نقل و حرکت دیکھنے کے لیے اس کے بالکل قریب چلے جاتے۔ میں نے ان کو کبھی دشمن کی کثرت کی پروا کرتے نہیں دیکھا، وہ کبھی حملہ آوروں سے مرعوب نہیں ہوئے۔ ہاں غور و فکر اور تدبیر جاری رکھتے تھے۔ ان کے سامنے معاملے کے تمام پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا تھا اور وہ غصے یا گھبراہٹ کا شکار ہوئے بغیر تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر حالات کے تقاضوں کے مطابق مناسب فیصلہ کر دیتے تھے۔''[3]

جہاد، روح کی غذا:

جہاد فی سبیل اللہ سلطان کی زندگی کا مقصد اور ان کی روح کی غذا تھا۔ ان کی حیات کا ہر لمحہ اس عظیم مقصد کے لیے وقف تھا۔ جہاد سے ان کے شغف کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی بہاؤالدین ابن شداد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

① النوادر السلطانیہ، ص ۵۱ ② النوادر السلطانیہ، ص ۵۱ ③ النوادر السلطانیہ، ص ۵۱

''وہ جہاد کے انتہائی پابند تھے۔اس کا بہت زیادہ اہتمام کیا کرتے تھے۔اگر کوئی شخص قسم کھا کر کہے کہ سلطان نے جہاد شروع کرنے کے بعد ایک درہم یا دینار بھی جہاد یا اس کی تیاری سے ہٹ کر کسی مصرف میں خرچ نہیں کیا تو وہ سچا ہوگا۔ جہاد، اس کی محبت اور اس کا شغف ان کے سارے قلب و بدن پر پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ان کے ہاں جہاد ہی کے بارے میں باتیں ہوتیں، اسی پر غور و فکر ہوتا، اس کے لیے افراد کی تربیت کی دھن لگی رہتی، ان کی توجہ کے مستحق وہی لوگ بنتے جو انہیں جہاد کی اہمیت یاد دلاتے رہیں اور اس پر برانگیختہ کرتے رہیں۔ جہاد کی محبت میں سلطان نے اپنے اہل و عیال، وطن، گھر اور تمام لذاتِ دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔اس کے بدلے انہوں نے ایک ایسے خیمے کے سائے میں زندگی بسر کرنے پر قناعت کی تھی جسے آندھیاں دائیں بائیں حرکت دیتی رہتی تھیں۔مرج عکا کے محاذ پر ان کا خیمہ ان پر گر پڑا تھا۔اگر وہ اپنے حفاظتی کیبن میں نہ ہوتے تو زندہ نہ بچتے مگر ایسے خطرات سے جہاد میں ان کی رغبت، ثابت قدمی اور توجہ میں اضافہ ہو جاتا تھا۔[1]

جب کوئی شخص ان کا مقرب بننا چاہتا تو وہ انہیں جہاد پر ابھارتا یا ان کے سامنے جہاد کی باتیں کرتا۔(اس رغبت کے پیش نظر) ان کے لیے جہاد کے فضائل پر کئی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ جہاد کے آداب پر ایک کتاب میں نے بھی تصنیف کی جس میں جہاد سے متعلق تمام روایات کو جمع کر دیا گیا اور مشکل الفاظ کی تشریح کر دی گئی۔سلطان اکثر اس کا مطالعہ کرتے تھے۔انہوں نے خود یہ کتاب شہزادہ افضل کو پڑھائی۔[2]

بحری جہاد کا ولولہ:

شام کے ساحل کے ایک سفر میں قاضی ابن شداد رحمۃ اللہ سلطان کے ساتھ تھے۔وہ سلطان کی شجاعت، عزیمت اور بلند نگاہی کے ضمن میں اس سفر کے دوران سلطان سے اپنی گفتگو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سردی کے دن تھے، سمندر میں زبردست طغیانی تھی۔میں نے پہلے سمندری طوفان نہیں دیکھا تھا اس لیے مجھ پر یہ مناظر دیکھ کر سمندر کی غیر معمولی ہیبت طاری ہوگئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر کوئی مجھے کہے کہ تم سمندر میں ایک میل کا سفر کر کے دکھا دو تو تمہیں ساری دنیا کی حکومت دے دی جائے گی تب بھی میں ایسا خطرہ مول نہیں لوں گا۔ میں نے سوچا وہ لوگ کتنے کم عقل ہیں جو چند دیناروں اور درہموں کے لیے سمندر میں سفر کرتے ہیں۔ مجھے اس وقت ان علماء کا قول بہت وزنی لگا جو سمندری سفر کرنے والوں کی شہادت کو معتبر قرار نہیں دیتے۔یہ تمام خیالات سمندر کی امنڈتی ہوئی موجوں اور ان سے خوف کی پیداوار تھے۔ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سلطان نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور کہا: آپ سے ایک بات کہوں؟

میں نے عرض کیا: ضرور فرمائیے۔

سلطان نے کہا: ''میرے دل میں یہ بات آرہی ہے کہ جب میں ساحل کے باقی شہر بھی فرنگیوں سے واپس

---

(1) النوادر السلطانیہ، ص ۵۳ (2) النوادر السلطانیہ، ص ۵۴

لے لوں تو تمام مفتوحہ علاقے نائبین میں تقسیم کر دوں، وصیت لکھوا کر انہیں الوداع کہہ دوں۔ پھر سمندر میں نکل جاؤں اور اس کے جزیروں کو فتح کرتا چلا جاؤں یہاں تک کہ اسی مہم میں مجھے موت آجائے یا دنیا میں کہیں بھی کفر باقی نہ رہے۔''[1]

سلطان کے ان جملوں نے میرے دل میں آنے والے خیالات کو دھو ڈالا اور میں نے بے ساختہ کہہ دیا:

''آج دنیا میں سلطان سے زیادہ بہادر اور ان سے زیادہ اللہ کے دین کی نصرت کے لیے بے تاب فرد کوئی اور نہیں ہے۔''

سلطان نے یہ سن کر پوچھا: ''بھلا وہ کیسے؟''

میں نے عرض کیا: ''بہادری تو اس سے ظاہر ہے کہ میں اس سمندر کو دیکھ کر ہول کھا رہا ہوں اور آپ اسی میں سفر کی بات کر رہے ہیں۔ اور اللہ کے دین کی نصرت کا ولولہ اس سے ثابت ہے کہ آپ کسی ایک خاص علاقے سے اللہ کے دشمنوں کے خاتمے پر مطمئن نہیں ہیں بلکہ آپ تو تمام دنیا کو ان سے پاک کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔''

پھر میں نے کہا: میرے جی میں جو آرہا ہے عرض کروں؟ کہا: ضرور۔

عرض کیا: آپ کی نیت بے شک بہت اچھی ہے مگر میری رائے یہ ہے کہ آپ سمندری سفر میں اپنے لشکروں کو بھیجیں کیوں کہ آپ اسلام کا حصار اور مورچہ ہیں۔ اس لیے آپ کا خود کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔

سلطان نے میری بات سن کر پوچھا: مجھے یہ بتائیے کہ سب سے بہتر موت کون سی ہوتی ہے؟

میں نے کہا: اللہ کے راستے میں شہادت۔

سلطان نے کہا: تو پھر زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مجھے اعلیٰ ترین موت نصیب ہو جائے گی۔[2]

عفو و درگزر:

سلطان ماتحتوں کی لغزشوں سے عفو و درگزر کے عادی تھے۔ ایک بار قاضی ابن شداد رحمہ اللہ کا خچر بدک کر بھاگا اور سلطان کی سواری سے ٹکرا گیا، سلطان کی ران پر چوٹ آئی مگر ان کے چہرے پر تبسم تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ بارش کے موسم میں قاضی صاحب سلطان کے ساتھ بیت المقدس کی گلیوں سے گزر رہے تھے، اس وقت وہاں کیچڑ ہی کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ قاضی صاحب کا خچر تیز چلا تو کیچڑ اڑا جس سے سلطان کے سارے کپڑے خراب ہو گئے مگر وہ مسکراتے رہے۔ قاضی صاحب نے احتیاطاً اپنی سواری کو سلطان کی سواری سے پیچھے کرنا چاہا تا کہ دوبارہ یہ صورتحال پیش نہ آئے، مگر سلطان نے اجازت نہ دی اور ساتھ ہی رکھا۔[3]

---

[1] اس زمانے میں جزیرۂ سسلی (صقلیہ) پر ایک طاقتور عیسائی گروہ ''نارمنوں'' کی حکومت تھی جو شمالی افریقہ اور مصر پر موقع بموقع حملے کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح جزیرۂ روڈس اور قبرص بھی نصاریٰ کے پاس تھے سلطان ان جزائر سمیت تمام مراکزِ کفر کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔

[2] النوادر السلطانية، ص ۵۴،۵۵

[3] النوادر السلطانية، ص ۶۳

ایک بار ایک غلام نے دوسرے غلام کی طرف موزہ اچھالا، وہ غلطی سے سلطان صلاح الدین کے پاس جا گرا، سلطان نے دوسری طرف رخ پھیر کر اپنے ہم نشین سے بات چیت جاری رکھی جیسے انہیں کچھ پتا ہی نہ چلا ہو۔

ایک بار انہوں نے آواز دی کہ پانی لاؤ، کسی نے نہ سنا، دوبارہ، سہ بارہ کہا۔ یہاں تک کہ پانچ بار آواز لگائی مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ تب صرف اتنا کہا: ''ساتھیو! بخدا ہمیں پیاس مارے دیتی ہے۔''[1]

دشمنوں سے حسن سلوک:

سلطان اپنے دشمنوں سے بھی حسنِ سلوک کیا کرتے تھے۔ ایک بار ایک فرنگی قیدی پیش کیا گیا جو ڈر اور خوف سے کانپ رہا تھا۔ سلطان نے مترجم سے کہا: ''پوچھو کہ کیوں ڈر رہا ہے؟'' قیدی نے کہا: ''پہلے تو میں ڈر رہا تھا مگر اب آپ کا مہربان چہرہ دیکھ لیا ہے تو اچھے سلوک کی امید بندھ گئی ہے۔'' سلطان کو رحم آ گیا اور اسے آزاد کر دیا۔[2]

مہمان نوازی:

سلطان صلاح الدین ایوبی انتہائی مہمان نواز تھے۔ ان کی حتی الامکان خاطر تواضع کرتے، خندہ پیشانی سے ملتے، ان کے مسائل کو حل کرنے اور درخواستوں پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرتے۔ ان کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے۔ کسی مہمان کو وہ کھلائے پلائے بغیر رخصت نہ کرتے تھے۔ خدام کو تاکید کی گئی تھی کہ جب بھی کوئی عالم یا بزرگ آئیں تو انہیں سلطان سے ضرور ملوایا جائے تاکہ سلطان ان کی مناسب خدمت کر سکیں۔[3]

علماء کے اعزاز و اکرام کا ایک واقعہ:

ایک بار قاضی ابن شداد رحمہ اللہ کے ایک دوست عالم دین دور دراز کے علاقے سے آئے۔ وہ حج کے لیے نکلے تھے، حج کے بعد بیت المقدس کی زیارت کے لیے فلسطین آئے۔ ساتھ ہی ان کی تمنا تھی کہ اس رجلِ رشید کو ایک نگاہ دیکھ لیں جس نے بیت المقدس کو آزاد کرا کے مسلمانوں پر احسان کیا ہے۔

وہ سلطان کے معسکر میں پہنچے اور قاضی ابن شداد رحمہ اللہ سے دوستی کی وجہ سے پہلے ان سے ملے۔ قاضی صاحب نے سلطان کو ان کی آمد کی اطلاع دی تو سلطان نے انہیں اسی رات اپنے پاس بلوا لیا اور بڑی عزت و تکریم کی۔ رات کو وہ بزرگ قاضی ابن شداد کے خیمے میں ٹھہرے اور صبح ہوتے ہی رختِ سفر باندھ لیا۔ قاضی صاحب جانتے تھے کہ سلطان اپنے مہمانوں خصوصاً علماء و مشائخ کو رخصت کرتے ہوئے ہدایا دیا کرتے ہیں اور کسی کا اس کے بغیر چلے جانا پسند نہیں کرتے، اس لیے اپنے دوست کو منع کیا اور کہا کہ سلطان سے الوداعی ملاقات کر کے جائیے گا مگر انہوں نے کہا:

''میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں ان کو ایک نگاہ دیکھنا چاہتا تھا، میری آرزو پوری ہو گئی۔'' یہ کہہ کر وہ چل دیے۔

سلطان کو بعد میں پتا چلا کہ وہ جا چکے ہیں تو بے چین ہو گئے اور قاضی صاحب کو سرزنش کرتے ہوئے کہا:

---

① تاریخ مختصر الدول، ص ۳۸۸، ۳۸۹، ط دار الشرق
② النوادر السلطانیة، ص ۶۸
③ النوادر السلطانیة، ص ۶۶

''ایسا آدمی ہماری نوازش سے حصہ پائے بغیر چلا گیا! یہ کیسے ہو گیا؟ ہمیں یہ برداشت نہیں۔''

سلطان نے اتنی سخت ناگواری ظاہر کی کہ قاضی صاحب بھی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے دمشق کے منتظمین کو خط لکھ کر اپنے دوست سے رابطے کی صورت نکالی اور انہیں پیغام دیا کہ سلطان معظم آپ کے اس طرح چلے جانے سے ہم پر بہت ناراض ہوئے ہیں۔ آپ دوبارہ آ جائیں تاکہ سلطان کا غصہ دور ہو۔ یہ پیغام پڑھ کر وہ عالم کچھ عرصے بعد دوبارہ سلطان کے ہاں آئے۔ سلطان نے حسبِ عادت ان کا اعزاز واکرام کیا۔ کئی دن خیمہ گاہ میں ٹھہرا کر مہمانی کی اور پھر خلعتِ فاخرہ، بہترین سواری، سفر کے خرچے اور اہل وعیال، دوست احباب اور پڑوسیوں تک کے لیے ملبوسات کے ہدیے دے کر رخصت کیا۔[1]

غرض سلطان صلاح الدین ایوبی ایک ایسی عبقری شخصیت تھے جس کے نظائر تاریخ میں خال خال ملتے ہیں۔ تاریخِ اسلام اس بطلِ جلیل پر ہمیشہ فخر کرتی رہے گی اور مسلمان تا قیامت اس مردِ مجاہد کے ممنون ومشکور رہیں گے جس کی سیرت کی ہر ہر سطر لائقِ رشک اور قابلِ تقلید ہے۔

[1] النوادر السلطانیۃ، ص ٦٨

سلطان ایوبی کے جانشین

سلطان ایوبی کی وفات کے بعد شہزادہ الملک الافضل نے حکومت سنبھال لی اور دستور کے مطابق عدل وانصاف سے حکومت کرنے لگا مگر اس میں اپنے باپ جیسا فہم وتدبر تھا نہ رعب ودبدبہ۔ جلد ہی اس کے اپنے چچا الملک العادل اور اپنے بھائیوں خصوصاً الملک العزیز سے اختلافات پیدا ہوگئے۔ الملک الافضل کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ اس کی تخت نشینی کے دوسرے سال ۵۹۰ھ (۱۱۹۴ء) میں نصرانیوں نے قلعۂ جبیل پر قبضہ کرلیا اور وہ کچھ نہ کرسکا۔ اسے کمزور دیکھ کر سلطان ایوبی کے بیٹوں اور بھائیوں نے اپنی اپنی جگہ خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یوں سلطان ایوبی کی عظیم سلطنت پانچ ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ الملک الافضل دمشق کا حکمران رہا، الملک الظاہر نے حلب اور الملک العزیز عثمان نے قاہرہ میں خود مختار حکومتیں قائم کرلیں، بیت المقدس بھی الملک العزیز کی تحویل میں تھا۔ سلطان کے ایک بھائی الملک العادل نے کرک اور الجزیرہ کا علاقہ سنبھال لیا۔ دوسرا بھائی سیف الاسلام یمن اور جزیرۃ العرب کا خود مختار حاکم بن گیا۔

سلطان ایوبی کے بیٹے اور بھائی خوش قسمت تھے کہ انہیں بیرونی حملوں سے محفوظ امن وامان کے دن میسر آئے، انہوں نے اپنی توجہ تعمیری کاموں پر مرکوز رکھی۔ ان میں سے کسی نے اپنے باپ کی طرح بیرونی مہم جوئیوں میں دلچسپی نہ لی۔ اس پرامن دور میں شام کے ساحلوں پر یورپی تاجروں اور القدس کے زائرین کو بہترین مراعات حاصل تھیں۔ اسلامی دنیا کی معیشت وتجارت ترقی کی طرف گامزن تھی۔ بڑے بڑے تعمیراتی منصوبوں پر عمل ہورہا تھا۔ لوگ خوشحال اور آسودہ تھے تاہم امن کے انہی دنوں میں سلطان کے بیٹوں میں اقتدار کی کش مکش شروع ہوگئی۔ [1]

❁❁❁

الملک العادل

۵۹۲ھ (۱۱۹۵ء) تا ۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء)

سلطان ایوبی کا سگا بھائی الملک العادل نہایت اولوالعزم سپاہی اور زیرک سیاست دان تھا۔ اس وقت وہ ۵۳ سال کا ہوچکا تھا مگر جوانوں سے زیادہ توانا تھا۔ وہ صلاح الدین کے دور میں بھی بڑے اثر ورسوخ کا مالک تھا۔ سلطان کے بیٹوں میں اختلافات دیکھ کر وہ رفتہ رفتہ امورِ سیاست اپنے ہاتھوں میں لینے لگا۔ وہ ایوبی سلطنت کے مشرقی شہروں کا

---

① النجوم الزاهرة: ۱۰۳/۶، مفرج الكروب: ۲۸/۳، السلوک لمعرفة دول الملوک لتقي الدين المقريزي: ۲۳۱/۱، ط العلمية؛
The Crusades by Harold Lamb: p: 177, Badford London, 1931

والی تھا۔ امیرِ دمشق الملک الافضل کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا اور امورِ مملکت سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کے نائبین کی بے تدبیری سے رعایا تنگ تھی۔ ان حالات نے امیرِ قاہرہ الملک العزیز کو دمشق پر چڑھائی کا جواز فراہم کر دیا۔ رجب ۵۹۲ھ (۱۱۹۵ء) میں جب دونوں بھائیوں میں جنگ چھڑی تو العادل نے الملک العزیز کا ساتھ دیا۔ جنگ کے نتیجے میں الملک الافضل کوچۂ اقتدار سے باہر ہو گیا اور العادل نے العزیز کا ساتھ دینے کے صلے میں دمشق کی ولایت حاصل کر لی۔ [1]

چوتھی صلیبی جنگ:

یہ انتظامی تبدیلیاں بروقت ہوئی تھیں کیوں کہ روم کا پاپائے اعظم ایک بار پھر صلیبی حکمرانوں کو ارضِ مقدس پر حملے کی دعوت دے چکا تھا۔ اگر دمشق میں الافضل کی جگہ العادل نہ آ جاتا تو یہ جنگ جیتنا بہت مشکل تھا۔ ۵۹۳ھ (۱۱۹۶ء) میں جرمنی کے بادشاہ ہنری ششم نے صلیبی لشکروں کو بحیرۂ روم کے راستے اسلامی دنیا پر حملے کے لیے بھیجا تو یہاں اسے العادل جیسے کہنہ مشق سپاہی سے پالا پڑا جو سلطان صلاح الدین کے جذبے کو مسلمانوں میں دوبارہ بیدار کر رہا تھا۔

صلح رملہ کے تحت عکا پہلے ہی صلیبیوں کے قبضے میں تھا، صلیبیوں نے اسے مستقر بنا کر بیروت کا رخ کیا۔ الملک العادل نے بڑی مستعدی سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور چھاپہ مار کارروائیوں کے ذریعے صلیبی لشکر کو آگے بڑھنے سے باز رکھا۔ دو سال تک جھڑپیں ہوتی رہیں۔ قیساریہ سمیت شام کے ساحلی محاذوں پر صلیبی سورماؤں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی، البتہ ۵۹۴ھ (۱۱۹۷ء) میں انہوں نے بیروت پر قبضہ کر لیا مگر العادل نے جوابی یلغار کر کے ان کے اہم شہر یافا کو فتح کر لیا۔ فرنگی اس شکست سے تلملا اٹھے اور دوسری سمت رخ کر کے ''تبنین'' کا محاصرہ کر لیا۔

الملک العادل نے یہ اطلاع پاتے ہی الملک العزیز کو کمک کے لیے طلب کیا۔ دونوں کی مشترکہ افواج جب تبنین پہنچیں تو فرنگی گھبرا کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ چچا بھتیجے نے مفرورین کا تعاقب جاری رکھا اور انہیں مارتے کاٹتے رہے یہاں تک کہ فرنگی صور کے قلعے میں جا چھپے۔ الملک العادل نے فرنگیوں پر دھاوے جاری رکھے۔ اس دوران اٹلی میں شاہ ہنری ششم کی موت واقع ہو گئی جبکہ عکا میں ہنری آف شیمپئن جو صلیبی افواج کی قیادت کر رہا تھا، بلندی سے گر کر مر گیا، اس کی ناگہانی موت سے عیسائی افواج کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ آخر فرنگیوں نے الملک العادل سے تین سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا۔

الغرض چوتھی صلیبی جنگ میں عیسائی حملہ آور مکمل طور پر ناکام رہے اور مختصر سی مدت کے لیے بھی مسلمانوں کا کوئی شہر ان کے قبضے میں نہ آیا بلکہ ساحلِ شام پر ان کی مقبوضہ حدود مزید سمٹ گئیں۔ درحقیقت الملک العادل اور الملک العزیز نے خود کو سلطان صلاح الدین کا صحیح جانشین ثابت کر دکھایا تھا۔ [2]

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی: ۱/ ۲۴۳ تا ۲۴۷، ط العلمیة ؛ البدایة والنهایة: سنة ۵۹۲ھ

② مفرج الکروب لابن واصل: ۳/ ۷۱ تا ۷۶، ط الامیریة ؛ السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی: ۱/ ۲۵۳، ط العلمیة

الملک العزیز اس فتح کے بعد مصر پہنچا تو ایک شاعر نے اس کی مدح کرتے ہوئے کہا:

قَدِمتَ بِالسَّعدِ وَ بِالمَغنَم...... کَذاَ قُدُومُ المَلِکِ المُقَدَّم

''آپ سعادت اور غنیمت کے ساتھ آئے ہیں۔ صفِ اوّل کے بادشاہ کی آمد اسی طرح ہوا کرتی ہے۔''

یَا قَاتِلَ الکُفَّارِ وَاَحزَابِہ...... بِالسَّیفِ وَالدِّینَارِ وَالدِّرهَم

''اے کفار اور ان کے اتحادیوں سے شمشیر اور دینار و درہم کے ذریعے لڑنے والے''

قَمِیصُکَ المَورُوثُ عَن یُوسُف...... مَا جَاءَ اِلَّا صَادِقاً بِالدَّم

''آپ کو یوسف کا کرتا وراثت میں ملا ہے جو سچ مچ خون میں لت پت ہے''

نوجوان ایوبی شہزادے الملک العزیز کو زیادہ مہلت نصیب نہ ہوئی اور وہ ۲۰ محرم ۵۹۵ھ کو ۲۸ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ ایک بہادر، سخی اور شریف حاکم تھا۔ ①

اس کے بعد مصر کی حکومت اس کے کم عمر بیٹے الملک المنصور کو ملی مگر وہ حکومت چلانے کے قابل نہ تھا اس لیے امرائے سلطنت اس پر مطمئن نہ تھے۔ سلطان ایوبی کے پرانے مملوک امراء مختلف شہروں میں منتشر ہونے کے باوجود باہمی محبت و مودت کے رشتے میں منسلک تھے۔ وہ العادل کو سلطان صلاح الدین کے پوتوں سے زیادہ قابل سمجھتے تھے، اس لیے وہ سب العادل کے گرد جمع ہو گئے۔ العادل نے ان کے اجلاس میں کہا:

''کیا یہ بات باعثِ شرم نہیں کہ میں اس بڑھاپے میں ایک بچے کا اتا بک بنوں۔ بادشاہت وراثت میں ملنے والی چیز نہیں بلکہ طاقتور کا حق ہے۔ صلاح الدین ایوبی کے بعد میں سلطنت کا حق دار تھا مگر میں مرحوم کے احترام میں اپنے حق سے دست بردار ہو گیا۔ مگر جب میں نے یہ باہمی جھگڑے دیکھے تو مجھے اندیشہ ہوا کہ مملکت میرے ہاتھ سے بھی جائے گی اور مرحوم کی اولاد سے بھی۔ میں نے آخری حد تک معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی مگر جب میں نے دیکھا کہ جب تک میں حکومت نہیں سنبھال لیتا، یہ بگاڑ درست نہیں ہوگا۔'' ②

عربوں، ترکوں اور کردوں میں یہ رواج چلا آتا تھا کہ وہ قبیلے کے بزرگ ترین آدمی کو سردار منتخب کر لیتے تھے۔ الملک العادل کو بھی اسی اصول کے تحت پوری ایوبی سلطنت کا حکمران مان لیا گیا۔ الملک العادل نے ۱۱ شوال ۵۹۶ھ (۷ جولائی ۱۲۰۰ء) کو مصر کا انتظام براہِ راست سنبھال لیا۔ یوں ایوبی شہزادوں کی باہمی کش مکش کا اختتام الملک العادل کی بادشاہت پر ہوا اور مسلمانوں نے سکون کا سانس لیا۔

العادل نے پایۂ تخت دمشق سے قاہرہ منتقل کر دیا۔ اس کے دورِ اقتدار میں ایوبی سلطنت ایک بار پھر مستحکم ہو گئی۔ اس نے تیزی سے اپنی حدودِ سلطنت میں توسیع کی۔ اب وہ مصر، شام، اردن، حجاز اور یمن کا بلاشرکتِ غیرے حکمران تھا۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۹۲/۲۱، ط الرسالۃ

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۲۶۳/۱، ط العلمیۃ

سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹوں میں سے صرف الملک الظاہر تھا جس نے طویل عرصے تک حکومت کی۔ وہ العادل کا داماد بھی تھا۔ وہ ۶۱۳ھ میں اپنی وفات تک حلب اور مضافات کا حکمران رہا۔[1]

العادل ہوشیاری، دلیری، معاملہ فہمی اور خوش کلامی میں اپنے دور کا نابغۂ روزگار انسان تھا۔ نیک سیرت اور خوبرو تھا۔ اس کی شخصیت بڑی باوقار، مہیب اور پُرکشش تھی۔ ماتحتوں اور رعایا پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ متحرک رہتا تھا، گرمی کا موسم دمشق میں اور سردی کا مصر میں گزارتا تھا۔[2] قوتِ ہاضمہ ایسی تھی کہ سالم بھنا ہوا دنبہ اکیلا کھا جاتا تھا۔[3]

سقوطِ بازنطینی روما:

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کے آغاز میں پوپ انوسنٹ ثالث کلیسائے روم کی گدی پر براجمان ہوا۔ اس نے ایک بار پھر صلیبی جنگوں کے لیے راہ ہموار کرنا شروع کی۔ مگر اس بار اس کے سامنے صرف بیت المقدس کی فتح کا ہدف نہ تھا بلکہ وہ پوری مشرقی دنیا کو کلیسائے روم کے ماتحت لانا چاہتا تھا، یہاں تک کہ بازنطینیوں کے مرکز قُسطَنطِینِیّہ اور اس کے روحانی آستانے یونان کو بھی۔ صدیوں سے دنیائے نصرانیت دو مراکز میں تقسیم تھی: ایک طرف بازنطینی تھے جو کلیسائے یونان سے وابستہ تھے اور ان کا سیاسی مرکز قُسطَنطِینِیّہ تھا۔ دوسری طرف اطالوی تھے جن کا سیاسی و روحانی مرکز روم تھا۔ کلیسائے روم کا سربراہ پوپ انوسنٹ ثالث چاہتا تھا کہ یہ تقسیم ختم ہو اور ساری دنیائے نصرانیت ایک کلیسا اور ایک سیاسی مرکز کے تحت آکر پورے عالم اسلام کو اپنی جولان گاہ بنائے۔

اس دوران قُسطَنطِینِیّہ میں ایک انقلاب آیا۔ وہاں قیصر اسحٰق فرشتہ خصال کو جس نے صلاح الدین ایوبی سے اتحاد کر کے مسلمانوں کی خوشنودی کے لیے اپنے پایۂ تخت میں مسجد تعمیر کرائی تھی، بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے اندھا کر کے جیل میں ڈال دیا گیا اور باغی گروہ کا سربراہ قیصر الیکس ثالث کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہو گیا۔ ادھر معزول قیصر کا بیٹا فرار ہو کر اٹلی پہنچا اور صلیبی جنگ کے لیے تیار افواج کے قائدین کو عالم اسلام سے پہلے قُسطَنطِینِیّہ پر قبضے کے لیے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

۵۹۹ھ (۱۲۰۳ء) میں صلیبی افواج کے بحری بیڑے اپنے ہدف کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے بازنطینی پایۂ تخت کا محاصرہ کر لیا۔ جنگ جاری تھی کہ نیا قیصر خوفزدہ ہو کر شہر سے فرار ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بازنطینیوں نے بوڑھے معزول قیصر اسحٰق کو جیل سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے فوراً بعد ساحل پر لنگر انداز صلیبیوں نے سفیر بھیج کر اس سے یہ شرط منوالی کہ اب بازنطینی بادشاہت کلیسائے روم کے ماتحت ہو گی۔ مگر اس سے پہلے کہ صلیبی عالم اسلام کی طرف روانہ ہوتے، قُسطَنطِینِیّہ کے مقامی امراء نے قیصر اسحٰق اور رومیوں کے معاہدے کو مسترد کرتے ہوئے بغاوت کر دی اور بوڑھے قیصر کو اس کے بیٹے سمیت گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ یہ ۱۴ ربیع الآخر ۶۰۰ھ (یکم جنوری ۱۲۰۴ء) کا واقعہ ہے۔

---

① العبر فی خبر من غبر للذھبی: ۳/۹۹ تا ۱۵۹، ط العلمیة ② وفیات الاعیان لابن خلکان: ۵/۷۶، ط دار صادر

③ السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی: ۱/۳۱۲، ط العلمیة

بازنطینی امراء اب صلیبیوں کے مقابل آ گئے مگر ایک خوفناک جنگ کے بعد انہیں شکست ہوئی اور صلیبی قسطنطنیہ میں داخل ہو گئے۔ گنوار اور اجڈ صلیبیوں نے پورے شہر میں لوٹ مار کا طوفان برپا کر دیا۔ یوں بازنطینی رومی سلطنت کا سقوط ہو گیا اور کلیسائے روم کو وہ وسعت نصیب ہوئی جس کا خواب پوپ انوسنٹ ثالث کب سے دیکھ رہا تھا۔ پوپ نے کلیسا کے اقتدار کو غیر معمولی حد تک مستحکم کر کے اگلی کئی صلیبی جنگوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔ ①

الملک العادل کے بیٹے:

الملک العادل ایک خوش حال مملکت کا خوش قسمت حکمران تھا۔ چند مشرقی اضلاع کو چھوڑ کر سلطان ایوبی کی ساری مفتوحہ زمین اس کے زیرِ نگیں تھی۔ اس کے بیٹے بھی جوان، ہوشیار اور جیالے تھے۔ اس نے بیٹوں کی قابلیت دیکھتے ہوئے اس عظیم الشان سلطنت کی صوبے داریاں انہیں دے دی تھیں۔ پایۂ تخت قاہرہ میں الملک الکامل محمد اس کا نائب تھا۔ شام میں الملک المعظم عیسیٰ تھا اور الجزیرہ میں الملک الاشرف۔ یہ تینوں لڑکے ایک ہی سال یعنی ۵۷۶ھ میں پیدا ہوئے تھے اور اب لگ بھگ ۳۸، ۳۸ سال کے تھے۔ امورِ حکومت زیادہ تر یہی انجام دیتے تھے۔ سب کی تعلیم و تربیت مذہبی، علمی اور جہادی ماحول میں ہوئی تھی۔ انہوں نے بڑے بڑے علماء اور محدثین سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ ہر ایک صاحبِ شمشیر بھی تھا اور عالم فاضل بھی۔

الملک الکامل اپنے باپ کی طرح ہوشیار، تجربہ کار اور دور اندیش سیاست دان تھا۔ اس کے رعب داب اور حسنِ انتظام کے باعث مصر خوشحالی کی راہ پر گامزن تھا۔ شریعت کی پابندی اور سنت کی اشاعت کا ولولہ رکھتا تھا۔ سفر و حضر میں علمائے دین اس کے ساتھ رہتے تھے۔

الملک المعظم عیسیٰ حافظِ قرآن تھا۔ مطالعے کا اتنا شوقین تھا کہ عموماً کوئی نہ کوئی کتاب اس کی بغل میں ہوتی تھی۔ فقہ حنفی پر عمل پیرا تھا اور ''العقیدۃ الطحاویہ'' کو اہلِ سنت کا معیار مانتا تھا۔ فقہ میں اتنی مہارت تھی کہ علماء نے اسے فتویٰ دینے کا اہل قرار دیا تھا۔ ساتھ ہی زبردست گھڑسوار اور تیغ زن بھی تھا۔ تین ہزار چنیدہ سپاہیوں کا ایک خاص دستہ اس کی کمان میں رہتا تھا۔ اس فوج کا نظم وضبط اور سج دھج دیکھ کر دنیا حیران رہ جاتی تھی۔ عوام سے بے تکلف ملتا جلتا تھا۔ اپنے چچا صلاح الدین ایوبی کا عاشق تھا۔ ہر جمعے کو ان کی قبر پر جاتا تھا۔

الملک الاشرف موسیٰ الجزیرہ، حران رُہا اور خلاط کا حاکم تھا۔ سخی اور شریف تھا۔ مساجد اور مدارس کی تعمیرات پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ فقراء اور درویشوں کو نوازتا۔ حنبلی مذہب کی طرف مائل تھا۔ ایک مدت تک وہ سیر تماشوں اور ناؤ نوش کا بھی شوقین تھا مگر بعد میں علماء کے سمجھانے پر یہ چیزیں ترک کر دیں۔ ان قابل بیٹوں کے ہوتے ہوئے الملک العادل ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ آنے والے سال کتنے ہولناک ہیں۔ ②

---

① The Crusades by Harold Lamb:p;187 to 229

② سیر اعلام النبلاء: ۱۱۵/۲۲ تا ۱۲۷، تراجم الملک العادل ابی بکر و بنیہ، ط الرسالۃ

پانچویں صلیبی جنگ:

۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) عالم اسلام کے لیے دوطرفہ خطرات کے پیغام لایا، مشرق میں چنگیز خان کی بے لگام طاقت ابھری اور مغرب میں صلیبی جنگجوؤں کی از سرنو صف بندی ہونے لگی۔ چنگیز خان کا حملہ ابھی یقینی نہ تھا، خوارزم شاہ سے تجارتی معاملات پر اس کا معاہدہ ہو چکا تھا لیکن ادھر مغربی سرحدوں سے صلیب کے پجاری یکا یک عالم اسلام پر ٹوٹ پڑے۔ اس جنگ کی تیاری اس طرح ہوئی کہ ۶۰۹ھ (۱۲۱۲ء) میں راہبانہ زندگی گزارنے والے نصرانی لڑکوں کا ایک بڑا گروہ ارضِ مقدس کی زیارت کے لیے کمر باندھ کے نکلا مگر وہ منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی قزاقوں، بردہ فروشوں اور راہزنوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان کا ایک جہاز بحیرۂ روم میں ڈوب گیا۔ باقی ماندہ لڑکے سخت ابتری کے عالم میں واپس آگئے۔ پوپ انوسنٹ کو ایک نیا بہانہ مل گیا۔ اس نے کہا:

"یہ شرم کی بات ہے کہ بچے سرزمینِ مقدس کی بازیابی کے لیے نکلیں مگر ہم گھروں میں دبکے رہیں۔"

اس نے اس جگہ کے قریب جہاں لڑکوں کا جہاز ڈوبا تھا، ایک یادگار تعمیر کرائی اور یورپ میں ایک نئی صلیبی جنگ کی آواز لگا دی۔ اس نے ایک کم سن شہزادے ہنری ششم کو رومن سلطنت کا سربراہ مقرر کر دیا اور رجب ۶۱۲ھ (نومبر ۱۲۱۵ء) میں یورپی حکمرانوں کے ایک اجلاس میں اعلانِ جنگ کر دیا۔ روانگی کے لیے صفر ۶۱۴ھ (جون ۱۲۱۷ء) کی تاریخ طے ہوئی۔ چار سال تک یورپ میں اندرونی تنازعات پر پابندی لگا دی گئی۔ پادریوں نے آمدن کا بیسواں حصہ جنگ کے لیے مختص کر دیا۔ تاہم جنگ کے لیے روانگی سے پہلے پوپ انوسنٹ فوت ہوگیا۔ اگرچہ اس کی تیرہ سالہ پاپائیت میں عملی طور پر ایک بھی عیسائی ارضِ مقدس پر حملے کے لیے نہیں پہنچ سکا۔ تاہم اس کے دور کو قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کا شاندار ترین دور کہا جاتا ہے کیوں کہ اس نے کلیسا کا اقتدار بے انتہا وسیع کر کے اسے حکومتوں سے بالاتر کر دیا تھا۔

انوسنٹ کے بعد بھی صلیبی جنگ کی تیاری بدستور ہوتی رہی۔ سب سے پہلے شاہِ ہنگری نے فوجیں تیار کیں، پھر شاہ جرمن فریڈرک ثانی اور شاہِ قُسطنطینیہ نے ہتھیار اٹھائے۔ آسٹریا، آرمینیا اور قبرص کے نامی گرامی بادشاہ، نواب، نائٹ اور مذہبی رہنما اس حملے میں شریک تھے۔ اس بار مصر کے شمالی ساحلی شہر دمیاط پر قبضہ کر کے آگے بڑھنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ صلیبی جنگ گزشتہ تمام جنگوں سے مختلف تھی۔ یورپ نے چار صلیبی جنگوں کے تجربات سے یہ جان لیا تھا کہ شام پر حملہ کر کے القدس پر قبضہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کی جگہ اب ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے ایوبی سلطنت کے عسکری مرکز مصر کو فتح کیا جائے چاہے اس میں کئی سال کیوں نہ لگ جائیں۔ جب مسلمان عسکری طاقت سے محروم ہو جائیں تب بیت المقدس کا سوچا جائے۔ ①

مصر کے شمال میں بحیرۂ روم تھا جہاں صلیبی بیڑے نقل و حرکت کر رہے تھے۔ ملک کا پایۂ تخت قاہرہ سمندر سے لگ بھگ سو میل دور تھا۔ قاہرہ کے شمال میں دریائے نیل چھوٹی چھوٹی کئی شاخوں میں بٹ گیا تھا۔ یہ اس عظیم دریا کا ڈیلٹا

① The Crusades by Harold Lamb:p:236 to 240

تھا۔ ڈیلٹائی شاخوں کے درمیان ہر طرف لہلہاتے کھیت تھے اور درجنوں نہریں ایک جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ دریا کی شاخوں اور نہروں کے کناروں پر پشتے بنے ہوئے تھے جن کے بالائی حصے راستوں اور شاہراہوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ یہ وہ میدانِ جنگ تھا جہاں پانچویں صلیبی جنگ لڑی جانے والی تھی۔

جنگ کا پہلا قدم دمیاط پر قبضہ کرنا تھا۔ یہ شہر بحیرۂ روم کے ایسے مقام پر واقع ہے کہ یہاں پر قابض فوج با آسانی بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کے راستوں کی نگرانی کر سکتی ہے لہٰذا یہ عالم اسلام کے لیے شمال مغربی دروازے کی حیثیت رکھتا تھا۔ دمیاط کی فصیل کے قریب ہی دریائے نیل بحیرہ روم میں جا گرتا تھا، یہاں قبضہ کر کے دریائے نیل کے راستے سے نہ صرف پورے ملک مصر بلکہ مشرقی افریقہ کے دیگر ممالک تک بھی آسانی سے رسائی ہو سکتی تھی۔

صلیبی فوجیں سیدھا دمیاط جانے کی بجائے رمضان ۶۱۳ھ (۱۲۱۷ء کے آغاز) میں عکا کے ساحل پر لنگر انداز ہوئیں اور ایک مدت تک بیسان، بانیاس اور صور کے گردونواح میں قتل وغارت کا بازار گرم کرتی رہیں۔ مجاہدِ اسلام الملک العادل نے اس موقع پر خود کو صلاح الدین کا حقیقی بھائی ثابت کر دکھایا۔ اس کی عمر ۷۰ برس ہو چکی تھی مگر وہ شام میں پوری ہوش مندی اور ہمت و تدبیر کے ساتھ صلیبیوں کے سامنے بند باندھنے کی تیاری کرتا رہا۔

صلیبی عکا سے روانہ ہو کر ربیع الاوّل ۶۱۵ھ (مئی ۱۲۱۸ء) میں دمیاط پہنچ گئے۔ ان کی قیادت قبرص کا حکمران شاہ جان آف برین کر رہا تھا جسے یورپی دنیا قانونی طور پر شاہِ یروشلم بھی مانتی تھی۔

الملک العادل نے اپنے بیٹے الملک الکامل محمد کو دمیاط کی حفاظت کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ وہ خود رومی بادشاہ کیکاؤس سے مزاحمت کے لیے شام میں رک گیا۔ کیکاؤس شمال کے بری راستے سے شام پر یلغار کر رہا تھا۔ العادل نے اپنے دوسرے بیٹے الملک الاشرف کو بھیج کر اس کی راہ میں حصار باندھ دیا۔ ربیع الآخر ۶۱۵ھ (جولائی ۱۲۱۸ء) میں دونوں کے مابین کانٹے کا مقابلہ ہوا، آخر کار الاشرف نے شاہِ روم کو شکستِ فاش دے کر پسپا کر دیا۔

اُدھر دمیاط کے محاذ پر جنگ چھڑ چکی تھی۔ فرنگی دریائے نیل کے ڈیلٹا سے اپنے بحری جہاز مصر میں گھسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے دریا کے دہانے پر پانی کی سطح کے ساتھ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک زنجیروں کا حصار قائم کر رکھا تھا، اس زنجیری پھاٹک کے اوپر ایک بلند و بالا عظیم الشان پل تھا جو دریا کے ایک کنارے سے دمیاط کی فصیل تک چلا گیا تھا۔ سمندر سے دریائے نیل میں آنے کے لیے ہر کشتی کو اس پل کے نیچے سے گزرنا پڑتا تھا، پل پر مسلمان سپاہیوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ نصرانیوں کا بحری بیڑا حملہ کرتا تو پل سے ان پر تیراندازی، آتش زنی اور سنگ باری ہوتی۔ چار ماہ تک ہولناک مقابلے کے بعد صلیبی پل پر قابض ہو گئے، مزید آگے بڑھنے کے لیے انہوں نے زنجیروں کا حصار توڑ دیا مگر اتنے دنوں میں الملک الکامل محمد نے کچھ فاصلے پر ایک اور پل بنا کر اس پر فوج بٹھا دی تھی۔ بحری بیڑے کے وہاں پہنچتے ہی پھر زبردست لڑائی شروع ہو گئی۔ ایک طویل لڑائی کے بعد یورپی جہاز رانوں نے اس پل پر بھی قبضہ کر لیا۔

الملک الکامل محمد نے ہر تدبیر ناکام دیکھ کر ایک عجیب ترکیب آزمائی، اس نے بہت بڑی تعداد میں مال بردار قسم کی دیو ہیکل کشتیاں بنوائیں اور ان میں ہزاروں من پتھر لدوا کر ان کو صف در صف نیل کے دونوں کناروں کے درمیان کھڑا کر دیا۔ جب دشمن کا بحری بیڑا اس طرف آیا تو الملک الکامل نے حکم دیا کہ کشتیوں کے پیندوں میں سوراخ کر دیے جائیں، حکم کی تعمیل ہوئی، دیو ہیکل کشتیاں اس طرح دریا کی تہہ سے جا لگیں کہ ان کا بالائی حصہ سطح آب کو چھو رہا تھا۔ ہزاروں من پتھروں کے وزن کی وجہ سے ان کو اپنی جگہ سے ہلانا ممکن نہ تھا، عیسائی سپاہی ان کو ہٹانے کی کوئی ترکیب کارگر نہ دیکھ کر رک گئے۔ ①

الملک العادل کی وفات اور اس کے بیٹوں کا اقتدار:

نت نئے حربوں کے ساتھ یہ جنگ جاری رہی اور آخر فرنگی ہر رکاوٹ توڑ کر دمیاط کی فصیل تک پہنچ گئے۔ الملک الکامل نے ان حالات میں اپنے والد سے کمک طلب کی۔ الملک العادل کو یہ اطلاع ملی تو وہ کفِ افسوس ملتے اور اُمت کے حال پر آہ و زاری کرتے ہوئے بستر سے لگ گیا۔ کچھ دنوں بعد ۷ جمادی الآخرہ ۶۱۵ھ (۳۰ اگست ۱۲۱۸ء) کو دمشق کے باہر خیمہ زن محافظِ اسلام الملک العادل نے ۷۳ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ②

❁❁❁

الملک الکامل محمد

۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء) تا ۶۳۵ھ (۱۲۳۸ء)

الملک العادل کی وفات کو اس وقت تک خفیہ رکھا گیا جب تک اس کے جانشین الملک الکامل نے مصر میں اقتدار نہ سنبھال لیا۔ الکامل ایک تجربہ کار سپاہی تھا، اس نے صلیبیوں سے بھرپور مزاحمت جاری رکھی، تاہم انہی دنوں اس کے بعض امراء نے امیر عماد الدین ابن مشطوب کی سربراہی میں اسے برطرف کر کے اس کے بھائی الملک الفائز کو حکمران بنانے کی کوشش شروع کر دی، چنانچہ الملک الکامل کو دمیاط سے اس حالت میں نکلنا پڑا کہ صلیبی فوج دریائے نیل میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ الکامل کی عدم موجودگی اور مسلمانوں کے مابین اس سیاسی خلفشار سے صلیبیوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور ذوالقعدہ ۶۱۵ھ (جنوری ۱۲۱۹ء) میں ان کا بحری بیڑا دریائے نیل میں گھس آیا۔ فرنگی وادی میں اترے اور دمیاط کا محاصرہ کر لیا۔ اس دوران الملک العادل کے دوسرے بیٹے الملک الاشرف موسیٰ اور الملک المعظم عیسیٰ باپ کے انتقال کے بعد شام اور الجزیرہ کے مختلف حصوں کے خود مختار بادشاہ بن گئے تھے، تاہم ان کے درمیان یہ طے تھا کہ تمام اہم معاملات مشورے سے حل کیے جائیں گے۔ ③

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۱۵ھ تا ۶۱۸ھ ② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۱۵ھ تا ۶۱۸ھ
③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۳۰۷/۱ تا ۳۱۵، ط العلمیۃ

دمیاط پر فرنگیوں کا قبضہ:

دمیاط کے محصورین دس ماہ تک صلیبیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ الملک الکامل دریائے نیل کی وادی اُشموم میں پڑاؤ ڈال کر عقب سے حریف پر تاخت وتاراج کرتا رہا مگر موسم خزاں میں اہلِ دمیاط کی خوراک ورسد ختم ہونے کو آگئی۔ پھر موسم سرما میں خلافِ معمول بارشیں شروع ہوگئیں۔ آخر کار ۲۴ شعبان ۶۱۶ھ (۴ نومبر ۱۲۱۹ء) کی ایک طوفانی رات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صلیبی دمیاط کی فصیل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ صبح تک شہر فتح ہو چکا تھا۔ فرنگیوں نے وہاں شہریوں کا قتلِ عام کیا اور جامع مسجد کو گرجا بنالیا۔ الکامل کچھ فاصلے پر خیمہ زن تھا مگر نیل کی نہروں میں سیلاب نے اس کے لیے آگے بڑھنا ناممکن کر دیا تھا اس لیے وہ بالکل بے بس تھا۔

دمیاط پر صلیبیوں کے قبضے کے ساتھ عالم اسلام کی شمال مغربی سرحدیں غیر محفوظ ہوگئیں۔ دمیاط یورپی اقوام کا مضبوط ترین مرکز بن گیا اور انہوں نے اردگرد کے وسیع زرعی علاقے اور قصبات پر بلا روک ٹوک قبضہ کرلیا۔ اب یورپی جہاز راں بحیرۂ روم اور بحیرہ احمر کے راستے دور دور تک اپنی افواج پہنچا سکتے تھے تاہم فرنگی قاہرہ پر حملے سے پہلے یورپ سے مزید افواج کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ ڈیڑھ سال تک فریقین میں کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی۔ دمیاط کا قلعہ اور دُہری فصیل مسلمانوں کے دور میں بھی پختگی اور استحکام میں بے مثال تھے۔ فرنگی بے تحاشا سرمایہ خرچ کر کے اسے مزید بلند اور مضبوط کرتے گئے یہاں تک کہ اسے فتح کرنا ناممکن معلوم ہونے لگا۔ ①

وادیٔ نیل کا تاریخی معرکہ:

الکامل اس دوران مشرقی افق پر تاتاری یلغار کے شعلے لپکتے دیکھتا رہا جو خوارزم، وسطِ ایشیا اور خراسان کو راکھ بنا رہی تھی مگر وہ خود صلیبیوں میں گھرا ہوا تھا اور قاہرہ کی حفاظت کے لیے سخت فکر مند تھا۔ محاذ کی خاموشی کے ان دنوں میں اس نے بے پناہ مالی وافرادی وسائل صرف کرکے دمیاط سے ۲۸ میل جنوب میں دریائے نیل کے موڑ کے ساتھ بلند ٹیلوں پر ایک اور شہر تعمیر کرالیا جس کا نام ''المنصورہ'' رکھا گیا۔ یہ شہر مصر میں مسلمانوں کا نیا دفاعی مرکز بن گیا۔

الملک الکامل نے فرنگیوں سے فیصلہ کن جنگ سے پہلے اپنے بھائی المعظم اور الاشرف کو مدد کے لیے طلب کرلیا۔ الاشرف کے نام مراسلے میں اس نے فی البدیہ یہ اشعار لکھے:

یَامُسْعِفِیْ اِنْ کُنْتَ حَقًّا مُسْعِفِیْ...... فَارْحَلْ بِغَیْرِ تَقَیُّدٍ وَتَوَقُّفٖ

''اے میرے مددگار! اگر تو واقعی میرا مددگار ہے تو کسی تاخیر اور وقفے کے بغیر روانہ ہو جا۔''

وَاطْوِ الْمَنَازِلَ وَالدِّیَارَ وَلَا تُنِخْ...... اِلَّاعَلٰی بَابِ الْمَلِیْکِ الْاَشْرَفٖ

''منزلیں اور علاقے پھلانگتا جا اور سواری کو الملک الاشرف کے دروازے پر ہی روکنا۔''

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ا ص ۳۱۶ تا ۳۲۰، ط العلمیة، البدایة والنہایة: سنة ۶۱۶ھ،
The Crusades by Harold Lamb:p;241 to 245

قَبِّلْ يَدَيْهِ لَاعُدِمْتَ وَقُلْ لَهُ...... عَنِّیْ بِحُسْنِ تَعَطُّفٍ وَتَلَطُّفِ

''تیرا بھلا ہو، اس کے ہاتھ چوم کر میری طرف سے بڑے ادب واحترام سے کہنا۔''

اِنْ تَاتِ صِنْوُکَ عَنْ قَرِيْبٍ تَلْقَهُ...... مَا بَيْنَ حَدِّ مُهَنَّدٍ وَمُثَقَّفِ

''اگر تم اپنے بھائی کے پاس فوراً آجاؤ تو اسے ہندی تیغوں کی دھاروں اور لچک دار نیزوں کی زد میں پاؤ گے''

اَوْ تُبْطِ عَنْ اِنْجَادِهِ فَلِقَاؤُهُ...... يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَنْ عِرَاضِ الْمَوْقِفِ

''اور اگر اس کی مدد میں دیر کی تو پھر اس سے ملاقات قیامت کے دن اعمال پیش ہوتے وقت ہی ہو سکے گی۔''

الملک الاشرف اس سے پہلے بیت المقدس کی فصیل کو مسمار کر چکا تھا تا کہ اگر فرنگی وہاں قابض ہو بھی جائیں تو اس کا دفاع نہ کر سکیں اور جنگ کسی ایسے معاہدے پر منتج ہو کہ ارضِ مقدس فریقین کی یکساں تحویل میں رہے۔ اب اسے شام میں کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔ وہ اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے المنصورہ پہنچا اور الملک الکامل سے جاملا۔

صفر ۶۱۸ھ (مئی ۱۲۲۱ء) میں فرنگیوں کو یورپ سے بھاری کمک پہنچ گئی اور دو لاکھ دس ہزار سورماؤں پر مشتمل صلیب کا ٹڈی دل لشکر دریائے نیل کی وادیوں میں صف بستہ ہو گیا۔ انہوں نے دریائے نیل کے کنارے قاہرہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ الکامل نے دربارِ خلافت میں خلیفہ ناصر سے فوجی امداد کی درخواست کی مگر کوئی پذیرائی نہ ہوئی۔ آخر اس نے اس موقع پر اپنا پہلو کمزور دیکھ کر حریف کو پیش کش کی کہ وہ بیت المقدس اور اس کے نواحی علاقے لے کر صلح کر لیں مگر فرنگی رضامند نہ ہوئے اور پیش قدمی کرتے رہے۔

فرنگیوں کی بری فوج ''المنصورہ'' پہنچ گئی مگر یہاں اسے رکنا پڑا کیوں کہ یہ شہر دریائے نیل اور ''اشمون طناح'' (اشموم ندی) کے درمیان سطح مرتفع پر واقع تھا۔ اس مثلث دوآبے میں ان کی پیش قدمی بہت مشکل تھی۔ انہوں نے کئی بار آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر بلندی پر مورچہ بند مسلمانوں نے تیراندازی اور آتش زنی کے ذریعے انہیں ہر بار پسپا کر دیا۔ فرنگی یہاں تک پہنچ کر بھی قاہرہ سے ۶۰ میل دور تھے۔ انہوں نے یہاں خندقیں کھود کر طویل پڑاؤ کی تیاری کی۔ دونوں لشکر مورچے سنبھال کر ایک مدت تک سنگ باری، آتش زنی اور تیراندازی سے ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے رہے۔ دریائے نیل کی وجہ سے دشمن مسلمانوں پر عمومی دھاوا بول کر اپنی عددی کثرت کا فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا، مسلمان غوطہ خور چھاپہ مار حملوں کے ذریعے انہیں خاصا جانی و مالی نقصان پہنچا رہے تھے۔

الملک الکامل کو وقت درکار تھا اور وہ اسے مل چکا تھا۔ وہ کئی ماہ سے قاہرہ میں جہاز بنوا کر انہیں نیل کی دوسری شاخ سے اسکندریہ بھیج رہا تھا۔ اسکندریہ میں مسلمانوں کا بحری بیڑا جونہی مضبوط ہوا، اس نے دمیاط پہنچ کر فرنگیوں کے بحری جہازوں کی نقل و حرکت مسدود کر دی۔ وہ ساحلِ سمندر اور دریائے نیل پر قابض ہو کر دمیاط میں صلیبیوں کے عقب میں پہنچ گئے۔ آبی راستوں پر قبضے کے بعد الکامل اپنی افواج کو کسی بھی جگہ لے جا سکتا تھا۔ اس دوران الکامل کے بلاوے پر اس کا دوسرا بھائی الملک المعظم عیسیٰ بھی دمشق سے تازہ دم دستوں سمیت دمیاط پہنچ گیا، یوں دمیاط کے گرد

مسلمانوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

انہی دنوں مخبروں نے الملک الکامل کو اطلاع دی کہ صلیبی لشکر کی خوراک کے تمام بڑے ذخائر دمیاط شہر کے گوداموں میں محفوظ ہیں، اپنے ساتھ وہ مختصر مدت کے لیے اناج کے محدود ذخائر لے کر چلے ہیں کیوں کہ ان کی لشکر گاہ کے اردگرد نیل کی وادی میں پھیلے ہوئے کھیتوں اور باغات کی پیداوار انہیں تازہ بتازہ مل رہی ہے۔ ان کا سارا انحصار فی الحال انہی کھیتوں اور باغات پر ہے۔ یہ اگست کا مہینہ تھا اور زوردار بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ دریائے نیل پانی سے لبالب بھر چکا تھا۔ الکامل نے موسم اور مخبر کی بروقت اطلاع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے ایک فوجی دستے کو خفیہ طور پر دریا کے پار بھیج کر صلیبی افواج کے پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر دریا کا بند تڑوادیا۔ دریا کا پانی سیلاب کی شکل میں ان تمام میدانوں، کھیتوں اور باغات میں پھیل گیا جو فرنگی لشکر کے اطراف میں تھے، اس اچانک افتاد سے صلیبی بدحواس ہوگئے۔ ادھر موقع پا کر الملک الکامل نے اپنے لشکر کے ساتھ سیلاب زدہ علاقے سے ہٹ کر دریا پر پل بنوایا اور اسے عبور کر کے اس شاہراہ پر قبضہ کر لیا جو صلیبی لشکروں کی دمیاط کی جانب واپسی کا واحد راستہ تھا۔

اب صلیبی حملہ آور ہر طرف سے گھر گئے تھے، منجنیقوں سے ان پر سنگ باری مسلسل ہو رہی تھی، مجاہدین ہر طرف سے پے بہ پے حملے کر کے تیروں کا مینہ برسا رہے تھے، غذائی اجناس کی کمی کے باعث قحط موت بن کر صلیبیوں کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ صلیبی لشکر کے سربراہ شاہ جان نے مایوسی کے عالم میں دمیاط کی طرف پسپائی اختیار کی مگر سپاہی اور گھوڑے سیلاب زدہ نہروں، نالیوں اور کیچڑ میں پھنس کر رہ گئے۔ آخر شاہ جان نے دل برداشتہ ہو کر دو لاکھ سپاہیوں سمیت انتہائی ذلت کی حالت میں ہتھیار ڈال دیے۔ اسے سلطان الکامل کے خیمے میں پہنچایا گیا۔ سلطان نے اس کے ساتھ بہت فراخ دلی کا سلوک کیا اور دمیاط خالی کرنے اور آٹھ سال تک جنگ نہ کرنے کی شرط پر تمام قیدیوں کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا۔ ۹ رجب ۶۱۸ھ (۲۸ اگست ۱۲۲۱ء) کو فتح مند اسلامی لشکر دمیاط میں داخل ہوا۔ مسلمانوں نے شکرانے کے نوافل ادا کیے، الملک الکامل نے ایک عظیم الشان محفل منعقد کی، عوام وخواص سب کو جمع کیا، بیس فرنگی شہزادے، درجنوں صلیبی راہب اور لاتعداد شکست خوردہ فرنگی سر جھکائے کھڑے تھے، یہ دیکھ کر راجح الحِلّی نامی ایک شاعر کھڑا ہوا اور اس نے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے:

حَبَا نَا اِلٰهُ الخَلقِ فَتحًا بَدَالَنَا...... مُبِيْنًا وَّاِنعَامًا وَّ عِزًّا مُّؤَبَّدًا

''رب کائنات نے ہمیں واضح طور پر فتح مبین عطا فرمائی اور اپنی نعمتوں اور دائمی عزت سے مالا مال فرمایا۔''

تَهَلَّلَ وَجهُ الدَّهرِ بَعْدَ قُطُوبِهٖ...... وَاَصبَحَ وَجهُ الشِّرکِ بِالظُّلمِ اَسوَدَا

''زمانے کا شکن آلود چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا اور شرک کا منہ تاریکیوں میں چھپ کر سیاہ ہوگیا۔''

وَنَادٰی لِسَانُ الْكَوْنِ فِی الْاَرْضِ رَافِعًا...... عَقِيْرَتَهٗ فِی الْخَافِقِيْنَ وَ مُنْشِدَا

''کائنات بزبانِ حال ان لرزہ براندام نصرانیوں کو پکار کر با آواز بلند کہنے لگی۔''

أَعُبَّادَ عِيسَى إِنَّ عِيسَى وَ حِزْبَهُ...... وَمُوسَى جَمِيعًا يَخْدِمُونَ مُحَمَّدًا

''اے عیسیٰ کے پجاریو! دیکھو تو سہی! عیسیٰ (الملک المعظم) اور اس کا لشکر اور موسیٰ (الملک الاشرف) متحد ہو کر محمد ﷺ (کے دین) کی خدمت کر رہے ہیں۔''

الملک الکامل محمد نے معاہدے کے مطابق شاہ جان سمیت تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا۔[1]

ہیرلڈ لیمب اس شکست کے بارے میں لکھتا ہے:

''اب تک صلیبی القدس پر قبضے کے بارے میں پرامید تھے۔ وہ اپنی شکستوں کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ وہ ہمارے گناہوں کی سزا تھی مگر منصورہ کی شکست کے بعد ان کا یقین ڈگمگانے لگا۔ اس کے برعکس نیم دل مسلمانوں کا اعتماد بحال ہو گیا۔ منصورہ کی جنگ سے یہ واضح ہو گیا کہ صلیبی لشکروں کو اب بھی شکست دی جا سکتی ہے۔''[2]

چھٹی صلیبی جنگ

صلیبی آٹھ سالہ جنگ بندی کا معاہدہ کر کے واپس لوٹے تھے مگر انہوں نے جلد ہی ایک حیلہ کر کے معاہدہ توڑ ڈالا۔ دمیاط کی جنگ میں جرمنی شریک نہیں ہوا تھا بلکہ جرمن بادشاہ فریڈرک ثانی راستے سے واپس لوٹ گیا تھا۔ کلیسا نے اس حرکت پر اسے کافر قرار دے دیا۔ اب فریڈرک کے ذمے تھا کہ وہ ''کفر'' سے نکلنے کے لیے صلیبی جنگ لڑے۔ صلیبیوں کے پاس یہ حجت تھی کہ مسلمانوں سے جنگ بندی کا وعدہ ان حکمرانوں نے کیا تھا جو جنگ میں شریک تھے۔ فریڈرک کا اس معاہدے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس حیلے کے ساتھ ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں شاہِ جرمنی فریڈرک دوئم ایک لشکرِ جرار لے کر شام کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت تاتاریوں کے حملے سے مشرق میں مسلمانوں کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ نیز مصر اور فلسطین کے حاکم الملک الکامل کا اپنے بھائی الملک المعظم حاکمِ دمشق سے جھگڑا چل رہا تھا اس لیے مسلمانوں کا دفاعی پہلو بہت کمزور تھا۔ الملک المعظم نے فرنگیوں کے قبضے کے خوف سے القدس کی فصیل مسمار کرا دی تاہم وہ اپنے بھائی الکامل کے ساتھ مل کر دشمن کے خلاف کوئی متحدہ محاذ بنانے پر تیار نہ ہوا۔

الملک الکامل اگر تنہا جنگ لڑتا تو شکست کا امکان واضح تھا۔ اس دوران ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) میں فریڈرک عکا پہنچ گیا۔ الکامل بھی اپنی فوج کے ساتھ عکا کے قریب تل العجول پر خیمہ زن ہوا۔ فریڈرک نے الکامل کو یہ مراسلہ بھیجا:

''دمیاط کی جنگ کے موقع پر آپ ہمیں سارا فلسطین دینے پر رضامند ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے اس سے کم پیش کش نہیں کریں گے جو آپ فرنگیوں کو کر چکے ہیں۔ مجھے مایوس کرنا آپ کے مفاد میں بھی نہ ہوگا۔''

الکامل کئی ہفتوں تک اس پیش کش پر غور کرتا رہا۔ خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے مملکت کی حفاظت کو القدس کی

---

① البدایة والنہایة، الکامل فی التاریخ، السلوک لمعرفة دول الملوک میں سنہ ۶۱۵ھ تا ۶۱۸ھ کے حالات دیکھیے۔
The Crusades by Harold Lamb:p:247 to 249

② The Crusades by Harold Lamb:p:250

تولیت پر ترجیح دی اور جنگ سے بچنے کے لیے جرمنوں سے صلح قبول کرلی۔

۱۸ ربیع الاوّل ۶۲۶ھ (۱۴ فروری ۱۲۲۹ء) کو فریقین میں معاہدہ ہوگیا کہ دس سال تک القدس عیسائیوں کے پاس رہے گا۔ القدس سے عکا کی بندرگاہ تک راہ داری کی پٹی بھی انہیں دی جائے گی۔ حرم، مسجدِ اقصیٰ اور قبۃ الصخراء مسلمانوں کی تحویل میں رہیں گے، وہاں اذان اور نماز جاری رہے گی۔ اس کا انتظام مسلمانوں کے پاس ہوگا۔ عیسائی بیت المقدس کی مسمار شدہ فصیل کو دوبارہ تعمیر نہیں کریں گے تاکہ شہر کی آزاد حیثیت باقی رہے۔ فریڈرک سے ضمانت لی گئی کہ یہاں مسجدِ اقصیٰ کی زیارت کے لیے آنے والے مسلمانوں کو تحفظ دیا جائے گا۔ نیز آئندہ یورپ سے عالم اسلام پر کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا۔ غرض مسلمانوں اور عیسائیوں نے القدس کو تقسیم کر کے اسے غیر عسکری شہر قرار دے دیا۔[1]

بیت المقدس جرمنوں کے حوالے اور علماء کا احتجاج:

الکامل کے اس فیصلے سے مسلمانوں کو بہت دکھ ہوا، اسے ایک ذلت آمیز شکست کے مترادف سمجھا گیا اور اس کی وجہ سے الکامل کی نیک نامی سخت متاثر ہوئی۔ جب القدس کے مسلم باشندوں کو انخلاء کا حکم دیا گیا تو وہاں ایک چیخ و پکار مچ گئی۔ نقل مکانی کرنے والے مسلمان علماء، امام اور مؤذن الکامل کی خیمہ گاہ میں آگھسے۔ شاہی خیمے کے سامنے دھرنا دیا۔ مؤذن وقت بے وقت اذانیں دینے لگے۔ الکامل سخت برافروختہ ہوا۔ اس نے اپنی صفائی میں کہا:

> ''میں نے عیسائیوں کو صرف چند گرجے، ویران گھر اور ملبے کے ڈھیر دیے ہیں۔ مسجد اقصیٰ اسی طرح ہمارے پاس ہے۔ اسلامی شعائر باقی ہیں۔ مسلمان حاکم القدس کے ضلعے میں اسی طرح برقرار رہے گا۔''

مگر لوگ مطمئن نہ ہوئے اور اسے جلی کٹی سناتے رہے۔

شاہِ جرمن القدس کی زیارت کے لیے بے تاب تھا۔ الکامل نے اس کا انتظام کردیا۔ وہ اپنے حشم و خدم کے ساتھ مسلمان علماء اور قاضیوں کی راہنمائی میں بیت المقدس پہنچا۔ یہاں کے قدیم گرجوں اور تاریخی مقامات کی زیارت کی، جب وہ حرم اقصیٰ کے پاس آیا تو گنبد صخرہ اور مسجد کی خوب صورتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

اس دورے میں اس نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کو اپنے دلی خلوص اور ایفائے عہد کا یقین دلا کر جائے۔ جب اس نے مسجد اقصیٰ کے زینے پر قدم رکھا تو ایک پادری بائبل تھامے مسجد میں جاتا دکھائی دیا۔ فریڈرک اسے دیکھ کر چلایا:

> ''جانتے نہیں یہاں ہم الملک الکامل کی رعایا ہیں۔ اس نے ہمارے اور تمہارے اوپر احسان اور انعام کرتے ہوئے یہ گرجے سپرد کیے ہیں۔ تم میں سے کوئی اپنی حد سے آگے نہ بڑھے۔ اگر بلا اجازت آئندہ کوئی یہاں گھسا تو اس کا سر قلم کردوں گا۔''

یہ ڈانٹ سن کر پادری لرزتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔ شاہِ جرمن نے یہ شب شہرِ مقدس میں گزاری۔ اس رات قاضی نے مسجد اقصیٰ کے مؤذن کو پابند کردیا کہ وہ مہمان حکمران کا لحاظ کرتے ہوئے چھت پر اذان نہ دے۔ صبح

[1] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۶ھ؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۱/۳۵۱ تا ۳۵۴، ط العلمیۃ

شاہِ جرمن نے پوچھا: ''اذان کی آواز نہیں سنائی دی!'' جب اسے وجہ بتائی گئی تو وہ بولا: ''خدا کی قسم! میں نے رات یہاں اس لیے گزاری تھی کہ اقصیٰ کی اذانیں اور مسلمانوں کی عبادت کی آوازیں سن سکوں۔''

جمادی الآخرہ ۶۲۶ھ (مئی ۱۲۲۹ء) میں فریڈرک ثانی اپنے وطن واپس چلا گیا۔ ①

المعظم، الاشرف اور الکامل کی وفات:

الملک الکامل کو یقین تھا کہ اب یورپ کے پاس اسلامی دنیا کا رخ کرنے کا کوئی بہانہ نہیں رہے گا اور صلیبی جنگیں ختم ہو جائیں گی۔ واقعی اس کے بعد ۲۱ سال تک کوئی صلیبی حملہ آور ایشیا کی سمت نہ آیا۔ تاہم صلیبی مسلمانوں کو پوری طرح زیر کرنے کی خواہش سے کبھی دست بردار نہ ہو سکے اور ۲۱ برس بعد اسی جذبے نے ایک نئی جنگ چھیڑ دی۔

فریڈرک سے معاہدے سے پہلے ذوالقعدہ ۶۲۴ھ (نومبر ۱۲۲۷ء) میں ایوبی شہزادے الملک المعظم عیسیٰ ابن ملک العادل کی وفات ہو گئی تھی۔ اس کا پایۂ تخت دمشق اس کے دوسرے بھائی الملک الاشرف نے لے لیا اور یوں وہ پورے شام کا حاکم بن گیا۔ الملک المعظم کے جانشین الناصر داؤد کے پاس فلسطین، کرک اور کچھ نواحی قلعے رہ گئے۔ ②

شام میں الملک الاشرف اور مصر میں الملک الکامل کی حکومت تادیر قائم رہی۔ ۴ محرم ۶۳۵ھ (۲۷ اگست ۱۲۳۷ء) کو الملک الاشرف ایک طویل دورِ اقتدار کے بعد دنیا سے رخصت ہوا، اور اس کا بھائی الملک الصالح اسماعیل دمشق کا حکم بن گیا۔ اسماعیل کمزور تھا، اس لیے اس نے الکامل کے دباؤ پر جلد ہی دمشق اس کے حوالے کر کے بعلبک، بصریٰ اور چند قلعوں پر اکتفا کر لیا۔ چھ ماہ بعد ۲۲ رجب ۶۳۵ھ (۱۱ مارچ ۱۲۳۸ء) کو الملک الکامل بھی راہیٔ آخرت ہوا۔ اس نے مصر پر دس سال گورنر اور تیس سال بادشاہ کی حیثیت سے قابلِ رشک حکومت کی اور عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرتا رہا۔ الملک الکامل کی گدی اس کے بیٹے الملک الصالح نجم الدین ایوب ثانی نے سنبھالی۔ ③

❁❁❁

الملک الصالح نجم الدین ایوب

۶۳۷ھ (۱۲۴۰ء) تا ۶۴۷ھ (۱۲۴۹ء)

الملک الصالح نجم الدین ایوب ۶۰۳ھ (۱۲۰۷ء) میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے والد کی زندگی میں پہلے مصر اور پھر حصنِ کیفا اور سنجار کا گورنر رہا تھا۔ والد کی وفات کے وقت وہ سنجار میں تھا کہ مصر پر اس کے چھوٹے بھائی ابوبکر العادل نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ ④ لہو ولعب کا عادی یہ بیس سالہ نوجوان امورِ سلطنت چلانے کے لائق نہ تھا۔ ⑤ یہ دیکھ کر الصالح ایوب نے مصر کے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا اور اس بارے میں امراء سے رابطے کیے۔ مثبت جواب ملنے

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی، ص ۳۵۴، ط العلمیة

② تاریخ الاسلام للذھبی: سنة ۶۲۴ھ　③ تاریخ الاسلام للذھبی: سنة ۶۳۵ھ

④ تاریخ الاسلام للذھبی: وفیات سنة ۶۴۷ھ　⑤ مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب لابن واصل: ۲۶۲/۵، ط الامیریة

پر وہ مصر روانہ ہو گیا۔ راستے میں دمشق کے حاکم الملک الجواد (بن مودود بن الملک العادل) نے جسے ہر وقت دمشق پر مصری فوجوں کے حملے کا خدشہ رہتا تھا، اسے پیش کش کی کہ وہ سنجار اسے دے کر دمشق لے لے۔ الصالح ایوب نے اس پیش کش کو غنیمت سمجھا اور دمشق کی حکومت سنبھال لی۔ یہ ۶۳۶ھ کا واقعہ ہے۔

الصالح ایوب چند ماہ تک وہاں رہنے کے بعد مصری امراء سے خط و کتابت کر کے مصر روانہ ہو گیا۔ مگر ابھی وہ راستے میں تھا کہ اس کے چچا الصالح اسماعیل نے جو بعلبک کا حاکم تھا، اچانک دمشق پر دھاوا بول دیا اور صفر ۶۳۷ھ میں اس پر قابض ہو گیا۔ الصالح ایوب واپس پلٹا تا کہ دمشق کی صورتحال پر قابو پائے مگر دمشق ہاتھ سے نکلنے کی خبر سنتے ہی امراء اسے چھوڑ کر فرار ہو گئے اور وہ نابلس میں اپنی اہلیہ اُم خلیل (شجرة الدر)، امیر رکن الدین بیبرس کبیر [1] اور چند خدام کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ یہ دیکھ کر الناصر داؤد نے اسے قلعۂ کرک میں بلوا لیا اور اعزاز و اکرام کے ساتھ نظر بند رکھا۔ یہ واقعہ ۶۳۷ھ کا ہے۔ اس دوران العادل نے الناصر داؤد کو ایک لاکھ اشرفیوں کی پیش کش کی تا کہ وہ الصالح ایوب کو اس کے حوالے کر دے مگر الناصر داؤد بہت سمجھدار تھا۔ اس نے یہ پیش کش مسترد کر دی اور الصالح ایوب کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس میں طے پایا کہ شام الناصر داؤد کا اور مصر الصالح ایوب کا ہو گا۔ الناصر داؤد کی اس حرکت نے العادل کو غضب ناک کر دیا۔ وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت کرک پر چڑھائی کے لیے نکل پڑا۔ اس خبر سے الناصر داؤد اور الصالح ایوب دونوں اتنے خوفزدہ ہوئے کہ نابلس چلے گئے۔ ایک دن الصالح ایوب نابلس کے قریب واقع کوہِ طور پر چڑھ گیا اور تنہائی میں اللہ سے خوب گڑگڑا کر اس بدحالی سے نجات کی دعا کی۔ اُدھر العادل یلغار کرتا ہوا بَلبِیس تک پہنچا تھا کہ امراء نے اس سے نالاں ہو کر بغاوت کر دی اور الصالح ایوب کو بلاوا بھیج دیا۔ الناصر داؤد اب الصالح ایوب کو ساتھ لے کر مصر روانہ ہوا۔ راستے بھر خدشہ لاحق رہا کہ کہیں یہ بلاوا کوئی فریب تو نہیں مگر قسمت الصالح ایوب کا ساتھ دے رہی تھی۔ مصری لشکر گاہ میں اس کا شاندار استقبال ہوا اور امراء نے اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ یہ ذوالقعدہ ۶۳۷ھ کا واقعہ ہے۔ الصالح ایوب نے العادل کو قید کر دیا جبکہ الناصر داؤد کو بیس ہزار اشرفیاں بھیجیں مگر اس نے یہ رقم کم سمجھ کر ٹھکرا دی۔ [2]

الصالح ایوب کے خصائل:

تخت نشینی کے وقت الصالح ایوب کی عمر ۳۴ سال تھی۔ وہ ایک دور اندیش، شجاع اور مدبر انسان تھا۔ علامہ مقریزی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ ایک بہادر اور محتاط حکمران تھا۔ اپنی شان و شوکت اور عظمت کی وجہ سے بڑا پُر ہیبت تھا۔ عالی ہمت، حیادار اور پاکباز تھا۔ پست کاموں سے کنارہ کش اور بے ہودہ گوئی سے دور تھا۔ مذاق اور بے کار باتوں سے مکمل

---

① یہ رکن الدین بیبرس وہ نہیں جو بعد میں مصر کا بادشاہ بنا تھا بلکہ یہ وہ ہے جس نے ۶۴۲ھ میں غزہ کی جنگ لڑی تھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

② البدایة والنهایة: سنة ۶۳۶ھ، ۶۳۷ھ، تاریخ الاسلام للذهبي، وفیات سنة ۶۴۷ھ؛ مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب لابن واصل: سنة ۶۳۵ھ، ۶۳۶ھ، ۶۳۷ھ..... العادل کو ۶۴۵ھ میں قید کے دوران ہی قتل کر دیا گیا۔

احتراز کرتا تھا۔ بڑا باوقار اور کم گو انسان تھا۔ جب وہ گھر سے اپنے ملازموں کے پاس آتا تو اسے دیکھ کر سب خوف سے کانپ اٹھتے اور کسی کو کسی کے پاس کھڑے رہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ جب وہ اپنے ہم نشینوں میں بیٹھتا تو چپ رہتا۔ کوئی خوشی کی بات اسے بہلاتی تھی نہ جنبش دے پاتی۔ ہم نشینوں کا یہ حال ہوتا کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب وہ اپنے خاص ساتھیوں سے کچھ کہتا تو بڑے باوقار انداز میں کچھ چنیدہ کلمات کہہ دیتا۔ یہ کلمات صرف کسی اہم کام ہی کے لیے ہوتے۔ کوئی مشورہ ہوتا یا کوئی اہم حکم ہوتا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔ اس کے سامنے کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ پوچھی گئی بات کا جواب دینے سے زیادہ کچھ کہے۔ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی مصاحب نے اس کے سامنے خود کلام کی ابتداء کی ہو۔ نہ کسی کو کسی سفارش مشورے یا نصیحت کی ہمت ہوتی جب تک کہ سلطان خود بات کی ابتداء نہ کرے۔

جب وہ اکیلا ہوتا تو کوئی اس کے پاس نہ جا سکتا۔ درخواستیں اس کے پاس خدام لے جاتے اور وہ منظوری کی مہر لگا دیتا۔ اس رعب و دبدبے کے باوجود وہ حیا کی وجہ سے کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ اس سے کبھی کسی ملازم کے بارے میں کوئی بے ہودہ لفظ نہیں سنا گیا۔ اس کے دور میں شہر پر امن اور راستے محفوظ تھے۔ تاہم اس کی خودداری اور انا بہت بڑھی ہوئی تھی، اسی لیے جب الصالح اسماعیل نے اس کے بیٹے کو قید کیا تو اس نے اس کی رہائی کے لیے کوئی سوال نہیں کیا یہاں تک کہ اس کا بیٹا قید ہی میں مر گیا۔

اسے علم اور کتب کے مطالعے کا شوق نہ تھا۔ علماء اور صلحاء کے لیے وظائف جاری کر رکھے تھے مگر ان سے ملتا ملاتا نہ تھا کیوں کہ وہ تنہائی پسند، خاموش مزاج اور وقار و سکون کا عادی تھا۔ اسے تعمیراتی کاموں کی بڑی دھن تھی۔ بذاتِ خود ان کی نگرانی کرتا تھا۔ مصر میں اس جیسے تعمیری و ترقیاتی کام بنو ایوب کے کسی بادشاہ نے نہیں کرائے۔ فسطاط کے سامنے اس نے ''قلعۃ الروضۃ'' تعمیر کرایا جس پر بے پناہ دولت خرچ کی۔ وہاں ایک ہزار ترک غلام مقرر کیے جنہیں ممالیکِ بحریہ کہا جانے لگا۔ نیل کے کنارے اس نے کئی انتہائی خوبصورت محل بنوائے جن کا رخ چوگان (پولو) کے میدان کی طرف تھا۔ سلطان کو چوگان کا بہت شوق تھا۔ اس نے جبلِ جوار پر جامع ابن طولون کے سامنے ایک قلعہ ''کبش'' نامی بنوایا۔ ①

خوارزمی سپاہیوں کا قضیہ کیسے حل کیا گیا؟

اپنی ولی عہدی کے دور میں وہ خوارزمی سپاہیوں کے لاینحل مسئلے سے بخوبی عہدہ برآ ہوا تھا۔ یہ ترک سپاہی شام اور مصر کے لیے دردِ سر بن چکے تھے۔ اپنے قائد سلطان جلال الدین کی گم شدگی کے بعد ان کی کوئی منزل نہ تھی۔ وہ اِدھر اُدھر لوٹ مار کرتے پھرتے تھے اور ان کی شجاعت کی وجہ سے کسی کو ان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

الصالح ایوب نے اس مسئلے کو اس طرح حل کیا کہ ۶۳۴ھ (۱۲۳۷ء) میں اپنے والد الملک الکامل سے اجازت لے

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۱/۳۴۲، ط العلمیۃ ، یہ مقریزی کی عبارت کا خلاصہ ہے، لفظ بلفظ ترجمہ نہیں۔

کران سرگشتہ سپاہیوں کو اپنے ہاں بھرتی کر لیا۔ پھر حکمران بنا تو اس نے ترکوں اور خوارزمیوں کی ایک الگ فوج بنادی جو دریائے نیل کے ڈیلٹا پر واقع قلعوں میں تقرری کے باعث ''ممالیکِ بحریہ'' کے نام سے مشہور ہوئی اور اس نے آگے چل کر عالم اسلام کے دفاع کے لیے تاریخی کارنامے انجام دیے۔[1]

الصالح ایوب اور الصالح اسماعیل کا تنازعہ:

الصالح ایوب فرنگیوں کا سخت مخالف تھا۔ اس نے دشمن پر مسلمانوں کا دبدبہ برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اس کا چچا الصالح اسماعیل اس کا حریف تھا جس نے ۶۳۷ھ (۱۲۳۹ء) میں اس سے دمشق چھینا تھا۔ اب اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح مصر کو بھی زیرِ نگین کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنا پلہ بھاری کرنے کے لیے ۶۳۸ھ (۱۲۴۰ء) میں صفد اور شقیف کے قلعے فرنگیوں کے حوالے کر دیے تاکہ فرنگی الصالح ایوب کے خلاف اسے مدد دیں۔

شام کے سب سے بڑے عالم شیخ الاسلام عزالدین ابن عبدالسلام نے اس معاہدے پر احتجاج کیا مگر اسماعیل نے کوئی اثر نہ لیا اور شیخ کو حق گوئی کی پاداش میں گرفتار کر لیا۔ رہائی کے بعد وہ شاہِ مصر الصالح ایوب کی دعوت پر مصر چلے گئے۔ الصالح ایوب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور پوری قدردانی کرتے ہوئے انہیں مصر کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔[2]

بیت المقدس کی بازیابی۔ غزّہ کی جنگ:

بیت المقدس اس دوران ایک آزاد شہر کی حیثیت سے فرنگیوں کے پاس تھا۔ وہ معاہدے میں طے شدہ ادب و آداب کو فراموش کر چکے تھے۔ مسجد اقصیٰ میں گھنٹیاں بجاتے اور گنبد صخرہ پر چڑھ کر شراب پیتے مگر انہیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ معاہدے کے مطابق فرنگی اس کے مسمار شدہ برجوں کی مرمت نہیں کر سکتے تھے مگر فرنگیوں نے الکامل کی موت کے بعد اس کی فصیلیں بھی تعمیر کر لی تھیں اور شہر میں ایک قلعہ بھی بنا لیا تھا۔ الملک المعظم عیسیٰ کے بیٹے الناصر داؤد کو جو القدس کو مستثنیٰ کر کے فلسطین کے اکثر علاقے کا حاکم تھا، اس صورتحال سے سخت تشویش تھی۔ وہ اپنے باپ کی طرح حنفی فقیہ و مناظر اور صاحبِ سیف وقلم تھا، اس نے دینی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے القدس کے فرنگیوں کے خلاف کارروائی کی اور منجنیقوں سے قلعہ مسمار کر کے شرپسند فرنگیوں کو وہاں سے بھگا دیا۔

مگر اس کے جانے کے کچھ عرصے بعد فرنگی پھر وہاں گھس گئے اور اسی طرح مقاماتِ مقدسہ کی بے ادبی شروع کر دی۔ آخر الصالح ایوب کی غیرت نے انگڑائی لی۔ اس نے خود بھی ایک لشکر تیار کیا اور خوارزمی سپاہیوں کو بھی مدد کے لیے بلا لیا۔ دس ہزار خوارزمی ۶۴۲ھ (۱۲۴۴ء) میں دریائے فرات عبور کر کے فلسطین میں داخل ہو گئے۔ ان کا سردار حسام الدین برکہ خان تھا۔ وہ بعلبک اور غوطہ سے ہوتے ہوئے بیت المقدس پہنچے اور دھاوا بول کر شہر میں گھس گئے۔ نصرانی اس حملے کی تاب نہ لا سکے۔ ان کی بڑی تعداد کٹ گئی۔ باقیوں کو قیدی بننا پڑا۔

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۱ ۴۴۱؛ تاریخ ابن الوردی لزین الدین ابن الوردی: ۲/۱۶۱، ط العلمیة

② البدایة والنهایة: سنة ۶۳۷ھ، ۶۳۸ھ

چونکہ نصرانی القدس کی تولیت کے معاہدے میں درج مسلمانوں کے حقوق سے متعلق شقوں کی مسلسل خلاف ورزی کر کے از خود ہر معاہدے سے آزاد ہو چکے تھے، اس لیے خوارزمیوں نے بھی ان کا کوئی لحاظ نہ کیا اور ان کا خون بہانے اور املاک کو نذرِ آتش کرنے سے ذرا بھی نہ ہچکچائے۔ اس واقعے سے شام کی عیسائی ریاستوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے اسے مذہبی کی بجائے وطنی مسئلے کا رنگ دے دیا اور خوارزمیوں سے بدلہ لینے کے لیے حاکمِ دمشق الصالح اسماعیل، حاکمِ حماۃ الملک المنصور اور حاکمِ کرک الملک الناصر داؤد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

اب ایک نئی جنگ کی تیاری کی گئی۔ اس دوران الصالح ایوب نے اپنے سالار رُکن الدین بیبرس [1] کو فوج دے کر خوارزمیوں کا ساتھ دینے کے لیے مصر سے فلسطین بھیج دیا۔ یہ فوج غزہ میں آ کر ٹھہر گئی۔

جمادی الاولیٰ ۶۴۲ھ (اکتوبر ۱۲۴۴ء) میں غزہ کے میدان میں حریف افواج آمنے سامنے ہوئیں۔ حمص، حماۃ اور دمشق کے مسلمان سپاہی نصرانیوں کے شانہ بشانہ تھے۔ پادری صلیبیں بلند کر کے ان پر سایہ کر رہے تھے۔

آخر کار زوردار معرکہ ہوا۔ خوارزمیوں اور مصریوں کے جوش وجذبے کے سامنے نصرانیوں اور ان کے اتحادی مسلمانوں کی ایک نہ چلی۔ سب سے پہلے حماۃ کا حاکم الملک المنصور فرار ہوا۔ اس کے پیچھے باقی امراء بھی بھاگ نکلے۔ خوارزمیوں نے فرنگیوں کو ہر طرف سے گھیر لیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ فرنگیوں کے ۸۰۰ سپاہی گرفتار ہوئے جبکہ چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب مارے گئے۔ خوارزمی اور مصری سپاہی فاتحانہ انداز میں واپس ہوئے تو عیسائیوں اور ان کے اتحادیوں کی ۳۰ ہزار لاشیں غزہ کے میدان میں بکھری پڑی تھیں۔ [2]

ہیرلڈ لیمب لکھتا ہے: ''غزہ کی جنگ کے بعد فلسطین اور یروشلم ہمیشہ کے لیے نصرانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔'' [3]

الصالح ایوب کی فتوحات اور کارنامے:

الصالح ایوب کا ستارۂ اقبال بلندی پر تھا۔ اس نے ۶۴۳ھ (۱۲۴۵ء) میں خوارزمیوں کو ساتھ ملا کر دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ الصالح اسماعیل نے فرار ہو کر حاکمِ حلب الناصر ایوبی کے پاس پناہ لی اور تاج و تخت سے بالکل محروم ہو گیا۔

الصالح ایوب نے محاصرہ جاری رکھا اور ذوالقعدہ ۶۴۴ھ (مارچ ۱۲۴۷ء) میں فاتحانہ طور پر دمشق میں داخل ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے بعلبک سمیت شام کے اکثر اضلاع پر قبضہ کر لیا اور بیت المقدس کو بھی اپنی تحویل میں لے کر اس کی فصیل اور حفاظتی انتظامات کو اسی طرح مستحکم کرا دیا جیسے وہ سلطان صلاح الدین کے دور میں تھے۔

---

① اس جنگ میں مصری فوج کی کمان جس رکن الدین بیبرس بندقداری کے پاس تھی یہ وہ نہیں جو بعد میں بادشاہ ہوا، بلکہ یہ اُس کا ہم نام وہم لقب ایک الگ امیر تھا جو عمر اور مرتبے میں بڑا تھا۔ (تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۴۷/۲۷، ت تدمری) اسے بیبرس کبیر بھی کہا جاتا تھا۔ ۶۴۴ھ میں الصالح ایوب کو اس پر شک ہوا کہ وہ خوارزمیوں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف ساز باز کر رہا ہے، لہٰذا اس نے بیبرس کبیر کو حیلے بہانے سے غزہ سے مصر بلوایا اور قلعۃ الجبل میں قید کر دیا، اس کے بعد اس کا کوئی اتا پتا نہیں چلا، غالباً حالتِ قید ہی میں وہ مر گیا یا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ (تاریخ ابن الوردی: ۱۷۲/۲، مفرج الکروب: ۳۵۱/۵) جو بیبرس بادشاہ بنا، وہ غزہ کی جنگ کے وقت سترہ برس کا تھا کیونکہ اس کی ولادت ۶۲۵ھ کی تھی۔ (النجوم الزاھرۃ: ۹۵/۷)

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۳۱۸/۱ تا ۳۲۰، ط العلمیۃ

③ The Crusades by Harold Lamb:p;281

۶۴۴ھ (۱۲۴۶ء) میں اس نے ''الصالحیۃ'' کے نام سے مصر کی سرحد پر صحرائے سینا کے کنارے ایک نئی فوجی چھاؤنی بنائی جہاں فوج کی رہائش سمیت ہر ضرورت مہیا تھی۔ اس طرح شام اور مصر کے درمیان نقل وحرکت کرنے والی سپاہ کو بڑی سہولت میسر آگئی۔ اگلے برسوں میں یہ شہر مسلمانوں کا مضبوط فوجی مرکز ثابت ہوا۔ [1]

مصر وشام پر گرفت مضبوط کر کے الصالح ایوب نے ساحلِ فلسطین کو نصرانیوں سے پاک کرنے کی مہم شروع کی۔ ۱۰ صفر ۶۴۵ھ (۱۵ جون ۱۲۴۷ء) کو اس نے طبریہ پر قبضہ کیا اور جمادی الآخرہ کے آخری عشرے میں عسقلان بھی فتح کر لیا۔ [2]

ساتویں صلیبی جنگ:

الصالح ایوب کی فتوحات نے یورپی پادریوں کو ایک بار پھر مشتعل کر دیا۔ فرانس کے حکمران لوئیس نہم نے جسے دنیائے نصرانیت ''سینٹ لوئی'' کے لقب سے یاد کرتی ہے، پاپائے روم کی ترغیب پر ۶۴۶ھ (۱۲۴۸ء) میں ساتویں صلیبی جنگ کا علم بلند کر کے مصر کے ساحل کا رخ کیا۔ مذہبی علوم میں پادریوں کے ہم پلہ اس بادشاہ کو یورپ میں ایک درویش اور خدا رسیدہ انسان سمجھا جاتا تھا۔ [3] وہ قبرص پہنچا اور سردیاں گزار کر اپنے بیڑے پر مصر روانہ ہو گیا۔ [4]

الملک الصالح ایوب اس وقت دمشق میں تھا۔ اس کی بائیں ران پر ایک زخم نے ناسور کی شکل اختیار کر لی تھی جس کی وجہ سے سفر کرنا خطرناک تھا۔ تاہم صلیبیوں کی یلغار کی اطلاع پا کر وہ اسی حالت میں مصر کی طرف لپکا۔ فرنگیوں کا رخ دمیاط کی طرف تھا۔ الصالح ایوب نے ان سے پہلے محرم ۶۴۷ھ (اپریل ۱۲۴۹ء) میں وہاں پہنچ کر حفاظتی انتظامات مضبوط کیے اور قلعے کو افواج، اسلحے اور سامانِ رسد سے بھر دیا۔ ساتھ ہی قاہرہ میں اپنے نائب حسام الدین کو حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ جنگی جہاز تیار کرا کے انہیں ساحل پر بھیجا جائے۔ سپہ سالارِ اعلیٰ فخر الدین شیخ کو ہدایت کی کہ وہ دمیاط کی جنوبی سمت، شہر اور دریائے نیل کے درمیان وادی میں مورچہ بندی کر لے۔

الملک الصالح ایوب کی حالت دن بدن بگڑتی گئی یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ ناسور لاعلاج ہو کر باقی جسم کو گلا رہا تھا۔ سلطنت میں اعلان کر دیا گیا کہ جس کسی کا کوئی حق سلطان کے ذمے ہو، وہ آ کر وصول کر لے۔ اس اعلان پر بہت سے لوگ آئے اور ان کے مطالبات پورے کر دیے گئے۔

یہ قدرت کا عجیب امتحان تھا کہ تیسری صلیبی جنگ سلطان صلاح الدین نے شدید امراض کی حالت میں لڑی۔ پانچویں صلیبی جنگ میں الملک العادل بستر پر لگ گیا اور دورانِ جنگ ہی اس کا انتقال ہوا۔ اب ساتویں صلیبی جنگ میں الصالح ایوب نقل وحرکت سے قاصر تھا۔ اس دوران ۲۱ صفر ۶۴۷ھ (۴ جون ۱۲۴۹ء) کو شاہِ فرانس کا بحری بیڑا دمیاط

---

[1] المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار للمقریزی: ۱/ ۳۳۰، ۳۳۱، ط العلمیۃ

[2] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۴۳ھ تا ۶۴۵ھ

[3] تاریخ یورپ، حصہ دوم، سولھواں باب از اے سے گرانٹ، ترجمہ از مولوی عبدالحمد انصاری، ط جامعہ عثمانیہ دکن، ۱۹۳۱ء

[4] تاریخ الاسلام للذہبی: ۴۷/ ۳۵۵، سنۃ ۶۴۷ھ، ت تدمری

پہنچا اور اس نے ساحل کی طرف سے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ ساتھ ہی اس نے الصالح ایوب کو مراسلہ بھیجا جس میں درج تھا:

''آپ جانتے ہیں کہ میں دینِ نصرانیت کا امین ہوں، جیسا کہ تم اس وقت دینِ محمدی کے امین ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس وقت اندلس والے ہمیں خراج ادا کرتے اور تحائف بھیجتے ہیں۔ ہم انہیں گایوں کے ریوڑ کی طرح ہانکتے ہیں، مردوں کو قتل کرتے ہیں، عورتوں کا سہاگ اجاڑتے ہیں اور ان کی لڑکیوں اور بچوں کو غلام اور باندیاں بنا کر لے جاتے ہیں۔ ہم نے شہروں کو ان سے پاک کر دیا ہے۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں وہ وضاحت کے لیے کافی ہے اور خیر خواہی کی انتہاء ہے۔ اگر تم اب پادریوں اور راہبوں کی موجودگی میں شمع اٹھا کر صلیب پرستی کا اقرار کرو تب بھی مجھے اپنے قریب پہنچنے سے نہیں روک سکتے۔ میں تمہیں تمہاری عزیز ترین جگہ میں گھس کر قتل کر سکتا ہوں۔ پس جب یہ شہر میرے ہاتھ ہوں گے تو سوچو تمہیں بھلا کیا ملے گا۔ ہاں اگر تم جیتے اور شہر تمہارے ہوئے تو تم جو چاہے میرے ساتھ دست درازی کر لینا۔ بہر کیف میں تمہیں ان لشکروں سے خبردار کر رہا ہوں جو پہاڑوں اور وادیوں کو پر کرنے کے لیے کافی ہیں اور موت کی شمشیریں تمہاری طرف بڑھا رہے ہیں۔''

یہ خط پڑھ کر الصالح ایوب مسلمانوں کی توہین کے احساس سے آبدیدہ ہو گیا۔ اس نے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھ کر قاضی بہاؤ الدین کو کہا کہ قلم دان اٹھائیں۔ پھر اسی وقت یہ جواب لکھوایا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم. والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد رسول اللہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

مجھے تمہارا خط ملا۔ تم اپنے لشکر کی کثرت اور اپنے سپاہیوں کی تعداد سے ڈراتے ہو۔ ہم شمشیر زن ہیں۔ ہمارا ایک جرنیل شہید ہو جائے تو ہم دوسرے کو تیار رکھتے ہیں، جو ہم پر چڑھائی کرے ہم اسے برباد کر دیتے ہیں۔ اے فریب خوردہ شخص! جب تو ہماری تلواروں کی دھار، ہماری جنگ کا قہر، اپنے قلعوں اور ساحلوں پر ہمارا قبضہ، اور ہمارے ہاتھوں اپنے اگلے پچھلوں کی ویرانی آنکھوں سے دیکھ لے گا تب حسرت کے مارے اپنی انگلیاں چبائے گا، تیرے قدم اکھڑ جائیں گے۔ یہ وہ دن ہو گا جس کی ابتداء ہماری فتح اور انتہاء تیری شکست کے ساتھ ہو گی۔

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

(ظالم بہت جلد جان لیں گے کہ وہ کس ٹھکانے پر جا پہنچے ہیں۔)

ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس قول پر بات ختم کرتے ہیں:

کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ

(کتنی ہی مختصر جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں۔ اور بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

اور ہم حکماء کا یہ قول یاد کرتے ہیں کہ سرکش چت ہو جاتا ہے۔ تمہاری سرکشی ہی تمہیں گرائے گی اور مصیبت میں

مبتلا کرے گی۔ والسلام“

۲۲ صفر ۶۴۷ھ (۵ جون ۱۲۴۹ء) کو شاہِ فرانس نے فوج کو لے کر پیش قدمی کی اور ساحلِ سمندر پر دریائے نیل کے مغرب میں اپنا سرخ خیمہ نصب کر دیا۔ دریا کی مشرقی جانب سپہ سالار فخر الدین شیخ مصری فوج کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ اس نے دریا کا پل عبور کر کے فرانسیسیوں کو روکنے کی کوشش کی مگر حملہ آور ٹڈی دل سے بھی زیادہ تھے۔ ایک خوں ریز جھڑپ کے بعد مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس جھڑپ میں ایک مہمان امیر نجم الدین شہید ہو گیا۔

اسلامی فوج پل عبور کر کے واپس دریا کی مشرقی سمت آگئی۔ فخر الدین شیخ نے یہ سمجھ کر کہ حملہ آوروں کو روکنا بہت مشکل ہے، دریا کا پل توڑ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب فرنگیوں کو دریا پار کرنے میں کئی ہفتے لگ جائیں گے لہٰذا دمیاط محفوظ ہے۔ چنانچہ اس نے دمیاط کے ایک نواحی قلعے ”اشموم طناح“ کی سمت کوچ کر دیا۔ مگر سرکاری فوج کو شہر کے سامنے سے جاتا دیکھ کر دمیاط کے محافظ افسران حواس باختہ ہو گئے کیوں کہ دریا کے پار دشمن کا لشکرِ جرار موجود تھا۔ دمیاط کے محافظ شہر کے دروازے کھلے چھوڑ کر فوج کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ اہلِ شہر بھی بدحواس ہو کر نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔ پوری رات شہر خالی ہوتا رہا اور صبح تک وہاں ایک فرد بھی نہ رہا۔

اگلے دن اتوار ۲۳ صفر ۶۴۷ھ (۶ جون ۱۲۴۹ء) کو فرنگیوں نے دیکھا کہ میدان خالی ہے اور شہر کے دروازے کھلے ہیں۔ دوپہر تک وہ ٹھہرے رہے کہ کہیں یہ کوئی جنگی چال نہ ہو، مگر جب تصدیق ہو گئی کہ اسلامی فوج جا چکی ہے تو وہ دریا عبور کر کے شہر میں داخل ہو گئے۔ تمام اموال واسباب، اناج کے بے پناہ ذخائر اور اسلحے کے گودام جو الصالح ایوب نے ایک طویل محاصرانہ لڑائی کے لیے جمع کیے تھے، نہایت آسانی سے فرنگیوں کے ہاتھ آگئے۔

فرنگیوں نے اس واقعے کو اپنے پادری نما بادشاہ سینٹ لوئیس کی کرامت سمجھا اور پھولے نہ سمائے۔ اُدھر مسلمان ناقابلِ بیان صدمے سے دوچار ہوئے۔ دمیاط مصر سے شام تک تمام اسلامی شہروں کے دروازے کی مانند تھا۔ یہ اتنا مضبوط شہر تھا کہ پانچویں صلیبی جنگ میں دشمن ڈیڑھ سال تک سر پٹخنے کے بعد کہیں جا کر اس پر قبضہ کر سکا تھا۔ اس بار تو الملک الصالح ایوب نے ماضی کی تمام جنگوں سے زیادہ اہتمام کے ساتھ یہاں اناج اور ہتھیار محفوظ کرائے تھے۔ مگر یہ شہر ایک دن بھی مزاحمت نہ کر سکا۔

سلطان پہلے ہی بستر پر شدید بدنی تکلیف سے گزر رہا تھا، اس خبر نے اس کے اعصاب پر بھی بجلی گرا دی۔ اتنے بڑے دفاعی مرکز کو دشمن کے حوالے کر کے بھاگ آنا قابلِ معافی نہ تھا۔ اس نے دمیاط کے محافظ افسران سے سخت باز پرس کی۔ ان کا جواب تھا: ”ہم کیا کرتے جب کہ فوج اور تمام سالار میدان سے ہٹ گئے تھے۔“

مگر فوج کی غلطی کو سامنے لا کر شہر کے محافظ بے قصور ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے پاس کوئی گنجائش نہ تھی کہ حکام بالا کی اجازت کے بغیر اتنا اہم دفاعی شہر دشمن کے لیے چھوڑ دیتے۔ الصالح ایوب نے فقہاء سے فتویٰ لیا اور ان میں سے پچاس ذمہ دار افسران کو بغاوت کا مجرم ٹھہرا کر سزائے موت دے دی۔

وہ فوج کے سپہ سالار فخر الدین ابن شیخ پر بھی غضب ناک ہوا، اور اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: ''تم سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ کچھ مدت حریف کا سامنا کر لیتے۔ ایک مہمان مجاہد نجم الدین کے سوا جان دینے والا اور کوئی نہ تھا؟''

سلطان کا غصہ دیکھ کر فوج کے امراء گھبرا گئے۔ ڈر تھا کہ کہیں فخر الدین ابن شیخ کو بھی قتل نہ کر دیا جائے۔ بعض امراء نے خفیہ اجلاس میں فخر الدین کو مشورہ دیا کہ نیم جاں سلطان کو قتل کر کے اپنی جان بچالے مگر فخر الدین ابن شیخ ایک کے بعد دوسری حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ تجویز مسترد کر دی۔

سلطان نے اب منصورہ جا کر مورچہ بندی کا فیصلہ کیا۔ تیس سال پہلے الملک الکامل نے دمیاط پر صلیبیوں کے قبضے کے بعد نیل کے کنارے یہ عسکری شہر تعمیر کرایا تھا جس کی حالت اب کچھ شکستہ ہو چکی تھی۔ سلطان کو چارپائی پر ڈال کر ۲۵ صفر (۸ جون) کو المنصورہ کے قلعے میں پہنچایا گیا۔ یہاں حفاظتی انتظامات کے استحکام اور فصیل کی مرمت کا کام تیزی سے شروع ہوا۔ قاہرہ سے بحری جہاز منگوا لیے گئے۔ جہاد کے لیے نفیر عام ہوئی۔ اردگرد کے شہروں سے پیشہ ور سپاہی اور ہزاروں رضا کار آ گئے جن میں بڑی تعداد چھاپہ مار جنگ کے ماہر اعرابیوں کی تھی۔ چار ماہ تک یہ مجاہدین فرنگیوں پر شب خوں مارتے رہے۔ اس دوران سینکڑوں دشمن زخمی اور قتل ہوئے اور سینکڑوں قیدی بن کر المنصورہ اور قاہرہ پہنچے۔ دریائے نیل اور سمندر میں بحری فوج کی جھڑپیں بھی جاری رہیں۔

یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۵ شعبان ۶۴۷ھ (۲۲ نومبر ۱۲۴۹ء) کو سلطان الصالح ایوب کا انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر ۴۴ سال تھی، اس نے ۱۲ سال تک ایک حوصلہ مند، عادل اور غیور حکمران کے طور پر حکومت کی تھی۔ وہ ایوبی خاندان کا آخری طاقتور بادشاہ تھا جس کی عظمت مصر سے شام تک مسلّم تھی۔ ①

الصالح ایوب کا وصیت نامہ:

الملک الصالح ایوب نے وفات سے پہلے اپنے بیٹے توران شاہ کے نام ایک وصیت نامہ بھی لکھوایا جو خاصا طویل ہے جسے یہاں اسے تقریباً مکمل درج کیا جا رہا ہے کیوں کہ یہ ایک نایاب تاریخی دستاویز ہے جس میں جہاں حکمرانوں کے لیے سدابہار گراں مایہ نصائح ہیں، وہاں دولتِ ایوبیہ کے دورِ زوال میں پیدا شدہ ان خرابیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے جن کے باعث ایک عظیم سلطنت کو اندرونی طور پر دیمک لگ چکا تھا۔

اس نصیحت نامے میں گزشتہ ایوبی حکمرانوں کے دور کے کچھ واقعات اور ماضی میں مصریوں کی بعض شکستوں کے اسباب بھی سامنے آتے ہیں جو تاریخ کے کسی اور مأخذ میں نہیں ملتے۔ اس شاہکار مکتوب میں مستقبل کی جنگ کے سارے امکانات سامنے رکھتے ہوئے، ہر قسم کی صورت کے لیے ہدایات بھی لکھ دی گئی تھیں اور بعد میں انہی تجاویز پر عمل کر کے مصری افواج نے دشمن کو شکستِ فاش سے دوچار کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حال اور مستقبل پر مرحوم بادشاہ کی نگاہ کس قدر گہری تھی۔ مرحوم کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ خاموش طبع انسان تھا مگر آخری لمحات میں یہ

① السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی: ۱/۴۳۳ تا ۴۴۱، ط العلمیة

طویل وصیت نامہ لکھوا کر شاید اپنے جانشین کے لیے وہ سبھی کچھ کہہ گیا تھا جو وہ سالہا سال سے اسے کہنا چاہتا ہوگا۔
اب مکتوب کے مندرجات پیشِ خدمت ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیٹے توران شاہ! اللہ تمہیں اپنی اصلاح کی توفیق دے۔ تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں بلوانے میں اس لیے تاخیر کی کہ تمہارے اندر لڑکپن، جوشیلا پن اور غیر مستقل مزاجی ہے۔ مملکت ان چیزوں کا تحمل نہیں کر سکتی۔ باپ اپنے بیٹے کے لیے بہتری کے سوا کچھ نہیں سوچتا۔ تمہاری وہ عادتیں جو میں جانتا ہوں، انہیں ترک کر دو۔ تمہاری حکومت باقی رہے گی۔ اگر تم میری نصیحتیں نہیں مانو گے اور اپنی انہی عادتوں پر مصر رہو گے تو تمہاری حکومت جاتی رہے گی۔

اپنے تمام کاموں میں ثابت قدم رہنا۔ فوج کے بارے میں میری سیرت پر عمل کرنا۔ معاملات کو اسی سطح پر رہنے دینا جن پر وہ چلے آرہے ہیں۔

تمام امراء کے بارے میں وصیت ہے کہ ان کا اکرام واحترام کرنا۔ تمہاری پرواز کے پَر وہی ہیں۔ تمہاری پشت پناہی انہی کے باعث ہے۔ ان کے دلوں کو خوش رکھنا۔ ان کی مراعات بڑھا دینا۔ ہر امیر کے لیے بیس سوار مزید بڑھا دینا۔ اموال خرچ کرنا۔ اس طرح یہ لوگ تم سے محبت کریں گے اور اس (صلیبی) دشمن سے دفاع میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ دمیاط (پر فرنگیوں کے قبضے) کے معاملے میں کسی کا مواخذہ نہ کرنا۔ یہ تقدیر کا فیصلہ تھا جس میں کسی کا کوئی دخل نہ تھا۔

بھائی فخر الدین بن شیخ میرے سب سے پُرانے رفیق ہیں۔ ان کا ایسا احترام کرنا جیسا میرا کرتے ہو۔ انہیں اپنا والد سمجھنا، ان کی بات سننا اور ماننا۔ ان کی مخالفت مت کرنا۔ انہیں دو سو گھڑ سوار مزید دے دینا۔

اُم خلیل (شجرۃ الدر) کے بارے میں وصیت ہے کہ ان کے مجھ پر اس قدر حقوق اور احسانات ہیں جنہیں میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کا اکرام واحترام کرنا۔ انہیں اپنی ماں جیسا سمجھنا اور ہر قسم کی راحت پہنچانے میں کسر مت چھوڑنا۔ ان کے دل کو کبھی ٹھیس مت لگنے دینا۔ ان کی تدبیر کی مخالفت مت کرنا۔ یہ میری وصیت ہے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا۔

باقی تمام اہلِ خانہ کے بارے میں وصیت ہے کہ ان سے اچھا سلوک کرنا۔ ان کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں۔ ان میں سے کسی چھوٹے بڑے کی خدمت سے دریغ نہ کرنا۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم سے حکومت چھن جائے گی کیوں کہ میں لکھ چکا ہوں کہ اگر تم نے خلاف ورزی کی تو تم عاق سمجھے جاؤ گے۔

بیٹا! یہ بات یاد رکھنا کہ حکومت ابتداء میں ایک نوخیز درخت کی طرح ہوتی ہے جسے ہوائیں اِدھر اُدھر جھکاتی رہتی ہیں اور کبھی اسے جڑ سے بھی اکھاڑ دیتی ہیں۔ لیکن جب کچھ زمانہ اور کچھ سال گزر جائیں تو درخت کی جڑیں گہرائی میں چلی جاتی ہیں، پھر تیز آندھیاں بھی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ میرے بچے! میرا اشارہ سمجھ لو۔

اگر تمہارا دل کسی شخص کی طرف سے تنگ ہو تو اسے برداشت کرو اور اس سے اچھا سلوک کرو، وہ بھی تم سے اچھا تعلق رکھے گا۔ تمہیں تمہارے دشمن بھی محبوب بنالیں گے۔

سزا دینے میں جلدی مت کرنا۔ یاد رکھنا، لوگ آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں۔ پس کبھی کسی کی بات پر یقین نہ کرنا جب تک اسے اس کے مخالف کے سامنے نہ لا کھڑا کرو۔ اگر کبھی کوئی ہتھ کٹا شخص تمہارے پاس (ہاتھ کٹنے کی شکایت لے کر) آئے تو ممکن ہے اس کا مخالف اس سے زیادہ مجروح حالت میں ہو۔ جب تم اس بات کو یاد رکھو گے تو تمہارے پاس شکایات اور فریادیں کم رہ جائیں گی۔

میرے بیٹے! میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جب دشمن سلطان (الملک الکامل) شہید کے زمانے میں دمیاط پر حملہ آور ہوا تھا تو وہاں شہر کے والی اور محافظ سپاہیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ مگر ان لوگوں نے قاہرہ سے سلطان کی آمد اور شام سے افواج کے پہنچنے تک شہر کی حفاظت کی۔ اس وقت شہر میں غذا کا ذخیرہ ایک ماہ کا بھی نہ تھا مگر دشمن دمیاط کے ساحل پر بھی قبضہ نہ کر سکا۔ مگر جب امرائے فوج نے سلطان شہید سے اختلاف کیا اور ابن مشطوب اور کُردوں جیسے لوگوں نے الملک الفائز کے ساتھ الگ گروہ بنالیا تو سلطان شہید غضب ناک ہو کر اُشموم کی طرف نکل گئے اور فوج بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔ انہوں نے اپنی خیمہ گاہ اور سامان وہیں چھوڑ دیا۔ دمیاط سے نکلنے والے نکل گئے اور شہر کا والی بھی چلا گیا۔ صرف شہری وہاں رہ گئے جنہوں نے شہر کے دروازے بند کر دیے اور اس کی حفاظت کرنے لگے یہاں تک کہ (فرنگیوں سے جنگ اور قحط کی وجہ سے) ان کی اکثریت مرگئی اور باقی لوگ لاچار ہو گئے۔ شہر کی فصلیں خالی ہو گئیں۔ فرنگی جو شہر کی دیواروں میں نقب لگانے کی کوشش کر کے عاجز آگئے تھے، وہ دیواریں پھلانگ کر شہر میں گھس گئے۔

میں نے تو دمیاط کو اس قدر مضبوط کر دیا تھا کہ وہاں بیس سال کے لیے خوراک کے ذخائر موجود تھے۔ شہریوں کے پاس جو ذخیرے تھے وہ الگ تھے۔ دفترِ خوراک سے معلوم کر لینا کہ وہاں کس قدر ذخائر تھے۔ میں نے اس شہر کو مصر کے تمام گھڑ سواروں اور پیادوں سے مستحکم کر دیا تھا۔ میں نے کوئی عذر نہیں چھوڑا تھا۔ میں خود مرض کی وجہ سے اشموم میں تنہا رہ گیا تھا۔ مگر جب ہمارے سپاہیوں نے دشمن کو دیکھا اور کشتیوں کے ذریعے خشکی کی طرف جانے لگے تو انہیں شکست ہوگئی اور انہوں نے خشکی کا علاقہ فرنگیوں کے سپرد کر دیا۔ وہ خود خواتین کو دمیاط سے نکالنے میں مشغول ہو گئے۔ لوگ بھاگ نکلے اور فوجی بھی ان کے پیچھے چل دیے۔ فخر الدین جوان کے امیر تھے، ان کے پیچھے گئے اور انہیں واپس لائے۔ انہوں نے دمیاط کے ہر دروازے پر ایک امیر مقرر کر دیا۔ مگر جب صبح ہوئی تو دیکھا شہر میں کوئی سپاہی باقی نہیں۔ محافظ دستے رات کو فصیل کی کھڑکی توڑ کر نیچے اتر گئے تھے۔ انہوں نے تمام اموال اور ذخائر وہیں چھوڑ دیے تھے جنہیں شہری آپس میں لوٹنے اور جھپٹنے لگے، پھر انہوں نے دمیاط کو خالی کر دیا اور اگلے دن وہاں فرنگی قابض ہو گئے۔ یہ سب اللہ کی تقدیر میں لکھا تھا۔ تم صبر کرو گے تو اپنا مقصد حاصل کر لو گے۔

اگر تم اس کم بخت دشمن سے عاجز آ جاؤ اور یہ لوگ دمیاط سے نکل کر تمہاری طرف آ جائیں اور تم میں ان سے لڑنے کی طاقت بھی نہ ہو اور تمہیں کمک ملنے میں بھی دیر ہو جائے اور یہ لوگ تم سے (شام کا) ساحل، غزہ اور بیت المقدس مانگ لیں تو تم ذرا بھی تامل کیے بغیر انہیں اس شرط پر دے دینا کہ انہیں مصر میں کوئی ایک قصبہ بھی نہیں دیا جائے گا۔

اگر وہ منصورہ میں تم پر حملہ آور ہوں تو تم لشکر کو سمندر کے ساتھ پسِ پردہ رکھنا۔ دشمن یہاں فقط جنگی کشتیوں کے ذریعے حملہ کر سکے گا۔ تم جہاں تک ممکن ہو، اپنی جنگی کشتیوں کے بیڑے کو مضبوط کرنا۔ اور پوری کوشش کر کے آگ لگانے والی کشتیاں دشمن کے پیچھے سمندر میں اتار دینا جو دشمن کی رسد کا راستہ مسدود کر دیں۔ ان شاء اللہ یہی حربہ دشمن کی ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔ سلطان شہید (الملک الکامل) نے بھی دشمن پر اسی تدبیر سے فتح پائی تھی۔

دو ہزار عرب اور خوارزمی گھڑ سواروں کو دشمن اور دمیاط کے درمیان تعینات کر دینا۔

گھڑ سواروں اور پیادوں سے خوب کام لینا اور ان پر خوب خرچ کرنا۔

اگر اسماعیل اور ناصر (کے تنازعے) کے باعث مشرق (شام) سے تمہیں کمک نہ پہنچے اور دشمن تم سے اپنے شہروں کی واپسی کا مطالبہ کریں اور تمہیں شکست سامنے نظر آ رہی ہو اور یقین ہو کہ (معاہدہ نہ کیا تو) مملکت ہاتھ سے چلی جائے گی تو یہی ناگزیر ہوگا کیوں کہ اضطراری حالات کے احکام الگ ہوتے ہیں۔ [1]

یاد رکھنا! مصر تمام مملکت کا مرکز ہے۔ اس کے ذریعے تم تمام بادشاہوں پر غلبہ پا سکتے ہو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں رہا تو سمجھو سارا مشرق تمہارے پاس ہے۔

تم اور بھائی فخر الدین متفق ہو کر ناصر کا دل خوش کر کے اسے راضی کرو۔ ناصر کو میری ناراضی ہی نے مجھ سے دور کیا تھا۔ دراصل اس کی طرف سے مجھے کچھ مراسلے ملے تھے جن کے مطابق اس نے کچھ اچھے کام کیے تھے۔ میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس پر اس کی مجھ سے وابستہ امیدیں ختم ہو گئیں اور وہ اسماعیل اور مودود سے جا ملا۔ پھر انہوں نے مل کر جو کیا سو کیا۔ یہ سب اسماعیل اور مودود کی وجہ سے تھا جبکہ ناصر ان چیزوں میں ان کا شریک تھا۔

اور ہاں ناصر نے نابلس میں میرے خلاف جو کیا، اس میں (اللہ کی طرف سے) ایک بہت بڑی مصلحت تھی۔ میں اس پر اس کا شکر گزار ہوں۔ وہ میرے خلاف کرک میں آ دھمکا۔ اگر وہ نہ آتا تو اسماعیل اس پر قابض ہو جاتا

---

[1] اسماعیل سے مراد حاکمِ دمشق الملک الصالح اسماعیل ہے جو الملک الصالح ایوب کا چچا تھا۔ وہ ایک خود غرض اور مفاد پرست حاکم تھا۔ الملک الکامل کی وفات کے بعد اس نے تاج و تخت کو اپنا حق سمجھتے ہوئے الصالح ایوب کو بادشاہ بننے سے روکنے کی پوری کوشش کی اور اس سے دمشق چھیننے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ الصالح اسماعیل فرنگیوں کا حامی تھا اور اس کی زیادتیوں سے نالاں ہو کر شیخ عزالدین عبدالسلام شام سے مصر نقل مکانی پر مجبور ہوئے تھے۔
ناصر سے مراد داؤد بن الملک المعظم عیسیٰ (حاکم کرک) تھا جو ایک عالم فاضل شخص تھا۔ الصالح ایوب جب اقتدار حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا تو ناصر داؤد نے اسے نابلس سے اپنی تحویل میں لے کر کرک کے قلعے میں نظر بند کر دیا تھا اور بعد میں اس معاہدے کے تحت رہا کر دیا تھا کہ شام اس کا اور مصر الصالح ایوب کا ہوگا۔

جس نے میرے تعاقب میں مجھ پر شام کی زمین تنگ کر دی تھی۔ پس ناصر نے میرے بارے میں جو کچھ کیا، اسی میں خیر ہوئی۔ یہی تو اللہ کی طرف سے طے کردہ وقت کے مطابق مصر میں میری آمد اور یہاں حکومت قائم کرنے کا سبب بنا۔ پس میں ناصر کے بارے میں اچھی نیت رکھتا ہوں۔ اگر تم دونوں میں اتفاق ہو جائے اور اس کی نیت تمہاری محبت میں صاف ہو جائے اور وہ تم سے عہد پورا کرے تو تمہارا ذہن ساحلِ شام کی حفاظت سے راحت پا جائے گا۔

ناصر کے گناہ ایسے نہ تھے جیسے اسماعیل کے گناہ جس نے مجھ سے جھگڑا کیا، مجھ سے دمشق چھینا، میرے بیٹے کو قید کیا، اور میرے خلاف جو کچھ کیا سو کیا۔ اس نے شام کے قلعے دین کے دشمنوں کو دے دیے اور میرے خلاف کفر سے مدد مانگی۔ اس طرح اس نے مجھ سے میرے شہر چھینے۔ پس تم ناصر کو اس طرح راضی کرو کہ اس سے مدد لے سکو یعنی اسے بُصریٰ اور اس کا نواحی زرعی علاقہ دے دو۔ مگر اسے بعلبک کا قلعہ مت دینا۔ اس کی اولاد اور متعلقین سے بھی اچھا سلوک کرنا۔ بُرے کی بُرائی کا بدلہ اور اچھے کی اچھائی کا صلہ اللہ ہی دے گا۔

تمام قیدیوں کو رہا کر دینا، سوائے ان کے جن کا تمہارے چچا کو گرفتار کرانے میں ہاتھ ہو یا جو ملک میں فساد کرنے میں ملوث رہے ہوں۔

اگر اللہ تمہیں اس دشمن پر غلبہ عطا کرے اور تم اس سے دمیاط چھین لو، اور اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا، تو تم ایک بیرونی فصیل بھی بنانا جس کی بلندی قدِ آدم ہو۔ [1] اس کے اوپر اور نیچے نشانہ بازی کے لیے سوراخ ہوں۔ فصیل کی چوڑائی اتنی ہو کہ اس پر چڑھ کر پتھروں یا آتش گیر مادے کے ذریعے لڑائی کی جا سکے۔ اس (پر چڑھنے کے لیے اندرونی جانب) زینے بھی ہوں۔ ہر دو زینوں کے درمیان تیس تیس قدم کا فاصلہ ہو۔ اس فصیل کو برجِ سلسلہ کے سامنے سے شروع کر کے سمندری ڈیلٹا میں اس مقام تک لے جانا جہاں فرنگی اترے تھے۔ یہاں تین گز دار تیر کمانیں نصب کرنا۔ پھر اس بیرونی فصیل کے سامنے ایک خندق کھدوانا جو سمندر کے پانی سے میٹھے پانی (دریائے نیل کے سرے) تک طویل ہو۔ جیسا کہ سلطان (الملک الکامل) شہید نے اس وقت کھدوائی تھی جب دشمن حملہ آور ہوا تھا۔ اسے اس طرح کھدوانا کہ جب دشمن آئے تو اسے میٹھے پانی تک رسائی نہ ہو سکے اور پڑاؤ کے لیے کوئی جگہ نہ مل سکے۔ بیرونی فصیل کے ہر دو زینوں کے درمیان دو سنگ زن ہونے چاہئیں جو دشمن پر پتھراؤ کریں۔ سپاہی ان دشمنوں سے لڑیں گے جو بیرونی فصیل پر چڑھیں گے جبکہ منجنیق اور دور مار ہتھیاروں سے انہیں مارا جائے گا جو فصیل کے پیچھے (اس سے دور) ہوں گے۔ اس فصیل میں ہزارہا مصلحتیں ہیں۔ اس کی تعمیر کے کام کو اپنے

---

[1] یہاں عربی عبارت یہ ہے: "بباشورة تكون طول قامة" جس کا ترجمہ قدِ آدم کیا گیا ہے، مگر غالباً یہاں سہوِ کتابت ہوا ہے۔ فصیل کی بلندی قدِ آدم یعنی چھ فٹ ہونا کسی طرح قرینِ قیاس نہیں۔ عام گھروں کی چہار دیواری بھی سات آٹھ فٹ بلند ہوتی ہے۔ اسی مکتوب میں فصیل کے لیے زینوں کا ذکر بھی ہے جو ثابت کرتا ہے کہ سلطان کو اونچی دیوار مطلوب تھی ورنہ قدِ آدم دیوار کے لیے زینوں کی کیا ضرورت تھی؟ واللہ اعلم بالصواب

امراء اور بیت المال پر تقسیم کر دو۔ فرنگی قیدیوں سے اس کی تعمیر کرانا اور اس میں پوری کوشش کرنا۔ تم دمیاط کے بارے میں مامون ہو جاؤ گے۔

اگر دشمن دمیاط سے نہ نکلے اور اپنے لیے کمک کا انتظار کرتا ہے تو تم خشکی اور دریائی ڈیلٹا کی طرف سے گھڑ سواروں اور پیادوں کے ذریعے دشمن پر حملہ کر دینا اور سمندر کی طرف سے جنگی کشتیوں کے ساتھ دھاوا بول دینا۔ امید ہے کہ تم اس طرح ڈیلٹا پر قابض ہو جاؤ گے۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو تم سمندر کے دھانے پر قابو پا لو گے اور فرنگیوں کو (کمک یا رسد کی) کوئی کشتی نہ دمیاط پہنچ سکے گی نہ وہاں سے نکل پائے گی۔

بیٹا! میں نے مسلمانوں کے امور تمہارے سپرد کر دیے ہیں۔ انہیں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق کر گزرنا۔ مے نوشی سے بچتے رہنا۔ بادشاہوں پر تمام آفتیں اسی کے باعث آتی ہیں۔ میری بات کی خلاف ورزی نہ کرنا ورنہ تمہیں پچھتانا پڑے گا اور تمہیں امراض گھیر لیں گے۔ تمہیں شراب وہی پلا سکے گا جس پر تمہیں اعتماد ہوگا اور تمہیں بیماریوں میں وہی مبتلا کرے گا جو تمہارا مقرب ہوگا۔

مسلمانوں اور نصرانیوں کو شراب سازی سے باز رکھنا۔ افواج اور شہروں کو بیماریوں سے پاک رکھنا۔ مے نوشی کرنے والے کی ہم نشینی بھی مت اختیار کرنا ورنہ شیطان تمہیں یہ کام اچھا محسوس کرائے گا اور تم بیمار پڑ جاؤ گے۔

میں نے معاملات کا تجربہ کیا ہے، اچھے برے کی تحقیق کی ہے۔ میں تو اس وقت پچھتایا جب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پس میرے بیٹے! ان چیزوں سے بچتے رہنا جن سے میں منع کر چکا ہوں۔ یہ ایک تجربہ کار، سچے اور مشفق شخص کی نصیحت ہے۔

لشکر کے دفاتر پر توجہ دو۔ ان لوگوں نے جو کہ نصرانی ہیں، شہروں کو برباد اور لشکر کو کمزور کر دیا ہے۔ گویا کہ شہر ان کی ملک ہیں جب چاہیں بیچ دیں۔ جب کسی امیر کو (مراعات کا) کوئی پروانہ لکھ کر دیا جاتا ہے تو یہ (دفاتر کے نصرانی ملازمین کاغذات پر محکمانہ کارروائی کرنے سے پہلے) دو سو دینار یا زیادہ رشوت لیتے ہیں۔ جب کسی فوجی کو کچھ ملے تو اس سے سو یا کچھ کم لیتے ہیں۔ اگر سپاہی کا وظیفہ ہزار دینار ہوتا ہے تو یہ اسے پانچ چھ جگہ منتشر کر دیتے ہیں، کچھ قوص میں، کچھ مشرقی حصے میں، کچھ مغربی حصے میں۔ سپاہی تک وظیفہ پہنچنے کے چار واسطے بن جاتے ہیں۔ پہلے وظیفہ ان واسطوں سے گزرتا ہے تو پھر کیا سپاہی کے لیے کچھ باقی بچ جاتا ہے؟

مثلاً کوئی شخص عام سپاہیوں میں ہو تو وہ سخت مشقتیں جھیل کر فقط تین ملاوٹ شدہ درہم پاتا ہے۔ تو اس کا کیا حال ہوگا؟ اس کے گھر والے ہلاک ہو جائیں گے۔ کسی سپاہی کو تو کچھ مل جاتا ہے اور کسی کو یہ بھی نہیں ملتا۔ سپاہ کی تباہی کا سبب یہی ہے۔ نصرانی بھی ایسا کر کے یہی چاہتے ہیں کہ شہر اجڑ جائیں اور فوج کمزور ہو جائے تاکہ شہر ہمارے ہاتھ سے جاتے رہیں۔

نظام کو سلطان صلاح الدین رحمہ اللہ کے طرز پر لوٹانا چاہیے جس میں سپاہی کا وظیفہ منتشر نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے ایک

دو فریبی دفاتر سے سب کچھ مل جاتا تھا۔ پس شہر آباد تھے، فوج اور کسان مضبوط تھے۔

جب لوگ ایک شہر میں آباد ہوں اور ہر ایک اس شہر کو ایک ایک کونے سے تباہ کر رہا ہو، افسران کسانوں پر ظلم کر رہے ہوں تو شہر تباہ ہی ہوں گے۔ یہ سب نصرانیوں کے کارنامے ہیں۔

مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ انہی (مقامی نصرانی) لوگوں نے (بحیرۂ روم کے) جزائر کے فرنگی بادشاہوں کو خط لکھ کر کہا تھا کہ مسلمانوں سے جہاد تم نے نہیں کیا بلکہ ہم ہیں جو ان کے خلاف دن رات جہاد کرتے ہیں وہ اس طرح کہ ہم ان کے اموال حاصل کر لیتے ہیں، ان کی عورتوں کو استعمال کرتے ہیں، ان کے شہروں کو ویران اور افواج کو کمزور کرتے ہیں، اب تم آ کر یہ شہر فتح کر لو، ہم نے تمہارے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں چھوڑی۔ پس (اے فرزند!) تمہارا دشمن تو تمہارے ساتھ تمہارے ملک میں ہے یعنی یہی نصرانی۔ ان میں سے کسی نومسلم پر وثوق مت کرنا۔ یہ کسی وجہ سے مسلمان ہوتے ہیں جبکہ ان کا دین ان کے اندر یوں پوشیدہ ہوتا ہے جیسے آگ ایندھن میں۔

بیٹا! آج کل اکثر سپاہی عوام، تاجر اور فسادی قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں سے جو بھی قباء پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر ان ترکوں میں سے کسی امیر کے پاس آجائے اور اسے کوئی گھوڑا ہدیہ کر دے، وہ سپاہی بن جاتا ہے۔ وہ اپنے افسر کے سامنے کسی بہادر اور جنگ آزما سپاہی کے وظیفے کی مخالفت کر دے تو وہ افسر اس بہادر سپاہی کا وظیفہ اسی عام اور بے کار سپاہی کو بخش دیتا ہے۔ اکثر سپاہیوں کی یہی حالت ہے۔ جب ضرورت کے وقت وہ دشمن کو دیکھتے ہیں تو بھاگ نکلتے ہیں اور یوں اپنے لشکر کی صف بندی توڑ دیتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ جنگ آزما نہیں، یہ ان کا کام ہی نہیں۔ پس لازم ہے کہ فوج میں فقط اس کو بھرتی کیا جائے جو گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ بازی کر سکتا ہو، چوگان اور تیر اندازی جانتا ہو اور اس کی سپاہیانہ صلاحیت ظاہر ہو۔

بیٹا! جو کچھ میں نے کہا ہے اسے یاد رکھنا۔ (فوج کی اندرونی حالت کے متعلق) یہ ساری باتیں مجھے بھائی فخر الدین کے سوا کسی نے نہیں بتائیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ انہیں سلطان صلاح الدین کے اپنے ہاتھ کا ایک مکتوب پڑھنے کو ملا جس میں تحریر تھا کہ فیوم اور سمنود (مصر کے دو اضلاع) اور ساحلوں کی ساری آمدن بحری بیڑے کے لیے وقف ہے۔ پس بحری بیڑہ اسلام کے دو بازوؤں میں سے ایک ہے۔

ضروری ہے کہ بحری فوج سیر شکم ہو۔ اگر تم بحری سپاہیوں کے لیے ماہانہ مشاہرہ بیس درہم طے کر دو تو جنگ اور نشانہ بازی کے ماہر دور دراز سے تمہارے پاس چلے آئیں گے۔

ضرورت کے وقت (ہنگامی حالت میں) تو تمہیں وہی لوگ ملیں گے جنہیں تم جبراً بھرتی کرو گے، ان کی صلاحیت کا علم نہیں ہوگا، وہ بال بچوں والے ہوں گے اور (محنت مزدوری کر کے) انہیں کھلاتے پلاتے ہوں گے۔ تم انہیں بحری فوج میں لے جاؤ گے جبکہ وہ بے کار ثابت ہوں گے۔ ان کے بچے بھوکے مر جائیں گے، وہ ہمارے خلاف بددعائیں کریں گے۔ تو ایسی حالت میں تم دشمن پر کیسے فتح پا سکتے ہو؟

جب تمہارا کوئی بحری بیڑہ دشمن کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو تم یہ نقصان پورا کرنے کے لیے (عوام سے) ہزار ہزار دینار وصول کرتے ہو۔ روزانہ صبح سے شام تک کتنے ہی شرفاء، تاجر اور ہنر مند لوگ دھر لیے جاتے ہیں۔ ان کے گھر والے (انہیں چھڑانے) حاکم کے پاس آتے ہیں۔ ہر ایک سونا تول کر دیتا ہے اور اپنی جان چھڑا لیتا ہے۔ جبکہ وہ شخص جو بالکل فقیر اور بے بس ہوتا ہے، اسے تم بحری فوج میں دھکیل دیتے ہو۔ میں فرزند کو ان حالات سے متنبہ کر رہا ہوں۔ بھائی فخر الدین نے مجھے یہ سارے حالات بتائے ہیں۔ وہ تمہیں جو کچھ کہیں، اسے غور سے سننا۔

فرزند کو درج ذیل خدام کے بارے میں وصیت کی جاتی ہے:

محسن اور رشید جو کہ صفِ اوّل کے دو خادم ہیں، ان کا تبادلہ مت کرنا۔ میں نے خادموں اور ممالیک میں سے جسے بھی ترقی دی ہے، وہ اس کی وفاداری اچھی طرح آزمانے کے بعد دی ہے۔ استاذ دار اور امیر جاندار کے بارے میں بھی وصیت ہے کہ ان کا تبادلہ نہ کرنا۔ میں اپنے تمام کاموں میں ان پر اعتماد کرتا ہوں۔

کُردی امراء کی ایک دوسرے کے بارے میں شکایات پر کان مت دھرنا۔

ناصر الدین کے پاس گندی اور جھوٹی باتیں ہیں، اس کا باطن بھی کچھ اچھا نہیں۔ میں نے بھائی فخر الدین کو ان سفیروں کے بارے میں بتادیا ہے جو دمشق سے حلب جاتے ہوئے اس کے پاس یرغمال بنالیے گئے ہیں۔ حُسام تنہائی کا عادی ہے، اس کا کسی سے کچھ ربط وضبط نہیں۔

اگر لشکر کو کسی سمت بھیجنا ہو تو ضیاء الدین قیمُری کو افسر بنایا جائے۔ ناصر الدین کبھی لشکر لے کر نہیں گیا۔

سیف الدین قیمُری کے ساتھ وہ معاملہ کرنا جو بھائی فخر الدین طے کردیں۔ اسے دمشق میں فوج کا افسرِ اعلیٰ بنانا۔ ابن یغمور تفتیشی افسر رہے گا اور ناصر الدین عوامی شکایات سننے پر مقرر ہوگا۔ ابن یغمور تفتیشی کاموں اور مالیات کی وصولی کا اہل ہے مگر لشکر کا امیر بننے کے قابل نہیں۔ اس پر پورا بھروسہ مت کرنا۔ اسے کچھ مدت ایک کام پر لگانا، پھر وہ ذمہ داری کسی اور کو دے دینا۔ ابن یغمور دفتری کاموں کے زیادہ لائق ہے۔

فخر الدین عثمان کے قرابت داروں میں سے کوئی بھی فوجی خدمات کے قابل نہیں۔

ابن العزیز کے بارے میں رائے یہ ہے کہ اس کی جماعت کا مؤاخذہ کیا جائے۔ اسے اس کے غلاموں کے ساتھ تنہا کردیا جائے۔ اسے، اس کے غلاموں اور گھر کے ملازموں کا وظیفہ مقرر کردیا جائے جو ان کے خصوصی لوگوں کو کافی ہو جائے۔ بھائی فخر الدین بخوبی جانتے ہیں کہ دمیاط کے محاذ پر اور اس کے علاوہ اس نے کیا گل کھلائے ہیں۔ وہ کسی ذمہ داری کے قابل نہیں۔

محکمہ اوقاف کے متولی کو معزول کردو، اس کی جگہ ابن نحوی کا تقرر کرنا، وہاں آنے جانے والوں نے مجھ سے اس کی سفارش کی ہے۔ ابن جباب اور اس کے وکیل کے کرتوت اچھے نہیں۔ اسے معزول کردینا۔ اس کی جگہ نصر ابن فقیہ کا تقرر کرنا۔ وہ اچھا آدمی ہے، فقیہ ہے، اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

میں نے بھائی فخر الدین کو بیس ممالیک کی ایک فہرست دی ہے۔ انہیں ترقی دینا۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک پرچم اور ایک طبل دینا۔ ان سے حسنِ سلوک کرنا۔

میں تمہیں ممالیک سے اچھے برتاؤ کی انتہائی تاکید کرتا ہوں۔ میں انہی پر اعتماد کرتا آیا ہوں۔ وہ میری کمر اور بازو ہیں۔ ان کے دلوں کو خوش رکھنا۔ ان سے اچھے وعدے کرنا۔ میری وصیت کے خلاف مت جانا۔ اگر ممالیک نہ ہوتے تو مجھ میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ میں گھوڑے پر سوار ہوتا اور دمشق یا کسی اور جگہ تک پہنچ سکتا۔

یہ میری وصیت ہے۔ روزانہ اس کا مطالعہ کرنا۔ بھائی فخر الدین سے مشورہ کیے بغیر کچھ مت کرنا۔ اللہ خیر کا معاملہ فرمائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اگر اہلِ حلب تم سے مطالبہ کریں کہ کرک ناصر کو دے دیا جائے تو اسے شوبک دے دینا۔ اگر وہ اس پر خوش نہ ہو تو ساحل کا کچھ اور علاقہ بھی دے دینا مگر کرک کو اپنے ہاتھ سے مت جانے دینا۔

اللہ کے لیے، اللہ کے لیئے میری وصیت یاد رکھنا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ بدبخت دشمن (فرنگی) ہوسکتا ہے کہ مصر (قاہرہ) کی طرف بڑھے تو اس وقت کرک ہی تمہارا مورچہ ہوگا جس میں تم اپنے اہل وعیال کو محفوظ رکھ سکتے ہو۔ مصر میں ایسا کوئی قلعہ نہیں ہے۔ کرک میں تمہارے پاس ساری فوج جمع ہوسکتی ہے اور تم یلغار کر کے دشمن کو مصر سے پسپا کر سکتے ہو۔ اگر تمہارے پاس کرک جیسا مورچہ نہ ہوا تو تمہاری فوج بکھر جائے گی۔

میں نے طے کر لیا ہے کہ اپنے اموال، اہل وعیال اور ہر شے جسے محفوظ رکھنا ہے، وہاں منتقل کر دوں۔ اگر یہ قلعہ میرے پاس نہ ہوتا تو نہ میرا دل مضبوط رہ سکتا تھا نہ پشت۔ سب حمد اللہ واحد ہی کے لیے ہے۔ درود وسلام ہوں ہمارے نبی ﷺ اور ان کی آل اور اصحاب پر۔"[1]

کیا توران شاہ کو جانشین مقرر کیا گیا تھا؟

یہ وصیت یہی ظاہر کرتی ہے کہ الملک الصالح نے توران شاہ کو اپنا جانشین طے کر دیا تھا مگر بعض مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ مرحوم بادشاہ نے توران شاہ کی غیر مستقل مزاج طبیعت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بعد میں وصیت میں یہ لکھوا دیا تھا:

"میرے مرنے کے بعد مصر کے تاج وتخت کا فیصلہ خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ جو چاہے فیصلہ کریں۔"[2]

غالباً یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ اگر توران شاہ نااہل نکلے تو الزام باپ پر نہ آئے۔ صدیوں بعد یہ پہلی مثال تھی کہ کسی بادشاہ نے جانشینی کا فیصلہ خلیفہ کے ہاتھ میں دے دیا ہو۔ مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ اہلِ مصر کے پاس

---

① نهاية الارب للنويري: ۲۹/ ۳۴۱ تا ۳۵۲، ط دار الكتب قاهرة،
علامہ نویری نے اس مکتوب کو نقل کرنے سے پہلے وضاحت کی ہے کہ انہوں نے مکتوب کے اصل نسخے کو خود دیکھا تھا جو سلطان مرحوم کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا

② السلوک لمعرفة دول الملوک للمقريزي: ۱/ ۳۴۳، ط العلمية

توران شاہ کا کوئی متبادل نہیں تھا اور حالتِ جنگ میں وہ خلیفہ مستعصم باللہ کے فیصلے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے تھے۔

دمیاط میں فرنگیوں کی حالت:

اُدھر دمیاط میں فرنگی آرام اور انتظار کے دن گزار رہے تھے۔ وہ اس لیے رکے ہوئے تھے تاکہ برسات کا موسم گزر جائے اور انہیں نیل کی طغیانی کے اس تلخ تجربے سے نہ گزرنا پڑے جس نے پانچویں صلیبی جنگ میں انہیں بالکل بے بس کر دیا تھا۔ فراغت کے ان دنوں میں لشکرِ صلیب کے مرد وزن فحاشی و بے حیائی سے بدمست تھے۔ مغربی وقائع نگار ژانول اعتراف کرتا ہے کہ لوگ بدکاری اور عیاشی میں اس قدر منہمک تھے کہ حد نہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''میری رہائش گاہ سے جس طرف بھی کوئی پتھر پھینکا جاتا، وہ ضرور کسی قحبہ خانے پر جا کر گرتا۔''[1]

الغرض صلیبی اپنی عیش پرستی کے باعث اُس سیاسی بحران سے فائدہ نہ اٹھا سکے جو دولتِ ایوبیہ کو درپیش تھا۔

شجرۃ الدر کی قیادت:

الملک الصالح ایوب کی وفات زنان خانے میں ہوئی تھی۔ ملک کو سنبھالنے والا اب کوئی نہ تھا۔ فرنگیوں کا لاؤ لشکر سر پر کھڑا تھا۔ نئے حکمران کا فیصلہ کرنے کے لیے خلیفۂ بغداد تک اطلاع پہنچنے اور جواب وصول کرنے میں نہ معلوم کتنا وقت لگتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خلیفہ کا فیصلہ امرائے سلطنت قبول نہ کرتے۔

اس نازک وقت میں ملک وقوم کی نگہبانی کے لیے نہایت اہم فیصلے ملکہ شجرۃ الدر کے سر پر آپڑے تھے۔ یہ ایک کنیز تھی جو مرحوم سلطان کی منظورِ نظر ہو کر آخر اس کی زوجہ بنی۔ سلطان کی اس قدر چہیتی تھی کہ سفر وحضر میں ساتھ ساتھ رہتی۔ اس کے ہوتے ہوئے سلطان نے عمر بھر دوسری شادی نہیں کی جبکہ اس دور میں تعددِ ازدواج عام سی بات تھی۔

شجرۃ الدر رموزِ سیاست کی ماہر تھی۔ وہ بازاروں میں اڑنے والی افواہوں کی بھی خبر رکھتی اور ہر سازش کی ٹوہ لیتی رہتی تھی۔ ملکی حالات اور وقت کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ یہ تجربات اب اس کے کام آرہے تھے۔

اس نے ایک ذمہ دار سیاست دان ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ اپنی باندیوں، غلاموں اور مخبروں کے ذریعے فرنگیوں کی ہر آن خبر رکھتی رہی۔ اس نے سلطان کی موت کو بالکل خفیہ رکھا تاکہ رعایا مایوس، سپاہی کم حوصلہ اور فرنگی دلیر نہ ہو جائیں۔ ساتھ ہی اس نے معاملات خلیفہ کے حوالے کرنے کی جگہ اپنے سوتیلے بیٹے توران شاہ کو بادشاہ مقرر کرنا عینِ مصلحت سمجھا مگر توران شاہ مصر سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر دور ایشیائے کوچک کے قلعے حصنِ کیفا میں تھا۔

شجرۃ الدر نے اس مسئلے کو بھی حل کر لیا۔ اس نے سپہ سالار فخر الدین شیخ اور ایک معتمد امیر جمال الدین محسن کو بلا کر سلطان کی موت سے آگاہ کیا اور انہیں تاکید کی کہ اس حادثے کی بھنک کسی کو نہ پڑنے پائے۔ اس نے سلطنت کے امور اور دفاع کی ذمہ داری انہی دونوں کے سپرد کر دی تاہم خود بھی سلطان کی جانب سے وقتاً فوقتاً احکامات جاری کرتی رہی تاکہ کسی کو سلطان کی موت کا شک تک نہ ہونے پائے۔ حرم کا ایک خادم سہیل ہو بہو سلطان کی طرح لکھنا جانتا تھا۔

---

[1] The Crusades by Harold Lamb:p:293

شجرۃ الدراس سے احکام لکھوا کر شاہی مہر ثبت کرتی اور امراء کو بھیج دیتی۔ یہی فرامین امیرِ قاہرہ حسام الدین کو پہنچتے تھے۔ اسے بھی شک نہ ہوا کہ سلطان فوت ہو چکا ہے۔ شجرۃ الدر کو جنگ کے لیے خطیر رقم کا انتظام کرنا تھا۔ وہ خفیہ طور پر شاہی خزانے اور محل کے ہیرے جواہرات فروخت کر کے جنگی مصارف پورے کرنے لگی۔

شجرۃ الدُّر نے تمام امور اسی طرح معمول کے مطابق چلائے جیسے سلطان کی زندگی میں تھے۔ حسبِ معمول دربارِ سلطانی آراستہ ہوتا۔ امرائے مملکت حاضری دیتے، دستر خوان لگتا۔ سلطان کے بارے میں یہی خبر دی جاتی کہ وہ بیمار ہیں، کسی سے مل نہیں سکتے۔ ۲۲ شعبان ۶۴۷ھ (۲۹ نومبر ۱۲۴۹ء) کو شجرۃ الدر نے سلطان کی جانب سے فرمان بھیج کر توران شاہ کے لیے ولی عہدی کی بیعت بھی لے لی۔ اس سے پہلے وہ ممالیکِ بحریہ کے سالار فارس اقطائی کو حصنِ کیفا بھیج چکی تھی تا کہ توران شاہ کو پایۂ تخت بلا لیا جائے۔ ادھر سلطان کے کسی ذہین مصاحب نے سلطان کے خط اور مہرِ شاہی میں معمولی سا فرق محسوس کر کے سمجھ لیا کہ سلطان اب دنیا میں نہیں۔ یہ بات تیزی سے لوگوں میں پھیل گئی مگر کوئی اسے سر عام زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اُدھر فرنگی جاسوسوں نے بھی یہ بات اچک لی۔ شاہِ فرانس لوئیس کو جونہی سلطان کی موت کی خبر پہنچی وہ المنصورہ پر حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس وقت اگرچہ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی مگر بارش کا خطرہ نہیں تھا۔ ۲۵ شعبان (۲ دسمبر ۱۲۴۹ء) کو صلیبی لشکر دریائے نیل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی ان کے بحری جہاز بھی دریا میں چلے آ رہے تھے جبکہ مسلمان اپنے بادشاہ کی وفات پر ماتم کناں تھے۔

شجرۃ الدر نے اطلاع پاتے ہی جہاد کی ترغیب پر مشتمل ایک طویل مراسلہ لکھوا کر قاہرہ اور دیگر شہروں کی مساجد میں بھیج دیا تا کہ اسے منبروں پر پڑھ کر سنایا جائے۔ مراسلے کا آغاز اس آیت کریمہ سے ہو رہا تھا:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝

”نکلو اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو خواہ بوجھل ہو اور جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔“[1]

یہ مراسلہ اتنا دردانگیز تھا کہ جب جامع قاہرہ کے منبر پر سنایا گیا تو لوگ زار و قطار رونے لگے اور ہر طرف سے آہ و فغاں کی آوازیں بلند ہونے لگی۔ ہزاروں افراد سر پر کفن باندھ کر قاہرہ سے محاذِ جنگ کی طرف نکل پڑے۔

یکم رمضان ۶۴۷ھ (۷ دسمبر ۱۲۴۹ء) کو فرنگی افواج یلغار کرتی ہوئیں المنصورہ اور دمیاط کے مابین نیل کی وادی میں آگئیں۔ یہاں کانٹے کا مقابلہ ہوا جس میں فریقین نے شجاعت و بہادری کی حد کر دی۔ بیسیوں مسلمان شہید ہوئے جن میں ایک رئیس امیر العلامی بھی تھا۔ بہت سے صلیبی امراء اور سپاہی بھی مارے گئے۔

۷ رمضان (۱۳ دسمبر) کو فرنگی مزید پیش قدمی کر کے معسکرِ اسلامی کے قریب پہنچ گئیں۔ فریقین میں جھڑپیں جاری رہیں مگر فرنگی المنصورہ کی طرف بڑھتے رہے جو دریائے نیل کے ایک موڑ پر اس طرح واقع تھا کہ اس کے شمالی اور مغربی

[1] سورۃ التوبہ، آیت نمبر: ۴۱

حصے دریا کے ساحل کے ساتھ تھے اور مشرقی حصے کو اشموں ندی محفوظ بنا رہی تھی۔ ۱۳ رمضان (۱۹ دسمبر) کو فرنگیوں کی بری فوج اسی ندی کے کنارے پہنچ گئی جبکہ ان کی بحری فوج شہر کو شمالی اور مغربی سمت سے گھیرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ①

اسلامی لشکر کا بڑا حصہ مشرقی سمت میں مورچہ بند ہو گیا۔ لشکرِ صلیب نے بھی اسی طرف خیمے لگائے اور خندقیں کھود کر ایک طویل محاصرے کی تیاری کر لی۔ دریائے نیل میں صلیبی بحری بیڑا شہر پر حملے کرنے لگا تاہم اسلامی بحریہ دفاع کے لیے تیار تھی۔ ② صلیبی منجنیقوں نے شہر پر سنگ باری شروع کی، مسلمانوں نے جواب میں آتشیں پچکاری استعمال کر کے انہیں جلا دیا۔ فرنگی آتشیں ہتھیاروں سے واقف نہ تھے۔ وہ آگ کی پچکاری سے خوفزدہ رہتے اور اسے ''گریگ فائر'' (یونانی آگ) کا نام دیتے۔ صلیبی وقائع نگار ژانول لکھتا ہے:

''یہ آگ بجلی کی طرح کڑکتی تھی اور ایک پردار اژدھے کی مانند تھی۔ رات کو اس کی روشنی اتنی تیز ہوتی تھی کہ ہم اپنے پڑاؤ میں بیٹھے سب کچھ صاف دیکھا کرتے تھے۔'' ③

چونکہ منجنیق کے بغیر فتح مشکل تھی اس لیے شاہِ فرانس نے اپنے کچھ جہازوں کو تڑوا کر ان کی لکڑی سے دوبارہ منجنیق سازی شروع کرائی۔ مگر نئی منجنیقوں کو بھی مسلم آتش زنوں نے خاکستر کر دیا۔ ④

تیسری صلیبی جنگ کی طرح اس جنگ میں شب خون اور چھاپہ مار کارروائیوں کا اہم کردار تھا۔ مسلمان عددی لحاظ سے کم تھے، اس لیے وہ کھلے میدان کی لڑائی سے پہلے دشمن کو چھوٹے چھوٹے زخم لگا کر کمزور اور پست ہمت کر دینا چاہتے تھے۔ مجاہدین روزانہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں نکلتے اور چھپ چھپا کر دشمنوں کو تیروں کا نشانہ بناتے۔ جو فرنگی ہاتھ لگتا، اسے پکڑ لاتے۔ اوسطاً روزانہ بیس تیس فرنگی ہلاک اور زخمی ہوتے اور دس پندرہ قیدی بنا لیے جاتے۔ ان کارروائیوں میں مجاہدین اپنی ذہانت سے کام لے کر عجیب و غریب حربے اپناتے۔

علامہ مقریزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ایک شخص نے تربوز کاٹ کر اپنا سر اس میں گھسا لیا اور پانی میں غوطہ لگا کر فرنگیوں کے قریب چلا گیا تاکہ وہ اسے تربوز سمجھیں۔ فوراً ایک فرنگی پانی میں اتر گیا تاکہ اسے لے لے۔ جیسے ہی وہ پاس پہنچا مسلمان نے اسے دبوچ لیا اور کھینچ کر اپنے معسکر میں لے آیا۔'' ⑤

رمضان سے ذوالقعدہ تک ایسی کارروائیاں جاری رہیں۔ اس دوران اسلامی بحریہ فرنگیوں کے ایک بحری جہاز پر قبضہ کر کے ایک نواب سمیت دو سو دشمنوں کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئی۔ جبکہ ایک بار گھڑ سواروں نے ندی عبور کر کے دشمن پر جارحانہ حملہ کیا اور چالیس افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۱/۴۴۴ تا ۴۴۵، ۴۴۹ ② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/۴۴۷

③ The Crusades by Harold Lamb: p:29

④ The Crusades by Harold Lamb: p:29

⑤ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/۴۴۷، ط العلمیۃ

۵ ذوالقعدہ ۶۴۷ھ (۹ فروری ۱۲۵۰ء) مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش لایا۔ کسی غدار نے دشمن کو ندی کے کم گہرے حصے کا پتا بتادیا تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی صلیبی تیار ہوگئے۔ ① راستہ صاف کرنے کے لیے شاہِ فرانس کا بھائی ڈیڑھ ہزار چنیدہ شہ سواروں کو لے کر منہ اندھیرے نکلا اور ندی عبور کر کے فجر سے پہلے مسلمانوں کی خیمہ گاہ تک پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے بہت سے سپاہی ندی پر پل بچھانے میں مصروف ہوگئے تاکہ باقی فوج بھی پار اتر جائے۔

مسلمان اس حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ نائبِ سلطنت فخر الدین شیخ حملے کی منادی سنتے ہی بے تابی کے عالم میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ وہ باقی فوج کو تیاری کا حکم دیتے ہوئے چند غلاموں سمیت باہر آیا اور لڑتے لڑتے شہید ہوگیا۔ اس کی شہادت سے مسلمانوں کی ہمت جواب دے گئی اور وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کی اکثریت قاہرہ کی طرف نکل گئی۔ فرنگی خیمہ گاہ میں گھستے چلے گئے، یہاں ان کا حملہ سست پڑ گیا کیوں کہ ایک تو مسلم تیر اندازوں نے جوابی کارروائی شروع کردی تھی، دوسرے حملہ آوروں کے گھوڑے خیموں کی طنابوں میں الجھنے لگے تھے۔

صلیبیوں کے کچھ دستے قاہرہ کی طرف فرار ہونے والے مسلمانوں کے تعاقب میں نکل گئے، جبکہ زیادہ تر منصورہ شہر میں گھس کر ہر کسی کو تیغ زنی کا نشانہ بنانے لگے تاہم کچھ آگے جا کر وہ شہر کی گلیوں میں پھنس کر رہ گئے۔ جب سیاہ فام غلام کھڑکیوں سے ان پر گزدار تیر برسانے لگے اور چھتوں سے ان پر پتھروں کی بارش ہوئی تو انہیں جان بچا کر منتشر ہونے کے سوا کچھ سجھائی نہ دیا۔ کچھ صلیبی اس ہلے میں سلطان کے محل تک پہنچ گئے تھے۔ اس موقع پر سلطان کا مملوک افسر رکن الدین بیبرس اپنے جانبازوں کو لے کر آگے بڑھا اور اس شدت کا جوابی حملہ کیا کہ فرنگیوں کو بھاگتے ہی بنی۔ کچھ دیر بعد ان کے مختلف گروہ شہر کے چوراہوں میں پھر منظم ہوگئے۔ ادھر سے مملوک سپاہی اور مقامی مسلمان بھی تلواریں سونت کر پہنچ گئے اور دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ مسلمان شہر کی گلی گلی سے واقف تھے اور صلیبی انجان۔ وہ زیادہ دیر تک نہ سکے اور چند ایک کے سوا سبھی مارے گئے۔ بہت کم بچ کر فرار ہو سکے۔ ②

اس حملے کی خبر پیغام رساں کبوتروں کے ذریعے فوراً قاہرہ پہنچادی گئی تھی، لہٰذا وہاں ایک ہل چل برپا تھی۔ منصورہ سے پسپا ہو کر آنے والوں کے لیے قاہرہ کے دروازے کھول دیے گئے۔ رات بھر مفرورین یہاں پہنچتے رہے اور لوگ تشویش سے بے حال رہے۔ تاہم صبح فرنگیوں کی پسپائی کی خوشخبری پہنچی جس سے ہمتیں از سرِ نو بحال ہوگئیں۔ ③

الملک المعظم توران شاہ

اُدھر شجرۃ الدر کے بلاوے پر توران شاہ ۱۱ رمضان (۷ دسمبر) کو ایشیائے کوچک سے مصر روانہ ہو چکا تھا، اس کے ساتھ صرف پچاس سوار تھے، راستے میں پہلے موصل اور پھر حلب کے مقامی امراء نے اسے روکنے اور قتل کرنے کے

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۴۴۷/۱، ط العلمیۃ

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۴۴۷/۱، The Crusades by Harold Lamb:p;298 to 300

③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۴۴۷/۱، ۴۴۸

لیے دریائے فرات کے پاس گھات لگائی مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ دشمنوں سے پوشیدہ رہنے کے لیے اسے صحرائے عانہ کا راستہ اختیار کرنا پڑا، تین دن کے اس صحرائی سفر میں وہ پیاس سے مرنے کے قریب ہوگیا۔ آخر وہ دمشق اور الصالحیہ سے ہوکر ۲۱ ذوالقعدہ ۶۴۷ھ (۲۵ فروری) کو المنصورہ پہنچ گیا۔ اس کی آمد پر سلطان کی وفات کا سرکاری اعلان کیا گیا اور نئے حکمران کی رسم تخت نشینی ادا ہوئی۔[1]

فرنگیوں سے فیصلہ کن جنگ:

نئے بادشاہ کو جہاد سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک دن بھی گھوڑے پر سوار ہوکر میدانِ جنگ تک نہ گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کشتی پر بیٹھ کر دور سے محاذ کی سیر کرلیتا تھا۔[2] پھر بھی تخت پر ایک بادشاہ کی موجودگی مسلمانوں کے لیے حوصلہ افزا تھی۔ انہوں نے فرنگیوں کا ناطقہ بند کرنے کی نئی تدابیر آزمائیں۔ منصورہ پر حملہ آور فرنگیوں کو خوراک و رسد دریائے نیل کے راستے دمیاط سے بھیجی جارہی تھی۔ مسلمانوں نے خشکی کے راستے پیادہ فوج کو بھیجا جو درجنوں کشتیاں ٹکڑوں کی شکل میں بار برداری کے اونٹوں پر لاد کر ساتھ لے گئی۔ نیل کے ڈیلٹا تک پہنچ کر کشتیاں جوڑلی گئیں۔ جب دمیاط کے فرنگیوں نے خوراک و رسد کا بحری بیڑا صلیبی معسکر کی طرف روانہ کیا تو پیچھے سے یہ کشتیاں سپاہیوں سمیت پانی میں اتار دی گئیں اور فرنگی بیڑے کی واپسی کا راستہ بند کردیا۔

ادھر منصورہ سے اسلامی بحری بیڑا حرکت میں آیا اور اس نے سامنے سے راہ مسدود کردی۔ فرنگی دونوں طرف سے گھیرے میں آکر بے بس ہوگئے۔ اس لڑائی میں ایک ہزار کے لگ بھگ فرنگی ہلاک اور قید ہوئے۔ ۵۲ جہاز مسلمانوں کے ہاتھ آئے جو خوراک سے بھرے ہوئے تھے۔ یوں دریائی راستے پر مسلمانوں کے قبضے کے باعث دمیاط سے فرنگیوں کی سپلائی لائن کٹ گئی اور پورا صلیبی پڑاؤ قحط کا شکار ہوگیا۔ ذوالحجہ کے پہلے عشرے (مارچ ۱۲۵۰ء) میں فرنگیوں نے دمیاط سے ایک اور مال بردار بیڑہ بھیجا مگر مسلمانوں نے اسے بھی گھیر لیا۔ اس کارروائی میں ۳۲ جہاز ہاتھ آئے۔ یہ تدابیر مرحوم بادشاہ کے وصیت نامے کے مطابق عمل میں لائی گئیں تھیں۔

فرنگی قحط سے بدحال ہو چکے تھے۔ اس لیے مذاکرات کا ڈول ڈالا تاہم اس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا کیوں کہ توران شاہ نے مذاکرات کے لیے دمیاط کو خالی کرنے کی شرط رکھی تھی اور شاہِ فرانس یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

فرنگی المنصورہ کے سامنے پڑاؤ ڈال کر ایک جال میں پھنس گئے تھے۔ انہوں نے اب ہر قیمت پر دمیاط واپسی کو ترجیح دی اور کیمپ خالی کرکے ۳ محرم کی شب بڑی خاموشی سے دمیاط کی طرف روانہ ہوگئے۔ مگر مسلمان پوری طرح چوکس تھے۔ انہوں نے پوری منصوبہ بندی سے ان کا تعاقب شروع کردیا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو فرنگیوں کے آگے بھی اسلامی فوج تھی اور پیچھے بھی۔ اب جان توڑ لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۳۴۸/۱، ۳۴۹، ط العلمیة

② الروض الزاهر فی سیرة الملک الظاهر للعلامة محی الدین بن عبد الظاهر (م ۶۹۲ھ)، ص ۴۹، ط الریاض، ۱۹۷۶ء

۴ محرم ۶۴۸ھ (۸ اپریل ۱۲۵۰ء) کو نیل کی وادی میں فیصلہ کن معرکہ لڑا گیا۔ فرنگیوں نے پوری کوشش کی کہ گھیرا توڑ کر دمیاط پہنچ جائیں مگر نوجوان افسر رکن الدین بیبرس بندقداری اور دیگر مصری جرنیلوں نے انہیں اپنے شکنجے سے نہ نکلنے دیا۔ صبح سے شام تک جاری اس ہولناک لڑائی میں لگ بھگ ۳۰ ہزار صلیبی مارے گئے جبکہ ایک لاکھ کے قریب زندہ گرفتار کر لیے گئے۔ شاہِ فرانس لوئیس نہم ایک ٹیلے پر پناہ لیے ہوئے تھا۔ اسے جان کی امان دے دی گئی اور زنجیر پہنا کر المنصورہ کی ایک حویلی میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس فتح سے پورے عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے مبارکباد اور تہنیت کے پیغامات مصر آنے لگے۔ ①

توران شاہ کا قتل اور ایوبی حکومت کا خاتمہ:

الملک المعظم توران شاہ اپنے باپ سے یکسر مختلف تھا۔ وہ مطالعے کا عادی تھا، علماء اور دانشوروں سے مباحثے کرتا تھا۔ مگر انتظامی اعتبار سے وہ کمزور اور لاپروا تھا۔ اس نے اتنی شاندار فتح سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور اپنے دل پسند مشاغل میں مگن ہو گیا۔ اس نے اپنے والد کے بیش قیمت نصیحت نامے پر بھی کوئی عمل نہ کیا بلکہ کھلم کھلا اس کی خلاف ورزی کرنے لگا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں شجرۃ الدر سے جس نے اس کے تاج وتخت کے لیے راہ ہموار کی تھی، بدسلوکی شروع کر دی۔ پھر اس نے نہ صرف اپنے باپ کے مقرب افسران کو برطرف کر دیا بلکہ ان ترک جرنیلوں کی خدمات کو بھی نظر انداز کر دیا جو فتح میں پیش پیش تھے۔ ② اس کے معاصر مؤرخ علامہ محی الدین کا کہنا ہے کہ وہ شراب کے نشے میں دُھت رہنے لگا۔ وہ مدہوشی کی حالت میں ہی دربار میں آ بیٹھتا تھا اور بلاوجہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا تھا۔ ③

اس طرزِ عمل نے فوج کو اس کے خلاف کر دیا۔ یہ ترک جرنیل جو ممالیک کہلاتے تھے، آپس میں بڑے متحد تھے۔ ان کے سردار فارس الدین اقطائی نے توران شاہ کو حصنِ کیفا سے قاہرہ لانے اور تخت پر بٹھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا جس پر توران شاہ نے اقطائی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے حصنِ کیفا کا گورنر بنا دے گا، مگر بعد میں توران شاہ نے یہ وعدہ بھی پورا نہ کیا۔ وہ ممالیک کو اپنے اوپر مسلط دیکھ کر پریشان تھا اور انہیں کمزور کرنا چاہتا تھا۔ رات کو وہ جلتی ہوئی شمعیں سامنے رکھتا، ان کے سر کاٹ کاٹ کر پھینکتا اور کہتا: ”میں ممالیک کا یہی حشر کروں گا۔“

ممالیک توران شاہ کے عزائم کو بھانپ چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بغاوت کی تیاری کر لی۔ ایک دن توران شاہ حسبِ عادت تختِ شاہی پر بیٹھا تھا کہ ۲۳ سالہ نوجوان افسر بیبرس بندقداری نے آگے بڑھ کر یکدم اس پر تلوار چلا دی۔ توران شاہ نے اضطراری حالت میں بچاؤ کے لیے ہاتھ آگے کر دیا، تلوار اس کی انگلیاں کاٹ کر گزر گئی۔ توران شاہ سمجھ گیا کہ بغاوت ہو چکی ہے۔ وہ یکدم بھاگا اور جان بچانے کے لیے لکڑی کے ایک بُرج میں چھپ گیا۔ وہ بیبرس سے واقف نہ تھا، اس لیے چلانے لگا: ”کون ہے مجھے زخمی کرنے والا؟“ لوگوں نے کہا: ”یہ کوئی باطنی فدائی تھا۔“

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۱/ ۴۵۵ تا ۴۵۷؛ نہایۃ الارب للنویری: ۲۹/ ۳۵۵ تا ۳۵۷، ط دار الکتب قاہرہ

② الروض الزاہر فی سیرۃ الملک الظاہر، ص ۵۰ ③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۱/ ۴۵۷، ۴۵۸، ط العلمیۃ

توران شاہ نے کہا: ”نہیں نہیں۔ اللہ کی قسم! وہ ممالیکِ بحریہ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ اللہ کی قسم! میں ان میں سے کسی کو باقی نہیں چھوڑوں گا۔“ اس کے بعد توران شاہ نے ہاتھ کی مرہم پٹی کے لیے طبیب کو بلوایا۔ اُدھر ممالیکِ بحریہ آپس میں کہنے لگے: ”اسے نمٹادو۔ ورنہ یہ تمہیں نیست ونابود کردے گا۔“

ممالیک تلواریں سونتے توران شاہ کے پیچھے پیچھے برج میں گھس گئے۔ توران شاہ جس کے ہاتھ سے اب تک خون بہہ رہا تھا، ڈر کر برج کی چوٹی پر چڑھ گیا اور وہاں بنی کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ یہ دیکھ کر ممالیک نے برج کو آگ لگادی۔ توران شاہ جان بچانے کے لیے بلندی سے کود گیا اور دوڑ کر ممالیک کے سردار فارس اقطائی کے دامن سے جالپٹا اور پناہ طلب کرنے لگا مگر اقطائی کو رحم نہ آیا۔ یہ دیکھ کر توران شاہ سمندر کی طرف بھاگ نکلا۔ وہ چیخ رہا تھا:

”مجھے بادشاہت نہیں چاہیے۔ مجھے چھوڑ دو۔ قلعے میں جانے دو۔ مسلمانو! تم میں سے کوئی نہیں جو مجھے پناہ دے، کوئی نہیں جو مجھے بچائے؟“

مگر اس کی چیخ وپکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ممالیک اس پر تیر برسانے لگے۔ باقی سپاہی یہ منظر دیکھ رہے تھے مگر کسی کو دخل اندازی کی مجال نہ تھی۔ تیروں کی بوچھاڑ نے تھوڑی ہی دیر میں توران شاہ کو ڈھیر کردیا۔ ممالیک تیرتے ہوئے اس تک گئے اور تلواروں سے اس کے جسم کے ٹکڑے کردیے۔ یہ واقعہ ۱۶ محرم ۶۴۸ھ (۲۰ اپریل ۱۲۵۰ء) کا ہے۔

کٹی پھٹی لاش تین دن تک ساحل پر پڑی رہی اور پھول گئی مگر کسی کو دفن کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر خلیفہ بغداد کے سفیر نے جو قاہرہ آیا ہوا تھا، سفارش کی جس پر لاش کو دفن کرنے کی اجازت دی گئی۔

قتل کرنے والے فوجی افسران نے توران شاہ کی جگہ ملکہ شجرۃ الدرّ کو تخت پر بٹھادیا۔

توران شاہ کی موت پر مصر سے ایوبی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس خاندان نے تقریباً پون صدی تک بڑی آب وتاب سے شام ومصر میں حکومت کی اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہا۔[1]

ملکہ شجرۃ الدرّ کے فرنگیوں سے کامیاب مذاکرات:

شجرۃ الدرّ کوئی خاندانی شہزادی نہیں بلکہ کنیز تھی۔ وہ ایک ہوشیار اور زیرک سیاست دان تھی۔ اسے تخت پر بٹھانے والے، اس کے معتمد امراء بھی سابق غلام تھے جو ترقی کرکے فوجی جرنیل بنے جن میں بیبرس، قطز، اقطائی اور جانکشیر نمایاں تھے۔ اس کی تخت نشینی نے مصر میں غلاموں کے اس سلسلۂ حکومت کی داغ بیل ڈال دی جو تاریخ میں ”دولۃ الممالیک“ کے نام سے مشہور ہوئی۔

شجرۃ الدرّ نے محبوس شاہِ فرانس سے دوٹوک مذاکرات کیے اور اس کی رہائی کے لیے درج ذیل شرائط پیش کیں:

1. وہ دمیاط کو خالی کرادے۔
2. چار لاکھ دینار فدیہ ادا کرے۔

---

① نہایۃ الارب للنویری: ۲۹/۳۲۰ تا ۳۶۰؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۱/۳۵۷، ۳۵۸، ط العلمیۃ

③ دس سال تک فرانس کی طرف سے دوبارہ حملہ نہ ہونے کی ضمانت دے۔

شاہِ فرانس نے شرائط قبول کرلیں۔ ساتھ ہی ان تمام قیدیوں کو فدیہ دے کر رہا کرانے کا ارادہ ظاہر کیا جو حالیہ اور گزشتہ جنگوں میں گرفتار ہوئے تھے۔ یہ فرمائش قبول کرلی گئی۔ ۳ صفر ۶۴۸ھ کو دمیاط دوبارہ مسلمانوں کو مل گیا جبکہ شاہِ فرانس سے رقم وصول کر کے اسے آزاد کردیا گیا۔ شاہِ فرانس نے مزید جن قیدیوں کا فدیہ ادا کیا وہ ۱۲ ہزار ۱۱۰ تھے۔ شاہِ فرانس اس قافلے کو لے کر عکا چلا گیا جو ساحلِ شام پر اب بھی فرنگیوں کے قبضے میں تھا۔ نصرانیوں کو اس شکست کا اتنا غم ہوا کہ بعض شہروں میں لوگوں نے اپنے گرجوں میں آویزاں مریم و مسیح کی تصاویر کو سیاہی سے لیپ دیا۔[1]

مصر سے ایوبی سلطنت کا خاتمہ ہوجانے کے باوجود اس خاندان کے کچھ شہزادے مزید چند سالوں تک شام اور الجزیرۃ میں حکمران رہے جن میں ایک صلاح الدین ایوبی کا پڑپوتا الملک الناصر حاکمِ حلب تھا۔ اس نے مصر سے ایوبیوں کا اقتدار ختم ہوتا دیکھ کر ۶۴۸ھ میں دمشق پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس طرح وہ تقریباً پورے شام کا سلطان بن گیا۔

اس کے علاوہ میافارقین پر الملک العادل کے پوتے محمد الکامل کا اقتدار باقی تھا۔ ایوبی خاندان کے یہ دو حکمران ۶۵۸ھ میں ہلاکو خان کی یلغار کا سامنا کرتے ہوئے شہید ہوئے۔[2]

اس طرح آلِ نجم الدین ایوب کی وہ عظیم مملکت جو مصر و شام سے الجزیرہ اور آرمینیا تک وسیع تھی، صفحۂ ہستی سے غائب ہوکر تاریخِ اسلام کا ایک روشن ورق بن گئی۔

---

① نهاية الارب للنويرى ۲۹ ص ۳۴۱ تا ۳۶۰، ط دار الكتب قاهره ؛
السلوک لمعرفة دول الملوک للمقريزى : ۱ ص ۳۵۹، ۳۶۰، ط العلمية

② ایوبیوں کے ان دو آخری شہزادوں کے حالات چھٹے باب میں مملوک سلاطین کے تحت آئیں گے۔
مزید تفصیل کے لیے درج ذیل مآخذ میں ۶۴۰ھ سے ۶۵۸ھ تک کے حالات ملاحظہ فرمائیں:
البداية والنهاية ، تاريخ الاسلام للذهبى ، السلوک لمعرفة دول الملوک للمقريزى

ایوبی خانوادے کے اہم حکمرانوں کا خاکہ

	نام حکمران	آغازِ حکومت	اختتام	علاقہ	خاص بات
	صلاح الدین ایوبی کا خاندان				
۱	صلاح الدین ایوبی بن نجم الدین ایوب	۵۶۷ھ (۱۱۷۱ء)	۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء)	مصر، شام، حجاز الجزیرہ، کردستان	دولتِ ایوبیہ کی بنیاد رکھی، بیت المقدس فتح کیا۔
۲	الملک العزیز عثمان بن صلاح الدین	۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء)	۵۹۶ھ (۱۲۰۰ء)	مصر	اپنے بھائی الافضل سے کش مکش
۳	الملک الافضل بن صلاح الدین	۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء)	۵۹۲ھ (۱۱۹۶ء)	دمشق	بھائیوں اور چچا سے کش مکش کے بعد حکومت سے محروم ہوا۔
۴	الملک الظاہر بن صلاح الدین	۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء)	۶۱۳ھ (۱۲۱۶ء)	حلب	عادلانہ اور پرامن حکومت
۵	الملک العزیز بن الملک الظاہر	۶۱۳ھ (۱۲۱۶ء)	۶۳۴ھ (۱۲۳۷ء)	حلب	عدل وانصاف سے حکومت کی
٦	الملک الناصر بن الملک العزیز بن الملک الظاہر بن صلاح الدین	۶۳۴ھ (۱۲۳۷ء)	۶۵۸ھ (۱۲۶۰ء)	حلب، دمشق	۶۴۸ھ میں دمشق پر قبضہ کر کے اسے پایہ تخت بنایا۔ ۶۵۸ھ میں ہلاکو خان نے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔
	الملک العادل کا خاندان				
۱	الملک العادل بن نجم الدین ایوب	۵۹۶ھ (۱۲۰۰ء)	۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء)	شام، مصر، الجزیرہ	تیسری، چوتھی اور پانچویں صلیبی جنگیں لڑنے والا عظیم مجاہد اور سیاستدان

۲	الملک الکامل محمد بن الملک العادل	۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء)	۶۳۵ھ (۱۲۳۸ء)	مصر	پانچویں صلیبی جنگ کا فاتح
۳	الملک العادل بن الملک الکامل	۶۳۵ھ (۱۲۳۸ء)	۶۳۷ھ (۱۲۴۰ء)	مصر	کم عمر اور نااہل حکمران
۴	الملک المعظم عیسیٰ بن الملک العادل	۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء)	۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء)	دمشق، القدس	پانچویں صلیبی جنگ کا مردِ مجاہد حنفی فقیہ، مصنف
۵	الناصر داؤد بن الملک المعظم عیسیٰ	۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء)	۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء)	دمشق، کرک	حنفی فقیہ، شاعر۔ باپ کی عظیم ریاست سے جلد محروم ہو گیا، فقط کرک باقی رہا۔
۶	الملک الاشرف بن الملک العادل	۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء)	۶۳۵ھ (۱۲۳۷ء)	خلاط، دمشق، الجزیرہ	سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کا سخت حریف
۷	الملک المظفر شہاب الدین غازی بن الملک العادل	۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء)	۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء)	میافارقین، خلاط، آمد	پرفتن دور میں پرامن حکومت
۸	الملک الصالح اسماعیل بن الملک العادل	۶۳۵ھ (۱۲۳۷ء)	۶۴۴ھ (۱۲۴۷ء)	دمشق، بعلبک	الملک الکامل اور اس کے بیٹے الصالح ایوب سے دشمنی، دوبارہ دمشق پر قبضے میں کامیاب، آخر میں دربدر
۹	الملک الصالح ایوب بن الملک الکامل	۶۳۷ھ (۱۲۳۸ء)	۶۴۷ھ (۱۲۴۹ء)	مصر، شام، الجزیرہ	فرنگیوں سے جہاد کا سلسلہ پھر شروع کیا۔ شام و مصر کو یکجا کیا، مجاہد بادشاہ
۱۰	الملک المعظم توران شاہ بن صالح ایوب	۶۴۷ھ (۱۲۵۰ء)	۶۴۸ھ (۱۲۵۰ء)	مصر، شام، الجزیرہ	مصر میں ایوبی خاندان کا آخری حکمران۔ نااہل۔ فقط دو ماہ حکومت کی۔ اس کے بعد حکومت اس کی سوتیلی ماں شجرۃ الدر نے سنبھال لی۔
۱۱	الملک الکامل محمد بن الملک المظفر شہاب الدین غازی بن عادل	۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء)	۶۵۸ھ (۱۲۶۰ء)	میافارقین، خلاط، آمد	ہلاکو خان کے ہاتھوں گرفتاری اور شہادت

چوتھا باب

سلطنتِ خوارزم شاہی

اور فتنۂ تاتار

۵۲۲ھ تا ۶۵۶ھ

۱۱۲۸ء تا ۱۲۵۸ء

فتنۂ تاتار

ایوبی خاندان کے بعد شام اور مصر میں عالم اسلام کے دفاع کی ذمہ داری مملوک سلاطین نے سنبھال لی۔ اس وقت عالم اسلام کو بیک وقت صلیبیوں اور تاتاریوں کی یلغار کا سامنا تھا۔ مملوک سلاطین نے ان دونوں محاذوں پر حریف طاقتوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور انہیں شکستِ فاش سے دوچار کر کے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو بحال کیا۔

مگر اس سے پہلے کہ ہم یہ بیان کریں کہ حکومت کس طرح ایوبیوں سے مملوکوں کو منتقل ہوئی اور ان نئے قائدین نے صلیبی حملوں کو روکنے کے ساتھ ساتھ ''فتنۂ تاتار'' کا رُخ کس طرح پھیرا، ضروری ہے کہ ہمیں ''فتنۂ تاتار'' کے بارے میں معلومات حاصل ہوں۔ پھر چوں کہ تاتاریوں کا مقابلہ سب سے پہلے خوارزم شاہی حکمرانوں نے کیا تھا، اس لیے خوارزم شاہی خاندان کا تعارف بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

احادیث میں فتنۂ تاتار کی طرف اشارے:

فتنۂ تاتار، وہ قیامتِ صغریٰ تھی جو ساتویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں مسلمانوں پر ٹوٹی۔ اس عالمی فتنے کے بارے میں خود احادیثِ نبویہ میں واضح پیش گوئیاں موجود تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بڑی وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا:

''قیامت اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ مسلمان ترکوں کی ایک ایسی قوم سے قتال نہ کریں جن کے چہرے تہ بہ تہ ڈھالوں کی طرح ہوں گے۔ وہ بالوں کے لباس اور بالوں ہی کے کپڑے پہنیں گے۔''[1]

نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''تم قیامت سے پہلے ایسی قوم سے قتال کرو گے جس کے جوتے بالوں کے ہوں۔ ان کے چہرے گویا تہ بہ تہ ڈھالوں کی طرح ہوں گے۔ سرخ چہروں اور چھوٹی آنکھوں والے ہوں گے۔''[2]

اس مفہوم کی کئی روایات صحیح بخاری، صحیح مسلم، سننِ ابوداؤد اور دیگر کتب حدیث میں مروی ہیں اور اکثر شراحِ حدیث نے پورے شرح صدر کے ساتھ ان احادیث کا مصداق تاتاریوں کے حملے اور ان کی تباہ کاریوں کو قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ نامور شارحِ حدیث مُلّا علی قاری رحمہ اللہ ان روایات کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

① صحیح مسلم، ح: ۷۴۹۷، الفتن واشراط الساعة

② صحیح مسلم، ح: ۷۴۹۸، الفتن واشراط الساعة

”زیادہ قریب الفہم بات یہی ہے کہ ان احادیث میں چنگیز اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں برپا ہونے والے فساد کی جانب اشارہ ہے۔“[1]

تاتاری حملے کے چشم دیدہ گواہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ان ترکوں سے قتال کا مشاہدہ ہوگیا ہے...... یہ لوگ ان تمام علامات کے ساتھ ہمارے زمانے میں پائے گئے ہیں، مسلمانوں نے ان سے بارہا قتال کیا ہے جو اب تک جاری ہے۔“[2]

علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کے مطابق ان واقعات کا ایک حصہ ۶۱۷ھ میں پیش آچکا ہے۔ ترکوں (تاتاریوں) کا ایک عظیم لشکر ظاہر ہوا جس نے ماوراء النہر اور خراسان کے باشندوں کو ہلاک کر دیا۔ صرف وہی لوگ بچے جنہوں نے غاروں میں پناہ لی۔“[3]

یاد رہے کہ احادیث میں ترک کے لفظ کا اطلاق تاتاریوں پر اس لحاظ سے ہے کہ تاتاری ترک بن یافث بن نوح علیہ السلام کی نسل سے ہونے کے لحاظ سے ترک قوم کی ایک شاخ تھے۔

تاتاری یورش کی تباہ کاریاں:

تاتاریوں کے حملے سے چھ سو سالہ قدیم اسلامی تہذیب وتمدن خاک میں مل گیا۔ عالم اسلام کے مغربی شہروں کے سوا کوئی علاقہ تاتاری غارت گروں سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا اور جہاں ان کے قدم نہیں پہنچے وہاں بھی ان کا خوف لوگوں کو حواس باختہ کیے دے رہا تھا۔ ہر شخص یہ یقین کر چکا تھا کہ تاتاری آج نہیں تو کل یہاں بھی آگ اور خون کی ہولی کھیلیں گے۔ بڑے بڑے نامور بادشاہ، شہزادے، سپہ سالار اور مجاہد قائدین اسی طوفان کی نذر ہوئے۔ ہزاروں قلعے اور لاکھوں کی آبادی پر مشتمل بڑے بڑے شہر بے نام ونشان ہو گئے۔

تاتاریوں کے حملے کے چشم دید گواہ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یہ حادثہ تمام دنیا پر چھا گیا ہے مگر خصوصاً مسلمانوں پر۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے لے کر آج تک ایسی مصیبت نازل نہیں ہوئی تو وہ یقیناً سچا ہوگا کیوں کہ تاریخ میں اس واقعہ کے قریب بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ بڑے بڑے حوادث کے تذکرے میں مؤرخین جو عظیم ترین حادثہ بیان کرتے ہیں وہ بیت المقدس میں بخت نصر کے ہاتھوں بنی اسرائیل کا قتل عام ہے، مگر درحقیقت بیت المقدس ان شہروں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جن کو ان بد بخت تاتاریوں نے تباہ و برباد کیا ہے، ان شہروں میں سے ہر ایک بیت المقدس

---

① مرقاۃ المفاتیح فی شرح مشکوۃ المصابیح: ۳۴۰۸/۸، ط دار الفکر بیروت

② شرح النووی علی صحیح مسلم: ۳۸،۳۷/۱۸، ط دار احیاء التراث العربی

③ عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری. ۲۰۱/۱۴، کتاب الجهاد، باب قتال الترک، ط دار احیاء التراث العربی

سے کئی گنا بڑا ہے، اسی طرح بنی اسرائیل کے مقتولین کو تاتاریوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے افراد کی تعداد سے کچھ نسبت نہیں ہے، اس لیے کہ ان شہروں میں سے ایک شہر کے افراد کی تعداد بھی بنی اسرائیل کے تمام مقتولین سے زیادہ ہے۔ شاید دنیا والے اس عالم کے فنا ہونے تک اس جیسا حادثہ پھر نہیں دیکھیں گے، سوائے یاجوج ماجوج کی تباہ کاری کے۔ (کہ وہ اس سے زیادہ ہوگی)

جہاں تک دجال کے ظہور کا تعلق ہے تو وہ ان لوگوں کو زندہ چھوڑ دے گا جو اس کے تابع ہوں گے اور صرف مخالفین کو قتل کرے گا، مگر ان تاتاریوں نے تو کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا، بلکہ عورتوں، مردوں، بچوں سب کو قتل کر ڈالا، یہاں تک کہ انہوں نے حاملہ عورتوں کے شکم چاک کر کے بچوں کو نکال کر ذبح کیا ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن. وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم.

یہ ایسا عظیم فتنہ ہے کہ اس کی چنگاریاں ہر طرف اڑ رہی ہیں اور اس کا فساد ہر طرف پھیل چکا ہے، اور یہ شہروں سے اس بادل کی طرح گزرتا چلا گیا ہے جس کو آندھی ہانک رہی ہو۔''[1]

مشہور جغرافیہ دان، مؤرخ اور سیاح یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) جو اس حملے کے وقت سلطنتِ خوارزم کے شہر ''مرو'' میں تھے، ایک مراسلے میں اس سانحہ پر اپنے غم اور اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان شہروں میں کفار اور خدا کے منکر گھس چکے ہیں، ان پردہ سراؤں پر گمراہوں اور دشمنوں کا حکم نافذ ہے، وہ محلات حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے ہیں، اب وہ وطن صرف انسانی لاشوں اور کوؤں کا ٹھکانہ بن گیا ہے، وہاں صرف الوؤں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، ان ممالک کی حدود میں بادِ سموم کے بگولے چل رہے ہیں، دوسروں کا دل بہلانے والا وہاں جا کر خود وحشت زدہ ہو جاتا ہے، تباہی و بربادی کے اس حادثے پر شاید ابلیس بھی مرثیہ کہتا ہوگا۔''[2]

اس حادثے کا مشاہدہ کرنے والا بخارا کا ایک شخص جان بچا کر خراسان پہنچا، لوگوں نے اس سے تاتاریوں کی غارت گری کا حال پوچھا تو اس نے کہا:

''آمدند و کندند وسوختند وکشتند و بُردند و رفتند''

(وہ آئے، کھود ڈالا، جلا ڈالا، قتل عام کیا، لوٹا اور چلے گئے۔)[3]

یہ جملہ جس میں تاتاریوں کی دہشت گردی کی پوری داستان پنہاں ہے، ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔

❁❁❁

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۱۷ھ

② معجم الادباء للحموی: ۱/۳۴، ۳۵، قدیم نسخہ ...... نوٹ: یہ اقتباس معجم الادباء کے اس قدیم نسخے سے لیا گیا ہے جو ''جامعہ مسجد الخلیل الاسلامی کراچی'' کے کتب خانے میں موجود ہے، بعض جدید نسخوں میں یہ عبارت موجود نہیں ہے۔

③ تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۱۸۹، ط برس : تاریخ گزیدہ از حمد اللہ مستوفی، ص ۵۸۲، انتشارات امیر کبیر ، ایران۔ والقصۃ للجوینی

سلطنتِ خوارزم

موجودہ جمہوریہ ازبکستان کی شمال مغربی سرحد پر دریائے آمو کے قریب ''اورگنج'' نام کا ایک شہر ہے۔صدیوں قبل یہ شہر ''جرجانیہ'' یا ''اورگنج'' کہلاتا تھا۔یہ ایک ریاست کا صدر مقام تھا جسے تاریخ اسلام میں خوارزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔خوارزم کا علاقہ اس وقت سے ایک علیحدہ ریاست شمار ہوتا آیا ہے جب شاہِ فارس بہرام گور کے ایک رشتہ دار نے اس پر قبضہ جمالیا تھا۔زمانہ قدیم ہی سے خوارزم کے ہر حکمران کو ''خوارزم شاہ'' کہا جاتا تھا۔تاریخی روایات کے مطابق کے خسرو وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے سکندر اعظم کے حملے سے ۹۸۰ برس قبل اس ریاست کے حاکم کو خوارزم شاہ کا لقب دیا تھا۔زمانہ قدیم میں ریاست خوارزم کے دو دارالحکومت تھے:ایک دریائے جیحوں کے مشرقی کنارے پر تھا جسے ''کاث'' کہا جاتا تھا اور دوسرا مغربی کنارے پر تھا جسے ''جرجانیہ''،''گرگانج'' یا ''اورگنج'' کہتے تھے۔اورگنج کے علاوہ ،خیوا اور ہزار اسپ بھی ریاست کے اہم شہر شمار ہوتے تھے۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے دور میں غازیٔ اسلام قتیبہ بن مسلم نے ۹۳ھ (۷۱۲ء) میں اس ریاست کو فتح کر کے اسلامی مقبوضات میں شامل کیا تھا۔ایک عرصہ تک یہ علاقہ خلفائے اسلام کے زیرنگیں رہا جب خلافت کا اثر ورسوخ کم ہوا تو دیگر بہت سی حکومتوں کی طرح یہاں بھی مسلمان بادشاہوں کی خود مختار حکومت قائم ہوگئی۔اسلامی مقبوضات میں شامل ہونے کے بعد خوارزم کو تاریخ میں بڑی پذیرائی نصیب ہوئی۔اسلام کے کتنے ہی نامور فقہاء، محدثین، دانشور اور بادشاہ یہاں کی خاک سے اٹھے اور دنیا میں آفتاب ومہتاب بن کر چمکے۔یہ علاقہ علم وحکمت،تزکیہ د معرفت، تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت کا مرکز بن گیا۔[1]

خوارزم شاہی حکمران:

زمانے کی گردش کے ساتھ ساتھ تختِ خوارزم پر یکے بعد دیگرے مختلف حکمران براجمان ہوتے رہے،مگر یہ سب خلافتِ اسلامیہ کے ماتحت ایک صوبے دار کی سی حیثیت رکھتے تھے۔تاہم ایک عرصے کے بعد جب عباسی خلفاء کی شوکت کو گہن لگا تو یہاں کے حکمران خلافت کی کفش برداری سے آزاد ہوگئے۔ان خود مختار حکمرانوں کا پہلا دور ۳۴۰ھ (۹۵۱ء) میں ابوسعید احمد خوارزم شاہ سے لے کر ۴۰۸ھ (۱۰۱۷ء) میں ابوالحارث خوارزم شاہ تک رہا۔دوسرا دور ۴۰۸ھ (۱۰۱۷ء) میں التون تاش خوارزم شاہ سے شروع ہوکر ۴۲۹ھ (۱۰۳۷ء) میں ''ماہ ملک خوارزم شاہ'' پر ختم ہوا۔[2] اس کے بعد تیسرے دور میں اس خطے کی زمام اقتدار اس خاندان کے ہاتھ میں آئی جس کی ابتداء ''انوشت گین خوارزم شاہ'' سے،اور انتہاء ''سلطان جلال الدین منکبرتی خوارزم شاہ'' پر ہوئی۔

---

① روضۃ الصفا از میر خواند(م ۹۰۳ھ): ۱۹۹/۴ تا ۲۰۱، ط نول کشور

② تاریخ بیہقی از محمد بن حسین بیہقی م ۴۷۰ھ، ص ۴۳۵ تا ۴۴۵،ط دانشگاہِ فردوسی مشہد

انوشت گین اور اس کی اولاد:

تیسرے دور کی خوارزمی ریاست کا بانی انوشت گین، گرجستان کے ایغوری قبیلے سے تعلق رکھنے والا ترک غلام تھا۔ اسے اپنے آقا سلطان ملک شاہ سلجوقی کا اتنا اعتماد حاصل تھا کہ سلطان نے اسے ایک ہزار سپاہیوں کا افسر مقرر کر دیا تھا۔

۴۷۵ھ (۱۰۸۲ء) میں ملک شاہ کے حکم سے انوشت گین خوارزم کی صوبے داری پر مامور ہوا اور آخری دم تک اس ذمہ داری کو بخوبی نبھاتا رہا۔ انوشت گین کی زندگی میں بھی اس کا بیٹا محمد عرف قطب الدین باپ کی نیابت میں خوارزم کا نظم ونسق سنبھالے ہوئے تھا۔ ۴۹۰ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد اس نے بڑی خوش اسلوبی سے ریاست کا نظام چلایا اور اپنے نئے آقائے نعمت سلطانِ وقت شاہ سنجر بن ملک شاہ سلجوقی کا دل وجان سے تابع دار رہا۔

۵۲۲ھ (۱۱۲۸ء) میں محمد قطب الدین نے داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے خوارزم شاہی تخت وتاج اپنے بیٹے مظفر الدین اتسنر کے حوالے کیا۔ اس نوجوان نے برسرِ اقتدار آکر سلجوقی سلطنت کے زوال سے فائدہ اٹھایا اور ۵۳۸ھ میں خوارزم شاہی ریاست کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

۲۹ برس کی حکمرانی کے بعد ۵۵۱ھ (۱۱۵۶ء) میں مظفر الدین اتسنر دنیا سے رخصت ہوا اور اس کا بیٹا ابوالفتح ایل ارسلان اس کا جانشین ہوا۔ ایل ارسلان کے سات سالہ دورِ حکومت میں سلطنت خوارزم میں کوئی نمایاں توسیع نہیں ہوئی۔ وہ ۵۵۸ھ (۱۱۶۳ء) میں راہیِ آخرت ہوا۔[1]

علاؤالدین تکش: ۵۸۹ھ تا ۵۹۶ھ (۱۱۹۳ء تا ۱۲۰۰ء)

ایل ارسلان کی وفات کے ساتھ ہی اس کے ولی عہد علاؤالدین تکش اور دوسرے بیٹے سلطان شاہ کے مابین اقتدار کی خوں ریز جنگیں شروع ہو گئیں جو وقفے وقفے سے بیس سال تک جاری رہ کر آخر ۵۸۹ھ میں سلطان شاہ کی طبعی موت اور علاؤالدین تکش کی فتح یابی پر اختتام پذیر ہوئیں۔ سلطان تکش نے مملکت خوارزم کا انتظام سنبھالتے ہی ریاستی حدود اربعہ کے اضافے پر توجہ دی۔ اس وقت سلجوقی سلطنت سمٹ کر مختلف ٹکڑوں میں بکھر چکی تھی۔ عراق میں طغرل ثانی سلجوقی اقتدار کا آخری نمائندہ تھا۔ تکش نے اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ رے اور ہمدان جیسے اہم شہر بھی اس کے مقبوضات میں داخل ہو گئے اور سلطنتِ خوارزم کی سرحدیں بغداد کی حدود سے جا ملیں۔

یہاں سے خوارزم شاہیوں اور خلافتِ عباسیہ میں وہ کش مکش شروع ہوئی جو کبھی ختم ہونے میں نہ آئی۔ عباسی خلیفہ ناصر نے خوارزم شاہ سے مطالبہ کیا کہ عراق کے بعض اضلاع خلافت بغداد کی تحویل میں دے دیے جائیں۔ تکش نے اسے منظور نہ کیا۔ دونوں مملکتوں کے باہمی تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے گئے۔ ۵۹۲ھ (۱۱۹۶ء) میں ہمدان کے مقام پر خوارزمی اور خلافتی افواج کے مابین گھمسان کا معرکہ ہوا جس میں بغدادی افواج شکست کھا کر پسپا ہو گئیں۔[2]

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۴۷۵/۷ھ تا ۵۵۸ھ۔ التاریخ ابن خلدون: ۱۰۶/۵ تا ۱۱۲؛ التاریخ السیاسی للدولة الخوارزمية للدكتورة عفاف سيد صبرة، ص ۳۶ تا ۹۵، ط دار الكتاب الجامعی القاهرة۔

[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۵۸ھ تا ۵۹۲ھ

سلطان تکش ۲۶ سال حکومت کر کے ۱۹ رمضان ۵۹۶ھ (۳ جولائی ۱۲۰۰ء) کو دنیا سے رخصت ہوا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''وہ عادل اور نیک سیرت تھا۔ لوگوں سے اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کا عالم اور اصول دین سے خوب واقف تھا۔ اس نے خوارزم میں احناف کے لیے ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اسی مدرسے کی خاک میں اسے دفن کیا گیا۔''[1]

علاؤالدین محمد خوارزم شاہ: ۵۹۶ھ تا ۶۱۸ھ (۱۲۰۰ء تا ۱۲۲۱ء)

سلطان تکش کی موت کے بعد اس کا ولی عہد قطب الدین محمد اپنے باپ کا لقب اختیار کر کے علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔ چوں کہ اس کا اصل نام صرف محمد تھا اس لیے مؤرخین کبھی اسے محمد خوارزم شاہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ اپنے دور کا سب سے بڑا مسلمان بادشاہ تھا۔ اس نے چند سالوں کے اندر اندر درجن بھر چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتوں کو اپنی مملکت میں شامل کر کے خوارزم کو عالم اسلام کی سب سے بڑی سلطنت بنا دیا جو پورے ترکستان اور خراسان پر مشتمل تھی۔ موجودہ ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، افغانستان اور ایران اس کے صوبے تھے۔ شرقاً غرباً یہ کوہستان پامیر سے عراق تک اور شمالاً جنوباً بحیرۂ ارال سے دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کے شہر نہ صرف عالم اسلام بلکہ تمام دنیا کے قدیم ترین متمدن شہر تھے۔ یہ تہذیب وثقافت اور اسلامی علوم و فنون کے مراکز تھے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ دنیا کے گنجان ترین خطے شمار ہوتے تھے۔ بخارا، اورگنج، سمرقند، نیشاپور اور ہرات میں سے کسی کی آبادی لاکھوں سے کم نہ تھی۔ یاقوت حموی جن کی ساری عمر سیاحت میں بسر ہوئی، تحریر کرتے ہیں:

''میں نے خوارزم سے زیادہ عظیم، خوشنما اور دولت مند مقام کہیں نہیں دیکھا۔''[2]

نئے مفتوحہ ممالک کے بیش بہا خزانے، ان کے ہرے بھرے باغات اور کھیتوں کی پیداوار، روزمرہ کی معرکہ آرائیوں اور فتوحات کے نتیجے میں حاصل ہونے والے اموال، یہ سب غنائم کھنچ کھنچ کر خوارزم میں جمع ہو رہے تھے۔ اقطاع عالم سے ہنر مند اور صنعت پیشہ افراد کشاں کشاں خوارزم چلے آ رہے تھے، یہاں آ کر ان کی کاریگری کے جوہر صحیح معنوں میں کھلتے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے سے متعلقہ اشیاء میں ان کی باریک بینی اور جدت طرازی نے خوارزمی معاشرت کو اوج فلک پر پہنچا دیا تھا۔

یہاں اسلحہ سازی کے نئے نئے کرشمے ظاہر ہو رہے تھے۔ خوارزمی اسلحہ ساز بڑی ہنر مندی سے ایسی لچکدار تلواریں تیار کر لیتے تھے جو موڑ کر دہری کی جا سکتی تھیں، ہلکی زنجیر دار زرہیں بنائی جاتی تھیں جن کو پہن کر جسم کے تمام اعضاء کی نقل و حرکت بڑی سہولت سے جاری رہتی تھی نا حد درجہ مضبوط فولادی خود تیار کیے جاتے تھے جو ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود تلوار اور نیزے کی کاری ضربات بآسانی سہہ لیتے تھے۔ ڈھالوں پر بیل بوٹے بنانے کے لیے سونے چاندی کا

[1] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۵۹۶ھ
[2] معجم البلدان: تحت خوارزم

کام ہوتا تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کے مقابلے میں آتشیں تیروں اور نفت کا استعمال بڑی کامیابی سے کیا تھا۔ خوارزمی اہل فن نے اسے کئی درجے ترقی دے کر مزید مؤثر بنالیا تھا۔

تقریباً تمام شہروں کے دفاع کے لیے سنگین فصیلیں تعمیر کی گئی تھیں۔ زیادہ اہم خطوط پر واقع شہروں کے گرد دو دو فصیلیں بھی موجود تھیں۔ عام طور پر شہروں کی فصیلوں کا دائرہ کئی میل کا ہوتا تھا۔ شہر کے درمیانی حصے میں قلعے کا ہونا لازمی تھا جو عموماً کسی بلند ٹیلے یا پہاڑی پر تعمیر کیا جاتا تھا۔ شہر کی فصیل سَر ہونے کے بعد قلعہ آخری دفاعی حصار ثابت ہوتا تھا۔ شہروں کی فصیلوں میں کئی دروازے مختلف سمتوں کھلتے تھے اور یہ مضبوط ترین لوہے سے تیار کیے جاتے تھے۔ علاؤالدین محمد نے قلعوں اور فصیلوں کی تعمیر پر خصوصی توجہ دی، جس کی وجہ سے اس کے زیر نگین علاقوں کا دفاع حددرجے مستحکم ہوگیا اور اس کی سلطنت کے شہر اس قابل ہوگئے کہ کئی کئی ماہ تک بڑے سے بڑے دشمن کو فصیل سے اندر پَر نہ مارنے دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ علاؤالدین محمد نے تمام قلعوں میں خوراک، اسلحہ اور ہر قسم کے سامانِ رسد کے بے بہا ذخائر جمع کرادیئے تھے جو ہر کڑے وقت پر کام آتے رہے۔ سلطنت خوارزم کی اصل دفاعی زنجیریں دریائے سیحوں اور دریائے جیحوں کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے بڑے بڑے فصیل بند شہروں کی دو قطاریں تھیں۔ بناکت، تاشقند، جند، اترار اور قوقند نے دریائے سیحوں اور سمرقند، بخارا، اورگنج، بلخ اور ترمذ نے دریائے جیحوں کے کنارے دو ایسے طویل مضبوط دفاعی خط تیار کیے تھے جن کا توڑ مشرق و مغرب کے حملہ آوروں کے لیے ہر لحاظ سے مشکل ترین تھا۔ محاصرے کی صورت میں ان میں سے کوئی بھی شہر فی الفور دوسرے شہروں سے کمک حاصل کرسکتا تھا۔[1]

ظاہری اسباب و وسائل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ساتویں صدی ہجری کی ابتداء میں خوارزم کی عسکری قوت دنیائے اسلام کی مضبوط ترین اور جنگ آزما قوت تھی جو حال ہی میں ترکان خطا سمیت اپنے تمام مخالفین کی سرکوبی کر چکی تھی اور کسی بیرونی دشمن سے مغلوب ہونے کے امکانات اس عسکری طاقت کے لیے بہت کم تھے۔

عرب مؤرخین نے اپنی تواریخ میں علاؤالدین محمد کی شخصیت کا اچھے لفظوں میں ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح فقہ حنفی کا پابند، مسلک اہل سنت والجماعت کا پیروکار، خوش عقیدہ اور دیندار تھا۔ غیرت و شجاعت کی بھی اس میں کمی نہ تھی۔ اس کی عظمت کی گواہی ایک مغربی مؤرخ کی زبانی سنئے۔ ہیرلڈ لیمب لکھتا ہے:

’’دنیائے اسلام کے قلب میں اس وقت علاؤالدین محمد خوارزم شاہ امیر جنگ کی حیثیت سے متمکن تھا۔ اس کی سلطنت ہندوستان سے لے کر بغداد تک، بحیرہ خوارزم (بحیرہ آرال) سے خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ سلجوقی ترکوں کے سوا جنہوں نے صلیبی محاربین کے مقابلے میں فتوحات حاصل کی تھیں اور مصر کے مملوک سلاطین کے علاوہ جو روز افزوں ترقی پر تھے، باقی تمام اسلامی سلطنتوں پر محمد خوارزم شاہ بالکل چھایا ہوا تھا۔ سلطان محمد ہی رتبہ میں شہنشاہ تھا۔ عباسی خلیفہ ناصر اس سے ناراض تھا، مگر اس کی قوت کو مانتا تھا۔‘‘[2]

---

[1] تاریخ خوارزم شاہی از غلام ربانی عزیز، ص ۳۴۳ تا ۳۵۵ [2] چنگیز خان از ہیرلڈ لیمب (اردو ترجمہ از عزیز احمد)، ص ۴۲

مؤرخ ابوالفداء کا کہنا ہے:

"خوارزم شاہ کا آستانہ دنیا بھر کے شاہی خانوادوں کے اعیان سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ اس کے حاشیہ بردار، طشت دار، سلاح دار، رکاب دار سب کے سب مختلف شاہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس کا دسترخوان بڑا وسیع و عریض تھا۔"[1]

شہاب الدین النسوی کا بیان ہے:

"اس نے گزشتہ بادشاہوں سے چلی آنے والی نماز کے اوقاتِ خمسہ میں نقارے بجانے کی رسم اپنی دہلیز سے ختم کر کے ان شہزادوں کے لیے جاری کر دی جو اس کی نیابت میں مختلف صوبوں میں حکومت کر رہے تھے کہ ان کی دہلیز پر حسبِ سابق یہ رسم ادا کی جاتی رہے۔ اپنے لیے اس نے "نوبتِ سکندری" رائج کی جو طلوعِ آفتاب اور غروب کے وقت بجائی جاتی تھی۔ یہ ستائیس بڑے بڑے نقارے تھے جو سونے سے تیار کیے گئے تھے۔ ان پر نادر جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس رسم کی ابتداء کے دن ستائیس بادشاہوں یا سلاطین کی اولاد (یعنی شاہی خانوادوں کے اعیان) کو جمع کر کے یہ نقارے بجوائے گئے تاکہ خوب چرچا ہو۔ ان میں سے طغرل بن ارسلان سلجوقی، اولادِ سلطان غیاث الدین غوری، ملک علاؤالدین شاہِ بامیان، ملک تاج الدین حاکم بلخ، اس کا بیٹا ملک اعظم حاکم ترمذ اور ملک سنجر حاکم بخارا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔"[2]

اس کا لشکر اور خیمہ گاہ بڑی شان و شوکت کے مظہر ہوا کرتے تھے، مگر وہ خود نہایت سادہ بود و باش رکھتا تھا۔ سلسلۂ سہروردیہ کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ اس سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وہ ایک سادہ سے تخت پر بیٹھا تھا، بخارا کا کرتا پہنے ہوئے تھا جس کی قیمت پانچ درہم سے زیادہ نہیں تھی، سر پر چمڑے کا ایک پارچہ اوڑھا ہوا تھا جو ایک درہم کا ہوگا۔"[3]

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وہ ایک عالم فاضل انسان تھا۔ فقہ، اصول فقہ اور دوسرے علوم سے خوب واقف تھا۔ علماء کرام کا اکرام کرتا تھا۔ ان سے محبت اور احسان کا برتاؤ رکھتا تھا۔ ان کی مجالس بکثرت منعقد کراتا اور ان کی علمی بحثوں میں حاضر رہتا۔ وہ تھکاوٹ اور مسلسل سفروں کا عادی بن چکا تھا۔ عیش و عشرت سے احتراز کرنے والا تھا۔ لذات سے کنارہ کش تھا۔ اس کی فکر مملکت کے انتظام، اس کی نگرانی اور رعایا کی حفاظت سے وابستہ تھی۔ وہ دین داروں کی بڑی تعظیم کرتا، ان کی طرف متوجہ رہتا اور ان کی برکات حاصل کرنے کا مشتاق رہتا۔"[4]

---

① المختصر فی تاریخ البشر لابی الفداء (م ۷۳۲ھ): ۱۴۹/۳، ط المطبعة الحسینیة مصر

② سیرة سلطان جلال الدین منکبرتی از شہاب الدین محمد بن احمد النسوی، ص ۱۳۱، ط دار الفکر العربی مصر، ۱۹۵۳ء

③ تاریخ الاسلام للذهبی سنة ۶۲۰ھ

④ الکامل فی التاریخ لابن اثیر سنة ۶۱۶ھ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''عرب مؤرخین علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت واخلاق کی کسی بڑی کمزوری اور کسی قابلِ ذکر مخصوص عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ دین داری، خوش اعتقادی اور شجاعت وصلابت کا عام طور پر اعتراف کرتے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی بڑی اسلامی سلطنتوں کے ختم کرنے میں صرف ہوئیں جو اس وسیع مشرقی حصے میں واقع تھیں، ایک طرف شمال و مغرب میں اس نے سلجوقیوں کو ان کی آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ دوسری طرف مشرق اور جنوب میں وہ ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا، اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایران وترکستان کی سپہ گری کا بہترین عنصر اس نہ ختم ہونے والے سلسلۂ جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گیا تھا۔ ان زرخیز ومردم خیز ممالک کے شہروں اور قصبات کی فضا اور ذہن پر جنگ ہر وقت چھائی رہتی تھی۔''[1]

اس فضا اور ماحول میں علاؤالدین خوارزم شاہ سے مزید چند ایسی سنگین غلطیاں ہوئیں جن کے وبال سے اس کے سارے کارناموں پر پانی پھر گیا اور عالمِ اسلام مشرق تا مغرب راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

یورشِ تاتار کے وقت عالم اسلام کی حالت:

ساتویں صدی ہجری کے اس اندوہناک حادثے سے قبل عالمِ اسلام کی حالت ایک جان بلب مریض کی سی تھی جسے طرح طرح کی مہلک بیماریوں نے صاحبِ فراش کر دیا ہو۔ چھٹی صدی ہجری کے اختتام پر اسلامی دنیا شدید انتشار اور لامرکزیت میں مبتلا تھی۔ ہر صوبے پر ایک خود مختار حاکم براجمان تھا۔ اور تو اور خود خلافتِ بغداد کا دائرہ اثر بھی بغداد کی حدود سے باہر نہ تھا۔ خلیفہ ناصر جس کو خاندانی وراثت میں منصبِ خلافت مل گیا تھا، اپنی بداعتقادی، کینہ پروری، عصبیت اور تنگ نظری کے باعث ایک معمولی حاکم بننے کا حق دار بھی نہ تھا۔ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں آئے دن ایک دوسرے کے مقابل آکر خون کی ندیاں بہا رہی تھیں۔ خدا خوفی اور عاقبت شناسی دلوں سے رخصت ہو رہی تھی۔ حبِ دنیا اور موت سے نفرت کا مرض وبا کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ علمی پروازیں عروج پر تھیں، مگر عملی طور پر تعطل کا دور دورہ تھا۔ عوام وحکام سب فریضہ جہاد کو طاقِ نسیاں میں رکھ چکے تھے۔ چند نفوسِ قدسیہ کے سوا، دعوت الی اللہ کا مشغلہ اپنانے والے افراد ڈھونڈے نہ ملتے تھے۔ باطل فرقوں کا طوطی ہر جگہ بول رہا تھا۔ گناہ اور منکرات عام ہو گئے تھے۔ علامہ مقریزی رحمہ اللہ مصر کے بارے میں جو عالم اسلام کا بازوئے شمشیر زن شمار ہوتا تھا، لکھتے ہیں کہ مجوسیوں کا تہوار ''نوروز'' وہاں عام منایا جاتا تھا۔ لوگ دریائے نیل کے کنارے کھلے عام فواحش ومنکرات کا ارتکاب کرتے تھے اور انہیں کوئی روکنے والا نہیں ہوتا تھا۔[2]

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت: ۳۱۲/۱

[2] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲۴۷/۱

ایسی حالت میں کسی ایسے عمومی حادثے کا وقوع سنت اللہ کے عین مطابق تھا جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر انہیں توبہ وانابت پر آمادہ کرے۔ چنانچہ بصیرت مند آنکھیں مشاہدہ کر رہی تھیں کہ اب کوئی خونیں حادثہ کبریٰ پیش آنے والا ہے۔

آسمانی نشانیاں:

مشیتِ خداوندی نے اس بڑے حادثے سے قبل مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے آسمانی حوادث کا ایک لگاتار سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ۵۹۲ھ میں عراق میں اور اگلے سال شام و مصر میں نہایت ہولناک سیاہ آندھی آئی۔ طوفانی ہواؤں نے ایسی تباہی مچائی کہ ایک عینی شاہد قاضی فاضل رحمہ اللہ کے بقول "معلوم ہوتا تھا جہنم کی ایک وادی بہ پڑی ہے۔" اس طوفان سے سفینے غرق ہو گئے، درخت اکھڑ گئے، مکانات گر گئے اور ہزاروں افراد مارے گئے۔

۵۹۷ھ میں مصر میں دریائے نیل خشک ہو گیا، ایسا قحط پڑا کہ لوگ مرنے لگے۔ کثرتِ اموات کے سبب مُردوں کو کفن دینا مشکل ہو گیا۔ شاہِ مصر الملک العادل نے قحط کے ایک مہینے میں دو لاکھ بیس ہزار افراد کے کفن دفن کا انتظام اپنے خرچے پر کرایا۔ خوراک نایاب ہونے کی وجہ سے کتے اور مردار کھانے کی نوبت آ گئی، یہاں تک کہ لوگ انسانی لاشوں کو نوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اسی سال شام، ایشیائے کوچک اور عراق میں ہولناک زلزلے سے لاکھوں افراد ہلاک ہوئے، صرف نابلس شہر میں تیس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اترے۔ اُدھر حجاز اور یمن کے درمیانی علاقہ میں وبا پھیل گئی۔ اٹھارہ بستیوں میں ایک شخص بھی زندہ نہ بچا۔ عبداللہ بن حمزہ کے بارہ ہزار سواروں اور بے شمار پیادوں پر آسمانی بجلی گری، اکثریت ہلاک ہوئی۔ خراسان، شام، الجزیرہ، عراق، ایشیائے کوچک اور قبرص میں زلزلوں پر زلزلے آئے جن میں بکثرت افراد جاں بحق ہوئے۔

۵۹۹ھ کی ایک شب آسمان سے لگاتار شہابِ ثاقب ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔ ①

اہل اللہ کی زبانی حوادث کے نزول کی پیش گوئیاں:

اس دوران بعض اللہ والوں کی زبان سے کچھ پیش گوئیاں بھی ظاہر ہوئیں۔ شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ خوارزم کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ آپ کے خلیفہ شیخ مجد الدین رحمہ اللہ بڑا پُر تاثیر وعظ کہا کرتے تھے۔ ایک جم غفیر ان کا وعظ سننے آتا تھا۔ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کی والدہ ترکان خاتون شیخ مجد الدین رحمہ اللہ کی عقیدت مند تھی اور ان کی مجلسِ وعظ میں شریک ہوتی تھی۔ کسی حاسد نے خوارزم شاہ کے کان بھرے کہ آپ کی والدہ کا شیخ مجد الدین کے ہاں آنا جانا خدشے سے خالی نہیں، شاید شیخ مجد الدین آپ کی والدہ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ خوارزم شاہ یقین کر بیٹھا اور مشتعل ہو کر شیخ مجد الدین رحمہ اللہ کو دریا میں غرق کرنے کا حکم دے دیا۔ حکم کے مطابق شیخ رحمہ اللہ کو دریا بُرد کر دیا گیا۔

کچھ دیر بعد جب خوارزم شاہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس حرکت پر پچھتایا۔ ایک طباق جواہرات سے پُر کر کے اس پر تلوار

① البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۰۰ھ تا ۶۰۵ھ

اور کفن رکھ کر شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ کی خانقاہ میں حاضر ہوا اور درخواست کی:

"یا تو خون بہا میں یہ دولت قبول کر کے میرے جرم عظیم سے درگزر کریں یا یہ تلوار لے کر میرا سر قصاص میں قلم کر دیں۔"

شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ نے جلال میں آ کر جواب دیا:

"کَانَ ذَالِکَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُوْرًا"

"یہ بات لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے۔"

مجد الدین کا خون بہا یہ زر و جواہر نہیں بلکہ اس کا خون بہا تیری پوری سلطنت اور خود تیرا سر ہے۔ یہی نہیں بلکہ میرا سر بھی قلم ہوگا اور بے شمار بندگان خدا کے سر قلم ہونے والے ہیں۔"[1]

تاریخ بتاتی ہے کہ تاتاری حملے کی طرف اشارہ کرنے والی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

خلافتِ بغداد اور سلطنتِ خوارزم میں کشیدگی:

خلافتِ بغداد اور سلطنتِ خوارزم کے درمیان کشیدگی، تاتاری حملے کا پہلا سبب بنی۔ بغداد خلافتِ عباسیہ کا مرکز تھا جبکہ "خوارزم" دنیائے اسلام کا بازوئے شمشیرزن۔ خوارزم اور خلافتِ بغداد کے تعلقات ایک عرصے سے کشیدہ چلے آ رہے تھے اور دونوں حکومتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔

اسی کشیدگی کے باعث خلیفہ ناصر نے خوارزمی حکمران سلطان علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کو قتل کرانے کے لیے حسن بن صباح کے بدنام زمانہ فدائیوں کا تعاون حاصل کیا تھا۔ فدائی خنجر برداروں نے خوارزم شاہ پر قاتلانہ حملہ کی کوشش کی مگر وار خالی گیا۔ تاہم خوارزم شاہ کا ایک سپہ سالار ان کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ خلیفہ ناصر کی سازش طشت از بام ہوئی تو سلطان علاؤ الدین محمد خلیفہ کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا۔

خلیفہ ناصر سے خوارزم شاہ کی ناراضگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دستور کے مطابق ہر مسلمان حکمران کو خلیفہ کی طرف سے پروانۂ حکومت سے خلعت عطا ہوتی تھی۔ خلیفہ نے چھوٹے چھوٹے شہروں کے حکمرانوں کو یہ اعزاز عطا کیا تھا مگر خوارزم شاہ کو اس سے محروم رکھا تھا۔ نیز حج کے موقع پر خلیفہ کے حکم سے باطنی حکمران کے پرچم کو خوارزمی پرچم سے آگے رکھا گیا جس کو خوارزمی سلطنت نے اپنی ہتک خیال کیا۔ نفرت کی یہ چنگاریاں دہکتی رہیں یہاں تک کہ ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں یکا یک خوارزم اور بغداد کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ سلطان علاؤ الدین بن محمد نے کھلم کھلا خلیفہ ناصر کی خلافت کا انکار کر دیا اور تین لاکھ سپاہیوں کا لشکر جرار لے کر بغداد کی طرف یلغار کی۔

خوارزم شاہ کی پیش قدمی کی خبر سے خلیفہ ناصر کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے سہروردی سلسلہ کے بانی، نامور صوفی بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کو صلح کا پیام دے کر خوارزم شاہ کی طرف روانہ کیا۔ مگر خوارزم شاہ نے اس پیام کو مسترد کر دیا۔

---

[1] روضۃ الصفا از میر خواند: ۲۵/۵

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ جو اُمت کے دو بڑے گروہوں کو باہمی خوں ریزی سے بچانے کی نیت سے آئے تھے، بے حد دل گیر ہو کر واپس لوٹے۔ ان کے بے نیلِ مرام لوٹتے ہی موسم کے تیور بدل گئے۔ رات کے وقت اس شدت کی برف باری ہوئی کہ خوارزمی فوج کا ہراول دستہ تباہ ہو گیا اور پیش قدمی کے راستے بند ہو گئے۔ چنانچہ خوارزم شاہ اس مہم کو ملتوی کر کے واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔ (1)

چنگیز خان کا ظہور

مسلم حکمرانوں کی باہم محاذ آرائیوں کے اس تسلسل کے دوران عالمِ اسلام سے ہزاروں میل دور، ایشیا کے عظیم کوہستانی سلسلے پامیر کے پار ایک خونخوار و بے لگام طاقت سر اُٹھا رہی تھی جس کا مرکز سرزمین چین کے شمالی حصے میں گوبی (منگولیا) کا ریگستان تھا۔ زمانہ قدیم سے یہاں خانہ بدوش قبائل آباد چلے آتے تھے جن کی گزر اوقات شکار اور گلہ بانی پر تھی۔ پانی اور چارے کی تلاش میں پسندیدہ مقامات پر قبضے کے سلسلے میں یہ قبائل اکثر آپس میں کشت و خون کرتے رہتے تھے۔ یہ لوگ سرخ و زرد رنگت والے تھے، ان کے چہرے چوڑے اور گٹھے ہوئے تھے۔ ناکیں چھوٹی چپٹی اور داڑھیاں چھدری تھیں، جسم مضبوط اور توانا اور چھریرے تھے۔ ان کا حلیہ باقی اقوام سے نرالا تھا، کسی غیر قوم کا آدمی ان میں فوراً پہچان لیا جاتا تھا لہٰذا ان میں کوئی جاسوس داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ شامانی مذہب کے پیروکار تھے جو خُدا کے مبہم تصور کے ساتھ بُت پرستی، توہمات اور چند رسومات تک محدود تھا۔

ان جنگلی قبائل میں سے ایک بڑا قبیلہ ''مغل'' کہلاتا تھا، جھیل بیکال کے آس پاس کی چراگاہیں ان کے قبضے میں چلی آ رہی تھیں، یہ سرسبز علاقہ اس جھیل سے لے کر منچوریا کے سرحدی پہاڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔ (2)

مغلوں کا جدِ امجد تومنہ خان تھا، اس کے دو بیٹے تھے: قبل خان اور قاچولی بہادر۔ قبل خان کی اولاد سے چوتھی پشت میں چنگیز خان پیدا ہوا۔ چنگیز خان کا نسب یہ ہے: چنگیز بن یسوکائی بن برتان بن قویلہ بن قبل خان بن تومنہ خان۔

چنگیز خان کا اصل نام ''تموجین'' تھا جس کا لفظی معنیٰ ''لوہار'' ہے۔ وہ ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) میں مغل جنگجو یسوکائی کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ (3) اس کی ولادت کے وقت مغل قبیلہ ہمسایہ قبائل سے مغلوب ہو چکا تھا، اس لیے چنگیز کا بچپن اور لڑکپن بدحالی میں گزرا، تاہم اس نے رفتہ رفتہ اپنے منتشر قبیلے کو منظم کر کے ہمسایہ قبائل کو زیر کر لیا۔ ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء)

---

(1) الکامل فی التاریخ: سنة ۶۱۴ھ، سیرة سلطان جلال الدین: ص ۱۳۵ تا ۱۴۰

(2) منگول، تاتاری اور مغل کی وضاحت: منگولیا کی طرف نسبت کر کے ان قبائل کو عموماً منگول کہا جاتا تھا جن میں بہت سے قبائل شامل تھے: مثلاً قرایت، مکریت، تایجوت وغیرہ۔ ان قبائل میں سے ایک قبیلہ ''تاتاری'' تھا جس کے افراد بکثرت تھے اور غالباً چھٹی صدی ہجری کے وسط تک یہی قبیلہ زیادہ طاقتور تھا، اسی لیے عرب مؤرخین نے ان منگول قبائل کو جو چنگیز کی قیادت میں عالم اسلام پر حملہ آور ہوئے تھے، ''تتر'' کے لفظ سے یاد کیا ہے، اور اسی لیے اردو میں بھی انہیں عموماً تاتاری کہا جاتا ہے تاہم تاتار اور مغل دو مستقل قبائل تھے اور چنگیز خان اور اس کے آباء مغل تھے۔ اس لیے چنگیز خان کی سلطنت کو مغل سلطنت کہا جاتا ہے اور بسا اوقات اس کے تمام افسران و سپاہ کو بھی مغل کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ اس کی فوج اور ملازمین میں سب مغل خاندان کے نہ تھے۔

(3) روضة الصفا: ۵ ص ۱۱...... مگر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونی ورسٹی میں چنگیز کی ولادت ۱۱۶۷ء یعنی ۵۶۲ھ لکھی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔

میں اُس نے منگولیا کے تمام سرداروں کو جمع کر کے قرولتائی (عظیم جرگے) کا انعقاد کیا اور اپنی قیادت کے عہد و پیمان کے ساتھ چنگیز خان کا لقب اختیار کر لیا۔ یوں وہ منگولیا کے تمام قبائل کا سردار بن گیا۔ وہ دراز قد، تومند اور چھدری ڈاڑھی والا انسان تھا۔ اُس نے صحرائے گوبی میں نیا شہر ''قراقرم'' تعمیر کر کے اُسے اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ ①

یاسا:

اس اَن پڑھ آدمی نے اپنی سلطنت کا ایک باقاعدہ آئین مدوّن کیا جسے ''یاسا'' (یاساق) کہا جاتا تھا۔ اس کی رعایا میں سے ہر شخص کے لیے یاسا کی پابندی لازمی تھی۔ اس میں عقیدے کی تعلیم بھی تھی مگر مختصر۔ سیاست، انتقالِ اقتدار، اصولِ جنگ، آدابِ معاشرت، جائز اور ناجائز امور اور جرائم کی سزاؤں سمیت بہت کچھ تھا۔ ان میں سے کچھ چیزیں مغل بزرگوں کے تجربات پر مبنی تھیں، کچھ چنگیز خان کی اپنی اختراعات تھیں اور بہت سی باتیں توہمات پر مبنی تھیں۔

یاسا میں ایک خدا خالقِ ارض وسماء پر ایمان لانے کی تعلیم دی گئی مگر اس کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں۔ یاسا کے قوانین کے مطابق چنگیز خان کے حکم کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہر فرد کو اپنے مذہب پر عمل کی آزادی تھی۔ دشمن کے لیے جاسوسی، جھوٹی گواہی، کالے جادو، چوری، زنا اور اغلام کی سزا موت تھی۔ مہینے میں تین بار نشہ کرنے کی رخصت تھی۔ گرج چمک اور بارش کے دوران پانی کا استعمال ممنوع تھا۔ دوسری قوموں سے مکاری، دغا اور فریب کی اجازت تھی۔ ان کا قتلِ عام جائز اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی درست تھی۔ الغرض یاسا معقول اور فضول باتوں کا مجموعہ تھا۔ ②

چین کی تسخیر:

منگولیا اور کوہِ طیان شیان کے پاس بسنے والے جنگجو قبائل کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے کے بعد چنگیز خان نے طوفانی ہوا کی طرح تمام ایشیائے بلند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے دیوارِ چین کو پھلانگ کر چین پر حملہ کیا اور چند سالوں کے اندر اندر اسے فتح کر لیا۔ ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) میں وہ ہزار ہا سالہ قدیم چینی شہنشاہیت کا خاتمہ کر چکا تھا۔ اب اس کی یلغار کے لیے موزوں ترین میدان عالمِ اسلام کی گنجان آباد مملکتوں کا سلسلہ تھا جنہیں روندنے کے لیے وہ آٹھ لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل دنیا کی سب سے بڑی فوج تیار کر چکا تھا جبکہ عالمِ اسلام کے حکمران غفلت میں مدہوش ہو کر ایک دوسرے کے گریبان نوچ رہے اور انہیں اپنے سروں پر منڈلانے والے خطرے کا احساس تک نہ تھا۔ ③

خلیفہ ناصر کی سفارت:

ان حالات میں جبکہ چنگیزی خطرے کے تناظر میں مسلمانوں کا اتحاد سانس کی طرح ضروری تھا، خلیفہ ناصر خوارزم کو

---

① اردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونی ورسٹی لاہور)، مادّہ: چنگیز؛ چنگیز خان از ہیرلڈ لیمب، ترجمہ عزیز احمد، ص ۱۱ تا ۵۴

② اردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونی ورسٹی لاہور)، مادّہ: چنگیز؛ چنگیز خان از ہیرلڈ لیمب، ترجمہ عزیز احمد، ص ۵۵ تا ۵۹

عالمِ اسلام کو تہ و بالا کرنے کے بعد وہ منگولیا واپس چلا گیا جہاں ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں وہ بیماری کے باعث فوت ہو گیا۔ (تاریخ جہانگشا: ۱/۶،۲۴، ط برس) اس کی عمر شمسی حساب سے تقریباً ۷۳ برس اور قمری حساب سے تقریباً ۷۵ سال بنتی ہے۔

③ چنگیز خان: ہیرلڈ لیمب، ص ۶۵ تا ۹۵، سیرۃ سلطان جلال الدین، ص ۳ تا ۱۲، تاریخ ابن خلدون: ۵/۵۸۳ تا ۵۸۵، ط دار الفکر

تباہ وبرباد کرنے پر غور کر رہا تھا۔ اس نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے رائے طلب کی کہ ہمیں سلطان علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کی طاقت کی سرکوبی کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ بعض ملت فروش وزراء نے کہا: ''عالم پناہ! ہماری رائے یہ ہے کہ ہمیں چنگیز خان سے مدد طلب کرنا چاہیے کہ اس کے سوا دنیا کا کوئی فاتح خوارزم شاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''①

اس موقع پر بعض دانش مند مشیروں نے خلیفہ کو اس خطرناک اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا:

''خلیفۃ المسلمین! ان کافر تاتاریوں کو صاحبِ ایمان مسلمانوں کی جان اور عزت وعصمت پر مسلط کرنا نہ عقلاً درست ہے نہ شرعاً۔ ممکن ہے کہ جب یہ وحشی قوم مملکتِ خوارزم پر قابض ہو جائے تو مرکزِ خلافت کا احترام بھی فراموش کر دے اور ہمارے لیے شامت وندامت کا باعث بنے۔''

خلیفہ ناصر نے بے التفاتی سے جواب دیا:

''تاتاری وحشیوں کو درمیان میں حائل شہر فتح کرنے میں کم از کم پچاس برس ضرور لگ جائیں گے۔ تاہم ہدف ان کے پہلے ہی حملے سے حاصل ہو جائے گا، یعنی علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کی عسکری قوت تباہ ہو جائے گی۔''

خلیفہ نے مکتوب کا مضمون تیار کرا لیا، چونکہ چنگیز خان کی مملکت تک جانے کے لیے خوارزم راستے میں پڑتا تھا اس لیے اس مکتوب کو خوارزمی افسران کی تلاشی سے بچانے کے لیے عجیب طریقہ اختیار کیا گیا۔ قاصد کا سر مونڈ کر خط کا مضمون دربارِ خلافت کی مہر سمیت اس کے سر پر آتشیں سوئی سے گودوایا گیا۔ اس نہ مٹنے والی تحریر کو کسی روغن سے چھپا دیا گیا۔ قاصد کے بال جب خوب بڑھ گئے تو اسے روانہ کر دیا گیا۔ اس طرح پیغام بحفاظت چنگیز خان تک جا پہنچا۔ چنگیز خان جو عالمِ اسلام پر حملہ کرنے میں اسی لیے متذبذب تھا کہ کہیں مسلمان حکومتیں متحد ہو کر اس کے مقابلے میں نہ نکل آئیں، اب مطمئن ہو گیا اور دنیائے اسلام پر یلغار کے لیے پر تولنے لگا۔②

چنگیز خان کا تجارتی قافلہ:

چنگیز خان کی راہ میں حائل سب سے پہلا اسلامی ملک خوارزم تھا۔ چنگیزی سلطنت اور خوارزم کو برف پوش پہاڑوں کی تقریباً ایک ہزار کلومیٹر چوڑی زنجیر جدا کرتی تھی۔ ان فلک بوس پہاڑوں کو عبور کرنا آسان نہ تھا۔ نیز خوارزم کی عسکری قوت بھی کمزور نہ تھی، اس لیے چنگیز خان نے حملے سے قبل خوارزم کے محل وقوع، جغرافیائی حالات، عسکری وسائل اور دیگر تفصیلات کی فراہمی ضروری سمجھی۔ اس سے قبل چین پر حملے کے لیے بھی چنگیز خان نے یہی انداز اختیار کیا تھا۔ اس بار اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے تجارتی قافلوں سے کام لینے کا منصوبہ بنایا۔ ۶۱۵ھ بمطابق ۱۲۱۸ء

---

① روضۃ الصفا: ۵ / ۲۵...... ''صاحب روضۃ الصفا'' نے یہاں وزیر کا نام نقل نہیں کیا اور محض ''یکے از وزراء عرض داشت'' تحریر کیا ہے۔ مگر اندازہ یہ ہے کہ یہ مؤید الدین قمی تھا جو خلیفہ ناصر کا شیعہ وزیر تھا اور اُمورِ سلطنت پر پوری طرح مسلط تھا۔ غالباً اسی لیے علامہ ابن تیمیہ فرماتے تھے کہ چنگیز خان کو عالم اسلام پر حملے کی دعوت دینے والے روافض تھے۔ وَاعظم منہ عند ھذہ الطائفۃ التی کانت من اعظم الاسباب فی خروج جنکسخان إلی بلاد الإسلام. (العقود الدریۃ، ص ۲۰۱)

② روضۃ الصفا: ۵/ ۲۵

میں اس نے سفیر بھیج کر علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کو پیش کش کی کہ دونوں ملکوں کی فلاح و بہبود کے لیے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ علاؤ الدین نے اس پیش کش کو قبول کر کے سرحدیں تجارت کے لیے کھول دیں۔

کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ سرحدی شہر اترار کے حاکم غائر خان نے خوارزم شاہ کو اطلاع دی کہ منگولیا سے آنے والے تاجر دشمن کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں اور ایسا ایک قافلہ سرحد پر حراست میں لے لیا گیا ہے۔ خوارزم شاہ نے جواباً غائر خان کو اس سلسلے میں ہر اقدام کی اجازت دی۔ چنانچہ اہلِ قافلہ کو قتل کر کے ان کا مال و متاع ضبط کر لیا گیا۔[1]

قاصد کا قتل اور چنگیز خان کا غضب:

چنگیز خان کو اپنے قافلے کی ہلاکت کی اطلاع ملی تو اس نے نہایت غضبناک ہو کر سلطان علاؤ الدین محمد کو خط لکھا:

''اگر یہ سب کچھ اترار کے حاکم نے اپنی مرضی سے کیا ہے تو اسے ہمارے حوالے کر دو۔ اور اگر یہ تمہارے حکم سے ہوا ہے تو سراسر عہد شکنی ہے جس کا انجام بہت بُرا ہے۔ میں ایسا لشکر لاؤں گا جس کا مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔''[2]

غائر خان خوارزم شاہ کا ماموں تھا اور فوج کا بہت بڑا حصہ اسی کے قبیلے پر مشتمل تھا، اس لیے خوارزم شاہ کے لیے اسے چنگیز خان کے حوالے کرنا بہت ہی مشکل تھا۔[3] پھر چنگیز خان کے پیغام کے الفاظ ایسے تحکمانہ تھے کہ خوارزم شاہ کا دماغ کھول گیا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے چنگیز خان کے قاصد کا سر قلم کرا دیا اور اس کے ساتھیوں کی ڈاڑھیاں مونڈ کر انہیں اس پیغام کے ساتھ واپس بھیج دیا:

''میں خود تیرے مقابلے کے لیے آرہا ہوں، اگر تو دنیا کے آخری کونے میں چلا جائے تب بھی میں تجھے سزا دے کر رہوں گا اور تیرا وہی حشر کروں گا جو تیرے ساتھیوں کا کر چکا ہوں۔''

خوارزم شاہ کی جانب سے اس بدسلوکی پر چنگیز خان غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے اعلان کیا:

''آسمان پر دو سورج نہیں چمکتے، اس دنیا میں دو شہنشاہ نہیں ہوں گے۔''

اس کے بعد اس نے برق رفتار قاصد بھیج کر خوارزم شاہ کو ان الفاظ میں اعلان جنگ سنایا:

''تو نے جنگ پسند کی ہے، اب جو ہوگا سو ہوگا۔''[4]

پہلا معرکہ:

چنگیز خان کے حکم پر لشکرِ تاتار صحرائے گوبی کے جنوب مغربی حصے میں جمع ہو گیا اور موسم خزاں (رجب ۶۱۶ھ بمطابق ستمبر ۱۲۱۹ء) میں اس نے جھیل بیکال کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف سفر شروع کیا۔ چنگیز خان کی منصوبہ بندی ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ راہبر، مترجم، طبیب، اسلحہ ساز اور تاجروں کا روپ دھارے ہوئے جاسوس، آتشیں اسلحے اور منجنیقوں کے ماہر چینی بھی لشکر میں شامل تھے۔ آٹھ لاکھ سپاہیوں کا یہ لشکر ناقابلِ عبور برف پوش پہاڑوں، تنگ گھاٹیوں،

---

① تاریخ جهان کشا از عطاملک جوینی (م ۶۸۳ھ)، ص ۱۶۷ تا ۱۶۹، ط هرمس
② تاریخ گزیده از حمد الله مستوفی، ص ۴۹۳، ط ایران
③ الکامل فی التاریخ: سنة ۶۱۷ھ
④ الکامل فی التاریخ: سنة ۶۱۷ھ

یخ بستہ ندی نالوں اور دلدلوں سے گذر کر (تقریباً ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کی مسافت طے کر کے) آٹھ لاکھ جنگجوؤں کا یہ لشکر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں وسط ایشیا جانے والی ''شاہراہ پیلو'' واقع تھی۔ چنگیز خان نے یہاں لشکر کے دو حصے کیے: ایک حصہ اپنے بڑے بیٹے جوجی خان کی کمان میں دے کر اسے شاہراہ کے ذریعے خوارزم کی شمال مشرقی سرحدوں تک پہنچنے کا حکم دیا تا کہ وہ خوارزم شاہ کو اس طرف متوجہ رکھے۔ اس دوران چنگیز خان خود غیر معروف، سنسان اور دشوار گذار راستوں سے ہو کر ایک لمبا چکر کاٹتے ہوئے بخارا پر پشت سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔

جوجی خان ''شاہراہ پیلو'' پر تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے خوارزم کی شمال مشرقی سرحد کے قریب جا پہنچا۔ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ چنگیز خان کے متوقع حملے کی روک تھام کے لیے چار لاکھ سپاہیوں کے عظیم لشکر کے ساتھ سرحد کی طرف روانہ ہو چکا تھا، مگر اس کی پیش قدمی بڑی سست تھی، دار الحکومت اور گنج سے نکل کر وہ بخارا پہنچا۔ پھر سمرقند اور جند سے ہوتے ہوئے اس نے دریائے سیحوں کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ اسے معلوم ہوا کہ چنگیزی لشکر دریا کے پار کوہستان میں ہے جس کی چھاپہ مار ٹولیاں خوراک ورسد کے لیے نواحی دیہاتوں پر شب خون مار رہی ہیں۔

ہر چند کہ اس بھاری بھر کم لشکر کے ساتھ کوہساروں کی بھول بھلیوں میں داخل ہونا خطرناک تھا، مگر سلطان علاؤ الدین محمد نے سردارانِ لشکر کے منع کرنے کے باوجود آگے بڑھ کر حملہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس نے دریا عبور کر کے پُر پیچ گھاٹیوں اور درّوں میں پیش قدمی شروع کی۔ ایک دن سفر کر کے ایک تنگ وادی میں اس کا اور تاتاری فوج کا آمنا سامنا ہوا۔ ایک ہولناک جنگ شروع ہوئی جو در اصل وحشت ناک معرکہ آرائیوں کے ایک ایسے سلسلے کی پہلی کڑی تھی جس نے عالمِ اسلام کی نصف سے زائد آبادی کو موت کی نیند سلا دیا۔

اس غیر موزوں میدان میں خوارزمی فوجی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کے جوہر نہ دکھا سکے۔ تنگ وادی میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ان کی اکثر صفیں میدان کے تنگ ہونے کے باعث اگلی صفوں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنے سے عاجز تھیں۔

تاتاری سپاہی اپنے ہلکے پھلکے اسلحہ اور تیز رفتار نظامِ جنگ کی بدولت خوارزمی لشکر کو بُری طرح روندر ہے تھے کہ ایک موقع پر وہ خوارزم شاہ کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ اس کی جان بمشکل بچ سکی۔ [1] علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ کے بقول:

''فریقین اس طرح گتھم گتھا تھے کہ تلواریں سونتا مشکل تھا۔ وہ خنجروں اور چھریوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے۔ خون کی ندیاں اس طرح بہہ رہی تھیں کہ گھوڑے پھسل پھسل کر گرتے تھے۔'' [2]

تاتاریوں سے اس پہلی لڑائی میں کم از کم بیس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ خوارزم شاہ اور اس کے افسران کے اعصاب پر اس کا بہت بُرا اثر ہوا اور وہ تاتاریوں سے بُری طرح مرعوب ہو گئے۔ اس کے بعد خوارزم شاہ کسی میدان میں تاتاریوں سے لڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔ [3]

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۱۷ھ؛ تاریخ جہان کشا جوینی: ۱/۳۴۴ تا ۳۴۶، ط ہرمس؛ چنگیز خان از ہیرلڈ لیمب، ص ۱۰۲ تا ۱۰۵

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۱۷ھ ③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۱۷ھ؛ تاریخ جہان کشا جوینی: ۱/۳۴۷، ط ہرمس

خوارزم شاہ کا فرار:

خوارزم شاہ اپنے باقی ماندہ لشکر کے ساتھ سرحدی شہروں کو چھوڑ کر سمرقند آ گیا۔ اِدھر چنگیز خان کے حکم سے اس کے بیٹے دریائے سیحوں کے ساحلی شہروں پر حملہ آور ہو کر قتلِ عام کر رہے تھے۔ کھوپڑیوں کے مینار قائم ہو رہے تھے۔ دریا مسلمانوں کے لہو سے سرخ ہو رہا تھا۔ سرحدی شہر قوقند (خجند) میں دلیر خوارزمی حاکم تیمور ملک نے صرف ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ تاتاری حملہ آوروں کو کئی ماہ تک الجھائے رکھا۔ اس دوران علاؤ الدین خوارزم شاہ کے پاس اپنی افواج دوبارہ مرتب کرنے کا اچھا موقع تھا، مگر اس نے کچھ نہ کیا۔ اترار کے بہادر گورنر غائر خان نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کئی ماہ تک تاتاریوں کو اترار کی فصیلوں سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ آخر بھوک پیاس اور مسلسل زخموں نے محصورین کی کمر توڑ دی۔ قوقند کی طرح اترار کی آبادی کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ غائر خان کی آنکھوں اور کانوں میں پگھلی ہوئی چاندی ڈال کر اسے بدترین طریقے سے قتل کیا گیا کیوں کہ چنگیز خان کے قافلے کو اسی نے مروایا تھا۔ ①

اس دوران علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ نے حواس باختگی کے عالم میں ایک اور غلط فیصلہ کر ڈالا۔ اس نے اپنی باقی فوج کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اسے مختلف قلعوں اور شہروں کی فصیلوں کے دفاع پر مامور کر دیا۔ شہزادہ جلال الدین نے اس حکمتِ عملی کی شدید مخالفت کی مگر خوارزم شاہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب مسلمانوں کے پاس کوئی بڑی فوج نہ رہی تھی جس کے ذریعے وہ کسی میدان میں تاتاریوں کو منہ توڑ جواب دے سکتے۔ ②

سقوطِ بخارا:

تاتاری فوج کا وہ حصہ جو "جوجی خان" کی قیادت میں مشرق کی طرف سے بڑھتا آ رہا تھا، خوارزم شاہ اور اس کے امراء کو اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب رہا جنہیں اندازہ ہی نہ تھا کہ چنگیز خان لشکر کے بڑے حصے کے ساتھ ان کی پشت کی طرف سے آ رہا ہے۔ محرم ۶۱۷ھ بمطابق مارچ ۱۲۲۰ء میں چنگیز خان یکدم بخارا کی فصیلوں کے سامنے نمودار ہوا۔ اہلِ بخارا دم بخود رہ گئے۔ شہر کی محافظ فوج نے باہر نکل کر مقابلہ کی کوشش کی، مگر شکست کھائی۔ اہلِ شہر نے خوفزدہ ہو کر جان و مال کی امان کے وعدے پر شہر کے دروازے کھول دیئے۔ چنگیز خان سپاہیوں کے سیلاب کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ اس کا شاطر بیٹا تولی خان اس کے ہمراہ تھا۔ بخارا کی جامع مسجد "جامع الکبیر" کی دلکشی سے متاثر ہو کر اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور پوچھا: "یہ تمہارے بادشاہ کا محل ہے؟" لوگوں نے کہا: "نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔"

چنگیز خان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور مسجد میں داخل ہو کر اس منبر پر چڑھ گیا جہاں قرآن مجید کا ایک بڑا نسخہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اعلان کیا: "میری افواج کے لیے خوارک کا اور ان کے گھوڑوں کے لیے چارے کا فوری بندوبست کرو۔ اس مسجد جیسی وسیع عمارتیں اصطبل کے طور پر خالی کر دو۔"

---

① روضة الصفا: ۲۸،۲۷/۵ ؛ تاریخ جهان کشا جوینی: ۱/۷۰ا تا ۷۳ا، ۷۷ا تا ۷۹ا، ط هرمس

② سیرة جلال الدین، ص ۹۰، ۹۱، ط دار الفکر العربی قاهرة ؛ تاریخ جهان کشا جوینی: ۲۶۹/۱، ط هرمس

پھر اس نے عید گاہ میں عوام کو جمع کر کے کہا:

''اے بخارا والو! میں آسمان لازوال کا قہر ہوں۔ وہ آسمان لازوال کہ جس کی قدرت کائنات کے ہر گوشے میں ہے میں اس کا بھرپور وار ہوں۔ خوارزم شاہ نے سخت جرائم کا ارتکاب کیا ہے، میں اس لیے آیا ہوں تا کہ اسے اس کے جرائم کی سزا دے کر یونہی برباد کروں جیسا کہ میں نے دوسرے بادشاہوں کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔''

لرزہ براندام عوام نے اپنے غلّے کے گوداموں کے دروازے کھول دیے۔ تاتاریوں نے جامع مسجد سمیت تمام مساجد و مدارس میں گھوڑے باندھ دیے۔ علماء و فقہاء کو ان کی رکھوالی پر مجبور کیا گیا۔ الماریوں سے قرآن مجید نکال کر ان میں چارہ اور بھوسا بھر دیا گیا۔ مقدس اوراق کفار کے ناپاک پیروں تلے کچلے جا رہے تھے۔ تاتاری مساجد میں شراب کے جام پی رہے تھے اور بخارا کی رقاصائیں ان کی تلواروں کے اشاروں پر ان کے سامنے نغمہ سرا تھیں۔ مسلمان خون کے آنسو روتے ہوئے اپنے دین و مذہب کی پامالی کا یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ تاتاریوں کو لوٹ مار کی کھلی اجازت تھی۔ عفت مآب خواتین کی کھلم کھلا عصمت دری کی جا رہی تھی۔ امراء اور اکابر شہر سے ساری دولت چھین لی گئی اور مزید مال کی جستجو میں ان کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ چند دن یہ قیامت برپا رہی۔

پھر شہر کی تمام آبادی کو ایک کھلے میدان میں ہانک دیا گیا۔ عورتوں کو بالوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر ان کے شوہروں سے علیحدہ کیا گیا۔ نالہ و فریاد کی آوازیں آسمان تک بلند ہونے لگیں۔ باحیا اور سراپا غیرت خواتین وحشی بھیڑیوں کے پنجوں میں سسک رہی تھیں۔ قاضی صدر الدین خان رحمہ اللہ، امام زادہ رکن الدین رحمہ اللہ اور چند افراد یہ منظر نہ دیکھ سکے۔ وہ تڑپ کر اُٹھے اور تاتاری وحشیوں پر ٹوٹ پڑے، ان کی دیکھا دیکھی اور افراد نے بھی ہلہ بول دیا اور تاتاری سپاہیوں کے ہتھیار چھین کر انہیں واصل جہنم کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر تاتاریوں کا منظم لشکر جو میدان کو گھیرے ہوئے تھا، حرکت میں آیا۔ قتل عام کے لیے تلواریں بے نیام ہوئیں۔ شام تک لاکھوں کی آبادی میں سے یہاں لاشوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مقتولین کی کھوپڑیوں سے مینار قائم کر دیے گئے۔ شہر کو آگ لگا کر، روپوش ہو جانے والے افراد کی زندگی کے امکانات بھی ختم کر دیے گئے۔ بخارا کے جلتے ہوئے مکانات سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے سیاہ بادل آسمان پر اس طرح چھا گئے کہ دن کے وقت سورج کی روشنی معدوم ہو گئی۔

بہت سی نوجوان لڑکیوں اور ہنر مند افراد کو تاتاریوں نے زندہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ ان کو اپنے گھوڑوں کے ساتھ پیدل چلنے پر مجبور کر رہے تھے جب تھکن سے نڈھال ہو کر یہ مظلوم قیدی قدم اُٹھانے سے عاجز آجاتے تو تاتاری وحشی ان کو بے دریغ قتل کر کے آگے چل دیتے۔ ①

سلطان علاؤ الدین محمد سمرقند میں مقیم تھا۔ جب اسے بخارا پر چنگیز خان کے اچانک حملے کی خبر ملی تو اس نے گھبرا کر سمرقند سے کوچ کی تیاری کی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ مشرق کی طرف سے جوجی یلغار کر رہا ہے۔ جنوب مشرق سے چنگیز خان

① الکامل فی التاریخ سنۃ: ۶۱۷ھ؛ چنگیز خان از ھیرلڈ لیمب، ص ۱۱۰ تا ۱۱۶؛ تاریخ جہان کشا جوینی: ۱/۱۸۲ تا ۱۸۹، ط ہرمس

کا دوسرا سالار جبی نویان آگے بڑھ رہا ہے۔ اب چنگیز خان بخارا سے فارغ ہو کر خود مغرب کی طرف سے سمرقند پر حملہ آور ہوگا۔ اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ گھیرے میں آنے سے قبل ہی زیادہ سے زیادہ دور بھاگنے کی کوشش کرے۔

خوارزم شاہ کے خوف کا یہ عالم تھا کہ سمرقند کے شہر پناہ سے نکلتے ہوئے اس نے خندق کی طرف دیکھ کر کہا:

''ہم پر حملہ آور تاتاری تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ اگر وہ اپنے چابک اس خندق میں ڈالیں تو خندق لبالب بھر جائے۔''

مایوس وشکستہ دل خوارزم شاہ اپنے پیچھے رہ جانے والے افسران کو بھی خوفزدہ کرتے ہوئے سمرقند کے جنوب میں خراسان (موجودہ افغانستان) کی طرف فرار ہوگیا۔ [1]

سقوطِ سمرقند:

سقوطِ بخارا کے بعد ربیع الاوّل ۶۱۷ھ رمئی ۱۲۲۰ء میں تاتاری لشکر کے تینوں بڑے حصے ملک کی تین سرحدوں سے یلغار کرتے ہوئے سمرقند میں مجتمع ہوگئے۔ محصور مسلمانوں نے تین دن تک دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، مگر آخری دن ہولناک جنگ کے دوران ایک غدار امیر برشاش خان اپنے تیس ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر چنگیز خان سے جاملا۔ مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ فوج کی شکست کے بعد تاتاری شہر میں داخل ہوگئے۔

سمرقند کی فصیل جو اپنی بلندی وسنگینی میں عجائبات زمانہ میں سے شمار ہوتی تھی، مسمار کردی گئی تاکہ آئندہ یہاں کسی مورچہ بندی کا امکان نہ رہے۔ اس کے بعد اہل شہر کا قتل عام شروع ہوا اور تاتاریوں نے مسلمانوں کی لاشوں سے شہر کے گلی کوچوں کو پُر کردیا۔

چندروز تک چنگیز خان نے غدار برشاش خان اور اس کے ساتھیوں کی خوب خاطر تواضع کی اور پھر ایک دن جب یہ ملت فروش گہری نیند سو رہے تھے تاتاری فوج نے ان کی تکابوٹی کردی۔ چنگیز خان دشمن کے غداروں سے کام ضرور لیتا تھا مگر ان پر اعتماد کرنے کا قائل نہ تھا۔ [2]

مسلمانانِ خوارزم کی ہجرت:

خوارزمی فوج کی مسلسل شکستوں اور تاتاریوں کی بے روک ٹوک پیش قدمی سے عوام بے حد خوفزدہ تھے۔ چنانچہ بے شمار لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے پڑوسی مسلم ممالک کی طرف روانہ ہوگئے مگر تاتاری جگہ جگہ گشت کررہے تھے، اس لیے مہاجرین کی خاصی تعداد ان کے ہاتھوں قتل ہوگئی اور بے شمار لوگ بھوک پیاس اور سفر کے مصائب سے راستے ہی میں دم توڑ گئے۔ اس کے باوجود ہزاروں افراد ہندوستان، شام اور ایشیائے کوچک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جن میں قاضی منہاج السراج جیسے علماء ومشائخ بھی تھے۔ اس کے علاوہ ساداتِ کرام کے بہت سے خاندان اسی زمانے

---

[1] تاریخ جہان کشا جوینی: ۲ر۳۴۸، ط ہرمس؛ روضۃ الصفا: ۴ر۸۲۴

[2] روضۃ الصفا: ۵ر۲۹ تا ۳۰؛ تاریخ جہان کشا جوینی: ۲ر۱۹۶ تا ۲۰۲، ط ہرمس

میں ہجرت کر کے ہندوستان اور دیگر ممالک میں آباد ہوئے۔ ان کی نسلیں آج بھی ان علاقوں میں آباد ہیں۔ [1]

علاؤالدین خوارزم شاہ کی موت:

خوارزم شاہ تاتاریوں کے خوف سے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف فرار ہوتا رہا۔ اس کے بزدل مشیر اور خائن وزراء اسے ترکِ جہاد کا درس دے رہے تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ درباری نجومیوں نے جن پر خوارزم شاہ اعتماد کرتا تھا، یہ کہہ دیا تھا: ''آپ کا ستارہ گردش میں ہے، آپ کو کچھ عرصہ تک دُشمن کے مقابلے میں نہ آنا چاہئے۔''

ان باتوں سے متاثر ہو کر خوارزم شاہ کسی میدان میں دُشمن کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ چنگیز خان نے اپنے بہترین سوار دستے اس کے تعاقب میں روانہ کر دیے تھے۔ خوارزم شاہ اپنے خاندان کی خواتین کو ماژندران کے سنگین و فلک بوس قلعوں میں چھوڑ کر خود چند ہمراہیوں اور شہزادوں سمیت تاتاریوں کے آگے آگے بھاگتا ہوا اپنی مملکت کی آخری حدود سے بھی باہر نکل کر بحیرہ کیسپین (خزر) کے کنارے جا پہنچا۔ [2] ایک کشتی میں بیٹھ کر وہ سمندر کے کسی جزیرے میں پناہ لینے روانہ ہوا۔ راستے میں وہ شدتِ غم سے اپنا سر کشتی کے تختوں سے ٹکراتا اور کہتا تھا:

''سبحان اللہ! اپنی عظیم مملکت میں سے دو گز زمین بھی ہمارے پاس نہ رہی، جس میں ہم دفن ہو سکتے۔'' [3]

ایک جزیرے میں پہنچ کر کچھ عرصہ خوارزم شاہ بیماری اور بے وطنی کے مصائب جھیلتا رہا۔ اسی دوران اسے خبر ملی کہ تاتاریوں نے ماژندران کے قلعوں پر قبضہ کر کے اس کی ماں، ترکان خاتون، بیگمات اور شہزادیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس خبر سے خوارزم شاہ کے اعصاب شل ہو گئے اور وہ صدمے کی تاب نہ لا کر دنیا سے کوچ کر گیا۔ [4]

اس کی موت اس کسمپرسی کے عالم ہوئی کہ اسے کفن کا کپڑا بھی میسر نہ آیا۔ اس کے اپنے کرتے اور ایک خادم کے عمامے میں لپیٹ کر اس کی تجہیز و تکفین کی گئی۔ [5]

جس موت سے وہ بچنا چاہتا تھا وہ سمندر کی وسعتوں میں بھی آ کر رہی۔ اگر خوارزم شاہ فرار ہونے کے بجائے ڈٹ کر مقابلہ کرتا تو دو کامیابیوں: فتح یا شہادت میں سے ایک ضرور پا لیتا، مگر جہاد کا راستہ ترک کر کے وہ خود بھی تباہ ہوا اور ملک و قوم کو بھی ہلاکت کے غار میں دھکیل دیا۔

مقامِ عبرت اور تباہی کے ذمہ داران:

اگرچہ اس عالمگیر تباہی کے اسباب و علل میں علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی خطرناک سیاسی و عسکری غلطیوں کا بڑا دخل ہے مگر اس معاملے پر غور و خوض میں وسعت نظری سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فردِ واحد کو اتنے بڑے پیمانے

---

[1] طبقاتِ ناصری: ۲/۱۳۴، ۱۳۵، ط کابل؛ مغربی پنجاب کے شہر جلال پور جٹاں (ضلع گجرات) کے قریب "مدینہ" نامی ایک گاؤں میں خوارزمی سادات آج بھی آباد ہیں۔ عجب نہیں کہ سلطان جلال الدین کے قدم بھی یہاں پڑے ہوں۔

[2] تاریخ جہان کشا جوینی: ۲/۴۵۶ تا ۴۵۸، ط ہرمس؛ تاریخ الاسلام للذھبی، وفیات سنۃ: ۶۱۷ھ

[3] تاریخ الاسلام للذھبی، سنۃ وفیات: ۶۱۷ھ

[4] تاریخ جہان کشا جوینی: ۲/۴۵۸، ۴۵۹، ط ہرمس

[5] تاریخ الاسلام للذھبی، وفیات سنۃ: ۶۱۷ھ

پر مسلم قوم کی خون ریزی کا ذمہ دار قرار دینا کافی نہیں ہے۔ علاؤ الدین محمد تن تنہا اس تمام تر تباہی کا مجرم نہیں تھا بلکہ اس کے غدار امراء اور وزراء بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے اور وہ مسلم ہمسایہ ممالک بھی اس میں پورے پورے حصہ دار تھے جو اس قتل عام پر ٹس سے مس تک نہیں ہوئے اور مظلوموں کی حمایت میں کوئی عملی اقدام کرنے سے گریزاں رہے۔ خاص کر خلیفہ ناصر کی مجرمانہ حیثیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے روحانی باپ کی حیثیت رکھنے کے باوجود چنگیز خان کو خوارزم پر حملے کی دعوت دی اور مسند خلافت پر بیٹھ کر اس ''گھر پھونک تماشے'' سے لطف اُٹھایا۔

اس کے ساتھ ساتھ خود مسلم عوام کو بھی اس تباہی کی ذمہ داری سے مکمل طور پر بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا جن کی بداعمالیوں کے باعث یہ قہر خداوندی ان پر ٹوٹا۔ دنیا سے محبت، عیش وعشرت میں انہماک اور فنون حرب سے روز افزوں بے التفاتی کے سبب وہ سست اور تن آسان بن گئے تھے۔ راگ رنگ اور شعر وشاعری کے شغف نے نوجوانوں کو نرم اندام بنادیا تھا، فنونِ لطیفہ کا ذوق پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ بزدلی اور بے فکری عام ہوگئی تھی۔ عوام کو اگر شمشیر زنی یا تیر اندازی سے کوئی دلچسپی تھی بھی تو وہ صرف کھیل کود کی حد تک۔ مسلمان جفاکشی کا درس دینے والی اسلامی معاشرت کی جگہ نازک مزاج عجمی تمدن اپنا چکے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آرام پسند مسلمان سخت کوش تاتاریوں کے سامنے ڈھیر ہوتے چلے گئے اور کوئی ان کے سامنے قدم جمانے کی جرأت نہ کرسکا۔

درحقیقت سلطان علاؤ الدین محمد ایک ایسے سفینے کا نالائق ملاح تھا جس کے مسافر اسے ڈبونے کا تہیہ کرچکے تھے۔ جب کوئی قوم اجتماعی کمزوریوں، ناقابلِ برداشت کوتاہیوں اور عمومی جرائم کے باعث خودکشی کے گڑھے کی طرف بڑھ رہی ہو، قوم کا روحانی پیشوا (خلیفہ) بھی اسے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہو اور قوم کے حکمرانوں سے بھی مسلسل سنگین غلطیاں صادر ہونے لگیں تو اس قوم کی بربادی میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔ ایسی قوم کو بچانے کے تمام حربے اور منصوبے ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ صدیوں قبل پیش آنے والی یہ عبرتناک تباہی آج کے تن آسان مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے۔ اگر ہم اپنی غفلتوں سے باز نہ آئے تو ہمارا حشر بھی مختلف نہیں ہوسکتا۔

مغربی تاتاری:

علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کے تعاقب میں جانے والی تاتاری فوج ایران کے طول وعرض میں زبردست تباہی مچاتی ہوئی بحیرہ خزر تک پہنچ گئی تھی۔ اس تباہ کن لشکر نے اس طوفانی یلغار میں کسی جگہ قیام نہیں کیا، بلکہ سیلاب کی طرح ایک سمت سے داخل ہوکر دوسری سمت سے نکل گیا۔ خوارزم شاہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ان جنگجوؤں نے ماژندران کے قلعے فتح کرکے شاہی حرم اور خزانے پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ اس مہم سے فارغ ہوکر یہ فوج واپس ہونے کے بجائے اسی رفتار سے بحیرہ خزر کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف بڑھتی گئی۔ سوبدائی اور جبی نویان اب بھی اس لشکر کے قائد تھے۔ گرجستان کے جنگجو قبائل کو زیر وزبر کرتے ہوئے یہ سریع الحرکت لشکر بحیرہ خزر کے دوسری جانب شمال میں پہنچ گیا۔

چونکہ جبی نویان اور سوبدائی کی کمان میں ان تاتاریوں نے عالم اسلام کے مغرب کی طرف پیش قدمی کی تھی، اس لیے عرب مؤرخین ان کو التتر المغربیہ (مغربی تاتاری) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ [1]

تاتاریوں کی رُوس اور یورپ میں مزید پیش قدمی:

یلغار کے دوسرے سال مغربی تاتاریوں نے شمال کی جانب مزید پیش قدمی کی اور بحیرۂ خزر کے شمال میں واقع گھاس بھرے میدانوں میں ''لان'' اور ''قبچاق'' (موجودہ یوکرائن) کے قبائل کو روند کر رکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے رُوس کی طرف یلغار کی۔ رُوسی حکمرانوں نے تاتاریوں کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک عظیم متحدہ فوج ترتیب دی اور قبچاق کے زخم خوردہ جنگجوؤں کو ساتھ ملا کر دریائے نیپر کے ساتھ ساتھ تاتاریوں سے ٹکرانے کے لیے آگے بڑھے۔ تاتاری حملہ آور، رُوسی بادشاہوں اور قبچاقیوں کی اس متحدہ فوج کے سیلاب کے سامنے ایک چال کے تحت پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ نو دن تک یہ پسپائی جاری رہی۔ آخر ایک مناسب مقام پر تاتاریوں نے پلٹ کر حملہ کیا اور رُوسی فوج کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اس کے بعد تاتاری ''جنیوا'' میں داخل ہو گئے اور وہاں قتل و غارت کر کے ''دریائے وولگا'' کی طرف بڑھے، یہاں دریا کے ساحل پر آباد ''بلغار'' کے شہری ان سے نہ بچ سکے اور تاتاریوں نے ان کو جی بھر کر پامال کیا۔

اسی دوران جبی نویان مر گیا، مگر سوبدائی کا جنونِ غارت گری کم نہ ہوا۔ وہ دریائے نیپر عبور کر کے ماسکو اور دیگر یورپی ممالک پر ہاتھ صاف کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ [2]

تباہی در تباہی:

تاتاری لشکر کی پیش قدمی جاری رہی۔ سمرقند و بخارا کا جاں گداز افسانہ ہر جگہ دہرایا گیا۔ ایک ایک شہر میں مقتولین کی تعداد لاکھوں کے حساب سے ہوتی تھی۔ ''رے'' میں سات لاکھ، مرو میں تیرہ لاکھ، نیشاپور میں پندرہ لاکھ اور ہرات میں سولہ لاکھ افراد شہید کیے گئے۔ [3] ان مظالم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے قلم لرزتا اور دل کانپتا ہے۔

اس جانکاہ حادثہ میں اُمت مرحومہ اپنی شش صد سالہ قدیم ساری جمع پونجی کھو بیٹھی۔ مساجد، مدارس، کتب خانے اور خانقاہیں سب کچھ بے نام و نشان ہو گیا۔ مایہ ناز فقہاء، محدثین، صوفیاء، دانشور، ادیب، نامور بادشاہ، شہزادے، سپہ سالار اور مجاہدر ہنما غارتگری کے اس طوفان میں بہہ گئے۔ لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ انسانوں کے معدوم ہو جانے سے نسلوں کی نسلیں ختم ہو گئیں۔ قبائل کے قبائل فنا ہو گئے۔ چند برس میں عالمِ اسلام کا نقشہ اس طرح بدل گیا کہ جس کا تصور ممکن نہیں تھا۔ تاریخ کے سینکڑوں ہلاکت خیز صدمات کا تذکرہ، صبر و تحمل سے کرنے والے مؤرخ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ یہاں درد سے بے قابو ہو کر اشکِ خون آمیز بہاتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۱۷ھ

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۱۷ھ؛ چنگیز خان، ہیرلڈ لیمب، ص ۱۴۴

③ روضۃ الصفا، تاریخ جہان کشا جوینی اور الکامل فی التاریخ میں ان علاقوں کی جنگوں کے ذیل میں یہ تعداد دیکھی جا سکتی ہے۔

''اس حادثے کی ہولناکی اور دہشت انگیزی کے باعث میں کئی سال تک اس کے تذکرے سے احتراز کرتا رہا، اب بھی پس وپیش میں ہوں ...... ہاں! بھلا اسلام اور مسلمانوں کی موت کا اعلان کرنا کس کے لیے ممکن ہے؟ کون ہے جو اسے احاطۂ تحریر میں لانے کا حوصلہ کرسکے؟ اے کاش! میری ماں مجھے نہ جنتی، کاش کہ: میں اس سانحے سے قبل ہی مرگیا ہوتا، بھولا بسرا ہو چکا ہوتا، ...... مگر کچھ دوستوں نے مجھے یہ لکھنے پر آمادہ کیا، حالانکہ میں متذبذب تھا، پھر میں نے سوچا کہ نہ لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں، اب میں بتاتا ہوں کہ یہ ایسا حادثۂ عظمیٰ اور مصیبتِ کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ گزشتہ دن اور رات اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں...... اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آج تک ایسی مصیبت نازل نہیں ہوئی تو وہ یقیناً سچا ہوگا کیوں کہ تاریخ میں اس واقعہ کے قریب تو کجا اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں ملتا...... شاید دنیا والے یاجوج ماجوج کی تباہ کاری کے سوا قیامت تک اس جیسا حادثہ پھر نہ دیکھیں گے۔''[1]

نیز وہ آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:

''تاتاری چین کی حدود سے نکل کر ایک سال پورا ہونے سے پہلے پہلے ایک سمت میں آرمینیا کو عبور کر رہے ہیں اور عراق میں ہمدان سے بھی آگے ان کی پیش قدمی جاری ہے۔

اللہ کی قسم! مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ دراز کے بعد آنے والے لوگ جب اس حادثے کے تحریر شدہ حالات پڑھیں گے تو ان کو جھوٹا اور بعید از قیاس تصور کریں گے۔ وہ (ان واقعات کو مبالغہ آرائی سمجھنے میں معذور اور) حق بجانب ہوں گے، مگر جب وہ ایسا گمان کریں تو اس تحریر پر نظر ڈال لیں کہ ہم پہلے اس خدشے کا اظہار کر چکے اور اسے لکھ چکے ہیں۔''[2]

ایک مغربی مؤرخ لکھتا ہے:

''اس قتلِ عام نے عالمِ اسلام کے قلب کو ایک طرح کا چٹیل میدان بنا دیا...... ایک مرتبہ سے زائد ایسا ہوا کہ جہاں کوئی شہر آباد تھا (قتلِ عام کے بعد) وہاں ہل چلا کر غلّہ کاشت کیا گیا۔''[3]

عالمِ اسلام کے گنجان ترین شہروں میں مسلمانوں کے اس قتلِ عام پر آس پاس کی مسلم حکومتیں خاموش تماشائی بنی رہیں۔ خوارزمی افواج کی مسلسل شکستوں اور عامۃ المسلمین کے لہو کی ارزانی دیکھ کر بھی ان میں سے کسی نے اپنے اوپر جہاد فرض نہ سمجھا۔ ان مظلوموں کی اعانت کے لیے کسی پڑوسی کو اسلامی غیرت کے ناتے تلوار اُٹھانے کی ہمت نہ ہوسکی۔

خلیفہ ناصر جس نے خود چنگیز خان کو اس قتلِ عام کی دعوت دی تھی جی ہی جی میں اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ خلیفہ کا ایک وزیر سمرقند و بخارا کے مظالم کی روداد سن کر خلیفہ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

---

① الکامل فی التاریخ: ۱۰/ ۳۳۳،ط دار الکتاب العربی

② الکامل فی التاریخ: ۱۰/ ۳۳۶، ۳۳۷،ط دار الکتاب العربی

③ چنگیز خان از ہیرلڈلیمب، ص ۱۳۲

''ہائے ہمارے آقا!! تاتاریوں نے اسلامی شہروں پر قبضہ کر لیا ہے اور مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے۔''

خلیفہ نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی اور کہا:

''چھوڑو اس بات کو! میں اس سے زیادہ اہم مسئلے میں اُلجھا ہوا ہوں۔ وہ میری چتکبری چڑیا کہاں گئی؟ تین دن ہو گئے میں نے اسے نہیں دیکھا۔''[1]

اس سے بڑھ کر بے حسی کی بھلا کوئی مثال مل سکتی ہے؟

شیخ نجم الدین رازی رحمہ اللہ (م ۶۴۵ھ) جو اس زمانے کے ایک عظیم صوفی بزرگ اور ان مظالم کے عینی گواہ ہیں، اپنی تصنیف ''مرصاد العباد'' کے مقدمہ میں مسلم بادشاہوں کی بے حسی اور بے ہمتی پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ان ملعون اور ذلیل تاتاریوں نے اسلام اور مسلمانوں کو جس فتنے اور خرابی میں مبتلا کیا ہے اسے لفظوں میں سمونا ممکن نہیں اور اس حادثے کی دنیا بھر میں اس قدر شہرت ہو چکی ہے کہ تشریح کی ضرورت بھی نہیں۔ ہمارے بادشاہوں اور حکمرانوں پر اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے، اس لیے کہ:

''اَلْاَمِیْرُ رَاعٍ عَلٰی رَعِیَّتِہٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْھُم.''

(حاکم اپنی رعایا کا نگران ہے اور اس سے ان کے حقوق کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔)

اللہ نہ کرے اگر اب بھی ان کے دلوں میں اسلامی غیرت اور حمیت کا جذبہ بیدار نہ ہوا اور وہ دینی ولولے سے دلیری سے عاری رہے، اگر اب بھی سب مل کر مستحکم جمعیت نہ بنے، اگر اب بھی اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّجَاھِدُوْا بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے حکم کی تعمیل کے لیے کمربستہ نہ ہوئے، اپنی جان، مال اور بادشاہت کو اس فتنے کے تدارک کے لیے قربان نہ کیا تو اس بات کے آثار نظر آ رہے ہیں کہ اسلام کا وجود بالکل ختم ہو جائے اور اکثر ممالک پر حاوی یہ فتنہ باقی ماندہ دنیائے اسلام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے اور ساری دنیا کفر سے بھر جائے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِن ذٰلِکَ''[2]

تاتاریوں کی دہشت:

تاتاریوں کی غارت گری کے باعث عالمِ اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دہشت کا ایک عجیب عالم طاری تھا۔ تاتاریوں سے لڑنا ناممکن سمجھا جانے لگا تھا۔

عالمِ اسلام کے عظیم مفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''تاتاری یورش عالمِ اسلام کے لیے ایک بلائے عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں۔ مسلمان مبہوت و ششدر تھے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا۔ تاتاریوں کو ایک

---

① النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهره لجمال الدین یوسف بن تغری بردی: ۲۶۲/۶ ط دار الکتب مصر

② مرصاد العباد من المبدأ الی المعاد (فارسی)، ص ۱۰،۹ . قلمی نسخه (کتب خانه آستانه ،قم ،ایران)

بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا۔ ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابلِ قیاس سمجھی جاتی تھی یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا:

"اِذَا قِیْلَ لَکَ اِنَّ التَّتَرَ انْهَزَمُوْا فَلَا تُصَدِّقْ."

(اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو کہیں شکست ہوئی ہے تو یقین نہ کرنا۔)"[1]

شام کے حاکم الملک الاشرف کی مجلس میں تاتاریوں سے نمٹنے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، تو اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا: "میں ایسی قوم کے بارے میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں جس کا کوئی فرد آج تک زندہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ گھیرے میں آکر بھی وہ ہتھیار نہیں ڈالتے، لڑتے لڑتے مرجاتے ہیں یا بچ نکلتے ہیں۔"

مشہور تھا کہ "لَا یُقَالُ کَمْ قُتِلَ مِنْ بَلَدِ کَذَا، وَاِنَّمَا یُقَالُ کَمْ بَقِیَ."

(یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس شہر میں کتنے افراد قتل ہوئے، یہ کہنا چاہیے کہ کتنے زندہ بچے۔)

مؤرخین کہتے تھے کہ مقتولین کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے کیوں کہ لاشیں گننے والے گن گن کر جب تھک جاتے تھے تو اس سے کئی گنا زیادہ لاشیں مزید نظر آجاتی تھیں۔ مسلمان دم بخود اور متحیر تھے۔ حکام کی کم ہمتی کے باعث سب کے حوصلے پست ہوگئے تھے۔ تاتاریوں کی تخریب کاری محض خون ریزی کی حد تک ہی نہیں تھی بلکہ وہ سچ مچ خون آشام تھے۔ اس دور کے ایک فلسفی موفق عبداللطیف بغدادی شام گئے تو حلب میں انہیں ایک مصیبت زدہ مگر دلیر عورت ملی جسے تاتاریوں نے اس کے شوہر اور بچے سمیت گرفتار کرلیا تھا۔ اس عورت نے انہیں اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے بتایا کہ ایک تاتاری نے ہمارے سامنے ہمارے بیٹے کو ذبح کیا اور اس کا خون پی گیا۔ بعد میں وہ سو گیا تو میں نے اسے قتل کردیا اور اپنے شوہر کے ساتھ بھاگ نکلی۔[2] لوگوں کی حالت یہ تھی کہ خوف اور بدحواسی کی وجہ سے ان کے دماغ ماؤف ہوگئے تھے۔ اپنی جان بچانے کے سوا انہیں کوئی اور چیز سوجھتی ہی نہیں تھی۔ موفق بغدادی لکھتے ہیں:

"مجھے واسط کا ایک تاجر ملا، وہ تاتاریوں سے بچ کر پہاڑ میں جا چھپا تھا اور کئی دنوں بعد باہر نکلا تھا، اس نے بتایا کہ زمین لاشوں سے پٹی پڑی تھی، مویشیوں کے ریوڑ اور مال و اسباب کے ڈھیر بکھرے پڑے تھے، ہم دس افراد زندہ بچ گئے تھے۔ اگر ہماری عقلیں ٹھکانے ہوتیں تو اتنا کچھ جمع کرلیتے کہ تمام آرزوئیں پوری ہوجاتیں۔ مگر ہمیں اور کچھ سمجھ نہ آیا، بس ایک اونٹ پر زیادہ سے زیادہ آٹا لاد کر بھاگ نکلے۔"[3]

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ ان شہروں میں قتل عام کی دل خراش داستان لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایک تاتاری عورت ایک گھر میں داخل ہوئی اور اہل خانہ کو یکے بعد دیگرے قتل کرتی چلی گئی۔ لوگ اسے

---

① تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/۳۱۵۔ اس سے مشابہ جملہ علامہ ابن اثیر نے یوں نقل کیا ہے: "اِنْ قِیْلَ اِنَّ التَّتَرَ یَقْتُلُوْنَ فَصَدِّقُوْا، وَاِنْ قِیْلَ اِنَّهُمْ انْهَزَمُوْا فَلَا تُصَدِّقُوْا." "اگر کہا جائے کہ تاتاری قتل کر رہے ہیں تو مان لینا، اگر کہا جائے کہ وہ شکست کھاگئے تو مت ماننا۔" (الکامل فی التاریخ: ۱۰/۳۵۸)

② تاریخ الاسلام للذھبی: سنۃ ۶۱۷ھ

③ بحوالہ بالا

تاتاری سپاہی سمجھ رہے تھے (اس لیے ہاتھ اُٹھانے کی ہمت نہ کر سکے) آخر جب اس نے قتل کی کارروائی سے فارغ ہو کر اپنے ہتھیار اُتارے تو ایک مرد نے اسے پہچان لیا (کہ یہ عورت ہے) اور اسے مار ڈالا۔"

نیز وہ لکھتے ہیں:

"ایک تاتاری سپاہی تنہا ایک گلی میں گھسا جس میں سو آدمی تھے۔ تاتاری یکے بعد دیگرے ان سب کو قتل کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان سو میں سے ایک فرد بھی نہ بچا، کسی کو اس پر ہاتھ اُٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ لوگوں پر پست ہمتی طاری تھی۔ وہ اپنا دفاع ہی نہیں کرتے تھے چاہے وہ کم ہوں یا زیادہ۔ ایسی ذلت سے اللہ کی پناہ۔"①

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ بڑے دردمندانہ انداز میں تحریر کرتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور اسلام کو کوئی ایسا شخص میسر کر دے جو ان کی حفاظت اور مدافعت کر سکے۔ بلاشبہ مسلمانوں کو جس دُشمن نے پالا پڑا ہے وہ بڑا طاقتور ہے اور جو بادشاہ ان کو میسر آتے ہیں ان کی توجہ اپنی شہوتوں اور شکم سیری کے سوا کسی چیز کی طرف نہیں۔"②

خلیفہ کی حکمتِ عملی:

تاتاریوں کے لیے اب بغداد پر حملے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ یہ صورتحال خلیفہ ناصر سے بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔

---

① الکامل فی التاریخ: ۳۴۸/۱۰، ط دار الکتاب العربی

② الکامل فی التاریخ: ۳۴۷/۱۰، ط دار الکتاب العربی

تاتاریوں کے ہاتھوں جانی اتلاف کا ایک تخمینہ: اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تاتاریوں نے ۶۱۶ھ سے ۶۵۸ھ تک جاری اپنی ۴۲ سالہ یلغار میں لگ بھگ پونے دو کروڑ مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ جن شہروں میں تاتاریوں نے قتلِ عام کیا تھا، ان میں کچھ بڑے تھے اور کچھ چھوٹے۔ ۱۲ بڑے شہر یہ تھے: بخارا، سمرقند، اورگنج، نیشاپور، بلخ، رے، ہمدان، نسا، ہرات، بغداد، اربل، غزنی۔ (ان میں لاہور، ملتان، شاہ پور (سرگودھا)، اصفہان، حلب اور دمشق سمیت وہ تمام شہر شامل نہیں جہاں مکمل قتلِ عام نہیں ہوا تھا بلکہ امان دے دی گئی تھی یا جزوی قتل و غارت ہوئی تھی۔) بارہ میں سے درج ذیل چھ شہروں کے مقتولین کے اعداد و شمار دستیاب ہیں:

"رے" میں سات لاکھ۔ اورگنج میں بارہ لاکھ۔ مرو میں تیرہ لاکھ۔ نیشاپور میں پندرہ لاکھ۔ ہرات میں سولہ لاکھ۔ بغداد میں اٹھارہ لاکھ۔ (بلخ کے شہداء میں سے فقط سادات اور علماء و مشائخ کی تعداد دستیاب ہے جو پچاس ہزار ہے۔)

۲۵ چھوٹے شہر یہ تھے: اترار، جند، قوقند، ترمذ، فاریاب، میمنہ، اندخوئی، جوزجان، بادغیس، زابل، طالقان، بامیان، سیستان، قزوین، خلاط، دقوقا، طنزہ، خابور، بیلقان، سراؤ، ماردین، میافارقین، آمد، اسعرد، اردبیل۔ ان میں سے فقط قزوین کے شہداء کی تعداد منقول ہے جو ۴۰ ہزار ہے۔ (مکران اور خضدار سمیت بہت سے چھوٹے شہر جہاں مکمل قتلِ عام نہیں ہوا، یہاں شامل نہیں کیے گئے۔) ان کے علاوہ تولک، سبزدو، فیروزکوہ، کالیون، اشیار، فیوار جیسے بیسیوں قلعے بھی تھے جہاں مکمل یا جزوی قتلِ عام ہوا مگر ان میں سے کسی کے مقتولین کے اعداد و شمار دستیاب نہیں۔ دیہی علاقوں میں بھی بہت لوگ قتل کیے گئے، ان کے اعداد و شمار بھی دستیاب نہیں مگر بعض مؤرخین کی عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ملک کے دیہاتی علاقوں کے مقتولین مجموعی طور پر کئی کئی لاکھ تک پہنچ جاتے تھے۔ (یکجا حوالوں اور تفصیلات کے لیے دیکھیے راقم کی کاوش: شیرِ خوارزم سلطان جلال الدین اور تاتاری یلغار۔ اصل مآخذ کے لیے دیکھیے: الکامل فی التاریخ، تاریخ جہان کشا جوینی، تاریخ حبیب السیر، روضۃ الصفا، جامع التواریخ، تاریخ گزیدہ، تاریخ وصاف)

ہمیں بارہ بڑے شہروں میں سے چھ کے اعداد و شمار ملے ہیں جن کے مطابق شہداء کی مجموعی تعداد اندازاً اکیاسی (۸۱) لاکھ بنتی ہے۔ یوں ہر شہر کے مقتولین کی اوسط تعداد ۱۳ لاکھ ۵۰ ہزار نکلتی ہے۔ اس کے مطابق بارہ بڑے شہروں کے مجموعی شہداء اندازاً ایک کروڑ ۶۲ لاکھ بنیں گے۔ اس کے ساتھ ۲۵ چھوٹے شہروں کو ہم ۲۰ ہزار کی اوسط کے ساتھ دیکھیں تو پانچ لاکھ تعداد بنتی ہے۔ چھوٹے اور بڑے شہروں کے مقتولین کا یہ تخمینہ ایک کروڑ ۶۷ لاکھ تک پہنچ جاتا ہے۔ میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے سپاہی اور رضاکار اس کے علاوہ ہیں۔ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان ۴۲ سالوں میں لگ بھگ پانچ لاکھ مسلمان مختلف معرکوں میں ضرور شہید ہوئے ہوں گے۔ یوں یہ تعداد ایک کروڑ ۷۲ لاکھ بیس ہزار تک چلی جاتی ہے۔ اور اگر دیہاتوں کے مقتولین کو شامل کریں تو تعداد دو کروڑ سے بھی متجاوز ہو سکتی ہے۔

تھی۔ اس نے حاکمِ اربیل کو کہہ کر ''دربندات'' کی گھاٹیوں پر چھاپہ مار جنگ کے ماہر گُردوں کے پہرے لگوا دیے۔ اس کے ساتھ ساتھ خلیفہ نے نفسیاتی رُعب ڈال کر تاتاریوں کو عراق میں گھسنے سے روکنے کی تدبیر اپنائی۔

جب تاتاری فوج عراق کی سرحد پر پہنچی تو ان کا نمائندہ حسبِ معمول اطاعت کی ترغیب دینے کے لیے روانہ ہوا۔ خلیفہ نے یہ خبر سن کر بغداد اور اس کے مضافات میں منادی کرا کے بے شمار دیہاتیوں اور شہریوں کو جمع کر لیا اور انہیں اسلحے اور وردیوں سے آراستہ کر دیا۔ اب دیکھنے میں یہ بہت بڑی فوج معلوم ہوتی تھی۔ خلیفہ نے اس فوج کے ایک حصے کو اربل اور دوسرے کو دقوقا بھیج دیا۔ وہاں کے حکام کو تاکید کی گئی کہ جب تاتاری سفیر ملنے آئے تو کھلے میدان میں ایک تقریب منعقد کی جائے جس میں اپنی فوج کو اس مصنوعی فوج کے ساتھ ملا کر سفیر کو مرعوب کیا جائے۔

جب تاتاری سفیر اربل کے باہر پہنچا تو میلوں تک پھیلے ہوئے اس لشکر کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سفیر کو فوج کی صفوں کے درمیان سے گزارا گیا۔ اس دوران یہ چالاکی بھی کی گئی کہ سفیر جن دستوں کا معاینہ کر کے آگے بڑھ جاتا تو وہ دستے اپنی جگہ چھوڑ کر ایک لمبا چکر کاٹ کر ٹیلوں وغیرہ کی اوٹ سے ہوتے ہوئے پھر سے اگلی صفوں میں شامل ہو جاتے، یوں چالیس پچاس ہزار کا یہ لشکر سفیر کو پانچ چھ لاکھ کا لشکر محسوس ہوا۔ اس کے بعد سفیر دقوقا پہنچا جہاں کا قلعہ دار خلیفہ ناصر کا ایک غلام تھا۔ وہاں پہلے سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ ہوا۔ خلیفہ کا غلام شہر کے باہر ایک نہایت بلند تخت پر بیٹھا جس کے سامنے بیس ہزار سپاہی ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے اور اردگرد نیم دائرے میں نہایت شاندار خیمے نصب تھے۔ درمیان میں دو کلومیٹر تک قالین بچھے ہوئے تھے۔ سفیر وہاں پہنچا تو اس کے جوتے اتروا لیے گئے اور جب وہ خلیفہ کے غلام کے تخت کے سامنے پہنچا تو اسے سجدے پر مجبور کیا گیا۔ سفیر کی مرعوبیت کا عالم دیدنی تھا۔

اس کے بعد سفیر کو بغداد روانہ کیا گیا اور اُدھر بغداد اور مضافات کے تمام گھوڑے، خچر، گدھے اور اونٹ جمع کر کے ان پر اَن گنت مصنوعی سپاہی اسلحے اور پرچموں سمیت بٹھا دیے گئے۔ ساتھ ہی آتش بازی کے سینکڑوں ماہرین بلوا لیے گئے۔ سفیر وہاں پہنچا تو آتش بازی سے زمین و آسمان سرخ ہو رہے تھے۔ اس کے بعد سفیر بغداد میں داخل ہوا تو خلیفہ کی اصل فوج نے استقبال کیا جس کا ہر سوار ہیرے موتی جڑی ریشمی زرتار پوشاک سے آراستہ تھا۔ جب وہ خلیفہ کی چوکھٹ تک پہنچا تو اسے کہا گیا کہ چوکھٹ کے نچلے درجے کو بوسہ دو، کیوں کہ بالائی درجہ بادشاہوں کے لیے مخصوص ہے۔

سفیر کو تھوڑی دیر کے لیے خلیفہ کے سامنے لایا گیا اور پھر اسے یہ کہہ کر رات کی تاریکی میں محل کے خفیہ دروازے سے واپس روانہ کر دیا گیا کہ اہلِ شہر اس کی آمد پر مشتعل ہیں، اس لیے یہاں اس کی جان کو خطرہ ہے۔ سفیر نے واپس جا کر جب یہ حال سنایا تو تاتاری بغداد پر حملے سے باز آ گئے۔ [1]

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۴۴ / ۴۸، ۴۹، ت تدمری ...... خلیفہ ناصر کی یہ چال یقیناً زبردست تھی اور ناچاری میں ایسا کرنا ناگزیر تھا، غالباً اس وقت بغداد میں کوئی ابن علقمی نہ تھا ورنہ بھانڈا فوراً پھوٹ جاتا۔ درحقیقت دھوکا پائیدار حکمت عملی کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے آخر بغداد کا انجام خوارزم سے مختلف نہ ہوا۔

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ

۶۱۷ھ تا ۶۲۸ھ (۱۲۲۰ء تا ۱۲۳۱ء)

اس دور کے اکثر سلاطین تاتاری یلغار کے سامنے سپر انداز ہو چکے تھے اور جذبۂ جہاد کو فراموش کر کے مسلمانوں کے اس عظیم قتل عام پر خاموش تماشائی بنے رہے تھے، مگر اس پر آشوب دور میں ہمت، ولولے، فرض شناسی اور جذبۂ جہاد سے سرشار ایک ایسا کردار نظر آتا ہے جس نے اس عالمگیر آفت سے تمام عالم اسلام کے دفاع کی ذمہ داری تن تنہا اپنے سر لے لی اور مسلم حکمرانوں کی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا کر اس فریضے کو انجام دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ تاریخ کا یہ لازوال کردار اور اسلام کا یہ عظیم سپوت ''سلطان جلال الدین منکبرتی خوارزم شاہ'' تھا۔ مایوسی کی گھٹاؤں میں سلطان جلال الدین ہی وہ مردِ مجاہد تھے جو اُمید کی شمع بن کر روشن ہوئے۔ وحشت اور بہیمیت کی طوفان خیز آندھیوں میں وہی تھے جنھوں نے اسلام کے خیمے کو اُکھڑنے سے بچانے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں اور انسانی تاریخ کی اس سب سے سرعت انگیز اور خطرناک ترین یلغار کی رفتار کو نہ صرف مدھم کر دیا بلکہ کئی مقامات پر دُشمن کو شکست فاش دے کر اس کا وہ زور بھی توڑ دیا جس کے بل بوتے پر وہ سارے عالم اسلام کو فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

سلطان کی جدوجہد صرف خوارزم کے مسلمانوں کی حمایت وحفاظت تک محدود نہ تھی بلکہ ان کی سرگرمیوں کا دائرہ ماوراء النہر سے لے کر ہندوستان تک اور ساحلِ سندھ سے لے کر قفقاز کے پہاڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں پورے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاتاریوں کا یہ سیلِ بے کراں جو اپنی طغیانی کے پہلے ہی سال میں چین سے لے کر بحیرہ خزر تک کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا، اگر سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی صورت میں ظاہر ہونے والی آہنی دیوار سے ٹکرا کر تھم نہ جاتا تو اگلے دو چار برسوں میں پورا اُفریقہ اور یورپ بھی اس کی زد میں آ کر تہہ وبالا ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دس سال تک چنگیزی یلغار کے سامنے فولادی ڈھال بن کر سلطان جلال الدین نے بالخصوص عالمِ اسلام پر اور بالعموم تمام اقوامِ عالم پر ایسا احسان کیا ہے جسے فراموش کرنا سراسر زیادتی ہے۔

براعظم ایشیا کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی سلطان جلال الدین کی تاریخی معرکہ آرائیاں دراصل ایک ایسی عظیم جہادی تحریک کا ظہور تھیں جسے ہم اہمیت کے لحاظ سے، صلیبیوں کے مقابلے میں سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کی

جہادی کاوش سے کم نہیں قرار دے سکتے۔

سلطان جلال الدین کی تخت نشینی (۶۱۷ھ۔۱۲۲۰ء):

سلطان جلال الدین منکبرتی، علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ہمت واستقلال جرأت و شجاعت، ذکاوت اور بیدار مغزی ان کے امتیازی اوصاف تھے۔ فنون حربیہ اور معرکہ دانی میں، اس دور میں ان کا ہم پلہ دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ وہ عیش وآرام سے متنفر اور سپاہیانہ کھیلوں کے دلدادہ تھے۔ اپنے باپ کے دورِ حکومت میں وہ افغانستان کے وسطی وجنوبی اضلاع (غزنی، قندھار، نیمروز وغیرہ) کے گورنر تھے۔ چوں کہ والد کے انتہائی مطیع تھے، اس لیے تاتاری طوفان کے دوران سلطان علاؤ الدین محمد نے اپنے مسلسل سفر اور پیہم فرار کے دوران ان کو ہر لحظہ اپنے ساتھ رکھا اور ان کے اصرار کے باوجود ان کو دشمن کے مقابلے میں نہ جانے دیا اور فوج کی قیادت ان کے حوالے نہ کی۔

جب ۶۱۷ھ (۱۲۲۰ء) میں بحیرۂ خزر کے جزیرے میں سلطان علاؤ الدین محمد نے وفات پائی تو سلطان جلال الدین سلطنتِ خوارزم کے وارث قرار پائے۔ اس تباہ شدہ مملکت کو بھیڑیوں کے نرغے سے نکالنا جان جوکھوں کا کام تھا، اس لیے یہ تاج وتخت پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر تھا۔ مگر سلطان جلال الدین مشکل حالات سے بددل ہونے والے نہ تھے۔ باپ کی طرح منہ چھپا کر بھاگنے کے بجائے وہ اپنے مٹھی بھر رضا کاروں کی معیت میں مجاہدانہ للکار کے ساتھ تاتاریوں کے مقابلے کے لیے نکلے۔

خوش قسمتی سے اس وقت تک خوارزم کا دارالحکومت ''اورگنج'' اپنی ناقابلِ تسخیر فصیلوں اور دریائے آمو کی قدرتی خندق کے باعث تاتاریوں کے حملے سے محفوظ تھا۔ سلطان جلال الدین نے ''اورگنج'' پہنچ کر تاتاریوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ خوارزم کی چار لاکھ سپاہیوں پر مشتمل عظیم فوج پارہ پارہ ہو چکی تھی۔

سلطان جلال الدین نے دشمن سے مقابلے کے لیے رضا کاروں کی بھرتی شروع کی، مگر اسی دوران ایک افسوسناک سانحہ پیش آ گیا۔ ایسے نازک حالات میں بھی جب کہ تاتاری اورگنج میں حملے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ایوانِ خوارزم کے چند بااثر سرداروں اور شہزادوں نے سلطان کا تختہ اُلٹ کر ان کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنا لیا۔ حالات بگڑتے چلے گئے۔ آخر کار سلطان مجبور ہو کر اپنے تین سو وفادار ساتھیوں کے ہمراہ خفیہ طور پر ''اورگنج'' سے نکل گئے۔

راستے میں ''استوا'' کے مقام پر ایک تاتاری فوج نے ان کو گھیر لیا۔ سلطان جلال الدین نے اپنے تھوڑے سے جانبازوں کے ساتھ اُن سے مقابلہ کیا اور لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ سلطان کے ''اورگنج'' سے نکلنے کے چند دن بعد تاتاریوں کے بڑے لشکر نے شہر پر حملہ کر دیا اور مقامی سرداروں اور اہلِ شہر کی مزاحمت کے باوجود شہر پر قبضہ کر کے قتلِ عام کے بعد دریائے آمو کا بند توڑ دیا جس سے تمام شہر زیرِ آب آ کر آبادی سمیت بے نام ونشان ہو گیا۔[1]

---

[1] سیرۃ سلطان جلال الدین للنسوی، ص ۲۳ تا ۱۲۲، ط دار الفکر العربی قاہرہ؛ الکامل فی التاریخ سنۃ ۶۱۷ھ؛ نہایۃ الارب للنویری: ۲۷، ۲۵۲، ۲۵۳، ط قاہرہ؛ تاریخ ابن خلدون: ۵/ ۱۳۶ تا ۱۳۸، ط دار الفکر

جہاد کی تحریکِ نو......فتوحات کا دور:

آغازِ سنہ ۶۱۸ھ (مارچ ۱۲۲۱ء) میں سلطان جلال الدین نے خراسان کا رُخ کیا۔ وہ لوگ جو تاتاریوں کی دہشت سے لرزہ براندام تھے، ان کا استقبال کر کے ان کی فوج میں شامل ہوتے جارہے تھے۔ تاہم مختصر وقت میں ان ناتجربہ کار لوگوں سے ایسی طاقتور فوج تشکیل دینا ممکن نہ تھا جو اس عالمگیر طوفان کا مقابلہ کر سکے۔ سلطان کو خراسان کے غیرت مند اور جنگجو مسلمانوں سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں جو ہر دور میں اسلامی فتوحات کا ہراول دستہ ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ سلطان نے جنوبی خراسان کے صوبہ نیمروز کے شہر ''بُست'' میں ڈیرے ڈال دیے۔ سلطان کی آمد کی اطلاع پاتے ہی امین الدین ملک دس ہزار بہادروں کے ساتھ حاضر ہوا اور جہاد کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ سلطان کا منصوبہ یہ تھا کہ تاتاریوں سے مقابلے کی ابتدا کسی ایسے مقام سے کی جائے جہاں کم سے کم جانی نقصان اُٹھا کر، زیادہ سے زیادہ دُشمنوں کو ہلاک کیا جاسکے تاکہ اپنی قوت محفوظ رکھ کر دُشمن کو مرعوب کیا جائے اور دہشت زدہ مسلمان جو تاتاریوں کو ناقابلِ شکست یقین کر چکے ہیں، خوف و ہراس کی فضا سے باہر نکل آئیں۔ چنانچہ ان کے مشترکہ لشکر نے قندھار کا رخ کیا جہاں تاتاری شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ سلطان نے انہیں گھیر کر اس طرح شکست دی کہ کشتوں کے پشتے لگادیے۔ اس فتح سے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی ملی اور سلطان کی دلیری کی چہار سو شہرت ہوگئی۔ [1]

غزنی اور پروان کے معرکے:

قندھار کے بعد سلطان جلال الدین نے غزنی کا رُخ کیا۔ یہاں ہزاروں قبائلیوں نے رضاکارانہ طور پر لشکرِ مجاہدین میں شمولیت اختیار کی۔ حاکمِ کابل مَلک شیر اور خلجی سردار سیف الدین اغراق بھی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ سلطان کی امداد کے لیے پہنچ گئے۔ چنگیز خان نے جو قندھار کی شکست کے بعد انگاروں پر لوٹ رہا تھا، شِگی قتقو نامی ایک معتمد سردار کی قیادت میں ایک زبردست لشکر سلطان کے مقابلے میں بھیج دیا۔ غزنی سے باہر بلق کے مقام پر دونوں فوجوں کا ٹکراؤ ہوا۔ تین دن تک دونوں فوجوں میں ہولناک جنگ جاری رہی۔ چوتھے دن تاتاریوں کا دم خم جواب دے گیا اور وہ بے شمار لاشیں چھوڑ کر پسپا ہوگئے۔ سلطان کے حکم پر ترک اور افغان مجاہدین نے ان کا تعاقب کیا اور اکثریت کو پسپائی کے دوران موت کی نیند سلادیا۔ یہ یادگار لڑائی رجب ۶۱۸ھ (اگست ۱۲۲۱ء) میں لڑی گئی۔

سلطان جلال الدین کو معلوم تھا کہ چنگیز خان سے میدانِ جنگ میں مقابلہ کیے بغیر تاتاریوں کو فیصلہ کن شکست دینا مشکل ہے، اس لیے انہوں نے چنگیز خان کو جو اس وقت طالقان میں فروکش تھا یہ پیغام بھیجا:

---

[1] روضۃ الصفا: ۵/۳۲ تا ۳۴ ، تاریخ ابن خلدون: ۵/۱۳۷ ، تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۴۷۶، ۴۷۷، ط ہرمس ، سیرۃ جلال الدین، ص ۱۳۲ تا ۱۳۴ ......

حمد اللہ مستوفی کے بیان کے مطابق اس ایک سال میں سلطان جلال الدین اور تاتاریوں کے مابین سات معرکے ہوئے جن میں ہر بار سلطان جلال الدین کو فتح نصیب ہوئی۔ (تاریخ گزیدہ، ص ۴۹۷، ط انتشارات امیر کبیر ایران)

''میں تجھے مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔ مجھے بتا تجھے کون سا میدان پسند ہے تاکہ میں وہاں پہنچ کر تیرا مقابلہ کروں اور تو بھی بذاتِ خود میدان میں نکل آ۔''

سلطان کی اس دلیرانہ للکار سے صحرائے گوبی کے بھیڑیے کی خود اعتمادی جاتی رہی۔ اس نے سلطان کا چیلنج قبول کرنے کے بجائے اپنے سب سے زیادہ عیار اور سفاک بیٹے تولی خان کی قیادت میں پہلے سے بڑھ کر تیاری کے ساتھ ایک لشکر جرار سلطان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ سلطان نے تاتاریوں کو زیادہ آگے بڑھنے کا موقع دینے کے بجائے، خود پیش قدمی کی اور کابل سے آگے ضلع پروان میں خیمے گاڑ دیے۔

اس دوران سلطان کو خبر ملی کہ تاتاریوں کا ایک اور لشکر قلعہ والیان پر جو پروان اور بامیان کے درمیان واقع تھا، حملہ کر چکا ہے۔ سلطان نے اپنے منتخب برق رفتار دستوں کے ساتھ ادھر کا رُخ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کرنے والے تاتاریوں پر اچانک حملہ کر کے ان میں سے تقریباً ایک ہزار کو ہلاک اور بقیہ کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس فتح میں سلطان کو بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا جس سے اسلحہ اور سواریوں کی کمی پوری ہوگئی۔

سلطان جلال الدین کے پروان پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد تولی خان کی قیادت میں تاتاریوں کا ٹڈی دل انبوہ متلاطم سیلاب کی طرح پروان کی حدود میں داخل ہوگیا۔ اس لشکر کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ مفتوحہ صوبوں کے مسلمان قیدیوں کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ تھی جن سے جبری مشقت بھی لی جاتی تھی اور لڑائی کے موقع پر ان کے ذریعے اپنی تعداد کو مزید بڑھا کر ظاہر کر کے حریف پر دہشت بھی طاری کر دی جاتی تھی۔ تاتاری فوج کی آمد کی اطلاع پا کر سلطان جلال الدین پروان کے مرکز چاریکار کی شمال مشرق کی طرف بڑھے اور تقریباً تین میل طے کر کے ایک وسیع میدان میں کوہستانی سلسلے کو پشت کی طرف رکھتے ہوئے اپنی افواج کی صف بندی کرنے لگے۔

مجاہدینِ اسلام کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ وہ ماضی کی تمام شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھے۔ سلطان جلال الدین نے لشکر کے دائیں بازو پر امین الملک اور بائیں بازو پر سیف الدین اغراق کو متعین کیا اور خود قلبِ لشکر میں آ گئے۔ سورج کے قدرے بلند ہوتے ہی تاتاری لشکر گرد و غبار اُڑاتا ہوا میدان کے دوسرے کنارے پر آن پہنچا۔ سلطان جلال الدین ان کی کثرت سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے انہیں اپنے رب پر کامل بھروسہ تھا۔ میدانِ جنگ کی طبعی ساخت و محل وقوع کو مدنظر رکھتے ہوئے نیز اپنے سپاہیوں کے دلوں سے فرار کا معمولی سا وسوسہ بھی منقطع کرنے کے لیے سلطان نے حکم دیا: ''تمام سپاہی گھوڑوں سے اُتر کر پیدل لڑیں اور پوری ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں۔''

تاتاری افسران مسلمان سپاہیوں کو پیدل دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آخر طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی اور دونوں لشکر گتھم گتھا ہوگئے۔ امین الملک کی قیادت میں لشکر اسلام کا دایاں بازو نہایت مضبوطی سے جم کر مقابلہ کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر تاتاری سپہ سالارِ اعلیٰ تولی خان نے دس ہزار تازہ دم اس طرف بھیج دیے تاکہ مسلمانوں کے دائیں بازو کو ہاتی فوج سے

کاٹ کر تتر بتر کر دیا جائے۔ اس طرح امین الملک کے دستوں پر تاتاری حملہ آوروں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اسلامی فوج کے دائیں بازو کو الٹے قدموں پیچھے ہٹنا پڑا۔

قلب لشکر میں سلطان جلال الدین نے یہ نازک صورتحال دیکھتے ہی قلب کی قیادت ایک معتمد جرنیل کے حوالے کی اور خود اپنے برق رفتار دستے کے ساتھ دائیں بازو کی طرف لپکے۔ سلطان کی بروقت آمد سے پسپا ہونے والے سپاہیوں کے دل پھر سے مضبوط ہوگئے اور وہ قدم جما کر تاتاریوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ شام تک جنگ پوری شدت سے جاری رہی مگر کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔

تاتاری جنگجو دھوکہ دہی اور مکاری میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے ایک عجیب چال چلی۔ دن بھر کی لڑائی میں ہزاروں تاتاری مارے گئے تھے۔ تاتاریوں نے لکڑیوں کے بت بنا کر اپنے مقتولین کے کپڑے ان کو پہنا دیے اور ان باوردی بتوں کو مقتولین کے خالی گھوڑوں کی زینوں پر نصب کر دیا۔ اس مصنوعی فوج کو میدانِ جنگ سے دور ایک مقام پر کھڑا کر دیا گیا۔ اگلی صبح دونوں فوجیں پھر آمنے سامنے ہوئیں۔ تاتاری لشکر کی افرادی کثرت اور ان کی سخت جانی نے کل کی لڑائی میں خوارزمی افسران کو خاصا پریشان کر دیا تھا۔ آج کی لڑائی شروع نہ ہوئی تھی کہ ان کو ایک اور دھچکا لگا۔ دور اُفق پر ایک نئی تاتاری فوج کی آمد کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ہزاروں سوار گھاٹیوں سے نکل کر اس وسیع میدان کے آخری سرے پر گشت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

افسران نے سلطان جلال الدین کو یہ منظر دکھاتے ہوئے کہا:

''تاتاریوں کے لیے بہت بڑی تعداد میں کمک آ گئی ہے۔ اپنی موجودہ تعداد کے ساتھ ہم اس کھلے میدان میں اتنے بڑے لشکر سے نہیں لڑ سکتے۔ بہتر ہوگا کہ فوراً پسپا ہو کر پشت پر واقع کوہستان میں مورچہ بندی کر لی جائے اور تیراندازی و سنگ باری کے ذریعے اپنی مدافعت کی جائے۔''

مگر شہادت کی تلاش میں پروانہ وار پھرنے والے سلطان جلال الدین کو بدترین حالات میں بھی دُشمن کے سامنے ڈٹ جانے کا حوصلہ میسر تھا۔ یہ نازک حالات دیکھ کر اور اپنے افسران کا مشورہ سن کر وہ اطمینان سے بولے:

''میرا قطعی حکم یہی ہے کہ کل کی طرح گھوڑوں سے اُتر جاؤ اور پا پیادہ یک بارگی دُشمن پر ٹوٹ پڑو۔''

سلطان کے حکم کی تعمیل میں افسران نے اپنے اپنے سپاہیوں کو گھوڑوں سے اُترنے کا اشارہ کیا اور یکدم نعرہ تکبیر بلند کر کے تاتاری لشکر پر ہلہ بول دیا۔ گھمسان کی لڑائی کے شعلے ایک بار پھر بھڑکنے لگے۔ سیف الدین اغراق کے چالیس ہزار خلجی سپاہی دُشمن کے لیے نہایت مہلک ثابت ہو رہے تھے۔ ان کا زور توڑنے کے لیے تاتاری لشکر کے چنیدہ سورماؤں کا ایک طوفانی دستہ ان کی مقابل تاتاری سپاہ کی مدد کے لیے پہنچ گیا اور اسلامی لشکر کی میسرہ اور تاتاریوں کے میمنہ کے درمیان ایک خوں ریز جنگ شروع ہوگئی۔ اس موقع پر افغان تیراندازوں نے موقع پا کر تاتاریوں پر اس شدت سے تیروں کا مینہ برسایا کہ دُشمن منہ پھیر کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی لشکر کے باقی دستوں نے بھی

اپنے مقابل تاتاری صفوں کو درہم برہم کردیا۔ تاتاریوں کے قدم اُکھڑ چکے تھے اور وہ میدان سے راہِ فرار اختیار کررہے تھے۔ سلطان جلال الدین دُشمن کو زندہ بچ نکلنے کا موقع دینے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے اشارہ کیا اور کوچ کے نقارے پر چوٹ پڑنے لگی۔ تمام مجاہدین تازہ دَم گھوڑوں پر سوار ہوکر تاتاری افواج کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔

فرار ہونے والے تاتاریوں نے آگے جا کر ذلت ورسوائی کا داغ مٹانے کے لیے آخری کوشش کے طور پر ایک اور میدان میں صف بندی کرلی۔ گھڑسوار مجاہدین کے یہاں پہنچتے ہی ایک بار پھر نہایت شدت سے معرکہ بپا ہوا۔ مگر یہ لڑائی زیادہ طول نہ پکڑ سکی۔ مسلمانوں کے شدید حملوں سے تاتاریوں کے قدم جلد ہی اُکھڑ گئے اور وہ ایک بار پھر پشت پھیر کر بھاگے۔ سلطانی افواج نے ان کا تعاقب جاری رکھا اور ہزاروں کافروں کو دورانِ تعاقب ہلاک کردیا۔ ایک روایت کے مطابق ہلاک شدگان میں چنگیز خان کا بیٹا تولی خان بھی شامل تھا۔ [1]

مسلمانوں میں پھوٹ:

پے در پے کئی میدانوں میں تاتاریوں کو شکستِ فاش دینے کے بعد سلطان جلال الدین مکمل فتح کے دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے اور ان کے ایک دو معرکوں کے نتائج چنگیز خان کے دماغ سے تمام دنیا کو تہس نہس کرنے کا جنون نکال کر، اسے صحرائے گوبی کا راستہ ناپنے پر مجبور کرسکتے تھے۔ مگر امیدوں کے یہ روشن چراغ ایک ناگہانی حادثے کی آندھی نے یکا یک گل کردیئے۔ اسلامی لشکر کے دو بڑے سردار: سیف الدین اغراق اور امین الدین ملک مالِ غنیمت میں حاصل ہونے والے ایک گھوڑے کے استحقاق پر آپس میں اُلجھ پڑے۔ اس کش مکش میں سیف الدین کا بھائی مارا گیا۔ سلطان جلال الدین کو اس صورتحال کا علم ہوا تو ان کے دل پر قیامت بیت گئی۔ انہوں نے فریقین کے درمیان صلح کرانے کی پوری کوشش کی، مگر سیف الدین اغراق جو غیظ وغضب سے بے قابو ہورہا تھا، کچھ سننے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ اپنے قبائلی جنگجوؤں کو لے کر سلطان کے لشکر سے علیحدہ ہوگیا۔ کئی خلجی اور غوری سرداروں نے اس کی تقلید کی۔ یہ اسلامی لشکر کے لیے ایک شدید دھچکا اور دُشمنانِ اسلام کے لیے سنہری موقع تھا۔ چنگیز خان نے صورتحال سے مطلع ہوتے ہی اپنے تمام بکھرے ہوئے لشکروں کو طلب کیا اور طوفانِ محشر خیز کی طرح غزنی کی طرف یلغار کی۔ راستے میں اس کے بیٹے چغتائی اور اوکتائی وسطِ ایشیا میں تعینات افواج لے کر اس سے آملے۔ [2]

معرکۂ نیلاب: (شوال ۶۱۸ھ۔ نومبر ۱۲۲۱ء)

سلطان جلال الدین نے اپنی باقی ماندہ شکستہ حال فوج کے ساتھ، اس عظیم لشکر کا کھلے میدان میں مقابلہ کرنا، خلافِ حکمت سمجھا اور دریائے سندھ کا رُخ کیا تاکہ اسے عبور کرکے ہندوستان میں داخل ہوجائیں اور شاہِ دہلی شمس الدین التمش سے مدد لے کر اس عالمی دہشت گرد سے فیصلہ کن ٹکر لیں مگر چنگیز خان نے سلطان کا ارادہ بھانپ کر تعاقب میں

---

[1] روضۃ الصفا: ۳۶/۵ تا ۳۸؛ تاریخ ابن خلدون: ۱۳۰/۵؛ الکامل فی التاریخ سنۃ ۶۱۷ھ؛ تاریخ جہان کشا، ص ۴۷۸، ۴۷۹، ط ھرمس

[2] روضۃ الصفا: ۳۸/۵؛ تاریخ ابن خلدون: ۱۳۱/۵؛ الکامل فی التاریخ سنۃ ۶۱۷ھ؛ تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۴۸۰، ط ھرمس

اتنی تیزی کا مظاہرہ کیا کہ سپاہیوں کو کھانا پکانے کے لیے بھی کہیں رکنے کی اجازت نہ دی اور ایک دن میں کئی کئی منازل طے کرتے ہوئے، رات کی تاریکی میں سلطان کو دریائے سندھ کے کنارے ''نیلاب'' (ضلع نوشہرہ) کے مقام پر جالیا۔

صبح روشن ہوئی تو سلطان جلال الدین نے خود کو تین اطراف سے تاتاریوں کے ٹڈی دل لشکر کے گھیرے میں دیکھا جبکہ پشت پر دریائے سندھ کی متلاطم موجیں چٹانوں سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ اب عزت کی موت کے سوا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ سلطان نے اسی حالت میں اپنے جوانوں کی صفیں مرتب کیں اور جنگ کا نقارہ پیٹ دیا۔ تین دن تک ساحل سندھ پر ایسی سخت لڑائی ہوئی جس کے سامنے گزشتہ تمام معرکے ماند پڑ گئے۔ [1] علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس بات کا سب کو اعتراف ہے کہ گزشتہ تمام جنگیں اس معرکے کے سامنے محض ایک تماشا تھیں۔'' [2]

چنگیز خان کی لاکھوں افراد پر مشتمل فوج کے سامنے اپنی افرادی قلت کو نظر انداز کر کے ڈٹ جانا اور تین دن تک پوری شدت سے مزاحمت جاری رکھنا سلطان جلال الدین کی قوتِ ایمانی، حوصلہ مندی اور معرکہ دانی کا کافی ثبوت ہے۔ تیسرے دن سہ پہر کے وقت چنگیز خان کے دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک تازہ دم دستے نے ایک دشوار گزار پہاڑی کا چکر کاٹ کر عقب سے سلطان کے بائیں بازو پر حملہ کر کے اس کو درہم برہم کر دیا۔ سلطان کی فوج پہلے بھی کم تھی۔ تین دن کی لڑائی میں بہت سے شہید اور بہت سے زخمی ہو چکے تھے۔ میسرہ کے اُلٹ جانے سے سلطان کی مٹھی بھر فوج اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور سلطان کے اکثر ساتھی منتشر حالت میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

سلطان صرف سات سو جانثاروں کے ساتھ دُشمن سے لڑتے بھڑتے دریائے سندھ کے کنارے کی طرف ہٹتے چلے گئے۔ اس کش مکش اور افراتفری میں سلطان کا سات سالہ معصوم بیٹا تاتاریوں کے ہاتھ آ گیا۔ چنگیز خان نے اس کے ٹکڑے کروا دیے۔ سلطان جلال الدین معرکہ کارزار میں ایسے منہمک تھے کہ ان کے پاس ایسے صدمات پر افسوس کرنے کا موقع نہ تھا۔ وہ اپنے باقی ماندہ جانبازوں کے ساتھ شہادت کی سعادتِ عظمیٰ حاصل کرنے کے لیے خون کے آخری قطرے تک جہاد جاری رکھنے کا تہیہ کر کے دُشمن سے برسرِ پیکار تھے۔ جب وہ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر زخمی شیر کی طرح دُشمن پر حملہ کرتے تو ان کو گھیرے میں لینے والے تاتاری کئی کئی لاشیں چھوڑ کر دور دور تک پیچھے ہٹ جاتے۔ مگر جلد ہی تازہ دم تاتاری آگے بڑھ کر نئے جوش و خروش سے ان پر حملہ کر دیتے۔

چنگیز خان حیرت زدہ نگاہوں سے ان کے لڑنے کا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ ہر حال میں سلطان کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ اس حکم کے بعد تاتاری سلطان پر براہ راست کوئی مہلک حملہ کرنے سے کترانے لگے۔ ان کو یقین تھا کہ اپنے باقی ساتھیوں کی شہادت کے بعد سلطان جلال الدین ان کے آگے سرنگوں ہو جائیں گے۔

سلطان نے چنگیز خان کا منصوبہ بھانپ لیا۔ ان کو یہ گوارا نہ ہوا کہ چنگیز خان ان کو ذلت کی زنجیروں میں جکڑ کر قہقہے لگائے۔ انہوں نے ہر صورت میں چنگیز خان کے منصوبے کو ناکام بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

---

[1] روضة الصفا: ۴/ ۸۲۶؛ سيرة جلال الدين، ص ۱۵۵؛ تاريخ جهان كشا، ص ۳۸۰، ۳۸۱، ط هرمس [2] الكامل في التاريخ: سنة ۶۱۷ھ

سلطان نے دریا کے کنارے چٹانوں کی بلندی پر چڑھ کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ دُشمنوں کا ریلا سیلاب کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ دوسری طرف تیس چالیس فٹ گہرائی میں دریا کا ٹھنڈا پانی اس زور وشور سے ٹھاٹیں مار رہا تھا کہ اس میں اترنے کا تصور ہی بڑے سے بڑے سورما کا پتہ پانی کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر سلطان جلال الدین اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے گھوڑے کو چابک رسید کر کے اس خطرناک بلندی سے بے دریغ دریا کی سرکش لہروں میں کود گئے۔

یہ منظر دیکھ کر چنگیز خان نے حیرت سے اپنا گریبان دانتوں میں داب لیا اور بولا: ''بیٹا ہو تو ایسا ہو۔''

چنگیز خان کے بیٹے اور امراء تعجب سے منہ پر ہاتھ رکھ کر سلطان کو دریا کی سرکش موجوں سے الجھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ بعض جوشیلے سرداروں نے چنگیز خان سے دریا میں کود کر سلطان کو پکڑنے کی اجازت مانگی مگر چنگیز خان نے ان کی خواہش کو حماقت پر محمول کرتے ہوئے کہا: ''تم اس پائے کے جواں مرد نہیں ہو۔''

ساحلِ سندھ کے اس تاریخی معرکے میں اگرچہ مسلمانوں کو شکست ہوئی مگر ان کی قربانیاں رائیگاں نہ گئیں اور تاریخ پر اس معرکے کے اثرات ثبت ہو گئے۔ اس معرکے میں تاتاریوں نے اپنی تمام تر قوت مسلمانوں کے مقابلے میں جھونک دی، مگر مسلمانوں نے تعداد کی کئی گنا کمی کے باوجود تین دن تک ان کا اس قدر شدید مقابلہ کیا جس کی مثالیں شاذ و نادر ہیں۔ لڑائی کے اختتام پر کفار کے مقتولین کی تعداد، مسلم شہداء کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ تھی لہٰذا اس موقع پر فتح کے باوجود تاتاریوں کی افرادی قوت کو زبردست دھچکا لگا[1] جس کے باعث ان کی وہ طوفانی پیش قدمی جو بڑے بڑے صوبوں کو چشم زدن میں روندرہی تھی، یہاں آ کر ایک طویل عرصے کے لیے تھم گئی اور چنگیز خان کی افواج کو مغربی پنجاب کے بعض شہروں میں لوٹ مار کر کے جلد ہی واپس لوٹنا پڑا۔ اگر اس محاذ پر تاتاریوں کو سلطان جلال الدین کے ہاتھوں ایسے کاری زخم نہ لگتے تو ان کا چند ہی ماہ میں دہلی، بغداد اور مصر پر قابض ہو جانا کوئی بعید نہ تھا، اسی لیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ جیسے صاحبِ نظر مؤرخ کہہ اُٹھے: ''لَوْلَاهُ لَدَاسُوا الدُّنْيَا''

(اگر سلطان جلال الدین نہ ہوتے تو تاتاری تمام دنیا کو روند ڈالتے۔)[2]

سلطان جلال الدین ہندوستان میں:

سلطان جلال الدین کے دریا میں چھلانگ لگاتے ہی ان کے باقی ماندہ اکثر ساتھیوں نے بھی ان کی تقلید کی تھی جن میں سے بعض دریا میں ڈوب کر شہید ہو گئے اور بعض دوسرے کنارے تک صحیح و سالم پہنچ کر سلطان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ بعد میں اس تعداد میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔

---

① روضۃ الصفا از خاوند میر: ۴/ ۸۲۶ تا ۸۲۸؛ سیرۃ جلال الدین، ص ۱۵۵ تا ۱۵۷؛ چنگیز خان، ۱۵۰ تا ۱۵۳؛ تاریخ خوارزم شاہی از غلام ربانی عزیز، ۲۱۸ تا ۲۲۰؛ حبیب السیر: ۲/ ۶۵۸، ۶۵۹؛ تاریخ جہان کشا، ص ۲۱۰، ۲۱۱، ط ہرمس

مؤرخین نے سلطان کی شجاعت پر چنگیز اور اس کے افسران کی حیرت کو واضح طور پر لکھا ہے۔ میر خواند شیرازی لکھتا ہے: ''از کمال تہور وتجلد او تعجب کردہ گریبان جامہ بدندان گرفت۔'' (حبیب السیر: ۶۵۹/۲) عطا ملک جوینی لکھتا ہے: ''تمامت مغولان از شگفت دست بر دہان نہادند'' (جہان کشا، ص ۴۸۳، ط ہرمس)

② سیر اعلام النبلاء: ۲۲/ ۳۲۸، ط مؤسسۃ الرسالۃ

سلطان جلال الدین اب ہندوستان کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ ضلع اٹک کا علاقہ تھا۔ ان دنوں ہندوستان کے وسطی علاقوں میں سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی جس کا مرکز دہلی تھا جبکہ اٹک سمیت دریائے سندھ کے ساحلی علاقے زیادہ تر ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھے۔ سلطان جلال الدین اور ان کے خالی ہاتھ ساتھیوں کو ان مسلم دُشمن بدطینت ہندو راجاؤں سے سخت خطرہ لاحق تھا، اس لیے سلطان نے اسلحہ کے حصول کا منصوبہ بنایا۔ ان کے چند جانباز سپاہی آس پاس کے علاقے کا جائزہ لے کر آئے اور اطلاع دی کہ کچھ فاصلے پر ہندو سپاہیوں کا ایک دستہ ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ سلطان نے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ جنگل سے درختوں کی شاخیں توڑ لائیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں سلطان نے ان لاٹھی بردار مجاہدین کے ساتھ ہندو سپاہیوں پر دھاوا بول دیا اور بہت سوں کو قتل اور دیگر کو فرار ہونے پر مجبور کر کے غنیمت کے طور پر سواری کے جانور اور خاصی مقدار میں اسلحہ حاصل کیا۔

قریبی ریاست کے ہندو راجا کو سلطان کی آمد کا علم ہوا تو وہ پانچ سو گھڑ سوار اور ایک ہزار پیادے لے کر ان کی تلاش میں نکلا۔ سلطان جلال الدین اپنے ساتھیوں کو لے کر گھنے جنگل میں پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ ایک پہاڑ کے قریب پہنچ کر سلطان نے توقف کیا اور دُشمن کو قریب آنے دیا۔ جب ہندو راجہ سامنے آیا تو سلطان نے تاک کر ایسا تیر مارا جو راجہ کے دل میں پیوست ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا کئی گنا لشکر گنتی کے چند مجاہدین کے سامنے بھی جم کر نہ لڑ سکا اور شکست کھا کر بھاگ نکلا۔ اس دفاعی جنگ میں شاندار کامیابی کے بعد سلطان جلال الدین نے چار ہزار افراد پر مشتمل ہندو فوج کے ایک کیمپ پر چھاپہ مار حملہ کا منصوبہ بنایا اور ایک سو بیس جانبازوں کو لے کر فوجی کیمپ پر اچانک ہلّہ بول دیا۔ یہاں بھی ہندو شکست کھا کر بھاگے اور فوجی پڑاؤ کا تمام ساز و سامان سلطان کے ہاتھ آ گیا۔

سلطان کی ان جہادی مہمات سے گھبرا کر اردگرد کی تمام ریاستوں کے ہندو حکمران ان کے خلاف متحد ہو گئے اور چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک متحدہ فوج ان کی طرف روانہ کی۔ سلطان جلال الدین کے ساتھیوں کی تعداد اب بھی پانچ سو سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم اس بار سلطان نے میدان میں باقاعدہ صف بندی کر کے دُشمن کا مقابلہ کیا اور بارہ گنا بڑے لشکر کو چھٹی کا دودھ یاد دلا کر میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ [1]

چنگیز خان کی منگولیا واپسی: ۶۱۹ھ (۱۲۲۲ء)

چنگیز خان اب اپنے وطن واپس جانا چاہتا تھا۔ چین اور منگولیا میں اس کی واپسی اس لیے بھی ضروری ہو چکی تھی کہ وہاں اس کا نائب مقولی بہادر مر چکا تھا اور ''ہیا'' کی مفتوحہ مملکت میں بغاوت کے شعلے لپک رہے تھے۔ [2] واپسی پر پشاور سے ہوتے ہوئے اس نے سمرقند کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں غزنی کی آبادی کو تہ تیغ کر کے شہر کو تباہ کر دیا اور سلطان محمود غزنوی کی قبر سے اس کی ہڈیاں برآمد کر کے نذرِ آتش کر دیں۔ اسی طرح وہ زابل، غزنی اور غور سمیت خراسان کی بچی کھچی آبادیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹاتا چلا گیا تاکہ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کو ان علاقوں سے مدد ملنے

---

[1] روضۃ الصفا: ۸۲۸/۴؛ سیرۃ جلال الدین، ص ۱۵۸ تا ۱۶۳؛ تاریخ جہان کشا، ص ۳۸۳، ۳۸۴، ط ہرمس [2] چنگیز خان، ص ۱۵۷

کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اب تک مسلمان قیدیوں کی بہت بڑی تعداد تاتاریوں کی جبری خدمت کے لیے ان کے ساتھ ساتھ گھسٹتی پھر رہی تھی، اب چونکہ ان کی ضرورت نہیں رہی تھی، اس لیے چنگیز خان کے حکم سے ان کا قتل عام کر دیا گیا۔ ۶۱۹ھ (۱۲۲۱ء) کا موسم گرما کوہِ ہندوکش کے دامن میں گزار کر چنگیز خان سمرقند پہنچا اور کچھ مدت سیر و شکار میں گزار کر شمال مشرق کی طرف اس نے کوچ کیا۔ ① فتح کی تکمیل کی خوشی دوبالا کرنے کے لیے اس نے مادرِ خوارزم شاہ بوڑھی ملکہ ترکان خاتون اور شاہی خاندان کی دیگر بیگمات اور شہزادیوں کو حکم دیا کہ وہ سارے لشکر کے آگے آگے چلیں اور بلند آواز سے خوارزم شاہ اور اس کے تاج و تخت پر نوحہ وزاری کریں۔ ② دریائے سیحوں کے کنارے جہاں سے چنگیز خان خوارزم میں داخل ہوا تھا، ایک سبزہ زار میں چنگیز خان نے تمام سردارانِ لشکر کو قورِلتائی کے لیے طلب کیا۔ اس جشن کا جو نقشہ ہیرلڈ لیمب نے کھینچا ہے اس کا ایک عبرت انگیز اقتباس درج ذیل ہے:

”اس وقت چنگیز خان محمد خوارزم شاہ کے تخت پر بیٹھا، جسے وہ سمرقند سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے پاس اس مرحوم مسلمان بادشاہ کا تاج اور شاہی عصا رکھا تھا۔ جب قورِلتائی کا آغاز ہوا تو خوارزم شاہ کی والدہ (ترکان خاتون) کو گھسیٹ کر لایا گیا، اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں۔“ ③

۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) کے اوائل میں جبکہ موسم بہار شروع ہو چکا تھا، چنگیز خان صحرائے گوبی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ④ وہ مطمئن تھا کہ اس کے حریفوں کی طاقت فنا ہو چکی ہے۔ ساحل سندھ سے بحیرۂ خزر کے پار تک تاتاری پرچم لہرا رہے تھے اور مسلمانوں کی باقی ماندہ آبادی فاتحین کی غلام بن چکی تھی۔ ذوالحجہ ۶۲۱ھ میں چنگیز خان پانچ سال بعد اپنے پایۂ تخت واپس پہنچا۔ استقبال کرنے والوں میں اس کے پوتے: دس سالہ قبلائی خان اور نو سالہ ہلاکو خان بھی تھے۔ ⑤

شاہِ دہلی سے طلبِ اعانت:

اُدھر سلطان جلال الدین نے دہلی سے دو تین منازل کے فاصلے پر ڈیرے ڈال کر ایک معتمد مشیر سید عین الملک کو شمس الدین ایلتمش کے دربار میں بھیجا تا کہ حکومتِ دہلی کے سامنے تاتاری خطرے کی صحیح تصویر پیش کر کے اس سے اسلام اور ملت کے نام پر امداد طلب کی جاسکے۔ ایلتمش کے نام اپنے خط میں سلطان نے تحریر کیا تھا:

”اِنَّ الکِرَامَ لِلکَرِیمِ مَحلّ (یقیناً شریف آدمی شریف لوگوں کے پاس ٹھہرتا ہے۔) زمانے کے حوادث نے مجھے آپ کے پڑوس میں آنے اور ملاقات کرنے کا حق دیا ہے۔ ایسے مہمان بہت کم آیا کرتے ہیں، اگر ہم پاکیزہ محبت اور کامل بھائی چارے کا مظاہرہ کریں اور خوشحالی و بدحالی میں باہمی تعاون اور امداد کا عہد و پیمان کر لیں تو ہمارے تمام مقاصد اور اغراض ہمیں آسانی سے حاصل ہو سکیں گے اور ہمارے دشمن جب ہمارے اتحاد و یکجہتی کی اطلاع پائیں گے تو ان کی جارحیت کے دانت کند ہو جائیں گے۔“

---

① تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۲۱۳، ۲۱۴، ط ہرمس ② تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۵۳۴، ط ہرمس؛ روضۃ الصفا: ۴۱/۵
③ چنگیز خان، ص ۱۵۹ ④ تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۲۱۵، ط ہرمس ⑤ روضۃ الصفا: ۴۱/۵، ط نولکشور

سلطان شمس الدین التمش ایک محتاط طبیعت حکمران تھے، سلطان جلال الدین کی کھلم کھلا مدد کرنا ان کے لیے کئی پیچیدگیاں اور مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ وہ خود اندرونی شورشوں اور سازشوں کو بمشکل دبا کر اپنا تخت و تاج سنبھالے ہوئے تھے۔ پنجاب اور سندھ میں قباچہ اور اس جیسے بعض باغی ابھی تک ان کے قابو سے باہر تھے، ان کے پڑوسی خود مختار ہندو راجے پہلے ہی سلطان جلال الدین سے دشمنی ظاہر کر چکے تھے۔ نیز سلطان جلال الدین کی شجاعت، جنگی مہارت اور شہرۂ آفاق دبدبے کو دیکھتے ہوئے التمش کو اس بات کا بھی خوف تھا کہ کہیں وہ ہندوستان میں اپنے قدم جما کر دہلی کے تخت کے لیے ایک مستقل خطرہ نہیں بن جائیں۔ ان وجوہات کے علاوہ التمش کو سب سے زیادہ خدشہ اس بات کا تھا کہ سلطان کی اعانت و نصرت سے تاتاریوں کو ہندوستان پر حملے کا بہانہ مل جائے گا۔ یہ ایک ایسا خطرہ تھا جس کا تصور ہی اس دور کے حکمرانوں کو لرزانے کے لیے کافی تھا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود چونکہ سلطان جلال الدین بہر حال پڑوسی مسلم حکمران تھے اور انہوں نے اسلام اور ملت کے نام پر امداد طلب کی تھی، اس لیے سلطان التمش نے صاف صاف لفظوں میں انکار کرنا بھی بے مروتی سمجھا۔ آخر کار کئی دن کی سوچ بچار کے بعد انہوں نے سلطان کے لیے قیمتی تحائف اور لشکر کے لیے سامان رسد کے بھاری ذخیرے کے ساتھ اس مضمون کا جوابی مراسلہ بھیجا:

''ہندوستان کی آب و ہوا آپ کے لیے ناساز گار ہے، یہاں آپ کے لشکر کی صحت پر بہت برا اثر پڑے گا، بہتر ہوگا کہ آپ کسی اور خطے کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں، لیکن اگر آپ یہیں رہنا پسند کرتے ہیں تو ہم آپ کے قیام کے لیے دہلی کے نواح میں ایک قطعۂ زمین مخصوص کرنے کے لیے آمادہ ہیں، نیز اس ملک کے غیر مفتوحہ علاقوں میں سے جو علاقے بھی آپ اپنی طاقت کے ذریعے باغیوں اور فتنہ پردازوں سے پاک کریں گے ہم ان پر آپ کی حکومت تسلیم کر لیں گے۔''

سلطان التمش کے جوابی خط سے سلطان جلال الدین کو معلوم ہو گیا کہ حکومتِ دہلی کھلم کھلا اس جہاد میں اس کے ساتھ شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس طرف سے ناامید ہو کر انہوں نے مغربی پنجاب اور سندھ کے علاقوں کا رخ کیا تا کہ اپنی قوت بازو سے کچھ علاقے فتح کر کے مستقبل کے طوفانوں کے سامنے بند باندھنے کی سعی کریں۔[1]

سلطان کی ایران روانگی اور دفاعی حصار کی تعمیر:

سلطان جلال الدین نے دو اڑھائی سال تک ہندوستان میں رہ کر صوبہ سندھ و صوبہ پنجاب کا بہت سا حصہ فتح کر کے تاتاریوں کے خلاف جہاد کی ازسرِ نو تیاری کے لیے دفاعی حصار قائم کرنے کی کوشش کی، مگر مقامی مسلم حکمرانوں کے عدم تعاون کے باعث وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر کار ۶۲۱ھ (۱۲۲۴ء) میں انہوں نے فارس اور عراق کے ان علاقوں کی طرف روانگی اختیار کی جو تاتاری یلغار کی پہلی لہر گزر جانے کے بعد اب پھر سے آباد ہونے لگے تھے اور خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ تاتاری ان صوبوں اور شہروں کو تاراج کرنے کے لیے کسی بھی وقت دوبارہ یلغار کر سکتے ہیں۔

---

① سیرۃ جلال الدین، ص ۱۶۴، ۱۶۵؛ نہایۃ الارب للنویری: ۲۷/ ۲۶۰ تا ۳۶۴؛ چنگیز خان، ۱۵۳ تا ۱۵۵

سلطان جلال الدین نے ہندوستانی مقبوضات پر ایک گورنر مقرر کیا اور خود چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ بلوچستان اور کرمان سے ہوتے ہوئے شیراز جا پہنچے۔ راستے میں آنے والے تاتاریوں کے باج گزار حکمران سلطان کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے گئے۔ اصفہان اور رے کے باشندوں نے بھی بخوشی سلطان جلال الدین کی اطاعت قبول کر لی۔

دوسری طرف دریائے سندھ کی جنگ کے کچھ عرصے بعد چنگیز خان خراسان میں سہ بارہ قتل عام کراتا ہوا چین کی طرف لوٹ گیا تھا، وہاں "ہیا" کے باغیوں کی سرکوبی اور دیگر مہمات نے اسے چند سال تک اسلامی ممالک میں دوبارہ پیش قدمی کا موقع نہ دیا۔ تاتاری یلغار کے اس طرح عارضی طور پر رک جانے کے بعد خراسان، ایران اور عراق عجم کے تباہ شدہ شہروں میں ایک بار پھر زندگی کی رمق دکھائی دینے لگی تھی اور فرار یا روپوش ہونے والے بہت سے لوگ اپنے آبائی شہروں کے کھنڈرات میں دوبارہ آبسے تھے، مگر اب ان کی تعداد سابقہ آبادی کا چند فیصد بھی نہ تھی۔ مثلاً ہرات ہی کو لے لیجیے، تاتاریوں کے حملے سے پہلے اس کی آبادی لاکھوں کے حساب سے تھی، مگر ان کے ہاتھوں پامال ہونے کے بعد پندرہ سال تک اس عظیم شہر کی آبادی چالیس نفوس سے متجاوز نہ ہوسکی۔ سلطان جلال الدین کے زیر قبضہ علاقے بھی زیادہ تر ایسے ہی برباد شدہ شہروں پر مشتمل تھے، جہاں کچھ افراد دوبارہ آشیانے بنا چکے تھے، مگر ان کھنڈرات کے مغرب میں عالمِ اسلام کا نصف حصہ آبادی اور وسائل سے بھرپور تھا جس پر تاتاری حملہ آوروں کی حریصانہ نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات اور مذہبی مراکز انہی علاقوں میں تھے اور یہ بات تاتاری بھی بخوبی جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے یہ مراکز آباد ہیں اس قوم کو ختم کرنا محال ہے۔

تاتاریوں کی روک تھام کے لیے عالمی دفاعی حصار قائم کرنے کا منصوبہ:

عالمِ اسلام میں اس وقت سلطان جلال الدین وہ واحد حکمران تھے جو تاتاریوں کے عظیم فتنے کی تباہ کاریوں سے سب سے زیادہ واقف، ان کی مکاریوں سے سب سے زیادہ آگاہ اور میدانِ جنگ میں ان کو منہ توڑ جواب دینے کی سب سے بہتر صلاحیت رکھتے تھے۔ وقت کی آواز پر ہمہ تن گوش رہتے ہوئے وہ اس بات کو نہایت ضروری خیال کرتے تھے کہ حرمین شریفین اور باقی ماندہ مسلم ملکوں کی حفاظت کے لیے ایک متحدہ محاذ بنایا جائے۔ اس اتحادی طاقت کو تاتاریوں کے مقابلے میں بہترین طور پر استعمال کرنے کے لیے ان کے ذہن میں ایک عجیب منصوبہ تھا اور وہ یہ کہ ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر بحیرہ اسود کے ساحل تک ہلالی شکل کی ایک طویل دفاعی دیوار تیار کی جائے جو بیک وقت ہندوستان، فارس، بغداد، شام، حجاز، مصر اور ایشیائے کوچک کی مسلم آبادیات کا حصار بن سکے۔

اس عظیم کام کے لیے بے شمار وسائل اور لامحدود مالی و افرادی قوت درکار تھی۔ بے سروسامانی کے عالم میں اس منصوبے کا نقشہ بنانے والے سلطان جلال الدین کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلمان حکمرانوں کا تعاون حاصل کرنا ناگزیر تھا۔ چونکہ خلافت بغداد کو عالمِ اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس لیے سلطان کا خیال تھا کہ اگر خلیفہ ناصر سابقہ رنجشیں فراموش کر کے ان کی امداد پر رضامند ہو جائے تو پھر اردگرد کی مسلم حکومتیں بھی حالات کی سنگینی کا اندازہ

کر کے ان کے ساتھ تعاون میں پس و پیش نہیں کریں گی۔ اس خیال کے پیش نظر سلطان نے خلیفہ سے براہ راست رابطہ کرنا ضروری سمجھا تاہم موسم سرما شروع ہو چکا تھا اس لیے وہ مناسب دنوں کے منتظر رہے۔ [1]

دربارِ خلافت میں سفارت کی ناکامی اور بغدادی لشکر سے جنگ:

صفر ۶۲۱ھ (مارچ ۱۲۲۴ء) میں سلطان بغداد کی طرف روانہ ہوئے، تاکہ خلیفہ ناصر سے گفت وشنید کر کے باہمی تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ قریب پہنچ کر سلطان نے ضیاء الملک کو اپنا ایلچی بنا کر دربارِ خلافت میں بھیجا۔ ضیاء الملک نے خلیفہ کی خدمت میں سلطان کی آمد کا مقصد اور اس کا پس منظر بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور خلیفہ کو سلطان کی نیک نیتی کا یقین دلانے کی کوشش کی، مگر افسوس کہ خوارزم کے کم وبیش ایک کروڑ مسلمانوں کا خون بہہ جانے کے بعد بھی خلیفہ کے دل میں برباد شدہ مملکت خوارزم کی نفرت اسی طرح موجود تھی۔ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کی ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے کے بعد بھی عالمِ اسلام کا پیشوا اس کی اولاد اور مسلم رعایا پر رحم کھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

خلیفہ کی برافروختگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کچھ دنوں پہلے سلطان کے ہراول دستوں کے سالار ایلچی جہان پہلوان نے ایران کے علاقے خوزستان پر حملہ کیا تھا جو دربارِ خلافت کے زیرِ سایہ سمجھا جاتا تھا، اگرچہ سلطان نے خوزستان کی شکست خوردہ فوج سے بھی اچھا سلوک کیا تھا اور اس لڑائی کے تمام گرفتار شدگان کو فوراً رہا کر دیا تھا مگر اس جھڑپ سے بغداد اور خوارزم کے پرانے اختلافات پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ خلیفہ نے سلطان کے پیامِ صلح وتعاون کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا بلکہ سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ترک سپہ سالار ''قشتمور'' کو بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ سلطان جلال الدین سے مقابلے کے لیے روانہ کر دیا، ساتھ ہی حاکم اربل مظفر الدین کوکبری کو پیغام رساں کبوتروں کے ذریعے یہ فرمان بھیجا کہ وہ دس ہزار سپاہیوں کو لے کر دوسری سمت سے سلطان پر یلغار کر دے۔ سلطان جلال الدین بغداد کے باہر پڑاؤ ڈال کر خلیفہ کے جواب کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ انہیں بغدادی افواج کی پیش قدمی کی خبر ملی۔ سلطان جنگ کے ارادے سے آئے تھے نہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ ان کے پاس اپنی رفاقت اور حفاظت کے لیے فقط دو ہزار سپاہیوں کا دستہ تھا۔ تصادم سے بچنے کے لیے سلطان نے ایک بار پھر غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی اور قشتمور کے پاس ایلچی کی معرفت یہ پیغام بھیجا:

''میں لڑنے کے ارادے سے نہیں آیا، خلیفہ کا مہمان بن کر حاضر ہوا ہوں۔ مہمان کے ساتھ ایسا سلوک بے مروتی ہے۔ اس جانب ہماری آمد کا مقصد صرف یہ ہے کہ امیر المؤمنین ناصر کے سایۂ عاطفت کی پناہ حاصل کریں۔ اس وقت بلادِ اسلامیہ کو تاراج و برباد کرنے والے طاقتور دشمن نے ہر طرف غلبہ پا لیا ہے اور کوئی لشکر اس کے مقابلے کی سکت نہیں رکھتا۔ اگر خلیفۃ المسلمین میری مدد فرمائیں اور مجھے ان کی رضامندی کی پشت پناہی حاصل ہو تو میں اس گروہ تاتار سے مقابلہ کرنے اور اس کو مار بھگانے کا ذمہ لیتا ہوں۔''

[1] سیرۃ جلال الدین، ص ۱۷۰ تا ۲۰۷، چنگیز خان، ۱۷۰ تا ۱۷۲، تاریخ ابن خلدون: ۱۴۲/۵ تا ۱۴۴، ط دار الفکر

قشتمور پر سلطان کی درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ سلطان کے مٹھی بھر ساتھیوں کو روندنے کے لیے اس کے بیس ہزار سپاہی کافی ہیں، حملے کا حکم دے دیا۔ سلطان نے مقابلہ ناگزیر دیکھ کر اپنے ڈیڑھ ہزار سپاہیوں کو کچھ فاصلے پر گھات میں بٹھا دیا اور خود پانچ سو جانبازوں کے ساتھ صف بنا کر حریف افواج کے بالمقابل جا کھڑے ہوئے۔ سلطان کے ساتھ صرف پانچ سو سپاہی دیکھ کر قشتمور طوفانی انداز میں حملہ آور ہوا۔

سلطان جلال الدین نے حریف کے قلب اور پہلوؤں پر چند جارحانہ حملے کرنے کے بعد سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق پسپائی اختیار کی۔ قشتمور نے تیزی سے تعاقب کیا اور ان گھاٹیوں میں جا گھسا جہاں سلطان کے پندرہ سو سپاہی مورچہ زن تھے۔ خلافتی افواج کو یہاں پہنچتے ہی تیروں اور پتھروں کی بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس اچانک افتاد سے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ قشتمور مارا گیا اور بغدادی لشکر تیزی سے واپس مڑ کر شہر کی طرف پسپا ہو گیا۔ اس شکست کی خبر سے خلیفہ ناصر گھبرا گیا۔ اس نے بغداد کے پھاٹک بند کرا کے زبردست پہرے مقرر کر دیے اور دس لاکھ دینار کے مصارف سے زبردست دفاعی تیاریاں کر ڈالیں۔ حالانکہ سلطان جلال الدین کا بغداد پر چڑھائی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ خلافتی افواج کو گھر کا راستہ دکھا کر لوٹ آئے۔ [1]

سلطان کی شمالی ایران اور آذربائی جان میں فتوحات:

۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) میں سلطان جلال الدین نے مراغہ پر قبضہ کیا اور پھر حیرت انگیز رفتار کے ساتھ آذربائیجان پر یلغار کر کے تاتاریوں کے باج گزار حاکم اوزبک مظفر الدین بہلوان کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔

چند سال کے اندر اندر سلطان کی سلطنت ایک پتلی اور طویل پٹی کی شکل میں پنجاب سے لے کر بحیرہ خزر تک جا پہنچی۔ یہ ہزاروں میل طویل قطعہ دراصل ہندوستان سے لے کر شام اور مصر تک کی مسلم حکومتوں کے لیے تاتاری حملے سے مدافعت کا خط اول تھا۔ جسے سلطان جلال الدین نے ایک مختصر مگر تیز رفتار گھڑسوار فوج کے ذریعے اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا۔ اس دفاعی خط کو مضبوط کرنے کے لیے سلطان جلال الدین نے سلطانِ قونیہ علاؤ الدین کیقباد اور حاکم دمشق الملک المعظم ایوبی کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ خلیفہ ناصر کی وفات کے بعد نئے عباسی خلیفہ الظاہر نے بھی اس اتحاد میں شمولیت اختیار کی۔ اس طرح عالمِ اسلام کی حفاظت کے لیے ایک مستحکم دفاعی حصار قائم ہو گیا جس کی موجودگی میں تاتاری سیلاب کی لہریں ایک عرصے تک دوبارہ آگے نہ بڑھ سکیں۔ [2]

گرجستان کی فتوحات:

تاتاریوں کے حملے سے عالمِ اسلام کے دفاع کے لیے مضبوط مورچے تیار کرنے کے بعد بھی سلطان جلال الدین

---

[1] سیرۃ جلال الدین، ص ۱۸۹ تا ۲۰۷، تاریخ ابن خلدون: ۱۳۳/۵؛ روضۃ الصفا: ۳۰/۵؛ تاریخ جہان کشا، ص ۳۹۲ تا ۳۹۳، ط ھرمس

[2] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۱ھ، ۶۲۲ھ؛ سیرۃ جلال الدین، ص ۲۶۲، ۲۸۰؛ سلجوق نامہ از ابن بی بی (م ۶۸۰ھ)، اردو ترجمہ از محمد زکریا مائل، ص ۱۵۳ تا ۱۵۸، ط مرکزی اردو بورڈ لاہور

فارغ نہیں بیٹھے بلکہ اب ان کی توجہ گرجستان کے نصرانیوں کی طرف مبذول ہوگئی جو گزشتہ تقریباً ایک صدی سے عالمِ اسلام کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض تھے اور ارد گرد کی مسلم حکومتیں ان کے ظلم وستم سے جاں بلب تھیں۔ تاتاریوں کے ہاتھوں عالمِ اسلام کی خستگی وشکستگی کا حال دیکھنے کے بعد گرجی عالمِ اسلام کے باقی ماندہ ممالک خصوصاً مدینۃ الاسلام بغداد پر حملے کا منصوبہ ترتیب دے چکے تھے۔

سلطان جلال الدین نے تاتاری طوفان کی روک تھام کرنے کے بعد ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) سے لے کر ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) تک گرجستان پر پے در پے حملے کیے اور گرجیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس دوران وہ شدید بیمار بھی ہوئے مگر محاذ پر ڈٹے رہے۔ ان کی عدم موجودگی میں کرمان کے حاکم براق حاجب نے بغاوت بھی کی جسے سلطان نے خود بڑی سرعت سے یلغار کر کے فرو کیا اور دوبارہ گرجستان کے محاذ پر واپس آگئے۔ ان حملوں میں سلطان نے وہ تمام علاقے واگزار کرالیے جو گزشتہ صدی میں اسلامی مقبوضات میں داخل تھے۔ ان میں سے صرف پہلے حملے میں سلطان کے سپاہیوں کے ہاتھوں ستر ہزار گرجی قتل ہوئے جبکہ دوسرے حملے میں سلطان نے ایک لاکھ گرجیوں کو واصلِ جہنم کر کے ان کے پایۂ تخت تفلیس پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح اسلامی دنیا کے خلاف گرجیوں کے گھناؤنے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ①

علامہ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ نے گرجستان کے نصرانیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی ذلت ورسوائی کا نقشہ کھینچنے کے بعد تحریر فرمایا:

> ''ہم اور تمام مسلمان جب یہ حالات سنا کرتے تو اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو ایسا رہنما نصیب فرمائے جو ان کی حفاظت کرے، ان کی مدد کرے اور ان کا انتقام لے...... پس اللہ تعالیٰ نے ان پس ماندہ علاقوں پر نگاہِ رحمت کی۔ ان پر رحم فرمایا اور ان کو ''جلال الدین'' عطا فرمایا جس نے گرجیوں کا وہ حشر کیا جو تم دیکھ چکے ہو۔ وہ ان کافروں سے اسلام اور مسلمانوں کا انتقام لے کر رہا۔'' ②

خلیفہ ناصر کی وفات:

سلطان جلال الدین کو گرجستان سے تبریز آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ بغداد میں خلیفہ ناصر کا انتقال ہوگیا۔ یہ آخری شب رمضان ۶۲۲ھ (۱۵ اکتوبر ۱۲۲۵ء) کا واقعہ ہے۔ خلیفہ ناصر نے ستر سال کے لگ بھگ عمر پائی اور تقریباً ۴۷ سال حکومت کی۔ خلفائے بنو امیہ اور خلفائے بنو عباس میں سے کسی کو اتنی طویل مدتِ حکومت نصیب نہیں ہوئی، مگر افسوس کہ خلیفہ ناصر نے طویل اقتدار کی نعمت سے حقیقی معنوں میں فائدہ نہ اُٹھایا اور عالمِ اسلام کی وہ جرأت مندانہ قیادت نہ کی جس کی اس دور میں ضرورت تھی بلکہ اس کا طرزِ عمل برعکس رہا جو اس کی بدنامی کا باعث بنتا رہا۔ ③

---

① البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۲۲ھ، ۶۲۳ھ، ۶۲۴ھ، ۶۲۵ھ؛ تاریخ جہان کشا: ص ۴۹۷ تا ۵۰۳، ط ہرمس؛ سیرۃ سلطان جلال الدین: ص ۱۹۷ تا ۲۱۹ ② الکامل فی التاریخ: ۳۹۶/۱۰، ط دار الکتاب العربی ③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۲ھ

باطنی فرقے کی سرکوبی:

تاتاریوں کی پہلی یورش ہی سے اسلامی دنیا اس قدر شکستہ، ریختہ، غیر منظم اور بدحواس ہو چکی تھی کہ ہر قسم کے گمراہ فرقے عالمِ اسلام کو سازشوں کے جال میں جکڑنے کے بارے میں بڑے پُر امید اور مستعد نظر آ رہے تھے۔ خصوصاً قزوین کے قریب قلعہ ''اَلَموت'' کی باطنی سلطنت عالمِ اسلام کے لیے ایک بہتے ہوئے ناسور اور زہریلے پھوڑے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ یہ باطنی مذہب کے پیروکاروں کا مرکز تھا۔ ان کے تربیت یافتہ ایجنٹ اپنے مذہبی پیشوا کی تربیت کے مطابق دنیائے اسلام کے بڑے بڑے دریاؤں اور مراکز میں خفیہ طور پر موجود رہتے تھے اور حکم ملتے ہی کسی بھی قیمتی ہستی کا خون بہا کر عالمِ اسلام کو چشم زدن میں نہایت کاری زخم لگا دیتے تھے۔ قزوین کے کوہستان میں ان کے فلک بوس قلعے تھے جہاں سے یہ اپنی گھناؤنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔

گرجیوں کی سرکوبی اور تفلیس کی فتح کے بعد سلطان جلال الدین نے باطنیوں کو لگام دینے کی کوشش کی۔ جب تنبیہ اور فہمائش ان کے لیے کافی نہ ہوئی تو سلطان نے برق وباراں کی طرح یلغار کرتے ہوئے باطنی سلطنت پر حملہ کر دیا اور قلعہ ''اَلَموت'' کے سوا ان کے باقی تمام قلعوں پر قبضہ کر کے ان کی بہت بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس طرح باطنی فتنہ جس نے تقریباً ایک صدی سے اسلامی دنیا کے درباروں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اپنی سرگرمیاں نہایت محدود کرنے پر مجبور ہو گیا۔[1]

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ تحریر کرتے ہیں:

''سلطان جلال الدین نے باطنیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائیاں کیں اور ان سے انتقام لیا۔ واقعی باطنیوں کا شر اور ضرر بہت بڑھ چکا تھا۔ تاتاری حملے کے بعد اسلامی ممالک میں ان کی حرص بہت بڑھ گئی تھی، مگر سلطان جلال الدین نے ان کے ظلم وستم کی راہ مسدود کر کے ان کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا۔''[2]

قریب تھا کہ سلطان جلال الدین باطنیہ کے آخری مرکز قلعہ الموت کو بھی سر کر لیتے مگر اچانک تاتاریوں کی پیش قدمی کی خبر نے ان کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

تاتاریوں کی دوبارہ یورش۔ چنگیز خان کی موت:

چنگیز خان کی زندگی کے آخری ایام میں تاتاریوں نے ایک بار پھر سلطان کے خلاف یلغار کا آغاز کیا۔ تاتاریوں کے اس حملے سے قبل سلطان کا مسلم حکمرانوں کے ساتھ قائم کردہ وہ اتحاد کرچی کرچی ہو چکا تھا جس میں ان کے ساتھ حاکم شام ملک المعظم، عباسی خلیفہ ظاہر اور حکمرانِ ایشیائے کوچک سلطان علاؤ الدین کیقباد شامل تھے۔ ملک المعظم اور خلیفہ ظاہر سلطان جلال الدین کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے تھے۔ اب صرف سلطان علاؤ الدین کیقباد ہی ان کا واحد

---

① سیرۃ جلال الدین، ص ۲۲۸ تا ۲۳۰؛ تاریخ ابن خلدون: ۱۳۶/۵ تا ۱۳۹، ط دار الفکر

② الکامل فی التاریخ: ۴۲۳/۱۰، ط دار الکتاب العربی

حلیف رہ گیا تھا۔ اس لیے تاتاریوں کو سلطان جلال الدین پر تیغ آزمائی کا سنہرا موقع ہاتھ آیا تھا، مگر اس کسمپرسی کے عالم میں بھی سلطان جلال الدین نے اپنی تمام توانائیاں مجتمع کر کے رے کے میدان میں تاتاریوں کے ساتھ شدید مقابلہ کیا۔ نصرت خداوندی مسلمانوں کے شاملِ حال رہی اور تاتاری شکست کھا کر پسپا ہو گئے۔ [1] چنگیز خان کی زندگی میں عالمِ اسلام پر تاتاریوں کا یہ آخری حملہ تھا۔ اس لڑائی کے چند دنوں بعد چار رمضان ۶۲۴ھ کو ۷۳ سالہ چنگیز خان مسلسل بیماری کے باعث صحرائے گوبی میں فوت ہو گیا۔ [2]

اگلے سال چنگیز خان کے جانشین اوکتائی خان نے مزید تیاریوں کے ساتھ دو بڑے لشکر تیار کر کے سلطان کے مقابلے میں بھیجے۔ اس بار رے اور اصفہان کے میدانوں میں سلطان جلال الدین اور تاتاری وحشیوں کے مابین کئی زبردست معرکے ہوئے۔ پہلے دو معرکوں میں سلطان کو جزوی نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ تیسرا معرکہ جو ۲۲ رمضان ۶۲۵ھ (۲۶ اگست ۱۲۲۸ء) کو اصفہان سے باہر ہوا، تاریخ کی یادگار جنگوں میں سے ہے۔

اس جنگ میں سلطان کے سوتیلے بھائی غیاث الدین کا کردار بڑا شرمناک رہا۔ وہ معرکہ گرم ہوتے ہی اپنے سپاہیوں سمیت میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا تھا جس سے مسلمانوں کی افرادی قوت میں نمایاں کمی واقع ہو گئی تھی۔ جنگ کے آخری لمحات میں صورتحال نہایت عجیب تھی۔ رات کی تاریکی میں دونوں فوجیں بے ترتیب اور منتشر انداز میں باہم ٹکراتی رہیں اور انجام کار مسلمان اور تاتاری دونوں اندھیرے کو آڑ بنا کر میدانِ جنگ سے پسپا ہو گئے۔ [3]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ ایسی گھمسان کی جنگ تھی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، اس لیے کہ دونوں فریق میدانِ جنگ سے پسپا ہو گئے تھے۔'' [4]

اس جنگ کے دوران سلطان کے بھائی غیاث الدین کی غداری اور بعض افسران کے جذباتی پن اور ضد کے باعث لڑائی میں مسلمانوں کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا اور بڑے بڑے کمانڈر شہید ہو گئے۔ خود سلطان جلال الدین آٹھ دن تک لاپتہ رہے۔ لڑائی سے بچ جانے والے مسلمان اصفہان کی فصیلوں میں پناہ لیے ہوئے تھے اور تاتاری شہر سے باہر محاصرہ کر چکے تھے۔ اہلِ شہر کا مایوسی، بے حسی اور خوف سے بُرا حال تھا۔ یکم شوال کو اسی حالت میں نمازِ عید کی صفیں قائم کی جا رہی تھیں کہ سلطان جلال الدین سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ ان کو زندہ دیکھ کر مسلمان خوشی سے بے قابو ہو گئے اور ان کے استقبال کے لیے دوڑے۔ یوں نمازِ عید کی مسرت دوبالا ہو گئی۔

چند دن کی تیاری کے بعد سلطان جلال الدین ایک بار پھر اصفہان کی فصیلوں کے باہر کھلے میدان میں تاتاریوں سے نبرد آزما ہوئے۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ اس بار اللہ کی مدد و نصرت سے مسلمانوں نے شاندار فتح حاصل کی اور تاتاری

---

① سیرۃ جلال الدین، ص ۲۳۲ تا ۲۳۳؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۵ھ

② روضۃ الصفا: ۵/۴۱، ط نولکشور

③ سیرۃ جلال الدین، ص ۲۳۴ تا ۲۳۶؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۵ھ

④ العبر فی خبر من غبر: ۳/۱۹۲، ط العلمیۃ

بُری طرح پٹ کر بھاگے۔ سلطان نے اصفہان سے لے کر رے تک (کوئی تین سو کلومیٹر تک) ان کا تعاقب جاری رکھا اور چن چن کر ان کو قتل کیا۔ بچے کھچے تاتاری دریائے جیحوں عبور کر کے واپس چلے گئے اور آئندہ تین سال تک ان کو دریا عبور کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ [1]

گرجستان کی تاریخی لڑائی:

سلطان جلال الدین تاتاریوں کی گوشمالی سے فارغ ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے آس پاس کی چھوٹی کوئی درجن بھر خود مختار حکومتیں متحدہ محاذ بنا کر ان کے خلاف صف آرائی کی تیاریاں کررہی ہیں۔ دراصل سلطان کی پے در پے فتوحات سے ان کے وہ پڑوسی سخت مضطرب اور بے چین تھے جو تاتاریوں سے لڑنے کا حوصلہ نہ رکھنے کے باعث ان کے ذہنی غلام بن چکے تھے چوں کہ سلطان کی بہادری، ہمت اور مسلسل کامیابیوں نے ان حکمرانوں کی بزدلی اور کم ہمتی کو دنیا بھر پر عیاں کردیا تھا، اس لیے ان کا حسد سلطان کے خلاف اتحاد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس اتحاد میں گرجی، قپچاق، ارمن، الان، لکسز، سریر، سونیان، ابخاز اور جانیت قبائل نمایاں تھے۔ سلطان جلال الدین اپنے جانبازوں کو لے کر دشمن کے مقابلے کے لیے نکلے۔ اتحادی افواج سیلاب کی طرح بڑھی چلی آرہی تھیں۔ ایک وسیع میدان میں دونوں فریق صف آراء ہوئے۔ اتحادی فوجوں کی قیادت گرجیوں کے ہاتھ میں تھی۔

سلطان جلال الدین نے مقابلے سے قبل دُشمن کے دائیں بازو میں موجود بیس ہزار قپچاقی سپاہیوں سے خفیہ خط و کتابت کر کے ان کو اتحادی فوجوں سے علیحدگی پر رضامند کرلیا۔ قپچاقی اپنے پرچم اُٹھائے میدان سے باہر نکل گئے۔ ایک طاقتور حلیف کی قبل از جنگ جدائی نے اتحادی افواج کے باہمی اعتماد کو زبردست دھچکا لگایا اور لڑائی سے پہلے ہی ان میں بددلی پھیلنے لگی۔ اب سلطان جلال الدین نے دُشمن پر ایک اور نفسیاتی چوٹ لگائی۔ وہ خود بھیس بدل کر دونوں فوجوں کے درمیان آکودے اور مبارزت طلب کرنے لگے۔ دُشمن کی جانب سے یکے بعد دیگرے پانچ دیوقامت پہلوان مقابلے کے لیے آئے اور سلطان جلال الدین نمبروار مقابلہ کر کے ایک ایک کو موت کے گھاٹ اُتارتے چلے گئے۔ دُشمن کے سپاہیوں کے دل ڈوب رہے تھے اور وہ حیرت زدہ نگاہوں سے اپنے چنے ہوئے بہادروں کی لاشیں دیکھ رہے تھے۔ سلطان کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ ان کے اشارے پر مسلمانوں نے عمومی حملہ کردیا۔ مرعوب و سراسیمہ دُشمن کئی گنا ہوتے ہوئے بھی کچھ دیر کے مقابلے کے بعد پشت پھیر کر بھاگ نکلے۔ [2]

سلطان کے خلاف مسلم حکمرانوں کی مشترکہ مہم:

اگرچہ تاتاریوں کے خلاف کامیاب مدافعت کے باعث عام مسلمان سلطان جلال الدین کے ممنونِ احسان تھے، مگر اردگرد کے تمام مسلم و غیر مسلم حکمران ان کے خلاف حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔ اس کے علاوہ خود سلطان کے

---

(1) سیرة جلال الدین، ص ۲۳۷، ۲۳۸؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۶۲۵ھ

(2) تاریخ جہان کشا: ۲/ ۵۰۸ تا ۵۱۱، ط ہرمس

اپنے امراء میں بھی غداروں کی کمی نہ رہی تھی جو سلطان سے بددل ہو کر یا اغیار کے زرخرید بن کر اپنے آقا کے خلاف ہر قسم کی سازشوں میں حصہ دار بن گئے تھے۔ خود خوارزمی سلطنت کا وزیر اعظم سلطان کے خلاف منصوبہ بندیوں میں پیش پیش تھا۔ ۶۲۷ھ میں بہت کم افراد ایسے رہ گئے تھے جن پر سلطان جلال الدین اعتماد کر سکتے تھے۔ شام کا حاکم ملک الاشرف پہلے ہی سلطان جلال الدین کا حریف تھا۔ کچھ عرصے بعد سلطان جلال الدین کا واحد حلیف شاہ ایشیائے کوچک سلطان علاؤ الدین کیقباد بھی ان کا مخالف ہو گیا۔ اس وقت یہ دونوں حکمران اسلامی دنیا کے خوشحال، باثروت اور طاقتور ترین بادشاہوں میں سے تھے۔ ملک الاشرف اور سلطان علاؤ الدین کیقباد نے سلطان جلال الدین سے مقابلے کے لیے ایک مشترکہ فوج ترتیب دی۔ مصر کی افواج بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئیں۔

۲۸ رمضان ۶۲۷ھ (۱۱ راگست ۱۲۳۰ء) کو یاسی چمن کے مقام پر سلطان جلال الدین اور اتحادی حکمرانوں میں ایک افسوسناک معرکہ ہوا۔ سلطان جلال الدین اس وقت سخت بیماری کے باعث صاحبِ فراش تھے، اس لیے اپنی فوج کی کمان کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ نیز وہ اکثر کہنہ مشق جرنیل جن پر سلطان کو بھروسہ تھا، تاتاریوں سے گزشتہ لڑائی میں شہید ہو چکے تھے۔ گویا اب فوج بغیر سالار کے لڑ رہی تھی۔ نتیجتاً ان کو بُری طرح شکست ہوئی۔

خوارزمی فوج کے ہزاروں سپاہی کام آ گئے۔ ایک بڑی تعداد گرفتار ہو گئی۔ بہت سے منتشر ہو کر اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ سلطان جلال الدین بمشکل صرف سات آدمیوں کے ہمراہ جان بچا کر واپس ہوئے اور اتحادی افواج نے پیش قدمی کر کے ان کے مفتوحہ علاقوں کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔[1]

تاتاریوں کا حملہ اور سلطان کی پکار:

۶۲۸ھ کے آغاز میں سلطان جلال الدین کی حیثیت سمندری طوفان میں ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کے اس ملاح کی سی تھی، جس کے بس میں کچھ نہ رہا ہو۔ نہ ان کو کسی ہمسائے کی اعانت حاصل تھی، نہ ہی ان کے بازوئے شمشیر زن میں پہلے جیسا دم خم باقی رہا تھا۔ سالہا سال کی مسلسل جنگوں اور اسفار کی بے آرامی نے ان کی صحت کو تباہ کر دیا تھا۔ ان کے وزراء خائن اور امراء سرکش تھے۔ سپاہیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ اسلحہ، خوارک اور رسد کے انتظامات ناکافی تھے، خزانہ خالی تھا۔ سلطان کے دُشمنوں کو اسی موقع کا انتظار تھا۔ ''اَلَموت'' کے باطنی حاکم نے تاتاریوں کو پیغام بھیج کر احساس دلایا کہ اس موقع سے ضرور فائدہ اُٹھایا جائے۔

موسم سرما کی آمد آمد تھی کہ تاتاری افواج نے زبردست تیاریوں کے بعد دریائے جیحوں عبور کر لیا۔ سلطان کو اطلاع ہوئی تو اپنی حالت پر تڑپ کر رہ گئے۔ ان کا بدترین دُشمن ایسے وقت میں ان پر حملہ آور ہو رہا تھا جب ان کے پاس مقابلے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سلطان کے پاس اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ بچا تھا کہ وہ اپنے ہمسایہ مسلم حکمرانوں سے اسلام کے نام پر مدد طلب کریں۔ شاید کہ تاتاریوں کی شمشیر اپنی شہ رگ کے قریب دیکھ کر یہ حکمران مشترکہ ملی مفاد

---

[1] سیرۃ جلال الدین، ص ۳۰۰ تا ۳۳۰، سلجوق نامہ: ۱۲۰ تا ۱۲۳، الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۷ھ، تاریخ الاسلام للذھبی، سنۃ ۶۲۷ھ

کے لیے ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے دربارِ خلافت سے لے کر ارد گرد کے ہر چھوٹے بڑے حکمران کو یہ خط لکھا:

''شاہِ تاتار کا لشکر دریائے جیحوں عبور کر چکا ہے۔ میں آپ سب کے دفاع کے لیے سدِ سکندری بن کر کھڑا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک اپنے پرچم کے ساتھ ایک فوج میری مدد کے لیے بھیجے تا کہ ہمارے سپاہیوں کے حوصلے بلند اور دُشمنوں کے دانت کند ہو جائیں۔ اب میں اتمام حجت کر چکا ہوں اگر آپ نے کوتاہی کی تو انجامِ بد خود دیکھ لیں گے۔''

اُدھر تاتاری سفیر بھی مسلم حکمرانوں کے پاس پہنچ گئے تھے اور ان کو سلطان جلال الدین کی مدد کرنے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ بزدل حکمرانوں پر یہ دھمکیاں کام کر گئیں، لہٰذا کسی نے سلطان کی درخواست کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ چنانچہ تاتاریوں نے مطمئن ہو کر سلطان کے مقبوضہ علاقوں پر جو درحقیقت تمام عالمِ اسلام کی سرحد تھے، حملہ کر دیا۔ وہ بے دریغ قتل عام کرتے ہوئے ان شہروں اور صوبوں کو روندتے گئے جو سلطان جلال الدین کی تلوار کی حفاظت میں گزشتہ دس سال میں آباد ہوئے تھے۔ ①

سلطان کا انجام:

تاتاریوں کی کئی فوجیں صرف سلطان جلال الدین کو تلاش کرنے پر مامور تھیں۔ سلطان تقریباً سو ساتھیوں کے ساتھ ایک گاؤں میں روپوش تھے کہ کسی غدار نے مخبری کر دی۔ تاتاریوں نے راتوں رات حملہ کر کے سلطان کے اکثر ساتھیوں کو شہید کر دیا جبکہ سلطان جلال الدین اپنے دو غلاموں کے ہمراہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر کردستان کے پہاڑوں میں یہ دو غلام بھی اپنے آقا کی حفاظت کرتے کرتے ان پر قربان ہو گئے۔ اس کے بعد سلطان جلال الدین تنِ تنہا کسی نامعلوم مقام کی طرف نکل گئے۔ روایات کے اختلاف کی بنا پر سلطان جلال الدین کے انجام کے متعلق حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مشہور روایت یہ ہے کہ کردستانی ڈاکوؤں نے انہیں گرفتار کر کے ایک گھر میں قید کر دیا۔ بعد ازاں ایک غضبناک کُردی نے اس گھر میں داخل ہو کر سلطان جلال الدین کو نیزے کا وار کر کے شہید کر دیا۔ بقول مؤرخین یہ واقعہ وسط شوال ۶۲۸ھ / وسطِ اگست ۱۲۳۱ء کا ہے۔ دوسری روایت کے مطابق جس شخص کو کردوں نے سلطان جلال الدین سمجھ کر قتل کیا تھا، وہ دراصل سلطان کا سلاح دار تھا اور ان کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ جبکہ سلطان ایک درویش کے لباس میں نامعلوم مقام کی طرف نکل گئے تھے اور پھر کبھی دشمن کے ہاتھ نہ آئے۔ ②

سلطان کے بعد عالم اسلام کا حال:

سلطان جلال الدین کی شہادت یا گمشدگی کے بعد تاتاریوں کی یہ دوسری یورش شام، عراق، الجزیرہ اور دیگر مسلم

① تاریخ جہان کشا: ۲/۵۱۸ تا ۵۲۰، ط ہرمس؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۶۲۸ھ؛ سیرة جلال الدین، ص ۳۵۰ تا ۳۶۲

② تاریخ جہان کشا: ۲/۵۲۰ تا ۵۲۶، ط ہرمس؛ الکامل فی التاریخ: ۱۰/۴۵۰؛ سیرة جلال الدین، ص ۳۶۵ تا ۳۸۰؛ تاریخ الاسلام للذھبی: سنة ۶۲۸ھ

ممالک تک پھیل گئی۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ اس سانحے پر یوں رقم طراز ہیں:

''تاتاری قتل و غارت گری کر کے اس طرح صحیح وسلامت واپس لوٹے کہ انہیں کسی کا خوف نہ تھا۔ ایک گھڑسوار بھی ان کے سامنے حائل نہ ہوا۔ دیار بکر، الجزیرہ، اربل اور خلاط میں انہوں نے جو چاہا کیا۔ نہ کسی نے ان کو روکا نہ کوئی ان کے مقابلے میں کھڑا ہوا۔ سلاطینِ اسلام بلوں میں دبک گئے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ جلال الدین کی خیر خبر ملنا بھی منقطع ہوگئی۔''[1]

اسی پسِ منظر میں ڈاکٹر ایڈورڈ براؤن لکھتا ہے:

''کافر غارتگر منگول لشکروں کے سامنے جلال الدین اسلام کا آخری محافظ تھا۔''[2]

ایک عرصے تک سلطان جلال الدین کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلتی رہیں۔ تاتاریوں کو جہاں اس بارے میں کوئی سن گن ملتی وہ سلطان کی تلاش میں اس علاقے کا چپہ چپہ چھان مارتے۔ کتنے ہی افراد ایسے تھے جن کو سلطان جلال الدین خیال کر کے شہید کر دیا گیا۔ بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے سلطان جلال الدین ہونے کا دعویٰ کیا مگر جلد ہی ان کا جھوٹ کھل گیا۔[3]

سلطان جلال الدین اگرچہ اپنی زندگی میں کفار کو مغلوب نہ کر سکے مگر وہ درحقیقت ناکام نہیں ہوئے۔ اللہ کی راہ میں لڑنے والے مجاہدین کا جذبہ فتح وشکست سے بلند تر ہوتا ہے۔ اللہ کا حکم پورا کر کے اس کو راضی کرنا ان کا مقصودِ اصلی ہوتا ہے، اس لیے وہ ہر حال میں کامیاب رہتے ہیں۔ سلطان جلال الدین اس عظیم مقصد کو حاصل کر کے سرخ رو ہو گئے۔ آج بھی ان کی زندگی ظلم واستبداد کے خونی پنجوں سے نبرد آزما مجاہدوں کے جذبات کے لیے مہمیز کا کام دے رہی ہے جبکہ تاتاریوں کی اعانت کرنے والے ملت فروش مسلم حکمرانوں کا عبرتناک انجام، ان عاقبت نااندیشوں کو آئینہ دکھا رہا ہے جو اسلامی اخوت کو نظر انداز کر کے دوسروں کی تباہی کا تماشا دیکھتے ہیں اور انجام کار خود بھی بھسم ہو جاتے ہیں۔

سلطان کے ساتھیوں کا انجام:

سلطان کی گمشدگی کے بعد ان کے امراء اور سپاہی منتشر ہو گئے۔ کچھ اصفہان میں مقیم رہے یہاں تک کہ تاتاریوں نے ۶۳۹ھ میں وہاں قبضہ کر لیا۔ سلطان کے بہت سے سپاہی سلاجقۂ روم کے فرمانروا علاؤالدین کیقباد کی فوج میں شامل ہو گئے۔ ۶۳۴ھ میں کیقباد کی وفات کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین کے خسرو تخت نشین ہوا جس نے شکوک وشبہات کی بناء پر بعض خوارزمی افسران کو قید کر دیا۔ باقی خوارزمی فرار ہو گئے اور ایک عرصے تک آوارہ گردی اور لوٹ مار میں مصروف رہے۔ آخر کار ملک الصالح نجم الدین ایوب نے جو اپنے باپ الملک الکامل کی جانب سے حران، آمد اور کیفا کا حاکم تھا، باپ کی اجازت سے ان کو اپنی فوج میں شامل کر لیا۔[4] ان افسران میں برکہ خان خوارزمی، صاروخان اور بردی خان

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ٦٢٨ھ

② تاریخ ادبیاتِ ایران: ١١/٢، ط مرکز تحقیقات، اصفہان

③ تاریخ جہان کشاجوینی، ص ٥٢٦، ٥٢٧، ط ہرمس

④ تاریخ ابن خلدون: ١٦٧/٥، ١٦٨، ط دار الفکر

قابلِ ذکر ہیں۔ برکہ خوارزمی ان سب کا سردار تھا۔ اس کا مرتبہ اس وقت مزید بلند ہوگیا جب اس کی بیٹی الملک الصالح ایوب سے بیاہی گئی۔ تاہم ایک مدت بعد برکہ خوارزمی الصالح ایوب کا مخالف ہوکر اس کے حریف حاکمِ دمشق الصالح اسماعیل کی صف میں شامل ہوگیا۔ اس کش مکش کے نتیجے میں ۶۴۴ھ میں حمص کے قریب جنگ ہوئی جس میں برکہ خوارزمی مارا گیا۔ صاروخان اور بردی خان اس سے ایک سال قبل فوت ہوچکے تھے۔ اس لیے تھوڑی مدت میں خوارزمی امراء کی جمعیت منتشر ہوگئی۔[1]

سلطنتِ خوارزم شاہی

دورِ اقتدار ۱۵۳ سال

(۴۷۵ھ ...... تا ...... ۶۲۸ھ (۱۰۸۲ء ...... تا ...... ۱۲۳۱ء)

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	انجام	خاص بات
۱	انوشت گین	۴۷۵ھ تا ۴۹۰ھ (۱۰۸۲ء تا ۱۰۹۷ء)	وفات	بانی دولتِ خوارزمیہ۔ سلاجقہ کے ماتحت صوبہ داری
۲	محمد قطب الدین بن انوشت گین	۴۹۰ھ تا ۵۲۲ھ (۱۰۹۷ء تا ۱۱۲۸ء)	وفات	سلاجقہ کے ماتحت صوبہ داری
۳	آتسز مظفر الدین بن محمد قطب الدین	۵۲۲ھ تا ۵۵۱ھ (۱۱۲۸ء تا ۱۱۵۶ء)	وفات	۵۳۸ھ میں دولتِ خوارزمیہ کا استقلال
۴	ایل ارسلان	۵۵۱ھ تا ۵۶۷ھ (۱۱۵۶ تا ۱۱۷۲)	وفات	
۵	علاؤ الدین تکش	۵۶۷ھ تا ۵۹۶ھ (۱۱۷۲ء تا ۱۲۰۰ء)	وفات	اپنے بھائی سلطان شاہ سے بیس سال تک خانہ جنگی۔
۶	علاؤ الدین محمد	۵۹۶ھ تا ۶۱۸ھ (۱۲۰۰ء تا ۱۲۲۱ء)	وفات	دولتِ خوارزمیہ کا عروج، چنگیز خان کا حملہ
۷	جلال الدین منکبرتی	۶۱۸ھ تا ۶۲۸ھ (۱۲۲۱ء تا ۱۲۳۱ء)	شہید یا گم شد	چنگیز خان اور اس کے بیٹوں سے جہاد، آخری خوارزمی حکمران

---

[1] تاریخ الاسلام للذہبی، وفیات سنۃ ۶۴۴ھ

پانچواں باب

سقوطِ بغداد

۶۵۶ ھجری

۱۲۵۸ عیسوی

سانحۂ بغداد

تاتاریوں کا سیلِ بے کراں، عالمِ اسلام کے بڑے حصے پر قابض ہونے کے بعد مدینۃ الاسلام بغداد کے سامنے کئی سال تک رکا رہا۔ اس دوران منگولیا میں تاتاریوں کی مرکزی قیادت چنگیز خان کے پوتے منگو خان کے پاس آ چکی تھی جبکہ ایران وخراسان میں اس کا دوسرا پوتا ہلاکو خان حاکم تھا۔ قدرتِ خداوندی نے غفلت میں ڈوبے ہوئے قصرِ خلافت کے تاجداروں کو اپنی کوتاہیوں کو تلافی کے لیے ایک طویل وقفہ دیا، لیکن جب انہوں نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا تو قانونِ فطرت نے ان کو دنیا کے لیے عبرت بنا کر رکھ دیا۔

بغداد خلیفہ ناصر کے دور میں:

اس آخری دور میں بغداد کی جو حالت تھی اس پر بھی ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ ۵۷۵ھ میں خلیفہ الناصر بغداد میں مسند نشین ہوا تھا جس نے تقریباً ۴۷ سال حکومت کی۔ اکثر مؤرخین کے مطابق اس کے زمانے میں خلافتِ عباسیہ کے سقوط کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''رعایا کے ساتھ اس کا سلوک نہایت خراب اور ظالمانہ تھا۔ اس کے زمانے میں عراق ویران ہو گیا۔ ملک کے باشندے مختلف شہروں اور ملکوں میں بکھر گئے۔ خلیفہ نے ان کی جائیدادیں اور دولت ضبط کر لیں۔ اس کے کاموں میں سخت تضاد تھا۔ ایک دن ایک فیصلہ کرتا اور دوسرے دن اس کے الٹ کرتا۔ اس نے رمضان میں روزہ داروں کے لیے افطار کا اہتمام شروع کیا، کچھ مدت بعد یہ سلسلہ بند کر دیا۔ حاجیوں کی مہمانی کا انتظام شروع کرایا، پھر اسے بھی بند کرا دیا۔ عوام سے کچھ ٹیکس معاف کیے۔ پھر انہیں دوبارہ عائد کر دیا۔ اس کی تمام تر دلچسپیاں گولیوں سے نشانہ بازی، پالتو پرندوں سے کھیلنے اور کبوتر بازی سے وابستہ تھیں۔''[1]

غرض اس طرح اصل عسکری فنون کا دائرہ گھٹتا چلا گیا، معاشرے میں شمشیر زنی، نیزہ بازی اور گھڑ سواری جیسے حربی فنون اور عسکری کھیلوں کا رجحان کم ہو گیا اور تفریحی مشاغل زیادہ اہم ہو گئے، انجام یہ ہوا کہ مردانہ کمالات اور فنونِ حرب عراق سے ناپید ہو گئے۔ ناصر کے تفریحی مزاج نے نہ صرف عوام سے جہاد کا بچا کھچا ذوق ختم کر دیا بلکہ انہیں اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ وہ آیندہ کسی مرحلے پر دشمنانِ اسلام کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کے بقول خلیفہ ناصر کے یہ مشاغل ریاست کے زوال اور تباہی کی دلیل تھے۔[2]

---

[1] الکامل فی التاریخ: سنة ۶۲۲ھ

[2] تاریخ ابن خلدون: ۳/۶۶۰، ط دار الفکر

الناصر انتہائی بخیل اور زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کا نہایت حریص تھا۔ اس نے قصرِ خلافت میں ایک بہت بڑا خفیہ (زمین دوز) حوض بنوایا تھا جس میں فقط سونا جمع کیا جاتا تھا۔ وہ اس حوض کے کنارے آ کر کہا کرتا تھا:

''کیا اس کے بھرنے تک میں زندہ رہ پاؤں گا؟''[1]

یہ بات بھی تفصیل سے پیچھے گزر چکی ہے کہ الناصر ہی نے چنگیز خان کو خوارزم پر حملے کی دعوت دی تھی جس کا نتیجہ اتنا بھیانک نکلا کہ وسطِ ایشیا اور خراسان سے لے کر ہندوستان اور عراق تک تاتاریوں کا تسلط ہو گیا اور یہاں کی مقامی مسلم آبادیاں ملیامیٹ ہو گئیں۔ ایک نہایت خطرناک بات یہ بھی تھی کہ الناصر کے دور میں بغداد میں مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات شدت اختیار کر گئے، مذہبی منافرت مزید بڑھتی گئی یہاں تک کہ حکمران طبقے اور قصرِ خلافت میں بھی ان اختلافات کی بنیاد پر مستقل فریق پائے جانے لگے تھے۔ انہی میں سے ایک فریق آگے چل کر بغداد کی عبرت ناک تباہی اور خلافتِ عباسیہ کے حسرتناک انجام کا فوری سبب بنا۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ناصر کے دور میں عاشوراء کے ماتمی جلوس (جو ایک صدی سے زائد مدت سے بند تھے) پھر شروع ہو گئے اور شیعہ سنی فسادات بھی دوبارہ بھڑک اٹھے۔ اس سلسلے کا پہلا جلوس محرم ۵۸۲ھ میں نکلا۔ شیعوں نے سڑکوں پر آ کر نعرے لگائے اور کہا: ''اب خاموش رہنے اور تقیہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

انہوں نے سرِ عام صحابہ کی توہین کی جس پر لوگ مشتعل ہوئے اور حالات کشیدہ ہو گئے۔ اگلے سالوں میں یہ کشیدگی اہلِ بغداد کی زندگی کا حصہ بن گئی۔[2]

الظاہر کا مثالی مگر مختصر دور:

الناصر کا جانشین الظاہر اپنے باپ کے برخلاف بڑا متقی، پابندِ سنت، عادل اور رحم دل انسان تھا۔ اس نے بے گناہ لوگوں کو جیلوں سے رہا کر دیا۔ ان پر عائد جرمانے معاف کر دیے۔ اس کے دور میں چیزیں سستی ہو گئیں اور لوگ خوشحال ہونے لگے۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس نے خلیفہ بن کر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا زمانہ دہرا دیا۔ اگر کوئی کہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بعد اس جیسا خلیفہ اور کوئی نہیں آیا تو وہ سچا ہوگا۔ اس نے اپنے باپ اور اس سے پہلے خلفاء کے دور میں غصب کی گئیں جائیدادیں لوٹا دیں۔ تمام شہروں سے ٹیکس معاف کر دیے۔''

گزشتہ خلیفہ کے دور میں جاسوس مختلف عوامی محفلوں میں ہونے والی لوگوں کی باہمی گفتگو کا احوال لکھ لکھ کر خلیفہ کو بھیجا کرتے تھے۔ الظاہر نے اس سے منع کر دیا اور کہا: ''ہمیں لوگوں کی نجی مجلسوں کی باتیں جاننے سے کیا غرض۔ ہمیں بس وہی بات بتائی جائے جس کا تعلق حکومت کے ساتھ ہو۔'' کہا گیا: ''اس طرح تو لوگ بگڑ جائیں گے۔'' الظاہر نے کہا: ''ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کی اصلاح کر دے۔''

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۷/۲۶۰، غالباً یہی زمین دوز حوض تھا جسے ۶۵۶ھ میں ہلاکو خان نے لوٹا تھا۔ [2] العبر فی خبر من غبر: سنۃ ۵۸۲ھ

مگر جیسا کہ اس زمانے کے اہل اللہ کو خدشہ تھا، اس نیک سیرت خلیفہ کی مدتِ خلافت مختصر ثابت ہوئی اور وہ نو ماہ کے بعد انتقال کر گیا۔ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اللہ پاک جانتا ہے کہ جب سے یہ خلیفہ بنا، مجھے زمانے کے فساد اور لوگوں کی خرابی دیکھ کر ڈر تھا کہ کہیں اس کا دور مختصر نہ ہو، یہ بات میں اپنے کئی دوستوں سے کہہ چکا تھا کہ ہمارا زمانہ اور ہمارے دور کے لوگ اس جیسے نیک آدمی کے حق دار نہیں ہیں۔ پس ایسا ہی ہوا۔'' [1]

مستنصر باللہ کا زمانہ:

الظاہر کے بعد اس کا بیٹا مستنصر خلیفہ ہوا۔ اس کو حکومت کے لیے ۱۷ برس کا طویل وقت ملا۔ وہ ایک قابل، فیاض، ہوشیار اور محتاط انسان تھا۔ اس نے ایک طرف تاتاریوں سے بھی تعلقات بنا کر رکھے، دوسری طرف سلطان جلال الدین کو بھی تعاون کی امیدیں دلاتا رہا۔ تاہم وہ اس میں سنجیدہ نہ تھا، اس لیے آخر میں اس نے سلطان سے عین موقع پر غیر جانبداری اختیار کی اور اس طرح سلطنتِ خوارزم کو ملیامیٹ ہو جانے دیا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ ۶۲۸ھ میں سلطان جلال الدین کی گم شدگی کے بعد تاتاری بغداد کی سرحدوں تک آ گئے۔ مستنصر بغداد کی حفاظت کے لیے فکر مند تھا اس لیے خطیر اخراجات صرف کر کے ایک بڑی فوج مرتب کی جس میں ایک لاکھ گھڑ سوار تھے۔ اس طرح بغداد پر تاتاریوں کا قبضہ آسان نہ رہا۔ ۶۳۵ھ میں تاتاری بغداد کے مضافاتی علاقوں میں غارت گری کرنے لگے تو خلیفہ کے چند امراء افواج لے کر ان کی طرف گئے اور انہیں مار بھگایا۔ [2]

۶۳۸ھ میں تاتاری خاقان اوکتائی کی جانب سے بغداد سمیت تمام ملکوں کے حکام کی طرف یہ تنبیہی پیغام بھیجا گیا:

''پروردگارِ فلک کے نائب، زمین کو بچھانے والے، مشرق و مغرب کے مالک خاقان کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ تمام شہروں کی فصلیں مسمار کر دی جائیں اور خاقان کی اطاعت اختیار کی جائے۔''

مگر مسلمان حکمرانوں نے اس سفارت کو نظر انداز کر دیا۔ [3] اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ اس وقت بغداد کے پاس ایک بڑی طاقت ور فوج تھی جس کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ ہمت تھی۔

مستنصر نے تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ شدہ سینکڑوں درسگاہوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے ۶۳۱ھ میں بغداد میں ''مستنصریہ'' نامی ایک عظیم الشان جامعہ بنوائی جس میں تفسیر و حدیث کے ساتھ ائمہ اربعہ کی فقہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ میں تخصص کے الگ الگ چار درجات تھے۔ ہر درجے میں ایک فقیہ بطور مدرس مقرر تھا اور ساتھ دو معاون بھی تھے۔ ہر درجے میں ۶۲ طلبہ کے داخلے کی گنجائش تھی۔ حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دس طلبہ رکھے

---

(1) الکامل فی التاریخ: سنة ۶۲۳ھ

(2) البدایة والنهایة: سنة ۶۳۱ھ تا ۶۳۵ھ، ۶۴۰ھ، ۶۵۶ھ؛ الحوادث الجامعة والتجارب النافعة فی المائة السابعة، لابن الفوطی (م ۷۲۳ھ)، ص ۹۶، ۹۷، ط العلمیة

(3) البدایة والنهایة: سنة ۶۳۸ھ

جاتے۔ اس شعبے میں ایک شیخ الحدیث اور دو عبارت خواں تعینات تھے۔ ایک شعبہ علم طب کا تھا جس میں ایک ماہر طبیب دس طلبہ کو طب کی اعلیٰ تعلیم دیتا تھا۔ یتیم طلبہ کے لیے ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا تھا۔ تمام طلبہ کی جملہ ضروریات کا وافر انتظام ہوتا تھا۔ مطبخ سے روٹی، گوشت اور حلوہ تقسیم ہوتا تھا۔ موسمی میوے اور پھل بھی دیے جاتے تھے۔ جامعہ میں ایک شفاخانہ بھی تھا جہاں طلبہ کا مفت علاج ہوتا تھا۔ ایک کتب خانہ تھا جس میں دنیا بھر کی نادر و نایاب کتب جمع تھیں۔ خلیفہ نے مدرسے کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف کر دی تھیں، اس لیے اخراجات بخیر وخوبی پورے ہو جاتے تھے۔

مستنصر کی یہ بھی کوشش رہی کہ ملک میں سنی شیعہ تفرقہ بڑھنے نہ پائے، اس لیے وہ دونوں گروہوں کو خوش رکھتا تھا۔ سامرا میں شیعوں کے بارہویں امام کا غار تھا۔ بنو بویہ کے دور میں ارسلان بساسیری نامی شیعہ امیر نے ۴۵۰ھ میں غار پر ایک عمارت تعمیر کر دی تھی جسے شیعوں کے مقدس مقام کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ۶۴۰ھ میں یہ عمارت حادثاتی آتش زدگی کا شکار ہو گئی۔ مستنصر نے اسے دوبارہ تعمیر کرا دیا۔ اسی سال مستنصر کا انتقال ہو گیا۔[1]

قابل حکمران بھی مملکت کو زوال سے کیوں نہ نکال پائے؟

اگرچہ مستنصر بھی اپنے والد خلیفہ ظاہر کی طرح معاشرے میں اصلاح اور ملکی ترقی کا خواہش مند ضرور تھا مگر اس کے دور میں معاشرے کا فساد اور زمانے کا بگاڑ اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ اسے تبدیل کرنے کے لیے ایک غیر معمولی شخصیت کی ضرورت تھی۔ تاریخ میں ایسا کئی بار دیکھا گیا ہے کہ کسی زوال پذیر مملکت کے بعض آخری حکمران نہ صرف نیک سیرت اور شریف النفس ہوتے ہیں بلکہ وہ ملک وملت کی اصلاح اور معاشرے کی تربیت کے لیے بھی فکر مند رہتے ہیں مگر تب تک فساد کے عوامل اور تخریبی انقلاب کے اسباب مکمل ہو چکے ہوتے ہیں اور معمول کی کوئی اصلاحی کوشش اب حالات کو منطقی انجام تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ الظاہر اور المستنصر ایسے ہی خلفاء تھے۔ ایک کو وقت ہی بہت کم ملا۔ دوسرا ایک طویل مدت میں بھی حکومت کی گرتی ہوئی دیواروں کو زیادہ مستحکم نہ کر سکا۔

مستنصر کے بعد اس کا بھائی خفاجی خلافت کا صحیح حق دار تھا۔ وہ اتنا بہادر، چوکنا اور غیور انسان تھا کہ کہا کرتا تھا:

"اگر خلافت مجھے ملے تو میں دریائے جیحوں عبور کر کے تاتاریوں کا نام ونشان مٹا ڈالوں اور اسلامی علاقے ان سے بازیاب کرا کے چھوڑوں۔"

اگر خفاجی خلیفہ بن جاتا تو شاید بغداد کی تباہی اتنی قریب نہ آتی مگر ایک بگڑا ہوا نظام اکثر بگاڑ کی طرف مائل رہتا ہے، اصلاح کی طرف نہیں۔ اس کا رُخ پھیرنے کے لیے بہت بڑی اصلاحی تحریک درکار ہوتی ہے جس کا اُس وقت دور دور تک کوئی نام ونشان نہ تھا۔ اس لیے دربارِ خلافت کے سیاہ وسپید پر قابض امراء جن میں امیر دُویدار اور امیر اقبال شرابی قابلِ ذکر ہیں، خفاجی کو اقتدار سے دور رکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر خفاجی خلیفہ بنا تو انہیں من مانی نہیں کرنے دے گا۔ اس لیے انہوں نے مستنصر کے بیٹے ابو احمد عبداللہ کو خلیفہ بنانا طے کر لیا۔[2]

---

(1) البدایة والنهایة: سنة ۶۳۱ھ، ۶۴۰ھ، ط هجر

(2) تاریخ الخلفاء، ص۳۲۸؛ البدایة والنهایة: سنة ۶۴۰ھ، ۶۵۶ھ

آخری خلیفہ مستعصم باللہ:

۱۰ جمادی الآخرہ ۶۴۰ھ کو مستنصر کی وفات ہوئی تو امیر اقبال شرابی نے اس خبر کو اس وقت تک خفیہ رکھا جب تک ابواحمد کی خلافت کے لیے زمین ہموار نہ ہوگئی۔ مستنصر کے مرنے کے ۲۰ دن بعد پوری تیاری کر کے اس کی موت کا اعلان کیا گیا اور ساتھ ہی نئے خلیفہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ خفاجی کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو چکا تھا، اس لیے وہ سیاست سے لاتعلقی اختیار کر کے جزیرۃ العرب چلا گیا۔

مستعصم باللہ کے لقب سے مسند نشین ہونے والا یہ نوجوان بغداد کا آخری عباسی خلیفہ ثابت ہوا۔ خلافت کے وقت اس کی عمر ۳۰ سال تھی، وہ قرآن مجید کا حافظ وقاری تھا۔ نماز باجماعت کا سختی سے پابند تھا۔ مؤرخین کے بقول وہ کبھی مسکرات اور حرام چیزوں کے قریب نہیں گیا۔ ہر پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتا تھا۔ تاہم وہ ایک سیدھا سادا، ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ طبیعت میں ضرورت سے زیادہ نرمی اور لاپرواہی اور کسی قدر کنجوسی بھی تھی۔ اسے حکومت کے لیے ۱۵ سال ملے جن میں امرائے سلطنت کا ہر دن عید اور ہر شب سہاگ رات تھی۔ [1]

آخری دور میں بغداد کی عبرت ناک حالت:

مستنصر اور مستعصم کے دور میں بغداد خلفاء وامراء کی ظاہری شان وشوکت، دولت وثروت کی بے جا نمائش اور تکلفات وتصنع کے لحاظ سے ایک حیرت کدہ بن چکا تھا۔ حق گو علماء کم رہ گئے تھے۔ ان کی بجائے ایسے اہل فن اور اہل علم کی بڑی آؤ بھگت تھی جو اپنی الفاظی سے حکام کو افضل ترین ہستیاں ثابت کرنے پر تلے رہتے تھے۔ فقط پیشہ ور شاعر ہی نہیں بعض علماء بھی حکمرانوں کی مدح وستائش میں انتہاء کر دیا کرتے تھے۔ ۶۳۳ھ میں خلیفہ مستنصر دارالعلوم مستنصریہ کا دورہ کرنے گیا تو ایک فقیہ وجیہ الدین قیروانی نے خلیفہ کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا جس میں یہ شعر بھی تھا:

لَوْ كُنْتَ يَوْمَ السَّقِيفَةِ حَاضِرًا...... كُنْتَ الْمُقَدَّمَ وَالْإِمَامَ الْأَرْوَعَا

''اگر آپ سقیفہ کے دن حاضر ہوتے (جس دن حضرت ابوبکر صدیق کو خلیفہ چنا گیا تھا) تو آپ سب پر فائق رہتے اور رعب داب والے حکمران بن جاتے۔''

حد یہ ہے کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی درس گاہ میں اس وقت کوئی راست باز عالم نہ تھا جو ایسی غلط بیانی کی تردید کرتا۔ خوش قسمتی سے ایوبی خاندان کا عالم فاضل شہزادہ الملک الناصر داؤد (حاکم کرک) مہمان کی حیثیت سے محفل میں مدعو تھا۔ اس نے فوراً کہا: ''غلط کہتے ہو۔ اس وقت امیر المؤمنین کے جدِ امجد عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی حیات تھے، اس کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی سب سے فائق رہے اور وہی بارعب حکمران مقرر ہوئے۔''

یہ سن کر خلیفہ مستنصر چونکا۔ شہزادہ الناصر داؤد کو خلعت سے نوازا اور فقیہ موصوف کو جلاوطن کر دیا۔ [2]

---

(1) تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۲۸، ط نزار؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۴۰ھ، ۶۵۶ھ؛ سمط النجوم العوالی للعصامی: ۵۱۶/۳، ط العلمیۃ

(2) البدایۃ والنہایۃ: ۳۸۴/۱۷، ۳۸۵، ط دار ہجر

اس واقعے سے جہاں خلیفہ کی حق شناسی ظاہر ہوتی ہے، وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت خلفاء کی چاپلوسی کتنی عام تھی۔ اگر خلفاء کی مدح میں دین کی دھجیاں اڑا دینا عام سی بات نہ ہوتی تو اہلِ علم کی مجلس میں ایک فقیہ کو ایسا شعر کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اس سے خود اس دور کے علماء کی حالت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان میں سے بعض لوگ خوشامد کے لیے ہر حد پار کر جاتے تھے جبکہ باقی علماء کو یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ خلفاء کی موجودگی میں منہ پر کلمۂ حق بلند کریں۔

اہلِ حکومت کا عیش و تنعم:

جب رسمِ حق گوئی علماء میں بھی تقریباً ناپید ہو چکی ہو تو احتساب کا عمل خود ہی مردہ ہو جاتا ہے اور بالا دست طبقہ حد سے زیادہ آزاد ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ بغداد میں بھی یہی حال تھا۔ خلفاء کا عیش و تنعم بلند ترین سطح کو چھو رہا تھا۔ خلفاء تو خلفاء ان کے چہیتے خدام کی بھی شان و شوکت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ یہ لوگ معمولی غلاموں اور خادموں کی حیثیت سے محل میں بھرتی ہوتے تھے۔ کوئی فرّاش ہوتا، کوئی ساقی، کوئی ناظمِ توشک خانہ اور کوئی سلاح دار۔ مگر ان میں سے جو بھی خلیفہ کا منظورِ نظر بنتا تو اسے پَر لگ جاتے تھے۔ ان لاڈلے خدام کے عیش کے حالات پڑھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

خلیفہ مستنصر نے اپنے غلام علاؤ الدین طبرسی (دُویدار کبیر) کو اس کی شادی کے موقع پر ایک لاکھ دینار (تقریباً ۲۵ کروڑ روپے) ہدیہ کیے تھے۔ طبرسی کو اپنی جائیداد سے ملنے والی سالانہ آمدن پانچ لاکھ دینار (تقریباً ایک ارب ۲۵ کروڑ روپے) تھی۔ [1] ۶۳۲ھ میں امیر مجاہد الدین دُوَیدار کا نکاح حاکمِ موصل کی بیٹی سے ہوا تو مہر بیس ہزار دینار (تقریباً پانچ کروڑ روپے) رکھا گیا۔ [2] ۶۳۳ھ میں ایوبی شہزادہ الملک الناصر داؤد بغداد آیا تو اس کے اعزاز میں دی گئی ایک ضیافت پر بارہ ہزار دینار (تقریباً تین کروڑ روپے) خرچ ہوئے۔ [3] موصل کے حاکم نے بغداد کے امیر اقبال شرابی کے لیے ایک پرندہ بھیجا تو امیر نے اسے شاہراہ پر لٹکا کر حاضرین پر دو ہزار دینار (تقریباً ۵۰ لاکھ روپے) لٹائے۔ پھر پرندہ لانے والوں کو تین ہزار دینار (تقریباً ۷۵ لاکھ روپے) دیے۔ [4] امراء کے خدام اور غلام بھی نوابوں سے کم نہ تھے۔ امیر اقبال شرابی کے ایک خادم نے ایک امیر کی شادی میں چار ہزار دینار (تقریباً ایک کروڑ روپے) حاضرین میں لٹائے۔ [5] عبد الغنی بن فاخر فرّاش اَن پڑھ تھا مگر بادشاہوں جیسی زندگی گزارتا تھا۔ اس کے نوکروں میں سے ہر ایک کی تنخواہ ڈیڑھ سو دینار (تقریباً تین لاکھ ۷۵ ہزار روپے) تھی۔ [6]

اس کے مقابلے میں بغداد کی سب سے بڑی درس گاہ المستنصریہ میں حدیث اور فقہ پڑھانے والے مدرسین کی

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۴۷/ص ۴۳۳ (سنة ۶۵۰ھ)، ت تدمری
② الحوادث الجامعة و التجارب النافعة لابن الفوطی: ص ۷۱، ط العلمیة
③ الحوادث الجامعة و التجارب النافعة: ص ۷۴
④ الحوادث الجامعة و التجارب النافعة: ص ۸۷
⑤ الحوادث الجامعة و التجارب النافعة: ص ۸۵، سنة ۶۳۴ھ
⑥ الحوادث الجامعة و التجارب النافعة: ص ۱۹۸

نوٹ: خیمے لگانے اور قالین بچھانے کے کاموں کے ذمہ دار کو "فرّاش" کہا جاتا تھا۔ اس کے ماتحت کئی قلی اور نوکر ہوتے تھے جو اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔
توشک خانہ: وہ مکان جس میں امیروں کی پوشاک، بستر، لحاف، کمبل اور سامانِ خانہ داری رہتا ہے۔

تنخواہ بارہ دینار (تقریباً تیس ہزار روپے) سے زیادہ نہ تھی۔ [1] جبکہ حفاظ وقراءت کے مدرسین کو ماہانہ تین دینار (تقریباً ساڑھے سات ہزار روپے) دیے جاتے تھے۔ [2]

تقریبات میں نمازوں سے غفلت:

شاہانہ سطوت وشوکت کے سب سے بڑے مظاہرے ولی عہد کی جانشینی، نئے خلیفہ کی مسند نشینی اور عید کے مواقع پر ہوا کرتے تھے۔ سارا شہر ان جلسوں اور جلوسوں میں امنڈ آتا، کئی کئی پہر اسی لہو ولعب میں گزر جاتے۔ ان کھیل تماشوں میں فضول خرچی اور نمود ونمائش کی انتہا ہو جاتی۔ سب سے بڑھ کر افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس دوران نماز جیسے اہم ترین مذہبی فریضہ کی بھی پروا نہ کی جاتی اور لوگوں کی کئی کئی نمازیں چھوٹ جاتی تھیں۔

۶۳۴ھ میں خلیفہ مستنصر کی طرف سے امیر مجاہد الدین دُوَیدار کے اعزاز میں جو استقبالیہ جلوس نکالا گیا وہ رات بھر جاری رہا یہاں تک کہ نمازِ عشاء کا وقت ختم ہو گیا اور صبح صادق ہو گئی۔ [3] ۶۳۹ھ میں عید کے موقع پر جو شاہی جلوس نکلا اس میں لوگ اس قدر منہمک ہوئے کہ عید کی نماز عصر کے وقت جا کر ادا کی گئی۔ [4]

اسی طرح ۶۴۴ھ میں عید الفطر کا جشن اس دھوم دھام سے منایا گیا کہ نمازِ عید مؤخر ہوتی چلی گئی اور آخر کار نصف شب کے قریب لوگ عید گاہ پہنچے اور نمازِ عید ادا کی گئی۔ [5] اسی سال عید الاضحیٰ کے موقع پر اہلِ بغداد فوجی پریڈ دیکھنے شہر کے باہر جمع ہوئے تو اس تماشے میں شام ہو گئی اور نمازِ عید مغرب کے وقت پڑھی گئی۔ [6]

حج کا اہتمام معطل:

خلفاء کا قدیم معمول چلا آ رہا تھا کہ حج کے انتظامات ان کی طرف سے ہوتے تھے اور ہر سال ان کی طرف سے امیرِ حج مقرر کیا جاتا اور غلافِ کعبہ تبدیل کیا جاتا تھا مگر تاتاریوں کے خوف اور بدامنی کے باعث ساتویں صدی ہجری کے وسط میں عراق سے حجاج کے قافلوں کی روانگی باقاعدہ نہ رہی۔ ۶۳۳ھ سے ۶۴۰ھ تک مسلسل سات برس ایسے گزرے کہ عراق سے حاجیوں کے قافلے مکہ نہ آئے۔ اسی طرح ۶۴۴ھ سے ۶۴۹ھ تک چھ سال تک یہی حال رہا۔ [7]

ہر طرف سیاسی کھینچا تانیوں، خاندانی رقابتوں اور افراتفری کا دور دورہ تھا، ہر سمت اخلاقی و مذہبی انحطاط کا راج تھا۔ بے شعوری اور بے بصیرتی روز افزوں تھی۔ غیر شرعی امور عام ہو چکے تھے۔ خلیفہ کے لیے زمین بوسی، آستانہ بوسی

---

① العسجد المسبوک والجوهر المحکوک فی اخبار الخلفاء والملوک للملک الاشرف الغسانی (م ۸۰۳ھ)، ص ۴۵۸، ط دار البیان بغداد (۱۹۷۵ء)

② العسجد المسبوک والجوهر المحکوک فی اخبار الخلفاء والملوک، ص ۴۵۹

③ الحوادث الجامعة والتجارب النافعة لابن الفوطی (م ۷۲۳ھ)، ص ۸۶، ط العلمية، العسجد المسبوک والجوهر المحکوک فی اخبار الخلفاء والملوک، ص ۴۷۷، ۴۷۸

④ البداية والنهاية سنة ۶۳۹ھ ⑤ العسجد المسبوک والجوهر المحکوک فی اخبار الخلفاء والملوک، ص ۵۴۳

⑥ العسجد المسبوک والجوهر المحکوک فی اخبار الخلفاء والملوک، ص ۵۴۳

⑦ شفاء الغرام باخبار البلد الحرام: ۲/۲۸۶، ۲۸۷، لابی الطیب الفاسی (م ۸۳۲ھ)، ط العلمية

اور فرش پر ناک رکھنے کا رواج معروف تھا اور اس خلافِ شرع رسم میں کوئی عار محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ رشوت ستانی اور اخلاقی بے راہ روی بڑھتی جارہی تھی، ٹھگوں، عیاروں اور نوسربازوں کے علاوہ باطل فرقوں کے گماشتوں خصوصاً باطنیوں اور رافضیوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ فارغ البالی اور دولت وثروت کی وجہ سے موج مستی اور کھیل تماشوں کا ذوق بہت بڑھ گیا تھا۔ اسبابِ تعیش خصوصاً آلاتِ بزمِ موسیقی امراء کے لیے لازمۂ زندگی تھے۔ نچلے طبقے کے لوگ مغنیوں کی مجالس میں جوق در جوق شرکت کرتے۔ حکام میں بدعنوانی عام تھی، نئی نئی جاگیروں کے حصول کا شوق جنون کی صورت اختیار کرچکا تھا، دوسروں کی جائیدادیں غصب کرنا معمول کی بات تھی۔ [1]

ایسے پُرفتن حالات میں اگر کچھ اللہ کے بندے مدارس، خانقاہوں اور مساجد میں لوگوں کو سدھارنے کی مخلصانہ کوششیں کر بھی رہے تھے تو ان کی اثر پذیری بہت کم تھی۔ مزید نقصان یہ ہوا کہ ۶۴۵ھ میں بغداد کی انتظامیہ نے تمام واعظین کو وعظ کہنے سے منع کر دیا جس کے بعد اصلاحِ معاشرہ کی کوششیں مزید محدود ہوگئیں۔ [2]

عالم اسلام پر مشرق میں تاتاری مسلط ہو چکے تھے اور مغرب میں صلیبیوں کے حملے وقفے وقفے سے جاری تھے مگر خلافتِ بغداد عالم اسلام کی سرپرستی کی بجائے اسلامی حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کے لیے سازشی منصوبہ بندیوں کا مرکز بن چکی تھی۔ پس علماء ومشائخ کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ بگاڑ جو حکمران اور آسودہ حال طبقے میں جاگزیں ہو چکا تھا، کم ہونے کی بجائے بڑھتا جارہا تھا اور اس تنزل وانحطاط پر وہ خدائی تنبیہات بھی انہیں بیدار نہ کرسکیں جو حوادث سماویہ اور کفار کے تسلط کی شکل میں سامنے آچکی تھیں۔ پس مشیتِ الٰہیہ نے بغداد کو عالم اسلام کی پاسبانی سے فارغ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور چند سالوں میں اس کے حتمی اسباب بڑی تیزی سے پیدا ہوگئے۔

آسمانی تنبیہات:

اس سے پہلے ایک آخری تنبیہ کے طور پر اللہ نے مرکزِ اسلام مدینہ منورہ کے قریب وہ حیرت انگیز نشانی ظاہر کی جس کی پیش گوئی حضور اکرم ﷺ چھ صدیاں پہلے کر گئے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا:

> ”قیامت اس وقت تک برپا نہیں ہوگی جب تک حجاز سے ایک ایسی آگ نہ نکلے جس کی روشنی بصریٰ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن کردے گی۔“ [3]

۳ جمادی الآخرہ ۶۵۴ھ کو مدینہ منورہ میں زلزلے کے جھٹکے لگنا شروع ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک عجیب سی سنسناہٹ سنائی دیتی تھی۔ دو دن تک یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ اس دوران زلزلے کے ۱۴ جھٹکے لگے۔ جمعہ ۵ جمادی الآخرہ کو نمازِ جمعہ سے پہلے جھٹکے بند ہوگئے۔ نمازِ جمعہ کے بعد بنوقریظہ کے قریبی آتش فشاں پہاڑوں

---

① تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/۳۰۷

② الحوادث الجامعة، ص ۱۷۶

③ "قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ: أَخْبَرَنِي أَبُو هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ أَرْضِ الْحِجَازِ تُضِيءُ أَعْنَاقَ الْإِبِلِ بِبُصْرَى." (صحيح البخارى، ص ۷۲۱۸، باب خروج النار)

سے ہولناک دھواں بلند ہونا شروع ہوا جس نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ مغرب کے وقت دھوئیں کی جگہ ایسی آگ نمودار ہوئی جس کی لپٹیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ عینی شاہدین نے بتایا کہ مکہ سمیت کئی شہروں میں یہ شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ اس آگ نے آسمان کو سرخ کر دیا، آتش فشانی نے تیماء (جو مدینہ سے ۴۲۷ کلومیٹر شمال میں ہے۔) تک ایسی روشنی کر دی کہ گویا ہر گھر میں چراغ جل رہے ہوں۔ اس روشنی میں وہاں کے لوگ رات کے وقت لکھتے پڑھتے رہے۔ بُصریٰ کے اعرابیوں نے بتایا کہ وہ اس روشنی میں اپنے اونٹوں کی گردنیں دیکھ سکتے تھے۔

مدینہ منورہ کی تمام آبادی مسجدِ نبوی میں روضۂ رسول کے پاس جمع ہوگئی اور وہ پورا دن اور رات توبہ واستغفار میں گزارا۔ اگلے دن پہاڑ لاوا اُگلنے لگے۔ یہ سرخ لاوا نہروں کی طرح بہتا تھا اور پتھروں اور چٹانوں تک کو پگھلا دیتا تھا۔ جمنے کے بعد اس کا رنگ سیاہ ہو جاتا تھا۔ لاوا بارہ میل لمبائی اور چار میل چوڑائی میں پھیل گیا اور آس پاس کی وادیاں بھر دیں۔ چند دن بعد پہاڑوں نے لاوا اُگلنا بند کر دیا تاہم فضا پر اس کی کثافت حاوی رہی۔ دمشق تک یہ حال تھا کہ سورج اور چاند طلوع اور غروب کے وقت ایسے دکھائی دیتے جیسے انہیں گرہن لگا ہو۔[1]

اسی سال بغداد میں زبردست سیلاب آیا، سیلاب کی لہریں شہر کے وسط تک پہنچ گئیں، قصرِ خلافت بھی اس کی زد میں آ گیا۔ سیلابی ریلا بغداد کے اسلحہ خانے میں اس طرح گھسا کہ اکثر ہتھیار تلف ہوگئے۔ وزیر کے محل سمیت تین سو سے زائد مکانات منہدم ہوگئے۔ ادھر یکم رمضان ۶۵۵ھ کو مسجدِ نبوی آتش زدگی کا نشانہ بنی۔ ساری چھت اور کئی ستون جل کر راکھ ہوگئے۔ روضۂ اقدس کی چھت بھی سوختہ ہوگئی۔[2]

ابن علقمی کی وزارت:

مستعصم امورِ حکومت سے بے پروا تھا۔ اس نے سارے اختیارات امیر مجاہد الدین دُوَیدار اور امیر اقبال شرابی کو دے رکھے تھے۔ مزید ستم یہ کہ ۶۴۲ھ میں اس نے عہدۂ وزارت ابن علقمی کو بخش دیا جو بغداد کے شیعہ ادباء وفضلاء میں سے ایک تھا۔ مستعصم کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ رفتہ رفتہ اس نے تمام امورِ حکومت اسی کے سپرد کر دیے۔ ابن علقمی کا پورا نام مؤید الدین ابو طالب محمد بن علقمی تھا۔ ۵۹۳ھ میں پیدا ہوا تھا۔ مستنصر باللہ کے دور میں وہ دفترِ وزارت کا نائب اور جامعہ مستنصریہ کے تعمیراتی کام کا نگران رہا تھا۔ وہ بظاہر معتدل مزاج مگر درحقیقت متعصب رافضی تھا۔ اس کی طبیعت میں نفاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بظاہر وہ خلیفہ اور سنی امراء کی چاپلوسی کرتا تھا مگر اندرونی طور پر ان کی جڑیں کاٹنا چاہتا تھا۔ سنت کو مٹانے اور تشیع کو پروان چڑھانے پر کمر بستہ تھا۔ اس لیے اپنے دور میں روافض کی خوب سرپرستی کی، ان کے علماء کو ترقیاں دیں۔ اس نے مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید سے ''نہج البلاغہ'' کی شرح لکھوائی۔[3]

---

① البداية والنهاية: سنة ۶۵۴ھ؛ سمط النجوم العوالي للعصامي: ۵۱۷/۳ ② طبقات الشافعية الكبرىٰ للسبكي: ۲۶۷/۸

③ سير اعلام النبلاء: ۳۶۲/۲۳؛ البداية والنهاية: سنة ۶۵۶ھ ترجمة ابن علقمی؛ الاعلام للزركلي: ۳۲۱/۵، ط دار العلم للملايين؛ فوات الوفيات لابن شاكر صلاح الدين: ۲۵۲/۳، ط صادر

وزیر اور امیر دُوَیدار کے مابین کش مکش:

ابن علقمی کی زیادہ چپقلش عساکر بغداد کے افسرِ اعلیٰ مجاہدالدین دُوَیدار کے ساتھ تھی جسے عموماً دُوَیدار صغیر کہا جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ابنِ علقمی کو عہدۂ وزارت کی وجہ سے بالادستی حاصل تھی تو امیر دُوَیدار خلیفہ کے بیٹے ابوبکر کا مقرّب ہونے کی وجہ سے اس پر بھاری تھا۔[1] ۶۵۳ھ میں امیر اقبال شرابی کی وفات کے بعد مجاہدالدین دُویدار کی حیثیت اور بھی بڑھ گئی۔[2]

دربارِ قراقرم کے نئے فیصلے:

اس زمانے میں چنگیز خان کا پوتا منگو خان قراقرم (منگولیا) کے تخت پر براجمان تھا۔ شمالی ایران کے ضلع قزوین کے ایک عالم شمس الدین قزوینی[3] منگولیا جا کر اس سے ملے اور بتایا کہ باطنی ریاست جسے تاتاری نظر انداز کرتے آئے ہیں، فتنہ وفساد کا مرکز ہے۔ شمس الدین قزوینی نے اس پسِ منظر میں مغل حکومت کو عاجز اور ضعیف قرار دیا۔

منگو خان نے غضب ناک ہو کر پوچھا: ''ہماری حکومت میں تمہیں کیا کمزوری نظر آئی ہے؟''

شمس الدین قزوینی نے کہا: ''ایک گروہ جس نے نصرانیوں، مسلمانوں اور مغلوں سب سے الگ دین بنا رکھا ہے، کچھ قلعوں پر قابض ہے۔ وہ کچھ خراج ادا کر کے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ انتظار میں ہے کہ اگر آپ کی حکومت ذرا کمزور پڑے تو وہ ان قلعوں سے نکل کر باقی ماندہ مسلمانوں کو بھی ختم کر دے۔''

شمس الدین قزوینی کی اس فریاد کے بعد منگو خان نے باطنیوں کے قلعوں کو نیست ونابود کرنے کا فیصلہ کر لیا۔[4]

تاتاریوں کے نزدیک باطنیوں کے قلعوں کو ختم کرنا اس لیے ضروری تھا کہ یہ ان کی عزت کا مسئلہ بن گیا تھا مگر اس سے کہیں زیادہ اہم قضیہ ان کے نزدیک عراق اور شام کا تھا جس پر ہاتھ ڈالنے سے وہ ایک مدت سے کترا رہے تھے۔

---

① فوات الوفیات: ۲۵۲/۳

② سیر اعلام النبلاء: ۳۷۰/۲۳، ط الرسالۃ

③ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شمالی ایران دوسری تیسری صدی ہجری سے روافض کا مرکز رہا ہے، اسی لیے قزوین کو بھی روافض کا گڑھ سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں بھی شمالی ایران کے شہروں میں اکثریت اہلِ سنت کی تھی۔ گمراہ فرقوں کا جو کچھ اثر تھا، وہ دیہی علاقوں میں تھا۔ چنانچہ قزوین کے بارے میں قاضی منہاج السراج کہتے ہیں: ''ساکنان شہر قزوین ہمہ بر قاعدہ سنت وجماعت، وپاک مذہب، صافی اعتقاد اند، وبسبب ضلالت باطنیان وملاحدہ مدام ایشاں را باہم مقاتلہ ومکاوحت درمیان بود'' (طبقاتِ ناصری: ۱۸۱/۲)

④ طبقاتِ ناصری از قاضی منہاج السراج جوزجانی: ۱۸۲،۱۸۱/۲، ط کابل

نوٹ: سلاطین ہند اور مغلوں کی تاریخ کے بارے میں طبقاتِ ناصری نہایت اہم مأخذ ہے۔ اس کے مصنف قاضی منہاج السراج کے آباء واجداد سمرقند کے تھے۔ انکی ولادت ۵۸۹ھ کے قریب افغانستان میں شاہانِ غوریہ کے مرکز فیروزکوہ میں ہوئی۔ سلطان غیاث الدین غوری کی ملکہ کے سایۂ شفقت میں پرورش پائی۔ وہیں سات سال کی عمر میں امام علی غزنوی سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا۔ علوم اسلامیہ وفنون مروجہ کی تحصیل کے بعد ۶۱۳ھ میں اپنے والد کی جگہ سرکاری عہدے پر فائز ہوئے اور حکام کے لیے سفارتی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۶۱۷ھ میں افغانستان پر تاتاریوں کے حملے کے وقت مولانا قلعہ تولک میں محصور تھے جہاں آٹھ ماہ تک محاصرہ رہا اور آخر میں تاتاری ناکام ہو کر واپس چلے گئے۔ افغانستان اجڑ گیا تو ۶۲۴ھ میں قاضی صاحب لاہور آ گئے۔ شمس الدین التتمش نے پنجاب پر قبضہ کیا تو قاضی صاحب دربار دہلی سے وابستہ ہو گئے اور التتمش نے انہیں ۶۳۰ھ میں گوالیار کا قاضی مقرر کر دیا۔ وہ چھ سال اس عہدے پر رہے۔ التتمش کے بعد رضیہ سلطانہ تخت نشین ہوئی تو قاضی صاحب کو دہلی بلوا کر مدرسہ ناصریہ کی تاسیس، تعمیر...... (بقیہ اگلے صفحے کے حاشیہ پر)

نصرانیوں کی طرف سے تاتاریوں کو مشرقی مسلم ممالک پر حملے کی ترغیب:

منگوخان کو مشرق کے اسلامی ممالک پر حملے کی ترغیب دینے میں نصرانیوں کا بڑا اہم کردار تھا۔ چونکہ منگوخان کے عیسائیوں سے اچھے روابط تھے، اس پس منظر میں آرمینیا کا عیسائی حکمران ہتیون ہزار ہا میل طے کر کے قراقرم پہنچا اور اس کی باج گزاری قبول کر کے اس سے استدعا کی کہ وہ شام پر حملہ کرے اور انہیں بیت المقدس بازیاب کرا کے دے۔ منگوخان نے اس درخواست کو غور سے سنا کیوں کہ اس طرح اسے ایسے حلیف میسر آرہے تھے جن کے ذریعے عراق وشام کی تسخیر آسان ہوسکتی تھی۔ آخر کار مغل خاقان اور شاہِ آرمینیا کے مابین مسلمانوں کے خلاف ایک معاہدہ طے پا گیا جس میں انطاکیہ اور طرابلس کا حکمران بوہیمنڈ بھی شامل ہوگیا۔ ①

مگر منگوخان بخوبی جانتا تھا کہ نصرانیوں کو بیت المقدس واپس دلوانے سے قبل شام کو مسخر کرنا ضروری ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عراق میں قائم خلافتِ بغداد کو زیرِ نگین نہ کرلیا جائے جو سلطنتِ تاتار کی عالمگیریت کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہے۔ چنانچہ اس نے تمام رُکے ہوئے معاملات ایک ساتھ نمٹانے کا فیصلہ کیا اور وسطِ ایشیا اور خراسان کی حکومت اپنے بھائی ہلاکو خان کے سپرد کر کے اسے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ قراقرم سے وسطِ ایشیا روانہ کردیا۔ منگوخان نے اعلان کیا:

"ہم شام اور آرمینیا میں مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کریں گے۔ ہم اپنے بھائی ہلاکو خان کو خلیفہ کی تسخیر اور بیت المقدس کی بازیابی کے لیے بھیج رہے ہیں۔ ①

شاہِ فرانس کے نام ہلاکو خان کا مکتوب:

اُدھر ہلاکو خان نے دنیائے نصرانیت کو اپنی فوج کشی کی خوش خبری دینے کے لیے فرانس کے بادشاہ سینٹ لوئس کی جانب ایک سفارت بھیجی جس نے شاہِ فرانس کو ہلاکو خان کا درجِ ذیل مکتوب پیش کیا:

"ہماری رعایا میں بکثرت نصرانی شامل ہیں۔ ہم اپنی طاقت اور اختیار کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم مسلم ممالک کے تمام نصرانیوں کو غلامی اور محاصل کی ادائیگی سے آزاد کریں گے اور ان کے ساتھ عزت واحترام کا برتاؤ کیا جائے گا۔ ان کے مال واسباب سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ جو گرجے ویران ہوچکے ہیں، ان کی ازسرِ نو تعمیر

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

اور تدریس ونظم ونسق کا ذمہ دار بنادیا۔ رضیہ کے بعد بہرام شاہ نے ۶۳۹ھ میں انہیں پورے ہندوستان کا قاضی القضاۃ بنایا مگر قاضی صاحب کو یہ عہدہ راس نہ آیا، مخالفین اور حاسدین سے تنگ آکر انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور ۶۴۰ھ میں لکھنوتی چلے گئے، چند برس بعد واپسی ہوئی اور مدرسہ ناصریہ کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ ۶۴۶ھ میں التمش کے فرزند ناصر الدین محمود کو اقتدار ملا تو قاضی صاحب کی بڑی قدر دانی ہوئی۔ انہیں دوبارہ قاضی القضاۃ بنادیا گیا اور صدر جہاں کا لقب دیا گیا۔ آخری عمر میں انہوں نے اسی بادشاہ کی طرف منسوب کر کے "طبقاتِ ناصری" کی تالیف شروع کی اور ۶۵۸ھ میں اسے مکمل کیا۔ ان کی تاریخ وفات مذکور نہیں مگر اندازہ یہی ہے کہ ۶۵۸ھ کے بعد وہ زیادہ مدت زندہ نہیں رہے، یوں ان کی عمر لگ بھگ ۷۰ برس ہوئی۔

حاشیہ صفحہ موجودہ:

① The Preaching Of Islam :170 ، The Crusades by Harold Lamb:p:338

کرائی جائے گی۔ نصرانیوں کو ناقوس بجانے کی آزادی ہوگی۔"[1]

غرض دنیائے اسلام پر اس حملے میں تاتاریوں کو نصرانیوں کی دلی ہمدردیاں اور دعائیں حاصل تھیں۔

ہلاکو خان کی سمرقند آمد:

منگولیا سے ہلاکو خان کی روانگی ۲ ربیع الاوّل ۶۵۱ھ کو ہوئی۔[2] شعبان ۶۵۳ھ میں ہلاکو خان سمرقند پہنچا جہاں خراسان کے تقریباً تمام امراء اظہارِ اطاعت کرنے کے لیے اس کے پاس حاضر ہوئے۔[3] ذوالحجہ ۶۵۳ھ میں ہلاکو خان کی افواج ایران وعراق کی تسخیر کے عزم کے ساتھ دریائے آمو کے پار اتر چکی تھیں۔[4]

بغداد میں ہلاکو خان کے جاسوسوں کی آمد:

اتنے بڑے لشکر کے باوجود ہلاکو خان بغداد پر یکدم حملہ کرنے سے کترا رہا تھا، اس سے پہلے وہ خلافتِ عباسیہ کے نظام کو غداروں کے ذریعے اندرونی طور پر کمزور کرنا چاہتا تھا اور یہ خدمات روافض بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ ہلاکو خان نے اپنے جاسوس بغداد روانہ کردیے جو ۶۵۴ھ کے اوائل میں ابن علقمی سے ملے اور شہر کے حالات بھی دیکھتے بھالتے رہے۔ انہوں نے ابن علقمی اور اس کے زرخرید امراء کو خوب سبز باغ دکھائے۔[5]

بغداد میں سیاسی اور عسکری اداروں کے مابین تناؤ:

اب بغداد میں یکایک کچھ عجیب واقعات نے جنم لیا۔ ابن علقمی نے اپنے مدِ مقابل امیر مجاہد الدین دُوَیدار کے خلاف خلیفہ کے کان بھرے اور یہاں تک الزام لگایا کہ وہ مجھے اور آپ کو قتل کرنے کی تیاری کر چکا ہے اور آپ کی جگہ شہزادہ ابوبکر کو خلیفہ بنانے پر تلا ہوا ہے۔ خلیفہ اس الزام پر یقین کر کے دُوَیدار سے بداعتماد ہوگیا۔[6]

اس دوران ہلاکو کے نام بھیجے گئے ابن علقمی کے چند خطوط افسرانِ اعلیٰ کے ہاتھ لگ گئے۔ انہوں نے خلیفہ کو اس

---

① The Crusades by Harold Lamb:p:338,339

② تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی (م ۹۴۲ھ): ۳۳۸/۲ ،ط انتشارات خیام

③ جامع التواریخ(عربی) از رشید الدین فضل اللّٰہ: ۲،حصہ اول ۲۳۸ تا ۲۴۰

④ تاریخ حبیب السیر: ۴۷۷/۲

⑤ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۴۹۰/۱، ۴۹۱

نوٹ: السلوک کی عبارت میں یہ واقعہ ۶۵۴ھ کے تحت نقل کیا ہے اور مہینہ ذکر نہیں کیا گیا مگر واقعات کی رفتار سے ظاہر ہے کہ یہ ملاقات اوائل ۶۵۴ھ میں ہوئی تھی۔

⑥ طبقاتِ ناصری: ۱۹۳/۲

عرب مؤرخین نے یہ ذکر کیا ہے کہ دُویدار پر فقط الزام لگایا گیا تھا: انہ قد نسب الیہ العزم علی الفتک بالوزیر ثم بالخلیفہ المستعصم باللہ (العسجد المسبوک، ص ۶۱۶)

مگر بعض ایرانی مؤرخین مثلاً رشید الدین نے واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ الزام نہیں ثابت شدہ جرم تھا اور دُویدار نہایت بدقماش شخص تھا جس نے بدمعاشوں کو اپنے گرد جمع کیا ہوا تھا اور وہ یقینی طور پر خلیفہ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ (جامع التواریخ (عربی): جلد دوئم، حصہ اوّل، ص ۲۶۲، ۲۶۳)

یہ بیان متعصبانہ ہے۔ ہلاکو کے نام ابن علقمی کے خطوط امراء کے ہاتھ لگنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ دُویدار کو بھی ابن علقمی اور تاتاریوں کے رابطوں کی اطلاع تھی کیوں کہ دُویدار ان امراء کا سربراہ تھا، وہ اس قسم کی سازشوں سے یقیناً پہلے سے آگاہ ہو چکا ہوگا۔ غالباً اسی لیے وہ مزید موقع دیے بغیر ابن علقمی پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا مگر ابن علقمی نے خود کو بچانے اور اسے پھنسانے کے لیے افسانہ بنالیا کہ دُویدار خلیفہ کو ختم کرنا چاہتا ہے جبکہ یہ منصوبہ تو خود ابن علقمی کا تھا۔

انتہائی خطرناک صورتحال سے آگاہ کیا مگر خلیفہ پر ابن علقمی کا جادو کچھ ایسا چل چکا تھا کہ وہ بولا:
''یہ دُویدار نے کیا ہوگا۔ ابن علقمی ایسا نہیں کر سکتا۔''[1]

امیر دُویدار کی گرفتاری کا خطرہ:

اب خلیفہ کی دُویدار سے سخت بدگمانی واضح ہوگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ فی الفور دُویدار کے خلاف کوئی حکم جاری ہوگا۔ گرفتاری کے خطرے کے پیشِ نظر دُویدار نے اپنی فوج کو چوکس کر دیا۔ اِدھر ابن علقمی کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا کہ دُویدار اس پر ہاتھ ڈالنے سے نہیں چوکے گا، اس لیے اس نے بھی اپنے گرد وفاداروں کا پہرہ لگوا دیا۔

ربیع الآخر کی آخری شب سے ۲۰ جمادی الآخرہ تک کے ایام نہایت تناؤ کی حالت میں گزرے۔ اس دوران ابن علقمی خلیفہ پر زور دیتا رہا کہ وہ دُویدار اور اس کے حامی امراء کی گرفتاری کا حکم دے دے۔ اس کان بھرائی کے لیے ابن علقمی عجیب وغریب دلائل دیتا اور بعض اوقات قرآن مجید کی کچھ آیات بھی پڑھ کر سناتا تھا، مثلاً:

" لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَهِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِهِمۡ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ فِیۡهَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ۝

''یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وہ لوگ جو مدینہ میں افواہیں اڑایا کرتے ہیں، اگر باز نہ آئے تو ہم ضرور ان کو آپ پر مسلط کر دیں گے۔ پھر یہ لوگ آپ کے پاس بہت ہی کم رہنے پائیں گے۔''[2]

آخر کار کچھ سمجھ دار امراء نے بیچ میں پڑ کر خلیفہ کو دُویدار کے بارے میں نرمایا۔ خلیفہ نے ابن علقمی کو عفو ودرگزر کی تلقین کی اور دُویدار کو اپنے پاس طلب کیا۔ دُویدار نے جان کی تحریری امان طلب کی۔ ۲۰ جمادی الآخرہ کو خلیفہ نے امان نامہ لکھ دیا۔ اس پر دُویدار دربار میں حاضر ہوا اور معافی تلافی ہوگئی۔[3]

ہلاکو خان شمالی ایران میں:

اِدھر یہ کش مکش چل رہی تھی اور اُدھر ہلاکو خان کی افواج تیزی سے آگے بڑھتی آرہی تھیں۔ شعبان ۶۵۴ھ میں ہلاکو یلغار کر کے شمالی ایران میں باطنی قلعوں کو گھیر چکا تھا۔[4]

یکم ذوالقعدہ ۶۵۴ھ کو اس نے آخری باطنی پیشوا رکن الدین خورشاہ کی جان بخشی کے بدلے اس سے اَلَموت سمیت تمام قلعوں کی چابیاں وصول کر لیں۔ یہ تمام قلعے مسمار کر دیے گئے۔ مشہور رافضی دانشور نصیر الدین طوسی باطنی گروہ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ہلاکو خان نے ریاضی اور فلکیات میں اس کی مہارت دیکھ کر اسے اپنا مصاحب بنا لیا۔[5]

---

① طبقاتِ ناصری از قاضی منہاج السراج جوزجانی: ۱۹۳/۲، ط کابل
② سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۶۰ ...... یہ نفاق کی انتہا تھی کہ ایک منافق اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ آیت پڑھ رہا تھا جو اسی جیسوں کے خلاف نازل ہوئی تھی۔
③ العسجد المسبوک والجوہر المحکوک للاشرف الغسانی، ص ۶۱۶ تا ۶۱۹
④ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول ۲۳۸ تا ۲۴۰، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر
⑤ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول، ص ۲۵۰ تا ۲۵۵؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۶ھ؛ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۲۶۸/۸

بغداد میں شیعہ سنی فساد:

بغداد والے ہلاکو خان کی یلغار سے بے پروا ہوکر باہم سر پھٹول میں مشغول تھے۔[1] ذوالحجہ ۶۵۴ھ میں وہاں ایک فسادِ عظیم برپا ہوا۔ ابتداء اس طرح ہوئی کہ کرخ کے کسی شیعہ نے ایک سُنی نوجوان کو قتل کردیا۔ اس پر دربارِ خلافت کے کچھ خدام نے خلیفہ کو باور کرایا کہ شیعوں کا فتنہ حد سے بڑھ گیا ہے، انہیں کڑی سزا ملنی چاہیے۔ خلیفہ نے اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ سرکاری اہل کاروں نے کرخ پر دھاوا بول دیا، اوباش لوگ بھی اسے لوٹ مار کا نادر موقع سمجھ کر ساتھ ہولیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا جس میں دونوں طرف سے لوگ قتل ہوئے۔ البتہ زیادہ نقصان اہلِ کرخ کا ہوا، ان کی کچھ عورتیں بھی اغواء کی گئیں۔[2] ابن علقمی کے کچھ اعزہ واقارب بھی اس دارو گیر کی زد میں آگئے۔[3] یہ کارروائی خلیفہ کے بیٹے ابوبکر اور امیر دُوَیدار کی سرکردگی میں ہوئی تھی۔[4] اس دوران جو ہوا، نہایت افسوس ناک تھا جس کی کوئی وجہِ جواز پیش نہیں کی جاسکتی۔ خود اہلِ سنت اس کارروائی سے متنفر ہوئے۔[5] خلیفہ مستعصم بھی معاملے کو اس حد تک نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ جب اسے صورتحال سے مطلع کیا گیا تو اس نے کارروائی رُکوا کر لوٹ مار کا سامان واپس دلوایا اور اغواء شدہ عورتوں کو بازیاب کرا کے واپس بھیجا۔[6]

تباہی کا منصوبہ:

اس قابلِ ملامت واقعے سے شیعوں کا حکومت سے بددل ہونا فطری بات تھی۔ تاہم اس بناء پر پورے بغداد کو تباہ کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ مگر چونکہ ابن علقمی پہلے ہی سلطنت کی جڑیں کاٹنے کے لیے تیار تھا اور تاتاری جاسوسوں سے اس کی ملاقات ہوچکی تھی۔ لہٰذا اپنے ہم مذہبوں کی اس دُرگت کے بعد اس نے طے کرلیا کہ وہ جلد از جلد بنوعباس کو ختم کرکے خلافت علوی شیعوں کو منتقل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ وہ ہلاکو خان کو کہہ کر بغداد پر حملہ کرائے گا اور خلافتِ عباسیہ کے خاتمے کے بعد خود بغداد کا حکمران بن کر یہاں شیعہ خلافت قائم کرے گا اور بیعت نہ کرنے والے سُنیوں کا قتل عام کرائے گا۔[7]

وزیر کی تاتاریوں سے ساز باز:

ان دنوں ہلاکو خان باطنیوں کی سرکوبی سے فارغ ہوچکا تھا مگر اپنے پایۂ تخت سمرقند واپس جانے کی بجائے اس کا

---

① بغداد میں شیعہ سُنی کشیدگی پہلے سے تھی۔ محرم کے ماتمی جلوس فتنے کا باعث بنا کرتے تھے۔ ۶۴۰ھ کے آغاز میں بغداد کے محتسب نے پابندی لگائی تھی کہ عاشوراء کی مجالس فقط محلّہ کرخ میں منعقد ہوں گی۔ (الحوادث الجامعہ: ص ۱۴۳) ۶۵۰ھ میں یہ پابندی دوبارہ لگائی گئی۔ (العسجد المسبوک، ص ۵۸۵) ایسی باتوں سے شیعہ خاصے بددل تھے۔

② الحوادث الجامعة والتجارب النافعة لابن الفوطي، ص ۲۲۵، ۲۲۶، ط العلمية

③ البداية و النهاية: سنة ۶۵۶ھ

④ تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۶۶۲

⑤ طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۲/ ۱۹۲ مع حاشیہ

⑥ الحوادث الجامعہ، ص ۲۲۵، ۲۲۶ ⑦ مورد اللطافة فی من ولی السلطنة والخلافة از ابن تغری بردی: ۱/ ۲۳۲

رخ ہمدان کی طرف تھا۔ ربیع الاول ۶۵۵ھ میں وہ ہمدان میں پڑاؤ ڈال چکا تھا۔[1] ابن علقمی نے ضروری سمجھا کہ لشکر بغداد کو فتح کر کے واپس لوٹے۔ اس نے ہلاکو خان کو بغداد پر حملے کی دعوت دیتے ہوئے لکھا:

اب یہ

''آپ بغداد پر حملہ کریں، میں شہر آپ کے حوالے کرنے کا ذمہ لیتا ہوں۔''[2]

ابن علقمی نے یہ خفیہ پیغام اسی طرح روانہ کیا تھا جیسے خلیفہ ناصر نے چنگیز خان کو بھیجا تھا۔ یعنی قاصد کا سر مونڈ کر اس پر آنکھیں سوئی سے پیغام گدوایا گیا اور قاصد کے بال بڑے ہو جانے پر اسے روانہ کر دیا گیا۔ اسے تاکید کی گئی کہ ہلاکو خان کے پاس جا کر کہنا: ''میرا سر مونڈ کر اس پر لکھی تحریر پڑھ لو۔''[3]

قاصد ہلاکو خان کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ ابن علقمی کا پیغام میرے سر پر گدوایا گیا ہے۔ ہلاکو خان نے اس کا سر منڈوا کر تحریر پڑھ لی جس میں بغداد پر حملے کی دعوت کے بعد آخر میں لکھا تھا:

''مطالعے کے بعد مراسلہ پھاڑ دیجئے گا۔''

ہلاکو خان اس رمز کو سمجھ گیا اور فوراً قاصد کا سر قلم کرا دیا۔[4]

بغداد کی افواج میں کمی کی ہولناک سازش:

ابن علقمی کا پیغام ہلاکو خان کے لیے نہایت حوصلہ افزا تھا۔ وہ خود بھی ٹھانے ہوئے تھا مگر چونکہ مستعصم کا باپ مستنصر بغداد کے لیے ایک لاکھ گھڑ سواروں کی جو فوج تیار کر گیا تھا، وہ اب بھی موجود تھی، اس کے علاوہ خلیفہ کی بین الاقوامی حیثیت بھی ایک رکاوٹ تھی، لہٰذا ہلاکو خان نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے جواب بھیجا:

''بغداد کی افواج بکثرت ہیں۔ اگر تم سچے دل سے ہمارے وفادار ہو تو پہلے بغداد کی فوج کو کم کرا کے دکھاؤ۔ اس کے بعد ہم چڑھائی کریں گے۔''

ابن علقمی نے اپنی ہوشیاری اور عیاری سے ایسا کر دکھایا۔ اس نے خلیفہ کو یقین دلایا کہ بغداد کو تاتاریوں سے کوئی خطرہ نہیں، لہٰذا ایک بڑی فوج خزانے پر خواہ مخواہ کا بوجھ بن رہی ہے۔[5] وہ خلوت میں خلیفہ سے ملا اور کہنے لگا:

''اللہ کی عنایت سے تمام دنیا کے بادشاہ آپ کی چوکھٹ پر سر جھکاتے ہیں اور خود کو دربارِ خلافت کا خادم شمار کرتے ہیں۔ ایسے میں دور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر سال اتنی خطیر رقم افسرانِ فوج اور سپاہیوں پر خرچ نہ کی جائے۔ اگر امیر المؤمنین اجازت عنایت فرمائیں تو بندہ یہ خدمت انجام دے سکتا ہے کہ ان سپاہیوں کو روزگار پر لگا دے۔ ان کی آمدن سے دولتِ عباسیہ کا خزانہ لبالب بھر جائے گا۔''

---

[1] جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۶۰، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر
ہمدان ایران کا ایک صوبہ ہے۔ ہمدان شہر بغداد سے ۶۸ کلومیٹر دور ہے۔ یہ وسط ایشیا سے بغداد جانے والے قافلوں کا اہم پڑاؤ تھا۔

[2] مورد اللطافۃ فی من ولی السلطنۃ والخلافۃ از ابن تغری بردی: ۱/ ۲۳۲، ط دار الکتب المصریۃ

[3] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی: ۸/ ۲۶۳، ط ھجر؛ فوات الوفیات لابن شاکر صلاح الدین: ۳ص ۲۵۳، ۲۵۵، ط صادر

[4] فوات الوفیات: ۳/ ۲۵۳، ۲۵۵، ط صادر [5] المنھل الصافی والمستوفی بعد الوافی لابن تغری بردی: ۷/ ۱۲۸، ط الھیئۃ المصریۃ

مستعصم طبعی طور پر بخیل تھا، لہٰذا یہ ہلاکت خیز مشورہ اسے بھا گیا۔ اس نے ابن علقمی کو فوج میں کمی کا اختیار دے دیا۔[1] اس نے ابتدائی مرحلے میں ۱۵ ہزار سپاہیوں کو معطل کر دیا۔[2]

حاکم موصل بدرالدین لؤلؤ کی سیاست:

موصل کا حاکم بدرالدین لؤلؤ اپنی زندگی کا آفتاب ڈھلتے دیکھ رہا تھا۔ وہ آرمینیا کا ایک غلام زادہ تھا جس نے ۸۰ سال قبل موصل کے زنگی خانوادے کی خدمت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے آخر دولتِ موصلیہ زنگیہ کا مضبوط ترین ستون بن گیا تھا۔ ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں جب دولتِ زنگیہ انتہائی زوال کا شکار ہو چکی تھی، بدرالدین دولتِ موصل پر حاوی ہونے لگا۔ زنگی خاندان کے کم عمر اور ناتجربہ کار شہزادوں کو کٹھ پتلی حکمران بنانا اور حسبِ مرضی انہیں خفیہ سازشوں کے ذریعے معزول یا قتل کرا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا تھا۔ اس اعتبار سے مؤرخین اسے ظالم حکام میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود موصل کے عوام اسے پسند کرتے تھے۔

۶۳۰ھ میں اس نے زنگیوں کی نمائشی حکومت کو باقی رکھنے کا تکلف ختم کر دیا اور خود حکمران بن گیا۔ اکثر مؤرخین اس کی دانائی، عدل، تدبر اور سخاوت کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ مدارس اور علماء کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ علامہ ابن الاثیر الجزری نے اسی کے دورِ حکومت میں ''الکامل فی التاریخ'' جیسا عظیم شاہکار مکمل کیا اور بدرالدین نے انہیں انعام و اکرام سے نوازا۔ بدرالدین نے تاتاریوں کی ہر یلغار سے اپنے شہر کو محفوظ رکھا۔ اب ہلاکو خان کے حملے کے وقت اس کی عمر ۹۰ سال سے متجاوز تھی اور اس کی حکومت کو لگ بھگ نصف صدی گزر چکی تھی۔[3]

حاکم موصل کا خلیفہ کے نام تنبیہی مراسلہ:

وہ ہمیشہ اپنے ہمسایوں سے سیاسی داؤ پیچ کھیلتا آیا تھا۔ وہ تاتاریوں کا معاون تھا مگر اس امکان کے تحت کہ شاید تاتاری بغداد فتح کیے بغیر لوٹ جائیں، وہ خلیفہ کو بھی زیرِ احسان رکھنا چاہتا تھا، چنانچہ وہ ایک طرف ہلاکو خان کی طلب پر اسے عراق پر فوج کشی کے لیے ہتھیار فراہم کر رہا تھا اور دوسری طرف خلیفہ کو خطوط بھیج کر تاتاریوں کے عزائم سے آگاہ کر رہا تھا۔[4] مگر ایسے مراسلے عموماً پہلے ابن علقمی تک پہنچتے تھے اور وہ خلیفہ کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔ اگر کوئی خط یا پیغام خلیفہ کو مل بھی جاتا تو وہ ابن علقمی ہی سے اس بارے میں مشورہ لیتا۔ ایسے میں ابن علقمی اسے یقین دلا دیتا کہ یہ سب افواہیں ہیں اور کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ چنانچہ بدرالدین کے تنبیہی مراسلے بھی بے سود رہے۔[5]

ہلاکو خان کی پیش قدمی اور واپسی:

ربیع الآخر ۶۵۵ھ (مئی ۱۲۵۷ء) میں ہلاکو خان بغداد پر حملے کے لیے ہمدان سے روانہ ہوا۔ مگر پھر وہ اچانک

---

[1] تاریخ حبیب السیر: ۳۳۸/۲ [2] المنہل الصافی والمستوفی بعد الوافی لابن تغری بردی: ۱۲۸/۷، ط الہیئۃ المصریۃ

[3] البدایۃ والنہایۃ: ۶۵۷ھ، سیر اعلام النبلاء: ۳۵۶/۲۳، ۳۵۷

[4] ذیل مرآۃ الزمان لقطب الدین الیونینی: ۸۷/۱، ط دار الکتاب الاسلامی قاہرہ

[5] شذرات الذہب فی اخبار من ذہب لابن العماد الحنبلی (م ۱۰۸۹ھ): ۷ص ۳۶۸، ط دار ابن کثیر، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۲۶۹/۸

راستے سے واپس ہو گیا۔ (1)

فوج میں کمی کا سلسلہ جاری:

ادھر بغداد کی فوج میں کمی کا سلسلہ جاری تھا۔ ابن علقمی نے کچھ مدت بعد مزید ۲۰ ہزار گھڑ سواروں کو برطرف کر دیا۔ (2) یہ سلسلہ اتنا آگے بڑھا کہ آخر کار بغداد میں گھڑ سوار سپاہی دس ہزار سے بھی کم رہ گئے۔ باقی سپاہیوں کو نہ صرف برطرف کر دیا گیا بلکہ ان کے بغداد میں رہنے پر بھی پابندی لگا دی گئی تا کہ جنگ کے وقت انہیں ہنگامی طور پر بھرتی نہ کیا جا سکے۔ بڑے بڑے افسرانِ فوج کا یہ حال ہوا کہ وہ بازاروں اور مسجدوں میں بھیک مانگتے دیکھے گئے اور ان کے لیے قصیدے کہنے والے شعراء نے ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر ان پر مرثیے لکھے۔ (3) ۶۵۵ھ کے وسط میں بغداد کے اکثر سپاہی دور دراز کے علاقوں میں منتشر ہو چکے تھے اور خلیفہ بے فکری سے عیش و آرام میں منہمک تھا۔ (4)

ہلاکو کا وزیر کو بغداد کی حکومت دینے کا وعدہ:

اُدھر ابن علقمی کے ہلاکو سے رابطے قائم تھے۔ ابن علقمی کا مطالبہ تھا کہ بغداد پر قبضے کے بعد اسی کو حاکمِ بغداد بنایا جائے گا۔ تاتاریوں نے اس سے یہ وعدہ کر لیا۔ (5) بغداد کی فوج کو تباہ کرنے کے بعد ابن علقمی نے ہلاکو خان کو مراسلہ بھیج کر بغداد کی اندرونی حالت اور فوج میں کمی کی ساری کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ ہلاکو خان کو شروع میں یقین نہ آیا کہ ایسی حالت میں بغداد والے اپنی فوج میں اتنی کمی کیسے کر سکتے ہیں۔ مگر ابن علقمی نے دوبارہ مراسلہ بھیج کر اسے یقین دلایا کہ میرا بنو عباس کی حکومت سے وفاداری کا رشتہ بالکل منقطع ہو چکا ہے اور میں بغداد کی افواج کو بالکل منتشر

---

(1) جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص: ۲۶۷، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر
رشید الدین نے ہلاکو کی واپسی کی تاریخ ۱۲ رجب بیان کی ہے، قرائن سے ظاہر ہے کہ یہ واپسی کے آغاز کی نہیں، بلکہ ہمدان واپس پہنچنے کی تاریخ ہے۔
ہلاکو خان کی اس اچانک واپسی کی وجہ کسی مؤرخ نے بیان نہیں کی مگر بعض روایات سے اس کی ایک ممکنہ وجہ سامنے آتی ہے۔ علامہ ابن تغری بردی نے لکھا ہے کہ ابن علقمی نے خلیفہ کو فوج کی تعداد میں کمی کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا: والعدوُّ قد رجع. "دشمن تو واپس چلا گیا ہے۔" وعَلَيَّ إن عاد هلاكو القيام بدفعه. "اگر وہ دوبارہ آیا تو اسے روکنا میرے ذمے ہے۔" (مورد اللطافة في من ولي السلطنة والخلافة از ابن تغری بردی: ۱/ ۲۳۲)
بظاہر یہ انہی دنوں کی بات تھی جب ہلاکو خان بغداد کے قریب آ کر واپس لوٹ گیا تھا۔ شاید اس واپسی میں ابن علقمی کی سفارتی کوشش کا دخل ہوگا کیوں کہ اہم معاملات میں گفتگو اسی کے توسط سے ہوتی تھی۔ ہلاکو خان ابن علقمی کے کہنے پر اسی لیے واپس لوٹا ہوگا تا کہ خلیفہ کو یقین آ جائے کہ ابن علقمی اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر بغداد کو بچا سکتا ہے۔ عام ماحول میں ابن علقمی اپنے دعویٰ کوئی وزن نہ رکھتا کہ تاتاریوں کو واپس کرنا میری ذمہ داری ہے۔ مگر جب اس کی سفارتی کوشش کے باعث ہلاکو خان کی واپسی ہوئی تو خلیفہ نے یقین کر لیا کہ ابن علقمی ہمیشہ بغداد کو بچا سکتا ہے۔ یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ ہلاکو کی واپسی کو ابن علقمی نے یوں ظاہر کیا تھا جیسے صلح ہو چکی ہو (جبکہ درحقیقت کوئی معاہدہ طے نہیں پایا تھا۔) قاضی منہاج السراج لکھتے ہیں:
"وبعرض امیر المؤمنین چناں نمود کہ با کفار صلح افتادہ است، واو را بہ لشکر حاجت نیست۔" (طبقات ناصری: ۲/ ۱۹۱)
یعنی ابن علقمی نے خلیفہ پر یہ ظاہر کیا کہ کفار (تاتار) سے صلح ہو چکی ہے اور اب خلیفہ کو لشکر کی ضرورت نہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد خلیفہ نے اس پر اندھا بھروسہ کر لیا اور اتنا بے فکر ہو گیا کہ خطرہ اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی فوج میں کمی در کمی کی پروا نہ کی۔
(2) المنهل الصافي والمستوفي بعد الوافي از ابن تغری بردی: ۱۲۸/۷، ط الهيئة المصرية
(3) البداية والنهاية: سنة ۶۵۶ھ
(4) تاریخ حبیب السیر: ۲/ ۳۳۸
(5) تاریخ الاسلام للذهبي: ۴۸/ ۲۲۰، ت تدمری

اور معطل کر چکا ہوں۔ اب مزید دیر نہ کی جائے۔[1]

ہلاکو خان کی عراقی امراء کو دھمکیاں:

اس سے پہلے ہلاکو خان عراق کے تمام امراء کو دھمکی آمیز خطوط بھیج چکا تھا کہ وہ سب سلطنتِ تاتار کی اطاعت قبول کرلیں ورنہ ان کا انجام عبرت ناک ہوگا۔ یہ اقدام اس لیے ضروری سمجھا گیا تا کہ عین جنگ کے وقت خلیفہ کو کہیں سے کمک نہ مل سکے۔ اکثر امراء ہلاکو خان کے قہر سے بچنے کے لیے اس کے حلقۂ اطاعت میں آچکے تھے۔ یوں بغداد کو بیرونی مددگاروں سے بھی محروم کردیا گیا تھا۔[2]

حملے کا بہانہ:

ہلاکو خان کے لیے راستہ بالکل صاف تھا مگر اس نے حملے سے پہلے کوئی بہانہ تراشنا ضروری سمجھا اور یہ شوشہ چھوڑا کہ خلیفہ نے باطنیوں کے خلاف مہم میں تاتاریوں کی مدد کیوں نہ کی۔ یہ بالکل فضول الزام تھا کیوں کہ تاتاریوں کو بھی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ مگر یہ بہانہ بنا کر ہلاکو نے دس رمضان ۶۵۵ھ کو خلیفہ کے نام یہ مراسلہ بھیجا:

''ہم نے ملاحدہ کے قلعے فتح کرتے وقت تم سے اطاعت اور فوجی مدد طلب کی، تم نے اطاعت ظاہر کی مگر فوجی مدد نہ بھیجی۔ اطاعت اور اتحاد کی نشانی یہ تھی کہ سرکشوں سے مقابلے کے وقت تم ہمارے پاس فوج بھیجتے۔ ہم نصیحت کررہے ہیں کہ تم بغض اور دشمنی چھوڑ دو، سورج پر کیچڑ لیپنے کی کوشش مت کرو، ورنہ تھک ہار جاؤ گے۔

بہرکیف جو ہوا سو ہوا، اب اگر خلیفہ ہمارا مطیع ہے تو قلعے منہدم کردے، خندقیں پُر کردے اور ملک اپنے بیٹے کے حوالے کرکے ہمارے پاس حاضری دے۔ اگر ایسا نہیں کرسکتا تو امیر دُویدار اور سلیمان شاہ کو ہمارے پاس بھیج دے تا کہ ہم جو کہیں وہ بلاکم وکاست خلیفہ کو معلوم ہوجائے۔ اگر یہ باتیں قبول ہیں تو ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ اگر نصیحت پر کان نہ دھرا تو پھر فوجیں تیار کرکے میدان میں آجاؤ کہ ہم جنگ کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ جب ہم بغداد پر حملہ کریں گے تو کوئی فصیل تمہیں نہیں بچاسکے گی چاہے تم آسمان میں جا چھپو۔

اگر اپنا سر اور اپنا گھر بچانا ہے تو بات مان لو، ورنہ دیکھ لو گے کہ اللہ کا ارادہ کیا ہے۔''[3]

---

① تاریخ حبیب السیر: ۳۳۸/۲...... ہلاکو خان کا خیال تھا کہ کوئی ملک ایک طاقتور دشمن کے قریب ہوتے ہوئے ہرگز اپنی فوج میں اتنی کمی نہیں کرسکتا جتنی ابن علقمی بتارہا ہے، اس لیے اسے شک ہونے لگا کہ ابن علقمی خلیفہ کا وفادار ہے اور فوج میں کمی کا محض ناٹک کررہا ہے تا کہ تاتاری خوش فہمی کا شکار ہوکر آئیں اور مارے جائیں۔ ابن علقمی کا جواب ہلاکو کے اس قسم کے شبہات دور کرنے کے لیے تھا۔

② العسجد المسبوک والجوهر المحکوک للاشرف الغسانی، ص ۶۲۳

③ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللّٰہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۶۷، ۲۶۸، ط دار احیاء الکتب العربیة مصر

نوٹ: ہلاکو کا امیر دُویدار اور امیر سلیمان شاہ کو طلب کرنا کسی نیک نیتی پر مبنی نہیں تھا بلکہ انہیں گرفتار کرکے بغداد کو اعلیٰ ترین فوجی قائدین سے محروم کرنا مقصود تھا۔ دُویدار کی طلبی میں مکار وزیر کا ایماء بھی شامل ہوگا کیوں کہ بغداد میں دُویدار ہی اس کا سب سے بڑا حریف تھا۔ اگر وہ ہلاکو کے ہاتھ آجاتا تو وزیر کے راستے کا ہر کانٹا نکل جاتا۔ جہاں تک امیر سلیمان شاہ کا تعلق ہے، وہ ترکمان قبائل کا سردار اور تجربہ کارترین فوجی افسر تھا۔ مؤرخین کے بقول وہ اپنے دور کا رستم تھا جس نے تیس سال تک بغداد کا دفاع کیا اور تاتاریوں کو بار بار پسپا کیا۔ (طبقات ناصری: ۱۹۲/۲) ہلاکو خان کو اگر اپنا موقف خلیفہ تک پہنچانا تھا تو یہ کام ان افسرانِ اعلیٰ کو بلوانے پر موقوف نہ تھا بلکہ سفیر اسے بخوبی انجام دے سکتے تھے۔ یہ غیر معقول رویہ مکر وفریب اور سازش کی واضح علامت تھا۔

خلیفہ خیالی باتوں میں الجھا رہا:

اُدھر مستعصم باللہ کی قوتِ فیصلہ سلب ہوگئی تھی۔ وہ بس ابن علقمی کی رائے پر عمل کرتا جا رہا تھا۔ ابن علقمی یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مستعصم تاتاریوں کی اطاعت قبول کرکے اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچالے۔ وہ اس خانوادے کا بیج مٹانے پر تلا ہوا تھا، لہٰذا اس نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ ہلاکو خان کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے۔ ①

اس نے خلیفہ کو زمینی حقائق کی بجائے جذباتی اور خیالی باتوں میں الجھالیا۔ اس نے کہا:

''تاتاری لشکر کی کیا مجال کہ وہ اہلِ بغداد کو کچھ گزند پہنچا سکے۔ اگر بغداد کی عورتیں اور بچے ہی گھروں کی چھتوں سے تاتاریوں پر سنگ باری کریں تو ان کی لاشیں گلی کوچوں اور بازاروں میں بکھر جائیں۔'' ②

سفارتی محاذ پر خلیفہ کی ناکامی۔ نامناسب مراسلے:

ان پُرفریب باتوں میں آکر خلیفہ نے ہلاکو خان کے نام ایک ایسا مکتوب لکھوایا جس نے معاملے کو انتہائی حد تک بگاڑ دیا۔ یہ مکتوب علامہ شرف الدین ابن الجوزی رحمہ اللہ ہلاکو کے پاس لے کر گئے۔ جس میں تحریر تھا:

''اے نوجوان! جسے دو دن کی حکومت نے دھوکے میں ڈال دیا ہے، تم ہم سے ایسی چیز مانگ رہے ہو جو تمہیں کبھی نہیں مل سکے گی۔ مشرق سے مغرب تک تمام بوڑھے اور جوان میرے غلام ہیں مگر میں لڑائی نہیں چاہتا۔ میں خاقان اور ہلاکو خان کے ساتھ ایک جان دو قالب کی طرح ہوں، اگر تم بھی میری طرح ہو تو محبت کی تخم پاشی کرو۔ تمہیں خندقوں، قلعوں اور میری رعایا سے کیا کام، پس تم خراسان کی طرف لوٹ جاؤ۔ لیکن اگر تم جنگ ہی چاہتے ہو تو میرے جوان بھی جنگ کے لیے مستعد ہیں۔''

ہلاکو خان یہ جواب سن کر بپھر گیا اور اس نے کہا:

''جب خدا کسی قوم کو انجام تک پہنچانا طے کر لیتا ہے تو اس کے ذہن میں ایسی وہمی باتیں بھر دیتا ہے۔'' ③

اس کے بعد خلیفہ نے کچھ تحائف کے ساتھ قاضی بدر الدین کو سفیر بنا کر بھیجا۔ اس پیغام میں کہا گیا تھا:

''ماضی میں جب بھی کسی بادشاہ نے بغداد پر حملہ کیا، وہ تباہ و برباد ہو کر رہا۔ ہمارے گھرانے کی حکومت تا قیامت رہے گی، یہ مصلحت نہیں کہ آپ ایسے خاندان کے خلاف فوج کشی کریں۔''

اس پر ہلاکو خان مزید آگ بگولا ہوگیا۔ ④

ہلاکو خان کی فیصلہ کن یلغار۔ امرائے عراق کی باہمی مکاتبت:

آخر ہلاکو خان دو لاکھ جنگجوؤں کے ساتھ عراق کی طرف روانہ ہوگیا۔ ⑤ راستے میں آنے والے ہر شہر اور ہر قلعے

---

① العسجد المسبوک والجوهر المحکوک فی اخبار الخلفاء والملوک، للملک الاشرف الغسانی (م ۸۰۳ھ)، ص ۶۲۴، ۶۲۵

② تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۳۳۹/۲

③ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱

④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۷۶

⑤ المنهل الصافی والمستوفی بعد الوافی از ابن تغری بردی: ۱۲۸/۷، ط الهیئة المصریة

کے حاکم کے لیے دو ہی راستے تھے: یا تو ہلاکو خان کے خیمے میں حاضر ہو کر سر جھکا دے یا اپنی قوم سمیت بے رحمی سے قتل ہونا پسند کرے۔ اگر حاکم سرنگوں ہو جاتا تو اسے معافی مل جاتی اور اس کی فوج اپنے ساتھ شامل کر لی جاتی البتہ شہر کو لوٹ لیا جاتا اور قلعہ وفصیل کو تباہ کر دیا جاتا۔ (1)

بعض امرائے عراق اور افسرانِ بغداد کی خط وکتابت:

اس دوران ہلاکو کی اطاعت قبول کرنے والے عراقی امراء افسرانِ بغداد کو خطوط لکھ کر جنگ سے باز رہنے اور ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کر رہے تھے۔ تاتاریوں کی اطاعت قبول کرنے والے ایک امیر سلطان جوق نے پرانی دوستی کی بناء پر بغداد کی سرحدوں کے محافظ امیر قراسنقر کو خط لکھا:

”میں بڑے غور وفکر اور کوشش کے بعد ہلاکو خان کے دربار سے وابستہ ہو گیا ہوں۔ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک کر رہا ہے۔ تم اپنی زندگی بچاؤ۔ اپنے بچوں پر رحم کرو۔ اپنے گھر بار کو ان لوگوں سے محفوظ کر لو۔“

اس پر قراسنقر نے جواب دیا:

”تاتاری کون ہوتے ہیں عباسی خانوادے پر حملہ کرنے والے؟ عباسیوں کی حکومت پانچ صدیوں سے قائم ہے۔ جس نے بھی ان کو ختم کرنے کی کوشش کی، وہ خود نیست ونابود ہو گیا۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ تم مجھے سلطنتِ تاتار سے منسلک ہونے کی دعوت دو۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہلاکو خان ترکستان لوٹ جائے کیوں کہ خلیفۃ المسلمین کی طبیعت ہلاکو خان کی پیش قدمی سے بہت متاثر اور خفا ہو رہی ہے۔ اگر ہلاکو خان اپنے کیے پر نادم ہو تو فوج کو واپس بھیج دے۔ ہم خلیفہ سے سفارش کریں گے تاکہ صلح ہو جائے اور جنگ کا دروازہ بند ہو جائے۔“

سلطان جوق نے یہ مراسلہ ہلاکو خان کو دکھایا تو وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا: ”اگر خدا میرے ساتھ ہے تو مجھے خلیفہ اور اس کی افواج کا کیا خوف؟“ اس کے بعد اس نے امیر قراسنقر کو پیغام بھیجا:

”اگر خلیفہ ہمارا مطیع ہو گیا ہے تو نکل کر ہمارے پاس آئے۔ ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔“ (2)

ہلاکو خان بغداد کے سامنے:

اسد آباد پہنچ کر ہلاکو خان نے ایک بار پھر خلیفہ کے نام پیغام بھیجا کہ وہ بغداد سے نکل کر اس کے دربار میں حاضری دے۔ فوج کی کمی کے باعث بغداد کے امراء کو جنگ جیتنے کی بھی امید نہ تھی مگر خلیفہ کو ہلاکو خان کے پاس بھیجنا تو انتہائی ذلت کی بات تھی، اس لیے امراء نے ضروری سمجھا کہ اس وقت ہلاکو خان کو خطیر مال ودولت دے کر واپسی پر آمادہ کر لیا جائے اور اس کے بعد فیصلہ کن مقابلے کے لیے از سر نو فوج تیار کی جائے۔ چنانچہ علامہ محی الدین ابن الجوزی رحمہ اللہ سفیر بن کر ہلاکو خان کے پاس گئے۔ اس وقت تاتاری لشکر دینور تک پہنچ چکا تھا۔

---

(1) البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۶ھ، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی: ۲۶۸/۸

(2) جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل، ص ۲۸۳، ۲۸۴

ابن الجوزی رحمہ اللہ نے ہلاکو خان کو خلیفہ کا پیغام دیا کہ اگر تاتاری لوٹ جائیں تو انہیں منہ مانگی رقم دی جائے گی۔ ہلاکو خان سمجھ گیا کہ اہلِ بغداد فوج تیار کرنے کے لیے وقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے طنزیہ جواب دیا: "اتنی طویل مسافت طے کرنے کے بعد ہم خلیفہ کی زیارت کیے بغیر واپس کیسے چلے جائیں۔"

چنانچہ ہلاکو خان کرمان شاہ سے ہوتے ہوئے ۹ ذوالحجہ ۶۵۵ھ کو دریائے حلوان کے پار آ گیا۔ ①

اُردوئے زرّیں کی حملے میں شرکت۔ حاکم موصل کی اعانت:

اُدھر ۸۰ ہزار مغلوں کی ایک فوج شمال سے جنوب کی طرف بڑھ رہی تھی جس کی کمان تاتاری سردار باجی نویان کے ہاتھ میں تھی جو آذربائی جان میں تعینات تھا۔ ② اس لشکر میں بحیرۂ خزر کے پار دشتِ قپچاق میں آباد وہ مغل بھی شامل ہو گئے تھے جن کی مملکت اُردوئے زرّیں خیل کہلاتی تھی۔ ③

یہ لشکر موصل پہنچا جہاں کا حاکم بدرالدین لؤلؤ تاتاریوں کی اطاعت قبول کر چکا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے الصالح اسماعیل کی کمان میں کچھ دستے اس لشکر میں شامل کر دیے۔ ④ ساتھ ہی تاتاریوں کو دریائے دجلہ پر پُل تیار کر کے دیا اس طرح پوری فوج آرام سے دریا کے پار اُتر گئی۔ ⑤

خلیفہ کی ایک تدبیر جو ناکام رہی:

خلیفہ نے اس دوران ایک کام یہ کیا کہ گھاٹیوں میں ناکہ بندی اور لشکرِ تاتار کی نقل و حرکت کی خبریں لانے کے لیے

---

① جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۲۸۲ تا ۲۸۳

② طبقاتِ ناصری: ۱۹۳/۲

باجی نویان کو ۶۵۰ھ کی دہائی میں آذربائی جان، آرمینیا اور ایشیائے کوچک پر تسلط کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔ ہلاکو ربیع الاوّل ۶۵۵ھ میں جب باطنیوں کی سرکوبی سے فارغ ہو کر ہمدان روانہ ہوا تو اس نے باجی نویان کو طلب کر کے مذکورہ علاقوں کو اب تک پوری طرح فتح نہ کرنے پر سخت سرزنش کی تھی۔ باجی نویان معافی مانگ کر دوبارہ ان علاقوں کی تسخیر کے لیے چلا گیا تھا۔ (جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ دوئم: ص ۲۶۰) مگر ۶۵۵ھ کے اواخر میں اسے بغداد پر حملے کے لیے دوبارہ طلب کر لیا گیا تھا۔

③ ذیل مرآۃ الزمان: ۸۷/۱، ۸۸

رشیدالدین کے بیان کے مطابق بلغا بن شیبان بن جوجی، توتار بن سکنقور بن جوجی اور قولی بن اوردہ بن جوجی زریں خیل کے امدادی لشکر کی کمان کر رہے تھے۔ اس لشکر کو بلادِ روم سے اربل و موصل کی شاہراہ پر سفر کر کے بغداد آنے کا کہا گیا تھا۔ یہ بھی طے تھا کہ مشرق اور شمال سے آنے والے لشکر بیک وقت بغداد کو دو سمتوں سے گھیریں گے۔ (جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۸۱)

ان مغلوں کا اصل مرکز دشتِ قپچاق میں تھا جہاں جوجی کی اولاد کی حکومت تھی۔ سقوطِ بغداد تک ایل خانیوں اور اردوئے زریں میں بہتر تعلقات تھے اور ایل خانی اپنی ہر فتح کے مالِ غنیمت میں سے خمس اردوئے زریں کو بھیجا کرتے تھے۔ (طبقات ناصری: ۱۷۶/۲)

اردوئے زریں خیل کے خانوں کے عباسی خلفاء سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ (طبقات ناصری: ۲۱۴/۲) اس لیے بغداد پر فوج کشی میں ان کا حصہ دار بننا عجیب معلوم ہوتا ہے مگر کوئی بعید نہیں کہ ہلاکو خان نے ان پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا ہو کہ وہ عباسی خلافت کو ختم کرنے جا رہا ہے۔ بلکہ غالباً ہلاکو خان خود بھی خلیفہ کو قتل کرنے کا ذہن لے کر نہیں نکلا تھا اور خلیفہ سے خراج لینے پر راضی تھا مگر ابن علقمی اور نصیرالدین طوسی نے اسے پورے عباسی خاندان کا نام و نشان مٹانے پر آمادہ کیا۔ شاید خلیفہ کو فقط باج گزار بنانے سے خانانِ زریں خیل کو بھی انکار نہ ہو۔ مگر بعد میں جو وحشت وہاں برپا کی گئی، اس سے وہ نہایت غضب ناک ہوئے۔ مالِ غنیمت میں حصہ نہ ملنے کا رنج اس پر مزید تھا۔ اس کے بعد ایل خانیوں اور تاج زریں خیل کے درمیان دشمنی پڑ گئی۔ جس کی تفصیل اگلے باب میں آ رہی ہے۔

④ ذیل مرآۃ الزمان لقطب الدین الیونینی: ۸۸/۱، ط دار الکتاب الاسلامی قاہرہ

⑤ طبقاتِ ناصری از قاضی منہاج السراج جوزجانی: ۱۹۳/۲، ط کابل

ایک سو سپاہی دَربند کے کوہستان میں تعینات کر دیے۔ ① مگر مقامی کُردوں نے غداری کر کے تاتاریوں کو ان سپاہیوں کے مورچوں تک رسائی فراہم کر دی۔ یوں یہ سب کے سب وہیں شہید کر دیے گئے۔ ②

شمال کا لشکرِ تاتار بلا روک ٹوک تکریت پہنچ گیا۔ یہاں ایک بار پھر دریا پر پُل باندھنا پڑا مگر اہلِ تکریت نے یکدم حملہ کر کے پُل کو نذرِ آتش کر دیا اور بہت سے تاتاریوں کو موت کے گھاٹ اتار کر دوبارہ قلعہ بند ہو گئے۔ باجی نویان کے پاس شہر فتح کرنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے جلد از جلد دوسرا پُل بنوا کر فوج کو دریا کے پار پہنچا دیا۔ ③

اُدھر مشرق سے ہلاکو خان کا لشکر بڑھتا آ رہا تھا جس میں حاکمِ شیراز ابوبکر بن سعد زنگی بھی امدادی دستوں کے ساتھ شامل ہو چکا تھا۔ ④ آخر کار دو سمتوں سے اُمنڈنے والا تاتاری افواج کا سیلاب اپنی معاون افواج سمیت دولتِ عباسیہ کی حدود میں داخل ہو گیا۔ ⑤

محمد الکامل خلیفہ کی مدد کے لیے بے چین:

عالمِ اسلام میں اس وقت اگر کوئی شخص تاتاریوں کے عزائم کو بھانپ کر بغداد کو بچانے کے لیے مضطرب تھا تو وہ الجزیرہ کا نوجوان حکمران محمد الکامل (الملک العادل کا پوتا) تھا۔ اس وقت خود اس کی اپنی ریاست شدید خطرے کی زد میں تھی کیوں کہ کچھ مدت پہلے تاتاری لشکر اس کے پایۂ تخت میافارقین کے آس پاس گشت کر چکا تھا۔ اُس وقت محمد الکامل نے براہِ راست خاقانِ قراقرم منگو خان سے مل کر اپنی ریاست کو بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ نہایت طویل سفر کر کے اس کے دربار میں پہنچا تھا۔ موصل کے حاکم بدر الدین لؤلؤ کا بیٹا الصالح اسماعیل اور حاکم ماردین کا بیٹا مظفر بھی اسی وقت منگو خان کے ہاں تھے۔ سب خاقان سے اپنی ریاستوں کی بقاء کے خواہاں تھے۔ منگو خان نے محمد الکامل کی ریاست کا رقبہ جاننے کے بعد اسے تمام مہمان امراء سے اوپر جگہ دی اور کہا: "تم ان سب سے زیادہ معزز ہو۔" پھر اس نے وفد کو ہلاکو خان کے نام ایک امان نامہ لکھ دیا کہا: "آئندہ تمہارا معاملہ اسی کے ہاتھ ہوگا۔"

محمد الکامل جب وہاں سے واپس ہوا تو بغداد پر تاتاریوں کی چڑھائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ وطن واپس آنے کے کچھ دنوں بعد حاکمِ شام الملک الناصر کو تاتاریوں کے خلاف جہاد پر ابھارنے کے لیے دمشق چلا گیا۔ اس دوران بغداد کے محاصرے کی خبر آ گئی۔ اُدھر حاکمِ موصل بدر الدین لؤلؤ کا سفیر آ کر الملک الناصر کو تاتاریوں کی اطاعت

---

① ایشیا میں دربند کے نام سے تین کوہستانی سلسلے مشہور ہیں: ایک ایران کے دارالحکومت تہران کے شمال میں ہے جو کوہستان البرز سے جا ملتا ہے، یہ سطح سمندر سے ۱۷۰۰ میٹر بلند ہے۔ دوسرا سلسلہ شمالی عراق کے ضلع کردستان میں ہے جسے "دربند خان" کہا جاتا ہے۔ تیسرا دربند جسے "دربند شہرستان" یا "بند شروان" کہا جاتا ہے، قفقاز کی جمہوریہ داغستان میں ہے۔ ان تینوں سلسلوں میں پہاڑی راستے اس قدر تنگ اور پیچیدہ ہیں کہ بلندی پر بیٹھے ہوئے مٹھی بھر افراد دور مار ہتھیاروں سے پوری فوج کو روک سکتے ہیں۔ مذکورہ واقعے میں جس دربند کا ذکر ہے، وہ دربند خان (شمالی عراق) ہے جہاں کرد آباد تھے۔ یہ مقام بغداد سے ۳۴۴ کلومیٹر شمال میں ہے جبکہ موصل سے یہ تقریباً ۹۰ کلومیٹر جنوب مشرق میں ہے۔

② ذیل مرآۃ الزمان لقطب الدین یونینی: ۱/ ۲۷...... خلیفہ نے یہ سپاہی شمال کی طرف سے ہلاکو خان کے لیے آنے والی اس مغل کمک کو روکنے کے لیے مقرر کیے تھے جو باجی نویان کی کمان میں تھی۔ ہلاکو خان کا لشکر جو ہمدان سے آ رہا تھا، اس کی راہ میں دربند نہیں پڑتا تھا۔

③ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۹۴ ④ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۹۰ ⑤ العسجد المسبوک للاشرف الغسانی، ص ۶۲۶

پر آمادہ کرنے لگا۔ ان حالات میں محمد الکامل نے دربار دمشق میں ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا:

''ان تاتاریوں پر نہ تو شائستگی اور ملاطفت اثر کرتی ہے اور نہ ان کی خدمت کرنے کا کچھ فائدہ ہے۔ ان کا مقصد فقط لوگوں کا قتلِ عام کرنا اور زمین پر قبضہ کرنا ہے۔ آپ ۶۴۲ھ سے آج تک ان پر مال و دولت خرچ کیے جا رہے ہیں، بتائیے آپ کے خلوص اور محبت نے ان پر کوئی اثر کیا؟ آپ بدرالدین لولو اور اس کے سفیر کی باتوں سے دھوکا مت کھائیں۔ وہ آپ کو اپنی اغراض کے لیے لقمہ بنانا چاہتا ہے۔ میں آپ کو اس کے سفیر کی مکاری سے خبردار کر رہا ہوں۔ وہ کبھی بھی آپ کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی غرض کی جگہ آپ کا فائدہ نہیں سوچے گا۔ اس کی غرض آپ کے ملک کو آپ کے ہاتھ سے نکالنا (اور تاتاریوں کو بخشنا) ہے۔

میں اپنے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ چاہے میں تاتاریوں کا حامی بنوں یا مخالف، میری تقدیر میں قتل ہونا ہی لکھا ہے۔ پس میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں اپنی روح کو اللہ کی راہ میں قربان کر دوں۔

اب کس چیز کا انتظار ہے؟ تاتاری بغداد کا محاصرہ کر چکے ہیں۔ راہِ نجات یہی ہے کہ سلطانِ معظم اپنی افواج کو لے کر مسلمانوں کی مدد کے لیے کوچ کریں۔ میں آپ کے آگے آگے چلوں گا۔ اگر ہم نے بغداد کو بچا لیا تو یہی مقصود ہے۔ ایسے میں خلیفہ کے ہاں ہمارا مقام بھی بہت بلند ہو جائے گا۔ اور اگر ہم بغداد کو نہ بچا سکے تب بھی اس کا انتقام ضرور لے سکیں گے۔''

محمد الکامل کی گفتگو سے دربارِ دمشق میں سناٹا چھا گیا۔ اکثر امراء کو یہ دعوتِ جہاد اپنے دلوں کی آواز محسوس ہو رہی تھی مگر ایک غدارِ ملت زین الحافظی اس سے پہلے بعض بڑے امراء کو ہلاکو خان کے سامنے جھک جانے پر آمادہ کر چکا تھا۔ اس گروہ نے الملک الناصر کو کسی جرأت مندانہ فیصلے سے باز رکھا۔ آخر الملک الناصر نے مایوسی کے عالم میں الکامل کو کہا:

''میں تمہیں اپنے سفیر کے ساتھ ہلاکو خان کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ میرا سفیر تمہاری سفارش کر دے گا۔''

محمد الکامل یہ سن کر بھنا گیا۔ اس نے باآوازِ بلند کہا:

''سلطانِ عالی وقار! میں آپ کے پاس دین کا تقاضا لے کر آیا ہوں اور آپ مجھے اس کے بدلے دنیا سونپ رہے ہیں۔ اگر مجھے جان بچانا مقصود ہوتی تو میرا رُتبہ تاتاریوں کے ہاں آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ میں ان کے خاقان کا چہرہ دو بار دیکھ چکا ہوں۔''[1]

الناصر نے شرمندہ ہو کر کہا:

''اچھا اگر تاتاریوں نے تمہاری ریاست پر حملہ کیا تو میں تمہاری مدد کے لیے ایک فوج بھیج دوں گا۔''

''اُس وقت ایسا کرنا بے سود ہوگا۔ وہ لشکر مجھ تک پہنچ ہی نہیں سکے گا۔'' محمد الکامل نے تلخی سے کہا۔[2]

---

① تاتاریوں کے ہاں رسم تھی کہ جو شخص خاقان کا چہرہ دیکھ لیتا تھا، اسے جان کی امان مل جاتی تھی۔ (تاریخ الاسلام للذہبی: ۲۶۸/۴۸، ت تدمری)

② الاعلاق الخطیرۃ فی ذکر امراء الشام والجزیرۃ، لعزالدین ابن شداد، ص ۱۸۶ تا ۱۸۸، ط الشاملۃ

امرائے فوج کا خلیفہ سے جنگ پر اصرار:

ادھر دمشق میں یہ بحث جاری تھی اور اُدھر بغداد کا دم لبوں پر تھا۔ اہلِ بغداد کو دیر سے ہوش آیا تھا مگر وہ شہر حوالے کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ امیر سلیمان شاہ اور ملک عزّ الدین گردنے مجاہد الدین دُوَیدار سے ملاقات کی اور کہا:

''معاملہ ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ زبردست دشمن قریب آچکا ہے۔ وزیر دشمنوں سے گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ اس نے امیر المؤمنین کو ملک کے دفاع سے روک رکھا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟''

دُویدار نے کہا: ''اس بارے میں میرے لیے جو کچھ کہنا ممکن تھا، میں امیر المؤمنین کے گوش گزار کر چکا ہوں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔ باقی اگر آپ چاہیں تو آپ کے لیے امیر المؤمنین کے ساتھ خلوت میں ملاقات کی اجازت لے سکتا ہوں تاکہ آپ اپنی معروضات پیش کر سکیں۔''

دُویدار نے سلیمان شاہ اور ملک عزّ الدین کی خلیفہ سے ملاقات کروائی۔ مگر خلیفہ نے حسبِ معمول ابن علقمی سے بات کرنے کا عندیہ دیا۔ دونوں جرنیل نہایت مایوسی کی حالت میں قصرِ خلافت سے واپس لوٹے۔ [1] تاہم کچھ دیر بعد خلیفہ نے کوئی چارہ نہ پا کر مجاہد الدین دُویدار کو دشمن سے لڑنے کا حکم دے دیا۔ [2] یہ حکم ملتے ہی امراء نے بچی کھچی فوج کے ساتھ محل کے حشم وخدم اور بغداد و مضافات کے شہریوں کو ملا کر بیس ہزار کا لشکر تیار کر لیا۔ [3]

تاتاریوں سے گھمسان کی جنگ:

۹ محرم کو اطلاع ملی کہ باجی نویان کا لشکر دریائے دجلہ کی نہرِ دُجیل پار کر کے مغربی بغداد کے قریب آچکا ہے۔ [4] بغدادی فوج دریائے دجلہ کا پُل عبور کر کے شہر کے مغرب کی سمت نکلی تو تین میل دور باجی نویان کا لشکر ایک ٹڈی دَل کی طرح پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ [5] یہاں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں فریقین نے اپنی ساری طاقت جھونک دی۔ مسلمانوں میں زیادہ تر پیادہ سپاہی تھے جو سردھڑ کی بازی لگا کر پوری طرح قدم جما کر لڑے۔ [6]

آخر اللہ کی نصرت شاملِ حال ہوئی اور تاتاریوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس دوران بہت سے دشمن گرفتار اور قتل ہوئے۔ مقتولین کے سر کاٹ کر بغداد بھیج دیے گئے۔ سورج ڈھلنے تک تعاقب جاری رہا یہاں تک کہ مسلمان دریائے دجلہ کی ایک بڑی نہر کے پار نشیبی علاقے میں پہنچ گئے۔ [7] ملک عزّ الدین مزید

---

① طبقات ناصری از قاضی منہاج السراج جوزجانی: ۲/۱۹۳، ۱۹۴، ط کابل

② الحوادث الجامعة و التجارب النافعة، ص ۲۳۲؛ عقد الجمان فی تاریخ اہل الزمان للعینی: سنة ۶۵۶ھ، ط دار الکتب و الوثائق

③ طبقاتِ ناصری: ۲/۱۹۴...... بعض مؤرخین نے مسلمانوں کے لشکر کی تعداد چالیس ہزار نقل کی ہے۔ (سمط النجوم العوالی: ۳/۵۱۸، ط العلمیة) ممکن ہے اس میں بیس ہزار سپاہی اور بیس ہزار رضا کار ہوں۔ بیس ہزار تعداد بیان کرنے والے راویوں نے فقط سپاہیوں کو شمار کیا ہو۔

④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۸۵

⑤ الحوادث الجامعة و التجارب النافعة، ص ۲۳۲ ⑥ طبقاتِ ناصری: ۲/۱۹۳

⑦ الحوادث الجامعة و التجارب النافعة، ص ۲۳۱، ۲۳۲۔ نہر کا نام قاضی منہاج السراج نے ''نہر شیر'' جبکہ ابن الفوطی نے ''نہر بشیر'' نقل کیا ہے۔
نوٹ: طبقاتِ ناصری کے بعض نسخوں میں لفظ ''شہر شیر'' ہے جو سہوِ کاتب ہے۔

تعاقب پر مُصر تھا تاکہ دشمن سنبھلنے نہ پائیں مگر مجاہد الدین دُویدار نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ آخر رات اسی جگہ قیام کا فیصلہ ہوا۔ مجاہدین رات کو خیمہ گاہ میں تھکن دور کر رہے تھے جبکہ اُدھر غدارِ ملت ابن علقمی انہیں تباہ کرنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنے کچھ کارندوں کو رات کی تاریکی میں اس نہر کی طرف بھیج کر اس کا بند تڑوا دیا۔ سیلابی ریلا سیدھا نشیب میں واقع مسلمانوں کی خیمہ گاہ کی طرف آیا اور ہزاروں سپاہی اس کی نذر ہو گئے۔ سامانِ حرب ڈوب گیا۔[1]

پسپا ہونے والے تاتاریوں کو جب مسلمانوں کی اس حالت کی خبر ملی تو وہ لوٹ آئے۔ دس محرم کی صبح مسلمانوں نے تاتاریوں کو دوبارہ سامنے پایا۔ سیلاب سے تباہ حال مسلمان اب قدم جما کر نہ لڑ سکے اور شکستِ فاش سے دوچار ہوئے۔ امیر دُویدار، سلیمان شاہ اور عز الدین باقی سپاہیوں کے ساتھ بڑی خستہ حالت میں بغداد پہنچے جہاں شکست کی خبر پھیل چکی تھی اور مغربی بغداد کے لوگ افراتفری کے عالم میں دریا عبور کر کے مشرقی حصے کی فصیلوں کے پیچھے پناہ لے رہے تھے۔ اگلے دن گیارہ محرم کو ہلاکو خان شہر کی مشرقی سمت پہنچ گیا۔[2] ۱۵ محرم کو باجی نویان شہر کی مغربی سمت میں آ چکا تھا جہاں سے شہری آبادی کا انخلاء ہو گیا تھا۔ باجی نویان نے آرام سے وہاں رہائشی علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا۔[3]

اب اس کے اور قصرِ خلافت کے درمیان دریائے دجلہ اور مشرقی بغداد کی فصیل کے سوا کچھ حائل نہ تھا۔[4]

خلیفہ کے فرار کا منصوبہ جو عمل پذیر نہ ہو سکا:

مقابلہ بے سود دیکھ کر امیر مجاہد الدین دُویدار، امیر سلیمان شاہ اور ملک عز الدین خلیفہ سے آ کر ملے اور عرض کی:

"دشمن سر پر آن پہنچا ہے۔ ہمارے پاس گھڑ سوار بہت کم رہ گئے ہیں۔ دشمن کے گھڑ سوار ہزار گنا زیادہ ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ امیر المؤمنین مع اہل وعیال کشتی میں تشریف رکھیں۔ خزانوں کو بھی کشتیوں میں لادا جائے۔ ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ دریائے دجلہ کے راستے ہم بصرہ پہنچ جائیں گے۔ وہاں کے جزیروں میں محفوظ رہ کر ہم نصرتِ الٰہیہ کے نزول کا انتظار کر سکتے ہیں۔"

خلیفہ نے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ابن علقمی سے رائے لی۔ اس نے کہا: "اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں دشمن سے صلح کی راہ نکال لوں گا۔" یوں ایک مناسب مشورہ ضایع ہو گیا اور تقدیر میں لکھے سانحے کی راہ ہموار ہو گئی۔[5]

بغداد کا محاصرہ، تیر اندازی اور سنگ باری:

۱۱ محرم ۶۵۶ھ (۱۹ جنوری ۱۲۵۸ء) کو تاتاری بغداد کا دونوں سمتوں سے محاصرہ کر چکے تھے۔ خوف و دہشت اور

---

① طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۹۳، ۱۹۵ ...... اس لڑائی کی تفصیل میں مؤرخین کا کچھ اختلاف ہے۔ ابن الفوطی کے بیان کے مطابق تاتاری فریب کے طور پر ازخود پسپا ہوئے تھے اور دُویدار تعاقب پر مصر تھا۔ صبح لشکرِ تاتار نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ مسلمان پسپا ہوئے تو دیکھا نہر میں سیلاب کے باعث راہِ فرار مسدود ہو چکی ہے۔ یوں فوج تباہ ہو گئی۔ (الحوادث الجامعة، ص ۲۳۲) ایک روایت کے مطابق یہ بند تاتاریوں نے توڑا تھا۔ (حاشیہ "الحوادث الجامعة" ص ۲۳۲)

② طبقاتِ ناصری: ۲ص ۱۹۳، ۱۹۵؛ جامع التواریخ (فارسی): ۲ص ۲۸۵، ۲۸۶، ط لیدن؛ سمط النجوم العوالی: ۳/ ۵۱۸، ط العلمیة

③ طبقات الشافعیة الکبریٰ: ۸/ ۲۷۰؛ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۹۳، ۱۹۵

④ ذیل مرآة الزمان: ۱/ ۸۸، ط دار الکتاب الاسلامی قاہرہ

⑤ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۹۵

محاصرے کی شدت سے اہل شہر کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ تاتاریوں نے منجنیقوں کے ذریعے شہر پر سنگ باری شروع کردی۔ ساتھ ہی ہلاکو خان کے حکم پر تیروں کے ساتھ پرچے باندھ کر شہر میں پھینکے جانے لگے جن میں تحریر تھا کہ شہر کے ہر اس شخص کو امان ہے جو جنگ نہ کرے۔ اس تیراندازی اور سنگ باری سے شہر کا کوئی گوشہ محفوظ نہ تھا۔ [1]

اللہ عقلیں چھین لیتا ہے:

خلیفہ اس دوران اپنے کمرے میں بیٹھا قرآن مجید پڑھ رہا تھا اور اس کی ایک بیٹی اس کے پاس تھی کہ اچانک ایک تیر ایوانِ شاہی کے دریچے سے سنسناتا ہوا آیا اور بیٹی کے جسم میں پیوست ہوگیا۔ اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ جسم سے بہنے والے خون نے زمین پر ایک تحریر لکھ دی۔ خلیفہ نے اسے پڑھنے کی کوشش کی تو لکھا تھا:

إِذا أَرَادَ اللّٰهُ أَمْرًا سَلَبَ عَنْ ذَوِي الْعُقُولِ عُقُولَهُمْ.

''جب اللہ کسی امر کا فیصلہ کرلیتا ہے تو عقل مندوں کی عقلیں سلب کرلیتا ہے۔''

خلیفہ یہ الفاظ پڑھ کر زار و قطار رونے لگا۔ [2]

محاصرانہ جنگ اور شکست:

۲۲ محرم کو تاتاریوں کے ٹڈی دل نے بغداد کی فلک بوس فصیلوں پر باقاعدہ حملہ شروع کردیا۔ پہلے ہی دن وہ شہر کی مغربی سمت میں واقع برجِ عجمی میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہوگئے۔ ۲۵ محرم بروزِ جمعہ کو وہ اس برج کو گرا چکے تھے۔ پیر ۲۸ محرم کو تاتاری مغربی فصیل پر چڑھ کر اس پر قابض ہوگئے۔ اسی شام تاتاریوں نے مشرقی فصیل بھی سر کرلی۔

بغداد میں دریائے دجلہ آمد و رفت کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ بہت سے لوگ موت کو سر پر دیکھ کر دریا کے ذریعے فرار ہو رہے تھے۔ ہلاکو نے ان کی ناکہ بندی کرنے کے لیے بغداد کے شمال اور جنوب میں دریا کے کناروں پر پہرے لگا دیے۔ چنانچہ کشتیوں کے ذریعے نکلنے کی کوشش کرنے والے بہت سے لوگوں کو تاتاریوں نے سنگ باری کرکے دریا میں غرق کردیا۔ کوئی راہِ فرار نہ دیکھ کر خلیفہ بالکل مایوس ہوگیا۔ اس نے کہا: ''اب مجھے سرنگوں ہونا ہی پڑے گا۔'' [3]

مذاکرات اور ابن علقمی کی انتہائی نمک حرامی:

خلیفہ نے ایک بار پھر ابن علقمی سے مشورہ طلب کیا۔ اس نے کہا:

''تاتاریوں کے قیامت خیز لشکر کو پسپا کرنا ممکن نہیں۔ شہر میں اتنی فوج نہیں کہ دفاع کے لیے کافی ہو۔ عوام میں بھی

---

① جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۸۷، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

② طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/۲۷۲، ط ھجر، علامہ سبکی یہ واقعہ نقل کرکے لکھتے ہیں: اسی بنا پر خلیفہ وزیر کی بات مان کر تاتاریوں کے پاس جانے پر تیار ہوگیا۔ یعنی اب تو جو ہونا ہے، وہ ہوکر رہے گا۔ راقم عرض کرتا ہے کہ خلیفہ اس وقت بھی صحیح فیصلہ کرنے پر قادر تھا مگر اس نے خود کو اس خونی تحریر کا مصداق بنا کر چھوڑا۔
نوٹ: ایک دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح منقول ہے کہ خلیفہ اس وقت اپنی پسندیدہ باندی عرفہ سے نغمہ سن رہا تھا، وہی تیر کا شکار ہوئی اور تیر پر یہ رقعہ لپٹا ہوا تھا: "إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ إِنْفَاذَ قَضَائِهِ وَقَدَرِهِ أَذْهَبَ مِنْ ذَوِي الْعُقُولِ عُقُولَهُمْ." (البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۶ھ)

③ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۸۹، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

ایسی شجاعت نہیں کہ ان سے میدانِ جنگ میں کام لیا جا سکے۔ مصلحت اسی میں ہے کہ آپ جنگ بند کر دیں اور شہر کے دروازے تاتاریوں کے لیے کھول دیں۔'' [1]

خلیفہ کو جنگ بندی پر آمادہ کرنے کے بعد ابن علقمی نے صلح کی بات چیت کے لیے ہلاکو خان کے پاس جانے کی اجازت طلب کی۔ مستعصم نے اجازت دے دی۔ ابن علقمی مذاکرات کے بہانے ہلاکو خان کے پاس گیا اور اسے سمجھایا کہ شہر سرنگوں ہونے کے لیے تیار ہے۔ ہلاکو خان اب بھی اس پر آمادہ تھا کہ خلیفہ کو تابع بنا کر بغداد کی نصف پیداوار پر صلح کر کے لوٹ جائے، مگر ابن علقمی نے صلح کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا اور کہا:

''اگر صلح ہوئی تو زیادہ سے زیادہ بغداد سال دو سال آپ کے تابع رہے گا۔ پھر معاملہ پہلے کی طرح ہو جائے گا۔'' [2]

ابن علقمی نے اس بات پر زور دیا کہ خلافتِ عباسیہ کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔ اس کے بعد اس نے ہلاکو سے اپنے گھرانے اور شہر کے اہلِ تشیع کے لیے جان کی امان کا وعدہ لیا اور واپس آگیا۔ [3] اس میں ذرا بھی انسانیت ہوتی تو انسانیت کے ناطے ان لاکھوں شہریوں کی جاں بخشی کی ضمانت لے لیتا جن کا اس سیاسی کش مکش سے کچھ واسطہ نہ تھا مگر وہ تو خود اس پر تُلا بیٹھا تھا کہ اس کے فرقے کے سوا جتنے بھی انسان مارے جائیں کم ہیں۔

ابن علقمی نے واپس آکر خلیفہ کو اطمینان دلایا کہ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ جنگ بند کر دی گئی۔ شہر کے دروازے کھول دیے گئے اور فصیلوں کو تاتاری سپاہیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ [4]

بے سود سفارتی وفد:

خلیفہ کی جانب سے فخر الدین دامغانی اور ابن درنوش کچھ تحائف لے کر ہلاکو خان کے پاس گئے۔ تحائف کے انتخاب میں کنجوسی سے کام لیا گیا کیوں کہ خلیفہ کو نالائق مشیروں نے یہ سمجھایا تھا کہ اگر آپ بیش بہا تحائف بھیجیں گے تو یہ ہلاکو خان سے ڈرنے کی علامت ہوگی، اس طرح وہ اور جری ہو جائے گا۔ حالانکہ زمینی حالات اس منطق کا بالکل ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ چنانچہ ایسے گھٹیا تحائف دیکھ کر ہلاکو خان نرم پڑنے کی بجائے الٹا اور گرم ہو گیا۔ یہ ماجرا سن کر اگلے دن ۲۹ محرم کو خلیفہ نے قیمتی تحائف کے ساتھ دوسری سفارت بھیجی مگر ہلاکو خان اس قدر بگڑ چکا تھا کہ اس نے تحائف کی طرف دیکھا تک نہیں۔ [5]

شہزادہ ابوبکر کی آؤ بھگت۔ مسلم افسران وسپاہ کا قتل:

ابن علقمی نے اس صورتحال میں خلیفہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے ابوبکر کو ہلاکو خان کے پاس بھیجے تاکہ ہلاکو خان کا عندیہ صحیح طور پر معلوم ہو سکے۔ ساتھ ہی ابن علقمی نے ہلاکو خان کو خفیہ طور پر پیغام بھیجا:

---

① تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۳۳۰/۲

② نزھۃ الانام فی تاریخ الاسلام لابن دقماق صلاح الدین، ص ۲۳۰؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۶ھ

③ العبر فی خبر من غبر: ۲۷۸/۳، ط العلمیۃ؛ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۲۷۱/۸

④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۲۸۹ ...... واقعات کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۲۸ محرم کا قصہ ہے۔

⑤ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۲۸۹، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

''شہزادہ ابوبکر کا خوب اعزاز واکرام کیا جائے تاکہ خلیفہ آپ پر اعتماد کرلے اور ہمارا مقصد پورا ہوسکے۔''①

تیس محرم کو خلیفہ نے اپنے بڑے بیٹے کو ابن علقمی کے ساتھ ہلاکو کی خدمت میں بھیجا۔②

ہلاکو خان نے ابنِ علقمی کے منصوبے کے مطابق اس کی غیر معمولی خاطر مدارات کی۔ پورا لشکر خیر مقدم کے لیے نکلا۔ ہلاکو خود استقبال کے لیے چالیس قدم چل کر باہر آیا اور اپنے ساتھ لے جاکر نشست پر بٹھایا۔ اس نے شہزادے سے بڑی ملاطفت آمیز باتیں کیں اور مکروفریب سے کام لیتے ہوئے کہا:

''میں تو خلیفہ کی خدمت بجالانے حاضر ہوا ہوں۔ میں نے معلوم کیا کہ بزرگ ترین مسلمان رہنما کون ہے تو مجھے بتایا گیا کہ وہ خلیفۃ المسلمین ہیں۔ میں یہاں اس لیے آیا ہوں تاکہ خلیفہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کروں۔''

شہزادہ ابوبکر بڑا متاثر ہوا۔ اس نے واپس جاکر خلیفہ کو سارا ماجرا بتایا۔ لشکرِ تاتار جس طرح قتل وغارت کرتا ہوا آیا تھا اور جس بے دردی سے اس نے شہر کا محاصرہ کررکھا تھا، اسے دیکھتے ہوئے ہلاکو کی باتوں پر یقین کرنا حماقت تھا مگر شہزادے کی آؤ بھگت نے مایوسی میں ڈوبے خلیفہ کو بھی خوش فہمی میں مبتلا کردیا۔ افسرانِ فوج نے خلیفہ کو لاکھ سمجھایا کہ دشمن پر اعتبار نہ کیا جائے مگر ان کی پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔③

جمعرات یکم صفر کو بغداد کی فوج کو حکم دیا گیا کہ وہ امراء کے ساتھ ہلاکو خان کے ہاں حاضری دے۔ امیر مجاہد الدین دُوَیدار اور سلیمان شاہ سمیت تمام امراء، افسران اور سپاہی وہاں پہنچے اور سب کو قتل کردیا گیا۔④

خلیفہ ہلاکو خان کے دربار میں:

مستعصم دیکھ چکا تھا کہ اب اس کے پلے کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ابن علقمی سے صلاح مانگی۔ اس نے مکاری اور نمک حرامی کی انتہاء کرتے ہوئے کہا:

''ہلاکو خان آپ سے حسنِ سلوک پر آمادہ ہے کہ اپنی بیٹی کا نکاح آپ کے صاحبزادے ابوبکر سے کرنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو بغداد کا خلیفہ برقرار رکھے گا۔ بغداد کے لیے اس کی سرپرستی ایسے ہی ہوگی جیسے سلجوقی سلاطین کی ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا آپ کو مع اہل وعیال اس کے پاس جانا چاہیے۔''

مستعصم باللہ نے حد سے زیادہ کم عقلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بدبخت کی یہ بات بھی مان لی۔⑤

چار صفر کو مستعصم اپنے اہل وعیال اور امرائے سلطنت کے جلو میں شہر سے نکل کر ہلاکو خان کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہوگیا۔⑥ ابن علقمی نے شہر کے سات سو جلیل القدر سنی علماء، فقہاء اور صوفیاء کو بھی یہ کہہ کر ساتھ بھیج دیا کہ شہزادے کے

---

① طبقاتِ ناصری از قاضی منہاج السراج جوزجانی: ۲/ ۱۹۵، ط کابل

② جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۸۹، ط داراحیاء الکتب العربیۃ مصر

③ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۹۵، ۱۹۶ ④ جامع التواریخ (عربی)، ج ۲، حصہ اول: ص ۲۸۹

⑤ ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: ۱/ ۸۸؛ العبر فی خبر من غبر: ۳/ ۲۷۸؛ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/ ۲۷۱

⑥ تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۲/ ۳۴۰

نکاح میں آپ سب کی شرکت ضروری ہے۔ [1]

یہ لوگ ہلاکو خان کے ہیبت ناک پڑاؤ میں پہنچے جہاں سپاہیوں کی خوں خوار نگاہیں دیکھ کر ہی انسان بدحواس ہو جاتا تھا۔ تاحدِ نگاہ خیمے ہی خیمے تھے۔ درمیان میں ہلاکو کا سرخ ریشمی بلند وبالا خیمہ دور سے دکھائی دیتا تھا جس کے گرد قندیلیں اور قمقمے رات میں دن کا سماں پیدا کر دیتے تھے۔ [2] خلیفہ ہلاکو کے دربار میں پہنچا تو اس کے تیور کچھ اور ہی تھے۔ اس نے خلیفہ، اس کے دو بیٹوں: ابوبکر اور عبدالرحمٰن اور تین خدام کو مستثنیٰ کر کے باقی سب کی گردنیں اُڑا دیں۔ [3]

شیخ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''امیر المؤمنین خود عمائد کے ایک وفد کے ساتھ ہلاکو کے دروازے پر آئے۔ ہلاکو خان نے خلیفہ کو ایک خیمے میں ٹھہرایا اور وزیر ابن علقمی نے علماء و اعیانِ شہر کو دعوت دی کہ خلیفہ اور ہلاکو کے صلح نامے پر گواہ بننے کے لیے وہ بھی آئیں۔ وہ آئے تو ان کی گردنیں اڑا دی گئیں۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک جماعت کو بلایا جاتا اور سر قلم کر دیے جاتے۔ پھر خلیفہ کے معتمد امراء اور مقربین کو بلایا گیا۔ انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔'' [4]

شہزادہ ابوبکر نے یہ حالت دیکھ کر ہلاکو خان کو کہا:

''ہم یہ گمان کر بیٹھے تھے کہ تم اعلیٰ ذات کے ہو، اصیل مرد ہو، بڑے بادشاہ ہو۔ ہم نے اس لیے تمہارے قول پر اعتماد کیا۔ اب معلوم ہوا کہ تم بادشاہ ہو نہ مرد۔ تم نے دھوکہ بازی کی ہے جو مردوں کا شیوہ ہے نہ بادشاہوں کا۔'' [5]

ہلاکو خان کے سامنے یہ سب کہنا بڑی ہمت کی بات تھی مگر اب کچھ کہنا سننا بے فائدہ تھا۔

اہلِ شہر کو نہتا کر دیا گیا:

ہلاکو خان کو خدشہ تھا کہ شہر کی آبادی بہت زیادہ ہے، اس پر قبضہ کرتے وقت شہر میں چھپے ہوئے سپاہیوں اور عام لوگوں سے جھڑپیں ضرور ہوں گی اور اس کش مکش میں ہزاروں تاتاری مر سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے خلیفہ کو کہا:

''تم اہلِ بغداد کو حکم دو کہ وہ اسلحہ رکھ دیں اور گروہ در گروہ باہر آتے جائیں۔''

خلیفہ نے ایک شخص کو بھیج کر شہر بھر میں یہ منادی کرا دی۔ وہ لوگ جو لڑائی کے قابل تھے، اپنا اسلحہ پھینک کر نہتے باہر آنے لگے۔ تاتاری ان سب کو گھیر گھار کر قتل کرتے گئے۔ یوں شہر میں مزاحمت کا آخری امکان بھی ختم ہو گیا۔ [6]

جامع مسجد کا آخری خطبہ:

بغداد اب بالکل بے دست و پا تھا۔ ۲ صفر کو خلافتِ عباسیہ بغداد کا آخری جمعہ تھا۔ اس دن جامع مسجد میں خطیب

---

① العبر فی خبر من غبر: ۳/ ۲۷۸، ط العلمیة ؛ طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۸/ ۲۷۱

② طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۸/ ۲۶۸

③ تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۲/ ۳۴۰

④ طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۸ ص ۲۷۱

⑤ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۹۶، ۱۹۷

⑥ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۱

نے خطبے کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَمَ بِالْمَوْتِ مُشَيَّدَ الْاَعْمَارِ ، وَحَكَمَ بِفَنَاءِ اَهْلِ هٰذِهِ الدَّارِ

(سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے موت کے ذریعے پختہ عمارتیں بنانے والوں کو منہدم کر دیا اور جو اس شہر کے لوگوں کے فنا ہو جانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔)[1]

بغداد میں قیامتِ صغریٰ

۵ صفر کو تاتاریوں نے شہر پر دھاوا بول دیا اور ہر طرف تباہی مچادی۔[2] بہت سی عورتیں اور بچے قرآن مجید سروں پر رکھ کر باہر نکلے کہ شاید انہیں امان مل جائے مگر تاتاری گھڑسواروں نے انہیں کچل کر رکھ دیا۔[3]

شہر کے چھوٹے بڑے، عوام و خواص، امیر و غریب سب قتل کر دیے گئے۔ علماء، خطباء، قراء، امام اور مؤذن ڈھونڈ ڈھونڈ کر ذبح کیے گئے۔ مستعصم باللہ کے استاد شیخ القراء حضرت ابوالحسن بن نیار رحمہ اللہ کو قصرِ خلافت میں سب کے سامنے پکڑ کر ان کے حلق پر خنجر چلایا گیا۔[4] صوفی بزرگ شیخ علی خباز رحمہ اللہ کو قتل کر کے لاش کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دی گئی جہاں کتے ان کا گوشت نوچتے رہے۔[5]

نابینا حنبلی فقیہ شیخ یحییٰ بن یوسف صرصری رحمہ اللہ جنہیں حضور ﷺ نے خواب میں شہادت کی بشارت دی تھی، تاتاریوں کی بے رحم شمشیر سے قتل ہوئے۔ ان کی عمر ۶۸ سال تھی۔ ہلاکو خان نے انہیں پاس بلوایا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ تاتاری انہیں گرفتار کرنے آئے تو یہ پتھروں کا ڈھیر جمع کیے ہوئے تھے، ان پر سنگ باری شروع کی جس سے کئی تاتاری زخمی ہوئے۔ جب دشمن قریب پہنچے تو انہوں نے اپنی نوک دار لاٹھی سے حملہ کر کے ایک کو قتل کر دیا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔[6] سادات کے گھرانے بھی اس تباہی کی زد میں آئے۔ ان میں سے بے شمار افراد شہید ہوئے اور ان کی مستورات کی عصمت دری کی گئی۔[7]

ہلاکو اور خلیفہ، قصرِ خلافت میں:

قتل و غارت گری کے چار دن گزرنے کے بعد جمعہ ۹ صفر کو ہلاکو خان بغداد میں داخل ہوا۔ اس نے قصرِ خلافت کا رُخ کیا جسے اب تک قتلِ عام اور لوٹ مار سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔[8] وہ گھوڑے پر سوار سیدھا خلیفہ کے دربارِ خاص میں

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۸/ ۳۷، ت تدمری؛ تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۳۳، ط نزار

② الحوادث الجامعة، ص ۲۳۱، جامع التواریخ میں یہ تاریخ بدھ سات صفر بتائی گئی ہے۔(عربی نسخہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۱)

③ تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۶۶۳، ط دارالفکر ④ تاریخ الاسلام للذھبی: ۶۵۶ھ

⑤ البدایة والنهایة: ۱۷/ ۳۸۲، سنة ۶۵۶ھ، ط دارھجر. ایک روایت کے مطابق وہ خود اس انجام کی پیش گوئی کر چکے تھے۔(ایضاً)

⑥ البدایة والنهایة: سنة ۶۵۶ھ؛ المنهل الصافی و المستوفی بعد الوافی لابن تغری بردی: ۲/ ۸۶، ۸۷، ط الهیئة المصریة؛ البدایة والنهایة: سنة ۶۵۶ھ؛ المقصد الارشد فی ذکر اصحاب الامام احمد لبرهان الدین ابن مفلح (م ۸۸۴ھ): ۳/ ۱۴۴، ط مکتبة الرشد ریاض؛ طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۸/ ۲۷۱، ط ھجر

⑦ فوات الوفیات، لابن شاکر صلاح الدین (م ۷۶۴ھ) ۳ ص ۲۵۳: ط دارصادر ⑧ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۱

میں جا کر گویا مسند خلافت کا مذاق اڑا رہا ہو۔ [1] اس نے وہیں امرائے سلطنت تاتار کو جمع کر کے دربار آراستہ کیا۔ پھر اس نے خلیفہ کو بھی وہیں بلوالیا جو شہر کے باہر مغل خیمہ گاہ میں قید تھا۔ مستعصم ہلاکو خان کے پاس پہنچا تو اس کی حالت غیر تھی، وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ جن راستوں سے گزر کر وہ قصر خلافت تک آیا تھا، وہاں ہر طرف لاشوں کے ڈھیر اور خون کے چشمے دیکھنے کے بعد اس کی یہی حالت ہوسکتی تھی۔

ہلاکو خان نے طنزیہ لہجے میں مستعصم کو کہا:

''ہم یہاں تمہارے مہمان ہیں اور تم میزبان۔ ہمارے لائق جو کچھ ہو، پیش کر دو۔''

مستعصم دہشت کے باعث شناخت نہ کر سکا کہ کونسی چابی کس تالے کو لگتی ہے۔ آخر تاتاری خود کچھ الماریوں کے تالوں کو توڑ کر دو ہزار نفیس جوڑے، دس ہزار اشرفیاں، موتیوں سے جڑے زیور اور جواہرات نکال لائے۔ ہلاکو نے نہایت بے التفاتی کے ساتھ یہ سب کچھ اپنے امراء اور وہاں موجود سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر اس نے مستعصم کو کہا:

''جو مال و دولت زمین پر ہے، وہ سب ہمارے خدام کا ہے۔ ہمیں تم اس مال و دولت کا بتاؤ جو زمین میں گڑا ہے۔''

خلیفہ نے بتایا کہ قصر خلافت کے میدان میں ایک زمین دوز حوض ہے جو سونے سے بھرا ہوا ہے۔

تاتاری وہاں گئے اور زمین کھود کر حوض تک پہنچ گئے۔ یہ خالص سرخ سونے کے ٹکڑوں سے پُر تھا۔ ہر ٹکڑا سو مثقال (تقریباً ۴۸۶ گرام) کا تھا۔ [2]

قصر خلافت کی مستورات اور خزانے:

اس کے بعد ہلاکو خان نے قصر خلافت کی خواتین کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ یہ سات سو خواتین اور ایک ہزار کے قریب باندیاں تھیں۔ مستعصم نے اس موقع پر گڑگڑا کر ہلاکو خان سے کہا:

''مجھ پر اتنا احسان کر دو کہ ان پردہ دار عورتوں کی جاں بخشی کر دو جنہیں چاند اور سورج نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔''

ہلاکو نے کہا: ''ان میں سے ایک سو کو چن لو۔'' مستعصم نے ان میں سے قریبی رشتہ دار خواتین کو الگ کر دیا۔

ہلاکو خان رات کو واپس شہر کے باہر اپنے معسکر میں چلا گیا۔ اگلی صبح دس صفر کو اس نے مال برداری کا عملہ شہر بھیج دیا جس نے قصر خلافت کو مکمل طور پر خالی کر کے سب کچھ ہلاکو خان کی خیمہ گاہ میں پہنچانے کا کام شروع کر دیا۔ مغلوں کے درباری مؤرخ رشید الدین فضل اللہ نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

''جو کچھ خلفاء نے پانچ صدیوں میں جمع کیا تھا، اسے تاتاریوں نے اوپر نیچے رکھ دیا۔ گویا یہ پہاڑوں کے اوپر پہاڑ تھے۔'' [3]

---

① طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی: ۲۷۱/۸، ط ہجر

② جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۲،۲۹۱؛ تاریخ حبیب السیر: ۹۵/۳؛ روضۃ الصفا: ۸۲/۵، ط نولکشور

③ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۲،۲۹۱

قصرِ خلافت میں قتلِ عام:

قصرِ خلافت میں مقیم بنوعباس کا قتلِ عام کیا گیا۔ ایک ایک شخص کو نام بنام بلایا جاتا کہ کنبے سمیت حاضر ہو۔ وہ اپنے بال بچوں اور گھر کی عورتوں کے ساتھ نکلتا۔ اسے قصرِ خلافت کے چبوترے پر بکری کی طرح ذبح کیا جاتا اور خواتین کو قید کرلیا جاتا۔ قصرِ خلافت کے حرم سے جہاں پرندہ بھی بلا اجازت پر نہیں مار سکتا تھا، لگ بھگ ایک ہزار پردہ دار عورتیں باندیاں بنائی گئیں اور ان کی عزتیں لوٹی گئیں۔ ①

عزت وذلت مالک الملک کے ہاتھ میں:

مستعصم اس دوران ہلاکو خان کی خیمہ گاہ میں نظر بند رہا۔ ② اس حال میں بھی وہ تمام نمازیں اپنے وقت پر پابندی سے ادا کیا کرتا تھا۔ ایک دن صبح کی نماز کی نیت باندھی اور قرأت شروع کی تو زبان پر یہ آیت آگئی:

قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ○

”آپ یوں کہیے، اے اللہ! مالک تمام ملک کے، آپ ملک جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں، اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں۔ اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں۔ آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی۔ بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔“ ③

مستعصم پر شدید گریہ طاری ہوگیا۔ نماز ختم کر کے وہ دست بدعا ہو کر دیر تک بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑاتا رہا۔ اس واقعے کے عینی شاہد کا کہنا ہے کہ اس آیت مبارکہ کا ایسا حقیقی اور واقعی مصداق شاید ہی کوئی ہوگا۔ ④

مستعصم کے لیے غذا کے طور پر ہیرے جواہرات:

ایک دن ہلاکو خان نے حکم جاری کیا کہ اب خلیفہ کو کھانے کے لیے کچھ نہ دیا جائے۔ جب کئی پہر گزر گئے اور بھوک سے مستعصم کی حالت غیر ہوگئی تو اس نے پہرے داروں سے کھانا مانگا۔ انہوں نے ہلاکو خان تک یہ درخواست پہنچا دی۔ ہلاکو خان نے ایک طباق میں سونے کے کچھ ٹکڑے اور کچھ ہیرے جواہرات رکھوا کر مستعصم کو بھیج دیے۔

مستعصم کہنے لگا: ”یہ زر وجواہر بھلا کوئی کہاں کھا سکتا ہے؟“

اس پر ہلاکو خان نے کہلوایا: ”جس چیز کو تم کھا نہیں سکتے، اسے اپنی جان اور ہزاروں مسلمانوں پر خرچ کیوں نہ کیا۔ اس سونے چاندی سے تم نے لشکر کیوں نہ تیار کر لیے تاکہ تمہاری آبائی سلطنت دشمنوں سے محفوظ رہ سکتی۔“

مستعصم سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس نے سرد آہ بھری اور زار وقطار رونے لگا۔ ⑤

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۶۵۶ھ
② سیر اعلام النبلاء: ۱۸۲/۲۳، ط الرسالۃ
③ سورۃ آل عمران، آیت نمبر: ۲۶
④ تاریخ وصاف از عبداللہ بن فضل اللہ وصاف (م ۷۳۰ھ)، ص ۳۹، ط بمبئی
⑤ تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۹۶/۳؛ تاریخ وصاف، ص ۴۰، ۴۱، ط بمبئی

مستعصم باللہ کے آخری لمحات:

اب لاشوں کے تعفن کے باعث بغداد کے اندر یا باہر ٹھہرنا مشکل ہو چکا تھا۔۱۴ صفر ۶۵۶ھ کو ہلاکو خان نے لشکر کے بڑے حصے کے ساتھ بغداد سے کوچ کر دیا اور ایک منزل دور "جلابیہ" کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ ①

اسی شام ہلاکو نے مستعصم کو طلب کر لیا۔ مستعصم سمجھ گیا کہ اب آخری وقت ہے۔ اس نے غسل کرنے کی اجازت مانگی۔ ہلاکو خان نے شرط لگائی کہ غسل کرتے وقت پانچ تاتاری سپاہی سر پر مسلط رہیں گے۔ مستعصم نے کہا:

"میں پانچ جلادوں کی موجودگی میں غسل کرنے نہیں جا سکتا۔"

پھر اس نے نہایت حسرت کے ساتھ یہ شعر پڑھا:

وَاَصْبَحْنَا لَنَا دَارٌ كَجَنَّاتِ وَفِرْدَوْسٍ .... وَاَمْسَيْنَا بِلَا دَارٍ كَاَنْ لَمْ نَغْنَ بِالْاَمْسِ

"ہم نے صبح اس حالت میں کی تھی کہ ہم ایسے وطن میں تھے جو جنت الفردوس جیسا تھا۔ مگر شام ہوئی تو ہم ایسے بے وطن ہو گئے کہ گویا ہمارا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔" ②

ہلاکو کی خلیفہ سے ایک پرندے کے بارے میں پوچھ گچھ:

ہلاکو خان کے پاس حاضری سے دو تین گھنٹے پہلے خلیفہ مستعصم ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا کہ ایک سفید پرندہ آ کر اس کے خیمے پر آ کر کچھ دیر بیٹھا اور پھر خیمے کا چکر لگاتے ہوئے اُڑ گیا۔ ہلاکو خان کو خلیفہ کے بارے میں ہر حرکت کی اطلاع دی جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے خلیفہ سے اس بارے میں بھی پوچھ گچھ شروع کر دی اور کہا:

"یہ پرندہ کیسا تھا جو تمہارے پاس آیا تھا؟"

مستعصم باللہ نے کہا: "ایک پرندہ تھا جو خیمے پر آ کر بیٹھا اور اُڑ گیا۔"

ہلاکو نے بگڑ کر کہا: "تمہیں سوال کا صحیح صحیح جواب دینا ہوگا۔ بتاؤ یہ کہاں سے تمہارے پاس آیا تھا؟ اس نے تمہیں کیا کہا تھا؟ اور تم نے اسے کیا کہا تھا؟"

خلیفہ بے چارہ اس غیر معقول باز پرس کا کیا جواب دیتا۔ آخر ہلاکو خان نے کہا:

"تم لوگ جادوگر ہو۔ یہ پرندہ تمہارے پاس تمہارے کسی مددگار نے بھیجا تھا۔" ③

خلیفہ کو بچانے کی آخری کوشش جسے منافق وزیر اور طوسی نے ناکام بنا دیا:

ہلاکو خان اب تک متذبذب تھا کہ مستعصم کو قتل کیا جائے یا نہیں۔ مگر ابن علقمی نے کہا:

"جب تک آپ خلیفہ کو قتل نہیں کریں گے، عراق پر آپ کی گرفت مضبوط نہیں ہو سکے گی۔" ④

---

① جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۳، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر
② جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۳، ۲۹۳
③ نزھۃ الانام فی تاریخ الاسلام، لابن دُقماق صارم الدین (م ۸۰۹ھ)، ص ۲۳۸، ۲۳۹، المکتبۃ العصریۃ بیروت، ط ۱۹۹۹ء
④ سیر اعلام النبلاء: ۲۳ / ۱۸۳ ترجمۃ مستعصم باللہ، ط الرسالۃ

ہلاکو خان کے دربار سے وابستہ بعض مسلمان خلیفہ کے ہمدرد تھے۔ ان میں ایک نجومی حسام الدین بھی تھا جو خلیفہ کو عبرت ناک انجام سے بچانا چاہتا تھا۔ اس نے ہلاکو خان سے مؤدبانہ عرض کیا:

''جب بھی کسی نے خلیفہ پر دست درازی کی ہے، وہ تباہ ہوا ہے۔ اگر آپ نے حملہ کیا تو سورج چھپ جائے گا، بارشیں بند ہو جائیں گی، طوفان اور زلزلے آئیں گے، گھوڑے مر جائیں گے، سپاہی بیمار ہو جائیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی سال خاقان مر جائے گا۔''

ستاروں کے اثرات پر ایمان رکھنے والا ہلاکو خان شش وپنج میں پڑ گیا۔ ممکن تھا کہ وہ خلیفہ کو چھوڑ دیتا مگر غدارِ ملت نصیر الدین طوسی آڑے آ گیا۔ اس نے اطمینان دلایا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

ہلاکو نے پوچھا: ''پھر آخر کیا ہوگا؟'' طوسی نے کہا: ''خلیفہ کی جگہ آپ کی حکومت ہوگی۔''

ہلاکو نے حسام الدین کو طلب کر کے اس کا طوسی سے مباحثہ کرایا۔ طوسی نے ایک نہایت فصیح وبلیغ اور لچھے دار تقریر کی جو ہلاکو خان کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی۔ طوسی نے اپنی تقریر میں کہا:

''جنابِ عالی! حضرت زکریا اور یحییٰ جیسے پیغمبروں کے قتل پر کچھ نہیں ہوا۔ اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ کتنے ہی صحابہ شہید ہوئے مگر کوئی حادثہ درپیش نہیں ہوا۔ اگر حسام الدین کہتا ہے کہ یہ عباسیوں کی خصوصیت ہے تو دیکھو بنو عباس کے گزشتہ کتنے خلفاء قتل ہوئے مگر سورج کو گرہن لگا نہ چاند کو۔ طاہر بن حسین نے مامون کے حکم سے عباسی خلیفہ امین کو قتل کیا تھا۔ خلیفہ متوکل عباسی کو اس کے بیٹے اور امراء نے قتل کیا، مُنتصِر اور مُعتضِد کو ان کے افسران اور غلاموں نے مار ڈالا مگر کوئی زلزلہ اور طوفان نہیں آیا۔''[1]

مستعصم کا قتل:

ہلاکو خان کا خوف ختم ہو گیا مگر مغلوں کے ہاں مشہور تھا کہ بادشاہوں کا خون زمین پر گرنے سے آفاتِ آسمانی نازل ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اپنے رواج کے مطابق خلیفہ کو اس طرح قتل کرنے کا حکم دیا گیا کہ خون زمین پر نہ گرنے پائے۔[2]

جب تاتاری سپاہی مستعصم کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھے تو بنو عباس کے اس آخری بدقسمت خلیفہ نے ایسی دردناک چیخ ماری کہ دھرتی کا دل ہوتا تو پھٹ جاتا۔[3] ۴۶ سالہ مستعصم کو دری میں لپیٹ کر بوری میں بند کر کے اس وقت تک لاٹھیوں اور لاتوں سے پیٹا گیا جب تک اس کا دم نہ نکل گیا۔[4] اس کی قبر کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔ اس کے بیٹے ابوبکر کو بھی قتل کر دیا گیا۔ بڑے بیٹے ۲۵ سالہ ابو العباس احمد، منجھلے بیٹے ۲۳ سالہ عبدالرحمٰن کو بھی موت کا جام پلا دیا گیا۔

---

① جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۷۹، ۲۸۰؛ تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۱۰۷/۳
میر خواند شیرازی یہ واقعہ نقل کر کے لکھتا ہے کہ ہلاکو خان نے حسام الدین کو چند سال حراست میں رکھا تا کہ دیکھے کہ اس کی پیش گوئی درست نکلتی ہے یا نہیں۔ جب کچھ بھی وقوع پذیر نہ ہوا تو محرم ۶۶۱ ہجری میں اسے قتل کر دیا گیا۔ (تاریخ حبیب السیر: ۱۰۷/۳)

② نہایۃ الارب للنویری: ۳۲۲/۲۳، ط دار الکتب قاھرہ ③ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۲۷۱/۸، ط ھجر

④ نزھۃ الانام فی تاریخ الاسلام لابن دقماق، ص ۲۳۰؛ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۲۷۱/۸

چھوٹے بیٹے مبارک کو قید کرلیا گیا۔ تین بیٹیاں: خدیجہ، مریم اور فاطمہ قیدی بنالی گئیں۔ [1] یہ دل فگار واقعہ ۱۴ صفر ۶۵۶ھ کی شام کو پیش آیا۔ [2] انا للہ وانا الیہ راجعون

خلیفہ کے ساتھ قتل کیے جانے والے مشاہیر میں نامور فقیہ اور واعظ، جامعہ مستنصریہ کے استاذ، مدرسہ الجوزیہ کے مؤسس ۷۶ سالہ شیخ محی الدین یوسف بن عبدالرحمٰن ابن الجوزی رحمہ اللہ بھی تھے۔ [3] اس کے بعد ان کے تین عالم فاضل بیٹوں: جمال الدین، تاج الدین اور شرف الدین رحمہم اللہ کو بھی یکے بعد دیگرے شہید کردیا گیا۔ [4]

بغداد میں تباہی در تباہی:

ہلاکو کے جانے کے بعد بھی بغداد میں لوگوں کا قتلِ عام جاری رہا۔ بہت سے لوگوں نے مساجد، خانقاہوں اور مسافر خانوں میں گھس کر دروازے بند کرلیے مگر تاتاری دروازوں کو توڑ کر یا انہیں نذرِ آتش کر کے اندر گھس گئے۔ لوگوں نے بھاگ کر چھتوں پر پناہ لینے کی کوشش کی مگر تاتاریوں نے اوپر چڑھ کر انہیں تہہ تیغ کر ڈالا جس کے باعث پرنالوں سے خون بہہ کر نالیوں میں بہنے لگا۔ بہت سے لوگوں نے جان بچانے کے لیے کنوؤں، نالوں، کچرے کے ڈھیروں، بند کمروں اور چھتوں پر پناہ لینے کی کوشش کی مگر تاتاری شکاری کتوں کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر انہیں فنا کرتے گئے۔ بند کمروں اور مکانات کو جلا کر مکینوں کو اندر ہی کوئلہ بنا دیا گیا۔ [5] بغداد کے گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ [6]

چالیس دن تک قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ شہر کے ۲۵ لاکھ باشندوں میں سے مقتولین کی تعداد اٹھارہ سے بیس لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ [7] یہاں بسنے والے یہودیوں عیسائیوں، رافضیوں، ابن علقمی جیسے غداروں اور ان کے متعلقین کے سوا کسی کو پناہ نہ ملی۔ قتل عام سے قبل تاتاریوں نے مستثنیٰ کیے جانے والے لوگوں کے گھروں پر پہرے لگوادیے تھے۔ چنانچہ ان مخصوص محلوں، گھروں اور عمارتوں کے سوا باقی تمام شہر تہہ تیغ ہوگیا۔ [8] ابن علقمی کی کوشش کے باوجود روافض قتلِ عام سے پوری طرح نہ بچ سکے۔ گیہوں کے ساتھ گھن پسنے کے بمصداق ان کے ہزاروں لوگ اس طوفان قہر انگیز کی زد میں آکر مارے گئے۔ [9]

---

① البداية والنهاية: سنة ٦٥٦هـ؛ طبقات ناصری: ۲/ ۱۹۸؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۱۸۳؛ طبقات الشافعية الكبرىٰ: ۸/ ۲۷۱، ۲۷۲، ط هجر

② جامع التواريخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۳، ط دار احياء الكتب العربية مصر

③ سير اعلام النبلاء: ۲۳/ ۳۷۳، ط الرسالة

④ البداية والنهاية: سنة ٦٥٦هـ

⑤ البداية والنهاية: سنة ٦٥٦هـ

⑥ روضة الصفا: ۵/ ۸۲، ط نولکشور

⑦ البداية والنهاية: ٦٥٦هـ۔ یہ تعداد ہلاکو خان کے حکم سے کی گئی لاشوں کی گنتی کے نتیجے میں سامنے آئی تھی۔ (العسجد المسبوک للغسانی، ص ۶۳۱؛ طبقات الشافعية الكبرىٰ للسبكی: ۸/ ۲۷۱، ط هجر) جبکہ اس بارے میں دیگر اقوال بھی ہیں۔ ابن دقماق (م ۸۰۹ھ) نے نقل کیا ہے کہ مقتولین ۲۳ لاکھ تیس ہزار تھے۔ (نزهة الانام فی تاريخ الاسلام، ص ۲۴۰) ابن الفوطی لکھتے ہیں کہ مقتولین آٹھ لاکھ سے زائد تھے، اس شمار میں کیچڑ میں دب جانے والے، سرنگوں اور کنوؤں میں گھٹ کر یا بھوک پیاس یا دہشت سے مرجانے لوگ شامل نہیں ہیں۔ (الحوادث الجامعة، ص ۲۳۷)

⑧ الحوادث الجامعة والتجارب النافعة لابن الفوطی، ص ۲۳۶، ط العلمية

⑨ مورد اللطافة فی من ولی السلطنة والخلافة، للعلامة یوسف بن تغری بردی: ۱/ ۲۳۵، ط دار الكتب المصرية

گرانی، فنا اور وبا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ گلزار شہر جو پوری دنیا کا سب سے پُر رونق شہر تھا بالکل ویران و تاراج ہوگیا۔ بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر ٹیلوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ بارش ہوئی تو لاشیں مسخ ہوگئیں۔ شہر میں تعفن پھیلنے سے آب و ہوا خراب ہوگئی۔ وبائیں پھوٹ پڑیں جن کا اثر ملک شام تک پہنچا۔ اس ہوا اور وبا سے لوگ بکثرت ہلاک ہوئے۔ گرانی، فنا اور وبا تینوں کا راج تھا۔''[1]

کتب خانے دریا بُرد:

بغداد شہر نہیں راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ ہلاکو خان کی وحشیانہ یلغار کے نتیجے میں خلافتِ بغداد بیخ و بُن سے ناپید ہوگئی۔ وہ لاتعداد نادر و نایاب کتابیں جو مدارس اور کتب خانوں کی زینت تھیں مگر اپنے حاملین کی بے عملی پر نوحہ کناں تھیں، تاتاریوں کے ہاتھوں دریا بُرد کر دی گئیں۔ جب وہ دجلہ کے آبِ لہورنگ میں گریں تو ان کی روشنائی سے کئی دنوں تک دریا کا رنگ سیاہ رہا۔ یہ کتابیں تعداد میں اس قدر زیادہ تھیں کہ دریا میں جگہ جگہ ان کے ڈھیر پلوں کی طرح دکھائی دیتے تھے جن پر تاتاری پیادے اور سوار دریا کے آر پار آتے جاتے تھے۔[2]

عام معافی کے اعلان کے بعد شہر کی حالت:

چالیس دن کے بعد شہر میں عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ تب سینکڑوں لوگ جو تہہ خانوں اور خفیہ پناہ گاہوں میں چھپے تھے باہر نکلے۔ مگر چھ ہفتوں کی بھوک، پیاس اور خوف و دہشت سے ان کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکا تھا۔ بیوی شوہر کو، بھائی بہن کو اور باپ اپنے بچوں کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ باہر نکلتے ہی وہ وبائی امراض کا شکار ہوئے اور ان میں سے اکثر راہیِ عدم ہوگئے۔[3]

ایک فقیہ کی آپ بیتی:

بغداد کے اس سانحۂ فاجعہ سے بچ نکلنے والے راویانِ تاریخ بہت کم تھے، لہٰذا اس واقعے کو آپ بیتیوں کی شکل میں نقل کرنے کی روایات شاذ و نادر ہی ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک ایسی روایت مل گئی جسے اس سانحے سے بچنے والے ایک خوش قسمت فقیہ جمال الدین حنبلی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے جو ایک عالم فخر الدین حنبلی کے بیٹے تھے۔ وہ بتاتے ہیں:

''ہلاکو خان دو لاکھ سپاہی لے کر آیا، اس نے خلیفہ کو طلب کیا۔ خلیفہ کے ساتھ شہر کے قاضی اور عمائد جن کی تعداد سات سو تھی، اس کے پاس گئے۔ ان سب کو (ہلاکو کے پاس حاضری سے) روک دیا گیا۔ خلیفہ کو اور سترہ افراد کو طلب کیا گیا جن میں میرے والد (فخر الدین عبداللہ بن علی بن منصور بن رطلین حنبلی) بھی تھے۔

---

① البداية والنهاية: ١٧/٣٦٢

② سمط النجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی للعصامی المکی: ٣/٥١٩، ط العلمية ③ البداية والنهاية: سنة ٦٥٦ھ

(سات سو میں سے) باقی سب لوگوں کی گردنیں اڑا دی گئیں، جبکہ خلیفہ کو ایک خیمے میں اور ان سترہ افراد کو ایک الگ خیمے میں ٹھہرا دیا گیا۔ میرے والد بتاتے تھے کہ رات کے وقت خلیفہ ہمارے خیمے میں آ کر کہتے تھے: میرے لیے دعا کرو۔ ایک دن خلیفہ کے خیمے پر کوئی پرندہ آ بیٹھا۔ ہلاکو نے خلیفہ کو بلا لیا اور پوچھا:

''یہ پرندہ کیا کرنے آیا تھا۔ وہ تم سے کیا کہہ رہا تھا؟''[1]

پھر ہلاکو خان کی خلیفہ سے بات چیت ہوئی۔ پھر اس نے خلیفہ اور اس کے بیٹے ابوبکر کے بارے میں حکم دیا۔ انہیں پیٹا گیا یہاں تک کہ دونوں مر گئے۔ پھر تاتاریوں نے سترہ افراد کو ''تیر'' دے کر آزاد کر دیا۔[2]

ان لوگوں میں سے دو افراد قتل ہو گئے۔[3] جبکہ باقی اپنے گھروں تک پہنچ گئے تو دیکھا کہ ان کے گھر بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ میں ''مغیثیہ'' میں اپنے والد تک پہنچا۔[4] وہ اپنے باقی رفقاء کے ساتھ تھے۔

(میری بدحالی کے باعث) ان میں سے کوئی مجھے پہچان نہ سکا۔ کہنے لگے: ''کیا کام ہے؟''

میں نے کہا: ''میں فخر الدین ابن رطلین سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں انہیں جانتا ہوں۔''

میرے والد میری طرف مڑے اور کہنے لگے: ''تمہیں ان سے کیا کام ہے؟''

میں (بھی اپنے والد کو نہ پہچان سکا اور) بولا: ''میں ان کا بیٹا ہوں۔''

تو انہوں نے مجھے (غور سے) دیکھا اور جب پہچان لیا تو رونے لگے۔ میرے پاس کچھ تل کے دانے تھے، وہ میں نے انہیں دے دیے۔''[5]

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب خواص کی یہ حالت تھی تو عوام پر کیا کچھ نہیں بیتی ہوگی۔

بغداد تاتاریوں کے پنجے میں:

تاتاریوں کی حکومت میں اب بغداد کی باقی ماندہ آبادی کا حال مردوں سے بدتر تھا۔ علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ اس قبرستان سے بدتر شہر کا حال یوں لکھتے ہیں:

''خزانے نکالنے کے لیے شہر کے گھروں کو کھود ڈالا گیا، تاتاری کسی گھر میں گھس کر کھدائی کر کے وہاں سے دفینے نکال لیتے جبکہ گھر کا مالک قسمیں کھا کر کہتا تھا کہ وہ برسوں سے یہاں آباد ہے اور اسے کسی دفینے کا علم نہیں۔ شہر کے عیسائیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سرِعام شراب پئیں اور خنزیر کا گوشت کھائیں۔ مسلمانوں کو رمضان میں یہاں کے عیسائیوں کے ساتھ شریک ہو کر شراب پینے، خنزیر کھانے اور روزے توڑنے پر مجبور کیا گیا۔ مساجد میں شراب

---

[1] اس گفتگو کا ذکر مؤرخین میں سے فقط ابن دقماق صارم الدین نے اپنی کتاب ''نزھۃ الانام فی تاریخ الاسلام'' میں کیا ہے۔ ان کے حوالے سے یہ گفتگو گزشتہ اوراق میں زیادہ وضاحت سے گزر چکی ہے۔

[2] غالباً یہ خاص قسم کے تیر تھے جو امان کی نشانی کے طور پر انہیں دیے گئے تھے۔ [3] غالباً راستے میں رہزنوں کی لوٹ مار کے باعث یہ لوگ قتل ہوئے تھے۔

[4] مغیثیہ بغداد سے لگ بھگ ڈیڑھ سو کلومیٹر دور کوفہ کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ جمال الدین اپنے والد کا اتا پتا پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔

[5] سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۱۸۳، ط الرسالۃ

انڈیلی گئی اور اذان پر پابندی لگادی گئی۔ یہ وہ بغداد ہے کہ جب سے آباد ہوا تھا کبھی دارالکفر نہیں بنا تھا۔ جب سے دنیا بنی ہے، ایسا سانحہ کبھی پیش نہیں آیا۔''[1]

ابن الفوطی لکھتے ہیں:

''جو لوگ قتل سے بچ گئے ان میں مردوں کی بدبو سونگھنے یا تعفن آلود پانی پینے سے وبا پھیل گئی۔ لوگ تعفن اور مکھیوں کے اثرات سے بچنے کے لیے بکثرت پیاز سونگھا کرتے تھے کیوں کہ مکھیوں نے فضا کو بھر دیا تھا، وہ کھانے پینے کی چیزوں پر آکر انہیں خراب کر دیتی تھیں۔ حلہ، سیب اور کوفہ کے لوگ بغداد میں خوراک کی چیزیں لے آتے تھے۔ لوگوں کو اس سے فائدہ ہوا۔ وہ قیمتی کتب اور پیتل کے برتن اس کے بدلے اونے پونے بیچ ڈالتے تھے۔''[2]

نکتہ:

خلفائے بنوسفیان کے پہلے خلیفہ حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ تھے اور آخری معاویہ بن یزید۔ بنومروان کے پہلے حکمران کا نام مروان بن الحکم تھا اور آخری کا نام مروان بن محمد۔ خلفائے بنوعباس کا پہلا حکمران عبداللہ السفاح تھا اور آخری عبداللہ مستعصم۔ بنوعبید کا پہلا حکمران عبداللہ المہدی تھا اور آخری عبداللہ العاضد۔[3]

ابن علقمی کا انجام:

ابن علقمی کو یقین تھا کہ خلافتِ عباسیہ کے خاتمے کے بعد ہلاکو خان اسے اپنا محسن سمجھتے ہوئے بغداد کی حکومت اس کے سپرد کر دے گا مگر ہلاکو خان نے اسے گھاس نہ ڈالی اور ایک معمولی افسر ابنِ عمران کو بغداد کا حاکم مقرر کر دیا۔[4]

ابن علقمی کی نیت یہ تھی کہ بغداد میں اہلِ سنت کی مساجد، مدارس اور خانقاہیں ویران ہو جائیں جبکہ روافض کے مراکز آباد رہیں۔ وہ یہ بھی تہیہ کیے ہوئے تھا کہ بغداد میں روافض کی ایک عظیم الشان درسگاہ بنوائے گا تا کہ وہاں سے افکار وعقائدِ روافض کی خوب اشاعت ہو سکے مگر اس کے یہ خواب ادھورے رہ گئے۔[5] اُلٹا بغداد میں روافض کی متعدد عقیدت گاہیں بے نام ونشان ہو گئیں۔ شیعہ مؤرخ میر خواند لکھتا ہے کہ بغداد کو تاراج کرتے ہوئے تاتاریوں کے ہاتھوں بعض ائمہ اثنا عشریہ کے مزارت بھی نذرِ آتش ہوئے۔[6]

علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ابن علقمی جو توقع لگائے ہوئے تھا، وہ پوری نہ ہوئی۔ وہ اس وقت نادم ہوا جب ندامت کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ منقول ہے کہ ایک بار اس سے (اس کے گھر والوں نے) ہو مانگے۔ وہ ایک گھوڑے پر بیٹھ کر خود باہر نکلا تا کہ کچھ

---

[1] طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۸/ ۲۷۱، ۲۷۲، ط ھجر

[2] الحوادث الجامعة والتجارب النافعة لابن الفوطی، ص ۲۳۷، ط العلمیة ...... یاد رہے کہ ابن الفوطی (م ۷۲۳ھ) حنبلی محدث اور ادیب تھے۔ سقوطِ بغداد کے موقع پر خود بھی گرفتار ہوئے تھے اور پھر نصیر طوسی کی سفارش پر رہائی پائی تھی۔ (فوات الوفیات: ۲/ ۳۱۹؛ طبقات النسابین، ص ۱۳۷، ۱۳۸)

[3] البدایة والنہایة: ۱۷/ ۳۶۷، ۳۶۸، ط دار ھجر

[4] تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۳/ ۹۶

[5] البدایة والنہایة: ۱۷/ ۳۶۲

[6] روضة الصفا: ۵/ ۸۲، مطبوعہ نول کشور

جمع کرے، تو (اسے دیکھ کر) کوئی اسے گالیاں دینے لگا، کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا اور کوئی اسے طمانچے رسید کرنے لگا حالانکہ اس سے پہلے سلاطین آ کر اس کی چوکھٹ کو بوسہ دیتے تھے اور لشکری دن رات اس کی خدمت میں رہتے تھے۔ ایک بار ایک عورت نے گھر کی کھڑکی سے اسے (اس حال میں) دیکھا تو کہنے لگی: ''کیا امیر المؤمنین (مستعصم) کے زمانے میں تیری سواری ایسی ہوتی تھی؟'' ابن علقمی شرمندگی کے مارے ساکت و جامد ہو گیا۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ ایک بار کسی عورت نے اسے دیکھا کہ وہ ایک ٹٹو پر سوار ہے اور ایک سائیس ٹٹو کو ہانک رہا ہے۔ عورت نے طنز کرتے ہوئے کہا: ''ابن علقمی! بنو عباس کا سلوک تیرے ساتھ ایسا تو نہ تھا۔'' ابن علقمی منہ چھپا کر وہاں سے چل دیا اور ندامت کے باعث گھر میں بند ہو گیا۔[2]

غدار کے ساتھ تاتاریوں کا سلوک:

تاتاریوں کا ابن علقمی کے ساتھ جو سلوک تھا اس کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بار وہ اپنے مہمان خانے میں بیٹھا تھا کہ ایک عام تاتاری اپنے گھوڑے سمیت اندر آ گھسا۔ ابن علقمی کو جرأت نہ تھی کہ اسے کچھ کہتا۔ تاتاری جس کام سے آیا تھا، اس بارے میں ابن علقمی سے بات کرنے لگا۔ اس دوران گھوڑے نے دفتر کے قالین پر پیشاب کر دیا جس کے چھینٹے اُڑ کر ابن علقمی کے کپڑوں پر بھی لگے۔ اسے تب بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ اندر ہی اندر حسرت وندامت سے مرا جا رہا تھا مگر اوپر سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ میں بڑا کامیاب انسان ہوں۔ ایک بار کسی شیعہ نے اس سے پوچھا: ''جنابِ عالی! آپ نے جو کچھ کیا، وہ شیعوں کے حق میں غیرت کی وجہ سے کیا مگر اس کے نتیجے میں تو بے شمار ساداتِ کرام بھی قتل ہو گئے اور ان کی خواتین کی عزتیں پامال ہوئیں؟

بدبخت ابن علقمی نے جواب دیا: ''جب امیر دُویدار اور اس کے ہم مذہب (سُنی) قتل ہو گئے تو پھر ان باتوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔''[3]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس دشمنِ اسلام کا مقصد ساداتِ کرام کو اقتدار دلانا ہرگز نہ تھا، اہلِ بیت سے عشق ومحبت تو محض ایک ڈھونگ تھا۔ اصل مقصد محض اپنی دشمنی نکالنا تھا اور یہ ناپاک مقصد اسے اس حد تک مطلوب تھا کہ اس کے لیے ساداتِ کرام کا خون بہہ جانے بلکہ ان کی خواتین کی عصمتیں بھی لٹ جانے کی اسے کوئی پروا نہ تھی۔

ابن علقمی کی عبرت ناک موت:

مستعصم کے قتل کے بعد ابنِ علقمی زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکا۔ بغداد کی تباہی کے ایک سال بعد ۶۵۷ھ کے اوائل میں ہلاکو خان نے اسے طلب کیا اور اسے نہایت بدکردار، بد باطن اور احسان فراموش انسان قرار دیا جو اپنے سابقہ آقا

---

① طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی: ۸/ ۲۷۳، ۲۷۴، ط ہجر　② البدایۃ والنہایۃ: ۱۷/ ۳۸۰، ط دار ہجر
③ فوات الوفیات لابن شاکر صلاح الدین: ۳/ ۲۵۳، ط دار صادر

کے خلاف بدترین سازشوں میں ملوث رہا۔ اسے خوب ذلیل کرنے کے بعد ہلاکو خان نے آخر میں کہا:

''اگر ہم تجھے اپنا سب کچھ دے ڈالیں تب بھی تجھ سے خیر کی توقع نہیں ہوسکتی۔ تو نے نہ ان احسانات کے حق کا لحاظ کیا جو تیرے ساتھ کیے گئے تھے، نہ تو نے اس مرتبے کا کوئی حق ادا کیا جو تجھے دیا گیا تھا، نہ ہی تو نے اپنے ہم مذہب لوگوں کے حق کا کچھ خیال کیا۔ تو نے ان کی عورتوں اور اولاد کو ہمارا غلام بنا دیا۔ پس بھلا تو ہمارا خیر خواہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم تمہارے ساتھ اس سے بہتر اور کچھ نہیں کر سکتے کہ تمہارے شر سے باقی مسلمانوں کو اور تمہاری خفیہ سازشوں سے تاتاریوں کو بچانے کے لیے تمہیں قتل کر دیں۔''

اس کے بعد ہلاکو خان نے اسے بدترین اذیتیں دے کر قتل کرا دیا۔ ①

غرض یہ بدبخت ''خَسِرَ الدُّنْیَا وَالآخِرَۃ'' کا مصداق بن کر موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اس کی عمر ۶۶ سال تھی۔ ②

ابن علقمی حکومت کو اپنے خاندان میں منتقل کرنا چاہتا تھا، مگر یہ حسرت حسرت ہی رہی۔ وہ خود بھی عبرت کا نشان بن گیا۔ اس کی موت سے چند دن پہلے اس کا بھائی علم الدین بھی فوت ہوگیا۔ جبکہ اس کا بیٹا محمد اس کی وفات کے کچھ دنوں بعد راہی عدم ہوگیا۔ یوں اس خاندان کا بیج مٹ گیا۔ ③

کچھ ذکر نصیر طوسی کا:

نصیر الدین طوسی کا اصل نام محمد بن محمد بن الحسن تھا۔ وہ قم کی نواحی بستی طوس میں ۵۹۷ھ میں پیدا ہوا۔ متعصب رافضی تھا۔ پہلے باطنی دہشت گردوں کی خدمت کرتا رہا۔ پھر ہلاکو خان کا ملازم بنا اور کفار کو عالم اسلام پر فتوحات دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے شرعی علوم کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ انہیں مٹانے کے درپے رہا۔ اس کے مشورے پر بغداد میں اہلِ سنت کے تمام ذخائرِ کتب دریا برد کر دیے گئے۔ یوں صدیوں کا علمی ذخیرہ ضائع ہوگیا۔ یہ ایسا نقصان تھا جس کی تلافی آج تک نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد اس نے تاتاریوں کی سرپرستی میں مراغہ میں ایک فلکیاتی ادارہ قائم کیا اور فلسفہ، منطق اور ریاضی کے موضوعات پر کئی کتب لکھ کر بڑی شہرت پائی۔ طوسی ۶۷۲ھ میں فوت ہوا۔ اس کی قبر ایران کے قصبے کاظمیہ میں ہے۔ ④

نصیر طوسی کے سیاہ کارنامے:

شیعہ مؤرخین نے طوسی کو اسلام کا ہیرو مشہور کر رکھا ہے۔ بعض ناواقف اہلِ سنت بھی اسے عظیم دانش ور سمجھتے ہیں، جبکہ

---

① نزهة الانام فی تاریخ الاسلام لابن دقماق صلاح الدین، ص ۲۴۰؛ المنهل الصافی والمستوفی بعد الوافی: ۱۲۸/۳؛ مورد اللطافة فی من ولی السلطنة والخلافة: ۲۳۵/۱

ابن علقمی کے انجام کے بارے میں دوسری روایت یہ بتاتی ہے کہ وہ سقوطِ بغداد کے تین ماہ بعد تاتاریوں کے ہتک آمیز برتاؤ سے مایوس ہو کر رنج و غم کی حالت میں یکم جمادی الاولیٰ ۶۵۶ھ کو طبعی موت مر گیا تھا۔ (البدایة والنهایة: سنة ۶۵۶ھ ترجمة ابن علقمی؛ طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۲۶۳/۸، ط هجر)

② سیر اعلام النبلاء: ۳۶۲/۲۳، ترجمہ ابن علقمی، ط الرسالة

③ سیر اعلام النبلاء: ۳۶۲/۲۳، ط الرسالة ④ تاریخ الاسلام للذهبی: سنة ۶۷۲ھ

اس کے سیاہ کارنامے اس کی علمی خدمات پر حاوی ہیں۔ اسی لیے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس پر شدید نکیر کرتے تھے اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اسے ''نصیر الشرک'' کہہ کر یاد کرتے تھے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ طوسی کا پردہ چاک کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب حکومت نصیرِ شرک وکفر، وزیرِ ملحدین نصیر طوسی، وزیرِ ہلاکو خان کا دور آیا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں اور دیندار لوگوں سے دلی انتقام لیا، انہیں تلوار کی بھینٹ چڑھا دیا، یہاں تک کہ اپنے ملحدین بھائیوں (باطنیوں) کو بھی مروا دیا، اپنے انتقام کی خاطر اس نے خلیفہ، قاضیوں، فقہاء اور محدثین کو قتل کرایا۔ فلسفیوں، نجومیوں اور جادوگروں کو بچایا۔ مدارس، مساجد اور یتیم خانوں کے اوقاف اپنے قبضے میں لے کر اپنے خاص مریدوں کے حوالے کر دیے۔ اس نے اپنی کتب میں دنیا کو ازلی وابدی قرار دیا، آخرت کا انکار کیا، اللہ کی صفاتِ علم وقدرت اور اس کے سمیع وبصیر ہونے کی نفی کی۔ اور کہا کہ اللہ نہ اس دنیا میں ہے نہ اس کے باہر اس کا وجود ہے اور عرش پر کوئی معبود نہیں جس کی عبادت کی جائے۔ اس نے ملحدوں کے لیے درس گاہیں بنوائیں اور کوشش کی کہ ملحدوں کے امام ابن سینا کی کتاب ''الاشارات'' کو قرآن کا مقام دیا جائے۔ مگر جب یہ ممکن نہ ہوا تو اس نے کہا کہ ''الاشارات'' خواص کا قرآن ہے اور وہ قرآن عام لوگوں کے لیے ہے۔ اس نے نماز کو بدل کر دن میں دو نمازیں مقرر کرنے کی کوشش کی مگر یہ بھی ممکن نہ ہوا۔ آخر میں اس نے جادو سیکھا اور جادوگر بن کر بتوں کی پوجا کرنے لگا...... خلاصہ یہ ہے کہ وہ خود اور اس کے پیروکار کافر وملحد تھے۔''[1]

علامہ محب الدین الخطیب رحمہ اللہ طوسی کے ہاتھوں اسلامی علوم کی تباہی کا حال یوں لکھتے ہیں:

''وہ اس پر مُصر ہوا کہ اسلامی علوم کی کتب دجلہ میں غرق کر دی جائیں۔ جب ایسا ہوا تو دریا کا پانی کئی دنوں اور راتوں تک کتابوں کی روشنائی سے سیاہ ہو کر بہتا رہا۔ اس طرح اسلامی ورثے سے تاریخ وادب، لغت، شعر، حکمت کا بہت بڑا ذخیرہ ضائع ہو گیا۔ ان کے ساتھ علوم شرعیہ اور نسلِ اوّل کے اسلاف کی وہ قدیم کتب بھی تلف ہوئیں جن میں سے بہت سی آج تک باقی ہیں اور اس تمدنی سانحے میں ان جیسا بہت کچھ تلف ہو گیا جس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔''[2]

---

① اغاثۃ اللھفان من مصاید الشیطان: ۲/ ۱۰۳۲، ط عالم الفوائد

② الخطوط العریضۃ للأسس التی قام علیھا دین الشیعۃ الإمامیۃ الاثنی عشریۃ، ص ۳۲، ۳۳، ط المکتبۃ الشاملۃ

مسلمانوں کے قاتل۔ روافض کے ہیرو: عموماً ایرانی مؤرخین سقوطِ بغداد میں نصیر الدین طوسی اور ابن علقمی کی شرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان واقعات کو سُنّی مؤرخین کے جھوٹے افسانے قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقائق خود گزشتہ صدیوں کے شیعہ مؤرخین اسی طرح بیان کرتے آئے ہیں اور انہوں نے برملا لکھا ہے کہ یہ سب ابن علقمی اور طوسی کا کیا دھرا تھا۔ ملاحظہ ہوں کتب شیعہ:

(۱) مجالس المؤمنین از قاضی نور اللہ شوستری: ج ۲ ص ۲۰۲، ۲۰۵، ناشر کتاب فروشی اسلامیہ تہران

(۲) روضۃ الصفا از میر خواند ج ۵/ ۲۳۸، ناشر انتشارات علمی تہران: یا مطبوعہ نول کشور: ۵/ ۸۳

(۳) روضات الجنان، از محمد باقر بن زین العابدین خوانساری، ص ۶۵، تحقیق محمد علی روضاتی تہران

قریبی دور کے شیعہ علماء نے جب دیکھا کہ سقوطِ بغداد جیسے سانحوں میں شیعہ زعماء کی بھرپور شرکت کا انکار کرنا ممکن نہیں تو انہوں ایسی ناپاک حرکات اور اہل سنت کے قتل عام کو عظیم قومی خدمات کا درجہ دینا شروع کر دیا۔ آیۃ اللہ خمینی نے طوسی کی سیاست کو سراہتے ہوئے لکھا ہے: ...... بقیہ اگلے صفحہ کے حاشیہ پر

سانحۂ بغداد پر عالم اسلام میں اضطراب:

خلافتِ بغداد اپنی تمام تر کمزوریوں اور عیوب کے باوجود مسلمانوں کی سیاسی وحدت کا محور تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی رشتے کے باعث تمام مسلمان بنو عباس کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ پھر بغداد لاکھوں مسلمانوں کا مسکن، علوم وفنون کا گہوارہ، مساجد ومدارس، خانقاہوں اور کتب خانوں کا مرکز ہونے کی وجہ سے پورے عالم اسلام کی عزت وناموس کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے جب بغداد پر تاتاریوں کے حملے کی خبر عالم اسلام میں پھیلی تو ہر طرف غم واضطراب کی لہر دوڑ گئی، علماء نے اہلِ بغداد کی فتح اور تاتاریوں کی شکست کے لیے دعائے قنوتِ نازلہ کا اہتمام شروع کرایا۔[1] پھر جب بغداد کی تباہی کی خبر پہنچی تو پوری دنیائے اسلام تڑپ اٹھی اور چہار سو آہ وفغاں بلند ہونے لگی۔

تقی الدین اسماعیل بن ابی الیُسر نے درد سے بے تاب ہو کر کہا:

لِسَائِلِ الدَّمعِ عَنْ بَغْدَادَ اَخْبَارُ ... فَمَا وُقُوفُکَ وَالأَحْبَابُ قَدْ سَارُوْا

''آنسو بہانے والے کے لیے بغداد سے بہت سی خبریں ہیں۔ تم کیوں ٹھہر گئے جبکہ دوست روانہ ہو چکے۔''

عَلا الصَّلِیْبُ عَلٰی اَعْلٰی مَنَابِرِھَا ... وَقَامَ بِالأَمْرِ مَنْ یَّحْوِیْهِ زُنَّارُ

''بغداد کے بلند ترین منبروں پر صلیب آویزاں ہے اور انتظام کا ذمہ دار زنار باندھنے والا (نصرانی) ہے۔''

وَکَمْ حَرِیْمٍ سَبَتْهُ التُّرْکُ غَاصِبَةً ... وَکَانَ مِنْ دُوْنِ ذَاکَ السِّتْرِ أَسْتَارُ

''کتنی باعصمت عورتوں کو تاتاریوں نے اغواء کر لیا جبکہ ان کے پردوں پر بھی پردے پڑے رہتے تھے۔''

وَکَمْ حُدُوْدٍ أُقِیْمَتْ مِنْ سُیُوْفِهِمْ ... عَلَی الرِّقَابِ وَحُطَّتْ فِیْهِ أَوْزَارُ

''ان کفار کی تلواروں سے گردنیں کاٹ کر کتنی حدود قائم کی گئیں جن سے لوگوں کے گناہ معاف ہوئے۔''

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

''کارہائے خواجہ نصیر برائے مذہب کرد، آن کارہا است کہ خواجہ نصیر را خواجہ نصیر کرد۔''
(خواجہ نصیر نے مذہب کے لیے جو کارنامے انجام دیے، انہی کی بدولت خواجہ نصیر خواجہ نصیر بنا۔)

نیز آیۃ اللہ خمینی نے ایک جگہ لکھا ہے: ''بادشاہوں کی مصاحبت کی وجہ سے ہم میں سے کسی کو تقیہ کرنے (اپنے اصل دین کو چھپانے) کی نوبت آجائے تو یہ اس وقت تک جائز نہیں جب تک جان کا خطرہ نہ ہو۔ ہاں اگر کوئی شخص اس ظاہری مصاحبت سے اسلام اور مسلمانوں کی حقیقی مدد ونصرت کا کام لے تو جائز ہے جیسے علی بن یقطین اور نصیر الدین طوسی نے کیا۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔'' (الحکومۃ الاسلامیۃ، ص ۲۱۲، ۲۱۳، ط المکتبۃ الشاملۃ) (کشف الاسرار، ص ۱۵)

یاد رہے کہ علی بن یقطین ایک زندیق تھا جسے روافض اپنے راویوں میں شمار کرتے ہیں۔ وہ عباسی تحریک کے ابتدائی داعیوں میں سے شامل رہا۔ ۱۶۷ھ میں خلیفہ ہادی عباسی نے زندیقوں کی تفتیش شروع کی تو یہ بھی اس کی زد میں آیا اور قتل کیا گیا۔ (لسان المیزان: ۲/۳۰۲، ۴/۲۶۸)

ایک ایرانی مصنف عبدالوحید وفائی ابن علقمی اور طوسی کے اس ظلم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''باین وسیلہ، خلافتِ ۵۲۵ سالہ بنی عباس کہ مرکز فساد وفتنہ علیہ مسلمانان خاصۃ شیعہ بود، بر افتاد۔''

(اس طریقے سے بنو عباس کی ۵۲۵ سالہ خلافت جو مسلمانوں خصوصاً شیعوں کے لیے فتنہ وفساد کا مرکز تھی، ختم ہو گئی۔) (خواجہ طوسی یا وروحی وعقل، ص ۹۵)

یہی کچھ اقبال یغمائی نے لکھا ہے، دیکھیے اس کی کتاب: ''خداوند دانش وسیاست خواجہ نصیر الدین طوسی'' حاشیہ صفحہ موجودہ

[1] ذیل مرآۃ الزمان: ۱/۸۹، ط دار الکتاب الاسلامی قاہرہ

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَنَّ الْقَوْمَ اَغْفَلَهُمْ ... مَا كَانَ مِنْ نِعَمٍ فِيهِنَّ إِكْثَارُ

''اللہ جانتا ہے کہ ہماری قوم کو ان نعمتوں نے غافل کر دیا تھا جو بکثرت تھیں۔''

فَأَهْمِلُوْا جَانِبَ الْجَبَّارِ إِذْ غَفَلُوْا ... فَجَاءَ هُمْ مِنْ جُنُوْدِ الْكُفْرِ جَبَّارُ

''وہ غافل تھے تو خدائے جبار کی طرف سے انہیں مہلت دی گئی۔ پھر لشکرِ کفر کا بے رحم سرداران پر ٹوٹ پڑا۔''

مِنْ بَعْدِ أَسْرِ بَنِي الْعَبَّاسِ كُلِّهِمُ ... فَلَا أَنَارَ لِوَجْهِ الصُّبْحِ إِسْفَارُ

''بنو عباس سب کے سب قیدی بن گئے۔ اس کے بعد کبھی صبح کے چہرے پر روشنی نہ چمکے گی۔''

مَا رَاقَ لِيْ قَطُّ شَيْءٌ بَعْدَ بَيْنِهِم ... إِلَّا أَحَادِيْثُ أَرْوِيْهَا وَ آثَارُ

''ان کے بعد مجھے لوگوں میں کچھ نہیں بھاتا، سوائے ان باتوں اور واقعات کے جنہیں میں دہراتا رہتا ہوں۔''

لَمْ يَبْقَ لِلدِّيْنِ وَالدُّنْيَا وَقَدْ ذَهَبُوْا ... شَوْقٌ لِمَجْدٍ وَقَدْ بَانُوْا وَقَدْ بَارُوْا

''دین اور دنیا کے کسی مرتبے کا شوق نہ بچا جبکہ وہ لوگ چلے گئے، جدا ہو گئے اور برباد ہو گئے۔''

نَادَيْتُ وَالسَّبْيُ مَهْتُوْكٌ تَجُرُّهُمْ ... إِلَى السِّفَاحِ مِنَ الْأَعْدَاءِ دُعَّارُ

''میں نے انہیں پکارا جب قیدی بے عزت تھے اور انہیں لٹیرے دشمن خونریزی کی طرف لے جا رہے تھے۔''

وَهُمْ يُسَاقُوْنَ لِلْمَوْتِ الَّذِيْ شَهِدُوْا ... النَّارَ يَا رَبِّ مِنْ هٰذَا وَلَا الْعَارُ

''وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے تھے جو سامنے تھی، کہتے تھے: مولا! اس عار سے تو آگ (میں جل مرنا) بھلا۔''

آلُ النَّبِيِّ وَأَهْلُ الْعِلْمِ قَدْ سُبُوْا ... فَمَنْ تَرٰى بَعْدَهُمْ يَحْوِيْهِ أَمْصَارُ

''نبی ﷺ کی آل اور اہلِ علم قیدی بن گئے۔ پس کیا خیال ہے کہ ان کے بعد یہ شہر کسی کو بچا سکیں گے؟''

مَا كُنْتُ آمُلُ أَنْ أَبْقٰى وَقَدْ ذَهَبُوْا ... لٰكِنْ أَتٰى دُوْنَ مَا أَخْتَارُ أَقْدَارُ

''مجھے توقع نہ تھی میں باقی رہوں گا اور وہ لوگ چلے جائیں گے۔ مگر تقدیر نے وہ کر دیا جو میں نہیں چاہتا تھا۔''[1]

شیخ سعدی شیرازی کا عربی مرثیہ:

حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمہ اللہ جو اپنے عہدِ شباب میں بغداد کے علماء سے فیض حاصل کر چکے تھے، اس سانحے پر بے قرار ہو کر ایسا دردناک مرثیہ کہہ گئے جو اس دور کے تمام مسلمانوں کے دلی جذبات کا نمائندہ محسوس ہوتا ہے۔ شیخ نے اس بارے میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں مرثیے کہے ہیں۔ عربی مرثیہ یہ ہے:

نَسِيْمُ صَبَا بَغْدَادَ بَعْدَ خَرَابِهَا ...... تَمَنَّيْتُ لَوْ كَانَتْ تَمُرُّ عَلٰى قَبْرِيْ

''بغداد کی تباہی کے بعد اس کی ہوا کا جھونکا کاش کہ میری قبر پر ہی گزرتا (یعنی میں اس وقت زندہ نہ ہوتا)''

وَلَا تَسْئَلَنَّ عَمَّا جَرٰى يَوْمَ حَصْرِهِمْ ...... وَذٰلِكَ مِمَّا لَيْسَ يَدْخُلُ فِي الْحَصْرِ

''بنو عباس کے قید ہوتے وقت کی بات نہ پوچھو۔ یہ بات ایسی نہیں جو بیان کی حد میں آ سکے۔''

---

[1] تاریخ الاسلام للذهبي: ۴۸/۳۸، ت تدمری؛ تاريخ الخلفاء للسيوطي، ص ۳۳۳، ط نزار

أُدِيرَتْ كُؤُوسُ الْمَوْتِ حَتَّى كَأَنَّهُ ...... رُؤُوسُ الأَسَارَى تَحَرَّكْنَ مِنَ السُّكْرِ

''موت کے پیالے یوں گھومے کہ گویا (مقتول) قیدیوں کے (کٹے ہوئے) سر نشے میں اچھل رہے ہیں۔''

بَكَتْ جِدَارُ الْمُسْتَنْصِرِيَّةِ نُدْبَةً ...... عَلَى الْعُلَمَاءِ الرَّاسِخِينَ ذَوُو الْحِجْرِ

''جامعہ مستنصریہ کی دیواریں ان علمائے راسخین پر زاروقطار رو رہی ہیں جو عقل و دانش کے پیکر تھے۔''

نَوَائِبُ دَهْرٍ لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَهَا ...... وَلَمْ أَرَ عُدْوَانَ السَّفِيهِ عَلَى الْحَبْرِ

''یہ زمانے کے المیے ہیں۔ کاش میں ان سے پہلے مرجاتا اور علماء پر جاہلوں کا یہ ظلم نہ دیکھتا۔''

فَأَيْنَ بَنُو الْعَبَّاسِ مُفْتَخَرُ الْوَرَى ...... ذَوُو الْخُلُقِ الْمَرْضِيِّ وَالْغُرَرِ الزُّهْرِ

''کہاں ہیں بنوعباس جن پر زمانے کو فخر تھا۔ جو پسندیدہ اخلاق اور روشن پیشانیوں والے تھے۔''

غَدَا سَمَرًا بَيْنَ الْأَنَامِ حَدِيثُهُمْ ...... وَذَا سَمَرٌ يُدْمِي الْمَسَامِعَ كَالسُّمْرِ

''ان کا ذکر لوگوں میں ایک افسانہ بن گیا، یہ ایسا افسانہ ہے جو کانوں کو نیزوں کی طرح خون آلود کر دیتا ہے۔''

وَمُسْتَصْرِخٍ يَا لِلْمُرُوَّةِ فَانْصُرُوا ...... وَمَنْ يُصْرِخُ الْعُصْفُورَ بَيْنَ يَدَيْ صَقْرٍ

''وہ مدد مانگتے رہ گئے کہ برائے شرافت! مدد کرو۔ مگر اس چڑیا کی مدد کون کرتا جو شکرے کے چنگل میں ہو۔''

يُسَاقُونَ سَوْقَ الْمَعْزِ فِي كَبِدِ الْفَلَاةِ ...... عَزَائِزُ قَوْمٍ لَا يَعُودُونَ بِالزَّجْرِ

''ایسے لوگ کی محترم عورتیں صحرا کے سینے پر بکریوں کی طرح ہنکائی رہی ہیں جو ڈانٹ سننے کے بھی عادی نہ تھے۔''

جُلِبْنَ سَبَايَا سَافِرَاتٍ وُجُوهُهَا ...... كَوَاعِبُ لَا تَبْرُزْنَ مِنْ خُلَلِ الْخِدْرِ

''وہ دوشیزائیں جو کبھی پردے کی چادروں سے باہر نہ نکلتی تھیں، انہیں چہرے کھول کر قیدی بنا لیا گیا۔''[1]

شیخ سعدی کا فارسی مرثیہ:

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فارسی زبان میں جو مرثیہ لکھا ہے وہ اس واقعہ ہائلہ کی زیادہ دردناک منظر کشی کرتا ہے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المؤمنیں

''امیر المؤمنین مستعصم کی حکومت چھن جانے پر آسمان زمین پر خون کی بارش برسائے تو یہ بجا ہوگا۔''

اے محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک
سر برآور و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

''اے محمد ﷺ آپ کو قیامت کے دن ظہور فرمانا ہے تو ابھی جلوہ نمائی فرمائیں اور مخلوق پر ٹوٹنے والی یہ قیامت دیکھ لیں۔''

---

[1] کلیاتِ سعدی، ص ۱۱۳۹ تا ۱۱۴۲، ط انتشارات ہرمس

نازنیانِ حرم را خونِ خلق نازنیں
ز آستاں بگذشت و ما را خونِ دل از آستیں

''محل کی ناز پروردہ خواتین کا خون دہلیز سے باہر تک بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپکنے لگا۔''

زینہار از دورِ گیتی و انقلاب روزگار
در خیالِ کس نہ گشتی کانچناں گردد چنیں

''افسوس صد افسوس زمانے کی گردش پر اور افسوس دنیا کے اس انقلاب پر...... کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ کیا سے کیا ہو جائے گا۔''

دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکتِ بیت الحرام
قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقان بر زمیں

''جس نے اس محترم قصر کی شان و شوکت دیکھی ہو! وہ نگاہ اٹھا کر دیکھے (کہ اس مقام کا کیا حشر ہوا) جہاں روم کے قیصر خاک بوسی کرتے اور چین کے خاقان زمین پر بیٹھا کرتے تھے۔''

خونِ فرزندانِ عمّ مصطفیٰ شد ریختہ
ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں

''مصطفیٰ ﷺ کے چچازادوں کا خون اس خاک پر جا گرا...... جہاں بادشاہ سر جھکایا کرتے تھے۔''

دجلہ خونابست زیں پس گر نہد سر در نشیب
خاکِ نخلستانِ بطحا را کند با خوں عجیں

''دجلہ خون کا ایسا دریا بن چکا ہے کہ اگر وہ نشیبی زمین کا رخ کرے تو بطحا کے نخلستان کی مٹی کو خون سے گوندھ دے۔''

باش تا فردا کہ بینی روزِ داور رستخیز
کز لحد باروئے خوں آلود برخیزد دفیں

''صبر کر کہ کل یوم حشر کو یہاں کی قبروں میں دفن لوگ خون آلود چہروں کے ساتھ اٹھیں گے۔''[1]

کفار میں جشن مسرت:

ایک طرف یہ نالہ و شیون تھا تو دوسری طرف مسرت کے شادیانے بجائے جا رہے تھے۔ ہلاکو خان نے بغداد کے سارے خزانے لوٹ کر انہیں اپنے نئے پایۂ تخت مراغہ منتقل کر دیا۔ بہت سے قیمتی جواہرات خاقان منگو خان کو منگولیا بھیج دیے گئے۔ مراغہ کے باہر مغلوں کی لشکر گاہ میں فتحِ بغداد کا جشن منایا جاتا رہا۔ دور دور سے حکام اور امراء آکر ہدایا

[1] کلیاتِ سعدی، ص ۹۸۳ تا ۹۸۵، ط انتشاراتِ ہرمس

اور خراجِ تحسین پیش کرتے رہے۔ فارس سے اتابک ابوبکر بن سعد زنگی نے مؤدبانہ حاضری دی۔ سلاجقہ روم کا حکمران عزالدین بھی خود حاضرِ خدمت ہوا۔ [1]

خواجہ نصیر الدین طوسی اس موقع پر مسلمانوں کی ذلت وتباہی اور کفار کی بالادستی دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہورہا تھا۔ اسے نت نئے چٹکلے سوجھ رہے تھے اور طرح طرح کے من گھڑت قصے سنا کر وہ گزشتہ سُنّی بادشاہوں کی تذلیل کرتے ہوئے ہلاکو خان کی کفریہ حکومت کو اللہ کی رحمت قرار دے رہا تھا۔ اسی اثناء میں اس نے کہا:

''جلال الدین خوارزم شاہ تاتاریوں سے شکست کھا کر تبریز آیا۔ اس کے سپاہی عوام پر ظلم کیا کرتے تھے۔ جب اس سے شکایت کی گئی تو وہ کہنے لگا: ہم اس وقت مجاہد ہیں اور شہروں کو فتح کر رہے ہیں۔ شہروں کے انتظامات کرنا ہماری ذمہ داری نہیں، جب ہم حکمران بن جائیں گے تو فریادیوں کی دادرسی کیا کریں گے۔''

یہ سن کر ہلاکو خان نے فخر سے کہا:

''ہم تو خدا کے فضل سے شہروں کے فاتح بھی ہیں اور منتظم بھی۔ ہم سرکشوں سے جنگ کرتے ہیں اور اطاعت کرنے والی رعایا کے امور کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔ ہم جلال الدین جیسے عاجز اور ضعیف نہیں ہیں۔'' [2]

بدر الدین لؤلؤ کی ہلاکو خان کے دربار میں حاضری:

بدر الدین لؤلؤ حاکمِ موصل نے اپنے بیٹے الصالح اسماعیل کو مبارک باد دینے بھیجا مگر ہلاکو خان نے اس کی خوب تذلیل کی اور کہا: ''تم لوگ ہماری فتح کے بارے میں شک کا شکار تھے۔ تم کبھی ہماری طرف قدم بڑھاتے اور کبھی پیچھے ہٹتے تھے اور دیکھنا چاہتے تھے کہ فتح کس کو نصیب ہوتی ہے۔ اگر خلیفہ کو فتح ہوتی تو تم آج اسے مبارک باد دینے آتے۔ اپنے باپ سے کہہ دینا کہ ہمیں اس کے راہِ حق سے ہٹنے اور یقین کی جگہ ظن کو اختیار کرنے پر سخت تعجب ہے۔''

بیٹے نے آکر یہ پیغام سنایا تو باپ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، موت آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی۔ آخر ہلاکو خان کو منانے کے لیے اس نے موصل کے خزانے کے تمام ہیرے جواہرات اور سیم وزر کے ذخائر نکلوائے۔ امرائے شہر سے بھی جبراً بہت کچھ وصول کیا۔ اپنی بیگمات اور اولاد کے زیورات تک اتروا لیے۔ [3]

اگرچہ اس انتہائی بوڑھے شخص کے لیے سفر کرنا مشکل تھا، پھر بھی وہ ایک بیل گاڑی پر موصل سے نکل پڑا۔ ۲۹ رجب ۶۵۶ھ کو وہ مراغہ کے نواح میں ہلاکو خان کی لشکر گاہ میں پہنچا۔ [4]

---

① جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ دوئم: ص ۳۰۱، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

② جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ دوئم: ص ۳۰۱، ۳۰۲

سلطان جلال الدین پر یہ طعن وتشنیع مبالغے اور تعصب سے بھرپور ہے۔ درحقیقت سلطان جلال الدین نے حتی الامکان اپنی سلطنت میں عدل وانصاف کا برتاؤ کیا تھا۔ اگر بعض مواقع پر سلطان یا اس کی فوج سے کچھ زیادتیاں ہوئیں بھی تھیں تو وہ ہلاکو خان کے مظالم کے سامنے کچھ بھی نہ تھیں۔ پس کسی مسلمان کے لیے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ سلطان جلال الدین بلکہ کسی بھی مسلمان حکمران پر ہلاکو خان جیسے بدترین کافر کو ترجیح دے۔

③ تاریخ مختصر الدول لابن العبری، ص ۱۷۷، ط دار الشرق

④ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۰۰، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

جب اس نے موصل کے تمام زروجواہر ہلاکو کی خدمت میں پیش کیے تو اس ظالم کا موڈ درست ہوا۔اس نے بدر الدین لولو کی عزت افزائی کی اور تخت پر ساتھ بٹھایا۔ بدرالدین نے اپنے خزانے کے سب سے قیمتی موتی اپنے ہاتھوں سے ہلاکو خان کے کانوں میں پہنائے اور جان بچا کر بظاہر خوش وخرم واپس موصل پہنچا مگر درحقیقت ہلاکو خان کا رُعب اس پر پہلے سے کہیں زیادہ طاری ہو چکا تھا۔[1]

❁❁❁

آخری خلیفہ کے اہل وعیال کی سرگزشت

مستعصم کے قتل کے بعد اس کے اہل وعیال کا کیا ہوا؟ اس بارے میں یہ گزر چکا ہے کہ اس کے تین بیٹے: ابوبکر، احمد اور عبدالرحمن اس کے ساتھ ہی قتل کر دیے گئے تھے۔ جبکہ بعض اہلِ خانہ قیدی بنا لیے گئے تھے۔ ان میں سے جن کے احوال ہمیں دستیاب ہو سکے ہیں، وہ پیشِ خدمت ہیں۔

مستعصم کی ہاشمی اہلیہ اور اس کی غیرت وذہانت:

مستعصم کی ایک ہاشمی بیوی ہلاکو خان کی قید میں تھی۔ ہلاکو خان چاہتا تھا کہ خلیفہ کی ملکہ کو اپنے بستر کی زینت بنائے۔ اس ہاشمی غیرت مند خاتون نے اس رسوائی سے بچنے کے لیے اس بدبخت کو انواع واقسام کے عمدہ ونفیس تحائف بھیجے اور اس غلیظ ارادے سے باز رہنے کی درخواست کی مگر وہ نہ مانا اور اسے زبردستی اپنے پاس طلب کیا۔

ملکہ نے اس کی ہوس سے بچنے کے لیے ایک تدبیر سوچی۔ وہ اپنی خاص باندی کو سارا منصوبہ سمجھا کر اس کے ساتھ ہلاکو کے پاس گئی۔ اسے ایک مرصع شمشیر پیش کرتے ہوئے بولی: ”یہ خلیفہ کی تلوار آپ کی نذر ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خلیفہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو اس کی ضرب کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔“

ہلاکو نے اس عجیب دعوے کی تصدیق چاہی۔ ملکہ نے باندی کو سامنے کھڑا کیا اور تلوار اس پر سونت لی۔ باندی چیخنے چلانے لگی۔ ملکہ نے کہا: ”تم تو جانتی ہو کہ یہ تلوار خلیفہ کے سوا کوئی اور استعمال کرے تو کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ اچھا! تم ڈرتی ہو تو یہ تلوار لو۔ مجھ پر وار کر کے دیکھ لو۔“

ملکہ نے پہلے ہی باندی کو سمجھا دیا تھا کہ پوری قوت سے وار کرنا۔ باندی نے تلوار چلائی اور ملکہ کا جسم دو ٹکڑے ہو گیا۔ ہلاکو خان تب سمجھا کہ یہ ملکہ کی چال تھی۔ وہ اس پاکباز عورت کی عزت سے کھیلنے کا ارمان پورا نہ کر سکا۔[2]

مستعصم کے دو بیٹے جو زندہ رہے:

مستعصم کا ایک لڑکا علی تھا جو ایک مدت تک تاتاریوں کے ہاں قید رہا۔ سقوطِ بغداد کے چھ سال بعد ایک جنگ

① تاریخ مختصر الدول لابن العبری، ص ۱۷۷

② طبقات الشافعیة الکبری للسبکی: ۸/ ۲۷۳

میں مسلمان فتح یاب ہوئے تو اسے بازیاب کرالیا گیا۔[1]

مستعصم کا ایک کم سن بیٹا مبارک قتل عام سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ اسے عام طور پر مبارک شاہ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ ہلاکو نے تاتاریوں سے اس کی پرورش کرائی اور نصیر الدین طوسی سے اسے تعلیم دلوائی۔ اس کی شادی بھی ایک تاتاری عورت سے کرائی گئی جس سے دو لڑکے ہوئے۔[2]

مستعصم کی بیٹیوں کا حال:

سقوطِ بغداد کے وقت مستعصم کی تین بیٹیاں: خدیجہ، فاطمہ اور مریم گرفتار ہوئی تھیں۔[3]

خدیجہ بنت مستعصم جو "بابِ جوہر" کے لقب سے مشہور تھی، ہلاکو کے حکم سے خاقان کے پاس منگولیا بھیج دی گئی۔ خاقان نے اسے نکاح میں رکھا۔ اس سے دو لڑکے: عبدالعزیز اور عبدالحق پیدا ہوئے مگر بالغ ہونے سے قبل فوت ہوگئے۔ تیرہ برس کی جلاوطنی کے بعد ۶۷۱ھ میں اسے بغداد واپس بھیج دیا گیا۔[4]

محرم ۶۷۶ھ میں بغداد میں اس کی وفات ہوئی، ایک خلقت جنازے میں شریک ہوئی اور سقوطِ بغداد کے واقعات یاد کر کے لوگ زار و قطار روتے رہے۔[5]

فاطمہ بنت مستعصم:

فاطمہ بنت مستعصم کو سقوطِ بغداد کے بعد قیدی بنا کر بخارا پہنچا دیا گیا تھا۔ وہاں کے مشہور صوفی بزرگ حضرت باخرزی رحمہ اللہ نے فدیہ دے کر اس مظلومہ کو آزاد کرایا اور عزت سے اپنے ہاں رکھا۔ وہیں ۶۵۸ھ میں اس کی وفات ہوئی جس میں ایک خلقت نے شرکت کی۔ کلاباذ میں اس کی تدفین ہوئی۔ بعد میں مرقد پر گنبد بنا دیا گیا۔[6]

مظلومہ کی دعا:

مستعصم کی تیسری بیٹی کو کچھ خوبرو باندیوں سمیت خاقان منگوخان کی خدمت میں منگولیا روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ عباسیوں کی آبرو کو اپنے زنان خانے کی زینت بنائے۔ آخر یہ قافلہ سمرقند پہنچا جہاں قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ یہاں پہنچ کر بنتِ مستعصم نے تاتاری پہرے داروں کے افسر کو کہا:

"میرے آباء واجداد میں سے ایک بزرگ کی قبر اس شہر میں ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس کی زیارت کرلوں۔"

افسر نے اجازت دے دی۔ بنتِ مستعصم نے جا کر روضۂ قثم بن عباس پر حاضری دی۔ سنت کے مطابق دعا کی اور

---

① البدایة والنهایة: سنة ٦٦٣ھ

② جامع التواريخ (عربی) از رشید الدین فضل الله: ج ٢، حصه اول: ص ٢٩٣، ط داراحیاء الکتب العربیة مصر

③ البدایة والنهایة: ١٧/ ٣٦١، ط دارهجر

④ تاریخ الاسلام للذهبی: ٥١/ ١٣١، ت تدمری

⑤ تاریخ الاسلام للذهبی، وفیات، سنة ٦٧٦ھ

⑥ تاریخ الاسلام للذهبی: وفیات ٦٥٨ھ، متن میں فقط شیخ باخرزی تحریر ہے مگر ظاہر یہی ہے کہ یہ شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ تھے۔

پھر دو رکعت نماز ادا کر کے بارگاہِ الٰہی میں یوں فریاد کناں ہوئی:

''الٰہ العالمین! اگر میرے دادا تم بن عباس کی تیری بارگاہ میں کوئی عزت ہے تو اس کنیز کی جان اپنی بارگاہ میں قبول کر لے اور مجھے ان نامحرموں سے نجات نصیب فرما دے۔''

یہ دُعا قبول ہوئی اور بنتِ مستعصم کی جان اسی وقت عالمِ بالا کو پرواز کر گئی۔ [1]

مستعصم کی پوتی:

مستعصم کے ولی عہد ابوالعباس احمد کی ایک بیٹی رابعہ تھی جو سقوطِ بغداد کے وقت کم سن تھی۔ بعد میں اس کا نکاح ایک رئیس ہارون بن محمد الجوینی سے ہوا، مہر ایک لاکھ دینار رکھا گیا۔ یہ لڑکی ''السیدة النبویۃ'' کے لقب سے مشہور تھی۔ اس نے عزت اور عافیت سے زندگی گزاری اور جمادی الاولیٰ ۶۸۵ھ میں وفات پائی اور اپنی والدہ کے پاس دفن ہوئی۔ [2]

بشارتیں:

گریہ وزاری کے اس ماحول میں غیب سے ایسے اشارے مل رہے تھے کہ صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ مصر میں بغداد کی تباہی کی یہ خبر پہنچی تو ایک صاحب دل کی حالت غیر ہوگئی۔ سوچنے لگے کہ ایسا کیسے ہوا۔ اللہ نے ایسا کیوں ہونے دیا۔ سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھا کوئی کہہ رہا ہے:

''اللہ پر اعتراض مت کر۔ وہ جو کرتا ہے اس کی وجہ خوب جانتا ہے۔''

وہ صاحب بیدار ہوئے تو استغفار کرنے لگے۔ [3]

آثار ومبشرات بتا رہے تھے کہ اللہ کی رحمت کسی اور شکل میں نمودار ہونے کو ہے اور نصرتِ الٰہیہ عن قریب مسلمانوں کے شاملِ حال ہونے والی ہے۔

---

① طبقاتِ ناصری: ۱۹۹،۱۹۸/۲۔
اگرچہ روایت میں اس لڑکی کا نام مذکور نہیں مگر قرائن سے واضح ہے کہ یہ لڑکی مریم بنت مستعصم تھی کیوں کہ قیدی بنائی جانے والی تیسری لڑکی وہی تھی۔

② تاریخ الاسلام للذہبی، وفیات سنۃ ۶۸۵ھ

③ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی: ۸/ ۲۷۳، ۲۷۴، ط ہجر

چھٹا باب

اسلام کے نئے محافظ
مصر کے مملوک سلاطین

۶۴۸ تا ۹۲۳ ہجری

۱۲۵۰ تا ۱۵۱۷ءعیسوی

ممالیک کا ظہور

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں بغداد کی تباہی کے وقت عالم اسلام فنا و بقا کی کش مکش سے گزر رہا تھا۔ کافر و مشرک تاتاری چین کی آخری حدود سے لے کر شام کی سرحدوں تک ایک ناقابلِ تسخیر مملکت قائم کر چکے تھے۔ اِدھر مغرب میں صلیبی بھی ہمت نہیں ہارے تھے اور صلیبی جنگوں کے سات ناکام تجربات کے باوجود وہ عالم اسلام کو زیرِ دام لانے کے بارے میں نہ صرف پر امید تھے بلکہ تاتاریوں کے ہاتھوں عالم اسلام کے تہ و بالا ہونے سے انہیں مسلمانوں کو پوری طرح مسخر کرنے کے نئے راستے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے تاتاریوں کے سیاسی مراکز تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ ان کی خواتین جو خاقان سمیت کئی تاتاری شہزادوں کے حرم کی زینت تھیں، عیسائیت کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کے استیصال کے لیے اذہان ہموار کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس دوران اللہ کی قدرتِ کاملہ و حکمتِ بالغہ نے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے مصر کے مملوک سلاطین کو کھڑا کر دیا جنہوں نے تقریباً نصف صدی تک ایک طرف تاتاریوں اور دوسری طرف صلیبیوں سے پنجہ آزمائی کی اور عالم اسلام کے بارے میں ان کے مکروہ عزائم پر پانی پھیر دیا۔

یہ اللہ کی عجیب قدرت تھی کہ ایسے وقت میں جبکہ اسلام بے آسرا اور مسلمان بے سہارا ہو چکے تھے، اللہ نے دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں کو ایسے کمزور اور غیر معروف بندوں کے ہاتھوں نیچا دکھایا جو غلام تھے اور منڈیوں میں بکتے بکاتے تختِ شاہی تک پہنچے تھے۔ اسی لیے مصر کے ان سلاطین کو مملوک کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے "غلام"

تقریباً اسی وقت میں مملوکوں کی ایک اور نسل اسی طرح ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت کر رہی تھی جو "خاندانِ غلاماں" کے نام سے تاریخ برصغیر میں جانی پہچانی جاتی ہے۔

گزشتہ تمام حکمران خانوادوں کے برعکس ہم مملوکوں کے ہاں اصولِ وراثت کو بہت کمزور دیکھتے ہیں جو دیگر شاہی خاندانوں میں حکومت سازی کا سب سے طاقتور اصول تھا۔ مملوکوں نے اس اصول کو بدل کر "سب سے قابل اور سب سے طاقت ور" کا اصول اپنایا اور یوں عالم اسلام کی قیادت و حفاظت کے لیے بہترین رجال کار فراہم کیے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مصر کے مملوکوں کے پہلے پانچوں حکمران: شجرۃ الدر، عز الدین ترکمانی (الملک المعز) سیف الدین قطز (الملک المظفر) رکن الدین بیبرس (الملک الظاہر) اور سیف الدین قلاوون بالکل الگ الگ قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر ان میں کوئی بات مشترک تھی تو صرف یہ کہ یہ سب آزاد کردہ غلام اور مسلمان تھے۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے مملوک سلاطین کا تعارف بڑی تفصیل سے کرایا ہے۔ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''ان ہولناک حوادث کے بعد اللہ نے مہربانی فرماتے ہوئے مسلمانوں کی شیرازہ بندی، ان کے نظام کے دفاع اور ان کی سرحدوں کی حفاظت کا یہ انتظام فرمایا کہ اس نے مصر میں ترک قبائل کے ایسے بہادر رہنما پیدا کردیے جو دارالحرب سے دارالاسلام میں غلاموں کی صورت میں لائے جاتے تھے۔ بُردہ فروش سوداگران کم سن غلاموں کو مصری حکمرانوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ مصری حکمران انہیں مہنگے داموں خرید لیتے تاکہ ان کے ذریعے اپنی طاقت وشان وشوکت بڑھائیں۔ قومی غیرت کے باعث وہ ایسے غلاموں کا انتخاب کرتے تھے جن میں ایمانی قوت، قومی بہادری اور جرأت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ وہ شاہی محلات میں ان غلاموں کی ایسی پرورش کرتے کہ وہ مخلص افراد بن کر نکلیں۔ ان کی تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ دی جاتی۔ انہیں قرآن مجید کی تعلیم سے آراستہ کیا جاتا۔ وہ جوان ہوتے تو انہیں تیر اندازی، گھڑ سواری، تیغ زنی اور دوسرے سپاہیانہ فنون سکھائے جاتے۔ یہاں تک کہ وہ مضبوط اور طاقتور بن جاتے اور اپنے آقاؤں کی حفاظت کرنے اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کے قابل ہوجاتے۔ جب یہ غلام اس مقام پر پہنچ جاتے تو سلاطین ان کی تنخواہیں دوگنی کردیتے اور انہیں جاگیریں عنایت کرتے۔ پھر انہیں سلطنت کے اعلیٰ مناصب پر ترقی دی جاتی۔ اس قسم کے غلاموں کی بھرتی کا آغاز سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے سے ہوا، اور یہ سلسلہ برابر بڑھتا گیا۔

ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے ہاتھوں عالم اسلام کا مشرقی حصہ خاص کر ترکستان بالکل ویران ہوچکا تھا۔ تاتاریوں نے ترک قبائل کی اکثریت کو قتل اور باقی کو قیدی بنالیا تھا۔ قیدی ترک بچے اکثر فروخت کردیے جاتے اور ان کی بڑی تعداد مصر کے بازاروں میں پہنچ جاتی تھی۔ ایوبیوں کے آخری حکمران الملک الصالح نجم الدین ایوب نے اپنی فوج کو مضبوط کرنے کے لیے ایسے غلاموں کی بھرتی پر خاص توجہ دی جن میں ترکوں کی مختلف نسلیں یعنی ارمن، ترکمان اور خوارزمی شامل تھے۔ متنوع خدمات اور آقاؤں کی طرف نسبت کے لحاظ سے ان غلاموں کے کئی گروہ تھے، الملک العزیز عثمان کی طرف منسوب گروہ العزیزیہ کہلاتا تھا۔ الملک الصالح نجم الدین ایوب کی طرف منسوب گروہ صالحیہ کہلاتا تھا۔ انہی میں سے ایک گروہ ''ممالیکِ بحریہ'' کہلاتا تھا کیوں کہ یہ لوگ دریائے نیل کی دوشاخوں کے درمیان واقع قلعوں کی حفاظت پر تعینات تھے اور مملکت کو بحری حملوں سے بچانا ان کے ذمے تھا۔ ان ممالیک کے افسران میں عزالدین ترکمانی، چاشنگیر ترکمانی، رکن الدین بیبرس اور فارس الدین اقطائی نمایاں تھے۔''[1]

❁❁❁

---

[1] تاریخ ابن خلدون: ۵ / ۳۲۶ تا ۳۳۰، ط دار الفکر

یاد رہے کہ یہ علامہ ابن خلدون کی عبارت کا لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ان کے کلام کا خلاصہ ہے۔

ملکہ شجرۃ الدر

۶۴۸ھ (۱۲۵۰ء)

ہم پڑھ چکے ہیں کہ الملک الصالح ایوب کے بعد ایوبی خاندان کے آخری حکمران الملک المعظم توران شاہ کو صرف دو مہینے اقتدار کا موقع ملا تھا۔ اس کے بعد اس کی زیادتیوں سے دل برداشتہ ہو کر فوجی جرنیلوں نے اسے قتل کر دیا تھا۔ یہ فوجی جرنیل ممالیکِ بحریہ کے افسران عزالدین ترکمانی، فارس اقطائی اور بیبرس تھے۔ اس اقدام کے بعد ان کا رعب داب ہر طرف چھا گیا تھا اور انہیں مصر میں بادشاہ گر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

انہوں نے ایوبی خاندان کی علامت کو باقی رکھتے ہوئے الصالح ایوب کی بیگم ملکہ شجرۃ الدر کو حکمران بنادیا جو ایوبی حکرانوں اور ممالیک کی حکومت کی درمیانی کڑی تھی، کیوں کہ ایک طرف وہ ایک ایوبی حکمران الملک الصالح کی زوجہ تھی تو دوسری طرف ممالیک کی طرح خود بھی زرخرید تھی۔ ایک سابق کنیز کی حکمرانی کے بعد قابلیت اور اہلیت کے معیار پر پورا اترنے والے آزاد کردہ غلاموں کی تخت نشینی کی راہ بالکل ہموار ہوگئی تھی۔ اس لحاظ سے شجرۃ الدر کی حکومت ممالیک کی عظیم الشان عمارت کی پہلی اینٹ تھی۔

شجرۃ الدر محرم ۶۴۸ھ میں تخت نشین ہوئی تھی مگر وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکی۔ ایک عورت کی حکمرانی پر شرعی و فقہی زاویۂ نگاہ سے اعتراضات ہونے لگے، جنہیں دیکھتے ہوئے آخر تین ماہ بعد شجرۃ الدر کو معزول کر دیا گیا۔ اس کی جگہ ممالیکِ بحریہ نے اپنے سب سے تجربہ کار افسر عزالدین ترکمانی کو مصر کا بادشاہ مقرر کر دیا۔[1]

❁❁❁

پہلا مملوک سلطان۔ الملک المعز عزالدین ترکمانی

۶۴۸ھ تا ۶۵۵ھ (۱۲۵۰ء تا ۱۲۵۷ء)

عزالدین ایبک ترکمانی ربیع الآخر ۶۴۸ھ میں پہلے مملوک سلطان کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔ اس نے الملک المعز کا لقب اختیار کر کے مصر کا اقتدار سنبھال لیا۔ یہ مملوکوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز تھا۔ عزالدین ترکمانی مے نوشی اور موسیقی سمیت تمام منکرات سے بچنے والا ایک دیندار، صالح اور عادل حکمران تھا۔ اس نے مصر میں ایک بڑا دینی مدرسہ بھی قائم کیا اور چند سال تک بڑے حسنِ انتظام کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اس نے اپنے نو سالہ دورِ اقتدار میں مصر کو شام کے ایوبی امراء اور ان کے حلیفوں کی چیرہ دستیوں سے بخوبی بچائے رکھا۔ شام میں صلاح الدین ایوبی کے پڑپوتے الملک الناصر کی حکومت تھی۔ ۶۴۹ھ میں اس نے مصر پر چڑھائی کی مگر ترکمانی نے اسے آگے نہ بڑھنے دیا۔[2]

[1] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۶۴۸ھ؛ شذرات الذھب: ۵/ص ۲۶۷ [2] تاریخ الاسلام للذھبی: سنۃ ۶۵۵ھ

ممالیکِ بحریہ اور ممالیکِ معزیہ:

الملک المعز ترکمانی نے اپنے خاص آزاد کردہ غلاموں کو اپنا مقرب بنایا اور انہیں بڑے بڑے عہدے دیے۔ ممالیک کا یہ گروہ "ممالیکِ معزیہ" کہلانے لگا جس میں سیف الدین قطز کی حیثیت سب سے نمایاں تھی۔ ممالیکِ بحریہ کے دیگر بڑے افسران جن کے اتفاق سے ترکمانی کو حکومت ملی تھی اور وہ اس سے قبل ترکمانی کے ہم پلہ یا قریب المرتبہ تھے، اس صورتحال سے ناخوش ہوئے اور ان کی باہمی عصبیت مضبوط تر ہوتی گئی۔ ان افسران میں فارس الدین اقطائی اور رُکن الدین بیبرس سب سے نمایاں تھے۔

فارس الدین اقطائی کو ممالیکِ بحریہ کے سردار کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی وہ خود کو "بادشاہ" یا "بادشاہ گر" سمجھنے لگا تھا۔ اس کی آمد و رفت شاہانہ انداز میں ہوتی تھی۔ اس کے حاشیہ بردار اسے "الملک الجواد" کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

عز الدین ترکمانی اس صورتحال کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خدشات اس وقت مزید بڑھ گئے جب اقطائی نے "حماۃ" کے ایوبی حاکم الملک المنصور کی بہن سے نکاح کر لیا اور ترکمانی سے کہا کہ وہ اس شہزادی کو قلعۃ الجبل کے شاہی محل میں رہائش کی اجازت دے کیوں کہ وہ ایوبی خاندان کی شہزادی ہے اور قاہرہ کی عام آبادی میں اس کی رہائش اس کی شان کے خلاف ہوگی۔

ترکمانی نے سوچا کہ شہزادی سے شادی کر کے اقطائی کی حیثیت مزید بڑھ جائے گی اور اگر وہ ایک بار شہزادی کو شاہی محل میں لے آیا تو پھر اس جوڑے کو محل سے بے دخل کرنا بہت ہی مشکل ہوگا۔ مگر وہ اقطائی کو صاف صاف منع کر کے اس سے کھلی دشمنی بھی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اقطائی کو قتل کرنے کی تیاری کر لی۔

ایک دن جب فارس الدین اقطائی حسبِ معمول قلعۃ الجبل کے قصرِ شاہی میں آیا تو سیف الدین قطز سمیت متعدد ممالیکِ معزیہ گھات میں تھے۔ انہوں نے حملہ کر کے اقطائی کو مار ڈالا۔ یہ واقعہ ۶۵۲ھ کا ہے۔ [①]

اقطائی کے قتل نے ممالیکِ معزیہ اور ممالیکِ بحریہ کے مابین شدید تلخیاں پیدا کر دیں، ممالیکِ بحریہ کے کئی اعلیٰ افسران جن میں بیبرس بندقداری اور سیف الدین بلبان نمایاں تھے، اس واقعے کے فوراً بعد اپنی جان بچانے کے لیے قاہرہ سے فرار ہو کر شام چلے گئے اور الملک الناصر کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ [②]

وقتی طور پر مصر میں ترکمانی کو مکمل اقتدار حاصل ہو گیا اور اس کے قدم پوری طرح جم گئے۔ کچھ مدت بعد ۶۵۳ھ میں اس نے سابق ملکہ شجرۃ الدُّر سے شادی کر کے مزید سیاسی استحکام حاصل کرنے کی کوشش کی۔ [③] دراصل ممالیک کے تمام گروہ شجرۃ الدُّر کو اپنے آقائے ولی نعمت الملک الصالح ایوب مرحوم کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے بڑی عزت دیتے آئے تھے۔ ترکمانی نے اس سے شادی کر کے اس کی سیاسی حیثیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

---

① ذیل مرآۃ الزمان: ۱/ ۵۷، ۵۸. ط دار الکتاب قاهره ؛ مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان للیافعي: ۳/ ۹۹، ط العلمیة

② العبر فی خبر من غبر: ۳/ ۲٦۸، ط العلمیة ③ ذیل مرآۃ الزمان: ۱/ ۵۷، ط دار الکتاب قاهره

مگر شجرۃ الدر سے نکاح اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوا۔ شجرۃ الدُّر نہایت تیز طبع عورت تھی۔ اس نے امورِ حکومت میں دھیرے دھیرے دخل دیتے دیتے ان پر تسلط حاصل کر لیا اور ترکمانی اس کی منشأ کے بغیر کوئی اقدام کرنے سے قاصر ہو گیا۔ ①

ترکمانی کا قتل۔ شجرۃ الدر کا افسوس ناک انجام:

ربیع الاوّل ۶۵۵ھ میں الملک المعز عزالدین ملکہ شجرۃ الدر کی سازش کا شکار ہو کر قتل ہو گیا۔ وجہ یہ بنی کہ وہ حاکمِ موصل بدرالدین لؤلؤ کی لڑکی سے رشتہ کرنا چاہتا تھا۔ شجرۃ الدر کو معلوم ہوا تو بھڑک اٹھی اور اپنے کچھ خدام کو اس کے قتل پر آمادہ کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی سوچ لیا کہ وہ عزالدین کو قتل کرانے کے بعد شام کے حاکم الملک الناصر سے نکاح کر لے گی اور یوں شام و مصر کی ریاستیں یکجا ہو جائیں گی۔ اس نے الملک الناصر کو یہ پیغام بھیج بھی دیا۔ مگر الملک الناصر شجرۃ الدر کی ہوشیاری سے خوفزدہ ہو گیا اور اس نے یہ سمجھ کر کہ اس پیغام کے پیچھے کوئی دھوکہ ہے، اس پیغام کا کوئی جواب نہ دیا۔ کسی نہ کسی ذریعے سے یہ خبر موصل کے حاکم بدرالدین لؤلؤ تک بھی جا پہنچی۔ اس نے عزالدین ترکمانی کو پیغام بھیج کر خبردار کیا کہ شجرۃ الدر تمہیں مروا کر الملک الناصر سے شادی کی خواہش مند ہے۔ عزالدین نے اپنی شرافت کے باعث اس کے باوجود شجرۃ الدر پر ہاتھ نہ ڈالا۔ البتہ وہ اس سے کبیدہ خاطر ضرور ہو گیا۔ دونوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ اس کے باوجود ترکمانی کو یہ گمان نہ تھا کہ اس کی بیوی اسے قتل کرا دے گی۔

۱۴ ربیع الاوّل کی شام الملک المعز قلعے میں آیا اور غسل کے لیے حمام میں داخل ہوا تو منصوبے کے مطابق شجرۃ الدر کے غلاموں نے جو ایک گوشے میں چھپے ہوئے تھے، حمام کا دروازہ مقفل کر کے اس پر حملہ کر دیا اور اس کا گلا گھونٹنے لگے۔ عزالدین کچھ سمجھ نہ پایا۔ اس نے چیخ و پکار کی اور شجرۃ الدر کو آوازیں دیں۔ شوہر کو اس حال میں دیکھ کر شجرۃ الدر کو بھی رحم آ گیا۔ غلاموں سے کہنے لگی: ''اسے چھوڑ دو۔'' وہ بولے: ''اسے چھوڑ دیا تو یہ نہ ہمیں چھوڑے گا نہ آپ کو۔''

آخر عزالدین تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ شجرۃ الدر نے اس کی ایک انگلی کاٹ کر اسی شب ایک امیر ایک حلبی کبیر کو بھیجی اور ساتھ ہی پیغام دیا کہ تخت پر قبضہ کر لو۔ مگر اسے اس اقدام کی جرأت نہ ہوئی۔ صبح تک یہ خبر پھیل گئی اور مقتول سلطان کے ممالیک مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے شجرۃ الدر کو محل میں نظر بند کر دیا۔ جب ملکہ کو یقین ہو گیا کہ بازی ہاتھ سے نکل چکی ہے تو اس نے اپنے تمام ہیرے جواہرات ہاون دستے میں کوٹ کر برباد کر ڈالے۔

۱۹ ربیع الاوّل ۶۵۵ھ کو ممالیک نے کچھ باندیوں کو اس کے قتل پر مامور کیا جنہوں نے فوجی جوتوں سے ضربیں لگا لگا کر مصر کی سابق ملکہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی بے لباس نعش قلعے سے نیچے خندق میں پھینک دی گئی جسے گلنے سڑنے کے بعد کچھ لوگوں نے دفن کیا۔ ②

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۴۹۳، ط العلمية

② السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۶۵۵ھ

مملوک حکمرانوں میں عزالدین ترکمانی کی حیثیت صرف اس وجہ سے یادگار ہے کہ وہ اس نئے نظامِ سلطنت کا بانی تھا۔ اس کے علاوہ عزالدین ترکمانی کا اور کوئی خاص کارنامہ نہیں۔ چونکہ وہ خود بھی ان ترک مہاجرین میں سے تھا جنہیں الملک الصالح نے پناہ دے کر اپنا خدمت گار بنالیا تھا، اس لیے اس کے دورِ اقتدار میں ترک غلاموں کی خوب پذیرائی ہوئی۔ انہی ترکوں میں اس کا چہیتا نائب محمود قطز تھا جس نے مملوکوں کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے روشن کردیا۔

❁❁❁

الملک المنصور نورالدین علی

ربیع الاول ۶۵۵ھ تا ذوالقعدہ ۶۵۷ھ (اپریل ۱۲۵۷ء تا نومبر ۱۲۵۹ء)

ممالیک نے عزالدین ترکمانی کی موت کے بعد بلا تاخیر اس کے نابالغ بیٹے نورالدین علی کو ''الملک المنصور'' کے لقب کے ساتھ تخت پر بٹھادیا تھا تاکہ مزید سیاسی انتشار نہ پھیلے۔ یہ محض علامتی حکمران تھا اور تمام اختیارات ممالیک امراء کے ہاتھوں میں تھے جن میں نورالدین علی کا اتابک سیف الدین قطز سب سے نمایاں تھا۔ [1]

سقوطِ بغداد کے بعد شام میں تاتاری لشکر کی غارت گری:

مصر میں یہ اکھاڑ پچھاڑ جاری تھی اور اُدھر تاتاری مدینۃ الاسلام بغداد پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آخر محرم ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد ملیامیٹ ہوگیا اور عالمِ اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ساڑھے چھ صدیوں میں پہلی بار ایسا سال آیا کہ مسلمانوں کا کوئی خلیفہ نہ تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ۶۵۷ھ کے احوال کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''یہ سال جمعرات کے روز اس حال میں شروع ہوا کہ مسلمانوں کا کوئی خلیفہ نہ تھا۔'' [2]

دمشق اور حلب پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے پڑپوتے الملک الناصر کی حکومت تھی۔ الجزیرہ کے بعد شام اور مصر کے مسلمانوں کو اپنے انجام کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی، مگر صد افسوس کہ حکمران طبقہ اس وقت بھی باہمی محاذ آرائی میں مصروف تھا۔ الملک الناصر مصر پر حملہ کر کے مملوکوں کی نوخیز مملکت کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مملوکوں کا ایک مضبوط رئیس رکن الدین بیبرس کچھ مدت پہلے مصر چھوڑ کر اس سے آملا تھا جو مصر کی موجودہ حکومت کا مخالف تھا۔ اس کے باعث الملک الناصر کی کمر مضبوط ہوگئی اور وہ مصر پر قابض ہوجانے کی امید کرنے لگا۔ تاہم اسی دوران ہلاکو خان کا خطرہ سر پر آگیا اور الملک الناصر کو سہانے سپنوں سے باہر آنے پر حقیقت کی دنیا اس قدر بھیانک دکھائی دی کہ اس کی قوتِ فیصلہ جواب دے گئی۔ اب نہ وہ مصر پر قبضے کے قابل تھا اور نہ ہی اس میں تاتاریوں سے مقابلے کی ہمت تھی۔ [3]

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۶۵۵ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۸۶/۱۷

② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۷ھ

③ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۲۰۳ تا ۲۰۵؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۸ھ

ہلاکو خان نے اسے اپنے ہاں حاضر ہونے کا حکم نامہ بھیجا۔ الملک الناصر خلیفہ مستعصم کا حال دیکھنے کے بعد تاتاریوں پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا اس لیے خود جانا ہلاکت کے مترادف تھا، تاہم اس میں ہلاکو سے لڑنے کی ہمت بھی نہیں تھی، لہٰذا اسے مطمئن کرنے کے لیے اپنے کم سن بیٹے کو بیش قیمت تحائف کے ساتھ ہلاکو کے پاس بھیج دیا۔ ہلاکو نے تحائف کو کوئی اہمیت نہ دی اور الملک الناصر کے نہ آنے پر سخت برہم ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ اب وہ خود الملک الناصر کے ملک پر حملہ کرے گا۔ ①

اس نے الملک الناصر کو درج ذیل دھمکی آمیز مراسلہ بھیجا:

''الملک الناصر کو معلوم ہو کہ ہم نے خدا کی تلوار سے بغداد کو فتح کیا ہے، اس کے گھڑسوار قتل کیے، اس کی عمارتیں مسمار کر دیں اور اس کے رہائشی قیدی بنا لیے۔ ہم نے وہاں کے خلیفہ کو بلا کر پوچھ گچھ کی تو اس نے جھوٹ بولا جس کی بناء پر وہ قتل کا مستحق ہو گیا۔ اس نے بے شمار جواہر جمع کیے تھے مگر وہ بخیل تھا، مال جمع کیا مگر رجال تیار نہ کیے۔ پس تم یہ مراسلہ پڑھتے ہی شہنشاہِ روئے زمین کی خدمت میں اپنے آدمیوں اور خزانوں سمیت حاضری دو۔ ہمارے سفیروں کو اس طرح مت روک کر رکھنا جیسا کہ پہلے روک کر رکھا تھا۔ یا اچھی طرح نباہ کر دو یا تعلق ختم کر دو۔

ہمیں معلوم ہوا کہ شام کے تاجر اپنے اموال کے ساتھ نقل مکانی کر رہے ہیں۔ اگر وہ ہمیں پہاڑوں میں ملے تو انہیں پیس دیں گے، اگر ہموار زمین پر پائے گئے تو انہیں دھنسا دیں گے۔ بچنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔'' ②

الجزیرۃ پر ہلاکو خان کا حملہ:

۶۵۷ھ کے آغاز میں ہلاکو خان الجزیرہ اور شام پر یلغار کے لیے تیاریاں تھا۔ اس نے مفتوحہ علاقوں کے امراء سے کمک منگوانا شروع کی اور کئی سمتوں میں یلغار کا نقشہ طے کر لیا۔ اس نے سفیر بھیج کر حاکمِ موصل بدرالدین لؤلؤ کو کہلوایا: ''چونکہ تمہاری عمر ۹۰ سال سے زیادہ ہو چکی ہے، اس لیے ہم تمہیں اپنے ساتھ چلنے کی زحمت نہیں دیتے مگر اپنے بیٹے الملک الصالح کو جنگی پرچموں کے ساتھ شام اور مصر کی فتح کے لیے بھیج دو۔''

الملک الصالح اس حکم کے مطابق فوج لے کر ہلاکو خان کے پاس حاضر ہو گیا۔ ہلاکو خان اتنا خوش ہوا کہ اس نے سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی بیٹی جو اس کے ہاں رہائش پذیر تھی، الصالح کے نکاح میں دے دی۔ ③

آخر ۶۵۷ھ کے آغاز میں لشکرِ تاتار عراق اور الجزیرہ کے مختلف شہروں کو فتح کرنے نکل پڑا۔ تاتاری لشکر پہلے خلاط اور کردستان کے علاقے میں پہنچا اور وہاں جو بھی ملا، اسے موت کی نیند سلا دیا۔ ④

---

① البدایة والنهایة: سنة ۶۵۷ھ ② السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۰۶، العلمیة

③ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۳۰۵، ط دار احیاء الکتب العربیة مصر

سلطان جلال الدین کی اس لڑکی کا نام ترکان خاتون تھا۔ سلطان کی شہادت کے وقت وہ دو سال کی تھی۔ تاتاریوں نے اسے منگو خان کے پاس قراقرم بھیج دیا جہاں وہ پلی بڑھی۔ جب ہلاکو خان کو قراقرم سے وسطِ ایشیا بھیجا گیا تو یہ لڑکی بھی اس کے ساتھ روانہ کر دی گئی۔ (تاریخ جہان کشا جوینی، ۵۳۵، ۵۳۶، ط ھرمس)

④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۳۰۶

سقوطِ اربیل:

اربیل کا قلعہ ایشیا میں بے مثال سمجھا جاتا تھا جہاں جنگجو کُردوں کی فوج موجود تھی۔ تاتاری سردار ''ارقیونویان'' کو یہاں دانتوں پسینہ آگیا۔ آخر بدرالدین لؤلؤ سے مشورہ کیا گیا۔ اس نے موسم گرما تک انتظار کا کہا کیوں کہ کُرد گرمی سے گھبراتے ہیں۔ لؤلؤ کے مکروفریب اور جنگی تدابیر کی بدولت چھ ماہ کے محاصرے کے بعد یہ قلعہ فتح کرلیا گیا۔ [1]

میافارقین کا محاذ

اس سے دو ماہ پہلے تاتاریوں کی ایک فوج ایلکا نویان اور ہلاکو خان کے بیٹے اشموط کی کمان میں میافارقین کی فصیلوں کے سامنے پہنچ چکی تھی جو ایوبی خاندان کا مضبوط مرکز تھا۔ [2] یہاں الملک العادل کے دلیر پوتے محمد الکامل کی حکومت تھی جو بڑا شریف، عادل، غیور اور شجاع حاکم تھا۔ [3] اس کے زہد وعبادت اور پرہیزگاری کا یہ حال تھا کہ بیت المال سے کچھ نہیں لیتا تھا بلکہ خود کھڈی پر کپڑا بُنتا اور اسے فروخت کر کے گزر بسر کرتا تھا۔ [4]

وہ چند سال پہلے مصلحتاً تاتاریوں کی بالادستی قبول کر چکا تھا اور منگولیا جا کر خاقان منگو خان سے خصوصی رعایت کا پروانہ لے چکا تھا۔ مگر جب ہلاکو خان نے ۶۵۵ھ کے اواخر میں بغداد کا رُخ کیا تھا تو محمد الکامل نے خطرہ سر پر محسوس کرتے ہوئے دمشق جا کر الملک الناصر کو کہا تھا: ''وقت کا تقاضا ہے کہ ہم ایک لشکرِ جرار لے کر خلیفہ کی مدد کے لیے جائیں۔'' الملک الناصر نے اس وقت الکامل کی بڑی تعظیم وتوقیر کی اور مدد کا وعدہ بھی کیا [5] مگر اسے عمل کی توفیق نہ ہوئی جس کے نتیجے میں آج لشکرِ تاتار شام کی سرحدوں کے قریب آچکا تھا۔ اس حملے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ محمد الکامل نے اپنی پوری ریاست میں شراب پر کڑی پابندی عائد کر رکھی تھی جس کے باعث بعض شرابی افسران سخت ناراض تھے اور اسی عناد کے باعث وہ تاتاریوں کو میافارقین پر حملے کی ترغیب دیتے آرہے تھے۔ [6]

محمد الکامل اپنی ریاست کے شہر ''آمد'' میں تھا کہ اسے تاتاریوں کے میافارقین کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملی۔ وہ اپنے دستوں کو لے کر انہیں روکنے نکلا مگر قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دشمن کی تعداد اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔

---

① جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۸، ۲۹۹؛ تاریخ ابن خلدون: ۵/۳۲۲، ط دار الفکر

② جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۳۱۹؛ ذیل مرآۃ الزمان: ۱/۹۱، ط دار الکتاب الاسلامی قاھرہ
جامع التواریخ وغیرہ میں الجزیرہ پر ہلاکو کی افواج کی یلغار کا آغاز ۶۵۷ھ میں بتایا گیا ہے مگر معاصر مؤرخ اور چشم دید گواہ ابن شداد کے مطابق میافارقین کا محاصرہ ۱۲ ذوالقعدہ ۶۵۶ھ کو شروع ہوا تھا۔ (الاعلاق الخطیرۃ لابن شداد، ص ۱۸۸، ط الشاملۃ) جبکہ حاکم میافارقین کا کٹا ہوا سر جمادی الاولی ۶۵۸ھ میں دمشق بھیجا گیا تھا۔ یوں مدت محاصرہ ڈیڑھ سال بنتی ہے جسے بعض شعراء نے بطور مجاز دو سال سے بھی تعبیر کر دیا۔ (ذیل مرآۃ الزمان: ۱/۳۵۹) حافظ ذہبی اس مدت کو تقریباً بیس ماہ شمار کرتے ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۲۰۱) ان کے قول کے لحاظ سے محاصرۂ میافارقین کا آغاز شعبان ۶۵۶ھ میں بنتا ہے۔ مگر ابن شداد کا قول راجح ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہلاکو نے بغداد کی فتح کے آٹھ ماہ بعد الجزیرہ پر فوج کشی شروع کر دی تھی، تبھی یہ فوج آغاز ذوالقعدہ میں میافارقین پہنچی تھی۔ نیز بعض قلعوں مثلاً اربیل کو بغداد کی مہم کے دوران ہی گھیر لیا گیا تھا، اگرچہ اس کی فتح بہت تاخیر سے ہوئی۔ (جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۲۹۸)

③ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۲۰۲، ط الرسالۃ ④ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۳۲۳

⑤ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۳۲۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۳ ص ۲۰۲، ط الرسالۃ، اس ملاقات کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

⑥ الاعلاق الخطیرۃ فی امراء الشام والجزیرۃ، لابن شداد، ۱۸۸، ط الشاملۃ

وہ فوراً میافارقین کی طرف پلٹا اور لشکرِ تاتار سے پہلے پہلے شہر میں داخل ہو کر مورچہ بند ہو گیا۔ [1]

اس نے اپنے امرائے لشکر کو جہاد پر ابھارا اور انہیں کہا:

"میرے پاس خزانوں میں جو بھی سونا چاندی ہے، وہ ضرورت مندوں کے لیے وقف ہے۔ الحمد للہ! میں مستعصم کی طرح درہم و دینار کا غلام نہیں جس نے اپنے بخل کی وجہ سے بغداد بھی دے دیا اور اپنا سر بھی۔"

اس کی جرأت مندانہ باتوں سے پورا شہر جان کی بازی لگانے پر تیار ہو گیا۔

اُدھر ایلکانویان اور اشموط بن ہلاکو میافارقین کی فصیلوں کے سامنے پہنچ گئے اور انہوں نے الکامل کو اطاعت کی پیش کش کی اور جان بخشی کا یقین دلایا۔ محمد الکامل نے جواب دیا:

"حکمران کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ٹھنڈے لوہے پر چوٹ لگائے یا ناممکن چیز پر یقین کرے۔ تمہارے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ میں تمہاری میٹھی باتوں سے دھوکا کھانے والا نہیں۔ مجھے لشکرِ تاتار کا کوئی خوف نہیں۔ میں مرتے دم تک لڑوں گا۔ میں ایسے شخص کے بیٹے پر کیسے اعتماد کر لوں جس نے خلیفۂ بغداد سے دھوکا کیا۔"

اگلے دن محمد الکامل برق رفتار شہ سواروں کے ایک دستے کے ساتھ یکایک شہر سے نکل کر لشکرِ تاتار پر حملہ آور ہو گیا۔ اس کے پاس دنیا کے دو چنے ہوئے شمشیر زن تھے: ایک سیف الدین لوکیلی، دوسرا عنبر حبشی۔ انہوں نے بہت سے دشمنوں کو آناً فاناً موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کچھ دیر کے دھاوے کے بعد یہ دستہ واپس شہر میں جا چھپا اور اہلِ شہر کے ساتھ مل کر فصیل کے بُرجوں سے تاتاریوں پر تیر اندازی اور سنگ باری جاری رکھی۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی ان جان بازوں نے اسی طرح باہر نکل کر تاتاریوں کو نقصان پہنچایا۔ چوتھے دن تاتاریوں نے سیف الدین لوکیلی اور عنبر حبشی کے مقابلے کے لیے گرجستان کے سب سے بڑے پہلوان "ناوری" کو بھیجا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ تنہا ایک لشکر کے برابر ہے۔ مگر کچھ دیر کے تند و تیز مقابلے کے بعد ناوری بھی مارا گیا۔

میافارقین میں ایک زبردست منجنیق تھی جس کی مار بہت دور تک تھی۔ اہلِ شہر اس کے ذریعے سنگ باری کر کے تاتاریوں کو سخت نقصانات پہنچاتے رہے۔ تاتاریوں کے لیے یہ چھوٹا سا شہر لوہے کے چنے ثابت ہونے لگا۔ [2]

تین ماہ گزر گئے مگر یہ شہر ناقابلِ تسخیر رہا۔ آخر تاتاریوں نے موصل سے ایک بہت بڑی منجنیق منگوائی۔ [3] اس کے ساتھ ایک انتہائی ماہر منجنیق انداز بھی تھا۔ اس نے یہ شاندار منجنیق موصل کی فصیل پر نصب مہیب منجنیق کی بالکل سیدھ میں نصب کرائی۔ اب دونوں منجنیقوں نے بیک وقت ایک دوسرے پر سنگ باری اور آتش باری شروع کی۔ دونوں طرف کے منجنیق انداز مہارت میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ کمال یہ تھا کہ دونوں کے پتھر ایک ساتھ فضا میں بلند ہوتے اور بیچ میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ لوگ منجنیق اندازوں کی اس مہارت پر عش عش کر رہے تھے۔ [4]

---

① الاعلاق الخطیرۃ لابن شداد، ص ۱۸۸، ط الشاملۃ

② جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۳۱۹، ۳۲۰، ط داراحیاء الکتب العربیۃ مصر

③ طبقاتِ ناصری: ۲/۲۰۲ تا ۲۰۳ ④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۳۲۰، ۳۲۱

دن بھر یہ تماشا جاری رہا مگر آخر میں میافارقین کے مجاہدین لشکرِ تاتار کی منجنیق کو نذرِ آتش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔[1] اس کے بعد محمد الکامل نے حسبِ سابق قلعے سے نکل کر تاتاریوں پر حملہ کرنے اور انہیں سخت جانی و مالی نقصان پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا۔[2] ہلاکو خان کو یہ اطلاعات ملیں تو اس نے ارتقو نامی سردار کو کمک دے کر روانہ کیا اور ساتھ ہی ایلکا نویان کو حکم بھیجا کہ شہر کا محاصرہ ثابت قدمی کے ساتھ جاری رکھا جائے یہاں تک کہ شہر میں چارہ ختم ہو جائے۔

ابھی ارتقو محاذ پر پہنچ کر ایلکا نویان کو یہ پیغام پہنچا رہا تھا کہ شہر کی فصیلوں سے عنبر حبشی اور سیف الدین نے ایسا طوفانی دھاوا بولا کہ لشکرِ تاتار میں کھلبلی مچ گئی۔ ارتقو نے یہ دیکھ کر شراب کی بوتل منہ سے لگائی اور نشے میں دُھت ہو کر میدان میں آکودا۔ ایلکا نویان بھی گھوڑے پر سوار اپنے لشکر کو لڑانے نکلا مگر عنبر حبشی اور سیف الدین تاتاریوں کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے اس تک آپہنچے، ان کے حملے میں ایلکا نویان گھوڑے سے نیچے جا گرا۔ تاتاری ہر طرف سے بھاگ کر آئے اور اسے سہارا دے کر گھوڑے پر چڑھایا۔ اس دوران عنبر حبشی اور سیف الدین مار دھاڑ کرتے ہوئے بحفاظت واپس چلے گئے۔ غرض دھاووں کا یہ معمول جاری رہا اور کافر محمدی شیروں کو نرغے میں نہ لے سکے۔[3]

میافارقین کے بچاؤ کے لیے ابن شداد کی سفارتی کوششیں:

میافارقین پر تاتاریوں کے حملے نے حاکمِ شام الملک الناصر کو بے چین کر دیا تھا۔ اس نے علامہ عز الدین ابن شداد کو سفیر بنا کر ایک وفد کے ہمراہ ہلاکو خان کے پاس روانہ کیا تاکہ میافارقین کی خلاصی کی کوئی صورت نکالی جائے۔[4] یہ وفد یکم محرم ۶۵۷ھ کو دمشق سے نکلا اور صفر میں ہلاکو خان کے پاس پہنچا۔ ابن شداد نے الملک الناصر کا مکتوب سنایا جس میں ہلاکو خان کو آمد پر مبارکباد دی گئی تھی اور ساتھ ہی الجزیرہ پر اس کے حملے اور بے گناہ شہریوں کے قتلِ عام پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا۔ مکتوب میں کہا گیا تھا کہ دولتِ ایوبیہ بیس سال سے کسی جبر و اکراہ کے بغیر اپنی خوشی اور اختیار کے ساتھ تاتاریوں سے رواداری کا تعلق قائم کیے ہوئے ہے اور اسے مسلسل بیش قیمت تحائف اور مال و دولت بھیجتی رہی ہے مگر تاتاریوں کی طرف سے اس کے جواب میں اب تک جو سلوک کیا گیا، وہ مایوس کن ہے۔

ہلاکو خان نے مکتوب سن کر وفد کو کوئی جواب نہ دیا اور مہمان خانے میں واپس بھیج دیا۔ اگلے دن اس نے وفد کو طلب کیا اور نہایت سختی کے ساتھ کہا: ''تمہاری رعایا نے ہمارے ساتھ جنگ کی ہے، لڑائی کی ابتداء انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہم نے الجزیرہ پر حملہ فقط اس لیے کیا ہے تاکہ ہم اپنے دشمن عرب اور ترکمان قبائل کو ٹھکانے لگا سکیں۔''

علامہ ابن شداد نے جواب دیا: ''جب آپ نے ہمارے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کیا تو ہم مجبوراً آپ کی اطاعت کے حلقے سے باہر نکل گئے۔''

---

① طبقاتِ ناصری: ۲/۲۰۳ ② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۷ھ۔ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۲۰۲، ط الرسالۃ

③ جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۳۲۰، ۳۲۱، ط داراحیاء الکتب العربیۃ مصر

④ یہ بہاؤ الدین ابن شداد (م ۶۳۲ھ، مؤلف: النوادر السلطانیۃ) نہیں جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے مصاحب تھے بلکہ یہ عز الدین ابن شداد (مؤلف: سیرۃ الملک الظاہر) ہیں۔ ۶۱۳ھ میں حلب میں پیدا ہوئے اور ۶۸۴ھ میں فوت ہوئے۔ یہ پہلے الملک الناصر ایوبی اور پھر رکن الدین بیبرس کے مصاحب رہے۔

یہ سن کر تاتاری افسران غضب ناک ہوگئے اور بولے: ''تم ہوہی کتنے آدمی؟ کون ہے جو خان کے سامنے اس طرح بات کر سکے؟'' اس کے بعد وفد کو مقتولین کے ایک جم غفیر کے سامنے لے جایا گیا اور کہا گیا:

''اگر تم نے عقل کے ناخن نہ لیے تو تمہارا حال بھی یہی ہوگا۔''

چند دن بعد ہلاکو خان کے نائبین نے چاہا کہ علامہ ابن شداد تاتاریوں کے سفیر بن کر محمد الکامل کے پاس جائیں اور اسے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کریں۔ انہوں نے علامہ سے جھوٹ موٹ کہا: ''حاکمِ میافارقین تم کو بلا رہا ہے۔''

علامہ ابن شداد نے کہا: ''مجھے اس سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' تاتاری حکام نے کہا: ''تم ہمارے نمائندے بن کر اس کے پاس جاؤ گے۔'' ابن شداد نے کہا: ''میرے بادشاہ کی جانب سے مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔''

تاتاری حکام نے کہا: ''تمہیں بہر صورت جانا ہوگا۔'' ابن شداد نے انہیں بضد دیکھا تو پوچھا: ''مجھے اس سے مل کر کیا کہنا ہوگا؟'' تاتاری حکام نے کہا: ''تم اس سے کہو گے کہ میں حاکمِ دمشق کی طرف سے تمہارا سفارشی بن کر آیا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم ہلاکو خان کے پاس حاضری دو اور اس کی اطاعت اختیار کرلو۔''

علامہ ابن شداد نے تاتاریوں کا مہرہ بننے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر تاتاری انہیں لاشوں سے بھری ایک وادی کے پاس لے گئے اور کہنے لگے: ''اگلی گھڑی میں تمہارا حشر بھی یہی ہونے والا ہے۔''

علامہ ابن شداد نے بے خوفی کے ساتھ کہا: ''اللہ کی قضا وقدر کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔''

تاتاریوں کا ترجمان علامہ سے پوچھنے لگا: ''آخر آپ کو ہمارا سفیر بن کر جانے میں کیا رکاوٹ ہے؟''

علامہ ابن شداد نے کہا: ''تمہارے حکام چاہتے ہیں کہ مجھے مہرہ بنا کر حاکمِ میافارقین کو شہر سے باہر نکال لائیں اور اسے قتل کر دیں اور شہر پر قبضہ کر کے وہاں قتلِ عام کریں اور اس کا ذریعہ میں بنوں۔''

ترجمان علامہ کی یہ بات سن کر گھبرا گیا اور بولا: ''یہ بات دوبارہ مت کہنا۔ یہ تاتاری تمہیں فوراً قتل کر دیں گے۔''

حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے ابن شداد ظاہری طور پر سفیر بننے کے لیے تیار ہوگئے۔ انہیں محصور شہر کے دروازے پر پہنچایا گیا۔ وہ ایک تاتاری افسر کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور کئی دن تک مسلسل میافارقین کے نائب حاکم علم الدین اعسر سے ملتے رہے۔ ان ملاقاتوں میں علم الدین اعسر وفد کو کھانے میں بھنا ہوا گوشت، مرغ مسلّم اور حلوے پیش کرتا رہا، جبکہ شہر میں غذا بہت کم تھی مگر علم الدین تاتاریوں پر یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ ان کے پاس غذا کی فراوانی ہے۔ علامہ ابن شداد مجبوراً یہاں آئے تھے اور دُہری چال سے کام لے رہے تھے۔ انہوں نے میافارقین کے حکام کو چپکے چپکے کہہ دیا کہ آپ لوگ اپنے شہر کی مصلحت کو بہتر سمجھتے ہیں، آپ کو جو مناسب لگے، وہی کریں۔ اس دوران عارضی جنگ بندی تھی جس سے فائدہ اٹھا کر محمد الکامل نے فصیل کے شگاف پُر کر دیے اور منہدم حصے از سرِ نو تعمیر کر لیے۔ اُدھر علامہ ابن شداد کو الملک الناصر کی جانب سے یکے بعد دیگرے مراسلے پہنچ رہے تھے کہ کسی بھی طرح تاتاریوں کو میافارقین سے واپس کیا جائے۔

آخر ابن شداد کی کوششوں سے یہ طے پا گیا کہ تا تاری ایک لاکھ درہم وصول کر کے محاصرہ ختم کر دیں گے۔ چنانچہ انہیں اس رقم کی ایک قسط پہنچا دی گئی اور وہ کوچ کی تیاریاں کرنے لگے۔ دراصل تا تاریوں کو خدشہ تھا کہ الملک الناصر دمشق میں جہاد کی تیاری کر رہا ہے اور کسی بھی وقت وہ محمد الکامل کی مدد کے لیے فوج روانہ کر سکتا ہے۔

مگر اسی دوران تا تاریوں کو حاکمِ موصل بدر الدین لؤلؤ کا خفیہ مکتوب آن پہنچا جس میں بتایا گیا تھا کہ دمشق میں الملک الناصر کے امراء اس کے مخالف ہو گئے ہیں اور شام کے حالات بادشاہ کے قابو سے باہر ہو چکے ہیں۔

یہ خبر ملتے ہی تا تاریوں کی ہمت بندھ گئی اور وہ معاہدہ منسوخ کر کے دوبارہ محاصرے پر جٹ گئے۔ اب اشموط بن ہلاکو نے علامہ ابن شداد کو طلب کر کے پوچھا: ''یہ ایوبی امراء کیسے ہیں؟ ان کی طاقت کتنی ہے؟''

انہوں نے کہا: ''یہ عالمِ اسلام کے دلیر ترین لوگ ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے فرانس کو دمیاط میں شکست دی تھی۔ یہاں ان کے پاس ایک ہزار گھڑ سوار ہیں۔''

اشموط کے افسران کہنے لگے: ''نہیں، نہیں، ان کی تعداد اس سے کم ہے۔''

علامہ نے کہا: ''میں انہیں زیادہ جانتا ہوں۔''

اشموط نے علامہ ابن شداد کو شام واپس روانہ کر دیا اور جنگ کو تیز کرنے کا حکم دیا مگر خوش قسمتی سے انہی دنوں وہاں شدید برف باری شروع ہو گئی اور ایک وبائی مرض نے تا تاریوں کے اکثر گھوڑوں کو ہلاک کر دیا۔ پورے لشکر میں بمشکل پندرہ سو گھوڑے باقی بچے۔ آخر ۲۹ ربیع الاوّل ۶۵۷ھ کو اشموط تین ہزار پیادے شہر کے محاصرے پر چھوڑ کر محاذ سے واپس چلا گیا۔ سردیوں کے تین چار ماہ اسی طرح گزر رے۔ مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے الکامل نے شہر کے گرد ایک اور فصیل تعمیر کر لی اور ساتھ ہی ایک نئی خندق کھود کر اس میں پہاڑی چشموں کا پانی چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سفیر شام کے مختلف درباروں میں بھیج کر مدد طلب کی مگر اہلِ شام اپنی الجھنوں میں سرگرداں تھے۔ چنانچہ سردیاں گزرتے ہی تا تاری نئی تیاری کے ساتھ میافارقین کے گرد جمع ہو گئے۔ ①

یہ میرا شہر ہے۔ بشارتِ نبویہ:

میافارقین پر اس حملے کے دوران بدر الدین لؤلؤ کا ایک بیٹا جو موصل کی فوج کے ساتھ لشکرِ تا تار میں شامل تھا، اہلِ شہر کی مزاحمت پر حیران تھا۔ ایک شب اسے خواب میں آقائے نامدار ﷺ کی زیارت ہوئی۔ دیکھا کہ حضور ﷺ میافارقین کی فصیل پر کھڑے ہیں، قلعے کو اپنے دامنِ مبارک میں لیا ہوا ہے اور فرما رہے ہیں:

''یہ قلعہ اللہ کی امان میں ہے اور یہ شہر میری امان میں ہے۔''

صاحبزادہ بیدار ہوا تو حیرت سے اس کا بُرا حال تھا۔ دوسری شب بھی اس نے یہی خواب دیکھا۔ تیسری رات پھر ایسا ہی ہوا۔ صبح ہوتے ہی وہ چند ساتھیوں کے ہمراہ شکار کے بہانے لشکر گاہ سے نکلا اور فرار ہو گیا۔

① الاعلاق الخطیرۃ لعز الدین ابن شداد، ص ۱۸۹، ۱۹۰، ط الشاملۃ

بدرالدین لؤلؤ کو معلوم ہوا تو اسے پیغام بھیجا:

''یہ حرکت کر کے تم نے مجھے اور میرے شہروں کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔ ایسا کیوں کیا؟''

بیٹے نے جواب میں وہی خواب نقل کر دیا اور آخر میں لکھا: ''میں رسول اللہ ﷺ سے جنگ نہیں کر سکتا۔''

اس کے بعد لؤلؤ کے اس بیٹے کا کچھ اتا پتا نہ چل سکا۔ [1] بدرالدین لؤلؤ کی بھی قیدِ حیات تمام ہو چکی تھی۔ ۳ شعبان ۶۵۷ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔ [2] عمر ۹۶ سال تھی۔ [3] میافارقین اس کے بعد بھی ناقابلِ شکست رہا۔

ہلاکو خان میافارقین کے محاذ پر:

ہلاکو خان نے میافارقین کی فتح میں تاخیر پر قاصد بھیج کر بیٹے کو سرزنش کی اور کہا: ''میں نے بغداد کو چند دنوں میں مسخر کر لیا تھا اور تو ایک چھوٹے سے شہر کو اتنی طویل مدت میں بھی فتح نہ کر سکا؟''

بیٹے نے جواب بھیجا: ''آپ نے بغداد کو دھوکے سے فتح کیا تھا۔ اس محاذ پر تلوار چلانا پڑ رہی ہے۔''

ہلاکو خان نے اس جواب پر غضب ناک ہو کر خود پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا۔ [4] وہ ۲۲ رمضان ۶۵۷ھ کو اپنے معسکر سے روانہ ہوا۔ [5] میافارقین پہنچ کر اس نے فوج کی کمان ہاتھ میں لے لی۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ تین دن کے اندر اس شہر پر قابض ہو کر دکھائے گا۔ مگر تین دن کی مسلسل قہر انگیز جنگ میں دس ہزار تاتاری مارے گئے اور مسلمانانِ میافارقین ثابت قدم رہے۔ اس دوران تاتاریوں نے عجیب و غریب سفید پوش سواروں کو اپنے خلاف لڑتے دیکھا جن میں سے ہر ایک نے سینکڑوں تاتاری قتل کیے۔ آخر ہلاکو خان نے جنگ روک کر محمد الکامل کو کہلوایا:

''اس شہر پر خدا کا سایہ ہے۔ اس لیے میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ البتہ ایک فرمائش ہے، وہ یہ کہ وہ ان سفید پوشوں کو میرے پاس بھیج دیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسے مرد ہیں؟''

محمد الکامل نے جواب دیا: ''ہم ایسے لوگوں سے واقف نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ لوگ کون ہیں؟''

ہلاکو نے پیغام بھیجا: ''میں ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار اونٹ اور ایک ہزار بکریاں صدقہ دینا چاہتا ہوں۔ اہلِ شہر باہر آ کر وصول کر لیں۔''

محمد الکامل اس دھوکے میں بھی نہ آیا اور جواب دیا: ''ہم میں سے کوئی باہر نہیں آئے گا۔ اگر دینا چاہتے ہو تو تمہارے آدمی یہ مویشی لے کر خود شہر میں آ جائیں۔ ورنہ ہمیں کوئی حاجت نہیں۔ انہیں جہاں چاہو دے دو۔'' [6]

---

① طبقاتِ ناصری: ۲/ ۲۰۴، میافارقین کے محاذ پر بدرالدین لؤلؤ کے دو بیٹے آئے تھے: ایک سیف الدین اسحاق، دوسرا علاؤالدین علی۔ (الاعلاق الخطیرۃ، ص ۱۸۹، ط الشاملۃ)۔ غالباً یہ علاؤالدین تھا۔ ویسے تو الجزیرہ پر فوج کشی میں لؤلؤ کا بیٹا الصالح بھی شامل تھا مگر وہ لاپتا نہیں ہوا۔ اسی طرح اسحاق بھی معروف رہا۔

② سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۳۵۶، ۳۵۷، ط الرسالۃ

③ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۳۳۷

④ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۲۰۲، ۲۰۳

⑤ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۳۰۵

⑥ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۲۰۲ تا ۲۰۴

اب تاتاریوں نے آخری داؤ آزمایا۔ الکامل کے بیوی بچے ایک دوسرے قلعے میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ تاتاریوں نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد الکامل کی اولاد کو گرفتار کر لیا اور میافارقین کی فصیل کے سامنے لا کھڑا کیا تاکہ الکامل ان کی جان بچانے کے لیے شہر حوالے کر دے مگر الکامل کا جواب تھا: ''میرے پاس تمہارے لیے تلوار کے سوا کچھ نہیں۔''[1]

میافارقین کو سر کرنے کی نت نئی چالیں:

اب شہر کو سر کرنے کے لیے ایک نیا کھیل کھیلا گیا۔ ایک رئیس شرف الدین علائی کو بھیجا گیا جس نے میافارقین کے حکام کو خوش خبری دی کہ اس نے ستر ہزار دینار دے کر یہ شہر ہلاکو خان سے خرید لیا ہے، لہٰذا جنگ بند کر دی جائے۔

مگر اس سے پہلے کہ اس کا دھوکہ مؤثر ہوتا، بدر الدین لؤلؤ کی طرف سے بھی ایک قاصد نے آ کر اہلِ شہر کو بشارت دی کہ لؤلؤ نے یہ شہر ہلاکو خان سے خرید لیا ہے۔ اب دھوکہ واضح ہو گیا تھا۔ علم الدین اعسر نے قاصد کو کہا:

''تیرے آقا کی اوقات ہمیں معلوم ہے۔ ہم اللہ سے جانیں قربان کرنے کی بیعت کر چکے ہیں۔ اللہ کی قسم! یہ شہر اس وقت تک سرنگوں نہ ہوگا جب تک اس کا ایک ایک پتھر نہ اکھاڑ دیا جائے۔''

میافارقین پر قبضے سے تاتاریوں کے لیے ایشیائے کوچک کا راستہ بھی کھل جاتا تھا، اس لیے ایشیائے کوچک کے سلجوقی حکمران عز الدین کو بھی اس جنگ سے تشویش تھی۔ وہ خود صلح کرانے میافارقین آیا۔ محمد الکامل کے نائبین اس سے ملے تو اس نے کہا: ''مصلحت یہی ہے کہ محمد الکامل ہلاکو خان کے پاس حاضری دے دے۔ میں ہلاکو خان سے معافی کا پروانہ لے چکا ہوں۔''

محمد الکامل کے نائبین نے کہا: ''اگر تاتاری شہر کا محاصرہ چھوڑ کر چلے جائیں تو ہم خود اپنے بادشاہ کو لے کر ہلاکو خان کے پاس حاضر ہو جائیں گے۔''

تاتاری افسران اس مطالبے کے پسِ پردہ چال کو سمجھ گئے اور بولے:

''جونہی ہم محاصرہ ختم کریں گے، الکامل پہاڑوں میں مورچہ بندی کر لے گا۔''[2]

ہلاکو دریائے فرات کے پار۔ شام میں دہشت:

ہلاکو نے تنگ آ کر محاذِ میافارقین اپنے نائبین کے سپرد کیا اور خود دریائے فرات پار کر کے حلب کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب اس کے دریائے فرات عبور کرنے کی خبر شام پہنچی تو لوگوں کا خوف سے برا حال ہو گیا۔ الملک الناصر نے اپنے اہل و عیال کو محفوظ رکھنے کے لیے ''کرک'' کے قلعے میں بھیج دیا۔ دمشق کے بہت سے لوگ افراتفری میں ہجرت کر کے مصر کی طرف روانہ ہو گئے مگر یہ شدید سردی کا موسم تھا، اس لیے ان کی بڑی تعداد راستے میں جاں بحق ہو گئی۔ بہت سے لوگ ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ گئے۔ بہت کم افراد صحیح سلامت مصر پہنچ سکے۔[3]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۲۰۲، ط الرسالۃ
② الاعلاق الخطیرۃ لابن شداد، ۱۹۰، ۱۹۱، ط الشاملۃ
③ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۷ھ

حران کا سقوط:

اس دوران یکے بعد دیگرے متعدد شہر تاتاریوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔ جمادی الاولیٰ ۶۵۷ھ میں ہلاکو خان کی افواج حران پر قابض ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد یہ فوجیں ماردین کی طرف بڑھیں۔ [1]

سقوطِ ماردین:

ماردین کی فصیل بندی اس قدر مضبوط تھی کہ ہلاکو خان کا بیٹا اشموط جو اسے فتح کرنے پہنچا تھا، انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس نے اپنے نائب ارتقو کو بھیج کر وہاں کے حاکم الملک السعید کو پیغام دیا:

''قلعے سے اتر آؤ۔ اپنا سر بچاؤ۔ اپنی عورتوں، بچوں اور مال کو محفوظ کرلو۔ ورنہ اگر تمہارا سر آسمان تک بلند ہو جائے تب بھی لشکرِ تاتار کے قدموں تلے آ کر رہے گا۔''

الملک السعید نے جواب میں کہلوایا تھا:

''آپ لوگوں نے دوسروں سے بھی عہد و پیمان کیے تھے مگر پھر انہیں قتل کر ڈالا۔ پس اب میں تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ الحمد للہ! قلعہ سامانِ رسد اور بہادر کردستانی سپاہ سے بھرپور ہے۔''

آخر تاتاریوں نے منجنیقوں سے سنگ باری شروع کی اور شدید محاصرانہ جنگ ہونے لگی۔ آٹھ ماہ تک الملک السعید نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ مگر پھر قحط نے سپاہ کو لاغر کر دیا۔ الملک السعید خود بیمار ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ اس کے بیٹے مظفر الدین نے ہتھیار ڈال دینے پر اصرار کیا مگر الملک السعید نہ مانا۔ آخر بیٹے نے زہر دے کر باپ کو مار ڈالا اور ''ارتقو'' کو اپنے کارنامے سے آگاہ کر کے جاں بخشی کی درخواست کی، یوں جنگ رُک گئی۔

مظفر الدین اپنے بھائیوں سمیت ارتقو کے پاس حاضر ہوا تو اس نے تیور بدل کر کہا:

''کیا کسی بیٹے کے لیے جائز ہے کہ اپنے باپ کو قتل کرے؟''

مظفر الدین گھبرا گیا اور نرمی ہوئی آواز میں بولا: ''میں باپ کے سامنے گڑگڑاتا رہا کہ وہ لوگوں کا خون بہنے سے روکے مگر وہ نہ مانا۔ میں نے یہ کام اس لیے کیا کہ مجھے معلوم تھا کہ ہلاکو خان کی بلند اقبالی کے باعث قلعہ تو فتح ہو کر رہے گا مگر جنگ کر کے ہزاروں بے گناہ بلاوجہ مارے جائیں گے۔ پس میں نے سوچا کہ ایک جان ضائع کرنا لاکھوں جانیں ضائع کرنے سے بہتر ہے، خصوصاً جبکہ مقتول ظالم بھی ہو۔ بہرکیف مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے۔ اگر خاقان اس کے باوجود مجھے اس شہر کی حکومت پر برقرار رکھیں تو ان کی عنایت ہوگی۔''

ہلاکو خان کو مظفر الدین کا منافقانہ کردار اور خوشامدانہ جواب پسند آیا اور اسے ماردین کی حکومت پر برقرار رکھا۔ [2]

❁❁❁

---

① النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة: ۷/ ۷۳

② جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اول: ص ۳۲۴ تا ۳۲۶، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

سیف الدین محمود قُطُز......اسلام کی نئی شمشیر

ذوالقعدہ ۶۵۷ھ تا ذوالقعدہ ۶۵۸ھ

ان انقلابات کے دوران مصر میں عزّ الدین ترکمانی کا کم عمر بیٹا نورالدین علی (الملک المنصور) تخت پر براجمان تھا اور ایک معزز جرنیل سیف الدین قطز اس کے اتابک اور نائب السلطنت کے طور پر امورِ مملکت انجام دے رہا تھا۔

سیف الدین قطز کی داستان بڑی عجیب تھی۔ لوگ اسے غلام سمجھتے تھے جبکہ وہ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کا بھانجا تھا۔ وہ خوارزم سے آنے والے ان ترک لڑکوں میں سے ایک تھا جنہیں بردہ فروشوں نے غلام بنا کر منڈیوں میں بیچ دیا تھا۔ اس کا اصل نام محمود تھا مگر اسے قطز کہا جاتا تھا۔ وہ بازاروں میں بکتا اور غلامی کے تازیانے سہتا دمشق کے ایک تاجر ابن زعیم کے ہاتھ آ گیا۔ آقا ایک دن کسی بات پر بگڑ گیا اور اسے پیٹ دیا، ساتھ ہی اس کے باپ دادا پر لعن طعن کی۔ قطز رونے لگا۔ دن بھر اس نے کھانا نہ کھایا۔ آقا نے اپنے فرّاش (قُلیوں کے افسر) حاجی علی کو بھیجا کہ اسے منائے اور کھانا کھلائے۔ حاجی علی نے جا کر اسے دلاسا دیا اور کہا: ""میاں! ایک تھپڑ کھا کر رونے لگے۔"

قطز نے جواب دیا: "میں تھپڑ کی وجہ سے نہیں، اپنے باپ دادا کو لعنت ملامت کرنے پر رو رہا ہوں۔ جبکہ وہ میرے آقا سے بہتر تھے۔" حاجی علی نے کہا: "تمہارا باپ کون ہے؟ کوئی کافر ہی ہے نا۔"

قطز نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا: "میں مسلمان ہوں اور مسلمان کا بیٹا ہوں۔ میرا نام محمود بن مودود ہے، میں جلال الدین خوارزم شاہ کی ہمشیرہ کا بیٹا ہوں۔ شاہی خاندان سے ہوں۔"[1]

مگر اس وقت قطز کے اس انکشاف پر یقین کرنے والا کوئی نہ تھا۔

الملک الصالح کی خدمت میں:

۶۳۷ھ میں الملک الصالح مصر کا بادشاہ بنا تو قطز کی قسمت جاگی۔ اسے فوج کے لیے خریدے جانے والے کم سن غلاموں میں شامل کر لیا گیا اس طرح وہ دمشق سے مصر الملک الصالح نجم الدین ایوب کی خدمت میں جا پہنچا۔[2]

---

① النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۸۵/۷؛ تاریخ الاسلام للذهبی، وفیات: ۶۵۸ھ
حافظ ذہبی اور علامہ یوسف بن تغری بردی نے یہ واقعہ شمس الدین الجزری کی تاریخ سے نقل کیا ہے۔ شمس الدین الجزری نے یہ واقعہ اپنے والد سے سنا تھا اور انہیں حاجی علی نے خود یہ واقعہ سنایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ بادشاہ بننے کے بعد قطز نے مجھے پانچ سو دینار ہدیہ بھیجا اور ساتھ ہی مشاہرہ بھی مقرر کر دیا۔

② البدایة والنهایة: ۳۱۱/۱۷، ط دار هجر

نجومی کی پیش گوئی:

شیخ قطب الدین یونینی رحمہ اللہ نے قطز کے بچپن کا ایک واقعہ سندِ متصل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''امیر بدر الدین اتابکی کا بیان ہے کہ میں، قطز اور بیبرس بچپن میں اکثر ایک ساتھ گھڑ سواری کیا کرتے تھے۔ ایک بار ہم نے مصر کی ایک سڑک پر ایک رَملی (علمِ رَمل کے ماہر) کو دیکھا۔ پہلے قطز نے اس سے فرمائش کی: میری قسمت کا حساب لگاؤ۔ اس نے حساب لگا کر بتایا: تم مصر کے بادشاہ بنو گے اور تاتاریوں کو شکست دو گے۔ یہ سن کر ہم اس کا مذاق اڑانے لگے۔ پھر بیبرس نے کہا: ''میری قسمت دیکھو۔ رملی نے حساب لگا کر کہا: تم مصر اور اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کے بھی بادشاہ بنو گے۔ ہم نے اس کا اور زیادہ مذاق اڑایا۔ اب میرے دونوں دوستوں نے کہا: تم بھی اپنا ستارہ معلوم کرو۔ میں نے رَملی سے کہا: میری قسمت بھی دیکھ لو۔ اس نے حساب لگا کر کہا: ''تم ایک سو گھڑ سواروں کے افسر بنو گے اور یہ عہدہ تمہیں یہ دے گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بیبرس کی طرف اشارہ کیا۔ پھر سب کچھ بالکل ویسے ہی ہوا جیسا کہ اس نے پیش گوئی کی تھی۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی بشارت:

بچپن کے انہی دنوں میں قطز نے خواب میں رحمتِ عالم ﷺ کی زیارت کی۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اسے بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''تم مصر کے بادشاہ بنو گے اور تاتاریوں کو شکست دو گے۔''

قطز بیدار ہوا تو اس کے دل میں یقین محکم کی لازوال حرارت بھر چکی تھی۔ اس خواب پر اسے ایسا یقین تھا جیسا چمکتے سورج کی روشنی پر۔

ان دنوں مصر کے ایک امیرِ فوج ''الرہاوی'' کے ہاں دیگر موالی لڑکوں کے ساتھ قطز کی بھی فوجی تربیت ہو رہی تھی۔ اس کا ایک ہم عمر دوست ''حسام الدین برکہ خانی'' تھا۔[2] قطز کے لمبے بالوں میں جوئیں پڑ جاتی تھیں اور حسام الدین اس کی جوئیں نکالا کرتا تھا۔ مگر اس کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی جوں نکلتی وہ قطز کو ایک چپت لگاتا اور ملامت بھی کرتا۔ ایک بار قطز کے بالوں میں جوئیں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ حسام الدین اس دن اسے خوب چپتیں لگا رہا تھا۔ اسی دوران

---

① ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: ۱/۳۸۴، ط دار الکتاب الاسلامی قاہرہ

نوٹ: ان واقعات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ رَملی یا نجومی کو علمِ غیب حاصل ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر تو بالکل فریبی ہوتے ہیں اور فنِ رَمل یا فنِ نجوم کو جانتے ہی نہیں۔ جو صاحبِ فن ہوتا ہے وہ خود یہ جانتا ہے کہ حساب کتاب کی حیثیت ایک تخمینے کی سی ہوتی ہے جو کبھی صحیح اور کبھی غلط بھی ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حاذق طبیب کسی مریض کا چہرہ دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ یہ بس اتنے ماہ جیے گا۔ اسی لیے دنیا میں کوئی رملی یا نجومی ایسا نہیں گزرا جس کی ہر پیش گوئی درست ہو، جیسا کہ کوئی طبیب ایسا نہیں جس کی تشخیص ہمیشہ درست نکلی ہو کیوں کہ علمِ غیب فقط اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ شریعت میں نجومیوں سے قسمت کا حال پوچھنے سے منع کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ فنِ رَمل یا نجوم بالکل ہی بے اصل ہے، بلکہ اس کی وجہ لوگوں کو بدعقیدگی سے بچانا ہے کیوں کہ اکثر لوگ نجومیوں کی کوئی بات درست نکلنے پر انہیں عالم الغیب سمجھ بیٹھتے ہیں۔ نجومی بھی یہ نہیں کہتے کہ ہمارے اندازے میں غلطی کا امکان ہے بلکہ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ دھاک جما کر پیسے کھرے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

② برکہ خان سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے افسران میں سے ایک تھا جس نے سلطان جلال الدین کی گم شدگی کے بعد مختلف درباروں میں بڑی شہرت پائی اور کچھ علاقے پر اس کی حکومت بھی رہی۔ (تاریخ الاسلام للذھبی، وفیات: ۶۴۴ھ) سلطان کے منشی شہاب الدین نسوی نے اس کے دربار سے وابستہ ہو کر سیرت جلال الدین مکمل کی۔ برکہ خان کے موالیوں اور ان کی اولاد کو برکہ خانی کہا جاتا تھا۔ (تاریخ ابن الوردی ۲/۱۷۷، ط العلمیۃ)

اس کے منہ سے نکلا: ''اللہ کی قسم! میں تو چاہتا ہوں کہ بڑے ہو کر مجھے پچاس گھڑ سواروں کی افسری مل جائے۔''

قطز یکدم بول اٹھا: ''تسلی رکھو۔ یہ عہدہ میں تمہیں دے دوں گا۔''

حسام الدین نے ایک اور چپت رسید کی اور کہا: ''تم مجھے پچاس گھڑ سواروں کی افسری دو گے؟''

قطز نے کہا: ''ہاں'' حسام الدین نے ایک اور چپت رسید کر دی۔

قطز نے کہا: ''تمہیں تکلیف کیا ہے کہ بس پچاس سواروں کی افسری پر قناعت کر رہے ہو۔ اللہ کی قسم! یہ تو میں تمہیں دے ہی دوں گا۔'' حسام الدین نے حیران ہو کر کہا: ''تم بھلا مجھے کیسے یہ عہدہ دو گے؟''

قطز نے کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت کی تھی۔ انہوں نے مجھے بشارت دی تھی کہ تم مصر کے بادشاہ بن کر تاتاریوں کو شکست دو گے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد شک وشبہ سے بالاتر ہے۔''

حسام الدین دم بخود رہ گیا اور اس پیش گوئی کے سچے ہونے کا منتظر رہا۔''[1]

بچپن میں تاتاریوں کی غارتگری کے چشم دید مناظر قطز کے دل پر نقش تھے، وہ جانتا تھا کہ اس کے وطن کو اجاڑنے، اسے یتیم بنانے اور ہجرت وغلامی پر مجبور کرنے والے یہی تاتاری ہیں۔ وہ اپنے دل میں ان سے انتقام لینے کا تہیہ کیے ہوا تھا۔ وہ جوان ہوا تو انہی دنوں عز الدین ترکمانی نے مصر میں مملوکوں کی حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔ قطز کو اپنی حوصلہ مندی اور ہوشیاری کی بناء پر سلطان عز الدین ترکمانی کے دربار میں ایک نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔[2]

محمود بن مودود:

ایک بار شاہی قلعے میں ایک ماہر رَمّال آیا۔ قطز نے اسے اپنے دوست افسران کی محفل میں بٹھا کر فرمائش کی کہ وہ حساب لگا کر بتائے کہ مصر کا اگلا بادشاہ کون ہوگا اور تاتاریوں کو کون شکست دے گا۔ بہت دیر حساب لگانے کے بعد وہ بولا: ''مجھے اپنے حساب میں بس پانچ بے نقطہ حروف دکھائی دیتے ہیں اور اس کی ولدیت بھی پانچ بے نقطہ حروف کی ہے۔ آپ کا نام 'قطز' تو تین حرفی ہے۔ سلطان کے ولی عہد 'علی' کا نام بھی تین حرفی ہے۔''

قطز نے بے ساختہ کہا: ''تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ نام محمود بن مودود ہے۔''

رَمّال نے کہا: ''اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔''

قطز نے یہ سن کر کہا: ''میں ہوں محمود بن مودود۔ میں تاتاریوں کو شکست دوں گا۔ اپنے ماموں سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کا بدلہ لوں گا۔''

ساتھیوں نے کہا: ''اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔'' قطز نے کہا: ''مگر اس بات کو پوشیدہ ہی رکھنا۔''[3]

---

① ذیل مرآۃ الزمان: ۱/ ۳۸۳، ط دار الکتاب الاسلامی قاہرہ

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۷/ ۳۱۱

③ ذیل مرآۃ الزمان: ۱/ ۳۶۹؛ النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ: ۷/ ۸۶

شام اور مصر کو تاتاریوں سے خطرہ:

دن گزرتے گئے اور قطز کا عہدہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ الملک المعز ترکمانی نے اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ ربیع الاول ۶۵۵ھ میں ترکمانی کو اس کی بیگم شجرۃ الدر نے قتل کرا دیا اور چند دن بعد شجرۃ الدر کو ترکمانی کے غلاموں نے مار ڈالا۔ اس طرح تختِ مصر خالی ہو گیا جس پر ترکمانی کے کم عمر بیٹے الملک المنصور کو علامتی حکمران کے طور پر بٹھا دیا گیا۔ وہ ذوالقعدہ ۶۵۷ھ تک اس عہدے پر رہا۔ اس دوران تاتاری بغداد پر قابض ہو چکے تھے اور اب شام پر فوج کشی کی تیاری کر رہے تھے۔ اس صورتحال میں مصر کے فوجی جرنیل متفکر تھے کیوں کہ شام کے بعد لازمی طور پر مصر کی باری تھی۔ یہاں حال یہ تھا کہ ایک تو جنگ کے لیے خزانے میں کافی رقم موجود نہ تھی۔ دوسرے نوعمر اور ناتجربہ کار حکمران کی سرکردگی میں تاتاریوں کے خلاف کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ ①

اُدھر یہی فکر شام کے حکمران الملک الناصر کو لاحق تھی۔ ۶۵۷ھ کے آخر میں وہ دمشق کے باہر ''برزہ'' میں کیمپ لگا کر تاتاریوں سے مقابلے کے لیے فوج اکٹھی کر رہا تھا۔ اس کی کمان میں تقریباً ایک لاکھ عربی اور عجمی جمع ہو چکے تھے مگر اسے خوف تھا کہ یہ اتنی بڑی جمعیت بھی تاتاریوں اور ان کے ماتحت عجمی اور گرجی مشترکہ افواج کے ٹڈی دَل کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گی۔ ②

علامہ کمال الدین ابن العدیم رحمہ اللہ کی سفارت:

آخر الملک الناصر نے مصر سے مدد لینا ضروری سمجھا اور حلب کے سب سے بڑے عالم کمال الدین عمر ابن العدیم رحمہ اللہ (مؤلف: بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب) کو مصر بھیجا تاکہ حکومتِ مصر اس نازک موقع پر باہمی تنازعات کو پسِ پشت ڈال کر شام کا ساتھ دے۔ علامہ ابن العدیم رحمہ اللہ جب یہ پیغام لے کر قاہرہ پہنچے تو نائب سلطنت سیف الدین قطز نے ان کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ علامہ ابن العدیم رحمہ اللہ نے حکومتِ مصر کو بتایا:

''تاتاری الجزیرہ کے شہروں پر قابض ہو چکے ہیں اور اب شام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے دریائے فرات عبور کر لیا ہے اور حلب کے قریب آ چکے ہیں۔''

اس وقت مصر میں عمائدِ حکومت اور علماء و فقہاء تاتاریوں کے خلاف جہاد کے حوالے سے اہم فیصلے کرنے کے لیے باہم مشورے کر رہے تھے۔ علامہ ابن العدیم رحمہ اللہ بھی اس مشاورت میں شریک ہو گئے۔ ③

شیخ الاسلام عز الدین عبدالسلام رحمہ اللہ کی رائے:

مجلسِ مشاورت میں پیش کردہ ایک مسئلہ یہ تھا کہ کیا جہاد میں سخت ضرورت کے وقت رعایا پر کوئی ٹیکس عائد کر کے

---

① البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۶۵۷ھ، ۶۵۸ھ؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: سنۃ ۶۵۷ھ، ۶۵۸ھ

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/۵۰۹، ۵۱۱؛ النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ: ۷/ ۷۳

③ النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ للعلامۃ یوسف بن تغری بردی: ۷/ ۷۳، ط دار الکتب مصر؛ البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر: سنۃ ۶۵۷ھ، ط دار ھجر

پیسہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس مجلس میں مصر کے سب سے بڑے عالم شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے فرمایا:

''جہاد کے لیے حکومت رعایا سے رقم وصول کر سکتی ہے مگر اس کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ پہلے آپ سرکاری خزانے میں موجود تمام رقم، سونا چاندی اور جواہر جہاد کے لیے مجاہدین کے گھوڑوں، اسلحے اور دیگر ضروریات پر خرچ کر چکے ہوں اور خزانے میں کچھ بھی نہ بچا ہو۔ اس طرح آپ کا اور رعایا کا حال ایک سا ہو۔ حکام اور فوج کے پاس مال و دولت اور فخریہ ساز و سامان کے ہوتے ہوئے عوام سے کچھ لینا جائز نہیں ہے۔''[1]

مصر میں قطز کی تخت نشینی:

اس مجلسِ مشاورت میں حکومت کی طرف سے قطز ہی نے نمائندگی کی، جبکہ نوعمر بادشاہ الملک المنصور بالکل چپ چاپ رہا کیوں کہ اسے ان باتوں کی سمجھ ہی نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر الملک الناصر کے سفیر علامہ ابن العدیم رحمہ اللہ نے کہا:

''ایسے سخت حالات میں ایک مضبوط، بہادر اور قابل حکمران کے بغیر چارہ نہیں جس کی لوگ اطاعت کریں اور وہ جہاد میں ان کی قیادت کر سکے۔''

دیگر ارکانِ مجلس نے بھی ان کی تائید کی۔ گفت و شنید کے بعد آخر قطز کو نیا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔[2]

یہ واقعہ ۲۴ ذوالقعدہ ۶۵۷ھ کا ہے۔[3] اس فرزندِ اسلام کو ''الملک المظفر'' کے لقب سے یاد کیا گیا۔

قطز کے چناؤ میں خوارزمی افسران کی شرکت:

قطز کے چناؤ میں وہ خوارزمی افسران بھی پیش پیش تھے جو سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے ساتھ تاتاریوں کے خلاف جہاد میں شریک رہے تھے۔ وہ مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے اور روپوش تھے اور پھر یکجا ہو کر کچھ عرصے قبل قاہرہ آ گئے تھے۔ ان میں ناصرالدین قیمری، برکت خان، اختیار خان، سیف الدین صادق خان، ناصرالدین کشلو خان اور اطلس خان نمایاں تھے۔ قطز نے تب ان کی بڑی عزت افزائی کی تھی اور اس کے صلے میں وہ قطز کو حکمران بنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔[4]

بعض امراء کی مخالفت اور قطز کا جواب:

امرائے مصر میں سیف الدین قطز کا مخالف گروہ بھی موجود تھا۔ یہ لوگ ترکمانی کے جانشین الملک المنصور کے وفادار تھے اور اس کی جبراً معزولی اور نظر بندی پر ناراض تھے۔ یہ لوگ قطز کی تخت نشینی کے وقت موجود نہ تھے بلکہ شکار

---

① النجوم الزاهرة: ۷۳/۷؛ البداية والنهاية: سنة ۶۵۷ھ؛ تاريخ الخلفاء للسيوطى، ص ۳۳۲

② بحوالۂ بالا

③ السلوک لمعرفة دول الملوک: ۵۰۷/۱

④ جامع التواریخ(عربی): ج ۲، حصہ اوّل، ۳۱۱

پر گئے ہوئے تھے۔[1] جب وہ واپس لوٹے تو قطز کی تخت نشینی کی خبر سے سخت بددل ہوئے۔ قطز نے انہیں سمجھایا بجھایا اور یاد دلایا کہ یہ وقت باہمی اختلافات کا نہیں کیوں کہ تاتاری شام کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ قطز نے کہا:

''میرا ہدف فقط یہ ہے کہ تاتاریوں سے مقابلے کی تیاری کی جائے۔ ایک بادشاہ پر اتفاق کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ جب ہم اس دشمن کی طاقت توڑ دیں گے تو پھر تمہیں اختیار ہوگا کہ جسے چاہو بادشاہ بنالو۔''

یہ سن کر مخالف امراء بھی وقتی طور پر چپ ہو گئے۔[2]

قطز کی طرف سے الملک الناصر کو جہاد میں مدد کی یقین دہانی:

سیف الدین قطز کو اندازہ ہوگیا کہ الملک الناصر مصر کی موجودہ حکومت کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے اور اسی لیے وہ مصر پر حملے کا منصوبہ بنا تا رہا ہے۔ قطز نے اس وقت اتحاد بین المسلمین کی ضرورت پر زور دیا اور اپنی طرف سے ہر ایثار کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے اپنے سفیر برہان الدین خضر کو شامی سفیر علامہ ابن العدیم رحمہ اللہ کے ساتھ الملک الناصر کے پاس بھیجا تا کہ اسے یقین دلائیں کہ تاتاریوں کے مقابلے میں مصر شام کے ساتھ کھڑا ہے۔[3]

اس نے قسم کھا کر الملک الناصر کو لکھا:

''میں آپ کی بادشاہت ہرگز نہیں چھیننا چاہتا۔ میں مصر میں آپ کے نائب کے طور پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ جب آپ مصر تشریف لائیں گے، تو میں آپ کو تخت پر بٹھادوں گا۔ اور اگر آپ مجھے باقی رکھنا چاہیں گے تو میں آپ کی خدمت بجالاتا رہوں گا۔ اگر آپ چاہیں گے تو میں اپنے تمام لشکر کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر آپ کی اعانت کروں گا۔ اگر آپ میری آمد ناپسند کرتے ہیں تو میں آپ کے پسندیدہ امیر کی کمان میں لشکر آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''[4]

الملک الناصر اور بیبرس کے درمیان اختلاف:

قطز کے اس مکتوب نے الملک الناصر کے خدشات دور کر دیے۔ اسی دوران اسے اطلاع ملی کہ تاتاریوں کے گروہ حلب کی سرحدوں پر چھاپے مار رہے ہیں جس کے باعث بے شمار لوگ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ پھر اسے خبر ملی کہ تاتاریوں کے ایک لشکر نے حلب پر دھاوا بول دیا ہے اور مقابلے میں آنے والی مقامی فوج کو خاصا نقصان پہنچا کر واپس چلا گیا ہے۔ الملک الناصر نے یہ دیکھ کر رکن الدین بیبرس کی مدد سے تاتاریوں کو روکنے کی تیاری شروع کی۔ اس نے کوچ کر کے برزہ میں خیمہ گاہ لگائی اور تمام نائبین کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ کرک کے حاکم المغیث عمر اور سیف الدین قطز کو بطورِ خاص کمک بھیجنے کی تاکید کی۔ تاہم ان تیاریوں کے باوجود الملک الناصر اور اس کے امراء ہلاکو خان سے دہشت زدہ تھے۔ ایک ملت فروش امیر زین الدین حافظی نے اس کیفیت کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس

---

[1] البدایة والنهایة: سنة ۶۵۷ھ

[2] النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۷/۷۳

[3] السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۰۸

[4] السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۰۸، ط العلمیة

نے الملک الناصر کے سامنے ہلاکو خان کے ناقابلِ شکست ہونے کا ایسا نقشہ کھینچا کہ اس کی ساری خود اعتمادی جاتی رہی۔ حافظی نے مشورہ دیا کہ ہمیں جنگ کا خیال ترک کر کے ہلاکو خان کی دلجوئی کرنی چاہیے اور اس کے تابع داروں میں شامل ہو جانا چاہیے۔ حافظی کی باتوں نے الملک الناصر کا ارادہ متزلزل کر دیا۔ رکن الدین بیبرس کو یہ معلوم ہوا تو اس نے حافظی کو نہ صرف بُرا بھلا کہا بلکہ اس کی پٹائی بھی کر ڈالی اور کہا: ''تم ہی مسلمانوں کی ہلاکت کا سبب ہو۔''

حافظی نے جا کر الملک الناصر سے بیبرس کی شکایت لگائی اور دونوں کے درمیان خفگی پیدا کر دی۔ عین اسی وقت جہاد کے مخالف امراء نے الملک الناصر کو معزول کرنے کی سازشیں شروع کر دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے جہاد پر اتفاق کا ماحول ختم ہو گیا۔ [1] اس وقت آٹھ ہزار تاتاری ''بالس'' کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ [2] بیبرس چاہتا تھا کہ انہیں پسپا کر کے تاتاریوں کو کم ہمت اور مسلمانوں کو بلند حوصلہ بنایا جائے۔ وہ الملک الناصر کو کہتا رہا: ''آپ اگر مجھے فقط تین ہزار سوار دے دیں تو میں آگے بڑھ کر ان تاتاریوں پر حملہ کر دوں گا۔'' مگر الملک الناصر کا تذبذب ختم نہ ہوا۔ [3] بیبرس سمجھ گیا کہ اب یہاں رُکنا بے کار ہے۔ وہ ناامید ہو کر فلسطین کے ساحلی شہر غزہ چلا گیا۔ [4]

سقوطِ حلب:

تاتاری لشکر دریائے فرات عبور کر کے ذوالحجہ ۶۵۷ھ کے آخری عشرے میں حلب سے کچھ دور پہنچا اور ایک بستی سلمیہ میں خیمہ گاہ لگائی۔ اس کے بعد لشکر کا ایک حصہ حلب کی طرف روانہ ہو گیا [5] جہاں کا گورنر سلطان صلاح الدین ایوبی کا آخری بیٹا الملک المعظم تھا جس کی عمر ۸۱ سال ہو چکی تھی۔ [6] یہ شہر انتہائی مستحکم دفاعی انتظامات سے مالا مال تھا اور لوگ جہاد کے لیے پوری طرح سر بکف تھے۔ تاتاریوں کے قریب آنے کی اطلاع سنتے ہی ہزاروں سپاہیوں، رضا کاروں اور عوام پر مشتمل لشکر شہر سے نکل آیا اور اُس طرف روانہ ہو گیا جہاں تاتاری لشکر ان کی آمد کا منتظر تھا۔ وہاں پہنچ کر جب مسلمانوں نے لشکرِ تاتار کی کثرت دیکھی تو مرعوب ہو کر پسپائی اختیار کی اور واپس شہر میں گھس گئے۔ الملک المعظم بہت محتاط حاکم تھا، اس نے محصور رہ کر جنگ کا فیصلہ کیا اور اعلان کرا دیا کہ آج کے بعد کوئی شخص شہر سے باہر نہ نکلے۔ اگلے دن لشکرِ تاتار شہر کے سامنے آن پہنچا۔ الملک المعظم نے ایک بار پھر تاکید کی کہ کوئی باہر نہ نکلے مگر افسرانِ فوج نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر ہم باہر نہ نکلے تو دشمن جری ہو جائے گا۔

آخر سپاہیوں اور عوام پر مشتمل لشکر شہر سے نکلا اور ''کوہِ بانقوسا'' پر صف بندی کرنے لگا۔ تاتاری لشکر پہاڑ کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ تاتاریوں کے کچھ دستے آگے بڑھے اور اِدھر سے اسلامی لشکر کے ایک حصے نے ان پر حملہ بول دیا۔

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۵۰۹/۱، ط العلمیة

② بالس حلب اور رقہ کے درمیان دریائے فرات کے کنارے شام کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ عراق سے شام جاتے ہوئے شام کی حدود میں پہلا شہر یہی پڑتا تھا۔ (معجم البلدان: ۳۲۸/۱، ط دار صادر، المسالک والممالک للاصطخری (م ۳۴۶ھ)، ص ۶۲، ط دار صادر)

③ الروض الزاهر فی سیرة الملک الظاهر، ص ۶۱، ۶۲ ، ④ السلوک لمعرفة دول الملوک: ۵۰۹/۱، ط العلمیة

⑤ النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۷۵/۷ ⑥ تاریخ الاسلام للذهبی: وفیات: سنة ۶۵۸ھ

تاتاری یکدم منہ پھیر کر بھاگ نکلے اور مسلمان اندھا دھند تعاقب کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں گھات میں ہزاروں تاتاری چھپے ہوئے تھے۔اب مسلمانوں پر یک بارگی حملہ ہوا تو انہیں پسپا ہونا پڑا۔ تاتاری انہیں دھکیلتے ہوئے کوہ بانقوسا تک لے گئے جہاں اسلامی لشکر کے محفوظ دستے کھڑے تھے۔ ہزیمت دیکھ کر وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے اور تاتاری حلب تک تعاقب کرتے رہے۔اس بھگدڑ میں ہزار ہا مسلمان شہید ہوئے۔

اس دن تاتاری شہر کے سامنے تعینات رہے۔ پھر اگلے دن اچانک وہ واپس چلے گئے۔معلوم ہوا کہ لشکر تاتار عزاز کا رُخ کر رہا ہے۔عزاز کا مضبوط قلعہ مدافعت نہ کرسکا اور امن کی ضمانت لے کر سرنگوں ہو گیا۔[1]

۲ صفر ۶۵۸ھ کو لشکرِ تاتار ایک بار پھر حلب کے سامنے تھا۔ ہلاکو نے کوشش کی کہ اہلِ شہر دھمکیوں سے رام ہو جائیں مگر اسے جواب ملا کہ ہم صرف تلوار کی زبان سے بات کریں گے۔ ہلاکو نے اس ہمت پر حیران ہوتے ہوئے حملے کا حکم دے دیا۔سات دن کی محاصرانہ جنگ کے بعد اہلِ شہر نے جان کی امان پر دروازے کھول دیے۔ ہلاکو نے شہر فتح کرتے ہی جاں بخشی کا وعدہ پسِ پشت ڈال دیا۔ پانچ دن تک حلب میں بُری طرح قتل عام کیا گیا۔سڑکوں اور گلیوں میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں۔ حلب کا قلعہ دار کچھ دنوں تک قلعے میں مورچے بنا کر لڑتا رہا مگر آخر اسے بھی ہار ماننا پڑی اور دس صفر کو قلعہ بھی سرنگوں ہو گیا۔ہلاکو نے فصیلِ شہر اور قلعے کو مسمار کرا دیا۔ یہاں ایک لاکھ سے زائد عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا گیا۔حلب کا حال دیکھ کر شام کے باقی شہروں کے حاکم اتنے خوف زدہ ہوئے کہ از خود اپنے شہروں کو حملہ آوروں کے حوالے کرنے لگے۔حماۃ کے حاکم نے شہر کی چابیاں بھیج دیں اور ہلاکو نے اس کی فصیل اور قلعے کو بھی منہدم کرا دیا۔[2] شہر کی تمام چھوٹی بڑی مسجدیں، جامعات اور باغات کو تہس نہس کر دیا گیا۔یوں یہ انتہائی خوبصورت شہر جس پر زنگیوں اور ایوبیوں کو ناز تھا، کھنڈر بن گیا۔[3]

ہلاکو خان نے الملک المعظم کو جس کی حالت بڑھاپے اور محاصرے کی تکالیف کے باعث نہایت خستہ تھی، کوئی گزند نہ پہنچائی مگر اس کے دن پورے ہو چکے تھے۔ چند روز بعد وہ دنیائے فانی سے رحلت کر گیا۔[4]

الملک الناصر کا مقابلے سے فرار۔ دمشق میں افراتفری:

جب الملک الناصر کو حلب کے انجام کی اطلاع ملی تو اس پر دہشت طاری ہو گئی۔ وہ مقابلے کا خیال چھوڑ کر دمشق کو کسی کے سپرد کیے بغیر ۱۵ صفر ۶۵۸ھ کو یکایک اہل وعیال سمیت فلسطین کی طرف نکل گیا۔ یہ دیکھ کر ہر کوئی بھاگنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔تاتاریوں سے جنگ کے لیے جمع ہونے والی فوج بکھر گئی اور لوگ اپنا سامان کم سے کم قیمت پر فروخت کر کے قافلوں میں شامل ہونے لگے۔سخت سردی پڑ رہی تھی اور اونٹوں کے کرائے آسمان سے باتیں کر رہے

---

(1) النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۷/ ۷۶

(2) السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۱۱؛ البدایة والنهایة: سنة ۶۵۸ھ

(3) السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۱۱

(4) السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۱۱

تھے۔ غرض شہر میں قیامت برپا تھی۔ ①

قطز کا پیغام اور الملک الناصر کی نادانی:

الملک الناصر غزہ سے ہوتا ہوا مصر کی طرف روانہ ہوا مگر پھر وہ ممالیکِ مصر کے بارے میں خدشات کا شکار ہو گیا۔ اس دوران سیف الدین قطز کا پیغام آن پہنچا: ''تشریف لائیے۔ ہم مل کر تاتاریوں کے خلاف یکجان ہو جائیں۔''

مگر الملک الناصر مصر کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اس صورتحال سے تنگ آ کر اس کے کئی امراء اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور مصر چلے گئے جہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ جبکہ الناصر بالکل بے یار و مددگار رہ گیا۔ ②

میافارقین کے محاذ کے آخری مناظر:

اُدھر میافارقین کے محاصرے کو پندرہ ماہ گزر چکے تھے، اس کے باوجود مٹھی بھر مسلمان تاتاریوں کے ٹڈی دَل کے سامنے چٹان بن کر کھڑے تھے۔ مگر شہر میں غذا ختم ہو رہی تھی، مویشی مر چکے تھے اور لوگ مردار کھانے پر مجبور تھے۔ ③

شہر کے دروازے ''بابِ کر'' کی نگرانی امیر سابق الدین لاجین کے سپرد تھی۔ ایک شب وہ چپکے سے فصیل سے اُتر کر کسی ضروری کام سے اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے ایک غلام نے جو محاصرے کی سختیوں سے تنگ آ چکا تھا، تاتاریوں کو اطلاع دے دی کہ اس سمت سے فصیل خالی ہے۔ چنانچہ تین سو تاتاری رات کی تاریکی میں سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھنے لگے۔ دینار نامی ایک سپاہی نے ان کی نقل و حرکت محسوس کر لی اور نیزہ تھام کر فصیل پر چوکنا ہو گیا۔ جونہی پہلا تاتاری فصیل پر آیا، دینار نے نیزہ دے مارا۔ تاتاری چیخ مار کر اپنے ساتھیوں پر گرا۔ شور سن کر محمد الکامل اپنے دستے سمیت فصیل پر آن پہنچا اور شدید جھڑپ شروع ہو گئی جس میں دشمن کی بیسیوں لاشیں فصیل سے نیچے جا گریں۔ چونکہ قحط کی وجہ سے شہر کے لوگ مردار کھا رہے تھے، اس لیے الکامل نے حکم دیا کہ دشمن کوئی لاش ساتھ نہ لے جانے پائے۔ چنانچہ ستر گھڑ سوار اور دو سو پیادے باہر آئے اور انہوں نے تاتاریوں کو مار بھگایا اور لاشیں شہر میں لے آئے۔ ④

ان ایام میں تاتاریوں نے اپنے پڑاؤ کے گرد ایک فصیل تعمیر کر لی ⑤ جس کے باعث وہ شب خون سے محفوظ ہو گئے۔ عنبر حبشی اور سیف الدین جیسے جری مجاہدوں کے لیے بھی اب چھاپہ مار حملے کرنا مشکل تھا کیوں کہ ان کے برق رفتار گھوڑے بھوک سے مرنے کے قریب تھے۔ آخر انہوں نے گھوڑے ذبح کر کے ان کے گوشت پر گزارا شروع کیا۔ ساتھ ہی محمد الکامل سے اجازت طلب کی کہ ہم پیدل نکل کر دشمن پر حملہ کریں مگر اس نے اجازت نہ دی۔

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۰۹، ۵۱۱

② البداية والنهاية: ۱۷/۳۰۰

مقریزی کے مطابق الناصر مصر کی سرحدی بستی ''قطیا'' تک پہنچ گیا تھا اور سیف الدین قطز اپنا لشکر لے کر الصالحیہ تک آ گیا تھا، دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں کچھ خدشات بھی تھے (کیوں کہ ماضی میں الناصر مصر پر قبضے کے لیے کوشاں رہا تھا لہٰذا قطز بھی محتاط تھا اور اُدھر الناصر کو خدشہ تھا کہ کہیں مجھ سے مصر والے بدلہ نہ لیں۔) جن کے باعث الناصر سرحد سے واپس ہو گیا۔ (السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۱۳، ط العلمية)

③ سير اعلام النبلاء: ۲۳/۲۰۱، ۲۰۲، ط الرسالة

④ الاعلاق الخطيرة لابن شداد، ۱۹۱، ط الشاملة

⑤ سير اعلام النبلاء: ۲۳/۲۰۱، ۲۰۲، ط الرسالة

انہی ایام میں شہر کے کچھ جاں بلب لوگوں نے لشکرِ تاتار کے امراء کو پیغام بھیجا:

''یہاں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ اگر تاتاری اندر گھسیں تو یہاں لڑنے کے قابل کوئی نہیں ملے گا۔''[1]

تاہم تاتاریوں نے اس وقت اس بات پر یقین نہ کیا اور فصیل پر چڑھنے کی جرأت نہ کی۔[2]

دو غلاموں کی غداری۔ سقوطِ میافارقین:

مگر چند دن بعد شہر میں ایک معمولی واقعے نے تاتاریوں کا کام آسان کر دیا۔ ہوا یہ کہ شہر کے ایک امیر افتخار الدین کے دو غلاموں نے محمد الکامل کے غلاموں سے بدتمیزی برتی جس پر افتخار الدین نے اپنے ان غلاموں کو بُرا بھلا کہا اور ان کی پٹائی بھی کر دی۔ ان دونوں کو بہت طیش آیا اور انہوں نے خفیہ طور پر تاتاریوں سے رابطہ کر کے پوچھا:

''اگر ہم شہر تمہارے حوالے کرا دیں تو ہمارا انعام کیا ہوگا؟'' جواب ملا: ''پورا شہر تمہارا ہوگا۔''

دونوں غلاموں نے انہیں پیغام بھیجا: ''جمعرات ۲۳ ربیع الآخر کو بوقتِ سحر پہرے دار مصروف ہوں گے، ہم ایک سیڑھی نصب کر دیں گے، تم اس کے ذریعے فصیل پر آ جانا۔''

بد قسمتی سے اس دن سحر کے وقت کئی اہم افسران فصیل پر نہ تھے اور یہ سمت بالکل خالی رہ گئی تھی۔ تاتاری ان غلاموں کے بتائے ہوئے گوشے سے سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھ گئے۔ امیر حسام الدین آبٹ سن کر اس طرف آیا اور بڑی بہادری سے لڑتا رہا مگر آخر تیروں کے ۲۷ زخم کھا کر شہید ہو گیا۔ صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے چھ ہزار سپاہی شہر میں اتر چکے تھے۔ محمد الکامل اور امیر علم الدین سنجر یہ خبر ملتے ہی گھوڑوں پر سوار ہو کر تاتاریوں کو روکنے کے لیے نکلے مگر ایک شدید جھڑپ کے بعد علم الدین گرفتار ہو گیا جبکہ محمد الکامل پلٹ کر ایک بُرج میں محصور ہو گیا۔[3]

یہ جھڑپ شہر کی بیرونی اور اندرونی فصیل کے درمیان ہوئی تھی۔ اب تاتاری اندورنی فصیل پر چڑھ گئے مگر انہیں شہر میں گھسنے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ گلی کوچوں میں مسلمان گھات لگائے نہ بیٹھے ہوں۔ کئی دن بعد جب انہیں کوئی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی تو وہ اندر داخل ہوئے۔ تب معلوم ہوا کہ شہر کے ہزاروں محافظوں اور شہریوں میں سے صرف ۹۰ اَفراد زندہ ہیں۔[4] شہر قبرستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ لوگوں کے مُردہ اجسام اوپر تلے پڑے تھے۔[5]

تاتاریوں نے اب اُس بُرج کا محاصرہ کر لیا جس میں میافارقین کا مردِ آہن محمد الکامل آخری مورچہ بنائے ہوئے تھا۔ یہاں بھی سخت لڑائی ہوئی یہاں تک کہ محمد الکامل کے تمام ساتھی ایک ایک کر کے شہید یا گرفتار ہو گئے۔ آخر میں وہ اپنے غلام قراسنقر کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ تاتاریوں نے جان بخشی کی ضمانت دے کر اسے حراست میں لے لیا۔[6]

---

① جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۲۱، ۳۲۲

② سیر اعلام النبلاء: ۲۰۲/۲۳، ط الرسالۃ

③ الاعلاق الخطیرۃ لابن شداد، ص ۱۹۱، ط الشاملۃ

④ سیر اعلام النبلاء: ۲۰۲/۲۳، ط الرسالۃ

⑤ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۲۲

⑥ الاعلاق الخطیرۃ لابن شداد، ص ۱۹۲، ط الشاملۃ ؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۰۲/۲۳، ط الرسالۃ

شیروں کے جوڑے کا آخری دم تک جہاد:

میافارقین کے آخری دو مجاہد: سیف الدین اور عنبر حبشی اب بھی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھے۔ تاتاری شہر سے مال و اسباب لوٹ رہے تھے اور یہ دونوں شیر ایک مکان کی چھت پر چڑھ کر گلی سے گزرنے والے ہر سپاہی پر تیراندازی کر رہے تھے۔ آخر تاتاری سردار ''ارتقو'' خود چنیدہ سپاہیوں کا ایک جتھہ لے کر وہاں پہنچا اور انہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر دونوں جیالے میدان میں آ کودے اور نہایت بے جگری سے لڑتے ہوئے بہت سے دشمنوں کو فنا کرنے کے بعد آخر خود بھی جام شہادت نوش کر گئے۔ ①

محمد الکامل کی ہلاکو کے دربار میں جرأتِ رندانہ:

تاتاریوں نے محمد الکامل کو گرفتار کر کے ہلاکو خان کے پاس بھیج دیا جو اس وقت شام سے واپسی پر ''سروج'' کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ ② ہلاکو خان نے الکامل کو اپنے سامنے پا کر طنزیہ انداز میں کہا:

''تم مغلوں کے قوانین جانتے ہو۔ ہمارے ہاں تین گناہ معاف ہیں۔ چوتھے گناہ کی سزا قتل ہے۔ تمہارا پہلا گناہ یہ ہے کہ میں نے ہمدان میں تمہیں شراب پلانے کی کوشش کی تھی مگر تم نے انکار کر دیا۔ دوسرا گناہ یہ ہے کہ میں نے حکم دیا تھا کہ آمد کی فصیل مسمار کر کے اسے رکن الدین حاکم سلاجقۂ روم کے حوالے کر دو مگر تم نے یہ بھی نہ کیا۔ تیسرا گناہ یہ ہے کہ میں نے تمہیں حکم بھیجا تھا کہ اپنے بھائیوں سمیت میرے پاس بغداد پہنچو اور خلیفہ سے لڑو مگر تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ چوتھا گناہ یہ ہے کہ میں تمہارے شہر تک آیا مگر تم مجھ سے ملنے باہر نہ آئے اور کوئی ہدیہ تک نہ بھیجا، نہ کوئی ضیافت کی۔ شاید تم نے مرتے دم تک میرا چہرہ تک نہ دیکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔''

یہ سن کر الکامل نے بڑی حقارت سے کہا: ''تم ہو کون کہ میں تمہارا چہرہ دیکھنے کے لیے مشقت اٹھاتا۔ تمہارا نہ کوئی دین ہے نہ کوئی قول وقرار۔ تم ایک بے دین انسان ہو جس سے جہاد واجب ہے۔ میں تم سے بہتر ہوں۔''

ہلاکو نے طیش میں آ کر کہا: ''تم کس بات میں مجھ سے بہتر ہو؟''

الکامل نے کہا: ''میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہوں۔ میرے پاس دین بھی ہے اور امانت بھی۔ اقتدار بہر حال اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جسے چاہے عطا کر دے، جس سے چاہے چھین لے۔ ہمارے خاندان کی حکومت یمن سے تبریز تک تھی، اب وہ ہم سے چھن گئی۔ اسی طرح اللہ جب چاہے گا وہ تمہارے خلاف ایسے لوگ بھیج دے گا جو تمہیں قتل کریں گے اور تمہاری اولاد کو غلام بنالیں گے اور تمہارے لشکر میں سے کسی کو نہ چھوڑیں گے۔''

ہلاکو لاجواب ہو کر بولا: ''تمہاری باتیں تمہارے مرتبے سے اُونچی ہیں، تم ایک چھوٹے بادشاہ ہو۔'' ③

---

① جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۲۲، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

② الاعلاق الخطیرۃ لابن شداد، ص ۱۹۲، ایک روایت کے مطابق ہلاکو خان اس وقت ''زہا'' میں تھا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۲۰۲، ط الرسالۃ) ایک روایت کے مطابق وہ اس وقت ''تل باشر'' میں تھا۔ (جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۲۲)

③ الاعلاق الخطیرۃ لابن شداد، ص ۱۹۲، ط الشاملۃ (یہ تمام مقامات الجزیرہ کے ہیں۔

محمد الکامل کی شہادت:

ہلاکو اس وقت شراب پی رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ محمد الکامل شراب سے سخت پرہیز کرتا ہے مگر تمسخر کے طور پر اس نے شراب کا پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ محمد الکامل تلخ لہجے میں بولا: ''یہ حرام ہے۔''

مگر ہلاکو نے اسے مزید زچ کرنے کے لیے اپنی بیگم کو کہا: ''تم اسے جام پلا دو۔''

محمد الکامل نے جو زندگی اور موت سے بے نیاز ہو چکا تھا، اس اوچھی حرکت پر ہلاکو خان کے منہ پر تھوک دیا۔ ہلاکو غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے الکامل کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ ①

اس شیرِ نر کو اس طرح شہید کیا گیا کہ ایسی بہیمیت کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے ایک ایک عضو کو کاٹا جاتا تھا اور کٹی ہوئی بوٹیاں اسی کے منہ میں ٹھونسی جاتی تھیں۔ ② آخر میں محمد الکامل کا سر قلم کر دیا گیا اور اس کٹے ہوئے سر کو دمشق بھیجا گیا جہاں ۲۷ جمادی الاولیٰ ۶۵۸ھ کو ڈھول پیٹ کر سارے شہر میں سر کی نمائش کرائی گئی۔ ③

اُسوۂ حسینی پر عمل:

محمد الکامل کی جرأت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک شاعر نے کہا:

اِبْنُ غَازٍ غَزَا وَجَاهَدَ قَوْماً ...... اَثْخَنُوْا فِي الْعِرَاقِ وَالْمَشْرِقَيْنِ

''غازی کے بیٹے نے جنگ لڑی اور اس قوم سے جہاد کیا جو عراق اور مشرق و مغرب کو خون سے تر کر چکی تھی۔''

ظَاهِراً غَالِباً وَمَاتَ شَهِيْداً ...... بَعْدَ صَبْرٍ عَلَيْهِمْ عَامَيْنِ

''وہ دو سال تک (دشمنوں کے سامنے) ثابت قدم رہنے کے بعد فتح مند و غالب رہا اور شہید کی موت مرا۔''

لَمْ يَشِنْهُ اَنْ طِيْفَ بَالرَّاْسِ مِنْهُ ...... فَلَهٗ اُسْوَةٌ بِرَاْسِ الْحُسَيْنِ

''اس کے سر کی نمائش اس کے لیے عیب نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر اس کے لیے بہترین نمونہ ہے۔'' ③

کتبغا نویان...... انسان نما درندہ:

ہلاکو کو حلب پسند آ گیا تھا اور وہ وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا اگلا نشانہ دمشق تھا جسے سر کرنے کے لیے اس نے اپنے پرانے جنگجو سردار کتبغا نویان کو بھیج دیا ⑤ جس کی سفاکی اور عیاری کے قصے اتنے مشہور تھے کہ لوگ اس کا نام سن کر لرز

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۳ / ۲۰۲، ط الرسالۃ ④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول، ص ۳۲۳

② سیر اعلام النبلاء: ۲۳ / ۲۰۲، ط الرسالۃ؛ ذیل مرآۃ الزمان: ۱ / ۳۵۹، ط دار الکتاب قاھرہ

③ ذیل مرآۃ الزمان: ۱ / ۳۵۹، ط دار الکتاب قاھرہ، حصین بن عبد الرحمٰن (راوی صحیح بخاری) کی صحیح روایت کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کو بھی دمشق لایا گیا تھا، اگرچہ علامہ ابن تیمیہ نے اس پر رد کیا ہے مگر ان کا موقف خود محلِ نظر ہے۔ یہ بحث ''ازالۂ شبہات'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

⑤ تاتاریوں کے ہاں کتبغا کے مقام کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اس کی مجلس میں حمص کا حاکم الاشرف حاضر تھا۔ کتبغا نے اس سے پوچھا: ''تم نے کس سے پوچھ کر تیزر کے محصولات میرے بیٹے ہلاکو خان کو بھیجے؟'' اس نے کہا: ''حضور ہلاکو خان کے حکم سے۔'' کتبغا بگڑ کر بولا: ''تمہارے اندر رحم سرکشی ضرور ہے ورنہ میرا ہلاکو جب مجھے کسی علاقے کی طرف بھیجتا ہے تو وہاں کے معاملات کے متعلق میرے سوا کسی سے رابطہ نہیں کرتا، تمام امور پر مجھ سے ہی بات کرتا ہے اور میرے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔'' (الروض الزاهر في سيرة الملك الظاهر لمحي الدين عبد الظاهر، ص ۶۶، ۶۷، ط ریاض)

جاتے اور اسے قہرآسمانی تصور کرتے تھے۔ وہ ہلاکو خان کے دادا چنگیز خان کے دور سے تاتاری فوج میں ایک نمایاں مرتبہ رکھتا تھا، ہلاکو کی تمام فتوحات کا سہرا اسی کے سر تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہی وہ خبیث تھا جس نے ہلاکو خان کے لیے بلاد عجم سے لے کر شام تک کے علاقے مسخر کیے۔ اس بدبخت نے مسلمانوں کے مقابلے میں ایسے ایسے داؤ پیچ آزمائے جن کی مثال سے پہلے زمانے کی تاریخ خالی ہے۔''[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کے جنگی حربوں کی چند مثالیں دی ہیں جو درج ذیل ہیں:

❶ وہ ایک شہر فتح کرنے کے بعد اس کے لڑنے بھڑنے کے قابل افراد کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے شہر کا محاصرہ کر لیتا۔ پھر محصورین سے یہ مطالبہ کرتا کہ ہمارے ساتھ آنے والے مسلمانوں کو اپنے شہر میں جگہ دو تاکہ ان کے رہنے سہنے کا کوئی انتظام ہو سکے، بظاہر اس کا یہ مطالبہ مسلمانوں کے لیے ہمدردانہ معلوم ہوتا بلکہ بعض اوقات محصورین اپنی افرادی قوت میں اضافے کے پہلو کو دیکھ کر اسے اپنے لیے مفید خیال کرتے، مگر حقیقت میں یہ محصورین کو زیر کرنے کی تدبیر تھی۔

❷ اگر محصورین اس کی بات مان کر اس کے ساتھ آنے والے مسلمانوں کو شہر میں جگہ دے دیتے تو لازمی طور پر محصورین کی تعداد بڑھ جانے سے خوراک کے ذخائر جلد ختم ہو جاتے اور محاصرے کی مدت خود بخود مختصر ہو جاتی۔

❸ اگر محصورین اس کی چال سمجھ کر یہ مطالبہ نہ مانتے تو کتبغا اپنے ہمراہی مسلمانوں کو ان کے خلاف بھڑکا کر ان سے لڑنے کا حکم دے دیتا اور اس وقت تک ان کو لڑاتا رہتا جب تک کہ وہ شہر کو فتح نہ کر لیتے یا خود لڑتے لڑتے ختم نہ ہو جاتے۔

❹ اگر وہ شہر فتح کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو کتبغا نویان کو اپنا ایک آدمی ضائع کیے بغیر اپنا مقصد حاصل ہو جاتا اور اگر وہ لڑتے لڑتے فنا ہو جاتے تو بھی اس میں مسلمانوں ہی کی نسل کشی ہوتی جس سے کتبغا نویان ایک دلچسپ تماشے کی طرح لطف اندوز ہوتا۔ نیز اس باہم مسلم کش لڑائی میں محصورین کی قوت بھی کم ہوتی رہتی جس کے بعد یہ مکار جنگجو کم سے کم افرادی نقصان اٹھا کر بڑے بڑے شہروں کو آسانی سے فتح کر لیتا۔

❺ اس کی ایک چال یہ بھی تھی کہ کبھی وہ محصورین کو خیر خواہی کے انداز سے یہ پیغام دیتا:

''اے شہر والو! تمہارے پاس پانی کا ذخیرہ بہت کم ہے جو عن قریب ختم ہو جائے گا اور تم میں سے کسی کو جان کی امان نہ ملے گی ہم تمہارے تمام مردوں کو قتل کر دیں گے، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لونڈیاں اور غلام بنا لیں گے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس بُری حالت کے پیش آنے سے قبل ہی شہر بطور صلح ہمارے حوالے کر کے اپنی جانیں بچا لو۔''

❻ اگر شہر والے اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوتے اور جواباً یہ کہلوا دیتے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی، ہمارے ہاں پانی کا وافر ذخیرہ موجود ہے، ہم ایک عرصے تک تمہارا مقابلہ کر سکتے ہیں..... تو کتبغا نویان انہیں کہتا:

''مجھے اس بات کا موقع دو کہ میں تمہارے پانی کے ذخیرے کی تصدیق کر سکوں، اس لیے کہ اگر میرا گمان غلط

① البدایة والنهایة: سنة ٦٥٨ھ

ہے اور واقعی تمہارے پاس پانی بکثرت ہے تو پھر ہمیں طویل عرصے تک محاصرے کی کلفت اٹھانے کا کیا فائدہ؟ ہم محاصرہ اٹھا کر چلے جائیں گے۔''

شہر والے اس پیش کش کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر جواباً کہتے:

''آپ بصد شوق اپنے چند معتمد آدمیوں کو بھیج کر ہمارے پانی کے ذخیرے کی کثرت کی تصدیق کرلیں۔''

تب کتبغا نویان اپنے چند سپاہیوں کو شہر بھجوا دیتا، ان کے پاس لمبے لمبے نیزے ہوتے، بظاہر یہ چند نیزے شہر والوں کے لیے کسی خطرے کا باعث معلوم نہیں ہوتے تھے، مگر درحقیقت ان میں پورے شہر کی موت کا پیغام پوشیدہ ہوتا تھا۔ یہ نیزے ایک قسم کا انجکشن تھے، ان کی لکڑی اندر سے کھوکھلی تھی، اس کھوکھلے حصے میں نہایت زہریلا سیال مادہ بھر دیا جاتا تھا، نیزوں کو اس ترکیب سے بنایا گیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر زہر کو ایک خاص طریقے سے خارج کیا جاسکتا تھا۔ شہر والے ان نیزہ برداروں کو بے ضرر سمجھ کر ان کے لیے شہر کے دروازے کھول دیتے اور انہیں اپنے تالابوں، کنوؤں اور حوضوں پر لے جاتے۔ یہ مکار تاتاری اپنے نیزے پانی میں ڈبو ڈبو کر بظاہر پانی کی پیائش کرتے اور ساتھ ہی ساتھ اس پانی میں زہر ٹپکاتے جاتے حتیٰ کہ شہر کا سارا پانی زہر آلود ہو جاتا۔ بعد میں جب شہر والے پانی استعمال کرتے تو ان کی خاصی تعداد اسی سے ہلاک ہو جاتی اور باقی افراد ہتھیار ڈال دیتے۔ [1]

سقوطِ دمشق:

یہی کتبغا نویان اب دمشق پر حملہ آور فوج کا قائد تھا۔ صفر ۶۵۸ھ کے اواخر میں تاتاری لشکر دمشق جا پہنچا۔ شہر میں کوئی ایسا رہنما نہ تھا جو لوگوں کی قیادت کرتا۔ ایسے میں ملت فروش رئیس زین الدین حافظی نے لوگوں کو یقین دلایا کہ ہلاکو خان کی اطاعت ہی میں ہماری بھلائی ہے۔ چنانچہ شہر والوں نے مایوس ہو کر شہر کے دروازے کھول دیے اور لشکرِ کفار کا استقبال کیا۔ ہلاکو خان نے اہلِ شہر کے نام امان نامہ بھیجا تھا جو شہریوں کی اجتماع گاہ میدانِ اخضر میں پڑھ کر سنایا گیا۔ زین حافظی نے شہر کے امراء سے بہت کچھ مال و دولت وصول کر کے اس سے تحائف خریدے اور ہلاکو اور اس کے سرداروں کو پیش کر کے ان کے ہاں اپنا قد و کاٹھ اونچا کیا۔

دمشق کا قلعہ دار بدر الدین ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ تھا اور قلعہ بند ہو چکا تھا۔ تاتاری مہینہ بھر اس کا محاصرہ کیے رہے مگر بے سود۔ آخر کتبغا نویان نے درجنوں منجنیقوں کو بیل گاڑیوں پر لدوا کر قلعے کے سامنے پہنچا دیا۔ مسلسل سنگ باری نے قلعے میں شگاف ڈال دیے اور بالآخر جمادی الاولیٰ ۶۵۸ھ کے وسط میں قلعہ سر کر لیا گیا۔ قلعہ دار کو اس کے ساتھیوں سمیت موت کے گھاٹ اتار کے قلعے کو مسمار کر دیا گیا۔ [2]

دمشق پر تاتاریوں کے قبضے کے ساتھ ہی شام مکمل طور پر ان کے زیرِ نگین ہو گیا۔ بیت المقدس، کرک اور شوبک کے

---

[1] البدایة والنهایة: سنة ۶۵۸ھ

[2] السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۱۱ تا ۵۱۳، ط العلمیة

حاکم المغیث عمر نے تاتاریوں کی اطاعت قبول کرلی، یوں پورا شام، اردن اور فلسطین سمیت ان کے قبضے میں آگیا۔[1]

دمشق میں مسلمانوں کی حالتِ زار:

دمشق پر تاتاریوں کے قبضے سے جہاں مسلمانوں کا صدمے سے برا حال تھا وہاں عیسائی جشنِ مسرت منارہے تھے۔ شہر ایک تاتاری سردار ''ایل سبان'' کے حوالے کردیا گیا جو نصرانیوں کا حامی اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ نصرانی پادری اور راہب جا کر اس سے ملے۔ اس نے ان کی بڑی تعظیم کی اور ان کی عبادت گاہوں کا دورہ کیا۔ اس طرح مقامی نصرانیوں کی بن آئی۔ عیسائیوں کا ایک وفد حلب جا کر ہلاکو خان سے بھی ملا۔ ہلاکو نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ واپس بھیجا۔ یہ وفد خوشی کے شادیانے بجاتا شہر واپس آیا۔[2]

شیخ قطب الدین یونینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''دمشق کے نصرانی مسلمانوں کے خلاف بڑے بے باک اور مغرور ہو چکے تھے اور زبان درازی پر اتر آئے تھے کیوں کہ (تاتاری حاکم) ایل سبان اور دوسرے تاتاری سرداران کے گرجوں میں آتے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض نصرانی ہلاکو خان کے پاس گئے اور اس سے ایسا حکم نامہ لے کر آئے جس میں نصرانیوں کی رعایت اور لحاظ رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ (واپسی پر اس وفد میں شامل) نصرانی بابِ توما سے داخل ہوئے، وہ صلیب کو لوگوں کے سروں پر بلند کر رہے تھے، اپنے مخصوص نعرے لگا رہے تھے اور پکار پکار کر نصرانیت کے غلبے کا اعلان کر رہے تھے اور اسلام کی مذمت کر رہے تھے۔ انہوں نے لوگوں پر شراب اور مساجد کے دروازوں پر شراب کا چھڑکاؤ کیا۔ پس اس صورتحال سے مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا۔''

''بابِ توما سے آنے والے یہ عیسائی جب شیخ ابوالبیان رحمہ اللہ کی خانقاہ تک پہنچے تو پھر اپنے نعرے لگائے اور خانقاہ کے دروازے پر شراب کا چھڑکاؤ کیا۔ یہی کام انہوں نے مسجدِ کبیر اور مسجدِ صغیر کے ساتھ کیا۔ انہوں نے دکانوں میں موجود لوگوں کو حکم دیا کہ وہ صلیب کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں۔ جو کھڑا نہ ہوا، نصرانیوں نے اسے مارا پیٹا اور بے عزت کیا۔ اس انداز میں وہ پورے بازار سے گزر کر کلیسائے مریم کے چھوٹے بازار کے آخر تک پہنچے۔ کچھ عیسائیوں نے وہاں چوک میں ایک چبوترے پر چڑھ کر نصرانیت کی فضیلت و اسلام کی مذمت بیان کی۔''[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

''نصرانی جامع مسجد میں شراب لے کر داخل ہوئے۔ وہ اس بات کا تہیہ کیے ہوئے تھے کہ اگر تاتاریوں کا قیام زیادہ ہوا تو ہم بہت سی مساجد کو گرادیں گے۔ جب شہر میں یہ حال ہوا تو شہر کے علماء اور قاضی جمع ہوئے اور قلعے کے تاتاری والی ایل سبان کے پاس جا کر عیسائیوں کی شکایت کی مگر انہیں نہایت توہین آمیز سلوک کے ساتھ دھتکار

---

[1] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۵۱۳/۱، ط العلمیۃ [2] البدایۃ والنہایۃ، سنۃ ۶۵۸ھ، ۳۳۹/۱۷

[3] ذیل مرآۃ الزمان: ۱۶۲/۱، ۱۶۳، ط دار الکتاب الاسلامی قاھرہ

دیا گیا اور نصرانیوں کو ان پر ترجیح دی گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔“[1]

سلطانِ شام الملک الناصر کی دربدری اور گرفتاری:

الملک الناصر مصر کی سرحد سے واپس ہو کر ”کرک“ کے مستحکم قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ مگر جب اسے معلوم ہوا کہ تاتاری سردار کتبغا نویان اس قلعے کا محاصرہ کرنا چاہتا ہے تو وہ ڈر کر وہاں سے بھی نکل بھاگا، حالانکہ اگر وہ وہیں محصور رہتا تو تاتاری اسے سال ڈیڑھ سال تک سر نہیں کر سکتے تھے۔ الملک الناصر صحرائے سینا میں اِدھر اُدھر چھپنے لگا جبکہ تاتاری اسے جگہ جگہ کھوج رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے خانہ بدوش بدوؤں کو بھی اپنی غارت گری کا نشانہ بنایا۔ آخر الناصر کے ایک غلام حسین کردی طبل دار نے تاتاریوں سے ساز باز کر کے اسے گرفتار کرا دیا۔[2]

اسے کتبغا نویان کے پاس لے جایا گیا جو ”عجلون“ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ کتبغا نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ عجلون کے قلعہ دار کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرے۔ الملک الناصر نے ایسا ہی کیا اور تاتاری عجلون میں گھس گئے، انہوں نے پورے شہر کو لوٹ مار کر کے تاراج کر دیا۔ اس کے بعد الملک الناصر کو ہلاکو خان کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ہلاکو خان نے اس کی جاں بخشی کر دی اور ایک طفیلی کی طرح اپنے ساتھ رکھ لیا۔ یوں شام پر حکومت کرنے والے ایوبیوں کا یہ عالم فاضل ادیب و شاعر حکمران ایک ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔[3] ہلاکو خان نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے تمام دشمنوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اسے شام میں اپنا نائب مقرر کر دے گا مگر یہ وعدہ کبھی ایفاء نہ ہوا۔[4]

شام میں بدحالی:

تاتاریوں کی حکومت میں شام جیسا خوشحال ملک ایک سال کے اندر اندر شدید بدحالی کا شکار ہو گیا۔ ساحل کے فرنگیوں نے مسلمانوں کے دورِ غلامی سے خوب فائدہ اٹھایا اور کھوٹے سکے ڈھال کر انہیں بازاروں میں رائج کر دیا۔ اس دور کے ایک عالم لکھتے ہیں:

”شام کے لوگ شدید گرانی کا شکار ہوئے۔ ہر چیز چاہے کھانے پینے کی ہو یا کسی اور استعمال کی، گراں قیمت ہو گئی، روٹی دو درہم کی، ایک رطل گوشت پندرہ درہم، ایک رطل انگور دو درہم کے۔ مہنگائی کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ یافا کے فرنگیوں نے بکثرت دراہم ڈھالے جن میں بہت زیادہ ملاوٹ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سو درہم میں صرف پندرہ درہم چاندی ہوتی تھی باقی پیتل ہوتا تھا۔“[5]

---

① البدایۃ والنہایۃ، سنۃ ۶۵۸ھ

② سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۲۰۳ تا ۲۰۵، ط الرسالۃ ؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۸ھ

③ تاریخ الاسلام للذھبی، وفیات: ۶۵۸ھ

④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۰۸

⑤ ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: ۱/ ۴۳۱، ط دار الکتاب الاسلامی قاھرہ

فائدہ: ایک درہم = ۳ گرام سے کچھ زائد چاندی۔ ایک رطل = ۳۹۸ گرام (تقریباً ایک پونڈ)

بیبرس کی مصر واپسی:

مسلمانوں کی آخری اُمید اب مصر کے ممالیک تھے جنہیں کچھ مدت پہلے ہی سیف الدین قطز جیسا جری قائد نصیب ہوا تھا۔ اس وقت تاتاری شام کے چھوٹے بڑے تمام شہروں کو روند چکے تھے اور اب وہ فلسطین کی بستی غزہ تک پہنچ گئے تھے۔ خطرہ محسوس کرتے ہوئے قطز نے فوج کو مضبوط کرنے کی فوری ضرورت محسوس کی اور مصر کے سابق سپہ سالار بیبرس کو واپس بلوالیا جو کچھ مدت پہلے دربارِ شام سے وابستہ ہو گیا تھا۔ قطز کی دعوت پر وہ ۲۲ ربیع الاوّل ۶۵۸ھ کو مصر پہنچا۔ قطز نے شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔[1]

اُدھر مسلسل فتوحات نے تاتاریوں میں مصر پر فوری حملے کی زبردست امنگ پیدا کر دی تھی۔ ہلاکو خان اور اس کے دستِ راست کتبغا نویان کو اس بار بھی اپنی فتح کا مکمل یقین تھا۔

ہلاکو خان کا مراسلہ اور اس کا جواب:

ہلاکو نے اسی زعم میں سفیروں کے ساتھ ایک تہدید آمیز مراسلہ دربارِ مصر بھیجا[2] جس میں درج تھا:

''مشرق و مغرب کے مالک، شہنشاہ خاقانِ اعظم کی طرف سے سیف الدین قطز کے نام جو غلاموں کی نسل سے ہے اور ہم سے بھاگ کر ملک مصر میں جا چھپا ہے۔ قطز، اس کے سارے امراء و اعیانِ سلطنت اور مصر و ملحقہ علاقوں کے لوگ جان لیں کہ ہم زمین میں خدا کا لشکر ہیں۔ تم دوسروں کے انجام سے عبرت پکڑو۔ گرد و غبار چھٹنے اور نادم ہونے سے پہلے اپنے اختیارات ہمارے سپرد کر دو۔ ہم وہ ہیں جو رونے والے پر رحم نہیں کرتے۔ تم جانتے ہو کہ ہم نے اکثر شہر فتح کر کے زمین کو فساد سے پاک کر دیا ہے۔ اب تمہارا کام ہے بھاگنا اور ہمارا کام ہے تعاقب کرنا۔ مگر کونسی زمین ہے جو تمہیں پناہ دے۔ کونسا راستہ ہے جو تمہیں نجات دے۔ ہماری تلواروں سے بچا نہیں جا سکتا۔ ہماری دہشت سے کوئی جائے پناہ نہیں۔ ہمارے گھوڑے برق رفتار، ہمارے تیر جگر پاش اور ہماری شمشیریں آسمانی بجلیاں ہیں۔ ہمارے دل پہاڑوں جیسے اور ہماری تعداد ریت کے ذرّوں کے برابر ہے۔ قلعے ہمیں روکنے سے عاجز ہیں اور فوجیں ہمارے سامنے بے بس ہیں۔ ہم سے جنگ چاہنے والا نادم ہوتا ہے اور امان مانگنے والا سالم۔ اگر تم مخالفت کرو گے تو مرو گے۔ پس خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ تم ہمیں کافر سمجھتے ہو اور ہم تمہیں فاجر۔ تمہاری کثرت ہمارے آگے قلیل ہے اور تمہارے معزز ہمارے نزدیک ذلیل۔ اس فرمان کا جواب جلد از جلد دو، اس سے قبل کہ جنگ کا الاؤ دہکے اور اس کے شعلے تمہاری طرف بڑھیں۔''[3]

---

① البدایة والنهایة: سنة ۶۵۸ھ ، النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۱۰۱/۷، ط دار الکتب مصر

② اس سفارتی وفد میں سفیروں سمیت کل افراد چالیس تھے۔ دیکھیے: جامع التواریخ (عربی) ج ۲ حصہ اوّل: ص ۳۱۰

③ السلوک لمعرفة دول الملوک، ص ۵۱۲، ۵۱۵/۱، ط العلمیة؛ تاریخ وصاف، ص ۲۳ تا ۲۵، ط بمبئی۔ یہ مکتوب کا خلاصہ ہے۔ اصل مکتوب طویل اور مسجع و مقفیٰ عربی میں ہے۔ [illegible] کے ایک مقالے کے مطابق اس کا مخطوطہ مکتبہ الدراسات العلیا بکلیة الآداب، جامعہ بغداد عراق میں (رقم ۵۰۳۹) موجود ہے۔ ابن عربشاہ کے مطابق یہ مراسلہ ہلاکو کے منشی خواجہ نصیر الدین طوسی نے تحریر کیا تھا۔ (عجائب المقدور فی اخبار تیمور ص ۱۳۹)

سیف الدین قطز کی امرائے لشکر سے مشاورت:

سیف الدین قطز نے امرائے سلطنت کے اجلاس میں یہ مراسلہ پڑھ کر سنایا۔ ہلاکو خان کے خط کے دو ہی جواب ہو سکتے تھے: موت سے بدتر ذلت کی زندگی قبول کرنا۔ یا عزت کی موت کے لیے خطرات کے الاؤ میں کود پڑنا۔

قطز نے اس صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے امراء سے مشاورت کی اور کہا:

''ہلاکو خان کا لشکر خراسان سے ایران کی طرف آیا تو کسی خلیفہ، سلطان یا حکمران میں اس سے مقابلے کی تاب نہ تھی۔ وہ تمام ممالک پر قابض ہوگیا۔ پھر وہ دمشق تک آن پہنچا۔ اگر اُسے اپنے بھائی (منگوخان) کی وفات کی خبر نہ ملتی تو وہ مصر کا حشر بھی باقی اسلامی دُنیا جیسا کر چکا ہوتا۔ اس کے باوجود وہ اس سمت کتبغا نویان کو بھیج چکا ہے جو خونخوار شیر اور بل میں چھپے ہوئے اژدھے سے کم نہیں۔ جب وہ مصر کا رُخ کرے گا تو کسی میں اس سے مقابلے کی طاقت نہ ہوگی۔ پس وقت ہاتھ سے نکلنے سے پہلے ہی ہمیں تدبیر سوچ لینی چاہیے۔''

خدشہ تھا کہ اکثر امراء ہلاکو سے امان طلب کرنے کی رائے دیں گے مگر اس سے پہلے ہی امیر ناصر الدین قیمری نے ایسی حکمت آمیز گفتگو کی جس میں ان امراء کے دلائل بھی آگئے اور ان کی تردید بھی۔ امیر قیمری نے کہا:

''ہلاکو خان چنگیز خان کا پوتا، تولی خان کا بیٹا اور منگوخان کا بھائی ہے، اس کی شہرت محتاجِ بیان نہیں۔ چین سے مصر کی سرحد تک تمام علاقے اس کے قبضے میں ہیں۔ اسے خصوصی آسمانی تائید حاصل ہے۔ اگر ہم اس کے پاس جا کر امان طلب کریں تو اس میں کوئی عار کی بات نہ ہوگی۔ مگر خود زہر پھانک لینا کوئی عقل کی بات نہیں۔ دراصل ہلاکو خان ایسا شخص ہے ہی نہیں جس پر اعتبار کیا جا سکے۔ اسے سر کاٹ دینے کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کسی وعدے یا معاہدے کا پابند نہیں۔ اس نے دھوکے سے علاؤ الدین خورشاہ، خلیفہ مستعصم، حسام الدین عکہ اور حاکمِ اربل کو قتل کیا جبکہ وہ انہیں امان کا عہد دے چکا تھا۔ اگر ہم اس کے پاس جائیں گے تو ہمارا انجام بھی ان سے مختلف نہ ہوگا۔''

یہ سن کر قطز نے کہا: ''صورتحال یہ ہے کہ دیارِ بکر، ربیعہ اور شام کے تمام علاقے تباہ ہیں۔ بغداد سے ایشیائے کوچک تک بربادی ہی بربادی ہے۔ وہاں کھیتیاں، نسلیں، بیج اور جانوروں کے جوڑے نایاب ہو گئے ہیں۔ اگر ہم تاتاریوں سے قتال کے لیے یہاں صف بندی کریں گے تو مصر بھی باقی علاقوں کی طرح اجڑ جائے گا۔ اب تاتاریوں کے مقابلے میں ہمارے پاس تین ہی راستے ہیں: صلح، جنگ یا وطن سے ہجرت کرنا۔ وطن سے ہجرت کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ ہمارے پاس سوائے مَرّاکُش کے کوئی جائے پناہ نہیں اور وہ علاقہ یہاں سے بہت ہی دور ہے۔''

ناصر الدین قیمری نے فوراً بات بڑھاتے ہوئے کہا:

''اور تاتاریوں سے صلح بھی مناسب نہیں کیوں کہ ان کا وعدہ اور عہد ناقابلِ اعتبار ہے۔''

یہ سن کر کئی امراء نے کہا: ''مگر ہم تاتاریوں سے جنگ کی طاقت نہیں رکھتے۔ اب آپ ہی بتائیے کیا کرنا ہے۔''

قطز نے کہا: ''میری رائے یہ ہے کہ ہم سب جمع ہو کر جہاد کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ اگر فتح نصیب ہوئی تو وہی

مقصود ہے۔ اگر شکست ہوئی تو ہم مخلوقِ خدا کے سامنے شرمسار نہیں ہوں گے۔"

سب نے بظاہر اس رائے سے اتفاق کیا اور مجلس برخواست ہوگئی۔[1]

اب قطز نے ہلاکو کے مراسلے کا جواب دینے کے لیے بیبرس بندقداری کو خلوت میں بلا کر مشورہ طلب کیا۔ بیبرس کے نزدیک ہلاکو خان کا مراسلہ ایسا تحکمانہ تھا کہ اس کا جواب زبان سے دینا مؤثر نہیں تھا۔

اس نے کہا: "میری رائے یہ ہے کہ سفیروں کو قتل کر دیا جائے اور ہم مل کر کتبغا نویان کی طرف فوج کشی کر دیں۔ جیتیں یا ہاریں، دونوں صورتوں میں ہم پر کوئی الزام نہ ہوگا۔" قطز نے اس رائے سے اتفاق کیا۔[2]

جہاد کی تیاریاں:

قطز نے امرائے سلطنت کو جہاد کے لیے جمع ہونے کا حکم دیا۔ حماۃ کے حاکم الملک المنصور کو ان الفاظ کے ساتھ بلاوا بھیجا: "ان دنوں دسترخوان آراستہ کرنے کا خیال ترک کر دو، بس ہر سپاہی کو گوشت کا ایک ایک پارچہ دو اور جلد از جلد پہنچو۔"[3] حمص کے حاکم الاشرف مظفر الدین موسیٰ اور بانیاس کے حاکم الملک السعید بن الملک العزیز کے پاس سفیر بھیج کر جہاد کے لیے مدد طلب کی گئی۔ اگرچہ یہ دونوں ہلاکو کے باج گزار بن چکے تھے مگر الاشرف نے حوصلہ افزا جواب دیا اور کہا: "اللہ کا شکر ہے جس نے قطز کو دین کی نصرت کے لیے کھڑا کیا۔" اس نے سفیر سے وعدہ کیا کہ اگر اس کی فوج تاتاریوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں آئی تو موقع ملتے ہی پسپا ہو کر باقی لشکر کو پست ہمت کر دے گی۔

مگر الملک السعید نے قطز کے سفیر کو دھتکار دیا اور کہا: "کون ہے جو اس چھوکرے (قطز) کی اطاعت کرے؟"[4]

اُدھر مصر کے تمام صوبوں اور شہروں میں منادی کرائی جا رہی تھی:

"جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلو۔ دینِ محمدی کی نصرت کے لیے نکلو۔"

تمام نائبین کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں سپاہیوں کو جمع کریں اور ان کے لیے سامانِ حرب، انتظامِ سفر اور رسد کا خاطر خواہ انتظام کریں، اگر کوئی سپاہی ڈر کر روپوش ہو گیا ہو تو اسے ڈھونڈ کر اس کی پٹائی کی جائے۔[5]

تاتاری سفیروں کا قتل:

لشکر کی روانگی سے قبل مراسلہ لانے والے چاروں سفیروں کو قتل کر کے ان کے سر چوراہوں پر آویزاں کر دیے گئے۔ ان کے معاونین میں سے ایک لڑکے کو جو کم عمر تھا، قطز نے غلام بنا لیا۔[6] اگرچہ قاصد کا قتل درست نہ تھا مگر قطز اور اس کے دستِ راست بیبرس کے سامنے تاتاریوں کے وہ مظالم تھے جن کی کوئی حد و انتہا نہ تھی، شاید اسی لیے انہیں ہاتھ آئے ان تاتاریوں کو زندہ چھوڑنے کی گنجائش محسوس نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ ایک تو

---

① جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۰ تا ۳۱۳ ② جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۳

③ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۸ھ ؛ النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ: ۱۰۱/۷، ط دار الکتب مصر

④ نہایۃ الارب للنویری: ۴۷۳/۲۹ ⑤ السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۵۱۵/۱، ط العلمیۃ

⑥ السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۵۱۵/۱

اہلِ مصر کے دلوں سے تاتاریوں کا خوف نکال دیا جائے، دوسرے تاتاریوں کی تیاری سے پہلے ہی اپنی صف بندی کر لی جائے، اس لیے نہ صرف یہ کہ مراسلے کا کوئی جواب نہیں دیا گیا بلکہ کسی کو چھوڑا ہی نہیں گیا کہ وہ جا کر ہلاکو خان کو مصر کے دربار کا فیصلہ سناتا۔ ①

قاہرہ سے لشکر کی روانگی۔ افسران کی ہمت افزائی:

قطز کی ہمت و تدبیر عام لوگوں سے کہیں بلند تھی۔ اللہ نے اس مردِ مجاہد کے دل میں یہ خیال جاگزیں کر دیا تھا کہ تاتاریوں کو مصر کی سرحدوں تک پہنچنے کا موقع دینا زیادہ خطرناک ہوگا۔ اس کی بجائے خود جارحانہ حملہ کرنے سے مسلمانوں کی ہمت قوی ہوگی اور دشمن پر رعب طاری ہو جائے گا۔ مگر اکثر امرائے فوج کو قطز کی تدبیر پر بھروسہ نہ تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مصر کی سرحدوں کا دفاع ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو تاتاریوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کو بچاؤ کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔

۱۵ شعبان ۶۵۸ھ (اگست ۱۲۶۰ء) کو لشکر قاہرہ سے روانہ ہوا اور الصالحیہ میں جا کر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں لشکر جمع ہوتا رہا۔ اکثر امراء اس جنگ میں شرکت سے گھبرا رہے تھے۔ مگر حکمِ شاہی کے تحت بادلِ نخواستہ ساتھ چل پڑے تھے۔ قطز نے ان سب کو بلایا اور انہیں کھلے دل سے اپنی آراء ظاہر کرنے کا موقع دیا۔

عجیب بات یہ سامنے آئی کہ تقریباً سبھی نے مصر سے نکل کر جارحانہ حملے کو غلط تدبیر قرار دیا اور سلطان کے ساتھ چلنے میں پس و پیش ظاہر کی۔ اب صورتحال بڑی نازک ہوگئی تھی۔ اگر معاملہ اسی طرح رہتا تو عالم اسلام کے دفاع کا آخری مورچہ مصر بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ ایسے میں قطز نے اپنی قائدانہ اور خطیبانہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے امراء اجلاس میں ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا:

''امرائے مسلمین! تمہیں بیت المال کا روپیہ کھاتے ایک مدت گزر گئی۔ آج ضرورت کے وقت تم جہاد سے کترا رہے ہو!! میں جنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ جو جہاد کرنا چاہے ساتھ چلا آئے۔ جو نہ چاہے، اپنے گھر چلا جائے۔ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ مسلمانوں کی عورتیں باندیاں بنیں تو اس کی ذمہ داری انہی پیچھے رہنے والوں پر ہوگی۔''

سوزِ دل و جگر سے بھرپور اس مختصر سی تقریر نے بہت سے امراء کی غیرت کو جھنجھوڑ ڈالا۔ انہوں نے قطز کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور لڑنے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ یہ دیکھ کر باقی امراء بھی خواہی نخواہی جنگ کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ لشکر تیار ہوا جس میں مصری، شامی، عرب اور ترکمان سبھی شامل تھے۔ اسی شب قطز نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا اور ساتھ ہی مضطرب امراء کو غیرت دلانے کے لیے اعلان کیا: ''میں تاتاریوں سے لڑنے خود جا رہا ہوں۔''

اس اعلان کے بعد کسی افسر یا سپاہی کو پیچھے رہنے کا یارا نہ رہا۔ ② سب سمجھ گئے کہ:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں...... اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۱۵، ط العلمیۃ ② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۱۵، ط العلمیۃ

لشکر کی روانگی...... یلغار کا راستہ:

چنانچہ مصری فوج نے بڑی سرعت کے ساتھ صالحیہ سے یلغار شروع کی اور صحرائے سینا عبور کر کے ساحل کے ساتھ غزہ کا رخ کیا۔ آج ہم اسلامی فوج کی پیش قدمی کا نقشہ دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے۔ یہ فوج ایسے راستے سے گئی تھی جس کی کسی کو توقع نہ تھی۔ پورا منصوبہ قطز کی ذہانت کا کرشمہ تھا جس کے باعث اسلامی فوج اپنے ہدف تک اس سلامتی سے پہنچی کہ اسے کہیں کسی مزاحمت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ حالانکہ تاتاریوں کے دستے ان دنوں شام میں پھیل کر عجلون، صرخد اور بصریٰ کو تہس نہس کر چکے تھے اور اب شام و مصر کے درمیان واقع غزہ پر چھاپے مار رہے تھے۔ ①

ترکمان امراء اور شاہی خانوادے کے کئی نامور سپوتوں کی جمعیتیں سلطان کے لشکر میں شامل تھیں۔ سلطان قطز نے کہنہ مشق جرنیل رکن الدین بیبرس کو لشکر کے ہراول دستے کی قیادت سپرد کر کے ہدایت کی کہ وہ غزہ پہنچ کر تاتاریوں کی پیش قدمی کی ہر اطلاع قلبِ لشکر کو پہنچائے۔ بیبرس صحرائے سینا عبور کر کے غزہ پہنچا جہاں تاتاریوں کی ایک فوج گشت کر رہی تھی۔ ② ان تاتاریوں نے کتبغا نویان کے سفاک بھائی بیدرا کی قیادت میں کچھ ہی دن پہلے غزہ اور الخلیل میں لوٹ مار کر کے عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا تھا۔ ③ حلب میں مقیم ہلاکو خان تو درکنار کتبغا نوین بھی مصر والوں کے فیصلے سے لاعلم تھا اور وہ حمص میں پڑاؤ ڈال کر دربارِ مصر کی جانب سے سمع واطاعت کے جواب کا منتظر تھا ④ اس لیے سرحد پر تعینات یہ تاتاری فوج بہت مختصر تھی۔ مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملتے ہی بیدرا نے کتبغا نویان کو پیغام بھیج کر تازہ صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے جواب بھیجا: ''اپنی جگہ پر رہنا اور میرے آنے کا انتظار کرنا۔'' ⑤

اس کے ساتھ ہی کتبغا تیزی سے جنوب کی طرف لپکا ⑥ مگر بیبرس کی طوفانی یلغار نے بیدرا کو موقع نہ دیا۔ وہ اچانک اسلامی فوج کو اپنے سر پر دیکھ کر پسپا ہو گیا اور بیبرس نے دریائے عاصی تک اس کا تعاقب کیا۔ ⑦ ان تاتاریوں کو بھگا کر بیبرس نے غزہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ بیدرا نے غزہ سے پسپا ہوتے ہوئے کتبغا کو جو بعلبک پہنچ چکا تھا، مصری افواج کی یلغار کی خبر بھیج دی تھی۔ اس نے غضب ناک ہو کر فوراً ارد گرد پھیلی ہوئی افواج کو جمع کیا اور بیدرا کے ساتھ مصر کی سرحد کا رخ کیا۔ کتبغا نویان کے ساتھ شامل ملت فروش مسلمان امراء نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ٹھہر کر ہلاکو خان سے مزید کمک طلب کر لے، مگر کتبغا کو اپنی موجودہ قوت و کثرت اور اپنی عیاری و تجربہ کاری پر پورا بھروسہ تھا اس لیے وہ نہ رُکا۔ ⑧ غالباً حلب میں مقیم ہلاکو خان کو بھی یہ خبر دیر سے ملی ہوگی کہ سرحد پر فریقین کی افواج میں جھڑپیں شروع ہو چکی ہیں۔ بہر کیف تاتاری مطمئن تھے کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہی فتح مند ہوں گے اور مسلمان ناکام۔

---

① ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: ۱/ ۳۵۸،۳۵۱، ط دار الکتاب الاسلامی
② السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۱/ ۵۱۵، ط العلمیۃ
③ ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: ۱/ ۳۶۵، ط قاہرۃ
④ السلوک لمعرفۃ دولِ الملوک: ۱/ ۵۱۳
⑤ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۳
⑥ ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: ۱/ ۳۶۵
⑦ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۳
⑧ النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ: ۷/ ۷۹،۷۸؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۷/ ۴۰۱، ط دار ہجر

فرنگیوں سے محفوظ عقب کی ضمانت:

ادھر قطز کا لشکر غزہ پہنچ گیا تھا۔ قطز کو تاتاریوں کے طریقۂ حرب سے خوب واقفیت تھی۔ سابقہ کئی جنگوں میں ان کا طریقہ یہ رہا تھا کہ وہ بیک وقت دو یا تین جانب سے حملے کرتے تھے۔ اس خطرے کے پیش نظر قطز کو ہر قیمت پر محفوظ عقب چاہیے تھا۔ اسی مصلحت کے تحت غزہ سے آگے لشکر اسلام نے شمال کی جانب ساحل کے ساتھ عکا کا رخ کیا جہاں فرنگی قابض تھے۔ عکا کے فرنگی امراء اسلامی لشکر کو دیکھ کر باہر آئے اور قطز سے مل کر عسکری تعاون کی پیش کش کی۔

قطز نے ایک مدبر سیاست دان کی طرح فرنگی امراء کا اعزاز واکرام کرتے ہوئے انہیں خلعتوں سے نوازا تاہم ان کی امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر ان سے حلف لیا کہ وہ جنگ میں غیر جانبدار رہیں۔ ساتھ ہی متنبہ کرتے ہوئے قسم کھا کر کہا:

"اگر میرے لشکر کو نقصان پہنچانے ایک فرنگی بھی عقب سے آیا تو میں تاتاریوں کو چھوڑ کر پہلے تمہاری خبر لوں گا۔"[1]

یہ مناسب ترین حکمتِ عملی تھی کیوں کہ جہاں یہ ممکن تھا کہ فرنگی تاتاریوں کی غارت گری سے ڈر کر مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہتے ہوں وہاں یہ بھی امکان تھا کہ تعاون کی پیش کش کر کے وہ بے خبری میں عقب سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں۔ قطز کی دھمکی سے ڈر کر فرنگیوں نے غیر جانبداری کا وعدہ کر لیا اور اسے حرف بحرف نبھایا۔

عین جالوت کی سمت:

قطز کو لڑائی کے لیے اپنی مرضی کا میدان چاہیے تھا۔ اس لیے عکا سے پیش قدمی کا رخ پھر تبدیل کیا اور شام کے بڑے شہروں دمشق یا حلب کی سمت جانے کی بجائے نصف دائرے میں مڑ کر جنوب مشرق کی طرف پیش قدمی کی اور جھیل طبریہ کو بائیں ہاتھ پر چھوڑتے ہوئے عینِ جالوت کا رُخ کیا۔ ساتھ ہی ہراول کے سالار رکن الدین بیبرس کو پیغام بھیجا کہ وہ آگے بڑھ کر تاتاریوں سے پنجہ آزمائی کرے اور پھر پسپا ہوتے ہوئے عین جالوت آجائے۔

ادھر سے کتبغا کا لشکر بھی چلا آرہا تھا۔ بیبرس نے قطز کی ہدایت کے مطابق ایک دستے کے ساتھ حریف کے ہراول سے ٹکر لی اور کبھی جارحانہ حملوں اور کبھی پسپائی کا اندازِ جنگ اختیار کر کے اسے اپنے پیچھے لگائے رکھا۔ آخر تاتاری تعاقب کرتے ہوئے "عین جالوت" کے قریب پہنچ گئے جہاں اسلامی فوج اپنے خیمے گاڑ چکی تھی۔[2] بیبرس نے فوراً مخبر بھیج کر سلطان قطز کو تاتاریوں کے پڑاؤ کے مقام اور ان کے کمزور پہلوؤں سے آگاہ کیا۔[3] چنانچہ لشکرِ اسلام کا ہراول صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ تاتاریوں کے ہراول کے مقابلے میں نکل آیا اور اسے بکھیر کر رکھ دیا۔[4]

---

① السلوك لمعرفة دول الملوك: ۱/ ۵۱۶، ط العلمية

② السلوك لمعرفة دول الملوك: ۱/ ۵۱۶، ط العلمية

نوٹ: جالوت شمالی فلسطین کے ایک چشمے کا نام ہے جس کی وجہ سے یہ مقام عین جالوت کہلاتا ہے۔ یہ جگہ دریائے اردن کے مغربی کنارے پر جھیل طبریہ کے جنوب میں ہے اور آج کل اسرائیل کا حصہ ہے۔ بیسان، نابلس، جنین اور ناصرہ اس کے ارد گرد واقع ہیں۔ بیسان سے یہ دس میل شمال کی جانب ہے۔

③ الروض الزاهر فی سيرة الملك الظاهر، ص ٦۴

④ السلوك لمعرفة دول الملوك: ۱/ ۵۱۶، ط العلمية

قطز کی ولولہ انگیز تقریر:

اب دونوں فریق فیصلہ کن جنگ کے لیے صف بندی کرنے لگے۔ جنگ سے پہلے قطز نے امرائے فوج کو ایک جگہ جمع کیا اور ان کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کر کے ان کے لہو کو گرما دیا۔ مسلمانوں کی افسوس ناک شکستوں، تاتاریوں کے ہاتھوں ان کے قتلِ عام اور اسلامی شہروں کی بربادی کا ذکر کرنے کے بعد حاضرین کو جہاد کی دعوت دی اور فریاد کی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی مدد کے لیے کمر کس لیں، شام کو تاتاریوں کے پنجے سے چھڑانے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جان کی بازی لگا دیں۔ قطز نے انہیں فریضۂ جہاد ترک کرنے پر اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہوئے کہا کہ اگر اب بھی اس فرض کو ادا نہ کیا گیا تو یقیناً ہمارے گھروں کا بھی یہی انجام ہوگا۔

اس تقریر کا ہر لفظ سامعین کے دلوں میں اترتا جا رہا تھا۔ مجمعے پر رقت اور گریہ وزاری کا عالم طاری تھا۔ سسکیاں اور آنسو یہ یقین دلا رہے تھے کہ اُمت سابقہ غفلت کی تلافی کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ تمام امراء نے قسمیں کھائیں کہ وہ تاتاریوں سے جہاد کرنے اور ممالکِ اسلامیہ کے دفاع میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ ①

معرکہ عینِ جالوت:

۲۵ رمضان ۶۵۸ھ (۳ ستمبر ۱۲۶۰ء) بروز جمعہ طلوعِ آفتاب کے وقت دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ تاتاری ٹڈی دل لشکر میں کئی خوفزدہ مسلم امراء بھی اپنی فوجوں سمیت شامل تھے جن میں الملک السعید (ملک العادل کا پوتا) اور اشرف (حاکمِ حمص) کے نام سرِفہرست ہیں۔ ②

لڑائی کی گھڑی سر پر آن پہنچی تو سیف الدین قطز نے اپنے افسرانِ اعلیٰ سے کہا:

''خبردار! جب تک سورج ڈھل نہ جائے، سائے دراز نہ ہونے لگیں اور ہوا کے جھونکے نہ آنے لگیں، لڑائی چھیڑنے کی کوشش مت کرنا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دشمن سے اس وقت متصادم ہوں جب لوگ جمعہ کی نماز میں مشغول ہوں اور خطیب حضرات ہمارے لیے دعا کر رہے ہوں۔'' ③

سابقہ شکستوں کو دیکھتے ہوئے بہت سے مسلمانوں کے دل دہل رہے تھے مگر وہ آخری بازی کھیلنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لشکرِ اسلام کی مدد اور ہمت افزائی کے لیے فلسطین اور مصر کے ہزاروں کاشتکار رضا کارانہ طور پر آ گئے تھے، ان کی تکبیروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ساتھ ہی سلطان اور امرائے سلطنت کی جانب سے طبل اور بگل برابر بجائے جا رہے تھے۔ اس جوش وخروش نے تاتاریوں کو بھی خوفزدہ کر دیا اور وہ پہلے کی طرح کھلے میدان میں آگے بڑھنے کی بجائے اپنی پشت پر ایک پہاڑ کی اوٹ لے کر محفوظ ہیئت میں از سرِ نو صف بندی کرنے لگے۔

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۱۶، العلمیة

② البدایة والنهایة: سنة ۶۵۸ھ

③ البدایة والنهایة: وفیات سنة ۶۵۸ھ

نوٹ: یہ عبارت "البدایة والنهایة" کے دارِ ہجر والے نسخے میں نہیں، دار الفکر، دار احیاء التراث العربی اور مکتبہ حقانیہ پشاور کے نسخوں میں یہ عبارت موجود ہے اور وہیں سے لی گئی ہے۔

نماز کی ادائیگی کے بعد جنگ کا نقارہ بجا اور دونوں لشکر نہایت شدت کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ اگرچہ اس وقت مصری فوج بیک وقت تاتاریوں اور ان کے حلیف مسلم حکمرانوں سے ٹکر لے رہی تھی، پھر بھی حوصلہ مند سلطان سیف الدین قطز کو کوئی گھبراہٹ نہ تھی جیسے آقائے نامدار تاجدار رسالت ﷺ کی بشارت پر اسے پورا وثوق ہو۔ لڑائی اپنے جوبن پر تھی، دونوں فریق اپنی ساری قوت جنگ کی بھٹی میں جھونک چکے تھے، عین جالوت کی خاک خون سے سرخ ہو رہی تھی، لاشوں کے انبار لگ رہے تھے، تاتاری اپنی گزشتہ نصف صدی پر محیط فتوحات کے گھمنڈ میں نہایت جوش اور غیظ وغضب کے ساتھ بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے، ان کے ساتھ نام نہاد مسلم حکمرانوں کے دستے بھی اپنے کافر ومشرک آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے اور دنیاوی مال وجاہ کی بھیک ملنے کی امید میں اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان باطل پرستوں کے مقابلے میں مہاجر ترک سپاہی اور مصر کے سرفروش مسلمان دینِ حق کے دفاع کے لیے جان کی بازی لگا کر اس سیلابِ آتش وآہن کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح جمے کھڑے تھے۔

اس وقت تک لڑائی میں دونوں فریقوں کا پلہ برابر تھا کہ اچانک کتبغا نویان نے ایک جنگی چال چلتے ہوئے مسلمانوں کے بائیں بازو پر اس شدت سے حملہ کیا کہ اس جانب کے مجاہدین کے قدم اکھڑ گئے اور انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا، اس وقت ترک اور مصری جرنیلوں کے چہروں پر اضطراب وبے چینی کے آثار صاف دیکھے جاسکتے تھے، تاتاریوں کے شدید دباؤ سے مصری افواج کی صفیں درہم برہم ہوتی جارہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ لڑائی کا پانسہ مکمل طور پر تاتاریوں کے حق میں پلٹ چکا ہے، مگر اس نازک وقت میں بھی الملک المظفر سیف الدین قطز کی پیشانی پر عزم و استقامت کی چمک دمک عیاں تھی۔ اس مردِ حُر نے دشمن کی جارحانہ پیش قدمی کے تسلسل اور اپنے ساتھیوں کی پسپائی کو دیکھا تو غیرت کے مارے اپنا فولادی خود سر سے اتار پھینکا اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح اپنے قلبِ لشکر کے خاص دستوں کو لے کر دشمن سے بھڑ گیا۔ رکن الدین بیبرس نے بھی اس موقع پر نہایت جاں سپاری کا مظاہرہ کیا اور اپنے پے در پے حملوں سے تاتاریوں میں کھلبلی مچادی۔ پیچھے ہٹنے والے مصری سپاہیوں نے اپنے قائدین کی یہ جرأت دیکھی تو ان کی آتشِ حمیت بھی نئی شدت سے بھڑک اٹھی اور انہوں نے ایک بار پھر قدم جمالیے۔[1]

سلطان قطز کی شجاعت:

سیف الدین قطز نے آگے بڑھتے بڑھتے میدان کے اس حصے میں قدم رکھ دیا جہاں دست بدست شدید جنگ ہو رہی تھی۔ سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ اس موقع پر ایک عجیب بات ہوئی۔ وہ تاتاری لڑکا جو ہلاکو کے سفارتی وفد میں آیا تھا اور قطز نے اسے غلام بنا لیا تھا، اس وقت لشکرِ اسلام میں خادم کے طور پر شامل تھا۔ اس نے موقع پا کر کمان سنبھالی اور سلطان قطز پر تیر چلا دیا۔ سلطان نے یکدم متنبہ ہو کر فوراً گھوڑے سے چھلانگ لگا دی اور خود کو سنبھال

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۱۶؛ النجوم الزاہرة: ۷/ ۸۱؛ نہایة الارب للنویری: ۲۹/ ۴۷۳

لیا، اللہ نے سلطان کو محفوظ رکھا مگر تیر کا زخم ایسا سخت تھا کہ گھوڑا وہیں مر گیا۔ سلطان کو اردگرد اپنے کسی سپاہی کے پاس زائد گھوڑا نظر نہ آیا تو اپنی مدد کے لیے کسی کو متوجہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور پیدل ہی لڑائی جاری رکھی۔

اسی دوران ایک امیر کی نظر سلطان پر پڑ گئی وہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر سیدھا ادھر آیا۔ قریب آ کر وہ گھوڑے سے اُتر پڑا اور گھوڑا سلطان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے گویا ہوا:

''آقا! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ اس پر سوار ہو جائیے۔''

سلطان سیف الدین قطز نے اطمینان سے کہا: ''ایسا نہیں ہوسکتا، اس خطرے کے وقت تمہیں پیدل کر کے میں امت مسلمہ کو تمہاری خدمات سے محروم کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

امیر اصرار کرتا رہا، مگر قطز نے اپنے نفس کو اس پر ترجیح دینا گوارا نہ کیا۔ کچھ دیر بعد ایک دستہ زائد گھوڑے لے کر وہاں پہنچ گیا۔ سلطان قطز نے بلا پس و پیش ان میں سے ایک گھوڑا لے لیا۔

اس وقت ایک افسرِ اعلیٰ نے شکایت آمیز لہجے میں سلطان کو مخاطب کر کے کہا:

''جناب عالی! آپ اس امیر کے گھوڑے پر کیوں سوار نہ ہو گئے تھے؟ خدانخواستہ اگر دشمن آپ کو اس حالت میں پا لیتا تو خطرہ تھا کہ آپ شہید کر دیے جاتے اور آپ کے بعد ان دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں اسلام دنیا سے مٹ جاتا۔''

سلطان قطز نے بے ساختہ جواب دیا: ''نہیں! جہاں تک میری بات ہے، میں تو اس وقت مر کر سیدھا جنت میں جاتا، اور رہا اسلام، تو اس کا رب اللہ موجود ہے جو اس کو مٹنے نہیں دے گا۔ دیکھو صلیبیوں سے عین جنگ کے دوران الملک الصالح ایوب کی وفات ہوئی، پھر الملک المعظم قتل ہوا، فخر الدین شیخ شہید ہوئے، مسلمان فتح سے مایوس ہو چکے تھے مگر اللہ نے اس کے بعد بھی اسلام کی مدد کی۔ بڑے بڑے محافظینِ اسلام دنیا سے چلے گئے اور اللہ تعالیٰ ان کی جگہ دیگر افراد کو اسلام کی حفاظت کے لیے کھڑا کرتا رہا اور اسلام کو نہ مٹنے دیا۔''[1]

بیسان میں دوسرا معرکہ:

اس دوران سلطان قطز کی کڑی نگاہ لڑائی کے نقشے پر تھے اور افسران اعلیٰ کو موقع بموقع ہدایات دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ پھر یکایک معرکۂ جنگ کا نقشہ تبدیل ہوتا نظر آیا۔ تاتاریوں کے قدم اکھڑ چکے تھے اور وہ تیزی سے پسپا ہو رہے تھے۔ سلطان نے یہ دیکھ کر فوج کو تعاقب کا حکم دیا۔ عین جالوت سے بیسان تک دونوں فوجیں حالتِ فرار و تعاقب میں رہیں۔ بیسان پہنچ کر تاتاریوں نے ایک بار پھر صف بندی کی اور نئے جوش و خروش سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔[2]

مسلمان بھی اپنی نئی صف بندی عمدہ طریقے سے کر چکے تھے۔ قطز نے فوج کا ایک مختصر حصہ اپنی کمان میں رکھا تھا جسے تاتاریوں سے ابتداء میں ٹکرانا تھا۔ جبکہ زیادہ فوج کو عقبی وادیوں میں اِدھر اُدھر چھپا دیا تھا تاکہ دشمن کو پوری طرح

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۱۶، ۵۱۷، ط قاهره؛ البداية والنهاية: سنة ۶۵۸ھ

② السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۱۷؛ النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۷/۷۹ تا ۸۱

گھیر کر کچلا جاسکے۔[1]

معرکہ شروع ہوتے ہی تاتاریوں نے مسلمانوں کو تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے تیروں کی بارش ہو رہی ہو۔ قطز نے کچھ دیر مقابلے کے بعد تیزی سے پسپائی اختیار کرلی۔ تاتاری مسلمانوں کو شکست خوردہ تصور کر کے نہایت جوش وخروش سے ان کے تعاقب میں آئے، اس دوران انہوں نے بہت سے مسلمانوں کو شہید بھی کر ڈالا۔ مگر جونہی وہ کمین گاہوں میں چھپے ہوئے مجاہدین کی زد میں آئے، انہیں شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑ گیا۔[2]

وا اِسلاماہ:

تاتاریوں کے پاس اب کوئی جائے پناہ نہ تھی جبکہ مسلمانوں کے پاس بھی یہ آخری موقع تھا۔ یہاں معرکے کی قہرانگیزی گزشتہ لڑائی سے کہیں بڑھ کر تھی۔ کچھ دیر کے لیے معرکۂ کارزار کی شدت نے ہر کسی کو دائیں بائیں سے بیگانہ کردیا۔ تاتاری یہاں اس طرح پاگل ہو کر لڑے کہ مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔ بلند آواز اور دلیر قطز نے یہ دیکھا تو اونچائی پر چڑھ کر ایسا زوردار نعرہ لگایا کہ گرد ونواح کی پہاڑیاں تک گونج اٹھیں:

”وَا اِسلَامَاہُ.....یَا اَللہ ! اُنصُرعَبدَکَ قُطزَ عَلی التَتار.“

یہ جگر پاش نعرہ تین بار ایسی قوتِ قلبی اور سوزِ باطن کے ساتھ لگایا کہ دور دور تک یہ آواز پہنچ گئی اور ہر ایک کے رگ وپے میں بجلیاں دوڑ گئیں۔ مسلمانوں نے پیر جما کر آخری حلہ بولا اور تاتاریوں کو یوں لگا جیسے سمندری طوفان نے انہیں آلیا ہے۔ وہ تنکوں کی طرح اس ریلے میں بہتے چلے گئے۔ سیف الدین قطز نے یہ منظر دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر اپنا چہرہ مٹی پر رگڑتے ہوئے سجدہ شکر ادا کیا۔ پھر دو رکعت نمازِ شکرانہ پڑھی۔ نصرتِ الٰہیہ فرزندانِ توحید کی پیشانیوں کے بوسے لے رہی تھی۔ لشکرِ تاتار پر ادبار وحرمان کی گھٹائیں مسلط ہو چکی تھیں اور صحرائے گوبی کی وحشت ناک تاریکیوں سے برآمد ہونے والے آتشیں طوفان کے مقدر میں ہمیشہ کی پسپائی لکھ دی گئی تھی۔[3]

فتح مبین:

اب تاتاری فرار ہو رہے تھے اور مسلمان ہر سمت سے انہیں مار کاٹ رہے تھے۔ کچھ تاتاری ایک ٹیلے پر چڑھ کر مورچہ بند ہوگئے مگر عساکرِ اسلامیہ نے انہیں گھیر گھار کر ختم کردیا۔[4] کچھ تاتاری گھڑ سوار جان بچانے کے لیے گنے کے کھیتوں میں چھپ گئے تھے۔ قطز کے حکم سے کھیتوں کو آگ لگا دی گئی اور تمام سوار جل کر مر گئے۔[5]

---

① جامع التواریخ(عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۳،۳۱۴
② جامع التواریخ(عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۳،۳۱۴
③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/۵۱۷، ط العلمیۃ
④ النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ: ۷/۹۷
⑤ جامع التواریخ (عربی)از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۴

نوٹ: عربی تواریخ میں صراحت ہے کہ لڑائی ۲۵ رمضان کو زوال آفتاب کے بعد شروع ہوئی تھی۔ مگر یہ وضاحت نہیں کہ آیا لڑائی اسی روز ختم ہوئی تھی یا اگلے روز۔ بظاہر یہی سمجھ آتا ہے کہ لڑائی شام تک ختم ہوگئی تھی۔ جبکہ رشید الدین کے مطابق لڑائی فجر سے دوپہر تک جاری رہی تھی۔ (جامع التواریخ عربی، ج ۲ حصہ اوّل: ص ۳۱۴) یہاں یہ بھی امکان ہے کہ لڑائی کا آخری معرکہ جو بیسان میں لڑا گیا اور جس میں مسلمانوں کے چھپے ہوئے دستوں نے دشمن کو گھیرا تھا، ایک شب کے وقفے کے بعد اگلے دن بعد فجر کو شروع ہوا ہو اور تا ظہر جاری رہا ہو۔ اس حساب سے لڑائی پہلے دن ظہر تا مغرب اور دوسرے دن فجر تا ظہر ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب

امام سیوطی رحمہ اللہ اس جنگ کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تاتاریوں کو شرمناک شکست ہوئی اور اللہ کے فضل وکرم سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا اور وہ اس طرح خوفزدہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو گرفتار کرتے اور لوٹتے تھے۔''[1]

کتبغا نویان کا انجام:

جنگ کے اختتام پر جن قیدیوں کو سیف الدین قطز کے سامنے پیش کیا گیا ان میں الملک السعید بن عبدالعزیز بن الملک العادل بھی تھا جو تاتاریوں کی حمایت میں پیش پیش تھا۔ قطز نے اسلام اور مسلمانوں سے غداری کے جرم میں اس کی گردن اُڑا دی۔ ''کتبغا نویان'' کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا اور سلطان قطز کو یہ بات رہ رہ کر بے چین کر رہی تھی کہ کہیں وہ بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو گیا ہو۔ اسی اثناء میں ایک تاتاری نوجوان گرفتار کر کے لایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ کتبغا نویان کا بیٹا ہے۔ قطز نے بے تابی کے ساتھ اس سے پوچھا: ''کیا تمہارا باپ فرار ہو گیا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا: ''وہ بھاگنے والا شخص نہیں۔''

یہ سن کر قطز نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مقتولین کی لاشوں کی خوب اچھی طرح چھانٹی کی جائے۔

سپاہی اس نوجوان قیدی کو میدان کارزار میں ساتھ لے گئے جہاں لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ وہ دیر تک ایک ایک لاش کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اچانک چند مقتولین کے درمیان سے ایک بوڑھے شخص کی لاش برآمد ہوئی جسے دیکھ کر نوجوان قیدی کی چیخ نکل گئی اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ معلوم ہوا کہ یہی ''کتبغا نویان'' تھا جو اپنے اعمالِ بد سمیت جہنم رسید ہو چکا تھا۔ مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ اسے ٹھکانے لگانے والا امیر آقوش شمسی تھا۔ سیف الدین قطز کو جب ''کتبغا نویان'' کی ہلاکت کی اطلاع ملی تو سجدہ شکر بجا لا کر کہا: ''اب میں اطمینان کی نیند سو سکوں گا۔''[2]

---

[1] تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۳۵، ط نزار

[2] البدایة والنهایة: سنة ۶۵۸ھ؛ النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۸۰/۷

نوٹ: کتبغا کے انجام کے بارے میں رشید الدین کا بیان قطعی مختلف ہے۔ اس کے مطابق کتبغا زندہ گرفتار ہوا تھا۔ اسے زنجیروں میں باندھ کر قطز کے سامنے لایا گیا اور قطز نے اسے طعنے دینے کے بعد قتل کر دیا۔ رشید الدین نے قطز اور کتبغا کے درمیان ہونے والی طویل گفتگو نقل کی ہے جو دلچسپ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

قطز: اے عہد شکن! تو بے گناہوں کا اتنا خون بہانے اور جھوٹے وعدوں کے ذریعے بہادروں اور رئیسوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد آخر ہمارے جال میں آپھنسا۔

کتبغا: اس فتح پر مغرور مت ہونا۔ ہلاکو کو جونہی میرے قتل کی اطلاع ملے گی اس کے غصے کا سمندر کھول اٹھے گا اور آذربائی جان سے مصر تک تمام علاقہ مغلوں کے گھوڑوں کے سموں تلے روند دیا جائے گا۔ ہلاکو خان کے پاس مجھ جیسے تین لاکھ شہ سوار ہیں۔ ان میں سے فقط ایک ہی تو کم ہو گا۔''

قطز: اپنے گھڑ سواروں پر اتنا فخر مت کر۔ انہوں نے مکاری اور دھوکے سے یہ فتوحات حاصل کی ہیں نہ کہ مردانگی اور شجاعت سے۔

کتبغا: جب تک جان میں جان ہے میں تو اپنے آقا کا غلام ہوں، تیری طرح دغاباز نہیں ہوں۔ جتنی جلد ہو سکے مجھے قتل کر دے تا کہ مجھے تیری شیخیاں نہ سننی پڑیں۔''

اس کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ (جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۳۱۵ تا ۳۱۷)

مگر یہاں عرب مؤرخین کے بیانات زیادہ واضح معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے رشید الدین نے جس شخص کی گفتگو نقل کی وہ کتبغا کا بیٹا ہو جس سے مختصر بات چیت کا ذکر عرب مؤرخین نے بھی کیا ہے۔

قطز کی یہ بات درست ثابت ہوئی۔ دستِ قدرت نے اس مجاہد کو جس عظیم کام کے لیے پیدا کیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ حضور سرورِ کونین ﷺ کی جانب سے خواب میں ملنے والی یہ بشارت حرف بحرف درست ہو چکی تھی۔ اب واپسی کا وقت آ چکا تھا۔ تاہم تقدیر کا یہ فیصلہ دنیا سے پوشیدہ تھا۔ لوگ اس وقت خوشیاں منا رہے تھے اور فاتح سلطان کے استقبال کے لیے بے تاب تھے۔ علامہ مقریزی رحمہ اللہ عالمِ اسلام میں اس فتح کی خوشی کا حال یوں لکھتے ہیں:

''اتوار ۲۷ رمضان کی شب فتح کی خبر دمشق پہنچی، تاتاری سردار کتبغا نویان کا سر قاہرہ پہنچا۔ دمشق سے زین حافظی اور تاتاری نائبین فرار ہو گئے اور ان کے چیلے بھی ان کے ساتھ بھاگ نکلے۔ راستے میں زمین داروں نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا اور انہیں لوٹا کھسوٹا۔ اس طرح دمشق پر تاتاریوں کا قبضہ سات ماہ دس دن تک رہا۔ اسی اتوار کے دن سلطان قطز طبریہ پہنچے اور دمشق والوں کو مراسلہ بھیجا جس میں خوشخبری دی گئی تھی کہ اللہ نے انہیں فتح دی اور تاتاریوں کو شکست سے دوچار کیا۔ یہ پہلا مراسلہ تھا جو ان کی طرف سے دمشق آیا۔ جب یہ مراسلہ آیا تو لوگوں نے بے حد مسرت کا اظہار کیا اور نصرانیوں کے گھروں پر جھپٹ پڑے اور جس قدر ممکن تھا انہیں تباہ کیا، انہوں نے چرچ یعقوبیہ اور چرچ مریم کو مسمار کر کے نذرِ آتش کر دیا اور وہاں فقط ملبہ رہ گیا۔ مسلمانوں نے کئی نصرانیوں کو قتل کیا اور باقی نصرانی چھپ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تاتاریوں کے قبضے کے دوران نصرانیوں نے بارہا مسلمانوں پر حملوں کی تیاری کی تھی، ایسی مساجد اور اذان کے میناروں کو تباہ کیا جو ان کی عبادت گاہوں کے قریب تھے۔ وہ کھلم کھلا ناقوس بجاتے اور صلیب کو باہر گھماتے تھے، سڑکوں پر شراب پیتے تھے اور (مسلمانوں پر) اس کا چھڑکاؤ کرتے تھے۔''[1]

رشید الدین فضل اللہ کا بیان ہے:

''مصریوں نے مغلوں کو شام کے اطراف و جوانب سے دریائے فرات کے پار مار بھگایا۔ پھر انہوں نے کتبغا نویان کے معسکر کو لوٹ کر عورتوں، بچوں اور خدام کو گرفتار کر لیا۔ انہوں نے مغل افسران اور حکام کو قتل کر دیا۔ البتہ دمشق کے مغل افسران محفوظ رہے کیوں کہ انہوں نے رات ہی کو شکست کی خبر سنی اور بھاگ نکلے۔''[2]

علامہ شہاب الدین العدوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''لشکرِ مصر نے وہ کام کر دکھایا جو دنیا بھر کے بادشاہ نہیں کر سکے تھے، ان میں سلطان جلال الدین خوارزم شاہ بھی تھے، اللہ ان پر رحمت نازل کرے، جنہوں نے بڑی جدوجہد کی تھی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ یہ مصری لشکر سلطان جلال الدین کے لشکر کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر اللہ جسے چاہتا ہے اپنی نصرت سے نوازتا ہے۔ کتنی ہی قلیل جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ واقعہ حضور اکرم ﷺ کے معجزات میں سے ایک ہے جنہوں نے فرمایا تھا: میری امت میں سے ایک جماعت تا قیامت

---

[1] السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۱۷، ط العلمیة

[2] جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۶، ط دار احیاء الکتب العربیة مصر

اپنے دشمنوں پر غالب آتی رہے گی۔ انہیں چھوڑ جانے والا انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے گا اور وہ اسی حالت پر ہوں گے۔"[1]

سلطان قطز کا دمشق میں داخلہ اور تاریخی استقبال:

بدھ ۲۹ رمضان کو سلطان قطز کا فتح مند لشکر دمشق کے باہر پہنچا اور عید الفطر منانے کے بعد ۲ شوال کو سلطان نے قلعہ میں قدم رکھا۔ قدم قدم پر عوام کے جم غفیر نے فاتح سلطان کا تاریخی استقبال کیا۔[2]

عوام کی مسرت وفرحت کو بیان کرتے ہوئے علامہ العدوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس عظیم فتح پر مسلمانوں نے دوگنا چوگنا شکر ادا کیا۔ اس لیے کہ لوگ تاتاریوں کے خلاف فتح سے مایوس ہو چکے تھے کیوں کہ وہ اکثر ممالکِ اسلامیہ پر قابض تھے، انہوں نے جس بھی علاقے پر حملہ کیا، اسے فتح کر کے چھوڑا، جس بھی لشکر کا سامنا کیا، اسے شکست دے کر ہی رہے۔ پس رعایا ان کے خلاف فتح پر اور ملک المظفر قطز کی دمشق میں (فاتحانہ) آمد پر بہت مسرور ہوئی۔"[3]

دمشق میں فوری کیے جانے والے کام:

سلطان نے اسی دن دمشق کے ایسے کئی افسران کو پھانسی پر چڑھا دیا جنہوں نے مسلمانوں سے غداری کر کے تاتاریوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان میں ایک حسین کردی تھا۔ دوسرا شام کے سابق حکمران الملک الناصر کا طبل دار یوسف تھا جس نے الملک الناصر کو تاتاریوں کے ہاتھوں گرفتار کرایا تھا۔[4] محمد الکامل شہید کا کٹا ہوا سر جس کی تاتاریوں نے دمشق میں نمائش کی تھی، اب تک بابِ فرادیس پر آویزاں تھا۔ قطز نے اس کی تدفین کرائی۔[5]

سلطان نے شام کے انتظامی امور کو درست کیا اور تاتاریوں کے ہاتھوں پھیلی ہوئی افراتفری کا ازالہ کیا۔ جگہ جگہ اپنے نائب اور گورنر مقرر کیے۔ رعایا سے لطف ومہربانی کا ایسا سلوک کیا کہ سب گرویدہ ہو گئے۔[6]

شعراء کا خراجِ تحسین:

سلطان قطز کی اس فتح پر خطباء نے اظہارِ مسرت کیا اور شعراء نے قصیدے کہے۔ علامہ ابوشامہ المقدسی نے کہا:

غَلَبَ التَّتَارُ عَلَى الْبِلَادِ فَجَآءَ هُمْ ...... مِنْ مِصْرٍ تُرْكِيٌّ يَجُوْدُ بِنَفْسِهٖ

"تاتاری تمام شہروں پر قابض ہو گئے تو مصر سے ایک ترک جوان آیا جو اپنی جان کی بازی لگا چکا تھا۔"

---

① مسالک الابصار فی ممالک الامصار (احمد بن یحییٰ العدوی العمری، م ۷۴۹ھ): ۳/ ۱۸۱، ط المجمع الثقافی ابوظبی

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۱۷، ط العلمیۃ؛ مورد اللطافۃ: ۲ ص ۳۲

③ مسالک الابصار فی ممالک الامصار: ۲۷/ ۳۸۵، ط المجمع الثقافی ابوظبی؛ النجوم الزاھرۃ: ۷/ ۸۱، ط دار الکتب مصر

④ مسالک الابصار فی ممالک الامصار: ۲۷/ ۳۸۵، ط المجمع الثقافی ابوظبی

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۲۰۲، ط الرسالۃ...... علامہ قطب الدین یونینی فرماتے ہیں کہ یہ عجیب اتفاق ہے محمد الکامل شہید کا سر باب فرادیس کی مسجد میں اسی گوشے میں دفن کیا گیا جہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک مدفون ہے۔ (ذیل مرآۃ الزمان: ۱/ ۳۶۰، ط قاھرہ)

⑥ مورد اللطافۃ: ۲/ ۳۲، النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ: ۷/ ۸۱

بِالشَّامِ بَدَّدَهُمْ وَ فَرَّقَ شَمْلَهُمْ...... وَلِكُلِّ شَيْءٍ آفَةٌ مِنْ جِنْسِهِ

''اس نے شام میں انہیں روند دیا اور ان کی جمعیت کو بکھیر دیا۔ ہر شے کے لیے اس کا ہم جنس آفت ہوتا ہے۔''[1]

ایک شاعر نے کہا:

هَلَكَ الْكُفْرُ فِي الشَّامِ جَمِيعًا...... وَاسْتَجَدَّ الْإِسْلَامُ بَعْدَ دُحُوضِهِ

''پورے شام میں کفر ہلاک ہوگیا اور اسلام اپنی شکستگی کے بعد پھر سے نیا ہوگیا۔''

بِالْمَلِيكِ الْمُظَفَّرِ الْمَلِكِ الْأَرْ...... وَعِ سَيْفِ الْإِسْلَامِ عِنْدَ نُهُوضِهِ

''یہ انقلاب ملک المظفر کی بدولت اس کے اٹھ کھڑے ہونے پر ہوا جو باہیبت ہے اور اسلام کی تلوار ہے۔''

مَلِكٌ جَاءَ نَا بِعَزْمٍ وَحَزْمٍ ...... فَاعْتَزَزْنَا بِسُمْرِهِ وَبِبِيضِهِ

''یہ ایسا بادشاہ ہے جو ہمارے پاس عزم وتدبر کے ساتھ آیا تو ہم اس کے گندمی نیزوں اور چمکدار تلواروں کے باعث معزز ہوگئے۔''

اَوْجَبَ اللّٰهُ شُكْرَ ذَاكَ عَلَيْنَا...... دَائِمًا مِثْلَ وَاجِبَاتِ فُرُوضِهِ

''اللہ نے ہم پر اس نعمت کا ہمیشہ ہمیشہ شکر ادا کرنا واجب کر دیا ہے جیسا کہ اس کی عباداتِ مفروضہ ہم پر لازم ہیں۔''[2]

مغربی مؤرخین کی دسیسہ کاریاں:

مستشرقین نے عینِ جالوت کی فتح کا وزن کم دکھانے کے لیے بہت سی من گھڑت باتیں اپنی طرف سے تاریخ میں ٹھونس رکھی ہیں مثلاً یہ کہ ہلاکو خان ان دنوں خاقان منگو خان کی وفات کے باعث قراقرم جا چکا تھا اور پیچھے تاتاری فوج بہت کم تھی، مسلمان تاتاریوں سے چار گنا زیادہ تھے وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں۔

منگو خان کی موت ۶۵۵ھ میں ہوئی تھی جبکہ عینِ جالوت کا معرکہ ۶۵۸ھ کے نویں مہینے میں لڑا گیا تھا۔ اگر ہلاکو خان منگو کی وفات پر قراقرم گیا بھی تھا، تو یقیناً تین سال تک وہاں نہیں رہا تھا بلکہ اس کی واپسی ہو چکی تھی۔ عرب مؤرخین اور مغلوں کے تاریخ نگار صراحت کے ساتھ بتاتے ہیں کہ اس جنگ کے وقت ہلاکو خان شام میں تھا۔

مستشرقین اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ بتاتے ہیں مگر اس کا وہ کوئی حوالہ نہیں دے سکے۔ درحقیقت اس دور کے کسی مأخذ میں اس جنگ کے فریقین کی تعداد منقول نہیں۔ اگر سابقہ جنگوں میں فریقین کے تناسب کا لحاظ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ تاتاری زیادہ تھے جیسا کہ شروع سے ان کا لشکر بہت بڑا چلا آرہا تھا۔ پھر اس جنگ میں لشکرِ تاتار کے ساتھ کئی مسلمان حکام بھی اپنی فوجوں سمیت شامل تھے۔ یہ درست ہے کہ بعض تاتاری افسران

---

[1] ذیل مرآۃ الزمان: ۱/ ۳۶۷، ط قاہرہ ...... اردو کی کہاوت: ''لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔'' اسی مفہوم کو ادا کرتی ہے جسے علامہ ابوشامہ نے اس شعر میں بیان کیا۔

[2] ذیل مرآۃ الزمان: ۱/ ۳۶۷، ط دار الکتاب الاسلامی

مرکز سے مزید فوج منگوانا چاہتے تھے مگر ان کے سردار کتبغا نے اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس سے ثابت ہے کہ تاتاری بکثرت تھے اور مسلمانوں سے کم ہرگز نہ تھے۔ اگر کم ہوتے تو کتبغا کو مرکز سے فوج منگوانے میں کیا دشواری تھی۔ یہ نکتہ خود واضح کررہا ہے کہ تاتاریوں کی تیاری کافی تھی اور یہی وجہ ہے کہ دو میدانوں میں جم کر لڑائی ہوئی جس میں مسلمان ایک دوبار پسپا بھی ہوئے۔

بعض بشارتوں کا ذکر:

عینِ جالوت میں تاتاریوں کی شکست سے قبل مسلمان انتہائی شکستہ حال تھے اور انہیں اپنا مستقبل تاریک دکھائی دیتا تھا مگر عین انہی دنوں اللہ عزّ وجل کی طرف سے مسلسل بشارات ظاہر ہورہی تھیں۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

1. شیخ قطب الدین یونینی رحمہ اللہ نے شمس الدین ابن جزری رحمہ اللہ کے والد ابراہیم الجزری کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''میں ماہِ رمضان (۶۵۸ھ) کے دوسرے جمعہ کی نماز ادا کرکے جامعِ دمشق سے نکلا اور ''الخضراء'' کے بازار رماحین میں پہنچا تو دیکھا کہ تمام دکانوں پر شراب رکھی ہے اور نصرانی وہاں شراب بیچ رہے ہیں۔ کچھ مسلمان بھی ان کے ساتھ ہیں اور وہ وہاں سے گزرنے والے نمازیوں پر شراب چھڑک رہے ہیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہوا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں کو تر کرنے لگے۔ اتنے میں دمشق کے ایک صاحب حاجی عبدالعزیز وہاں سے گزرے، وہ بھی اسی بازار سے آرہے تھے جہاں سے میں آیا تھا اور ان کا بھی وہی حال ہوا تھا جو میرا ہوا تھا (یعنی دونوں پر شراب چھڑکی گئی تھی۔) ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ کر چہروں کو رومال سے ڈھانپ کر رونے لگے اور سسکیاں لینے لگے۔ اتنے میں شیخ محمد خالدی رحمہ اللہ وہاں سے گزرے۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر کہنے لگے:

''ارے میاں! کیوں روتے ہو۔ جس وجہ سے تم رورہے ہو، وہ عن قریب زائل ہونے کو ہے۔ میں تمہارے پاس محمد عطار کو بھیجتا ہوں، وہ تمہیں بشارت دیں گے۔ میں یہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر وہ مجھے وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد شیخ محمد عطار آگئے اور کہنے لگے: میں تمہیں اور تمام مسلمانوں کو بشارت دے رہا ہوں اور بتارہا ہوں کہ اس ماہِ رمضان کے گزشتہ جمعہ کو میں نے (خواب یا مکاشفے میں) دیکھا کہ تمام انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی ارواح صخرۂ بیت المقدس کے پاس جمع ہوئیں، جن میں حضرت ابراہیم خلیل، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور ہمارے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ مسلمان اس فتنۂ تاتار سے نجات پا جائیں مگر یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ مگر گزشتہ رات جو کہ جمعہ کی شب تھی (میں نے خواب یا مکاشفے میں دیکھا کہ) یہ حضرات دوبارہ جمع ہوئے اور اللہ سے دعا کی، اللہ نے اسے قبول فرمالیا۔ پس یہ ماہِ رمضان گزرنے سے پہلے پہلے تاتاریوں کو شکست ہوجائے گی۔ تم اور مسلمانانِ دمشق نئے مسلمان بادشاہ کے ساتھ نمازِ عید ادا کرو گے۔'' میرے والد فرماتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ شیخ محمد عطار نے فرمایا تھا۔''[1]

---

[1] ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: ۱/۳۶۴، ۳۶۵، ط دار الکتاب الاسلامی

❷ شام کے عظیم عالم علامہ کمال الدین ابن العدیم رحمہ اللہ نے ہلاکو خان کے شام پر قبضے کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہلاکو خان نے انہیں قاضی کا منصب بھی پیش کیا تھا مگر وہ اسے ٹھکرا کر ۶۵۷ھ میں قاہرہ چلے آئے اور پھر وہیں وفات پائی۔[1] وہ تاتاریوں کے خلاف جہاد کے موضوع پر شام اور مصر کے مابین سفیر بھی رہے۔

وہ اسی زمانے میں دیکھا جانے والا ایک خواب یوں نقل فرماتے ہیں:

''مکہ مکرمہ میں مقیم ایک اللہ والے جن کا تعلق یمن سے تھا فرماتے ہیں: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بیت اللہ کا طواف کرنے مسجد الحرام میں ہوں مگر وہاں مجھے بیت اللہ نظر نہیں آ رہا۔ میں (غمگین ہو کر) کہنے لگا:

''اسلام مٹ گیا۔ دین چلا گیا۔'' مجھ سے کہا گیا: ''خاموش! تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟''

میں نے کہا: ''کہاں گیا وہ بیت اللہ جس کا مسلمان طواف کرتے تھے؟'' جواب ملا: ''وہ ابھی ابھی آ رہا ہے۔''

میں نے کہا: ''اسے کون لا رہا ہے؟'' جواب ملا: ''مصر کے لوگ۔''

پھر دیکھتے ہی دیکھتے بیت اللہ اپنی جگہ پر آ گیا مگر اس پر غلاف نہ تھا۔ میں نے کہا: ''اس کا غلاف کہاں؟''

جواب ملا: ''وہ ابھی آنے والا ہے؟'' ابھی یہ سوال جواب جاری تھا کہ بیت اللہ کو غلاف پہنا دیا گیا جس کا رنگ سفید تھا۔''[2]

❸ علامہ ابن العدیم رحمہ اللہ اسی ضمن میں ایک اور ولی اللہ کی بشارت یوں نقل کرتے ہیں:

''مجھے ابوالعباس حورانی نے بتایا کہ ایک صالح شخص نے انہیں بتایا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ آسمان میں دو دروازے کھل گئے ہیں: ایک دروازے سے گھڑ سوار فرشتے نازل ہو رہے ہیں۔ پھر میں نے کسی کو کہتے سنا:

''یہ فرشتے اسلام کی نصرت کے لیے آسمان سے نازل ہوئے ہیں۔''

دوسرے دروازے کے بارے میں کہا گیا: ''یہ بابِ رحمت ہے جو کئی سالوں سے بند تھا۔ اب اسے کھول دیا گیا ہے تاکہ انسانوں پر رحمت کا نزول ہو۔''[3]

یورپ پر مسلمانوں کا احسان:

عین جالوت میں مسلمانوں کو نصیب ہونے والی عظیم فتح نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلم قوم ابھی زندہ ہے اور وہ اب بھی نہ صرف اپنی حفاظت کر سکتی ہے بلکہ باقی دنیا کو بھی تباہی و بربادی سے بچا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عینِ جالوت کی فتح سے پہلے تاتاری مشرقی یورپ میں گھس چکے تھے اور یورپ کے تمام درباروں پر ان کی دہشت طاری تھی۔ ہیرلڈ لیمب لکھتا ہے:

''وہ طوفان جو بیس برس پہلے یورپ کو چھو کر گزر گیا تھا اب مشرقی یورپ سے ٹکرایا تھا۔ یہ طوفان روس کے وسیع

---

① مقدمہ بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب لابن العدیم: ۱/ ۱۲، ط دار الفکر

② بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب لابن العدیم: ۲/ ۱۰۲۰ ③ بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب لابن العدیم: ۲/ ۱۰۲۱

میدانوں اور پولینڈ کے کھیتوں کھلیانوں کو تاخت وتاراج کرتے ہوئے کارپتھین کے کوہستان کو عبور کر کے سالیزیا میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے عقب میں دھوئیں کے سیاہ بادل اور شعلے تھے۔ یہ طوفان غول در غول منگولوں کی شکل میں نمودار ہوا تھا..... لوگ کہنے لگے: دنیا کی آخری فصل کاٹنے دجال کی فوجیں آگئی ہیں۔''[1]

وہ مزید لکھتا ہے:

''تاتاری مشرقی یورپ میں گھستے چلے گئے۔ ڈیوک آف بیوپریا اور ٹیوٹانک نائٹوں کو شکست ہوئی۔ ہنگری کی فوج کو پسپا ہونا پڑا اور وہاں کا مردِ میدان پونس ڈی آوبن تمام ٹمپلروں سمیت قتل ہو گیا۔ ۱۲۴۱ء میں منگول نیوسڈاٹ تک پہنچ گئے..... شاہ جرمنی فریڈرک کو تاتاریوں کا عتاب نامہ پہنچا کہ فوراً اپنی رعایا سمیت منگولیا پہنچ کر خانِ اعظم کی غلامی قبول کرو اور وہاں جو بھی خدمت ملے اسے اپنے لیے باعثِ عزت سمجھو۔

فریڈرک جواب میں یہ لکھنے پر مجبور ہوا: ''میں شکاری پرندوں سے خوب واقف ہوں اور خانِ اعظم کے ہاں باز بردار کا عہدہ میرے لیے مناسب رہے گا۔''[2]

پھر وہ یورپی بادشاہوں کے خوف کی عکاسی کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

''فریڈرک نے شاہ ہنری کو اپنے مراسلے میں لکھا: 'خدا نے دنیائے نصرانیت کے گناہوں کی سزا میں یہ تاتاری بھیجے ہیں۔''[3]

مشہور مغربی مؤرخ گبن کا بیان ہے:

''سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعے تاتاری طوفان کی خبر سنی، ان پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لیے نہیں نکلے۔''[4]

یورپی محقق جے جے سانڈرز کہتا ہے:

''یہ انتہائی ہولناک خطرہ بھی اقوام یورپ کو تیار نہ کر سکا کہ وہ اس سخت دشمن کی سرکوبی کے لیے متحد ہو جائیں۔''

''اگر منگولوں کا حملہ نہ رُکتا تو روما کی دنیائے مسیحیت کا حال چین اور ایران سے مختلف نہ ہوتا اور وہاں زندگی نابود ہو جاتی۔ وہ علم وہنر کا انقلاب جو اس کے بعد وہاں برپا ہوا، ناممکن ہو جاتا۔''[5]

غرض کئی مغربی مؤرخین نے کھلے لفظوں میں مسلمانوں کے اس احسان کا اعتراف کیا ہے۔ پس اس حال میں جبکہ یورپ ان درندوں کے سامنے سپر انداز ہونے کو تھا، اسلام کی شمشیر مظلوم انسانیت کا انتقام لینے کے لیے بے نیام ہوئی اور عینِ جالوت کے میدان میں اس نے تاتاریوں کے طوفان کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔

---

① The Crusades by Harold Lamb:p:271, Badford London, 1931

② The Crusades by Harold Lamb:p:271, 272

③ The Crusades by Harold Lamb:p:272

④ تاریخ دعوت و عزیمت: ۱/ ۳۱۷، بحوالہ: تاریخ انحطاط وسقوطِ روما از گبن

⑤ تاریخ فتوحاتِ مغول، ترجمہ فارسی از ابوالقاسم حالت، ص ۹۰، ۹۱، ط مؤسسۃ انتشارات تہران

عین جالوت کے بعد

جنگِ عینِ جالوت کے بعد اس دور کے بعض اہم ترین اشخاص اچانک یوں منظر نامے سے غائب ہو گئے جیسے ان کا کردار مشیتِ الٰہیہ کے نزدیک یہیں تک طے تھا۔

الملک الناصر کی شہادت:

عینِ جالوت میں شکست کے بعد ہلاکو خان نے اپنی حراست میں موجود سابق بادشاہِ شام الملک الناصر ایوبی کو بڑی بے دردی سے قتل کرا دیا۔ ایک روایت کے مطابق ہلاکو نے خود اسے تیر مار کر شہید کیا۔ دوسری روایت کے مطابق اس نے چار درختوں کے بالائی سروں کو موٹے رسّے سے کھینچ کر اس طرح بندھوا دیا کہ چاروں کے تنے اوپر سے آپس میں مل گئے۔ بیچ میں الملک الناصر کو لٹایا گیا، اب ہر درخت سے ایک ایک رسّی باندھ کر دوسرے سرے سے الملک الناصر کے ہاتھوں پاؤں جکڑ دیے گئے۔ اس کے بعد درختوں کو یکجا کرنے والا رسا کاٹ دیا گیا۔ درخت ایک جھٹکے سے اپنی سابقہ ہیئت پر آئے اور ساتھ ہی الملک الناصر کے ہاتھ پاؤں الگ الگ ہو گئے۔ دھڑ بیچ میں تڑپتے تڑپتے ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ دردناک واقعہ ۲۵ شوال ۶۵۸ھ کا بتایا جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایوبی خانوادے کے اس آخری بادشاہ کی عمر ۳۱ سال تھی۔[①] وہ صاحبِ شمشیر نہ سہی مگر اپنے دور کے بہترین شعراء میں سے ایک تھا۔[②]

سلطان قطز کی شہادت:

فتح مند سلطان سیف الدین قطز کو چند ہفتے بعد مصر واپس جاتے ہوئے راستے میں شہید کر دیا گیا: قطز کا قاتل کون تھا؟ یہ بات تاریخ کے عجائب میں سے ہے۔ یہ فوج کا سالار رکن الدین بیبرس تھا۔ اس ناروا حرکت کی وجہ وہی عہدوں اور مناصب کا پرانا جھگڑا تھا۔ بعض جدید تاریخ نگاروں نے یہاں یہ من گھڑت بات بھی شامل کر دی ہے کہ قطز نے بیبرس کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی جو کامیاب نہ ہوئی۔ اس پر بیبرس نے جوابی کارروائی کی۔ مگر اس کا کہیں کوئی ثبوت نہیں۔ ہاں اس پر مؤرخین متفق ہیں کہ دونوں میں اَن بن ہو چکی تھی۔

اصل میں اس قتل کی وجوہ پرانی جڑیں رکھتی تھیں۔ دراصل ممالیک دو طبقوں میں بٹ چکے تھے: بڑا طبقہ ممالیکِ بحریہ کا تھا جس میں بڑے چنے ہوئے جنگ آزما مملوک امراء شامل تھے اور بیبرس ان کا سردار تھا۔ دوسرا طبقہ ممالیکِ معزیہ کا تھا جس کا سرخیل الملک المعز ترکمانی تھا جس نے پہل کر کے ممالیک کی سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ چونکہ وہ ممالیکِ بحریہ سے خائف تھا، اس لیے ان کا رُتبہ گھٹانے اور اپنے مملوکوں کو آگے لانے کی سعی کرتا رہا۔ بیبرس سمیت ممالیکِ بحریہ کے بہت سے افسران الملک المعز ترکمانی کے دور میں انہی وجوہ سے مصر چھوڑ کر شام چلے گئے تھے جس کے نتیجے میں ممالیکِ معزیہ کا زور مزید بڑھ گیا تھا جن میں سیف الدین قطز سب سے نمایاں تھا جسے مؤرخین ''اخص ممالیک الملک المعز'' کہہ کر یاد کیا

① سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۲۰۳ تا ۲۰۵؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۸ھ ② اس کی شاعری کے نمونے ''ذیل مرآۃ الزمان'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

کرتے ہیں۔ الملک المعز اور شجرۃ الدر کے قتل کے بعد انہی ممالیکِ معزیہ کا غلبہ سیف الدین قطز کی تخت نشینی کی شکل میں ہوا۔ اگرچہ سیف الدین قطز نے ممالیکِ بحریہ کی ہر ممکن دلجوئی کی اور ان کے سردار بیبرس کو بھی شام سے مصر واپس بلا کر اعلیٰ عہدہ دیا مگر ممالیکِ بحریہ خوش نہیں تھے اور خود کو حکومت کا زیادہ حق دار سمجھتے تھے، کیوں کہ کئی سال پہلے ساتویں صلیبی جنگ میں فرنگیوں کا رُخ پھیرنے والے وہی تھے۔ توران شاہ کو قتل کرکے شجرۃ الدر کو تخت پر بٹھانے کے بعد وہ خود کو ''بادشاہ گر'' سمجھنے لگے تھے۔ سیف الدین قطز کو انہوں نے اپنی بالاتر حیثیت میں رکاوٹ کے طور پر دیکھا مگر چونکہ اس وقت تاتاریوں سے جہاد کی نازک صورتحال درپیش تھی، اس لیے سب نے متحد ہوکر اس طوفان کا مقابلہ کیا مگر اس مسئلے سے فارغ ہوتے ہی پرانی رنجشیں عود کر آئیں۔ بعض نئی تلخیوں نے اس رنجش کو پختہ عداوت میں تبدیل کر دیا جن میں سے ایک قضیہ یہ تھا کہ قطز نے بیبرس سے وعدہ کیا تھا کہ تاتاریوں کے خلاف فتح کے بعد اسے حلب کی ولایت دے دی جائے گی۔ مگر یہ وعدہ ایفا نہ ہوا اور حلب پر سابق حاکمِ موصل کے بیٹے علاؤالدین کو تعینات کر دیا گیا۔ [1]

اس پر بیبرس اور اس کے ساتھی امراء بپھر گئے۔ واپسی کے سفر میں لشکر صالحیہ کے قریب تھا کہ قطز نے شکار کے لیے جنگل کا رُخ کیا۔ بغاوت پر آمادہ امراء موقع پا کر پیچھے ہو لیے۔ شکار سے واپسی پر یہ امراء بھی ہم رکاب تھے۔ اس دوران بیبرس نے قطز سے ایک تاتاری باندی طلب کی۔ قطز نے منظوری دے دی۔ اس پر بیبرس نے سلطان کی دست بوسی کرنا چاہی۔ سلطان نے ہاتھ آگے بڑھائے تو بیبرس نے انہیں دبوچ لیا۔ یہ اشارہ تھا کہ اب سلطان پر حملہ کرنا ہے۔ چنانچہ باقی امراء نے تلواروں اور تیروں سے اس مردِ مجاہد کو وہیں ختم کر دیا۔ [2]

یہ افسوس ناک واقعہ ۱۶ ذوالقعدہ ۶۵۸ھ کا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ [3]

سیف الدین قطز علمائے اسلام کی نگاہ میں:

مصر کے عظیم ترین عالم علامہ عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ کو اس کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ وہ فرماتے تھے:

''اللہ اس کی جوانی پر رحمت نازل فرمائے۔ اگر وہ طویل مدت تک زندہ رہتا تو اسلام کا شباب لوٹا دیتا۔''

وہ یہ بھی فرماتے تھے:

''عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بعد مسلمانوں کی حکمرانی کرنے والوں میں سے کوئی بھی بھلائی اور عدل کے اعتبار سے قطز کے ہم پلہ نہیں تھا۔'' [4]

شیخ قطب الدین یونینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وہ نہ بہت سخی تھا اور نہ ہی بخیل۔ بلکہ اعتدال پسند تھا۔ علاؤالدین خوارزم شاہ کے بعد وہ پہلا حکمران تھا جس

---

(1) البدایۃ والنہایۃ: ۴۱۲/۱۷ ،تاریخ الاسلام للذھبی ،وفیات: ۶۵۸ھ

(2) النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ: ۸۱/۷ تا ۸۳، دار الکتب مصر

(3) تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۵۵/۴۸ ،ت تدمری

(4) قصۃ التتار من البدایۃ الی عین جالوت للدکتور الراغب السرجانی، ص ۲۶۷ ،ط مؤسسۃ اقرأ ،قاھرۃ، سنۃ: ۱۴۲۷ھ

نے تاتاریوں سے لڑنے کی جرأت کی اور انہیں ایسی شکست فاش دی کہ اسلام کا رخشہ ہو گیا۔"[1]

قطز کے قتل کے پندرہ سال بعد پیدا ہونے والے حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وہ بہادر، شجاع اور آگے بڑھ کر حملہ کرنے والا شخص تھا۔ ہوشیار اور مدبر تھا۔ دین، اسلام اور خیر کے کام اس کا ہدف تھے۔ تاتاریوں سے جہاد میں اس کے کارنامے نہایت روشن ہیں۔ اللہ اس کے شباب کے بدلے میں اسے جنت عطا کرے۔"[2]

دوسرے مقام پر تحریر کرتے ہیں:

"وہ سرخ رنگت اور گھنی ڈاڑھی والا خوش شکل نوجوان تھا، ابھی اس نے بادشاہت کا ایک سال بھی پورا نہیں کیا تھا۔ اللہ اس پر رحمت نازل فرمائے۔"[3]

علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ، امام صدر الدین ابن مرحل رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

"قطز کے سوا سلطنتِ مصر کے تمام بادشاہ شافعی تھے۔ قطز حنفی المسلک تھا۔"[4]

علامہ یوسف بن تغری بردی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو قطز کا قتل نہایت گراں گزرا۔ اس لیے کہ وہ بہترین ترک حاکم تھا۔ تاتاریوں کا رخ پھیرنے، ان کی بیخ کنی کرنے اور عالم اسلام کو ان سے بچانے میں اس کا بہت بڑا کردار تھا۔ اللہ اس پر رحمت کرے۔"[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وہ ایک صالح شخص تھا۔ اکثر جماعت سے نماز ادا کرتا تھا۔ شراب اور اس جیسی چیزوں کا استعمال نہیں کرتا تھا جن کے (اس دور کے) بادشاہ عادی تھے۔ اپنے آقا زادے ملک المنصور علی بن معز ترکمانی کو معزول کرنے سے لے کر اس وقت تک جو کہ اواخر ذوالقعدہ ہے، اس کی مدتِ حکومت تقریباً ایک سال تھی۔ اللہ اس پر رحمت نازل کرے اور اسے اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔"[6]

نیز وہ لکھتے ہیں:

"وہ شجاع، جنگجو، بکثرت خیر کے کام کرنے والا اور اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ تھا۔ لوگ اس سے محبت کرتے

---

① ذیل مرآۃ الزمان: ۱/۳۸۰، ط قاهرہ، اس عبارت میں لفظ "علاؤالدین خوارزم شاہ" سہوِ کاتب یا سہوِ مصنف ہے۔ یہاں جلال الدین خوارزم شاہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ علاؤالدین خوارزم شاہ نے تاتاریوں سے بُری طرح شکست کھائی تھی جبکہ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے انہیں کئی بار پسپا کیا تھا۔

② تاریخ الاسلام للذهبی: ۳۸/۳۵۵، ت تدمری

③ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۲۰۱، ط الرسالۃ

④ طبقات الشافعیۃ الکبری: ۸/۳۲۰ ...... قطز کے نسب کے بارے میں علمائے تاریخ متفق نہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ مجہول النسب ہے، اس لیے حافظ ذہبی اور حافظ ابن کثیر سمیت متعدد مؤرخین نے اسے "قطز بن عبداللہ" کہہ کر یاد کیا ہے۔ مگر دوسری رائے جسے خود قطز کا بیان تقویت دیتا ہے، یہ ہے کہ وہ خوارزمی خانوادے کا شہزادہ تھا۔ راقم کے نزدیک اس کا حنفی ہونا بھی اس رائے کی ایک وجہ ترجیح بنتا ہے کیوں کہ شام اور مصر میں اکثریت شوافع کی تھی، یہاں کے تمام سلاطین شافعی تھے اور قطز واحد حنفی سلطان تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہی ہو کہ اس کا تعلق خوارزم شاہی خاندان سے تھا جو نسل در نسل حنفی چلے آئے تھے۔

⑤ مورد اللطافۃ فیمن ولی السلطنۃ والخلافۃ: ۲/۳۲

⑥ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۸ھ

تھے اور اس کے لیے بہت دعائیں کرتے تھے۔''[1]

قبر مٹادی گئی، نام زندہ رہا:

سیف الدین قطز کو قتل کے بعد دفن نہیں کیا گیا تھا۔ نعش بے گور و کفن پڑی رہی۔ آخر بعض ہمدردوں نے آ کر اسے غرابی اور صالحیہ کے درمیان '' قُصَیر '' میں دفن کر دیا۔ لوگ اپنے اس محسن کی مرقد پر دُور دُور سے آ کر دعائے رحمت و مغفرت کرتے تھے۔ شیخ قطب الدین یونینی نے ۶۵۹ھ میں قبر کی زیارت کی تھی۔ لوگ اس مردِ مجاہد کے لیے بہت زیادہ دعائیں اور قاتلین کے لیے بد دعائیں کیا کرتے تھے۔ نئے حکمران بیبرس نے جب یہ رنگ دیکھا تو نعش کو قبر سے نکال کر کسی گمنام جگہ پر دفن کر دیا جس کا نام و نشان تک کسی کو نہ ملا۔ سیف الدین قطز کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے نسل بھی آگے نہ چل سکی۔[2] مگر قبر کے مٹ جانے یا بے اولاد رہ جانے سے قطز کی شان میں کوئی کمی آئی؟

بیبرس نے قطز کی قبر نہیں مٹائی بلکہ اپنے خوبصورت دامن پر ایک اَن مٹ دھبہ لگا لیا۔ قطز اگر ایک سال سے بھی کم عرصہ حکومت کر کے بے دردی سے قتل کر دیا گیا تو اس کا کیا نقصان ہوا؟ اس چیز نے اُلٹا اُن امراء کی شان گھٹا دی جو اس جرم میں ملوث ہوئے۔ اس اللہ کے بندے نے کوئی وارث نہ چھوڑا، نہ مزار۔ مگر آج تک دُنیا اسے سلامِ عقیدت پیش کرتی ہے؟ اس لیے کہ اصل چیز انسان کی نیت، اس کا جذبہ، اس کی قربانی اور اس کا کام ہے۔ دُنیا انہی کو اچھے الفاظ سے یاد کرتی ہے جو انسانیت کو کچھ دے جائیں۔ سینکڑوں بادشاہ آئے اور چلے گئے۔ ان میں سے کیسے کیسے عالی نسب، طویل زمانے تک حکومت کرنے اور بیسیوں بچے چھوڑ کر جانے والے بھی ہیں، ان کی قبروں پر عالی شان عمارتیں ہیں۔ مگر دُنیا ان میں سے کتنوں سے واقف ہے اور کتنے ہیں جن کا کوئی کارنامہ یاد رکھنے کے قابل ہے؟

طاقت کے اصول کا نقصان:

ممالیک کی سلطنت کا آغاز '' طاقت کے اصول '' پر ہوا تھا۔ حکومت اسی کا حق تھا جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ اس طاقت کا ظہور سب سے پہلے بیبرس کے ہاتھوں آخری ایوبی بادشاہ توران شاہ کے قتل سے ہوا تھا۔ پھر اسی اصولِ طاقت کو شجرۃ الدر نے آزما کر الملک المعز ترکمانی کو قتل کیا اور خود بھی قتل ہوئی۔ سیف الدین قطز کی تخت نشینی شورائیت کے اصول پر ہوئی تھی مگر بیبرس نے اس اسلامی روایت کو پھر توڑ دیا اور بادشاہ کو قتل کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ چنانچہ اس کے بعد ممالیک کی پوری تاریخ میں چند مواقع کو مستثنیٰ کر کے یہی اصول چلتا رہا۔ پس عہدِ ممالیک میں امراء کی طرف سے بادشاہوں کے خلاف بغاوتوں کے واقعات بکثرت ہیں جن میں بادشاہ قتل بھی ہوئے اور معزول بھی۔

❁❁❁

---

[1] البداية والنهاية: سنة ٦٦٨هـ۔۔۔۔۔ نوٹ: ہم البدایۃ والنہایۃ کا نسخہ دار ہجر استعمال کرتے آئے ہیں جس میں یہ عبارت اس طرح ہے: ''وقد كان شجاعا بطلا كثير الخير ممالئا للإسلام وأهله وهم يحبونه.'' جبکہ دار الفکر اور دار احیاء التراث کے نسخوں میں عبارت یوں ہے: ''وقد كان شجاعا بطلا كثير الخير ناصحا للإسلام وأهله، وكان الناس يحبونه ويدعون له كثيرا.'' مذکورہ ترجمہ دار الفکر اور دار احیاء التراث کے نسخوں کے مطابق ہے۔

[2] النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة: ٨٦/٧، ٨٧؛ تاريخ الاسلام للذهبي: ٣٥٥/٣٨، ت تدمری

شیرِ ببر۔ سلطان رکن الدین بیبرس

ذوالقعدہ ۶۵۸ھ تا محرم ۶۷۶ھ (نومبر ۱۲۶۰ء تا جون ۱۲۷۷ء)

اسلامی تاریخ میں بعض مواقع ایسے دکھائی دیتے ہیں جب اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے آراستہ ایک بہترین حکمران اور محسنِ قوم کو کسی دوسرے طالع آزما نے محض جاہ ومنصب کے لیے قتل کر دیا۔ ایسے میں لگتا یہی ہے کہ یہ دوسرا حاکم پہلے کی ضد ہوگا اور مملکت کو تباہی کی طرف لے جائے گا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ایک اچھے آدمی سے منصب چھیننے والا عموماً برا آدمی ہوتا ہے اور عام طور پر اس کی پالیسی بھی برعکس اور منفی ہوتی ہیں جنہیں نافذ کرنے کے لیے وہ جائز وناجائز کا فرق بھول جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی اللہ کی قدرتِ کاملہ واقعات کو عام ڈگر کے خلاف چلا دیتی ہے۔ منفی حالات سے مثبت نتائج برآمد کر دیتی ہے۔ انسان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور یقین کر لیتا ہے کہ اس دنیا کو چلانے والا اصل حاکم وہی ہے جو اپنے فیصلوں میں اسباب وذرائع اور حالات کے نقشوں کا محتاج نہیں۔ چنانچہ تاریخ بعض مواقع پر یہ منظر دکھاتی ہے کہ ایک قابلِ رشک حکمران کو جبراً ہٹا کر ایک دوسرا حکمران سامنے آیا مگر اس کے بارے میں سوچے گئے خدشات غلط ثابت ہوئے۔ نئے حکمران نے اپنی ذمہ داریاں اس خوبی سے نبھائیں کہ مخالفین بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ سیف الدین قطز کو قتل کر کے رکن الدین بیبرس کا بادشاہ بننا اِس کی ناقابلِ فراموش مثال ہے۔

اگر اس قسم کا حکمران کبھی خلافِ توقع اچھا ثابت ہو تو اس کے پیچھے کچھ خاص وجوہ بھی ہوتی ہیں: مثلاً یہ کہ وہ حکمران ذاتی طور پر بہت باصلاحیت ہوتا ہے۔ اس کی تربیت عمدہ ہوتی ہے، وہ نیک، دین دار، بہادر اور پرہیز گار ہوتا ہے۔ ایمان ویقین اور علم وعمل سے آراستہ، قومی غیرت کا حامل اور ملک وملت کے تقاضوں سے واقف ہوتا ہے۔ تاہم حکومت کی حرص اس کی کمزوری بن چکی ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ اسے یہ منصب بھی عطا کر دیتے ہیں تو اسے کسی اور چیز کی حرص نہیں رہتی اور وہ پوری طرح اللہ کی فرمانبرداری، مخلوق کی خدمت اور اسلام کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ اصل چیز اللہ کا تکوینی فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ اللہ جو فاسق وفاجر لوگوں سے بھی دین کا کام لیتا ہے، اس کے لیے یہ منظر دکھانا بھلا کیا مشکل ہے کہ ایک شخص کا ماضی داغ دار ہو، اس نے حکومت بھی بڑے غلط طریقے سے حاصل کی ہو، اور آگے بھی بہت کچھ ناجائز کر سکتا ہو، مگر قدرتِ الٰہیہ اس کو دین کی حفاظت کے لیے منتخب کر لے، اس

کے دل کا رخ بدل دے، اس کے اعمال اور اس کے دورِ حکومت کو قابلِ رشک بنا دے۔ سلطان رکن الدین بیبرس قدرت کے ایسے ہی کرشمے کا نام تھا۔

سلطان بیبرس کے ابتدائی حالات:

بیبرس کی ولادت ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) میں بحیرۂ اسود کے شمال میں واقع صحرائے قپچاق (یوکرائن) میں ہوئی تھی جہاں ترک قبائل آباد تھے۔ وہ ۱۴ سال کا تھا جب تاتاریوں نے وہاں حملہ کیا۔ بیبرس قیدیوں میں شامل ہوا اور غلام بنا کر بیچا گیا۔ امیر علاؤ الدین بند قدار نے اسے دمشق کے بازار سے خریدا، اسی نسبت سے وہ ''بیبرس بندقداری'' کہلایا۔ اس کی غیر معمولی طاقت، چستی، شجاعت اور ہوشیاری کو دیکھتے ہوئے شاہِ مصر الصالح ایوب نے اسے ترقی دی اور کچھ مدت بعد فوج کا سالار بنا دیا۔ [1] وہ گندمی رنگت، نیلی آنکھوں والا، قدرے دراز قامت اور بلند آواز انسان تھا۔ [2]

سلطان الصالح ایوب کے دور میں ساتویں صلیبی جنگ شروع ہوئی اور اسی دوران سلطان کی وفات ہوگئی۔ تاہم ملکہ شجرۃ الدر نے جنگ جاری رکھی اور بیبرس نے سالارِ فوج کے طور پر اپنے معسکر منصورہ کے دفاع اور حریف کی شکست فاش میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ جنگ کے دوران شجرۃ الدر نے اپنے سوتیلے بیٹے توران شاہ کو بادشاہت سونپ دی تھی مگر اس نے فتح کے بعد فاتح جرنیلوں کی ناقدری کی جن میں بیبرس نمایاں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے اوپر کسی کی زیادتی برداشت نہیں کرتے۔ پس اس نے سلطان توران شاہ کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔ شاہی محل میں اسے سب کے سامنے زخمی کیا، پھر دیگر سپاہیوں نے تعاقب کر کے توران شاہ کو تہہ تیغ کر دیا اور کسی کو آڑے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یوں ایوبی خاندان کی حکومت بیبرس کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ اس وقت بیبرس کی عمر صرف ۲۷ سال تھی۔ [3]

مملوکوں کی حکومت شروع ہوئی تو پہلے مملوک حکمران عز الدین ترکمانی کو بیبرس کی سطوت و ہیبت سے خوف آنے لگا۔ دونوں میں تعلقات کشیدہ ہوئے تو بیبرس نے قاہرہ چھوڑ دیا اور شام جا کر الملک الناصر کی فوج میں شامل ہوگیا۔ مگر جب الناصر نے تاتاریوں کے مقابلے سے پہلوتہی اختیار کی تو بیبرس ناراض ہو کر الگ ہوگیا۔ جلد ہی وہ مصر کے نئے حکمران سیف الدین قطز کی دعوت پر واپس مصر آ گیا اور عین جالوت کی فتح میں پیش پیش رہا۔

تاتاریوں میں بیبرس کی شجاعت اور جنگی مہارت کی دھوم مچ چکی تھی اور وہ اسے اپنی فتوحات کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ عین جالوت کی جنگ سے قبل جب حمص کے حاکم الاشرف نے تاتاری سپہ سالار کتبغا نویان کے پاس حاضر ہو کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ تاتاریوں کا اچھا مددگار ثابت ہوگا تو کتبغا نے اسے ڈپٹ کر کہا:

---

① النجوم الزاهرة: ۹۵/۷، ۹۶؛ الاعلام للزركلی: ۷۹/۲، ط دار العلم

② كان الملك الظاهر أسمر، أزرق العينين، جهوري الصوت، عليه مهابة وجلالة، وكان إلى الطول أقرب. (عقد الجمان: سنہ ۶۷۶ھ)
مغربی مؤرخین بیبرس کا حلیہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ چھ فٹ سے زیادہ قد آور اور یک چشم تھا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ بیبرس کی دونوں آنکھیں سلامت تھیں، قامت دراز تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔

③ السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۶۴۸ھ

''سنا ہے کہ بیبرس مصر سے کچھ فوج کے ساتھ نکل چکا ہے۔اگر تو واقعی بہادر ہے تو جاکر اس کا مقابلہ کر۔''[1]

جب اللہ نے عین جالوت میں مسلمانوں کو فتح نصیب کی تو بے فکری کے ماحول میں ممالیکِ معزیہ اور ممالیکِ بحریہ کی پرانی چپقلش عود کر آئی۔ فاتح بادشاہ کا بیبرس کو حلب کا گورنر نہ بنانا جلتی پر تیل کا مصداق بن گیا۔چنانچہ بیبرس کی شمشیر پھر بے نیام ہوئی اور اس نے سیف الدین قطز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔[2]

بیبرس کی تخت نشینی:

باہمی مشورے سے کسی طاقتور اور ہوشیار فرد کو حکمران بنالینا مملوکوں کی روایت بن چکا تھا۔جب مقتول بادشاہ کا قافلہ الصالحیہ پہنچا تو وہاں جمع مملوک امراء نے پوچھا:''بادشاہ کو کس نے مارا؟''

بیبرس نے بے خوفی سے کہا:''میں نے۔''

پس ایک اعلیٰ افسر اقطائی نجمی[3] نے آواز لگائی:''پھر تم ہی قطز کی جگہ تخت پر بیٹھو۔''

مطلب یہ تھا کہ جو بادشاہ کی جان لے سکتا ہے وہی سب سے دلیر، سب سے طاقتور اور حکومت کا اہل ہے۔

اس مختصر سی بات چیت میں مملوک امراء نے جمع ہوکر اسے بادشاہ مان لیا۔یہ ۱۹ ذوالقعدہ ۶۵۸ھ (۲۶ اکتوبر ۱۲۶۰ء) کا واقعہ ہے۔اس وقت بیبرس کی عمر ۳۳ سال تھی۔

اب تک قاہرہ میں سیف الدین قطز کے قتل کی خبر نہیں پہنچی تھی۔جب بیبرس کا جلوس وہاں پہنچا تو اعلان ہوا:

''الملک المظفر قطز کے لیے دعائے رحمت اور نئے حکمران بیبرس کے لیے دعائے خیر کرو۔''

لوگوں کو ایک محبوب اور قابل حکمران کی موت کا سخت غم ہوا۔انہیں خدشہ ہوا کہ نیا حکمران قہر و جبر کا عادی ہوگا۔یہ اندازہ عجیب نہ تھا۔بیبرس نے خود اپنی سخت طبیعت کی مناسبت سے پہلے پہل اپنا لقب الملک القاہر رکھا مگر جب ساتھیوں نے کہا کہ یہ لقب رکھنے والا ہر حکمران ناکام ہوا ہے، تب اس نے الملک الظاہر کا لقب اختیار کیا۔

اس نے جلد ہی سپہ سالاری اور حکمرانی کے مزاج کا فرق محسوس کرلیا اور سمجھ لیا کہ لوگوں پر قہر و جبر کی بجائے لطف و مہربانی کے ساتھ حکومت کرنا زیادہ مناسب ہے۔حکمران بننے کے بعد وہ اپنے مزاج پر قابو پانے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے تاکہ عوام اس سے ڈرنے کی بجائے مانوس ہوجائیں۔سابق حکومت نے جہاد کے لیے کئی ٹیکس عائد کر دیے تھے۔بیبرس نے انہیں فوری طور پر معاف کر دیا۔یہ اس کا پہلا اقدام تھا جس نے لوگوں میں پھیلی ہوئی ناگواری کو دور کیا اور وہ مطمئن ہوکر اسے دعائیں دینے لگے۔[4]

علامہ محی الدین بن عبدالظاہر رحمہ اللہ بیبرس کی تخت نشینی کے ابتدائی دنوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

---

[1] الروض الزاهر فی سيرة الملک الظاهر، ص ۶۶، ۶۷ [2] السلوک لمعرفة دول الملوک :سنة ۶۵۸ھ

[3] یہ اقطائی الگ شخصیت ہے جبکہ فارس الدین اقطائی جس کا ذکر پیچھے آیا، وہ الگ تھا۔

[4] السلوک لمعرفة دول الملوک :سنة ۶۵۸ھ

''جب سلطان قلعے میں براجمان ہوئے اور دربار شاہی میں بیٹھ گئے تو مختلف طبقات کے لوگوں سے بیعت لی، کوئی بھی بیعت سے پیچھے نہ رہا۔ پس سلطان کی حکومت کسی اختلاف کے بغیر قائم ہوگئی۔ سلطان نے امرونہی کا آغاز کیا۔ اموال خرچ کیے۔ احکام دیے اور عہدے سونپے، عزل ونصب کیا، مراکش، یمن اور شام کے حکمرانوں کو خطوط لکھ کر اپنی سلامتی اور اپنے ماتحتوں کی اطاعت کی خبر دی۔ ملک کو سلطنتِ صالحیہ (سلطان الصالح ایوب کی حکومت) کی رسوم اور قوانین کے مطابق چلانا شروع کیا۔ سلطان الصالح ایوب شہید کے پسندیدہ اور چنیدہ غلاموں کو اختیارات سونپے۔ اس سے سلطان کے دربار کا وقار بڑھ گیا اور لوگ سمجھ گئے کہ اللہ نے ایسے شخص کو حکومت دی ہے جو مملکت کے معاملات اور قوانین سے واقف ہے اور لوگوں کو ان کے مقام پر رکھتا ہے۔ سلطان نے شریعتِ مطہرہ کو نافذ کرنے کے احکام جاری کیے اور ایک عرصے تک حکومتی معاملات کو ترتیب دینے، دوستوں کو نجات دلانے، دشمنوں کا حال جاننے اور سلطنتِ صالحیہ کے قوانین جاری کرنے کے سوا کسی کام میں مشغولیت اختیار نہ کی، یہاں تک کہ کام بنانے والے اور بگاڑنے والوں میں واضح امتیاز ہو گیا۔''[1]

سلطان بیبرس، تخت نشینی کے بعد:

سلطان رکن الدین بیبرس کی تخت نشینی سے مصر میں ایک نئے اور تابناک دور کا آغاز ہوا۔ یہ ایسا دور تھا جس میں مصر کو پورے عالم اسلام کے محافظ، سرپرست، مرکزِ وحدت اور سیاسی محور کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسلام کی تاریخ میں سرزمینِ مصر کو یہ عظمت پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ خلافت کا احیاء، تاتاریوں سے جہاد، صلیبیوں سے عالم اسلام کا دفاع، باطنی اسماعیلیوں کا استیصال اور مسلسل تعمیراتی وترقیاتی کام سلطان بیبرس کے ایسے اہم کارنامے ہیں جن کے باعث اس رجلِ عظیم کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔ بیبرس کی طبیعت شیر ببر سے مشابہ تھی۔ اس میں خوف نامی کوئی چیز سرے سے نہیں تھی۔ جان دینا یا لینا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ لپکنا جھپٹنا، ایک لمحے میں فیصلہ کرنا اور کر گزرنا اس کی عادت تھی۔ وہ اپنے راستے میں حائل ہر رکاوٹ کو بلاتردد ریزہ ریزہ کر کے آگے نکل جانے والا شہ سوار تھا۔ اسے دھوکا دینا ممکن نہ تھا مگر کوئی اس کے دھوکے سے بچ نہیں پاتا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اگلے لمحے میں کیا کرے گا۔ مزاج کی اس تیزی، دلیری، سرعت اور بے پناہ قوتِ عمل نے اسے اپنے معاصرین پر فائق کر دیا تھا۔ اللہ کی قدرت کاملہ نے اسے ایسے وقت میں ظاہر کیا جب تاتاری اور صلیبی دونوں عالم اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ عماد الدین زنگی، سلطان نورالدین، صلاح الدین ایوبی اور الملک العادل اپنے اپنے دور میں صلیبیوں کا رخ پھیر کر نامور بنے۔ جلال الدین خوارزم شاہ اور سیف الدین قطز نے تاتاریوں سے جہاد کی تاریخ رقم کر کے نیک نامی حاصل کی۔ مگر بیبرس کی شخصیت اس لحاظ سے سب سے نمایاں ہے کہ اس نے بیک وقت صلیبی اور تاتاری دونوں عالمی طاقتوں کا مقابلہ کیا اور

---

[1] الروض الزاهر فی سیرة الملك الظاهر، ص ۷۰،۷۱

دونوں کوئی میدانوں میں چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ان کارناموں کی وجہ سے دنیائے اسلام اسے ''الاسد الضاری'' (خونخوار شیر) کہہ کر یاد کرتی ہے جبکہ مستشرقین اسے چیتے سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔

شوبک کی فتح:

سلطان نے تخت نشینی کے بعد سلطنت کو مزید وسعت دی اور شام ومصر کے درمیان راستوں کو مخالفین سے بالکل خالی کرالیا۔ یہاں قلعہ شوبک پر تاتاریوں کے باج گزار الملک المغیث عمر کی حکومت تھی۔ بیبرس نے یہاں ایک چھاپہ مار دستہ بھیجا جس نے ۱۶ ربیع الآخر ۶۵۹ھ کو قلعے پر قبضہ کرلیا۔ یہاں سیف الدین بلبان کو نائب مقرر کردیا گیا۔[1]

خلافت کا احیاء:

بیبرس کی تخت نشینی اس حال میں ہوئی تھی کہ تین سال سے عالم اسلام میں کوئی خلیفہ نہ تھا۔مسلمان سیاسی مرکزِ وحدت سے محروم تھے۔ سلطان بیبرس نے اس کمزوری کو دور کرنے پر بلاتاخیر توجہ دی اور خلافت کے لیے مناسب فرد کی تلاش شروع کی۔ انہی دنوں ایک کہنہ سال عباسی شہزادہ احمد بن ظاہر مصر پہنچا۔وہ آخری خلیفہ مستعصم کا سگا چچا تھا یعنی مستنصر کا سگا بھائی، ظاہر باللہ کا بیٹا اور خلیفہ ناصر کا پوتا۔ سلطان بیبرس نے اس کی آمد پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور ایک بڑے جلوس کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔شاہی محل میں مصر کے عمائد اور اعیان سلطنت کے مختلف وفود کی اس سے ملاقاتیں کرائیں۔اس وقت عالم اسلام میں خلافت کی کمی سب کو محسوس ہو رہی تھی مگر تین سال سے اس مسئلے کا فیصلہ اس لیے نہیں ہوسکا تھا کہ یہاں کئی سوال تھے: خلافت کا بہترین اہل کون ہے جس پر امت متفق ہوسکے؟ خلیفہ کے اختیارات کیا ہوں گے؟ خلافت کی حفاظت کون کرے گا اور کیسے؟ جب یہ عباسی شہزادہ نمودار ہوا تو بیبرس نے علماء وفقہاء کے مشورے سے اسی کو خلافت سونپنے کا فیصلہ کرلیا۔[2]

اس فیصلے کی کئی وجوہ تھیں مثلاً:

1. پانچ صدیوں سے مسلمان عباسی خلفاء پر متفق چلے آرہے تھے۔ اگر سقوطِ بغداد نہ ہوا ہوتا تو یہ خلافت چلتی رہتی۔ مناسب یہی تھا کہ امت کو اسی خانوادے کے ساتھ وابستہ رہنے دیا جائے جس سے وابستگی کے وہ عادی چلے آرہے تھے اور جس پر ان کے دل مطمئن اور اذہان متفق تھے۔
2. یہ تو طے تھا کہ خلافت قریش سے باہر نہیں جائے گی، لیکن اب اگر خلافت قریش کے کسی اور خاندان کو دی جاتی تو اس کی اہلیت پر سوال اٹھتے۔ دیگر شاخیں بجا طور پر پوچھ سکتی تھیں کہ اس خاندان کی وجہِ ترجیح کیا ہے؟ اور ہم کیوں محروم ہیں؟ ایسے سوالات افتراق کو جنم دیتے اور خلافت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔
3. ہلاکو خان نے بنوعباس کی خلافت ختم کی تھی۔ ابن علقمی اور نصیر طوسی جیسے غداروں کا ہدف بھی یہی تھا۔اب اہلِ سنت کے لیے یہ عزت وغیرت کا مسئلہ بن گیا تھا کہ وہ طاغوت اور اس کے آلہ کار بننے والوں کا خواب پورا نہ ہونے

[1] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۶۵۹ھ
[2] البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۶۵۹ھ ؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۶۵۹ھ

دیں اور اسی عباسی خلافت کو زندہ رکھیں۔

پس یہ تو طے ہو گیا کہ خلیفہ عباسی ہوگا۔ اگلا سوال یہ تھا کہ خلیفہ کے اختیارات کس حد تک ہوں گے؟

دنیائے اسلام کی سیاست میں عملی طور پر نہ صرف قریش بلکہ عربوں کا عمل دخل بھی کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت زمام کار ترکوں کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ چاہتے تو خود مسندِ خلافت پر بیٹھ جاتے مگر اس طرح قریشی ہونے کی شرط پوری نہ ہوتی، علماء کی طرف سے اعتراضات اٹھتے اور امت اس خلافت پر مطمئن نہ ہوتی۔

اگر قریشیوں یعنی عباسیوں کو مکمل با اختیار خلیفہ بنا کر بیبرس جیسے جرنیل خود بے اختیار ہو جاتے تو شاید خلافت مصر بہت جلد پھر اسی انجام سے گزرتی جو بغداد کا ہوا تھا۔ اگر عباسی خاندان صلاحیت، حوصلے اور قوت کے لحاظ سے اس قابل رہا ہوتا تو بغداد کو ہی بچا لیتا۔ پس انہیں مکمل اختیارات سونپنا بھی مصلحت کے خلاف تھا۔

ایسے میں درمیانی راہ یہی تھی کہ جو طاقتور فوجی امراء عالم اسلام کی حفاظت کے قابل ہیں وہ سیاسی و عسکری امور اپنے ہاتھوں میں رکھیں، خلافت کی حفاظت بھی وہی کریں۔ خلیفہ کی حیثیت ایک روحانی سرپرست کی رہے جو دینی لحاظ سے اُمت کی راہنمائی کر کے انہیں نظریاتی طور پر متحد رکھے۔ وہ ایک خاندانی بزرگ کی طرح ہو جس کا سب احترام کریں، اس سے دعائیں لیں اور باہمی جھگڑوں میں اس کی بات کو اہمیت دی جائے۔ پس خلافت کے اس نئے تصور کے ساتھ مملوکوں نے بنو عباس کو خلافت دینے کا فیصلہ کر لیا۔

احیائے خلافت کی عظیم الشان تقریب:

پیر ۱۳ رجب ۶۵۹ھ کو قاہرہ میں ایک عظیم الشان تقریب ہوئی۔ پورا قاہرہ یہاں تک کہ یہودی اور عیسائی بھی اس میں شریک ہوئے۔ احمد بن ظاہر کو تخت پر اعزاز و اکرام کے ساتھ بٹھایا گیا۔ سلطان بیبرس تکیے کے بغیر عام آدمی کی طرح سامنے فرش پر باادب بیٹھ گیا۔ قاضی تاج الدین نے محفل میں موجود کئی عرب حضرات سے شہادت لی کہ یہ صاحب مستعصم عباسی کے چچا اور ظاہر باللہ کے بیٹے ہیں۔ پھر خلافتِ بغداد کے بعض سابق خدام سے اس کی توثیق کرائی۔ گواہی مکمل ہونے پر پہلے قاضی تاج الدین نے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر سلطان بیبرس نے ہاتھ بڑھا کر کہا:

> ”میں آپ سے بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل پیرا رہوں گا۔ نیکی کا حکم دینے، برائی سے روکنے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے پر کاربند رہوں گا۔ اللہ کا مال حلال جگہ سے لوں گا اور صحیح مصارف پر خرچ کروں گا۔“

اس کے بعد شیخ الاسلام عبدالعزیز بن عبدالسلام رحمہ اللہ نے بیعت کی۔ پھر سب عوام و خواص بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اس طرح ساڑھے تین سال کے تعطل کے بعد مصر میں خلافت کا از سرِ نو احیاء ہوا۔ اگرچہ مصر کی یہ نئی عباسی خلافت، بغداد کی خلافت کے ہم پلہ نہ تھی کیوں کہ سیاسی و عسکری اُمور مملوک بادشاہوں کے پاس تھے۔

جمعے کے دن خلیفہ نے جامع مسجد کے منبر پر خطبہ دینے کی رسم جو صدیوں سے خلفاء کے نائب انجام دے رہے

تھے، ایک بار پھر شروع کی۔ خطبے میں سورۃ الانعام کی آیات تلاوت کیں، درود وسلام کے بعد صحابہ کی مدح کی اور بنو عباس کی عظمت کا ذکر کیا۔ پھر ایسی رقت انگیز تقریر کی کہ لوگ اسلاف کا سابق دور یاد کر کے اور اسلام کی اس نئی تابندگی کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ خلیفہ نے سلطان کے لیے دعائے خیر کی۔ پھر نماز جمعہ پڑھائی۔ [1]

بیبرس کے لیے سلطانِ مصر وشام کا پروانہ:

خلافت کے قیام کے بعد ۴ شعبان ۶۵۹ھ کو ایک اور تقریب میں خلیفہ نے بیبرس کو مصر کی سلطنت کا پروانہ دیا۔ یوں بیبرس کو آئینی طور پر سلطانِ مصر وشام کی حیثیت مل گئی۔ [2]

❁❁❁

تاتاریوں سے جہاد...... پہلا دور

ہلاکو خان عینِ جالوت کی شکست کی خبر سن کر جلا بھنا بیٹھا تھا۔ اس نے بیبرس کی تخت نشینی کے بعد ایک بار پھر اپنی فوجیں شام کی طرف روانہ کیں، مگر سلطان بیبرس نے سرحدوں کی حفاظت کا انتظام کر لیا تھا، بیبرس کے دور میں تاتاری کئی بار حملہ آور ہوئے مگر ہمیشہ ناکام و نامراد واپس لوٹے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ہلاکو خان کو جب عین جالوت میں اپنے لشکر کے حشر کی خبر ملی تو اس نے بہت سی فوجیں روانہ کیں تاکہ شام کے شہروں کو دوبارہ اہلِ اسلام سے چھین لیا جائے مگر وہ اپنی مراد سے محروم رہے اور ذلیل و خوار ہو کر لوٹ گئے کیوں کہ شیر پنجہ فگن، شمشیرِ قاطع سلطان الظاہر ان کے سامنے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے دمشق اور دوسرے شہروں کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بھرپور اسلحے اور مکمل تیاریوں کے ساتھ لشکر بھیج دیے تھے۔ پس تاتاری ان پر حملہ تو کیا کرتے، پاس بھی نہ آسکے۔ انہوں نے دیکھا کہ مملکت کی حالت بدل گئی ہے، آستینیں چڑھی ہوئی ہیں، تیز دھار تلواریں سونت لی گئی ہیں، لچک دار نیزے تیار ہیں، کمانوں پر تانتیں چڑھا دی گئیں ہیں، تیروں کے پھل لگا دیے گئے ہیں، گھوڑے سدھائے ہوئے ہیں، نقارے بجنے کو ہیں اور اللہ کی نصرت اہلِ شام پر اتر چکی ہے اور اس کی رحمت انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ پس الحمد للہ وہ شیطان الٹے پاؤں لوٹ گئے۔'' [3]

معرکہ مرقدِ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ۔ غیبی مدد کا نظارہ:

۶۵۹ھ (۱۲۶۱ء) میں تاتاریوں نے کتبغا کے بھائی بیدرا کی کمان میں حمص پر حملہ کیا مگر اب مسلمان شیر دل ہو چکے تھے۔ حاکم حماۃ الملک المنصور اور حاکم حمص الملک الاشرف نے مل کر انہیں روکنے کا فیصلہ کیا۔ ۵ محرم کو حمص کے باہر مرقدِ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے قریب معرکہ ہوا۔ تاتاری چھ ہزار تھے اور مسلمان صرف چودہ سو۔ مگر انہوں نے

---

① البدایة والنهایة :سنة ۶۵۹ھ؛ السلوک لمعرفة دول الملوک :سنة ۶۵۹ھ

② البدایة والنهایة :سنة ۶۵۹ھ؛ السلوک لمعرفة دول الملوک :سنة ۶۵۹ھ

③ البدایة والنهایة :سنة ۶۵۸ھ

جان کی بازی لگادی اور فتح یاب ہوئے۔ اس جنگ کے قائدین یعنی حماۃ وحمص کے فاتح امراء نے مصر آکر سلطان سے خلعت وصول کی۔ اس لڑائی میں غیبی نصرت کا نزول سفید پرندوں کی شکل میں ہوا۔ امیر بدرالدین قیمری کا بیان ہے:

''اللہ کی قسم! میں نے اپنی آنکھوں سے سفید رنگ کے پرندے دیکھے جو اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے تاتاریوں کے چہروں پر حملہ کرتے تھے۔''

علامہ نویری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ بات اتنے لوگوں نے ذکر کی ہے کہ تواتر کی حد کو پہنچ گئی ہے۔ لڑائی میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور تاتاری پسپا ہوگئے۔ (1)

حمص کی جنگ میں منہزم ہونے والے تاتاری لشکر نے واپسی پر حلب کا محاصرہ کرلیا جو چار ماہ تک جاری رہا۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ مگر شہر محفوظ رہا۔ (2)

ممالیک کی عراق پر فوج کشی اور اس کی فوری وجوہ:

سلطان بیبرس نے اب تک شام کے دفاع پر اکتفا کرتے ہوئے احتیاطاً عراق میں فوج کشی سے گریز کیا تھا۔ تاہم کچھ حالات ایسے بن گئے کہ پوری طرح تیاری کیے بغیر ۶۵۹ھ کے اواخر میں فی الفور عراق کی طرف فوج بھیجنا پڑی۔

عراق میں موصل کی دولتِ زنگیہ چھٹی صدی ہجری میں ایک الگ آن بان رکھتی تھی جسے ساتویں صدی ہجری میں بدرالدین لؤلؤ نے اپنی خود مختار حکومت میں تبدیل کردیا۔ تاتاریوں کا طوفان کئی بار موصل کی فصیلوں سے ٹکرایا مگر کبھی اسے سرنگوں نہ کرسکا۔ ہلاکو خان کے عراق پر حملے کے دوران بدرالدین لؤلؤ نے تعاون کا راستہ اپنا کر اپنی جان بچائی تھی اور اس کے بیٹے الصالح اسماعیل نے الجزیرہ پر تاتاریوں کی فوج کشی میں بھرپور ساتھ دیا تھا۔ پس جب شعبان ۶۵۷ھ میں لؤلؤ کی وفات ہوئی تو ہلاکو خان نے موصل کی حکومت الصالح اسماعیل کو سپرد کردی۔ وہ ایک مدت تک تاتاریوں کا حلیف رہا مگر بادلِ نخواستہ قائم کیا گیا یہ تعلق پائیدار ثابت نہ ہوا۔ (3)

اس دوران ممالیکِ مصر نے تاتاریوں کو بار بار پسپا کرکے اپنی قوت کا سکہ جمادیا تھا۔ اس لیے الصالح اسماعیل تاتاریوں کے خلاف سلطانِ مصر سے مدد لینے پر غور کرنے لگا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ ہلاکو کسی بھی وقت مزید بگڑ کر اس سے اقتدار چھین سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے حکومت اپنی بیوی کے سپرد کی اور چپکے سے مصر روانہ ہوگیا جو مشرق کے

---

(1) نهاية الأرب: ۳۰/ ۴۰، ۴۱، ط دار الكتب قاهره

(2) البداية: سنة ۶۵۹ھ۔ بعض مؤرخین نے محاصرے کے دوران شہر میں گرانی کا حال بتاتے ہوئے اشیائے خورد ونوش کی قیمتیں بیان کی ہیں جو دلچسپ ہیں: یعنی گوشت فی رطل: ۷ درہم، مچھلی فی رطل: تیس درہم، دودھ فی رطل: پندرہ درہم، چاول فی رطل: بیس درہم، شکر فی رطل: پچاس درہم، شہد فی رطل: تیس درہم، ایک مرغی: پانچ درہم، ایک انڈا: ڈیڑھ درہم۔ (نهاية الأرب للنويري: ۳۰ ص ۴۳، ط قاهره)

فائدہ: ایک رطل = ۳۹۸ گرام ہے یعنی تقریباً ایک پونڈ (تقریباً آدھ سیر) اور ایک درہم = ۳.۰۶ گرام چاندی ہے۔

(3) سير اعلام النبلاء: ۲۳/ ۳۵۷ ...... عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ الصالح اسماعیل کی بیوی ہلاکو خان کی بیٹی تھی جس سے الصالح کی رنجش ہوگئی، اس پر ہلاکو خان کو خفگی ہوئی اور تعلقات میں دراڑ آگئی۔ (سير اعلام النبلاء: ۲۳/ ۳۵۷) مگر دراصل الصالح کی یہ بیوی، ہلاکو خان کی نہیں سلطان جلال الدین کی بیٹی تھی جسے منگو خان نے پالا تھا اور ہلاکو نے الصالح کے نکاح میں دیا تھا۔ (تاريخ جهان كشا، ص ۵۳۵،۵۳۴؛ جامع التواريخ (عربی): ج ۲، حصہ اول: ص ۳۰۵)

مسلمانوں کی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ رجب ۶۵۹ھ میں وہ مصر پہنچ گیا۔ اس کا دوسرا بھائی مجاہد الدین اسحاق بھی جو الجزیرہ کے بعض قلعوں کا حاکم تھا، اس کے پیغام پر پیچھے پیچھے آ گیا، دونوں بھائیوں نے سلطان بیبرس سے مدد طلب کی۔ سلطان نے ان کا خوب اعزاز و اکرام کیا۔ [1]

خلیفہ کی جہاد کے لیے عراق روانگی:

انہی دنوں خلیفہ نے سلطان کو مشورہ دیا کہ تاتاریوں سے عراق واپس لینا چاہیے۔ سلطان نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور لشکر تیار کر کے ۶ شوال کو خلیفہ کے ساتھ روانہ ہوا اور دمشق تک ہم رکاب رہا۔ ۷ ذوالقعدہ کو دمشق میں خلیفہ اور سلطان کا تاریخی استقبال ہوا۔ [2] الصالح اسماعیل اور اس کے بھائی بھی اس فوج کشی میں ساتھ تھے تاکہ وہ اپنی آبائی حکومت واپس حاصل کر سکیں۔ [3]

ایک غلط مشورے پر عمل:

سلطان بیبرس چاہتا تھا کہ خلیفہ کو دس ہزار سپاہیوں کا لشکر دے تاکہ وہ تاتاریوں کو بغداد سے بے دخل کر کے دوبارہ قصرِ خلافت کو آباد کرے مگر اس موقع پر بدر الدین لؤلؤ کے ایک بیٹے نے خلوت میں سلطان سے گفتگو کر کے اس کا ارادہ بدل دیا۔ اس نے سلطان کو کہا: ”خلیفہ اگر بغداد میں جم گیا تو وہ آپ کو مصر سے نکال کر وہاں بھی قابض ہو جائے گا۔“

بیبرس وسوسوں کا شکار ہو گیا اور اس نے خلیفہ کی خاص کمان میں فقط تین سو گھڑ سوار دینے پر اکتفا کیا۔ تاہم اس نے شام کے مختلف امراء کو لکھ بھیجا کہ جب بھی خلیفہ تمہیں طلب کرے تم فوج لے کر فوراً اس کے پاس پہنچ جانا۔ [4]

بہر حال خلیفہ ایک منظم لشکر کی قیادت سے محروم رہا۔ اگر اسے ایک مضبوط فوج مل جاتی تو بغداد کو فتح کر کے تاتاریوں کے خلاف ایک مضبوط مرکز بنایا جا سکتا تھا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ بعد میں خلیفہ اور سلطان کے تعلقات خراب ہوتے۔ فریقین احسان مندی اور بے غرضی کا دامن تھامتے تو تعلقات بہتر رہتے اور خلفاء کی حیثیت اتنی کمزور نہ ہوتی جیسا کہ اس کے بعد ممالیک کے پورے دور میں رہی جس پر اُمت کے اکابر و اعیان کو رنج رہا۔

خلیفہ کی تاتاریوں سے جنگ اور شہادت:

۲۱ ذوالقعدہ کو خلیفہ کا لشکر دمشق سے بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ چونکہ اس فوج کشی کے باعث الصالح اسماعیل اور اس کے بھائیوں کو کچھ افرادی و مالی قوت میسر آ گئی تھی، لہٰذا رحبہ کے مقام پر وہ اپنے حامیوں سمیت خلیفہ مستنصر سے الگ ہو کر موصل کے راستے پر ہو گئے حالانکہ مستنصر انہیں ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

مستنصر ”عانہ“ سے ہو کر دریائے فرات کے پار آ گیا۔ اس دوران مختلف امراء اپنے چھوٹے بڑے جتھوں کے

---

[1] ذیل مرآۃ الزمان: ۲/۱۰۶، ط دار الکتاب الاسلامی

[2] البدایۃ والنہایۃ سنۃ ۶۵۹ھ، ۶۶۰ھ

[3] ذیل مرآۃ الزمان: ۲/۱۰۸، ط دار الکتاب الاسلامی

[4] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۶۵۹ھ

ساتھ اس کے پرچم تلے جمع ہوتے رہے یہاں تک کہ لگ بھگ ڈیڑھ ہزار سپاہی فراہم ہوگئے۔

بغداد کے تاتاری منتظم قرابغا کو اس فوج کشی کی اطلاع ملی تو وہ پانچ ہزار سواروں کے ساتھ اردگرد کے علاقوں کو تاراج کرنے لگا تاکہ خوف کے باعث کوئی بھی مستنصر کا ساتھ نہ دے۔ اس دوران مستنصر ''حدیثہ'' سے ہوتا ہوا ''ہیت'' آن پہنچا تھا مگر اہلِ شہر نے تاتاریوں کے انتقام کے خوف سے خلیفہ کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔ اس پر خلیفہ نے شہر کا محاصرہ کر کے ۲۹ ذوالحجہ کو اسے فتح کر لیا۔

اس کے بعد لشکر آگے بڑھا۔ تین محرم ۶۶۰ھ کی شب اسلامی لشکر نے انبار کے سامنے گزاری۔ اگلے دن قرابغا اپنی فوج لے کر لشکرِ اسلام کے سامنے آدھمکا۔ خلیفہ نے ترکمانوں کو دائیں اور عربوں کو بائیں بازو میں رکھا اور خود باقی لشکر کے ساتھ قلب میں رہا۔ آخر گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی جس کے دوران خلیفہ نے بذاتِ خود حریف پر جارحانہ حملہ کیا جس کی تاب نہ لا کر تاتاری دریائے فرات کی طرف ہٹتے چلے گئے، مسلمانوں کا دباؤ یہاں تک بڑھا کہ لشکرِ تاتار کا خاصا حصہ دریا میں غرق ہوگیا۔ مگر اس دوران تاتاریوں کی محفوظ فوج جو عقب میں چھپی ہوئی تھی، میدان میں آگئی اور اس نے عقب سے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ اس صورتحال میں عرب اور ترکمان بوکھلا کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے اور اس محفوظ تاتاری فوج نے خلیفہ کے دستوں کو گھیر لیا جس میں بڑے بڑے امراء اور خواص موجود تھے۔ بہت سے جانبازوں نے ایک طرف زوردار حملہ کیا اور دشمنوں کو مارتے کاٹتے ہوئے گھیرا توڑ کر محفوظ علاقے کی طرف نکل گئے۔ ان بچ جانے والوں میں الحاکم عباسی بھی تھا جو بعد میں خلیفہ منتخب ہوا۔

خلیفہ قلب کے سپاہیوں کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ وہ آخر تک ثابت قدم رہا جبکہ اس کے اکثر ساتھی شہید ہوگئے۔ اس کے بعد خلیفہ کا کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گیا۔ کوئی کہتا تھا وہ معرکے میں شہید ہوا، کوئی کہتا وہ زخمی حالت میں فرار ہوا اور عرب قبائل کے پاس جا کر پناہ لی اور وہاں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ یہ ظاہر تھا کہ اب وہ دنیا میں نہیں، ورنہ کسی نہ کسی طرح مصر پہنچ کر مسندِ خلافت سنبھال لیتا۔ ①

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بہتر تھا کہ خلیفہ حالات موافق ہونے اور حکومت مضبوط ہونے تک بلادِ اسلام میں قیام پذیر رہتا مگر جو اللہ کی تقدیر و مشیت ہو وہی ہوتا ہے۔'' ②

موصل کا معرکہ:

والی موصل الصالح اسماعیل اور اس کے بھائی خلیفہ مستنصر سے الگ ہو کر موصل کی سمت نکل گئے تھے۔ سنجار پہنچ کر الصالح اسماعیل نے موصل میں موجود اپنے حامیوں سے رابطہ کیا تاکہ تازہ صورتحال معلوم ہو سکے۔ ان سے پتا چلا کہ اس

---

① ذیل مرآۃ الزمان: ۲/۱۰۹ تا ۱۱۲، ط دار الکتاب الاسلامی

② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۵۹ھ

وقت فضا سازگار ہے۔ الصالح نے اپنے باقی بھائیوں کو سنجار میں چھوڑا اور خود تین سو سپاہیوں کے ساتھ ۲۰ ذوالحجہ ۶۵۹ھ کو موصل پہنچ گیا جہاں پہلے سے چار سو گھڑ سوار اس کی حمایت کے لیے تیار تھے۔

الصالح کی بیوی تُرکان بنت جلال الدین جنگ کے حق میں نہ تھی بلکہ ہلاکو خان سے صلح پر مصر تھی۔[1] وہ پہلے ہی ہلاکو خان کو الصالح کے عزائم کی اطلاع دے چکی تھی، اس لیے ہلاکو خان تیار بیٹھا تھا۔[2] چنانچہ خلیفہ مستنصر کی فوج کو نمٹاتے ہی اس نے تاتاری سردار ''سنداغون'' کو موصل بھیجا جس نے محرم کے اوائل میں شہر کا سخت محاصرہ کر لیا اور ۲۴ منجنیقوں سے سنگ باری شروع کر دی۔ شہر میں اسلحہ تھا نہ غذا کا ذخیرہ۔[3] البتہ ترکمان اور کُرد جوان بکثرت تھے۔ الصالح ان پر دل کھول کر خرچ کرتا رہا اور کہتا رہا: ''جونہی سلطان بیبرس کو ہمارا حال معلوم ہوگا، وہ مصر سے ہمیں کمک بھیج دے گا۔''

مگر یہ امید جلد پوری نہ ہوئی۔ اس کے باوجود اہلِ موصل بھرپور مزاحمت کرتے رہے اور اپنی منجنیقوں سے جوابی سنگ باری کرتے رہے۔ ایک دن کُردوں کا ایک جتھہ شہر سے نکل کر تاتاریوں پر حملہ آور ہوا اور انہیں خاصا نقصان پہنچا کر لوٹ آیا۔ اس کے جواب میں ایک دن ۸۰ تاتاریوں نے موصل کی فصیل پھلانگنے کی کوشش کی مگر شہر کے مستعد محافظوں نے ان سب کے سر کاٹ کر لشکرِ تاتار کی طرف پھینک دیے۔ تاتاری لشکر میں ایک ملت فروش مسلمان امیر ملک صدر الدین بڑی سرگرمی سے شریک تھا۔ ایک دن وہ ''خود'' (فولادی ہیلمٹ) اُتار کر کھڑا تھا۔ موصل کے ایک تیر انداز نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ سیدھا کھوپڑی میں جا گھسا۔ یہ حالت دیکھ کر سنداغون نے ہلاکو خان سے کمک طلب کی۔ چنانچہ اس نے مزید فوج بھیج دی۔[4]

آخر محاصرے کو کئی ماہ گزر گئے۔ یہ دیکھ کر الصالح نے حلب کے حاکم شمس الدین بُرلی سے مدد طلب کی۔ بُرلی کے پاس فوج بہت کم تھی مگر مسلمانوں کو مصیبت میں دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی مختصر سی جمعیت لے کر اہلِ موصل کی مدد کے لیے سنجار پہنچ گیا۔ سنداغون کو یہ اطلاع ملی تو وہ موصل کا محاصرہ چھوڑ کر فرار ہونے کی تیاری کرنے لگا مگر بدقسمتی سے اسی وقت ایک غدارِ ملت زین حافظی وہاں پہنچ گیا جس نے تاتاریوں کو بتایا کہ اہلِ موصل کی مدد کے لیے آنے والا لشکر بہت قلیل ہے۔ یہ سن کر سنداغون جری ہو گیا اور محاصرہ چھوڑ کر دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ سنجار کی طرف بڑھا۔

۱۴ جمادی الآخرہ ۶۶۰ھ کو فریقین میں زوردار معرکہ ہوا۔ بُرلی کے ساتھ نو سو گھڑ سوار تھے جن میں چار سو ترکمان اور ایک سو عرب تھے۔ ان مجاہدین نے گیارہ گنا تاتاریوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور انہیں سخت ترین نقصانات پہنچائے تاہم آخر میں تاتاری غالب آ گئے۔ کئی نامور امرائے اسلام شہید ہوئے جبکہ بُرلی پاؤں میں زخم کھا کر میدانِ جنگ سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا اور مصر پہنچ گیا جہاں سلطان بیبرس نے اسے گھڑ سواروں کا افسر مقرر کر دیا۔

---

① یہ بھی تاریخ کی عجیب کروٹ ہے کہ خوارزم کے مجاہدِ اعظم کی بیٹی اپنے باپ کے دشمنوں کے ساتھ تھی۔ اسے مجبوری کی انتہا بھی کہا جا سکتا ہے۔

② جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۲۷، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

③ ذیل مرآۃ الزمان: ۱۵۷/۲، ط دار الکتاب الاسلامی قاہرہ

④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۲۸

سنداغون بُرلی کو شکست دینے کے بعد دوبارہ موصل پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔[1]

سلطان بیبرس کو اہلِ موصل کی نازک حالت کا علم ہوا تو ایک امدادی لشکر روانہ کیا۔ سنجار کے قریب پہنچ کر امیر لشکر نے ایک نامہ بَر کبوتر موصل روانہ کیا جس میں اپنی آمد کا حال بتایا گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ کبوتر تاتاریوں کی ایک منجنیق کی زد میں آکر مر گیا۔ منجنیق انداز نے کبوتر کو اُٹھا کر پیغام دیکھ لیا اور سنداغون تک پہنچا دیا۔ اس نے فوراً تین دستے بیبرس کے امدادی دستے کو نمٹانے کے لیے بھیج دیے۔ اُدھر امدادی دستے کے ساتھ سنجار کے رضا کار بھی شامل ہو چکے تھے۔ تاتاریوں نے گھات لگا کر انہیں گھیر لیا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد امدادی دستے کے بہت سے سپاہی شہید اور باقی پسپا ہو گئے۔ تاتاریوں نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مقتولین کی وردیاں پہن لیں اور اپنے بالوں کو گرد مجاہدین کے انداز میں سنوار لیا۔ اگلے دن یہ دستہ موصل کے قریب پہنچا تو بہت سے موصلی سپاہی اسے اسلامی فوج سمجھ کر استقبال کے لیے باہر نکل آئے۔ تاتاریوں نے انہیں چاروں اطراف سے گھیر لیا اور کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔[2]

اُدھر شدید گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ شہر میں وبائیں پھیل رہی تھیں اور خوراک ختم ہو جانے کے باعث لوگ لڑنے سے عاجز ہو چکے تھے۔ جو لوگ خوراک کی تلاش میں جنگل کی طرف نکلتے تھے وہ تاتاریوں کا نشانہ بن جاتے تھے۔ کامیابی کے کوئی آثار دور دور تک نہ تھے۔ آخر الصالح اسماعیل نے مایوس ہو کر ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کی اور کہا:

> ”میں اپنے فعل پر نادم ہوں۔ میں باہر آنے کے لیے تیار ہوں مگر میری دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ سابقہ خطا پر میرا مؤاخذہ نہ کیا جائے۔ دوسری یہ کہ مجھے خاقان ہلاکو کے پاس بھیج دیا جائے اور سفارش کی جائے کہ مجھے قتل نہ کیا جائے۔“[3]

عرب مؤرخین کے بیان کے مطابق الصالح نے اہلِ شہر کے لیے بھی امان طلب کی تھی۔ سنداغون نے تمام شرائط منظور کر لیں۔ ۱۵ شعبان ۶۶۰ھ کو جان و مال کی امان کی شرط پر شہر تاتاریوں کے حوالے کر دیا۔ تاتاریوں نے شہر پر قابض ہونے کے بعد ابتداء میں سب کو امان دینے کا اعلان کیا۔ اس دوران انہوں نے شہر کی فصیل اور حفاظتی مورچے مسمار کر دیے۔ اس کے بعد وہ یکایک بدعہدی کر کے اہلِ شہر پر ٹوٹ پڑے۔ نو دن تک شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا اور یہ شہر جس پر صدیوں سے کوئی غیر مسلم طاقت قبضہ نہ کر سکی تھی، تباہ و برباد ہو گیا۔[4]

بے شمار لوگ قتل ہو گئے۔ فقط وہی بچ سکے جو پہاڑوں کی طرف فرار ہو سکے۔ شہر کے تمام ہنر مندوں کو جبری مشقت کے لیے قیدی بنا لیا گیا۔ جب تاتاری واپس ہوئے تو شہر میں کوئی شخص باقی نہ تھا۔ البتہ کچھ مدت بعد پہاڑوں میں روپوش ہونے والے لوگوں میں سے کچھ واپس آنے میں کامیاب ہو گئے جن کی تعداد فقط ایک ہزار کے لگ بھگ

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ٦٦٠ھ؛ ذیل مرآة الزمان: ٢/ ١٥٧، ط دار الکتاب الاسلامی
② جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ٢، حصہ اوّل: ص ٣٢٩، ٣٣٠، ط دار احیاء الکتب العربیة مصر
③ جامع التواریخ (عربی): ج ٢، حصہ اوّل: ص ٣٣٠، ٣٣١
④ ذیل مرآة الزمان: ٢/ ١٥٦ تا ١٥٩؛ الوافی بالوفیات: ٩/ ١١٧؛ سیر اعلام النبلاء: ٢٣/ ٣٥٧، ٣٥٨، ط الرسالة

تھی۔ اگلے کئی برسوں تک یہی لوگ موصل کی آبادی تھے۔[1]

الصالح اسماعیل کی شہادت:

الصالح اسماعیل کو ہلاکو خان کے پاس پہنچادیا گیا۔ وہ اسے دیکھ کر بھڑک اٹھا۔ حکم دیا کہ اس کے جسم پر چربی لپیٹ کر اوپر سے کس کر رسیاں باندھ دی جائیں، پھر اسے گردن تک تیل کے لگن میں ڈبو دیا جائے اور لگن تیز دھوپ میں رکھ دیا جائے۔ حکم پر عمل ہوا۔ یہ سخت گرمی کا موسم تھا۔ الصالح گرمی اور پیاس سے تڑپتا رہا، اس کا جسم دھیرے دھیرے گلتا رہا۔ آخرکار ایک ماہ تک اس دردناک عذاب میں مبتلا رہنے کے بعد اس کی روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہلاکو خان نے اس کے تین سالہ بچے پر بھی رحم نہ کھایا۔ اس معصوم کے دو ٹکڑے کر کے موصل میں دریائے دجلہ کے پل کے دونوں سروں پر آویزاں کر دیے گئے۔[2] کاش! بدرالدین لؤلؤ زندہ ہوتا تو اپنی لاڈلی اولاد کے ساتھ تاتاریوں کا سلوک دیکھتا۔ اس نے اپنی حکومت بچانے کے لیے تاتاریوں کا ساتھ دیا تھا مگر پانچ سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ بغداد کی طرح موصل بھی تباہ و برباد ہو گیا اور بنولؤلؤ حرفِ غلط کی طرح مٹ کر اک داستانِ عبرت ہو گئے۔

الحاکم کی خلافت:

اُدھر خلیفہ مستنصر کا کچھ اتا پتا نہ ملنے کے باعث مصر میں عجیب بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ آخر کئی ماہ کے انتظار کے بعد جب مستنصر کی موت یقینی ہو گئی تو اس جنگ سے بچ کر آنے والے عباسی خاندان کے ایک اور فرد احمد بن علی کو خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ خلیفہ مسترشد باللہ عباسی کا لکڑ پوتا (پڑپوتے کا بیٹا) تھا۔ وہ مشرقی محاذ سے واپس مصر پہنچا تو اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ سلطان بیبرس نے ۸ محرم ۶۶۱ھ کو قاہرہ میں ایک اجتماعِ عام منعقد کیا جس میں احمد بن علی ''حاکم بامر اللہ'' کے لقب سے نیا عباسی خلیفہ مقرر ہوا۔[3]

نئے خلیفہ کا خطبۂ جہاد:

خلیفہ حاکم بہترین خطیب تھا اور مسلمانوں میں جذبۂ جہاد عام کرنے کا خواہاں تھا۔ مسندِ خلافت سنبھالنے کے بعد اس نے نمازِ جمعہ کے اجتماع میں خطبہ دیتے ہوئے کہا:

''لوگو! جان لو کہ خلافت اسلام کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ اور جہاد تمام لوگوں پر واجب ہے۔ جہاد کا پرچم لوگوں کے اتحاد کے بغیر نصب نہیں ہو سکتا۔ مستورات تبھی قیدی بنتی ہیں جب اللہ کی حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب ہو۔ لہو تب ہی ارزاں ہوتا ہے جب جرائم عام ہوں۔ وہ کیسا منظر تھا جب کفار بلادِ اسلامیہ میں داخل ہوئے، اور انہوں نے اموال اور جانوں کو تلف کیا، مردوں اور بچوں کو قتل کیا، قصرِ خلافت اور مستوراتِ خلفاء کی

---

[1] جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۳۰، ۳۳۱، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

[2] جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۳۱

نوٹ: الصالح کے اس کم سن بچے کا نام علاؤ الدین تھا۔ (السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/۵۴۵، ط العلمیۃ)

[3] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۶۰ھ

پردہ دری کی، بچ جانے والوں کو دردناک عذاب میں رکھا، پس رونے دھونے اور نوحہ وزاری کی آوازیں بلند ہوئیں، اس طویل مدت کی ہیبت کے سبب آہ وفغاں ہوتی رہی، کتنے بوڑھے تھے جن کی سفید ڈاڑھیاں خون سے رنگین ہوئیں اور کتنے معصوم بچے بلکتے رہے مگر ان کی آہ وبکا پر کسی کو رحم نہ آیا۔ پس تم فریضۂ جہاد کو زندہ کرنے کے لیے آستینیں چڑھالو:

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

(پس اللہ کی نافرمانی سے بچو امکانی حد تک اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرو اپنے ہی بھلے کے لیے اور جو کوئی بھی بچالیا گیا نفس کے لالچ سے پس وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔)[1]

اب دین کے دشمنوں کے مقابلے اور مسلمانوں کے دفاع کی بجائے گھروں میں بیٹھے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ سلطان الملک الظاہر نے مددگاروں کی کمی کے باوجود خلافت سے تعاون کی ذمہ داری لی اور کفر کے لشکروں کو جو شہروں میں گھس چکے تھے، مار بھگایا۔ ان کے انتظام واہتمام سے بیعتِ خلافت مضبوط ہوئی اور دولتِ عباسیہ ان کے سبب لاؤلشکر والی ہوگئی۔ اللہ کے بندو! اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے میں دیر نہ کرو اور نیت خالص رکھو، تمہاری مدد ہوگی۔ شیطان کے حامیوں سے جنگ کرو، تم فتح یاب ہوگے۔ جو ہو چکا اس سے دہشت زدہ نہ ہونا، کہ جنگ میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ انجام کار کامیابی متقی لوگوں ہی کو نصیب ہوگی۔''[2]

تاتاریوں کے حملے کا خطرہ اور بیبرس کے حفاظتی انتظامات:

اس کے بعد ہلاکو خان نے شام پر ایک بڑے حملے کی تیاریاں شروع کردیں۔ شام میں اس اطلاع سے شدید خوف وہراس پھیل گیا۔ لوگ اپنا ساز وسامان فروخت کر کے مصر روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ قلعہ داروں نے اپنے ہاں جمع غلے کے گودام تک فروخت کرڈالے۔ بیبرس نے یہ اطلاع پا کر حلب سے آمد اور خلاط تک تقریباً دو سو میل کے علاقے میں گھاس کے سارے میدان نذرِ آتش کرادیے کیوں کہ ہلاکو کے لشکر گھوڑوں کو تازہ چارہ کھلانے کے لیے ہمیشہ گھاس کے میدانوں میں پڑاؤ ڈالتے تھے۔ شام کے ان باشندوں کو جو خطرے کی زد میں تھے، ہدایت کی گئی کہ وہ مصر کی طرف کوچ کریں، ان کا مالی بوجھ کم کرنے کے لیے اہلِ شام سے تمام ٹیکس ساقط کردیے گئے۔[3]

نئے حلیفوں اور مددگاروں کی تلاش:

سلطان بیبرس کی پالیسی یہ تھی کہ تاتاریوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ مسلم حکمرانوں اور امراء کو ساتھ ملایا جائے۔ سلطان نے تاتاریوں کے مفتوحہ علاقوں: عراق اور ایران کے امراء سے خفیہ روابط رکھے، انہیں خلعتیں بھیجیں اور ترغیب

---

① سورۃ التغابن، آیت نمبر ۱۶ ② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۶۰ھ
③ نہایۃ الارب للنویری: ۳۰/۶۳، ط دار الکتب قاہرہ؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۶۶۱ھ

دی کہ وہ ہلاکو خان کے خلاف سلطنتِ مصر کا ساتھ دیں۔ شیراز کی اتا بکی ریاست تاتاریوں کی باج گزار تھی۔ سلطان نے ۶۶۱ھ میں اس کے حاکم کو ہلاکو خان کے خلاف جہاد کے لیے مصر سے اتحاد کرنے کے ترغیبی مراسلے بھیجے۔ ①

چند ماہ بعد شیراز سے کئی نامی گرامی امراء قاہرہ حاضر ہوئے۔ ۳ رجب ۶۶۲ھ کو انہیں شرف باریابی ملا۔ ان میں سیف الدین اقبار بھی تھا جو سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کا جامہ دار رہا تھا۔ وفد میں اتابک سعد کے چند غلام بھی تھے۔ سلطان نے ان سب کو خلعتیں دیں اور انعام واکرام سے نوازا۔ ②

ہلاکو خان کے سالارِ فوج کو اپنے ساتھ ملانے کا عجیب واقعہ:

سلطان بیبرس نے ہلاکو کی قوت کو کم کرنے کے لیے نت نئی تراکیب سے ان مسلم امراء کو بھی اپنے ساتھ ملانا شروع کیا جو خواہی نخواہی سلطنتِ تاتار کے حلقہ بگوش بن چکے تھے۔ ان میں سے ایک سالار شمس الدین تھا جو عباسی خلافت کے دور میں کوفہ کا حاکم تھا۔ ہلاکو خان نے اسے اپنے دربار سے وابستہ کر کے بعض عراقی شہروں کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔

سلطان بیبرس نے اس کی قابلیت کے پیشِ نظر اسے خفیہ پیغام بھیج کر مصر بلایا مگر وہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ ایک دن سلطان نے اپنی محفل میں ایک امیر قلیج بغدادی کو کہا: ''تمہارا دوست سالار شمس الدین ہمارے ہاں آنے ہی والا ہے۔''

قلیج نے کہا: ''یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ تو عراق کی حکومت کا رکن ہے۔ بھلا اسے چھوڑ کر مصر کیوں آئے گا!''

سلطان نے کہا: ''اگر وہ خوشی سے نہ آیا تو مجبوراً آئے گا۔''

اب سلطان نے ایک خط تیار کرایا جو اس قسم کا تھا جیسے اس میں سالار شمس الدین کو اپنا وفادار مانتے ہوئے اس کے کسی خط کا جواب دیا گیا ہو۔ یہ خط ایک قاصد کو دے کر عراق روانہ کر دیا گیا۔ اس کے پیچھے ایک جاسوس بھیجا گیا تاکہ جب قاصد ہلاکو کی خیمہ گاہ کے پاس پہنچے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ جاسوس نے ایسا ہی کیا۔ تاتاریوں نے قاصد کی لاش کی جامہ تلاشی لی تو سالار شمس الدین کے نام خط برآمد ہوا۔ یہ خط ہلاکو کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ بیبرس کے منصوبے کے عین مطابق وہ یہی سمجھا کہ سالار شمس الدین، مصر کا جاسوس ہے۔ سالار شمس الدین اس وقت شکار پر گیا ہوا تھا۔ ہلاکو کے دربار میں اس کے وفادار موجود تھے، اس سے پہلے کہ تاتاری اُسے گرفتار کرنے پہنچتے، ایک مخلص غلام نے شکار گاہ پہنچ کر اسے یہ خبر دے دی۔ شمس الدین سمجھ گیا کہ اب یہاں ٹھہرنا موت کے مترادف ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سرپٹ بھاگا اور سیدھا مصر آ گیا۔

سلطان نے اس کا بڑا اعزاز واکرام کیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے عرض کیا: ''سلطان اگر مہلت دیں تو میں عراق سے اپنی دولت مصر منتقل کرنے کی کوشش کروں۔'' سلطان نے کہا: ''مجھے تمہارے مال کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر شام کے شہر نابلس کی نگرانی اسے سونپ دی۔ ③

---

① نهاية الارب: ۳۰/ ۹۰، ط دار الكتب قاهره ② نهاية الارب: ۳۰/ ۹۹، ط دار الكتب قاهره

③ نهاية الارب: ۳۰/ ۵۵،۵۴، ط دار الكتب قاهره

بیبرس اور برکہ خان کے تعلقات

سلطان بیبرس کا سب سے مضبوط حلیف خود تاتاری قوم کا ایک نومسلم شہزادہ بنا۔ یہ بحیرۂ خزر کے پار کی تاتاری ریاست کا بادشاہ برکہ خان (برقائی) تھا جو چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوجی کا فرزند تھا۔ وہ اسلام قبول کر چکا تھا۔ اس کی سلطنت قفقاز کے کوہساروں سے مشرقی یورپ کی سرحدوں تک وسیع تھی۔ اس کے اپنے چچازاد ہلاکو سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے جو بڑھتے ہوئے دشمنی اور پھر باقاعدہ جنگوں تک جا پہنچے۔

برکہ اور ہلاکو کے مابین عداوت کی وجوہات:

برکہ خان اور ہلاکو خان کے درمیان عداوت کی کئی وجوہ تھیں:

① ہلاکو خان نے مسلمانوں کا جس طرح قتل عام کیا تھا، اس پر برکہ خان سخت برہم تھا۔ نیز خلیفہ مستعصم کا قتل اس کے لیے ایک کرب ناک خبر تھی۔ اس ظلم وستم کے باعث وہ ہلاکو سے سخت ناراض تھا۔ وہ کہتا تھا:

”ہلاکو خان نے مسلمانوں کے تمام شہروں کو برباد کر دیا ہے۔ اس نے تمام مسلمان بادشاہوں کو ختم کر دیا ہے۔ اس نے دوست اور دشمن کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ اس نے چنگیزی خانوادے کے بزرگوں سے مشورہ کیے بغیر خلیفہ کو قتل کر دیا ہے۔ اگر اللہ نے میری مدد کی تو میں اس سے بے گناہوں کے خون کا بدلہ لوں گا۔“[1]

② برکہ خان کا مطالبہ تھا کہ مغلوں کے دستور کے مطابق نومفتوحہ علاقوں کے مالِ غنیمت سے اسے پانچواں حصہ دیا جائے۔ ہلاکو اس بارے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔[2]

③ اردوئے زرّیں سے کمک کے لیے آنے والا برکہ کا چچازاد بلغا بن شیبان ہلاکو خان کے ہاں پراسرار طور پر قتل ہو گیا۔ ہلاکو نے قتل کا الزام برکہ کے دوسرے چچازاد توتار پر لگا دیا۔ برکہ نے ہلاکو خان کو سزا جاری کرنے کا اختیار دے دیا مگر اسے اُمید تھی کہ ہلاکو خان رعایت سے کام لے گا مگر ہلاکو نے توتار کو قتل کر دیا جس پر برکہ خان کو خفگی ہوئی۔[3]

---

① جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۳۲، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر
قال الذھبی: "من أعظم الأسباب لوقوع الحرب بينه وبين هولاكو كونه قتل الخليفة." (تاریخ الاسلام للذھبی: ۱۹۱/۴۹، ت تدمری)

② قال عز الدين محمد بن شداد: حكى لي علاء الدين علي بن عبد الله البغدادي قال أخذت أسيراً من بغداد لما أخذتها التتر وكنت معهم مختلطاً بهم مطلعاً على أخبارهم فلما كانت سنة ستين ورد من عند بركة رسولان أحدهما يدعى بلاغا والآخر ططر برسالة مضمونها ما جرت به العادة من حمل ما كان يحمل إلى بيت باتو مما يفتح من البلاد وكانت العادة أن جميع ما يحصل في البلاد التي يملكونها ويستولون عليها من نهر جيحون مغرباً يقسم خمسة أقسام قسمان للقان وهو الملك الأعظم وقسمان للعسكر وقسم لبيت باتو فلما مات باتو وجلس بركة على التخت بدلاً منه لم يوصل إليه هولاكو مما أخذه من العراق ولا من الشام شيئاً مما كان يوصله إلى باتو (ذيل مرآة الزمان: ۱۶۱/۲)

③ روضۃ الصفا: ۸۹/۵، ط نولکشور …… رشید الدین کے مطابق برکہ کے دو عزیزوں: ”توتار“ اور ”بلغا“ کی موت کے بعد ہلاکو اور برکہ کے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ برکہ خان نے توتار کے خون کا بدلہ لینے کے لیے فوج کشی کی تھی۔ (جامع التواریخ عربی: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۳۲، ۳۳۳)
توتار کی موت کے متعلق وہ بتاتا ہے کہ ہلاکو کے پاس بلغا بن شیبان بن جوجی اچانک مر گیا، ہلاکو نے یہ الزام لگا کر کہ توتار نے جادو کے ذریعے اسے قتل کیا ہے، توتار کو برکہ کے پاس بھیجا، برکہ نے چنگیزی یاسا کے مطابق اسے دوبارہ ہلاکو کے سپرد کر دیا۔ ہلاکو نے ۱۷ صفر ۶۵۸ ہجری کو اسے قتل کر دیا، یہ دیکھ کر زریں خیل کے سپاہی ہلاکو کے لشکر سے فرار ہو گئے اور دربند اور جبیل گیلان سے ہوتے ہوئے قپچاق چلے گئے۔ (جامع التواریخ عربی: ج ۲، حصہ اوّل: ص ۳۱۷، ۳۱۸)

④ ہلاکو کے دربار میں کچھ جادوگر تھے جو بیرونی سفیروں پر بداثرات ڈالتے تھے۔ برکہ خان کو یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنی سفارت کے ساتھ کچھ ماہرینِ عملیات بھی بھیجے تا کہ ہلاکو کے جادوگروں کے اثرات کا توڑ کر سکیں۔ ہلاکو خان کو بھنک پڑگئی۔ اس نے ماہرینِ عملیات کو قتل کرادیا۔ ① پھر برکہ کے سفیروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ②

بعد میں ہلاکو نے معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے کچھ سفیروں کو تحائف دے کر برکہ خان کے پاس بھیجا مگر اس نے تحائف کو ٹھکرا دیا اور سفیروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ③ یہ ہلاکو کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ تھا۔

برکہ خان اور ہلاکو خان کے مابین خونریز جنگیں:

شوال ۶۶۰ھ (ستمبر ۱۲۶۲ء) میں ہلاکو شام اور مصر پر دوبارہ حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ برکہ خان کی فوج قفقاز کے فلک بوس درّوں سے نمودار ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر ہلاکو خان کو شام کی مہم ملتوی کر کے بحیرۂ خزر کی طرف فوج بھیجنا پڑی۔ اس لشکر نے دریائے تیرک عبور کر کے برکہ کی فوج کو وقتی طور پر پسپا کیا مگر برکہ کے بھتیجے نوگائی نے فوراً جوابی حملہ کیا جس میں ہلاکو کا لشکر درہم برہم ہو کر پیچھے ہٹتے ہوئے دریائے تیرک تک آ گیا۔ اس وقت موسم سرما عروج پر تھا۔ دریا کی سطح جو سخت سردی سے منجمد ہو چکی تھی، لشکر کے بوجھ سے ٹوٹ گئی اور ایل خانی تاتاریوں کی بڑی تعداد ڈوب گئی۔ ہلاکو خان کا ایک بیٹا بھی مارا گیا اور وہ خود پسپا ہو کر بحیرۂ آذربائی جان کے ایک جزیرے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ برکہ خان کی فوج نے بھی گہرے زخم کھائے تھے۔ نوگائی کی ایک آنکھ ضایع ہو گئی تھی۔ الغرض یہ جنگ نہایت شدید تھی۔ ④

ہلاکو کی پسپائی کے بعد برکہ خان نے میدانِ جنگ میں لاشیں ہی لاشیں دیکھیں تو آب دیدہ ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلا: ”میرے لیے یہ بات نہایت گراں ہے کہ میں مغلوں کو ایک دوسرے کی تلواروں سے قتل ہوتا دیکھوں، مگر اس شخص کے ساتھ اس کے سوا کیا کِیا جائے جو چنگیز خان کے دستورِ یاسا کو بدل ڈالے۔“ ⑤

اس کے بعد ہلاکو کی ایل خانی اور برکہ کی زرّیں خیل سلطنتوں میں جھڑپوں کا دائرہ کار مشرق تک پھیل گیا۔ ہلاکو نے گرجستان اور آرمینیا کے نصرانی حلیفوں کو ساتھ ملا کر زرّیں خیل کی سرحدوں پر حملے شروع کیے۔ جواب میں برکہ نے نہ صرف روسیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا بلکہ روس کے راستے وسطِ ایشیا تک تسلط حاصل کر لیا۔ سمرقند و بخارا کے مسلمان

---

① ولما بعث بركة رسله بعث معهم سحرة ليفسدوا سحرة هولاكو وكان عند هولاكو ساحر يسمى تكنا فاعطره هدية ارسلها بركة إليه معهم فلما وصلت الرسل بعث إليهم هولاكو من يخدمهم وساحرة من الخطا يتسمى كمشتا تطلعه على أحوالهم فعرفت أحوالهم وأخبرته فقبض عليهم وحبسهم في قلعة تلا، ثم قتلهم بعد خمسة عشر يوماً (ذيل مرآة الزمان: ۲/۱۶۱، ۱۶۲، ط قاهرہ)

② البداية والنهاية: ۱۷/۴۳۹　③ طبقاتِ ناصری از قاضی منہاج السراج جوزجانی: ۲/۱۹۸، ط کابل

④ نهاية الارب للنويري: ۲۷/۳۶۰، ط دار الكتب، قاهره؛

March of The Barbarians,by Harlod Lamb:p;229,230

علامہ نویری نے اس جنگ کا سن ۶۵۳ھ نقل کیا ہے جو تمام مؤرخین کے خلاف ہے۔ پیچھے حوالوں کے ساتھ گزر چکا ہے کہ سقوطِ بغداد میں ہلاکو کی امداد کے لیے برکہ کے فوجی دستے بھی شریک ہوئے تھے اور تب تک فریقین کے مابین تعلقات حلیفانہ تھے۔

⑤ ذيل مرآة الزمان لليونيني: ۲/۱۹۶، ط دار الكتاب الاسلامي قاهره...... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برکہ خان اسلام قبول کرنے کے باوجود منگل فیڈریشن سے معاملات میں ”یاسا“ کا پابند تھا اور ہلاکو کے مظالم درحقیقت ”یاسا“ کی حدود سے بھی متجاوز تھے جن کے باعث برکہ خان کو جنگ کا جواز مل گیا۔

جوق در جوق اس کی فوج میں شامل ہونے لگے۔ بحیرۂ خزر کے جنوب مشرق اور جنوب مغرب میں ان دونوں سلطنتوں کے مابین مسلسل جھڑپیں ہوتی رہیں۔ برکہ کے سپاہی ایمان وایقان سے بھرپور تھے جبکہ ہلاکو کی فوج کے سامنے خون ریزی کے سوا کوئی ہدف نہ تھا۔ اس کے سپاہی پست ہمت ہو کر منتشر ہونے لگے۔ بہت سے سلطان بیبرس کی تلوار سے خوفزدہ ہو چکے تھے اور بہت سے برکہ خان کے قبولِ اسلام کے بعد توحید کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ ①

ہلاکو خان کو شکست دینے کے بعد برکہ خان کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اس نے قُسطنطِینیہ کے گرد ونواح میں بھی چھاپہ مار سپاہی بھیج دیے۔ یہ دیکھ کر قیصر نے اس سے صلح کر لی اور بیش قیمت تحائف بھیج کر اپنا ملک بچایا۔ ②

نومسلم تاتاریوں کی مصر میں آمد اور مستقل سکونت:

تاتاری اب دو واضح جماعتوں میں بٹ گئے تھے: اسلام دشمن اور اسلام دوست۔ اسلام دوست تاتاری خود کو برکہ خان کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ہلاکو خان کی فوج میں برکہ کے وہ سپاہی موجود تھے جو پانچ سال قبل عراق پر فوج کشی میں مدد دینے کے لیے بھیجے گئے تھے مگر جب برکہ خان اور ہلاکو خان کے مابین دشمنی کے شعلے بھڑکے تو برکہ خان نے اپنے ان سپاہیوں کو لکھ بھیجا کہ اگر انہیں اُردوئے زرّیں تک واپسی میں مشکل ہو تو وہ مصر منتقل ہو جائیں۔

چنانچہ پہلے مرحلے میں دو سو گھڑسوار چار سرداروں کی کمان میں اپنے اہل وعیال سمیت مصر کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ شام پہنچے اور مقامی گورنر کو بتایا کہ ان کے آقا اور ہلاکو خان کے مابین دشمنی پڑ چکی ہے اور جنگ میں ہلاکو خان کا لڑکا مارا گیا ہے۔ اب وہ اپنے آقا کے حکم کے مطابق ہلاکو خان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں اور مصر میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ مقامی گورنر نے سلطان کو اطلاع دی۔ سلطان نے حکم بھیجا کہ ان تاتاریوں کی پوری طرح مہمانی اور دلجوئی کی جائے اور زادِ سفر دے کر مصر بھیج دیا جائے۔ آخر ۲۶ ذوالحجہ ۶۶۰ھ کو تاتاریوں کا یہ گروہ مصر پہنچ گیا۔

سلطان بیبرس نے خود باہر آکر ان کا استقبال کیا۔ شہر کی تقریباً ساری آبادی یہ منظر دیکھنے نکل آئی کیوں کہ یہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ تاتاری کسی سے امان مانگ رہے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے ان کے ہاں ایسی کوئی مثال نہ تھی۔ وہ صرف مارنا یا مرنا جانتے تھے۔ سلطان نے ان کی بہت بڑی ضیافت کی۔ انہیں اور ان کی خواتین کو خلعتیں بخشیں، انعام واکرام سے نوازا، رہائش گاہیں اور سواریاں مہیا کیں۔ جلد ہی ان تاتاریوں نے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ جب اس حسنِ سلوک کی اطلاع باقی تاتاریوں کو ہوئی تو ان کے گروہ جوق در جوق مصر کا رُخ کرنے لگے۔ سلطان نے ان سب کے ساتھ بہترین برتاؤ کیا اور انہیں مصر میں آباد ہونے کے لیے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں۔ ③

ان تاتاریوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کے کچھ دن بعد ۸ محرم ۶۶۱ھ کو نئے خلیفہ حاکم کی بیعت ہوئی تھی جس کی

---

① March of The Barbarians, by Harlod Lamb: p:230

② البدایة والنهایة: ۱۷/ ۴۴۹، ط دار هجر

③ السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۴۴، ۵۴۵، ط العلمیة ؛ نهایة الارب للنویری: ۳۰/ ۶۳، ۶۴، ط دار الکتب والوثائق قاهره

تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ تقریب بیعت میں یہ نومسلم تاتاری بھی شریک کیے گئے۔ [1]

ائمہ حرمین شریفین کو برکہ خان کے لیے دعاؤں کا پیغام بھیجا گیا۔ فرمان جاری کر دیا گیا کہ خطبات جمعہ میں خلیفہ اور سلطان بیبرس کے بعد برکہ خان کے لیے دعا کی جائے۔ [2] پناہ گزین تاتاریوں کی آمد کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ رجب ۶۶۱ھ کے اواخر میں ان کے کئی گروہ مصر پہنچے۔ [3] پھر ذوالحجہ ۶۶۱ھ کے آغاز میں یکے بعد دیگرے ان کے تین گروہ آئے۔ پہلا گروہ ۱۳۰۰ افراد پر مشتمل تھا جن میں نامی گرامی تاتاری سردار شامل تھے۔ سلطان نے ان سب کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ کیا اور ان کے لیے مکانات بنوا کر قاہرہ میں بسا دیا۔ سلطان کی ترغیب پر انہوں نے اسلام قبول کیا اور اسلامی شعائر اپنا لیے۔ [4]

برکہ خان کی طرف سلطان بیبرس کی پہلی سفارت:

ہلاکو خان کی مخالفت کے باعث سلطان بیبرس اور برکہ خان قدرتی طور پر یک جہت ہو گئے تھے جس میں مذہبی اتحاد بڑا اہم عنصر تھا۔ دونوں کے مابین نامہ و پیام کا آغاز ہو چکا تھا۔ پہلا مراسلہ ۶۵۹ھ میں سلطان بیبرس کی طرف سے برکہ خان کے نام بھیجا گیا تھا جس میں ہلاکو خان کے خلاف اتحاد کی دعوت دی گئی تھی۔ [5]

اس کے بعد محرم ۶۶۱ھ میں خلیفہ حاکم کی بیعت کی گئی تو اس بارے میں بھی برکہ خان کو اطلاعی رقعہ بھیجا گیا۔ [6]

بیعت کے بعد اسی مجلس میں سلطان بیبرس نے خلیفہ حاکم کے ساتھ مشورے میں طے کیا کہ برکہ خان کے نام باقاعدہ ایک سفارتی وفد بھیجنا چاہیے۔ [7]

چنانچہ بڑی تیزی کے ساتھ اس ارادے کو عمل میں لایا گیا اور اسی مہینے (محرم ۶۶۱ھ میں) سفارت روانہ کر دی گئی۔ سفارتی وفد کی قیادت کے لیے دو افراد مقرر تھے: ایک قاضی مجد الدین رحمہ اللہ جو بڑے نامی گرامی فقیہ تھے۔ [8] دوسرا شخص سیف الدین کشتک تھا جو سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کا جامہ دار تھا اور اس سفر میں آنے والے شہروں اور ضرورت پڑنے والی زبانوں کو جانتا تھا۔ [9]

اس کے علاوہ عراق سے آنے والے وہ تاتاری جو اصل میں اردوئے زریں سے تعلق رکھتے تھے، ساتھ کر دیے گئے

---

① ذیل مرآۃ الزمان: ۲/ ۱۸۶، ط دار الکتاب الاسلامی؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۴۷، ط العلمیۃ

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۵۸، ط العلمیۃ

③ ذیل مرآۃ الزمان: ۲/ ۱۹۵، ط دار الکتاب الاسلامی

④ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۶۱، ط العلمیۃ؛ نہایۃ الارب للنویری: ۳۰/ ۸۹، ۹۰، ط قاہرہ، علامہ نویری نے ان تاتاری امراء کے نام بھی نقل کیے ہیں۔

⑤ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۳۹، ط العلمیۃ، مگر کسی اور مؤرخ سے اس کی تائید منقول نہیں مل سکی۔

⑥ ذیل مرآۃ الزمان: ۲/ ۱۹۰، ط دار الکتاب الاسلامی

⑦ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۴۷، ط العلمیۃ

⑧ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۴۹، ط العلمیۃ

⑨ نہایۃ الارب للنویری: ۳۰/ ۶۴، ط دار الکتب والوثائق قاہرہ..... جامہ دار: وہ افسر جو بادشاہ کے لباس اور پوشاک کا منتظم ہو۔

تاکہ وہ راہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ سلطان نے سفارتی وفد کو کئی ماہ کا زادِ سفر اور ہر ممکن سہولیات فراہم کی تھیں۔ [۱]

وفد کی وساطت سے برکہ خان کے لیے بھیجے گئے ہدایا میں جانمازیں، عمدہ چادریں، سونے چاندی سے جڑے شمع دان، فانوس اور قندیلیں، خوارزم کی بنی ہوئی گھوڑوں کی زینیں اور لگامیں، کمانیں، نیزے، تیر، بہترین تلواریں، مضبوط ترین خود، خوش ذائقہ ادام اور کھانا پکانے میں طاق باندیاں بھی شامل تھیں۔ [۲]

سلطان نے برکہ خان کے نام مراسلہ میں بتایا تھا کہ مصر کی سلطنت بہت طاقتور ہے اور اس کی بکثرت افواج تاتاریوں کو شکست دے چکی ہیں۔ سلطان نے ہلاکو کے خلاف جہاد میں برکہ خان کو اپنا اتحادی قرار دیا اور برکہ کو جہاد میں مشغول رہنے کی ترغیب دیتے ہوئے اس فریضے میں کوتاہی کو خطرناک قرار دیا۔ مصر آنے والے تاتاریوں کے بارے میں سلطان نے لکھا: ''آپ کی عزت افزائی کی خاطر ہم نے ان کی خاطر مدارات کی ہے۔'' [۳]

برکہ کی پہلی سفارت:

۶۶۱ھ میں صورتحال ایسی بن گئی تھی کہ بیک وقت اِدھر سے سلطانِ مصر کے سفیر سلطنتِ زرّیں خیل کی سمت جا رہے تھے اور اُدھر سے برکہ خان کے سفیر مصر آ رہے تھے۔ ہوا یہ کہ سلطانِ مصر کی دلیری کی شہرت برکہ خان تک پہنچ چکی تھی اور وہ اس سے اتحاد کر کے ہلاکو خان کا قصہ نمٹا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ مصر کی اس سفارت کی روانگی سے کئی ماہ پہلے برکہ خان نے مصر کی طرف ایک سفارتی وفد روانہ کر دیا تھا جس کے سربراہ جلال الدین بن قاضی اور شیخ نورالدین علی نامی دو عمائد تھے۔ اس وفد کے پاس سلطان بیبرس کے نام برکہ خان کا ایک مکتوب بھی تھا جو یکم رجب ۶۶۰ھ کو تحریر کیا گیا تھا۔ اس مراسلے میں برکہ خان نے اپنے اور اپنی قوم کے مسلمان ہونے کا ذکر کر کے سلطان کو دوستانہ تعلقات اور عسکری اتحاد کی پیش کش کی تھی۔ [۴] یہ پیغام لے کر برکہ خان کے سفیر نورالدین علی اور جلال الدین قاضی ۱۱ رجب ۶۶۱ھ کو سلطان بیبرس کی

---

(۱) السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۴۹؛ نهاية الارب للنويری: ۳۰/ ۶۴، ط دار الکتب والوثائق قاهره

(۲) نهاية الارب للنويری: ۲۷/ ۳۶۰، ط دار الکتب، قاهره

(۳) نهاية الارب للنويری: ۳۰/ ۶۵، قاهرة؛ السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/ ۵۴۹

(۴) السلوک لمعرفة دول الملوک للمقريزی: ۱/ ۵۵۸، ط العلميه

نوٹ (۱): یہاں مقریزی نے مکتوب کی تاریخ کتابت یکم رجب ۶۶۱ھ لکھی ہے اور پھر حاملِ مکتوب کی دربارِ مصر میں حاضری کو بھی ۶۶۱ھ کے حالات میں ذکر کیا ہے۔ حالانکہ یہ ناممکن تھا کہ رجب ۶۶۱ھ میں لکھا ہوا خط قپچاق سے مصر اسی سال پہنچ جاتا۔ یہ طویل مسافت ڈاک کے لیے چار پانچ ماہ کی تھی جبکہ سفارتی وفد کے لیے یہ ایک سال کا سفر تھا۔ پس یہاں سہوِ کاتب صاف محسوس کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہم نے یہ تاریخ یکم رجب ۶۶۰ھ درج کی ہے۔ قطب الدین یونینی صراحتاً بتاتے ہیں کہ یہ سفیر گیارہ رجب ۶۶۱ھ کو دربارِ مصر میں حاضر ہوئے تھے۔ (ذیل مرآۃ الزمان: ۲/ ۱۹۴، ۱۹۵) اس لیے مکتوب لکھنے کا سنہ ۶۶۰ھ ہی ہو سکتا ہے۔

نوٹ (۲): یہاں روایت میں ایک جملہ ہے: ''ویخبرون باسلامه وإسلام قومه.'' بعض مؤرخین مثلاً آرنلڈ کو اس سے وہم ہو گیا ہے برکہ خان انہی دنوں اسلام لایا تھا، یہ بالکل غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ برکہ خان اور اس کی فوج میں اسلام کی اشاعت اس سے لگ بھگ تیس سال قبل شروع ہو چکی تھی جیسا کہ برکہ خان کے معاصر قاضی منہاج السراج نے نقل کیا ہے۔ (طبقات ناصری: ۲/ ۲۱۴) مگر غالباً اس دور میں یہ لوگ اپنے اسلام کا زیادہ اظہار نہیں کرتے تھے، اس لیے عام دنیا کو برکہ خان اور اس کے امراء کے مسلمان ہونے کی اطلاع نہ ہو گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ وہ اسلام لانے کے باوجود ''چنگیزی یاسا'' کے پابند تھے، اور ان کے بہت سے طور طریقے کفار جیسے ہی تھے، اس لیے عام مسلم دنیا انہیں مسلمان سمجھنے کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو۔ پس حکومت سنبھالنے کے بعد برکہ خان کو یہ وضاحت کرنا پڑی کہ ہم مسلمان ہیں اور سفارت کی مصر آمد کا ایک مقصد یہ اطلاع دینا بھی تھا۔

خدمت میں پہنچے اور اپنے بادشاہ کا مراسلہ پیش کیا۔[1] برکہ خان نے تحریر کیا تھا:

"السلام علیکم! اللہ کا شکر واجب ہے۔ہم آپ سے ہلاکو خان کے خلاف امداد طلب کرتے ہیں جس نے چنگیزی دستور "یاسا" کی مخالفت کی ہے۔انسانی جانوں کا جو بے پناہ ضیاع ہوا، وہ اسی کی سرکشی کے باعث تھا۔ بلاشبہ میں اور میرے چاروں بھائی ہر سمت میں (کفار سے) جنگ کا آغاز کر چکے ہیں تا کہ اسلام کے مینار کو مستحکم کیا جائے۔گزارش ہے کہ دریائے فرات کی سمت ایک فوج بھیجی جائے تا کہ ہلاکو خان کا راستہ روکا جا سکے۔"[2]

سلطان نے ان سفیروں کا بے حد اعزاز و اکرام کیا۔ جمعہ کے دن یہ سفیر جامع مسجد حاضر ہوئے تو خلیفہ الحاکم نے خطبے میں برکہ خان کے لیے بھی دعا کی۔[3]

سلطان بیبرس کی دوسری سفارت:

سلطان نے ان سفیروں کو گراں قدر انعامات سے نوازا تھا۔اس وفد کی مصر سے اُردوئے زرّین کی طرف روانگی ۱۷ رمضان ۶۶۱ھ کو ہوئی تھی۔ سلطان نے برکہ خان کے لیے بھی غیر معمولی تحائف روانہ کیے تھے جن میں قرآن مجید کا ایک ایسا نسخہ بھی تھا جو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے لکھوایا تھا۔دیگر تحائف میں زرافے، عربی گھوڑے، مصری گدھے، نیل گائے، بندر، نقرئی مشعلیں، چاندی کے شمع دان، مصری کارخانوں میں تیار کردہ کپڑوں کے تھان، شکر اور طرح طرح کی چیزیں تھیں۔[4]

سلطان نے اس وفد میں اپنے دو سفیر: عماد الدین عباسی اور فارس الدین مسعودی بھی شامل کر دیے تھے جن کے پاس سلطان کا مراسلہ تھا جس میں اتحاد کی ضرورت سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ دونوں سلطنتوں کو ہلاکو خان کے خلاف باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ساتھ ہی یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ ہلاکو سے بازیاب کرائے گئے علاقے میں سے شام کے قریبی اضلاع سلطنتِ مصر کا حصہ سمجھے جائیں گے۔[5]

سلطان کی پہلی سفارت برکہ کے دربار میں:

اُدھر محرم ۶۶۱ھ میں روانہ ہونے والا مصری وفد اسکندریہ سے بحری جہاز میں سوار ہو کر کئی ہفتوں بعد بازنطینیوں کے پایۂ تخت قُسطَنطِینیَہ پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات برکہ خان کی ایک سفارت سے ہوئی جو قیصرِ روم سے گفتگو کے لیے آئی تھی۔اس سفارت کو فوراً سلطنتِ زرّیں خیل واپس جانا تھا۔سلطان بیبرس کے سفارتی وفد میں قاضی مجد الدین رحمہ اللہ بیمار ہو گئے تھے لہٰذا وہ مصر واپس ہو گئے۔ جبکہ باقی سفیر برکہ خان کی اس سفارت کے ساتھ سلطنتِ زرّیں خیل

---

① ذیل مرآۃ الزمان: ۱۹۴/۲، ط دار الکتاب الاسلامی

② نہایۃ الارب للنویری: ۸۷/۳۰، ط دار الکتب ،قاھرہ

③ ذیل مرآۃ الزمان: ۱۹۱/۲. مصنف نے اس نماز جمعہ کی تاریخ ۱۸ شعبان بتائی ہے،اس کا مطلب ہے کہ وفد ایک ماہ سے زائد مدت تک مصر میں رکا تھا۔

④ نہایۃ الارب للنویری: ۸۷/۳۰، ۸۸، ط دار الکتب ،قاھرہ ، ذیل مرآۃ الزمان: ۱۹۷/۲، ط دار الکتاب الاسلامی

⑤ ذیل مرآۃ الزمان: ۱۹۷/۲، ط دار الکتاب الاسلامی

روانہ ہو گئے۔[1] اس قافلے نے بحیرۂ اسود عبور کیا۔ ساحل پر انہیں قپچاقی، روسی اور الانی نسل کے لوگ ملے۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ وفد ایک صحرا میں داخل ہوا جس میں جگہ جگہ سپاہیوں اور مال غنیمت سے بھری ہوئی خیمہ گاہیں دکھائی دیتی تھیں۔ تین ہفتے بعد جب یہ صحرا ختم ہوا تو ایک جھیل کے کنارے برکہ خان کی خیمہ گاہ دکھائی دی۔

سلطان کا وفد آداب بجالاتے ہوئے نو مسلم خاقان کے دربار میں حاضر ہوا۔ برکہ خان سفید پوشاک پہنے جواہرات سے مرصع صندل کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں جانب کرسیوں پر ساٹھ کے لگ بھگ سردار تھے۔[2]

برکہ خان کی دوسری سفارت دربارِ مصر میں:

برکہ خان اور اس کے امراء سلطان کا مراسلہ سن کر خوش ہوئے اور مثبت جواب کے ساتھ اپنا سفارتی وفد بھیجا جو ذوالقعدہ ٦٦٢ھ میں قاہرہ پہنچا۔ اس طرح بیبرس نے مغلوں کو اتحادی بنانے میں حسب توقع کامیابی حاصل کر لی۔[3]

برکہ خان نے اپنے اس خط میں تحریر کیا تھا:

''آپ جانتے ہیں کہ مجھے دینِ اسلام سے کتنی محبت ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہلاکو خان نے مسلمانوں پر کیسے ستم ڈھائے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنی سمت سے اس پر یلغار کیجئے اور میں اپنی سمت سے حملہ کرتا ہوں۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہم اسے ختم نہ کردیں یا مقبوضہ علاقوں سے اسے نکال باہر نہ کریں۔ اور بہرصورت وہ تمام علاقے جو ہلاکو سے آزاد کرائے جائیں گے، میں آپ ہی کو پیش کروں گا۔''

سلطان نے برکہ خان کا شکریہ ادا کیا اور اس رائے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے سفیروں کو خلعتوں سے نوازا۔[4]

برکہ کی جانب سلطان کی دوسری سفارت اور قیصر روم کی سازش:

اس دوران سلطان کا وہ وفد جو رمضان ٦٦١ھ میں روانہ ہوا تھا، قُسطَنطِینِیّہ جا کر پھنس گیا تھا۔ ہوا یہ کہ قیصر باسلوس اُن دنوں فرنگیوں سے لڑائی کے لیے پایۂ تخت سے دور ایک محاذ پر گیا ہوا تھا۔ وہ ہلاکو خان سے حلیفانہ تعلقات قائم کیے ہوئے تھا۔ سلطان کے وفود کا بار بار قُسطَنطِینِیّہ سے ہو کر برکہ خان کے پاس جانا، ہلاکو خان کو بازنطینی روما کے بارے میں بدگمان کرسکتا تھا۔ مزید یہ کہ ان دنوں ہلاکو خان کے کچھ سفیر قُسطَنطِینِیّہ میں تھے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے قیصر پر دباؤ ڈالا ہو۔ بہرکیف قیصر نے مصری وفد کو یہ کہہ کر روک لیا کہ وہ اُسے شرفِ باریابی بخشنا چاہتا ہے۔ چنانچہ مصری وفد بیس دن کا سفر کر کے قیصر کے سرحدی قلعے ''اکشاش'' میں پہنچا۔ ملاقات کے بعد قیصر نے انہیں کہا کہ وہ قُسطَنطِینِیّہ جا کر ٹھہریں، وہ محاذ سے فارغ ہو کر ان کے آگے کے سفر کے تمام انتظامات کر دے گا۔

---

[1] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/۵۵۸، ط العلمیہ

[2] نہایۃ الارب للنویری: ۳۰/۱۰۵، ۱۰۶، ط دارالکتب ،قاھرہ

[3] نہایۃ الارب للنویری: ۳۰/۱۰۶؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۱۱، ط العلمیۃ

[4] ذیل مرآۃ الزمان: ۲/۱۹۳، ۱۹۵، ط دارالکتاب الاسلامی؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ٦٦١ھ

سلطان کا وفد واپس قُسطنطینیہ جا کر انتظار کرتا رہا۔ آخر اس نے قیصر سے درخواست کی کہ اگر وہ انہیں سفری انتظامات کر کے نہیں دے سکتا تو واپس جانے دے۔ قیصر نے ان میں سے عماد الدین عباسی کو واپسی کی اجازت دے دی اور فارس الدین کو مزید انتظار کرنے کا کہا۔ قیصر کا بہانہ یہ تھا کہ ابھی سفر کے لیے وقت مناسب نہیں کیوں کہ جونہی ایشیائے کوچک کے سلجوقی حکمران رکن الدین کو یہ خبر ملے گی کہ مصری وفد خلیج قُسطنطینیہ سے ہوکر برکہ خان کے پاس جا رہا ہے، وہ سمجھے گا کہ رومیوں اور ہلاکو خان کی صلح ختم ہو چکی ہے اس لیے وہ جری ہو کر بازنطینی سرحد پر ٹوٹ پڑے گا۔

بہر حال یہ سب بہانے تھے۔ درحقیقت قیصر نے ہلاکو خان کی خوشنودی کے لیے سلطان کے اس وفد کو روک لیا تھا تاکہ وہ برکہ خان کے لیے جو پیغامات لے کر جا رہا ہے، تاخیر کے باعث ان کا مقصد فوت ہو جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ ایک سال گزر گیا اس دوران ناساز گار موسم کے باعث سلطان بیبرس کے دیے ہوئے قیمتی حیوانات ہلاک ہو گئے۔ ①

سلطان بیبرس کی قیصر کے خلاف تادیبی کارروائی:

رمضان ۶۶۲ھ کے وسط میں سلطان کو اطلاع ملی کہ قیصر کی حیلہ سازیوں کے باعث قُسطنطینیہ میں رُکے ہوئے سفیر کی تحویل میں موجود حیوانات ہلاک ہو چکے ہیں۔ سلطان نے فوراً قاہرہ کے پادریوں اور راہبوں کو طلب کیا۔ ان کے سامنے قیصر کے سلطنتِ مصر سے معاہدے کی دستاویز پیش کی جس میں راہ داری کی مکمل سہولیات دینے کا وعدہ تھا۔ سلطان نے کہا: ''قیصر نے میرے سفیروں کو روک رکھا ہے اور ہلاکو خان کی طرف مائل ہو چکا ہے۔''

سلطان نے پادریوں سے پوچھا کہ اس بدعہدی کے سبب قیصر پر دینِ مسیح کے لحاظ سے کیا حکم لگے گا؟

سب نے کہا: ''وہ دینِ مسیح سے خارج ہو چکا ہے۔''

سلطان نے ایک یونانی پادری کو جو فلسفی بھی تھا، سفیر بنا کر عتاب آمیز مراسلے کے ساتھ قیصر کے پاس بھیج دیا۔ ②

سلطان کے سفیر کی برکہ خان کے پاس حاضری اور واپسی:

اس دوران برکہ خان نے قیصر کی ان حرکات پر کارروائی کی اور اس کے بھیجے ہوئے مغلوں نے قیصر کی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ قیصر نے فوراً محبوس مصری سفیر فارس الدین کو مہرہ بنا کر مغل سپہ سالار کے پاس بھیج دیا۔ فارس الدین نے قیصر کی منشأ کے مطابق مغل سالار کو کہا: ''بازنطینی روما کا علاقہ سلطان بیبرس کے حلیفوں میں شامل ہے لہٰذا برکہ خان کو سلطان کا حلیف ہونے کے باعث قیصر کا لحاظ کرنا چاہیے۔'' مغل سالار نے اسے کہا: ''مجھے یہ تحریری طور پر لکھ دو۔''

فارس الدین قیصر کے اس قدر دباؤ میں تھا کہ اس نے یہ تحریر لکھ دی اور ساتھ ہی یہ بھی اضافہ کر دیا کہ میں قیصر کے پاس اپنی خوشی سے رُکا ہوا ہوں۔ مغل فوج حملے سے باز آ کر واپس چلی گئی۔ اب قیصر نے فارس الدین کو برکہ خان کے پاس بھیجنے کا انتظام کیا اور اپنا ایک سفیر بھی ساتھ کر دیا جس نے برکہ اور قیصر کے مابین صلح کا معاہدہ کرایا۔

برکہ نے سلطان کے سفیر سے اس قدر تاخیر کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا: ''مجھے قیصر نے روک رکھا تھا۔''

① ذیل مرآۃ الزمان: ۱۹۷/۲، ۱۹۸، ط دار الکتاب الاسلامی ② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱۰۹/۲، ط العلمیۃ

برکہ خان نے فوراً وہ تحریر منگوائی جو فارس الدین نے مغل سپہ سالار کو لکھ کردی تھی جو اس کے برعکس تھی۔

برکہ خان نے کہا: ''اگرچہ تم نے اپنے بادشاہ کے تحائف مجھے پہنچانے میں کوتاہی کی اور غلط بیانی بھی کی مگر میں سلطان بیبرس کے احترام میں تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں کروں گا۔''

فارس الدین جمادی الآخرہ ۶۶۵ھ میں واپس قاہرہ پہنچا۔ سلطان کو یہ اطلاعات مل چکی تھیں کہ اس نے سفارتی مہم انجام دینے میں سخت کوتاہی کی ہے اور قیصر کے روکنے کے باعث جو مال ضائع ہوا تھا، اس کا کوئی تاوان بھی طلب نہیں کیا۔ چنانچہ سلطان نے اسے معزول کردیا اور ان تحائف کی قیمت اسی سے وصول کی جو چالیس ہزار دینار تھی۔[1]

اہلِ یورپ سے تعلقات سازی:

سلطان کو یہ خطرہ برابر لاحق تھا کہ ہلاکو خان اور یورپ کے نصرانی کہیں اس کے خلاف مشترکہ جنگ نہ چھیڑ دیں۔ اس خطرے کے تدارک کے لیے سلطان نے نہایت دوراندیشی سے کام لیا اور یورپی درباروں سے دوستی گانٹھنے سے پہلے یورپی تاجروں اور منڈیوں کے مالکان سے راہ و رسم پیدا کی۔ جلد ہی وینس میں جو تاجروں کا مرکز تھا، سلطان کا اچھا اثر و رسوخ پیدا ہوگیا۔ تاتاریوں کی خونریزی نے یورپ سے ایشیا کی تجارت اور مقامی زراعت کو تباہ کرڈالا تھا۔ سلطان نے شام کے قلعہ بند فرنگیوں کو اجازت دے دی کہ وہ زمینوں کو کاشت کریں اور نفع حاصل کریں۔ مصر کی بندرگاہوں اور منڈیوں میں یورپی تاجروں کو ایسی مراعات دی گئیں کہ کئی عشروں سے ماند تجارت چمک اٹھی۔

سلطان نے صِقِلّیہ کے تاجروں اور قیصر سے بھی تجارتی معاہدے کرلیے۔ تجارت کی فضا سازگار بنانے کے بعد بیبرس کے لیے یورپی نوابوں اور سرمایہ داروں کو یہ سمجھانا آسان تھا کہ یورپ کو دمشق، قاہرہ اور قسطنطینیہ کے بازاروں سے جو نفع مل رہا ہے، وہ کسی نئی صلیبی جنگ کے متوقع مالِ غنیمت سے کہیں زیادہ ہے، لہٰذا ان فوائد کو ایک جنگ کی بھینٹ چڑھانا عقل کی بات نہیں۔ سلطان نے صِقِلّیہ کے بادشاہ ''چارلس کاؤنٹ آف انجو'' کے نام مراسلے میں لکھا کہ باہمی تجارت کا نفع اتنا ہے کہ جنگ کی وجہ سے اس میں خلل ڈالنا مناسب نہیں۔[2] بیبرس کی یہ رائے درست مانی گئی۔ رمضان ۶۶۲ھ میں چارلس کی سفارت قاہرہ حاضر ہوئی جس میں دونوں مملکتوں کے مابین دوستانہ تعلقات برقرار رکھنے کا یقین دلایا گیا۔[3] نتیجہ یہ نکلا کہ جب چند سالوں بعد پادریوں نے نئی صلیبی جنگ کی صدا لگائی تو یورپی تاجروں نے اس کے لیے چندہ دینے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ لہٰذا صلیبی جنگ مؤخر ہوتی رہی۔

تاتاریوں کو مزید ہزیمت:

۶۶۲ھ میں تاتاریوں نے ایک بار پھر کتبغا نویان کے بھائی بیدرا کی قیادت میں شام پر چڑھائی کی۔ حمص کے قریب تصادم ہوا جس میں مسلمان فتح یاب ہوئے اور بیدرا قتل ہوگیا۔ تاتاری بڑی بری حالت میں بھاگے۔

---

[1] ذیل مرآۃ الزمان: ۱۹۷/۲، ۱۹۸، ط دار الکتاب الاسلامی

[2] Marchof The Barbarians.by Harlod Lamb:p:231,232

[3] نہایۃ الارب للنویری: ۱۰۰/۳۰، ط دار الکتب

مسلمانوں کی ہمتیں اب بڑھ چکی تھیں، تاتاری اکا دُکا حملے کرتے اور چوروں کی طرح بھاگ جاتے۔ ۶۶۵ھ میں انہوں نے رحبہ پر حملہ کیا۔ شہریوں نے خود پامردی سے اپنا دفاع کیا اور تاتاریوں کو بھاگتے ہی بنی۔ ①

ہلاکو خان کے یورپ سے روابط اور بیبرس کی جوابی چال:

ہلاکو خان نے بیبرس اور برکہ خان پر قابو پانا مشکل دیکھا تو یورپ میں نئے حلیف تلاش کرنے کے لیے سفارتی مہم شروع کر دی۔ وہ خود نصرانیوں کا حامی تھا، اس کی بیگم دوقوز (طقز) خاتون نسطوری نصرانی تھی۔ اس نے برطانیہ کے شاہ ایڈورڈ اور پاپائے روم کو مراسلے بھیجے کہ اس وقت مصر کے خلاف تاتاریوں اور فرنگیوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔ مگر نصرانی ان دنوں باہمی تنازعات میں الجھے ہوئے تھے اس لیے فوری طور پر وہاں سے کوئی فوج کشی نہ ہو سکی۔ البتہ ہلاکو خان اپنے بیٹے اباقا کی شادی قُسطنطِینیَہ کے قیصر کی ناجائز بیٹی "میرایا" سے کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

سلطان بیبرس کو اس کا سخت خطرہ تھا کہ تاتاری یورپی طاقتوں کو ہم نوا نہ بنالیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عالم اسلام کے خلاف ایک نئی صلیبی جنگ شروع ہو کیوں کہ ابھی تاتاری سر پر کھڑے تھے اور شام کے ساحلوں پر نصرانیوں کے کئی قلعہ بند شہر موجود تھے۔ ایسے میں بیبرس کے اتحادی برکہ خان نے بھی یورپ کے کسی دربار سے رشتہ جوڑنے پر سنجیدگی سے غور کیا تاکہ طاقت کا توازن برابر ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے بھتیجے نوگائی کا نکاح قیصر کی دوسری بیٹی سے کرانے میں دیر نہ کی۔ اس طرح فریقین پھر ہم پلہ ہو گئے۔ ②

ہلاکو خان کی موت:

پے در پے شکستوں کے سبب ہلاکو خان مرگی کی بیماری میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ۱۹ ربیع الاوّل ۶۶۳ھ کو وہ ایل خانی سلطنت کے پایہ تخت "مراغہ" میں مر گیا، اس کی عمر ۶۰ سال سے زائد تھی۔ کچھ دنوں بعد اس کی متعصب عیسائی بیوی بھی فوت ہو گئی۔ مغربی مؤرخین الزام عائد کرتے ہیں کہ دونوں کو مسلمان حکیموں نے زہر دیا تھا۔ ③

مگر اس دور کے کسی تاریخی نوشتے سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ تاہم اگر واقعی ایسا ہوا ہو تو یہ ان مظالم کے فطری ردعمل کے سوا کچھ نہ تھا جو مسلمانوں پر نصف صدی سے ڈھائے جا رہے تھے۔ کمزور اور مظلوم افراد، بالادست ظالموں سے نجات پانے کے لیے خفیہ تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پس اگر ایسا ہوا ہو تو یہ پسے ہوئے محکوم طبقے کی مجبوری تھی۔ یہ طے ہے کہ دنیائے نصرانیت میں ان دونوں کی موت کا بڑا غم منایا گیا۔ ہیرلڈ لیمب لکھتا ہے:

"ساری عیسائی دنیا کو عیسائی مذہب کے ان دو محافظوں اور رہبروں کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔" ④

---

① البداية والنهاية: ۶۶۲ھ: ۱۸۷/۱ ② March of The Barbarians.by Harlod Lamb:p:231,232

نوٹ: نوگائی غیر مسلم تھا مگر برکہ خان کا معاون تھا۔ برکہ کے بعد اس نے سلطنت کے ایک علاقے پر مستقل حکومت قائم کر لی۔ اس کے لشکری "نوگائی تاتاری" یا "تاتار کریمیا" کہلائے۔ (March of The Barbarians.by Harlod Lamb:p:235) تاہم چند سال بعد اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ (السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱۰۰۹/۲؛ عقد الجمان للعینی: سنة ۶۶۹ھ)

③ March of The Barbarians.by Harlod Lamb:p:231 ④ بحوالۂ بالا

اباقا خان کی تخت نشینی ۔ برکہ خان کی ایک اور فتح:

ہلاکو کے بعد اس کا بیٹا اباقا خان (ابغا) ایل خانی مغلیہ سلطنت کا حکمران بنا۔ وہ اپنے باپ سے بڑھ کر مسلمانوں کا دشمن تھا۔ وہ حد درجہ نصرانیت نواز تھا اور اس کی بیوی بھی نصرانی تھی۔ دونوں مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اباقا نے برکہ خان سے جنگ کے لیے لشکر بھیجا مگر برکہ خان نے اسے شکستِ فاش دے دی۔ ①

اس فتح میں برکہ خان نے ہلاکو خان کے ہاں قید بہت سے مسلمانوں کو آزاد کرایا۔ ان میں مقتول خلیفہ مستعصم باللہ کا بیٹا علی بھی تھا۔ برکہ خان نے اسے دمشق بھیجا جہاں اس کا پرتپاک استقبال ہوا۔ ②

بیبرس کا عراق پر یلغار کا منصوبہ:

سلطان بیبرس کو ہلاکو کی موت اور برکہ خان کی تازہ فتوحات سے بے حد خوشی ہوئی۔ سلطان نے منصوبہ بنایا کہ ایک بڑا لشکر جمع کر کے عراق تک یلغار کی جائے اور بغداد تک تمام علاقے تاتاریوں سے چھڑا لیے جائیں مگر فرنگیوں سے مختلف محاذوں پر جنگ جاری تھی اس لیے کئی سال تک یہ عزم پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ ③

اُدھر ہلاکو خان کا جانشین اباقا، برکہ خان سے شکستِ فاش کے بعد بیبرس سے لڑائی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے گراں قدر تحائف کے ساتھ ایک وفد سلطان بیبرس کی خدمت میں بھیجا اور صلح کی پیش کش کی۔ ④ مؤرخین اس بارے میں خاموش ہیں کہ سلطان نے اس پیش کش کا کیا جواب دیا مگر یہ طے ہے کہ کوئی معاہدۂ صلح نہیں ہوا تھا۔ ⑤ چونکہ اس زمانے میں سلطان کا فرنگیوں سے جہاد شروع ہو چکا تھا (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔) غالباً اسی لیے اس پیش کش کو سختی سے مسترد کرنا خلافِ مصلحت اور قبول کرنا خلافِ حمیت سمجھا گیا اور اس معاملے کو معلق چھوڑ دیا گیا۔

برکہ خان کی وفات:

۶۶۵ھ میں برکہ خان کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ اسی خاندان کا ایک شہزادہ منکوتمر (بن طغان بن باتو بن جوجی بن چنگیز) حاکم ہوا۔ یہ منقول نہیں کہ وہ اسلام قبول کر چکا تھا یا نہیں مگر وہ مسلمانوں کے لیے باعثِ خیر ثابت ہوا۔ ⑥

۶۶۶ھ میں سلطان بیبرس نے منکوتمر کو برکہ خان کی موت پر تعزیتی پیغام بھیجا، ساتھ ہی اسے تخت نشینی کی مبارک باد دی اور ترغیب دی کہ وہ ہلاکو خان کی اولاد سے جنگ جاری رکھے۔ ⑦ سلطان بیبرس کا برکہ خان سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ اس کا ولی عہد الملک السعید جو اس وقت سات سال کا تھا، ''برکہ خان'' کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ ⑧

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/ ۲۹، ط العلمیة

② البدایة والنهایة: سنة ۶۶۳ھ

③ البدایة والنهایة: سنة ۶۶۳ھ

④ السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/ ۳۸، ط العلمیة

⑤ صلح نہ ہونے کا ثبوت اباقا کا وہ مکتوب ہے جو ۶۶۷ھ میں بھیجا گیا تھا اور آگے متن میں آرہا ہے۔

⑥ السلوک لمعرفة دول الملوک مقریزی: ۲/ ۴۵، ط العلمیة ، بعض جگہ (مثلاً: البدایة والنهایة: سنة ۶۶۵ھ) اسے باتو خان بن تولی لکھا گیا ہے جو درست نہیں۔

⑦ السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/ ۴۷، ط العلمیة

⑧ البدایة والنهایة: سنة ۶۷۶ھ

فرنگیوں سے جہاد

بیبرس نے ابتداء میں فرنگیوں سے نرمی کا رویہ اپنایا کیوں کہ اس وقت مسلمانوں کو تاتاریوں سے زیادہ خطرہ تھا۔ بیبرس نے شام کے ساحل کی طرف یلغار کی تو عکا اور یافا کے فرنگیوں نے صلح کی درخواست کی اور اس معاہدے کی تجدید چاہی جو ان کا سلطان صلاح الدین کے ساتھ تھا اور اس کا ذمہ دار شاہِ فرانس تھا۔ بیبرس نے یہ صلح منظور کرلی۔ یوں ساحل شام کے فرنگی قلعے مسلمانوں کی سرپرستی میں آگئے۔ اب فرنگیوں کے ذمے تھا کہ جب مسلمان جنگ میں ساتھ دینے کے لیے انہیں طلب کریں وہ حاضر ہوجایا کریں۔ ①

مگر صلح زیادہ دن برقرار نہ رہی۔ سلطان کو ساحلِ شام کے فرنگیوں کی بدعہدی کی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ مسلمانوں سے مطالبات کررہے تھے کہ انہیں مزید قلعے دیے جائیں۔ اب انہیں سزا دینا ضروری تھا۔ ۷ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو سلطان نے مصر سے شام کا رخ کیا اور غزہ میں قیام کیا۔ دورانِ سفر شکار میں مشغولیت کے ساتھ مقامی امراء اور قبائلِ عرب کے شیوخ سے ملاقاتیں ہوئیں، حمص کا حاکم الملک الاشرف حاضر ہوا۔ سلطان نے سب کو جہاد کی ترغیب دی۔

سلطان کو کرک کے امیر الملک المغیث کے بارے میں ثبوت مل چکے تھے کہ وہ تاتاریوں سے ساز باز کررہا ہے۔ وہ سلطان کے بلاوے پر ملاقات کے لیے آیا تو اسے گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے خطوط اور وہ قاصد پیش کیے گئے جو تاتاریوں تک پیام رسانی کا ذریعہ بنے تھے۔ مغیث کو قید کرکے قاہرہ بھیج دیا گیا۔

اس دوران بحیرۂ خزر کی جانب سے اطلاع آئی کہ تاجِ زرّیں خیل کے نومسلم تاتاریوں نے ایل خانی تاتاریوں کو ایک اور شکست دے ڈالی ہے۔ سلطان نے مشرقی محاذ سے مطمئن ہوکر فی الفور نصرانیوں سے نمٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب سلطانی افواج ساحل تک پہنچیں تو فرنگیوں کے سفارتی وفد نے حاضر ہوکر تجدیدِ صلح کی درخواست کی۔ سلطان نے کہا:

''یہ خیال ہماری آمد سے پہلے کیوں نہ آیا۔ ہم نے نہ تمہارا کوئی کھیت اجاڑا، نہ مال مویشیوں کو لوٹا، مگر تم ہماری فوج کی رسد روکتے رہے اور جو خادم یا غلام اکیلے ملے انہیں اغوا کرتے رہے۔ ہم نے قیدیوں کی آزادی کے وعدے کی تکمیل کے لیے کتنے قیدی قاہرہ سے تمہاری سرحدوں تک بھیجے مگر تم نے نہ تو اپنی قوم پر رحم کرتے ہوئے ان قیدیوں کو وصول کرنے پر توجہ دی، نہ ہمارے قیدی آزاد کرنے کا خیال کیا۔ ہمارے سفیر جو ایشیائے کوچک جارہے تھے، تمہارے کہنے پر قبرص کے راستے سے گئے جہاں انہیں گرفتار کرلیا گیا جبکہ ہم تمہارے سفیروں اور تاجروں سے ہمیشہ حسنِ سلوک کرتے رہے ہیں۔ بتاؤ تم نے مملکتِ مصر کا کب ساتھ دیا ہے؟ کب اسے کوئی فائدہ پہنچایا ہے؟ اب ملکِ شام میرے ہاتھ میں ہے اور مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا اب ایک ہی

---

① تاریخ ابن خلدون: ۴۴۱/۵، ط دار الفکر

مطالبہ ہے کہ ہمارے تمام قیدی رہا کردو۔ اور یہ سارے شہر جو تم نے لیے ہیں، ہمارے حوالے کردو۔''
فرنگی سفیر مبہوت رہ گئے اور کہنے لگے: ''ہم تمام مطالبات ترک کرتے ہیں۔ آپ بس صلح کی تجدید کردیں۔''
سلطان نے کہا: ''یہ بات میرے مصر سے چلنے سے پہلے کہتے۔ اب اس سردی اور بارش میں فوج کو یہاں تک لانے کے بعد اس کا کوئی مطلب نہیں۔''

فرنگی سفیر نامراد واپس ہوگئے۔ سلطان نے یلغار کر کے عکا کو گھیر لیا۔ خود ایک ٹیلے پر قیام کیا اور سپاہیوں کو خندقیں پاٹ کر شہر کی فصیل تک پہنچنے کا حکم دیا۔ جلد ہی لشکرِ سلطانی نے شہر کی محافظ فوج کو دھکیل دیا۔ بہت سے خندق میں جا گرے اور باقی شہر میں محصور ہوگئے۔ سلطان نے اپنی نگرانی میں منجنیقوں کی تنصیب کرائی اور نقب زنوں کو فصیل توڑنے کا حکم دیا۔ یہ مہم جاری تھی کہ سلطان کو بعض وجوہ سے واپس لوٹنا پڑا۔ ①

قیساریہ کی فتح:

۴ ربیع الآخر ۶۶۳ھ کو سلطان نے فرنگیوں کے خلاف جہاد کا عزمِ مصمم کر کے مصر سے کوچ کیا۔ راستے میں ناموافق حالات پیش آئے اور سواری و بار برداری کے جانور بکثرت مر گئے۔ بہت سا سامانِ رسد راستے میں چھوڑنا پڑا۔ سلطان نے اس کے باوجود یلغار کی رفتار کم نہ کی۔ افسران نے اونٹوں کی کمی کی شکایت کی تو سلطان نے جواب دیا:
''مجھے اونٹوں کی نہیں، اسلام کی نصرت کی فکر لاحق ہے۔''

۲۰ ربیع الآخر ۶۶۳ھ کو لشکرِ سلطانی غزہ پہنچا تو مخبر نے بتایا کہ قیساریہ کے فرنگی پوری تیاری میں ہیں اور ۷ امناجنیق نصب کر چکے ہیں۔ سلطان نے یہ خبر کسی کو نہ بتائی اور شکار کے بہانے غزہ سے نکل کر صیدا کے قریب قیام کیا۔ یہاں سے یکدم قیساریہ کی سمت یلغار کی اور شہر کے سامنے پہنچ کر فصیل پھلانگنے کے لیے سیڑھیاں بنوالیں۔

۹ جمادی الاولیٰ کی شب اسلامی لشکر نے بڑی سرعت سے شہر پر دھاوا بولا۔ حریف کو اس کی بالکل توقع نہ تھی۔ بہت سے فرنگی خندق میں گر پڑے۔ باقی ڈر کر شہر میں گھس گئے۔ سلطان نے چار منجنیقوں کے ذریعے شہر پر سنگ زنی اور آتش باری شروع کرائی۔ شہر کے دروازے جلا کر توڑ دیے گئے اور لشکرِ اسلام اندر داخل ہوگیا۔

فرنگیوں نے قیساریہ کے قلعے میں پناہ لی جس کی بنیادیں اتنی گہری تھیں کہ نقب لگانا ممکن نہ تھا۔ سلطان نے قلعے کے سامنے واقع گرجے کے مینار پر مورچہ بنایا تاکہ قلعہ بند سپاہی فصیل پر نہ چڑھنے پائیں۔ پھر دبابوں کے ذریعے قلعے پر دھاوے شروع کیے۔ چند حملوں میں سلطان نے خود دست بدست حصہ لیا۔ واپسی میں سلطان کی ڈھال میں کئی تیر پیوست دیکھے گئے۔ جمعرات ۱۵ جمادی الاولیٰ کو فرنگیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قیساریہ کے قلعے میں اذانِ فجر گونجنے لگی۔ سلطان کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ فلسطین اور شام کا ہر وہ قلعہ فتح کے بعد نیست و نابود کر دیا جائے جس سے کبھی بھی نصرانیوں کو عسکری مدد مل سکتی ہو۔ ان کی جگہ وہ قلعے مستحکم کیے جائیں جو مسلم آبادیوں کے ساتھ ہوں اور مسلمانوں

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۱/۵۵۱ تا ۵۵۵، ط العلمیة

کے دفاع کے لیے مفید ہوں۔ لہٰذا سلطان نے فتح کے بعد قیساریہ کا قلعہ مسمار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔[1]

البیرہ کی از سرِ نو تعمیر:

اُدھر دریائے فرات کے پار قلعہ البیرہ جو مشرق سے حملوں کی روک تھام کے لیے بہت اہم تھا، تاتاریوں کے حملوں میں تباہ ہو کر ایک مدت سے خستہ وشکستہ پڑا تھا۔ سلطان کو فرنگیوں سے جہاد کے دوران عقب سے تاتاریوں کے حملوں سے حفاظت کی ضمانت درکار تھی۔ اگرچہ تاتاریوں کا زور ٹوٹ چکا تھا مگر ان کی تاخت وتاراج کا خطرہ باقی تھا۔ اس لیے سلطان نے قلعہ البیرہ کی نہایت مستحکم تعمیر کا حکم دیا اور تاکید کی کہ وہاں دس سال تک کے لیے کافی اناج اور غلہ جمع رکھا جائے۔ حاکمِ حماۃ الملک المنصور اور امیر عزالدین ایغان کو رقعہ بھیجا کہ فوج لے کر البیرہ پہنچو، ورنہ میں خود ایک دستہ لے کر وہاں آتا ہوں۔ البیرہ کی تعمیرِ نو کے لیے سلطان نے قاہرہ سے دو لاکھ دینار اور دمشق سے دو لاکھ دراہم منگوا کر امراء کے حوالے کیے۔ امرائے شام البیرہ پہنچے تو اردگرد منڈلاتے ہوئے تاتاری گھبرا کر منتشر ہو گئے۔

البیرہ کے قلعے کی تعمیر بڑے زور و شور سے شروع ہوئی۔ امرائے لشکر بھی کاندھوں پر پتھر اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ سلطان نے اس دوران قیساریہ کا قلعہ منہدم کرانا شروع کر دیا تھا۔ ہاتھ زخمی ہو چکا تھا مگر کدال لے کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ کھدائی میں شرکت جاری تھی۔ اسی حالت میں امرائے البیرہ کو مراسلہ بھیجا:

''الحمد للہ! ہم نے آپ کو چھوڑ کر اپنے لیے کسی راحت و بےفکری کو خاص نہیں کیا۔ ایسا نہیں کہ آپ تکلیف میں ہوں اور ہم آرام میں۔ ہم سب کی حالت ایک سی ہے کہ کوئی دن رات جہاد میں مصروف ہے، کوئی پتھر ڈھو رہا ہے اور کوئی کفار کے بالمقابل پہرہ دے رہا ہے۔''

سلطان نے البیرہ کی تعمیر میں حصہ لینے والے تمام امراء، افسران، سپاہیوں، پہرہ داروں، مزدوروں اور عام لوگوں کے لیے انعامات بھیجے تاکہ ان کے حوصلے بلند رہیں۔[2]

حیفا، عثلیث اور ارسوف کی فتح:

قیساریہ کی فتح کے بعد سلطان نے اپنے امراء کو حیفا بھیجا، فرنگی اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ شہر چھوڑ کر بحری راستے سے فرار ہو گئے اور ۱۶ جمادی الاولیٰ کو یہ شہر لڑائی کے بغیر فتح ہو گیا۔ اسی روز ساحل پر عثلیث کا مضبوط ترین قلعہ بھی فتح کر کے اسے بھی زمین بوس کر دیا گیا۔

۱۹ جمادی الاولیٰ کو سلطان نے کسی کو اپنا ہدف بتائے بغیر ساحل کے ساتھ جنوب کا رخ کیا اور یکم جمادی الآخرہ کو ارسوف کا محاصرہ کر لیا۔ اس شہر کو فتح کرنا بہت مشکل تھا۔ سلطان نے اس کے لیے نہایت عجیب حربہ اپنایا۔ یہاں گرد و نواح کے جنگلات سے لکڑیوں کے انبار جمع کیے گئے۔ اس کے بعد شہر کی بیرونی خندق کے اندر سے ایک سرنگ کھدوا

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/ ۱۸، ۱۹، ط العلمیۃ

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/ ۱۸، ۱۹، ط العلمیۃ

شروع کی جو قلعے کی اندرونی خندق میں جانکلتی تھی۔ ان سرنگوں کے بالائی حصے کو لکڑی کے تختوں کے ذریعے محفوظ بنایا گیا۔ یہ کام ماہر انجینئروں، مہندسوں اور معماروں کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔

سرنگوں کی کھدائی کے ساتھ شہر کے دروازوں پر بھی حملے شروع ہوئے اور قلعہ شکن آلات حرکت میں آئے۔ سلطان نے عام سپاہی کی طرح جنگ کے ہر کام میں حصہ لیا، کبھی شمشیر بکف ہو کر شہر کے دروازے پر جنگ لڑی، کبھی قلعہ شکن آلات کے ساتھ حملے میں شرکت کی، منجنیقوں کو کھینچا، سرنگیں کھودیں، مٹی ڈھوئی اور پتھر اٹھائے۔ ساحل پر فرنگیوں کی کشتیوں کو تیروں کا نشانہ بنایا۔ وقائع نگاروں کے مطابق ایک دن سلطان نے دشمنوں پر جو تیر چلائے، ان کی تعداد کم از کم تین سو تھی۔

ایک دن سلطان کی سرنگ میں موجودگی کے دوران فرنگیوں نے اوپر سے کھدائی کر کے شگاف کر دیا اور وہاں سے پہلے نیزے پھینکے۔ پھر آنکڑے ڈال کر سلطان کو اوپر کھینچنے لگے۔ سلطان نے دست بدست لڑ کر خود کو بچانے کی پوری کوشش کی۔ امیر سنقر نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے سلطان کو پتھر پکڑانا شروع کیے اور سلطان نے دو حملہ آوروں کو پتھر مار مار کر قتل کر دیا، باقی بھاگ نکلے۔ یوں اللہ نے سلطان کو کفار کی قید میں جانے سے بال بال بچالیا۔

اس کے بعد بھی سلطان کی ہمت کا یہ عالم تھا کہ دونوں فوجوں کے درمیان تنہا چکر لگانے کی عادت ترک نہ کی۔ کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ سلطان کی حالت دیکھ کر تمام امراء اور سردار بھی اسی طرح جفاکشی اور جان بازی کا ثبوت دے رہے تھے۔ اس جنگ میں علماء وصلحاء کی بڑی تعداد شامل تھی۔ اس کے علاوہ پردہ دار خواتین بھی شریک تھیں جو زخمیوں کی دیکھ بھال اور سپاہیوں کو پانی پلانے کی خدمات انجام دے رہی تھیں۔ فوج میں مے نوشی یا بے حیائی کے کسی کام کا شائبہ تک نہ تھا۔

آخر سرنگیں قلعے تک پہنچ گئیں اور جمعرات ۵ رجب کو فوج نے سرنگ سے نکل کر دھاوا بول دیا۔ شہر کے دروازے کھلوا لیے گئے اور ارسوف کی فصیلوں پر اسلامی پرچم لہرانے لگے۔ شہر کے حفاظتی انتظامات ناکارہ بنا دیے گئے۔ اس مہم سے فراغت پر ۱۱ شعبان ۶۶۳ھ کو سلطان کی قاہرہ واپسی ہوئی۔ ①

قیساریہ اور ارسوف کے متبادل کے طور پر سلطان نے ایک نیا قلعہ "قاقون" تعمیر کرانا شروع کیا جو ۶۶۵ھ میں مکمل ہوا اور بعد میں آبادی اور بازاروں کی وجہ سے شہر بن گیا۔ ②

قلعہ صفد پر قبضہ:

اگلے سال ۶۶۴ھ میں سلطان نے دوبارہ ساحلِ شام کے فرنگی قلعوں پر لگاتار چھاپہ مار حملے کیے جن کا دائرہ کار طرابلس تک تھا، یہاں سے اس قدر مالِ غنیمت حاصل ہوا کہ گایوں اور بھینسوں کی قیمتیں بہت گر گئیں اور خریدار نا پید

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/۲۰،۲۱، ط العلمیة
② السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/۴۳، ط العلمیة

ہو گئے۔ اسی مہم میں سلطان نے عکا پر ایک نمائشی حملہ کیا جس کا مقصد دوسرے شہروں کے فرنگیوں کو بے فکر کرنا تھا۔ اس کے بعد یکا یک عکا سے باگ اٹھائی اور ۸ رمضان کو صفد پر جا کر مورچہ بندی کی، یہ قلعہ سلطان صلاح الدین نے فتح کیا تھا مگر بعد میں نصرانیوں نے اسے واپس چھین لیا تھا۔ یہاں چھ ہفتوں تک محاصرانہ جنگ ہوتی رہی۔ عیدالفطر کے دن خدشہ تھا کہ سپاہی حرام لہو ولعب میں مشغول نہ ہو جائیں۔ سلطان نے حکم دیا کہ اگر کسی نے شراب پی تو قتل کر دیا جائے گا۔

جب منجنیقوں نے قلعے کی دیوار کمزور کر دی تو سلطان نے قلعے کی دیوار میں نقب زنی کا حکم دیا اور کہا:

''پہلا پتھرا کھاڑنے والے کے لیے سو دینار انعام، دوسرا پتھرا کھاڑنے والے لیے ۹۰۔ اسی طرح نوبت بہ نوبت دسواں پتھرا کھاڑنے والا دس دینار کا حق دار ہوگا۔''

سلطان نے اپنے خادموں اور ملازموں کو بھی اس کارروائی کے لیے بھیج دیا۔ یہ ۲ شوال کا واقعہ ہے۔ اس دن قلعے کی فصیلوں کے سامنے بہت زوردار جنگ ہوئی۔ نقب زنی کرتے ہوئے بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ کوئی ایک گرتا تو دوسرا اس کی جگہ کھڑا ہو جاتا۔ آخر فرنگیوں نے قلعہ ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر امان طلب کی۔ سلطان نے اس شرط پر جان کی امان دی کہ نصرانی قلعے کا سارا مال ومتاع جوں کا توں چھوڑ کر اسے خالی کر جائیں۔ کوئی چیز ساتھ نہ لیں۔

اس طرح ۱۸ شوال ۶۶۴ھ کو صفد فتح ہو گیا۔ فتح کے بعد انخلاء کرنے والوں نے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رقم اور اسلحہ چھپا کر لے جانا چاہا۔ وہ تلاشی کے دوران پکڑے گئے اور قتل کر دیے گئے۔

صفد کی فتح کے بعد فرنگیوں کا اسلحہ خانہ اپنی خیمہ گاہ میں منتقل کرنے کا مرحلہ آیا تو سلطان نے اپنے کاندھے پر ہتھیار اٹھا کر لے جانا شروع کیے۔ یہ دیکھ سبھی حرکت میں آ گئے اور ایک گھنٹے میں پورا اسلحہ خانہ منتقل ہو گیا۔ صفد کی فتح کے بعد سلطان کی فوجیں مضافات میں پھیل گئیں اور لگ بھگ بیس قلعے مزید فتح کر لیے۔ [1]

صفد سے آزاد کیے گئے مسلمان قیدیوں سے سلطان کو معلوم ہوا کہ ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقے ''قارا'' کے ارمن عیسائی مسلمانوں کو قید کر کے فرنگیوں کو بیچا کرتے ہیں۔ یہی اطلاع ''سیس'' (آرمینیا) کے عیسائیوں کے بارے میں ملی کہ وہ تاتاریوں کے شام پر تسلط کے وقت سے مسلم آبادیوں پر حملوں اور عورتوں اور بچوں کے اغواء میں ملوث ہیں۔ سلطان نے فوراً ''قارا'' اور ''سیس'' پر یلغار کر کے ارمنیوں کو ان کے کرتوتوں کی سزا دی۔ [2]

عکا پر حملہ:

سلطان نے ۷ اجمادی الآخرہ ۶۶۵ھ کو ایک مختصر فوج کے ساتھ دوبارہ شام کا رخ کیا۔ غزہ میں فرنگی امراء ہدیے لے کر حاضر ہوئے اور صلح کی پیش کش کی مگر کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے اِدھر اُدھر لوٹ مار شروع کر دی۔ سلطان نے جواب میں عکا کے اردگرد اتنی تند وتیز چھاپہ مار کارروائیاں کرائیں کہ فرنگی حواس باختہ ہو گئے۔ ان کا سفیر صلح کے لیے آیا تو سلطان نے پیش کش ٹھکراتے ہوئے کہا: ''یہ کارروائیاں تمہاری لوٹ مار کا جواب ہیں۔''

① البداية والنهاية: سنة ۶۶۴ھ، السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/ ۳۳ تا ۳۵
② البداية والنهاية: سنة ۶۶۴ھ

اس کے بعد ماہ شعبان ۶۶۵ھ میں سلطان نے عکا کی طرف پیش قدمی کی، گردونواح میں پانی کے ذخائر اور چراگاہیں تلف کر کے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ سلطان نے خود گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ تھامے چار دن تک شہر کے مرکزی دروازے پر دھاوے کی قیادت کی۔ شہر تو فتح نہ ہو سکا البتہ دور دور تک اسلامی فوجوں کا رعب بیٹھ گیا۔

اسی دوران صور، سیس (آرمینیا) اور بیروت کے فرنگی امراء کے علاوہ حصن الاکراد کے ٹمپلرز بھی صلح کی درخواستیں لے کر آئے۔ سلطان نے سخت شرائط لاگو کر کے دس سال تک صلح منظور کر لی۔ [1]

یافا اور شقیف ارنوم کی فتح:

فرنگیوں کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں اس لیے سلطان نے ۶۶۶ھ میں دوبارہ شام کے ساحل پر یلغار کی اور ۲۰ جمادی الآخرہ کو صرف بارہ گھنٹے کی لڑائی کے بعد ''یافا'' کو فتح کرلیا۔ یہ وہ مستحکم قلعہ تھا جسے سلطان صلاح الدین نے تین دن میں سرنگوں کیا تھا مگر اگلے ہی دن شاہِ برطانیہ رچرڈ نے اسے دوبارہ چھین لیا تھا۔

یافا کے بعد اگلا دھاوا حصن شقیف ارنوم پر ہوا۔ یہ پہاڑی ڈھلوان پر واقع نہایت مستحکم قلعہ تھا جس پر قبضہ بظاہر ناممکن لگتا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے بڑی مشکل سے کئی ماہ کے محاصرے کے بعد اسے فتح کیا تھا مگر بعد میں ایوبی شہزادوں نے اسے عیسائیوں کے حوالے کردیا تھا۔ سلطان بیبرس نے اسے فتح کرنے کا تہیہ کرلیا۔ خوش قسمتی سے یہاں حملے سے پہلے سلطان کے جاسوسوں نے عکا کے فرنگیوں کے ایک مخبر کو پکڑ لیا جو حصنِ شقیف کے لیے یہ پیغام لے جا رہا تھا کہ لشکرِ اسلام عن قریب تم پر حملہ آور ہونے کو ہے۔

سلطان نے اس کی جگہ اہلِ عکا کی جانب سے دو جعلی خطوط تیار کرائے: ایک شقیف کے حاکم کے نام تھا جس میں اسے اس کے نائب کی سازشوں سے ڈرایا گیا تھا۔ دوسرا نائب کے نام تھا جس میں اسے حاکم سے بدظن کیا گیا تھا۔ یہ خطوط سلطان کا ایک نصرانی جاسوس حصنِ شقیف لے گیا۔ اس طرح وہاں حاکم اور وزیر میں باہمی اختلاف پڑ گیا۔ جب سلطان کا لشکر پہنچا تو شقیف کے نصرانی متحد ہو کر نہ لڑ سکے۔ یہاں ۲۶ منجنیقوں سے سنگ باری کی گئی اور آخر ۲۹ رجب بروز اتوار اسے بھی بازیاب کرالیا گیا۔ [2]

طرابلس پر حملہ:

اس کے بعد سلطان نے طرابلس کا رخ کیا جہاں افریس بوہیمنڈ کی حکومت تھی۔ وہ انطاکیہ اور طرابلس کا مشترکہ حاکم تھا۔ اس کی اسلام دشمنی مشہور تھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''انطاکیہ اور طرابلس کا حاکم افریس مسلمانوں کو ایذائیں پہنچانے میں سب سے آگے تھا۔'' [3]

---

[1] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۴۴/۲، ط العلمیۃ

[2] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۴۸/۲، ۴۹، البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۶۶ھ

[3] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۶۶ھ

سلطان نے طرابلس سے آدھی منزل پر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں ایک جنگی برج تھا جسے فتح کر کے تمام مورچہ بند فرنگیوں کو قتل کر دیا گیا۔ سلطانی افواج نے طرابلس کی نواحی پہاڑیوں پر چھاپہ مار کارروائیوں میں بے پناہ مالِ غنیمت حاصل کیا۔ اس دوران طرطوس اور صافیتا کے حاکموں نے تین سو مسلمان قیدی آزاد کرتے ہوئے صلح کی پیش کش کی۔ سلطان نے مصلحتاً اسے قبول کر لیا۔ سلطان کا طرابلس پر حملہ محض دھوکا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل ہدف کیا ہے۔ [1]

انطاکیہ کی عظیم فتح:

ایک دن طرابلس کے سامنے سے لشکرِ اسلام اچانک غائب ہو گیا۔ افریس خوش ہوا کہ جان چھوٹی مگر سلطان نے کچھ دور جا کر فوج کے تین حصے کر کے تین الگ سمتوں میں یلغار کر دی۔ ایک حصہ اپنی قیادت میں لے کر "قلعہ افامیہ" پر حملہ کیا۔ دوسرے حصے نے "سویدیہ" کو گھیر لیا۔ تیسرے حصے نے قلعہ "دربساک" پر حملہ کیا۔

مگر یہ تینوں حملے بھی نمائشی تھے۔ چند دن بعد یہ تینوں فوجیں پھر غائب ہو گئیں اور یکم رمضان کو یکدم اپنے اصل ہدف انطاکیہ کے سامنے جمع ہو گئیں۔ یہ تاریخی شہر دنیا کے وسیع اور مضبوط ترین فصیل بند شہروں میں سے ایک تھا۔ اس کی فصیل بارہ میل تک پھیلی ہوئی تھی جس میں ۱۳۶ برج اور ۲۴ ہزار حجرو کے تھے۔ اسے فرنگیوں نے پانچویں صدی ہجری میں القدس پر قبضے سے پہلے چھینا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی بھی اسے بازیاب نہیں کر سکے تھے۔ یہاں ایک لاکھ مسلح فرنگی جمع تھے۔ سلطان نے کوشش کی کہ بغیر جنگ کے شہر فتح ہو جائے مگر سمجھانے بجھانے کے باوجود فرنگی نہ مانے۔ آخر ۶ رمضان کو شہر پر حملہ شروع ہوا، شدید لڑائی کے بعد مسلمان قریبی پہاڑی سے کمندیں ڈال کر شہر کی دیواروں پر چڑھ گئے اور دست بدست لڑائی کے بعد شہر پر قابض ہو گئے۔ مسلم امراء نے شہر کی سخت ناکہ بندی کر رکھی تھی اس لیے کوئی بھی فرار نہ ہو سکا۔ امرائے سلطنت سمیت آٹھ ہزار افراد نے قلعے میں پناہ لی اور امان طلب کی۔ سلطان نے درخواست منظور کر کے قلعے کے دروازے کھلوا لیے۔ اس طرح ۱۴ رمضان ۶۶۲ھ کو یہ عظیم الشان فتح مکمل ہوئی۔

یہاں سے بڑی تعداد میں مسلمان قیدی بھی بازیاب کرائے گئے جن کی اکثریت حلب سے تعلق رکھتی تھی۔ انطاکیہ کی فتح بہت بڑی خوشخبری تھی جس کے بشارت نامے پورے عالم اسلام میں روانہ کر دیے گئے۔ انطاکیہ کے حاکم افریس بوہیمنڈ کو طرابلس میں یہ خبر پہنچی تو غم سے اس کا برا حال ہو گیا۔ [2]

مجھے پروا نہیں:

سیس (آرمینیا) کا نصرانی حاکم تکفور ہیتوم تاتاریوں کا حلیف تھا، اس نے کچھ عرصہ قبل مسلمانوں سے دربساک، بہنسا، مرزبان اور رعبان کے قلعے چھینے تھے۔ جواب میں سلطان نے ایک جنگ میں اس کے بیٹے کو گرفتار کر لیا تھا۔ تکفور اس کی رہائی کے لیے بڑی سے بڑی قیمت دینے پر آمادہ تھا مگر سلطان نے نقد رقم کی جگہ دو مطالبے رکھے:

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک، ۲/ ۴۹، ط العلمیة

② السلوک لمعرفة دول الملوک، ۱/ ۴۹، ۵۰، ط العلمیة

❶ وہ حلب کے امیر سنقر اشقر کو جسے تاتاریوں نے قید کیا ہوا تھا، کسی بھی طرح رہائی دلوائے۔
❷ مسلمانوں سے چھینے گئے چاروں قلعے: درب ساک، بہنسا، مرزبان اور رعبان واپس کردے۔

تلفور نے شرائط مان لیں اور تاتاریوں سے بات چیت کر کے سنقر اشقر کو اپنے ہاں منتقل کرالیا۔ مگر اب وہ دوسری شرط سے مکر گیا۔ صرف سنقر کی رہائی پر آمادگی ظاہر کی۔ اس پر سلطان نے جوابی مراسلے میں لکھا:

''جب تمہیں اپنے بیٹے اور ولی عہد کی گرفتاری برداشت ہے تو مجھے بھی اپنے دوست سنقر کی قید کی پروا نہیں جس سے میرا خونی رشتہ بھی نہیں۔ معاہدے سے تم برگشتہ ہوئے ہو، ہم نہیں۔ ہم اپنے عہد کے پابند ہیں۔ تم سنقر کے ساتھ جو چاہو کرو۔''

جب تکفور نے یہ مراسلہ پڑھا اور ساتھ ہی اسے انطاکیہ کے سقوط کی خبر ملی تو ڈر گیا۔ اس نے مسلمانوں سے چھینے گئے سارے قلعے واپس کر دیے اور سنقر کو بھی رہا کر دیا۔

سلطان نے بدلے میں نہ صرف حسب معاہدہ اس کے بیٹے کو آزاد کیا بلکہ اس کے بھتیجے اور غلاموں کو بھی چھوڑ دیا۔[1]

ایک عجیب کھیل:

٦٦٧ھ میں سلطان نے دمشق سے نکلتے وقت ایک عجیب کھیل کھیلا۔ چند ایک کے سوا تمام امراء کو مصر بھیج دیا اور پیچھے خود کو اس قدر بیمار ظاہر کیا کہ ہر طرف خبر پھیل گئی کہ سلطان کا آخری وقت قریب ہے۔

سلطان نے خربۃ اللصوص میں پڑاؤ ڈالا اور کچھ دنوں کے لیے غائب رہنے اور اچانک مصر میں ظاہر ہونے کا منصوبہ بنالیا۔ یہ راز پوری سلطنت میں صرف ایک شخص امیر شمس الدین کو بتایا گیا۔

١٦ شعبان کو سلطان نے امیر ایدمری، امیر جرمک اور امیر بریدی کو خفیہ حکم دیا کہ وہ حلب روانہ ہو جائیں مگر روانگی سے پہلے شاہی خیمے کے عقب میں آکر کچھ ہدایات لے لیں۔ شاہی خیمہ ایک احاطے میں تھا جس کے دروازے پر سخت پہرا تھا۔ سلطان کو اس احاطے سے اس طرح نکلنا تھا کہ پہرے دار بھی نہ پہچان پائیں۔ سلطان نے ایک بوسیدہ رومال سر پر باندھا، خادموں جیسا چغا پہنا۔ کپڑوں کا ایک گٹھا باندھ کر سر پر اٹھایا اور ایک راز دار غلام کو بلا کر کہا:

''میں قلی بن کر خیمے سے نکلوں گا، تم آگے آگے چلنا۔ پہرے دار پوچھے تو کہنا کہ یہ آدمی کپڑے اٹھانے آیا تھا۔''

سلطان نے اپنے ہی پہرے داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر باہر نکلنے میں چند لمحے لگائے۔

سلطان اسی حالت میں ان افسران سے جاملا جنہیں حلب جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ کوئی سلطان کو پہچان نہ سکا۔ کچھ دیر بعد سلطان نے ایک افسر کو چپکے سے کہا: ''مجھے پہچانتے ہو؟'' افسر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بولا: ''ہاں ہاں اللہ کی قسم'' یہ کہہ کر وہ اپنے گھوڑے سے اترنے لگا تا کہ آداب بجالائے مگر سلطان نے اشارے سے منع کر دیا۔

کچھ دیر بعد سلطان نے دوسرے افسر کو اسی طرح چھیڑا اور کہا: ''مجھے پہچانا''

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ٢/ ٥١، ط العلمية

وہ بھی حیران رہ گیا اور گڑ بڑا کر بولا: ''اخوند! یہ کیا!!'' سلطان نے کہا: ''بس چپ رہو۔''

کسی کو معلوم نہ تھا کہ سلطان کا ارادہ کیا ہے اور منزل کہاں۔ سلطان نے ایک نوکر کے کردار میں حقیقی رنگ بھرنے کے لیئے شاہی گھوڑے استعمال کرنے کی کوشش بالکل نہ کی۔ نصف شب کو یہ لوگ راستے کی ایک چوکی ''قصیر'' پہنچے۔ سلطان نے یہاں کے ناظم سے اپنے لیے ایک گھوڑا طلب کیا۔ اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا:

''یہ سلطان کے گھوڑے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان پر سوار ہو سکے۔ بھاگو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔''

بیسان پہنچ کر یہاں کے ناظم سے ملاقات کی کوشش کی۔ پہرے دار قافلے کو چوکی کی عمارت کے اندر لے گئے، یہاں ناظم پاؤں پسارے سو رہا تھا۔ سلطان نے اس کے قدموں کی طرف بیٹھ کر اپنے ایک ساتھی سے ازراہِ مذاق کہا:

''یہ دیکھو! لوگ میرے دروازے پر آتے ہیں اور میں اس ناظم کے دروازے پر آیا ہوں۔ مگر یہ میری طرف توجہ تک نہیں کر رہا۔ ہاں دنیا الٹتی بدلتی رہتی ہے۔'' ناظم بیدار ہوا تو سلطان نے پانی کا کوزہ مانگا۔ وہ بے اعتنائی سے بولا:

''یہاں کوئی کوزہ نہیں! پانی پینا ہے تو باہر جا کر پی لو۔''

آخر سلطان کے ایک ساتھی نے پانی لا کر دیا۔ یہاں سلطان کو سواری کے لیے ایک بیمار گھوڑا بھی مل گیا۔ یہ قافلہ عریش پہنچا تو سلطان نے کھانے کے لیے جَو کے دانے نکالے۔ دانے صاف کرتے کرتے عجیب سے لہجے میں کہا:

وَأَيْنَ الْخلق الْوُقُوف فِي الْخدمَة؟ هَكَذَا تخرج الْمُلُوك من ملكهم وَمَا يَدُوم إِلَّا اللّٰه سُبْحَانَهُ.

''کہاں ہیں وہ لوگ جو خدمت میں کھڑے رہتے تھے؟ اسی طرح بادشاہ اپنی بادشاہت چھوڑ جاتے ہیں۔ باقی رہنے والی بادشاہت تو صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہے۔''

اس خفیہ انداز میں ایک دن عشاء کے بعد یہ قافلہ قاہرہ کے قلعے پہنچا۔ پہرے داروں نے روک لیا کہ قلعہ دار سے پوچھے بغیر داخلے کی اجازت نہیں۔ سلطان کو قلعے کے خفیہ دروازے معلوم تھے، اس لیے قلعہ دار کے روکنے کے باوجود اندر داخل ہونا مشکل نہ ہوا۔ سلطان نے دو دن تک خود کو کسی پر ظاہر کیے بغیر امرائے سلطنت اور اپنے ولی عہد کے رنگ ڈھنگ دیکھے۔ جب دیکھا کہ سب لوگ اپنی ذمہ داریاں ٹھیک ٹھاک انجام دے رہے ہیں تو ایک دن منہ اندھیرے امراء کو اپنی شکل دکھادی۔ سب حیران رہ گئے۔ سمجھے کہ بیبرس کے روپ میں کوئی بہروپیا سامنے ہے۔ امراء اپنی تلواریں میان سے نکالنے لگے مگر...... چند لمحوں بعد غور سے دیکھ کر یقین ہو گیا کہ یہ سلطان بیبرس کے سوا کوئی نہیں۔ سب شرمندہ ہو کر آداب بجا لائے۔[1]

بہروپ بھرنے کی وجہ:

مغربی مؤرخین کا کہنا ہے کہ سلطان نے پہلے بیمار اور پھر لاپتا ہو جانے کی یہ چال اس لیے چلی تھی تاکہ اس کی موت کی خبر مشہور ہونے پر شام کے فرنگی سرحدی حملے شروع کر دیں، یوں صلح کا معاہدہ ٹوٹنے کی ابتداء انہی کی طرف سے ہو

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/۵۵ تا ۵۸ ـ ط العلمیة

اور مسلمانوں کو ان کے خلاف جنگ کا جواز مل جائے۔[1]

تاہم یہ محض الزام ہے۔ مسلم مؤرخین کے مطابق سلطان نے ایسا اس لیے کیا تھا تا کہ اپنے امراء اور ولی عہد کی وفاداری دیکھ لی جائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ سلطان کا مقصد کچھ دن فقیر اور گمنام رہ کر اللہ کی نعمتوں پر غور کرنا تھا کہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے۔ اگر وہ چھین لے تو بندہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ سلطان کے اس فقرے سے ظاہر ہے: ''بادشاہ اپنی بادشاہت چھوڑ جاتے ہیں۔ باقی رہنے والی بادشاہت تو صرف اللہ کی ہے۔''[2]

سفرِ حج:

سلطان کی عادت میں آرام نہ تھا۔ حرکتِ مسلسل طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ مصر میں اہم معاملات کا جائزہ لینے کے بعد سلطان نے ایک دن دوبارہ شام کی طرف رختِ سفر باندھا۔ شام پہنچ کر ذوالقعدہ میں یکدم خفیہ طور پر حجاز کا رخ کر لیا اور حج کی سعادت حاصل کی۔[3]

شام میں طوفانی مہمات۔ معرکۂ عکا، معرکۂ حصن الاکراد:

سلطان نے حج سے واپسی کا سفر اتنی سرعت سے کیا کہ ۲ محرم ۶۶۸ھ کو قافلۂ سلطانی دمشق میں داخل ہو چکا تھا۔ لوگ اس تیزی پر حیران رہ گئے۔ سلطان نے یہاں سے سیدھا حلب کا رخ کیا۔ ۳ صفر کو مصر واپسی ہوئی۔

ادھر تاتاریوں اور یورپی حکمرانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی مراسلت جاری تھی۔ سلطان کو اطلاع ملی کہ ہلاکو کے جانشین اباقا کی مدد کے لیے یورپ سے ایک فوج روانہ ہو چکی ہے جسے شام و ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقے سیس (آرمینیا) پہنچ کر تاتاری لشکر کے ساتھ ضم ہونا ہے۔

سلطان نے پھر شام کی طرف باگ پھیر دی۔ ۱۳ ربیع الآخر کو قافلۂ سلطانی دمشق میں تھا۔ اس دوران دوسری خبر ملی کہ تاتاریوں کی مدد کے لیے روانہ ہونے والا یورپی بیڑہ طوفان کا شکار ہو کر تباہ ہو چکا ہے۔ یوں سلطان کو اس جانب سے فرصت مل گئی۔ تاہم اس دوران ایک اور یورپی لشکر عکا کے نواب کی مدد کے لیے آ چکا تھا جس کی وجہ سے وہاں کے عیسائی جری ہو کر وادیٔ عکا میں صف بندی کرنے لگے تھے۔ سلطان نے جنین اور صفد کی فوجوں کو وہاں پہنچنے کا حکم دیا اور خود خفیہ طور پر دمشق سے نکل کر اچانک عکا کے سامنے آ کر ان فوجوں کی قیادت سنبھال لی۔[4]

عکا کے فرنگی سلطان کی آمد کی خبر پا کر گھبرا گئے۔ سلطانی افواج نے چند جھڑپوں میں ان کے چھکے چھڑا دیے اور اہلِ عکا لاشوں کے ڈھیر چھوڑ کر قلعہ بند ہو گئے۔ سلطان نے گرد و نواح میں مزید چھاپہ مار کارروائیاں کیں۔ پورے شام کا ایک طوفانی دورہ کیا۔ کسی کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ سلطان کا رخ کس سمت ہے۔ کسی جگہ ایک دو دن سے زیادہ قیام نہ ہوتا۔ سلطان نے ایک دن صفد میں گزارا، وہاں عکا کے مقتول نائٹوں کے سروں کی نمائش کی۔ پھر دمشق آ کر فاتح

---

(1) The Crusades by Harold Lamb:p:351 (2) السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۵۷/۲، ط العلمیۃ

(3) نہایۃ الارب: ۱۶۷،۱۶۶/۳۰، ط دار الکتب والوثائق القومیۃ قاہرہ (4) السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۶۳،۶۳/۲

جرنیلوں کو خلعتیں دیں۔ اگلے دنوں یکدم سلطان کو پہلے "حماۃ" اور پھر "کفر طاب" میں دیکھا گیا۔ سلطان نے فوج کو واپس چھاؤنیوں کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اب ساتھ حشم و خدم تھے نہ ساز و سامان۔ ایک دستے کے ساتھ سلطان نے شدید سردی کے موسم میں ناقابلِ تسخیر حصن مرقب پر دو مرتبہ دھاوا بولا تاہم بارش اور برف باری کی وجہ سے قلعہ سر نہ ہو سکا۔

۳ جمادی الآخرہ کو سلطان نے دو سو سپاہیوں کے ساتھ اپنا رخ بدلا۔ ایک جگہ خیمے لگا کر صرف چالیس چیدہ سواروں کو ساتھ لیا اور یکدم ٹیمپلرز کے سب سے مضبوط مرکز "حصن الاکراد" پر دھاوا بول دیا۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع تھا اور اس کے گرد تین فصیلوں نے اسے ناقابلِ تسخیر بنا رکھا تھا۔ یہ انتہائی عظیم الشان، مستحکم اور بلند و بالا ہے کہ آج بھی اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اسے ٹیمپلرز نے پہلی صلیبی جنگ کے بعد تعمیر کیا تھا۔ اپنے قیام کی ایک صدی میں یہ کبھی فتح نہیں ہوا تھا۔ سلطان صلاح الدین کی فوجیں بھی اسے سر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔

سلطان بیبرس نے قلعے کے سامنے کھڑے ہو کر بار بار حریف کو للکارا۔ جنگجو ٹیمپلرز یہ برداشت نہ کر سکے اور قلعے سے نکل کر خندق عبور کر کے سلطان کے سامنے آ گئے۔ سلطان نے شیر کی طرح حملہ کیا اور کئی کو کاٹ کر رکھ دیا۔ باقی الٹے پاؤں بھاگے مگر بدحواسی کے باعث زیادہ تر خندق میں جا گرے۔ سلطان نے حریف کا مذاق اڑاتے ہوئے آواز لگائی: "فرنگی صاحبان کے لیے راستہ چھوڑ دو۔ انہیں باہر آنے دو۔ ہم صرف چالیس سوار ہیں۔"

مگر کوئی سامنے نہ آیا۔ سلطان نے اپنی قوت کا سکہ جمانے کے بعد فوراً دمشق واپسی ضروری سمجھی کیوں کہ یورپ کی سمت سے کچھ نہایت تشویش انگیز خبریں مل رہی تھیں۔ [1]

شاہانِ یورپ آٹھویں صلیبی جنگ کے لیے روانہ:

سلطان کی تازہ فتوحات خصوصاً فتح انطاکیہ نے پاپائے روم اور شاہِ فرانس لوئیس نہم کو مضطرب کر دیا تھا۔ چنانچہ یورپ میں آٹھویں صلیبی جنگ کی تیاری ہو رہی تھی کہ بڈھا لوئیس نہم ایک بار پھر عالمِ اسلام کو فتح کرنے کا خواب دیکھتے ہوئے پادریوں کی نیک تمناؤں اور راہبوں کی دعاؤں کے ساتھ صلیبی جنگ لڑنے نکل پڑا۔ یہ وہی لوئیس نہم تھا جس نے ۶۴۸ھ میں ساتویں صلیبی جنگ کی قیادت کی تھی اور زندہ گرفتار ہو گیا تھا۔

جاسوس یہ خبریں شام پہنچا رہے تھے کہ اس بار لوئیس کے بھائی شاہِ صقلیہ "چارلس کاؤنٹ آف انجو" کے علاوہ "اراگوان" کا شاہ جان اور "نوارے" کے نائٹ بھی اس جنگ میں شامل ہیں اور ان کے پیچھے شاہِ برطانیہ ایڈورڈ بھی اپنا لشکر لے کر آئے گا۔ سلطان نے ۱۸ جمادی الآخرہ ۶۶۸ھ (۱۲ جنوری ۱۲۷۰ء) کو حصن الاکراد سے دمشق پہنچ کر مخبروں سے خبر وصول کی کہ شاہِ فرانس لوئیس نہم نے یورپی امراء کے ساتھ بحیرۂ روم میں سفر شروع کر دیا ہے مگر معلوم نہیں کہ اس کا ہدف کونسا ساحل ہے۔ سلطان نے یہ خبر سنتے ہی ساحلوں پر بحری فوج کا پہرہ سخت اور جنگی جہازوں کو متحرک کر دیا۔ [2]

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/ ۶۴، ۶۵، ط العلمیۃ ② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۶۶، ط العلمیۃ

باطنی اسماعیلیوں کے خلاف کارروائیاں:

صلیبی لشکر کے پہنچنے سے پہلے سلطان کو ایک اہم ہدف پورا کرنا ضروری تھا، یعنی شام میں سرگرم اسماعیلی گروہ کا خاتمہ۔ یہ لوگ ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کے مددگار ثابت ہوتے رہے۔ ان کی موجودگی میں سلطان کے لیے شام کا دفاع مضبوط رکھنا مشکل تھا۔ اگرچہ شمالی ایران میں واقع باطنیوں کا بڑا مرکز ''الموت'' تاتاریوں کے ہاتھوں ویران ہو چکا تھا مگر شام کے کوہستانی وساحلی علاقوں میں ان کا دوسرا مرکز ''مصیاف'' باقی تھا جہاں ان کا پیشوا نجم الدین حسن براجمان تھا۔ سلطان نے صلیبی لشکر کے پہنچنے سے پہلے اس کے مرکز کی طرف توجہ دی۔ سلطان کے نائبین نے مصیاف کو گھیر لیا اور آخر کار رجب ٦٦٨ھ میں اسے فتح کر لیا۔ نجم الدین حسن گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی عمر ٩٠ سال ہو چکی تھی۔ سلطان نے اسے جاگیر بخش کر گزر بسر کا اچھا انتظام کر دیا۔ اس طرح باطنی گروہ کی طاقت پاش پاش ہوگئی۔ [1]

❁❁❁

آٹھویں صلیبی جنگ

اس دوران سلطان بیبرس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ فرانس سے روانہ ہونے والے صلیبی لشکر کی منزل شام نہیں بلکہ مصر ہے۔ اس بناء پر سلطان نے بڑی تیزی کے ساتھ مصر کا رخ کیا۔ ٢ شوال ٦٦٨ھ (٢٤ مئی ١٢٧٠ء) کو سلطان کا قافلہ مصر میں تھا۔ [2]

تیونس کا معرکہ:

ادھر ہوا یہ کہ لوئیس نہم نے مصر کی کسی بندرگاہ کی بجائے جنگ کے آغاز کے لیے تیونس کے ساحل کو پسند کر لیا۔ عرب مؤرخین اس بارے میں خاموش ہیں کہ شاہِ فرانس نے تیونس کا رخ کیوں کیا؟ قرینِ قیاس یہ ہے کہ اسے منصورہ میں پچھلی بار گرفتار ہونے کی ذلت نہ بھولی تھی اور وہ بیبرس کے ہوتے ہوئے مصر میں کسی فتح کے بارے میں پُرامید نہ تھا۔

تاہم مغربی مؤرخین کچھ مختلف کہانی سناتے ہیں۔ ان کے مطابق سلطان بیبرس نے امیرِ تیونس کو منصوبہ سمجھایا تھا کہ وہ شاہِ فرانس کو گراں قدر تحائف بھیج کر اعتماد میں لے اور اسے یقین دلائے کہ وہ تیونس اس کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہے۔ شاہِ فرانس نے اسی جھانسے میں آکر شام یا مصر کی بجائے ایک قریبی ساحل پر اترنے کو ترجیح دی کیوں کہ اس کی دانست میں وہ یہاں بغیر لڑے قابض ہو سکتا تھا۔ بہرکیف شاہِ فرانس کا یہ فیصلہ بالکل غلط تھا۔

اس کے بیڑے نے ذوالقعدہ ٦٦٨ھ (جولائی ١٢٧٠ء) میں تیونس کے ساحل پر لنگر ڈالا تو اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر اس کے لشکر میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ ناکام محاصرہ کرنے کے سوا وہ کچھ نہ کر سکا اور محاصرے

---

① البداية والنهاية: سنة ٦٦٨هـ

② السلوك لمعرفة دول الملوك: ٢/ ٦٦، ط العلمية

کے دوران ہی بیمار پڑ کر مر گیا۔ ①

شام کا معرکہ:

سلطان بیبرس نے یورپ کی ناکام یلغار سے پورا فائدہ اٹھایا۔ تیونس پر صلیبی حملے نے قاہرہ میں جہاد کا ولولہ تازہ کر دیا تھا۔ سلطان نے لوئیس نہم کی موت کی خبر سنتے ہی پر جوش مسلمانوں کو ساتھ لے کر صفر ۶۶۹ھ میں پھر مصر سے شام کی طرف کوچ کیا اور عسقلان کی باقی ماندہ دیواروں کو مسمار کرا دیا تاکہ فرنگی اسے مورچہ نہ بنا لیں کیوں کہ شاہِ فرانس کی ناکام مہم کی تکمیل کے لیے برطانوی فرمانروا ''ایڈورڈ'' کا بحری بیڑا ساحلِ شام کی طرف آرہا تھا۔

آخر شاہِ برطانیہ نے شام کے ساحلوں پر فوجیں اتار دیں مگر وہ حملے کی جرأت نہ کر سکا۔ ۶۷۰ھ (۱۲۷۲ء) میں اس نے ساحلِ قیساریہ پر صلح کا معاہدہ کر لیا اور صلیبی جنگجو واپس ہو گئے۔ یہ صلیبی جنگوں میں آخری حملہ تھا جو تیونس کے ناکام محاصرے، لوئیس نہم کی موت اور معاہدۂ قیساریہ پر ختم ہو گیا۔ ''سینٹ لوئیس'' کے بعد کسی یورپی بادشاہ کو صلیب کے نام پر ہتھیار اٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اس طرح آٹھویں صلیبی جنگ پر صلیبی جنگوں کا سلسلہ اختتام پذیر ہو گیا۔ ②

عکا کے فرنگیوں نے اس شکست پر مشتعل ہو کر اپنے ہاں قید تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا ہے۔ سلطان نے جواباً قاہرہ میں قید عکا کے تمام نصرانیوں کو جو تعداد میں ایک سو تھے، سزائے موت دے دی۔ یہ ربیع الاول ۶۶۹ھ کا واقعہ ہے۔ ③

❁❁❁

شام کی آخری مہمات

۸ رجب ۶۶۹ھ کو سلطان کا قدم پھر دمشق میں تھا۔ اسلامی افواج کئی حصوں میں بٹ کر ساحل پر پہنچیں اور ''جبلہ''، ''لاذقیہ''، ''مرقب''، ''عرقہ'' اور دوسرے قلعہ بند شہروں پر چھاپے مارتی چلی گئیں۔ پھر افواج نے یکجا ہو کر ''صافیتا'' اور ''مجدل'' کو فتح کر لیا۔ ''طرطوس'' اور ''مرقب'' کے نوابوں نے نصف پیداوار ادا کرنے کے معاہدے پر صلح کر لی۔ ④

حصن الاکراد:

اس کے بعد ۱۹ رجب کو ٹیمپلرز کے ناقابلِ تسخیر مرکز ''حصن الاکراد'' کو گھیر لیا گیا۔ سلطان نے ایک ماہ کے سخت محاصرے اور سنگ باری کے بعد ۱۵ شعبان کو شہر اور ۲۵ شعبان کو قلعہ فتح کر لیا۔ یہاں کے نصرانیوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ گرجے کو جامع مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں ائمہ اور قاضی مقرر کر دیے گئے۔ ⑤

---

① The Crusades by Harold Lamb: p; 351 to 353؛ البدایة والنهایة سنة: ۶۶۸ھ

② The Crusades by Harold Lamb: p; 355, 356

③ البدایة والنهایة: سنة ۶۶۹ھ

④ البدایة والنهایة: سنة ۶۶۹ھ

⑤ البدایة والنهایة: سنة ۶۶۹ھ

قبرص میں اسلامی بحری بیڑہ تباہ:

اسی دوران سلطان کو اطلاع ملی کہ جزیرۂ قبرص کے نصرانیوں نے عکا والوں کی مدد کے لیے بحری بیڑا بھیجا ہے۔ سلطان نے اہلِ قبرص کو سزا دینے کے لیے وہاں ۱۷ بحری جہاز روانہ کیے۔ مگر تقدیر کی بات کہ قبرص کے قریب طوفان کے باعث یہ جہاز آپس میں ٹکرا گئے۔ ۱۴ جہاز تباہ ہوگئے، سینکڑوں مسلمان ڈوب گئے اور بچنے والے ۱۸۰۰ افراد کو قبرص والوں نے گرفتار کرلیا۔ [1]

عکا اور طرابلس پر حملے۔ ماؤنٹ فورٹ کی فتح:

سلطان نے اس ناکامی سے دل برداشتہ ہوئے بغیر پوری تیاری کے ساتھ عکا کے مضافات پر یلغار کی اور یکم شوال تک گردونواح کی ساری بستیوں کو فتح کرلیا۔ [2]

عکا کے سامنے ٹیوٹانک نائٹوں کا مضبوط قلعہ ماؤنٹ فورٹ بھی سر کرلیا گیا۔ [3]

اگلا ہدف طرابلس تھا۔ یہاں کے حاکم افرلیس بوہیمنڈ نے دب کر دس سال کے لیے صلح کرلی۔ واپسی سے پہلے سلطان نے باطنی اسماعیلیوں کا قلعہ "العُلیقہ" فتح کیا اور باطنیوں کو گرفتار کرلیا۔ [4]

سلطان نے قاہرہ واپس پہنچ کر سب سے پہلے قبرص میں غرق ہونے والے بیڑے کا متبادل تیار کرنے پر توجہ دی اور ۱۴ محرم ۶۷۰ھ کو خود ایک نئے جنگی جہاز کو سمندر میں ڈال کر اس کی آزمائش کی۔ [5]

اب سلطان کی شام کی ساحلی مہمات مکمل ہوگئی تھیں۔ اگلے سالوں میں اس کی زیادہ توجہ ترقیاتی کاموں اور تاتاریوں سے نمٹنے پر مرکوز رہی۔ شام کے فرنگی جو ایک محدود پٹی میں سمٹ گئے تھے، اب کسی مزاحمت کے قابل نہ تھے۔ ہیرلڈ لیمب سلطان کی فرنگیانِ شام کے خلاف مہمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"بیبرس کی یہ مہمات بظاہر بے ترتیب اور بے ہنگم دکھائی دیتی ہیں مگر غور سے دیکھنے پر ان کی بنیادی ترتیب اور باقاعدگی واضح ہوجاتی ہے۔ پہلے اس نے ساحلِ فلسطین کو عثلیث کے مضبوط قلعے تک صاف کردیا۔ پھر شمالی شام پر دھاوا بول کر انطاکیہ فتح کرلیا۔ اس طرح وہ زرخیز زمینوں اور شمالی ساحل کے راستے اور مراکز پر قابض ہوگیا۔ پھر اس نے صلیبیوں کے آخری مضبوط قلعوں کو فتح کرکے دامنِ کوہ سے صلیبی قلعوں کا بالکل خاتمہ کردیا۔ آخرکار صلیبیوں کے پاس طرابلس سے عکا تک ایک تنگ سی پٹی رہ گئی۔ صلیبیوں کی پشت پر سمندر تھا اور سامنے اسلامی سلطنت۔ وہ ساحل سے اندرونی علاقوں میں گھسنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کی سلطنت کی چوڑائی اتنی سمٹ چکی تھی کہ صرف آدھ گھنٹے گھڑسواری کے بعد فرنگی سوار خود کو مسلمانوں کے نرغے میں دیکھتے تھے۔" [6]

❁❁❁

---

[1] البدایة والنہایة: ۶۶۹ھ
[2] البدایة والنہایة: ۶۶۹ھ
[3] The Crusades by Harold Lamb: p; 354
[4] البدایة والنہایة: ۶۶۹ھ
[5] البدایة والنہایة: ۶۷۰ھ
[6] The Crusades by Harold Lamb: p; 354

تاتاریوں سے جہاد کا دوسرا دور

فرنگیوں کو نکیل ڈالنے کے بعد سلطان کی پوری توجہ تاتاریوں سے نمٹنے پر مرکوز ہو گئی۔ چند سال قبل اباقا خان نے صلح توڑ ڈالی تھی اور ۶۶۷ھ میں جب سلطان فرنگیوں سے الجھا ہوا تھا، اُس نے سفیر بھیج کر سلطان کو دھمکیاں دی تھیں۔ اس کے سفیر نے سلطان کو اپنے آقا کا زبانی پیغام دیتے ہوئے کہا تھا:

''تم ایک غلام ہو، تمہیں سیواس میں فروخت کیا گیا تھا۔ تم زمین کے بادشاہ کے مقابلے میں کیوں سرکشی کر رہے ہو۔''

اس کے بعد اباقا کا تحریری مراسلہ سنایا گیا جس میں درج تھا:

''خاقان اباقا جب سے مشرق سے نمودار ہوا ہے اس نے تمام ممالک پر غلبہ پالیا ہے۔ کسی نے اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کی۔ جس نے سرکشی کی وہ قتل کر دیا گیا اور ہلاک ہوا۔ اگر تم آسمان پر چڑھ جاؤ یا زمین میں چھپ جاؤ تب بھی ہم سے نہیں بچ سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم سے صلح کر لو۔''

سلطان نے اس مراسلے کو گیدڑ بھبکی سے زیادہ حیثیت نہ دی۔ حریف کی جانب سے از خود صلح کی پیش کش یہ ظاہر کر رہی تھی کہ سلطان کی قوت تسلیم کی جاچکی ہے۔ مگر اس وقت سلطان کی فرنگیوں سے جنگیں جاری تھیں، اس لیے تاتاریوں سے فوراً جنگ چھیڑنا مناسب نہ تھا۔ بہرکیف سلطان نے مختصر مگر واضح جواب دے کر سفیر کو واپس کر دیا۔[1]

سلطان نے اپنے جواب میں کہا تھا:

''ہم عراق، الجزیرہ اور ایشیائے کوچک کے ان تمام شہروں کی بازیابی چاہتے ہیں جن پر تاتاری قابض ہیں۔''

یہ واقعہ ۶۶۷ھ کا تھا۔[2] اب ۶۷۰ھ میں سلطان کو فرنگیوں کی مہمات سے فراغت مل چکی تھی۔

تاتاریوں کی پیش قدمی اور واپسی:

ادھر تاتاریوں کی نئی پیش قدمی کی اطلاعات تھیں۔ ایل خانی حکمران اباقا اپنے باپ ہلاکو خان کے اہداف پورے کرنا چاہتا تھا۔ تاتاریوں کے حلیف دس ہزار رومیوں نے ''عین تاب''، ''قسطون''، ''حارم''، ''قاقون'' اور ''انطاکیہ'' تک پہنچ کر لوٹ مار کی تھی۔ خوف کے باعث سرحداتِ عراق و شام سے لوگ نقل مکانی کر کے وسطی شام کی طرف آرہے تھے۔ ان حالات میں محرم ۶۷۰ھ کے اواخر میں سلطان کا لشکر شمالی شام پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر تاتاری اور رومی دونوں اپنے اپنے علاقوں کی طرف پسپا ہو گئے۔ سلطان نے اپنے امراء کو سخت تنبیہ کی کہ انہوں نے اپنے علاقوں کی حفاظت کی ذمہ داری پوری طرح کیوں نہ نبھائی۔[3]

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/۵۵،۵۶، ط العلمیة
② ذیل مرآة الزمان: ۲/۴۰۷، ط دار الکتاب الاسلامی
③ البدایة والنهایة: سنة ۶۷۰ھ

امیر قلاوون کے ہاتھوں تاتاریوں کو شکست:

اگلے سال تاتاریوں نے پھر یلغار کی اور البیرہ کا رخ کیا۔ سلطان نے خبر ملتے ہی ۴ صفر ۶۷۰ھ کو قاہرہ سے دمشق پہنچ کر فیصلہ کن مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ آخر ایک بھاری لشکر تیار ہو کر عراق کی طرف روانہ ہوا۔ ۵ جمادی الاولیٰ کو سلطان کے دستِ راست امیر سیف الدین قلاوون نے افواج سمیت دریائے فرات عبور کر لیا۔ تاتاریوں کی ایک فوج دریا کے پار مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لیے کھڑی تھی۔ دوسری البیرہ شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ قلاوون پہلے دریا عبور کر کے تاتاریوں سے نبرد آزما ہوا اور اس کے ایک بازو کو روند کر رکھ دیا۔ تاتاری سپہ سالار زخمی ہوا اور بمشکل جان بچا کر وہاں سے نکل پایا۔ لشکرِ اسلام نے اب البیرہ کا رخ کیا۔ یہ اطلاع ملتے ہی تاتاری بھاگ کھڑے ہوئے۔ سلطان نے البیرہ پہنچ کر سرحدی انتظامات کو مزید مضبوط بنایا۔ اس دوران شام میں باطنی اسماعیلیوں کی سرکوبی جاری تھی اور ان کے آخری تین قلعے: ''قدموس''، ''کہف'' اور ''مَنِیقہ'' بھی سر کر لیے گئے۔ یہ مہمات جمادی الآخرہ میں مکمل ہوئیں۔ لشکرِ سلطانی تاتاری قیدیوں کے ایک گروہ کے ساتھ دمشق واپس پہنچا تو اس کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ ①

سلطان بیبرس کی دوبارہ دمشق آمد:

صفر ۶۷۲ھ میں سلطان کو دوبارہ دمشق میں دیکھا گیا کیوں کہ ہلاکو خان کا بیٹا اباقا خود ایران سے لشکر لے کر بغداد آ گیا تھا۔ سلطان نے مصر سے مزید افواج منگوالیں۔ مسلمانوں کی ان تیاریوں کی خبریں ملنے پر تاتاریوں کو پیش قدمی کی ہمت نہ ہوئی۔ ②

اباقا خان کی سفارت برطانیہ میں:

اباقا خان اب یورپی بادشاہوں کو ساتھ ملا کر ایک فیصلہ کن جنگ چھیڑنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ اس نے اپنے سفیر پوپ کے پاس بھیجے۔ پھر سفیر برطانیہ کے فرمانروا شاہ ایڈورڈ سے ملے جو چند سال قبل فلسطین میں سلطان بیبرس سے شکست کھا چکا تھا۔ سفیروں نے شاہ ایڈورڈ کو اباقا خان کا مراسلہ پیش کیا جس میں شاہ کو فلسطین کی فتح کے لیے باہمی معاہدے کی پیش کش کی گئی تھی۔ مگر یہ سفارت بے سود ثابت ہوئی۔ شاہ ایڈورڈ ان دنوں اپنی سلطنت کے اندرونی مسائل میں بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ اگرچہ فلسطین پر قبضے کی تمنا اس کے دل سے محو نہیں ہوئی تھی مگر وہ داخلی مشکلات کے باعث اباقا خان کی پیش کش کا کوئی مثبت جواب نہ دے سکا۔ اس نے جوابی مکتوب میں لکھوایا:

''یروشلم کو نصرانیت کے دشمنوں سے نجات دلانے کا ارادہ بہت مبارک ہے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ تاہم ابھی ہم حتمی طور پر بتا نہیں سکتے کہ ہم کب تک فلسطین آئیں گے۔''

یہ واقعہ ۶۷۳ھ (۱۲۷۴ء) کا ہے۔ ③

---

① البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۷۱ھ ② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۷۲ھ

③ The Crusades by Harold Lamb: p; 355, 356

ہیرلڈ لیمب اس سفارت کی ناکامی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''حالات کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ جب یورپ کے نصرانی حکمران اپنے اپنے ملکوں کے اندرونی تنازعات میں مصروف تھے اور انہیں صلیبی جنگوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، اس وقت تاتاری مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ اور یروشلم کو مسلمانوں سے بازیاب کرانے کے لیے کمربستہ تھے۔''[1]

سرحداتِ ایشیائے کوچک پر دھاوے:

شعبان ۶۷۳ھ میں سلطان نے مصر سے ایک طویل سفر شروع کیا اور شمالی شام کے آخری کونے میں ایشیائے کوچک تک یلغار کی اور سیس، مصیصہ اور اذنہ کے دشوار گزار علاقے فتح کیے۔ یہ مہم رمضان کے آخری عشرے میں شروع ہو کر دو ماہ جاری رہی۔ ذوالحجہ میں سلطان کی دمشق واپسی ہوئی۔[2]

تاتاریوں کا البیرہ پر ایک اور ناکام حملہ:

تاتاری ایک بار پھر یلغار کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جمادی الآخرہ ۶۷۴ھ میں انہوں نے رومیوں کو ساتھ ملا کر البیرہ پر پھر حملہ کیا۔ اس لشکر میں ۱۵ ہزار تاتاری اور ۱۵ ہزار رومی تھے۔ ۲۳ منجنیقوں کے ساتھ شہر پر سنگ باری شروع کی گئی۔ مگر البیرہ کی فوج بلند ہمت تھی۔ ان کے چھاپہ مار دستوں نے شب خون مار کر سینکڑوں دشمنوں کو ہلاک کر دیا، رسد لوٹ لی اور منجنیقوں کو خاکستر کر دیا۔ تاتاریوں کی طرف سے نصب کی گئی ایک یورپین منجنیق پر ایک ماہرِ فن مسلمان تعینات تھا۔ وہ جبراً وقہراً ان کفار کے ساتھ چلا آیا تھا مگر دل سے اسلام کا حامی تھا۔ البیرہ کا ایک سپاہی فصیل پر منجنیق لگا کر تاتاریوں کی یورپی منجنیق تباہ کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر نشانہ درست نہیں بیٹھتا تھا۔ آخر تاتاریوں کے منجنیق انداز نے چیخ کر کہا: ''اگر اللہ تیرا ایک بازو توڑ دے تو البیرہ والوں کو تجھ جیسے اناڑی سے نجات مل جائے۔''

دیکھنے میں یہ بددعا تھی مگر حقیقت میں فنِ سنگ اندازی کا ایک باریک رمز تھا۔ البیرہ کا منجنیق والا سمجھ گیا کہ زاویے کو ایک ہاتھ کم کر کے نشانہ لگانا چاہیے۔ اس نے ایسا کیا تو نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا اور تاتاریوں کی منجنیق ٹوٹ گئی۔[3]

تاتاری اور رومی گیارہ دن کے محاصرے کے بعد ۱۹ جمادی الآخرہ ۶۷۴ھ کو ناکام و نامراد واپس لوٹ گئے۔

اس سے پہلے سلطان نے حریف کو گھیرنے کے لیے البیرہ کی طرف کوچ کر دیا تھا مگر جب اطلاع ملی کہ دشمن واپس چلا گیا ہے تو لشکر کو قاہرہ واپسی کا حکم دے دیا۔[4]

ایشیائے کوچک پر اباقاخان کا تسلط:

تاتاریوں کا رُخ اب ایشیائے کوچک کی طرف ہو گیا جہاں کےخسرو ثالث بن قلیج ارسلان چہارم تخت نشین تھا جس

---

① The Crusades by Harold Lamb:p:356

② البدایة والنهایة :سنة ۶۷۳ھ

③ تاریخ الملک الظاهر از عزالدین محمد ابن شداد (م ۶۸۴ھ)، ص ۱۲۷، ناشر Franz steinerVerlag, 1983

④ البدایة والنهایة :سنة ۶۷۳ھ

کا دور ۶۶۳ھ سے ۶۸۱ھ تک رہا۔ وہ کم سن، نا تجربہ کار اور کمزور حکمران تھا، اس لیے اباقا خان نے آسانی سے ایشیائے کوچک کے بڑے حصے پر تسلط حاصل کرلیا اور سلجوقی حکمران کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔ ①

افریقہ میں فتوحات:

اسی سال سلطان کے مصری لشکر نے افریقہ میں فتوحات حاصل کیں۔ سوڈان اور بلاد النوبہ کے علاقے مدتِ دراز بعد مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ یہاں کا بادشاہ گرفتار ہوا اور باشندوں پر جزیہ عائد کر دیا گیا۔ اس طرح سلطنتِ ممالیک بے حد وسیع ہوگئی۔ ②

ایک تاریخی جنگ۔ معرکہ بلستین:

۱۳ محرم ۶۷۵ھ کو سلطان کو پھر دمشق میں دیکھا گیا۔ یہاں سے لشکرِ سلطانی حلب کی سمت روانہ ہوا تاکہ ارمنی نصرانیوں کو تاتاریوں کا ساتھ دینے کی سزا دی جائے۔ اس فوج نے رومیوں کے سرحدی دستوں کو روندا اور بڑی تعداد میں رومی گرفتار کیے۔ ان میں سے بہت سے قیدی مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

۱۲ ربیع الآخر کو سلطان نے حلب میں اپنے ولی عہد الملک السعید کی شادی، سلطنت کے مایہ ناز امیر سیف الدین قلاوون کی صاحبزادی سے کرائی۔ شوال میں قافلۂ سلطانی دمشق میں تھا۔

سلطان نے تاتاریوں سے ایک فیصلہ کن ٹکر لینے کی ٹھان لی تھی۔ اوائلِ ذوالقعدہ میں حلب پہنچ کر لشکر نے جنگ کی تیاری کی اور بڑی تیزی سے دربند کی گھاٹیاں عبور کرلیں جو تاتاریوں کی سرحد تھیں۔

یہاں ۹ ذوالقعدہ کو تاتاریوں کے ہراول دستے سے ٹکر ہوئی جو تین ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ سلطان کے امیر سنقر اشقر نے انہیں بری طرح شکست دی، مگر اصل تاتاری لشکر جس میں گیارہ ہزار سوار تھے، پیچھے آرہا تھا۔ سلطانی لشکر پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے ''بلستین'' کے میدان میں اتر گیا۔ رومی بھی تاتاریوں کا ساتھ دینے چلے تھے مگر پھر سلطان کو آتا دیکھ کر واپس ہوگئے۔ تاتاریوں نے سلطان کو مدِ مقابل دیکھ کر بڑے جوش وخروش سے حملہ کیا۔ زیادہ دباؤ مسلمانوں کے بائیں بازو پر تھا جو اس حملے سے سنبھل نہ سکا۔ صفیں درہم برہم ہوئیں تو سلطان کا نشانِ شاہی بھی جگہ سے ہٹنے لگا۔ تاتاریوں نے دھاوا بول کر صفوں کو چیر دیا اور پھر دائیں بازو پر حملہ کر دیا۔ یہ حالت دیکھ کر سلطان نے اپنے خاص دستے کے ساتھ دائیں بازو کی مدد کے لیے جانا چاہا، مگر مڑ کر دیکھا تو بایاں بازو بھی تباہ ہونے کو تھا۔ سلطان نے امراء کی ایک جماعت کو اس کی مدد کے لیے بھیجا اور کچھ دیر بعد از سرِ نو پورے لشکر کو منظم کر کے یک بارگی حملہ کیا۔

تاتاری مسلمانوں کا دباؤ دیکھ کر گھوڑوں سے اتر کر پاپیادہ لڑنے لگے۔ فریقین نے جنگ جوئی کی انتہاء کر دی۔ آخر اللہ کی مدد نازل ہوئی اور تاتاری ہر طرف سے گھر گئے۔ مسلمانوں نے ان کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ سینکڑوں تاتاری قیدی بھی بنے۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کے نامی گرامی امراء نے دادِ شجاعت دی اور شہید ہوئے۔

---

① ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: سنۃ ۶۷۳ھ

② تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۲۸، ط نزار

مسلمانوں کا فتح مند لشکر ساحلِ بحیرۂ روم کے ساتھ ساتھ واپس ہوا تو رومیوں نے ان کے خوف سے قیساریہ خالی کردیا۔ سلطان نے بغیر لڑائی کے اسے فتح کرلیا اور ۱۷ ذوالقعدہ کو وہاں نماز جمعہ ادا کی۔

لشکرِ اسلام کے ساحل کی جانب واپس ہونے کے بعد تاتاری خاقان اباقا بھیس بدل کر خود میدانِ جنگ آیا۔ اپنے لشکر کا یہ حشر دیکھ کر وہ صدمے سے بے حال ہوگیا۔ اس نے طیش کے عالم میں ''قیساریہ'' اور ''ارزن الروم'' کے لوگوں کا قتل عام شروع کرادیا اور لگ بھگ دو لاکھ انسانوں کو موت کی نیند سلادیا۔

اُدھر فتح کے بعد لشکرِ سلطانی دمشق پہنچ چکا تھا۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ اباقا خود میدانِ جنگ تک آیا ہے۔ سلطان نے لشکر مرتب کر کے اباقا سے براہِ راست دو دو ہاتھ کرنے کے لیے فوج کو دوبارہ کوچ کا حکم دے دیا تھا۔ مگر اسی دوران مخبروں کی طرف سے تازہ ترین خبر ملی کہ اباقا مشرقی ممالک کو لوٹ گیا ہے۔ اس پر کوچ کا حکم روک دیا گیا۔ [1]

❁❁❁

سلطان کی وفات

سلطان کے خلاف زیرِ زمین سازشیں شروع ہوچکی تھیں۔ سلطان نے کئی بار بروقت ان کا تدارک کیا اور ذمہ داروں کو سزائیں دیں۔ ۶۷۳ھ میں مصر میں قیام کے دوران کئی ایسے امراء پکڑے گئے جو تاتاریوں کو اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے انہیں شام اور مصر پر حملے کی دعوت دے رہے تھے۔ سلطان نے انہیں قتل کرادیا۔ [2]

اچانک موت کا سبب:

دمشق واپسی پر سلطان کی امرائے شام سے ملاقاتیں جاری تھیں جو تاتاریوں کے خلاف فتح کی مبارک باد دینے آرہے تھے۔ ایسی ہی ایک مجلس میں ۱۴ محرم ۶۷۶ھ کو سلطان نے کوئی مشروب پی لیا۔ مجلس ختم ہوتے ہی سلطان کا بدن دکھنے لگا۔ صبح کو قے شروع ہوگئی۔ اس وقت طبیب سے پوچھے بغیر کوئی دوا لے لی جس سے طبیعت مزید بگڑ گئی۔ آخر اطباء آئے اور معاینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ معدے میں زہر پھیل گیا ہے۔ مسہل دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس لیے اسہال کی دوا دی گئی مگر اس سے کمزوری بہت بڑھ گئی، بخار نے جکڑ لیا اور منہ سے خون آنے لگا۔ اسی بیماری میں آخر سلطان بیبرس نے ۲۷ محرم ۶۷۶ھ کو وفات پائی۔

سلطان کی تدفین دمشق میں ہوئی۔ عمر تقریباً ۵۱ سال تھی۔ وفات کی خبر کو خفیہ رکھا گیا۔ جب قاہرہ میں سلطان کے بیٹے الملک السعید کے ہاتھ پر بیعت کی تکمیل ہوچکی تب سلطان کی وفات کا اعلان کیا گیا۔ [3]

---

① البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۷۵ھ

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۶۷۳ھ

③ تاریخ الملک الظاہر از ابن شداد، ص ۲۲۳ تا ۲۲۵؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک مقریزی: سنۃ ۶۷۶ھ

سلطان کی موت کے متعلق ایک کمزور روایت:

سلطان کی موت کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے ایوبی خاندان کے شہزادے الملک القاہر بن الملک المعظم عیسیٰ کو قتل کرانے کے لیے زہریلے مشروب کا پیالہ اسے پیش کیا۔ کچھ دیر بعد سلطان نے بھول کر خود بھی اسی پیالے سے مشروب نوش کرلیا۔ دونوں فوراً بیمار پڑ گئے۔ الملک القاہر نے اسی شب دم توڑ دیا اور سلطان نے کچھ دنوں بعد۔ یہ روایت حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی کسی جرح کے بغیر نقل کردی ہے تاہم اسے قبول کرنا محلِ نظر ہے کیوں کہ:

❶ الملک القاہر سے سلطان کا کوئی عناد نہ تھا۔ عقلی لحاظ سے مشکل معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے ایسے بے ضرر انسان کو بھری محفل میں زہر پلانے کی کوشش کی ہو۔

❷ اگرچہ قضاوقدر کے تحت موت کا کوئی بھی بہانہ بننا محال نہیں مگر سلطان جیسے ہوشیار شخص سے یہ بعید ہے کہ وہ اسی پیالے سے پی لے جس میں اسی کے حکم سے زہر ملایا گیا ہو۔

❸ سلطان کے دونوں ہم مجلس سوانح نگاروں: عزالدین ابن شداد اور علامہ محی الدین نے اپنی تواریخ میں سلطان کی وفات کی وجہ مرض ہی بتائی ہے۔ زہر خورنی کے مذکورہ واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

اگر موت کی وجہ واقعی زہر خورنی تھی تو پھر قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ کسی دشمن نے سلطان کو قتل کرنے کے لیے مشروب میں زہر ملایا ہوگا، کیوں کہ امراء میں سلطان کے مخالف موجود تھے جو اس سے پہلے چند بار سلطان کو قتل کرکے تختہ الٹنے کی کوشش کر چکے تھے۔ یہ حرکت انہی کی ہوگی۔ سلطان کو معلوم نہ تھا کہ پیالے میں زہر ہے۔ چنانچہ اکرام کے طور پر زہریلے مشروب والا اپنا خاص پیالہ پہلے مہمان کو تھمادیا اور پھر اسی بے خبری میں اس سے خود بھی نوش کرلیا۔ اس طرح پہلے مہمان اور پھر سلطان راہی آخرت ہوگئے۔ واللہ اعلم

سلطان بیبرس مؤرخین کی نظر میں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سلطان کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الملک الظاہر تیز فہم، دلیر، بلند ہمت اور گہری طبیعت کا مالک تھا۔ مملکت کے لیے فکر مند رہنے والا، اسلام کا ہمدرد اور حاکمانہ صفات سے آراستہ تھا۔ اسلام اور اہلِ اسلام کی نصرت جیسے کارِ خیر اس کا ہدف تھے۔''

پھر وہ اس کی فتوحات اور تعمیری کارناموں کا ذکر کرکے لکھتے ہیں:

''اس نے جہاد فی سبیل اللہ میں مشغولیت کے باوجود ایسی اچھی یادگاریں اور عمارتیں پیچھے چھوڑیں جو خلفاء اور بنوایوب کے دور میں بھی تعمیر نہ ہوئی تھیں۔ اس نے بھاری فوج بھرتی کی اور تین ہزار تاتاریوں کو بھی جو اس کے پاس آئے، جاگیریں اور ملازمتیں دیں۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں میانہ رو تھا اور یہی حال اس کی فوج کا تھا۔ اسی نے دولتِ عباسیہ کو اس کے مٹ جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا حالانکہ تین سال تک مسلمان بغیر خلیفہ کے رہے تھے۔ اس نے ہر مذہب کے مطابق الگ الگ قاضی القضاۃ مقرر کیے۔ وہ بیدار مغز، دلیر اور بہادر تھا۔ وہ

دشمنوں سے دن رات نمٹ کر بھی تھکتا نہ تھا۔ بلکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کا مدِ مقابل اور ان کی جمعیت واتحاد کو پارہ پارہ کرنے والا تھا۔ مختصر یہ کہ اللہ نے اس پچھلے دور میں اسے اسلام اور مسلمانوں کی مدد کے لیے کھڑا کیا تھا۔ وہ بے دینوں یعنی فرنگیوں، تاتاریوں اور مشرکین کے گلے میں ہڈی بنا ہوا تھا۔ اس نے مے نوشی بند کرادی تھی اور فاسقوں کو شہر بدر کر دیا تھا۔ وہ برائی اور فساد میں سے کوئی بھی چیز دیکھتا تو پوری قوت کے ساتھ اسے ختم کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے تین بیٹے اور سات بیٹیاں چھوڑیں۔ اس کی عمر ۵۰ سے ۶۰ سال کے درمیان تھی۔''[1]

علامہ مقریزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اللہ نے لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈال دی تھی کہ دشمنوں کو بھگانے میں سلطان تنہا ہی کئی لشکروں کے برابر ہے۔ اور اس کا نام ہی دشمنوں کو ہر طرف سے پسپا کر دیتا ہے۔''[2]

❁❁❁

تعمیری وترقیاتی کام

سلطان بیبرس نے صرف جہاد ہی نہیں کیا بلکہ اپنے دورِ حکومت میں بے پناہ ترقیاتی کام بھی کرائے اور بلاشبہ اس کی سخت ضرورت بھی تھی کیوں کہ تاتاریوں اور صلیبیوں کے حملوں نے عالم اسلام کے بہت سے شہروں کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ بہت سے آباد شہروں میں ہنگامی حالات کی وجہ سے برسوں سے ترقیاتی کام نہیں ہوئے تھے۔ کتنی ہی قدیم عمارتوں یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ کو بھی تعمیر ومرمت کی ضرورت تھی۔ بیبرس نے ان تمام ضروریات پر توجہ دی۔

اہم تعمیرات کی مہم:

حکمرانی کے پہلے ہی سال ۶۵۹ھ میں اس نے امرائے سلطنت کی کئی الگ الگ جماعتیں بنا کر کثیر الہدف ترقیاتی کاموں کی مہم شروع کی۔ اس مہم کے اہم اہداف درج ذیل تھے:

❁ مسجدِ نبوی کی تعمیرِ نو

❁ بیت المقدس کی تعمیرِ نو

❁ مصر کے اہم مورچے ''قلعۃ الروضہ'' کو جو گزشتہ جنگوں میں منہدم ہو چکا تھا، از سرِ نو تعمیر کرانا

❁ الجیزہ میں دریائے نیل پر پلوں کی تعمیر

❁ اسکندریہ شہر کی فصیلوں کی از سرِ نو تعمیر

❁ بحیرۂ روم کے ساحل ''الرشید'' پر ایک فلک بوس مینار کی تعمیر: تاکہ صلیبی جہازوں پر نگاہ رکھی جائے

---

① البدایة والنہایة: ۶۷۶ھ

② السلوک لمعرفة دول الملوک: ۶۴/۲، ط العلمیة

◉ دمیاط کی بحری خلیج کا دہانہ تنگ کرنے کا محیر العقول منصوبہ: تاکہ فرنگیوں کے جہاز شہر کے قریب نہ آنے پائیں۔
◉ شام میں درج ذیل قلعوں کی مرمت اور استحکام ...... قلعہ دمشق، قلعہ الصلت، قلعہ عجلون، قلعہ صرخد، قلعہ بصریٰ، قلعہ شیزر، قلعہ صلیبیہ، قلعہ شمیمیش، قلعہ حمص۔ ان تمام قلعوں کی فصیلیں مضبوط کی گئیں، خندقیں صاف کی گئیں، برج مضبوط اور بلند کیے گئے اور ہر ایک میں حسب ضرورت سپاہی تعینات کر کے اسے اناج اور اسلحے سے بھر دیا گیا۔
◉ عین جالوت کے میدان میں فتح کی یادگار کی تعمیر
◉ شام کے کاشت کاروں کو خوشحال بنانے کے لیے ان میں اناج کی تقسیم

ان مقاصد کے لیے بیبرس نے بے پناہ سرمایہ فراہم کیا۔ یہ منصوبے کئی سالوں میں مکمل ہوئے۔ [1]

مواصلات میں ترقی۔ بحری جہازوں کی صنعت:

ڈاک اور خبر رسانی کا تیز ترین نظام بنایا، جس کی رفتار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قاہرہ کے قلعۃ الجبل میں قائم دفترِ برید سے بھیجا گیا رقعہ چار دن میں دمشق پہنچ جاتا تھا۔ ہر ہفتے دو بار شام کی خبریں مصر اور مصر کی شام پہنچ جاتی تھیں جبکہ یہ کم از کم دس دن کا سفر تھا۔ بحری طاقت کو بڑھایا گیا۔ جنگی جہازوں کی صنعت کا کام تیز کیا گیا۔ بیبرس کے نزدیک بحری فوج کی اہمیت اتنی تھی کہ وہ خود جہاز سازی کے کارخانوں میں جا کر اپنی نگرانی میں یہ کام کراتا تھا۔ [2]

خلیج اسکندریہ کی کھدائی:

خلیجِ اسکندریہ میں پانی کم ہو گیا تو سلطان نے بڑے اہتمام سے اس کی کھدائی کرا کے اسے پھر سے جہاز رانی کے قابل بنوا دیا۔ [3]

پُل اور قصرِ ابلق:

۶۶۵ھ میں ''بیسوس'' کے قریب ''بحیرۂ ابی المنجا'' پر ایک پل بنوایا جو اپنے زمانے کا عظیم ترین پل شمار ہوتا تھا۔ دمشق کے میدانِ اخضر کے ساتھ نہر بردی کے کنارے سفید اور سیاہ سنگِ مرمر کا ایک عظیم الشان محل بنوایا جو ''قصرِ ابلق'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے چاروں طرف باغات اور نہروں کا حلقہ تھا۔ یہ محل ۶۶۵ھ میں تعمیر ہوا۔ ڈیڑھ صدی تک پورے شام میں ایسی خوش منظر عمارت اور کوئی نہ تھی۔ ۸۰۳ھ میں تیمور لنگ نے اسے تباہ کر دیا۔ [4]

الظاہریہ کی بنیاد:

شام میں سدیر کے قریب عباسیہ نامی ایک قصبہ تھا۔ سلطان نے اس کے پاس ''الظاہریہ'' کے نام سے ایک اور بستی آباد کی جس میں ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی۔ [5]

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک سنۃ ۶۵۹ھ
② السلوک لمعرفۃ دول الملوک سنۃ ۶۶۰ھ
③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۷/۲، ط العلمیۃ
④ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۳۵/۲، ط العلمیۃ
⑤ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۳۸/۲، ط العلمیۃ

مسجد نبوی کی تعمیر نو:

مسجدِ نبوی کی آخری توسیع وتجدید دوسری صدی ہجری کے وسط میں خلیفہ مہدی نے کی تھی۔ عمارت پانچ صدیوں سے وہی چلی آرہی تھی۔ ۶۵۵ھ میں آتش فشاں لاوے سے مسجد کی چھت جل گئی تھی۔ خلیفہ مستعصم کو تاتاری طوفان سے سابقہ پڑنے کے باعث اِدھر توجہ کا موقع نہ ملا۔ بعد میں سلطان سیف الدین قطز نے ۶۵۸ھ میں ایک وسیع منصوبے کے تحت مسجد کی تعمیر نو شروع کرائی جس کی تکمیل سلطان بیبرس نے کرائی۔ انجینئر، بڑھئی، معمار، نقاش اور دوسرے ماہرینِ فنون کی ایک جماعت تمام ساز وسامان کے ساتھ سمندری راستے سے مدینہ روانہ کی، چھت از سرِ نو بنائی گئی اور مسجد کو ہر لحاظ سے خوبصورت بنا دیا گیا۔ [1]

روضۂ اطہر کے گرد جالی:

۶۶۷ھ میں سلطان نے روضۂ اقدس کی حفاظت اور احترام کے پیشِ نظر اس کے گرد پہلی بار جالی دار دھاتی احاطہ کھینچا جو تقریباً بارہ فٹ بلند تھا۔ [2]

حرمین شریفین کی خدمت:

مدینہ منورہ کے باشندوں اور زائرین کے لیے ایک بڑا شفاخانہ قائم کیا جس میں مریضوں کا بالکل مفت علاج ہوتا تھا۔ مسجد الحرام اور مسجد النبوی میں روشنی کے لیے ہر سال بھاری مقدار میں شمعیں اور چراغوں کے لیے زیتون کا تیل بھیجا جاتا تھا۔ حرمین کے فقراء اور غریبوں کے لیے گندم کی بہت بڑی کھیپ بھی ہر سال بھیجی جاتی تھی۔ [3]

مدرسہ ظاہریہ:

سلطان نے قاہرہ میں ایک نئی درسگاہ مدرسہ ظاہریہ کی بنیاد ڈالی۔ اس میں حنفی وشافعی علماء وفقہاء کو برابر مناصب دیے۔ ۵ صفر ۶۶۱ھ کو اس کی افتتاحی تقریب ہوئی جس کی شان وشوکت دیکھ کر ایک شاعر نے کہا:

اَلَا ھٰکَذَا یَبْنِی الْمَدَارِسَ مَنْ بَنیٰ...... وَمَنْ یَتَعَالیٰ فِی الثَّوَابِ وَفِی الثَّنَا

سنو! مدارس بنانے والے اور ثواب وستائش میں بلند مرتبہ پانے والے اس طرح مدرسے بنایا کرتے ہیں۔ [4]

مسجد ''جامع الازہر'' کی تجدید، جامعۃ الازہر کی تاسیس:

بنوعبید کی قائم کردہ مسجد ''جامع الازہر'' قاہرہ کی پہلی مسجد تھی جسے جوہر عبیدی نے تعمیر کرا کے یہاں نمازِ جمعہ شروع کرائی تھی۔ ایک مدت تک یہ رفض کے فروغ کا مرکز بنی رہی۔ حاکم عبیدی نے جب نئی جامع مسجد بنوائی تو نمازِ جمعہ وہیں ہونے لگی، جامع الازہر ویران ہوگئی۔

---

[1] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۱/ ۵۶۲ ؛ تاریخ المکۃ المشرفۃ والمدینۃ الشریفہ لابن ضیاء، ص ۲۸۹، ط العلمیۃ

[2] وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ للسمہودی (م ۹۱۱ھ): ۲/ ۱۵۹، ۱۶۰، ط العلمیۃ

[3] تاریخ الملک الظاہر لابن شداد، ص ۳۰۲، ۳۰۳

[4] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/ ۳، ط العلمیۃ

سلطان بیبرس کے دور میں اس مسجد کی ازسرِ نو مرمت وتعمیر کرکے اسے دلکش رنگ وروپ دے دیا گیا۔ ۱۸ ربیع الآخر ۶۶۴ھ کو علماء وفقہاء کی اجازت سے یہاں دوبارہ نمازِ جمعہ شروع کی گئی۔ اس کے لیے وقف جاگیریں جو مختلف لوگوں کے قبضے میں تھیں، بازیاب کرائی گئیں۔ سلطان نے اس کے لیے الگ سے زرِ کثیر بھی جاری کیا۔

سلطان نے یہاں ایک درس گاہ بھی قائم کردی جس میں مدرسین، فقہاء اور قراء کو مقرر کیا گیا۔ یہی مدرسہ بعد میں "جامعۃ الازہر" کے نام سے موسوم ہوا اور آج تک قائم ہے۔[1]

جامع الحسینیہ کی تعمیر:

سلطان نے مصر میں ایک نئی جامع مسجد "جامع الحسینیہ" بھی بنوائی۔ ۶۶۶ھ میں یافا فتح ہوا تو اس کے قلعے کی لکڑی بحری جہازوں کے ذریعے مصر بھیجی جو اس مسجد کی تعمیر میں استعمال ہوئی۔[2]

نومفتوحہ علاقوں میں مساجد کی تعمیر:

شام کے نومفتوحہ علاقوں میں سلطان نے ہر جگہ جامع مساجد بنوائیں اور وہاں نصرانیوں کے دور میں رائج منکرات اور بری رسومات کا قلع قمع کرایا۔[3]

بیت المقدس کی خدمت کے لیے ادارہ:

بیت المقدس کی زیارت کے لیے پاپیادہ جانے والوں کے لیے ایک خاص ادارہ قائم کیا جو ایسے زائرین کے لیے زادِ راہ، جوتوں اور دیگر ضروریات کا انتظام کرتا۔ اس ادارے کی آمدن کے لیے شام میں جاگیریں وقف کردی گئیں۔[4]

جامع دمشق کے انتظاماتِ نو:

جامع دمشق میں مجاورین اور مستقل قیام پذیر عبادت گزاروں کا ہجوم ہوگیا تھا جس کی وجہ سے مسجد تنگ پڑنے لگی تھی۔ سلطان نے مسجد میں کسی بھی شخص کے قیام کی ممانعت کردی۔ یوں مسجد میں نمازیوں کے لیے زیادہ گنجائش نکل آئی۔[5]

بہترین محکمۂ جاسوسی:

سلطان بیبرس نے سلطنتِ ممالیک کے محکمۂ جاسوسی کو نہایت فعال بنادیا تھا۔ مخبر اندرون وبیرونِ ملک جگہ جگہ تعینات تھے اور سلطان کو بروقت ہر اہم خبر ملتی رہتی تھی۔ سلطان نے متعدد مواقع پر اپنے جاسوسوں سے خفیہ کارروائیں

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/ ۴۲، ط العلمیۃ؛ البدایۃ والنہایۃ سنۃ ۶۶۵ھ
بعض لوگ بنوعبید کو جامعۃ الازہر کا بانی قرار دیتے ہیں، یہ غلط ہے۔ بنوعبید نے صرف مسجد بنائی تھی جو "جامع الازہر" کے نام سے تھی۔ درس گاہ سلطان بیبرس نے قائم کی تھی جو "جامعۃ الازہر" کہلائی۔

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/ ۴۱، ۴۲، ۴۸، ط العلمیۃ

③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/ ۴۸، ط العلمیۃ

④ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/ ۱۴، ط العلمیۃ

⑤ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۶۵ھ

کا کام بھی بخوبی لیا۔ ان چالوں سے کبھی سلطان کے دشمن آپس میں لڑ پڑتے اور سلطان کے مخالف اس کے حامی ہو جاتے۔ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں سلطان نے کس طرح ہلاکو خان کے ایک قابل مسلمان امیر کو جاسوسوں کی مدد سے اپنے دربار میں آنے پر مجبور کر دیا تھا اور اسے شک بھی نہ گزرا کہ یہ منصوبہ سلطان کا تھا۔ انہی جاسوسوں کے ذریعے سلطان نے بعض اوقات ملت فروش امراء کو کیفرِ کردار تک بھی پہنچایا۔ اس کی ایک مثال پیشِ خدمت ہے۔

زین حافظی نامی ایک زندیق حکیم تھا جو ہلاکو خان کا ملازم تھا۔ وہ مال وجاہ کے لیے ایمان بیچ چکا تھا۔ موصل پر تاتاریوں کے قابض ہونے میں اس نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ دمشق پر تاتاریوں کے حملے کے وقت اس نے مسلمانوں کو بڑی ایذائیں پہنچائی تھیں۔

آخر سلطان بیبرس نے اس کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کیا۔ سلطان نے کچھ ایسے خطوط تیار کیے جن میں سلطان نے زین حافظی کو اپنے خاص وفادار کے طور پر مخاطب کر کے تاتاریوں کے خلاف بعض امور پر گفتگو کی تھی۔ سلطان کے جاسوسوں نے خفیہ چالوں کے ذریعے یہ خطوط یکے بعد دیگرے ہلاکو خان کے آدمیوں کے ہاتھ لگوا دیے۔ ہلاکو خان تک جونہی یہ خطوط پہنچے، اس نے زین حافظی کو طلب کر لیا اور کہا:

''تیری غداری اور حکومتوں سے بازی گری میرے نزدیک ثابت ہو گئی ہے۔ پہلے تُو حاکمِ بعلبک کا طبیب رہا۔ پھر حمص کے قلعہ دار کا ملازم رہا۔ پھر الملک الناصر کا نوکر بنا اور سب سے غداری کی۔ پھر تو میرے دربار میں آ گیا اور میں نے تیرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا مگر تُو نے مجھے بھی دھوکہ دیا۔ تُو سلطانِ مصر سے خط و کتابت کر رہا ہے۔''

یہ کہہ کر ہلاکو خان نے اسے بدترین اذیتیں دِلوا کر قتل کرا دیا اور اس کی اولاد اور اعزہ واقارب کو بھی فنا کرا دیا۔[1]

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ اس کے انجام کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

''وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

(اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کی وجہ سے ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔)[2]

بہر حال جو کوئی کسی ظالم کی مدد کرتا ہے، اللہ اسی ظالم کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ظالموں سے ظالموں کے ذریعے انتقام لیتا ہے۔ پھر وہ تمام ظالموں سے انتقام لے کر رہتا ہے۔ ہم اللہ کے انتقام، اس کے غضب، اس کی سزا اور اس کے بندوں کے شر سے اس کے حضور میں عافیت طلب کرتے ہیں۔''[3]

❁❁❁

---

① تاریخ الاسلام للذھبی، وفیات سنة: ۶۶۲ھ

② سورة الأنعام، آیت نمبر ۱۲۹، ترجمہ از حضرت مفتی محمد تقی عثمانی

③ البدایة والنهایة: ۱۷/ ص ۷۵۸، ط دار ھجر ۔ دشمنانِ اسلام کے خلاف اس قسم کی خفیہ کارروائیاں شریعت کے خلاف نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے کعب بن اشرف جیسے دشمنانِ اسلام کو اسی طرح قتل کرایا تھا۔ سلطان بیبرس کی اس کارروائی کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا تعریفی پیرائے میں نقل کرنا بھی ظاہر کرتا ہے کہ اسلاف اس طرح کی کارروائیوں کو سیاستِ شرعیہ کا حصہ سمجھتے تھے۔

ذاتی اوصاف

سلطان بیبرس ایک نہایت توانا اور ہوشیار و بیدار انسان تھا۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ سراسر مصروفِ عمل تھا۔

علماء و مشائخ سے تعلق:

وہ علماء، فقہاء، مشائخ اور درویشوں سے بڑی محبت کرتا اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کمی نہ برتتا۔ شیخ خضر بن ابوبکر رحمہ اللہ سے اس کا اصلاحی تعلق تھا۔ دمشق میں شیخ یوسف خزاعی، شیخ علی ترکمانی اور شیخ ابراہیم ارمنی رحمہم اللہ سے اکثر نشست رہتی۔ اسی طرح نابلس کے شیخ قفاعی اور اسکندریہ کے شیخ قباری رحمہما اللہ کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا تھا۔ اپنی مہمات کے لیے ان سے دعائے خیر کراتا۔ القدس، حمص، دمشق، بعلبک اور حماۃ میں اس نے مشائخ و فقراء کے لیے کئی خانقاہیں بنوائیں۔ علماء اور فقہاء کا بے حد احترام کرتا اور ان سے اکثر مشورے لیتا۔ حرمین شریفین کے بزرگوں اور خدام پر بڑی فیاضی سے خرچ کیا کرتا تھا۔[1]

مذہبی رواداری:

طبیعت میں مذہبی رواداری تھی۔ مصر میں چاروں مذاہب کے لیے الگ الگ قاضی القضاۃ مقرر کیے تھے۔ شوافع کے لیے تاج الدین عبدالوہاب، احناف کے لیے شمس الدین سلیمان، مالکیہ کے لیے شیخ السبکی، اور حنابلہ کے لیے شیخ محمد المقدسی، رحمہم اللہ۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ عدلیہ کی اس تشکیل پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ ایسا کارنامہ تھا جس کی مثل سابقہ دور میں نہیں ملتی۔ اور الحمد للہ آج تک یہی ترتیب چلی آ رہی ہے۔''[2]

نماز کی پابندی، منکرات سے اجتناب:

سفر ہو یا حضر سلطان پنج وقتہ نمازیں بڑی پابندی سے ادا کرتا تھا۔ سارے امراء، ملازموں اور سپاہیوں کو بھی نماز کا پابند کر رکھا تھا۔ اس کے لیے نگران اور مخبر مقرر کیے تھے کہ لوگ وقت پر اہتمام سے نمازیں ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ پوری سلطنت میں ملازموں کی ہر جماعت کو نماز پڑھانے کے لیے امام اور قرآن سکھانے کے لیے قاری مقرر کیے تھے۔

سلطان کے معاصر مؤرخ ابن شداد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ سلطان نے عمر بھر کبھی شراب نہیں پی تھی۔ پوری سلطنت میں شراب منع تھی۔ اسی طرح جسم فروشی اور بدکاری پر سخت قدغن تھی۔ کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اسلامی حدود کو توڑے اور بے راہ روی اپنائے۔[3]

---

① تاریخ الملک الظاهر لابن شداد، ص ۲۷۲ تا ۲۷۶

② البداية والنهاية: سنة ٦٦٣ھ، ٦٦٣ھ

③ تاریخ الملک الظاهر لابن شداد، ص ۳۰۰ تا ۳۰۲

دوستی نبھانا:

سلطان نے غلامی سے بادشاہی تک کا سفر کیا تھا۔ اس دوران اسے اچھے برے ہر طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ وہ دوستوں کا دوست تھا۔ مطلبی اور غرض پرست نہ تھا۔ اپنوں سے تعلقات نبھانے کا خوگر، وضع دار اور با مروت تھا۔

امیر بدرالدین شمسی اس کا دودھ شریک بھائی اور بچپن کا دوست تھا۔ لڑکپن میں دونوں قیدی بنے اور جدا ہو گئے۔ قدرت الٰہیہ نے سیواس کی غلام منڈی میں پھر ایک دوسرے سے ملا دیا۔ امراء نے انہیں خریدا تو پھر جدا ہو گئے۔ ایک مدت بعد حلب میں دونوں پھر ملے۔ پھر ایک عرصے تک جدا رہے اور آخر کار الملک الصالح ایوب کی فوج میں پھر دونوں اکھٹے ہو گئے۔ اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے دوستی نبھانے میں حد کر دی اور ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے۔ بیبرس کو سلطنت ملی تب بھی اس دوست سے ویسا ہی بے تکلفی کا تعلق رہا اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک ہمیشہ جاری رہا۔

بیبرس نے ایک مدت بنو ایوب کے سلاطین کی ملازمت میں گزاری تھی۔ جب بادشاہ بنا تو ایوبی شہزادوں اور امراء کے ساتھ اس نے ہمیشہ نیک برتاؤ کیا۔ انہیں ان کے شہروں کی حکومتوں اور عہدوں پر باقی رکھا۔ انہیں انعام واکرام سے نوازنا اور تقاریب میں ان کی عزت افزائی کرنا سلطان کا معمول تھا۔

امیر سنقر اشقر بھی اس کا پرانا دوست تھا۔ دونوں نوجوانی کی مہمات میں ساتھ رہے۔ سلطنت کے بعد بھی تعلق میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب سنقر اشقر تاتاریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا تو سلطان نے تاتاریوں کے نصرانی حلیف حاکم آرمینیا کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور صلح کے بدلے تاتاریوں سے اپنے دوست کو بازیاب کرا کے دم لیا۔ امیر سیف الدین قلاوون بھی اس کا دیرینہ رفیق بلکہ دستِ راست تھا۔ بیبرس نے سلطنت پانے کے بعد اس کی بیٹی سے اپنے ولی عہد کا رشتہ کر کے دوستی کو رشتہ داری میں بدل دیا۔ [1]

عدل وانصاف:

اگرچہ وہ سخت دار و گیر کا عادی تھا اور مجرموں کو اکثر نمونۂ عبرت بنا دیتا تھا مگر عوام کے حق میں نہایت نرم مزاج تھا۔ اس نے بادشاہ ہو کر بھی ایک عام آدمی اور ایک سپاہی کی سی زندگی گزاری تھی۔ اس کا مزاج بھی عامی آدمیوں جیسا تھا۔ اس لیے اسے عوام کی تکلیف سے سخت ذہنی اذیت ہوتی تھی اور وہ اس کے ردعمل میں ذمہ داروں سے سختی برتتا تھا۔ مظلوم کی اعانت اور فریادرسی کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔

علامہ ابن شداد لکھتے ہیں:

"سلطان کے عدل کا یہ حال تھا کہ اس کے دور میں کسی امیر کو عوام بلکہ یہود و نصاریٰ پر بھی زیادتی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جب بھی کوئی یہودی یا نصرانی یا کوئی عام آدمی سلطان تک اپنی شکایت پہنچاتا، سلطان فوراً دادرسی کر دیتا۔ اس کے عدل کی وجہ سے تمام صوبوں میں رعایا مطمئن تھی۔ ہر سال محرم، رجب، رمضان اور ذوالحجہ میں

[1] تاریخ الملک الظاهر، ص ۲۹۰ تا ۲۹۳

تمام شہروں کے جیل خانوں میں قیدیوں کے مقدمات کا از سرِ نو جائزہ لے کر بہت سوں کو رہا کر دیا جاتا۔''[1]

عوام کا نقصان نا قابلِ برداشت:

حکم تھا کہ کوچ کے دوران کوئی سپاہی یا افسر کسی کے کھیت یا باغ کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچائے۔ ایک بار کچھ سپاہی ایک کھیت میں گھس گئے۔ سلطان کو شکایت موصول ہوئی تو ان سب کی ناکیں کٹوا دیں۔

ایک افسر علم الدین حموی سے ایسی ہی حرکت سرزد ہوئی، سلطان نے اسے یہ سزا دی کہ گھوڑے سے اتر کر پیدل چلوایا اور گھوڑے کی زین کھیت کے نقصان کے طور پر زمین دار کو دلوا دی۔[2]

بھیس بدل کر گشت کرنا:

سلطان اکثر بھیس بدل کر لوگوں میں گھل مل جاتا اور اپنے نائبین کی کارکردگی کا پتا لگاتا۔ اگر معلوم ہوتا کہ کوئی نائب ظلم کر رہا ہے تو سلطان اسے سخت سزا دیتا۔ ایک بار وہ مغربی شہروں کی طرف نکل گیا اور ''وسیم'' نامی قصبے میں ٹھہرا۔ پتا چلا کہ مقامی حاکم ابن ہمام، اس کے نائب اور غلام لوگوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ سلطان نے اسے گرفتار کر کے اس کی تادیب کی اور اس کی جگہ دوسرے امیر کا تقرر کر دیا۔[3]

ایک رات سلطان نے بھیس بدل کر قاہرہ کے بازار کا چکر لگاتے ہوئے دیکھا کہ ایک افسر ایک عورت کی بے عزتی کر رہا ہے۔ آس پاس کچھ لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں، کوئی اسے منع نہیں کرتا۔

سلطان نے ان سب کو اچھی طرح پہچان لیا۔ اگلے دن سب کو بلوایا اور جلاد کو طلب کر کے سب کا ایک ایک ہاتھ کٹوا دیا۔ افسر کو اس کی بدمعاشی کی سزا دی گئی اور باقی لوگوں کو ظلم پر خاموشی کی۔[4]

غیظ وغضب، سخت سزائیں:

بعض اوقات وہ سزا دینے میں سختی برتتا مگر غلطی کا احساس دلایا جاتا تو تلافی کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ اکثر وہ سزا دیتے ہوئے کسی کی پروا نہیں کرتا تھا مگر کبھی سفارش قبول کر کے نرمی بھی اختیار کر لیتا تھا۔ ایک اتابیگ کے ہاتھوں کوئی شخص بلا قصد مارا گیا۔ اتابیگ نے خون بہا دے کر ورثاء کو راضی کر لیا۔ اس کے باوجود جب سلطان کو یہ اطلاع ملی تو اس اتابیگ پر سخت غضب ناک ہوا۔ سلطان کو سمجھایا گیا کہ ورثاء خون بہا لے کر خون معاف کر چکے ہیں۔ کئی درباریوں نے اس اتابیگ کی سفارش کی تب سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔[5]

ایک بار شام کے سفر سے واپسی پر اطلاع ملی کہ قاہرہ میں کچھ دنوں پہلے بہت بڑی آتش زدگی ہوئی تھی۔ سرکاری

---

① تاریخ الملک الظاہر لابن شداد، ص ۲۸۳،۲۸۴
② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۳۸/۳، ط العلمیۃ
③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۳/۲، ط العلمیۃ
④ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲۸/۲، ۲۹، ط العلمیۃ
⑤ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۵۶۱/۱، ط العلمیۃ

نوٹ: ''اتابک'' یا ''اتابیگ'' ترکی لفظ ہے۔ اصل میں یہ ''اطا'' (والد) اور ''بیگ'' (سردار) کا مرکب ہے۔ طا کو تا اور گاف کو کاف سے بدل دیا گیا۔ یہ لفظ ''بڑے سردار''، ''نائب سلطنت'' یا ''کم عمر بادشاہ کے سرپرست'' کے لیے مستعمل رہا ہے۔ (فیروز اللغات فارسی اردو۔ ص ۴۴، ۱۵۹؛ معجم متن اللغۃ: ۱۳۰/۱)

اہلکاروں کے مطابق یہ حرکت چند مقامی یہودیوں اور عیسائیوں نے کی تھی۔ سلطان نے مجرموں کو طلب کیا اور عوام کے اجتماع میں انہیں لکڑیوں کی چتا پر بندھوا دیا۔ پھر حکم دیا کہ انہیں جلا دیا جائے۔ امیر فارس الدین نے آگے بڑھ کر سفارش کی اور کہا: ''اس بار انہیں اس شرط پر معاف کر دیا جائے کہ یہ تمام مالی نقصان کا ہرجانہ دیں گے اور آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔''

سلطان نے سفارش قبول کر لی اور مجرموں سے تاوان لے کر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ [1]

عفو و درگزر:

مزاج میں تنگی بالکل نہ تھی۔ اسے عام طور پر ظالم و جابر مشہور کیا گیا ہے جو غلط ہے۔ اگرچہ کسی قدر جبر و ستم اس سے ضرور صادر ہوا مگر دوسری طرف ایسے واقعات بھی بکثرت ہیں جب اس نے بڑے بڑے دشمنوں کو معاف کر دیا اور ذرا بھی پروا نہ کی۔ اس کی بادشاہت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ وہ مصر سے بھاگ کر دمشق پہنچا جہاں الملک الناصر کی بادشاہت تھی۔ وہاں کے ایک امیر شمس الدین سنقر نے بادشاہ کو اسے قتل کرنے پر ابھارا۔ تاہم اللہ نے بیبرس کو ان دشمنوں کی زد سے بچالیا۔ سلطنت ملنے کے بعد بیبرس نے شمس الدین سنقر کی اس حرکت پر کوئی باز پرس نہ کی بلکہ اسے معاف کر دیا۔ [2]

سخاوت:

طبیعت کا فیاض اور سخی تھا۔ لاکھوں دینار اور دراہم یک مشت دے دیتا اور خزانے میں کمی کی ذرا پروا نہ کرتا۔ امراء اور سرکاری ملازموں کے لیے خلعتوں، عمدہ پوشاکوں، ہتھیاروں، سواریوں اور دیگر انعامات کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔ [3]

مصر میں غلہ مہنگا ہوا تو سلطان کو بڑی فکر ہوئی۔ فقراء کو مفت غلہ فراہم کرنے کا اعلان کر دیا۔ قلعے کے سامنے ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ سلطان کے پاس بیت المال میں اتنا اناج نہ تھا۔ کہا:

''خدا کی قسم! اگر اتنی خلقت کے لیے میرے پاس غلہ ہوتا تو سارا بانٹ دیتا۔''

چونکہ لوگوں کو کھڑے کھڑے صبح سے دوپہر ہو گئی تھی، اس لیے سلطان نے کہا:

''سب کو اس وقت آدھا آدھا درہم دے کر رخصت کیا جائے تاکہ آج کی روٹی کا انتظام کر لیں۔''

پھر ان سب کے ناموں کا اندراج کرایا اور امیر صارم سے کہا:

''ان میں سے سو غریبوں کو اپنے ذمے لے لو۔ انہیں اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلانا۔''

امیر صارم نے کہا: ''بالکل ایسا ہی ہوگا۔'' سلطان نے تمام فقراء کو اپنے امراء پر تقسیم کر دیا اور تاکید کی کہ ہر ایک کو تین ماہ کا اناج کسی بھی طرح فراہم کیا جائے۔ [4]

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/ ۲۴، ۲۵، ط العلمیة
② تاریخ الملک الظاهر لابن شداد، ص۲۸۷
③ تاریخ الملک الظاهر لابن شداد، ص۲۹۷
④ السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/ ۶، ط العلمیة

رمضان میں سلطان روزانہ تیس غلام آزاد کرتا اور پکا ہوا گوشت اور روٹی لوگوں میں تقسیم کراتا۔ ①

احسان شناسی:

جو اس کے ساتھ بھلائی کرتا وہ اسے بڑھ چڑھ کر بدلہ دیتا۔ جب وہ عینِ جالوت کے معرکے میں فتح کے بعد تاتاریوں کے تعاقب میں نکلا تھا تو اس مہم سے واپسی میں گھوڑے تھک چکے تھے۔ اس نے حماۃ کے ایک افسر سے اپنے لیے گھوڑا مانگا۔ اس نے عذر کر دیا۔ ایک دوسرے امیر طواشی کو پتا چلا تو اس نے گھوڑا فراہم کر دیا۔ بیبرس نے یہ بات یاد رکھی۔ جب اسے سلطنت ملی اور امیر طواشی حماۃ کا نمائندہ بن کر قاہرہ آیا تو سلطان نے اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو کر خود سلام میں پہل کی اور گلے سے لگا لیا۔ ②

بے تکلف زندگی:

طبیعت میں کوئی تکلف نہ تھا مگر سرحدوں کی حفاظت کے لیے احتیاط میں کوئی کسر نہ چھوٹنے پاتی۔ اس دور میں تاتاری گروہ در گروہ مصر حاضر ہو کر اسلام قبول کر رہے تھے۔ ایک بار تاتاریوں اور ترکوں کا ایک بہت بڑا قافلہ قاہرہ کے قریب پہنچا۔ سلطان نے اپنے امراء سے کہا:

''اتنے بڑے مجمعے کی آمد خدشے سے خالی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی شہر میں آمد سے پہلے ہم خود باہر جا کر انہیں دیکھ لیں۔ اگر وہ اطاعت کے ساتھ آئے ہیں تو ٹھیک۔ ورنہ ہم مسلح ہو کر مقابلے کے لیے تیار ہوں گے۔ اور میں تم ہی میں سے ایک فرد ہوں۔ مجھے بس ایک ہی گھوڑا کافی ہے۔ باقی میرے پاس جو بھی گھوڑے، اونٹ اور مال ہے، وہ سب اللہ کے راستے میں جہاد کی نیت سے وقف ہے۔'' ③

بھیس بدلنے میں مہارت:

۶۶۷ھ میں علماء کے ایک وفد اور تین سو مملوکوں کے ساتھ حج کیا۔ نقل و حرکت اس قدر خفیہ تھی کہ سلطان کی واپسی تک لوگوں کو پتا نہ تھا کہ سلطان کا قیام کہاں ہے، حجاز میں، مصر میں یا شام میں؟ حقیقت کی خبر خواص کے علاوہ کسی کو نہ تھی۔ سلطان نے کیم ذوالقعدہ کو کرک کے قلعے سے اپنا سفر شروع کیا اور ۲۹ ذوالحجہ کو واپسی ہوئی۔ سفر سے پہلے کسی کو پتا نہ تھا کہ کہاں کا قصد ہے۔ ساتھ میں ہلکا پھلکا سامان اور توشے کے طور پر صرف جو کے تھیلے تھے۔

۱۵ ذوالقعدہ کو قافلہ مدینہ پہنچا اور ۵ ذوالحجہ کو مکہ۔ سلطان نے عام لوگوں کی طرح حج کیا، کوئی حاجب تھا نہ پہرے دار۔ تنہا نمازیں ادا کیں اور اسی طرح طواف وسعی سمیت سارے ارکان پورے کیے۔ حج سے پہلے لوگ احرام کی چادریں دھونے کے لیے سلطان کی طرف پھینکتے رہے، سلطان نے چادریں دھو دھو کر انہیں واپس پکڑائیں اور ماتھے پر

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۹، ط العلمیۃ
② تاریخ الملک الظاہر، لابن شداد، ص ۲۹۵
③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۱۰، ط العلمیۃ

بل تک نہ آیا۔ جب باب کعبہ پر چڑھنے کا موقع ملا تو سلطان نے کتنے ہی زائرین کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر اوپر کھینچا اور بیت اللہ
کے دروازے سے اندر جھانکنے کا موقع دیا۔ اس دوران بعض حاجی سلطان کے احرام سے چمٹ کر اوپر چڑھنے کی کوشش
کرنے لگے۔ اس کھینچا تانی میں سلطان کی چادر پھٹ گئی مگر چہرے کا تبسم باقی رہا۔ خانہ کعبہ کو عرقِ گلاب سے غسل دیا
اور اپنے ہاتھ سے اسے خوشبو لگائی۔ آتے جاتے ہوئے مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر حاضری دی۔ حرمین کے
منتظمین، بزرگوں، خادموں اور عام شہریوں کے ساتھ نہایت فیاضی اور لطف واحسان کا سلوک کیا۔ [1]

راز داری:

سلطان کی طبیعت میں راز داری، تیزی اور خلاف توقع طور پر دوسروں کو حیرت زدہ کردینے کی عجیب صلاحیت تھی۔
اس محیر العقول انسان نے بھیس بدل کر کہیں بھی پہنچ جانے، اپنی نقل وحرکت کو خفیہ رکھنے اور اچانک کہیں بھی ظاہر ہو
جانے کی روایت قائم کردی تھی۔ اس کا اثر یہ تھا کہ لوگ اکثر وبیشتر چوکنا رہتے۔ مخالفین ڈرتے کہ نہ معلوم سلطان کس
وقت سر پر ٹوٹ پڑے۔ حاسد اپنی زبانیں بند رکھتے کہ کہیں پاس سے گزرنے والا شخص سلطان ہی نہ ہو۔

حج کے سفر کے اختتام پر جب سلطان نے دمشق میں قدم رکھا تو یہ آمد اتنی خفیہ تھی کہ جب دمشق کے ایوان میں
ڈاک کا وہ مراسلہ پڑھا جارہا تھا جس میں سلطان کی عن قریب دمشق پہنچنے کی خوش خبری تھی، عین اسی وقت سلطان کو شہر
کے مرکزی باغ میدانِ اخضر میں چہل قدمی کرتے دیکھا گیا۔ ارکانِ دولت دوڑتے ہوئے آئے اور سلطان کو پہلے
سے موجود پاکر حیران رہ گئے۔

اسی طرح حلب میں داخلہ ہوا کہ سلطان کو شہر میں داخل ہوتے ہوئے کسی نے پہچانا نہ نکلتے وقت۔ اسی سفر میں
سلطان نے دوبارہ دمشق سے ہوکر بیت المقدس کا سفر کیا۔ حج سے لے کر بیت المقدس تک تقریباً تین ماہ کے اس سفر
میں سلطان نے اپنا کرتا تک تبدیل نہیں کیا تھا۔ [2]

شرعی سزاؤں کا نفاذ:

سخت سزاؤں کو چھوڑ کر وہ باقی زندگی میں شریعت کا پابند تھا اور رعایا سے بھی شریعت کی پابندی کراتا تھا۔ شراب
خانے، قحبہ گری اور فسق وفجور کی تمام حرکات نہ صرف قانونی طور پر منع تھیں بلکہ ان کے مرتکبین سے کوئی رعایت بھی نہیں
کی جاتی تھی۔ حدود جاری کی جاتیں اور جن جرائم کی حد شریعت نے مقرر نہیں کی، وہاں تعزیر نافذ ہوتی۔ عام طور پر فسق
وفجور سے باز نہ آنے والوں کو شہر بدر کردیا جاتا تھا مگر دورانِ جہاد مے نوشی پر قتل کی دھمکی بھی دی جاتی تھی۔ [3]

اخلاقی بگاڑ پر گرفت:

خواتین میں مردوں کی مشابہت کی عادت چل پڑی تھی۔ سلطان نے فرمان جاری کیا کہ کوئی عورت مردوں کی

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۶۶۷ھ؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۶۱، ط العلمیۃ

[2] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۶۳، ط العلمیۃ [3] السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۳۳، ۳۸، ط العلمیۃ

مانند عمامہ نہ باندھے، نہ ان کی ہیئت اختیار کرے۔[1]

بادشاہت اور حفاظتِ دین کا تلازم:

سلطان کے نزدیک بادشاہت دین کی حفاظت کا دوسرا نام تھا۔ حج کے سفر میں بھی امورِ ملکی کی نگہداشت جاری تھی۔ مکہ سے یمن کے حاکم کو مراسلے میں لکھا:

"بادشاہ وہی ہے جو اللہ کے راستے میں جہاد کا حق ادا کرے اور اپنی جان کو اسلام کی حفاظت کے لیے وقف کر دے۔ اگر تم واقعی بادشاہ ہو تو تاتاریوں کو نکال باہر کرو۔"[2]

فنونِ حربیہ کی ترویج:

فنونِ حربیہ کو رواج دینے کا بڑا شائق تھا۔ خود ان کھیلوں میں حصہ لیتا جس کی وجہ سے عوام وخواص سب میں شمشیرزنی، نیزہ بازی اور دیگر عسکری کھیلوں سے دلچسپی عام ہوگئی۔ علامہ مقریزی لکھتے ہیں:

"سلطان نے قاہرہ کے باہر عیدگاہ میں تیراندازی اور فنونِ حربیہ کا میلا لگوایا۔ وہ خود ظہر کے بعد وہاں آتا اور تیراندازی اور نیزہ بازی کرتا اور عشاء کے بعد واپس جاتا۔ لوگوں کو تیراندازی اور نیزہ بازی کی ترغیب دیتا، یہاں تک کہ امیروں اور غلاموں میں سے کوئی ایسا نہ رہا جس نے یہ مشاغل نہ اپنا لیے ہوں۔"[3]

بہادروں کی حوصلہ افزائی:

سلطان نے حوصلہ افزائی کے لیے نت نئے طریقے اختیار کر رکھے تھے مثلاً قلعہ صفد پر حملے کے دوران سلطان نے ایک خیمے میں اپنا دسترخوان لگایا جس پر مشروبات اور عمدہ کھانے تھے۔ جراح اور طبیب بھی موجود تھے۔ جہاد میں شریک علماء وفقہاء میں سے جو زخمی ہوتا، اسے وہاں لایا جاتا۔ علاج بھی ہوتا اور سلطان کی ہم نشینی بھی نصیب ہوتی۔[4]

شکار اور چڑیا گھر بنانے میں دلچسپی:

شکار کھیلنے کے لیے بہانہ ڈھونڈتا اور اکثر ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان سفر کرتے ہوئے شکار کا شغل بھی شروع کر دیتا۔ کبھی شکار کی مہم سے دشمن کو دھوکے میں ڈال دیتا اور اس بہانے اچانک اس کے سر پر جا پہنچتا۔[5]

جانور پالنے کا بھی شوق تھا، قاہرہ میں قلعۃ الجبل میں ایک چڑیا گھر بنوایا۔ اس میں عام جانوروں کے علاوہ پندرہ شترمرغ اور تین سو ہرن تھے۔ کچھ زرافے بھی تھے۔ ان کی دیکھ بھال کا بہترین انتظام تھا۔[6]

سادہ ترین زندگی:

سلطان نے اپنے لیے کوئی شان وشوکت اختیار نہیں کی تھی۔ ایک عام سپاہی ہی کی طرح رہنا پسند تھا۔ سپاہیوں اور

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۳، ط العلمیۃ

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۶۱، ط العلمیۃ

③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۵۵، ط العلمیۃ

④ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۳۴، ط العلمیۃ

⑤ تاریخ الملک الظاہر لابن شداد، ص ۲۹۸

⑥ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲/۶۳، ۷۹؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۷۰ھ

مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مزا آتا تھا۔ صفر ۶۶۴ھ میں اسکندریہ پہنچ کر خلیج کی کھدائی کے کام میں بذات خود حصہ لیا۔ اسی سال ماہِ رمضان میں صفد کا محاصرہ کیا تو فصیل شکنی کے لیے دمشق سے مناجیق منگوائیں۔ شتربان اور قلی انہیں جسر یعقوب کے راستے ہی لا سکتے تھے۔ یہ اتنا دشوار گزار علاقہ تھا کہ سب تھک ہار گئے اور اطلاع بھیج دی کہ یہ کام ممکن نہیں۔ سلطان نے اپنے دستے سمیت وہاں پہنچ کر ان بیل گاڑیوں کو پہاڑی چڑھائیوں پر کھینچنا شروع کیا جن پر مناجیق کے ٹکڑے لدے ہوئے تھے۔ باقی سپاہی وقتاً فوقتاً تھک کر آرام کرتے اور باری باری گاڑیاں کھینچتے مگر سلطان نے ایک بار بھی دم نہیں لیا یہاں تک کہ مناجیق کو قلعہ صفد کے سامنے لا کر نصب کرا دیا۔ ①

مقبولیت کا عالم:

سلطان کی مقبولیت پورے عالم اسلام میں تھی اور اس کی فتوحات کا سکہ پوری دنیا پر بیٹھ چکا تھا۔ قاہرہ میں آئے دن غیر ملکی سفیر حاضر ہوتے اور سلطان کا سایۂ عاطفت طلب کرتے۔ سفارتی وفود کی کثرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رجب ۶۷۳ھ میں جب سلطان شام کی ایک مہم سے قاہرہ لوٹا تو دیکھا کہ ۲۵ ممالک کے سفیر مہمان خانے میں منتظر ہیں۔ سلطان نے انہیں شرفِ باریابی دیا، اہم امور پر بات کی اور انہیں انعام واکرام سے نوازا۔ ②

استاذ کا ادب:

اس دور میں آزاد کردہ غلام اپنے سابقہ آقا کو ''استاذ'' کہا کرتے تھے اور اس کا نہایت ادب کرتے تھے۔ سلطان بیبرس کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ وہ سلطان الصالح ایوب کی خدمت میں آنے سے پہلے لڑکپن میں امیر علاؤالدین بندقدار کا غلام تھا اور اسی نسبت سے ''بیبرس بندقداری'' کہلاتا تھا۔ اس کا آقا امیر بندقدار مزاج کا سخت تھا۔ جب بیبرس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو وہ اسے کڑی سزا دیتا تھا۔ اس کی حویلی کے صحن میں ایک بیری کا درخت تھا۔ بعض اوقات وہ بیبرس کو اس بیری پر لٹکا دیتا تھا۔

بیبرس کے سلطان بننے کے بعد بھی امیر بندقدار طویل عرصے تک زندہ رہا۔ بیبرس کبھی کبھی اس سے ملنے جاتا اور اس کی حتی الامکان خدمت کرتا۔ ایک بار بندقدار بیمار پڑ گیا۔ بیبرس اپنے امراء کے ہمراہ اس کی عیادت کے لیے گیا۔ بندقدار بستر پر پڑا تھا۔ اپنے سابقہ ننھے خادم کو اس مقام پر دیکھ کر اس پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے بیری کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''بیبرس! تم اس درخت کو پہچانتے ہو؟''

بیبرس نے بڑے ادب سے کہا: ''ہاں استاذ! اگر یہ نہ ہوتا تو مجھے یہ مقام بھی نہ ملتا۔''

مطلب یہ تھا کہ اگر آپ میری تربیت اور تادیب میں سختی نہ برتتے تو میں بادشاہت کا اہل نہیں ہو سکتا تھا۔ ③

اس سے سلطان کی مثبت سوچ اور احسان شناسی اور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/۴۳، ط العلمیة ② البدایة والنہایة: سنة ۶۷۳ھ

③ مختار الاخبار لبیبرس المنصوری، ص ۱۲

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو:

اگرچہ اپنے عزائم کو خفیہ رکھ کر تیزی سے اہداف پانا سلطان کی عادت تھی مگر بعض اوقات اس کی ساری احتیاط دھری کی دھری رہ جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیشِ خدمت ہے۔ ۶۶۰ھ میں سلطان بیبرس نے دمشق کے حاکم طیبرس کی بعض ناپسندیدہ باتوں کی وجہ سے اچانک اسے معزول کرنے کا ارادہ کرلیا۔ حسبِ عادت سلطان نے یہ کام نہایت رازداری سے کرنا چاہا۔ سلطان کے ایک امیر کا بیان ہے:

''میں دوپہر کو قاہرہ میں اپنی آرام گاہ میں تھا کہ سلطان کی طرف سے بلاوا آگیا۔ مجھے اس طرح خلافِ معمول بلاوے پر یقین ہوگیا کہ سزا دی جائے گی۔ میں نے اہل وعیال کو الوداع کہا اور قلعے میں پہنچا، دیکھا میری طرح امیر عزالدین دمیاطی کو بھی بلایا گیا ہے۔ ہم دونوں کو یقین ہوگیا کہ ہمیں گرفتار کیا جائے گا۔ ہم سلطان کے پاس پہنچے، وہاں اور کوئی نہ تھا۔ سلطان نے کھڑے ہوکر استقبال کیا تو ہمارا خوف دور ہوگیا۔ سلطان نے ہمیں اتنا قریب بٹھالیا کہ ہمارے گھٹنے اس کے گھٹنوں سے جا ملے۔ تب سلطان نے جیبی قرآن مجید نکال کر ہم سے حلف لیا کہ ہم راز فاش نہیں کریں گے اور جو حکم دیا جائے گا مانیں گے۔ ہم نے حلف اٹھایا تو سلطان نے رازدارنہ انداز میں کہا: 'دونوں اسی وقت دمشق جاؤ اور جاتے ہوئے غزہ کی فوج ساتھ لے لو۔ حاکم دمشق علاؤالدین طیبرس کو گرفتار کرلو، اس کی جگہ اب تم حاکم ہو۔ اگر اس کارروائی سے پہلے یہ راز اللہ کی مخلوق میں سے کسی کے لبوں پر آیا تو میں تم دونوں کو قتل کرادوں گا۔'

ہم دونوں قلعے سے نکلے تو راستے میں ہمیں دیکھ کر ایک شخص دوسرے سے کہنے لگا: 'یہ دونوں حاکمِ دمشق کو گرفتار کرنے دمشق جارہے ہیں۔' ہم دونوں کے چہرے خوف سے زرد ہوگئے۔ ہم نے قسم کھائی کہ اب گھر نہیں جائیں گے۔ اسی وقت سواریاں منگوا کر شام کا رخ کیا اور سلطان کا حکم پورا کرنے تک دم نہیں لیا۔''

اس واقعے کا تتمہ یہ ہے کہ حاکم دمشق دستور کے مطابق ان کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آیا تو ان دو امراء نے مصافحہ کرتے ہی اسے یکا یک گرفتار کرلیا۔ پھر انہی دو میں سے ایک یعنی علاؤالدین رکنی سلطان کے حکم کے مطابق دمشق کا نیا حاکم بن گیا، کچھ دنوں بعد معزول حاکم کے ایک مصاحب رشید نے ایک عجیب انکشاف یوں کیا:

''جب سابق حاکم نے مصر سے آپ کی آمد کی اطلاع سنی تو مجھے بلایا اور کہا: 'ان کے لیے دسترخوان لگانا اور خود بھی شریک رہنا مگر محتاط ہوکر۔ میں کھانے میں شریک نہیں ہوسکوں گا۔'' میں نے پوچھا: 'بھلا یہ کیوں۔' امیر نے کہا: 'کیوں کہ یہ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔' میں نے کہا: 'اللہ آپ کی حفاظت کرے۔' یہ کہہ کر میں رونے لگا۔ امیر نے کہا: 'یہ تو ہوکر رہے گا۔ تم اپنی فکر کرو کہ تمہارا کیا ہوگا۔' میں نکلا اور دستور کے مطابق ان امراء کے لیے دسترخوان لگایا۔ اس کے بعد وہی ہوا جو امیر نے کہا تھا۔''

علامہ نویری رحمہ اللہ یہ واقعات نقل کرکے کہتے ہیں:

"یہ بات اللہ نے مصری عوام کی زبان پر جاری کر دی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جو کہتے ہیں ویسا ہی ہو جاتا ہے۔"[1]

مستشرقین کی ہفوات:

مستشرقین اگرچہ بیبرس کے کارناموں کا تذکرہ کرنے پر مجبور ہیں، مگر ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اسلام کے اس شیر کی شخصیت کو داغ دار دکھایا جائے۔ چنانچہ عام طور پر سلطان بیبرس کی تصویر کشی اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ یک چشم تھا، ایک قسم کا مسخرا تھا۔ اخلاقی اقدار سے بے پروا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہماموں پر دھاوا بولتا، خوب صورت ترین عورتوں کو اغوا کر کے لے جاتا تھا، پھر ان کے زیورات سے شفا خانے تعمیر کراتا تھا۔ شراب خانے بند کرا کے بھی وہ گھریلو زندگی میں شراب نوشی کیا کرتا تھا۔ اپنی تفریح کے لیے لڑکوں سے یاری لگاتا تھا۔

تاریخ میں ان چیزوں کا کوئی ثبوت نہیں۔ بیبرس کی دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔ وہ بڑا باوقار اور پاکباز انسان تھا۔ مے نوشی، رقص و سرود، عیش و عشرت اور شہوات و لذات سے دور تھا۔

بیبرس کی اگر کوئی برائی یا عیب ثابت ہے تو اسی قدر کہ اس نے دو سابق بادشاہوں: توران شاہ اور سیف الدین قطز کو قتل کیا تھا اور یہ کہ وہ بعض مواقع پر ضرورت سے زیادہ سخت سزائیں نافذ کر دیتا تھا۔ ان دو معیوب باتوں کے سوا بیبرس کی شخصیت کے بارے میں جس قدر منفی چیزیں مشہور کی گئی ہیں وہ سب مستشرقین کی ہفوات اور ان کی بدباطنی کا اظہار ہیں، جن کا کسی ضعیف تاریخی روایت میں بھی ذکر نہیں ملتا۔

---

① نہایۃ الارب: ۳۰/ ۶۰ تا ۶۲، ط قاہرۃ

الملک السعید برکہ خان

صفر ۶۷۶ھ تا ربیع الآخر ۶۷۸ھ (جولائی ۱۲۷۷ء تا ستمبر ۱۲۷۹ء)

سلطان بیبرس نے اپنے بیٹے الملک السعید برکہ خان کو جانشین مقرر کردیا تھا مگر مملوک امراء کے اذہان اب تک موروثی سلطنت کے اصول کو قبول نہیں کر پائے تھے۔ الملک السعید تخت پر بیٹھ تو گیا مگر ابھی اس کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی، جہاں داری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ بہت جلد اس کی نااہلی ظاہر ہوگئی اور سب نے دیکھ لیا کہ اس میں اپنے نامور باپ جیسی کوئی بات نہیں۔ جب شاہی محل کے خواص اور فوجی جرنیلوں میں ایک تنازعہ کھڑا ہوا تو یہ نیا حکمران اسے نہ سلجھا سکا۔ اس نے شاہی خواص کی حمایت کی جس پر فوجی جرنیل بددل ہوگئے۔ آخر تخت نشینی کے فقط دو سال دو ماہ بعد ربیع الآخر ۶۷۸ھ میں اسے معزول کردیا گیا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اس کی اچانک موت واقع ہوگئی۔ [1]

❁❁❁

الملک العادل بدرالدین سلامش

ربیع الآخر تا رجب ۶۷۸ھ (ستمبر تا دسمبر ۱۲۷۹ء)

الملک السعید کی جگہ اس کے بھائی بدرالدین سلامش کو الملک العادل کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا گیا جو صرف سات سال کا تھا۔ مملوک جرنیل سیف الدین قلاوون کو اس کا اتابیگ مقرر کردیا گیا۔ نئے سکے کی ایک جانب کم عمر بادشاہ کا اور دوسری جانب قلاوون کا نام کندہ کرایا گیا۔ خطبے میں خلیفہ کے ساتھ ان دونوں کا نام لیا جانے لگا۔

مگر یہ صورتحال سلطنت کو کمزور کرسکتی تھی۔ اس لیے صرف تین ماہ بعد سیف الدین قلاوون نے کم سن بادشاہ کو معزول کر کے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ [2]

❁❁❁

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۶۷۶ھ، ۶۷۸ھ؛ النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: سنة ۶۷۶ھ، ۶۷۸ھ

② السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۶۷۸ھ؛ النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: سنة ۶۷۸ھ

سلطان سیف الدین قلاوون

رجب ۶۷۸ھ تا ذوالقعدہ ۶۸۹ھ (دسمبر ۱۲۷۹ء تا دسمبر ۱۲۹۰ء)

امیر سیف الدین قلاوون ۲۰ رجب ۶۷۸ھ کو "الملک المنصور" کے لقب کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ قطز اور بیبرس کی طرح وہ بھی غلامی سے شاہی تک پہنچا تھا۔ الصالح ایوب نے اسے ایک ہزار دینار میں خریدا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ ترقی کر کے مملوک امراء میں شامل ہو گیا۔ وہ بیبرس کا دوست تھا اور جب دونوں سمدھی بنے تو یہ رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔ بلاشبہ وہ اپنے پیشرو جیسی اعلیٰ صفات سے آراستہ تھا۔[1]

امیر سنقر کی سمجھ داری:

سلطان بیبرس کے بعض وفادار قلاوون کی حکومت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان میں بیبرس کا دوست امیر سنقر اشقر پیش پیش تھا، اس نے قلاوون کے خلاف شام میں بغاوت کردی تھی۔ مسلمانوں میں انتشار کی اطلاع ملتے ہی تاتاریوں نے جنگ کی تیاری کر لی۔ وہ سنقر کو ساتھ ملا کر مصر پر چڑھائی کا عزم کیے ہوئے تھے۔ قلاوون کو خبر ملی تو اس نے سنقر کو خط لکھا:

> "تاتاری اسلامی شہروں پر حملہ کرنے آرہے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اتحاد کرلیں۔ تاکہ ہماری جنگ کی وجہ سے مسلمان ہلاک نہ ہوں۔ جب تاتاری ہمارے ملک پر قابض ہوں گے تو ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔"

سنقر نے دانش مندی کا ثبوت دیا اور اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنے قلعے مصری حکام کے حوالے کر دیے۔[2]

اس دوران تاتاریوں نے موقع پا کر اچانک حلب پر حملہ کر دیا۔ ۲۱ ربیع الآخر ۶۷۹ھ کو ان کے دستے ناگہاں شہر میں آگھسے۔ انہوں نے جامع مسجد، قصرِ امارت، امراء کے محلات اور کئی مدارس کو نذرِ آتش کر دیا۔ پورے شہر میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لوگ جان بچانے کے لیے خفیہ پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔ دو دن تک وہ شہر میں لوٹ مار کرتے رہے۔ اس دوران انہیں اطلاع ملی کہ سیف الدین قلاوون اور امیر سنقر میں صلح ہو گئی ہے۔ مزید برآں یہ کہ ایک مسلمان نے جس کی آواز بہت بلند تھی، جامع مسجد کے مینار پر چڑھ کر آواز لگا دی:

"اللہ کی مدد آن پہنچی، اللہ کی مدد آن پہنچی۔ مسلمانو! انہیں پکڑ پکڑ کر باندیوں کی طرح کوٹھڑیوں میں بند کرو۔"

---

① البدایۃ والنہایۃ: وفیات سنۃ ۶۸۹ھ
② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۷۹ھ

یہ کہتے ہوئے وہ اپنا رومال لہرا کر شہر کے باہر کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

تاتاری سمجھے کہ مسلمانوں کا امدادی لشکر قریب آ چکا ہے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔ ①

اس دوران قلاوون جمادی الآخرہ ۶۷۹ھ میں مصری فوج لے کر تاتاریوں سے جہاد کے لیے شام پہنچ گیا تھا۔ اُدھر تاتاری حلب تک آ گئے تھے۔ مگر جب انہیں قلاوون اور سنقر کے اتحاد کی خبر ملی تو ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ الٹے پاؤں اپنی سرحدوں کی طرف لوٹ گئے۔ ②

قلاوون نے سنقر کو حسبِ وعدہ انطاکیہ اور کفر طاب دے کر اپنا وفادار بنا لیا۔ وہ نہایت زیرک انسان تھا اور مخالفین کو رام کرنا جانتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شام اور مصر کو عالمِ اسلام کا حصنِ حصین بنا دیا۔ ③

معرکۂ مرقدِ خالد بن ولید:

اُدھر ایل خانی مغلیہ سلطنت کا حکمران ابا قا اسلام کے اس قلعے کو ڈھانے کے درپے تھا۔ اس نے ۶۸۰ھ میں اپنے بھائی منکوتمور کی کمان میں پچاس ہزار سواروں کا لشکر شام روانہ کیا، اور خود بھیس بدل کر خفیہ طور پر اس لشکر کے پیچھے روانہ ہوا تاکہ اپنے سورماؤں کی کارکردگی دیکھے۔ آگے چل کر آرمینیا کے عیسائی بھی اس لشکر میں ضم ہو گئے اور آخر ایک لاکھ سے زائد جنگجوؤں کا یہ ٹڈی دل جمادی الآخرہ ۶۸۰ھ میں دریائے فرات عبور کر کے شام کی سرحدات میں داخل ہو گیا۔ مسلمان امیر قلاوون اور سنقر اشقر کی قیادت میں پوری طرح مقابلے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے دشمن کو حمص تک پیش قدمی کا موقع دیا۔ اس دوران بدوؤں کے چھاپہ مار دستے تاتاریوں پر شب خون مارتے رہے۔ آخر ۱۵ رجب کی صبح حمص کے باہر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مزار کے قریب فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ جنگ شروع ہوتے ہی تاتاریوں کے میسرہ نے مسلمانوں کے میمنہ پر جارحانہ حملہ کیا۔ اسلامی میمنہ نے بڑی پامردی سے اس حملے کا دفاع کیا اور پھر اس زور کا جوابی حملہ کیا کہ تاتاریوں کا میسرہ پسپا ہوتے ہوتے اپنے قلب سے جا ملا جو منکوتمور کی قیادت میں تھا۔

دوسری طرف تاتاریوں کے میمنہ نے مسلمانوں کے بائیں بازو کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ صبح سے ظہر تک اس قدر خون ریز جنگ ہوئی کہ لہو کی ندیاں بہہ گئیں۔ صورتحال یہ تھی کہ جامع دمشق میں لوگ مصحفِ عثمانی ہاتھوں میں بلند کیے گریہ وزاری کے ساتھ دعائیں کر رہے تھے۔ میدانوں میں مسلمان ننگے سر قرآن اٹھائے، رو رو کر اللہ کو یاد کر رہے تھے۔ ہر کسی کی زبان پر لشکرِ اسلام کی نصرت کی پکار تھی۔

دوپہر تک تاتاریوں کا پلہ بھاری ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی ہزاروں لاشیں گر چکی تھیں، تاتاری مسلمانوں کے بائیں بازو کو درہم برہم کر چکے تھے، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد میدانِ جنگ سے بھاگ رہی تھی اور تاتاری میمنہ کے

---

① ذیل مرآۃ الزمان: ۳۶،۳۵/۴، ط دار الکتاب الاسلامی قاھرہ

② البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۶۷۹ھ

③ البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۶۸۰ھ

گھڑسوار اُن کے تعاقب میں تھے۔ مفرور مسلمان دمشق، قلعہ صفد، حمص اور غزہ کی طرف نکل گئے تھے۔

تاہم شکست کے ان تمام آثار کے باوجود امیر قلاوون کی کمان میں قلب لشکر کے بہادر میدانِ جنگ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے کھڑے تھے۔ شاہی نشانات اور علم اپنی جگہ بلند تھے، نقارے اور بگل برابر بج رہے تھے۔

تاتاریوں کا پورا دباؤ اب قلب پر تھا۔ کچھ دیر بعد ان کی عددی کثرت نے قلب کے بائیں پہلو کو بھی متزلزل کر دیا، پھر بھی امیر قلاوون کے قدم نہ اکھڑے۔ یہ دیکھ کر باقی امراء کو بھی غیرت آئی اور وہ ہر طرف سے امنڈ کر اپنے دستوں سمیت امیر کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ سب نے مل کر سر دھڑ کی بازی لگا دی اور اس شدت سے پے در پے حملے کیے کہ تاتاریوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ حاجی عزالدین جامہ دار جان پر کھیل کر تاتاری سالار منکوتمور تک پہنچ گیا اور نیزہ گھونپ کر اسے زخمی کر دیا، پھر خود بھی تلواروں اور نیزوں سے چھلنی ہو کر رتبۂ شہادت پا گیا۔

اس دوران اسلامی میمنہ کے امیر عیسیٰ بن مہنا نے اپنے گھڑ سواروں کو لے کر تاتاریوں کے میسرہ پر ایک نہایت جارحانہ حملہ کیا جس سے ان کی صفیں چر کر رہ گئیں۔ اُدھر سے بنو تغلب کے عرب جواب تک گھات میں چھپے ہوئے تھے، ٹوٹ پڑے۔ تاتاری سمجھے کہ مسلمانوں کو تازہ کمک مل گئی ہے اور وہ ہر طرف سے گھیرے میں آنے کو ہیں۔ چنانچہ وہ تیزی سے میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ سلطان قلاوون نے تعاقب کا حکم دیا اور میلوں تک تاتاریوں کی لاشیں بچھتی چلی گئیں۔ تاتاری فوج کا میمنہ جنگ کے پہلے مرحلے میں فرار ہونے والے مسلمانوں کے تعاقب میں حمص تک پہنچ گیا تھا اور شہر کے دروازے بند دیکھ کر گرد و نواح میں غارت گری کر رہا تھا۔ اس کے بعد یہ سورما شجر پوش وادیوں میں اتر کر کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ دیر میں باقی فوج بھی ان سے آملے گی۔ سہ پہر کے وقت جب ان کے مخبر نے اطلاع دی کہ تاتاری لشکر میدان سے پسپا ہو چکا ہے تو وہ حیران رہ گئے اور تیزی سے پلٹے۔ جب وہ واپس میدانِ جنگ کے قریب پہنچے تو سلطان کا سارا لشکر تاتاریوں کو شکست دے کر ان کے تعاقب میں نکل چکا تھا اور میدان میں سلطان کے ساتھ صرف ایک ہزار سوار تھے۔

سلطان نے تاتاریوں کے میمنہ کو حمص کی طرف سے آتے دیکھا تو پرچم اور شاہی نشانات لپیٹنے اور نقارے بند کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ جب تاتاری میمنہ قریب کی وادیوں سے گزر کر آگے نکل گیا تو سلطان نے پشت سے اس شدت کا حملہ کیا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور بہت کم بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح میدان مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

اگلے دن اطلاع آئی کہ تعاقب کے دوران قتل کیے گئے تاتاریوں کی تعداد میدانِ جنگ کے مقتولین سے بھی زیادہ ہے۔ تاہم بہت سے مفرور تاتاری دریائے فرات کے قریبی گھاس کے جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ سلطان کے حکم سے اس جنگل کو آگ لگا دی گئی اور وہاں چھپے ہوئے اکثر دشمن مارے گئے۔

۲۲ رجب ۶۸۰ھ کو فاتح مسلمان اس طرح دمشق میں داخل ہوئے کہ ان کے نیزوں کی انیوں پر تاتاریوں کے

کیے ہوئے سر تھے۔ اس عظیم فتح پر تمام اسلامی شہروں میں خوشیاں منائی گئیں اور سلطان قلاوون کا شمار بھی قطز اور بیبرس جیسے حکمرانوں میں ہونے لگا۔①

اباقا کی موت:

تاتاریوں کا سپہ سالار منکوتمور جنگ سے بمشکل جان بچا کر واپس عراق پہنچ سکا۔ وہ زخمی تھا، دوران سفر ایک دن غسل کر کے نکلا ہی تھا کہ بیمار پڑ گیا اور نصیبین پہنچ کر مر گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ کسی نے غسل کے پانی میں زہر ملا دیا تھا۔

خاقان اباقا نے دریائے فرات کے کنارے اس شکست کی خبر سنی اور الٹے پاؤں بغداد سے ہوتے ہوئے ہمدان پہنچا۔ اس شکست نے اس کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ سکونِ قلب پانے کے لیے وہ ہمدان کے گرجے میں گیا اور نصاریٰ کے تہوار میں شرکت کی۔ مگر دماغی فتور روز بروز بڑھتا گیا۔

آخر کار ۲۰ ذوالقعدہ کو وہ پاگل پن کی حالت میں مر گیا۔ عمر ۵۰ سال تھی اور مدتِ حکومت ۱۸ برس۔②

نومسلم مغل شہزادے تکودار احمد خان کی تخت نشینی:

اباقا کی موت پر ایل خانی مغلوں کی قوریلتائی (بڑی مجلسِ مشاورت) منعقد ہوئی اور ۶۸۱ھ کے آغاز میں اباقا کے نوجوان بھائی "تکودار" کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ وہ کئی سال پہلے خفیہ طور پر مسلمان ہو چکا تھا، اس لیے سلطنت سنبھالتے ہی اس نے اپنا نام "احمد خان" رکھ لیا۔ اس نے مغلوں کی سب سے بڑی حریف سلطنتِ مصر سے دوستانہ تعلقات کی داغ بیل ڈالی اور سلطان قلاوون کو اپنے قبولِ اسلام اور فلاحی کاموں کی اطلاع دیتے ہوئے مراسلے میں لکھا:

"قوریلتائی منعقد کی گئی جس میں سب بھائیوں، بیٹوں، امرائے لشکر اور زمین کو جھر دینے والی افواج کی رائے یہ ہوئی کہ ہمارے بڑے بھائی کی مہم کو پورا کیا جائے۔ مگر جب ہم نے اس میں غور کیا تو اسے عمومی خیر کے خلاف محسوس کیا۔ نفرت کے اسباب ختم ہو چکے ہیں، اور ہم نے گفتگو میں پہل کر کے حجاب دور کر دیا ہے۔ جب اللہ نے سلطانِ مصر کو دنیا کی اصلاح کی توفیق بخشی ہے تو واجب ہے کہ اتحاد و اتفاق کے دروازے کھول دیے جائیں تا کہ شہر آباد ہوں اور تلواریں میان میں چلی جائیں۔"

سیف الدین قلاوون نے اس مراسلے پر بے حد مسرت کا اظہار کرتے ہوئے احمد خان کو جواب میں تخت نشینی اور قبولِ اسلام پر مبارک باد دی اور اس کے اصلاحی کاموں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

"ایک متقی اور قوم کے ہمدرد بادشاہ کی روش یہی ہونی چاہیے۔ جب آپ بھی اس دین میں داخل ہو چکے ہیں تو تمام کدورتیں مٹ گئیں اور باہمی تعاون کا تعلق قائم ہو گیا۔ بلاشبہ جو اتحاد و اتفاق کا راستہ اختیار کرے اور امن کی طرف مائل ہو، وہ بے راہ نہیں ہو سکتا۔"

---

① البداية والنهاية: سنة ۶۸۰ھ؛ نهاية الأرب للنويرى: ۳۱/ ۳۰ تا ۳۷، ط قاهره؛ تاريخ مختصر الدول، ص ۵۱۲، ط دار الشرق

② تاريخ مختصر الدول، ص ۵۰۵؛ البداية والنهاية: سنة ۶۸۰ھ

مگر سلطان نے ساتھ ہی اس مراسلے میں احمد خان کو یہ بھی یاد دلایا کہ ابھی تک آرمینیا سے اسلامی شہروں پر تاخت وتاراج جاری ہے حالانکہ یہ علاقہ مغلوں کا باج گزار ہے اور اس کا خراج انہی کو ملتا ہے، لہٰذا جب تک یہ کارروائیاں بند نہیں ہوتیں صلح پائیدار نہیں ہو سکتی۔ یہ مکتوب یکم رمضان ۶۸۱ھ کو لکھا گیا تھا۔ (۱)

احمد خان کا قتل، ارغون خان کی حکومت:

احمد خان خود سیف الدین قلاوون کی خواہش کے مطابق اسلامی شہروں پر مغلوں اور ان کے حلیفوں کی مار دھاڑ ختم کرنا چاہتا تھا مگر ابھی تک مغلوں کی خاصی تعداد ذہنی طور پر اس کے ساتھ نہ تھی۔ بہت سے شہزادے جن میں اس کا بھتیجا ارغون بن اباقا بھی شامل تھا، اسلام دشمن تھے اور اس کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔

آخر ان شہزادوں نے اس کا تختہ الٹنے اور اسے قتل کرنے کی تیاری کی۔ احمد خان کو پتا چلا تو اس نے باغیوں کے خلاف کارروائی شروع کی۔ نتیجے میں مغلوں کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ آخر کار ارغون خان کے حامی غالب آئے اور احمد خان کا تختہ الٹ کر اسے شہید کر دیا گیا۔ یہ المناک واقعہ ۲ جمادی الآخرہ ۶۸۳ھ کا ہے۔ (۲)

ارغون خان کی تخت نشینی مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کن ثابت ہوئی۔ مزید یہ کہ اس نے موصل کے ایک یہودی طبیب سعد اللہ کو اپنا وزیر بنالیا جو اسی کی طرح مسلمانوں کا کٹر مخالف تھا۔ (۳)

آرمینیا کے نصرانیوں سے معرکے:

سیف الدین قلاوون کو آرمینیا کے عیسائیوں کی جانب سے شمالی شام پر حملوں کی سخت فکر تھی۔ ایسے ایک حملے میں نصرانیوں نے حلب کی جامع مسجد میں گھس کر توڑ پھوڑ کی تھی۔ آخر قلاوون نے ارمنی عیسائیوں کو سزا دینے کے لیے شمال کی طرف افواج روانہ کیں جو آرمینیا میں گھستی چلی گئیں اور نصرانیوں کی طاقت کا قلع قمع کر دیا۔ اس یلغار میں تاتاریوں کی ایک فوج سے بھی پالا پڑا، مسلمانوں نے اسے بھی مار بھگایا۔ سلطان قلاوون کے حکم سے حلب کی مسجد کو از سر نو تعمیر کر کے پہلے سے بھی بہتر بنا دیا گیا۔ (۴)

غیر مسلم تاتاریوں اور یورپ کا گٹھ جوڑ:

ارغون اپنے باپ کی طرح نصرانیت نواز اور سخت اسلام دشمن تھا۔ وہ تنہا قلاوون سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتا تھا، اس لیے اہل یورپ کو بیت المقدس کی فتح میں مدد دینے کا لالچ دے کر اکسانے لگا کہ وہ مغرب سے دنیائے اسلام پر حملہ کریں۔ اس نے پاپائے روم اونوریس چہارم کو اپنے مراسلے میں ایک نئی صلیبی جنگ کی دعوت دیتے ہوئے لکھا:

"خدا، پاپائے روم اور چنگیز خان کی مدد سے ہم مسلمانوں کو نکال باہر کر سکتے ہیں۔"

(۱) تاریخ مختصر الدول، ص ۵۱۶، ط دار الشرق

(۲) تاریخ مختصر الدول، ص ۵۲۰ تا ۵۲۶، ط دار الشرق

(۳) تاریخ ابن خلدون: ۵/ ۶۱۶، ۶۱۷، ط دار الفکر

(۴) تاریخ ابن خلدون: ۵/ ۴۵۸، ط دار الفکر

اس نے ایک راہب کو اپنا سفیر بنا کر یورپ روانہ کیا جس نے بازنطینی بادشاہ کے دربار سے لے کر روم کے کلیساؤں تک سفر کیا۔ کلیسائے اعظم کے کارڈینلوں سے ملاقات کر کے وہ شاہِ فرانس سے ملنے پیرس گیا، شاہِ برطانیہ کے پاس بھی حاضر ہوا۔ وہ ایک سال تک یورپی فرمانرواؤں کا مہمان رہا۔ اس دوران اس کی وساطت سے ارغون خان کے مراسلے ان حکمرانوں تک پہنچتے رہے۔ آخری خط میں ارغون خان نے شاہِ فرانس فلپ کو لکھا:

''ہماری درخواست ہے کہ آپ سرما کے آخری مہینے میں کوچ کریں اور موسمِ بہار کے پہلے مہینے کی ۱۵ تاریخ کو دمشق کے قریب پڑاؤ ڈالیں۔ اس وقت آپ کی فوج آگئی تو ہم آپ کو بیت المقدس دوبارہ فتح کر کے دے دیں گے۔ لیکن اگر آپ نہ پہنچے تو ہمارا فوج بھیجنا کارآمد نہیں ہوگا۔''

اللہ کے غیبی نظام نے عالمی کفریہ طاقتوں کا یہ گٹھ جوڑ پروان نہ چڑھنے دیا۔ یورپی حکمران آپس کے جھگڑوں میں منہمک رہے اور ارغون خان کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی۔

بعد میں اہلِ مغرب یہ موقع ہاتھ سے نکل جانے پر کفِ افسوس ملتے رہے اور ان کا یہ رنج آج بھی ان کی تواریخ میں جھلکتا ہے جیسا کہ مستشرق ہیرلڈ لیمب اس صورتحال پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''یورپ کے بادشاہ اپنے آپس کے جھگڑوں میں اس قدر منہمک تھے کہ اب ایشیا کا سفر کر کے یروشلم تک پہنچنا انہیں دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ ان چند مہینوں میں دو صدیوں کے محارباتِ صلیبی کی ساری کوششیں ضایع ہوگئیں۔''[1]

ارغون خان یورپی لشکروں کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہوگیا۔ اس نے نصرانیت کی جگہ ہندو مذہب میں دلچسپی لینا شروع کردی۔ غیر مرئی طاقتیں حاصل کرنے کے لیے وہ جادو ٹونے اور طلسمی عملیات کے چکر میں پڑ گیا۔ مگر ربیع الاوّل ۶۹۰ھ میں جب ہندوستان کے ایک جوگی نے اسے ہمیشہ صحت مند رکھنے والی دوا تیار کر کے دی تو وہ اسے استعمال کرتے ہی بیمار پڑگیا اور چند دنوں بعد جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔[2]

شام میں نصرانیوں کی مسلسل ہزیمتیں:

ساحلِ شام پر کچھ قلعے ابھی تک فرنگیوں کے پاس تھے۔ ۷ ا ربیع الاول ۶۸۴ھ کو سلطان نے ہاسپٹلرز کا مضبوط مورچہ حصن المرقب فتح کرلیا اور یہاں کے فرنگیوں کو جان کی امان دے کر طرابلس جانے دیا۔[3]

طرابلس کی فتح:

طرابلس کا تاریخی شہر سلطان کا اصل ہدف تھا جسے پہلی صلیبی جنگ کے بعد سات سال کے طویل ترین محاصرے

---

① March of The Barbarians, by Harlod Lamb: p:234

② تاریخ وصاف از عبداللہ بن فضل اللہ وصاف: ۲/ ۲۴۵، ط بمبئی ؛ تاریخ ابن خلدون: ۶۱۷/۵، ط دار الفکر

نوٹ: تاریخ ابن خلدون میں ارغون کی وفات کی تاریخ غلط درج ہے'' فمات سنة سبعين. '' غالباً یہ سہو کاتب ہے۔

③ نهاية الارب للنويری: ۳۱ / ۳۹، ط دار الكتب قاهره

کے بعد ۵۰۳ھ میں مسلمانوں سے چھینا گیا تھا۔ پونے دو صدیاں گزر چکی تھیں اس دوران صلاح الدین ایوبی اور رکن الدین بیبرس بھی اسے واپس نہیں لے سکے تھے۔ یہ سعادت امیر قلاوون کے نصیب میں تھی۔ ربیع الاول ۶۸۸ھ میں سلطان نے طرابلس کو گھیر لیا اور مسلسل ایک ماہ تک سنگ باری کر کے اس کی سنگین فصیلیں شکستہ کر دیں۔ آخر ۴ ربیع الآخر ۶۸۸ھ کو طرابلس سرنگوں ہو گیا اور اس ضلع کے دیگر قلعے بھی سر کر لیے گئے۔ یہ ایک عظیم فتح تھی جس پر پوری سلطنت میں خوشیاں منائی گئیں۔ قلاوون نے فرنگیوں کی حریص نگاہوں کی روک تھام کے لیے طرابلس کے قلعے کو مسمار کر دیا اور یہاں کی مسلم آبادیات کے قریب حصن الاکراد سے کچھ فاصلے پر ''طرابلس'' کے نام سے ایک نیا قلعہ تعمیر کرا دیا۔[1]

عکا پر حملہ اور قلاوون کی وفات:

اس فتح کے اگلے سال امیر سیف الدین قلاوون نے کچھ فوج کو عکا پر حملے کے لیے بھیجا جس نے وہاں منجنیقوں کی تنصیب شروع کر دی۔ سلطان باقی فوج کے ساتھ عکا روانگی کے لیے قاہرہ کے باہر خیمہ زن تھا کہ عین اسی حالت میں اس کا وقت اجل آن پہنچا۔ ۲۶ ذوالقعدہ ۶۸۹ھ کو وہ دنیا سے رخصت ہوا۔[2]

قلاوون کے عہد کی بعض خصوصیات:

قلاوون کے عہد میں مملوکوں کے زیر سایہ عالم اسلام امن و امان کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ تاتاریوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ صلیبی جنگیں ختم ہو گئی تھیں، شام کے فرنگی اپنے قلعوں میں سمٹے ہوئے تھے۔ شام اور مصر میں علماء وفقہاء کے حلقے پہلے سے زیادہ آباد تھے۔ خانقاہوں کی رونقیں بڑھ گئی تھیں۔ گزشتہ صدی کے مقابلے میں اب مدارس کئی گنا زیادہ ہو چکے تھے۔ سلاطین اور امراء اسلام کی ہر خدمت اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور کارہائے خیر میں جی کھول کر خرچ کرتے تھے۔

قلاوون اس لحاظ سے تمام مملوک سلاطین میں ممتاز ہے کہ اسی کی نسل میں سلطنت سب سے زیادہ چلی۔ اس میں بہت سی خوبیاں تھیں تاہم آخر میں اس نے خوشحال طبقے پر بھاری جرمانے عائد کیے اور انہیں سخت سزائیں دیں۔[3]

بیبرس کے دور سے مصر میں بسنے والے نومسلم تاتاریوں کو فوج میں شامل کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ قلاوون نے اسے جاری رکھا۔ یوں نومسلم تاتاری مصری فوج کا ایک مضبوط بازو بن گئے۔[4] اس نے ایک تاتاری لڑکی بنتِ کرمون سے شادی بھی کی تھی جس سے اس کا بڑا لڑکا علاؤالدین علی الملک الصالح پیدا ہوا تھا۔[5]

❁❁❁

---

① البداية والنهاية :سنة ٦٨٨هـ؛ تاريخ ابن خلدون: ٣٦٣/٥

② البداية :سنة ٦٨٨هـ؛ تاريخ ابن خلدون: ٣٦٣/٥، ط دار الفكر

③ البداية والنهاية :سنة ٦٨٨هـ، ٦٨٩هـ

④ الطوائف المغولية في مصر ،للدكتور صلاح الدين محمد نور، ص ٣٦، ط الاسكندرية

⑤ عقد الجمان للعيني :سنة ٦٧٦هـ

خلیل الاشرف

ذوالقعدہ ۶۸۹ھ تا محرم ۶۹۳ھ (دسمبر ۱۲۹۰ء تا دسمبر ۱۲۹۳ء)

قلاوون کے بعد ۷ ذوالقعدہ ۶۸۹ھ کو اس کا بیٹا خلیل الاشرف تخت نشین ہوا جو جہانبانی کی خوبیوں سے مالا مال تھا۔ اس نے باپ کی ادھوری مہم پوری کرنے میں دیر نہ لگائی اور اگلے سال ۶۹۰ھ کے آغاز میں نہایت سرعت کے ساتھ قاہرہ سے عکا پہنچ کر سخت ترین محاصرہ کر لیا۔ یہ شہر فرنگیوں نے ۵۸۷ھ میں صلاح الدین ایوبی سے چھینا تھا اور اسے صلیب کے چنگل میں ۱۰۳ برس گزر چکے تھے۔ اس جہاد میں شرکت کے لیے شام اور مصر کے علماء وفقہاء تک جوق در جوق پہنچے اور ہر طرح کی خدمات انجام دیں یہاں تک کہ منجنیقوں کو کھینچ کر عکا تک پہنچانے میں بھی شریک رہے۔ ①

عکا کی فتح:

عکا کا محاصرہ ۴ ربیع الآخر ۶۹۰ھ کو شروع ہوا۔ ڈیڑھ ماہ تک جنگ جاری رہی۔ اسلامی فوج نے لگاتار سنگ باری سے فصیل کے ناقابلِ تسخیر برج توڑ دیے اور خندق کو مٹی سے پاٹ کر اسے عبور کر لیا۔ اس کے بعد شکستہ برجوں کو گرادیا گیا اور جمعہ ۱۷ جمادی الآخرہ کو مجاہدین منہدم برجوں سے شہر میں داخل ہو گئے۔ حریف نے قلعے اور اندرونی برجوں میں محصور ہو کر مزاحمت کی مگر دس دن بعد ان کا زور ٹوٹ گیا۔

صور اور صیدا کے فرنگیوں کو اپنے سب سے مضبوط حصار کے سرنگوں ہونے کی خبر ملی تو وہ اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ ان شہروں کو خالی کر کے بھاگ نکلے۔ خلیل الاشرف نے بلا تاخیر ان تمام شہروں پر قبضہ کر لیا اور ان کی فصیلوں اور قلعوں کو مسمار کرا کے پورے ساحلِ شام سے فرنگیوں کے مورچوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح فرنگی جو ۴۹۰ھ میں شام میں آگھسے تھے، دو صدیوں بعد یہاں سے مکمل طور پر بے دخل ہو گئے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سنہ ۶۹۰ھ کے تحت لکھتے ہیں:

''یہ سال شروع ہوا تو عکا اور طویل مدت سے فرنگیوں کے زیرِ قبضہ ساحلی علاقے فتح ہو گئے اور ان کے پاس یہاں ایک پتھر کی جگہ بھی نہیں رہی۔ حمد واحسان اللہ ہی کے لیے ہے۔'' ②

صلیبی جنگوں کی باقیات کا خاتمہ:

عالم اسلام سے ملحق آخری عیسائی ریاست عکا کے خاتمے کے ساتھ ہی ۴۸۹ھ میں شروع ہونے والی دو سو سالہ صلیبی

---

① البداية والنهاية: سنة ۶۸۹ھ، ۶۹۰ھ ② البداية والنهاية: سنة ۶۹۰ھ

جنگوں کی باقیات کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ بلاشبہ ان جنگوں کے نتائج مسلمانوں کے حق میں رہے اور اقوام یورپ کو سوائے ذلت، رسوائی، ناکامی، جانی ومالی نقصان اور مکمل شکست کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ جنگوں کے اس طویل سلسلے میں مسلمانوں کی کئی نسلوں نے جہاد کیا۔ اس دوران ان پر بڑے بڑے صبر آزما مراحل آئے، ہمت شکن مصائب سے سابقہ پڑا۔ شہادتیں، گرفتاریاں اور پسپائیاں بھی ان کے حصے میں آئیں مگر انہوں نے کمال ہمت و پامردی سے جہاد جاری رکھا اور بالآخر ارضِ اسلام کو غاصب نصرانیوں سے پاک کر کے دم لیا۔ اس کے بعد صدیوں تک یورپ کو سرزمین اسلام کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی بلکہ ان کی ہمت کی آخری حد یورپ کی مدافعت تک محدود ہوگئی۔

صلیبی جنگوں سے یورپ میں علمی انقلاب:

ہاں! بے پناہ نقصان اٹھانے کے باوجود ایک لحاظ سے یورپ کے لیے یہ جنگیں مفید رہیں۔ ان دو صدیوں میں یورپ کو مسلم تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یورپ کے بہترین دماغوں نے یہ سمجھ لیا کہ جب تک ہم علمی وفنی لحاظ سے مسلمانوں کے برابر نہیں آجاتے، کامیابی نصیب ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہاں پہلی بار مسلم ممالک کی درسگاہوں جیسے تعلیمی ادارے قائم کیے یا پہلے سے قائم شدہ تعلیمی اداروں کو ترقی دے کر جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا۔ فلکیات، کیمیا، ریاضی اور طبعیات پر مسلم حکماء کی لکھی ہوئی بے نظیر کتب وہاں پڑھائی جانے لگیں۔ اس سے پہلے ان کتب کو سمجھنے کے لیے وہاں کے اہلِ علم نے عربی زبان سیکھی اور اپنے ہاں بھی عربی زبان کے سکھانے کا اہتمام کیا تاکہ طلبہ براہِ راست ان علوم وفنون کو اصل ماخذ سے پڑھ سکیں۔ اس کے بعد ان کتب کے تراجم کا کام شروع ہوا اور مسلمانوں کی علمی وفنی کتب یورپ کی ہر اہم علمی زبان میں منتقل ہوتی چلی گئیں۔ یہاں سے یورپ نے ترقی کی اس شاہراہ پر قدم رکھا جس نے اسے چند صدیوں میں فاتحِ عالم بنا دیا۔

آرمینیا میں فتوحات:

اگلے سال خلیل الاشرف نے شمالی شام کو آرمینی عیسائیوں سے محفوظ بنانے کے لیے وہاں فوج کشی کی اور قلعۃ الروم فتح کر لیا۔ ۶۹۲ھ میں اس نے دوبارہ ادھر یلغار کی تیاری کی تاہم آرمینیا کے حاکم نے مرعوب ہو کر بہنسا، تل حمدون اور مرعش جیسے اہم عسکری مورچے حوالے کر کے صلح کر لی۔ [1]

خلیل الاشرف کا قتل:

شاید خلیل الاشرف کی فتوحات کا دائرہ مزید بڑھتا مگر ۱۵ محرم ۶۹۳ھ کو اسے امرائے دربار کی ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا۔ خلیل الاشرف نے صرف تین سال حکومت کی مگر اس کا نام اس لیے تاریخ میں زندہ رہا کہ ساحلِ شام کو غیر ملکی طاقتوں سے مکمل طور پر پاک کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ [2]

❁❁❁

---

(1) البدایۃ والنهایۃ: سنۃ ۶۹۱ھ، ۶۹۲ھ

(2) البدایۃ والنهایۃ: ۶۹۳ھ

الملک الناصر محمد بن قلاوون...... پہلا دورِ حکومت

محرم ۶۹۳ھ تا محرم ۶۹۴ھ (دسمبر ۱۲۹۳ء تا دسمبر ۱۲۹۴ء)

۱۶ محرم ۶۹۳ھ کو مقتول سلطان کی جگہ اس کے بھائی محمد بن قلاوون کو "الملک الناصر" کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔ وہ ۱۵ محرم ۶۸۴ھ کو پیدا ہوا تھا اور تخت نشینی کے وقت پورے ۹ سال کا تھا۔ [1]

الملک الناصر محمد بن قلاوون تاریخ کے ان منفرد حکمرانوں میں سے ایک ہے، جنہیں تین بار حکومت کرنے کا موقع ملا۔ وہ دو بار معزول ہوا۔ تیسری بار اس کی حکومت تا دمِ مرگ رہی۔

پہلا دور تقریباً ایک سال کا تھا۔ اس دوران وہ برائے نام بادشاہ تھا، امورِ حکومت امراء کے ہاتھوں میں تھے، مگر وہ اس پر بھی راضی نہ تھے۔ آخر ۱۰ محرم ۶۹۴ھ کو کئی امراء نے اس کے خلاف بغاوت کی جو ناکام ہوگئی۔ اس کے وفادار امراء نے باغیوں کو قتل کر ڈالا۔ مگر اس کے فوراً بعد وفادار امراء کے سرخیل زین الدین کتبغا نے کمزور حکمران کو سلطنت پر اضافی بوجھ قرار دیا اور اسے معزول کر کے گھر میں نظر بند کر دیا۔ [2]

❀❀❀

---

① نہایۃ الارب للنویری: ۳۱/ ۲۶۷، ط دار الکتب قاهرہ

② البدایۃ والنہایۃ: ۶۹۳ھ، ۶۹۴ھ

زین الدین کتبغا، مصر کا نومسلم تاتاری حکمران

محرم ۶۹۴ھ تا محرم ۶۹۶ھ (دسمبر ۱۲۹۴ء تا نومبر ۱۲۹۶ء)

۱۱ محرم ۶۹۴ھ کو ’کتبغا‘ کا سلطانِ مصر وشام بن جانا تاریخ کی عجیب کروٹ تھی۔ یہ نیا بادشاہ جس نے الملک العادل کے لقب سے مصر وشام پر حکومت کی، ایک تاتاری سپاہی تھا جو ۶۳۳ھ میں پیدا ہوا تھا اور ۲۵ برس کی عمر میں عین جالوت کی جنگ میں مسلمانوں سے نبرد آزما ہوا تھا۔ معرکہ عینِ جالوت سے پہلے تاتاریوں میں مشہور ہو چکا تھا کہ مصر پر کتبغا نامی ایک شخص حکومت کرے گا، اس لیے ہلاکو نے کتبغا نویان کو سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا اور جب وہ جنگ میں مارا گیا تو تاتاریوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ مشہور پیش گوئی غلط کیسے نکلی۔ ۶۵۹ھ میں تاتاریوں کو حمص میں دوسری شکست ہوئی، اس جنگ کے قیدیوں میں یہ چھوٹا کتبغا بھی شامل تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا اور اسے مصر میں فوجی خدمات پر لگا دیا گیا۔ ۲۵ برس بعد وہ ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچا کہ مصر وشام کا سارا انتظام اس کے ہاتھوں میں تھا۔[1] اس سے اسلام کی اس رواداری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو سات صدیوں بعد بھی مسلم معاشرے میں اس حد تک موجود تھی کہ دشمن قوم کا ایک قیدی مسلم سلطنت کی مسندِ اقتدار تک پہنچ گیا۔ کتبغا کو یہ منصب اس کی قابلیت کی بنا پر ملا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وہ بہت اچھا حاکم تھا، سیرت، عدل وانصاف اور اسلام کی نصرت کے ولولے میں وہ سب امراء سے بہتر تھا۔“[2]

اس کے دور میں تاتاریوں کی بڑی تعداد مصر آئی اور مشرف بہ اسلام ہو کر یہیں آباد ہو گئی۔ یہاں کے خاندانوں سے ان کے رشتے ناتے بھی ہوئے اور یوں ایک ملا جلا معاشرہ وجود میں آنے لگا۔[3]

کتبغا کو حکومت کے صرف دو سال ملے۔ اس کے بعد امراء نے یہ الزام لگا کر اس کے خلاف بغاوت کر دی کہ وہ تاتاریوں سے خفیہ روابط قائم کیے ہوئے ہے۔ کتبغا نے یہ حالات دیکھ کر حکومت چھوڑ دی اور چپکے سے شام کی طرف فرار ہو گیا۔ یہ ۱۷ محرم ۶۹۶ھ کا واقعہ ہے۔[4]

---

① البدایة والنهایة: سنة ۶۹۳ھ، ۶۹۴ھ ② البدایة والنهایة: سنة ۶۹۴ھ

③ تاریخ ابن خلدون: ۵/ ۴۶۸، ط دار الفکر ...... سلطنتِ ممالیکِ مصر میں تاتاریوں کے نفوذ اور اثرات پر مصری مؤرخ دکتور صلاح الدین بن محمد نورکا محققانہ مقالہ ”الطوائف المغولیة فی مصر“ (شائع کردہ: منشأة المعارف اسکندریہ) قابلِ مطالعہ ہے۔

④ السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/ ۲۷۳، ۲۷۴، ط العلمیة

الملک المنصور حسام الدین لاجین

محرم ۶۹۶ھ تا ربیع الآخر ۶۹۸ھ (دسمبر ۱۲۹۶ء تا فروری ۱۲۹۹ء)

۱۸ محرم ۶۹۶ھ کو ممالیک نے اپنے ایک امیر حسام الدین لاجین کو ان شرائط کے ساتھ مسندِ حکومت پر لا بٹھایا کہ وہ اپنے لیے امتیازی طور طریقے نہیں اپنائے گا، امراء کے مشورے کے بغیر کوئی حکم جاری نہیں کرے گا اور اپنے خاص آدمیوں کو ارکانِ سلطنت پر ترجیح نہیں دے گا۔ ان شرائط پر حسام الدین لاجین سے دو بار حلف لیا گیا۔ اس کے بعد اس کی بیعت کی گئی۔ ①

لاجین مرحوم سلطان قلاوون کا غلام تھا، اسے ایک ہزار درہم میں خریدا گیا تھا۔ اس نے الملک المنصور کے لقب کے ساتھ حکومت شروع کی۔ وہ عادل اور منصف مزاج انسان تھا۔ تعمیراتی ذوق رکھتا تھا، اس نے ایک عرصے سے ویران جامع مسجد طولونیہ کو ۲۰ ہزار دینار (تقریباً ۵۰ کروڑ روپے) کی خطیر لاگت سے ازسرِ نو تعمیر کرایا اور وہاں ایک درسگاہ بھی شروع کی جس میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ②

اس دوران سابق بادشاہ الملک الناصر بن قلاوون کرک کے قلعے میں نظر بند تھا۔ ان حالات میں امرائے مصر میں یہ تحریک اٹھی کہ الملک الناصر کو قاہرہ لا کر تخت پر بٹھایا جائے۔ اگرچہ وہ ابھی تک سلطنت چلانے کے قابل نہیں تھا جبکہ موجودہ امراء زیادہ بہتر طور پر سلطنت کو سنبھالنے کے اہل تھے مگر یہ تحریک بہت جلد زور پکڑ گئی اور کئی امراء حسام الدین لاجین کے خلاف بغاوت پر تیار ہو گئے۔ آخر ۱۰ ربیع الآخر ۶۹۸ھ کو حسام الدین لاجین کو اس کے کئی وفادار امراء سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس نے دو سال دو ماہ تک حکومت کی۔ ③

❀❀❀

---

① البداية والنهاية: سنة ۶۹۶ھ؛ نهاية الارب: ۳۱/۳۱۳، ط دار الكتب قاهره

② تاريخ ابن خلدون: ۵/ ۴۶۹، ط دار الفكر

③ تاريخ ابن خلدون: ۵/ ۴۷۱ تا ۴۷۵، ط دار الفكر؛ السلوك لمعرفة دول الملوك: ۲/ ۳۰۰، ۳۰۱، ط العلمية

الملک الناصر بن قلاوون...... دوسرا دورِ حکومت

جمادی الاولی ۶۹۸ھ تا شوال ۷۰۸ھ (مارچ ۱۲۹۹ء تا اپریل ۱۳۰۹ء)

۴ جمادی الاولی ۶۹۸ھ کو الملک الناصر قاہرہ پہنچا۔ اب وہ پندرہ سال کا ہو چکا تھا۔ عوام وخواص کے ایک بہت بڑے جلوس نے اس کا استقبال کیا اور دو دن بعد تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ حقیقت میں الملک الناصر کا اصل دورِ حکومت اب شروع ہوا تھا۔ اس کا خاندان رعایا پر بڑا مہربان تھا اس لیے لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ [1]

مغلوں میں اقتدار کی کش مکش۔ غازان کی حکومت:

اس دوران مصر کی حریف مغل سلطنت میں کئی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ نصرانیت نواز ارغون خان بن اباقا یورپ سے مدد آنے کا انتظار کرتے کرتے ۶۹۰ھ میں مرگیا تھا۔ اس کا بیٹا شہزادہ غازان تختِ شاہی کی طرف دیکھتا رہ گیا اور اس کے سگے چچا کیخاتو خان نے جو مسلمان ہو چکا تھا، حکومت سنبھال لی۔ مگر مغلوں میں اب تک اسلام کی دعوت زیادہ پھیلی نہ تھی، لہٰذا کیخاتو کی حکومت کو تین سال گزرے تھے کہ مغل سرداروں نے بغاوت کر کے اس نو مسلم حکمران کو قتل کر دیا۔

کیخاتو کی جگہ ہلاکو کا ایک پوتا بایدو خان بن طراقائی بن ہلاکو تخت نشین ہوا۔ اس وقت تک نہ صرف چنگیز خان بلکہ ہلاکو خان کا قبیلہ بھی بہت پھیل چکا تھا۔ شہزادوں کی پوری قطار تھی اور حکومت کے کئی کئی دعوے دار تھے۔ اس لیے بہت جلد بایدو خان کی اپنے بھتیجے غازان بن ارغون سے چپقلش شروع ہوگئی جو خود کو ایل خانی سلطنت کا بہترین مستحق سمجھتا تھا۔ ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ غازان نے غالب آکر بایدو خان کو قتل کرا دیا اور ذوالحجہ ۶۹۴ھ میں ایل خانی مغل سلطنت کا تاجدار بن گیا۔ غازان نے اسلام قبول کر کے اپنا نام 'محمود' رکھ لیا تھا، تخت نشین ہوتے ہی اس نے سکوں پر کلمہ طیبہ نقش کرنے اور اسلامی شعائر کو عام کرنے کا حکم دیا۔ مگر قبولِ اسلام کے باوجود اپنے آباء واجداد کی مانند سفا کی اور مار دھاڑ کی سرشت اس پر غالب تھی اور نئے ممالک کی تسخیر کا جذبہ اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ اپنے پردادا ہلاکو خان کی طرح اس نے بھی پہلا ہدف شام اور مصر کو بنایا۔ [2]

غازان کی امرائے مصر سے ساز باز:

مملوک حکومت میں بار بار حکمرانوں کی تبدیلی سے ایک سیاسی بحران آچکا تھا، حکومت کمزور ہورہی تھی۔ غازان نے

---

① البدایة والنهایة :سنة ۶۹۸ھ

② تاریخ ابن خلدون: ۶۱۷/۵، ۶۱۸ ؛ البدایة والنهایة: ۶۷۶/۱۷، ط دار هجر

موقعے سے فائدہ اٹھایا اور مزید ہوشیاری یہ کی کہ باقاعدہ حملے سے پہلے مملوک امراء کو اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا۔ کئی مملوک جرنیلوں سے اس کی خط وکتابت ہوئی جنہوں نے اسے وفاداری کا یقین دلایا، کئی امراء اس کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ غازان نے ان کا مملکتِ تاتار سے تعلق مزید پختہ کرنے کے لیے انہیں تاتاری عورتوں کے رشتے دینے میں بھی توقف نہ کیا۔ ①

غازان کی یلغار۔ معرکہ حمص:

۶۹۹ھ میں غازان نے مملوک سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور اس کی افواج شام کی طرف بڑھنے لگیں۔ اس اطلاع سے اسلامی شہروں میں خوف ودہشت کی لہر دوڑ گئی کیوں کہ تاتاریوں کی سابقہ فتوحات کے تلخ ترین تجربات سے سب آگاہ تھے۔ شمالی شام کے شہروں: حلب اور حماۃ کے لوگ بھاگ بھاگ کر مملکت کے وسطی علاقوں میں پناہ لینے لگے۔ تاہم سلطان ناصر محمد بن قلاوون فوری طور پر مصر سے فوج لے کر شام کے دفاع کے لیے آن پہنچا۔

۸ ربیع الاول کو شاہی فوج دمشق میں داخل ہوئی۔ نئے مجاہدین بھرتی کر کے لشکر دمشق سے روانہ ہوا۔ شام کے علماء وفقہاء اور عمائدِ شہر ہم رکاب تھے۔ مساجد میں دعائیں کی جا رہی تھیں اور قنوتِ نازلہ پڑھی جا رہی تھی۔

مگر جنگ سے پہلے ہی فوج میں بددلی پھیل چکی تھی۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ غازان کے قبولِ اسلام کے بعد تاتاری بہت بڑی تعداد میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ مقابلے پر آنے والی تاتاری فوج کی اکثریت انہی نومسلموں پر مشتمل تھی۔ اس لیے شام اور مصر کے بہت سے سپاہی دلی طور پر ان نومسلموں سے لڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ جو امراء مملوکوں سے باغی ہو کر غازان سے جا ملے تھے، انہیں وہاں خوب نوازا گیا تھا، غازان کی اس سخاوت وعنایت نے بھی اسے نیک نامی بخش دی تھی۔ اس کے برخلاف کچھ ماہ پہلے شام کی سرحدی سپاہ نے عراق میں تاتاریوں کی حدود پر حملے کیے تھے جس میں وہاں آباد مسلمانوں کا بھی بہت جانی ومالی نقصان ہوا تھا۔ اس واقعے سے ایک طرف تو غازان کو حملے کا بہانہ ہاتھ آ گیا تھا، دوسرے خود شامی مسلمان اپنی حکومت اور فوج کو تنقید کا نشانہ بنانے لگے تھے۔ سلطان کی طرف سے جنگ سے پہلے مالی عنایات میں کمی نے بھی سپاہیوں کو مایوس کیا۔ پس اس ماحول میں یہ باتیں مشہور ہو گئی تھیں کہ مملوکوں کو تاتاریوں سے شکست ہو گی۔

آخر ۷ ربیع الاوّل کو سلطان کا لشکر نکلا اور حریف کی خبریں وصول کرتا ہوا حمص کے باہر خیمہ زن ہوا۔ ادھر سے تاتاری پیش قدمی کرتے آ رہے تھے۔ ایک شب اطلاع ملی کہ تاتاری سلمیہ کے قریب وادی خزندار پہنچ چکے ہیں۔ لشکرِ سلطانی نے یہ سن کر علی الصبح کوچ کیا اور ایک ہی دن میں نہایت تیزی سے تین منازل طے کر کے دشمن کو جا لیا۔

سلطان کو لشکر سے دور ایک بلند ٹیلے پر ٹھہرایا گیا تاکہ جنگ میں شکست ہو تو بھی سلطان نرغے میں نہ آئے۔ اب فریقین صف بندی کر رہے تھے۔ غازان کے ساتھ دربارِ مصر سے وابستہ کئی امراء بھی تھے جن میں سیف الدین قبچق،

① مختار الاخبار، لبیبرس المنصوری (م ۷۲۵ھ)، ص ۱۰۷، الدار المصریۃ اللبنانیۃ، ۱۹۹۳ء

بکتر اور فارس الفا ہری نمایاں تھے۔ ان سے غازان کو مصری وشامی افواج کی خوبیوں اور کمزوریوں کا اچھی طرح علم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی معلومات اور تجربے کے تحت فوج کو حکم دیا کہ وہ ساکت کھڑی رہ کر دشمن کے حملے کا انتظار کرے۔ تقدیر کی بات کہ عین حملے کے وقت مصری سپہ سالار بیبرس کی طبیعت بگڑ گئی اور اسے چار پائی پر ڈال کر خیمہ گاہ کی طرف لے جایا گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں مملوکوں نے حریف پر جارحانہ حملے کا فیصلہ کرلیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی:

''نیزے پھینک دو۔ تلواریں سونت لو۔''

پوری فوج نے نیزے پھینک دیے مگر بہت جلد ثابت ہو گیا کہ یہ حکم نقصان دہ تھا۔ شہ سواروں نے دھاوا بولنے کے لیے گھوڑوں کو ایڑ لگائی تو بہت سے گھوڑوں کے سُم زمین پر گرے، نیزوں کی اَنیوں پر لگے اور کٹ گئے۔

دوسری غلطی یہ ہوئی کہ نفط اندازوں نے اس اندازے سے آتشیں محلول پھینکنا شروع کیا کہ دشمن یلغار کر کے اس کی زد میں آجائے گا مگر دشمن اپنی جگہ پر رہا اور اپنی ہی فوج آگے بڑھتے بڑھتے اس کی زد میں آگئی۔

جارحانہ حملے کی حکمتِ عملی اس لحاظ سے بھی درست نہ تھی کہ فوج جو تین منازل طے کر کے آئی تھی، اس طرح مزید تھکن کا شکار ہوگئی۔ پھر جب گھڑ سوار مجاہدین دشمن کے قریب پہنچے اور اسے نہایت منظم انداز میں ساکت وجامد دیکھا تو مرعوب ہو گئے اور ان کا حملہ کمزور ثابت ہوا۔ تو مسلموں پر حملے کا تصور بھی ان کا جوش ٹھنڈا کیے دے رہا تھا۔

اس دوران مغل لشکر نے جوابی کارروائی شروع کردی۔ دیر تک گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ اس دوران مملوکوں کے میسرہ نے ایک زوردار دھاوے میں تاتاریوں کے میمنہ کو پسپا کر دیا۔ ایسا لگتا تھا مملوک آج عین جالوت کی تاریخ دہرادیں گے۔ مگر غازان نے یہ دیکھا تو اپنے خاص دستے کے ساتھ میمنہ کی مدد کے لیے گیا اور اس کے قدم جمادیے۔ اس کے حکم سے مغل تیراندازوں نے مملوکوں کے دائیں بازو پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کردی جس سے صفوں میں ابتری پھیل گئی۔ اگلی صف میں موجود طرابلس کا حاکم سیف الدین کرت سب سے پہلے تیروں کی زد میں آیا۔ وہ جنگ سے پہلے ایک دوست کو کہہ رہا تھا: ''گزشتہ شب خواب دیکھا ہے کہ ایک پرندہ مجھے کہہ رہا ہے، پڑھو:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

(اے ہمارے رب! ہمارے دِلوں کو ٹیڑھا نہ کرنا اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں عنایت کر اپنے پاس سے رحمت۔ بیشک تُو ہے خوب عطا فرمانے والا۔) [1]

میں نے یہ آیت پڑھی تو اس پرندے نے مجھے اپنے دائیں پر کے اوپر بٹھایا اور ایک باغ میں لے گیا۔ اس خواب کی تعبیر یہی سمجھتا ہوں کہ مجھے شہادت نصیب ہوگی۔''

تیروں کی بارش ہوئی تو سب سے پہلے اسی کا گھوڑا چھلنی ہوا۔ اس کے بعد تاتاریوں کا عام حملہ شروع ہوا۔ ان کے بائیں بازو نے مملوکوں کے دائیں بازو کی صفیں الٹ دیں۔ سیف الدین گھوڑے سے اتر کر تلوار چلاتا رہا اور نہایت

[1] سورۂ آل عمران، آیت نمبر ۸

بہادری سے لڑتے لڑتے رتبۂ شہادت پا گیا۔ مملوکوں کا دایاں بازو تتر بتر ہو گیا۔

سلطان محمد بن قلاوون، اس وقت اپنے محافظوں کے ساتھ میدان میں خون کی ندیاں بہتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ معرکے میں گھس جائے مگر امراء نے اسے روک دیا کہ کہیں اسے گزند پہنچی تو سب تلپٹ ہو جائے گا۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ مملوکوں کے قدم ایسے اکھڑے کہ پھر جم نہ سکے۔ یہ منظر دیکھ کر سلطان نے روتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: ''یا اللہ! مجھے مسلمانوں کے لیے نحوست کا باعث نہ بنانا۔''

سلطان کے محافظ اسے بمشکل بچا کر بعلبک کے قلعے میں پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

امیر بدر الدین سلاح زخمی حالت میں تھا۔ ہزیمت دیکھ کر اپنا برق رفتار گھوڑا منگوایا جس کی نظیر کہیں نہ تھی۔ اس پر سوار ہونے لگا تو رفقاء نے کہا: ''گھوڑا نہایت قوی ہے، آپ اس حالت میں اسے کیسے قابو کریں گے۔''

وہ سمجھ رہے تھے کہ امیر فرار کے لیے گھوڑے پر سوار ہو رہا ہے مگر امیر نے گھوڑے کی لگام دشمن کی طرف پھیر دی اور آواز لگائی: ''جو شہادت چاہتا ہے میرے پیچھے آجائے۔''

افسران نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ بولا: ''اللہ کی قسم! میں تو اس دن کا کب سے منتظر تھا۔''

امیر قوام الدین نے کہا: ''آپ لشکر کے نگران ہیں، ہمارا کوئی امیر نہیں جو زخمی نہ ہو چکا ہو۔ اکثر مملوک شہید ہو چکے ہیں۔ جائز نہیں کہ ہم خود کو ہلاکت میں ڈالیں۔''

بدر الدین نے جواب دیا: ''جب کچھ بچا ہی نہیں تو آج کے دن پیچھے کیوں رہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو دشمن کی طرف دوڑا دیا۔ مگر ایک مملوک اس کی جان بچانے کے لیے ساتھ دوڑ پڑا اور گھوڑے کا رخ حمص کی طرف پھیر کر اسے ایک چابک دے مارا۔ گھوڑا بجلی کی طرح اچھلا اور چشم زدن میں غبار اڑاتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ جب وہ حمص کی قریبی نہر میں اترا تو امیر ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ کچھ غلاموں نے بروقت پہنچ کر اس کی جان بچائی اور اسے دوسرے گھوڑے پر سوار کر کے قلعے میں لے گئے۔

۲۸ ربیع الاوّل ۶۹۹ھ کو برپا ہونے والی اس جنگ کا نتیجہ بڑا بھیانک تھا۔ مملوکوں کے بڑے بڑے امراء میدانِ جنگ میں کام آچکے۔ بہت سے فرار کے دوران پکڑ کر قتل کیے گئے۔ خیمہ گاہ میں موجود اسلحے کے ذخائر اور بے اندازہ مالیت کا ساز و سامان دشمن کے ہاتھ لگ گیا۔ غازان مملوکوں کا تعاقب کرنا چاہتا تھا مگر اس کے مشیروں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ممکن ہے حریف فوج کوئی چال چل رہی ہو۔[1]

شام میں خوف و ہراس:

شکست کی خبر سے دمشق اور گرد و نواح کے علاقوں میں کہرام مچ گیا۔ لشکر کے باقی ماندہ لوگ دمشق پہنچے تو وہاں سخت بدحواسی پھیل گئی۔ ڈر تھا کہ تاتاری پہلے کی طرح قتل عام کریں گے۔ البتہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ غازان مسلمان ہے

---

(1) عقد الجمان للعینی: سنة ۶۹۹ھ؛ النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة: ۱۲۲/۸

اس لیے سب کو جان و مال کی امان دے گا۔ کچھ خوش فہمی میں مبتلا لوگ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ غازان ہمیں مالا مال کر دے گا۔ مگر اکثریت خوف زدہ تھی۔ شہری انتظامیہ میں سے صرف قلعہ دار اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ قلعے میں مقیم رہا۔ باقی حکام، قضاۃ، افسران اور سپاہیوں کی اکثریت شہر چھوڑ گئی۔ علماء وفقہاء اور عوام وخواص میں سے جن کا بس چلا وہ نقل مکانی کر گئے۔ پیچھے اوباشوں کی بن آئی اور لوٹ مار عام ہوگئی۔ قیدی جیل توڑ کر باہر نکل آئے اور باغات کے دروازے اور کھڑکیاں اکھاڑ کر لے گئے۔[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی جرأت۔ غازان سے گفتگو:

سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ تاتاری کسی بھی وقت دمشق میں داخل ہوا چاہتے تھے اور ان کی دہشت سے ہر شخص لرزہ براندام تھا۔ ان حالات میں دمشق کی ایک مایہ ناز علمی شخصیت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اصلاحِ احوال کا بیڑا اٹھایا۔ وہ عمائدِ شہر کے ایک وفد کے ساتھ غازان سے ملنے گئے تاکہ اس سے اہلِ دمشق کے لیے جان کی امان حاصل کریں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جب غازان سے ملنے گئے تو اسے عدل وانصاف کے بارے میں آیات اور احادیث کھل کر سنائیں۔ انہوں نے غازان سے کہا: ”تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ امام اور مؤذن بھی ہیں مگر اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر چڑھائی کی۔“

غازان اِن کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ اس نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ عالم کون ہیں؟ میں نے اس سے زیادہ دلیر اور مضبوط دل گردے والی شخصیت آج تک نہیں دیکھی۔ اس پر لوگوں نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے علمی کمالات کا ذکر کیا۔ اس ملاقات میں ضیافت بھی ہوئی۔ وفد کے سب لوگ شریک ہوئے مگر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ جب وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

”یہ کھانا جائز نہیں؟ یہ تو غریب مسلمانوں کی لوٹی ہوئی بھیڑ بکریوں اور ان کی لکڑی کے ایندھن سے پکایا گیا ہے۔“

غازان نے دعا کی درخواست کی تو امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا:

”یا اللہ! اگر اس جنگ سے غازان کا مقصد تیرے دین کی سربلندی اور تیری راہ میں جہاد ہے تو اس کی مدد فرما اور اگر دنیا کی سلطنت اور حرص وہوس مقصد ہے تو پھر تو ہی اس سے نمٹ لے۔“

غازان ان الفاظ پر آمین آمین کہتا رہا[2] جبکہ وفد کے دیگر علماء اپنے کپڑے سمیٹ رہے تھے کہ ابھی حکم ہوگا اور ابھی شیخ کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ غازان نے امام صاحب کی سفارش پر بہت سے قیدی آزاد کر دیے اور انہیں اعزاز واکرام کے ساتھ یہ یقین دلا کر رخصت کیا کہ اہلِ شام کو امن دیا جائے گا۔ اس مجلس سے نکل کر ان کے بعض ساتھی ان پر برس پڑے اور بولے: ”آپ نے تو ہماری ہلاکت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اب ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔“

---

① النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة: ۱۲۴/۸؛ البداية والنهاية: سنة ۶۹۹ھ

② یاد رہے کہ غازان تاتاری ہونے کے باوجود عربی سمجھتا تھا، پس یہ خیال نہ کیا جائے کہ وہ امام صاحب کی دعا کو سمجھے بغیر آمین کہہ رہا ہوگا۔

وہ بولے: ''میں خود بھی تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔''

وفد کے ارکان دمشق روانہ ہوئے تو راستے میں لٹیروں سے پالا پڑا جنہوں نے ان کا لباس تک چھین لیا جبکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کچھ دیر بعد واپس ہوئے تو ان کی حق گوئی کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی اور راستے میں لوگ برکت کے حصول کے لیے ان کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ وہ اس شان سے دمشق پہنچے کہ تین سو افراد ہم رکاب تھے۔[1]

دمشق میں مغلوں کی لوٹ مار۔ قلعہ سر کرنے کی کوششیں:

غازان نے سیف الدین قبچق کو دمشق میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اس نے دمشق آکر غازان کی طرف سے لوگوں کو جان کی امان کا مژدہ سنایا۔ تاہم یہ وعدہ ایفا نہ ہوا۔ اگرچہ سابقہ دور جیسا قتلِ عام تو نہ ہوا مگر ہزاروں افراد قید اور ہزاروں قتل کیے گئے۔ عورتوں کی پردہ دری کی گئی، شرفاء کی لڑکیاں باندیاں بنائی گئیں۔ کتب خانوں اور وقف کی عمارتوں تک کو لوٹ لیا گیا۔ تاتاریوں نے جامع مسجد میں گھس کر شراب پی اور عورتوں سے بدکاری کی۔ حکومت کے مویشی، اناج اور اسلحے کے گودام غصب کر لیے گئے۔ کم از کم ۲۰ ہزار جانور دمشق سے ہانک کر اپنی خیمہ گاہ میں پہنچائے گئے۔ سرکاری خزانے سے جو رقم لوٹی گئی اس کی مالیت کم از کم ۳۶ لاکھ درہم (تقریباً ۹ ارب روپے) تھی۔ جاں بخشی کے بدلے ہر شہری پر ٹیکس لگا دیا گیا چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ شہر کے ہر بازار سے لاکھوں دینار جبراً وصول کیے گئے اور نہ دینے والوں کو سخت زدوکوب کیا گیا۔

شہر کے گردونواح میں بھی تاتاریوں کی لوٹ مار جاری تھی۔ بڑے بڑے علماء کی گردنوں میں رسیاں ڈال کر انہیں گھسیٹا گیا۔ میدانِ جنگ سمیت دمشق اور مضافاتی قصبات میں قتل ہونے والے سپاہیوں اور عام شہریوں کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ تک لگایا جا رہا تھا۔ قیدی گیارہ ہزار سے کم نہ تھے۔ ہر طرف تاتاری قابض ہو چکے تھے۔ صرف دمشق کا عظیم الشان قلعہ ان کی دست برد سے محفوظ تھا اور قلعہ دار ''سنجر منصوری ارجواش'' وہاں ڈٹا ہوا تھا۔ اس کی استقامت کے پیچھے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوصلہ افزا پیغامات کارفرما تھے۔ انہوں نے قلعہ دار کو کہلوایا تھا کہ جب تک ایک پتھر بھی باقی ہے تم قلعہ حوالے نہ کرنا۔ حملہ آوروں نے منجنیقوں کی تنصیب شروع کی تو قلعے سے جوابی آتش زنی کی گئی اور منجنیق جل گئی۔ یہ سن کر غازان خود قلعہ فتح کرنے دمشق پہنچا۔ اس نے خندق پاٹنے کا حکم دیا مگر گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ بھرائی میں کم سے کم ایک مہینہ لگ جاتا۔ آخر غازان کے حکم سے اس کے نائب سیف الدین قبچق نے قلعہ دار سے جا کر ملاقات کی، ہتھیار ڈالنے کی صورت میں جاں بخشی کا وعدہ کیا اور بصورتِ دیگر عبرت ناک انجام کی دھمکی دی۔

قلعہ دار بڑا دلیر تھا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا: ''کون ہے جو قلعے کے قریب آنے کی جرأت کرے۔ میں اسے تیروں سے چھلنی کر دوں گا۔ جا کر غازان سے کہو کہ وہ قلعے کے پاس آ کر اپنا حشر دیکھ لے۔''

---

[1] الاعلام العلیۃ فی مناقب ابن تیمیۃ لابی حفص البزار، ص ۶۹ تا ۷۲، ط المکتب الاسلامی بیروت؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۷/۷۱۹، ط دار ھجر؛ العقود الدریۃ فی مناقب ابن تیمیۃ لابن عبدالہادی الدمشقی (م ۷۴۴ھ)، ص ۱۳۴، ط دار الکتاب العربی بیروت

غازان نے جلد از جلد نئی منجنیقوں کی تنصیب کا حکم دیا۔ انجینئر ان کی تیاری پر جٹ گئے۔ قلعہ دار نے جاسوسوں کے ذریعے معلوم کرالیا کہ منجنیق سازی کہاں ہو رہی ہے۔ اس نے رات کو چند چنیدہ سپاہی بھیجے جنہوں نے منجنیق سازوں کو خنجروں سے مار ڈالا اور منجنیقوں کو روغنِ نفط سے جلا کر تاریکی میں غائب ہو گئے۔ اس طرح قلعہ سر کرنے کی مہم طویل ہوتی چلی گئی۔ اس دوران لوگ خوفزدہ ہو کر گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔ مساجد ویران ہو گئیں۔ جمعہ کی نماز میں بھی شہر کی سب سے بڑی مسجد جامع اموی میں ایک صف بمشکل پوری ہوتی تھی۔ کسی شخص کو گھر سے نکلنا پڑتا تو وہ بوسیدہ کپڑے پہن کر فقیروں کے بھیس میں نکلتا اور کام ختم ہوتے ہی فوراً واپس آتا۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آجائے۔

جمادی الاولیٰ کے وسط میں غازان فوج کے بڑے حصے کے ساتھ عراق واپس چلا گیا البتہ اس کی فوج کا ایک حصہ قلعے کو گھیرے رہا اور ایک دستہ بولائی نامی تاتاری سردار کی قیادت میں دمشق کے مضافات میں تباہی مچاتا رہا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علماء کا وفد لے کر بولائی سے اس کی خیمہ گاہ میں جا کر ملے اور لوگوں پر رحم کرنے کو کہا۔ ان کی سفارش سے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کو آزاد کر دیا گیا۔ ①

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور مغل حاکم کی گفتگو:

بولائی نے اس ملاقات میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے کچھ سوالات بھی کیے۔ انہوں نے بڑے معتدل اور مدلل جوابات دیے۔ بولائی نے پوچھا: ''تم یزید کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو۔''

امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ہم نہ اس کو بُرا بھلا کہتے ہیں نہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ کوئی نیک آدمی نہیں تھا کہ ہم اس سے محبت کریں۔ اور نہ ہی ہم کسی متعین مسلمان کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔''

بولائی نے کہا: ''کیا تم یزید پر لعنت نہیں کرتے؟ کیا وہ ظالم نہ تھا؟ کیا اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کرایا؟''

امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا:

''ہم ظالموں کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو قرآن مجید نے کہا ہے: اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (آگاہ رہو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔) مگر ہم کسی کو متعین کر کے اس پر لعنت نہیں کرتے، بعض علماء نے یزید پر لعنت بھی کی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش ہے لیکن ہمارے نزدیک پہلا قول بہتر ہے۔ ہاں جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا یا اس میں مدد کی یا اس پر راضی ہوا، اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو، اللہ تعالیٰ اس کا کوئی عمل قبول نہ کرے۔'' ②

---

① عقد الجمان للعینی: سنة ۶۹۹ھ؛ البدایة والنہایة سنة ۶۹۹ھ؛ السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی: سنة ۶۹۹ھ

② اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ یزید پر لعنت کو مجتہد فیہ مسئلہ مانتے تھے یعنی جوازِ لعنت کے قائلین کو بھی اہلِ حق تسلیم کرتے تھے۔ البتہ لعنت سے احتراز کو وہ راجح مسلک قرار دیتے تھے جیسا کہ جمہور اہلِ سنت کا قول ہے۔ مگر آج کل ''بعض حضرات'' کے نزدیک یزید پر لعنت کا حرام ہونا مسئلہ قطعی ہے اور لعنت کے جواز کے قائلین کو سُنی ماننے والے بھی ان کے نزدیک رافضیت کے ڈسے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں یہ حضرات امام ابن تیمیہؒ کے بارے میں کیا فتویٰ دیں گے!!

بولائی نے پوچھا: ''تم اہل بیت سے محبت کرتے ہو۔''

فرمایا: ''ان کی محبت ہمارے نزدیک فرض وواجب ہے، جس پر اجر ملتا ہے۔''

اس کے بعد امام صاحب رحمہ اللہ نے اس کی دلیل میں حدیث غدیرِ خم سنائی۔[1] پھر فرمایا:

''ہم ہر نماز میں درود پڑھتے ہیں، جس میں ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ'' پڑھا کرتے ہیں۔''

بولائی کہنے لگا: ''تو پھر اہل بیت سے نفرت کون کرتا ہے؟''

امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جوان سے نفرت کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت۔''

اس کے بعد امام صاحب رحمہ اللہ نے وزیر سے پوچھا: ''یہ تاتاری ہوکر یزید کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟''

وزیر نے کہا: ''تاتاریوں کو بتایا گیا ہے کہ شام والے ناصبی ہیں۔'' امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بلند آواز میں فرمایا:

''یہ جھوٹ ہے۔ جس نے یہ کہا اس پر اللہ کی لعنت۔ دمشق میں کوئی ناصبی نہیں۔ اگر یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی توہین کرے تو لوگ اس پر چڑھ دوڑیں گے۔ ہاں پہلے زمانے میں یہ بنوامیہ کا مرکز تھا۔ اس وقت بعض اموی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عداوت رکھتے تھے اور انہیں بُرا بھلا کہتے تھے مگر اب یہاں ایسے لوگوں میں سے کوئی باقی نہیں۔''[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کوشش سے شراب خانوں کی بندش:

اس دوران نئے حاکم سیف الدین قبجق نے شراب خانے کھلوادیے تھے جو اس کی آمدن کا بڑا ذریعہ بن گئے تھے۔ شراب خانہ یومیہ ایک ہزار درہم ٹیکس ادا کرتا تھا۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ حاکم سے ملے اور اسے سمجھایا کہ یہ بالکل ناجائز کام ہے۔ وہ مان گیا اور امام صاحب رحمہ اللہ نے اس کی اجازت سے کئی مے خانوں میں جاکر شراب تلف کردی۔[3]

تاتاریوں کا شام سے انخلاء:

رجب کے آغاز تک تاتاری دمشق اور مضافات پر قابض رہے۔ اس دوران الملک الناصر قلاوون نے قاہرہ پہنچ کر بے پناہ مالی وسائل خرچ کر کے ایک نئی جنگ کی تیاری شروع کردی تھی۔ دمشق میں اطلاع پہنچی کہ سلطانِ مصر تازہ افواج لے کر آنے کو ہے۔ یہ سنتے ہی تاتاری نہایت تیزی سے دمشق اور اس کے مضافات کو خالی کر کے دریائے فرات کی طرف کوچ کر گئے۔ اس وقت دمشق میں کوئی حاکم تھا نہ منتظم، پولیس تھی نہ فوج۔ شہر میں اب بھی شراب کی کچھ دکانیں باقی تھیں۔ تاتاریوں کے واپس جاتے ہی دیندار مسلمانوں کو حوصلہ ہوا کہ ان خرابیوں کا سدباب کریں۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے تلامذہ اور ساتھیوں کے ساتھ شہر کا دورہ کیا، مے خانوں میں جاکر شراب بہادی، ساغرو مینا توڑ ڈالے اور اس برائی کے مرتکبین کو سخت سرزنش کی۔ اس کارروائی پر شہر کے شریف لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

---

① آج کل کے نام نہاد محققین ''حدیثِ غدیرِ خم'' سے نالاں ہیں اور اس سے استدلال کو رفض قرار دیتے ہیں۔ اس فتوے کی زد میں امام ابن تیمیہ بھی آتے ہیں۔

② مجموع الفتاوی لابن تیمیة: ۴۸۷/۳ تا ۴۸۸، یہ واقعہ خود امام ابن تیمیہ کی زبانی منقول ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک بھی اُموی دور میں شام میں ناصبیت موجود تھی اور خود بعض اموی حکام اس مرض میں مبتلا تھے۔ پس امویوں سے ناصبیت کی مطلقاً نفی کرنا درست نہیں۔

③ عقد الجمان للعینی: سنة ۶۹۹ھ ؛ البدایة والنهایة سنة ۶۹۹ھ ؛ السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۶۹۹ھ

تاتاری شہر کی فصیل کو جگہ جگہ سے منہدم کر چکے تھے۔ قلعہ دار سنقر منصوری نے اعلان کرایا کہ شہر کے لوگ مسلح ہو کر باری باری فصیلِ شہر پر پہرہ دیں۔ اس کام میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پیش پیش تھے۔ وہ رات بھر فصیل کے گرد گشت کرتے اور لوگوں کو اللہ کی راہ میں جہاد اور پہرے کے فضائل سناتے اور ہمت و استقامت کی تلقین کرتے۔ [1]

باغیوں کے خلاف مہمات میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کوششیں:

شام کے علاقے کوہ جرد اور کسروان کے قبائل جن میں باطنیہ و اسماعیلیہ جیسے شیعہ فرقوں کے علاوہ نصرانی بھی شامل تھے، مدتِ دراز سے مقامی حکومتوں کے خلاف درد سر بنے ہوئے تھے، انہوں نے تاتاریوں کا پورا ساتھ دیا تھا اور جب مملوک سپاہی شکست کھا کر ان کے علاقے سے گزر رہے تھے تو ان کوہستانیوں نے انہیں گھیر کر قتل کرنے اور لوٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تاتاریوں کے دمشق سے نکل جانے اور سرکاری افواج کا نظم و ضبط دوبارہ قائم ہونے کے بعد امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کوہستانی لٹیروں کی تادیب میں بھی حصہ لیا۔ جب ذی قعدہ ۶۹۹ھ میں سرکاری فوج نے ان علاقوں پر یورش کی تو امامِ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ رضا کاروں کا ایک لشکر لے کر ساتھ نکلے۔ کوہستان کے کئی باغی اور لٹیرے سرداروں نے ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور فوج سے چھینا گیا سامان واپس کر دیا۔ [2]

مسلمانوں کی تقویتِ قلب کے لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا رسالہ:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان ایام میں ایک مختصر رسالہ تحریر کیا جو حالیہ شکست کے اسباب، غم زدہ دلوں کو تسلی اور جہاد کی بھرپور ترغیب پر مشتمل تھا۔ انہوں نے اس میں لکھا:

"گزشتہ سال مسلمانوں کی شکست کی وجہ کھلے گناہ اور منکرات تھے مثلاً نیتوں کا کھوٹ، غرور و تکبر، ظلم، بے حیائی، کتاب و سنت سے بے توجہی، اللہ کے فرائض کی پابندی میں کوتاہی، الجزیرہ اور روم میں مسلمانوں پر زیادتی۔ پس یہ اللہ کی حکمت تھی کہ وہ مسلمانوں کو اس بلاء میں مبتلا کرے تا کہ ان کی صفائی ہو جائے اور وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ دشمنانِ اسلام کی سرکشی، مکاری، بدعہدی اور شریعت سے روگردانی واضح ہو جائے تا کہ مسلمان اللہ کی مدد کے حق دار بنیں اور دشمن انتقام کے۔" [3]

سلطانِ مصر کے نام امامِ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کا مکتوب:

اگلے مہینوں میں وقفے وقفے سے تاتاریوں کی دوبارہ یورش کی افواہیں پھیلتی رہیں اور دمشق کے لوگ خوف و ہراس کی حالت میں رہے۔ جبکہ مصر سے الملک الناصر قلاوون کی افواج آنے میں تاخیر ہوتی رہی۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ضروری سمجھتے تھے کہ مصر سے ایک بھاری لشکر آ کر مستقل طور پر شام کی سرحدوں پر قیام کرے اور یہاں کا دفاع

---

[1] البداية والنهاية: سنة ۶۹۹ھ

[2] البداية والنهاية سنة ۶۹۹ھ

[3] العقود الدرية فى مناقب ابن تيمية لابن عبد الهادى، ص ۱۳۶، ط دار الكاتب العربى، بيروت

سنبھالے۔ انہوں نے سلطان مصر کے نام ایک طویل مکتوب لکھا جسے بڑی شہرت ملی، اس میں انہوں نے فتنہ تاتار کی تباہ کاریوں اور مسلمانوں کی حالیہ شکست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تسلی کے طور پر لکھا:

''یہ فتنہ جو پھیل چکا ہے، اگرچہ دل فگار ہے مگر ان شاء اللہ اس کی مثال اس دوا کی سی ہے جو مریض کو پلائی جائے۔ اس کے ذریعے مشرق و مغرب میں سب مسلمانوں کو ان خارجیوں کی حقیقت معلوم ہوگئی جو کلمہ پڑھ کر بھی شریعت سے برگشتہ ہیں۔ جو لوگ دل سے اسلامی لشکر سے نالاں تھے وہ پھر اس کے حامی ہو گئے ہیں۔ مسلمان نیند سے بیدار ہو چکے ہیں اور سلطان کی جانب سے جہاد کی تیاری اور اس کے لیے دولت وقف کر دینے پر خوش ہیں۔''

انہوں نے جہاد کے لیے اس وقت کو نہایت موزوں قرار دیتے ہوئے لکھا:

''اس وقت اللہ کا امت پر انعام ہے کہ مشرق و مغرب کے مسلمان متحد ہیں۔ مشرقی شہروں کے مسلمان اللہ کے لشکروں کے منتظر ہیں۔ موصل، الجزیرہ اور کردستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد جہاد کے لیے تیار ہے۔''

انہوں نے انکشاف کیا کہ اس وقت غازان اپنی مملکت میں اندرونی اختلافات سے دوچار ہے۔ اس کے بعد لکھا:

''مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ دشمنوں کے اپنی زمین میں گھسنے کا انتظار کرتے رہیں۔ حضور ﷺ اور ان کے خلفاء دشمن کی طرف لشکر بھیجا کرتے تھے چاہے دشمن نے ان کی سرزمین کا رخ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے مرض وفات میں بھی فرمایا کہ اسامہ کے لشکر کو روانہ کر دو۔ اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا۔''

انہوں نے شرعی مسئلہ بتاتے ہوئے کہا:

''مسلمانوں پر لازم ہے کہ کم از کم سال میں ایک بار دشمن کی زمین کو روندیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ گنہگار ہوں گے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان کفار پر یلغار کرتے رہے، فتح پاتے رہے۔''

اس کے بعد سلطان کو لشکر کشی کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھا:

''اس کا پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے دل مضبوط رہیں گے اور وہ تعمیراتی کاموں اور کاشت کاری میں مشغول ہو جائیں گے۔ بصورتِ دیگر جب تک دشمن چلا نہ جائے گا وہ خوفزدہ رہیں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ (شام کے) شمالی شہروں حلب وغیرہ میں معاشی لحاظ سے بہترین وسائل ہیں جن سے لشکر نفع اٹھائے گا۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ان شہروں میں آپ کے مددگار اور خیر خواہوں کے دل مضبوط رہیں گے اور دشمن پر رعب پڑے گا۔ ورنہ لوگ دشمن کے ساتھ جا ملیں گے کیوں کہ لوگ اسی کے ساتھ ہوتے ہیں جس کا سکہ چل رہا ہو۔ پس اگر فوج کا ایک حصہ ہمیشہ سرحد پر قیام پذیر رہے تو یہ بہت اچھا ہوگا۔

چوتھا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر افواج الجزیرۃ پر تسلط پا کر وہاں مسلمانوں کو ایذا دیے بغیر سرکاری اموال بازیاب کرا لیں تو یہ نہایت نفع بخش ہوگا۔ اور اگر وہ وہاں ٹھہر جائیں تو ان علاقوں کے امراء بھی ان سے آملیں گے۔ کیوں

کہ روافض اور نصرانیوں کے سوا، سب کے دل ویسے بھی مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔"[1]

جب حکام کا تذبذب برقرار رہا تو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سلطان سے ملنے خود مصر روانہ ہوئے۔ وہ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۷۰۰ھ کو قاہرہ پہنچے۔ سلطان سے ملاقات میں انہوں نے کہا:

"اگر شام آپ کی سلطنت میں شامل نہ ہوتا تب بھی اگر شام کے لوگ آپ سے مدد مانگتے تو آپ پر ان کی اعانت واجب تھی۔ اب تو شام آپ کی حکومت کا حصہ ہے۔ اگر آپ کو اس کی حفاظت کی پروانہیں تو صاف کہہ دیں۔ ہم خود اپنا انتظام کرلیں گے اور ایسا حاکم خود منتخب کریں گے جو خطرے کے وقت ملک کی حفاظت کرے اور امن کی حالت میں اس سے فائدہ اٹھائے۔"

الملک الناصر ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، اس نے جہاد کا پختہ عزم کرلیا۔ تاہم فی الحال اس نے بارش اور سردی کی وجہ سے فوری طور پر فوج کشی سے معذرت کی۔[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کچھ مدت سلطان کے مہمان رہے۔ جب وہ دمشق واپس پہنچے تو اطلاع ملی کہ شاہِ تا تار غازان نئی افواج کے ساتھ عراق پہنچ گیا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لوگوں کو ہمت دلائی اور خوش خبری دی کہ سلطانِ مصر جلد افواج لے کر شام آرہا ہے مگر انتظار کے دن طویل ہوتے گئے۔

اس دوران ۱۸ جمادی الاولیٰ ۷۰۱ھ کو مصر میں خلیفہ حاکم عباسی کی وفات ہوگئی۔ وہ محرم ۶۶۱ھ میں مسندِ خلافت پر بیٹھا تھا۔ اس طرح اس نے چالیس سال تین ماہ تک اس مسند کو رونق بخشی۔ اس کے بعد اس کے فرزند ابو ربیع سلیمان کو خلافت ملی، وہ مستکفی باللہ کے لقب سے اس مسند پر براجمان ہوا۔[3]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی قوم کو متحد اور بیدار رکھنے کی کوششیں:

مصری افواج کی آمد میں دیر ہوتی رہی مگر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے عوام اور فوج کا حوصلہ بلند رکھا۔ وہ قسم کھا کر کہتے تھے: "اس بار ہم ضرور فتح پائیں گے کیوں کہ ہم مظلوم ہیں اور مظلوم کی مدد ضرور ہوتی ہے۔"

وہ یہ آیت پڑھتے:

ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ

"پھر جس کے ساتھ زیادتی کی گئی...... اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا...... بے شک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرتے والا ہے اور بہت بخشنے والا ہے۔"[4]

اس سے استدلال کر کے وہ فرماتے: "اس وعدۂ خداوندی کے تحت ہماری فتح یقینی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔"

---

(۱) تلخیص از "رسالۃ الی السلطان الملک الناصر فی شان التتار" ط المکتبۃ الشاملۃ

(۲) البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۷۰۰ھ، العقود الدریۃ فی مناقب ابن تیمیۃ لابن عبد الہادی، ص ۱۳۵، ط دار الکاتب العربی

(۳) البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۷۰۱ھ

(۴) سورۃ الحج، آیت نمبر ۶۰

اس دوران ایک بحث چھڑ گئی کہ تاتاری کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو چکے ہیں اس لیے کافر نہیں اور نہ وہ باغی ہیں کیوں کہ وہ کبھی کسی اسلامی حکومت کے تحت داخل ہی نہیں ہوئے۔ اس لیے ان پر بغاوت کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ پس ان سے جنگ شرعاً جائز بھی ہے یا نہیں؟ اس بحث سے خود علماء تردد میں پڑ گئے۔

اس کے جواب میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہا کہ تاتاری خوارج کے حکم میں ہیں جو حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے مقابلے میں خود کو حکومت کا زیادہ مستحق سمجھ کر ان سے برسرِ پیکار رہے۔ تاتاری بھی خوارج کی طرح خود کو دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں حکومت کا زیادہ حقدار سمجھے ہوئے ہیں، وہ مسلمانوں پر گناہوں اور مظالم کا الزام لگاتے ہیں مگر خود اس سے کہیں بڑھ کر جرائم کے مرتکب ہیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس بارے میں پورے وثوق سے کہتے تھے: ''اگر تم مجھے تاتاریوں کی صف میں سر پر قرآن رکھے کھڑا دیکھو تو بھی مجھے قتل کر دینا۔''

اس جواب سے سب کو اطمینان ہو گیا، شک وشبہ دور ہو گیا اور وہ سب جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

شعبان ۷۰۲ھ میں مصری افواج دمشق پہنچیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے خیمہ گاہ میں جا کر سلطان سے ملاقات کی اور اللہ کی قسم کھا کر کہا: ''فتح ہماری ہے۔'' امراء نے انہیں یاد دلایا کہ ''ان شاء اللہ'' کہہ لیں۔

فرمانے لگے: ''ان شاء اللہ یقین کے ساتھ کہتا ہوں نہ کہ تردد کے ساتھ۔''

سلطان نے ان سے درخواست کی کہ وہ سلطانی پرچم کے ساتھ کھڑے ہوں مگر انہوں نے جواب دیا:

''سنت یہ ہے کہ آدمی جہاد میں اپنے قبیلے کی صف کے ساتھ رہے۔''[1]

تاتاریوں کی یلغار:

اُدھر غازان نے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کا لشکرِ جرار مملوکوں کے مقابلے پر بھیج دیا۔ اس نے لشکر کے سپہ سالار قطلو شاہ نویان کو تاکید کی تھی کہ وہ حمص سے آگے نہ جائے اور مملوکوں کی پیش قدمی کا انتظار کرے مگر مملوک دمشق کے قریب خیمہ زن رہے اور دشمن کو آگے بڑھنے پر اکساتے رہے۔ آخر قطلو شاہ سے مزید انتظار نہ ہو سکا اور وہ پیش قدمی کرتا ہوا دمشق کی نواحی وادی مرج الصفر تک آ گیا۔[2]

روزہ توڑنے کا فتویٰ:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ شامی دستوں کے ساتھ تھے۔ انہوں نے فتویٰ دیا کہ جس کا روزہ ہے وہ روزہ توڑ دے تاکہ جہاد کے لیے قوت پیدا ہو۔ وہ خود مجاہدین اور امراء کے پاس جا کر انہیں افطار کراتے اور یہ حدیث سناتے:

إِنَّكُمْ مُصَبِّحُو عَدُوِّكُمْ، وَالْفِطْرُ أَقْوَىٰ لَكُمْ، فَأَفْطِرُوا

''تمہارا دشمن سے مقابلہ ہونے کو ہے۔ روزہ نہ رکھنے کی حالت میں تم زیادہ طاقتور ہو گے۔ پس افطار کر لو۔''[3]

---

① البدایة والنهایة: سنة ۷۰۲ھ ② مختار الاخبار لبیبرس منصوری (م ۷۲۵ھ)، ص ۱۲۵، ۱۲۶، ط الادارة المصریة اللبنانیة

③ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۱۲۰، کتاب الصوم باب اجر المفطر

معرکۂ شقحب:

ہفتہ ۲ رمضان ۷۰۲ھ (۲۰ اپریل ۱۳۰۳ء) کی صبح دمشق کے لوگ مساجد کے میناروں اور چھتوں پر چڑھ کر ننگے سر اللہ سے فتح و نصرت کی دعائیں کر رہے تھے۔ جنوب میں گرد و غبار کے بادل اٹھتے دکھائی دیے اور لوگ سمجھ گئے کہ معرکہ شروع ہو رہا ہے۔[1] دمشق سے ۳۷ کلومیٹر دور ''شقحب'' کے میدان میں ایک لاکھ بیس ہزار تاتاری، شامی و مصری سپاہ کے مقابل کھڑے تھے۔ طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی اور فریقین ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں طرف سے سپاہی شمشیر و سناں کے جوہر دکھانے لگے۔[2]

امام ابن تیمیہ کی شجاعت:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جو اس وقت چالیس سال کے تھے، لڑائی کے ان ہولناک لمحات میں جان کی بازی لگا دی۔ ان کے ایک رفیق کا کہنا ہے:

> ''ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا: مجھے میدان کے اس حصے میں لے چلو جہاں موت سامنے ہو۔ میں انہیں اگلی صف میں لے گیا۔ سامنے سے دشمن گرد و غبار کے بادلوں میں امنڈ رہا تھا اور سپاہیوں کا اسلحہ چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔
>
> میں نے کہا: یہ موت بالکل سامنے ہے۔ اب آپ نے جو کرنا ہے کریں۔
>
> انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور ان کے ہونٹ ہلنے لگے۔ میرا خیال ہے وہ دشمن کے لیے بددعا کر رہے تھے۔ پھر وہ معرکۂ کارزار میں گھس گئے اور جنگ کی شدت نے ہمیں جدا کر دیا۔[3]

تاتاریوں نے اپنے سرداروں قطلوشاہ اور طیطق کی قیادت میں نہایت جوش و خروش سے بار بار حملے کیے۔ ان کے طوفانی دھاووں کو روکنا آسان نہ تھا۔ سینکڑوں مسلمان دیکھتے ہی دیکھتے کٹ گئے۔ میمنہ کے امیر حسام الدین، امیر مبارز الدین اور شمسی حاجب سمیت سلطانی حلقے کے لگ بھگ ایک ہزار چنیدہ افسران اور سپاہی شہید ہو گئے۔ یہ دیکھ کر مملوکوں کا قلب حرکت میں آیا اور میمنہ کی مدد کے لیے اس کے ساتھ جا ملا۔

اُدھر سے لشکر کا میسرہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر قلب کے پیچھے آ گیا۔ تمام مملوک امراء نے اپنے دستوں کو ملا کر ایک حلقہ باندھ لیا جس کے وسط میں عباسی خلیفہ مستکفی باللہ اور الملک الناصر قلاوون تھے۔ سلطان نے نہایت پامردی کا مظاہرہ کیا اور اپنے گھوڑے کے پاؤں بیڑیوں سے باندھ دیے تاکہ فرار کی کوئی صورت نہ رہے۔ تاتاری پوری کوشش کر کے بھی اس سیسہ پلائی ہوئی دیوار کو جنبش نہ دے سکے۔[4] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جنگ کے ان ہولناک ترین لمحات میں صفوں کے درمیان دوڑتے ہوئے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے، بلند آواز سے جہاد اور شہادت کے فضائل

---

[1] البداية والنهاية: سنة ۷۰۲ھ

[2] مختار الاخبار لبيبرس المنصوري، ص ۱۲۶، الإدارة المصرية

[3] العقود الدرية في مناقب ابن تيمية لابن عبد الهادي، ص ۱۹۴، ط دار الكاتب العربي

[4] مختار الاخبار، ص ۱۲۷

سنا رہے تھے، میدان سے فرار ہونے پر وعیدیں یاد دلا رہے تھے۔[1]

تاتاریوں کو عبرت ناک شکست:

اب مملوکوں کا جارحانہ حملہ شروع ہوا تو تاتاریوں کی صفیں تیزی سے ٹوٹنے لگیں۔ مصری وشامی افواج نے انہیں ہر طرف سے مارنا اور کاٹنا شروع کیا۔ تاتاری منتشر ہو کر مختلف اطراف میں بھاگ نکلے۔ ان کے زیادہ تر دستے کوہ غباغب میں مورچہ بند ہو گئے اور اپنے گرد الاؤ روشن کر لیے۔ سلطانی افواج نے ان پہاڑیوں کا محاصرہ کر لیا اور اگلے دن ظہر تک ان پر تیر اندازی کرتے رہے۔ آخر تاتاری بھوک اور پیاس سے پریشان ہو گئے۔

قطلوشاہ نے بے بس ہونے سے پہلے اپنے دستوں کو یکدم پہاڑیوں سے نیچے اتار کر تیزی سے شمال مشرق کی طرف نکل جانے کی کوشش کی۔ مملوکوں نے اس وقت انہیں نکل جانے دیا مگر جلد ہی ان کا تعاقب شروع کر دیا اور اگلی رات تک انہیں ہدف بنائے رکھا۔ سلطان نے اگلے دن تعاقب کے لیے تازہ دم دستے بھیج دیے جنہوں نے رحبہ تک تاتاریوں کا پیچھا کیا۔ بہت سے تاتاری دریائے فرات عبور کرتے ہوئے ڈوب گئے۔ جب وہ پار پہنچے تو ایک لاکھ بیس ہزار میں سے صرف تیس ہزار باقی رہ گئے تھے۔

مملوکوں کا فتح مند لشکر دمشق سے ہوتا ہوا قاہرہ پہنچا تو اس کا تاریخی خیر مقدم ہوا۔ عجلون کے خطیب عبدالواحد تبریزی رحمہ اللہ نے کہا:

اَللّٰهُ اَکْبَرُ جَاءَ النَّصْرُ وَالظَّفَر ...... وَالْحَمْدُلِلّٰهِ هٰذَا کُنْتُ اَنْتَظِر

"اللہ اکبر! نصرت اور فتح آپہنچی۔ اللہ کا شکر ہے، میں تو اسی کا انتظار کر رہا تھا۔"

کِنَانَةُ اللّٰهِ مِصْرُ جُنْدُهَا نُثِلَتْ ...... لَارَیْبَ فِیْهِ وَجُنْدُاللّٰهِ مُنْتَصِر

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مصر اللہ کا ترکش ہے جس کے لشکر تیروں کی طرح پھیلا دیے گئے ہیں۔ اور اللہ کا لشکر بدلہ لے کر رہتا ہے۔"[2]

غازان کی موت:

اس شکست کے بعد غازان بھی زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا اور اگلے سال ۷۰۳ھ میں دنیا سے کوچ کر گیا۔[3]

باطل فرقوں کی ریشہ دوانیاں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا انتباہی مکتوب:

تاتاریوں کی پسپائی کے باوجود شام میں ان کے حامی اور مسلمانوں کے غدار رافضی فرقوں، نصیریوں، باطنیوں اور اسماعیلیوں کی شکل میں موجود تھے۔ انہوں نے مقابلے کی کٹھن گھڑیوں میں ہمیشہ اسلام کے مقابلے میں کفریہ طاقتوں کا

---

① العقود الدریة فی مناقب ابن تیمیة، ص ۱۹۳، ط دار الکاتب العربی

② مختار الاخبار لبیبرس المنصوری، ص ۱۲۸، ط الادارة المصریة اللبنانیة

③ البدایة والنهایة: ۷۰۳ھ

ساتھ دیا تھا اور نازک مواقع پر ہمیشہ مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپا تھا۔ انہوں نے تاتاریوں اور نصرانیوں کو اسلامی شہروں پر چڑھائی کی دعوت دی۔ وہ قبرص کے نصاریٰ کے حلیف تھے جو اکثر شام پر حملے کرتے رہتے تھے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے قلب پر اس صورتحال کا بڑا شدید اثر تھا اس لیے تاتاریوں کی واپسی کے بعد انہوں نے سلطانِ مصر الملک الناصر قلاوون کو ایک مکتوب لکھتے ہوئے ان آستین کے سانپوں کو فوراً کچل دینے پر زور دیا۔ انہوں نے اپنے مکتوب میں ان کی بدعقیدگی کے حال بیان کرنے کے بعد ان کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''جب تاتاریوں نے شام کا رخ کیا تو ان بدفطرت لوگوں نے اسلامی افواج پر بڑی زیادتیاں کیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے قبرص کے عیسائیوں کو پیغام بھیج کر ساحلِ شام کے ایک ٹکڑے پر ان کا قبضہ کرایا اور خود صلیب کا پرچم اٹھا کر چلے۔ انہوں نے مسلمانوں سے چھینے ہوئے گھوڑوں، ہتھیاروں اور قیدیوں کی اتنی بڑی تعداد قبرص پہنچائی کہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ بیس دن تک غلاموں کا بازار لگا رہا جس میں مسلمان قیدی، گھوڑے اور ہتھیار اہلِ قبرص کو بیچے جاتے رہے۔ تاتاریوں کی آمد پر انہوں نے گھی کے چراغ جلائے اور جب تاتاریوں کے مقابلے میں اسلامی فوجیں مصر سے روانہ ہوئیں تو ان کے چہرے فق ہو گئے۔ جب اللہ عزوجل نے سلطان کی آمد پر مسلمانوں کو فتحِ مبین نصیب فرمائی تو ان کے ہاں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس سے بڑھ کر بھی انہوں نے بہت کچھ کیا۔ چنگیز خان کو اسلامی ممالک پر حملے کی دعوت دینے والے یہی تھے۔ (1) یہی ہلاکو کے بغداد پر قبضے، حلب کی تباہی اور صالحیہ کی بربادی کا سبب بنے۔ اس کے علاوہ ان کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی کے بہت سے واقعات ہیں۔ ان کے پڑوس میں بسنے والے مسلمان سخت مصائب کا شکار رہے۔ ہر رات ان کی ٹولیاں پہاڑوں سے اترتیں اور وہ فساد مچاتیں جسے اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ ڈاکہ زنی کرتے، شرفاء کو ستاتے اور جرائم کے مرتکب ہوتے۔ قبرص کے عیسائی جب ان کے علاقے میں آتے تو یہ مسلمانوں سے چھینے ہوئے ہتھیار دے کر ان کی میزبانی کرتے۔ جو نیک وصالح مسلمان انہیں ملتا اسے قتل کر دیتے یا اس کا سب کچھ لوٹ لیتے۔ شاید ہی کوئی ان سے بچ کر نکل پاتا تھا۔'' (2)

روافض کی سرکوبی کے لیے لشکر کشی:

الملک الناصر نے امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے مطالبے پر کوہستانی روافض کے خلاف فوج کشی کی منظوری دے دی۔ ۲ محرم ۷۰۵ھ کو پہلے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ دمشق کے رضاکاروں کا ایک گروہ لے کر خود اس مہم پر نکلے۔ انہوں نے بعض مقامات پر روافض کے علماء سے مناظرے بھی کیے اور انہیں دنداں شکن جواب دے کر ان کی بدعقیدگی ثابت کر دی۔ جو تائب ہو گئے وہ محفوظ رہے۔ جو سرکشی پر اڑے رہے ان کی دار و گیر کے لیے دمشق سے ترک افسران کی فوجیں آ پہنچیں اور یہ سارا علاقہ فتنہ پرور لوگوں سے پاک کر دیا گیا۔ (3)

---

(1) چنگیز خان کو بلانے والا خلیفہ ناصر اور اس کا وزیر مؤید الدین قمی دونوں شیعہ تھے۔ غالباً مؤید الدین اس سازش میں پوری طرح اپنے آقا کا شریک کار تھا۔

(2) العقود الدریة فی مناقب ابن تیمیة لابن عبد الهادی، ص ۲۰۱، ط دار الکاتب العربی (3) العقود الدریة فی مناقب ابن تیمیة، ص ۲۰۲

الملک الناصر کا استعفاء:

نوجوان بادشاہ الملک الناصر قلاوون تاتاریوں کے خلاف فتح اور رعایا سے حسنِ سلوک کے باعث ہر دل عزیز حکمران تھا مگر سلطنت کے کچھ سرکردہ امراء اس کی مقبولیت سے حسد کرنے لگے تھے۔ ان میں سلطنت کا نائب بیبرس چاشنگیر پیش پیش تھا۔ اس کی محلاتی سازشوں نے الملک الناصر کو سیاست سے بددل کر دیا۔

رمضان ۷۰۸ھ میں وہ حج کے لیے روانہ ہوا تو شام کے قلعے کرک میں رک گیا اور اپنے اہل وعیال کو بھی وہیں بلا لیا۔ کچھ دنوں تک وہ سرکاری فیصلے وہیں سے صادر کرتا رہا مگر جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ اسے حکومت سے دست کش ہو جانا چاہیے۔ آخر اس نے قلعۂ کرک کی محدود حکومت اختیار کرنے اور تختِ شاہی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

الملک الناصر کا یہ دوسرا دورِ حکومت ۶ جمادی الاولیٰ ۶۹۸ھ سے ۲۳ شوال ۷۰۸ھ تک رہا یعنی تقریباً ساڑھے دس سال تک۔ ①

---

① البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۷۰۷ھ، ۷۰۸ھ

رکن الدین بیبرس چاشنگیر کی حکومت

شوال ۷۰۸ھ تا رمضان ۷۰۹ھ (اپریل ۱۳۰۹ء تا مارچ ۱۳۱۰ء)

الملک الناصر کی از خود معزولی کے بعد ۱۳ شوال ۷۰۸ھ کو اس کا نائب بیبرس چاشنگیر حکومت پر قابض ہو گیا۔ چاشنگیر اپنی نیابت کے دور میں بڑا مقبول اور رعب داب والا امیر شمار ہوتا تھا مگر از خود حکومت سنبھال کر اس نے اپنی ساکھ گرالی۔ مصر یا شام کے شرفاء، علماء اور عام شہریوں کو الملک الناصر کی جگہ اس کا تخت نشین ہونا پسند نہ آیا۔ لوگ اس کے خلاف جری ہو گئے، امراء اور جرنیل سرکش بن گئے، حالات کو سنبھالنے کے لیے اس کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی اور ہر طرف افراتفری پھیلتی چلی گئی۔ غرض اس کا عہدِ حکومت کسی بھی لحاظ سے قابلِ رشک نہ تھا۔[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی نظر بندی، چاشنگیر کا زوال:

چاشنگیر نے مزید ستم یہ کیا کہ حاسدین کی باتوں سے متاثر ہو کر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو شہر بدر کر کے اسکندریہ میں نظر بند کرا دیا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی وقت پیش گوئی کر دی تھی کہ چاشنگیر کی حکومت کو بہت جلد زوال آجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

چاشنگیر کی حکومت کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ عوام و خواص الملک الناصر کے ایام یاد کرنے لگے۔ قاہرہ سے سو کے لگ بھگ امراء اور جرنیل چاشنگیر سے باغی ہو کر الملک الناصر کے پاس کرک پہنچے اور اسے دوبارہ میدانِ سیاست میں اترنے پر آمادہ کیا۔ الملک الناصر نے ملک کی حالتِ ابتر دیکھتے ہوئے دوبارہ زمامِ اقتدار سنبھالنے کا ارادہ کر لیا۔ ۷ اشعبان ۷۰۹ھ کو جب وہ دمشق پہنچا تو اس کے مداح عوام و خواص اس کے استقبال کے لیے جوق در جوق نکل آئے۔ اس کے بعد الملک الناصر نے مصر کی طرف کوچ کر دیا۔ عمائدِ سلطنت، سرداروں اور علماء و فقہاء کا بہت بڑا مجمع اس کے ساتھ تھا۔ چاشنگیر خونریزی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے ہوا کا رخ دیکھ کر ۱۶ رمضان کو خود ہی استعفاء دے دیا اور فرار ہو گیا۔ الملک الناصر قاہرہ پہنچا تو مصر کے عوام نے اپنے محبوب حکمران کا تاریخی خیر مقدم کیا۔[2]

❀❀❀

---

[1] المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار للمقریزی: ۲۸۷/۳، ط العلمیۃ

[2] دول الاسلام مع الذیل للذهبی: ۲۲۱/۲، ط دار صادر؛ البدایۃ والنهایۃ سنۃ: ۷۰۹ھ؛ الاعلام للزرکلی: ۷۹/۲

الملک الناصر بن قلاوون.......تیسرا دورِ حکومت

شوال ۷۰۹ھ تا ذوالحجہ ۷۴۱ھ (مارچ ۱۳۱۰ء تا جون ۱۳۴۱ء)

یکم شوال ۷۰۹ھ کو الملک الناصر بن قلاوون نے گیارہ ماہ کی عزلت نشینی کے بعد دوبارہ عنانِ حکومت سنبھال لی۔ تخت نشینی کے اگلے ہی روز اس نے علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کی آزادی کا حکم جاری کیا اور جب وہ اسکندریہ کے قلعے سے قاہرہ پہنچے تو ان کا پرتپاک استقبال کیا۔[1] الملک الناصر اب ۲۵ سال کا ہو چکا تھا۔ اس کا سیاسی تجربہ اب پہلے سے زیادہ تھا اس لیے اس تیسرے دورِ حکومت میں اس کی شخصیت میں غیر معمولی مضبوطی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے اپنے مخالف امراء کو بہت جلد دبالیا۔ بیبرس چاشنگیر کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ الملک الناصر نے اسے اس کی سابقہ حرکتیں یاد دلا کر شرم دلائی اور پھر قتل کرا دیا۔[2]

الملک الناصر کا یہ تیسرا دورِ حکومت شوال ۷۰۹ھ سے ذوالحجہ ۷۴۱ھ تک ۳۲ سال دو ماہ پر محیط ہے۔ اس دوران حالات مجموعی طور پر پُرامن رہے۔ یہ آٹھویں صدی ہجری کی ابتداء تھی اور عالم اسلام دو صدیوں کے جنگ زدہ ماحول سے نکل کر اب ایک محفوظ اور مستحکم دور میں داخل ہو رہا تھا۔ صلیبی جنگوں اور تاتاری یورش کی تباہ کاریوں کے بعد یہ مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔

جہادی مہمات

الملک الناصر بن قلاوون کا زمانہ امن وامان کا تھا مگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کے ارشاد کے مطابق کبھی کبھی سرحدات کفار پر مہمات بھیجی جاتی رہتی تھیں۔ ایک بڑی مہم ۷۱۵ھ میں ایشیائے کوچک کے رومی علاقوں میں گئی اور ملطیہ کو فتح کر کے دربند کے علاقوں میں اپنی دھاک بٹھاتے ہوئے واپس لوٹی۔[3]

اسی طرح ۷۳۵ھ میں ''سیس'' (آرمینیا) کے نصرانیوں کے خلاف فوج کشی ہوئی۔[4]

نصرانیوں کی تخریب کاریاں:

نصرانی صلیبی جنگوں کے بعد تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے تاہم ان کے گماشتے اسلامی شہروں میں تخریب کاری کر گزرتے

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ سنۃ : ۷۰۹ھ
(۲) السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: ۲/ ۴۴۷ تا ۴۴۹، ط العلمیۃ
(۳) دول الاسلام مع الذیل للذھبی: سنۃ ۷۱۵ھ
(۴) دول الاسلام مع الذیل للذھبی :سنۃ ۷۳۵ھ، ط دار صادر

تھے۔ قاہرہ میں انہوں نے کئی بار آتش زدگی کی، پہلے پہل یہ اتفاقیہ واقعات محسوس ہوئے مگر جلد ہی تفتیش سے معلوم ہو گیا کہ یہ نصرانیوں کی کارستانی ہے۔ مجرموں کو پکڑا گیا تو ان کے قبضے سے آتش گیر مادے کی بھاری مقدار برآمد ہوئی چنانچہ انہیں سزائے موت دے دی گئی۔ ①

۷۳۵ھ میں حماۃ کے بازار میں آتش زدگی سے اڑھائی سو دکانیں جل گئیں۔ اسی سال انطاکیہ میں بھی ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔ کسی مجرم کا سراغ نہ مل سکا۔ پانچ سال بعد دمشق اور قیساریہ میں بھی آتش زدگی ہوئی۔ دمشق کی جامع مسجد کا مشرقی مینار خاکستر ہو گیا۔ اس بار محکمۂ سراغ رسانی نے مجرموں کا پتا لگا لیا۔ یہ عیسائیوں کا ایک گروہ تھا۔ اصل مجرموں کو سولی دے دی گئی اور باقی شرکاء پر دس لاکھ درہم جرمانہ عائد کیا گیا تا کہ نقصان کی تلافی ہو سکے۔ ②

جامع اموی کا سفید مشرقی مینار:

سلطان الملک الناصر نے اسی رقم سے جامع اموی کے مشرقی گوشے میں ایک نیا سفید مینار تعمیر کرایا۔ اسلام کی سابقہ تاریخ میں اتنا بلند اور خوبصورت مینار کوئی نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہی مینار ہے جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا جیسا کہ حدیث میں ہے:

"فینزل عند المنارۃ البیضاء شرقیّ دمشق."

(وہ دمشق کے مشرقی سفید مینار پر اتریں گے۔) ③

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ وہی مینار ہے جو ہمارے دور میں نصرانیوں کے مال سے بنایا گیا ہے کیوں کہ انہوں نے اسے جلایا تھا تو انہی کے اموال سے اسے دوبارہ بنایا گیا۔ پس ان کی ہلاکت کے لیے اسی پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا۔" ④

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی گرفتاری اور وفات

درمیان کے کچھ سالوں میں الملک الناصر کے مزاج میں ذرا سختی آگئی تھی۔ ۷۲۶ھ میں اس نے حاسدین کی اڑائی ہوئی باتوں سے متاثر ہو کر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو قاہرہ کے قلعے میں قید کر دیا جہاں انہوں نے ذوالقعدہ ۷۲۸ھ میں وفات پائی۔ ⑤

الملک الناصر کی وفات:

کچھ دنوں بعد ۲۸ ذوالحجہ ۷۴۱ھ کو الملک الناصر محمد کی بھی وفات ہو گئی۔ اس کی عمر ۶۰ سال تھی۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

---

① دول الاسلام مع الذیل للذھبی: سنۃ ۷۲۱ھ، ط دار صادر

② دول الاسلام مع الذیل للذھبی: سنۃ ۷۳۵ھ، ۷۴۰ھ، ۷۴۱ھ

③ صحیح مسلم، ص ۱۲۹۳۷، باب ذکر الدجال

④ البدایۃ والنھایۃ: ۵۹۱/۱۲، سنۃ ۹۶ھ، ط دار ھجر

⑤ دول الاسلام مع الذیل للذھبی: سنۃ ۷۲۶ھ، ۷۲۸ھ

''مسلمانوں کو اس کی موت کا بڑا صدمہ ہوا کیوں کہ انہوں نے اس میں ہر قسم کی بھلائی دیکھی تھی۔ بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ اس پر رحمت نازل کرے اور اسے بدلے میں جنت عطا کرے۔''[1]

الملک الناصر کے عہد پر ایک تبصرہ:

اگر چہ یہ دور محلاتی سازشوں، مخالفین سے کش مکش، تلخ سیاسی قضیوں اور مخالفین کے خلاف کارروائیوں سے یکسر خالی نہ تھا۔ تاہم مجموعی طور پر یہ دور قابل رشک تھا۔ شعائرِ اسلامیہ کے احیاء اور شریعت کی بالادستی سے مسلمانوں کی آنکھیں ٹھنڈی تھیں۔ مے نوشی اور دیگر فواحش ومنکرات پر سخت پابندی عائد تھی۔ الملک الناصر نے اناج واجناس پر بہت سے سابقہ ٹیکسوں کا خاتمہ کر کے عوام کو خوشحال کر دیا تھا۔ شہروں کی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ آوارہ کتوں کو مار کر خندقوں میں دفن کر دیا جاتا تھا۔[2]

ترقیاتی کام:

الملک الناصر نے تعمیراتی وترقیاتی کاموں پر خاص توجہ دی۔ دمشق کی جامع اموی کا مشرقی مینار اس کا ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ ہے۔[3] وہ مدارس اور خانقاہیں بنوانے کا ذوق رکھتا تھا۔ ۷۰۳ھ میں اس نے مدرسۂ ناصریہ تعمیر کرایا جس میں ائمہ اربعہ کی فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مدرسے کی بنیاد عادل کتبغا نے رکھی تھی مگر تکمیل الملک الناصر کے دور میں ہوئی۔[4] ۷۲۵ھ میں اس نے مصر میں سریاقوس کی مشہور خانقاہ بنوائی جہاں کے شیخ کو ''شیخ الشیوخ'' کہا جاتا تھا۔ ایک بڑی نہر کھدوائی جو صرف دو ماہ میں مکمل کی گئی اور خلیجِ ناصری کے نام سے مشہور ہوئی۔[5]

الملک الناصر کے بعد کئی سلاطین آئے مگر ان آنے والے حکمرانوں کو گزشتہ صدی جیسے ہولناک چیلنج درپیش تھے نہ وہ کوئی تاریخ ساز کردار رکھتے تھے۔ بس وہ گزشتہ دور کا ایک تسلسل تھے دیگر حکمران خانوادوں کی طرح ان میں بھی اچھے، برے اور ملے جلے کردار والے افراد ملتے ہیں۔

---

① دول الاسلام مع الذیل للذہبی: ۷۴۱ھ

② دول الاسلام مع الذیل للذہبی: سنۃ ۷۲۰ھ، ۷۲۴ھ، ۷۲۹ھ

③ البدایۃ والنہایۃ: ۵۹۱/۱۲

④ حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاہرۃ للسیوطی: ۲۶۵/۲، ط داراحیاء الکتب العربیۃ مصر

⑤ حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاہرۃ للسیوطی: ۲۶۰/۲، ط داراحیاء الکتب العربیۃ مصر

ممالیکِ بحریہ کا زوال

مملوک سلاطین کا دور بہت طویل ہے اور اس سلسلے کے بادشاہ اور حکمران بکثرت۔ مگر تاریخ ساز کردار ادا کرنے والے وہی تھے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ الملک الناصر محمد کا زمانہ ممالیک کا دورِ عروج تھا۔ چونکہ ''ہر کمالے را زوالے'' کا اصول ہر زمانے اور ہر چیز پر صادق آتا ہے، اس لیے اگلے عشروں میں ممالیک کے سورج کو بھی گہن لگا۔

اس زوال کی ایک بڑی وجہ موروثی سلطنت کے اصول کا اعادہ تھا۔ اس سے پہلے مملوکوں کا ہر حکمران قابلیت اور قوت کی بنیاد پر برسرِ اقتدار آتا رہا۔ مگر الملک الناصر کے بعد موروثیت نے جڑیں پکڑ لیں۔

الناصر کے بیٹوں کا دور

الناصر کی موت کے ساتھ ہی سلطنتِ ممالیک میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ یعنی سابق حکمران کے بیٹوں اور پوتوں کی حکومت کا۔ الملک الناصر کے بعد اس کے آٹھ بیٹوں نے ۷۴۲ھ تا ۷۶۲ھ (۱۳۴۰ء تا ۱۳۶۱ء) تقریباً ۲۱ سال یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ یہ سب کم عمر اور ناتجربہ کار تھے۔ امراء نے انہیں کٹھ پتلی بنالیا۔ درباریوں کی سازشوں کی وجہ سے ان میں سے کسی ایک کی حکومت کو بھی استحکام نصیب نہ ہوا۔

ان کا مختصر احوال یہ ہے:

❶ **الملک المنصور ابوبکر:** (ذوالحجہ ۷۴۱ھ تا صفر ۷۴۲ھ۔ ۵۹ دن)

اسے تخت نشین ہوئے دو ماہ ہوئے تھے کہ امراء نے اس پر گھناؤنے الزامات عائد کر کے بغاوت کر دی جس کے نتیجے میں یہ معزول ہو گیا۔ اسے اس کے کئی بھائیوں سمیت ''قوص'' میں قید کر دیا گیا۔ اس کے ایک بھائی الملک الاشرف کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔[1]

❷ **الملک الاشرف علاء الدین کجک:** (صفر ۷۴۲ھ تا شعبان ۷۴۲ھ)

تخت نشینی کے وقت اس کی عمر پانچ یا سات سال تھی۔ یہ فقط علامتی حکمران تھا۔ حکم امیر قوصون کا چلتا تھا۔ وہ محاسبے کے نام پر مخالف امراء کا قافیہ تنگ کر رہا تھا۔ پانچ ماہ بعد امیر قوصون کے مخالف امراء نے بغاوت کر کے اس برائے نام حکمران کو معزول کر دیا۔[2]

---

① النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: سنة ۷۴۱هـ، ۷۴۲هـ ② النجوم الزاهرة: سنة ۷۴۲هـ؛ البداية والنهاية سنة ۷۴۲هـ

③ الملک الناصر احمد: (شعبان ۷۴۲ھ تا محرم ۷۴۳ھ)

کچک کی جگہ اس کے بھائی احمد کو تخت پر بٹھایا گیا۔ لمبی ڈاڑھی، لمبی زلفوں، بھاری تن و توش اور غیر معمولی جسمانی طاقت رکھنے والا یہ جوان بھی ایک ناکام حکمران ثابت ہوا۔ امراء کی گرفتاریاں معمول بن گئی تھیں۔ آخر امراء نے متفق ہو کر اسے معزول کر دیا۔[1]

④ الملک الصالح اسماعیل: (محرم ۷۴۳ھ۔ ربیع الآخر ۷۴۶ھ)

الملک الصالح نیک و صالح نوجوان تھا۔ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتا تھا۔ امراء نے یہی سوچ کر اسے حکومت کا موقع دیا تھا کہ وہ رحم دل ہے لہٰذا انہیں سابقہ سختیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ مزید حفظِ ماتقدم کے طور پر تخت نشینی کے وقت اس سے یہ وعدہ بھی لیا گیا کہ وہ کسی کو تکلیف نہ دے گا اور جرم کے بغیر امراء کی پکڑ دھکڑ سے باز رہے گا۔

الملک الصالح کا دور پُر امن تھا مگر اختیارات امراء ہی کے پاس تھے۔ وہ تین سال تین ماہ تخت نشین رہا۔ ربیع الآخر ۷۴۶ھ میں وہ سخت بیماری کے بعد وفات پا گیا۔[2]

⑤ الملک الکامل شعبان: (ربیع الآخر ۷۴۶ھ۔ جمادی الآخرہ ۷۴۷ھ)

یہ رعب داب والا انسان تھا جس نے امورِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر مخالف امراء کو دبا دیا تھا مگر ساتھ ہی وہ ظلم وستم کا عادی تھا۔ مے نوشی اور گانے بجانے کا بے حد شوقین تھا۔ عورتوں کی بہت زیادہ ناز برداریاں کرتا تھا۔ اس کردار کے باعث حکومتی نظام ٹھپ ہو گیا اور اقتصادی لحاظ سے مملکت تباہی کی طرف جانے لگی۔

آخر کار یکم جمادی الآخرہ ۷۴۷ھ کو امراء نے بغاوت کر دی۔ شعبان ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور فرار ہو کر رُوپوش ہو گیا تاہم امراء نے اسے تلاش کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ۳ جمادی الآخرہ کو اسے سزائے موت دے دی گئی۔ اس کی حکمرانی ایک سال ۵۸ دن رہی۔[3]

⑥ الملک المظفر امیر حاج: (جمادی الآخرہ: ۷۴۷ھ تا رمضان ۷۴۸ھ)

تخت نشینی کے وقت امیر حاج کی عمر ۱۵ سال تھی۔ اس نے ایک سال تین ماہ حکومت کی۔ کبوتر بازی کا بے حد شوقین تھا جس پر امراء کو تشویش تھی۔ آخر تنگ آ کر ایک امیر نے اسے ملامت کی اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے دو کبوتر مار دیے۔ اس پر نوجوان بادشاہ نے بپھر کر اس امیر کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس امیر کے حامی امراء اسے برداشت نہ کر سکے اور شاہی محل کے اندر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بادشاہ کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں بادشاہ گرفتار ہو گیا۔ مخالف امراء نے اسے قتل کر دیا۔[4]

---

① النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ لجمال الدین یوسف ابن تغری بردی: سنۃ ۷۴۲ھ، ۷۴۳ھ، ط دار الکتب مصر

② النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ: سنۃ ۷۴۳ھ، ۷۴۶ھ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳/۴۱۸

③ النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ: سنۃ ۷۴۶ھ، ۷۴۷ھ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳/۴۱۸

④ شذرات الذھب فی اخبار من ذھب: ۸ص ۲۶۳، ط دار ابن کثیر؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳/۴۱۹

⑦ الملک الناصر حسن، پہلی بار: (رمضان ۷۴۸ھ تا جمادی الآخرہ ۷۵۲ھ)

یہ گیارہ سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا۔ تین سال نو ماہ برائے نام حکومت کی۔ آخر اس کے بارے میں امراء کا اختلاف ہوگیا جسے رفع کرنے کے لیے اس پر اتفاق ہوا کہ اس کے بھائی صالح کو حکومت دی جائے۔ [1]

⑧ الملک الصالح صالح: (جمادی الآخرہ ۷۵۲ھ تا شوال ۷۵۵ھ)

یہ چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ تین سال چار ماہ بعد امراء اس سے بھی بے زار ہوگئے۔ نتیجہ اس کی معزولی اور نظر بندی کی شکل میں نکلا۔ اس کی جگہ اس کے بھائی حسن کو دوبارہ تخت پر بیٹھنے کا موقع دیا گیا۔ [2]

الملک الناصر حسن۔ دوبارہ: (شوال ۷۵۵ھ تا جمادی الاولیٰ ۷۶۲ھ)

حسن دوبارہ تخت نشین ہوا تو جوان ہو چکا تھا۔ تاہم اس کا دورِ حکومت اب بھی برائے نام تھا۔ چھ سال سات ماہ حکومت کی۔ آخر امراء نے اس کے خلاف بغاوت کی اور اسے قتل کر کے اس کے گھر ہی میں دفن کر دیا۔ [3]

حسن اپنے دیگر بھائیوں کی بہ نسبت بہتر حکمران ثابت ہوا۔ اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا جو "مدرسۃ السلطان حسن" کے نام سے مشہور تھا۔ علامہ مقریزی کہتے ہیں کہ اس جیسا عظیم الشان مدرسہ پورے عالم اسلام میں کوئی نہ تھا۔ [4]

خلاصہ یہ کہ الملک الناصر مرحوم کے آٹھ بیٹوں کو باری باری حکومت ملی۔ ان میں سے تین قتل کیے گئے، چار معزول ہوئے اور ایک بیمار ہو کر فوت ہوا۔ [5]

سیاہ وبا:

اس دور کا سب سے ہولناک ترین حادثہ طاعون کی وہ وبا تھی جو ۷۴۹ھ میں فلسطین کے شہر غزہ سے نمودار ہوئی اور بڑی تیزی سے اس نے کئی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لاکھوں لوگ اس کی بھینٹ چڑھے اور عالم اسلام کے گنجان ترین علاقوں میں جنازوں کو کندھا دینے والے کم پڑ گئے۔ اسے "اَلْوَبَاءُ الْاَسْوَد" (کالی وبا) کا نام دیا گیا۔

علامہ مقریزی کے بقول اس وبا نے مشرق و مغرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انسان ہی نہیں، چرند، پرند، حیوانات یہاں تک کہ مچھلیاں بھی اس سے متاثر ہو کر ہلاک ہوئیں۔ سب سے پہلے یہ شمال میں بلادِ قفچاق میں ظاہر ہوئی اور مغلوں کی سلطنت میں حشر برپا کر دیا، مغلوں کے گھوڑے اس کا شکار ہوئے جن کی ہڈیوں کے ڈھیر جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔ پھر اس کا اثر قُسطَنطِینِیّہ، شام اور مصر تک آن پہنچا۔ طاعون کا اثر اس طرح ظاہر ہوتا کہ آدمی کی کنپٹی اور بغل میں چھوٹے چھوٹے دانے نکلتے، کچھ ہی دیر میں وہ خون تھوکنے لگتا اور دیکھتے ہی دیکھتے مرجاتا۔ [6]

---

① البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۷۵۲ھ، المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳/۴۱۹

② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۷۵۲ھ، المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳/۴۱۹

③ شذرات الذھب فی اخبار من ذھب: ۸/۳۳۶ ④ السلوک فی معرفۃ دول الملوک: ۴/۲۵۳، ۲۵۴، ط العلمیۃ

⑤ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۷۴۱ھ تا ۷۶۲ھ، النجوم الزاہرۃ: سنۃ ۷۴۱ھ تا ۷۶۲ھ

⑥ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۷۴۹ھ

آخر اللہ کی بارگاہ میں دعاؤں سے یہ بلا ٹلی۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اس وبا کے وقت شام میں تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ربیع الاول ۷۴۹ھ کے شروع میں خبر ملی کہ غزہ میں طاعون کی وبا پھیل گئی ہے اور روزانہ ایک ہزار سے زائد آدمی مر رہے ہیں۔ یہ سن کر میں حمص چلا گیا مگر وہاں بھی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ جس دن میں وہاں پہنچا تین سو آدمی مرے تھے۔ میں حمص نہ ٹھہرا بلکہ دمشق چلا گیا۔ وہاں لوگوں نے تین دن کا روزہ رکھا ہوا تھا۔ جمعہ کو سب مسجد میں جمع ہوئے اور دعا کی۔ اللہ نے وبا کو کم کر دیا۔ میں دمشق سے عجلون اور پھر بیت المقدس پہنچا۔ وہاں وبا ختم ہو گئی تھی۔"[1]

❁❁❁

الملک الناصر بن قلاوون کے پوتوں اور پڑپوتوں کا دور

سلطان حسن پر الملک الناصر بن قلاوون کے بیٹوں کا دور ختم ہو کر پوتوں اور پڑپوتوں کا دور شروع ہو گیا جو ۷۶۲ھ سے ۷۸۲ھ (۱۳۶۱ء تا ۱۳۸۲ء) تک جاری رہا۔ ان ۲۱ برسوں میں چار حکمران گزرے۔ یہ سب کم عمر اور نا اہل تھے اس لیے کٹھ پتلی بنے رہے۔ سر پر کوئی بااثر شخصیت نہ ہونے کی وجہ سے امراء آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔[2]

ان پوتوں اور پڑپوتوں کا حال درج ذیل ہے:

① منصور صلاح الدین بن المظفر امیر حاج: (۷۶۲ھ تا ۷۶۴ھ)

الناصر کے پوتوں میں سے پہلا سلطان منصور صلاح الدین بن امیر حاج تھا جو ۱۴ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ وہ لاپرواہ اور عیاش تھا، اکثر رقص وسرود کی محفل میں وقت گزارتا اور نمازیں تک ضائع کر دیتا تھا۔[3]

② اشرف شعبان بن حسین: (۷۶۴ھ تا ۷۷۸ھ)

الناصر کے پوتوں میں سے دوسرا سلطان، اشرف شعبان بن حسین تھا جو دس سال کی عمر میں بادشاہ بنا تھا اور ۷۶۴ھ تا ۷۷۸ھ (۱۳۶۳ء تا ۱۳۷۶ء) حکومت کی۔ اس کی حکومت نسبتاً بہتر تھی اور ایک طویل مدت تک چلتی رہی۔

اس کے دور کا افسوس ناک واقعہ اسکندریہ پر قبرص کے نصرانی حکمران پیٹر لوز گنان کا حملہ تھا۔ جمعہ ۱۲ محرم ۷۶۷ھ (۱۱ اکتوبر ۱۳۶۵ء) کو نصرانی اہلِ شہر کی مزاحمت کا زور توڑ کر اندر گھس گئے اور عوام کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ تین دن تک قیامت برپا رہی۔ مساجد، سرکاری عمارتوں، رفاہی اداروں اور عالی شان عمارتوں کو تباہ کر دیا گیا۔ جب تک قاہرہ سے امدادی فوجیں آئیں، پیٹر پانچ ہزار شہریوں کو قیدی بنا کر بے پناہ مالِ غنیمت کے ساتھ واپس جا چکا تھا۔ یہ حملہ اس لیے کامیاب ہوا کہ شہر کے دفاعی انتظامات کمزور تھے۔[4]

---

① رحلة ابن بطوطة لابی عبداللہ ابن بطوطة (م ۷۷۹ھ): ۱۷۹/۴، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

② السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۷۶۱ھ تا ۷۸۳ھ

③ النجوم الزاھرة فی ملوک مصر والقاھرة: ۱۱/۷؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۲۱۹/۳

④ السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۷۶۷ھ؛ الالمام بالاعلام للنویری الاسکندری: ۳۲۶/۱

۷۷۸ھ میں اشرف شعبان نے خلیفہ متوکل بن معتضد کے ساتھ سفرِ حج کیا۔اس کی عدم موجودگی میں مخالف امراء نے اسے معزول کرنے کی سازش کی۔شعبان یہ اطلاع ملتے ہی قاہرہ لوٹ آیا۔خلیفہ بھی واپس قاہرہ آ گیا۔مگر حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔باغیوں نے شعبان کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ خلیفہ کو سلطانی اختیارات دینے کی کوشش کی مگر خلیفہ نے انکار کر دیا۔شعبان جان خود کو خطرے میں دیکھ کر روپوش ہو گیا تاہم باغی امراء نے اسے ڈھونڈ نکالا اور پھانسی دے دی۔یہ ذوالقعدہ ۷۷۸ھ کا واقعہ ہے۔[1] اس کے بعد الملک الناصر بن قلاوون کے پڑپوتوں کا دور شروع ہو گیا۔

۳ علی بن شعبان بن حسین: (۷۷۸ھ تا ۷۸۳ھ)

شعبان کی جگہ اس کے بیٹے علی کو الملک المنصور کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔اس کی عمر سات برس تھی۔یہ بھی برائے نام حکمران تھا۔چار سال تین ماہ تک علامتی طور پر تخت نشین رہا۔۱۳ صفر ۷۸۳ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔[2]

۴ امیر حاج زین الدین بن شعبان بن حسین: (۷۸۳ھ تا ۷۸۴ھ)

الناصر کی نسل میں سے آخری سلطان زین الدین امیر حاج تھا جو ربیع الاول ۷۸۳ھ میں تخت نشین ہوا۔اس وقت اس کی عمر گیارہ سال تھی۔اس کی حکومت کو ڈیڑھ سال بھی نہ گزرا تھا کہ ۱۹ رمضان ۷۸۴ھ کو مملوکوں کے ایک طاقتور گروہ نے جو "چراکسیہ" یا "برجیہ" کہلاتا تھا، اپنے سردار برقوق کی قیادت میں بغاوت کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔[3]

جمادی الآخرہ ۷۹۱ھ میں برقوق کے خلاف بغاوت ہوئی اور مخالف امراء نے اسے ہٹا کر امیر حاج کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔امیر حاج نے آٹھ ماہ مزید حکومت کی تاہم صفر ۷۹۲ھ میں برقوق نے ایک بار پھر قوت حاصل کر کے اسے معزول کر دیا۔اس کے ساتھ ہی "ممالیکِ بحریہ" کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔[4]

---

[1] سمط النجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی للعصامی المکی: ۴/ ۳۵، ۳۶؛ تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۵۲، ط نزار

[2] سمط النجوم العوالی: ۴/ ۳۶، ط العلمیة ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳/ ۳۱۹، ۳۲۰

[3] السلوک لمعرفة دول الملوک سنة ۷۸۳ھ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳/ ۳۲۰

[4] سمط النجوم العوالی: ۴/ ۳۶؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳/ ۳۲۰

ممالیک بحریہ ایک نظر میں

دورِ اقتدار ۱۴۴ سال

۶۴۸ھ ...... تا ۷۹۲ھ

۱۲۵۰ء ...... تا ۱۳۸۹ء

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	انجام	خاص بات
۱	شجرۃ الدر	محرم تا ربیع الآخر ۶۴۸ھ (اپریل تا جولائی ۱۲۵۰ء)	معزول	ساتویں صلیبی جنگ
۲	الملک المعز عز الدین ترکمانی	۶۴۸ھ تا ربیع الاول ۶۵۵ھ (۱۲۵۰ء تا اپریل ۱۲۵۷ء)	قتل	دولتِ ممالیک کا بانی
۳	نور الدین علی بن عز الدین	۶۵۵ھ تا ۶۵۷ھ (۱۲۵۰ تا ۱۲۵۷ء)	معزول	کم عمر۔ برائے نام حکمران
۴	سیف الدین قطز	۶۵۷ھ۔ ۱۲۵۸ء	قتل	تاتاریوں کو عین جالوت میں شکست
۵	بیبرس اوّل الملک الظاہر رکن الدین	۶۵۸ھ تا ۶۷۶ھ (۱۲۵۹ء تا ۱۲۷۷ء)	وفات	دشمنانِ اسلام کے خلاف مسلسل جہاد قاہرہ میں خلافتِ عباسیہ کا احیاء
۶	الملک السعید برکہ بن بیبرس	۶۷۶ھ تا ۶۷۸ھ (۱۲۷۷ء تا ۱۲۷۹ء)	معزول	برائے نام حکمران
۷	سلامش بن بیبرس	ربیع الآخر تا رجب ۶۷۸ھ (ستمبر تا دسمبر ۱۲۷۹ء)	معزول	برائے نام حکمران
۸	سیف الدین المنصور قلاوون	۶۷۸ھ تا ۶۸۹ھ (۱۲۷۹ء تا ۱۲۹۰ء)	وفات	مجاہد و مدبر۔ تاتاریوں کو شکست دی

۹	الاشرف خلیل بن قلاوون	۶۸۹ھ تا ۶۹۳ھ (۱۲۹۰ء تا ۱۲۹۳ء)	قتل	فرنگیوں کا ساحل شام سے مکمل صفایا
۱۰	الناصر محمد بن قلاوون۔ پہلی بار	۶۹۳ھ تا ۶۹۴ھ (۱۲۹۳ء تا ۱۲۹۴ء)	معزول	کم عمر برائے نام حکمران
۱۱	العادل کتبغا	۶۹۴ھ تا ۶۹۶ھ (۱۲۹۴ء تا ۱۲۹۶ء)	معزول	مصر کا واحد تاتاری حکمران
۱۲	حسام الدین لاجین	۶۹۶ھ تا ۶۹۸ھ (۱۲۹۶ء تا ۱۲۹۸ء)	قتل	
	الناصر محمد بن قلاوون۔ دوبارہ	۶۹۸ھ تا ۷۰۸ھ (۱۲۹۸ء تا ۱۳۰۸ء)	استعفاء	تاتاریوں سے شکست۔ پھر فتح
۱۳	بیبرس ثانی الملک المظفر چاشنکیر	۷۰۸ھ تا ۷۰۹ھ (۱۳۰۸ء تا ۱۳۰۹ء)	استعفاء، پھر قتل	ناکام دورِ حکومت
	الناصر محمد بن قلاوون۔ سہ بارہ	۷۰۹ھ تا ۷۴۱ھ (۱۳۰۹ء تا ۱۳۴۰ء)	وفات	طویل اور کامیاب ترین حکومت تاریخ وفات: ۲۸ ذوالحجہ
۱۴	ابوبکر بن ناصر۔ سیف الدین	۷۴۱ھ تا ۷۴۲ھ (۱۳۴۰ء تا ۱۳۴۱ء)	معزول	الناصر کے بیٹوں کا دور شروع
۱۵	کوچک بن ناصر۔ علاؤ الدین	۷۴۲ھ (۱۳۴۱ء)	معزول	برائے نام حکومت
۱۶	احمد بن ناصر۔ شہاب الدین	۷۴۲ھ تا ۷۴۳ھ (۱۳۴۱ء تا ۱۳۴۲ء)	معزول	برائے نام حکومت
۱۷	اسماعیل بن ناصر۔ عماد الدین	۷۴۳ھ تا ۷۴۶ھ (۱۳۴۲ء تا ۱۳۴۵ء)	وفات	برائے نام حکومت
۱۸	الکامل شعبان اوّل بن ناصر	۷۴۶ھ تا ۷۴۷ھ (۱۳۴۵ء تا ۱۳۴۶ء)	قتل	برائے نام حکومت
۱۹	المظفر حاجی اوّل بن ناصر	۷۴۷ھ تا ۷۴۸ھ (۱۳۴۶ء تا ۱۳۴۸ء)	قتل	برائے نام حکومت

۲۰	الحسن بن ناصر۔ پہلی بار	۷۴۸ھ تا ۷۵۲ھ (۱۳۴۷ء تا ۱۳۵۱ء)	معزول	برائے نام حکومت
۲۱	صالح بن ناصر صلاح الدین	۷۵۲ھ تا ۷۵۵ھ (۱۳۵۱ء تا ۱۳۵۴ء)	معزول	برائے نام حکومت
	الحسن بن ناصر۔ دوبارہ	۷۵۵ھ تا ۷۶۲ھ (۱۳۵۴ء تا ۱۳۶۰ء)	قتل	تعمیراتی کاموں میں دلچسپی
۲۲	المنصور محمد بن حاجی	۷۶۲ھ تا ۷۶۴ھ (۱۳۶۰ء تا ۱۳۶۲ء)	معزول	الناصر کے پوتوں میں پہلا حکمران دو سال برائے نام حکومت
۲۳	الاشرف شعبان ثانی	۷۶۴ھ تا ۷۷۸ھ (۱۳۶۲ء تا ۱۳۷۶ء)	قتل	۱۴ سال تک اچھی حکومت کی۔ عمر ۲۴ سال۔
۲۴	المنصور علی بن شعبان	۷۷۸ھ تا ۷۸۳ھ (۱۳۷۶ء تا ۱۳۸۲ء)	وفات	۵ سال تک برائے نام حکومت۔ عمر ۱۳ سال
۲۵	الصالح، حاجی ثانی بن شعبان۔ (ممالیکِ بحریہ کا آخری حکمران)	ربیع الاوّل ۷۸۳ھ تا رمضان ۷۸۴ھ (۱۳۸۱ء تا ۱۳۸۲ء)	معزول	ممالیکِ بحریہ کا آخری علامتی حکمران۔ عمر ۳ سال۔ برقوق نے معزول کر دیا۔
	الملک الظاہر برقوق (چراکسیہ کا پہلا حکمران)	۱۹ رمضان ۷۸۴ھ تا ۵ جمادی الآخرہ ۷۹۱ھ (دسمبر ۱۳۸۲ء تا جون ۱۳۸۹ء)	گرفتار	۷۹۱ھ میں حاجی ثانی کو دوبارہ اقتدار ملا اور برقوق گرفتار ہو گیا۔
	الصالح، حاجی ثانی بن شعبان، دوبارہ	جمادی الآخرہ ۷۹۱ھ تا ۱۰ صفر ۷۹۲ھ (جون ۱۳۸۹ء تا فروری ۱۳۹۰ء) فقط آٹھ ماہ [1]	دوبارہ معزول	سات ماہ حکمران رہا۔ اس کے بعد برقوق دوبارہ اقتدار پر قابض ہو گیا اور ممالیکِ بحریہ کا دور ختم ہو گیا۔

---

[1] مآخذ: السلوک لمعرفة دول الملوک ، النجوم الزاهرة فی ملوک مصر و القاهرة ، تاریخ ابن خلدون ، تاریخ الخلفاء

ممالیک چراکسیہ

مملوک سلاطین اپنے اپنے ادوار میں غلام خرید کرانہیں تعلیم وتربیت کے بعد اپنا مقرب بناتے رہے تھے۔اس لیے سلطنتِ مصروشام میں ممالیک کے کئی گروہ بن چکے تھے جواپنے اپنے آقاؤں کی طرف منسوب ہوتے تھے،کوئی ظاہری کہلاتا تھا،کوئی اشرفی،کوئی منصوری اورکوئی صالحی۔

۶۸۰ھ (۱۲۸۱ء) میں سلطان الملک المنصور قلاوون نے اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے وفاداروں کی ایک نئی جماعت بنانے کی منصوبہ بندی کی تواس کے لیے بحیرۂ خزر کے شمال اور بحیرۂ اسود کے مشرق میں آباد چراکس قبیلے کے غلام خریدے تاکہ ان میں سے کوئی ایسا نہ ہو جو پہلے سے کسی مصری یا شامی امیر سے تعلق رکھتا ہو۔کم قیمت ہونے کی وجہ سے قلاوون نے ایسے تین ہزار غلام خرید لیے اور انہیں ایک بُرج (قلعہ) میں تربیت دلوائی۔اس لیے انہیں ''ممالیکِ بُرجیہ'' بھی کہا جانے لگا۔

قلاوون کے بیٹے الملک الناصر کے دور میں یہی چراکسی غلام ترقی پاکر امراء کے مراتب تک پہنچے۔اوراس کے پوتوں کے دور میں پوری مملکت کے کرتادھرتا بن گئے۔آخرکار جب انہوں نے حکمرانوں کو کمزور اور ناکارہ دیکھا تو بغاوت کرکے اپنی بادشاہت قائم کرلی۔اس طرح ممالیکِ بحریہ کی جگہ ممالیک چراکسیہ کا دور شروع ہوا۔[1]

چراکسیہ کا پہلا حکمران۔الظاہر البرقوق: (۷۸۴ھ تا ۸۰۱ھ)

ان میں سے پہلا امیر البرقوق تھا۔اس نے ۷۸۴ھ میں ممالیک بحریہ کے آخری اورکم سن حکمران حاجی ثانی کو معزول کرکے خود حکومت سنبھال لی۔اس نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر درحقیقت زمانے کی ایک اہم ضرورت پوری کی تھی کیوں کہ تقریباً چارعشروں سے برائے نام سلاطین کی حکومت نے ملک کو بہت کمزور کردیا تھا۔

برقوق کی حکومت کے ساتویں سال ممالیکِ بحریہ کے حامی امراء نے بغاوت کرکے اسے گرفتار کرلیا اور اس کی جگہ سابق حکمران حاجی ثانی کو دوبارہ تخت پر بٹھادیا،مگر آٹھ ماہ بعد برقوق نے حکومت دوبارہ حاصل کرلی۔

اس باراس کی حکومت طویل ہوئی۔اس نے ایک بااختیار سلطان بن کر مصر کو دوبارہ مضبوط اور مستحکم کردیا۔[2] اس کے دور میں مشرق سے مغل فاتح تیمور کا ظہور ہوا جس نے ہندوستان کی فتح کے بعد شام ومصر کو فتح کرنے کی ٹھانی اور

---

① سمط النجوم العوالي في انباء الاوائل والتوالي للعصامي (م ۱۱۱۱ھ): ۳۸/۴، ط العلمية

② سمط النجوم العوالي: ۳۸/۴ تا ۴۱ ، المواعظ والاعتبار للمقريزي: ۴۲۰/۳، ۴۲۱

الظاہر برقوق کو مراسلہ بھیج کر ڈرایا دھمکایا۔ اس نے اپنے مراسلے میں کہا:

''ہم اللہ کے غضب سے پیدا کردہ لشکر ہیں۔ ہم اللہ کے غضب کا شکار بننے والوں پر مسلط ہوتے ہیں۔ ہم کسی کی فریاد سے نرم دل نہیں ہوتے۔ کسی رونے والے کے آنسو سے متاثر نہیں ہوتے۔ اللہ نے ہمارے دل سے رحم نوچ لیا ہے۔ ہمارے پاس اس کے لیے ہلاکت ہی ہلاکت ہے جو ہماری تابع داری نہ کرے۔''

الظاہر برقوق نے اس کی لن ترانیوں کا دوٹوک جواب دیتے ہوئے لکھا:

''اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحم چھین لیا ہے تو یہی سب سے بڑا عیب ہے۔ کیا تم مسلح شہ سواروں کو بھیڑ بکریوں سے ڈراتے ہو۔ اگر ہم نے تمہیں قتل کیا تو یہ بڑا انعام ہوگا۔ اگر ہم قتل ہوئے تو جنت ہم سے ایک گھڑی دور ہوگی۔ کیا تم امیر المؤمنین خلیفہ سے اطاعت کرانا چاہتے ہو۔ تمہاری بات سننے کے قابل ہے نہ ماننے کے۔''[1]

تاہم تیمور جلد حملہ نہ کر سکا اور برقوق شوال ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں فوت ہوگیا۔ اس کی مدتِ اقتدار ۱۷ سال تھی۔[2]

الملک الناصر فرج بن برقوق۔ پہلی بار: (۸۰۱ھ تا ۸۰۸ھ)

برقوق کی وفات کے بعد اس کا بیٹا فرج تخت نشین ہوا۔ وہ صدقہ وخیرات اور فلاحی کاموں میں خوب حصہ لیتا تھا۔ اس کی حکومت کو ابھی ایک سال پورا ہوا تھا کہ مسجد الحرام میں آگ لگ گئی۔ ہوا یہ کہ مسجد الحرام سے متصل ''رباطِ راشت'' نامی ایک خانقاہ تھی جس میں صوفیہ کے لیے الگ الگ حجرے بنے ہوئے تھے۔ کوئی شخص اپنے حجرے میں چراغ جلتا چھوڑ گیا۔ اس کی لو بھڑک اٹھی جس کے باعث خانقاہ میں آگ لگ گئی اور بڑھ کر مسجد الحرام کی چھت تک پہنچ گئی۔ چھت کی بلندی کے باعث اسے بجھانا مشکل ہوگیا اور آخر کار پوری چھت بھسم ہوگئی۔ فرج نے ایک امیر کا تقرر کر کے بہت کم مدت میں مسجد الحرام کی چھت از سرِ نو بنوادی۔ اسی طرح خانقاہ کو بھی دوبارہ تعمیر کر دیا گیا۔[3]

فرج کو حکومت سنبھالے دوسرا سال تھا کہ تیمور لنگ نے شام پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں مغلوں نے ربیع الاوّل ۸۰۳ھ میں حلب کو مسخر کر کے وہاں مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ پھر وہ دمشق تک آن پہنچے۔ مغلوں کو روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ جمادی الآخرہ ۸۰۳ھ میں دمشق بھی سرنگوں ہوگیا اور وہاں مغلوں نے بدترین مظالم ڈھائے۔[4]

فرج بن برقوق نے مغلوں کے حملے کی خبر سن کر مصر سے شام کی طرف پیش قدمی کی مگر مغل جنگ سے کترا کر ایشیائے کوچک کی طرف نکل گئے۔ فرج بن برقوق نے شام کے انتظام کو از سرِ نو درست کیا اور امیر تغری بردی کو حاکمِ شام مقرر کر دیا۔ غرض مملوک اپنے دفاع کے لیے مستعد رہے۔ اگر وہ چوکس نہ ہوتے تو مغلوں کا شام و مصر پر قابض ہوجانا ذرا بھی بعید نہ تھا۔[5]

---

① عجائب المقدور فی اخبار تیمور، لابن عربشاہ، ۱۳۷، ۱۳۸، ط کلکتہ

② سمط النجوم العوالی: ۴/ ۳۱

③ سمط النجوم العوالی: ۴/ ۴۲، ط العلمیۃ

④ انباء الغمر بابناء العمر لابن حجر: سنۃ ۸۰۳ھ، ط لجنۃ احیاء التراث

⑤ النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ: سنۃ ۸۰۳ھ

فرج بن برقوق کی حکومت چھ سال تک مستحکم رہی۔اس کے بعد امرائے سلطنت نے اس کے خلاف سازشیں شروع کردیں جن سے تنگ آکر وہ ربیع الاوّل ۸۰۸ھ میں روپوش ہوگیا۔ (۱)

عبدالعزیز بن برقوق الملک المنصور: (۸۰۸ھ)

فرج کی روپوشی کے بعد امراء نے اس کی جگہ اس کے بھائی عبدالعزیز کو الملک المنصور کے لقب کے ساتھ تخت پر بٹھادیا جس کی کم سنی کے باعث نظام حکومت تباہی کے کنارے جالگا۔ (۲)

فرج بن برقوق۔دوبارہ: (۸۰۸ھ تا ۸۱۵ھ)

تین ماہ کی روپوشی کے بعد فرج جمادی الآخرہ میں اپنے وفادار امراء کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔مخالفین بھاگ نکلے اور فرج نے امورِ سلطنت دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔اگلے برسوں میں اس نے مخالف امراء کے خلاف بڑی سختی برتی مگر امراء کی سازشیں ختم نہ ہوئیں۔آخر بادشاہ نے امراء کو یکے بعد دیگرے گرفتار اور قتل کرنے کا سلسلہ شروع کردیا۔یہ دیکھ کر بعض امراء بھاگ کر شام چلے گئے جہاں سلطان کے وفادار اور مخالف امراء میں کش مکش جاری تھی۔

۸۱۳ھ میں فرج بن برقوق بھی باغی امراء کے تعاقب میں شام پہنچ گیا۔اس نے مخالف امراء پر جن میں شیخ محمودی اور نوروز پیش پیش تھے، بڑی مشکل سے قابو پایا۔آخر منحرف امراء نے بادشاہ کی تابع داری کی پختہ قسمیں کھائیں۔بادشاہ نے امیر تغری بردی (النجوم الزاہرہ کے مؤلف کے والد) کو شام میں اپنا نائب مقرر کیا اور وقتی طور پر کچھ امن قائم کرکے واپس مصر آگیا۔تاہم یہاں آکر بھی اسے چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔امراء نے عہد کی پاس داری نہ کی۔نہ وہ بادشاہ کے مطیع ہوئے اور نہ ہی باہم متحد رہے۔ان میں باہمی چپقلشیں اور تنازعے زوروں پر تھے۔بادشاہ سخت شکی مزاج بن گیا تھا اور شبہے کی بناء پر قتل کرنا اس کے لیے معمولی بات ہوگئی تھی۔ہر روز مخبر کسی نے کسی امیر کی سازش کی خبر لاتے اور وہ آئے دن قتل اور گرفتاری کے احکام جاری ہوتے رہتے۔ (۳) علامہ یوسف بن تغری بردی لکھتے ہیں:

> ''ان توڑی جانے والی قسموں کے باعث یہ سب امراء تھوڑی ہی مدت میں موت کے گھاٹ اتر گئے۔میں ان میں سے کسی امیر کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ بستر کی موت مرا ہو۔بلکہ یہ سب مختلف طریقوں سے قتل ہوگئے کیوں کہ انہوں نے اللہ (کے نام کی کھائی ہوئی قسمیں توڑ کر اللہ) پر جرأت کی تھی۔وہ الملک الناصر (فرج بن برقوق) کے بُرے برتاؤ کے باعث اس کے خلاف خروج کرتے، پھر دوبارہ اس کی اطاعت کی طرف لوٹ آتے تھے، قسموں اور وعدوں کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔انہوں نے اس عمل کو کھیل بنالیا تھا۔یہ ان کی عادت بن چکی تھی۔آخر اللہ نے انہیں ایک دوسرے پر مسلط کردیا۔وہ اپنی قوت، شدید جنگجوئی اور انتہائی شجاعت کے باوجود یوں مٹ گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔بادشاہ نے ان کے بعد ایسے لوگوں کو عہدے دیے جو ان کے ہم مرتبہ تو کجا کسی بھی اعتبار سے ان کے پاسنگ بھی نہ تھے۔'' (۳)

---

(۱) سمط النجوم العوالی: ۴/۳۳ (۲) النجوم الزاھرۃ: سنۃ ۸۱۳ھ، ۸۱۴ھ (۳) النجوم الزاھرۃ: ۱۳/۱۲۹

ذوالقعدہ ۸۱۴ھ میں سلطان فرج نے شامی امراء کے خلاف کارروائی کے لیے ایک بار پھر کوچ کی تیاری کی اور اس سے پہلے اپنی مطلقہ بیوی خوند بنت صرق اور امیر ابن الطبلاوی کو قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ نہایت لرزہ خیز ہے۔ علامہ یوسف بن تغری بردی کے مطابق سلطان نے بیگم بنت صرق کو طلاق رجعی دے دی تھی جس کے بعد بیگم اپنے ذاتی گھر منتقل ہو گئی تھی۔ سلطان کو اس کے باوجود بیگم کی طرف میلان تھا مگر کسی نے سلطان کو شکایت لگا دی کہ ایک افسر ابن الطبلاوی بیگم سے ملتا رہتا ہے۔ قرائن سے یہ بات مؤکد ہو گئی مثلاً یہ کہ تلاشی لینے پر ابن الطبلاوی کے ہاں سے بیگم کی انگشتری برآمد ہوئی۔[1] یہ خبر ملنے پر سلطان نے بیگم کو حکم بھیجا کہ وہ اس کے پاس آ جائے۔ بیگم خوش ہوئی کہ سلطان شاید طلاق سے رجوع کر رہا ہے۔ اس نے مہندی لگائی، بہترین لباس پہنا اور سج دھج کر سلطان کے محل میں داخل ہوئی۔

سلطان اس وقت محل کے باغیچے میں بیٹھا تھا۔ جب عملے نے سلطان کو اطلاع دی کہ بیگم تشریف لا رہی ہیں تو سلطان اُٹھ کر باغیچے کی دہلیز کی طرف چل دیا اور وہاں ایک چبوترے پر جا بیٹھا۔ بیگم کو کچھ معلوم نہ تھا کہ سلطان کا موڈ کیسا ہے۔ وہ آئی اور سلطان کے ہاتھ پکڑ کر دست بوسی کرنے لگی۔ اس وقت محل کی بیگمات، شہزادیاں اور باندیاں ملکہ کے استقبال کے لیے وہیں آ چکی تھیں۔ سلطان نے ان سب کے سامنے دھاڑ کر کہا:

"او رنڈی! کیا بادشاہوں کی سواریوں پر بلاصی سوار ہوں گے؟"[2]

اس سے پہلے کہ بیگم اپنی صفائی میں کچھ کہہ پاتی، سلطان نے میان سے نیمچہ[3] نکال کر بیگم کے ہاتھ پر دے مارا جس سے بیگم کے ایک ہاتھ کی انگلیاں کٹ کر گر گئیں جو مہندی میں رنگی ہوئی تھیں۔

بیگم نے ایک چیخ ماری اور باغیچے کی طرف دوڑ پڑی۔ سلطان بھی اس کے پیچھے بھاگا اور نیمچے سے اس کے کندھے پر وار کیا جس سے گوشت کا ایک ٹکڑا الگ ہو گیا۔ بیگم اپنی جان بچانے کے لیے دوڑتی رہی، سلطان بھی دوڑتے ہوئے اسے یکے بعد دیگرے ضربیں لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ بیگم سہ دری میں گھس گئی۔ سلطان نے وہیں گھس کر پے در پے ضربات سے اس کی جان لے لی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے بچاتا۔ باغیچے کی دہلیز اور سہ دری کی دیواروں پر جگہ جگہ ملکہ کے خون کے چھینٹے لگ چکے تھے۔

سلطان نے بیگم کا سر قلم کر دیا جس کے کانوں میں ابھی تک بدخشانی جھمکے چمک رہے تھے۔ سلطان نے سر کو گندھی ہوئی چوٹی پکڑ کر اٹھایا اور اپنی نشست گاہ میں جا بیٹھا۔ سر کو ایک طباق سے ڈھانپ کر سامنے رکھا اور ابن الطبلاوی کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہوا تو سلطان نے اسے سامنے بٹھایا اور پھر یکدم طباق ہٹا کر کہا: "اس سر کو پہچانتے ہو؟"

ابن الطبلاوی نے نگاہیں نیچے کر لیں۔ سلطان نے چشم زدن میں نیمچے کا وار کیا اور اس کی جھکی ہوئی گردن اڑا دی۔

---

① شرعاً اتنی سی بات سے ناجائز تعلقات (بدکاری) ثابت نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے شرعاً مجرم کا اپنا اقرار یا چار عینی شہادتیں شرط ہیں۔ یہاں عین ممکن تھا کہ ملکہ نے کوئی اہم کام اس افسر کے سپرد کیا ہو اور انگشتری اس لیے دی ہو کہ بوقت ضرورت اس افسر کو دوسروں سے کام لینے میں آسانی ہو۔ مگر سلطان نے بیگم اور اس افسر کو صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اپنے ہاتھ سے دونوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا جو صریح ظلم تھا۔

② بلاص صعید مصر کا ایک شہر ہے۔ ممکن ہے امیر ابن طبلاوی اسی شہر کا ہو۔

③ نیمچہ: ایک قسم کی چھوٹی تلوار جو لباس میں چھپانا آسان تھا۔

پھر اس کی نعش کو ملکہ کی نعش کے ساتھ ایک لحاف میں لپیٹا اور دفن کرا دیا۔[1]

سلطان کا سفرِ شام اپنے سالے امیر نوروز پر قابو پانے کے لیے تھا۔ سفر سے پہلے اس نے قاضیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے امیر نوروز کی بہن سارہ کو طلاق دے دی۔ پھر اس بے چاری کو مجبور کیا کہ وہ ایک فوجی افسر مقبل رومی سے نکاح کرے۔ سارہ اس پر قطعاً تیار نہ تھی مگر سلطان نے اسے قتل کی دھمکی دی اور زبردستی یہ نکاح کرا دیا۔[2]

ان ظالمانہ اقدام کے بعد سلطان ۸ ذوالحجہ کو حشم وخدم کے ایک بڑے جلوس میں مصر سے روانہ ہوا۔ اس نے خلیفہ مستعین باللہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ درباری نجومی شیخ برہان الدین نے حساب کتاب لگا کر بتایا کہ سلطان کا یہ سفر انتہائی سعادتوں اور کامیابیوں کا باعث ہوگا۔[3] تاہم سلطان کا موڈ درست نہ ہوا۔ غزہ پہنچتے پہنچتے وہ کتنے ہی مملوکوں کو ٹھکانے لگا چکا تھا۔ یہ دیکھ کر امراء سلطان سے بددل ہوگئے۔ ہراول دستے کے اکثر امراء بھاگ کر شام میں سلطان کے مخالف امیر نوروز کے دھڑے سے جا ملے۔ سلطان بھی پیچھے پیچھے منزلیں طے کرتا ہوا ذوالحجہ کی آخری تاریخ کو دمشق پہنچا۔ یہاں اس نے مجلسِ مشاورت منعقد کی کہ باغی امراء کا کیا کرنا چاہیے۔ شام کے عمر رسیدہ گورنر امیر تغری بردی نے کہا:

''سلطان! آپ پانچ سو افراد کو قتل کرا چکے ہیں مگر کیا حاصل؟ جس گھوڑے پر سوار ہیں، وہی سرکش ہو چکا ہے۔''

سلطان نے کہا: ''جو ہو چکا سو ہو چکا۔ آئندہ کے بارے میں مشورہ دو۔''

امیر تغری بردی نے کہا: ''میری ایک رائے ہے، اسے مان لیں تو حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔''

سلطان نے پوچھا: ''وہ کیا؟''

امیر نے کہا: ''آپ واپس مصر لوٹ جائیے۔ جو آپ کی طرف مائل ہیں وہ آپ کے پاس لوٹ آئیں گے۔ جو آپ سے ڈرتے ہیں، وہ یہیں رہ جائیں گے اور مخالف امراء سے جا ملیں گے۔ آپ مصر پہنچ کر عام معافی کا اعلان کر دیں۔ امراء کے قتل کا سلسلہ بند کر دیں اور ان سے حسنِ سلوک شروع کریں۔ اپنے گزشتہ سلوک پر ان سے معذرت کریں۔ ایسا برتاؤ کریں کہ سب کو آپ کی نیک نیتی کا یقین ہو جائے۔ تبھی آپ کی رعایا مطمئن ہوگی اور آپ کی اطاعت پر لوٹ آئے گی۔ جب ایک ہزار امراء آپ کے وفادار ہو جائیں تو پھر آپ ان کی مدد سے دشمنوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ ابھی تو مخالف امراء بکثرت ہیں۔ شام ان کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اگر وہ بکھر گئے تو شام کئی حصوں میں بٹ جائے گا۔ وہ متفق ہوگئے تو آپ کے خلاف فوج کشی کر کے مصر میں گھس جائیں گے۔''

سلطان کے تمام مصاحبین نے اس مشورے کو سراہا مگر سلطان چپ چاپ رہا۔ خاصی دیر بعد وہ بولا:

---

[1] لاشوں کے ساتھ یہ گھٹیا سلوک انسانیت اور شرافت کے منہ پر طمانچہ تھا۔ بعد میں خود سلطان کی نعش کے ساتھ جو ہوا، شاید اسی کا بدلہ تھا۔

[2] النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة: ۱۳/ ۱۳۲، ۱۳۳

[3] علامہ یوسف بن تغری بردی یہ واقعہ نقل کر کے کہتے ہیں:

''یہ سلطان کے لیے منحوس ترین سفر تھا۔ کاش مجھے معلوم ہو سکتا کہ برہان الدین نے اس کے بعد اس علم کی معرفت کا دعویٰ چھوڑا یا نہیں؟ میں ان نجومیوں کے گھٹیا پن پر حیران ہوں کہ اپنے علم کے بطلان کی ایسی کھلم کھلا دلیلیں واقع ہونے کے بعد بھی وہ اس علم پر قولاً اور عملاً جمے رہتے ہیں۔'' (النجوم الزاهرة: ۱۳/ ۱۳۶)

''اُتا![1] میں نے ان لوگوں کو اس لیے قتل کیا کہ میری حرمت عظیم ہے۔ اب اگر میں یہاں سے لوٹ جاؤں تو میری حُرمت کہاں باقی بچے گی؟ میں ان لوگوں سے اتنا واقف ہوں جتنا دوسرے نہیں۔ اللہ کی قسم! وہ میرے سامنے زخمی شکار کی مانند ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر میرے ساتھ دس مملوک بھی ہوں تو میں ان سے جنگ کروں گا۔''

امیر تغری بردی نے کہا: ''پھر سمجھ لیجئے کہ اب وہ آپ سے جنگ کر کے ہی رہیں گے۔''

چھ محرم ۸۱۵ھ کو سلطان دمشق سے حمص کی طرف روانہ ہوا۔ باغی امراء شمال کی طرف پسپا ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ سلطان بعلبک جا پہنچا۔ یہاں سلطان کو اطلاع ملی کہ باغی امراء وادیٔ لجون کی طرف نکل گئے ہیں۔ سلطان غضب ناک ہو کر ان کے تعاقب میں نکلا اور اس قدر تیز یلغار کی کہ اس کی اکثر فوج پیچھے رہ گئی اور وہ چند دستوں کے ساتھ ۱۳ محرم کی شام کو دشمن کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

مخالف امراء سلطان سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے ایک سرکردہ فرد شیخ محمودی کا خیال تھا کہ سلطان کل حملہ کرے گا اور اس سے پہلے ہمیں رات کے وقت حلب کی طرف بھاگ جانا چاہیے۔

اُدھر سلطان نے اسی وقت حملہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس کے سپہ سالار دمراش محمدی نے کہا:

''جناب عالی! ابھی گھوڑوں کو آرام کرنے دیں۔ جنگ کل کر لی جائے۔''

سلطان نے کہا: ''رات کو وہ بھاگ جائیں گے۔''

سپہ سالار نے کہا: ''جب آنکھوں سے آنکھیں ملیں گی تو وہ کہاں تک بھاگیں گے؟ وہ تھک چکے ہیں۔ ان کے گھوڑے جواب دے چکے ہیں۔''

مگر سلطان نے سپہ سالار کی بات پر توجہ دیے بغیر طبلِ جنگ بجوایا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ سلطان کے سپاہی بے دلی کے ساتھ حملے میں شریک ہوئے مگر اندھیرے کے سبب ان میں سے بہت سے کیچڑ میں پھنس گئے۔ اُدھر باغی امراء موت سر پر دیکھ کر سر پر کفن باندھ کر میدان میں اُتر آئے۔ سلطان کی فوج کو دیکھتے ہی دیکھتے شکست ہوگئی۔ امیر مقبل رومی سمیت متعدد امراء قتل ہو گئے۔ خلیفہ باغیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ سلطان کچھ دیر لڑنے کے بعد نہایت خستہ حالت میں بھاگ نکلا اور پندرہ محرم کو دمشق پہنچ گیا۔ امراء نے رائے دی کہ اب سیدھے مصر چلیں مگر سلطان نہ مانا اور باغی امراء بھی تعاقب کرتے ہوئے دمشق پہنچ گئے۔

۱۸ محرم کو جنگ برپا ہوگئی جو طول پکڑتی چلی گئی۔ آخر باغیوں نے خلیفہ مستعین باللہ پر جو قیدی کے طور پر ان کے ساتھ تھا، دباؤ ڈالا کہ وہ سلطان کو معزول کر دے اور خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ بھی بن جائے۔ خلیفہ یہ پیش کش سن کر گھبرا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ معاملہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی سلطان غالب آجائے اور تخت کی جگہ تختہ مقدر ہو جائے۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔

---

[1] یہ ترکی زبان کا لفظ ہے جو ''ابّا'' یا ''بابا'' کے ہم معنی ہے۔ امیر تغری بردی کی عمر رسیدگی کے باعث سلطان اسے ''اُتا'' کہتا تھا۔

یہ دیکھ کر امراء نے ایک چال چلی۔ انہوں نے خلیفہ کے ماں شریک بھائی ناصر الدین مبارک شاہ کو ساتھ ملا کر خلیفہ کی طرف سے امرائے سلطنت کے نام ایک جعلی مکتوب تیار کرایا جس میں سلطان کی زیادتیاں اور برائیاں ذکر کرنے کے بعد سب کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ خلیفہ کو سلطان مان کر بیعت کریں اور کوئی بھی اس میں دریغ نہ کرے۔ ①

جب خلیفہ کو اس مکتوب کے شائع ہونے کی خبر ہوئی تو اس نے سمجھ لیا کہ اب پیچھے ہٹنا فوری خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس نے باغی امراء سے پختہ عہد و پیمان لیے کہ وہ اس کی اطاعت پر ہمیشہ کاربند رہیں گے۔ سب نے پختہ قسمیں کھا کر اس کی بیعت کر لی۔ ۲۵ محرم کو ایک تقریب میں خلیفہ کی طرف سے سلطان فرج بن برقوق کی معزولی کا اعلان کر دیا گیا اور کہا گیا کہ خلیفہ خود سلطان بن گیا ہے۔ اب فرج کی مدد یا حمایت جائز نہیں۔ امراء میں سے جو بھی خلیفہ کی بیعت کر لے وہ مامون ہوگا۔ جب یہ بات شہر میں پہنچی تو وہاں کے بہت سے امراء دلی طور پر خلیفہ کے ساتھ ہو گئے۔

اب باغیوں کا پلہ بھاری ہو گیا اور انہوں نے سلطان کی فوج کو شکست دے دی۔ ۹ صفر کو وہ شہر پر قابض ہو گئے۔ سلطان نے فرار ہو کر حلب جانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور آخر قلعے میں محصور ہو گیا۔ باغیوں نے اسے جان کی امان دینے کا وعدہ کیا جس پر سلطان نے دو دن بعد خود کو ان کے حوالے کر دیا۔ کچھ امراء سلطان کو اسکندریہ میں نظر بند کرنا چاہتے تھے مگر کچھ کا خیال اس کا قصہ تمام کرنے کا تھا۔ ②

چنانچہ ۱۶ صفر کی شب چند امراء جلادوں کو ساتھ لیے سلطان کے پاس قلعے میں پہنچے۔ سلطان ان کے تیور دیکھ کر مقصد سمجھ گیا اور اضطراری کیفیت میں ان سے دست و گریباں ہو گیا۔ جلادوں نے یہ دیکھ کر خنجر نکال لیے اور اس پر جھپٹے۔ وہ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ جلاد بھی پیچھے دوڑتے ہوئے اس پر خنجر کے وار کرتے گئے۔ سلطان نے ہاتھوں کے ذریعے بچاؤ کی کوشش کی مگر خالی ہاتھ کچھ پیش نہ گئی۔ پانچ زخم کھا کر سلطان زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ ایک غلام نے آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ جب وہ مُڑا تو سلطان کے بدن میں حرکت ہوئی۔ اس نے دوبارہ گلا گھونٹا اور پھر واپس جانے لگا۔ سلطان کے بدن میں پھر حرکت ہوئی۔ غلام نے تیسری بار گلا گھونٹا اور ساتھ ہی خنجر سے حلق کاٹ ڈالا۔ پھر اس کی پوشاک اتار لی اور برہنہ لاش کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ سوائے شلوار کے بدن پر کوئی کپڑا تک نہ تھا۔ آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ اگلے دن کچھ لوگوں نے رحم کھا کر اس کی تجہیز و تکفین کی۔ ③ امیر یوسف بن تغری بردی کی ہمشیرہ جو مصر میں سلطان کے ہاتھوں ملکہ بنت صرق کے بہیمانہ قتل کے واقعے کی چشم دید گواہ ہیں، وہ سلطان کے قتل کے وقت دمشق میں تھیں۔ ④ وہ بتاتی ہیں:

---

① النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۱۳/ ۱۴۴ تا ۱۴۷

② النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۱۳/ ۱۸۹ تا ۱۹۸

③ النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۱۳/ ۱۴۸

④ کیوں کہ وہ اپنے والد امیر تغری بردی کی سخت بیماری کے باعث ان کی عیادت کے لیے سلطان کے ساتھ ہی مصر سے شام آئی تھیں۔ امیر تغری بردی سلطان کے باغیوں سے مقابلے میں پسپا ہو کر دمشق آنے کے اگلے دن ۱۶ محرم کو فوت ہوئے تھے۔ یعنی سلطان کے قتل سے ایک ماہ پہلے ان کی وفات ہوئی۔

"جب جلاد سلطان کو قتل کرنے کے لیے دمشق کے قلعے میں گئے تو وہ سلطان کو خنجروں سے ضربیں لگا رہے تھے جبکہ سلطان ان کے آگے اسی طرح بھاگ رہا تھا جیسے بنت صرق سلطان کے آگے دوڑ رہی تھی اور سلطان اسے نیچے سے مار رہا تھا۔ سلطان کا خون قلعے کے بُرج کی دیواروں پر اسی طرح لگا ہوا تھا جیسے بیگم بنت صرق کا خون باغیچے کی دیواروں پر نقش ہوا تھا۔"[1]

فرج کی کُل مدتِ حکومت چودہ سال ایک ماہ بنتی ہے۔[2]

مستعین باللہ: (صفر تا شعبان ۸۱۵ھ)

فرج بن برقوق کے قتل کے بعد عباسی خلیفہ مستعین باللہ متفقہ طور پر خلیفہ کے علاوہ سلطان بھی بن گیا تھا۔ امیر نوروز اور شیخ محمودی اس کے دو طاقتور ترین امراء تھے مگر اندرونی طور پر دونوں حسد کا شکار تھے اور طاقتور ترین امیر بننے کے خواہش مند تھے۔ شیخ محمودی زیادہ چالاک تھا۔ اس نے امیر نوروز کو کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ شام ہی میں رہوں اور شام کے علاوہ الجزیرہ اور سرحداتِ مصر کی گورنری بھی میرے پاس ہو۔ تم خلیفہ کے ساتھ مصر چلے جاؤ اور وہاں اتا بک (نائب) کے طور پر رہو۔"

نوروز نے اپنے ساتھیوں سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ سب نے کہا:

"یہی بہتر ہے۔ اس طرح دارالخلافہ کی حکمرانی آپ کے ہاتھ میں رہے گی۔"

مگر امیر نوروز نے کہا: "اگر شیخ محمودی شام میں ٹھہر گیا تو اپنے اثر ورسوخ کی بناء پر بہت طاقتور ہو جائے گا اور پھر میرا تعاقب کرتے ہوئے مصر میں آ دھمکے گا۔ اگر مصر جانا زیادہ فائدہ مند ہوتا تو شیخ محمودی اسے چھوڑ کر شام کی گورنری کو پسند نہ کرتا۔ پس بہتر یہی ہے کہ میں اسے مصر بھیج دوں اور خود شام کی گورنری لے لوں۔"

ساتھیوں کے سمجھانے کے باوجود امیر نوروز اسی رائے پر مُصر رہا۔

اگلے دن خلیفہ کے دربار کا آغاز ہوتے ہی نوروز نے پہل کر کے خلیفہ سے شام کی گورنری مانگ لی۔ خلیفہ نے درخواست قبول کر لی۔ اب خلیفہ کے ساتھ مصر جانا شیخ محمودی کے حصے میں آیا۔ یہی شیخ محمودی چاہتا تھا۔ اس نے امیر نوروز کو احمق بنا کر کسی جھگڑے کے بغیر نائب خلافت کا عہدہ حاصل کر لیا۔

امیر نوروز کو شام کا گورنر بنا کر خلیفہ مصر روانہ ہوا اور ۲ ربیع الآخر کو قاہرہ پہنچا۔ اس نے شاہی محل میں سکونت اختیار کی تو شیخ محمودی کو یقین ہو چلا کہ خلیفہ واقعی سلطان کی طرح حکومت کرے گا۔ اس نے خلیفہ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ شاہی پروٹوکول جو ہر سلطان کو ملا کرتا تھا، یہ کہہ کر پہلے ہی دن بند کروا دیا کہ فوج لمبا سفر کر کے تھک چکی ہے۔ جبکہ اس نے اپنا پروٹوکول جاری رکھا۔ امراء کو پابند کیا کہ وہ خلیفہ کی بجائے اس کے پاس حاضر ہوا کریں۔[3]

---

[1] النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۱۳/ ۱۲۳

[2] سمط النجوم العوالی: ۴/ ۴۲، ۴۳

[3] النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: ۱۳/ ۱۹۹ تا ۲۰۲

عالم اسلام میں علماء و مشائخ کو مستعین باللہ کے تختِ شاہی پر جلوس سے بے حد خوشی تھی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنے تاثرات کا اظہار ایک قصیدے کی شکل میں کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

اَلْمُلْکُ فِینَا ثَابِتُ الْاَسَاسِ...... بِالْمُسْتَعِینِ الْعَادِلِ الْعَبَّاسِی

عادل خلیفہ مستعین عباسی کے باعث، ہماری بادشاہت کی بنیاد مستحکم ہے

رَجَعَتْ مَکَانَۃُ آلِ عَمِّ الْمُصْطَفیٰ...... لِمَحَلِّهَا مِنْ بَعْدِ طُوْلِ تَنَاسٍ

مدتوں طویل فراموشی کے بعد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زادوں کا مرتبہ اپنی جگہ پر لوٹ آیا ہے۔

ذُوْالْبَیْتِ طَافَ بِهِ الرِّجَالُ فَهَلْ یُرٰی...... مِنْ قَاصِدٍ مُتَرَدِّدٍ فِی الْیَاسِ

یہ خلیفہ ایسے گھرانے سے ہے جس کا (ضرورت مند) لوگ طواف کرتے رہتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو حاجت روائی کی نیت سے یہاں آیا ہو مگر مایوس لوٹا ہو۔ ①

مگر یہ خوشیاں عارضی ثابت ہوئیں۔ شیخ محمودی کی سازشیں بڑھتی چلی گئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شعبان ۸۱۵ھ میں شیخ محمودی خلیفہ کو ہٹا کر "الملک المؤید" کے لقب کے ساتھ تخت پر براجمان ہو گیا۔ ②

الملک المؤید شیخ محمودی: (۸۱۵ھ تا ۸۲۴ھ)

شیخ محمودی برقوق کے موالی میں سے تھا۔ جوڑوں کے درد میں مبتلا رہنے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے عاجز تھا مگر اپنی ہوشیاری اور قوتِ تدبیر کے باعث وہ سب پر حاوی ہو گیا۔ اس نے کئی سال حکومت کی۔

شام میں امیر نوروز کے حامی امراء اس کے خلاف صف آراء ہوئے مگر شیخ محمودی نے شام جا کر ان سے متعدد جنگیں لڑیں اور آخر سب کو سرنگوں کر کے دم لیا۔ وہ علوم و فنون کی اشاعت اور مدارس کے قیام میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ آٹھ سال پانچ ماہ حکومت کر کے وہ ۹ محرم ۸۲۴ھ کو فوت ہو گیا۔ ③

الملک المظفر بن محمودی: (محرم تا شعبان ۸۲۴ھ)

شیخ محمودی کے بعد اس کے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو الملک المظفر کے لقب کے ساتھ علامتی بادشاہ مان لیا گیا۔ الظاہر برقوق کے ایک آزاد کردہ غلام ططر نے منتظم اعلیٰ کے طور پر امورِ مملکت سنبھال لیے۔ یہ بچہ فقط ساڑھے چھ ماہ تک برائے نام بادشاہ رہا۔ ④

امیر ططر: (شعبان تا ذوالحجہ ۸۲۴ھ)

۲۸ شعبان ۸۲۴ھ کو امیر ططر نے الملک المظفر کو معزول کر کے خود بادشاہت سنبھال لی۔ تین ماہ بعد ۲۶ ذوالحجہ کو

---

① تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۵۳، ط نزار

② سمط النجوم العوالی للعصامی المکی: ۳۶/۴، ط العلمیۃ

③ سمط النجوم العوالی: ۳۵/۴ تا ۴۷ ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳۲۵/۳

④ سمط النجوم العوالی: ۴۷/۴ ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۳ ص ۳۲۵ ③ سمط النجوم العوالی: ۴۷/۴، ۴۸

اس نے صلیبی گروہ ہاسپٹلرز کے ایک اور اہم جنگی مرکز جزیرۂ روڈس پر ۸۴۴ھ، ۸۴۶ھ اور ۸۴۸ھ (۱۴۴۰ء، ۱۴۴۲ء اور ۱۴۴۴ء) میں تین حملے کیے اور ان کا زور توڑ دیا۔ پہلا حملہ دشمن کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لیے تھا۔ دوسرا حملہ منظم تھا مگر کامیاب نہ ہوا۔ تیسرے حملے میں چقمق نے امیر ینال علائی کی کمان میں بہت بڑی فوج بھیجی جس میں خاصے رضا کار بھی شامل تھے۔ ۱۶ ربیع الاوّل کو افواج قاہرہ سے روانہ ہوئیں اور اسکندریہ سے بحری جہازوں میں بیٹھ کر روڈس کی طرف بڑھیں۔ دمیاط کی بحری فوج بھی اس سے آملی۔ یہ دونوں افواج طرابلس (ٹریپولی) پر جا کر لنگر انداز ہوئیں اور اسے چھاؤنی بنا کر روڈس پر حملہ آور ہوئیں۔

اسلامی فوج کا ایک حصہ خشکی پر اُتر کر امیر ینال کی قیادت میں روڈس کے قلعہ بند نصرانیوں سے برسرِ پیکار رہا جبکہ دوسرا حصہ امیر یلنجا کی کمان میں بحری جہازوں پر گشت کرتا رہا تاکہ اگر یورپی حکمرانوں کی طرف سے کوئی کمک آئے تو اسے راستے ہی میں روک لیا جائے۔ یہ پیش بندی کامیاب ثابت ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ایک یورپی بحری بیڑہ وہاں آدھمکا۔ مسلمانوں کے بحری بیڑے نے اسے آگے نہ بڑھنے دیا اور گھمسان کی جنگ کے بعد اسے پسپا کر دیا۔

اُدھر روڈس کے قلعے پر مسلسل حملے جاری رہے۔ نصرانیوں کو یہاں سخت جانی و مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلمانوں کے بھی بہت سے افراد شہید ہوئے۔ بہرکیف کئی ہفتوں کی جنگ کے باوجود یہ قلعہ سر نہ ہو سکا۔ آخر لشکرِ اسلام نے مراجعت کی اور ۱۲ رجب کو واپس قاہرہ پہنچ گیا۔[1]

چقمق کی حکومت کامیابی سے چل رہی تھی کہ وہ سخت بیمار پڑ گیا اور امورِ مملکت انجام دینے کے قابل نہ رہا۔ آخر ۲۲ محرم ۸۵۷ھ کو اس نے اپنے بیٹے کے حق میں منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ بارہ دن بعد وہ وفات پا گیا۔[2]

فخر الدین عثمان بن چقمق: (۸۵۷ھ)

چقمق کا بیٹا عثمان تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر بیس سال سے کچھ کم تھی۔ اس وقت تو امراء نے اطاعت ظاہر کی مگر بارہ دن بعد جونہی چقمق کی وفات ہوئی، امراء بغاوتوں پر تُل گئے۔ آخر عثمان کو معزول کر دیا گیا اور امیر ینال علائی تخت نشین ہو گیا۔[3]

الملک الاشرف سیف الدین ینال علائی: (۸۵۷ھ تا ۸۶۵ھ)

ینال علائی برقوق کا زرخرید غلام تھا جسے اس کے بیٹے فرج نے آزاد کر دیا تھا۔ وہ دراز قد شخصیت تھا مگر قدرتی طور پر ڈاڑھی کے بال برائے نام تھے۔ ۸ ربیع الاوّل ۸۵۷ھ کو اس نے حکومت سنبھالی اور ملک بعدل و انصاف کے ساتھ چلایا۔ اس نے آٹھ برس تک اچھی حکومت کی۔ سخت بیماری کے باعث ۱۴ جمادی الاولیٰ ۸۶۵ھ کو اس نے اپنے بیٹے احمد کے حق میں ولی عہدی کی وصیت کی اور اگلے دن وفات پا گیا۔[4]

---

[1] النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة: سنة ۸۴۴هـ، ۸۴۳هـ، ۸۴۴هـ، ۸۴۸هـ
[2] سمط النجوم العوالی: ۴/ ۵۰
[3] سمط النجوم العوالی: ۴/ ۵۱
[4] سمط النجوم العوالی: ۴/ ۵۱، ۵۲؛ النجوم الزاهرة: ۱۶/ ۲۱۸، ۲۱۹

احمد بن ینال: (۸۶۵ھ)

احمد بن ینال کی حکومت فقط پانچ ماہ رہی۔ امراء نے بغاوت کر کے اسے اسکندریہ کے قلعے میں قید کر دیا۔ امیر خشقدم ناصری نے اس کی جگہ حکومت سنبھال لی۔ [1]

خشقدم ناصری: (۸۶۵ھ تا ۸۷۲ھ)

خشقدم الملک المؤید کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اس نے تقریباً ساڑھے چھ سال حکومت کی۔ اس کا دور بھلائی یا برائی کے اعتبار سے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا۔ [2]

بلبائی المؤید: (۸۷۲ھ)

ربیع الاوّل ۸۷۲ھ میں اس کی موت کے بعد بلبائی المؤید تخت نشین ہوا مگر دو ماہ بعد معزول کر دیا گیا۔ [3]

الملک الظاہر تمر بغا: (۸۷۲ھ)

اب الملک الظاہر تمر بغا کو بادشاہ بنایا گیا جو ایک قابل شہ سوار، ماہر تیر انداز اور بے مثل تیر ساز تھا مگر وہ اچھی حکومت نہ کر سکا۔ ۵۸ دن بعد امراء نے اسے بھی ہٹا دیا۔ [4] اب امیر خیبر بک تخت نشین ہوا مگر ایک رات بعد برطرف ہو گیا۔ [5]

الملک الاشرف قائتبائی: (۸۷۲ھ تا ۹۰۱ھ)

قائتبائی اشرف برسبائی کا زرخرید غلام تھا جو بعد میں چقمق کی ملکیت میں آیا اور آزاد کر دیا گیا۔ وہ ایک صالح اور دیندار انسان تھا۔ عنفوانِ شباب میں بار برداری پر مقرر تھا۔ ایک بار رمضان کی آخری راتوں میں وہ اپنے ایک مملوک دوست کے ساتھ اونٹوں پر سامان لدوا رہا تھا کہ خیال آیا شاید آج شبِ قدر ہو، کیوں نہ ہم سب دعا مانگیں۔ قائتبائی نے دعا مانگی کہ یا اللہ مجھے مصر کا حکمران بنا دے۔ اس کے دوست نے امارت اور جاگیر کی دعا کی۔ شتربان سے پوچھا کہ تم کیا دعا کرو گے؟ اس نے کہا: ''اللہ ایمان پر موت دے دے۔'' بعد میں قائتبائی بادشاہ بنا اور اس کا دوست سرکاری امیر ہو گیا۔ قائتبائی کہا کرتا تھا: ''وہ شتربان ہم دونوں سے بازی لے گیا۔''

سلطان قائتبائی کا دور ممالیک چراکسیہ کا دورِ زرّیں تھا۔ ہر طرف امن وامان اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ سلطان کا نام فلاحی ورفاہی کاموں کے باعث مشہور ہے۔ وہ اپنے ساڑھے ۲۹ سالہ طویل دورِ حکومت میں مدارس، مساجد، کتب خانے، خانقاہیں اور مسافر خانے بنوانے میں مصروف رہا۔ حرمین شریفین کے لیے اس کی خدمات یادگار رہیں گی۔ اس نے حرمین شریفین کے باشندوں سے تمام ٹیکس ہٹا دیے۔ مسجدِ خیف کو عظیم الشان کر کے بنایا اور اس پر ایک شاندار گنبد بھی تعمیر کرایا۔ حاجیوں کو عرفات میں سہولت سے پانی فراہم کرنے کے مستقل انتظامات کرائے۔ [6] مکہ اور

---

① سمط النجوم العوالی للعصامی المکی: ۵۲/۴، ط العلمیۃ ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۴۲۶/۳

② سمط النجوم العوالی: ۵۲/۴ ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۴۲۶/۳

③ سمط النجوم العوالی: ۵۳/۴ ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۴۲۶/۳

④ سمط النجوم العوالی: ۵۳/۴

⑤ النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ: سنۃ ۸۷۲ھ

⑥ سمط النجوم العوالی: ۵۳/۴ تا ۲۰

مدینہ میں نئے مدارس قائم کیے۔[1] ۸۸۶ھ میں مسجدِ نبوی کو آتش زدگی کے باعث سخت نقصان پہنچا تو سلطان قائتبائی کے حکم سے مسجد کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا اور روضۂ اطہر پر قائم گنبد کو بھی نئے نقشے کے مطابق پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور مضبوط شکل میں بنوایا گیا۔ یہی وہ ''گنبدِ خضراء'' ہے جو عاشقانِ بارگاہِ رسالت کے لیے طور تجلی ہے۔[2]

علامہ عصامی مکی رحمہ اللہ سلطان قائتبائی کو شاندار خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ چراکسہ کے ہار کا وسطی نگینہ تھا۔ وہ رعایا کے دلوں کے سب سے زیادہ قریب، حالات میں بہترین اور احسان میں بالاترین تھا۔ عقل میں سب سے افضل، شرافت میں کامل تر، نیکی اور رفاہ کے کام میں سب سے آگے اور تعمیراتی اور وقف کے کاموں میں سب سے بڑھ کر تھا۔ وہ سب سے زیادہ طویل مدت تک حکومت کرنے والا، اقتدار کے لحاظ سب سے مضبوط اور قوی تھا۔ اس کے دور میں سلطنت اس دلہن کی مانند تھی جو عروسی جوڑے اور زیورات سے سجی ہو۔''[3]

۲۶ ذوالقعدہ ۹۰۱ھ کو قائتبائی کی وفات ہوگئی اور اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔[4]

محمد الناصر بن قائتبائی۔ پہلی بار: (۹۰۱ھ تا ۹۰۲ھ)

محمد بن قائتبائی الملک الناصر کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ ابھی چھ ماہ گزرے تھے کہ مرحوم سلطان قائتبائی کے ایک مملوک قانصوہ نے ۲۸ جمادی الاولیٰ ۹۰۲ء کو اس کے خلاف بغاوت کی اور اسے معزول کر دیا۔[5]

قانصوہ الاشرفی: (۹۰۲ھ)

قانصوہ الملک الاشرف کے لقب کے ساتھ حکمران بنا مگر گیارہ دن بعد امراء نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ وہ فرار ہو کر فلسطین چلا گیا اور وہیں لاپتا ہو گیا۔[6]

محمد بن قائتبائی۔ دوبارہ: (۹۰۲ھ تا ۹۰۴ھ)

جمادی الآخرہ ۹۰۲ھ میں محمد بن قائتبائی کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا مگر جلد ہی اس کے کرتوت سامنے آنے لگے۔ وہ کھیل تماشوں، شعبدہ بازیوں، اوباش مصاحبین کی مجالس، بدترین مظالم اور طرح طرح کی بے حیائیوں کا عادی تھا۔[7]

موروثی نظامِ حکومت نے بارہا یہ مناظر دکھائے ہیں کہ ملک کا اعلیٰ ترین عہدہ ''میرٹ'' پر نہ دیا گیا جس کے باعث بہترین حکمران کے بعد بدترین شخص نے حکومت سنبھال لی اور مستحکم ترین سلطنت تباہ ہو گئی۔ سلطان اشرف قائتبائی میں جس قدر خوبیاں تھیں، محمد الناصر اسی قدر نالائق اور ظالم تھا۔ اس کی حرکتیں امرائے سلطنت کو مشتعل کرتی رہیں۔

---

① مفاكهة الخلان في حوادث الزمان لابن طولون الحنفي (م ۹۵۳ھ): ۱/۳۱، ط العلمية
② سمط النجوم العوالي: ۴/۵۶؛ وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ للسمهودي: ۲/۱۵۹، ط العلمية
③ سمط النجوم العوالي: ۴/۵۹
④ بحوالة بالا
⑤ شذرات الذهب: ۱۰/۳۴، ط دار ابن كثير
⑥ شذرات الذهب: ۱۰/۳۴، ط دار ابن كثير
⑦ شذرات الذهب: ۱۰/۳۴؛ سمط النجوم العوالي: ۴/۵۹

اس کا ماموں قانصوہ ایک اَن پڑھ دیہاتی تھا، اپنی مادری زبان کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا تھا، وہ کچھ ہی عرصے پہلے قاہرہ آیا تھا اور فوج میں اسے ایک اہم عہدہ مل گیا تھا۔ وہ بھانجے کی ان حرکات سے سخت نالاں تھا۔ اس نے ایک افسر طومان بائی کو بھانجے کے قتل کی ذمہ داری سونپ دی۔ ۱۵ ربیع الاوّل ۹۰۴ھ کو بادشاہ شہر سے باہر سیر وتفریح کر رہا تھا کہ دس سپاہی طے شدہ منصوبے کے مطابق اس پر ٹوٹ پڑے اور قتل کر کے اس کی لاش قاہرہ پہنچادی۔ ①

قانصوہ الظاہری ابوسعید: (۹۰۴ھ تا ۹۰۵ھ)

قانصوہ اپنے بھانجے کو قتل کرا کے خود بادشاہ بن گیا مگر ناخواندہ ہونے کے باعث اس کے لیے حکومت چلانا بہت مشکل تھا۔ ② جان بلاط نامی ایک امیر اس کا چہیتا تھا۔ قانصوہ نے اپنی بہن نکاح میں دے کر اس سے رشتہ داری بھی بنالی تھی۔ یہ دیکھ کر امیر طومان بائی ان دونوں کے مابین نفرت پھیلانے لگا۔ اس کی سازش کامیاب رہی اور جان بلاط نے قانصوہ ظاہری سے نالاں ہو کر ۲ ذوالقعدہ ۹۰۵ھ کو اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ قانصوہ ظاہری نے مجبور ہو کر تخت چھوڑ دیا۔ اس کی حکومت ایک سال سات ماہ رہی۔ ③

الملک الاشرف جان بلاط: (۹۰۵ھ تا ۹۰۶ھ)

یہ قائتبائی کے پسندیدہ غلاموں میں سے ایک تھا۔ قائتبائی نے اسے قرآن مجید اور علم ریاضی کی تعلیم دلوانے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ اس کی حکومت کا آغاز اچھی توقعات کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے قاہرہ کے باہر ایک درسگاہ تعمیر کرائی جو "مدرسہ جان بلاطیہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ جان بلاط کی حکومت کو چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ طومان بائی نے بغاوت کر کے اسے معزول کر دیا۔ اسے اسکندریہ میں قید کر کے کچھ دنوں بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پہلے اسے قاہرہ میں اپنے آقا قائتبائی کے پہلو میں دفن کیا گیا مگر بعد میں قاہرہ سے باہر دفنا دیا گیا۔ دوبارہ تدفین کے لیے جب نعش نکالی گئی تو وہ بالکل صحیح وسالم تھی۔ ④

---

① شذرات الذھب: ۱۰/ ۳۴، ط دار ابن کثیر ؛ مفاکھۃ الخلان فی حوادث الزمان لشمس الدین الصالحی (م ۹۵۳ھ)، ص ۱۶۷، ط العلمیۃ ؛ سمط النجوم العوالی: ۴/ ۶۰، ط العلمیۃ

② سمط النجوم العوالی: ۴/ ۶۰ ③ شذرات الذھب: ۱۰/ ۴۱ ④ شذرات الذھب: ۱۰/ ۴۱

نوٹ: اب ہم تاریخ کا سفر کرتے کرتے دسویں صدی ہجری میں داخل ہو گئے ہیں جو اسلامی تاریخ نویسی کا دورِ زوال ہے۔ یہاں البدایۃ والنہایۃ، الکامل فی التاریخ، تاریخ الاسلام ذہبی یا تاریخ ابن خلدون جیسی جامع کتب ہمیں میسر نہیں۔ اگر عصامی کی 'سمط النجوم العوالی' ابن طولون حنفی کی "مفاکہۃ الخلان" اور ابن عماد کی "شذرات الذہب" سامنے نہ ہوتیں تو شاید ممالیک چراکسہ پر لکھنا بہت ہی مشکل ہو جاتا۔ مآخذ کی اس کمی کے باعث ان صدیوں کی تاریخ کا بہت بڑا حصہ گم ہو چکا ہے یہاں تک کہ اس دور کے متعدد حکمرانوں کی تخت نشینی اور معزولی کی صحیح تاریخ کا پتہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جان بلاط کی معزولی کی تاریخ بھی ہمیں اب تک کہیں مذکور نہیں مل سکی۔ البتہ عصامی کے مطابق اس کے بعد آنے والا حکمران طومان بائی فقط ایک دن حکمران رہا تھا۔ (سمط النجوم العوالی: ۴/ ۶۱) جبکہ ابن عماد کے مطابق طومان بائی کے بعد آنے والے حکمران قانصوہ غوری کی تخت نشینی دو شوال ۹۰۶ھ کو ہوئی تھی۔ (شذرات الذھب: ۱۰/ ۴۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جان بلاط کی حکومت ذوالقعدہ ۹۰۵ سے اواخر رمضان ۹۰۶ تک رہی۔ یعنی اس کا عہدِ اقتدار دس ماہ سے کچھ زائد تھا۔ اس لحاظ سے جان بلاط کے بارے میں علامہ عصامی کی عبارت (فِی اَوَائِل سنۃ خمس وتسعمائۃ ...... وخلع بعد ستۃ اشھر) میں واضح تسامح نظر آتا ہے۔ اسی طرح شذرات کی عبارت (فاقام نصف سنۃ وستۃ عشر یوما) بھی تسامح پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اگر جان بلاط کی حکومت ذوالقعدہ ۹۰۵ سے اواخر رمضان ۹۰۶ تک رہی تو وہ نہ چھ ماہ ہوگی نہ ڈیڑھ سال بلکہ لگ بھگ دس ماہ ہو گی۔

اس کا ماموں قانصوہ ایک اَن پڑھ دیہاتی تھا، اپنی مادری زبان کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا تھا، وہ کچھ ہی عرصے پہلے قاہرہ آیا تھا اور فوج میں اسے ایک اہم عہدہ مل گیا تھا۔ وہ بھانجے کی ان حرکات سے سخت نالاں تھا۔ اس نے ایک افسر طومان بائی کو بھانجے کے قتل کی ذمہ داری سونپ دی۔ ۱۵ ربیع الاوّل ۹۰۴ھ کو بادشاہ شہر سے باہر سیر وتفریح کر رہا تھا کہ دس سپاہی طے شدہ منصوبے کے مطابق اس پر ٹوٹ پڑے اور قتل کر کے اس کی لاش قاہرہ پہنچا دی۔ [1]

قانصوہ الظاہری ابوسعید: (۹۰۴ھ تا ۹۰۵ھ)

قانصوہ اپنے بھانجے کو قتل کرا کے خود بادشاہ بن گیا مگر ناخواندہ ہونے کے باعث اس کے لیے حکومت چلانا بہت مشکل تھا۔ [2] جان بلاط نامی ایک امیر اس کا چہیتا تھا۔ قانصوہ نے اپنی بہن نکاح میں دے کر اس سے رشتہ داری بھی بنالی تھی۔ یہ دیکھ کر امیر طومان بائی ان دونوں کے مابین نفرت پھیلانے لگا۔ اس کی سازش کامیاب رہی اور جان بلاط نے قانصوہ ظاہری سے نالاں ہو کر ۲ ذوالقعدہ ۹۰۵ھ کو اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ قانصوہ ظاہری نے مجبور ہو کر تخت چھوڑ دیا۔ اس کی حکومت ایک سال سات ماہ رہی۔ [3]

الملک الاشرف جان بلاط: (۹۰۵ھ تا ۹۰۶ھ)

یہ قائتبائی کے پسندیدہ غلاموں میں سے ایک تھا۔ قائتبائی نے اسے قرآن مجید اور علم ریاضی کی تعلیم دلوانے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ اس کی حکومت کا آغاز اچھی توقعات کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے قاہرہ کے باہر ایک درسگاہ تعمیر کرائی جو ''مدرسہ جان بلاطیہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ جان بلاط کی حکومت کو چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ طومان بائی نے بغاوت کر کے اسے معزول کر دیا۔ اسے اسکندریہ میں قید کر کے کچھ دنوں بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پہلے اسے قاہرہ میں اپنے آقا قائتبائی کے پہلو میں دفن کیا گیا مگر بعد میں قاہرہ سے باہر دفنا دیا گیا۔ دوبارہ تدفین کے لیے جب نعش نکالی گئی تو وہ بالکل صحیح وسالم تھی۔ [4]

---

(1) شذرات الذهب: ۱۰/ ۳۴، ط دار ابن کثیر ؛ مفاکهة الخلان فی حوادث الزمان لشمس الدین الصالحی (م ۹۵۳ھ)، ص ۱۶۷، ط العلمیة ؛ سمط النجوم العوالی: ۴/ ۶۰، ط العلمیة

(2) سمط النجوم العوالی: ۴/ ۶۰ (3) شذرات الذهب: ۱۰/ ۴۱ (4) شذرات الذهب: ۱۰/ ۴۱

نوٹ: اب ہم تاریخ کا سفر کرتے کرتے دسویں صدی ہجری میں داخل ہو گئے ہیں جو اسلامی تاریخ نویسی کا دورِ زوال ہے۔ یہاں البدایة والنهایة، الکامل فی التاریخ، تاریخ الاسلام ذہبی یا تاریخ ابن خلدون جیسی جامع کتب ہمیں میسر نہیں۔ اگر عصامی کی ''سمط النجوم العوالی'' ابن طولون حنفی کی ''مفاکہة الخلان'' اور ابن عماد کی ''شذرات الذہب'' سامنے نہ ہوتیں تو شاید ممالیک چراکسہ پر لکھنا بہت ہی مشکل ہو جاتا۔ مآخذ کی اس کمی کے باعث ان صدیوں کی تاریخ کا بہت بڑا حصہ گم ہو چکا ہے یہاں تک کہ اس دور کے متعدد حکمرانوں کی تخت نشینی اور معزولی کی صحیح تاریخ کا پتہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جان بلاط کی معزولی کی تاریخ بھی ہمیں اب تک کہیں مذکور نہیں مل سکی۔ البتہ عصامی کے مطابق اس کے بعد آنے والا حکمران طومان بائی فقط ایک دن حکمران رہا تھا۔ (سمط النجوم العوالی: ۴/ ۶۱) جبکہ ابن عماد کے مطابق طومان بائی کے بعد آنے والے حکمران قانصوہ غوری کی تخت نشینی دو شوال ۹۰۶ھ کو ہوئی تھی۔ (شذرات الذهب: ۱۰/ ۴۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جان بلاط کی حکومت ذوالقعدہ ۹۰۵ سے اواخر رمضان ۹۰۶ تک رہی۔ یعنی اس کا عہد اقتدار دس ماہ سے کچھ زائد تھا۔ اس لحاظ سے جان بلاط کے بارے میں علامہ عصامی کی عبارت (فی اوائل سنة خمس وتسعمائة ...... وخلع بعد ستة اشهر) میں واضح تسامح نظر آتا ہے۔ اسی طرح شذرات کی عبارت (فاقام نصف سنة وستة عشر یوما) بھی تسامح پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اگر جان بلاط کی حکومت ذوالقعدہ ۹۰۵ سے اواخر رمضان ۹۰۶ تک رہی تو وہ نہ چھ ماہ ہوئی نہ ڈیڑھ سال بلکہ لگ بھگ دس ماہ ہوگی۔

قحط الرجال کے باعث مملوکوں کو اب کوئی قابل حکمران ڈھونڈے نہیں مل رہا تھا۔ مملوک امراء اتنی کثرت سے تھے کہ ان کی آراء ایک شخص پر متفق نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ امراء ایک کو پسند کر کے بٹھاتے تو کچھ ہی دنوں میں دوسرے امراء اسے نااہل تصور کر کے ہٹا دیتے۔[1]

الملک العادل طومان بائی اوّل: (ایک دن)

''الملک العادل'' کے لقب سے تخت پر بیٹھنے والا یہ شخص بڑا فتنہ پرور تھا۔ اس نے اپنی حکومت حاصل کرنے کے لیے دو حکومتوں کا تختہ الٹوایا مگر جب تخت نشین ہوا تو اسے فقط ایک دن کا لطف نصیب ہوا۔ اگلے دن امراء نے اسے قتل کر دیا۔[2] درحقیقت ممالیک زوال کا شکار ہو چکے تھے اور دنیا کے نقشے سے ان کے مٹ جانے کا وقت آ گیا تھا۔

قانصوہ بن عبداللہ غوری: (۹۰۶ھ تا ۹۲۲ھ)

قانصوہ بن عبداللہ عمر رسیدہ، کمزور اور مفلس فوجی افسر تھا۔ عمر لگ بھگ ۶۵ سال تھی۔ مملوکوں نے یہی دیکھ کر اسے تخت پر بٹھانے کی کوشش کی کہ اسے ہٹانا آسان ہوگا۔ مگر وہ جتنا اناڑی لگتا تھا، اسی قدر سمجھ دار اور ذہین تھا۔ اس نے امراء سے کہا: ''میں اس شرط پر یہ عہدہ قبول کروں گا کہ تم مجھے قتل نہیں کرو گے۔ جب بھی مجھے ہٹانا چاہو، مجھے بتا دینا۔ میں تمہاری بات کی موافقت کروں گا اور چپ چاپ کہیں چلا جاؤں گا۔'' امراء نے اس کا عہد و پیمان کر لیا[3] اور ۲ شوال ۹۰۶ھ کو قانصوہ تخت نشین ہو گیا۔[4] اس کا آغازِ حکومت اچھی توقعات کے ساتھ ہوا۔ اس کی مجالس میں اکثر تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔[5]

ایسا لگتا تھا کہ اس قدر کمزور امیر چند دنوں کا مہمان ہوگا مگر بالکل خلافِ توقع اس نے حکومت کو سنبھال لیا اور امراء کو مطمئن رکھا۔ اس کا اندازِ سیاست یہ تھا کہ نہ اپنی بڑائی جتاتا، نہ ہی ماتحتوں پر سختی کرتا۔ عوام اور فوج جو بادشاہوں کی بار بار تبدیلی سے تنگ آ چکے تھے، اس کے آنے پر خوش تھے۔ وہ تعمیراتی اور فلاحی کاموں کا شوقین تھا۔ اس نے مصر کے حاجیوں کے لیے خلیجِ عقبہ کا راستہ کھلوا کر ان کا سفر مختصر کر دیا۔ مکہ معظمہ میں اس کی تعمیراتی یادگاریں ایک مدت تک صدقہ جاریہ بنی رہیں۔ اس نے ایک جامع مسجد بنوائی اور ساتھ ہی اپنے لیے ایک مقبرہ بھی تعمیر کرایا مگر اس کی قسمت میں وہاں دفن ہونا نہیں لکھا تھا۔

قانصوہ کے ابتدائی کئی سال اسی طرح امن و عافیت سے گزرے مگر پھر ایک فتنے نے حالات کو خرابی کی طرف دھکیل دیا۔ ابتداء قانصوہ کے مخالف امراء کی طرف سے ہوئی مگر بعد میں قانصوہ بھی پوری طرح قصوروار بن گیا۔

ہوا یہ کہ ایک بار کچھ امراء نے جو حکومت میں اُدل بدل کے عادی ہو چکے تھے، قانصوہ کو جبراً معزول کرنے کی سازش کی۔ قانصوہ کو خبر مل گئی۔ اس نے تمام امراء کو جمع کیا اور ان کے درمیان زمین پر بیٹھ گیا۔ جبکہ دستور یہ تھا کہ

---

① سمط النجوم العوالی: ۹۱/۴ ② سمط النجوم العوالی: ۹۱/۴ ③ سمط النجوم العوالی: ۹۲،۹۱/۴
④ شذرات الذھب فی اخبار من ذھب: ۳۱/۱۰، ط دار ابن کثیر
⑤ ملاحظہ ہو: مجالس السلطان الغوری للدکتور عبد الوھاب عزام، ط مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، ۱۴۳۱ھ

بادشاہ کی موجودگی میں امراء کھڑے رہتے تھے۔ قانصوہ کے اس انداز پر سب کو حیرت ہوئی۔

قانصوہ نے انہیں کہا: ''میں آپ سب سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کچھ لوگ ایک آدمی کے پاس جائیں اور اسے دراہم کی ایک مہر بند تھیلی بطورِ امانت سونپنے کی کوشش کریں۔ وہ آدمی کہے کہ میں یہ امانت ایک شرط پر رکھوں گا، وہ یہ کہ اسے واپس لینا آپ کے ذمے ہے۔ جب آپ واپس مانگیں گے، میں کسی حیل وحجت اور جھگڑے کے بغیر دے دوں گا۔ وہ لوگ اس پر راضی ہو جائیں۔ کچھ عرصے بعد وہ لوگ اس کے پاس آئیں اور کہیں کہ ہم یہ امانت تم سے لڑ جھگڑ کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ آدمی کہے کہ تمہاری امانت یہ رہی، اسے بغیر جھگڑے اور لڑائی کے لے لو۔ مگر وہ لوگ کہیں کہ ہم تو لڑ جھگڑ کر ہی لیں گے، تو اب بتاؤ کہ ان فریقین میں سے کون درست ہے اور کون غلط؟''

امراء قانصوہ کا اشارہ سمجھ گئے۔ انہوں نے اپنی غلطی پر معافی مانگی۔

قانصوہ نے کہا: ''میں تمہارے ساتھ اسی لیے بیٹھا ہوں تاکہ تم جان لو کہ میں تمہی میں سے ایک ہوں۔ میں کسی بات میں ممتاز نہیں ہوں۔ یہ سلطنت تم میں سے جو چاہے میں اس کے سپرد کر دیتا ہوں۔ میں ذرا بھی جھگڑا نہیں کروں گا۔ میں تو بس ایک سپاہی ہوں۔''

اس پر سب امراء نے اس کے ہاتھ چومے، اطاعت کا وعدہ کیا اور درخواست کی کہ وہ بادشاہت پر برقرار رہے۔

اگر بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو تاریخ میں یہ ایک بادشاہ کی شرافت اور حسنِ تدبیر کی عمدہ مثال بن جاتی۔ مگر اس کے بعد قانصوہ نے جو کیا، وہ اس خوبصورت حکایت کو بدنما بنا دیتا ہے۔ قانصوہ نے امراء پر ظاہر تو یہی کیا کہ وہ ان سے قطعاً خفا نہیں ہے مگر اندر سے وہ ان پر سخت برہم تھا۔ اس نے سازش میں شریک تمام امراء کو بلیک لسٹ میں رکھا۔ وہ امراء یہ سوچ کر بے فکر ہو چکے تھے کہ بادشاہ اور ہمارے درمیان کوئی رنجش نہیں رہی مگر بادشاہ ایک منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔ اس نے کچھ عرصے بعد خفیہ تدابیر کے ذریعے ایک ایک کر کے بلیک لسٹ امراء کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ کبھی وہ دو امراء کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں باہم لڑوا دیتا، کبھی کسی کو کھانے میں زہر دے کر مروا دیتا۔ یوں اس نے کچھ عرصے میں ممالیک کے تمام صفِ اوّل کے امراء سے نجات حاصل کر لی۔

اس کے بعد اس نے باہر سے نئے غلام منگوائے اور انہیں کلیدی عہدے دے کر حکومت پر مسلط کر دیا۔ یہ ناتجربہ کار نودولتیے عوام پر قابو پا کر خود بے قابو ہو گئے اور لوگوں پر ظلم کرنے لگے۔ نوبت یہ آئی کہ جس کسی کے لباس، سواری اور گھر بار سے خوش حالی جھلکتی، اس پر دباؤ ڈالا جاتا کہ وہ سرکار کو قرض دے۔ اس طرح اس کی بہت سی دولت ہتھیا لی جاتی۔ کسی مالدار شخص کی وفات ہو جاتی تو اس کا ترکہ ورثاء میں تقسیم ہونے سے پہلے ہی سرکار اپنی تحویل میں لے لیتی۔

قانصوہ یہ سب دیکھ کر بھی چشم پوشی کرتا رہا کیوں کہ اس کے لیے یہی کافی تھا کہ یہ امراء اس سے غداری نہیں کریں گے اور اس کی کرسی مضبوط رہے گی۔ اس طرح قانصوہ نے بڑے دبنگ انداز میں سولہ سال تک حکومت کی۔ [1]

---

(1) سمط النجوم العوالی: ۴/۶۱ تا ۶۳

مگر اس مصنوعی استحکام نے دولتِ چراکسیہ کو اندرونی طور پر بالکل کھوکھلا کر دیا۔ قانصوہ نے دوسری بھاری غلطی یہ کی کہ اپنی حکومت کو بچانے کے لیے ایران کے بادشاہ شاہ اسماعیل صفوی سے دوستی کر لی جو اہلِ سنت کا سخت ترین مخالف اور ایشیائے کوچک میں ابھرنے والی دولتِ عثمانیہ کا بدترین دشمن تھا۔ اس طرح مصر ایران کا حلیف بن کر دولتِ عثمانیہ کے مدِ مقابل آ گیا۔ دولتِ عثمانیہ کے سربراہ سلطان سلیم اوّل نے قانصوہ کو متنبہ کیا کہ وہ اسماعیل صفوی سے اتحاد ختم کر دے کیوں کہ یہ دولتِ عثمانیہ کی سلامتی کے لیے خطرہ تھا۔ مگر قانصوہ نہ مانا۔ آخر سلیم اوّل کی افواج ایشیائے کوچک سے شام کی طرف روانہ ہوئیں۔ ادھر قانصوہ بھی ایک لشکرِ جرار لے کر قاہرہ سے سرحداتِ شام کی طرف نکلا۔ مرج دابق کے مقام پر دونوں فوجوں میں زبردست معرکہ ہوا جس میں ترک غالب رہے اور چراکسیہ کو شکستِ فاش ہوئی۔ قانصوہ مارا گیا اور اس کا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ یہ واقعہ ۲۵ رجب ۹۲۲ھ کا ہے۔ قانصوہ کی عمر ۸۰ سال تھی۔ [1]

طومان بائی ثانی: (۹۲۲ھ تا ۹۲۳ھ)

قانصوہ کے بعد قاہرہ کے تخت پر ایک امیر طومان بائی کو بٹھایا گیا۔ سلیم اوّل نے اسے ماتحتی اختیار کرنے کی پیش کش کی مگر وہ نہ مانا۔ آخر ترک افواج نے پیش قدمی کی۔ پہلے شام میں فریقین کے درمیان معرکہ ہوا۔ مصری افواج شکست کھا کر پسپا ہوئیں۔ ترک افواج تعاقب کرتے ہوئے قاہرہ پہنچ گئیں۔ محرم ۹۲۳ھ میں مصری افواج کی قوتِ مزاحمت جواب دے گئی اور ترک افواج شہر میں داخل ہو گئیں۔ طومان بائی گرفتار ہو گیا۔ ۲۱ ربیع الاوّل ۹۲۳ھ کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ یوں چراکسیہ کی حکومت ختم ہوئی اور ساتھ ہی مملوکوں کی ۲۸۳ سالہ دورِ حکومت ختم ہو گیا۔ [2]

دورِ ممالیک پر ایک تبصرہ:

مملوکوں نے مصر وشام کی باگ ڈور ایسے حالات میں سنبھالی تھی جب ان کے مشرق میں تاتاریوں کا فتنہ تمام ممالک کو تہہ و بالا کر چکا تھا اور بحیرۂ روم سے یورپی طاقتیں مسلسل عالم اسلام پر حملے کر رہی تھیں۔ مملوکوں نے ان دونوں طاقتوں کا سر نیچا کر کے دکھایا اور بین الاقوامی سطح پر ملتِ اسلامیہ کو ایک غالب قوت کی حیثیت میں زندہ رکھا۔

مملوکوں کے دونوں گروہ: بحریہ اور چراکسیہ میں عظیم الشان حکمران گزرے ہیں جن کے کارنامے آج بھی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ حرمین شریفین کے لیے ان کی خدمات سابقہ تمام مسلم حکمرانوں سے ممتاز نظر آتی ہیں۔

ممالیک کی اصل قوت ان کی اسلامی حمیت اور موروثی طرزِ حکومت کی جگہ "میرٹ" پر حکمرانوں کا عزل ونصب تھا مگر پہلے ممالیکِ بحریہ ان اصولوں سے پیچھے ہٹے اور زوال کا شکار ہوئے۔ پھر چراکسیہ نے ان کی جگہ لی اور صحیح اصولوں کی پاسداری کی کوشش کی مگر آخر میں وہ بھی جمود کا شکار ہو کر ایک ناکام نظام کا تسلسل بن گئے۔ چنانچہ قانونِ الٰہی نے انہیں بارِ سیادت سے سبک دوش کر کے یہ ذمہ داری دیگر اقوام کو سونپ دی۔

---

① تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بک، ص ۱۹۲، ط دار النفائس بيروت ② تاريخ الدولة العلية العثمانية، ص ۱۹۳ تا ۱۹۵

ممالیک چراکسیہ ۔۱۳۹ سالہ دور

۷۸۴ھ تا۹۲۳ھ..............۱۳۸۲ء تا۱۵۱۷ء

نمبر	حکمران	دورِحکومت	انجام	خاص بات
۱	الظاہر برقوق ۔سیف الدین	رمضان۷۸۴ھ تا شوال ۸۰۱ھ (۱۳۸۲ء تا۱۳۹۹ء)	وفات	بانی دولتِ چراکسیہ
۲	فرج بن برقوق الناصر، پہلی بار	شوال ۸۰۱ھ تا ربیع الاول ۸۰۸ھ (۱۳۹۹ء تا۱۴۰۵ء)	ازخودمعزول	چھ سال پانچ ماہ حکومت کی
۳	الملک المنصور عبدالعزیز بن برقوق	ربیع الاول تا جمادی الآخرہ ۸۰۸ھ۔ ستمبر تا دسمبر ۱۴۰۵ء	معزول	تین ماہ حکومت کی
	فرج بن برقوق الناصر، دوبارہ	جمادی الآخرہ ۸۰۸ھ تا صفر ۸۱۵ھ (دسمبر ۱۴۰۵ء تا جون ۱۴۱۲ء)	قتل	
	خلیفہ مستعین باللہ	صفر تا شعبان ۸۱۵ھ (جون تا دسمبر ۱۴۱۲ء)	معزول	چراکسیہ کی حکومت عارضی طور پر چھ ماہ تک معطل رہی
۴	شیخ محمودی، ابونصر المؤید	شوال ۸۱۵ھ تا محرم ۸۲۴ھ ۱۴۱۲ء تا۱۴۲۱ء	وفات	چراکسیہ کی حکومت دوبارہ شروع۔خلیفہ بے اختیار
۵	احمد بن شیخ محمودی۔المظفر	محرم تا شعبان ۸۲۴ھ (فروری تا اگست ۱۴۲۱ء)	معزول	سات ماہ برائے نام حکومت
۶	الظاہر ططر	شعبان تا ذوالحجہ ۸۲۴ھ (اگست تا دسمبر ۱۴۲۱ء)	وفات	چار ماہ برائے نام حکومت
۷	محمد بن ططر الصالح	ذوالحجہ ۸۲۴ھ تا ربیع الاول ۸۲۵ھ (دسمبر ۱۴۲۱ء تا مارچ ۱۴۲۲ء)	معزول	تین ماہ حکومت کی

۸	برسبائی اشرف سیف الدین	ربیع الاول ۸۲۵ھ تا ذوالحجہ ۸۴۱ھ (مارچ ۱۴۲۲ء تا جون ۱۴۳۸ء)	وفات	۱۶ سال ۸ ماہ حکومت کی۔ کمزور سلطنت کو مضبوط کیا، قبرص پر تین حملے کیے۔
۹	یوسف بن برسبائی العزیز	ذوالحجہ ۸۴۱ھ تا ربیع الاول ۸۴۲ھ (جون تا ستمبر ۱۴۳۸ء)	معزول	تین ماہ حکومت کی
۱۰	چقمق الظاہر سیف الدین	ربیع الاول ۸۴۲ھ تا محرم ۸۵۷ھ (ستمبر ۱۴۳۸ء تا فروری ۱۴۵۳ء)	وفات بعمر ۸۰ سال	۱۵ سال حکومت کی۔ جزیرۂ روڈس پر تین حملے کیے
۱۱	عثمان بن چقمق، المنصور فخر الدین	محرم تا ربیع الاول ۸۵۷ھ (فروری تا مارچ ۱۴۵۳ء)	معزول	ڈیڑھ ماہ حکومت کی
۱۲	اینال العلائی اشرف سیف الدین	ربیع الاول ۸۵۷ھ تا جمادی الاولیٰ ۸۶۵ھ (مارچ ۱۴۵۳ء تا مارچ ۱۴۶۱ء)	وفات	آٹھ سال دو ماہ حکومت کی
۱۳	احمد بن اینال، المؤید شہاب الدین	جمادی الاولیٰ تا رمضان ۸۶۵ھ (مارچ تا جولائی ۱۴۶۱ء)	معزول	چار ماہ حکومت کی
۱۴	خشقدم، الظاہر سیف الدین	رمضان ۸۶۵ھ تا ربیع الاول ۸۷۲ھ (جولائی ۱۴۶۱ء تا اکتوبر ۱۴۶۷ء)	وفات	ساڑھے چھ سال حکومت کی
۱۵	بلبائی مویدی، ظاہر سیف الدین	ربیع الاول تا جمادی الاولیٰ ۸۷۲ھ (اکتوبر تا دسمبر ۱۴۶۷ء)	معزول	دو ماہ حکومت کی
۱۶	تمربغا، الظاہر	جمادی الاولیٰ تا رجب ۸۷۲ھ (دسمبر ۱۴۶۷ء تا فروری ۱۴۶۸ء)	معزول	دو ماہ حکومت کی
۱۷	خیربک	ایک رات	معزول	
۱۸	قائتبائی اشرف سیف الدین	رجب ۸۷۲ھ تا ذوالقعدہ ۹۰۱ھ (فروری ۱۴۶۸ء تا اگست ۱۴۹۶ء)۔	وفات	مثالی حکمران۔ ۲۹ سال حکومت۔ ملک مستحکم۔ مؤسس گنبدِ خضرا۔

۱۹	محمد بن قائتبائی الناصر۔پہلی بار	۲۶ ذوالقعدہ ۹۰۱ھ تا ۲۸ جمادی الاولیٰ ۹۰۲ھ اگست ۱۴۹۶ء تا فروری ۱۴۹۷ء	معزول	چھ ماہ حکومت کی۔
۲۰	قانصوہ الاشرفی	۹۰۲ھ۔۱۴۹۷ء (گیارہ دن)	معزول ۔لاپتا	
	محمد بن قائتبائی الناصر۔دوبارہ	۱۰ جمادی الآخرہ ۹۰۲ھ تا ذوالقعدہ ۹۰۴ھ فروری ۱۴۹۷ء تا جولائی ۱۴۹۹ء	قتل ۹۰۴ھ	انتہائی نالائق اور بدکردار
۲۱	قانصوہ ابوسعید	ذوالقعدہ ۹۰۴ھ تا جمادی الآخرہ ۹۰۵ھ جولائی ۱۴۹۹ء تا جنوری ۱۵۰۰ء	معزول ۹۰۵	ایک سال سات ماہ حکومت کی
۲۲	جان بلاط الاشرف	ذوالقعدہ ۹۰۵ھ تا رمضان ۹۰۶ھ ۱۴۹۹ء	معزول، قتل	دس ماہ حکومت کی
۲۳	العادل طومان بائی اوّل	ایک دن	قتل	
۲۴	الاشرف قانصوہ الغوری	شوال ۹۰۶ھ تا رجب ۹۲۲ھ (مئی ۱۵۰۱ء تا اگست ۱۵۱۶ء)	میدان جنگ میں قتل	۱۷ سال حکومت ترکانِ عثمان سے جنگیں
۲۵	طومان بائی ثانی، الاشرف	رجب ۹۲۲ھ تا محرم ۹۲۳ھ اگست ۱۵۱۶ء تا فروری ۱۵۱۷ء	گرفتار، قتل	آخری مملوک حکمران۔ ترکانِ عثمان کے ہاتھوں قتل

دورِ ممالیک......علمی وتمدنی خدمات

ممالیک بحریہ کا دور مصر اور شام میں علم وتمدن کا دورِ زریں تھا۔ بڑے بڑے علماء، محدثین اور فقہاء کا تعلق اسی دور سے ہے۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام، ابوشامہ المقدسی، علامہ ابن منظور، ابن دقیق العید، امام نووی، ابن خلکان، علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم، امام مزی، حافظ ذہبی، علامہ مغلطائی، حافظ ابن حجر، حافظ ابن کثیر، علامہ مقریزی، علامہ جلال الدین سیوطی، امام بوصیری اور علامہ قلقشندی رحمہم اللہ جیسے نامور اہلِ علم اس زمانے میں علوم وفنون کی ضیا پاشیوں میں منہمک رہے۔ شروحِ حدیث، اصولِ حدیث، فقہِ اسلامی، علم الرجال، طبقات اور تاریخ پر اس دور میں ایسی ضخیم اور جامع کتب تحریر کی گئیں جن کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ مصر اور شام اس دور میں علمی، تمدنی، سیاسی اور روحانی لحاظ سے عالم اسلام کا قلب بن گئے تھے۔ تاتاریوں سے بچ کر اس خطے میں پناہ لینے والوں میں ہزاروں عالم فاضل گھرانے بھی شامل تھے جن کے جوہرِ قابل اس دور میں پوری دنیا کے لیے آفتابِ عالم تاب کی شکل اختیار کر گئے۔ ان میں سینکڑوں جلیل القدر مشائخ اور صوفیائے کرام بھی تھے جن کی ایمانی وروحانی کوششوں نے مصر اور شام کو ایک پاکیزہ معاشرے میں تبدیل کر دیا۔

علمی سرگرمیوں سے دلچسپی:

ممالیک سلاطین علماء ومشائخ کی علمی وروحانی سرگرمیوں کی پوری سرپرستی کیا کرتے تھے۔ علامہ ابن خلکان، علامہ محی الدین اور عزالدین ابن شداد جیسے مؤرخین کا تعلق سلطان رکن الدین بیبرس کے دور سے تھا جو تاریخ نگاری کا بڑا شوقین تھا اور مؤرخین کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا اور ان سے تاریخی واقعات سنتا اور لکھواتا تھا۔ اس کا کہنا تھا:

"سماع التاریخ اعظم من التجارب."

(تاریخی واقعات کا سننا تجربات سے کہیں بڑھ کر ہے۔)[1]

مملوک امراء حدیث، فقہ، تاریخ اور ادب پڑھنے پڑھانے کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ درسگاہیں اور تعلیمی مراکز کھلوانے کے شوق میں ممالیک نے ایوبی حکمرانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بیبرس نے جامع الازہر کھلوانے کے بعد وہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کرایا جسے پہلے "الجامعۃ الظاہریہ" اور پھر "الجامعۃ الازہر" کے نام سے شہرت ملی۔ ۷۲۵ھ اور ۷۶۱ھ میں اس مسجد اور درسگاہ کی تعمیرِ نو ہوئی اور بعد میں توسیع وتجدید کا سلسلہ جاری رہا۔[2]

---

(1) النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ: ۱۸۲/۷ (2) المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار للمقریزی: ۵۶،۵۵/۴

جامعۃ الازہر کے علاوہ بھی ممالیک نے سلطنت میں جابجا تعلیمی مراکز قائم کیے۔ قلاوون نے ''مدرسۂ منصوریہ'' اور ناصر بن قلاوون نے ''مدرسۂ ناصریہ'' تعمیر کرایا۔ (1) سلطان قائتبائی نے بیت المقدس میں ایک عظیم درسگاہ قائم کی۔ (2) سلطان شعبان بن حسین نے قاہرہ کے قلعۃ الجبل کے سامنے ایک تعلیم گاہ کھلوائی۔ (3) الملک الاشرف جانبلاط نے اپنے قاہرہ میں ایک نیا مدرسہ تعمیر کیا جو ''مدرسۂ جانبلاطیہ'' کہلاتا تھا۔ (4) سلطان حسن بن ناصر نے ۷۵۷ھ میں دنیا کا سب سے بڑا مدرسہ قائم کرنا شروع کیا جس کی تعمیر تین سال میں مکمل ہوئی۔ اس پر دو کروڑ سولہ لاکھ درہم (تقریباً ساڑھے پانچ ارب روپے) خرچ ہوئے۔ تعمیر کا یومیہ خرچہ بیس ہزار درہم تھا جس کے باعث سلطان کو ایک بار کہنا پڑا:

''اگر اس طعنے کا ڈر نہ ہوتا کہ بادشاہ اپنی تعمیر کی تکمیل سے عاجز ہو گیا ہے، تو میں اس کی تعمیر رکوا دیتا۔'' (5)

امرائے سلطنت بھی علمی سرگرمیوں کے سرپرست تھے۔ امیر جمال الدین محمود کا تعمیر کردہ مدرسۂ محمودیہ اپنے دور کا بہترین تعلیمی ادارہ تھا۔ (6) سیف الدین منجک نے بیت المقدس میں ''مدرسۂ منجکیہ'' تعمیر کرایا۔ (7) حاجی ملک چوکندار نے الملک الناصر بن قلاوون کے دور میں بیت المقدس میں ایک درسگاہ بنوائی جو مدرسۂ ملکیہ کہلائی۔ (8)

مساجد اور خانقاہوں کا قیام:

دینی ماحول عام ہو جانے کی وجہ سے مساجد کی تعمیرات بھی بکثرت ہوتی تھیں۔ قاہرہ اور اس کے گرد و نواح میں سینکڑوں مساجد تھیں۔ فقط جامع مسجدوں کی تعداد ایک سو تیس تک پہنچ چکی تھی۔ (9)

ممالیک خانقاہوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ ان کے دور میں درجنوں نئی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ بیبرس جاشنکیر نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں قصرِ وزارت کو خانقاہ میں تبدیل کر دیا جسے ایک زمانے تک مصر کی سب سے بڑی خانقاہ کی حیثیت حاصل رہی۔ (10) اشرف برسبائی نے آمد میں ایک عمارت کو خانقاہ کے طور پر وقف کیا تھا۔ (11)

شفاخانے:

ممالیک نے صحت کے شعبے پر پوری توجہ دی۔ سلطان قلاوون نے قاہرہ میں بہت بڑا شفاخانہ ''مارستان الکبیر منصوری'' قائم کیا جس کے احاطے کا طول پانچ سو اور عرض دو سو گز تھا۔ تعمیر ۶۸۳ھ میں شروع ہو کر گیارہ ماہ میں مکمل

---

(1) حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاهرۃ للسیوطی: ۲/۲۶۴، ۲۶۵، ط داراحیاء الکتب العربیۃ

(2) مفاکهۃ الخلان فی حوادث الزمان لابن طولون الحنفی (م ۹۵۳ھ): ۱/۳۱، ط العلمیۃ ؛ الأنس الجلیل بتاریخ القدس والخلیل لابی الیمن العُلیمی (۹۲۸ھ): ۲/۳۳۵، ط مکتبۃ دندیس – عمان

(3) المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار للمقریزی: ۲/۲۸۳

(4) شذرات الذهب: ۱۰/۴۱، ط دار ابن کثیر

(5) حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاهرۃ للسیوطی: ۲/۲۶۹، ط داراحیاء الکتب العربیۃ

(6) المواعظ والاعتبار (الخطط للمقریزی): ۴/۲۵۰، ۲۵۱

(7) الدارس فی تاریخ المدارس لعبد القادر النعیمی (م ۹۲۷ھ): ۱/۳۶۱، ط العلمیۃ

(8) الانس الجلیل فی بتاریخ القدس والخلیل، لابی الیمن العلیمی (م ۹۲۸ھ): ۲/۳۸، ط مکتبۃ دندیس عمان

(9) المواعظ والاعتبار (الخطط للمقریزی): ۴/۲ تا ۵

(10) حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاهرۃ: ۲/۲۶۵

(11) الدارس فی تاریخ المدارس لعبد القادر النعیمی (م ۹۲۷ھ): ۲/۱۱۱، ط العلمیۃ

ہوئی۔ دس ہزار درہم اس کے سالانہ اخراجات کے لیے وقف تھے۔ یہاں امراض کے الگ الگ شعبے قائم تھے۔ مثلاً: آنکھوں کا شعبہ، شعبۂ جراحی، شعبۂ امراضِ شکم، شعبۂ بخار وغیرہ۔ ہر شعبے میں خواتین اور مردوں کے الگ الگ حصے تھے۔ خدمت کے لیے نرسیں اور خدمت گار تعینات تھے۔ عمارت چار احاطوں پر مشتمل تھی۔ دواسازی، تیار ادویات کے ذخیرے، ادویات کی تقسیم، مریضوں اور عملے کو خوراک اور صاف پانی کی فراہمی اور حساب کتاب کے کھاتوں کے لیے الگ الگ عمارات تھیں۔ اسی میں ایک طبیہ کالج تھا جس میں فنِ طب و جراحت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دیگر ممالیک سلاطین نے بھی شفاخانے قائم کیے جن میں شیخ محمودی المؤید کا قائم کردہ شفاخانہ مشہور تھا۔ [1]

کتب خانے:

دورِ ممالیک میں جابجا کتب خانے قائم کیے گئے تھے۔ ہر درسگاہ کے ساتھ ایک لائبریری بنوائی جاتی تھی۔ قاہرہ کے قلعہ جبل کا کتب خانہ اپنے دور کے عظیم ترین کتب خانوں میں سے ایک تھا جو ہر فن کی نادر و نایاب کتب سے آراستہ تھا۔ سلطان رکن الدین بیبرس کے مدرسۂ ظاہریہ کا کتب خانہ بڑا مشہور تھا۔ قلاوون کے مدرسۂ منصوریہ اور محمد بن قلاوون کے مدرسۂ ناصریہ کے کتب خانے تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، تاریخ اور طب سمیت درجنوں علوم کی ہزاروں کتب کو حاوی تھے۔ مدارس کے علاوہ خانقاہوں اور جامع مساجد کے ساتھ بھی لائبریریاں ہوا کرتی تھیں۔ [2]

فرقہ بندیوں کی روک تھام:

ممالیک سلاطین دینی لحاظ سے بڑا پختہ ذہن رکھتے تھے۔ اُمت میں فرقہ بندیوں کو روکنے کے لیے ان کے نزدیک ضروری تھا کہ مکاتبِ فکر کو ائمہ اربعہ کے اتباع میں محدود رکھا جائے چنانچہ سلطان بیبرس کے دور سے یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ صرف اس شخص کو قاضی، خطیب، مدرس یا امام مسجد مقرر کیا جاتا تھا جو ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا مقلد ہو۔ جو ان سے ہٹ کر کسی اور گروہ کی طرف منسوب ہوتا عدالت میں اس کی گواہی بھی قبول نہیں کی جاتی تھی۔ [3]

اگرچہ شیعہ اور دوسرے فرقے بڑی تعداد میں شام و مصر میں موجود تھے اور حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ چہار دیواری میں کیا کرتے ہیں لیکن اگر حکومت کو اطلاع ملتی کہ کسی نے باطل عقائد کا اظہار کیا ہے تو اسے سخت سزا دی جاتی اور توبہ کرائے بغیر نہ چھوڑا جاتا۔ [4] حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی توہین پر سزائے موت مقرر تھی۔ [5]

حرمین شریفین کی خدمت:

ممالیک سلاطین کو حرمین شریفین سے بڑی عقیدت تھی۔ خاص کر مسجدِ نبوی اور روضۂ اطہر کی دیکھ بھال کے لیے ان کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان سے پہلے سلطان نورالدین زنگی نے روضۂ اطہر کی حفاظت کے لیے زیرِ زمین

---

[1] المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار للمقریزی: ۲۶۸/۴

[2] المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۲۱۲/۲ ؛ النجوم الزاهرة: ۳۳/۸ ؛ نهایة الارب للنویری: ۱۰۹/۳۱، ط قاهرة

[3] المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار للمقریزی: ۱۶۱/۴

[4] الدرر الکامنة فی اعیان المائة الثامنة لابن حجر العسقلانی: ۲۹۹/۲؛ ۱۷۵/۶، ۴۷/۴ [5] الدرر الکامنة: ۱۱۳/۴

سیسہ بھری خندق بنوائی تھی، جس پر صندل کا جنگلا نصب تھا۔ سلطان رکن الدین بیبرس نے ۶۶۸ھ میں حج کے موقع پر دیکھا کہ زائرین مرقدِ مبارک کے پاس جا کھڑے ہوتے ہیں جس میں بے ادبی ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ اس نے صندل کے جنگلے کے گرد تقریباً بارہ فٹ اونچا جالی دار احاطہ تعمیر کرا دیا جس کے اندر بیت فاطمہ الزہراء بھی آ گیا۔ اس کے بعد سے آج تک کسی انسان کو یہ احاطہ عبور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ العادل کتبغا نے ۶۹۴ھ میں اس احاطے کو بلند کر کے مسجد کی چھت سے ملا دیا۔ دو صدیوں بعد سلطان اشرف قائتبائی نے ۸۹۲ھ میں روضۂ اقدس کے گرد سنگ مرمر کا ایک احاطہ کھینچ دیا اور اس کے گرد فولادی جالیاں نصب کرا دیں۔

روضۂ پاک پر گنبد کی تعمیر بھی ممالیک سلاطین کا کارنامہ ہے۔ سب سے پہلے ۶۷۸ھ میں سلطان قلاوون نے روضے کے احاطے کے گرد سنگِ مرمر کے ستونوں کا ایک دائرہ بنوایا اور اس پر چھت ڈال کر روضۂ اطہر کا پہلا گنبد تعمیر کرایا جو لکڑی کا تھا اور کناروں پر سیسے کی چادریں تھیں۔ اس کے بیٹے الناصر محمد نے اسی گنبد کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ پھر الظاہر چقمق نے اپنے دور میں نئے سرے سے گنبد بنوایا۔ ۸۸۶ھ میں سلطان اشرف قائتبائی نے گنبد کو باقی رکھتے ہوئے اس پر سفید و سیاہ سنگِ مرمر کا ایک بڑا گنبد اس طرح بنوایا کہ پرانا گنبد اس کے اندر آ گیا۔ چھ سال بعد اسی بادشاہ نے دونوں گنبدوں کے اوپر ایک تیسرا نہایت خوبصورت اور عظیم الشان گنبد تعمیر کرایا جو اب گنبدِ خضراء کہلاتا ہے اور زائرین کی مشتاق نگاہوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے۔ اس وقت سلطان قائتبائی نے اس گنبد کا رنگ نیلا رکھا تھا۔ ساڑھے تین صدیوں بعد عثمانی ترک سلاطین نے ۱۲۳۳ھ میں اس پر سبز رنگ چڑھا دیا جو آج تک باقی ہے۔ ①

معاشرے میں علماء کا مقام اور مذہبی رواداری:

معاشرے میں مفتیان اور علماء کا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ وہ حکومتی اقدامات کو منسوخ کرانے کی جرأت رکھتے تھے۔ جب ۶۸۰ھ میں سیف الدین قلاوون نے تاتاریوں سے ایک بڑی جنگ کے لیے شام میں فوج اکٹھی کی تو اس وقت مقامی نصرانیوں سے بغاوت کا خطرہ تھا، سلطان نے بہت سے عیسائی شہریوں کو گرفتار کر کے گردنوں میں پھانسی کے پھندے ڈلوا دیے کہ کلمہ پڑھو ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مجبوراً انہوں نے کلمہ پڑھ کر جان چھڑائی۔ جنگ کے بعد انہوں نے عدالت میں مقدمہ پیش کیا کہ ہمیں جبراً مسلمان بنایا گیا ہے لہٰذا ہمیں اپنا آبائی مذہب اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ قاضی جمال الدین مالکی نے مقدمے کی سماعت پوری غیر جانب داری سے کی اور پختہ شہادتوں سے جبری قبولِ اسلام ثابت ہونے پر انہیں دوبارہ آبائی مذہب اختیار کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ان کی اکثریت سابقہ مذہب پر لوٹ گئی۔ ②

---

① وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ للسمہودی (م ۹۱۱ھ): ۲/۱۵۷ تا ۱۶۰، ط العلمیة

② البدایة والنهایة: سنة ۶۸۰ھ

خلافتِ عباسیہ قاہرہ

۶۵۶ھ میں خلافتِ عباسیہ بغداد کے سقوط کے بعد ساڑھے تین سال تک خلافت معطل رہی۔ آخر قاہرہ کو مرکزِ خلافت بننے کا شرف نصیب ہوا۔ بچے کھچے عباسی شہزادوں کو وہاں مسندِ خلافت دے دی گئی۔ ان خلفاء کا اقتدار علامتی تھا۔ جب بھی کسی خلیفہ کی بیعت کی جاتی تو اس کے ساتھ ہی وہ اعلان کر دیتا کہ میں نے بطورِ خلیفہ امورِ سلطنت بادشاہ کے حوالے کر دیے ہیں۔ ① قاہرہ میں سترہ عباسی خلفاء گزرے ہیں جن کا مختصر احوال درجِ ذیل ہے:

① مستنصر باللہ، احمد: (رجب ۶۵۹ھ تا محرم ۶۶۰)

ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے دوران ایک عباسی شہزادہ احمد بن ظاہر بچ نکلا اور عراق عرب وشام سے ہوتا ہوا مصر آن پہنچا جہاں مملوک سلطان رکن الدین بیبرس نے علماء وقضاۃ کے مشورے سے ۱۳ رجب ۶۵۹ھ کو اسے منصبِ خلافت پر فائز کر دیا۔ کچھ مدت بعد مستنصر نے تاتاریوں کو عراق سے نکالنے کے لیے فوج کشی کی۔ ۳ محرم ۶۶۰ھ کو تاتاریوں سے ایک معرکہ ہوا جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور خلیفہ لاپتا ہو گیا۔ اس کی مدتِ خلافت فقط چھ ماہ رہی۔ ② ایک سال تک لوگ اس انتظار میں رہے کہ خلیفہ کا کچھ پتا چل جائے مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

② الحاکم، احمد بن ابو علی: (۶۶۱ھ تا ۷۰۱ھ)

مستنصر کی گم شدگی کے ایک سال بعد ۸ محرم ۶۶۱ھ کو احمد نامی ایک اور عباسی شہزادے کو خلافت سونپی گئی جس نے حاکم کا لقب اختیار کیا۔ وہ ایک زبردست خطیب تھا۔ اس کے خطبات نے مسلمانوں میں جذبۂ جہاد بیدار کر دیا۔

کچھ مدت بعد حاکم کے ہم نشینوں سے سلطنت کی باتیں باہر افشاء ہونے لگیں جس پر ۶۶۳ھ میں سلطان بیبرس نے حاکم سے ملاقاتوں پر پابندی لگا دی۔ ۴۰ سال خلافت کے بعد ۱۸ جمادی الاولیٰ ۷۰۱ھ کو حاکم کی وفات ہوئی۔ ③

③ المستکفی، سلیمان بن الحاکم: (۷۰۱ھ تا ۷۳۲ھ)

حاکم کے بعد اس کا ۲۶ سالہ بیٹا سلیمان، المستکفی کے لقب سے آراستہ ہو کر خلیفہ بنا۔ وہ عالم فاضل، خوش نویس اور بہادر تھا۔ چوگان اور غلیل اندازی میں طاق تھا۔ علماء اور ادباء کو ہم نشین رکھتا اور انہیں انعامات سے نوازتا تھا۔ سلطان الملک الناصر قلاوون سے اس کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ دونوں مل کر سیر وتفریح کے لیے نکلا کرتے اور چوگان

---

① الاعلام للزرکلی: ۱/۱۳۳، ترجمۃ الحاکم العباسی، ط دار العلم

② ذیل مرآۃ الزمان للیونینی: ۲/۹۵؛ تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۳۶، ط نزار ③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۳۷، ط نزار

کھیلتے تھے مگر ۷۳۶ھ میں سلطان خلیفہ سے یکدم سخت ناراض ہوگیا۔ اس نے خلیفہ کو ایک برج میں بند کردیا۔ پھر ذوالحجہ ۷۳۷ھ میں اسے پورے خاندان سمیت جو تقریباً ایک سو افراد تھے، قوص کے قلعے میں نظر بند کردیا۔ مؤرخین نے سلطان کی ناراضی کی یہ وجہ لکھی ہے سلطان کے سامنے ایک رقعہ پیش کیا گیا جس پر خلیفہ کے دستخط تھے اور اس میں حکم تحریر تھا کہ سلطان فلاں معاملے میں مجلس شرع میں حاضر ہو۔ اس پر سلطان الملک الناصر بن قلاوون خفا ہوگیا۔

مگر فقط اتنی سی بات سلطان کو اس قدر غصہ دلانے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ یقیناً کچھ پس پردہ لگائی بجھائی بھی چلی آرہی تھی جیسا کہ بعض مؤرخین نے واضح کیا ہے کہ سلطان کو ابراہیم بن متمسک عباسی نے جو ایک بدچلن عباسی شہزادہ تھا، خلیفہ کے خلاف بھڑکایا تھا۔ دراصل ابراہیم کے دادا خلیفہ الحاکم نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے متمسک کو ولی عہد بنایا تھا مگر متمسک باپ کی زندگی ہی میں چل بسا۔ اس پر خلیفہ الحاکم نے اسی ابراہیم کو جو مرحوم متمسک کا بیٹا تھا، ولی عہد مقرر کردیا۔ مگر کچھ عرصے بعد جب اس پر ظاہر ہوا کہ پوتا عیش وعشرت میں مست رہتا ہے تو اس نے ولی عہدی منسوخ کرکے اپنے دوسرے بیٹے مستکفی کو ولی عہد مقرر کردیا اور الحاکم کے بعد وہی خلیفہ ہوا۔ اس پر ابراہیم اپنے چچا مستکفی کا دشمن بن گیا کیوں کہ وہ منصب خلافت کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ سلطان کو خلیفہ کے خلاف بھڑکا کر اپنا قد اونچا کرتا رہتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سلطان نے خلیفہ مستکفی کی جگہ اسی کو خلیفہ بنانا طے کرلیا اور خلیفہ کو قید کردیا۔

شعبان ۷۴۰ھ میں خلیفہ کی وہیں وفات ہوگئی۔ وہ آخری خلیفہ تھا جس کا نام خطباتِ جمعہ وعیدین میں لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد خطبے میں فقط سلطان کا نام لیا جانے لگا۔[1]

⑭ الواثق باللہ، ابراہیم بن متمسک: (۷۴۱ھ)

مرحوم خلیفہ مستکفی نے قوص میں نظر بندی کے دوران چالیس عادل افراد اور مقامی قاضیوں اور حکام کی موجودگی میں اپنے بیٹے احمد کو خلافت کا ولی عہد مقرر کردیا تھا مگر سلطان ناصر بن قلاوون نے اس پہلو کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا اور اس کی جگہ بدکردار عباسی شہزادے ابراہیم بن متمسک کو خلیفہ بنانے کا عزم کرلیا تاہم مخالفت کے خیال سے اسے ظاہر نہ کیا۔ ایک ماہ تک مسندِ خلافت خالی رہی۔ ۱۳ رمضان ۷۴۰ھ کو سلطان نے اپنا ارادہ ظاہر کردیا۔ اس پر علمائے دربار آڑے آئے اور کہا کہ یہ رسمِ خلافت کی خلاف ورزی ہے، سابق خلیفہ نے چالیس عادل افراد اور قاضیوں کی موجودگی میں اپنے بیٹے احمد کو ولی عہد بنادیا تھا۔ اس لیے اس معاملے پر نظرِ ثانی کی جائے۔

سلطان کچھ دنوں کے لیے پھر رُک گیا اور اس نے یہ اعلامیہ جاری کردیا کہ نمازِ جمعہ کے خطبے میں فقط سلطان کا نام لیا جائے، خلیفہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی اس نے حکم دیا کہ قوص سے مرحوم خلیفہ کے بیٹے احمد کو پورے خاندان سمیت واپس قاہرہ بلالیا جائے۔ آخر ذوالقعدہ میں احمد قاہرہ پہنچا اور سلطان سے اپنا عہدہ طلب کیا۔ سلطان نے توجہ نہ دی کیوں کہ وہ ابراہیم کو مسند پر بٹھانا طے کرچکا تھا۔ علماء کو ہم خیال بنانے کے لیے اس نے ابراہیم کو بلواکر سرزنش کی۔

[1] تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۴۰، ۳۴۲، ۳۴۳، ط نزار

ابراہیم نے ندامت ظاہر کی اور توبہ کا اعلان کیا۔ اب سلطان نے اعتراض کرنے والے علماء کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ ابراہیم توبہ کر کے پاک صاف ہو گیا ہے، پس اب اسے نااہل نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ چھ ذوالقعدہ ۷۴۰ھ کو اس کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ [1]

مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ حد درجہ نالائق ہے۔ مؤرخین کے مطابق وہ کبوتر بازی اور مرغ لڑانے کا شوقین تھا۔ لین دین میں اکثر دھوکہ دیا کرتا تھا۔ فساق وفجار کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ [2]

سلطان الملک الناصر بن قلاوون جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اسے اپنے فیصلے پر افسوس ہوا۔ اس نے اپنے جانشین سلطان ابوبکر بن ناصر کو وصیت کی کہ وہ منصبِ خلافت اس کے اہل کو لوٹا دے۔ ۲۸ ذوالحجہ ۷۴۰ھ کو سلطان کی وفات ہوئی اور ابوبکر بن ناصر تختِ شاہی پر بیٹھا۔ ایک سال تک اس نے نالائق خلیفہ کو مہلت دی مگر جب کوئی صورت نہ رہی تو اس نے ذوالحجہ ۷۴۱ھ میں فقہاء کو طلب کر کے ان سے فتویٰ لیا کہ خلافت کا حق دار کون ہے؟

قاضی عزالدین ابن جماعہ نے کہا: "خلیفہ مستکفی نے قوص میں وفات پانے سے قبل اپنے بیٹے احمد کے حق میں ولی عہدی کی وصیت کی تھی۔ اس پر شہر کے چالیس ثقہ افراد گواہ بنے۔ قوص میں میرے نائب کے مطابق یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔"

سلطان نے اس وضاحت کے بعد ابراہیم کو معزول کر دیا اور احمد کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لی گئی۔ [3]

⑤ احمد بن مستکفی، الحاکم: (۷۴۱ھ تا ۷۵۳ھ)

گیارہ ذوالحجہ ۷۴۱ھ کو مرحوم خلیفہ مستکفی کے فرزند احمد کو خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔ وہ بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ علماء وفضلاء اسے بہت پسند کرتے تھے۔ فصیح وبلیغ خطبات دیا کرتا تھا۔ ۷۵۳ھ میں وفات پا گیا۔ [4]

⑥ المعتضد باللہ، ابوبکر بن مستکفی: (۷۵۳ھ تا ۷۶۳ھ)

احمد بن مستکفی کی وفات کے بعد اس کے بھائی ابوبکر کو معتضد باللہ کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت پر بٹھایا گیا۔ وہ متواضع، دین دار اور علم دوست شخص تھا۔ جمادی الاولیٰ ۷۶۳ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ [5]

⑦ المتوکل، محمد بن معتضد۔ پہلی بار: (۷۶۳ھ تا ۷۸۵ھ)

معتضد کے بعد اس کا بیٹا محمد، جمادی الاولیٰ ۷۶۳ھ میں المتوکل کا لقب پا کر مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ یہ ۴۵ سال تک خلیفہ رہا۔ درمیان میں یہ دو بار معزول ہوا۔ کم سن سلطان علی بن شعبان کے اتابک امیر اینبک نے ۴ ربیع الاول ۷۷۹ھ کو یہ الزام لگا کر اسے معزول کر دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانا چاہتا ہے۔ اب متوکل کی جگہ زکریا بن ابراہیم (مستعصم)

---

① السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۲۸۷/۳، ۲۸۸، ط العلمیۃ

② تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۴۳، ط نزار

③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۴۳، ۳۴۴؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۴۲۳/۳

④ تاریخ الخلفاء، ص ۳۴۴؛ الاعلام للزرکلی: ۱۳۲/۱، ۱۳۳، ط دارالعلم للملایین؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۴۲۳/۳

⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۱؛ الاعلام للزرکلی: ۶۴/۲، ط دارالعلم للملایین؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۴۲۳/۳

کو اتفاقِ رائے اور بیعت کے عمل کے بغیر ہی خلیفہ بنا دیا۔ ①

⑧ مستعصم، زکریا بن ابراہیم۔ پہلی بار: (۷۷۹ھ)

زکریا بن ابراہیم (مستعصم) کی خلافت پر امراء اور عمائد ناراض تھے چنانچہ بیس دن بعد اسے معزول کر دیا گیا۔ ②

❁ المتوکل، محمد بن معتضد۔ دوسری بار: (۷۷۹ھ تا ۷۸۵ھ)

حکومت مخالفین کا دباؤ کم کرنے پر مجبور تھی۔ چنانچہ ۲۳ ربیع الاوّل ۷۷۹ھ کو متوکل کی خلافت بحال کر دی گئی۔ ③

۷۸۴ھ میں انقلاب آیا اور ممالیکِ بحریہ کی جگہ ممالیکِ چراکسیہ کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس حکومت کا بانی سلطان برقوق ۷۸۵ھ میں خلیفہ المتوکل سے ناراض ہو گیا کیوں کہ اسے یہ خبر ملی تھی کہ خلیفہ اس کے خلاف بغاوت کی سازش کر رہا ہے۔ یکم رجب کو سلطان نے خلیفہ کو بلوا کر ان امراء کے سامنے کھڑا کر دیا جنہوں نے یہ الزام لگایا تھا۔ خلیفہ نے سختی سے اس الزام کی تردید کی جبکہ امراء اپنی بات پر اڑے رہے۔ سلطان کو خلیفہ پر اس قدر غصہ آیا کہ تلوار سونت لی۔ قریب تھا کہ خلیفہ کا سر قلم ہو جاتا مگر علماء درمیان میں آگئے اور سلطان کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ سلطان نے فقہاء سے خلیفہ کے قتل کا فتویٰ طلب کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا اور خلیفہ کا دفاع کرنے لگے۔ آخر سلطان نے خلیفہ کو معزول کر کے ایک قلعے میں قید کر دیا۔ ④

⑨ الواثق باللہ، عمر بن ابراہیم بن متمسک: (۷۸۵ھ تا ۷۸۸ھ)

اب عمر بن ابراہیم کو "الواثق باللہ" کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت بخشی گئی۔ وہ تین سال خلیفہ رہنے کے بعد ۱۹ شوال ۷۸۸ھ کو فوت ہوا۔ ⑤

❁ مستعصم، زکریا بن ابراہیم۔ دوسری بار: (۷۸۸ھ تا ۷۹۱ھ)

واثق کی وفات پر امراء نے سلطان برقوق کو مشورہ دیا کہ وہ متوکل کو دوبارہ خلیفہ بنا دے مگر برقوق نہ مانا اور واثق کے بھائی زکریا (مستعصم) کو خلیفہ بنا دیا جو پہلی بار ۷۷۹ھ میں متوکل کی برطرفی کے بعد فقط بیس روز تک خلیفہ رہا تھا۔

مستعصم دو سال آٹھ ماہ تک اس منصب پر رہا۔ ۷۹۱ھ میں برقوق کے خلاف بغاوت کا ماحول بن گیا۔ آخر برقوق نے امراء کو مطمئن کرنے کے لیے سابق خلیفہ متوکل کے ساتھ کیے گئے سلوک پر ندامت ظاہر کی اور ربیع الاوّل ۷۹۱ھ میں اس نے مستعصم کو معزول کر دیا۔ وہ اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گیا اور ۲۴ جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ کو وفات پائی۔ ⑥

❁ المتوکل، محمد بن معتضد۔ سہ بارہ: (۷۹۱ھ تا ۸۰۸ھ)

۱۴ ربیع الاوّل ۷۹۱ھ کو متوکل تیسری بار مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ اس کا سارا دور سلاطین کی خانہ جنگیوں میں گزرا۔

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۳؛ الذیل التام علی دول الاسلام: سنة ۷۷۹ھ　② تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۳، ط نزار

③ السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۷۷۹ھ　④ الذیل التام علی دول الاسلام: سنة ۷۷۹ھ، ۷۸۴ھ، ۷۸۵ھ

⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۳؛ الاعلام للزرکلی: ۵ص ۳۹　⑥ السلوک لمعرفة دول الملوک: سنة ۷۹۱ھ، ۸۰۱ھ

برقوق کی جگہ حاجی بن شعبان تخت نشین ہوا مگر آٹھ ماہ بعد برقوق نے دوبارہ حکومت حاصل کر لی۔ برقوق مرا تو اس کے بیٹے فرج نے حکومت سنبھالی۔ تیمور لنگ کا شام پر حملہ اسی دور میں ہوا۔ یہ تمام حوادث خلیفہ متوکل کے اس تیسرے دور میں پیش آئے۔ تاہم اس دوران کسی نے خلیفہ کو معزول کرنے کی کوشش نہ کی۔ متوکل اسی عہدے رہتے ہوئے ۱۸ رجب ۸۰۸ھ کو فوت ہوا۔ [1] متوکل کی اولاد بہت تھی۔ اس کے پانچ بیٹے: المستعین عباس، المعتضد داؤد، مستکفی سلیمان، القائم حمزہ اور مستنجد یوسف خلیفہ ہوئے۔ یہ اعزاز کسی اور خلیفہ کو نصیب نہیں ہوا۔ [2]

⑩ المستعین، عباس بن متوکل: (۸۰۸ھ تا ۸۱۵ھ)

متوکل نے وفات سے پہلے اپنے بیٹے عباس کے لیے ولی عہدیٔ خلافت کی وصیت کر دی تھی چنانچہ باپ کی وفات کے بعد شعبان ۸۰۸ھ میں عباس المستعین باللہ کے لقب کے ساتھ خلیفہ بن گیا۔ [3]

سلطان فرج بن برقوق کے خلاف بغاوت کے دوران باغی امراء نے محرم ۸۱۵ھ میں مستعین کو خلیفہ کے ساتھ بادشاہ بھی مان لیا۔ خلیفہ نے اس بیعت سے قبل امراء سے وفاداری کی نہایت پختہ قسمیں لیں۔ یوں منصبِ خلافت ایک بار پھر قدیم شکل میں بحال ہو گیا۔ تمام فرامین خلیفہ کی منظوری اور مہر کے ساتھ ہی جاری ہونے لگے۔ علماء و فضلاء نے اس پر نہایت خوشی کا اظہار کیا جن میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نمایاں تھے۔

تاہم کچھ ہی دنوں بعد مملوکوں کے بااثر امیر شیخ محمودی نے خلیفہ کی حیثیت کو گرانا شروع کر دیا۔ حد یہ ہو گئی کہ خلیفہ کا کوئی حکم نامہ شیخ محمودی کی منظوری کے بغیر جاری نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر شعبان ۸۱۵ھ میں شیخ محمودی نے جبراً امورِ سلطنت اپنے قبضے میں لے لیے اور بادشاہ بن بیٹھا۔ خلیفہ کو حسبِ سابق عضوِ معطل بنا کر قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ بعد میں معزول کر کے اسے اسکندریہ بھیج دیا گیا۔ مستعین نے وہیں ۸۳۳ھ میں طاعون سے متاثر ہو کر وفات پائی۔ [4]

⑪ المعتضد، داؤد بن متوکل: (۸۱۵ھ تا ۸۴۵ھ)

شیخ محمودی نے خلیفہ مستعین کو معزول کر کے ۸۱۵ھ میں داؤد بن متوکل کو خلیفہ بنا دیا جو المعتضد کے لقب کے ساتھ آراستہ ہوا۔ وہ نہایت سخی، ذکی اور بہترین منتظم تھا۔ اس کی مجالس بڑی شائستہ اور دل پذیر ہوا کرتی تھیں۔ وہ بہت سے علوم و فنون میں دسترس رکھتا تھا۔ طویل بیماری کے بعد ۴ ربیع الاول ۸۴۵ھ کو فوت ہوا۔ عمر ۷۰ برس کے قریب تھی۔ [5]

⑫ مستکفی، سلیمان بن متوکل: (۸۴۵ھ تا ۸۵۴ھ)

یہ ایک صالح، دیندار اور عبادت گزار شخص تھا۔ اکثر خاموش رہتا تھا۔ گناہوں سے سخت اجتناب کرتا تھا۔ اس کی اولاد بھی متقی اور دیندار تھی۔ ذوالحجہ ۸۵۴ھ میں وفات پائی۔ عمر ۶۳ سال تھی۔ [6]

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۲،۳۵۱؛ الذیل التام علی دول الاسلام للسخاوی: سنة ۷۹۱ھ؛ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۲۲۴/۳

② تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۵۱، ط نزار

③ الذیل التام علی دول الاسلام للسخاوی: سنة ۸۰۸ھ

④ تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۴ تا ۳۵۶

⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۷،۳۵۶؛ الاعلام للزرکلی: ۳۳۴/۲

⑥ تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۹،۳۵۸

⑬ القائم بامر اللہ، حمزہ بن متوکل: (۸۵۴ھ تا ۸۵۹ھ)

خلیفہ بنتے وقت اس کی عمر ۶۳ سال تھی۔ زبان میں قدرے لکنت تھی۔ گزشتہ خلفاء کے برعکس یہ بارعب، دلیر اور ہوشیار شخص تھا۔ مگر سلاطین کے سامنے اس کی بھی نہ چل سکی۔ ۸۵۹ھ میں اس کی شاہِ مصر الملک الاشرف ینال سے خفگی ہوگئی۔ سلطان نے جمادی الآخرہ ۸۵۹ھ میں اسے معزول کر کے اسکندریہ میں قید کر دیا گیا۔ ۸۶۳ھ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا بھائی سابق خلیفہ مستعین بھی اسی طرح معزول اور قید ہو کر اسکندریہ میں فوت ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں کی قبریں بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ ①

⑭ المستنجد، یوسف بن متوکل: (۸۵۹ھ تا ۸۸۴ھ)

یہ بڑھاپے کی حالت میں ۳ رجب ۸۵۹ھ کو مسندِ خلافت پر بیٹھا تھا۔ تقریباً ۲۵ سال تک یہ عہدہ سنبھالے رکھا۔ آخری دو برس فالج کے باعث معذوری میں گزرے۔ آخر ۲۴ محرم ۸۸۴ھ کو وفات پائی۔ عمر ۹۰ برس سے زائد تھی۔ ②

⑮ المتوکل، عبدالعزیز بن یعقوب بن متوکل: (۸۸۴ھ تا ۹۰۳ھ)

یہ اعلیٰ اخلاق اور بہترین خصائل کا مالک تھا۔ نیک سیرتی اور خوش مزاجی کے باعث عوام میں بڑا مقبول رہا۔ بلند پایہ ادیب بھی تھا۔ تقریباً ۱۹ برس اس عہدے پر رہا۔ ۲۹ محرم ۹۰۳ھ کو وفات پائی۔ ③

⑯ المستمسک باللہ، یعقوب بن عبدالعزیز: (۹۰۳ھ تا ۹۱۷ھ)

یکم صفر ۹۰۳ھ کو مسندِ خلافت سنبھالی اور پندرہ برس خلیفہ رہا۔ اس کے دور میں ممالیکِ چراکسیہ کی سلطنت ڈگمگا رہی تھی۔ چھ سلاطین یکے بعد دیگرے آئے۔ پہلے محمد بن قائتبائی، پھر قانصوہ اشرفی، پھر قانصوہ ابوسعید، پھر جان بلاط، پھر طومان بائی اور آخر میں قانصوہ غوری۔ اُدھر ترکوں کی دولتِ عثمانیہ دن بدن عروج کی طرف گامزن تھی۔ ایسے میں مملوکوں کی آغوش میں قائم عباسی خلفاء کی مسند بھی خطرے سے دوچار تھی۔ ④

⑰ المتوکل، ابوعبداللہ محمد بن یعقوب: (۹۱۷ھ ۹۲۳ھ)

عثمانی سلطان سلیم اوّل نے ۹۲۳ھ میں جب مصر پر قبضہ کیا تو واپسی میں آخری عباسی خلیفہ محمد المتوکل اور مصر کے قاضی القضاۃ کو ساتھ استنبول لے گیا جہاں ایک تقریب میں خلیفہ متوکل نے حضور اکرم ﷺ کے تبرکات اور چادر مبارک جو خلافت کی نشانیاں تھے، سلیم اوّل کے حوالے کر دیے۔ یوں متوکل پر عباسی خلافت کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ ⑤

---

① تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۵۹، ط نزار؛ الذیل التام سنۃ ۸۵۹ھ

② تاریخ الخلفاء، ص ۳۶۰،۳۵۹؛ الذیل التام: سنۃ ۸۵۹ھ، ۸۸۳ھ

③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۶۱،۳۶۰

④ الاعلام للزرکلی: ۲۰۰/۸، ط دار العلم للملایین

⑤ الاعلام للزرکلی: ۲۹/۳، ط دار العلم للملایین؛ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ للدکتور فرید بک، ص ۱۹۵،۱۹۳

خلافتِ عباسیہ (مصر) کی حیثیت پر ایک نگاہ

ممالیک بحریہ اور ممالیک چراکسیہ کے زمانے میں قاہرہ خلفائے بنوعباس کا دارالخلافہ رہا۔ اگرچہ ان خلفاء کا سیاست میں کوئی کردار نہیں تھا مگر اس کے باوجود منصبِ خلافت کو بالکل عبث گمان کرنا درست نہیں۔ مستشرقین کی تحریروں میں خلافت عباسیہ مصر کے لیے ایک قسم کا طنز اور استہزاء جھلکتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر منصبِ خلافت پر انگشت نمائی کرتے ہیں کہ یہ خلفاء صرف برکت کے لیے مسندِ خلافت پر بٹھائے گئے تھے اور اُمت کے لیے نیک دعاؤں کے سوا ان کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ مستشرقین اسے مسلمانوں کی دقیانوسیت قرار دیتے ہیں کہ وہ صدیوں تک ایک فضول عہدے کو اپنے سروں پر مسلط کیے رہے جس کا کوئی کام نہ تھا اور بلاضرورت اس پر سرکاری اموال خرچ ہوتے رہے۔

ان مستشرقین سے پوچھا جائے کہ کیا وہ تاجِ برطانیہ کو بے حیثیت اور فضول تصور کرتے ہیں؟ جبکہ ملکی سیاسی و عسکری معاملات سے شاہ اور ملکہ کا کوئی تعلق نہیں اور پارلیمنٹ تمام امور کی مختار ہے اور تمام ذمہ داریاں وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے سر پر ہیں۔ مگر اس کے باوجود آج بھی برطانوی معاشرے میں تاج و تخت کو ملکی وقار کی علامت سمجھ کر ایک عظیم حیثیت دی جاتی ہے اور شاہی خاندان کے لیے سرکاری خزانے سے ایک خطیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔

بلاشبہ مصر کے عباسی خلفاء اپنی کارکردگی کے لحاظ سے بہت کمزور تھے اور عموماً انہیں سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا مگر اس کے باوجود وہ اُمت کے روحانی سرپرستوں کے طور پر ایک قابلِ عزت علامتی حیثیت ضرور رکھتے تھے۔ مملوک سلاطین نے خود کو جہاں داری کے لیے فارغ کر لیا تھا جبکہ خلفاء کا کام اُمت کے لیے عقیدے اور عمل میں صحیح منہج کی عملی راہنمائی تھا۔ دائرہ کار کی یہ تقسیم ایک قسم کا سمجھوتہ تھا جو خلفاء اور مملوک سلاطین کے درمیان شروع سے طے تھا۔ اس سمجھوتے کی رو سے خلفاء نے ریاست و سیاست اور جہاد و دفاع سے متعلق تمام امور سلاطین کے حوالے کر دیے تھے۔ پھر بھی ہر نیا حکمران تخت نشینی سے پہلے موجودہ خلیفہ سے ان اختیارات کی تجدید کراتا تھا۔ [1]

---

[1] الحاکم بن مستکفی کے خلافت نامے کے متن میں درج ذیل الفاظ اسی مضمون کو ادا کر رہے ہیں:

"وأما الجهاد فكفى باجتهاد القائم أمير المؤمنين بمأموره، المقلد عنه جميع ما وراء سريره، وأمير المؤمنين قد وكل منه خلد الله ملكه وسلطانه عينًا لا تنام، وقلد سيفًا لو أغفت بوارقه ليلة واحدة عن الأعداء سلت خياله عليهم الأحلام، وسيؤكد أمير المؤمنين في ارتجاع ما غلب عليه العدا، وقدم الوصية بأن يوالي غزو العدو المخذول برًا وبحرًا، ولا يكف عمن ظفر به منهم قتلًا ولا أسرًا، ولا يفك أغلالًا ولا إصرًا، ولا ينفك يرسل عليهم في البر من الخيل عقبانًا وفي البحر غربانًا تحمل كل منهما من كل فارس صقرًا، ويحمي الممالك ممن يتخرق أطرافها بإقدام، وأمهات الممالك التي هي مرابط البنود ومرابط الأسود، والأمراء والعساكر والجنود."

(تاريخ الخلفاء، ص ۳۳۹)

صرف مصر ہی نہیں بیرونی دنیا کے اسلامی ممالک بھی خلیفہ سے اپنی حکومت کی منظوری اسی طرح لیتے تھے جیسے خلفائے بغداد سے لیا کرتے تھے۔ ہندوستان تک کے مسلم بادشاہ پروانۂ سلطنت لینے اپنے سفیر قاہرہ بھیجتے تھے۔ ①

یہاں یہ پہلو بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دورِ ممالیک میں اگر چہ خلیفہ کا حتمی عزل ونصب بادشاہ کے ہاتھ میں تھا مگر رسم یہی تھی کہ اس عزل ونصب میں علماء اور فقہاء کی اتفاق رائے کا خیال رکھا جائے۔ نیز سابق خلیفہ نے اگر کسی کو ولی عہدِ خلافت بنادیا ہو تو خلافت کا اوّلین حقدار وہی ہوگا اور کسی ناگزیر امر کے بغیر اسے معزول نہیں کیا جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کسی موقع پر کسی خلیفہ کا تقرر محض بادشاہ کی مرضی سے ہوا جس میں سابق خلیفہ کی وصیت اور علماء وفقہاء کے اتفاق کا لحاظ نہ رکھا گیا تو اس پر معاشرے میں سخت نکتہ چینی ہوئی اور بادشاہ کو جلد یا بدیر اپنا فیصلے سے رجوع کرنا پڑا۔ ②

علماء وفقہاء حضرات مسندِ خلافت کے لیے عموماً ایسی شخصیت پر متفق ہوتے تھے جو علم وفضل، پرہیز گاری اور خوش اخلاقی میں ممتاز ہو۔ اس طویل دور میں صرف ایک خلیفہ واثق ایسا گزرا ہے جو عیش پرست اور بدخصلت تھا اور اس کی وجہ بھی فقط یہ تھی کہ اسے کم عمری ہی میں اس کے دادا خلیفہ حاکم نے اچھی توقعات وابستہ کرتے ہوئے ولی عہدِ خلافت مقرر کردیا تھا اور مزید یہ کہ اس وقت کے مملوک سلطان محمد الناصر بن قلاوون نے بھی اس کی خلافت سے اتفاق کرلیا تھا مگر خلیفہ بن کر جب اس کے عیوب سامنے آئے تو علماء نے شدت سے اس کی مخالفت کی اور مساجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھنے سے انکار کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سال کے اندر اسے معزول ہونا پڑا اور اس کی جگہ حاکم ثانی خلیفہ مقرر ہوا جس کے بارے میں علماء نے لکھا کہ وہ راتوں کا تہجد گزار اور دن کا سپاہی تھا۔ ③

مختصر یہ کہ اس دور کے اکثر خلفاء دین داری اور علم وادب سے دلچسپی میں بنو عباس کے دورِ عروج کے مسند نشینوں کے وارث تھے۔ البتہ ان کے اختیارات بہت محدود تھے جنہیں وہ مثبت کاموں میں صرف کرتے تھے۔ علمی سرگرمیوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ علماء وفقہاء اور قاضیوں سے میل جول رکھتے تھے اور دینی خدمات کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں عطیات سے نوازتے تھے۔ ④ بعض خلفاء سپاہیانہ کھیلوں میں حصہ لے کر انہیں فروغ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ ⑤ بعض خلفاء اہم معرکوں میں مجاہدین کے شانہ بشانہ شریک ہوئے اور ان کی موجودگی نے مسلمانوں میں ایسا جوش پیدا کیا کہ وہ تاتاریوں کے ٹڈی دل لشکروں سے بلاخوف وخطر بھڑ گئے۔ ⑥ بعض خلفاء حدیث سنتے اور اس کا درس بھی دیتے تھے۔ ⑦ بعض خلفاء زہد وعبادت میں مشہور تھے جیسا کہ خلیفہ مستکفی باللہ ثانی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس نے بالغ ہونے کے بعد کبھی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا معاصر تھا۔ امام سیوطی رحمہ اللہ

---

① دیکھیے حالات خلفاء: مستکفی، حاکم ثانی، مستعین، معتضد وغیرہ (تاریخ الخلفاء، ۳۴۰ تا ۳۵۶، ط نزار)

② تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۲، ط نزار

③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۴۳ تا ۳۴۵، ط نزار

④ الدرر الکامنۃ: ۱/۲۳۱، ترجمۃ المستکفی بن الحاکم

⑤ الدرر الکامنۃ: ۱/۳۲، ط، ترجمۃ القائم بامر اللہ

⑥ تاریخ الخلفاء، ص ۳۴۰، ط نزار، الدرر الکامنۃ: ۱/۲۳۱، ط، ترجمۃ المستکفی بن الحاکم

⑦ الدرر الکامنۃ: ۱/۳۲، ط، ترجمۃ الحاکم بن المستکفی

کے والد اس کے مقرب ترین علماء میں شامل تھے۔ مستکفی کے بارے میں امام سیوطی رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

''ہم اس کے گھر اور اس کی مہربانیوں میں پلے بڑھے، اس کی آل اولاد دینداری، عبادت اور خیر کے لحاظ سے بہترین ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اولاد کے سوا روئے زمین پر کسی اور خلیفہ کی اولاد اس خلیفہ کے اہل وعیال سے زیادہ عبادت گزار گزری ہوگی۔''[1]

سلطان الملک الظاہر چقمق خلیفہ مستکفی کا بہت احترام کرتا تھا، جب اس کی وفات ہوئی تو سلطان نے خود جنازے کو کندھا دیا اور قبر تک گیا۔[2]

اگرچہ قاہرہ کے عباسی خلفاء سیاسی امور سے الگ رہے البتہ چراکسیہ کے دوسرے حکمران فرج بن برقوق کے دور میں خلیفہ مستعین باللہ کو سیاسی وعسکری قیادت سنبھالنے کا ایک موقع ملا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مملوک سرداروں نے سلطان کے خلاف بغاوت کر کے اسے بے دخل کر دیا تھا۔ اس موقع پر محرم ۸۱۵ھ میں امرائے سلطنت نے پختہ عہد وقرار کے ذریعے یہ دستور منظور کیا تھا کہ اختیاراتِ حکومت خلیفہ کے پاس ہوں گے اور سلطان نائب ہوا کرے گا۔

اس فیصلے سے عالم اسلام کے علماء وفقہاء کو بہت خوشی ہوئی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو اس دور کے ممتاز ترین محدث تھے، اس خوش گوار انقلاب پر ایک قصیدہ لکھا مگر افسوس کہ کچھ ہی دنوں بعد امرائے سلطنت اپنے عہد سے منحرف ہو کر اپنے مملوک سردار شیخ محمودی المؤید سے جا ملے جس نے خلیفہ کو مجبور کر کے نہ صرف دوبارہ اختیاراتِ سلطنت مملوکوں کے نام کرا لیے بلکہ خلیفہ کو معزول بھی کر دیا۔ مستعین نے اس فیصلے پر احتجاج کرتے ہوئے شام کے فقہاء سے استفتاء کیا، سب نے فتویٰ دیا کہ شیخ محمودی کے لیے خلیفہ کو معزول کرنا جائز نہیں تھا۔ تاہم اس فتوے کو اہمیت دیے بغیر شیخ محمودی نے مستعین کو قید کر دیا۔[3] خلفائے بنوعباس کا یہ زمانہ متوکل ثالث تک چلا۔ آخر کار ترکانِ عثمان کے نامور حکمران سلطان سلیم اوّل نے ۹۲۳ھ میں مصر پر تسلط حاصل کر کے خلیفہ سے استعفاء لے لیا اور خلافت کو اپنے خاندان میں منتقل کر لیا۔ خلافتِ عباسیہ قاہرہ اور مملوک حکومت کا اختتام ایک ساتھ ہوا۔ اس طرح دو سو چونسٹھ سال مکمل کر کے خلافتِ عباسیہ قاہرہ کا خاتمہ ہوا۔ اس کے ساتھ خلافتِ عباسیہ بغداد کا دور ملا لیا جائے تو بنوعباس کا دورِ خلافت ۷۹۰ سال تک جا پہنچتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا بجا ہے کہ اُمت کی تاریخ میں بنوعباس کا زمانہ خلافت سب سے زیادہ ہے۔

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۹، ط نزار ② تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۹، ط نزار ③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۵۴ تا ۳۵۶، ط نزار

ملحوظہ: ممالیک بحریہ، ممالیک چراکسیہ اور خلفائے بنوعباس مصر کے حالات بیان کرنے میں ہم نے اختصار سے کام لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارا ہدف اُمتِ مسلمہ کی سبق آموز تاریخ لکھنا ہے۔ پس حکمرانوں کے ان تمام حالات کو جو امراء کی باہم اکھاڑ پچھاڑ، عہدے داروں کے عزل ونصب، باہمی اختلافات، محلاتی سازشوں، شہزادوں، وزیروں اور امرائے سلطنت کے ذاتی احوال کے ریکارڈ کے سوا کچھ نہیں، سامنے لانا ہمارے مقصد سے میل نہیں رکھتا۔ ویسے بھی ان حالات میں ایک ہی قسم کے واقعات کی تکرار ہے اور پڑھنے والا سبق حاصل کرنے کی بجائے اس مواد سے سخت بدمزہ ہوتا ہے۔

جدول: خلافتِ عباسیہ قاہرہ

رجب ۶۵۹ھ......تا......۹۲۳ھ

۱۲۶۰ء......تا......۱۵۱۷ء

۲۶۴سال

نمبر	خلیفہ	دور خلافت	انجام	معاصر سلاطین	خاص بات
۱	مستنصر باللہ	رجب ۶۵۹ھ تا محرم ۶۶۰ھ (جون تا دسمبر ۱۲۶۱ء)	جہاد میں لاپتا	بیبرس اوّل	خلافت کا دوبارہ آغاز
۲	حاکم اوّل	محرم ۶۶۱ھ تا جمادی الاولیٰ ۷۰۱ھ (۱۲۶۲ء تا ۱۳۰۲ء)	وفات	بیبرس اوّل، برکہ، سلامش، قلاوون، ناصر بن قلاوون، کتبغا، لاجین	۴۰ سالہ طویل خلافت
۳	مستکفی اوّل	جمادی الاولیٰ ۷۰۱ھ تا شعبان ۷۴۰ھ (۱۳۰۲ء تا ۱۳۴۰ء)	نظر بند کی حالت میں وفات	جاشنگیر، ناصر بن قلاوون	۳۵ سالہ طویل خلافت
۴	واثق باللہ	ذوالقعدہ ۷۴۰ھ تا ذوالحجہ ۷۴۱ھ (۱۳۴۰ء تا ۱۳۴۱ء)	معزول	ناصر بن قلاوون	ترکانِ عثمان کا عروج
۵	حاکم ثانی	ذوالحجہ ۷۴۱ھ تا جمادی الآخرہ ۷۵۳ھ (۱۳۴۱ء تا ۱۳۵۲ء)	وفات	ابوبکر، کوچک، احمد، اسماعیل، شعبان، حاجی اوّل، حسن، صالح	الملک الناصر کے آٹھ برائے نام حکمران بیٹوں کے دور میں وقار اور یکسوئی کے ساتھ وقت گزارا۔

٦	معتضد اوّل	جمادی الآخرہ ۷۵۳ھ تا جمادی الاولیٰ ۷۶۳ھ (۱۳۵۲ء تا ۱۳۶۲ء)	وفات ۷۶۳ھ	حسن بن ناصر	
۷	متوکل اوّل، پہلی بار	جمادی الاولیٰ ۷۶۳ھ تا ۴ ربیع الاوّل ۷۷۹ھ (۱۳۶۲ء تا ۱۳۷۷ء)	معزول	منصور محمد بن حاجی، شعبان ثانی، منصور بن شعبان، حاجی ثانی، ظاہر برقوق	الملک الناصر کے چار حکمران پوتوں کے دور میں وقار اور یکسوئی کے ساتھ وقت گزارا۔ اسی کے دور میں چراکسیہ غالب آئے اور اسے معزول کر دیا۔
۸	مستعصم، زکریا، پہلی بار	بیس دن ربیع الاوّل ۷۷۹ھ (اگست ۱۳۷۷ء)	معزول		
	متوکل اوّل۔ دوبارہ	۲۳ ربیع الاوّل ۷۷۹ھ تا یکم رجب ۷۸۵ھ (۱۳۷۷ء تا ۱۳۸۳ء)	معزول		
۹	واثق ثانی	یکم رجب ۷۸۵ھ تا ۱۹ شوال ۷۸۸ھ (۱۳۸۳ء تا ۱۳۸۶ء)	وفات	الظاہر برقوق	تیمور لنگ کی یلغار
	مستعصم زکریا، دوسری بار	۱۹ شوال ۷۸۸ھ تا ربیع الاوّل ۷۹۱ھ (۱۳۸۶ء تا ۱۳۸۹ء)	معزول	الظاہر برقوق	
	متوکل اوّل۔ سہ بارہ	۱۴ ربیع الاوّل ۷۹۱ھ تا ۱۸ رجب ۸۰۸ھ (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۶ء)	وفات	الظاہر برقوق، فرج بن برقوق	طویل دورِ خلافت
۱۰	مستعین	رجب ۸۰۸ھ تا محرم ۸۱۵ھ (۱۴۰۶ء تا ۱۴۱۲ء)	معزول	فرج بن برقوق، شیخ محمودی	خلافت کے ساتھ سلطنت کے انضمام کی کوشش

۱۱	معتضد ثانی	شعبان ۸۱۵ھ تا ۴ ربیع الاول ۸۳۵ھ (۱۴۱۲ء تا ۱۴۳۱ء)	وفات	احمد بن شیخ ططر، محمد بن ططر، اشرف قائتبائی	تیس سال طویل خلافت
۱۲	مستکفی ثانی	۴ ربیع الاول ۸۳۵ھ تا ۲۹ ذوالحجہ ۸۵۴ھ (۱۴۳۱ء تا ۱۴۵۱ء)	وفات	چقمق	
۱۳	قائم	ذوالحجہ ۸۵۴ھ تا جمادی الآخرہ ۸۵۹ھ (۱۴۵۱ء تا ۱۴۵۵ء)	معزول	چقمق، عثمان بن چقمق، اینال علائی،	
۱۴	مستنجد	۳ رجب ۸۵۹ھ تا ۱۴ محرم ۸۸۳ھ (۱۴۵۵ء تا ۱۴۷۸ء)	وفات	اشرف اینال، احمد بن اینال، خشقدم، بلبائی، تمربغا، خیبر، اشرف قائتبائی	۲۵ سالہ طویل خلافت
۱۵	متوکل ثانی	۱۶ محرم ۸۸۴ھ تا ۲۹ محرم ۹۰۳ھ (۱۴۷۸ء تا ۱۴۹۷ء)	وفات	اشرف قائتبائی، محمد قائتبائی الناصر	
۱۶	متمسک	۹۰۳ھ تا ۹۱۷ھ (۱۴۹۷ء تا ۱۵۱۱ء)	وفات	محمد قائتبائی ناصر، قانصوہ اشرفی، جان بلاط الاشرف، العادل طومان بائی، قانصوہ غوری،	۲۱ سال خلافت مملوکوں کا دورِ زوال
۱۷	متوکل ثالث	۹۱۷ھ تا ۹۲۳ھ (۱۵۱۱ء تا ۱۵۱۷ء)	استعفاء	قانصوہ غوری، طومان بائی ثانی	آخری عباسی خلیفہ سلطان سلیم اوّل کے حق میں دست بردار ہوگیا۔

ساتواں باب

منگول سلطنت

اور

دعوتِ اسلام

۶۱۸ تا ۷۶۵ ھجری

۱۲۲۱ تا ۱۳۶۴ عیسوی

بقا کی جنگ

عالم اسلام پر مغلوں کے قبضے کے بعد ساتویں صدی ہجری کو عالم اسلام کی تاریخ میں اس لحاظ سے سب سے نازک اور مشکل ترین دور کہا جا سکتا ہے کہ ایک نہایت جنگجو اور بے رحم قوم کی ہمہ گیر یورش نے عالم اسلام کو جغرافیائی طور پر تہ وبالا کر دیا تھا اور مسلمانوں کی اتنے بڑے پیمانے پر نسل کشی کی تھی کہ ان کے بڑے بڑے صوبے اور ملک آبادی سے تقریباً خالی ہو گئے تھے۔ اس دور کے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ مجھے مکہ میں عراق کے ایک عالم نورالدین بن زجاج ملے جن کے ساتھ ان کا بھتیجا بھی تھا۔ انہوں نے بتایا کہ صرف عراق میں ۲۴ ہزار علماء قتل ہوئے ہیں اور میرے اور میرے اس بھتیجے کے سوا کوئی عالم باقی نہیں بچا۔[1] تاتاریوں نے ۶۱۶ھ سے ۶۵۸ھ تک کے ۴۲ سالہ دور میں عالم اسلام کے تقریباً ۵۰ لاکھ مربع کلومیٹر علاقے پر قبضہ کیا تھا[2] اور اس دوران کم وبیش پونے دو کروڑ مسلمانوں کو شہید کیا تھا۔[3]

دوسری طرف اسی دور میں مسلمانوں کی باقی ماندہ نسل کو گمراہ کرنے کے لیے تمام گمراہ کن طاقتیں اسلام کی نظریاتی سرحدوں کو پامال کرنے پر تل آئی تھیں۔ تاتاری خود شامانی مذہب کے پیروکار تھے جو کسی آسمانی کتاب یا پیغمبر کا قائل نہ تھا بلکہ خدا کے مبہم تصور کے ساتھ بُت پرستی، توہمات اور چند رسومات تک محدود تھا۔ نصرانی جو صلیبی جنگوں میں ایوبی خاندان کی مدافعانہ قوت کا توڑ نہیں کر سکے تھے، مشنری پروگرام کے تحت مقبوضہ وغیر مقبوضہ مسلم علاقوں کے طول وعرض میں پھیل کر مسیحیت کا پرچار کر رہے تھے، انہیں تاتاری حکمرانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنگیز خان اور اس کے جانشین، عیسائی پادریوں اور مبلغوں کا اعزاز واکرام کرتے تھے اور انہیں تبلیغ کے لیے مکمل آزادی فراہم کرتے تھے، چنگیز خان کے بعض بیٹوں نے عیسائی عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ ہلاکو خان کی ماں اور اس کی بیوی دونوں عیسائی تھیں۔ عیسائی مبلغین کو خاصی امید تھی کہ تاتاری حکمرانوں کی آیندہ نسلیں صلیب کی گود میں آ گریں گی۔ بدھ مت کے مذہبی پیشواؤں کی بھی بن آئی تھی اور وہ عوام وخواص میں بت پرستی کو فروغ دینے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ چنگیز خان بدھ مت کے مذہبی رہنماؤں سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ رافضیت کے علم برداروں کو بھی تاتاری حکمرانوں کی حمایت حاصل تھی۔

---

① رحلة ابن بطوطة: ۲۴/۳، ط اکادیمة المغربیة الرباط

② عالم اسلام میں تاتاریوں کے مقبوضہ ممالک موجودہ دور میں تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، کرغیزستان، افغانستان، ایران، عراق اور شام کے پورے رقبے پر مشتمل تھے۔ اس کے ساتھ پاکستان کے صوبہ خیبر پختون خواہ، پنجاب اور بلوچستان پر بھی کچھ مدت ان کا تسلط رہا۔ ترکی کا مشرقی علاقہ کچھ ان کے قبضے میں اور کچھ ان کی زد میں رہا۔ یہ مجموعہ تقریباً اتنا ہی بنتا ہے۔

③ یہ حساب مختلف شہروں میں مقتولین کی دستیاب تعداد کا اوسط نکال کر کیا گیا ہے جس کی تفصیل چوتھے باب کے ص ۲۲۰ کے حاشیہ نمبر ۲ میں گزر چکی ہے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگلی صدی تک جغرافیائی اور نظریاتی دونوں محاذوں پر اسلام مکمل طور شکست کھا جائے گا اور دنیا میں اسلام کے نام لیوا ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں گے۔ وہ مؤرخین جو اس دور کی تاریخ مرتب کر رہے تھے، اس قسم کے اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے اور ان کو امید نہ تھی کہ ان کی تاریخ کو پڑھنے والی آیندہ نسلیں مسلمان ہوں گی، مگر جب ہم تاریخ کا صفحہ پلٹ کر اگلی صدی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں دنیا کے نقشے پر کاشغر سے مَراکش تک اور بحرِ ہند سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک ہر طرف اسلامی پرچم لہراتے دکھائی دیتے ہیں اور ان تمام ممالک پر مسلم حکمرانوں کا اقتدار دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ اسلام کے شہر اور دیہات مسلمانوں سے بھرپور ہیں اور ان میں چپے چپے پر مساجد، مدارس، خانقاہیں اور کتب خانے آباد ہیں، غرضیکہ آئندہ قرن میں گزشتہ صدی کے ان شدید حوادث اور مصائب کا جن سے اسلام کے مٹنے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا، کوئی خاص اثر باقی نہیں ملتا۔ تاریخ کا یہ عجیب انقلاب اور حیرت ناک معجزہ جس نے مؤرخین کے تمام اندازوں کو غلط کر دیا، کیوں کر رونما ہوا؟ اس معمے کو حل کرنے کے لیے ہمیں عالمِ اسلام پر تاتاریوں کے تسلط کے بعد مسلمانوں کی ذہنی کیفیت، ان کی نفسیات، ان کے بے مثال صبر و تحمل، حکمت عملی اور ان کوششوں کو جائزہ لینا ہوگا جو بے بسی اور بے کسی کے اس دور میں وہ اسلام کی اشاعت اور حفاظت کے لیے انجام دیتے رہے۔

ساتویں صدی کی ابتداء میں برپا ہونے والے اس خونی انقلاب نے مسلمانوں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر کس قدر گہرے زخمی لگائے ہوں گے؟ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو مسلمانوں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا ہو اور جو حساس ذہن اور دردمند دل کا مالک ہو۔ اس زمانے کے مسلمان دورِ حاضر کے مسلمانوں سے بہر حال بہتر تھے۔ ان میں دینی شعور، قومی غیرت اور مذہبی حمیت آج کے مسلمانوں سے زیادہ تھی، اگرچہ وہ اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار اور روحانی کم مائیگی کے مریض تھے مگر اس کے باوجود وہ دنیا میں ایک سربلند، باوقار اور غیرت مند قوم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔
ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں جب بلندی کی اس چوٹی سے وہ بحیثیت قوم سر کے بل نیچے گرے اور ان کا ظاہری ڈھانچا بھی ختم ہوتا دکھائی دینے لگا تو ان کے باقی ماندہ افراد پر اس شدید جھٹکے سے جس قدر بھی منفی اثرات مرتب ہوتے، کم تھے۔ اس موقع پر اگر وہ یاس اور قنوطیت کا جامہ اوڑھ لیتے اور دین کی حفاظت اور اشاعت سے بالکل دستبردار ہو کر گمنامی کی موت مر جاتے تو انسانی نفسیات کی روشنی میں اتنے بڑے اجتماعی نقصان کے بعد ان سے اس کی توقع کی جا سکتی تھی، اگر وہ ناامیدی کا زہر قاتل پی کر اجتماعی موت کو گلے لگا لیتے تو یہ قرین قیاس تھا۔ اگر اتنے عظیم قتل عام سے بچ جانے والے مسلمان اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر کسی دوسرے مذہب سے منسلک ہو جاتے تو مٹ جانے والے دیگر مذاہب کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی بعید نہ تھا۔
مگر یہاں ہم ایک حیرت انگیز فرق محسوس کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ اگرچہ حزن و ملال سے مسلمانوں کی حالت غیر تھی اور انہیں عالم اسباب کی حدود میں امید کی کوئی کرن دور دور تک دکھائی نہیں دیتی تھی، مگر اس کے باوجود وہ مایوسی کی اس انتہا

تک نہیں جا پہنچے تھے جہاں بندہ خالق کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے، جہاں دل کفر سے آلودہ ہونے لگتا ہے اور زبان پر خدا سے شکوہ وشکایات کے کلمات آجاتے ہیں، یہ ان مصیبت زدہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی کہ وہ اللہ پر ایمان کی دولت سے محروم نہیں ہوئے۔ انہوں نے اللہ کی رحمت سے امید وابستہ رکھی، قرآن وحدیث میں مذکور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں پر ان کا یقین برقرار رہا۔ ان مصائب نے مایوسی کا زہر گھول کر ان کے ایمان کو گدلا نہیں کیا بلکہ ان آزمائشوں کی بھٹی سے ان کے ایمان کا رنگ جو مادیت کے میل کچیل سے دھندلا گیا تھا، نکھر آیا۔

ان حالات میں بظاہر کچھ کرنا ناممکن نظر آرہا تھا، مگر مسلمانوں نے رب العالمین کی نصرت کے بھروسے پر انتہائی کسمپرسی کے عالم شب کی گریہ وزاری اور دن کی جہد مسلسل کو اپنا وطیرہ بنا کر اسلام کی بقاء کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ یہ کوششیں اور سرگرمیاں کسی منظم منصوبے کے تحت یا کسی شخص واحد کی قیادت میں انجام نہیں دی جاری تھیں، نہ ہی ان کا تعلق کسی خاص ملک، کسی خاص علاقے یا کسی ایک شعبے سے تھا، بلکہ ایک عمومی بیداری اور اندرونی جذبے کے تحت دنیا کے مختلف خطوں اور منطقوں میں واقع مقبوضہ اور آزاد مسلم ممالک کے مخلص مسلمانوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف شعبوں میں دین کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے اپنی بساط بھر کوشش شروع کردی۔ ان کی ان کوششوں پر جو بظاہر پہاڑ کو سوئی سے چیرنے کے مترادف تھیں، اللہ جل شانہ کی رحمتِ خاصہ متوجہ ہوئی اور رفتہ رفتہ حالات بدلنے لگے۔

روز اول سے تا امروز اسلام کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں پر بار بار ایسے تباہ کن حملے ہوتے آئے ہیں کہ اگر رب العالمین کی طرف سے اس دین کی حفاظت اور نصرت کا وعدہ اور اس کی نگہداشت ونشوونما کے لیے دعوت وجہاد کا تفصیلی وہمہ گیر نظام نہ ہوتا تو یقیناً دیگر قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی کب کا ناپید ہو چکا ہوتا، مگر "نظام دعوت وجہاد" نے دین کے برگ وبار کی بربادی اور اس کی شاخوں کے جھلنے کے باوجود اس کے تنے اور جڑوں کو اکھڑنے نہ دیا۔ جب بھی اس کی جغرافیائی سرحدوں پر دشمنوں نے چڑھائی کی اس کے ردعمل میں امت مسلمہ کا ایک خوش قسمت طبقہ جہاد کے لیے سربکف ہوگیا اور اس نے عالم اسلام کی جغرافیائی سرحدوں کا کامیابی سے دفاع کی۔ اسلام کی نظریاتی سرحدوں پر جب بھی باطل پرستوں نے دھاوا بولا، امت کے اولوالعزم مصلحین اور داعی اس کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہر زمانے میں اسلام کو اس کی اصل روح کے ساتھ محفوظ رکھا۔

بقا کی جنگ چار محاذوں پر:

اسلام کی بقا اور آبیاری کے لیے مسلمانوں کی ان سرگرمیوں کو ہم چار اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

① آزاد مسلم ممالک میں تحریکِ جہاد
② تاتاریوں کو دعوتِ اسلام
③ مسلمانوں کی اصلاح اور راہنمائی
④ علمی ورثے کی حفاظت کا کام

پہلا محاذ.....آزاد مسلم ممالک میں تحریکِ جہاد

تاتاریوں کی ہولناک یورش کے سامنے صرف دو ملک اپنا دفاع کرنے میں کامیاب ہوئے: ایک مصر۔ دوسرا ہندوستان۔ اگرچہ تاتاری فوجیں ان دونوں ملکوں کی سرحدوں پر تاخت وتاراج کرتی رہیں اور نصف صدی تک ان دونوں مسلم مملکتوں کا وجود خطرے کی زد میں رہا،لیکن جزوی نقصانات اٹھانے کے باوجود یہاں کے حکمرانوں نے اپنے ملکوں کو بربادی سے بچائے رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے مصر اور ہندوستان کا اقتدار ایسے باصلاحیت قائدین کو عطا کردیا جنہوں نے تاتاری یلغار کے مقابلے کے لیے بھرپور دفاعی تیاریاں کیں اور سابق مسلم حکمرانوں کی کوتاہیوں کی تلافی کردی۔ مصر میں سلطان سیف الدین قطز اور اس کے بعد الملک الظاہر رکن الدین بیبرس بندقداری، سیف الدین قلاوون اور محمد الناصر نے پوری پامردی کے ساتھ نہ صرف مصر کا دفاع کیا بلکہ تاتاریوں کو شام کے تمام مقبوضہ علاقوں سے نکل جانے پر مجبور کردیا۔[1]

ہندوستان میں سلطان شمس الدین التمش اور اس کے جانشینوں نے سلطنتِ دہلی (جو وادیٔ گنگا جمنا سے پنجاب اور سندھ تک وسیع تھی) کی مدافعت کے لیے زبردست جنگی انتظامات کیے۔ ۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) میں تاتاریوں نے لاہور پر حملہ کیا جس میں مسلمانوں کا نقصان بھی بہت ہوا اور لاہور شہر جزوی طور پر تباہ ہوا مگر تاتاری اس پر مستقل قبضہ نہ کرسکے۔ ہندوستان کی مسلم سلطنت پر تاتاریوں کے دھاوے اس کے بعد بھی جاری رہے، مگر غیاث الدین بلبن، جلال الدین خلجی اور علاؤ الدین خلجی جیسے جواں ہمت بادشاہوں نے ان کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ علاؤ الدین خلجی کا کردار اس سلسلے میں سب سے نمایاں ہے جس نے چھ معرکوں میں تاتاریوں کو منہ توڑ شکست دے کر ہندوستان کے بارے میں ان کے عزائم کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا۔[2]

یہ بھی تاریخ کے عجائب میں سے ہے کہ تاتاری حملہ آوروں نے بڑے بڑے خاندانی بادشاہوں اور خوارزم اور بغداد جیسی طاقتورترین اسلامی مملکتوں کو نیست ونابود کردیا مگر مصر اور ہندوستان کی نسبتاً کم قوت والی مسلم حکومتوں اور غلام نسل سے تعلق رکھنے والے ان کے حکمرانوں کے مقابلے میں انہوں نے ہمیشہ شکست کا منہ دیکھا۔

❁❁❁

---

① تاتاریوں سے جہاد میں ممالیک سلاطین کے کارناموں کی تفصیلات آپ گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں۔ جبکہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کی دفاعی کوششوں کا ذکر حصہ پنجم میں "سلاطین ہند" کے باب میں آئے گا۔

② تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ از مشفق خواجہ: ۱/ ۲۴۴ تا ۲۷۲، ط المیزان لاہور

دوسرا محاذ......تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام

تاتاریوں کو اسلام کی جانب مائل کرنے اور انہیں اسلام کی دعوت دینے کا کام نہایت دشوار اور پر خطر تھا۔ وہ تاتاری جو مسلمانوں کی نسل کشی کر رہے تھے، جن کی تلواریں مسلمانوں کے لہو سے تر بتر تھیں، انہیں اسلام کی طرف بلانا کتنا مشکل اور صبر آزما کام ہوگا؟؟ ہر صاحب عقل اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس موضوع پر گفتگو سے قبل ضروری ہے کہ مغل سلطنتوں کی مختلف شاخوں پر ایک نگاہ ڈال لی جائے کیوں کہ ہر شاخ میں اشاعتِ اسلام کی داستان جدا ہے۔

چنگیز خان اور اس کے جانشین

مغل سلطنت کا بانی تموجن تھا جو ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) میں منگولیا کے صحرائے گوبی میں پیدا ہوا۔[①] اس نے منگولیا کے مختلف قبائل کو مسخر کرنے کے بعد ۶۰۲ھ میں چنگیز خان کا لقب اختیار کیا اور چند سالوں بعد عالم اسلام پر یلغار کر کے بڑی بڑی مملکتوں کو تہس نہس کر ڈالا اور ان کی جگہ عظیم مغل سلطنت قائم کی۔ اس کے چار بیٹے تھے: سب سے بڑا جوجی خان (دوشی) تھا۔ اس کے بعد چغتائی خان تھا۔ پھر اوکتائی خان تھا۔ سب سے چھوٹا تولی خان تھا۔ چنگیز خان نے اپنے مقبوضات چار حصوں میں تقسیم کر کے انہی چار بیٹوں کے نام کر دیے تھے۔

① اوکتائی منجھلا ہونے کے باوجود نہایت معتدل مزاج اور عقل مند تھا۔ لہٰذا اسی کو قراقرم (منگولیا) کا تخت ملا۔ یہاں کے مغل حکمران کو "خانِ اعظم" یا "خاقانِ اعظم" کہا جاتا تھا۔ نیز یہ بادشاہ "خانانِ قراقرم" بھی کہلاتے تھے۔

② بڑے بیٹے جوجی نے بحیرۂ خزر کے آس پاس ایک وسیع آزاد سلطنت قائم کر لی تھی، جو شاخِ زرّیں خیل کہلاتی تھی۔ یہ سلطنت اس کی اولاد میں چلتی رہی۔

③ چغتائی کی عملداری میں وسطِ ایشیا اور خراسان کے علاقے تھے۔

④ تولی کی اولاد کے پاس ایرانی مقبوضات تھے۔

آگے چل کر ان چار ممالک میں مزید تقسیمات بھی ہوئیں۔ ایک ہی علاقے میں تخت کے ایک سے زائد دعوے دار بھی کھڑے ہوئے۔ تاہم یہ سارے ممالک ایک وفاق (فیڈریشن) کے تابع تھے جس کا سربراہ "خانِ اعظم" منگولیا میں ہوتا تھا۔ شہزادوں میں اختلافات کے مواقع پر خانِ اعظم کا فیصلہ حتمی ہوتا تھا۔[②]

---

① روضۃ الصفا: ۱/۱۱   ② تاریخ مختصر الدول لابن العبری، ص ۲۲۷، ط دار الشرق بیروت۔

خانات منگولیا

او کتائی خان (۶۲۴ھ تا ۶۳۹ھ):

مغلوں کے ہاں یہ طے تھا کہ حکومت حکمران خاندان میں رہے گی مگر کسی حکمران کے مرنے کے بعد جانشین کا انتخاب ان کی عظیم مجلسِ شوریٰ میں ہوتا تھا جس میں پوری سلطنت کے عمائد کو مدعو کیا جاتا۔ اس شوریٰ کو ''قوریلتائی'' کہا جاتا تھا۔ اس کے انعقاد اور فیصلہ ہونے میں بعض اوقات کئی کئی ماہ لگ جاتے تب اگلے حکمران کا فیصلہ ہوتا۔ چنگیز خان کے بعد قوریلتائی میں ہونے والی بحث کے نتیجے میں اس کے منجھلے بیٹے او کتائی خان کو باپ کی مسند کا وارث مان لیا گیا اور وہ تاتاریوں کے مرکز قراقرم کا خاقانِ اعظم بنا۔ اس نے ۶۲۴ھ سے ۶۳۹ھ تک حکومت کی۔ ①

اس کے دور میں مغل افواج تین اطراف میں پیش قدمی کر کے بہت دور تک جا پہنچیں جن کی تفصیل یہ ہے:

سلطنتِ خوارزم کا خاتمہ (۶۲۸ھ): چنگیز خان کے سب سے بڑے حریف سلطان جلال الدین نے خوارزمی سلطنت کو از سرِ نو قائم کر لیا تھا جو ایران سے گرجستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ او کتائی خان نے ایک تجربہ کار سردار جرماغون کو ایک لشکرِ جرار دے کر اس مہم پر بھیجا جس کے نتیجے میں سلطان جلال الدین خوارزمی کو شکست ہوئی اور خوارزم شاہی سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، اس کے بعد اگلے تیس سالوں (سیف الدین قطز) کے ظہور تک عالم اسلام کے پاس تاتاریوں کے مقابلے میں کوئی ایسا جرنیل نہ تھا جو سرحدوں کا دفاع کر سکتا۔ سلطان جلال الدین خوارزمی کی شکست کے نتیجے میں تاتاریوں کو اپنے سب سے بڑے دشمن سے نجات مل گئی۔

سلطنتِ کین کی تسخیر (۶۲۸ھ): شمالی چین میں ''سلطنتِ کین'' چنگیز خان سے باغی ہو گئی تھی۔ چنگیز خان مرنے سے قبل اس پر حملے کے لیے ایک جامع نقشۂ جنگ تیار کر چکا تھا مگر اُسے زندگی نے مہلت نہ دی۔ او کتائی نے تخت نشینی کے بعد اس ادھورے کام کی تکمیل کی اور سلطنتِ کین کو از سرِ نو مسخر کیا۔ یہ مہم ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) میں تکمیل کو پہنچی۔

یورپ اور مغربی رُوس کی فتح (۶۳۳ھ تا ۶۴۱ھ): چنگیز خان کے دور میں اس کے جرنیلوں: سوبدائی اور جبی نویان نے رُوس اور یورپ پر یلغار کی تھی مگر کچھ فتوحات کے بعد لشکر واپس ہو گئے اور مہم نامکمل رہی۔ او کتائی نے سلطنتِ کین کا قلع قمع کرنے کے فوراً بعد قوریلتائی طلب کر کے یورپ پر حملے کے لیے ڈیڑھ لاکھ سپاہیوں کا لشکر ترتیب دیا جس کی عمومی کمان شاخِ زرّیں خیل کے بادشاہ باتو خان کے ہاتھ میں تھی جبکہ اس کے بھائی برکہ خان، اوردہ، سنقور اور سیبان اس کے مددگار تھے۔ نیز دیگر شاخوں کے نامی گرامی شہزادے جیسا کہ او کتائی کے بیٹے گیوگ اور قادان، نیز تولی خان کا بیٹا منگو خان بھی اس مہم میں شریک تھے۔ اس کے علاوہ یورپ میں جنگ کا تجربہ رکھنے والا سردار سوبدائی بھی ہمراہ تھا۔

---

① جامع التواریخ (فارسی) از رشید الدین فضل اللہ: ۲/۲ تا ۸۵، ط لیڈن

② تاریخ فتوحاتِ مغول، ص ۷۹، ۸۰ ③ تاریخ فتوحاتِ مغول، ص ۷۷، ۷۸

۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) کے موسم بہار میں یہ لشکر چلا اور یورپ کی سرحدوں پر کئی حصوں میں بٹ گیا۔ سوبدائی نے دریائے دولگا عبور کر کے بلغاریہ کو ازسرِ نو مسخر کیا۔ منگوخان نے بحیرہ خزر کے شمال میں آباد قبچاقی قبائل کو جو دریائے وولگا کی نشیبی سمت میں آباد تھے، اپنے قہر کا نشانہ بنایا۔ قبچاقی سردار باچمان نے جم کر منگو کا مقابلہ کیا مگر آخر شکست کھا کر قتل ہوا۔ قبچاقیوں کے ۴۰ ہزار گھرانے اپنے دوسرے سردار ''کوتان'' کی قیادت میں نقل مکانی کر کے ہنگری چلے گئے۔ کچھ قبچاقی قبائل اس کے بعد بھی مغلوں سے مزاحمت کرتے رہے جنہیں برکہ خان نے ۶۳۵ھ (۱۲۳۸ھ) میں مسخر کرلیا۔

اس کے بعد تاتاری غارت گر رُوس کی طرف متوجہ ہوئے۔ روسی شہزادے اس سے قبل اپنی ہزار سالہ تاریخ میں فقط چند بار یورپ کی سمت سے سویڈن، فرانس اور جرمن کی اقوام کے حملوں کا نشانہ بنے تھے مگر ہر بار وہ مغربی حملہ آوروں کو پسپا کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ یہ پہلی بار تھی کہ ان پر مشرق سے حملہ ہو رہا تھا جس سے وہ نہایت خوفزدہ تھے۔ وہ متحد نہ ہو سکے اور آخر تاتاریوں نے ۶۳۵ھ (دسمبر ۱۲۳۷ء) کی شدید سردی کے دوران مغربی روس کی مرکزی ریاست ''ریازان'' پر قبضہ کرلیا۔ موسم بہار تک مغربی روس کے باقی شہر بھی فتح ہوگئے۔

اس دوران منگوخان دریائے ڈنیپر (Dniper) عبور کر کے ''یوکرائن'' پر دھاوا بول چکا تھا۔ جمادی الاولی ۶۳۸ھ (دسمبر ۱۲۴۰ء) میں اس ریاست کا پایۂ تخت ''کیف'' سرنگوں ہوگیا اور تاتاریوں نے یہاں لاشوں کے انبار لگا دیے۔

ان فتوحات کے بعد تاتاری یورپ کی طرف پلٹ پڑے جہاں دہشت کا عجیب عالم تھا۔ تاتاریوں کے خوف سے ماہی گیروں نے ساحلوں پر جانا چھوڑ دیا جس کے باعث بازاروں میں مچھلی ناپید ہوگئی۔ سب سے پہلے ہنگری کی باری آئی جس کے حکمران نے قبچاقیوں کو پناہ دے کر مغلوں سے دشمنی مول لی تھی۔ ۶۳۸ھ (۱۲۴۱ء) میں سوبدائی، گیوگ اور باتو خان نے الگ الگ سمتوں سے ہنگری پر دھاوا بول دیا اور اس کے شہروں کو زیروزبر کرتے ہوئے دریائے ڈینوب تک پہنچ گئے۔ ہنگری جیسے طاقتور ملک کی فتح کے بعد تاتاری مزید پیش قدمی کرتے تو فرانس اور جرمنی سمیت تمام ممالکِ یورپ ان کے لیے تَر نوالہ تھے جہاں شہزادے اور نواب شدید اختلافات اور خوف و ہراس کا شکار تھے مگر غالبًا تاتاریوں کے پاس آگے کی دُنیا کے متعلق معلومات نہ تھیں۔ اس لیے ان کی فتوحات کا ریلا یہیں پر تھم گیا۔ ①

اوکتائی کے دور میں اکثر مفتوحہ علاقوں کی حد تک نہ صرف امن وامان رہا بلکہ یہاں ترقی اور خوشحالی کے اثرات بھی ظاہر ہوئے۔ تاہم خراسان وترکستان پر قابض تاتاری سردار آس پاس کی مسلم ریاستوں پر حملے کرتے رہے۔ ②

توراکینہ خاتون (۶۳۹ھ تا ۶۴۴ھ)

اوکتائی کے بعد ہنگامی طور پر اس کی بیوی توراکینہ تخت نشین ہوئی۔ یہ بہت ہوشیار اور تجربہ کار عورت تھی۔ اس نے عبوری حکمران کے طور پر پانچ سال تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ ③

① تاریخ فتوحاتِ مغول، ص ۸۱ تا ۹۰ ② جامع التواریخ (فارسی) از رشید الدین فضل اللہ: ۲/۲ تا ۸۵، ط لیڈن
③ جامع التواریخ (فارسی) از رشید الدین فضل اللہ: ۲/۷ ۲۳ تا ۲۴۰، ط لیڈن

گیوک خان بن اوکتائی (۶۴۴ھ تا ۶۴۵ھ)

پانچ سال بعد توراکینہ نے قورلتائی طلب کر کے اپنے بیٹے گیوک خان کو تخت سونپ دیا۔ گیوک خان کی تخت نشینی بڑی دھوم دھام سے ہوئی مگر وہ فقط ایک سال حکومت کر سکا۔[1]

منگو خان بن تولی خان (۶۴۵ھ تا ۶۵۵ھ)

گیوک خان کی موت کے بعد مرکزی قیادت چنگیز خان کے چھوٹے بیٹے تولی کی نسل میں منتقل ہوگئی۔ تولی کے چار بیٹے تھے: منگو، ہلاکو، قوبلائی (قوبیلا) اور ارتق بوقا۔ منگو خان کو اتفاقِ رائے سے منگولیا کا خاقان مان لیا گیا۔ اس نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو ایران وخراسان اور عراق کا حاکم بنادیا اور اسے "ایل خان" یعنی چھوٹے خان کا خطاب دیا۔ اس طرح ایران وخراسان کی مغل حکومت "ایل خانی سلطنت" کہلانے لگی۔ منگو نے ۶۴۶ھ سے ۶۵۵ھ تک حکومت کی۔[2]

ارتق بوقا بن تولی (۶۵۵ھ تا ۶۵۸ھ)

منگو خان کے مرنے پر اس کے بھائی ارتق بوقا نے تخت سنبھال لیا مگر اس کی اپنے بڑے بھائی قوبلائی خان سے اقتدار کی کش مکش شروع ہوگئی۔ آخر شہزادے قوبلائی خان پر متفق ہو گئے۔[3]

قوبلائی خان بن تولی (۶۵۵ھ تا ۶۹۳ھ)

اب قوبلائی خان خاقانِ چین بنا۔ اس نے قراقرم کو چھوڑ کر چین میں ایک نیا شہر "خان بالغ" (موجودہ بیجنگ) آباد کر کے اسے پایۂ تخت بنایا۔ اس نے بیرونی فتوحات پر بھی توجہ دی اور سیام (تھائی لینڈ) اور برما کو بھی فتح کر ڈالا۔ اس کا دورِ حکومت ۶۵۵ھ سے ۶۹۳ھ تک رہا۔ ان ۳۸ سالوں میں مغلوں کا رعب ودبدبہ اتنا بڑھ گیا کہ یورپ سے وفود حاضر ہو کر خاقان کو سلامی دیا کرتے تھے۔[4]

خاناتِ قپچاق (اُردوئے زرّیں خیل)

جوجی خان (۶۱۸ھ تا ۶۲۶ھ):

چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوجی (دوشی) کے حصے میں بحیرۂ خزر کے شمال مشرقی علاقے آئے تھے جو قفقاز سے مشرقی یورپ تک وسیع تھے۔ یہ علاقہ خاناتِ قپچاق اور یہ سلطنت اُردوئے زرّیں کہلاتی تھی۔ سوویت روس کی ریاستیں: شیشان، داغستان، تاتارستان، گرجستان اور یوکرائن کے علاقے بھی خاناتِ قپچاق کا حصہ تھے۔

جوجی کو اپنے باپ اور بھائیوں کے مزاج میں مناسبت نہیں تھی۔ وہ نرم طبع اور صلح پسند تھا اور باقی بھائیوں سے الگ

---

① جامع التواریخ (فارسی): ۲/۲۴۰ تا ۲۵۲، لیڈن

② جامع التواریخ (فارسی): ۲/۳۷۴ تا ۳۹۰، لیڈن

③ طبقاتِ ناصری: ۲/۱۷۸ تا ۱۸۹

④ جامع التواریخ (فارسی): ۲/۳۹۱ تا ۵۶۰، لیڈن

تھلگ رہتا تھا۔ اگرچہ وہ بہادر بھی تھا اور خوں ریز بھی مگر اصول پسند اور کھری طبیعت کا مالک تھا۔ اورگنج کی فتح میں اس نے شہر والوں کو جان کی امان دے دی تھی، جبکہ اس کے بھائی مکمل قتل عام پر اصرار کر رہے تھے، اس بات پر اس کا نہ صرف بھائیوں سے جھگڑا ہوا تھا[1] بلکہ اسے باپ سے بھی سخت ڈانٹ ڈپٹ سننا پڑی، تب سے اس نے اپنی فوج کے ساتھ عالم اسلام کی بجائے بحیرہ کیسپین سے شمال کی طرف روس اور یورپ کا رخ کیا۔

متمدن دنیا سے الگ گھاس کے میدانوں اور وادیوں پر مشتمل یہ علاقہ جو قفقاز اور قبچاق سے لے کر یورپ کے سرحدی علاقوں تک وسیع تھا، اسے پسند آ گیا اور وہ آخر تک وہیں رہا۔ چنگیز خان نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ اسے الگ رکھا جائے اس لیے یہ وسیع خطہ اس کے نام کر دیا۔ یوں اس کی الگ بادشاہت قائم ہوگئی جو "تاجِ زرّیں خیل" کہلائی۔ یہ سلطنت اتنی وسیع تھی کہ اس کی حدود کو طے کرنے میں چار ماہ لگتے تھے[2] اور اس کی طاقت اس قدر تھی کہ خود چنگیز خان اس سے خائف تھا۔[3]

اسی بناء پر چنگیز خان نے اپنے آخری ایام میں اسے چین طلب کیا تھا مگر اس نے بیماری کا عذر پیش کر کے انکار کر دیا جس پر چنگیز خان مزید شکوک وشبہات کا شکار رہا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد جوجی عمر کی چالیس بہاریں پوری کرنے سے پہلے فوت ہوگیا۔[4] کہا جاتا ہے کہ بغاوت کے خدشے کے تحت چنگیز خان نے اسے زہر دلوا دیا تھا۔[5] مگر اس کے بعد چنگیز بھی زندہ نہ رہ سکا اور اسی سال فوت ہوگیا۔

باتو خان (۶۲۴ھ تا ۶۵۰ھ):

جوجی کے سات بیٹے تھے جن میں سے چنگیز خان نے بڑے بیٹے باتو خان کو اس کا جانشین مقرر کر دیا۔ باتو خان نے تخت نشین ہو کر روس اور یورپ کا خاصا رقبہ فتح کیا۔ ۶۳۹ھ میں جب وہ یورپ کی مہمات سے لوٹا تو دریائے وولگا کے مشرق میں "سرائے" (Serai) نام شہر آباد کر کے اسے اُردوئے زرّیں کا پایہ تخت قرار دیا۔[6]

برکہ خان (۶۵۲ھ تا ۶۶۵ھ):

۶۵۰ھ میں باتو خان وفات پا گیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا سرتاق اور پھر سرتاق کا بیٹا "اولاغچی" تخت نشین ہوئے مگر دو سال میں دونوں یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اب جوجی کا منجھلا بیٹا برکہ خان بادشاہ بنا جو تخت نشینی سے قبل اسلام قبول کر چکا تھا۔ آگے یہ حکومت برکہ خان کی اولاد میں قائم رہی۔[7]

---

① سیرۃ سلطان جلال الدین، ص ۱۷۱

② روضۃ الصفا: ۴۳/۵، جامع التواریخ (فارسی): ۱۳۲/۲؛ چنگیز خان از ہیرلڈ لیمب: باب ۱۷، ص ۱۳۳؛ تاریخ الاسلام للذہبی: ۴۹/۹۰۰،ت تدمری

③ طبقاتِ ناصری از منہاج السراج: ۲/ ۱۴۹، ط کابل

④ جامع التواریخ (فارسی) از رشید الدین فضل اللہ: ۱۳۳/۲، ط لیڈن

⑤ طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۵۰

⑥ تاریخ فتوحات مغول، ص ۱۵۱

⑦ جامع التواریخ (فارسی): ۱۳۷/۲، ۱۳۸، ط لیڈن

ایل خانی سلطنت

ایل خانیوں میں درج ذیل حکمران گزرے:

ہلاکو خان (۶۵۴ھ تا ۶۶۳ھ):

چنگیز خان کے پوتے ہلاکو بن تولی خان نے ایران وخراسان سے عراق تک جو حکومت قائم کی تھی وہ ایل خانی سلطنت کہلاتی تھی۔ چونکہ ایل خانیوں کی سرحدیں مسلمانوں کے دارالخلافہ سے ملتی تھیں، اس لیے ایک مدت تک ایل خانی مسلمانوں کے سخت حریف رہے۔ بغداد کی تباہی انہی ایل خانی تاتاریوں کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کے بعد خلافت قاہرہ منتقل ہوئی تو ان کی سلطنتِ مصر سے جنگیں چلتی رہیں۔ ان کا پایۂ تخت آذربائی جان کا شہر مراغہ تھا۔ ایل خانی سلطنت کا بانی ہلاکو خان ۶۶۳ھ میں مرگیا۔ اس کی عمر ۶۰ سال سے اوپر تھی۔ ①

اباقا خان (۶۶۳ھ تا ۶۸۰ھ):

ہلاکو کے بعد اس کا بیٹا اباقا خان (ابغا) ایل خانی مغلیہ سلطنت کا حکمران بنا۔ اس کی بیوی یورپین شہزادی تھی جس کے اثر سے وہ خود بھی عیسائیت کے قریب ہو چکا تھا۔ اباقا نے شام اور مصر پر کئی حملے کیے مگر ناکام رہا۔ اس نے سترہ سال حکومت کی اور ۶۸۰ھ میں فوت ہوا۔ ② پھر یہ مملکت خانہ جنگی کا شکار ہو کر دوسرے مغل خاندانوں میں تقسیم ہوگئی۔

چغتائی سلطنت

چنگیز خان کے بیٹے چغتائی خان کی سلطنت سرحداتِ چین اور سطح مرتفع پامیر سے لے کر وسط ایشیا اور خراسان تک پھیلی ہوئی تھی۔ چغتائی خان ۶۳۸ھ میں فوت ہوا تو اس کی سلطنت سخت سیاسی انتشار کا شکار ہوگئی۔ اسی حالت میں اس کا بیٹا قرابلا خان تخت نشین ہوا جس نے ۶۵۲ھ تک حکمرانی کی۔ اس کے بعد چغتائی سلطنت کا بحران اس قدر بڑھا کہ کچھ مدت تک قرابلا کی بیوی ارغنہ خاتون کو حکومت چلانا پڑی۔ پھر چغتائی کا پوتا الغو خان تخت پر بیٹھا اور ۶۶۴ھ تک حکمران رہا۔ جلد ہی یہ سلطنت چغتائی کے پوتوں پڑپوتوں میں بٹ کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی شکل اختیار کر گئی۔ ③

⚙⚙⚙

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک: ۲/ ۲۹، ط العلمیة

② THE PREACHING OF ISLAM:175,176 ,by T.W.Arnold, LONDON :CONSTABLE & COMPANY . 1913

دعوتِ اسلام از شیخ محمد عنایت اللہ، ص ۲۳۰، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب۔ (یہ آرنلڈ کی مذکورہ بالا کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔)

نهاية الارب للنويري: ۲۷/ ۳۹۵ تا ۴۰۰، ط دار الكتب والوثائق قاهره

نوٹ: اباقہ خان کو عرب مؤرخین نے "ابغا" یا "اباغا" بھی کہہ کر یاد کیا ہے۔

③ جامع التواريخ (فارسی): ۲/ ۱۸۴ تا ۱۸۹، ط ليڈن ؛ تاريخ ابن خلدون: ۵/ ۵۹۹ تا ۶۰۱، ط دار الفكر

دعوتِ اسلام میں مشکلات

خاناتِ منگولیا اور خاناتِ قپچاق کی سلطنتیں عالم اسلام کی حدود سے باہر تھیں جبکہ ایل خانیوں اور چغتائیوں نے عالم اسلام کے بہت بڑے رقبے کو گھیرا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر مغل فیڈریشن مسلمانوں کے لیے ایک تاریک قید خانے سے کم نہ تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہاں دعوتی اور تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھنا تو دور کی بات اپنی جان اور اپنے ایمان کو بچائے رکھنا بھی آسان نہ تھا۔ مسلمان تاتاریوں کے مظالم کا اصل ہدف اور ان کے سب سے بڑے جنگی حریف رہے تھے جو اب شکست کھا کر غلام بن چکے تھے۔ مسلمانوں کے لیے شدید نفرت کے اس ماحول کو تبدیل کر کے اس سطح پر لانا کہ کوئی تاتاری اسلام کی دعوت کی جانب کان لگائے، ظاہری تناظر میں محال تھا۔ تاتاریوں کو اسلام کی طرف بلانا اس لیے مزید مشکل ہوگیا تھا کہ عیسائیت اور بدھ مت پیشوا جن کی تاتاری حکمرانوں کے دربار تک رسائی تھی، ان کو اپنے مذہب کی طرف مسلسل دعوت دیتے رہتے تھے۔ چنگیز خان کے بیٹوں کے دورِ حکومت میں تاتاریوں کا واضح جھکاؤ عیسائیت کی طرف تھا، اس کی سب بڑی وجہ یہ تھی کہ عیسائی تاتاریوں کے جنگی حریف نہیں بلکہ حلیف تھے۔ مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگیں جاری رکھنے کے باعث وہ مسلم دشمنی میں تاتاریوں کے ساتھ عملی اشتراک رکھتے تھے۔ عیسائیوں سے تاتاریوں کے مراسم اتنے گہرے تھے کہ انہوں نے عیسائی عورتوں سے شادیاں کر رکھی تھیں۔ چنگیز خان کی ایک بیوی عیسائی تھی۔ اس کے جانشین اوکتائی خان نے بھی ایک عیسائی خاتون سے شادی کی تھی جس سے اگلا خاقان گیوک خان پیدا ہوا جو خود عیسائیت سے انتہائی متاثر تھا۔ اس کے جانشین منگو خان نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ [1] ہلاکو خان کی بیوی بھی عیسائی تھی۔ [2] اس کے بیٹے اباقا خان کی شادی قُسطَنطِینِیَّہ کی عیسائی شہزادی سے ہوئی تھی۔ عیسائی پادری چنگیز خان کے بیٹوں کے دربار میں حاضر باش اور ان پر اثر انداز تھے۔ [3] بدھ مت کے پیشوا بھی تاتاریوں کے ہاں معزز تھے جن کی کوششوں نے چنگیز خان کی اولاد تیزی سے بدھ مت کی طرف راغب ہوئی۔ [4]

اس کے باوجود تاریخ کا ہر طالبِ علم سلاطینِ اسلام اور تاتاریوں کے درمیان خونریز جنگوں کا حال پڑھتے پڑھتے اچانک چنگیز خان کے پوتوں اور پڑپوتوں کو اسلام کی آغوش میں جاتے دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے۔ مؤرخِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تاتاریوں کی تباہ کاریوں اور غارت گری کے ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"قریب تھا کہ سارا عالم اسلام اس سیلاب بلا میں بہہ جائے، اور جیسا کہ اس وقت کے اہلِ نظر اور دردمند مصنفین نے خطرہ ظاہر کیا ہے، کہ اسلام کا نام ونشان بھی مٹ جائے کہ دفعۃً تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام شروع ہوگئی، اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور مسلمان بادشاہ نہ کر سکے، وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام

---

[1] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۳۱، ۳۲

[2] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۶۳ھ

[3] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۳۱ تا ۳۴

[4] THE PREACHING OF ISLAM 170,171

دیا اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابلِ تسخیر قوم کا اسلام سے مسخر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے مفتوح ہوجانا ہے۔ تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا اور عالم اسلام کو بزورِ شمشیر فتح کر لینا اتنا عجیب واقعہ نہیں کیوں کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان کمزوریوں اور بیماریوں کا شکار تھا جو بالعموم تہذیب و تمدن کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں اور انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں، اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خونخوار، خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمہ یہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں یہ نیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ بگوش بن گئی جو اپنی ہر قسم کی مادی وسیاسی طاقت کھو چکا تھا اور جس کے پیروؤں کو تاتاری سخت ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔''[1]

تاتاریوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ آج اس راہ میں درپیش مشکلات کا اندازہ پوری طرح کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر اس کی ایک جھلک پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کے ان الفاظ میں دیکھی جاسکتی ہے:

''مسلمان مبلغوں کا یہ کام اس وجہ سے اور بھی دشوار تھا کہ اس وقت اسلام کو دو زبردست حریفوں سے مقابلہ درپیش تھا یعنی: بدھ مت اور عیسوی دین۔ اسلام اور یہ دونوں مذاہب ان وحشی فاتحین کو اپنا معتقد بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے جنہوں نے ان مذاہب کے پیروکاروں کو پامال کر رکھا تھا۔ ان مذاہب کا باہمی مقابلہ ایک ایسا منظر پیش کرتا ہے، جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں۔''[2]

وہ مزید لکھتا ہے:

''مغلوں کے عہدِ حکومت کے ابتدائی دور میں بدھ مت اور عیسوی مذہب اسلام کے ایسے زبردست حریف تھے جن کے مقابلے میں اسلام کا کامیاب ہونا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا کیوں کہ حملۂ تاتار کے طوفان میں مسلمانوں نے دوسروں کی بہ نسبت بہت زیادہ نقصان اٹھایا تھا۔ مغربی ایشیا کے وہ آباد شہر جو کسی زمانے میں اسلامی مذہبی نظام اور علوم وفنون کے مراکز تھے، جلا کر خاکستر کر دیے گئے تھے اور مسلمانوں کے علماء و فضلاء یا تو قتل کر دیے گئے تھے یا غلام بنا لیے گئے تھے۔ اگرچہ مغل حکمران عموماً تمام مذاہب کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے تھے لیکن ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اسلام سے کم وبیش نفرت اور عداوت رکھتے تھے۔''[3]

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت: ۱/ ۳۲۲، ۳۲۳

[2] THE PREACHING OF ISLAM169؛ (دعوتِ اسلام، ص ۳۲۱)

[3] THE PREACHING OF ISLAM172,173 (دعوتِ اسلام، ص ۳۲۶)

یہاں ''بعض'' کا لفظ محلِ نظر ہے۔ ابتدائی عشروں کے اکثر مغل حکمران یعنی چنگیز خان، چغتائی خان، گیوک خان اور ہلاکو خان وغیرہ اسلام کے سخت دشمن تھے۔ صرف اوکتائی خان اور جوجی خان کو مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔

[4] THE PREACHING OF ISLAM169 (دعوتِ اسلام، ص ۳۲۲)

تاتاریوں پر بدھ مت کے اثرات:

تاتاری ابتداء ہی سے بدھ مذہب سے متاثر تھے۔ ان کی مملکت کے اردگرد جاپان، کوریا اور تبت جیسے ممالک تھے جو بدھ مت کے گڑھ تھے۔ خود چین میں بدھ مت کے عالم ہر جگہ مل جاتے تھے۔ چنگیز خان اور اس کے بیٹوں کے درباروں میں بدھ مذہب کے پیشواؤں کا بڑا اعزاز واکرام کیا جاتا تھا۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

''چنگیز خان کے حضور میں بدھ مت کے عالم شامانیوں سے مذہبی مسائل پر مناظرہ کرتے تھے۔''[1]

چنگیز خان کے بعد بدھ پیشواؤں کی قدر و منزلت مزید بڑھ گئی اور خاناتِ منگولیا بڑی حد تک بدھ مت کے زیر اثر آگئے۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

''قوبلائی خان کے عہد میں چین کے مغلوں پر بدھ مت کے قوی اثرات شروع ہوئے کیوں کہ وہ ہر طرف سے بدھ مت کے پیروکاروں میں گھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ چودھویں صدی کی ابتداء میں بدھ مت نے ان پر پورا اِقتدار حاصل کرلیا تھا۔ ان میں بدھ مت کی اشاعت کے لیے تبت کے لاما گرو نے بڑی سرگرمی سے کام لیا۔''[2]

تاتاریوں پر نصرانیت کے اثرات:

دوسری طرف دُنیائے نصرانیت جو عالم اسلام پر یورشِ تاتار کے زمانے میں مغرب سے صلیبی جنگوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چھیڑے ہوئے تھی، تاتاریوں کو نصرانی بنانے کے لیے پوری طرح سرگرم تھی۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

''اگرچہ مغلوں کی سلطنت کے مشرقی حصے میں بدھ مت نے غلبہ حاصل کرلیا تھا لیکن ابتداء میں مسیحی کلیسا کا اثر بھی کچھ کم نہ تھا اور عیسائیوں کو بڑی امید تھی کہ مغل ہمارا مذہب اختیار کرلیں گے۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی میں نسطوری فرقے کے مبلغوں نے ایشیا بھر میں مغرب سے لے کر مشرق کی سمت میں شمالی چین تک مسیحی دین کا پرچار کیا تھا۔ تیرہویں صدی تک مختلف مقامات میں ان کی متفرق جماعتیں پائی جاتی تھیں۔ پرسٹر جان کو جس کے متعلق قرونِ وسطیٰ میں بہت سے قصے مشہور تھے، ایک مسیحی تاتاری قبیلے کرایت کا سردار سمجھا جاتا تھا جو بحیرۂ بیکال کے جنوب میں آباد تھا۔ جب چنگیز خان نے اس قوم پر فتح پائی تو اس نے ان کے سردار کی بیٹی سے شادی کی اور اس کے بیٹے اوکتائی نے بھی اسی خاندان کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم کیا۔ اوکتائی کا بیٹا گیوک خاقان اگرچہ خود عیسائی نہ تھا لیکن عیسائیوں پر بہت مہربان تھا۔ اس کا وزیرِ اعظم اور معتمد کاتب بھی عیسائی مذہب رکھتے تھے۔ اس کے دربار میں نسطوری پادریوں کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور اس نے پوپ انوسنٹ چہارم کے سفیروں کو شرفِ باریابی بخشا تھا۔ مشرق اور مغرب کے عیسائی ممالک تاتاریوں سے یہ اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ان کی مدد کریں گے۔ یہ آرمینیا کا عیسائی بادشاہ ہتیون تھا جس نے منگو خان کو اس بات کی ترغیب دی تھی کہ وہ ہلاکو خان کی سرکردگی میں وہ لشکر روانہ کرے جس نے بالآخر بغداد کو تباہ و برباد کیا۔ ہلاکو خان کی بیوی عیسائی تھی اس لیے وہ

---

[1] THE PREACHING OF ISLAM:169,170 (دعوتِ اسلام، ص ۲۲۲)　[2] بحوالہ بالا

عیسائیوں پر بالعموم اور نسطوریوں پر بالخصوص بہت مہربان تھا۔ جو مغل گرجستان اور آرمینیا میں آباد ہوئے ان میں سے اکثر لوگوں کو ان ملکوں کے عیسائی اپنے مذہب پر لے آئے اور ان کو اصطباغ دیا۔[1] پریسٹر جان کی عظمت اور شان وشوکت کے جو حیرت انگیز قصے یورپ میں مشہور تھے، ان کی وجہ سے یورپ کے عیسائی سبز باغ دیکھ رہے تھے اور ان میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ مغل بھی عیسائی ہیں۔ اور یہ خیال ان کے دلوں میں ان غلط خبروں کی وجہ سے اور بھی پختہ ہوگیا تھا کہ متعدد مغل شہزادے عیسائی ہوگئے ہیں اور وہ عیسوی مذہب کے بڑے سرگرم حامی ہیں۔ اسی قسم کے مغالطے کی بناء پر سینٹ لوئی شاہِ فرانس نے ولیم ساکنِ روبرک کو خاقان کے دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا تاکہ وہ خاقان کو تاکید کرے کہ وہ عیسوی دین کی ترویج میں جو کوشش صرف کررہا ہے، اسے مستعدی سے بدستور جاری رکھے۔ لیکن جلد ہی اس بات کا انکشاف ہوگیا کہ یہ خبریں درحقیقت بالکل بے بنیاد تھیں۔ البتہ ولیم نے دیکھا کہ منگو خان کے دربار میں عیسوی مذہب کو کامل آزادی حاصل تھی اور چند مغل عیسائی بھی ہوچکے تھے۔ جس کی وجہ سے عیسائی پادری یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ دوسرے مغل بھی ان کا مذہب قبول کرلیں گے۔''[2]

آفرین ہے ان بندگانِ خدا کی ہمت پر جنہوں نے شب کی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر اور سجدوں میں آنسو بہا کر محض اس کی غیبی نصرت اور امداد کے وعدے پر بھروسہ کرکے بظاہر ناممکن دکھائی دینے والے اس ہدف کے حصول کے لیے پرعزم پیش قدمی کا آغاز کیا۔ وہ لرزہ خیز خطرات کی وادی سے گزرتے ہوئے اور بے مثال عزم واستقامت کے ساتھ ناقابل تحمل مصائب کا سامنا کرتے ہوئے، بڑی موقع شناسی اور حکمت سے اس عظیم مقصد کے لیے مصروفِ عمل رہے۔ یہ کام کتنی خاموشی اور کتنا خفیہ خفیہ ہوا؟ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مؤرخین اپنی تمام تر تگ ودوش کے باوجود اس میدان میں کام کرنے والے داعیوں اور مبلغین میں سے چند ایک کے سوا کسی کے کوائف معلوم کرنے میں ناکام رہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں۔ اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا، ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے۔ جن مخلصین نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے۔''[3]

یہ اللہ کے بندے جہاں بھی تھے، اپنے اپنے حال اور ماحول کے مطابق اس مہم کو انجام دیتے رہے۔ اسلام کے آفاقی پیغام کا آبِ حیات قطرہ قطرہ تاتاریوں کے کانوں میں ٹپکاتے رہے۔ نیز مسلمانوں کی تہذیب وثقافت بذاتِ خود تاتاریوں کے لیے متاثر کن تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صدی گزرنے تک تاتاری اجتماعی طور پر مسلمان ہوچکے تھے۔

---

[1] اِصْطِبَاغ: (بِہْتِسْمَہ): نصرانی مذہب اختیار کرتے وقت سر پر پانی چھڑکنے کی رسم ادا کرنا۔ (فیروز اللغات جامع)

[2] THE PREACHING OF ISLAM: 169,170,171، (دعوتِ اسلام، ص ۲۲۳) [3] تاریخ دعوت وعزیمت: ۳۲۲/۱

خاناتِ قبچاق میں دعوتِ اسلام

''شاخِ زرّیں خیل'' کے تاتاریوں میں اسلام کی دعوتِ عام کرنے والے مبلغین میں سب سے پہلے ایک قیدی کا ذکر ضروری ہے جس کے حالات پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ مشیت الٰہیہ تاتاری قوم کے اونچے طبقے میں دینِ حق کے بیج بکھیرنے کے لیے اسے پابجولاں اس زندان خانے میں لے گئی تھی۔

شہزادی خان سلطان۔ اسلام کی ایک گمنام مبلّغہ جس نے تاریخ بدل دی:

یہ قیدی ایک خاتون تھی۔ کوئی عام عورت نہیں، ایک شہزادی تھی۔ وہ خوارزم کے بادشاہ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی بیٹی اور مجاہد اسلام جلال الدین خوارزم شاہ کی بہن ''خان سلطان'' تھی۔ چنگیز خان کے حملے نے جب خوارزم کو تہ وبالا کیا اور علاؤالدین محمد خوارزم شاہ تاتاریوں سے جان بچا کر بحیرۂ خزر کے ایک جزیرے کی طرف روانہ ہوا تو اس وقت اس نے اپنے خاندان کی خواتین اور بچوں کو ماژندران کے ایک مضبوط قلعے میں چھوڑ دیا تھا۔ ان خواتین میں خوارزم شاہ کی ضعیف العمر والدہ ملکہ ترکان خاتون اور اس کی بیٹی شہزادی خان سلطان بھی شامل تھی۔ تاتاریوں نے شاہی خاندان کے افراد کی وہاں موجودگی کی اطلاع پا کر اس قلعے کا محاصرہ کرلیا، قلعہ بڑا مستحکم تھا مگر اس کی بلند دیواریں بھوک اور پیاس کا مداوانہ کرسکیں، جب قلعے کے تالاب پانی سے خالی ہوگئے اور محصورین بوند بوند کو ترسنے لگے تو مجبور ہو کر انہوں نے خود کو دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ تاتاریوں نے ان قیدیوں کو طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنانے کے بعد چنگیز خان کے پاس بھجوا دیا۔ اس نے تمام بچوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کرا دیا اور خواتین کو اپنے بیٹوں اور سرداروں میں تقسیم کرا دیا۔[1] ملکہ ترکان خاتون کو چنگیز خان اپنے ساتھ صحرائے گوبی لے گیا تھا جہاں ۶۳۰ھ میں فرشتہ اجل نے آ کر اسے رنج وغم کی زنجیروں سے آزاد کرایا۔[2] اس میں کوئی شک نہیں کہ ذلت ورسوائی تیز دھار نشتر اور ظلم وتشدد کے تازیانے ان اللہ کی بندیوں کو تڑپاتے رہے مگر جسمانی تکلیف اور ذہنی اذیت کی انتہا بھی انہیں ایمان اور دین اسلام سے برگشتہ نہ کرسکی۔

شہزادی خان سلطان کو چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوجی خان نے اپنے پاس رکھ کر بیوی بنا لیا۔ ان بدعقیدہ اور اجڈ دشمنوں کے درمیان اس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک عذاب تھا، مگر اس خدا کی بندی نے ان تمام تکالیف اور پریشانیوں کو

① سیرت سلطان جلال الدین، ص ۹۵ تا ۹۷؛ تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۵۳۳، ط ہرمس؛ روضۃ الصفا: ۸۲۵/۴

② سیرت سلطان جلال الدین، ص ۹۵ تا ۹۸؛ تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۵۳۳، ط ہرمس

مقدر کا لکھا اور ربّ کا فیصلہ سمجھ کر برداشت کیا اور صبر و تحمل سے حوادث زمانہ کی گرفت میں اپنی گردش معکوس کا نظارہ کرتی رہی۔ صبر کا پھل میٹھا نکلا۔ رفتہ رفتہ اس پر سختیاں کم ہوتی گئیں۔ اس سے جوجی کی اولاد بھی ہوئی۔ [1]

جوجی خان اور اسلام:

اس دوران اس کے شوہر جوجی خان کا ذہن بہت بدل گیا تھا اور وہ مسلمانوں کے بارے میں بہت نرم ہو گیا تھا۔ اسے تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم کے باعث سخت شرمندگی تھی۔ کوئی بعید نہیں کہ یہ شہزادی کی شخصیت کا اثر ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ جوجی اس بیوی کو بہت چاہنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شہزادی کو نہ صرف نماز، تلاوت اور دیگر مذہبی عبادات کی اجازت دے دی گئی تھی بلکہ جوجی نے خود اسے تاکید کی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن مجید پڑھایا کرے۔ جوجی خان سلطان کے بھائی سلطان جلال الدین سے رشتہ داری اور حلیفانہ تعلقات قائم کرنے کا خواہش مند تھا۔ خان سلطان نے اپنے بھائی کو جوجی کے ان نیک ارادوں کے بارے میں ایک مکتوب بھی لکھا تھا۔ [2]

اسی زمانے میں جوجی کے ہاں ایک بچہ ہوا جس کا نام برکہ خان رکھا گیا۔ اس کی ولادت ہوتے ہی جوجی نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ یہ بچہ بڑا ہو کر مسلمان ہو۔ اس کی ناف بھی مسلمان دائی قطع کرے اور اسے دودھ بھی مسلمان دائی پلائے۔'' چنانچہ برکہ خان کی نشو و نما مسلمان دائیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ [3]

وہ لڑکپن ہی سے اسلامی تعلیم و تربیت سے کچھ نہ کچھ آراستہ ہو چکا تھا۔ جیسا کہ قاضی منہاج السراج نے لکھا ہے:

''جب وہ عقل و شعور کی عمر کو پہنچا تو مسلمان علماء کی ایک جماعت کو اکٹھا کر کے ان میں سے ایک صاحب کو چن لیا گیا تاکہ اسے قرآن کی تعلیم دے۔ بعض ثقہ راوی کہتے ہیں کہ اس کی تعلیمِ قرآن شہر خجند میں ہوئی تھی۔'' [4]

اگرچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوانی میں اسلام لایا تھا جیسا کہ منقول ہے کہ ایک دن بخارا سے تاجروں کا ایک قافلہ اردوئے زرّیں خیل آیا۔ اس میں دو مسلمان تاجر تھے۔ برکہ خان نے ان سے علیحدگی میں ملاقات

---

① سیرۃ سلطان جلال الدین للنسوی، ص ۳۰۱

② سیرۃ سلطان جلال الدین للنسوی، ص ۳۰۱

جوجی نے شہزادی خان سلطان کو اپنے بھائی سلطان جلال الدین سے خط و کتابت کی اجازت دے رکھی تھی اور بہن بھائی میں مکاتبت ہوتی رہتی تھی مگر اس کا کوئی ریکارڈ تاریخ میں منقول نہیں۔ فقط ایک مکتوب محفوظ ہے جو سلطان جلال الدین کو ۶۲۶ھ میں خلاط کے محاصرے کے دوران ملا تھا جس کے متن کا حاصل مطلب سلطان جلال الدین کے منشی النسوی نے نقل کیا ہے۔ اسی خط میں بہن نے بھائی کو بتایا تھا کہ خاقان (جوجی) نے مجھے بچوں کو قرآن پڑھانے کا حکم دیا ہے اور وہ آپ سے رشتہ داری اور معاہدۂ صلح کا خواہاں ہے۔ (سیرۃ سلطان جلال الدین، ص۳۰۰) مگر معاہدے کی طرف کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ یاد رہے کہ جب یہ خط سلطان جلال الدین کو ملا تو جوجی خان کی وفات کو دو سال گزر چکے تھے اور تخت قپچاق پر باتو خان براجمان تھا۔ شاید قاصد کو غیر معمولی مسائل اور رکاوٹوں کے باعث اس قدر تاخیر ہوئی۔ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ بیبرس کی ایک سفارت کو مصر سے اردوئے زرّیں تک پہنچنے میں دو سال سے زائد لگ گئے تھے۔

③ طبقاتِ ناصری از قاضی منہاج السراج جوزجانی: ۱۵۰/۲، ط کابل

④ طبقاتِ ناصری: ۲۱۳/۲

یہاں اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ خجند ماوراء النہر میں ہے جبکہ جوجی کا ملک ماوراء النہر سے شمال مغرب میں تھا۔ جواب یہ ہے کہ اردوئے زرّیں کو دشتِ قپچاق کے ساتھ بحیرہ ارال کے بعض جنوبی شہروں پر بھی اختیار حاصل ہو گیا تھا جیسا کہ سمرقند میں برکہ خان کی مداخلت کے ایک واقعے سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ (طبقات ناصری: ۲/ ۲۱۶،۲۱۵) اسی طرح بخارا بھی اس کی جاگیر میں شامل ہو گیا تھا جیسا کہ علامہ عینی کے نقل کردہ بعض واقعات اس کا ثبوت ہیں۔ (عقد الجمان: سنہ ۶۵۲ھ)

کی اوران سے اسلام کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ ان تاجروں نے اس خوبی سے اس کے سوالات کے جوابات دیے کہ برکہ خان کو اسلام کی حقانیت کے بارے میں ذرہ برابر شبہ نہ رہا۔ چنانچہ وہ اسلام لے آیا۔ ① مگر یہ روایت اگر درست ہے تو اس کا مطلب غالباً یہ ہوگا کہ برکہ نے اسلام کا اعلان اس وقت کیا تھا۔ ② ورنہ اسلام کی گھٹی اسے بچپن سے مل چکی تھی جیسا کہ قاضی منہاج السراج نے تصریح کی ہے اوراس میں شک نہیں کہ اس میں شہزادی خان سلطان کا براہِ راست یا بالواسطہ بہت اہم کردار تھا۔

شہزادی خان سلطان کے حالات کا اس سے زیادہ تذکرہ نہیں ملتا، تاریخ اس کے اس آخری کارنامے کا ذکر کر کے اس کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ نہیں معلوم ہوسکا کہ شہزادی کو یہ مہم جاری رکھنے کا موقع کب تک ملا اور کب اس کی وفات ہوئی؟ تاریخ سے اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس کے گھریلو مکتب سے متاثر ہوکر اس کی زندگی میں کوئی تاتاری بادشاہ یا شہزادہ مشرف بہ اسلام ہوا یا نہیں؟ تاریخ میں یہ بھی واضح نہیں کہ کیا شہزادی خان سلطان سے قرآن پڑھنے والوں میں تاج زریں خیل کے وارث باتو خان اور برکہ خان شامل تھے یا نہیں؟

---

① THE PREACHING OF ISLAM:174.175؛دعوتِ اسلام، ص ۲۲۸، ۲۲۹
آرنلڈ نے اس واقعے کے لیے ابوالغازی بہادرخان کی ''تاریخ مغول'' کے فرانسیسی ترجمے (۱۸۱/۲) کا حوالہ دیا ہے۔ اب تک مجھے اس اصل ماخذ تک رسائی نہیں ہوئی۔

② قاضی منہاج السراج کے مطابق برکہ خان کی ولادت عالم اسلام پر تاتاریوں کے حملے کے دور میں ہوئی تھی۔ ''ثقات چنیں روایت کنند کہ ولادتِ این برکا در وقت فتوحات اسلام بود۔'' (طبقات ناصری: ۲/۱۵۰) عالم اسلام میں تاتاریوں کی فتوحات کا پہلا زمانہ ۶۱۶ھ سے ۶۱۸ھ تک ہے۔ پس برکہ خان کی ولادت اسی دوران ہوگی۔ اسی دوران ۶۱۷ھ کے وسط میں شہزادی خان سلطان تاتاریوں کے قبضے میں آئی تھی۔ گرفتاری کی تاریخ متعین نہیں مگر یہ واقعہ یقیناً سلطان علاؤالدین محمد کی وفات (شعبان ۶۱۷ھ) سے چند ہفتے قبل کا ہے کیوں کہ اپنی مستورات کی گرفتاری کی خبر ہی سے علاؤالدین محمد کی حالت زیادہ بگڑی تھی۔ (تاریخ جہان کشا جوینی: ۲/۳۵۸، ط ہرمس) چونکہ تاریخی روایات میں گرفتاری کے بعد شہزادی کے جوجی سے نکاح میں کسی تاخیر کا ذکر نہیں، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ۶۱۷ھ کی آخری سہ ماہی میں وہ جوجی کی بیوی بن چکی تھی۔ اس بنیاد پر اگر ۶۱۸ھ میں وہ جوجی کے کسی بچے کی ماں بن گئی ہو تو یہ عقلاً بعید نہیں۔ تاریخ میں یہ مذکور ہے کہ خان سلطان سے جوجی کی اولاد ہوئی تھی: واستخصها دوشی خان لنفسه واستولدها. (سیرت سلطان جلال الدین للنسوی، ص ۳۰۱) مگر اس اولاد میں برکہ خان شامل تھا یا نہیں۔ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ بعض مؤرخین نے برکہ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: ''وهو فی عشر الستین.'' (ذیل مرآة الزمان: ۲ / ۳۶۵؛ النجوم الزاهرة سنة ۶۶۵ھ) جس کا حاصلِ مطلب یہ ہے کہ بوقتِ وفات وہ پچاس سال سے اوپر کا تھا۔ یہ تو طے ہے کہ برکہ کی وفات ۶۶۵ھ میں ہوئی تھی۔ اگر اس وقت اس کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو تو اس کی ولادت ۶۱۵ھ سے پہلے بنتی ہے۔ جبکہ شہزادی خان سلطان جوجی کے نکاح میں ۶۱۷ھ میں آئی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برکہ شہزادی خان سلطان کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔

مگر دوسری طرف قاضی منہاج السراج نے ثقہ راویوں کا حوالہ دے کر نقل کیا ہے کہ برکہ کی ولادت عالم اسلام پر تاتاری یلغار کے زمانے میں اس وقت ہوئی تھی جب جوجی اسلام سے متاثر ہو چکا تھا تبھی اس نے برکہ کی پرورش مسلمان دائیوں کے سپرد کی تھی۔ اس حساب سے برکہ کی کل عمر پچاس سال سے کم بنتی ہے (عالم اسلام پر تاتاریوں کے حملے سے ۶۶۵ھ تک تقریباً اتنا ہی وقت بنتا ہے۔) اس بحث سے یہ تو طے نہیں ہو پاتا کہ برکہ خان جوجی کی کس بیوی کا بیٹا تھا، البتہ یہ طے ہو جاتا ہے کہ برکہ کی ولادت کے وقت شہزادی خان سلطان جوجی کے نکاح میں تھی جس کے اسلامی فکر کے اثرات نے جوجی کو اسلام کے قریب کیا۔

فوائد: (۱) رشید الدین کے مطابق ۶۲۳ھ میں جب جوجی کی وفات ہوئی تو وہ تیس سے چالیس سال کے درمیان کا تھا۔ (جامع التواریخ، فارسی: ۲/۱۳۲، لیڈن) یعنی اس کی ولادت ۵۸۳ھ سے ۵۹۳ھ کے درمیان ہوئی تھی۔

(۲) برکہ خان کے بڑے بھائی باتو خان کی کل عمر ۴۸ سال تھی جس کی وفات ۶۵۰ھ میں ہوئی تھی۔ (جامع التواریخ فارسی: ۲/۱۳۷، لیڈن) یعنی باتو کی ولادت ۶۰۲ھ کی تھی اور باپ کی وفات کے وقت وہ ۲۲ سال کا تھا۔

(۳) برکہ سے بڑا ایک اور بھائی تھا جس کا نام ''اوردہ'' تھا۔ مجموعی طور پر یہ چودہ بھائی تھے۔ باتو دوسرا اور برکہ تیسرا تھا۔ (جامع التواریخ: ۲/۹۱، ۹۲، لیڈن)

مگر قرائن بتاتے ہیں کہ جوجی کے پورے گھرانے پر شہزادی خان سلطان نے بھرپور اثرات مرتب کیے۔ جب مؤرخ سقوطِ بغداد کے کچھ عرصے بعد جوجی خان کے بیٹے برکہ خان کو اچانک اسلام کا اعلان کر کے اپنے چچازاد بھائی ہلاکو خان کے خلاف جہاد کے لیے تلوار اٹھائے دیکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان کا جو بیج وہ خدا کی بندی اس دشمن قوم کے بچوں میں بو کر گئی تھی وہ کیسا تناور درخت بنا اور کیسے عمدہ برگ و بار لایا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادی خان سلطان نے "سرائے محل" کے ایک کونے میں جس اخلاص اور دلی جذبے کے ساتھ بچوں کو قرآن کی تعلیم دی تھی، اس کے اثرات آہستہ آہستہ ظاہر ہو کر رہے اور نوخیز تاتاری شہزادوں میں اسلامی سوچ پروان چڑھتی رہی۔

درحقیقت یہ اثرات خود جوجی کی زندگی میں نمایاں ہو چکے تھے۔ جوجی اپنی زندگی کے آخری سالوں میں مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم کی بناء پر سخت شرمندہ تھا اور تلافی کے لیے اپنے حریف خوارزمیوں کو دوست بنانے اور اپنی بیوی شہزادی خان سلطان کے خانوادے سے تعلقات قائم کرنے کا خواہش مند تھا۔ یہی خواہش اس کے قتل کا سبب بنی، چونکہ چنگیز خان کی موجودگی میں ان عزائم کی تکمیل ناممکن تھی لہٰذا جوجی نے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ اسی دھن میں اس نے ایک بار اپنے رازدار ساتھیوں کو کہا:

"ہمارا باپ دیوانہ ہے۔ اس نے اس قدر انسانوں کو ہلاک کر ڈالا، ایسی بڑی بڑی مملکتوں کو زیروزبر کر دیا۔ مجھے مناسب یہی لگتا ہے کہ شکار کے دوران باپ کو ہلاک کر دوں اور سلطان محمد خوارزم شاہ کے خاندان سے رشتہ داری قائم کرلوں۔ اس سرزمین کو دوبارہ آباد کروں اور مسلمانوں کی مدد کروں۔"[1]

---

① طبقات ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۱۵۰/۲، ط کابل

جوجی کے ان جملوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی قرین قیاس لگتا ہے کہ وہ مسلمان ہو چکا ہو۔ ورنہ آخر ایک کافر تاتاری حکمران کو کیا پڑی تھی کہ وہ مسلمانوں کے قتل عام کے گناہ پر نہ صرف افسوس کرتا بلکہ اس کی تلافی کے لیے فتنے کے سرغنہ کو جو اس کا سگا باپ تھا، قتل کرنے کی تدبیر کرتا؟ جوجی کے دور میں سلطان علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کا وارث سلطان جلال الدین تھا۔ جوجی کے دل میں اس مردِ مجاہد سے رشتہ قائم کرنے، اُجڑے ہوئے مسلمانوں کو بسانے اور انہیں سہارا دینے جیسے مشکل اہداف کی تکمیل کا جذبہ کیا فقط اپنے باپ اور بھائیوں کی نفرت نے پیدا کر دیا تھا یا اس کے پیچھے کوئی ایمانی شمع بھی روشن تھی؟ کیا اپنے نومولود کے مسلمان ہونے کی خواہش کرنا اور بیوی کو قرآن کی تعلیم عام کرنے کا حکم دینا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ جوجی کے دل میں اسلام کی صداقت گھر کر چکی تھی؟

مزید یہ کہ رشید الدین نے جوجی کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چودہ لڑکے گنوائے ہیں اور گیارہویں کا نام محمد بتایا ہے۔ (جامع التواریخ فارسی: ۹۱/۲) ایسی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ اصل نام کچھ اور ہو اور یہ نام بعد میں اسلام قبول کر کے اپنایا گیا ہو۔ پس ظاہر یہی ہے کہ یہ اس کا پیدائشی نام تھا۔ جس باپ نے تیسرے بیٹے کی پیدائش پر اس کے مسلمان ہونے کی خواہش کی تھی، چند سال بعد ایمان کی مزید ترقی کے باعث وہ گیارہویں بیٹے کا نام "محمد" رکھے تو اس میں کیا تعجب ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اس کایا پلٹ کے پیچھے اس کی بیوی شہزادی خان سلطان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟ دشتِ قپچاق میں اس زمانے میں دور دور تک کوئی مسلمان نہ تھا جس سے جوجی کے متاثر ہونے کی اُمید کی جا سکتی۔ تو ظاہر ہے یہ مسلمان بیوی ہی کا کرشمہ تھا جس نے اس طاقتور ترین بادشاہ کو متاثر کر دیا۔ پس عین ممکن ہے کہ جوجی نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر لیا ہو۔ یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ پہلے اس نے خود اپنی بیوی سے قرآن پڑھا ہو اور کلام اللہ کی اثر انگیزی ہی نے اسے آمادہ کیا ہو کہ وہ بیوی کو خاندان کے دوسرے بچوں کو قرآن سکھانے کا حکم دے۔ اگر متمدن دنیا سے ہزاروں میل دور گھاس کے میدانوں میں خیموں کے شہروں پر حکومت کرنے والے اس بادشاہ کا مسلمان ہونا ظاہر نہیں ہوا تو اس کی قوی وجوہ موجود تھیں۔ اس وقت مغلوں کا پیشوائے اعظم چنگیز خان زندہ تھا جس کے ہاں اسلام کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ جوجی کے قبولِ اسلام کو وہ کھلی بغاوت سمجھ کر مغلوں کی اجتماعی طاقت کے ساتھ اردوئے زریں پر ٹوٹ پڑتا۔ اسلام کی تبلیغ کو بتدریج آگے بڑھانے کے لیے باپ کو لاعلم رکھنا اور اس کے قہر و غضب سے بچ کر زیرِ زمین کام کرنا ضروری تھا۔ ان پہلوؤں کے پیشِ نظر اگر جوجی اسلام لا کر بھی اسے خفیہ رکھے ہوئے ہو تو کوئی بعید نہیں۔ ممکن ہے جوجی کو اگر دو تین عشرے مزید مل جاتے تو اپنے بیٹوں کی طرح کسی وقت وہ بھی اسلام کا اعلان کر دیتا مگر شاید اسے وقت ہی نہ مل سکا۔

اس نے چنگیز خان کو راستے سے ہٹانے کے لیے اپنے رازدار ساتھیوں سے جو دل کی بات کہی تھی، وہ اس کے بھائی چغتائی تک پہنچ گئی جو مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے چنگیز خان کو فوراً آگاہ کیا۔ ایک روایت کے مطابق چنگیز خان نے ایک جاسوس بھیجا جس نے جوجی کے کھانے میں زہر ملا دیا، یوں جوجی کی موت واقع ہوگئی۔[1]

باتو خان کے دور میں:

جوجی خان کا بڑا بیٹا باتو خان ۶۲۴ھ میں اس کے تاج وتخت کا وارث بنا۔ اس نے سلطنت کو مزید وسعت دے کر ایک طرف جنوبی روس اور دوسری طرف مغرب میں پولینڈ کو بھی فتح کر ڈالا۔ ۶۳۹ھ میں وہ بوداپسٹ فتح کر چکا تھا۔[2]

اس کے ہم عصر قاضی منہاج السراج رحمہ اللہ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''وہ نہایت عقل مند اور مسلم دوست تھا۔ اس کے سائے میں مسلمان خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ اس کی لشکرگاہ اور قبائل میں نماز باجماعت قائم تھی۔ امام اور مؤذن ہر جگہ موجود تھے۔ اس کی پوری مدتِ حکومت اور زمانۂ حیات میں اس کے فرمان سے یا اس کے پیروکاروں اور لشکر سے مسلم ملکوں کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔ ترکستان کے مسلمانوں کو اس کی حمایت کے سائے میں بڑی فراغت اور بہت امن نصیب تھا۔ ایران کا کوئی بھی صوبہ جو مغلوں کے ماتحت آتا تو اس (کی آمدن) میں باتو خان کا حصہ طے ہوتا۔ مغلوں کے تمام امرائے لشکر اس کے مطیع تھے اور اسے اس کے باپ کی مانند تصور کرتے تھے۔ جب گیوک خان کا انتقال ہوا اور وہ واصل جہنم ہو چکا تو چغتائی کے بیٹوں کے سوا تمام مغل امراء نے اس سے درخواست کی وہ مغل تخت (قراقرم) کی فرمانروائی قبول کرلے اور بادشاہ بن بیٹھے۔ مگر اس نے قبول نہ کیا جس پر مغل امراء نے منگو خان بن تولی کو تخت پر بٹھا دیا۔''[3]

باتو خان کی یہ صفات اسے مسلمانوں کا پکا ہمدرد ثابت کردیتی ہیں اور یہ امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید وہ خفیہ طور پر مسلمان ہو چکا ہو۔ اس دور کے بعض لوگ یہی کہتے تھے۔ چنانچہ قاضی منہاج السراج رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے ثقہ لوگوں سے سنا ہے کہ باتو خفیہ طور پر مسلمان تھا مگر اس بات کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ وہ پوری طرح اہلِ اسلام کا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس نے کم وبیش اٹھائیس سال حکومت کی۔ اگر وہ اہلِ ایمان میں سے تھا تو اللہ اس پر رحمت کرے، اگر کفار میں سے تھا تو اللہ اس کا عذاب کم کرے۔''[4]

برکہ خان حکمرانی سے پہلے:

باتو خان اپنے چھوٹے بھائی برکہ خان کو جسے اس کے باپ نے پیدائش کے ساتھ ہی مسلمان بنانے کا فیصلہ کیا تھا، بڑی عزت دیتا تھا۔ جب وہ بالغ ہوا تو لشکرگاہ میں جتنے بھی مسلمان تھے، وہ سب اسی کے دستے میں شامل کردیے

---

① طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۱۵۰/۲، ط کابل

② الدولة الخوارزمية والمغول للحافظ احمد حمدی، ص ۲۷۹، ط دار الفکر العربی قاھرة

③ طبقاتِ ناصری: ۱۷۶/۲

④ طبقاتِ ناصری: ۱۷۶/۲

گئے۔[1] باتو خان نے برکہ کو امورِ سلطنت چلانے میں معاون بنا رکھا تھا اور اس کے لیے جاگیریں، افسران اور سپاہی مقرر کر رکھے تھے۔ اسی نیابت کے دور میں برکہ خان اپنے سفیر دیگر ممالک میں بھیجتا تھا۔[2]

برکہ خان اور شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ:

برکہ خان کی اسلامی تربیت میں بہت بڑا حصہ بخارا کے ایک صوفی بزرگ شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ کا تھا جو مشائخِ خوارزم کے سرتاج شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے۔ نہایت متقی، پرہیزگار اور عابد و زاہد انسان تھے۔ ۶۱۶ھ میں جب چنگیز خان نے عالمِ اسلام پر حملہ کیا تو بخارا اس کی یلغار کی زد میں آنے والا پہلا بڑا اسلامی شہر تھا۔ چنگیزی حملے میں یہ اس طرح تباہ و برباد ہوا کہ تمام عمارتیں جل کر خاک ہو گئیں اور مٹھی بھر افراد کے سوا تمام باشندے تاتاریوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ بخارا کی تباہی کے چند ماہ بعد تاتاریوں نے خوارزم کے دار الحکومت اورگنج کی طرف پیش قدمی کی جہاں شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ اپنی خانقاہ میں اپنے خلفاء سمیت فروکش تھے انہوں نے اپنے خلفاء کو تاکیدی حکم کے ساتھ مختلف ملکوں کی جانب روانہ کر دیا اور خود اورگنج میں رہ کر جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔[3]

شیخ باخرزی رحمہ اللہ کو مرشد کی جانب سے بخارا کے کھنڈرات میں آباد ہونے کا حکم ملا تھا۔ وہ یہاں چلے آئے۔ عالمِ اسلام کا یہ عظیم شہر، اب شہر نہیں قبرستان تھا۔ اس کی سوختہ اور منہدم بستیوں کے نواح میں شیخ رحمہ اللہ نے ایک چھوٹی سی خانقاہ قائم کی۔ انہوں نے خداداد عزم وہمت اور کامل ایمان کے بل بوتے پر اس وحشت ناک ماحول میں تاتاریوں کی تلواروں کے نیچے ایک نہایت کٹھن وقت گزارا۔

۶۲۲ھ میں انہوں نے یہاں درسِ بخاری شروع کیا۔ اب لوگ دور دور سے شیخ رحمہ اللہ سے استفادہ کرنے کے لیے حاضر ہوتے اور اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کر کے لوٹتے۔ بہت سے لوگ شیخ کے پڑوس کو غنیمت جان کر یہیں رہنے لگے۔ یوں شیخ کے دم سے بخارا دوبارہ آباد ہونے لگا۔[4]

شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ کا سفیر اُردوئے زرّیں میں:

شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ کی شہرت اب مغلوں میں دور دور تک پھیل چکی تھی۔ وہ بڑی حکمت اور اخلاص کے ساتھ دعوتِ اسلام کو ایک مہم کی طرح انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد کو دعوتِ اسلام کے لیے باتو خان کی سلطنت میں بھیجا۔ یہ شاگرد وہاں برکہ خان سے ملا اور دربارِ اُردوئے زرّیں میں اسلام کا پیغام پہنچایا اور

---

① طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۲/ ۲۱۳، ط کابل

یہاں مؤلف کی عبارت "چوں بحدِ بلوغ رسید آنچہ در لشکرگاہِ توشی مسلمان بودہ است، ہمہ در خیل او فرمود" تسامح سے خالی نہیں۔ جوجی کی وفات (۶۲۴ھ) کے وقت برکہ خان حدِ بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔ پس اسے باتو خان کے دور کا واقعہ سمجھنا چاہیے۔ "لشکرگاہِ توشی" سے لازم نہیں آتا کہ توشی (جوجی) اس وقت زندہ ہو۔ بلکہ غالب ظن یہ ہے کہ یہاں اس کے بیٹے باتو خان کی لشکرگاہ کو مجازاً "لشکرگاہِ دوشی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

② طبقاتِ ناصری: ۲/ ۲۱۳ ③ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۶۴، ۳۶۵، ط الرسالۃ

④ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۳۶۵، ط الرسالۃ

اسلامی تعلیمات کو واضح کیا۔ اس وعظ و بیان کا وہاں بڑا اثر ہوا۔ برکہ خان نے اس کے بعد اپنے مغل افسران وسپاہ کو اسلام کی دعوت دینے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔[1] اس کی کوششوں کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ۶۳۱ھ میں برکہ نے ایک سفارت ہندوستان بھیجی جس نے سلطان شمس الدین التتمش کے دربار میں حاضری دی۔ سلطان نے انہیں گوالیار بھیج دیا جہاں اس زمانے میں قاضی منہاج السراج رحمہ اللہ چیف جسٹس کے طور پر تعینات تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ لوگ مسلمان تھے اور ہر جمعہ کو راقم الحروف کے نائب کے پیچھے جامع مسجد میں نماز ادا کرنے آتے تھے۔ سلطانہ رضیہ کے زمانے تک یہی سلسلہ جاری رہا۔''[2]

برکہ خان کو اولیاء اللہ سے ملاقات کا شوق:

اس عنفوانِ شباب میں برکہ خان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا اس سے زیادہ تذکرہ نہیں ملتا۔ شاید یہ دور اس نے مغلوں کی عادت کے مطابق جنگی فنون اور شکار و شہ سواری جیسے مشاغل میں مہارت حاصل کرتے ہوئے گزارا ہوگا۔

یہ بھی واضح ہے کہ قرآن مجید کی رسمی تعلیم حاصل کر لینے کے باوجود برکہ خان کے ذہن میں دین کی جامع تصویر نہیں آئی تھی اور اس کی تعلیم و تربیت میں بہت سی بنیادی کمزوریاں باقی تھیں۔ وہ جس علاقے میں رہتا تھا، وہاں مسلمانوں کا کوئی شہر نہ تھا۔ اسلامی تعلیمات کے حصول اور اصلاحِ نفس کے ذرائع نایاب تھے۔ برکہ خان یقیناً یہ خلش محسوس کرتا تھا چنانچہ اس نے وسطِ ایشیا کے جلیل القدر اولیاء و مشائخ کی زیارت کا قصد کیا[3] جن میں شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ سرفہرست تھے۔ پہلے اس نے ایک قاصد بھیج کر شیخ رحمہ اللہ سے بیعت کی مگر زیارت کا شوق کم نہ ہوا۔[4]

شیخ باخرزی رحمہ اللہ کا استغناء:

مزید اظہارِ عقیدت کے لیے اس نے شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ کو بخارا کے دیہات اور جنگلات کا جاگیر نامہ بھیجا جس کی رو سے اس تمام علاقے کی آمدن کے مالک شیخ باخرزی رحمہ اللہ قرار دیے گئے۔ برکہ کا مقصد تھا کہ اس طرح شیخ کو تحفظ اور مرتبہ بھی حاصل ہوگا اور جاگیر کے اموال کو شیخ مہمانوں، درویشوں اور علماء و صلحاء کی خدمت پر خرچ کر سکیں گے۔ جب قاصد نے انہیں جا کر یہ جاگیر نامہ دیا تو شیخ رحمہ اللہ نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

قاصد نے کہا: ''یہ آن جناب کے ہاتھ میں رہے گا تو آپ کے متعلقین کو ہر طرح کی حفاظت میسر رہے گی۔''

شیخ رحمہ اللہ نے کہا: ''یہ دستاویز اُس گدھے کے گلے میں باندھ دو۔ پھر اسے جنگل کی طرف ہانکو۔ اگر وہ گدھا بھاگنے نہ پائے تو میں اس کو قبول کر لوں گا۔ اور اگر یہ دستاویز گدھے کو بھاگنے سے نہ روک سکے تو مجھے کیا نفع پہنچائے گی۔''

---

① عقد الجمان للعینی: سنة ۶۵۲ھ

علامہ عینی نے یہ ساری معلومات ''تاریخ نصیرس'' کے حوالے سے نقل کی ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ برکہ خان نے بھی اسی شاگرد کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا: ''فاسلم علیٰ یدہ.'' ممکن ہے برکہ خان اس سے پہلے فقط اسلام کی طرف مائل رہا ہو اور باقاعدہ اس نے اسلام اسی وقت قبول کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تجدیدِ اسلام ہو۔

② طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۲/۲۱۴، ط کابل

③ طبقاتِ ناصری: ۲/۲۱۴ ④ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۶، ط الرسالة

قاصد نے واپس آکر برکہ خان کو شیخ کی بے نیازی کا یہ واقعہ سنایا۔ برکہ کو شیخ رحمہ اللہ سے غائبانہ عقیدت تو پہلے سے تھی۔ اب اس میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ اس نے کہا: ''اب میں خود شیخ کی خدمت میں جاؤں گا۔''[1]

شہزادہ فقیر کی کٹیا پر:

آخر اس نے اپنے بڑے بھائی باتو خان سے بخارا جانے کی اجازت لی۔ باتو خان اگر چہ بظاہر اسلام نہ لایا تھا مگر اسے بھی شیخ باخرزی رحمہ اللہ سے عقیدت تھی۔ اس نے اس بات پر مسرت ظاہر کی کہ برکہ ایک سچے درویش کا مرید بننا چاہتا ہے۔ اب برکہ خان چند ساتھیوں سمیت اس طویل سفر پر روانہ ہوگیا۔ آخر وہ اپنے پایۂ تخت ''سرائے باتو'' سے چل کر کئی مہینوں کے سفر کے بعد جنداور اُترار سے ہوتا ہوا بخارا پہنچا۔[2]

ایک شہزادہ جسے دنیا کی ہر نعمت اور ہر راحت حاصل تھی آج وہ ایک ایسی دولت کی طلب میں بخارا کے درویش کی چوکھٹ پر دستک دینے آیا تھا جس سے بادشاہوں کے خزانے خالی تھے۔ برکہ خان شیخ کے حجرے کی چوکھٹ پر پہنچا تو نصف شب بیت چکی تھی۔ باہر برف باری ہورہی تھی مگر برکہ خان نے دروازے پر دستک دے کر شیخ کو بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور باہر ہی نماز کی نیت باندھ لی۔ خون منجمد کرنے والی سردی میں وہ ساری رات نوافل پڑھتا رہا۔

مشرق سے صبح کی سپیدی نمودار ہوئی تو شیخ کی خانقاہ کا دروازہ کھلا۔[3] شیخ اُمراء اور حکام سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر کچھ مریدوں نے سفارش کی کہ برکہ کو باریابی کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے کہا:

''یہ ایک بڑے ملک کا شہزادہ ہے۔ بہت دور سے شیخ کی خدمت میں آیا ہے۔ شیخ کی برکت حاصل کرنا اور بات چیت کی سعادت پانا چاہتا ہے۔ اس سے ملنے میں کوئی حرج نہیں۔'' آخر شیخ نے ملاقات کی اجازت دے دی۔[4]

برکہ خان مؤدبانہ انداز میں اندر داخل ہوا۔ شیخ باخرزی رحمہ اللہ نے نہایت شفقت اور محبت سے اس کا استقبال کیا۔

برکہ خان بے خود ہو کر شیخ کے قدموں پر گر گیا اور ان کی قدم بوسی کرنے لگا۔[5]

اس نے شیخ رحمہ اللہ کے ہاتھ پر اسلام کی تجدید کی۔ شیخ نے اسے کھانا کھلایا۔[6]

---

① عقد الجمان :سنة ۶۵۲ھ

② سیر اعلام النبلاء: ۳۶۶/۲۳ ،ط الرسالة

حافظ ذہبی اس سفر کی توقیت کے بارے میں لکھتے ہیں: " وقد سافر من سقسین بنة نیف وأربعین إلی بخاری لزیارة الشیخ سیف الدین الباخرزي. " (سیر اعلام النبلاء: ۳۶۶/۲۳) اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت برکہ خان کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ شیخ باخرزی کی ولادت ۵۸۶ھ کی ہے۔ جب برکہ خان ان کی خدمت میں آیا تو اس وقت شیخ کی عمر پچپن سے ساٹھ سال کے درمیان تھی۔

نوٹ: ''سقسین'' سرائے باتو کا دوسرا نام تھا یا اس کا ایک محلّہ تھا۔ سرائے باتو کو فقط ''سرائے'' بھی کہا جاتا تھا۔ اسے جوجی کے پیشرو باتو خان نے ۱۲۴۰ء میں اپنے پایۂ تخت کے طور پر بحیرۂ خزر کے شمال اور دریائے وولگا کے ڈیلٹا میں آباد کیا تھا۔ آج کل یہ علاقہ جنوبی روس کے ضلع ''استراخان'' میں شامل ہے۔ اس کے بعد سلطنت کا دوسرا بڑا شہر ''بُلغار'' تھا۔ (غلط فہمی نہ ہو۔ یہ مملکت بلغاریہ نہیں، بلکہ روس کا ایک شہر ہے۔)

③ عقد الجمان للعینی :سنة ۶۵۲ھ

④ سیر اعلام النبلاء: ۳۶۶/۲۳، ط الرسالة

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۳۶۶/۲۳ ،ط الرسالة

⑥ عقد الجمان للعینی :سنة ۶۵۲ھ

برکہ خان کے ساتھ اس کے چند اور ہم خیال امراء بھی آئے تھے۔ ان سب نے شیخ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ برکہ خان نے شیخ رحمہ اللہ کے پاس کچھ دن گزارے اور ضروریاتِ دین کی تعلیم حاصل کی۔ اس کی ساٹھ بیویاں تھیں۔ شیخ رحمہ اللہ کے حکم پر اس نے چار کے سوا باقی سب سے تعلقات ختم کر دیے۔ شیخ رحمہ اللہ نے چند وظائف اور کچھ دعائیں تحریر کر کے اسے اور اس کے ساتھیوں کو دیں اور ان کو پابندی سے پڑھتے رہنے کی تاکید کی۔ برکہ خان شیخ کے پاس زیادہ عرصہ رہنا چاہتا تھا مگر شیخ رحمہ اللہ نے بہت سی مصلحتوں کے تحت اسے جلد واپس چلے جانے کی تاکید کی اور فرمایا:

''میں چاہتا ہوں تم اپنی سلطنت میں رہو۔''[1]

برکہ خان کی اشاعتِ اسلام میں دلچسپی:

اپنے ملک واپس پہنچ کر برکہ خان نے ایک مدت خاموشی کے ساتھ دین کی تبلیغ جاری رکھی۔ اس کی بیوی ججک خاتون نے بھی اسلام قبول کر لیا اور ایک خیمے کو مسجد کے طور پر اس نے مستورات میں دعوتِ اسلام کا مرکز بنا لیا۔[2]

برکہ خان نے عباسی خلیفہ مستعصم سے بھی روابط قائم کر لیے اور دو مرتبہ خلیفہ کی طرف سے اسے خلعتِ تکریم بھیجی گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے ہم خیال امراء کی تعداد بڑھتی گئی۔ قاضی منہاج السراج کے مطابق باتو خان کے دورِ حکومت میں برکہ خان کا لشکر تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا جس میں نماز باجماعت ادا کی جاتی تھی۔[3]

برکہ اور سرتاق کی کش مکش:

مگر برکہ بہت احتیاط سے کام کر رہا تھا اور اسے اس کی ضرورت بھی تھی، اس لیے کہ تاتاریوں کا حکمران طبقہ اس کے اسلام لانے پر خوش نہیں تھا۔ اس کے بڑے بھائی باتو خان کا بیٹا سرتاق نہ صرف عیسائیوں کا گہرا دوست تھا بلکہ عیسائیت میں دلچسپی بھی لے رہا تھا اور یورپ کے حکمران اس کی جانشینی کے متوقع اعلان کو کلیسا کی فتح کا پیش خیمہ سمجھ کر اس کی بادشاہت کے منتظر تھے، مگر یہاں تاریخ نے ایک عجیب انداز میں کروٹ لی۔ ۶۵۰ھ میں ۴۸ سالہ باتو خان اپنے کسی جانشین کا اعلان کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا۔[4]

اس کا بیٹا سرتاق جو کہ نسطوری عیسائی مذہب اپنا چکا تھا، ان دنوں منگو خان کے ہاں قراقرم میں تھا۔ منگو خان نے اسی کو باتو خان کا جانشین مقرر کر دیا۔ اس صورتحال سے دنیائے نصرانیت کو بے حد مسرت ہوئی یہاں تک کہ شاہِ فرانس نے اپنا ایک خصوصی نمائندہ ولیم آف روبروک سرتاق کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اسے دینِ مسیحی پر پختہ کرے اور اس کی

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳۶۶/۲۳، ط الرسالۃ ② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۴۸۶/۱، ط العلمیۃ

③ طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۲۱۴/۲، ط کابل

④ باتو خان کے معاصر مؤرخ قاضی منہاج السراج لکھتے ہیں:

''بعض ثقہ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ باتو خفیہ طور پر مسلمان ہو گیا تھا مگر وہ اسے ظاہر نہیں کرتا تھا اگرچہ وہ پوری طرح مسلمانوں جیسے عقائد رکھتا تھا۔'' (طبقات ناصری: ۱۷۶/۲، ط کابل)

ہو سکتا ہے اس نے سرتاق کی نصرانیت نوازی دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر اس کی جانشینی کا اعلان نہ کیا ہو تاکہ برکہ خان کو آگے بڑھنے کا موقع مل سکے۔

سلطنت میں مسیحیوں کی عبادت گاہیں کھلوائے۔ سرتاق کو اب اپنے دارالحکومت پہنچ کر تخت پر بیٹھنے کی جلدی تھی۔ اس نے ہزاروں میل طویل مسافت کا یہ سفر تیزی سے شروع کیا اور آخر اپنی مملکت میں پہنچ گیا۔ [1]

برکہ خان کی دعا جو قبول ہوئی:

مگر سرتاق اپنے چچا برکہ خان سے ملنے سے کترایا اور اپنی لشکر گاہ کو دوسری سمت لے جانے لگا۔ برکہ خان نے اسے پیغام بھیجا: ''میں تمہارے باپ کی جگہ پر ہوں۔ تم کیوں بیگانوں کی طرح برتاؤ کر رہے ہو؟ کیوں پاس نہیں آتے؟''

سرتاق نے جواب بھجوایا: ''تم مسلمان ہو اور میں نصرانی۔ میں کسی مسلمان کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔''

سرتاق کا یہ رویہ اردوئے زرّیں کی دو حصوں میں تقسیم پر منتج ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ جلد یا بدیر ایک بڑی جنگ کی شکل میں نکلتا۔ مغلوں کی اکثریت ابھی تک کسی واضح دین کی پابند نہ تھی، اس لیے ان میں اسلام کی اشاعت کے امکانات بہت قوی تھے، خصوصاً اُردوئے زرّیں اس کے لیے بہت زرخیز تھا مگر اس دوران خود اس کے مابین خانہ جنگی ہونا اشاعتِ اسلام کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ اس پسِ منظر میں برکہ خان کی بے چینی واضح تھی جو سرتاق سے لڑے بغیر اس علاقے میں اسلام کی راہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔ اس فکر مندی اور تشویش کے عالم میں اسے بارگاہِ الٰہی میں استغاثے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس نے حکم دیا کہ لشکر گاہ میں اس کے قریب کوئی دکھائی نہ دے۔

پوری رات اس نے تنہائی میں اللہ کے حضور نہایت گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہوئے گزاری۔ وہ دعا میں کہہ رہا تھا:

''یا اللہ! اگر دینِ محمدی اور شریعتِ اسلام برحق ہے تو سرتاق کے معاملے میں تو ہی انصاف فرما دے۔''

تین راتیں اس نے اسی طرح دعائیں کرتے ہوئے گزاریں۔ چوتھے روز سرتاق دردِ شکم میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ [2] اپنے باپ کے بعد وہ فقط ڈیڑھ سال زندہ رہ سکا۔ [3]

برکہ خان کے خلاف ایک اور سازش:

منگو خان کسی طرح اس عظیم سلطنت کو نو مسلم برکہ خان کے ہاتھ میں جاتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے سرتاق خان کی ہلاکت سے مطلع ہوتے ہی باتو خان کے ایک پوتے اولاغچی کو پروانہ حکومت لکھ بھیجا مگر اب مشیت کا غیبی شکنجہ مسلمانوں کی مدد کے لیے حرکت میں آ چکا تھا۔ برکہ خان کی راہ میں حائل تمام دشمن یکے بعد دیگرے ہٹتے چلے گئے اور کچھ مدت بعد اولاغچی بھی وفات پا گیا۔ [4]

باتو خان کے بھتیجے طغائی کی بیوی براق شین چاہتی تھی کہ وہ اپنے لڑکے ''تُدان منگو'' کو تخت پر بٹھا دے مگر مغل امراء نے اس کی رائے مسترد کر دی۔ براق شین نے ناراض ہو کر ہلاکو خان کو ایک خفیہ مراسلہ بھیجا جس میں اسے کہا گیا تھا کہ

---

① تاریخ فتوحات مغول از جے جے سانڈرز (فارسی ترجمہ از ابوالقاسم خالت): ص ۱۵۲، ط مؤسسہ انتشارات امیر کبیر تہران: ۱۳۶۳ھ

② طبقاتِ ناصری از منهاج السراج جوزجانی: ۲/ ۲۱۷، ۲۱۸

③ عقدالجمان للعینی: سنة ۶۵۲ھ

④ جامع التواریخ (فارسی) از رشید الدین فضل اللہ: ۲/ ۱۳۸، لیدن

وہ فوراً چڑھائی کرے تو یہ مملکت کسی روک ٹوک کے بغیر اسے مل جائے گی۔ خوش قسمتی سے یہ سازش طشت از بام ہوگئی۔ مغل امراء نے براق شین کو پکڑ لیا اور پانی میں غرق کر دیا۔ برکہ خان کے سوا اب شمال کی اس سلطنت کا کوئی دعویدار نہ تھا۔ چنانچہ ۶۵۲ھ میں برکہ خان نے اپنے باپ کا تاج وتخت سنبھال لیا۔[1]

برکہ خان کی بادشاہت: (۶۵۲ھ تا ۶۶۵ھ)

برکہ خان نے جلد ہی اپنی حکومت کو مضبوط کر لیا۔ اگر اسے خطرہ تھا تو فقط خاقانِ اعظم منگو خان سے، مگر محرم ۶۵۵ھ میں منگو خان حد سے زیادہ شراب نوشی کے باعث مر گیا[2] جس کے فوراً بعد منگولیا میں مرکزی قیادت کے دعویدار تاتاری شہزادوں میں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوگیا جو سالہا سال جاری رہا۔[3] اس ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر برکہ خان کو اپنے قدم اچھی طرح جمانے کا موقع مل گیا۔

یورپی مؤرخین الزام لگاتے ہیں کہ سرتاق اور اس کے بعد منتخب ہونے والے حکمران کی ہلاکت برکہ خان کی سازش کا کرشمہ ہے، مگر یہ غلط ہے۔ اس بارے میں مستند روایت برکہ خان کے معاصر مؤرخ قاضی منہاج السراج جوزجانی رحمہ اللہ کی ہے جس کے مطابق برکہ خان نے بارگاہِ الٰہی میں اس قضیے کو حل کرنے کی استدعا کی تھی جس کے بعد سرتاق اچانک وفات پا گیا۔ بہرصورت برکہ خان کی حکومت مسلمانوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی جس نے ایک طرف مسلمانوں کے نیم جان وجود کو سہارا دیا اور دوسری طرف عیسائیت کی جانب جاتے ہوئے تاتاریوں کو اسلام کے راستے پر ڈال دیا۔[4]

برکہ خان اور خدمتِ اسلام:

برکہ خان نے اسلامی شعائر کو رائج کیا اور علماء، قراء، حفاظ اور ائمہ کو اپنے ملک میں بلا کر اسلام کی دعوت کو عام کیا۔ اس کے معاصر مؤرخ قاضی منہاج السراج رحمہ اللہ اس کی بادشاہت میں اسلامی شعائر کا حال یوں لکھتے ہیں:

”برکہ خان کے لشکر کا طریقہ یہ ہے کہ ہر گھڑ سوار کے پاس ایک جائے نماز ہوتی ہے۔ جب بھی نماز کا وقت آتا ہے تو لشکری اس کی ادائیگی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ پورے لشکر میں کوئی شرابی نہیں۔ بڑے بڑے مفسرین، محدثین، فقہاء اور مناظر برکہ خان کے پاس ہوتے ہیں۔ اس کے ہاں دینی کتب کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔ اس کی ہم نشینی اور گفتگو اکثر علماء کے ساتھ ہوتی ہے جو اس کے دربار سے وابستہ ہو کر علم شریعت کے متعلق بات چیت کرتے ہیں۔ برکہ خان انتہائی پختہ اور غیرت مند مسلمان ہے۔“[5]

یہ دینی غیرت وحمیت ہی تھی کہ جب وقت پڑا تو اس مردِ مجاہد نے اسلام کی حفاظت کے لیے اپنے ہم قوم تاتاریوں

---

① عقود الجمان فی تاریخ اھل الزمان لبدر الدین العینی: سنة ۶۵۲ھ؛ جامع التواریخ (فارسی): ۲/۱۳۷، ۱۳۸، ط لیڈن

② جامع التواریخ (فارسی): ۲/۳۳۷، ۱۳۸، ط لیڈن ③ تاریخ ابن خلدون: ۵/۵۹۸، ط دار الفکر

④ طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۲/۲۱۷، ۲۱۸

⑤ طبقاتِ ناصری: ۲/۲۱۴، ط کابل

کے خلاف جہاد سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ۶۵۸ھ میں ہلاکو خان بغداد کو تباہ کرنے کے بعد دمشق، حلب اور دوسرے اسلامی شہروں میں تباہی مچا رہا تھا۔ اس کا خلیفہ مستعصم کو قتل کرانا برکہ خان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔[1] ہلاکو خان نے برکہ خان کے بعض اقارب اور سفیروں کو بھی قتل کیا تھا۔ چنانچہ جب بغداد کو تودۂ خاک بنانے کے بعد ہلاکو نے مغل دستور کے مطابق لوٹے گئے زر و جواہر کا کچھ حصہ سلطنت کی تمام شاخوں کے فرمانرواؤں کو بھیجا اور اسی ضمن میں سفیروں کی وساطت سے کچھ تحائف برکہ خان کو بھی بھیجے تو برکہ خان نے نہ صرف تحائف کو ٹھکرا دیا بلکہ ہلاکو خان کے سفیروں کو قتل کرا دیا[2] جو ایل خانیوں کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ تھا۔ جب ۶۵۸ھ میں ہلاکو خان کو عین جالوت میں عبرتناک شکست ہوئی تو وہ اُس کا بدلہ لینے کے لیے مصر پر دوبارہ حملہ کرنے کا خواہش مند ہوا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتا، اچانک برکہ خان نے قفقاز کی سرحدیں عبور کر کے ہلاکو خان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس کے لشکر کو شکست دے دی۔

اُدھر ۶۵۹ھ میں الملک الظاہر رکن الدین بیبرس نے مصر کی حکومت سنبھال لی تھی۔ اس نے برکہ خان سے سفارتی تعلقات قائم کر کے ہلاکو کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے میں دیر نہ کی۔ یہ محاذ اس طرح قائم ہوا کہ ان دنوں دو سو تاتاری ہلاکو خان سے منحرف ہو کر شام سے ہوتے ہوئے مصر چلے آئے تھے۔ سلطان بیبرس نے ان کا خوب اعزاز اکرام کیا اور انہیں اسلام کی دعوت دی چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے۔[3] اس کے بعد سلطان نے برکہ خان کے نام دوستی، نیک تمناؤں اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف متحد ہونے کی ترغیب پر مشتمل ایک خط تحریر کیا اور اسے اپنے سفیروں کے حوالے کر کے انہیں ان نومسلم تاتاریوں کے ساتھ برکہ خان کی جانب روانہ کر دیا۔

اس دوران برکہ خان کی جانب سے بھی سلطان بیبرس کی طرف ایک وفد مصر روانہ کر دیا گیا تھا جس نے یہ پیغام پہنچایا کہ ہمیں متحد ہو کر ہلاکو خان کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ یوں دونوں سلطنتوں کے مابین سفارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ اب بڑی تعداد میں تاتاری وفود مصر آتے رہے اور اسلام قبول کر کے اپنے علاقوں کو لوٹتے رہے۔[4] اگرچہ ہلاکو خان کے خلاف مشترکہ حملے کا منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا کیوں کہ برکہ خان سے دوستی کے فوراً بعد سلطان بیبرس کو فرنگیوں کے خلاف کئی جنگیں لڑنا پڑیں اور ان مہمات کے اختتام سے قبل برکہ خان کی وفات ہو گئی۔ اُدھر ہلاکو خان بھی مر گیا، اس لیے اُردوئے زرّیں اور سلطنتِ مصر کو ہلاکو خان کے ملک پر متحدہ حملے کی زیادہ ضرورت نہ رہی۔

غیر مسلم تاتاریوں اور اہلِ یورپ سے مہمات کے نتیجے میں برکہ خان کی سلطنت اپنے باپ دادا سے کہیں زیادہ وسیع ہو گئی۔ یوکرائن، بلادِ خزر اور قبچاق کے علاوہ مشرقی یورپ، مغربی روس، شمال مشرقی ایشیائے کوچک اور ماوراء النہر میں جند، بخارا، سمرقند اور خوارزم کے علاقے بھی اس کے تصرف میں تھے۔ خراسان اور وسطِ ایشیا کے بہت سے ایسے شہروں

---

① ووقع بينه وبين ابن عمه هولاكو، وقاتله بسبب قتله للخليفة المستعصم بالله وغيره من المسلمين. (النجوم الزاهرة: سنة ٦٦٥هـ)

② طبقاتِ ناصری: ۲/۱۹۸۔ اس اختلاف کی تمام وجوہ پر گزشتہ باب میں بیبرس اور برکہ کے تعلقات کے ذیل میں مفصل روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

③ تاريخ الاسلام للذهبي سنة ٦٦٠هـ؛ السلوك لمعرفة دول الملوك: سنة ٦٦٠هـ

④ اس کی تفصیلات گزشتہ باب میں سلطان بیبرس کے حالات کے تحت گزر چکی ہیں۔

میں بھی جو اس کے قبضے میں نہیں تھے، نمازِ جمعہ کے خطبے میں اس کے لیے دعا کی جاتی تھی۔ [1]

برکہ خان کی غیرتِ دینی کا ایک واقعہ:

قاضی منہاج السراج جوزجانی رحمہ اللہ نے برکہ خان کی غیرتِ دینی کا ایک واقعہ یوں نقل کیا ہے کہ سمرقند میں ایک
عیسائی نوجوان نے اسلام قبول کرلیا جس پر مسلمان بہت خوش ہوئے اور اس کا خوب اعزاز واکرام کیا۔ کچھ دنوں بعد
سمرقند میں ایک ایسے مغل حاکم کا تقرر ہوا جو نصرانیت کی طرف مائل تھا۔ علاقے کے نصرانی اس کے پاس گئے اور کہا:
''مسلمان ہمارے بچوں کو نصرانیت سے انحراف اور دینِ محمدی کی اتباع کی تلقین کرتے ہیں۔ اگر یہ دروازہ کھل گیا
تو ہمارے اہل وعیال دینِ مسیحی سے منحرف ہو جائیں گے۔ آپ اس قضیے کو نمٹائیے۔''

مغل حاکم نے اس نومسلم نوجوان کو بلوالیا۔ پہلے نرمی، شفقت اور انعام واکرام کے لالچ کے ساتھ اسے اسلام
ترک کرنے کی ترغیب دی۔ جب وہ نہ مانا تو اس پر ہر وہ بدترین تشدد کیا جو ممکن تھا۔ مگر وہ نومسلم کلمۂ توحید پر ثابت قدم
رہا۔ آخر مغل حاکم نے عوام کے سامنے اسے سزائے موت دی اور وہ ایمان پر استقامت کی ایک مثال بن کر شہید
ہوگیا۔ سمرقند کے علماء نے یہ منظر دیکھا تو ایک نوشتے پر اس واقعے کے گواہوں کے دستخط لیے اور ایک وفد بنا کر برکہ
خان کے پاس گئے اور یہ ماجرا سنایا۔ برکہ خان حمیتِ دینی سے بے تاب ہوگیا۔ اس نے سمرقند میں ایک مسلمان مغل
حاکم کا تقرر کیا اور اس نومسلم نوجوان کے قتل میں ملوث تمام لوگوں کو قتل کرادیا۔ [2]

اسلام کے اس عظیم خادم نے ربیع الآخر ۶۶۵ھ (۱۲۶۶ء) میں وفات پائی۔ [3]

شیخ قطب الدین یونینی رحمہ اللہ برکہ خان کی سلطنت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''اس کا ملک نہایت وسیع ہے مگر ہمارے ملک سے بہت دور ہے۔ اس کے سپاہی بکثرت ہیں۔ اس کا ملک بعض وجوہ سے ہلاکو خان کے ملک سے بڑا ہے کیوں کہ اس کے شہر، سپاہی اور خزانے زیادہ ہیں۔ مگر ہلاکو خان کا لشکر مقبوضہ ممالک میں لوٹ مار کرکے تونگر ہوگیا تھا۔'' [4]

پھر آگے برکہ خان کی دین داری کا حال یوں نقل کرتے ہیں:

''برکہ خان مسلمانوں سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ علماء کی تعظیم وتوقیر کرتا تھا۔ صالح مسلمانوں سے عقیدت رکھتا تھا۔ مشائخ مسلمین سے برکت حاصل کرتا تھا اور ان کے ملفوظات اور اقوال برکہ خان کے ہاں غور سے سُنے جاتے تھے۔ علماء کا احترام اس کے ملک میں بہت زیادہ تھا۔ ہلاکو اور اس کے درمیان جنگ کی سب سے بڑی وجہ ایک تو یہ تھی کہ ہلاکو نے خلیفہ مستعصم باللہ کو قتل کیا تھا۔ دوسری یہ کہ برکہ خان الملک الظاہر بیبرس سے محبت کا تعلق رکھتا تھا اور اس کے سفیروں کی بڑی تکریم کرتا تھا۔ حجاز کے لوگ اس کے پاس جاتے تو وہ ان سے حسنِ سلوک

---

(1) طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۲/ ۲۱۸، ط کابل

(2) طبقاتِ ناصری: ۲/ ۲۱۵ تا ۲۱۷

(3) ذیل مرآۃ الزمان: ۲/ ۲۶۰؛ تاریخ الاسلام للذہبی: ۲۳/ ۳۶۶، ت تدمری

(4) ذیل مرآۃ الزمان: ۲/ ۳۶۲

کرتا اور انہیں بکثرت مال عطا کرتا اور ان کے احترام اور نیک برتاؤ میں انتہا کر دیتا تھا۔ برکہ اور اس کے لشکر کے بہت سے سپاہی اسلام قبول کر چکے تھے۔ ان کی مساجد خیموں کی بنی ہوتی تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ لاد کر سفر کرتے تھے۔ ان مساجد کے امام صاحبان اور مؤذن صاحبان مقرر تھے۔ جب بھی لشکر کسی جگہ رُکتا، وہیں یہ مساجد گاڑ دی جاتیں تھیں اور ان میں پانچوں نمازیں ادا کی جاتیں۔ [1]

وہ برکہ خان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ بہادر، سخی، محتاط، عادل اور نیک سیرت انسان تھا۔ خونریزی اور شہروں کی تباہی سے نفرت کرتا تھا۔ وہ بُردبار، رحمدل اور درگزر کرنے والا حکمران تھا۔'' [2]

اوزبک خان کا دورِ حکومت اور اِشاعتِ اسلام:

برکہ خان کے بعد نصف صدی تک اس کے جانشینوں میں کچھ مسلمان تھے اور کچھ غیر مسلم۔ مسلمانوں میں سے تدان منگو خان جو ۶۸۲ھ میں حکمران بنا، قابلِ ذکر ہے۔ [3] اس نے ۶۸۴ھ میں ہنگری اور ۶۸۶ھ میں پولینڈ اور ٹرانسلفانیا کو فتح کیا۔ بلقان، سربیا اور بلغاریہ بھی اس کے قبضے میں آ گئے۔ ان فتوحات کے بعد اس کی مملکت یوکرائن کی سطح مرتفع سے لے کر دریائے ڈینوب کے ڈیلٹا تک وسیع ہو گئی۔ [4]

۷۱۲ھ (۱۳۱۳ء) میں اسی خاندان کا شہزادہ محمد اوزبک خان بن طغرل تخت نشین ہوا تھا جس کی اولاد سے مشہور اُزبک قبیلے نے جنم لیا۔ محمد اوزبک نوجوانی میں چار ایرانی علماء: شیخ سید محمد، شیخ تولقات، شیخ احمد اور شیخ حسن قرقان کی تبلیغ سے مسلمان ہوا تھا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر اشاعتِ اسلام ہوئی کہ ایک سال کے اندر اندر کوئی تاتاری شہزادہ اسلام سے محروم نہ رہا۔ چنانچہ اوزبک خان نے ممالیکِ مصر کو ایک مراسلے میں لکھا کہ اب بلادِ قبچاق میں کوئی بُت پرست باقی نہیں رہا۔ اوزبک خان نے تیس سال حکومت کی اور اپنی سلطنت کو ایک بہترین اسلامی ملک کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوشاں رہا۔ اس کا دور خاناتِ قبچاق کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ اس نے پایۂ تخت سرائے میں ایک بڑا مدرسہ اور تیرہ جامع مساجد تعمیر کرائیں۔ مغل شہزادیوں نے بھی مساجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اس دور میں بہت سے علماء و فقہاء اور مشائخ وسطِ ایشیا، ایران اور عراق سے بلادِ قبچاق آئے جن میں شیخ زادہ خراسانی، قاضی شمس الدین سائلی حنفی، شیخ خضر شافعی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ جبکہ بے شمار مقامی نوجوانوں نے دیگر اسلامی ممالک کا سفر کر کے اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی اور اپنے وطن واپس آ کر جگہ جگہ مدارس قائم کیے۔ اسی طرح یہاں بکثرت خانقاہیں قائم ہوئیں اور تزکیہ نفس کا سلسلہ عام ہوا۔ صحرائے قبچاق میں سرائے، بُلغار، قرم، سوداق (سولدایا)، ازاق، ماجر اور حاجی طرخان جیسے شہر اسلامی علوم کے مراکز بن گئے جن سے بڑے بڑے علماء نے جنم لیا۔ [5]

① ذیل مرآۃ الزمان: ۳۶۵،۳۶۴/۲، ط دار الکتاب الاسلامی ② ذیل مرآۃ الزمان: ۳۶۵/۲ ③ عقد الجمان للعینی: سنۃ ۶۸۲ھ
④ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۱۹ ⑤ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۵۵، ۱۶۰

ایل خانیوں میں اشاعتِ اسلام

ایران، عراق، آرمینیا اور مشرقی ایشیائے کوچک پر قابض ایل خانی مغل، اسلام کے سخت دشمن تھے۔ مغلوں کی اسی شاخ نے جس کا بانی ہلاکو خان تھا، بغداد کو تہس نہس کیا۔ ایران، عراق، الجزیرہ اور شام اسی کی بے رحمی کی بھینٹ چڑھے تھے۔ ہلاکو خان نے اپنے حریفوں: ممالیکِ مصر اور اُردوئے زرّیں سے مقابلے کے لیے آرمینیا کے عیسائی حکمرانوں اور صلیبی حملہ آوروں سے اتحاد کر رکھا تھا۔ اس کی لاڈلی بیگم بھی عیسائی تھی جس نے اسے عیسائیوں کی طرف مائل کر دیا تھا۔ چنانچہ ایل خانی دربار میں عیسائیوں کا بڑا زور تھا۔ انہی وجوہ سے یہاں اشاعتِ اسلام قدرے تاخیر سے ہوئی۔

اباقا کے دور میں:

۶۶۳ھ میں ہلاکو خان کی موت پر اس کا بیٹا اباقا تخت نشین ہوا۔ اگرچہ وہ خود عیسائی نہ تھا مگر اس نے قُسطنطینیہ کی عیسائی شہزادی سے شادی کی تھی۔ اس کا دربار پادریوں سے بھرا رہتا تھا۔ اس نے یورپی بادشاہوں: سینٹ لوئیس (شاہِ فرانس)، چارلس (شاہِ سسلی) اور جیمز (شاہِ ریاست ارغون، شمالی اندلس) کے ہاں سفیر بھیج کر ان کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف اتحاد کیا تھا۔ اسی مقصد کے تحت ۶۷۲ھ (۱۲۷۴ء) میں اس نے سولہ افراد کا ایک وفد ریاست لیون (فرانس) بھیجا تھا۔ وہاں اس وفد کے سربراہ نے اپنے کئی ساتھیوں سمیت نصرانیت قبول کر لی اور اصطباغ لیا۔[1]

تکودار کے دور میں:

دنیائے نصرانیت یہ تصور کر رہی تھی کہ ایل خانیوں کے زیرِ قبضہ ایران و عراق بہت جلد نصرانی ممالک بن جائیں گے مگر مشیتِ الٰہیہ کے ایک کرشمے نے ان کی توقعات خاک میں ملا دیں کیوں کہ حیرت انگیز طور پر اس دوران اسلامی تعلیمات کی مسحور کن مہک نے ہلاکو کے دوسرے بیٹے "تکودار" کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا جس کی ولادت ۶۵۱ھ میں ہوئی تھی اور اپنے والد ہلاکو خان کی وفات کے وقت وہ تیرہ سال کا تھا۔[2] مغربی مؤرخین حیرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ "تکودار" عیسائیت کی گود میں پروان چڑھا تھا، ہلاکو خان کے مقرب پادریوں نے اسے بچپن ہی میں بپتسمہ دیا تھا اور اس کا نام "نکولس" تجویز کیا تھا، مگر بعد میں اس کا رجحان اسلام کی جانب ہونے لگا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔[3]

---

① THE PREACHING OF ISLAM:175,176: دعوتِ اسلام، ص ۲۲۹

② انتشار الاسلام بین المغول لدکتور رجب محمد عبد الحلیم، ص ۱۷۹، ط دار النھضۃ العربیۃ قاھرہ، ۱۹۸۶ء

③ THE PREACHING OF ISLAM:175,176: دعوتِ اسلام، ص ۲۳۰

اسے مشرف بہ اسلام کرنے والا ایک عام آدمی عبدالرحمٰن الرافعی تھا جو ایک رومی غلام کا بیٹا تھا اور خلیفہ مستعصم باللہ کے ہاں قالین بچھانے اور خیمے لگانے کی ذمہ داری انجام دیتا تھا۔ بظاہر وہ ایک معمولی آدمی تھا مگر جب اس نے اسلام کی دعوت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو اللہ نے ایک قوم کا رُخ بدلنے میں اس سے بڑا کام لیا۔

عبدالرحمٰن الرافعی کو سقوطِ بغداد کے وقت قیدی بنالیا گیا تھا۔ بعد میں تاتاریوں نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ وہ بڑا ہوشیار شخص تھا اور مختلف طریقوں سے تاتاریوں پر اپنی دھاک بٹھاتا رہتا تھا۔ تاتاریوں میں اس کے زہد و عبادت کی بھی شہرت تھی۔ وہ اسے ''شیخ'' کہہ کر بلاتے تھے حالانکہ وہ نہ کوئی عالم تھا نہ صوفی۔

جب ہلاکو خان کا بیٹا اباقا بادشاہ بنا تو اس نے عبدالرحمٰن کا رُتبہ مزید بڑھا دیا۔ اسی دور میں عبدالرحمٰن کو شہزادہ تکودار کے حلقے سے وابستگی کا موقع ملا۔ عبدالرحمٰن گاہے گاہے اسے اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کرنے لگا جس کے نتیجے میں آخر ایک دن تکودار نے اسلام قبول کرلیا۔ [1]

اباقا خان سترہ سال حکومت کرکے ۶۸۰ھ میں دنیا سے رخصت ہوا تو تیس سالہ شہزادہ تکودار ہی ایران اور عراق کی اس عظیم سلطنت کا وارث تھا۔ تکودار نے اسلام کا اعلان کردیا اور اپنا اسلامی نام احمد خان رکھا۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

''اس نے حتی المقدور اس بات کی کوشش کی کہ تمام عیسائی دینِ محمدی قبول کرلیں۔ جب انہوں نے سرکشی اختیار کی اور اسے بھی انہیں مجبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی تو اس نے ان کا اعزاز بڑھا کر اور ان کو انعام و اکرام اور تحفے تحائف دے کر ان کا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کے عہد میں بہت سے عیسائیوں نے مسلمانوں کا دین اختیار کرلیا۔'' [2]

سلطان احمد خان کا اہلِ بغداد کے نام مکتوب:

تکودار احمد خان نے تختِ نشینی کے فوراً بعد اہلِ بغداد کے نام درجِ ذیل تاریخی مکتوب ارسال کیا:

''ہم تختِ بادشاہ پر براجمان ہوچکے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، پس اہلِ بغداد کو یہ بشارت پہنچے۔ مدارس، اوقاف اور تمام خیرات کے کاموں کو عباسی خلفاء کے دور کے مطابق جاری کیا جارہا ہے۔ مساجد و مدارس کے ہر مستحق کو اس کا حق پہنچے گا۔ لوگ اسلامی قوانین سے باہر نہیں نکلیں گے۔

بغداد والو! تم مسلمان ہو اور ہم نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سنا ہے کہ یہ جماعتِ مسلمین ہمیشہ تا قیامت غالب اور فتح مند رہے گی۔ ہم نے جان لیا کہ یہ خبر صحیح ہے اور رسول اللہ ﷺ سچے ہیں۔ اللہ ایک ہے، واحد ہے، یکتا ہے، بے نیاز ہے۔ پس آپ لوگ مطمئن رہیں اور یہ باتیں دیگر شہروں کو بھی لکھ بھیجئے۔'' [3]

---

(1) الحوادث الجامعة والتجارب النافعة لابن الفوطی، ص ۲۹۸، ۲۹۹

(2) THE PREACHING OF ISLAM176؛ دعوت اسلام، ص ۲۳۰

(3) نهاية الارب للنويري: ۲۷/۳۰۲، ط دار الكتب

سلطان احمد خان کے کارنامے

سلطان احمد خان نے عبدالرحمٰن رافعی کو وزیرِ اوقاف مقرر کر دیا۔ اس سے قبل محکمہ اوقاف کی جانب سے یہودی اور نصرانی طبیبوں اور نجومیوں کے وظائف پر ایک خطیر رقم خرچ کی جاتی تھی۔ اب یہ وظائف بند کر کے ان کے بقدر رقم عازمینِ حج کو زیادہ سے زیادہ سہولیات بہم پہنچانے میں خرچ کی جانے لگی۔ عطا ملک جوینی (مؤلف تاریخِ جہان کشا) کو جو مغلوں کے ہاں قید تھا، رہا کر کے بغداد کا منتظم بنا دیا گیا۔ ①

تکودار احمد خان دن کا ایک خاص وقت علماء و مشائخ کی صحبت میں گزارتا تھا اور ان کے علمی دروس سنتا تھا۔ اس کے حکم سے بہت سی مساجد اور مدارس کی تعمیر شروع ہوئی۔ اسلامی احکام کے نفاذ کے لیے قاضی مقرر کیے گئے۔ اس نے مغلوں میں اسلام کی ترویج کے لیے مغل شہزادیوں کے نکاح مسلمان امراء سے کرائے۔ ②

پہلے تاتاری اپنے ہاں آنے جانے والے قافلوں کی کڑی نگرانی کرتے تھے اور جاسوسی کے ذرا سے شک پر مسافروں اور تاجروں کو مار ڈالتے تھے، اس لیے عرب تاجر ایل خانی سلطنت کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ احمد خان نے ان تمام مظالم کو ختم کر دیا اور شک کی بناء پر قتل کی ممانعت کر دی۔ تاجروں کو مراعات دیں اور قافلوں کو مکمل آزادی دے دی۔ جس کی وجہ سے کچھ ہی مدت میں مشرق کی تجارت چمک اٹھی۔ ③

مستشرقین کا احمد خان کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا:

مستشرقین یہ تاثر دیتے ہیں کہ تکودار نے جبراً اپنی قوم کو مسلمان بنانے کی کوشش کی اور اسلام قبول نہ کرنے والوں پر مظالم ڈھائے۔ وہ اس بارے میں کتبِ تواریخ کا ایک حوالہ پیش کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ اس کے حکم سے بُت خانے اور گرجے مسمار کر دیے گئے تھے اور ان کی جگہ مساجد آباد کی گئی تھیں۔ ④

چنانچہ ایسے حوالے دے کر مستشرقین نہ صرف اس نومسلم بادشاہ بلکہ مذہبِ اسلام پر بھی اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہاں ایسے بُت خانوں اور گرجوں کے انہدام کا ذکر ہے، جو بُت پرستوں اور نصرانیوں نے غیر مسلم تاتاریوں کی پشت پناہی کی بناء پر مساجد کو منہدم کر کے قائم کر لیے تھے۔ ⑤

یہی وجہ ہے کہ تاریخی مآخذ ایل خانی سلطنت میں قائم غیر مسلموں کی مشہور عبادت گاہوں کے انہدام کے ذکر سے خالی ہیں۔ احمد خان سے پہلے اور بعد میں یہ عبادت گاہیں اسی طرح قائم دکھائی دیتی ہیں۔ اگر احمد خان نے غیر مسلموں

---

① تاریخ حبیب السیر: ۱۱۹،۱۱۸/۳ ② انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۸۱

③ ان امور کا ثبوت اس خط سے ملتا ہے جو سلطان احمد نے سلطانِ مصر کو لکھا تھا جس کی ایک عبارت یہ ہے: وحرّمنا على العساكر والشحاني في الأطراف التعرّض لهم في مصادرهم ومواردهم وقد كان صادف قراغولنا جاسوسا في زيّ الفقراء كان سبيل مثله ان يهلك فلم نر اهراق دمه صيانة لحرمة ما حرّمه الله تعالى وانفذناه إليهم ولا يخفى عليهم ما كان في إنفاذ الجواسيس من الضرر العام للمسلمين فان عساكرنا طالما رأوهم في زيّ الفقراء والنسّاك واهل الصلاح فساءت ظنونهم في تلك الطوائف فقتلوا منهم من قتلوا وفعلوا بهم ما فعلوا ورفعت الحاجة بحمد الله تعالى الى ذلك بما صدر اذننا به من فتح الطريق وتردّد التجّار وغيرهم. (تاریخ مختصر الدول لابن العبری، ص ۲۹۱)

④ تاریخ حبیب السیر: ۱۱۹/۳ ⑤ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۸۱،۱۸۰

کی عبادت گاہیں مسمار کر کے مساجد تعمیر کرائی ہوتیں تو یہ مشہور کر دیا جاتا کہ سب سے پہلے اس کی زد میں آتے۔ جب ایسا نہ ہوا تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ بت خانوں اور گرجوں میں تبدیل کی گئی قدیم مساجد ہی کو بحال کیا گیا تھا۔

احمد خان کا معاصر نصرانی مؤرخ ابن العبری (م ۶۸۵ھ) اس کے رعایا پرور ہونے کی گواہی یوں دیتا ہے:

''وہ میانہ روی کے ساتھ خرچ کرنے، رواداری برتنے اور کرم نوازی کے اوصاف سے آراستہ تھا۔ اس نے خزانوں سے بہت کچھ نکالا اور اسے اپنے شہزادوں، امراء اور لشکروں پر خرچ کیا۔ اس نے مغلوں اور تمام قوموں کے ساتھ احسان اور شفقت کا معاملہ کیا، خاص طور پر نصرانیوں کے پیشواؤں کے ساتھ۔''[1]

اس گواہی سے مستشرقین کے دونوں اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں۔ واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ احمد خان نے مغلوں پر ظلم وستم کر کے انہیں جبراً مسلمان بنایا نہ نصرانیوں پر زیادتیاں کیں۔ بلکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کے طرزِ عمل سے غیر مسلم اسلام کے قریب آئے۔ اگر وہ ظالم اور ستم گر ہوتا تو اسلام کبھی نہ پھیلنے پاتا بلکہ تاتاری دن بدن اسلام سے دور ہوتے چلے جاتے۔ ہر دور میں اسلامی جہاد ظلم وستم کے قلعوں کو زمین بوس کرتا رہا ہے، جبکہ دلوں کو فتح کرنے کا کام اسلامی اخلاق نے کیا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

سلطان مصر کے نام تکودار احمد خان کا مراسلہ:

احمد خان نے سلطنتِ مصر سے دوستانہ تعلقات کی نیو ڈالی اور جمادی الاولیٰ ۶۸۱ھ میں سلطانِ مصر سیف الدین قلاوون کے نام اپنے تاریخی خط میں لکھا:[2]

''اللہ نے اپنی ہدایت کی روشنی سے ہمیں عنفوانِ شباب ہی میں اپنی وحدانیت کے اقرار اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی کی توفیق بخشی تھی۔[3] اللہ جسے چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ پس ہم ہمیشہ دین کی سربلندی اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی طرف مائل رہے۔ پس اللہ نے ہمارے والد اور بڑے بھائی کے بعد ہمیں بادشاہت سونپی۔ اسلام ان تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں۔ اب خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق کی اور اہل حق کی پیروی کریں...... ہم نے خدا کی عنایت سے دین کے نشانوں کو بلند کیا ہے اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے اور شرع محمدی کے قوانین کو ان کی

---

[1] تاریخ مختصر الدول، ص ۲۸۹، ط دار الشرق بیروت [2] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۸۱

[3] یہاں مراسلے کے الفاظ یہ ہیں: "قد کان ارشدنا فی عنفوان الصبیٰ و ریعان الحداثة الی الاقرار بربوبیته والاعتراف بوحدانیته و الشهادة لمحمد علیه افضل الصلوٰة بصدق نبوته." آرنلڈ نے "عنفوان الصبیٰ و ریعان الحداثة" کا ترجمہ "early youth and vigour" سے کیا ہے۔ (THE PREACHING OF ISLAM176: دعوتِ اسلام، ص ۲۳۰) جس کا ترجمہ بعض مترجمین نے "بچپن" اور بعض نے "جوانی" سے کیا ہے۔ آرنلڈ کا ترجمہ اپنی جگہ درست ہے جبکہ اردو ترجمہ نہ تو "بچپن" درست ہے نہ ہی "جوانی"، بلکہ صحیح ترجمہ "عنفوانِ شباب" ہونا چاہیے۔ یہ مدت بارہ سے اٹھارہ سال تک مانی جاتی ہے جسے "ٹین ایج" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس تکودار کا قبول اسلام اسی زمانے میں ہوا تھا۔ اپنے باپ ہلاکو خان کی موت کے وقت تکودار تیرہ برس کا تھا۔ اس کے بعد عبدالرحمان رافعی نے اس کے حلقے میں شامل ہو کر اسے اسلام لانے پر آمادہ کیا تھا۔

عظمت اور بزرگی کے لحاظ سے عین مقتضائے انصاف پر جاری کیا ہے۔ ہم نے تمام رعایا کے دلوں کو خوش کیا ہے اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی، ان سب کو یہ کہہ کر معاف کر دیا ہے کہ خدا بھی تمہاری اگلی خطاؤں کو معاف کرے۔ ہم نے مسلمانوں کے اوقاف کی جن میں مساجد، مقبرے اور مدارس شامل ہیں، اصلاح کی ہے اور تمام خیرات خانوں اور مسافر خانوں کو جن کے نشانات مٹ گئے تھے، دوبارہ آباد کیا ہے اور اوقاف کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور اور وقف کرنے والوں کی شرائط کے مطابق حقداروں تک پہنچا دیا ہے۔ ہم نے حکم دیا ہے کہ ہمارے حکام حاجیوں کے معاملہ کو مہتم بالشان سمجھیں اور ان کے لیے سامان سفر مہیا کریں اور جن راستوں سے وہ سفر کرتے ہیں، ان کو آباد و بے خطرہ رکھیں، حاجیوں کے قافلوں کو مکمل سہولیات کے ساتھ روانہ کریں۔ ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمد و رفت رکھتے ہیں، پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنے طریقہ سے جس طرح چاہیں سفر کریں اور فوج اور کمانڈروں اور افسران کو جو ملک کے اطراف میں مقرر ہیں، سخت ممانعت کی ہے کہ وہ سوداگروں کی آمد و رفت میں کسی طرح کی مزاحمت نہ کریں تاکہ شہر اور ملک آباد ہوں، فتنے اور فساد ختم ہوں، نیز تلواریں میان میں رہیں اور تمام باشندے آرام و آسائش سے زندگی بسر کریں اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے نکل جائیں۔ ①

سلطان احمد خان کے خلاف بغاوت:

اس وقت تک تاتاریوں کی اکثریت مسلمان نہیں ہوئی لہٰذا نومسلم تاتاری شہزادے احمد خان تکودار کو غیر مسلم تاتاریوں کی مخالفتوں، سازشوں، بغاوتوں بلکہ مسلح جنگوں سے بھی پالا پڑا۔ اس کے بھتیجے ارغون خان نے خاقان اعظم قوبلائی خان کو شکایت بھیجی کہ تکودار اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہوگیا ہے۔ چنانچہ قبلائی خان کی شہ پر ۶۸۳ھ میں ارغون خان تکودار کے خلاف بغاوت برپا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں احمد خان کو شہید کر دیا گیا اور ارغون نے خود حکومت سنبھال لی۔ ②

ارغون خان کی بادشاہت:

ارغون خان مسلمانوں کا مخالف تھا۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف شاہانِ یورپ سے اتحاد کی بڑی کوششیں کیں۔ اس نے ''بوسکیرل'' نامی ایک جنیوی باشندے کو اپنا مکتوب دے کر پوپ کے پاس بھیجا جس میں کہا گیا تھا:

''میں عن قریب فلسطین پر فوج کشی کرنے والا ہوں۔ میرا ایک بیٹا عیسائی ہے۔''

اس مکتوب میں درخواست کی گئی تھی کہ شاہانِ یورپ اس کی مدد کے لیے شام پر حملہ کریں۔ کچھ مدت بعد اس نے چاگان نامی ایک منگول سردار کو جو عیسائیت قبول کر چکا تھا، اسی درخواست پر مشتمل دوسرا تاکیدی مکتوب دے کر پوپ

① تاریخ وصاف از عبداللہ بن فضل اللہ وصاف (۶۶۳ھ تا ۷۳۰ھ)، ص ۱۱۰۔ ط اصفہان

② تاریخ ابن خلدون: ۵/ ۶۱۲، ط دار الفکر؛ تاریخ حبیب السیر: ۳ص ۱۲۱ تا ۱۲۵؛ تاریخ وصاف: ۱/ ۱۳۵ تا ۱۳۷؛ THE PREACHING OF ISLAM178: دعوتِ اسلام، ص ۲۳۲، ط حکومت پنجاب

کے پاس بھیجا۔ جواب میں پوپ نکولس نے ارغون خان کو بپتسمہ لینے کی ہدایت کی۔ بہر صورت یورپ میں کوئی صلیبی فوج تیار نہ ہو سکی۔ (۱) اس دور میں بدھ، شامانی، یہودی اور نصرانی اُمورِ سلطنت پر چھا گئے۔ مسلمانوں کو ہر طرح دبایا گیا۔ سات سال تک یہ سلسلہ جاری رہا مگر اسلام کی پیش قدمی نہ رکی۔ (۲)

یہودی وزیر سعد الدولہ کی اسلام دشمنی:

ارغون خان نے ایک یہودی سعد الدولہ کو سلطنت کا نائب بنا دیا جس نے بغداد کی حکومت اپنے ایک بھائی کو اور شمالی ایران کی حکومت اپنے دوسرے بھائی کو بخش دی۔ فارس پر بھی اپنے ایک رشتہ دار کو گورنر مقرر کر دیا۔ اس کا غرور اتنا بڑھ گیا کہ بعض اوقات وہ درباری آداب کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا تھا۔ ایک بار وہ ارغون خان کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے پاؤں پھیلا کر بیٹھا تھا۔ کسی مغل امیر نے اعتراض کیا تو اس نے گھٹنوں میں تکلیف کا بہانہ کر دیا۔ (۳)

ابتداء میں سعد الدولہ نے مسلمان امراء و فضلاء کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا۔ (۴) وہ مسلمانوں کو دھوکے میں رکھ کر ان کی جڑیں کاٹنا چاہتا تھا۔ اس کی داد و دہش سے متاثر ہو کر بہت سے عرب اور فارسی شعراء نے اس کی شان میں قصیدے بھی کہہ ڈالے۔ آخر سعد الدولہ نے اندازہ لگایا کہ اب اسلام کو مٹانے کا مناسب وقت آ چکا ہے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کا قافیہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ (۵) وہ اسلام اور جناب رسول اللہ ﷺ پر طعنہ زنی بھی کرنے لگا۔ پھر وہ دن آیا جب سعد الدولہ نے ارغون خان کی خوشامد کرتے ہوئے کہا:

> ''منصب نبوت چنگیز خان کی وراثت سے آپ ہی کو نصیب ہوا ہے۔ عربوں کے پیغمبر نے لوگوں کو گردن پر تلوار رکھ کر جبراً مسلمان کیا تھا۔ (نعوذ باللہ) اب اگر آپ ہمت کریں اور اجازت مرحمت فرمائیں تو ایک نئے دین کی ترویج ہونی چاہیے جس کے ذریعے قدیم مذہبی اقدار کی بیخ کنی ہو سکے گی۔''

ارغون خان جو پہلے ہی مسلمانوں کا دشمن تھا، اس پر رضامند ہو گیا۔ اس کے حکم سے بہت سے مسلمان قتل کیے گئے۔ اس نے عدالت اور محکمۂ مال کے تمام عہدوں سے مسلمانوں کو برطرف کر دیا اور ان کی دربار میں آمد پر بھی پابندی لگا دی۔ (۶) اب سعد الدولہ نے ایک اور قدم اٹھایا اور خفیہ طور پر ارغون خان کو اس پر بھی آمادہ کر لیا کہ خانہ کعبہ کو قدیم زمانے کے طرز پر دوبارہ بُت کدہ بنا دیا جائے (العیاذ باللہ) اور تمام سلطنت میں بدھ مت کو رائج کر دیا جائے۔ (۷)

---

(۱) The Crusades by Harold Lamb:p:362 --- نیز گزشتہ باب میں سلطان قلاوون کے حالات کے تحت یہ قصہ دیکھیے۔ ہیرلڈ لیمب نے "March of The Barbarians" میں اس پر مزید روشنی ڈالی ہے۔

(۲) انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۸۵

(۳) تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۱۳۱/۳

(۴) تاریخ حبیب السیر: ۱۳۱/۳۔

(۵) تاریخ الدولۃ المغولیۃ فی ایران لدکتور عبدالعزیز عبدالسلام فہمی، ص ۱۷۹، ط دار المعارف، مصر

(۶) تاریخ حبیب السیر: ۱۳۱/۳، ۱۳۲؛ THE PREACHING OF ISLAM174؛ دعوت اسلام، ص ۲۲۷

(۷) تاریخ حبیب السیر: ۱۳۱/۳، ۱۳۲

سعد الدولہ یہودی کا قتل اور ارغون خان کی وفات:

چنانچہ اس بارے میں جزیرۃ العرب کے اطراف میں آباد یہودیوں کو خفیہ مراسلے بھی لکھ دیے گئے اور کفار ایک طاغوتی انقلاب لانے کی تیاری کرنے لگے۔ مگر دوسری طرف اسلام جس تیزی سے تاتاریوں کو اپنا ہمنوا بنارہا تھا، کفار کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ درحقیقت سعد الدولہ کو اندازہ نہ تھا کہ خود مغلوں میں اسلام کے ہمدرد کس قدر طاقت پکڑ چکے ہیں۔ تاتاری امراء سے سعد الدولہ کی سازش چھپی نہ رہ سکی۔ انہیں ویسے بھی ایک یہودی کا اس قدر با اختیار ہونا گوارا نہ تھا۔ ان میں سے مسلمان امراء دینی حمیت کے باعث سعد الدولہ کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ یہ سب سعد الدولہ کے خلاف اقدام کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔ جب ارغون خان سخت بیمار ہوا تو مخالف امراء نے موقع پا کر سعد الدولہ اور اس کے معاونین کو گرفتار کر لیا اور کچھ دن بعد سعد الدولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بستر مرگ پر پڑے ہوئے ارغون خان کو جب سعد الدولہ کی موت کا علم ہوا تو اس کی حالت مزید بگڑ گئی اور ۷ ربیع الاول ۶۹۰ھ کو وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔[1]

کیخاتو کی حکمرانی اور انجام:

اس کے بعد ہلاکو خان کا ایک پوتا کیخاتو بن اباقا تخت نشین ہوا۔ وہ عیاش اور بد فطرت انسان تھا۔ بکثرت مے نوشی کرتا تھا اور عوام و خواص کی لڑکیوں اور لڑکوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا تھا۔[2] اس نے پوری کوشش کی کہ مغل سلطنت میں اسلام کی اشاعت یکسر بند ہو جائے۔ سرکاری حکم جاری ہوا کہ کوئی شخص مغلوں میں اسلام کی تبلیغ نہ کرنے پائے۔[3]

آخر خود مغل امراء اس سے تنگ آ گئے۔ اور ہلاکو خان کے ایک اور پوتے بایدو خان بن ترغائی نے صفر ۶۹۴ھ میں بغاوت کر دی۔ اس نے جمادی الآخرہ میں اس ظالم بادشاہ کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔[4]

غیر مسلم مغل حکمران اور اسلام:

اسلام کے داعی اور اسلام کے گرویدہ نو مسلم تاتاری اس مشکل زمانے میں نہ صرف ثابت قدم رہے بلکہ برابر قدم بڑھاتے رہے اور حق کے متلاشی کشاں کشاں اسلام کی آغوش میں آتے رہے۔ ارغون، کیخاتو اور بایدو نے ۶۸۳ھ سے ۶۹۴ھ تک حکومت کی۔ ان گیارہ سالوں میں حکومت کرنے والے تینوں ایل خانی حکمران غیر مسلم تھے جنہیں اسلام سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دنیائے نصرانیت بڑی اُمید کر رہی تھی کہ ایل خانی نصرانی ہو جائیں گے مگر یہ غیر مسلم مغل کوشش کے باوجود اسلام کو نہ مٹا سکے۔ ارغون خان نے ہر کوشش کر ڈالی مگر کچھ نہ ہو سکا۔ مغلوں میں اسلام اس قدر جڑیں پکڑ چکا تھا کہ اس کے خلاف ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔[5] بلکہ بعض اوقات ان غیر مسلم مغل حکام کو

---

① تاریخ حبیب السیر: ۳/ ۱۳۱ تا ۱۳۳ ؛ تاریخ وصاف: ۲/ ۲۴۲ تا ۲۴۵؛ تاریخ ابن خلدون: ۵/ ۶۱۷، ط دار الفکر

② تاریخ حبیب السیر: ۳/ ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۸، ۱۳۹؛ تاریخ ابن الوردی: ۲/ ۲۳۲، ط العلمیة

③ THE PREACHING OF ISLAM 178 دعوتِ اسلام، ص ۲۲۳

④ تاریخ حبیب السیر: ۳/ ۱۳۸، ۱۳۹ ⑤ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۸۶، ۱۸۷

بادل نخواستہ مسلمانوں کی دلجوئی کرنا پڑتی تھی جیسا کہ ۶۸۹ھ کی عید الفطر کے موقع پر جب تبریز کے علماء وفقہاء نے عید گاہ میں بہت بڑا اجتماع منعقد کیا تو ارغون خان نے انہیں خلعتوں سے نوازا۔[1] ارغون کی بیویوں میں ایک خاتون مسلمان تھی جو سلاجقۂ روم کے خاندان کی شہزادی تھی[2] جس کے باعث اس کے کنبے میں اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی اور ارغون کے ایک نواسے نے اسلام قبول کرلیا جو امیر حسین کے نام سے مشہور ہوا۔[3]

کیخاتو بھی مغل شہزادوں اور امراء میں اسلام کو پھیلتا دیکھ کر ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کی جسارت نہ کرسکا۔ اس کے دربار میں مسلمان مغل امراء اور علماء بھی موجود رہے۔ مسلمان مغلوں میں سے ایک مشہور سردار حسن بن بوقو کیخاتو کے بچپن کا ساتھی تھا۔[4] کیخاتو نے علماء اور ہاشمی شرفاء کو ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا تھا۔[5] اس کی دو بیویاں مسلمان تھیں: ایک کا نام عائشہ تھا جبکہ دوسری کرمان کے مسلمان حکمران قطب الدین کی بیٹی تھی اور اسے ''خاتون'' کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔[6] کیخاتو نے خاص قسم کے ''کرنسی نوٹ'' بھی رائج کیے جن کی حیثیت نصف درہم سے دس درہم تک تھی۔ ان نوٹوں پر ختائی رسم الخط میں کلمہ طیبہ نقش ہوتا تھا۔[7]

اس کے دور میں مسندِ وزارت ایک عالم قاضی صدر الدین احمد زنجانی کے پاس رہی جنہیں صدرِ جہاں کا لقب دیا گیا۔ ایل خانیوں کے پایۂ تخت تبریز میں بادشاہ کی نیابت انہی کے سپرد تھی۔ ان کے بھائی جو ''قطب جہان'' کے لقب سے پکارے جاتے تھے، قاضی القضاۃ مقرر تھے جبکہ ان کے چچازاد ''قوام الملک'' کو بغداد کا والی مقرر کیا گیا تھا۔[8]

غازان بن ارغون:

بایدو خان کی تخت نشینی کے کچھ ہی دنوں بعد ایل خانی تخت کا ایک اور اُمیدوار سامنے آگیا۔ یہ ارغون خان کا بیٹا غازان تھا۔ اس کے بارے میں کوئی بھی یہ توقع نہیں کرسکتا تھا کہ اسے اسلام سے کوئی دلچسپی ہوسکے گی۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

> ''غازان کی تعلیم وتربیت بدھ مت کے مطابق ہوئی تھی۔ اس نے خراسان میں بدھوں کے لیے کئی مندر بھی تعمیر کیے تھے۔ ایران میں مغلوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد بدھ مت کے بہت سے پروہت ایران چلے آئے تھے۔ غازان ان کی صحبت سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے فطری طور پر مذہب سے بڑا لگاؤ تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنے زمانے کے مختلف مذاہب کے عقائد کا مطالعہ کیا تھا اور وہ ہر مذہب کے عالموں کے ساتھ مذہبی مباحثے کیا کرتا تھا۔''[9]

---

① جامع التواریخ (عربی) از رشید الدین فضل اللہ: ج ۲، حصہ دوئم: ص ۱۵۷، ط دار احیاء الکتب العربیۃ مصر
② جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ دوئم: ص ۱۲۳
③ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ دوئم: ص ۱۲۵؛ انتشار الاسلام بین المغول: ص ۱۸۶، ۱۸۷
④ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ دوئم: ص ۱۸۶ ⑤ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۸۶، ۱۸۷
⑥ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ دوئم: ص ۱۷۰ ⑦ تاریخ حبیب السیر از غیاث الدین میر خواند شیرازی: ۱۳۷/۳، ۱۳۸
⑧ جامع التواریخ (عربی): ج ۲، حصہ دوئم: ص ۱۷۹؛ تاریخ حبیب السیر: ۱۳۷/۳، ۱۳۸
⑨ THE PREACHING OF ISLAM:178؛ دعوتِ اسلام، ص ۲۳۳

غازان کیسے مسلمان ہوا؟:

مگر قلب کو کفر کی تاریکی سے نجات دلانے کے لیے عموماً مطالعہ، مشاہدہ یا مباحثہ کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے پیغمبرانہ اسلوب کے مطابق دعوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام ایک شافعی عالم شیخ صدرالدین محمد بن حمویہ رحمہ اللہ اور غازان کے چہیتے وزیر امیر نوروز بیگ کے ذریعے ہوا۔ شیخ نے نوروز بیگ کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے آقا کو اسلام کی دعوت دے۔ نوروز بیگ علومِ اسلامیہ سے خاصا واقف، مطالعے کا عادی اور صوفیائے کرام کی خدمت پر کمربستہ رہتا تھا۔ وہ اس قابل تھا کہ ایل خانی شہزادے کو اسلام کی خوبیاں سمجھا سکے۔ چنانچہ اس نے شہزادے کو اسلام کی طرف راغب کرنا شروع کر دیا۔ اس نے شہزادے پر یہ بھی واضح کیا کہ اسلام کی برکت سے رعایا اور خصوصاً تاجر لوگ آپ کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ امیر نوروز بیگ کی کوششیں رنگ لائیں اور غازان اسلام لانے پر آمادہ ہو گیا۔ ①

امیر نوروز بیگ چاہتا تھا کہ غازان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا مبارک عمل شیخ محمد بن حمویہ شافعی اور ایک جید عالم علم الدین بن برزالی رحمہما اللہ کے ہاتھ پر ہو۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں بغداد کے ایک بزرگ شیخ الشیوخ صدرالدین جوینی رحمہ اللہ بھی وہاں تشریف لے آئے۔ چنانچہ غازان نے ان تینوں بزرگوں کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ساتھ ہی

---

① عقد الجمان للعینی: سنة ٦٩٥ھ ...... ایسا لگتا ہے کہ ذہنی اور عقلی طور پر اسلام کی حقانیت کا اطمینان کر لینے کے باوجود غازان کو اسلام قبول کرنے میں اس لیے تأمل تھا کہ اس طرح غیر مسلم مغل حسبِ عادت اس کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں گے۔ مگر جب امیر نوروز بیگ نے غازان کو سمجھایا کہ مشرف بہ اسلام ہونے سے وہ کمزور نہیں بلکہ مضبوط ہو جائے گا اور مسلمان جو مغلوں کے مظالم سہہ رہے ہیں اس کے حامی بن جائیں گے، تو غازان کا دل مضبوط ہو گیا۔ یاد رہے کہ کسی کو اسلام کی طرف مائل کرتے وقت اس قسم کے فوائد کی طرف متوجہ کرنا نہ تو سنتِ نبویہ کے خلاف ہے اور نہ ہی اس کے باعث کسی نومسلم کے قبولِ اسلام کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے قریشِ مکہ کو دعوت دیتے وقت دنیا فتح کرنے کی بشارت دی تھی:

لما أسلم عمر بن الخطاب شق ذلک علی قریش وفرح المؤمنون، قال الولید بن المغیرة للملأ من قریش، و هم الصنادید والاشراف: امشوا إلی أبی طالب، فأتوه فقالوا له: أنت شیخنا و کبیرنا قد علمتَ ما فعل هؤلاء السفهاء، وإنا آتیناک لتقضی بیننا وبین ابن اخیک، فأرسل أبو طالب إلی النبی ﷺ فدعاه فقال: یا ابن أخی هؤلاء قومک یسألونک ذا السؤال فلا تمل کل المیل علی قومک، قال: وماذا یسألونی ؟ قالوا: ارفضنا وارفض ذکر آلھتنا وندعک وإلھک، فقال النبی ﷺ أتعطونی کلمة واحدة تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم ؟ فقال أبو جھل: لله أبوک لنعطینکھا وعشر أمثالھا، فقال النبی ﷺ: قولوا لا إله إلا الله، فنفروا من ذلک، فقاموا فقالوا: أجعل الآلھة إلھا واحدا، کیف یسع الخلق کلھم إله واحد.

(أسباب النزول لابی الحسن علی بن احمد الواحدی النیسابوری (م ٤٦٨ھ)، ص ٣٨١، ط العلمیة)

حضور ﷺ نے بہت سے ایسے افراد کو جو اسلام کی حقانیت کو سمجھ چکے تھے، نفسانی کش مکش سے نکالنے کے لیے دنیوی فوائد کی ترغیب بھی دی تھی۔ سیرتِ نبویہ میں ایسی ایک مستقل جماعت کا ذکر "مؤلفۃ القلوب" کے عنوان سے ملتا ہے اور قرآن مجید میں بھی ان کا ذکر ہے۔ (سورۃ التوبۃ، آیت: ٦٠)

یاد رہے کہ آرنلڈ نے غازان کے قبولِ اسلام کے واقعے کو ایک اور مغربی مؤرخ "سی ڈی آکسن" کے حوالے سے نقل کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

"دوراندیشی سے کام لے کر ایک مسلمان امیر نوروز بیگ نے جو غازان کا طرف دار تھا، اس پر اسلام قبول کرنے کے لیے زور ڈالا۔ اس نے غازان سے کہا کہ ایک پیش گوئی کے مطابق تم ہی وہ بادشاہ ہو جو اس زمانے کے قریب ظہور کرنے والا ہے تاکہ وہ دینِ اسلام کی حفاظت وحمایت کرے اور اس کی گزشتہ شان وعظمت کو بحال کر دے، اگر اس نے اسلام قبول کر لیا تو وہ تمام ایران کا فرمانروا ہو جائے گا اور اہلِ اسلام کا فر مغلوں کے تکلیف دہ جوئے سے آزاد ہو کر اس کے حامی بن جائیں گے اور خداوند کریم اسے دینِ برحق کا محافظ جان کر اسے فتح وظفر عنایت کرے گا۔ غرض کسی قدر تامل کے بعد غازان نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور اس کے افسروں اور لشکریوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ اس نے عالموں اور دین دار لوگوں میں خیرات تقسیم کی، مسجدوں میں حاضری دی اور اولیاء کی قبور کی زیارت کی۔"

(THE PREACHING OF ISLAM p. 179، دعوتِ اسلام، ص ٢٣٣، ٢٣٤) چونکہ مؤلف نے کسی اسلامی مأخذ کا حوالہ نہیں دیا لہٰذا اس بیان کے تمام مندرجات پر وثوق نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جو باتیں مسلم مؤرخین کی نقل سے مطابقت رکھتی ہیں، وہ بلاشبہ معتبر ہیں۔

بہت سے مغل امراء بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہ واقعہ شعبان ۶۹۴ھ کے آخری عشرے کا ہے۔
غازان نے ایک عالم کو ذمہ داری سونپ دی کہ وہ اسے دین کی تعلیم دیا کرے۔ عوام پر مظالم کا سلسلہ بند کر دیا گیا، شعائرِ اسلام عام ہوئے، مساجد تعمیر اور آباد ہونے لگیں۔ رمضان میں غازان نے روزے رکھے۔ عید الفطر کا دن آیا تو صلوٰۃِ عید کے لیے بہت بڑا اجتماع ہوا اور غازان بھی اس میں شریک ہوا۔ اس نے یہود و نصاریٰ پر جزیہ عائد کر دیا۔[1]
غازان کے قبولِ اسلام سے عالمِ اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی جس کا ذکر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ یوں کرتے ہیں:

"اس سال تاتاریوں کے بادشاہ غازان بن ارغون نے اسلام قبول کر لیا اور امیر توزون (نوروز بیگ) کے ہاتھ پر اسلام کا اعلان کیا۔ (غازان کی سلطنت میں بسنے والے) سب تاتاری یا ان کے اکثر افراد اسلام میں داخل ہوگئے۔ غازان کے قبولِ اسلام کے دن لوگوں پر سونے چاندی اور موتیوں کی بارش کی گئی۔ بادشاہ کا اسلامی نام محمود رکھا گیا، وہ نمازِ جمعہ کی ادائیگی اور خطبہ سننے کے لیے مسجد میں حاضر ہوا، عیسائیوں کے عبادت خانے ویران ہوگئے، غیر مسلموں پر جزیہ مقرر کر دیا گیا، بغداد اور دیگر شہروں میں ہونے والے مظالم کا سلسلہ بند کر دیا گیا اور غصب شدہ چیزیں لوٹا دی گئیں۔ تاتاریوں کے ہاتھوں میں اب تسبیحیں دکھائی دیکھتی ہیں۔"[2]

ڈاکٹر رجب محمد عبدالحلیم لکھتے ہیں:

"غازان نے اپنے قبولِ اسلام کی خبر عراق اور خراسان بھیج دی۔ اس نے امیر نوروز بیگ سے کچھ آیاتِ قرآنیہ سیکھیں، اسی طرح نماز سیکھی اور ۶۹۴ھ کے ماہِ رمضان کے روزے رکھے۔ ہر شام اس کے ساتھ بہت سے ترکی اور فارسی لوگ افطار کرتے تھے۔ پس اسی وقت سے اسلام تاتاریوں میں پھیل گیا۔ ان کے اکثر سپاہیوں اور افسران نے اسلام سے ہم آغوش ہونے کا اعلان کر دیا۔ مغل امراء بھی اسی رُخ پر چل پڑے۔ ان میں سے ایک نے جس کا نام فیروز کوہ تھا، اپنے ۸۰ ہزار ماتحتوں اور سرداروں کے ساتھ اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔"[3]

قبولِ اسلام کے بعد غازان کی قوت میں اضافہ ہو گیا اور اسے اپنے مخالفین پر برتری حاصل ہوگئی۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

"جب وہ بایدو خان کے ساتھ تختِ ایران کے لیے برسرِ پیکار تھا تو اس کے حریف کے لشکر میں جو مغل مسلمان تھے، وہ بایدو کا ساتھ چھوڑ کر اپنے ہم مذہب غازان کی مدد کو چلے آئے۔"[4]

علماء اور فقہاء بھی غازان کے ساتھ کھڑے ہوگئے، نتیجہ یہ نکلا کہ بایدو خان فقط آٹھ ماہ حکومت کر پایا اور غازان اسے شکست دے کر ذوالحجہ ۶۹۴ھ میں ایل خانی سلطنت کا تاجدار بن گیا۔[5] اس نے خاقانِ منگولیا کی ماتحتی سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس سے پہلے تمام مغل حکمران خاقان کے نائب شمار ہوتے تھے۔ غازان پہلا بادشاہ تھا جس

---

① عقد الجمان للعینی: سنۃ ۶۹۵ھ
② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۶۹۴ھ، حافظ ابن کثیر نے غازان کے قبولِ اسلام کو ۶۹۴ھ کا واقعہ بتایا ہے جبکہ علامہ عینی اسے ۶۹۵ھ کے تحت ذکر کرتے ہیں۔
③ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۸۸، ۱۸۹
④ THE PREACHING OF ISLAM: 178,179، دعوتِ اسلام، ص ۲۳۳
⑤ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۸۹

نے مغل فیڈریشن سے علیحدگی اختیار کی۔[1] غازان نے قبولِ اسلام کے بعد عربی اور فارسی بھی سیکھنا شروع کی۔فارسی پر اسے پوری قدرت حاصل ہوگئی جبکہ عربی وہ اچھی خاصی سمجھ لیتا تھا اور اسلامی کتب کا مطالعہ بھی کرتا تھا۔[2]

غازان کے اسلام پر بے جا شک وشبہ:

بعض مؤرخین نے غازان کے اسلام کو اخلاص پر محمول نہیں کیا مگر مؤرخ رشید الدین فضل اللہ (م ۷۱۶ھ) غازان کا دفاع کرتے ہوئے اس کے اسلام کو خلوصِ قلب پر مبنی قرار دیتا ہے۔ وہ معترضین کو جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے:

''ایسے زبردست بادشاہ کو کیا لالچ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرے اور خصوصاً ایسے بادشاہ کو جس کے بت پرست اَجداد نے دنیا کو فتح کیا ہو۔''[3]

غازان کا شام پر حملہ:

غازان کے مشرف بہ اسلام ہونے پر توقع یہ تھی کہ ایل خانی سلطنت اور ممالیک کے مابین قدیم عداوت ختم ہوجائے گی اور ان کے مابین اچھے تعلقات قائم ہوجائیں گے مگر چونکہ اس دشمنی کے عوامل فقط مذہبی نہیں بلکہ سیاسی بھی تھے، اس لیے دونوں سلطنتوں کے درمیان اختلافات برقرار رہے اور آخرکار غازان نے ممالیک کے خلاف جنگوں کا ایک سلسلہ شروع کردیا۔ ربیع الاوّل ۶۹۹ھ میں اس کی فوجوں نے حمص کے معرکے میں مملوک بادشاہ الناصر بن قلاوون کو شکست دے دی اور کچھ مدت تک دمشق پر بھی قابض رہیں۔امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کوششوں سے الناصر بن قلاوون نے جوابی حملے کی تیاری کی اور رمضان ۷۰۲ھ غازان کو شکستِ فاش دے کر شام کو تاتاریوں سے بچالیا۔[4]

شام پر حملے کے بارے میں غازان اور اس کے دربار سے وابستہ علماء کا موقف یہ تھا کہ ممالیکِ مصر کسی بھی طرح حکمرانی کے اہل نہیں کیوں کہ وہ غلاموں کی نسل سے ہیں جبکہ غازان خاندانی شرافت کا حامل ہے، لہٰذا مملکتِ مصر کو ایل خانی سلطنت کے تابع ہونا چاہیے۔ اگر مصری حکمران ایسا نہیں کرتے تو ان کا حکم باغیوں اور خوارج کا سا ہے، لہٰذا اُن کے خلاف جنگ کرنا جہاد ہے تاکہ دنیا میں عدل اور انصاف قائم کیا جائے۔[5]

مگر دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ ان لڑائیوں کے دوران لشکرِ تاتار نے جگہ جگہ لوٹ مار کی۔خصوصاً دمشق میں اس نے مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ یہ مناظر دیکھ کر مصری وشامی علماء غازان کی سیاست سے سخت متنفر ہوئے اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے غازان اور اس کی افواج پر خوارج کا حکم لگا کر ان سے جنگ کو جہادِ شرعی قرار دیا۔[6]

---

① الدرر الکامنة لابن حجر: ۴/ ۲۴۹، ۲۵۰، ط دکن

② انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۱۵

③ THE PREACHING OF ISLAM 178؛ دعوت اسلام، ص ۲۳۳

④ ان معرکوں کی تفصیل گزشتہ باب میں سلطان الملک الناصر بن قلاوون کے حالات کے تحت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

⑤ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۰۴

⑥ تفصیل گزشتہ باب میں الملک الناصر بن قلاوون کے حالات میں گزر چکی ہے۔

یہی نہیں بلکہ بعض علماء نے غازان اور اس کے پیروکاروں پر کفر اور شرک کا حکم بھی لگایا۔ اس نفرت نے ایسے جذبۂ
مقاومت کی شکل اختیار کرلی جس نے کچھ عرصے بعد مغلوں کو شام سے نکال باہر کیا۔ بہرصورت مظالم کے باعث
غازان اور اس کے تمام پیروکاروں پر کفر وشرک کا حکم لگانا انصاف کی بات نہیں۔ البتہ ان کے ظلم وستم میں کوئی شک
نہیں۔ غازان اور اس کے لشکر کے ظلم وستم میں ملوث ہونے کی متعدد وجوہ تھیں:

❶ لشکرِ تاتار میں سبھی مسلمان نہ تھے۔ بلکہ بہت سے شامانی اور بدھ بھی تھے۔ آرمینیا اور گرجستان کے نصرانیوں کی
خاصی تعداد اس لشکر میں شامل تھی۔ کچھ لوگوں نے سیاسی مفادات کے لیے بظاہر اسلام قبول کرلیا تھا مگر دل میں کفر
چھپائے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ غالباً لوٹ مار میں زیادہ حصہ اسی قسم کے لوگوں کا تھا۔[1]

❷ نومسلم تاتاریوں کی تربیت میں ابھی بڑی کمی تھی۔ اپنے آباء واجداد کی عادات ان میں باقی تھیں۔

❸ تاتاری اب تک چنگیزی قوانین "یاسا" پر عمل پیرا تھے جس میں ایسی لوٹ مار ہر مہم کا لازمہ تھی۔ اس لیے نومسلم
مغلوں کا بھی ایسی حرکات میں مبتلا ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی مگر اس بناء پر انہیں کافر ومشرک کہنا انصاف سے بعید ہے۔

ایل خانی سلطنت میں روافض کی سرگرمیاں:

تاتاریوں میں اسلام عام ہوتا دیکھ کر روافض نے ان کے اسلامی جوش سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔
نصیر الدین طوسی اور ابن علقمی جیسے شیعوں نے عراق کو جس طرح تاتاریوں کی گود میں ڈالا تھا، اس کے پیشِ نظر
تاتاریوں کے دربار میں انہیں ایک خاص مقام مل گیا تھا۔ ہم مزاج ہونے کے باعث روافض کی یہود سے عام طور پر
دوستی ہوا کرتی ہے۔ نصیر الدین طوسی جب قلعہ اَلَموت میں باطنیوں کے ہاں ملازم تھا تو وہاں اسماعیلیوں کے علاوہ کچھ
یہودی دانشور بھی اس کے مصاحب بن گئے تھے۔ جب ہلاکو خان نے نصیر الدین طوسی کو اپنا وزیر بنایا تو یہ اسماعیلی اور
یہودی دانشور بھی اس محفل کا حصہ بن گئے۔ یوں ایل خانی سلطنت کے اس ابتدائی دور میں روافض اور یہودیوں کی
خوب بن آئی۔ یہی وجہ تھی کہ سعد الدولہ نامی یہودی ایل خانی حکمران ارغون کے دور میں وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر
فائز رہا اور اس دوران اس نے اسلام کی جڑیں کاٹنے کی پوری کوشش کی۔[2]

ہلاکو نے طوسی کے ایماء پر اپنے پایۂ تخت مراغہ میں ایک عظیم الشان تعلیمی ادارہ قائم کیا جس میں ایک بڑی لائبریری
بھی تھی۔ ساتھ ہی ایک رصدگاہ بھی بنوائی جس پر بغداد سے لوٹے گئے خزانوں کی دولت دل کھول کر خرچ کی گئی۔
لائبریری میں بھی بغداد سے لوٹی ہوئی کتب کا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔[3] طوسی لائبریری میں مطالعہ کرتا، رصدگاہ میں ستارہ
شناسی میں منہمک رہتا اور مدرسے میں عقلی علوم کا درس دے کر شاگرد پیدا کرتا جو اکثر وبیشتر اسی کی طرح آزاد خیال،
عقلیت پسند اور کج عقیدہ ثابت ہوتے۔ طوسی نے عقلی علوم پر کئی کتب بھی لکھیں۔ ۶۷۲ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔[4]

---

① انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۰۶،۲۰۵

② تاریخ حبیب السیر: ۱۳۱/۳

③ السلوک لمعرفۃ دول الملوک للمقریزی: سنۃ ۶۵۸ھ

④ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۶۷۲ھ

ہلاکو کے پڑپوتے غازان کے دور میں طوسی کا فرزند اصیل طوسی وزیرِ اوقاف مقرر رہا۔ وہ شاہی طبیب اور نجومی بھی تھا اور ستاروں کا حال دیکھ کر پیش گوئیاں کرتا تھا۔ اس کا مرتبہ اس قدر تھا کہ جب غازان نے دمشق فتح کیا تو اسے حق الخدمت کے طور پر دو لاکھ درہم (تقریباً ۵۰ کروڑ روپے) دیے۔[1] چونکہ عراق وایران میں اکثریت اہلِ سنت تھی اس لیے تاتاری حکمران سنی علماء ودانش وروں سے بھی بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ تاتاریوں کے درباروں میں شیعہ اور سنی دونوں کو جگہ ملی اور دونوں اپنے اپنے افکار پھیلانے کی کوشش کرتے رہے۔

عالم اسلام کی تاریخ کی ابتدائی اڑھائی صدیوں میں شیعوں کی کوئی حکومت نہیں تھی۔ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں بنوعبید افریقہ میں پہلی اسماعیلی شیعہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس دوران بحرین، عرب اور شام پر قرامطی شیعہ قبضہ کر چکے تھے۔ اس کے چند عشروں بعد بنوبویہ نے عراق وایران میں اثنا عشری شیعہ حکومت بنائی اور عباسی خلفاء پر مسلط ہو گئے۔ اس طرح چوتھی صدی ہجری میں اکثر عالم اسلام شیعیت کی گرفت میں تھا۔

پانچویں صدی ہجری میں محمود غزنوی، طغرل بیگ، الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی جیسے نامور فاتحین کے ظہور نے ایک بار پھر اہلِ سنت کو عروج عطا کیا، قرامطہ اور بنوبویہ کی حکومتیں مٹ گئیں۔ پھر چھٹی صدی ہجری کے وسط میں صلاح الدین ایوبی کے عروج کے ساتھ ہی مصر کی اسماعیلی حکومت بھی ختم ہوگئی۔ یہ صورتحال ساتویں صدی ہجری کے وسط تک رہی کہ اس دوران عالم اسلام میں کوئی شیعہ حکومت نہیں تھی۔ شیعوں نے اپنی الگ حکومت کے قیام کے لیے تاتاریوں کا ساتھ دیا اور خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ کرایا۔ مگر ان کا حکومت کرنے کا خواب پورا نہ ہوسکا اور تاتاریوں نے حکومتی اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اس کے بعد شیعہ علماء اور دانش ور اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح تاتاریوں کو شیعہ بنایا جائے اور ان کے ہاتھوں شام ومصر کی سُنی حکومت کو سقوطِ بغداد جیسے انجام تک پہنچایا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ تاتاری حکمرانوں کے ہاں وزیر، طبیب اور نجومی بن کر اپنا اثر ورسوخ بڑھاتے رہے۔[2]

اولجائتو، محمد خدابندہ:

غازان کے بعد اس کا بھائی اولجائتو تخت نشین ہوا۔ اس کی ماں نصرانی تھی لہٰذا ولادت کے بعد اِسے بپتسمہ دیا گیا تھا اور "نکولس" نام رکھا گیا تھا۔ اس کی تعلیم وتربیت نصرانیوں کے طرز پر ہوئی تھی مگر اس کی شادی ایک ایسی خاتون سے ہوئی جو مسلمانوں کی ہمدرد تھی۔ جب اولجائتو کی ماں فوت ہوگئی تو اس کی اہلیہ نے اسے مسلمان ہونے کی ترغیب دینا شروع کردی۔ آخرکار یہ کوشش کامیاب رہی اور اولجائتو مشرف بہ اسلام ہوگیا۔[3]

۷۰۳ھ میں غازان کی موت کے بعد وہی ایل خانی سلطنت کا تاجدار بنا۔ حکومت سنبھالنے کے بعد ایک برس تک وہ ایک اچھے حکمران کی طرح تمام ذمہ داریاں نبھاتا رہا اور اس کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کے مطابق رہا۔[4]

---

① السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی: سنة ۶۹۹ھ؛ عقد الجمان فی تاریخ اهل الزمان للعینی: سنة ۶۹۹ھ

② THE PREACHING OF ISLAM 179؛ دعوتِ اسلام، ص ۲۳۳ ③ البدایة والنهایة: ۱۸/ ۱۵۳

خدابندہ اسلام کی خوبیاں دیکھ کر شروع میں عام اہل سنت کے مذہب کے مطابق مسلمان ہوا تھا مگر جلد ہی اس کے دربار کے ایک شیعہ عالم جمال الدین ابن مطہر نے اس کے ذہن پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔[1]

سلطان خدابندہ ویسے بھی علماء اور درویشوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ جمال الدین بن مطہر کے علم و فضل نے اسے اپنا گرویدہ بنالیا اور وہ آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات پر اعتبار کرنے لگا۔ جمال الدین نے اس کی جہالت اور سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اسے سمجھانا شروع کیا کہ نبی اکرم ﷺ کی خلافت کے اصل حق دار اہل بیت ہیں، آپ ﷺ کے بعد خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھی جسے ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) نے غصب کر لیا، اہل سنت جو اس ظلم میں ان کے ساتھ ہیں، ایک باطل مذہب کی پیروی کر رہے ہیں۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کو ماننے والے شیعانِ علی صحیح اسلامی تعلیمات پر عمل کر رہے ہیں۔

الغرض سلطان خدابندہ نے ان باتوں پر یقین کر کے نہ صرف شیعہ اثنا عشری مذہب اختیار کر لیا بلکہ ابن مطہر کے کہنے پر اہل سنت کے مذہب کو خلاف قانون بھی قرار دے دیا۔ چوں کہ اس کی حکومت خراسان، ایران اور عراق تک پھیلی ہوئی تھی اس لیے ان تمام ممالک میں اہلِ سنت سخت آزمائش کی زد میں آگئے۔ ابن مطہر کے بہکانے پر سلطان نے خطبے سے خلفائے ثلاثہ کا ذکر حذف کرا دیا۔ حکم دیا کہ مساجد میں جمعہ کے خطبے میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے حامی صحابہ مثلاً عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا نام لیا جائے۔[2] جبکہ ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سمیت بقیہ تمام صحابہ کے اسماء خارج کر دیے جائیں۔ نئے سرکاری سکوں پر بارہ اماموں کے نام کندہ کرا دیے۔[3] کلمہ طیبہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ" کے ساتھ "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰهِ" کے الفاظ بھی بڑھا لیے گئے۔[4]

قاضی مجد الدین اسماعیل کی جرأت و کرامت اور خدابندہ کا رافضیت سے رجوع:

عوام کو جبراً شیعہ بنانے کی اس سازش کو بغداد، اصفہان اور شیراز کے جرأت مند علماء نے کامیاب نہیں ہونے دیا اور سرکاری حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ بدستور خطبے میں خلفائے اربعہ کا نام لیتے رہے۔ سلطان کو معلوم ہوا تو نہایت غضب ناک ہوا۔ اس نے دشمنوں کو اذیت ناک موت دینے کے لیے آدم خور کتے پال رکھے تھے۔ قیدی کو ایک چار دیواری میں کھڑا کر کے اس پر کتے چھوڑ دیے جاتے۔ قیدی جان بچانے کے لیے بھاگتا اور کتے اس کا تعاقب کرتے ہوئے اسے بھنبھوڑتے رہتے یہاں تک کہ اس کا کام تمام کر کے اس کی ایک ایک بوٹی کھا جاتے۔ سلطان خدابندہ نے

---

① رحلة ابن بطوطة: ۲/ ۳۷، ط اکادیمیة المغربیة
ابن المطہر کا اصل نام حسین بن یوسف تھا۔ ۷۲۶ ہجری میں فوت ہوا تھا۔ یہ امام ابن تیمیہ کا معاصر تھا۔ اس نے اثنا عشری مذہب کی تائید میں بہت سی کتب لکھیں۔ امام صاحب نے اسی کے باطل عقائد کی تردید کے لیے اپنی شاہکار تصنیف "منہاج السنۃ" تحریر کی تھی۔ (النجوم الزاھرة: ۹ ص ۲۶۷، ط دار الکتب مصر)

② رحلة ابن بطوطة: ۲ ص ۳۸، ط اکادیمیة المغربیة

③ تاریخ ابن خلدون: ۵ ص ۶۱۹، ط دار الفکر

④ روضة الصفا: ۵ ص ۱۴۴، ط نولکشور

مخالف علماء کو انہی کتوں کے آگے پھینکنے کا فیصلہ کرلیا۔ سب سے پہلے شیراز کے قاضی امام مجد الدین اسماعیل رحمہ اللہ کو لایا گیا۔ انہیں چاردیواری میں لاکر شکاری کتوں کو ان پر چھوڑ دیا گیا۔ قاضی صاحب ذرا بھی نہ گھبرائے۔ کتے ان کے قریب پہنچتے ہی رک گئے اور دم ہلانے لگے۔ یہ خبر سلطان کو پہنچی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا اور سمجھ گیا کہ یہ بزرگ حق پر ہیں۔ وہ ننگے پاؤں دوڑا آیا اور قاضی صاحب کے قدم چومنے لگا۔ اس کے بعد اس نے شیعہ عقائد سے توبہ کرلی اور پوری سلطنت میں ازسرِ نو اہل سنت کے عقائد و رسوم کا احیاء کیا اور شریعت کے خلاف تمام رسموں پر پابندی لگادی۔ [1]

شام پر ایل خانیوں کا حملہ:

مشرف بہ اسلام ہونے کے باوجود ایل خانی مغلوں کا ممالیکِ مصر سے تنازعہ پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ معمولی واقعات سرحدی جھڑپوں اور کبھی کبھار فوج کشی کا باعث بھی بن جاتے تھے۔ چنانچہ محمد خدابندہ کے دور میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا جس میں مغل فوج نے رمضان ۷۱۲ھ میں شام کی سرحدوں پر چڑھائی کی اور تین ہفتوں تک رحبہ کا محاصرہ کیے رکھا۔ مقامی مسلمانوں نے بڑی بے جگری سے اس کا مقابلہ کیا۔ آخر محمد خدابندہ نے اپنے وزیر رشید الدین فضل اللہ کے مشورے پر یہ مہم ترک کردی اور اہلِ شہر سے وفاداری کا وعدہ لے کر لوٹ گیا۔ [2]

رشید الدین فضل اللہ:

یہ رشید الدین فضل اللہ ایک نومسلم حکیم تھا۔ نسلاً یہودی تھا۔ فلسفہ، طب اور تاریخ کا ماہر تھا۔ وہ غازان کے دور میں شاہی طبیب مقرر ہوا تھا۔ پھر خدابندہ کے عہد میں وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہوگیا۔ اس نے تبریز میں متعدد خانقاہیں اور مدارس قائم کیے۔ اسے رشید الدولۃ کا لقب دیا گیا مگر عام طور پر اسے ''رشید الدین'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ [3]

اس نے مغل بادشاہوں کے لیے ''جامع التواریخ'' کے نام سے ایک بڑی ضخیم تاریخ مرتب کی جسے مؤرخین کے ہاں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عالم اسلام پر تاتاریوں کے حملے، معاصر اسلامی ممالک اور مغلوں کی مختلف سلطنتوں کے حالات پر یہ ایک قیمتی مأخذ ہے۔

خدابندہ کی موت اور رشید الدین کا قتل:

۷۱۶ھ میں خدابندہ مرض الموت میں مبتلا ہوگیا۔ طبیب اس کے علاج سے عاجز آگئے، انہوں نے رشید الدین سے مشورہ مانگا۔ اس نے جسم سے فاسد مادے کے اخراج کے لیے مسہل دینے کی تجویز دی۔ مگر اس تدبیر سے سلطان

---

① رحلۃ ابن بطوطۃ: ۲/ ۳۸، ۳۹، ط اکادیمیۃ المغربیۃ

یہ واقعہ عام مؤرخین نے نقل نہیں کیا مگر ابن بطوطہ نے اسے پوری تفصیل سے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ ایران کے سفر کے دوران خود قاضی مجد الدین اسماعیل سے شیراز میں ملے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ قاضی صاحب اپنے مدرسے ''المجدیہ'' میں تھے۔ انہوں نے میرا بہت اعزاز و اکرام کیا۔ ان کی مجلس میں مشکوٰۃ المصابیح اور مشارق الانوار کا درس ہوتا تھا۔ (رحلۃ ابن بطوطۃ: ۲/ ۴۷) گویا یہ واقعہ سند متصل سے مذکور ہے، اس لیے اس کے مستند ہونے میں کوئی کلام نہیں ہونا چاہیے۔

② دول الاسلام: سنۃ ۷۱۲ھ

③ الاعلام للزرکلی: ۵/ ۱۵۲، ط للملایین

کی حالت مزید بگڑ گئی اور وہ فوت ہوگیا۔

رشید الدین کے مخالف درباریوں نے اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنالیا اور اس پر سلطان کے قتل کا الزام لگا دیا۔ رشید الدین نے لاکھ کہا کہ مجھ جیسے عام مسکین آدمی کو جو بادشاہ کی نظرِ کرم کے باعث اس اعلیٰ مقام پر پہنچا ہو، بھلا بادشاہ سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔'' مگر مغلوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس نے اپنی ساری نقد دولت دے کر جاں بخشی کرانے کی کوشش کی مگر بات نہ بنی۔ مغلوں نے اس سے دس لاکھ دینار (تقریباً پچیس ارب روپے) وصول کیے۔ پھر اس کے سولہ برس کے لڑکے کو قتل کیا۔ آخر میں رشید الدین کا نہ صرف سر قلم کر دیا بلکہ جسم کے پرخچے اڑا کر ٹکڑے الگ الگ شہروں میں بھیجے گئے اور انہیں بھون دیا گیا۔ تبریز میں سر کی نمائش کر کے اعلان کیا گیا: ''یہ یہودی ملحد کا سر ہے۔''

اس کی تصانیف بھی جو بکثرت تھیں، جلادی گئیں۔ ان میں سے فقط جامع التواریخ ہم تک پہنچ سکی ہے جو فنِ تاریخ میں رشید الدین کی وسعتِ نگاہ اور غیر معمولی مہارت کا ایک بین ثبوت ہے۔ یہ افسوس ناک واقعہ ۷۱۶ھ کا ہے۔ رشید الدین کی عمر ۷۵ برس تھی۔ سرکاری طور پر کردار کشی کے باعث یہ بات بہت زیادہ پھیل گئی کہ رشید الدین یہودی تھا حالانکہ حالات و واقعات اسے ثابت نہیں کرتے۔ ①

امام صفدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس میں بردباری، تواضع اور سخاوت کی صفات تھیں۔'' ②

امام صفدی رحمہ اللہ رشید الدین کے متعلق مخالفین کی آراء نقل کرنے کے بعد ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رشید الدین کا اسلام لانا بادلِ نخواستہ نہیں تھا۔ وہ مسلمانوں کا خیر خواہ تھا اور ہر حال میں ان کی خدمت کرتا رہا۔ مجھے رحبہ کے قاضی نجم الدین نے بتایا کہ کس طرح رشید الدین نے رحبہ کے باشندوں کے حق میں سفارش کی، اہلِ رحبہ کی جانوں کو بچایا اور انہیں تاتاریوں سے نجات دلانے میں مدد دی۔ تبریز میں اس کی نیکیاں عظیم تھیں۔ وہ سعادت کے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ اسلام دشمنی اور مکاری سے اس کا کوئی سروکار نہ تھا۔'' ③

ابوسعید بہادر خان:

۷۱۶ھ میں خدابندہ کے بعد اس کا بیٹا ابوسعید بہادر خان تخت نشین ہوا۔ اس کی کم عمری کے باعث سلطنت کا نظام اس کا نائب امیر چوپان چلاتا رہا۔ ابوسعید جوان ہوا تو اس کا امیر چوپان سے تنازعہ ہوگیا۔ آخر کار ابوسعید نے غالب آکر امورِ مملکت خود سنبھال لیے۔ ④ وہ پکا مسلمان تھا، اس لیے اس نے شعائرِ سنت کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی۔ ⑤

اس کے دور میں عراق کے نومسلم تاتاری شہزادوں میں اختلافات کھڑے ہوگئے۔ ۷۱۹ھ کے دوران ان کے مابین زبردست خانہ جنگی ہوئی جس میں ان کے ہزاروں افراد مارے گئے۔ ⑥ خانہ جنگی کے بعد تاتاری اس قابل نہ

---

① الوافی بالوفیات: ۵۸/۲۲؛ اعیان العصر واعوان النصر للصفدی: ۴۳/۴، ۴۴، ط دار الفکر؛ الاعلام للزرکلی: ۱۵۲/۵، ۵۳

② اعیان العصر واعوان النصر: ۴۳/۴، ۴۴

③ بحوالہ بالا

④ المختصر فی اخبار البشر لابی الفداء: ۹۶/۴

⑤ دول الاسلام للذہبی مع ذیولہ: سنۃ ۷۱۶ھ

⑥ دول الاسلام للذہبی مع ذیولہ: سنۃ ۷۱۹ھ

تھے کہ مزید ملک گیری کا لالچ کرتے۔ ابو سعید نے دوراندیشی سے کام لیا اور ۷۲۱ھ میں الملک الناصر کو بیش قیمت تحائف بھیج کر صلح کر لی۔ اس طرح مشرق ومغرب کے تمام اسلامی شہر مامون ہو گئے۔ ①

ابو سعید کا الملک الناصر سے اتنا مستحکم تعلق ہو گیا تھا کہ اپنی سلطنت کی بعض اندرونی مشکلات کی اطلاعات وہ الناصر کو بھیجا کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہ اپنے مخالف مغل امیر ''چوپان'' پر غالب آیا تو اس نے الملک الناصر کو مراسلے میں اس کی خوش خبری دی اور بتایا کہ اس کی حکومت اب مستحکم ہو گئی ہے۔ ②

یوں ان دونوں مملکتوں میں گہرے رشتے استوار ہو گئے۔ تحائف کے ساتھ سفیروں کی آمد و رفت جاری رہی۔ ③

سلطان ابو سعید نے ایک مثالی حکمران کی طرح اپنے فرائض انجام دیے۔ اس نے یورپ سے بھی تجارتی روابط قائم کیے اور وہاں کے تاجروں کو مراعات دیں۔ ④ اسی زمانے میں نئے تجارتی راستے دریافت ہوئے۔ ہندوستان سے تجارتی قافلے پہلے پشاور، کابل اور بلخ سے ہوتے ہوئے اورگنج (خوارزم) تک پہنچا کرتے تھے، اب سمندری راستہ بھی استعمال ہونے لگا، یعنی ہندوستان کے ساحل سے تجارتی جہاز خلیج فارس میں بندرگاہِ ہرمز پر لنگر انداز ہوتے اور یہاں سے تجارتی مال ایران اور افغانستان کے سرحدی علاقوں سے گزار کر وسطِ ایشیا پہنچا دیا جاتا۔ اسی دور میں مارکو پولو نے یورپ سے چین تک سفر کیا اور مغربی دنیا کو مشرقی تہذیب و تمدن سے آگاہ کیا۔ ⑤

یوں ایران، عراق اور ایشیائے کوچک میں مغلوں کے عوام و خواص اب مسلم تہذیب و ثقافت کے رنگ میں رنگ گئے۔ انہوں نے اپنی آبائی زبان و تمدن کی جگہ فارسی، عربی اور ترکی لسان و تمدن کو اختیار کر لیا اور فارسیوں، عربوں اور ترکوں کی طرح عالم اسلام کا ایک حصہ بن گئے۔ نصرانیت اور بدھ مت کو شکست ہوئی اور ان کے آثارِ قدیمہ کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ غرض ہلاکو خان کے ہاتھوں سقوطِ بغداد کو ابھی چھ عشرے گزر رہے تھے کہ دعوتِ اسلام نے ایل خانی مغلوں کی تلواروں کو اسلام کی تلوار بنا دیا۔ ⑥

ہلاکو خان سے سلطان ابو سعید تک افغانستان کے تمام تاتاری حکمران ایران کو اپنا مرکز بنا کر خراسان اور عراق پر حکومت کرتے رہے۔ ۷۳۶ھ میں ابو سعید کا انتقال اس حال میں ہوا کہ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس لیے اس کی جانشینی کے معاملے پر امراء سلطنت میں اختلاف ہو گیا۔ عراق و خراسان کے تاتاری شہزادے پھر دست و گریباں ہو گئے۔ حکمران اس تیزی سے تبدیل ہوئے کہ ۲۰ سال میں آٹھ بادشاہ آئے اور چلے گئے۔ سلطنت میں ابتری پھیل گئی اور مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ۷۳۷ھ سے ۷۴۴ھ تک تاتاریوں کی خانہ جنگیاں جاری رہیں جس کے نتیجے میں ہلاکو خان کی قائم کردہ ایل خانی سلطنت ٹکڑوں میں بٹ کر بے نام و نشان ہو گئی۔ ⑦

① دول الاسلام للذہبی مع ذیولہ: سنۃ ۷۲۱ھ
② المختصر فی اخبار البشر: ۹۷/۴
③ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۲۵
④ تاریخ الدولۃ المغولیۃ فی ایران، ص ۲۳۱
⑤ الدولۃ الخوارزمیۃ والمغول للحافظ احمد حمدی، ص ۲۹۰ تا ۳۰۳
⑥ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۲۶
⑦ تاریخ ابن خلدون: ۶۲۲/۵ تا ۶۲۷، ط دار الفکر

ایل خانی سلطنت میں رفض کی اشاعت کی کوششیں اور علمائے اہلِ سنت کا کردار:

یہاں یہ بھی ذہن نشین رکھا جائے کہ تاتاریوں میں رفض پھیلانے کا کام زیادہ تر ایل خانی سلطنت میں ہوا تھا جو عراق، مغربی افغانستان، ایران اور ایشیائے کوچک کے مشرقی حصے پر مشتمل تھی جہاں روافض اپنے عقائد کی اشاعت کے لیے سرگرم رہے جبکہ علمائے اہلِ سنت نے بھی نہایت ہمت واستقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ ایسے علماء میں امام زین الدین بدوی (عمر بن عمران) رحمہ اللہ کا نام نمایاں ہے جو عمر بھر روافض اور اہلِ بدعت کے لیے شمشیرِ بے نیام رہے۔ آخر ان پر غداری کا الزام لگا کر انہیں تاتاری حکام کی نگاہوں میں معتوب کیا گیا۔ حکام نے انہیں اور ان کے ایک ساتھی کو آدم خور کتوں کے آگے پھینک دیا۔ ان کے ساتھی کو کتوں نے بھنبھوڑ کر لقمہ بنالیا مگر یہ اللہ کا ذکر کرتے رہے اور کتے انہیں کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ اس پر تاتاری حکام نادم ہوئے اور انہیں اعزاز واکرام کے ساتھ رہا کر دیا۔[1]

روافض کی طرف سے سیاسی غلبے کی کوشش اور اس کا سدباب:

بعض رافضی پیشوا مختلف طریقوں سے لوگوں کو جمع کر کے سیاسی غلبے کے لیے بھی کوشاں رہے تاہم سُنی امراء نے بڑی مستعدی سے ان کی روک تھام کی۔ ابن بطوطہ بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں طوس کے ایک رافضی شیخ حسن نے ڈیڑھ لاکھ افراد کی ایک فوج تیار کر کے ایران کے متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنی خلافت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ ایل خانی مغلوں نے ان پر کئی بار چڑھائی کی مگر شکست کھائی۔ آخر ہرات کے حاکم حسین بن غیاث الدین نے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ان کے خلاف کارروائی کی اور ان کا قصہ پاک کیا۔[2]

ایل خانی سلطنت کو چھوڑ کر خراسان، وسطِ ایشیا اور شاخِ زرّیں خیل (قفقاز) کی تاتاری ریاستوں میں سنی علماء کی تبلیغی مساعی غالب رہیں۔ البتہ شیعوں کی فکری جدوجہد کا اثر یہ ضرور ہوا کہ ایران اور عراق میں ان کی تعداد ماضی کی بہ نسبت قدرے بڑھ گئی مگر بہرِ صورت اسلامی دنیا کا ''سوادِ اعظم'' اہلِ سنت ہی رہے۔

شیعوں کا تناسب قدرے بڑھ جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وسطِ ایشیا سے شام تک تاتاریوں نے زیادہ تر سُنی آبادیوں کو نشانہ بنایا تھا کیوں کہ وہی تاتاریوں سے جہاد میں پیش پیش تھے جبکہ شیعوں نے عموماً تاتاریوں کا ساتھ دیا تھا یا غیر جانب دار رہے تھے، اس لیے اکثر مواقع پر ان کے شہروں یا قصبات سے تعرض نہ کیا گیا[3] اور بعض مواقع پر سُنی

---

① الدرر الكامنة في اعيان المائة الثامنة لابن حجر العسقلاني: ۴/ ۲۱۳، ط دکن

فائدہ: امام زین الدین بدویؒ چند سال بعد دمشق آگئے مگر یہاں بھی حاسدین نے پیچھا نہ چھوڑا جس کے باعث وہ دمشق کے قلعے میں قید کیے گئے، اس وقت امام ابن تیمیہؒ بھی وہاں محبوس تھے۔ امام بدویؒ ان کے ساتھ قید میں گزرے دنوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ابن تیمیہؒ نے قید کے دوران یہ شعر کہا تھا:

لَا تَفْكِرَنْ وَثِقِ اللّٰهَ إِنَّ لَهُ ...... أَلْطَافًا دَقَّتْ عَنِ الْأَذْهَانِ وَالْفِطَنِ

يَأْتِيكَ مِنْ لُطْفِهِ مَا لَيْسَ تَعْرِفُهُ ...... حَتّٰى تَظُنَّ الَّذِي قَدْ كَانَ لَمْ يَكُنِ

''فکر نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو کہ اس کی عنایات اتنی باریک ہیں کہ ذہن اور فہم کی ان تک رسائی نہیں۔ اس کا کرم اس انداز میں آتا ہے کہ تم سمجھ نہیں سکتے اور ایسا لگتا کہ کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔'' (الدرر الكامنة: ۴/ ۲۱۳)

② رحلة ابن بطوطة: ۳/ ۴۶، ط اكاديمية المغربية الرباط ③ تاريخ الاسلام للذهبي: ۴۴/ ۵۰، ت تدمری

شہروں میں بھی انہیں قتلِ عام سے مستثنیٰ رکھا گیا۔[1] اس لیے جب قتل وغارت کا یہ طوفان تھا تو قدرتی طور پر عالم اسلام میں شیعہ اور سُنی آبادی کا تناسب وہ نہیں رہا تھا جو پہلے تھا۔[2]

نومسلم ایل خانیوں اور مملوک حکمرانوں کی کش مکش......ایک اہم نکتہ

یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ ایران وعراق میں شیعہ سنی اختلاف اور دونوں فریقوں کی تبلیغی جدوجہد کی وجہ سے ایل خانی شہزادے اسلام کے صحیح منہج اور مزاج کے بارے میں ایک عرصے تک فکری انتشار کا شکار رہے۔ اسی ذہنی اضطراب کی وجہ سے وہ کئی عشروں تک شریعتِ اسلامیہ سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہوسکے اور باقی اسلامی ممالک سے ان کے تعلقات کشیدہ ہی رہے۔ ان کے مقابلے میں سب سے بڑی قوت مملوک سلاطین کی تھی جو پختہ اہلِ سنت تھے اور اس دور میں اسلام کی جغرافیائی ونظریاتی سرحدوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ چونکہ ایل خانیوں کی عسکری مہمات سے سُنی مملوکوں کو ہمیشہ نقصان پہنچا، اس لیے شیعہ اہلِ قلم کی پوری حمایت ایل خانیوں کے ساتھ رہی اور اسی لیے فارسی کی تواریخ غازان اور محمد خدابندہ کی تعریف وتوصیف اور مملوکوں پر تنقید سے بھری ہوئی ہیں۔ چونکہ گزشتہ صدی کے بہت سے اُردو تاریخ نگاروں نے تاتاریوں کے حالات کے لیے فارسی مآخذ سے استفادہ کیا ہے اس لیے نومسلم تاتاریوں اور مملوکوں کی کش مکش میں انہوں نے تاتاریوں کے حق بجانب ہونے کا تاثر دیا ہے جبکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔

اگر عربی مآخذ میں منقول حافظ ابن کثیر، حافظ ذہبی، علامہ بدرالدین عینی اور مقریزی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر علمائے اسلام کی آراء کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ نومسلم تاتاریوں کے مقابلے میں مملوک سلاطین اور شاہانِ دہلی کا وجود ایک نعمت تھا۔ تاتاری اس وقت تک اسلام سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوئے تھے۔ اگر وہ مملوکوں یا سلاطینِ دہلی پر غالب آجاتے تو اسلام کی صحیح شکل وصورت کی بقا خطرے میں پڑجاتی۔

---

① جیسا کہ سقوطِ بغداد اس کی واضح مثال ہے۔

② اگر بعض مواقع پر شیعہ عوام قتلِ عام کی زد میں بھی آئے ہوں (جیسا کہ سقوطِ بغداد میں تاتاریوں کی طرف سے شیعوں کے محلوں کی حفاظت کے انتظام کے باوجود سُنی آبادیوں میں گھلے ملے ہزاروں شیعہ قتل ہوئے۔) تو یہ ہمارے دعوے کے خلاف نہیں۔ اسی طرح اگر بعض شیعہ امراء چند مواقع پر تاتاریوں کے خلاف جہاد میں سنیوں کے ساتھ شریک ہوئے ہوں، تو یہ بھی ناممکن نہیں۔ بہرصورت جہاد میں اہلِ سنت ہی نمایاں تھے اور وہی زیادہ تر تاتاریوں کی غارت گری کا نشانہ بنے اور لاکھوں کی تعداد میں شہید ہوئے جبکہ شیعوں کو اس تباہ کاری میں بہت کم جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ ہاں ان کے درجنوں مزارات ضرور منہدم ہوئے کیوں کہ اس بارے میں تاتاریوں نے شیعہ سنی کی تفریق نہیں کی۔

چغتائی سلطنت میں اشاعتِ اسلام

چنگیز خان کے بیٹے چغتائی خان کی سلطنت خاناتِ منگولیا، ایل خانیوں اور اُردوئے زرّیں کے درمیان واقع تھی اور ان ممالک کو باہم ملاتی تھی۔ یہ چینی ترکستان اور سطح مرتفع پامیر سے لے کر وسط ایشیا اور خراسان تک پھیلی ہوئی تھی۔ چغتائی خان کی موت کے کچھ عرصے بعد سلطنت اس کے پوتوں پڑپوتوں میں تقسیم ہوگئی۔ چغتائی خان مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ انہیں طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنانا اس کی عادت تھی۔ قاضی منہاج السراج جوزجانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''چغتائی کے مزاج میں مسلم دشمنی ایسی راسخ تھی کہ مسلمانوں کا خون بہاتا اور کسی کو زندہ نہ چھوڑتا تھا۔ چنگیز خان کے وضع کردہ احکام اس نے نافذ کر رکھے تھے جیسا کہ چوری، بدکاری، غلط بیانی اور خیانت پر سزائے موت دی جاتی تھی۔ کسی کے حلق میں لقمہ پھنس جاتا تو وہ قتل کر دیا جاتا۔ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا شخص پانی میں چلا جاتا تو اسے قتل کر دیا جاتا۔ جو کوئی پانی کے کنارے بیٹھ کر منہ دھوتا (وضو کرتا) وہ بھی قتل کر دیا جاتا۔ چھوٹی موٹی غلطی پر آدمی کو بالکل برہنہ کر کے سخت ضرب کے تین یا پانچ یا دس ڈنڈے مارے جاتے۔ ان احکام کا مجموعہ ''یاسا'' کہلاتا تھا۔''[1]

نیز وہ لکھتے ہیں:

''چغتائی ہمیشہ مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے کی دھن میں رہتا اور ایسے اسباب پیدا کرتا تھا جن سے مسلمان مصائب اور تکالیف کا شکار ہوں اور باقی ماندہ مسلمانوں کا قلع قمع ہو جائے اور کہیں بھی مسلمانوں کے آثار نہ رہیں۔ وہ اس فتنے کو پھیلانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے مغل امراء اور افسران کو پابند کر رکھا تھا کہ وہ مسلمانوں کی ایسی حرکات اور باتوں کو خاقان او کتائی تک پہنچاتے رہیں جو ان کے لیے تباہی اور استیصال کا باعث بن سکیں۔''[2]

دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں:

''چغتائی ظالم اور بدکردار انسان تھا۔ چنگیز خان کی اولاد میں اس سے بڑھ کر مسلمانوں کا دشمن اور کوئی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی بھی شخص مسلمانوں کا ذکر بُرائی کے سوا نہ کرے۔ اس کے علاقوں میں امکان نہ تھا کہ کوئی مسلمان بکری کو سنت کے مطابق ذبح کرے یا نماز ادا کر سکے۔ وہ او کتائی سے وابستہ رہ کر اسے ابھارتا رہتا تھا کہ مسلمانوں کو قتل کرایا جائے۔ کوئی مسلمان اس کے سامنے نہیں آسکتا تھا۔''[3]

---

① طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۲/۱۵۲، ط کابل
② طبقاتِ ناصری: ۲/۱۶۷، ط کابل
③ طبقاتِ ناصری: ۲/۱۵۴، ط کابل

چغتائی سلطنت کے حکمرانوں میں اسلام کے پھیلنے میں تاخیر کیوں ہوئی؟

چغتائی اور اس کے ورثاء کی سخت گیری کے باعث ان کی سلطنت میں مسلمان بے حد دبے ہوئے تھے۔ اس دوران یہاں اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا تو اسے بھی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

چغتائی سلطنت کا تمام علاقہ مسلمانوں کا تھا۔ یہاں عوام کی اکثریت مسلمان تھی۔ تاتاری حملے سے قبل یہ علاقے مسلمان علماء وفقہاء اور محدثین وصوفیاء سے بھرے ہوئے تھے، قدم قدم پر مساجد، مدارس اور خانقاہیں قائم تھیں۔ اس سلطنت کے جنوب اور مغرب میں بھی سارے شہر مسلمانوں کے تھے۔ اس کے باوجود یہاں پر قابض تاتاریوں میں اسلام کا سورج نسبتاً تاخیر سے طلوع ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو خود یہاں کے تاتاری حکام کی سخت روی تھی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ خانات منگولیا، ایل خانی اور اُردوئے زرّیں کے حکمران اس سلطنت کی جغرافیائی اہمیت کے باعث اس کے کچھ نہ کچھ حصوں کو اپنی سلطنتوں کے ساتھ ضم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس لیے یہاں کے حکام ہر وقت اپنے ہم قوموں کے ساتھ کشیدگی کا شکار رہتے تھے اور یہاں سیاسی استحکام اور امن وامان قائم نہیں ہونے پاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آٹھویں صدی ہجری میں جبکہ تاتاری غارت گری کا نشانہ بننے والے تمام شہر از سرِ نو آباد ہو چکے تھے، وسطِ ایشیا کے اکثر شہر اس وقت بھی برباد تھے اور وہاں اقتصادی وتجارتی سرگرمیاں بھی بہت کم تھیں۔ سمرقند، بخارا اور ترمذ جیسے شہر جو کبھی علوم وفنون اور معیشت کا گہوارہ تھے، قصبات کی حیثیت میں رہ گئے تھے۔ ان کی فصیلیں تھیں نہ قلعے۔ اکثر مساجد منہدم اور بازار ویران تھے۔ جہاں علماء وفضلاء کا طوطی بولتا تھا، وہاں گنے چنے علماء نظر آتے تھے۔ ①

اس صورتحال میں یہاں اسلام کے مبلغین نے شہزادوں اور حکمرانوں تک دعوتِ اسلام پہنچانے کا کام مؤخر رکھا اور پہلے عام تاتاریوں کو اسلام سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام زیادہ تر خانقاہوں کے ذریعے ہوا جن میں بخارا کے شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ کی خانقاہ مرکزی حیثیت رکھتی تھی جو چغتائی سلطنت میں عام تاتاریوں کو اسلام کے قریب کرتی رہی جبکہ اسی خانقاہ نے اسی زمانے میں اُردوئے زرّیں کے شہزادوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ②

تاتاریوں کی جانب سے وسطِ ایشیا کے انتظامات میں جن مسلمان وزراء سے کام لیا جاتا تھا، انہوں نے بھی یہاں احیائے اسلام کے لیے محتاط اور تدریجی انداز میں مختلف امور انجام دیے جن میں تباہ شدہ شہروں اور مساجد کی از سرِ نو تعمیر کا کام بھی تھا۔ ان وزراء میں محمود یلواج، قطب الدین جش عمید اور خواجہ بہاؤ الدین مرغلانی قابلِ ذکر ہیں۔ ③

چغتائی خاندان کا پہلا مسلم حکمران:

چغتائیوں کا پہلا حکمران جس نے اسلام قبول کیا چغتائی خان کا پوتا مبارک شاہ بن قرا ہلاکو تھا جو ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء)

---

① انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۲۸، ۲۲۹ ، رحلۃ ابن بطوطۃ: ۳/۱۷، ۲۲، ۳۵، ۳۰، ط اکادیمیۃ المغربیۃ

② سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۳۶۳ تا ۳۶۹، ط الرسالۃ

③ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۲

میں برسرِ اقتدار آیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی والدہ "ارغانہ" مسلمان تھی اور اسی کے اثر سے مبارک شاہ مسلمان ہوا۔ [1]

براق خان غیاث الدین:

مگر اس کی حکومت کو استحکام نصیب نہ ہوا اور کچھ ہی مدت بعد اس کے چچازاد براق خان نے جو غیر مسلم تھا، اس سے حکومت چھین لی۔ مگر اسلام کی پیش قدمی شروع ہو چکی تھی چنانچہ بادشاہت کے کچھ عرصہ بعد براق خان نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام غیاث الدین رکھا گیا۔ اس کا ایک بھائی احمد اوغول بھی مسلمان تھا۔ بہر کیف براق کو اسلام کی اشاعت کا موقع نہ مل سکا۔ اس کا زیادہ وقت اپنے سخت ترین دشمن ابا قاخان بن ہلاکو خان سے خون ریز جنگوں میں گزر گیا۔ براق خان نے ۶۶۴ھ سے لے ۶۶۸ھ تک حکومت کی۔ [2]

تالیقاوہ:

اس کے بعد اس کا بیٹا دوا خان بادشاہ بنا مگر جلد ہی سلطنت شہزادوں کی خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بن گئی۔ ان شہزادوں کے مذہب کے بارے میں تاریخ خاموش ہے کہ آیا ان میں سے کون کون مسلم تھا اور کون کون غیر مسلم۔ بہر حال یہ کش مکش سیاسی ہونے کے ساتھ مذہبی پہلو بھی رکھتی تھی اور قیاس یہی ہے کہ ان میں سے جہاں اکثر آبائی مذہب پر تھے وہاں کچھ مسلمان بھی تھے۔ ۷۰۸ھ میں اقتدار "تالیقاوہ بن قادامی" نے حاصل کر لیا جسے مسلمان بادشاہ مانا جاتا ہے، اسے بھی اقتدار کا زیادہ وقت نہ ملا اور وہ ۷۰۹ھ میں قتل کر دیا گیا۔ خانہ جنگی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ [3]

اسان بغا:

اب تخت پر ایک بُت پرست شہزادہ اسان بغا (بن دوا بن براق) براجمان ہوا جس نے ۷۱۸ھ تک حکومت کی۔ اسی زمانے میں اس کا ایک بھائی "یساور" مسلمان ہو گیا اور دونوں بھائیوں میں سخت کشیدگی ہو گئی۔ آخر یساور بھاگ کر فارس کے ایک مغل امیر کے پاس چلا گیا جس نے اس کی مدد کی اور یوں یساور نے ۷۱۶ھ میں اسان بغا کو ایک جنگ میں شکست دے ڈالی۔ تاہم وہ اسان بغا سے تخت نہ چھین سکا۔ [4]

کبک خان:

اسان بغا کے بعد ۷۱۸ھ میں یہاں کبک خان (بن دوا خان بن براق خان) کی حکومت آئی جو آٹھ برس تک قائم رہی۔ اس سے قبل وسط ایشیا کے چغتائی حکمران چینی ترکستان کے شہر "مالیق" (بالیغ) میں رہ کر اپنے نائبین کے ذریعے حکومت کرتے تھے۔ کبک خان نے ان سے فاصلہ رکھنے کے لیے خراسان کے شہر نخشب کے قریب ایک نیا شہر "قرشی" آباد کر کے اسے پایۂ تخت قرار دیا۔ اس نے انتظامی اور اقتصادی امور میں ایران اور عراق کے مسلم تمدن کی پیروی کی

---

① انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۳

② انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۳، ۲۳۴

③ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۴

④ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۵

اور مسلم افسران اور فضلاء سے کام لیا۔ پایۂ تخت میں ایک مسجد بھی تھی اور کبک خان کی وصیت تھی کہ اس کی تدفین اسی مسجد کے سایے میں کی جائے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خان خفیہ طور پر مسلمان ہوگیا تھا مگر قوم کی بغاوت کے ڈر سے اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھا۔ ۷۲۶ھ میں کبک خان کی وفات ہوگئی۔ [1]

طرمہ شیریں خان:

کبک خان کے اندیشے درست تھے کیوں کہ چغتائی مغل ابھی تک کفر کی طرف مائل تھے۔ اسی لیے کبک کی وفات کے بعد انہوں نے حکومت اس کے غیر مسلم بھائی الچکدائی کے سپرد کردی جس نے مسلم افسران کو برطرف کرنا شروع کردیا۔ مگر کچھ ہی مدت گزری تھی کہ اس کے بھائی طرمہ شیرین خان نے حکومت اس سے چھین لی۔

وہ ۷۲۶ھ میں وسطِ ایشیا کا حکمران بنا۔ وہ اسلام کے گمنام داعیوں کی کوششوں کی بدولت اسلام قبول کرچکا تھا مگر اس نے اپنے اسلام کو خفیہ رکھا تھا۔ تخت نشین ہونے کے کچھ دنوں بعد اس نے مولانا حسام الدین یاغی اور شیخ حسن نامی دو بزرگوں کے ہاتھ پر مسلمان ہونے کا اعلان کردیا اور اپنا نام علاؤ الدین طرمہ شیریں رکھ لیا۔ وہ نمازوں کا پابند ہوگیا اور شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا اہتمام کرنے لگا۔ اس دور کے علماء اسے عادل، پاکباز اور دین داروں سے محبت کرنے والا شمار کرتے تھے۔ چغتائی سلطنت میں طرمہ شیریں کا وہی مقام ہے جو ایل خانی سلطنت میں غازان اور اُردوئے زرّیں میں برکہ خان کا۔ اس کے دور میں وسطِ ایشیا کے مغلوں کی اکثریت مسلمان ہوگئی جس میں طرمہ شیریں سے تعاون کرنے والے علماء و مشائخ کا بڑا کردار تھا۔ طرمہ شیرین نے اپنا پایۂ تخت بُخارا کو بنالیا اور سلطنت کے دروازے تاجروں کے لیے کھول کر اسے عالم اسلام کے ساتھ منسلک کردیا۔ چنانچہ مصر سمیت تمام ممالک سے تجارتی قافلے وسطِ ایشیا آنے جانے لگے۔

مگر طرمہ شیریں کی یہ پالیسیاں غیر مسلم مغل شہزادوں کو پسند نہ آئیں اور انہوں نے طرمہ کو چنگیزی قوانین کا مخالف قرار دیا اور مختلف الزامات لگائے کہ جن میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے مغلوں کی وہ رسم ترک کردی ہے جس کے مطابق ہر سال تمام امراء جمع ہوکر بادشاہ کے اعمال کو ''قوانینِ یاسا'' کے مطابق پرکھتے ہیں اور اگر اس نے متعدد خلاف ورزیاں کی ہوں تو اسے معزول کردیا جاتا ہے۔ یہ بھی اعتراض تھا کہ وہ چغتائی سلطنت کے اصل مرکز کو چھوڑ کر بخارا میں کیوں مقیم ہے؟ آخر فضا طرمہ شیریں کے مخالف ہوگئی اور باغی گروہ نے اس کے خلاف بغاوت کی اور ۷۳۴ھ میں اسے معزول کردیا۔ [2]

جنکشائی اور اسلام دشمنی:

باغیوں نے طرمہ شیریں کے بھتیجے جنکشائی کو حکمران بنادیا جو بدھ مت کا پیروکار تھا۔ جنکشائی کے دور میں ''مالیق''

---

[1] الانتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۵، ۲۳۶

[2] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸

کو دوبارہ پایۂ تخت بنالیا گیا۔ بدھ مت کے پیشواؤں کے ساتھ ساتھ پادریوں نے بھی خوب پر پرزے نکال لیے اور اپنے عقائد کی خوب تشہیر کرنے لگے۔ یورپ میں یہ چرچا ہوا تو وہاں سے پادریوں کے وفود آنے لگے جنہیں پایۂ تخت میں کیتھولک چرچ بنانے کی اجازت دے دی گئی۔[1]

بوزون اُغلی:

جنکشائی کا دور طویل ثابت نہ ہوا اور بہت جلد طرمہ شیریں خان کے ایک اور بیٹے بوزون اُغلی نے ۷۳۵ھ میں اقتدار سنبھال لیا[2] جس کے بارے میں ابن بطوطہ کا کہنا ہے: ''وہ مسلمان تھا مگر وہ دین سے دُور اور بدسیرت تھا۔''[3]

اس وقت دعوتِ اسلام کے مقابلے میں بُدھوں اور نصرانیوں کی ہیجان انگیزی نے سلطنت کو ایک عجیب کش مکش سے دوچار کر رکھا تھا۔ بوزون نے غیر مسلموں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی اور اس کی خاطر اس نے یہود و نصاریٰ سمیت تمام غیر مسلموں کو نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جبکہ مسلمانوں کو سابقہ مراعات سے محروم کیا جانے لگا۔ اس صورتحال نے مسلمانوں کو مضطرب کر دیا جس کے باعث ۷۴۰ھ میں پایۂ تخت مالیق میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ عوام نے ایک پادری، اس کے پانچ ساتھیوں اور اٹلی سے آئے ہوئے ایک تاجر کو مار ڈالا۔ حکومت نے گھبرا کر کسی پر کوئی مقدمہ نہ چلایا۔ اس کے بعد غیر مسلم مسلمانوں کو مزید دبانے سے باز آ گئے۔[4]

سلطان خلیل:

کچھ عرصے بعد ایک مغل شہزادے خلیل بن الیسور (بن دوا بن براق) کا ظہور ہوا۔ مؤرخین نے خلیل کو ایک عابد و زاہد اور صوفی حکمران کے طور پر یاد کیا ہے۔ شہزادہ خلیل کی دین داری کے باعث مسلمان عوام جن میں مغل بھی شامل تھے، اس کے گرد جمع ہو گئے۔ غزنی کے حاکم حسین بن سلطان غیاث الدین نے اس کے لیے ایک امدادی لشکر بھیج دیا۔ ترمذ کا ہاشمی النسب رئیس سید علاؤ الملک خداوند زادہ چار ہزار سپاہی لے کر خود شہزادہ خلیل کے پاس آن پہنچا۔ اس طاقت کے ساتھ شہزادہ خلیل بوزون کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ بوزون کے پاس ۸۰ ہزار سپاہی تھے مگر فیصلہ کن موقع پر یہ سپاہی خلیل کے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے بوزون کو گرفتار کر کے خلیل کے حوالے کر دیا۔ یہ حیران کن منظر ظاہر کر رہا تھا کہ اندرونی طور پر چغتائی سلطنت کے اکثر مغل سپاہی مسلمان ہو چکے ہیں۔

خلیل نے بوزون کو قتل کر دیا اور ماوراء النہر کو مرکز قرار دے کر ۷۴۳ھ میں چغتائی سلطنت کی مسند سنبھال لی۔ اس نے اپنی قوت کو اسلام کی سربلندی کے لیے استعمال کیا۔ ایک طرف اس نے وسطِ ایشیا کے مشرقی علاقوں میں آباد بُدھوں کو زیرنگین کیا تو دوسری طرف وہ اپنے آباء کے قدیم پایۂ تخت مالیق (بالیغ) تک جا پہنچا جو بدھ مت کے پیروکار

---

[1] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۸، ۲۳۹
[2] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۹
[3] رحلة ابن بطوطة: ۳۰/۳، ط اکادیمیة المغربیة الرباط
[4] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۹

مغلوں کا گڑھ تھا۔ اسے مسخر کرنے کے بعد اس نے منگولیا کی طرف یلغار کی اور خاناتِ منگولیا کو مرعوب کرنے اور ان سے صلح کا اقرار نامہ لینے کے بعد واپس لوٹا۔ واپسی پر اس نے مالیق میں سید علاؤ الملک خداوندزادہ کو گورنر بنا دیا تاکہ بت پرست مغل سرکشی نہ کرسکیں۔ یہ تمام مہمات فقط سال ڈیڑھ سال میں انجام پائیں۔ یوں سلطان خلیل نے غیر مسلم چغتائیوں کی بکھری ہوئی سلطنت کو متحد کر کے ایک بڑی اسلامی مملکت قائم کردی۔ مگر اسے سلطنت کو مستحکم کرنے کا وقت نہ ملا اور تخت نشینی کے دو سال پورے ہونے سے قبل اس کی وفات ہوگئی۔ ①

سلطان خلیل تاریخِ اسلام کا ایک تابندہ ستارہ تھا۔ افسوس کہ معاصرین نے اس کی کوئی سوانح نہیں لکھی اور اس کا دور بھی بہت مختصر رہا۔ اگر اسے دس پندرہ سال مل جاتے تو شاید وہ سلطان صلاح الدین اور محمود غزنوی کے ہم پلہ ثابت ہوتا۔ نقشبندیہ سلسلے کے بانی خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی بخاری (۷۱۸ھ تا ۷۹۲ھ) کو سلطان خلیل سے دلی تعلق تھا۔ سلطان کی وفات کے بعد وہ رنج وغم کے باعث تارک الدنیا ہوگئے اور انہوں نے اپنی زندگی تصوف کے لیے وقف کردی۔ ②

تغلق تیمور کا زمانہ:

۷۴۳ھ میں سلطان خلیل کی وفات کے بعد چغتائی سلطنت ایک بار پھر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ مسلم اور غیر مسلم مغل شہزادوں نے الگ الگ ریاستیں قائم کرلیں۔ اس صورتحال کو بدلنے والا شخص دوا خان بن براق خان کا پوتا شہزادہ تغلق تیمور تھا جو غیر مسلم تھا اور کاشغر پر حکومت کرتا تھا۔ وہ ایک بلند ہمت انسان تھا اور چغتائی خان کی وراثت کے دیگر دعویداروں کو کچل کر سلطنت کو اس کی سابقہ حدود میں متحد کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس سے قبل کہ وہ مخالفین کو اپنا مفتوح بناتا، ایک مفتوح نے اس کے دل کو زیر کرلیا۔ ③

شیخ جمال الدین رحمہ اللہ اور تغلق تیمور:

شیخ جمال الدین رحمہ اللہ بخارا کے ایک فرشتہ صفت بزرگ تھے۔ ایک بار وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ سفر کرتے ہوئے کاشغر کے اس علاقے سے گزرے جو تغلق تیمور کے آباء واجداد کی شکارگاہ کے طور پر مخصوص تھا، اور اس میں کسی غیر سرکاری شخص کا داخلہ ممنوع تھا۔ شیخ جمال الدین رحمہ اللہ اور ان کے احباب ناواقفیت کی بناء پر ممنوعہ حدود میں داخل ہوگئے، سپاہیوں نے انہیں ان کے ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا۔ خدا کی قدرت کہ اس وقت تغلق تیمور خود شکار کھیلنے کے ارادے سے اپنے نوکروں اور شکاری کتوں کے ساتھ شکارگاہ میں موجود تھا، سپاہیوں نے شہزادے کو ان اجنبیوں کی گرفتاری کی اطلاع دی، شہزادے نے انہیں اپنے پاس طلب کرلیا۔ شیخ جمال الدین رحمہ اللہ اور ان کے ساتھیوں کی مشکیں باندھ کر انہیں تغلق تیمور کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے برافروختہ ہوکر نہایت غضبناک لہجے میں دریافت کیا:

”تم کون لوگ ہو اور تمہیں ہماری زمین میں بلا اجازت داخل ہونے کی ہمت کیسے ہوئی؟“

---

① انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۹ تا ۲۴۱　② انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۴۰

③ دعوتِ اسلام، ص ۲۳۵ ؛ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۴۱

شیخ جمال الدین رحمہ اللہ نے جواب دیا:

''ہم اس سرزمین میں اجنبی ہیں، ہمیں ہرگز اس کا علم نہ تھا کہ ہم ممنوعہ علاقے میں چل رہے ہیں۔''

شہزادے نے اپنے شکاری کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت آمیز لہجے میں شیخ سے پوچھا:

''بتاؤ تم بہتر ہو یا میرا یہ کتا؟''

شیخ جمال الدین رحمہ اللہ نے بڑی متانت اور نرمی سے جواب دیا: ''جناب! اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر رہوں گا اور اگر خدانخواستہ میرا خاتمہ ایمان پر نہ ہوا تو یہ کتا مجھ سے بہتر ہوگا۔''

اخلاص، خیر خواہی اور دردِ دل سے ادا کیے گئے شیخ جمال الدین رحمہ اللہ کے ان الفاظ نے شہزادے کی روح کو جھنجھوڑ دیا اور وہ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوگیا کہ آخر ایمان کیا چیز ہے جس کے بغیر انسان کتے سے بھی بدتر ہے؟ اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ جب میں شکار سے واپس آؤں تو اس بزرگ کو میرے پاس لے آنا۔

شکار کے بعد تغلق تیمور نے تنہائی میں شیخ جمال الدین رحمہ اللہ سے ملاقات کی اور ان سے ''ایمان'' کی حقیقت واضح کرنے کی درخواست کی۔ شیخ جمال الدین رحمہ اللہ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اسے ایمان کی حقیقت سمجھائی، اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کیا اور اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآنِ کریم کی صداقت کے دلائل ایسے دلنشین پیرائے میں بیان کیے کہ شہزادے کا دل ان حقائق کے سامنے جھکتا چلا گیا۔

جب شیخ نے کفر کے وبال، اس کے نقصانات اور اس کی پاداش میں دنیا و آخرت کی تباہ و بربادی کی منظر کشی کی تو شہزادے کو اپنی گزشتہ زندگی پر انتہائی ندامت ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ تغلق تیمور کا دل اسی وقت مومن ہوگیا تھا مگر اس نے شیخ کے سامنے اپنی کچھ مجبوریاں ظاہر کیں اور کہا: ''اگر میں ابھی مسلمان ہونے کا اعلان کردوں تو میرے لیے اپنی رعایا کو راہِ راست پر لانا ناممکن ہوگا۔ آپ خاموشی سے کچھ عرصے کے لیے واپس چلے جائیے اور جب میں اپنے باپ دادا کے تخت و تاج اور ملک کا مالک بن جاؤں تو آپ میرے پاس آیئے گا۔''

شیخ جمال الدین رحمہ اللہ اپنے وطن واپس چلے گئے اور تغلق تیمور سلطنت کو وسیع کرنے کے لیے جنگی مہمات میں مشغول ہوگیا۔ ادھر شیخ جمال الدین رحمہ اللہ ایک جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوگئے، جب وفات کا وقت قریب ہوا تو اپنے بیٹے شیخ رشید الدین کو بلایا اور انہیں کہا: ''تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ بن جائے گا، تم اس وقت اس کے پاس جانا اور اسے میرا اسلام پہنچا کر بے خوف و خطر وہ وعدہ یاد دلانا جو اس نے مجھ سے کیا۔''[1]

شیخ رشید الدین تغلق تیمور کے دربار میں:

اُدھر تغلق تیمور کئی سال کی طویل جنگجوئی کے بعد اپنے مخالفین کی سرکوبی میں کامیاب ہوگیا۔ ۷۴۶ھ میں اس نے چینی ترکستان (سنکیانگ) کو اپنی عمل داری میں شامل کرلیا۔ ۷۴۸ھ میں وہ ماوراء النہر پر بھی قابض ہوگیا۔ اس نے

[1] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۴۱، ۲۴۲؛ دعوتِ اسلام، ص ۲۳۵، ۲۳۶

اپنے بیٹے کو سمرقند کا گورنر بنا دیا اور ایک زیرک نوجوان مغل کو جو ایک پاؤں سے لنگڑا تھا، اس کا وزیر مقرر کر دیا۔ اس نوجوان کا نام تیمور تھا اور بعد میں وہ ''تیمور لنگ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ ①

جب تغلق تیمور پے در پے فتوحات حاصل کر کے ایک بڑا بادشاہ بن گیا تو شیخ جمال الدین رحمہ اللہ کے بیٹے شیخ رشید الدین کا انتظار ختم ہو گیا۔ وہ طویل سفر کر کے بادشاہ سے ملنے اس کی لشکر گاہ میں پہنچے مگر کارندوں نے انہیں بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کا موقع نہ دیا۔ ہر طرح کے جتن کر کے بھی جب شیخ رشید الدین تغلق تیمور سے ملنے میں ناکام رہے تو ایک دن صبح سویرے انہوں نے وہ پرسوز صدا بلند کرنے کا فیصلہ کر لیا جو سوئی ہوئی روح کو بھی بیدار کر دیتی ہے۔ انہوں نے لشکر گاہ کے قریب اذان کی صدائے دلنواز بلند کی۔ یہ پرسوز آواز سکوتِ سحر کو توڑتی ہوئی تغلق تیمور کے کانوں تک جا پہنچی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے غصے میں آ کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ نیند خراب کرنے والے اس ''گستاخ'' کو پکڑ لاؤ۔ تاتاری شیخ رشید الدین کو پکڑ لائے۔ تغلق تیمور نے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا:

''مجھے میرے والد جمال الدین رحمہ اللہ نے آپ سے ملنے کی وصیت کی تھی۔ انہوں نے وفات سے پہلے آپ کو سلام کہا تھا۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس اس وعدے کی یاددہانی کے لیے بھیجا ہے جو آپ نے ان کے ساتھ کیا تھا۔''

یہ سن کر تغلق تیمور نے کہا: ''جب سے میں تخت پر بیٹھا ہوں، وہ وعدہ مجھے یاد تھا۔ مگر وہ شخص دوبارہ کبھی نہ آیا۔ بہر حال میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے اسی وقت کلمہ طیبہ پڑھا اور مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ ②

ایمانی قوت اور پہلوانی طاقت کا مقابلہ:

اس کے بعد تغلق تیمور نے چاہا کہ امرائے لشکر سے فرداً فرداً گفتگو کر کے انہیں اسلام کی دعوت دی جائے۔ سب سے پہلے جس امیر سے گفتگو کی گئی وہ امیر تُولک تھا۔ جب اسے اسلام کی دعوت دی گئی تو وہ رو پڑا اور کہنے لگا:

''تین سال پہلے کاشغر کے کچھ نیک لوگوں کی تبلیغ سے میں نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر آپ کے ڈر کے باعث کبھی اس کا اظہار نہ کر سکا۔''

یہ سن کر تغلق تیمور نے تُولک کو خوشی سے گلے لگا لیا۔ پھر دیگر شہزادوں اور امراء سے بات کی گئی اور وہ سب مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ البتہ ایک مغل امیر ''جراس'' نے اسلام قبول کرنے لیے یہ شرط رکھی کہ اسلام کا مبلّغ رشید الدین اس کے غلام سے کشتی میں جیت کر دکھائے۔ یہ غلام ایسا زبردست پہلوان تھا کہ دو سال کے اونٹ کو اٹھا لیتا تھا۔ بہر حال شیخ رشید الدین نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور کہا: ''اگر میں تمہارے غلام کو نہ گرا سکا تو میں تمہیں مسلمان ہونے کا نہیں کہوں گا۔ اور اگر اللہ کی یہی مرضی ہے کہ مغل مسلمان ہو جائیں تو وہ مجھے اس غلام کو پچھاڑنے کی طاقت ضرور بخشے گا۔''

---

① انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۲

② انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۳۲ ؛ دعوتِ اسلام، ص ۲۳۶

تغلق تیمور اور دیگر مسلمان امراء نے شیخ کو بہت سمجھایا کہ وہ مقابلہ نہ کریں مگر وہ اپنے عزم میں اٹل رہے۔

آخر مقابلہ شروع ہوا جسے دیکھنے کے لیے عوام وخواص کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا۔ کافر غلام کے سامنے شیخ رشید الدین بہت چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ جونہی دونوں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے شیخ رشید الدین نے غلام کے سینے پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ وہ ادھ مُوا ہو کر گر پڑا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو شیخ کے قدموں پر سر رکھ کر کلمۂ شہادت پڑھنے لگا۔ ہر طرف سے آفرین وتحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ اسی وقت ایک لاکھ ساٹھ ہزار مغلوں نے اسلام قبول کیا اور غیر شرعی بال کٹوا دیے۔ [1]

تغلق تیمور کا دور حکومت ۷۶۵ھ (۱۳۶۳ء) تک رہا۔ اس دوران اس بادشاہ نے بڑی حکمت عملی اور سرگرمی کے ساتھ اپنی مملکت میں اسلام کی اشاعت کی اور اس کی زندگی ہی میں ان تمام صوبوں میں اسلام کا دور دورہ ہو گیا جو چغتائی خان کی سلطنت کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ اس کے بعد چغتائی سلطنت کا کوئی حکمران غیر مسلم نہیں گزرا۔ [2]

تیمور لنگ:

تغلق تیمور کے بعد اس کی سلطنت منتشر ہوئی تو اس کے صوبہ دار تیمور لنگ نے ترقی کی اور نہ صرف سلطنتِ چغتائیہ کو متحد کیا بلکہ مغلوں کے تمام ''خانات'' کو یکجا کر کے ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا۔

تیمور لنگ کو تاریخ میں ایک ظالم حکمران کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ [3] مگر اس کی شخصیت کا یہ پہلو بہر حال یادگار ہے کہ اس نے مغل دربار کو اسلامی علوم وفنون کا مرکز بنا دیا۔ اپنے دور کے نہایت جلیل القدر علماء اس کے دامن سے وابستہ رہے جن میں علامہ سعد الدین تفتازانی اور میر سید شریف جرجانی رحمہما اللہ جیسے حضرات بھی تھے۔ تیمور خود بھی عالم فاضل اور ادیب تھا۔ اس نے اپنی سوانح عمری خود لکھی ہے جو دُنیا کی بہترین آپ بیتیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ وہ عالمِ اسلام کی مختلف زبانوں اور متنوع علوم وفنون پر دسترس رکھتا تھا اور علمی بحثوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ اس نے غیر مسلم ترک قبائل اور مغلوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے بھی خاصی کوشش کی اور مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے قیام میں بھی دلچسپی لیتا رہا۔ [4]

---

(1) انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۴۲، ۲۴۳؛ دعوتِ اسلام، ص ۲۳۵ تا ۲۳۷؛

(2) انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۴۱، ۲۴۳

(3) تیمور کے حالات سلاطین عثمانیہ اور سلاطین دہلی کے حالات کے ضمن میں آئیں گے۔ وہیں اس کی فتوحات، کارناموں اور مظالم کا بھی ذکر آجائے گا۔

(4) انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۴۳ تا ۲۴۷

خاناتِ منگولیا میں دعوتِ اسلام

تاتاریوں کی تین سلطنتیں ایک صدی کے اندر اندر مکمل طور پر اسلام کی آغوش میں آگئیں مگران کے مرکزِ اعظم چین کو مبلغینِ اسلام فتح نہ کرسکے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ علاقہ عالم اسلام سے کٹا ہوا تھا اور یہاں تبلیغی وفود کی آمد آسان نہ تھی۔ پھر یہ وسیع وعریض ملک اپنی جگہ ایک مستقل دُنیا تھی جس کا ہر صوبہ ایک ملک کی مانند تھا۔

چین میں اسلام کے ابتدائی نقوش:

تبلیغِ اسلام کے حوالے سے ہم چین کو تین علاقوں میں تقسیم کرسکتے ہیں: پہلا علاقہ چینی تُرکستان ہے جسے سنکیانگ کہا جاتا ہے جہاں زیادہ تر ''ایغور'' قوم کے لوگ آباد ہیں اور یہ علاقہ وسطِ ایشیائی ریاستوں سے متصل ہے۔ یہاں اسلام کے آثار دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ظاہر ہو چکے تھے۔ کیوں کہ اُموی خلفاء نے اسلامی فتوحات کا دائرہ چین کی سرحد تک پہنچادیا تھا۔ ایسے میں وسطِ ایشیا اور فارس کے مسلمانوں کا چینی ترکستان کے لوگوں سے اختلاط ہوا جس کے باعث مقامی لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے یہاں تک کہ چند صدیوں میں وہاں مسلمانوں کی آبادیاں وجود میں آگئیں۔

دوسرا علاقہ دیوارِ چین کے پار ہے جسے مشرقی چین کہا جاتا ہے اور چین کی اکثر آبادی وہیں ہے۔ یہاں اسلام کی تبلیغ کا کام پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اس وقت شروع ہوا جب یہاں مسلمان تاجروں کی آمدورفت کا آغاز ہوا اور حکومت کی طرف سے انہیں مساجد کی تعمیر کی اجازت دی گئی اور ان کی تبلیغ سے مزید لوگ مسلمان ہونے لگے۔ عموماً یہ لوگ بندرگاہوں کے قریب رہتے تھے۔[1] یہ تانگ خانوادے کی حکومت کا دور تھا۔ ایک چینی مؤرخ (جس کا زمانہ ۱۳ے ء سے ۴۲ے ء تک کا ہے۔) ان کے متعلق لکھتا ہے:

''مغرب کے وحشیوں کے گروہ کے گروہ مملکتِ وسطی میں وارد ہوئے۔ وہ کم از کم ایک ہزار کوس اور ایک سو ممالک سے طوفان کی طرح امنڈ آئے اور اپنی مقدس کتابیں بطورِ ہدیہ لائے۔ ان کتابوں کو وصول کرکے شاہی محل کے اس شعبے میں بھیجا گیا جہاں مقدس مذہبی کتب کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے سے ان کے عقائد عام ہوگئے اور تانگ سلطنت میں لوگ علانیہ ان پر عمل کرنے لگے۔''[2]

---

① دعوتِ اسلام، ص ۲۹۳

② دعوتِ اسلام، ص ۲۹۳

اس کے باوجود تاتاریوں کے حملے تک چین میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ نہ تھی۔ یہ علاقہ عالم اسلام سے بہت دور تھا جس کے باعث مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اختلاط کے مواقع بہت کم تھے۔

چنگیز خان کے دور میں اسلام کی پیش قدمی:

تیسرا علاقہ شمالی چین ہے جس میں صحرائے گوبی، ''منگولیا'' اور ''بلادِ خطا'' داخل ہیں اور یہی مغلوں اور تاتاریوں کا اصل وطن تھا۔ یہاں مسلمان تاجروں کی آمد و رفت چنگیز خان کے دور میں شروع ہوئی اور چنگیز خان نے ان میں سے بہت سے مسلمانوں کو ان کی قابلیت کے لحاظ سے اہم عہدے دیے تھے جن میں محمود یلواج، جعفر خواجہ، حسن اور دانش مند حاجب نمایاں تھے۔[1] چنگیز خان کی زندگی ہی میں اس کے خاندان کے اکا دُکا افراد نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ جیسا کہ ایک روایت کے مطابق اس کا ایک سالا مشرف بہ اسلام ہوا اور اس کا نام جمال خواجہ مشہور ہوا۔[2]

چنگیز خان کی اسلام کے بارے میں دلچسپی:

چنگیز خان مسلمانوں سے ان کے مذہب کے بارے میں بھی سوال و جواب کرتا رہتا تھا، خصوصاً جب اس نے عالمِ اسلام پر چڑھائی کی تو سالہا سال کی مسلسل فتوحات اور مسلمانوں کے بے دریغ قتل عام کے بعد اس نے یہ محسوس کرلیا کہ اسلام عالمگیر طاقت رکھنے والا ایک غیر معمولی دین ہے کیوں کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ بُری طرح تباہ ہونے کے باوجود کسی ایک مسلمان نے بھی تاتاریوں کا دین اختیار نہیں کیا۔ اس سے چنگیز خان کو اندازہ ہوگیا کہ مسلمان چاہے اس وقت مغلوب ہوگئے ہیں مگر اسلام کو پسپا کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ ۶۲۱ھ میں جب وہ چین واپس جانے لگا تو راستے میں بخارا میں پڑاؤ ڈالتے وقت اس نے حکم دیا کہ مسلمانوں میں سے جو شخص اپنے مذہب کا سب سے بڑا عالم ہو، اسے میرے پاس لایا جائے۔ بخارا کے ایک بزرگ نے جنہیں صدرِ جہاں کہا جاتا تھا، حکم کی تعمیل میں قاضی اشرف نامی ایک بڑے عالم اور ایک مشہور واعظ کو چنگیز خان کی خدمت میں بھیج دیا۔

چنگیز خان نے ان دونوں سے پوچھا: ''تمہارا عقیدہ اور اسلام کی تعلیم کیا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا: ''کائنات کا پیدا کرنے والا ایک اللہ ہے۔ جو بے مثل ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔''

چنگیز خان نے کہا: ''مجھے اس عقیدے پر کوئی اعتراض نہیں۔''

پھر چنگیز خان نے اسلام کی مزید تفصیل پوچھی تو علماء نے عقیدۂ رسالت پر گفتگو کی اور کہا:

''اللہ نے اپنے بندوں کے راہنمائی کے لیے پیغمبر بھیجے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ کونسے کام کرنے کے ہیں اور کونسے کام ممنوع ہیں۔''

چنگیز خان نے اس عقیدے کو بھی اچھا قرار دیا اور کہا:

---

[1] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۶۰

[2] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۶۵

''میں تو خدا کا بندہ ہوں مگر میں بھی ہر وقت اپنے قاصد مختلف شہروں میں بھیجتا ہوں جن کے ذریعے میں مختلف احکام بھیجتا ہوں اور بہت سی چیزوں سے منع کرتا ہوں، اپنے سپاہیوں پر سخت ترین پابندیاں لگاتا ہوں۔''

مطلب یہ تھا کہ خالق کا اپنے بندوں کی طرف رسول بھیج کر اپنے احکامات سے آگاہ کرنا بالکل معقول بات ہے۔

اس کے بعد علماء نے کہا:

''مسلمان مخصوص اوقات میں روزانہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں جسے نماز کہتے ہیں۔اس کے دوران انسان باقی ساری مخلوق سے لاتعلق ہوتا ہے اور اللہ کی عبادت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔''

چنگیز خان نے اسے بھی پسند کیا۔

علماء نے اب روزے کے بارے میں بتایا اور کہا: ''اللہ کا فرمان ہے کہ سال میں ایک ماہ روزے رکھے جائیں۔''

چنگیز خان نے تائید کرتے ہوئے کہا: ''بالکل درست ہے کہ لوگ اگر گیارہ ماہ تک غفلت کے ساتھ بسیار خوری کرتے ہیں تو کم از کم ایک مہینہ حساب رکھ کر کھائیں تاکہ اپنے خالق کی نعمتوں کی قدر ہو سکے۔''

علماء نے زکوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''ہر سال بیس اشرفیوں میں سے آدھی اشرفی مفلسوں اور محتاجوں کو دینا بھی اسلام کا حکم ہے۔''

چنگیز خان نے اسے بھی پسند کیا اور کہا: ''خدا نے لوگوں میں سے کسی کو رزق زیادہ عطا کیا ہے اور کسی کو کم۔پس اگر خوشحال لوگ مفلسوں کو اس طرح دیا کریں تو اعتدال پیدا ہو جائے گا۔''

علماء نے کہا: ''اللہ کے بندوں پر فرض ہے کہ اگر استطاعت ہو تو زندگی میں ایک بار بیت اللہ کی زیارت کریں۔''

چنگیز خان نے کہا: ''سارا جہاں خدا کا گھر ہے۔دنیا کے کسی بھی کونے میں رہ کر اس تک رسائی ہو سکتی ہے۔یہاں صحیح طریقہ یہ ہے کہ جن کے پاس زیادہ مال ہے، وہ ثواب کے لیے اسے فقراء اور مساکین پر خرچ کر دیا کریں تاکہ ان کی نیک نامی قیامت تک باقی رہے۔''

جب یہ دونوں علماء وہاں سے نکل کر صدر جہاں کے پاس پہنچے تو قاضی اشرف نے یہ رائے ظاہر کی کہ چنگیز خان کو مسلمان شمار کرنا چاہیے۔مگر واعظ نے اسے حج کے انکار کے باعث غیر مسلم ہی شمار کیا۔[1]

اوکتائی خان کے دور میں مسلمانوں کا لحاظ:

چنگیز خان کے جانشین اوکتائی کی کوشش تھی کہ شہروں کو آباد کیا جائے اور رعایا سے نرمی برتی جائے۔چین کے مشرقی علاقوں میں بہت سے مسلمان آباد تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوکتائی ان کی خوبیوں سے متاثر تھا۔لہٰذا برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس نے اپنے بھائیوں اور مغل امراء کی تنگ دلی اور مخالفت کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی روش اختیار کی۔اس دور کے معاصر مؤرخ قاضی منہاج السراج لکھتے ہیں:

---

(1) روضۃ الصفا: ۵ر ۴۰، ۴۱، ط نولکشور..... واعظ کی بات درست تھی، کسی اسلامی رکن کا انکار کرنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔

''اوکتائی بذاتِ خود نہایت کریم اور خوش اخلاق تھا۔ وہ مسلم دوست تھا اور مسلمانوں کا احترام کرنے اور انہیں سہولیات فراہم کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ اس کے دور میں اس کی سلطنت کے مسلمان خوشحال اور معزز تھے۔ اس کے دور میں (چین کے) تمام شہروں جیسا کہ تنگت، طمغاج اور تبت وغیرہ میں مساجد تعمیر ہوئیں۔ اس نے تمام علاقوں کے قلعے مسلم امراء کے حوالے کر دیے۔ وہ امراء جو ایران اور توران سے بلائے گئے تھے، ترکستان، طمغاج اور تبت میں تعینات کر دیے گئے۔ اس نے حکم جاری کیا کہ مسلمانوں کو ''دوست'' اور ''بھائی'' کہہ کر یاد کیا جائے۔ اس نے مغلوں کو حکم دیا کہ اپنی لڑکیاں مسلمانوں کے نکاح میں دیں اور اگر کوئی (مسلمان) ان کی اولاد کا رشتہ حاصل کرنے میں رغبت ظاہر کرے تو انکار نہ کریں۔ تمام مشرقی علاقوں میں نمازِ جمعہ شروع کر دی گئی۔ مسلمان ان علاقوں میں آباد ہو گئے اور انہوں نے اپنے بہت سے قصبے اور شہر آباد کر لیے۔''[1]

جھوٹا خواب سنانے والے اسلام دشمن کو سزا:

اس کا بڑا بھائی چغتائی اور دوسرے درباری اسے مسلمانوں کے خلاف ابھارتے تھے مگر یہ ان کی رائے کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے اس کے دربار میں آ کر دعویٰ کیا کہ مجھے چنگیز خان نے خواب میں آ کر یہ وصیت کی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھتی جا رہی ہیں، خطرہ ہے کہ ان کی وجہ سے آخر کار مغل سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ نہ آ جائے۔ اس لیے قتل عام کر کے مسلمانوں کا بالکل صفایا کر دیا جائے۔

اوکتائی نے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص مسلم دشمنی کے باعث ایک جھوٹا دعویٰ کر کے مسلمانوں کو مروانا چاہتا ہے۔ اس نے ایک بڑی مجلس منعقد کر کے اس شخص کو اپنا دعویٰ دہرانے کا حکم دیا۔ جب وہ اپنا خواب دہرا چکا تو اوکتائی نے کہا:

''تم مغل زبان جانتے ہو یا ترکی یا دونوں؟'' اس شخص نے جواب دیا: ''میں مغل زبان سے واقف نہیں، فقط ترکی جانتا ہوں۔'' اوکتائی نے کہا: ''اور چنگیز خان مغل زبان کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ اگر اس نے تم سے خواب میں مغل زبان میں بات کی تو تم اسے کیسے سمجھ پائے؟ اور اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ وہ ترکی بول رہا تھا تو یہ جھوٹ ہے؟''

وہ شخص لاجواب ہو گیا اور اوکتائی نے جھوٹے دعوے کی پاداش میں اسے قتل کرا دیا۔

اس کے بعد اوکتائی نے مسلمانوں کے مخالف امراء کو جن میں اس کا بڑا بھائی چغتائی بھی تھا، سمجھاتے ہوئے کہا:

''یہ مسلمان ہمارے بھائی اور ہمارے دوست ہیں۔ ان کے باعث ہماری مملکت کو جو قوت ملی ہے، وہ ظاہر ہے۔ ان کی مدد سے دنیا ہمارے لیے مسخر ہو گئی ہے۔''[2]

اوکتائی نے مسلمان کی جان بچائی:

مغل قانون کے مطابق پانی میں غوطہ لگا کر وضو یا غسل کرنا منع تھا۔ ایک بار اوکتائی خان نے دورانِ سفر ایک مسلمان کو تالاب میں غسل کرتا دیکھا۔ پیچھے پیچھے چغتائی بھی آ رہا تھا۔ اگر وہ مسلمان کو تالاب میں دیکھ لیتا تو یقیناً اسے قتل

① طبقاتِ ناصری: ۲/ ص ۱۵۱، ۱۵۲
② طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۵۴ تا ۱۵۷

کرادیتا۔ اوکتائی نے فوراً چاندی کا ایک ٹکڑا اس مسلمان کو بھیجا اور حکم دیا: ''اسے تالاب میں پھینک دو۔ اگر چغتائی اعتراض کرے تو کہنا کہ میں اپنی چاندی نکالنے کے لیے غوطہ لگا رہا ہوں۔''

مسلمان نے ایسا ہی کیا۔ کچھ ہی دیر میں چغتائی وہاں پہنچ گیا اور مسلمان کو پانی میں دیکھ کر اس کے قتل پر بضد ہوگیا۔ مسلمان نے کہا: ''میری چاندی یہاں گرگئی ہے، اسے نکال رہا ہوں۔''

چغتائی نے غوطہ خوروں کو پانی میں بھیجا تو واقعی وہاں سے چاندی کا ٹکڑا نکل آیا۔ یوں مسلمان کی جان بچ گئی۔ [1]

اوکتائی کی مسلمانوں پر اس قدر مہربانی کو دیکھتے ہوئے قاضی منہاج السراج رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''میں نے بعض ثقہ لوگوں سے سنا ہے کہ مسلمانوں پر اس قدر لطف وکرم اس بات کی دلیل ہے کہ اوکتائی خفیہ طور پر مسلمان ہو چکا تھا۔'' [2]

اوکتائی سے پہلے اور اس کے بعد مسلمانوں پر سختیاں:

تاہم اوکتائی کے سوا منگولیا کے تقریباً سارے خاقان مسلمانوں کے بارے میں سخت گیر تھے۔ اس لیے انہیں اسلام کی دعوت دینا بہت مشکل تھا۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

''چنگیز خان نے حکم دیا کہ جو لوگ جانوروں کو اسلامی طریقے سے ذبح کریں ان کو قتل کردیا جائے۔ اس حکم کو اس کے پوتے قبلائی خان نے دوبارہ جاری کیا اور مخبروں کے لیے انعامات مقرر کیے۔ اس سے ظلم وستم کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو سات سال تک جاری رہا۔ چنانچہ بہت سے مفلسوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس حکم کو دولت کمانے کا ایک آسان طریقہ سمجھا اور غلاموں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنے آقاؤں پر غلط الزام لگائے۔ گیوک خان نے اپنی مملکت کا انتظام دو عیسائی وزیروں کے سپرد کر رکھا تھا اور اس کا دربار بھی عیسائی راہبوں سے بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے عہد میں بھی مسلمانوں پر بہت سختیاں ہوئیں۔'' [3]

مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے مظالم کیے تھے کہ چینی تماشا گر جب بھی پردے پر عکس ڈال کر تصویریں دکھاتے تو ایک تصویر میں ایک سفید ریش بوڑھا آدمی دکھائی دیتا تھا جس کی گردن گھوڑے کی دُم سے بندھی ہوتی تھی اور گھوڑا اسے گھسیٹتا پھرتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل گھڑسوار مسلمانوں سے کیسا بدتر سلوک کرتے تھے۔ [4]

تورا کینہ خاتون کا دور اور فاطمہ ایرانی:

۶۳۹ھ میں جب اوکتائی کی وفات ہوئی تو عارضی طور پر اس کی بیگم تورا کینہ خاتون کو تخت پر بٹھایا گیا جو نصرانی تھی۔ اس کے مشیروں میں ایران سے قید کر کے لائی گئی ایک مسلمان خاتون فاطمہ کا ذکر ملتا ہے جو نہایت ذہین اور عقل مند تھی

---

① طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۵۲، ۱۵۳

② طبقاتِ ناصری: ۲/ ۱۵۷، ط کابل

③ THE PREACHING OF ISLAM:172,173 ؛ دعوتِ اسلام، ۲۲۶

④ THE PREACHING OF ISLAM:173,with footnote ؛ دعوتِ اسلام، ۲۲۶ ؛ بحوالہ هوورتھ ۱/ ۱۵۹

اور اس نے رفتہ رفتہ توراکینہ کا قرب حاصل کر لیا تھا۔ توراکینہ کی حکومت چلانے میں فاطمہ کا کردار بہت اہم تھا۔ [1]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان خواتین بھی مغل درباروں میں خاصا اثر ورسوخ رکھتی تھیں۔ تاہم چونکہ دربارِ مغلیہ میں اسلام، نصرانیت اور بدھ مت کی شدید کش مکش چل رہی تھی، اس لیے بدخواہ فاطمہ کا مرتبہ گھٹانے کے درپے رہے۔ ان دنوں توراکینہ کا بیٹا شہزادہ کوتان بیمار تھا۔ حاسدین نے مشہور کر دیا کہ فاطمہ نے جادو کے ذریعے اسے بیمار کیا ہے۔ کوتان کو بھی اس الزام پر یقین آگیا اور اس نے وصیت کی کہ اگر وہ مرجائے تو فاطمہ کو قتل کر دیا جائے۔

بدقسمتی سے کوتان کی موت واقع ہوگئی اور توراکینہ نے مغل امراء کے اصرار پر بادلِ نخواستہ فاطمہ کو ان کے سپرد کر دیا۔ اسے کئی دنوں تک برہنہ اور بھوکا پیاسا باندھ کر رکھا گیا اور طرح طرح سے اس پر تشدد کیا گیا یہاں تک کہ اس نے ناکردہ جرم کا اقرار کر لیا جس کے بعد اسے چمڑے میں لپیٹ کر دریا میں ڈبو دیا گیا۔ [2]

گیوک خان کا زمانہ:

توراکینہ نے پانچ سال حکومت کے بعد قورِلتائی (مغلوں کی عالمی مجلس) بلا کر اپنے بیٹے گیوک خان کو بادشاہ مقرر کر دیا۔ [3] اس کی تربیت لڑکپن سے نصرانی اساتذہ نے کی تھی جس کے باعث وہ طبعی طور پر ملتِ نصاریٰ کا بڑا حامی تھا۔ چنانچہ اس کے دور میں خاناتِ منگولیا کا ماحول ایسا بن گیا تھا کہ کوئی مسلمان ملازم کسی نصرانی کے سامنے اونچی آواز میں بات تک نہیں کر سکتا تھا۔ روس، روم اور شام سے بڑے بڑے پادری آکر اس کے دربار میں جمع ہو گئے۔ [4]

مسلمانوں کے خلاف نصرانیوں کی سازش:

ایک بار کچھ نصرانیوں نے جو مغل سلطنت کے انتظامات میں اہم عہدوں پر تھے، مسلمانوں کے خاتمے کے لیے یہ تدبیر سوچی کہ تمام مسلمان مردوں کو خصی کر دیا جائے۔ ان کے سربراہ نے گیوک خان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر اس کا حکم نامہ بھی حاصل کر لیا۔ مگر جب وہ یہ حکم نامہ لے کر گیوک خان کے دربار سے باہر نکلا تو اچانک مغلوں کے شکاری کتے اس پر جھپٹ پڑے اور اس کے خصیتین چبا ڈالے۔ دینِ محمدی کا یہ معجزہ دیکھ کر پادری ایسے خوفزدہ ہوئے کہ اس حکم نامے کو خود ہی فنا کر دیا۔ [5]

---

① تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۲۹۷، ط ہرمس؛ النساء الحاکمات فی المغول للدکتور علاء محمد خلیل، ص ۱۲۶

② تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۳۰۱ تا ۳۰۳، ط ہرمس؛ جامع التواریخ(فارسی) از رشید الدین فضل اللہ: ۲/ ۲۳۸، لیڈن

③ تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۳۰۳ تا ۳۰۸، ط ہرمس

④ تاریخ جہان کشا جوینی، ص ۳۱۳، ۳۱۴، طہرمس؛ جامع التواریخ (فارسی): ۲/ ۲۳۸، لیڈن

⑤ روضۃ الصفا: ۵/ ۵۶..... اکبر شاہ نجیب آبادی سے یہاں غلطی ہوئی ہے، انہوں نے لکھ دیا ہے کہ شکاری کتوں نے گیوک خان پر حملہ کیا تھا جس کے زخم سے وہ کچھ عرصے بعد مر گیا تھا۔ حالانکہ اصل مآخذ کی عبارت سے یہ مفہوم ہرگز نہیں نکلتا۔ روضۃ الصفا کی عبارت یہ ہے:
''جمعے از نصرانیان کہ در زمرۂ نواب کیوک خان انتظام داشتند، نشانی حاصل کردند کہ مسلمانانِ ملک محروسہ را خصی کنند، و یکے از عظمائے آن طائفہ نشان را گرفتہ از بارگاہ بیروں آمدہ تا بشارت بترسایان رساندہ گماشتگان بر ولایت بداں عمل نمایند، اتفاقاً سگان درندہ درو ے افتادند و خصیتین او را کندند، نصاریٰ بعد ازاں از اعجاز دین محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہراساں شدہ تمام آن نشان نہ بردند۔''

امام نورالدین کے ساتھ بدسلوکی:

دربار میں بدھ مت کے پروہت بھی بکثرت تھے جو ہمیشہ اس کو مسلمانوں خصوصاً علماء پر مظالم کے لیے اُکساتے رہتے تھے۔ وہاں امام نورالدین نامی ایک عالم تھے جن کے علم وفضل سے لوگ بے حد متاثر تھے۔ بدھ مت کے پیشواؤں اور عیسائی پادریوں کو یہ برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے گیوک خان پر زور دیا کہ وہ امام نورالدین کو دربار میں طلب کرے اور ان کا ہم سے مناظرہ کرائے۔ اگر وہ حضورﷺ کی رسالت کی صداقت اور اسلام کی دیگر ادیان پر برتری کو ثابت نہ کرسکیں تو انہیں قتل کردیا جائے۔ گیوک خان نے امام نورالدین کو بلوالیا اور مجلسِ مناظرہ منعقد کرائی۔ امام نورالدین نے محکم دلائل سے اپنے مدعیٰ کو ثابت کیا اور فریقِ مخالف کے اعتراضات کے منہ توڑ جوابات دیے۔ پادریوں نے کہا: ''پیغمبر کو روحانی ہونا چاہیے۔ اس کا خواتین کی طرف کوئی میلان نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ حضرت عیسیٰ۔ تمہارے پیغمبر کی نو بیویاں اور کئی بچے تھے۔ آخر یہ کیوں؟

امام نورالدین رحمہ اللہ نے جواب دیا:

''اگر اہل وعیال کا ہونا نبوت کے منافی ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام کی ۹۹ بیویاں کیوں تھیں؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک سوساٹھ بیویاں اور ایک ہزار کنیزیں کیوں تھیں؟''

پادری لاجواب ہوکر ان پیغمبروں کی نبوت کا انکار کرنے لگے اور بولے: ''یہ لوگ پیغمبر نہیں فقط بادشاہ تھے۔''

بہرکیف منہ کی کھانے کے بعد پروہتوں اور پادریوں نے مناظرہ ختم کردیا اور گیوک خان سے کہا:

''آپ امام نورالدین سے کہیں کہ وہ ہمیں دو رکعت نماز ادا کرکے دکھائے۔''

گیوک خان کے کہنے پر امام نورالدین رحمہ اللہ نے نماز کی نیت باندھ لی۔ جب وہ سجدے میں گئے تو گیوک کے حکم پر کچھ کارندوں نے ان کا سر زور زور سے زمین پر پٹخا مگر انہوں نے نماز نہ توڑی۔ نماز مکمل کرکے انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے اور کوئی شکوہ شکایت کیے بغیر اپنے گھر چلے گئے۔

اسی شب گیوک خان مرگیا اور مغل بہت خوفزدہ ہوگئے۔ انہوں نے آکر امام نورالدین رحمہ اللہ سے معافی مانگی۔ [1]

اس وقت گیوک خان سمرقند میں تھا اور منگولیا جارہا تھا۔ وہ بالکل نوجوان تھا اور فقط ایک سال حکومت کرسکا۔ [2]

منگو خان کا رویہ:

منگو خان چین اور منگولیا کے مسلمانوں کے ساتھ قدرے نرم رویہ رکھتا تھا۔ ایک بار اسے کسی مخبر سے معلوم ہوا کہ پایۂ تخت کا بدھ پیشوا ''ایدیگوت'' عین نمازِ جمعہ کے وقت مسلمانوں کا قتلِ عام کرنے کی سازش کررہا ہے۔ منگو خان نے ایدیگوت کو گرفتار کراکے نمازِ جمعہ کے وقت مسلمانوں کے مجمع کے سامنے سولی پر لٹکادیا۔ [3]

---

① طبقاتِ ناصری از منہاج السراج جوزجانی: ۲/۱۷۱ تا ۱۷۳، ط کابل

② جامع التواریخ (فارسی) از رشید الدین فضل اللہ: ۲/ ۲۵۰، لیڈن ③ تاریخ حبیب السیر: ۳/ ۶۱

بدھ مت کے لیے سہولتیں:

مگر منگو خان کے بعد مسلمانوں کے خلاف تعصب بڑھ گیا۔ دوسری طرف بدھ مذہب کو وہاں اشاعت کے لیے ہر طرح کا سازگار ماحول میسر تھا جس کے باعث وہاں بدھسٹوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

> ''قوبلائی خان کے عہد میں چین کے مغلوں پر بدھ مت کے قوی اثرات شروع ہوئے کیوں کہ وہ ہر طرف سے بدھ مت کے پیروؤں سے گھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ چودہویں صدی کی ابتداء میں بدھ مت نے ان لوگوں پر پورا اقتدار حاصل کرلیا۔ ان میں بدھ مت کی اشاعت کے لیے تبت کے لاما گرو نے بڑی سرگرمی سے کام لیا۔ چنانچہ منگولیا کے لوگ اب تک یہی مذہب رکھتے ہیں۔''[1]

اہم عہدوں پر فائز مسلمانوں کی اسلام کے لیے کوششیں:

تاہم دشواریوں کے باوجود دعوتِ اسلام کے ذرائع مسدود نہ تھے کیوں کہ چنگیز خان کے بیٹوں کے دور میں فارس اور ترکستان کے ہزاروں مسلمان خاناتِ منگولیا کی افواج میں شامل تھے۔ قوبلائی خان کے زمانے میں تاشقند کے نواحی قصبے بناکت کا ایک تاجر احمد بناکتی بیس سال تک اس کا وزیر مالیات رہا۔ نیز ایک عرب مسلمان اس کے ہاں قاضی اور دوسرا عرب وزیر کا معاون تھا۔ تاریخ کے اوراق میں عبدالرحمٰن نامی ایک شخص کا ذکر بھی آتا ہے جو قوبلائی خان کے ہاں محصولات کا افسر (کلکٹر) تھا۔ یورپی سیاح مارکوپولو جس نے ۶۹۶ھ (۱۲۹۶ء) میں قوبلائی خان کے ہاں حاضری دی تھی، اپنے سفرنامے میں وہاں کے دو مسلمان ریاضی دانوں: علی الدین موصلی اور اسماعیل ہروی کا ذکر بھی کرتا ہے۔[2]

مغلوں کی حکومت میں چونکہ ہندوستان کے سوا تقریباً پورا ایشیا ایک سلطنت بن چکا تھا، لہٰذا ذرائع آمد و رفت ہر طرف کھلے تھے۔ اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر ایران اور وسطِ ایشیا سے بہت سے مسلمان چین جا کر آباد ہوئے جبکہ کچھ چینی وسطِ ایشیا اور ایران میں آکر رہنے لگے۔ اس میل جول نے بھی اسلام کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔[3]

سیّد اجل شمس الدین عمر اور اس کی اولاد کے کارنامے:

اسی زمانے میں بخارا کا ایک تاجر شمس الدین عمر خاناتِ منگولیا کا بڑا مقرب رہا جسے عرب ''السید الاجل'' اور چینی ''ہیان ہانگ فانگ'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ وہ چنگیز خان کے دور میں یہاں آیا تھا اور اسے ایک ہزار گھوڑوں کا تحفہ دے کر اس کی نگاہوں میں آگیا تھا۔ اوکتائی خان اور منگو خان کے زمانے میں اسے اعلیٰ عہدے دیے گئے جبکہ قوبلائی خان نے اسے جنوبی صوبے یونان (Yunnan) کا گورنر مقرر کردیا۔ شمس الدین عمر نے وہاں سڑکیں، پل اور شہروں کی فصیلیں تعمیر کرائیں، لوگوں سے ٹیکس ختم کردیے اور عدل و انصاف کا بول بالا کیا۔ اس کے زیر سایہ وہاں بہت سے باہر کے مسلمان آکر آباد ہوئے اور مقامی لوگ بھی بکثرت مسلمان ہوئے۔ گورنر نے وہاں کنفیوشس کے پیروکاروں

---

[1] THE PREACHING OF ISLAM:170، دعوتِ اسلام، ص ۲۲۱

[2] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۶۰، ۲۶۱ [3] دعوتِ اسلام، ص ۲۹۴

کے لیے مندر اور مسلمانوں کے لیے مساجد اور مدارس بھی تعمیر کرائے۔ ۶۶۹ھ میں اس نیک گورنر کی وفات ہوئی تو پورے چین میں سوگ منایا گیا۔ ۸۰۸ھ میں چین کے منگ حکمرانوں نے اپنے ایک دانشور ''تشانگ ہو'' سے شمس الدین عمر کی خدمات پر ایک کتاب مرتب کرا کرا سے خراج تحسین پیش کیا۔

شمس الدین عمر کے پانچ بیٹے اور اُنیس پوتے تھے جو اس کے بعد اس صوبے کی گورنری اور دیگر اہم عہدوں پر رہے۔ اس کا ایک بیٹا نصیر الدین (نائسُل یانگ) پہلے چین کا وزیر، پھر شانسی کا گورنر رہا اور پھر یونان کا گورنر رہا۔ ۶۹۲ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ دوسرا بیٹا حسن صوبہ گوانگ ڈونگ کا سپہ سالار رہا۔

تیسرا بیٹا حسین پہلے مملکت کا وزیر اور پھر مشرقی ساحلی صوبے کیانگ سی (جیانگسو) کے شہر کا گورنر رہا۔ اپنے بھائی نصیر الدین کی موت کے بعد اسے یونان کا گورنر بنا دیا گیا۔ چوتھا بیٹا شمس الدین جیانگسو کے ایک شہر ''کین تشانگ'' کا والی رہا۔ پانچواں بیٹا مسعود پہلے وزیر اور پھر یونان کا گورنر بنایا گیا۔ ان بندگانِ خدا کی کوششوں کی بدولت آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں اس صوبے کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھی۔ [1]

شمس الدین عمر کے پوتے بھی اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ ان میں سے نصیر الدین کے ایک بیٹے نے جسے ''بایان فنشانگ'' کہا جاتا ہے، ''سینغان فو'' کی سب سے بڑی مسجد تعمیر کی۔ [2] اس کا اثر ورسوخ اتنا تھا کہ وہ ۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء) میں خاقانِ چین سے یہ اقرار نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اسلام سچا مذہب ہے۔ [3]

چین اور منگولیا کا حکمران طبقہ مسلمان نہ ہوا:

چین میں اسلام لانے والوں کا دائرہ عام طبقے تک محدود تھا اور چینی حکمرانوں میں سے کسی کے مسلمان ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہی وجہ تھی کہ دیگر مغل سلطنتوں کے برعکس یہاں لوگوں کے فوج در فوج مشرف بہ اسلام ہونے کے واقعات پیش نہیں آئے اور اسی لیے آج تک چین غیر مسلم ملک ہے، تاہم بعض بدھ مت کے پیروکار جو مغل سلطنت کے اہم عہدوں پر تھے: مشرف بہ اسلام ہوئے جن میں ''کرگز'' نامی ایک گورنر کا ذکر ملتا ہے جو پہلے بدھسٹ تھا اور پھر اسلام لے آیا۔ صوبہ کانسو کا گورنر ''آنندا'' جو قوبلائی خان کا پوتا تھا، چودھویں صدی عیسوی میں چین میں اسلام کی اشاعت کے لیے بھرپور انداز میں سرگرم رہا۔ اس نے ''تان گوت'' میں بہت سے افراد کو مسلمان کیا۔ اپنے زیرِ کمان لشکر میں بھی وہ اسلام کی تبلیغ کرتا رہا جس کے باعث بہت سے سپاہی مسلمان ہوئے۔ ایک بار اُسے خاقان کے دربار میں طلب کیا گیا اور بدھ مت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ انکار پر اسے قید کر دیا گیا مگر پھر اس خدشے سے رہا کر دیا گیا کہ ''تنگوت'' کے باشندے جو اس سے بڑی عقیدت رکھتے تھے بغاوت نہ کر دیں۔ [4]

---

[1] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۶۱ تا ۲۶۳

[2] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۶۳ ...... اصل مصدر میں شہر کا نام اسی طرح درج ہے۔ میں باوجود کوشش کے نہیں جان سکا کہ چین کا کونسا شہر مراد ہے۔

[3] انتشار الاسلام بین المغول، ص ۲۶۳

[4] دعوتِ اسلام، ص ۲۲۸

چین میں اسلام پر ابن بطوطہ کا تبصرہ:

چین میں اسلام کی اس اشاعت کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے جو عالم اسلام پر چنگیزی حملے کے ۱۲۷ سال بعد ۷۴۳ھ میں چین پہنچے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"چین کے ہر شہر میں مسلمانوں کی الگ آبادیاں ہیں، ان کی مساجد ہیں جہاں نماز جمعہ اور دیگر نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ وہاں مسلمانوں کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔"[1]

البتہ شمالی چین، منگولیا اور صحرائے گوبی میں اس وقت بھی مقامی مسلمان ناپید تھے جیسا کہ ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

"یہاں کوئی مسلمان نہیں رہتا، سوائے ان کے جو مسافر ہیں۔ اس لیے کہ یہ علاقہ رہائش کے قابل ہی نہیں۔ یہاں کوئی گنجان شہر نہیں۔ کچھ دیہات اور ہموار قطعات ہیں جن میں فصل، پھل اور گنا پیدا ہوتا ہے۔"[2]

اسلام کی روحانی قوت کا معجزہ:

مغلوں کی چار سلطنتوں کا مذکورہ جائزہ واضح کرتا ہے کہ اسلام نے ان میں سے تین کو ایک صدی کے اندر اندر مسلم سلطنتوں میں تبدیل کر دیا جہاں شریعتِ اسلامیہ نافذ تھی اور حکمران اسلام کے گرویدہ تھے جبکہ چوتھی سلطنت میں مسلمانوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کے لیے ہر قسم کی ترقی کے دروازے کھلے تھے۔

یہ جائزہ ایک مسلمان کو انتہائی مسرت و فرحت اور ایک غیر مسلم کو تعجب و حیرت سے دوچار کر دیتا ہے۔ تاریخ کے اس باب کا مطالعہ ایک غیر جانب دار انسان کو یقین دلا دیتا ہے کہ اسلام کی روحانی قوت بے مثال اور لازوال ہے۔ یہ ایسا دین ہے جو ہر زمان و مکان میں انسانوں کے قلوب کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایسا دین ہے جو شدید ترین حالات اور مشکل ترین ادوار میں بھی نہ صرف باقی رہنے بلکہ آگے بڑھنے کی بھی طاقت رکھتا ہے اور ناقابلِ عبور رکاوٹوں سے بادِ صبا کی طرح گزر جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عالم اسلام پر چنگیز خان کے حملے کو سوا صدی گزرنے پر تمام مقبوضہ اسلامی ممالک کے تاتاری حکمران اپنے خاندانوں، قبیلوں اور رعایا سمیت اسلام قبول کر چکے تھے۔

تھامس آرنلڈ کا اعتراف:

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اسلام کے اس معجزے پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے بے ساختہ لکھتا ہے:

"اسلام کے لیے اپنی گزشتہ شان و شوکت کی خاکستر سے پھر جی اٹھنا اور اپنے مبلغوں کی کوشش سے ان وحشی تاتاریوں کو اپنا حلقہ بگوش بنانا مقدر ہو چکا تھا۔"[3]

---

① رحلۃ ابن بطوطۃ: ۱۲۷/۳، ط اکادیمیۃ المغربیۃ الرباط

② رحلۃ ابن بطوطۃ: ۱۵۱/۳

منگولیا کے رہائش کے قابل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں برف باری اور تیز ہواؤں کے طوفان اکثر آتے رہتے ہیں آج بھی منگولیا میں فی مربع کلومیٹر آبادی کی شرح بہت کم ہے۔ طوفانوں کے باعث یہاں کے مقامی لوگوں کی ہلاکتوں کی خبریں عموماً آتی رہتی ہیں۔

③ The preaching of Islam 170، دعوتِ اسلام: ترجمہ از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ط محکمہ اوقاف پنجاب

اکبر شاہ نجیب آبادی کا تبصرہ:

اکبر شاہ خان نجیب آبادی اس انقلاب کی تکوینی حکمتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے فاتح بن کر اپنے مفتوحوں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا تو دوسری طرف انہوں نے مفتوح ہو کر اپنے فاتحین کو بھی اسلام کا خادم بنالیا، اگر چنگیز خان اور ہلاکو خان کی ملک گیریاں اور خون ریزیاں ظہور میں نہ آتیں تو اسلام کی صداقت وعظمت کا یہ پہلو کہ وہ فاتحین کو بھی اپنا مفتوح بنا سکتا ہے، کسی قدر مشتبہ رہتا۔ پس مغلوں کی ترک تازیوں کو اگر ایک طرف عالم اسلام کے لیے مصیبت کبریٰ کہا جاسکتا ہے تو دوسری طرف اس کا نام رحمتِ عظمیٰ رکھا جاسکتا ہے۔''[1]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کا تبصرہ:

مؤرخ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تاتاریوں کے قبول اسلام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اسلام نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دامِ محبت میں اسیر کرنے کی عجیب و غریب قدرت حاصل ہے۔ تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، بڑے بڑے عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا درویش پیدا ہوئے اور انہوں نے بہت سے نازک مواقع پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔''[2]

ہیرلڈ لیمب کا اظہارِ افسوس:

دوسری طرف تاتاریوں کے قبولِ اسلام سے عیسائیوں کو شدید دھچکا لگا، جس کا اثر ان کی تحریروں سے آج بھی ظاہر ہوتا ہے۔ امریکی مستشرق ہیرلڈ لیمب (جسے مغربی دنیا غیر جانبدار اور محتاط تاریخ نویس باور کراتی ہے) اس موقع پر حسرت ناک انداز میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا:

''تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ جنوب مغرب میں (چنگیز خان کی اولاد نے) انہی عناصر کی پرورش کی جنہیں تباہ کرنے کے لیے وہ قراقرم سے آیا تھا۔''[3]

مغلوں کے قبولِ اسلام کے اسباب:

مذکورہ گفتگو سے بڑی حد تک مغلوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کے محیّر العقول انقلاب کے اسباب وعلل واضح ہو چکے ہیں مگر ہم بات کو سمیٹنے کے لیے ان اسباب کو نمبروار بیان کرتے ہیں:

① اسلام زندہ جاوید دین ہے، اس کی تعلیمات آفاقی اور ہر زمان ومکان کے لیے کافی ہیں، جب کہ دیگر مذاہب اوہام ورسوم، فرسودہ خیالات اور جھوٹی روایات کا مجموعہ ہیں۔ عقل اور حقیقت کی نگاہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں، عملی

---

① تاریخ اسلام نجیب آبادی: ۳/۳۳۳ ② تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/۳۳۴

③ March of The Barbarians p:287

زندگی میں ان کی کوئی کارفرمائی نہیں۔ مگر اسلام بجائے خود ایک زندگی ہے۔ یہ ایک برقی رو ہے جو فطرت کے ہمدم وہم ساز ہے۔ اسے مٹانا ناممکنات میں سے ہے۔ خالق کائنات خود اسلام کا محافظ ہے جس نے اسلام کی بقاء کا ذمہ لیا ہے۔

❷ خالق کائنات نے اسلام کی اشاعت اور اصلاح خلق کا ایک مربوط نظام دیا ہے جسے ''دعوت دین'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضور خاتم النبیین ﷺ نے امت کو دعوت اسلام کی عملی تعلیم دی۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ دعوت دین تھا۔ سچے دین کی اشاعت وحفاظت کا یہ نسخہ زوال کے اس دور میں بھی اُمت کے پاس تھا اور اہل علم وفضل دار باب معرفت نے اسے بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔

❸ تاتاری بالکل اجڈ اور جاہل تھے۔ انہیں علم سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کے ہاں طاقت واحد اُصول حیات تھا۔ ان کے پاس کوئی قدیم دین نہ تھا۔ ان کا اپنا مذہب ''شامانی'' جو ستارہ پرستی اور بُت پرستی پر مشتمل تھا، چند اوہام کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ آسمان، ستاروں، ہواؤں اور بُتوں کی پرستش کرتے تھے اور چنگیز خان کے قانون نامے ''یاسا'' پر عمل پیرا تھے۔ سخت گیر اور ستم پیشہ ہونے کے باوجود ان کی طبائع میں بدوؤں جیسی سادگی تھی۔ عقلی حجتوں اور دور دراز کی تاویلات سے وہ بالکل واقف نہ تھے۔ اس لیے جب وہ کسی بات کو حق سمجھ لیتے تو پھر اس پر ڈٹ جاتے تھے۔

❹ تاتاری منگولیا کے نیم وحشی ماحول سے نکل کر مشرق کے تمدن وثقافت پر قابض ہوئے تھے۔ اب انہیں متمدن اور عالم وفاضل اقوام سے واسطہ پڑ رہا تھا جن کی اعلیٰ تہذیب وتمدن اختیار کرنا انہیں جہانبانی کے لیے مفید بلکہ ضروری معلوم ہوا۔ چنانچہ وہ نہ صرف ان اقوام کے علوم وفنون اور اخلاق وآداب بلکہ ان کی ایمانیات کو بھی جاننے میں دلچسپی لینے لگے۔ جو مذاہب تاتاریوں کو اپنا حلقہ بگوش بنانے کے لیے کوشاں تھے، وہ ایک مستقل فلسفہ رکھتے تھے، اس لیے ہر مذہب کے مبلغین تاتاریوں کو متاثر کرنے کے متعلق پُر امید تھے۔ مگر اللہ نے ان میں سے اسلام کو واضح غلبہ عطا کیا۔

❺ اہم ترین سبب اسلام کی دعوت دینے والوں کی جاں سوز اور دل گداز محنت وریاضت تھا۔ ان گمنام مبلغین اور داعیوں میں وہ مجاہدین بھی تھے جو تاتاریوں کے آہنی قید خانوں میں ناقابل برداشت تشدد کا سامنا کر رہے تھے۔ اس عظیم مہم میں ان مردوں اور خواتین کا بھی حصہ ہے جو غلاموں اور باندیوں کی حیثیت سے ان کے ہاں حقیر اور پست خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان داعیوں میں وہ صوفیاء بھی تھے جو مقبوضہ ممالک میں گوشہ تنہائی میں بیٹھے دنیا کا نقشہ پلٹنے کے لیے دن کو خاموش دعوت اور راتوں کو چپکے چپکے دعاؤں میں مصروف تھے۔ ان میں بعض ایسے معزز مسلمان بھی تھے جو اپنی دنیوی قابلیت اور فنون میں مہارت کے باعث تاتاریوں کے ہاں کوئی موزوں عہدہ پا چکے تھے اور اپنے مقام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی حکمت عملی اور دانائی کے ساتھ ان کو راہ حق کی تلاش پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔

جب اس سوز واخلاص کے ساتھ حکام کو اسلام کی دعوت دی گئی تو انہوں نے پہلی بار دل کے اندھیروں میں اجالے کی کرنیں محسوس کیں۔ ان کے شہزادوں اور اعلیٰ عہدے داروں نے اس پر غور کیا اور یکے بعد دیگرے اس سچائی کو تسلیم کیا۔ ان کے بعد عام تاتاری بھی جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔

نومسلم مغلوں کے کارنامے

غیر مسلم تاتاری حکمرانوں نے عالم اسلام کو صرف انسانوں کی قتل گاہ اور اپنے مویشیوں کی چراگاہ کے طور پر استعمال کیا تھا، مگر اسلام قبول کرنے والے تاتاری حکمرانوں نے از سرِ نو ملکوں کی آباد کاری کا کام شروع کیا۔ چونکہ اس دوران چنگیز خان کی نسل بہت پھیل گئی تھی اور اس کی آل اولاد کے درجنوں خاندان وجود میں آ چکے تھے اس لیے ان کے مابین حصولِ اقتدار کے لیے کشت وخون بھی جاری رہا جس سے مختلف ریاستیں متاثر ہورہی تھیں تاہم یہ جنگیں محدود پیمانے پر تھیں اور انسانوں کے قتلِ عام کے وہ مناظر اب نہیں دُہرائے جارہے تھے جو کہ تاتاریوں کی بہیمانہ روایات کا حصہ تھے۔ نومسلم تاتاری حکمرانوں میں سے سلطان برکہ خان، سلطان احمد خان، محمود غازان، سلطان محمد خدابندہ، سلطان ابو سعید، طرمہ شیریں خان اور محمد اوزبک خان نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے بہت کام کیا، نئے سرے سے آباد کاری پر توجہ دی۔ تجارتی قافلوں کی آمد ورفت تاتاریوں کے مظالم کے ڈر سے کئی عشروں سے بند تھی، اسے دوبارہ بحال کیا گیا۔ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت کا نیا گلشن آباد ہونے لگا۔ اُجڑی ہوئی مسلم دنیا کو آب پاشی کے ذریعے زرخیز بنانے پر خاص توجہ دی گئی اور بہت سے سابقہ ٹیکس ختم کردیے گئے۔ چونکہ تاتاری حکمرانوں کا تعلق چین سے تھا، اس لیے ہند، عراق اور خراسان کے مسلمانوں کے تعلقات وسطی چین تک وسیع ہونے لگے۔

چینی صنعت کاروں نے اپنے فن نقاشی کو افغانستان، ہند اور وسط ایشیا تک منتقل کیا جبکہ افغانستان اور ایران سے قالین بافی کا ہنر چین پہنچا۔ تہذیبی، ثقافتی اور صنعتی روابط کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے قول وعمل سے اسلام کا پیغام چین کے ان دور دراز کے علاقوں تک پھیل گیا جو اَب تک اسلام سے محروم تھے۔ ①

مسلم تاتاریوں کی ایک شاخ جو ”شاہانِ مغلیہ“ کے نام سے پہچانی جاتی ہے، صدیوں تک ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی محافظ رہی۔ اس خانوادے میں بابر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب عالمگیر جیسے نامور حکمران پیدا ہوئے جن کے کارنامے آج تک اسلامی تاریخ میں محفوظ ہیں اور برصغیر کے طول وعرض میں ان کی یادگاریں آج بھی ان کی عظمتِ رفتہ کی داستانیں سناتی نظر آتی ہیں۔ تاریخ کے اس تحیر خیز انقلاب اور تاتاریوں کی اس کایا پلٹ کو دیکھ کر بے اختیار اقبال مرحوم کا یہ شعر لبوں پر آ جاتا ہے:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

---

① الدولة الخوارزمية و المغول، ص ۲۵۳ تا ۲۷۳ ؛ انتشار الاسلام بین المغول، ص ۱۴۲ تا ۱۷۳، ۲۰۸ تا ۲۲۶، ۲۲۹ تا ۲۵۷

فہارسِ خاناتِ مغلیہ

(۱) سلطنت منگولیا و چین

نمبر	حکمران	دور حکومت	خاص بات
۱	چنگیز خان	۶۰۳ھ تا ۶۲۴ھ (۱۲۰۶ء تا ۱۲۲۷ء)	بانی مغلی سلطنت۔
۲	اوکتائی خان بن چنگیز	۶۲۴ھ تا ۶۳۹ھ (۱۲۲۷ء تا ۱۲۴۱ء)	روس و یورپ کی از سر نو فتح
	توراکینہ خاتون زوجۂ اوکتائی	۶۳۹ھ تا ۶۴۴ھ (۱۲۴۱ء تا ۱۲۴۶ء)	عبوری دور
۳	گیوک خان بن تولی بن چنگیز	۶۴۴ھ تا ۶۴۵ھ (۱۲۴۶ء تا ۱۲۴۷ء)	نصرانیت نوازی
۴	منگو خان بن تولی	۶۴۵ھ تا ۶۵۵ھ (۱۲۴۷ء تا ۱۲۵۷ء)	ایشیا پر نئی فوج کشی
	ارتق بوقا بن تولی (باغی)	۶۵۵ھ تا ۶۵۸ھ (۱۲۵۷ء تا ۱۲۶۰ء)	قوبلائی سے خانہ جنگی
۶	قوبلائی خان بن تولی	۶۵۸ھ تا ۶۹۳ھ (۱۲۶۰ء تا ۱۲۹۳ء)	خاناتِ منگولیا کا دورِ عروج۔ نیا پایۂ تخت "خان بالیغ" (پیکنگ) آباد کیا۔

(۲) خاناتِ قبچاق

نمبر	حکمران	آغاز حکومت	خاص بات
۱	جوجی بن چنگیز	۶۱۸ھ تا ۶۲۴ھ (۱۲۲۱ء تا ۱۲۲۷ء)	بانی مغل شاخ زریں خیل
۲	باتو بن جوجی	۶۲۴ھ تا ۶۵۰ھ (۱۲۲۷ء تا ۱۲۵۲ء)	روس پر حملہ۔ ماسکو اور پولینڈ پر قبضہ
	سرتاق بن باتو	۶۵۰ھ (۱۲۵۲ء)	مختصر حکومت

	تولا بغا بن سرتاق	۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء)	مختصر حکومت
۳	برکہ بن جوجی	۶۵۲ھ تا ۶۶۵ھ (۱۲۵۶ء تا ۱۲۶۷ء)	اسلام قبول کرنے میں پہل، ایل خانی تاتاریوں سے جہاد
۴	منکو تیمور بن طغان بن باتو	۶۶۵ھ تا ۶۸۱ھ (۱۲۶۷ء تا ۱۲۸۳ء)	قسطنطنیہ پر حملہ، ایل خانیوں سے جنگیں۔ اسلام قبول کرنا ثابت نہیں مگر مسلمانوں کا دشمن نہ تھا۔
۵	تدان منکو خان بن طغان بن باتو	۶۸۲ھ تا ۶۸۶ھ (۱۲۸۳ء تا ۱۲۸۷ء)	پکا مسلمان ہے۔ سلطنت میں اسلام کی اشاعت کی۔ ہنگری، بلغاریہ اور یوکرائن کے نصرانیوں سے جہاد کیا۔ آخر میں ازخود سلطنت چھوڑ کر صوفیائے کرام کی رفاقت اختیار کر لی۔
۶	تلابغا بن منکو تیمور	۶۸۶ھ تا ۶۹۰ھ (۱۲۸۷ء تا ۱۲۹۱ء)	مختصر دورِ حکومت، مسلم حکمران
۷	طقطائی بن منکو تیمور	۶۹۰ھ تا ۷۱۲ھ (۱۲۹۱ء تا ۱۳۱۲ء)	ستارہ پرست، مسلمانوں کے لیے نرم، سلاجقۂ روم سے جنگیں لڑیں۔
۸	محمد اوزبک غیاث الدین بن طغرل شاہ بن منکو تیمور	۷۱۲ھ تا ۷۳۶ھ (۱۳۱۲ء تا ۱۳۳۶ء)	اوزبک قوم کا بانی۔ اشاعتِ اسلام میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ تاتاریوں کی دیگر ریاستوں سے جنگیں بھی جاری رہیں۔
۹	جانی بیگ بن طغرل	۷۳۶ھ تا ۷۵۶ھ (۱۳۳۶ء تا ۱۳۵۶ء)	
۱۰	محمد بردو بیگ بن جانی	۷۵۶ھ تا ۷۵۹ھ (۱۳۵۶ء تا ۱۳۵۹ء)	

بردو بیگ کے بعد اس کے بیٹے سکندر خان اور پوتے عبداللہ خان نے حکومت کی۔ نویں صدی ہجری (پندرہویں صدی عیسوی) میں یہ سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل ہوگئی۔ [1]

[1] تاریخ ابن خلدون: ج ۵ ص ۶۰۷ تا ۶۰۹، ط دار الفکر

(۳) ایل خانی سلطنت

نمبر	حکمران	دور حکومت	معاصر سلاطین	خاص بات
۱	ہلاکو خان	۶۵۴ھ تا ۶۶۳ھ (۱۲۵۶ء تا ۱۲۶۵ء)	قطز، بیبرس	بانی ایل خانی سلطنت
۲	اباقا بن ہلاکو (نصرانی)	۶۶۳ھ تا ۶۸۰ھ (۱۲۶۵ء تا ۱۲۸۱ء)	بیبرس، قلاوون	شام پر حملے
۳	تکودار احمد۔ مسلم	۶۸۰ھ تا ۶۸۳ھ (۱۲۸۱ء تا ۱۲۸۴ء)	قلاوون	مشرف بہ اسلام ہوکر ممالیک سے صلح کی
۴	ارغون بن اباقا	۶۸۳ھ تا ۶۹۰ھ (۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء)	قلاوون	شام پر حملے
۵	کے خاتو بن ہلاکو۔ مسلم	۶۹۰ھ تا ۶۹۴ھ (۱۲۹۱ء تا ۱۲۹۵ء)	الاشرف خلیل	مغلوں میں خانہ جنگی
۶	بایدو بن طراقائی بن ہلاکو	جمادی الآخرہ ۶۹۴ھ تا ذوالحجہ ۶۹۴ھ (اپریل ۱۲۹۵ تا اکتوبر ۱۲۹۵ء)	محمد الناصر بن قلاوون	
۷	غازان محمود بن ارغون، مسلم	ذوالحجہ ۶۹۴ھ تا ۷۰۳ھ (اکتوبر ۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۴ء)	العادل کتبوغا، لاجین، الناصر بن قلاوون	شام پر حملے
۸	اولجائتو بن ارغون، محمد خدابندہ	۷۰۳ھ تا ۷۱۶ھ (۱۳۰۴ء تا ۱۳۱۶ء)	بیبرس ثانی جاشنگیر، محمد الناصر بن قلاوون	رفض کی اشاعت۔ بعد میں توبہ تائب ہوکر سنی ہوگیا۔
۹	ابوسعید۔ سنی مسلم	۷۱۶ھ تا ۷۳۶ھ (۱۳۱۶ء تا ۱۳۳۶ء)	محمد الناصر بن قلاوون	سنت کا احیاء۔ ممالیک سے صلح

(۳) خاناتِ چغتائیہ

نمبر	حکمران	دور حکومت	خاص بات
۱	چغتائی خان بن چنگیز	۶۲۴ھ (۱۲۲۶ء) تا ۶۳۸ (۱۲۴۱ء)	بانی سلطنت
۲	قرابلا خان بن چغتائی	۶۳۸ھ (۱۲۴۱ء) تا ۶۵۲ (۱۲۵۴ء)	
۳	ارغانہ خاتون زوجہ قرابلا	کچھ مدت	
۴	الغوخان، چغتائی کا پوتا	۶۵۲ (۱۲۵۴ء) تا ۶۶۴ (۱۲۶۵ء)	
۵	مبارک شاہ بن ارغانہ	۶۶۴ھ (۱۲۶۵ء) تا ۶۶۸ (۱۲۷۰ء)	چغتائی سلطنت کا پہلا مسلم حکمران
۶	براق خان غیاث الدین	۶۶۸ (۱۲۷۰ء) تا ۶۶۹ (۱۲۷۰ء)	مسلم حکمران
۷	دوآخان بن براق	۶۶۹ (۱۲۷۰ء)	
	خانہ جنگی کا دور	۶۶۹ (۱۲۷۰ء) تا ۷۰۹ھ (۱۳۰۹ء)	
۸	اسان بغا بن دوا خان	۷۰۹ھ (۱۳۰۹ء) تا ۷۱۸ھ (۱۳۱۸ء)	
۹	کبک خان	۷۱۸ھ (۱۳۱۸ء) تا ۷۲۶ھ (۱۳۲۶ء)	بدھ مت قبول کیا، پھر خفیہ مسلمان ہوا
۱۰	ترمہ شیرین خان	۷۲۶ھ (۱۳۲۶ء) تا ۷۳۴ھ (۱۳۳۴ء)	مشرف با اسلام ہوا
۱۱	جنک شائی	۷۳۴ھ (۱۳۳۴ء) تا ۷۳۵ھ (۱۳۳۵ء)	بدھ مت اور نصرانیت کا سرپرست
۱۲	بوزون	۷۳۵ھ (۱۳۳۵ء) تا ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء)	برائے نام مسلمان، نصاریٰ کا سرپرست
۱۳	خلیل بن یسور بن دوا	۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) تا ۷۴۴ھ (۱۳۴۳ء)	صوفی، اشاعتِ اسلام میں سرگرم
۱۴	تیمور خان		
۱۵	غازان بن میسور بن دوا خان		
۱۶	دانش مندا غلن		
۱۷	قلی خان		
۱۸	تغلق تیمور	۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) تا ۷۶۵ھ (۱۳۶۳ء)	مشرف بہ اسلام ہوا۔ تیمور لنگ کا آقا
۱۹	خواجہ خضر خان		تیمور لنگ کا سسر

تیسرا محاذ......اُمّت کی اصلاح اور راہنمائی

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کی نازک گھڑیوں میں جہاں ایک طرف غیور اور جرأت مند مسلم قائدین نے ملتِ اسلامیہ کی جغرافیائی حد بندی کو مزید پامال ہونے سے بچایا اور دوسری طرف گمنام مبلغین نے تاتاریوں میں اسلام کی اشاعت کی وہاں مسلمانوں کی نئی نسل کے عقائد ونظریات کی حفاظت اور ان کی اصلاح وتربیت کے لیے امت کے وہ رجال کار اٹھ کھڑے ہوئے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے مالا مال اور علم وفضل کی دولت سے آراستہ تھے، ان میں بڑا حصہ ان قوی الایمان اور صاحب حال بزرگوں کا تھا جو سلف صالحین کی نسبت خاصہ کے وارث، ان کے معارف کے امین اور ان کے تربیت یافتہ تھے جنہیں صوفیاء اور مشائخ کہا جاتا ہے۔

اس شکستگی، تباہی اور یاس کے عالم میں باقی ماندہ مسلمان اگر کسی چیز کے سہارے زندہ رہ سکتے تھے تو وہ اللہ کی یاد، اس سے تعلق اور اس کے دینِ مبین پر عمل تھا۔ عالم اسلام کے اکثر آباد حصے پر تاتاریوں کے جابرانہ قبضے، مسلمانوں کی بے رحمانہ نسل کشی اور نصرانی مبلغین کی سرگرمیوں نے باقی ماندہ امتِ مسلمہ کو ذہنی ارتداد پر برانگیختہ کرنے والے کئی عوامل جمع کردیے تھے۔ اس صورتحال نے اللہ والوں کو بے چین کردیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ اگر سیاسی شکست و ریخت کے بعد ذہنی گمراہی کے اس سیلاب کے سامنے رکاوٹیں نہ کھڑی کی گئیں تو آیندہ برسوں میں اسلام اور مسلمانوں کا بچا کھچا ڈھانچہ بھی نابود ہوجائے گا۔ اس دور کے ایک صوفی بزرگ شیخ نجم الدین رازی رحمہ اللہ (جو شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ کے فیض یافتہ تھے) اپنی تصنیف "مرصاد العباد" کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

> "نعوذ باللہ اس بات کا خوف اور خطرہ پیدا ہو چلا ہے کہ مسلمانی کا جو نام باقی رہ گیا ہے، ہم حقیقت سے کورے مسلمانوں کی شامت اعمال کے سبب یہ بھی ختم ہوجائے اور اسلام کا نام ونشان تک مٹ جائے۔"[1]

اس صورت حال نے مصلحین اُمت کو تڑپا دیا، چنانچہ وہ ہر خطرے سے بے پروا اور ہر طرف سے یکسو ہو کر اُمت کی اصلاح اور درپیش نازک حالات میں ان کی شرعی راہنمائی کے کام میں جُت گئے۔ ان میں علماء بھی تھے اور صوفیاء بھی۔ ان اولوالعزم علماء کی جدوجہد اور ان صوفیائے کرام کے سلاسل کو عالم اسلام میں غیر معمولی پذیرائی نصیب ہوئی۔ اگلے دور کی سیاست، علمی ورثے اور ادب وشاعری پر ان اصحابِ عزیمت کی تعلیمات کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔ ان مصلحین نے نئے سرے سے ایمان ومعرفت کی شمعیں روشن کیں اور معاشرے میں اصلاحِ قلب کی محنت پر زور دیا تاکہ لوگ

[1] مرصاد العباد، ص ۱۰۹، قلمی نسخہ، موجود در کتب خانہ آستانہ، قم (ایران)

اللہ کی طرف انابت، مصائب وحوادث پر صبر، تھوڑے مال پر قناعت، دنیا سے لاتعلقی اور فکرِ آخرت کے عادی بن جائیں۔ علمائے مجددین نے حوادث کی تیز آندھیوں میں اُمت کا ہاتھ پکڑا اور اسے بڑی حکمت ودانائی اور تدبر کے ساتھ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکال کرلے گئے۔ ذیل میں ایسی چند عبقری شخصیات کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کی اصلاحی، تبلیغی اور تجدیدی کوششوں کے اثرات آج تک اسلامی دنیا پر ثبت ہیں۔

❁❁❁

شیخ سیف الدین باخَرزِی

۵۸۶ھ تا ۶۵۹ھ

اس پُرآشوب دور میں شیخ سیف الدین باخَرزِی رحمہ اللہ نے جو علم اور معرفت میں اپنے دور کے بے تاج بادشاہ تھے، بڑا انقلاب آفرین کام کیا اور دعوتِ اسلام اور تربیتِ رجال کے میدان میں اُمت مسلمہ کے لیے ایک مثال بن گئے۔

وہ ۹ شعبان ۵۸۶ھ کو نیشاپور اور ہرات کے درمیان واقع قصبے ''باخَرز'' میں پیدا ہوئے تھے۔ نام سعید بن مُطَہّر تھا مگر سیف الدین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ علومِ دینیہ میں ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ علم حدیث سے انہیں خاص شغف تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں وہ بغداد آئے تھے اور علامہ ابن الجوزی سے سماعِ حدیث کیا تھا۔ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ کے فرزند علامہ جلال الدین رحمہ اللہ سے فقہی مہارت حاصل کی۔ [1] فقہ حنفی پر دسترس کے باعث انہیں فقہائے احناف میں شمار کیا جاتا ہے۔ [2]

ان کے چہرے پر انوارات کا اتنا غلبہ تھا کہ نگاہ بھر کر دیکھنا مشکل تھا۔ ان کے پیرومرشد شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ انہیں شارعِ عام پر چلتے ہوئے نقاب پہننے کی تاکید کرتے تھے تاکہ لوگ ان کو دیکھ کر بے خود نہ ہوجائیں۔ [3]

وہ شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ کے حکم پر ۶۱۸ھ میں خوارزم کے پایۂ تخت اُورگنج سے بُخارا آئے جو تاتاریوں کے حملے سے ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۳۲ سال تھی۔ بخارا کو مرکز بنا کر انہوں نے چالیس سال اَن تھک کام کیا۔ ان کی خانقاہ بیک وقت مرکزِ سلوک اور مدرسۂ حدیث تھی جہاں انہوں نے ۶۲۲ھ سے بخاری شریف کا درس دینا شروع کیا تھا۔ [4] شیخ منہاج الدین نسفی رحمہ اللہ ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''وہ اصول وفروع میں حدیث کے تابع تھے۔ وہ فلکیات اور طب میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا طریقِ سلوک تکلفات سے پاک تھا۔ وہ علم وفضل میں ایک بے کراں سمندر تھے۔ درحقیقت وہ اگلوں اور پچھلوں کے لیے سرمایۂ فخر تھے۔ انہیں ایک جلال اور ایک وجاہت حاصل تھی۔ ان کی شہرت مسلمانوں اور تاتاریوں میں عام تھی۔

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۳، ط الرسالۃ
[2] الجواھر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ: ۱/۲۴۹
[3] سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۵، ط الرسالۃ
[4] سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۵، ط الرسالۃ

ان کی ہمت سے علم حدیث ترکستان اور ماوراء النہر میں (ایک بار پھر) پھیل گیا۔ پس ان علاقوں میں سنت کے انوارات چھاگئے۔''[1]

تاہم اس مقبولیت سے قبل شیخ بڑے سخت امتحانات سے گزرے تھے۔ جب وہ بخارا آئے تو انہی دنوں سمرقند میں بایقو اخان نامی ایک تاتاری گورنر کا تقرر ہوگیا۔[2] یہ بڑا سفاک انسان تھا۔ اس نے ترمذ پر حملے کے دوران درندگی اور وحشت کی انتہا کرتے ہوئے نہ صرف تمام مسلمانوں کو قتل کرا دیا تھا، بلکہ شہر کے جانوروں اور پرندوں تک کو مروا ڈالا تھا۔ اسے شیخ رحمہ اللہ کی سرگرمیوں اوران کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی خبر ملی۔ فسادی حاشیہ برداروں نے ان باتوں کو غلط رنگ دے کر بیان کیا اور کہا: ''آخر یہ شخص آپ کے علاقے میں کیا کرنے آیا ہے؟ یقیناً وہ خلیفہ بننا چاہتا ہے۔''

یہ سن کر بایقو اخان آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے حکم دیا کہ شیخ کو گرفتار کر کے سمرقند لایا جائے۔ جب اس کے سپاہی شیخ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر انہیں ننگی تلواروں کے پہرے میں بخارا سے سمرقند لے جا رہے تھے تو شیخ رحمہ اللہ کے چہرے پر خوف کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے کہہ رہے تھے:

''اس ذلت کے بعد جلد ہی مجھے بڑی عزت نصیب ہوگی۔''

خدا کی قدرت کہ ادھر شیخ باخرزی رحمہ اللہ سمرقند کے قریب پہنچے ادھر ظالم وجابر بایقو اخان کی روح پرواز کر گئی۔ تاتاری سپاہیوں کو جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے شیخ کو آزاد کر دیا اور اس کرامت سے متاثر ہو کر بہت سے تاتاری اسلام لے آئے۔ اہل سمرقند کو شیخ رحمہ اللہ کی آمد کی خبر پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے زبردست جوش وخروش کے ساتھ شیخ کا استقبال کیا۔ ان کی درخواست پر شیخ رحمہ اللہ چند دن سمرقند میں رہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے مزار کی زیارت کے لیے ''خرتنگ'' بھی گئے۔ لوگوں نے ان سے خوب استفادہ کیا۔ کچھ دن بعد شیخ رحمہ اللہ بخارا واپس تشریف لے گئے۔[3]

ان کی زندگی کا ہر لمحہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل تھا بلکہ تاتاری افسران اور سپاہی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ان کو دیکھ کر ان گنت مسلمانوں نے اپنی اصلاح کی اور بے شمار تاتاریوں نے خفیہ طور پر دین اسلام قبول کیا۔ تاتاری امراء ان سے اتنے متاثر تھے کہ ان کی کسی بات کو مسترد نہیں کرتے تھے۔

۶۳۶ھ میں تارابی نامی ایک فتنہ باز شخص نے جھوٹی کرامات اور مکاشفات کے ذریعے ایک خلقت کو اپنے گرد اکھٹا کر کے مغلوں سے ٹکر لی جس کے نتیجے میں وہ خود اپنے سات ہزار پیروکاروں سمیت قتل ہوا، اس کے باقی پیروکار بھی قتل ہو جاتے مگر شیخ باخرزی کی سفارش پر مغل امراء نے ان کی جاں بخشی کر دی اور پیشانیوں پر داغ لگا کر چھوڑ دیا۔[4]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۴، ط الرسالۃ

② سمرقند اس وقت وسط ایشیا کا انتظامی مرکز تھا اور بخارا بھی اسی کے تحت آتا تھا۔

③ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۵، ۳۶۶، ط الرسالۃ

④ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۵...... نوٹ: تاراب بخارا سے ۹ میل دور ایک بستی ہے۔ تارابی کا ظہور یہیں سے ہوا تھا۔ اس کا اصل نام محمود تھا۔ وہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں۔ وہ غیب دانی کا بھی دعوے دار تھا اور یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اسے پرواز کی قوت حاصل ہے۔ اس کے قتل ہونے پر بھی اس کے مرید یہی تصور کرتے رہے کہ وہ پرواز کر کے غائب ہوگیا ہے اور اب اگلے کسی زمانے میں ظاہر ہوگا۔ (تاریخ جہان کشا از عطا ملک جوینی، ص ۱۹۱ تا ۱۹۲، ط ہرمس)

انہی دنوں تاتاریوں کا ایک بڑا سردار شیخ کی دعوت پر مشرف بہ اسلام ہو کر ان کا مرید بن گیا۔ شیخ نے اس کا نام ''مؤمن'' رکھا۔ چونکہ شیخ رحمہ اللہ جس طرح اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے اس سے ان کی جان ہر وقت خطرے میں تھی، لہٰذا نومسلم تاتاری سردار شیخ کا مستقل پہرے دار بن گیا۔ ①

حافظ ذہبی رحمہ اللہ تاتاریوں میں شیخ باخرزی رحمہ اللہ کی اس مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''تاتاریوں میں شیخ باخرزی رحمہ اللہ ''الغ شیخ'' یعنی بڑے حضرت کے نام سے مشہور تھے۔'' ②

تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام کے حوالے سے شیخ باخرزی رحمہ اللہ کی شہرت پورے عالم اسلام میں پھیل چکی تھی۔ عباسی خلیفہ کے دربار میں بھی ان کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ امراء اور حکام سے تعلقات رکھنا پسند نہیں کرتے تھے مگر عوام و خواص سبھی ان کی دعاؤں اور توجہات کے طالب رہتے تھے اور کوئی نہ کوئی خدمت بجالانا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ مستعصم باللہ انہیں گراں قدر تحائف بھیجا کرتا تھا۔ ایک بار بھیجے گئے تحائف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید بھی تھا۔ حاکم آذربائی جان مظفر اوزبک پہلوان کی بیٹی نے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ دانت مبارک بھیجا تھا جو غزوۂ اُحد میں شہید ہوا تھا۔ حاکمِ شیراز ابوبکر بن سعد ہر سال ان کی خانقاہ کے لیے ایک ہزار دینار کا ہدیہ بھیجتا تھا۔ حاکمِ موصل بدرالدین لؤلؤ نے بھی ایک بار ہدایا ارسال کیے تھے۔ فرمانروائے دہلی سلطان ناصرالدین محمود اور اس کے نائبِ سلطنت سلطان غیاث الدین بلبن نے بھی ان سے مراسلت کی تھی۔ ③

محمود یلواج جب بخارا کا گورنر بنا تو اس نے فی نفر ایک دینار اور ہر تجارتی مال پر دسواں حصہ ٹیکس لگا دیا۔ اس دوران اس نے شیخ رحمہ اللہ کی بزرگی کی شہرت سن کر انہیں ایک ہزار دینار پیش کیے، مگر شیخ رحمہ اللہ نے ناجائز طریقوں سے حاصل کیے ہوئے اس مال کو بڑی بے نیازی سے ٹھکرا دیا۔ ④

۶۴۵ھ میں جب منگوخان منگولیا کے تخت پر بیٹھا تو اس نے انہیں بہت سے ہدایا بھجوائے ⑤ اور چاندی کی

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۵، ۳۶۶، ط الرسالۃ

② "وَعُرِفَ الشَّیْخُ بَیْنَ التَّارِبِ "اَلغُ شَیْخُ" یعنی "اَلشَّیْخُ الْکَبِیْرُ." (سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۶)

③ غیاث الدین بلبن نے یقیناً یہ مراسلت نائب السلطنت کے طور پر کی تھی کیوں کہ اس کے بادشاہ بننے سے چند سال قبل شیخ باخرزی کی وفات ہو گئی تھی۔

④ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۵، ط الرسالۃ

محمود بن محمد خوارزم کا باشندہ تھا اور چنگیز خان کے ہاں تجارت کے لیے گیا تھا، چنگیز خان کی عنایات نے اسے خرید لیا اور وہ سلطنتِ منگولیا کا وفادار بن گیا۔ وہ چنگیز خان کی طرف سے ابتداء میں سفارتی امور پر مقرر تھا۔ سفیر کو مغلی زبان میں ''یلواج'' کہتے ہیں، چنانچہ یہ لفظ اس کے نام کا جزو بن گیا۔ وہ بہت ہوشیار آدمی تھا۔ بیک وقت عربی، فارسی، ترکی، مغلی، ایغوری، خطائی اور ہندی زبانیں جانتا تھا۔ ترقی کر کے وہ چنگیز اور اس کی اولاد کا وزیر اور پھر گورنر بن گیا۔ وسطِ ایشیا کا گورنر بننے کے بعد اس نے کئی تباہ شدہ اسلامی شہروں کو از سرِ نو آباد کرایا۔ (مجمع الآداب لابن الفوطی: ۳/۱۹۸، ط ایران)

اگرچہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے محمود یلواج ملتِ اسلامیہ کا غدار تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ خوارزم پر چنگیز خان کے حملے کی کامیابی میں اس کا بھی ہاتھ تھا تاہم بعد میں اس نے جو تعمیری کام کرائے، وہ اس کے ماضی کی کسی قدر تلافی کر دیتے ہیں۔ محمود یلواج کی وفات ۶۵۲ھ میں ہوئی اور اس کا بیٹا مسعود بیگ اپنی وفات ۶۸۸ھ تک اس کی مسند پر رہا۔ وہ بڑا عالم فاضل آدمی تھا۔ پھر اس کا بیٹا ابوبکر ۶۹۷ھ تک اس عہدے پر رہا۔ ان دونوں نے بہت سے تعمیراتی کام کرائے۔ (دور ترکستان فی اسلام المغول للدکتور محمد علی البار، ص ۳۱)

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲۳/۳۶۷، ط الرسالۃ

ایک ہزار اینٹیں بھی بخارا بھیجیں تاکہ شیخ باخرزی کی سرپرستی میں ایک مدرسہ بنایا جائے۔ منگوخان کے حکم پر اس مدرسے کے اخراجات کے لیے وسیع وعریض زرعی زمین بھی خرید کر وقف کی گئی۔ [1]

منگوخان کے دور میں محمود یلواج کا بیٹا مسعود بخارا کا گورنر بن کر آیا جو ایک معتزلی عالم تھا۔ اس نے شیخ کی چوکھٹ کو بوسہ دیا اور اس وقت تک باہر کھڑا رہا جب تک باریابی کی اجازت نہ ہوگئی۔ وہ کہتا تھا: ''شیخ کی ہیبت ہمارے حکام کے دلوں میں اس قدر ہے کہ اگر شیخ انہیں میرے قتل کا کہیں تو وہ مجھے بلاتوقف قتل کر دیں۔'' [2]

شیخ باخرزی ہمیشہ حق گوئی اور راست بازی کی راہ پر قائم رہے اور ظالم حکام کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے سے انہوں نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ جب چغتائی خان کا وزیر عمید الدین حبش وسطِ ایشیا کا گورنر بنا تو شروع میں اس نے مسلمانوں کی عزت وحرمت کے تحفظ کا خیال نہ کیا بلکہ اپنے تاتاری آقاؤں کو خوش رکھنا ہی اس کا مقصود ٹھہرا۔ ایسے میں شیخ باخرزی رحمہ اللہ نے اسے ایک مراسلہ لکھا اور اسے سخت الفاظ میں ملامت کرتے ہوئے کہا:

''اللہ نے تمہیں یہ اقتدار عطا کیا ہے تو تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم حق کا ساتھ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو بتاؤ کل قیامت کے دن اللہ کے سامنے کیا عذر پیش کرو گے؟'' [3]

شیخ رحمہ اللہ ایک بہترین خطیب تھے اور فی البدیہہ نہایت مؤثر خطبات دیتے تھے جن میں نصیحت آموز اشعار کی چاشنی بھی شامل ہوتی تھی۔ شیخ رحمہ اللہ کے ساٹھ غلام تھے جو سب کے سب حافظِ قرآن اور خوش نویس تھے۔ شیخ رحمہ اللہ انہیں قرآن مجید اور حدیث بھی پڑھاتے تھے۔

شیخ رحمہ اللہ کی وفات ذوالقعدہ ۶۵۹ھ میں ہوئی۔ انہیں ان کی وصیت کے مطابق ان کے مرشد شیخ نجم الدین کبریٰ کے خرقے میں کفن دیا گیا۔ ان کی وصیت یہ بھی تھی میری میت پر کوئی نوحہ اور ماتم ہرگز نہ کیا جائے اور جنازے کے آگے آگے قرآن مجید کی تلاوت کی رسم بھی نہ کی جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ان کی نمازِ جنازہ میں چار لاکھ افراد نے شرکت کی۔ [4] انہوں نے اپنے ورثے میں نیک اولاد، مجازینِ سلسلہ، تربیت یافتہ مریدین اور نومسلم تاتاریوں کا جمِ غفیر چھوڑا۔ اس کے علاوہ وہ صوفیانہ اشعار، رسائل، فتاویٰ اور مکاتیب کا ایک بڑا ذخیرہ بھی چھوڑ گئے جس میں سے زیادہ تر گردشِ زمانہ سے تلف ہوگیا جب کہ اس کا کچھ حصہ ''مجموعہ آثار سیف الدین باخرزی'' سے شائع ہو چکا ہے۔ [5]

❁❁❁

---

① تاریخ جہان کشاجوینی، ص ۱۳۲، ط انتشارات ہرمس، ایران ؛ تاریخ حبیب السیر: ۳/ ۶۱

② سیر اعلام النبلاء: ۲۳/ ۳۶۷، ط الرسالۃ

③ دور ترکستان فی اسلام المغول للدکتور محمد علی البار، ص ۳۱، ۳۲

④ سیر اعلام النبلاء: ۲۳ص ۳۶۳ تا ۳۶۹، ط الرسالۃ

⑤ یہ مجموعہ مولانا غلام نبی توکلی چشتی کی مساعی سے مرتب ہوکر ''منشورات نشر تہران'' سے شائع ہوا ہے۔

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

(۵۸۹ھ تا ۶۹۴ھ (۱۱۹۳ء تا ۱۲۹۴ء)

تاتاریوں کے زیرِ قبضہ مسلم ممالک کے محکوم مسلمانوں کو اس دور میں ایسے بلند ہمت اور جہاں دیدہ مصلحین کی سخت ضرورت تھی جن کی سرپرستی اور راہنمائی میں وہ اپنی زندگی کی راہ متعین کریں اور ان کے تجربات کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں کا سامنا کریں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جو رجال کار کھڑے ہوئے ان میں شیخ سعدی رحمہ اللہ کا کردار بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے بغداد میں علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، اس کے علاوہ تحصیل علم کی خاطر دیس دیس پھرے تھے اور عراق، حجاز اور شام کے کونے کونے میں گئے تھے۔ اسی دوران وہ ساحل شام کے نصرانیوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوئے اور پھر ایک مسلمان امیر نے زرِفدیہ ادا کر کے انہیں رہائی دلوائی اور اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ وہ ہندوستان بھی گئے اور پنڈتوں سے بحث و مباحثہ کیا۔ ایک بار پجاری کا روپ دھار کر ایک مندر میں کچھ دن گزارے۔ عالم اسلام پر تاتاری یلغار سے کچھ عرصے قبل جبکہ سلطنتِ خوارزم اور چنگیز خانی سلطنت کے مابین تجارتی معاہدہ ہو چکا تھا، انہوں نے چینی ترکستان کا سفر کیا۔ یہ ان کا دورِ جوانی تھا مگر ان کے اشعار اس وقت بھی اس دور دراز علاقے میں مقبول تھے۔ آخر تاتاریوں کی یورش کا قیامت خیز حادثہ پیش آیا جس میں دیگر سلطنتوں کے ساتھ ان کا آبائی وطن شیراز بھی لپیٹ میں آیا۔ یہ زمانہ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے بے وطنی کی حالت میں گزارا۔ امت مسلمہ پر سکرات کی اس کیفیت اور مختلف ممالک اور طبقات میں اس حادثہ کبریٰ کے خوں فشاں مناظر کو انہوں نے بچشم خود دیکھا اور اس کے شدید اثرات کا بڑی گہرائی کے ساتھ معاینہ کیا۔ ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ و برباد کر کے خلافت عباسیہ کا خاتمہ کیا تو شیخ سعدی رحمہ اللہ حزن و ملال کی شدت سے چیخ اٹھے:

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں ...... بر زوالِ ملک مستعصم امیر المؤمنیں

”اگر امیر المؤمنین مستعصم کی حکومت کے سقوط کے غم میں آسمان زمین پر خون برسائے تو بجا ہے۔“[1]

اس پر آشوب دور میں شیخ سعدی رحمہ اللہ اپنے آبائی وطن شیراز تشریف لائے، ان دنوں یہاں تاتاریوں کے باج گزار حاکم ابو بکر بن سعد کی حکومت تھی۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے یہاں درویشانہ زندگی اختیار کی اور خانقاہی نظام کے ذریعے عوام و خواص کی اصلاح و تربیت کا کام شروع کیا۔ انہوں نے شیراز کے باہر نہرِ رکن آباد کے کنارے ایک باغ میں اپنی خانقاہ قائم کی اور وہاں سنگِ مرمر کے حوض بنوائے۔ سالکین وہاں جمع ہوتے، شیخ کے دسترخوان پر کھانا کھاتے اور ان کی مسحور کن باتیں سنتے۔ ان میں وہ لوگ بھی ہوتے تھے جو کپڑے دھونے ان حوضوں پر آیا کرتے تھے۔

اس دور کے ذرائع نشر و اشاعت میں خطابت، شاعری، تصنیف و تالیف اور وعظ و تلقین خاص اہمیت رکھتے تھے۔

---

[1] کلیاتِ سعدی، ص ۷۶۴

شیخ رحمہ اللہ نے ان تمام طریقوں کو اپنایا اور ان ذرائع سے امت کو وہ روحانی غذا اور نظریاتی خوراک مہیا کی جس کی انہیں ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں شیخ رحمہ اللہ نے وعظ ونصیحت کی مجالس منعقد کیں، ہزاروں اشعار کہے اور کئی رسائل اور کتابچے تصنیف کیے جن میں گلستان اور بوستان کو لافانی حیثیت حاصل ہے۔ وہ بدترین حالات میں بھی اپنے مخاطبین کو مایوس اور رنجیدہ نہیں ہونے دیتے تھے اور تبسم آمیز پیرایے میں قصص وامثال کے ذریعے اصلاح کرتے تھے۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ کو اپنی اس مہم میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ کیا اپنے کیا پرائے، سب ان کی شیریں بیانی کے گرویدہ ہوگئے۔ ان کی تحریریں فصاحت وبلاغت اور سلاست وروانی کا اعلیٰ معیار تصور کی جانے لگیں اور ان کے اشعار کی لطافت ونزاکت کو شاعری کی معراج کا درجہ دیا جانے لگا۔ لوگ دور دراز سے شیراز آتے اور ان کی نظم ونثر کی نقول اپنے اپنے ممالک لے جاتے۔ چنانچہ آمد ورفت کی مشکلات کے باوجود اسی دور میں شیخ سعدی رحمہ اللہ کی تحریریں دنیا بھر میں مقبول ہوچکی تھیں۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ اپنے کلام میں اچھی صفات اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے قارئین کو غیر محسوس طور پر امید، ولولے، حوصلہ مندی، زندہ دلی اور خوش طبعی کی طرف لے جاتے ہیں۔ گلستان اور بوستان پڑھیے تو کہیں بھی خوف، ناامیدی اور حسرت ویاس کا ماحول نہیں ملے گا بلکہ آج بھی حوادث ومصائب کا مارا ہوا انسان ان کا مطالعہ کرکے خود کو شاداب اور مسرور محسوس کرتا ہے۔ تاریخی قصوں، حکایتوں، ذاتی تجربات، خبروں، لطیفوں اور برمحل شعروں سے مزین شیخ سعدی رحمہ اللہ کی تحریروں نے مسلم علماء وفضلاء کو جدوجہد کے ایک نئے ڈھنگ سے روشناس کرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اہل قلم کی ایک پوری کھیپ اس میدان میں اتر آئی۔ چونکہ تاتاری علم وفضل سے کورے تھے، اس لیے وہ لامحالہ اس میدان میں انہی اہل قلم پر انحصار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم فضلاء، ادباء اور شعراء کو کھل کر کام کرنے کا موقع مل گیا اور ان کو کفار کے مقبوضہ علاقوں میں ایسی کارآمد حیثیت حاصل ہوگئی جس سے کام لے کر وہ نہ صرف معاشرے بلکہ حکمران طبقے کو بھی نظریاتی طور پر متاثر کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ کا دوسرا اہم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اس دور کے باقی ماندہ آزاد یا کفار کے باج گزار مسلم حاکموں اور بادشاہوں کی راہ نمائی اور ذہن سازی کے لیے باقاعدہ کام کیا۔ ان کے اشعار میں حکمرانوں کی اصلاح کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ گلستان اور بوستان کے ابتدائی ابواب اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے طویل عمر پائی اور اپنی حکیمانہ کوششوں کا اثر خود اپنی زندگی میں دیکھ لیا۔ ۶۹۴ھ (۱۲۹۵ء) میں جب ان کی وفات ہوئی تو حالات سازگار ہوچکے تھے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کی تعبیر ایک حقیقت بن کر سامنے آچکی تھی۔[1]

---

[1] رحلة ابن بطوطة: ۵۰/۲، ط اکادیمیة المغربیة الرباط ؛ معجم المؤلفین، عمر بن رضا: ۱۵۱/۶، ط مکتبة المثنی بیروت ؛ الانوار الساطعة فی المائة السابعة للشیخ آغا بزرگ تهرانی، مکتبة الشامله ؛ الحوادث الجامعة لابن الفوطی: سنة ۶۹۳ھ
شیخ سعدی کے بہت سے حالات ان کی تصانیف گلستان وبوستان میں بھی بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

شیخ الاسلام عز الدین عبد العزیز بن عبد السلام

۵۷۸ھ تا ۶۶۰ھ

شیخ الاسلام عبد العزیز بن عبد السلام رحمہ اللہ ساتویں صدی ہجری کی عظیم ترین علمی شخصیات میں سے ایک تھے۔ وہ ۵۷۸ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ وہ کسی عالم فاضل گھرانے کے فرد تھے، نہ ہی انہیں لڑکپن میں علم دین حاصل کرنے کا موقع ملا۔ نوجوانی کے ایام تک وہ ایک درویش آدمی تھے اور جامع اموی کے ایک کونے میں معتکف رہتے تھے۔ عبادت وریاضت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ ایک دن سخت سرد رات میں انہیں غسل کی ضرورت ہوئی۔ رات کو مسجد کے دروازے باہر سے بند کر دیے جاتے تھے۔ اس لیے باہر جا کر گرم پانی حاصل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، پاکی کا اتنا خیال تھا کہ صبح کا انتظار نہ کیا اور مسجد کے تالاب کے ٹھنڈے یخ پانی سے غسل کر لیا۔ اس کے بعد سونے کے لیے لیٹے تو ٹھنڈ کی وجہ سے غشی طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں انہیں غیبی ندا سنائی دی: ''تمہیں علم چاہیے یا عمل؟''

تقدیر میں لکھی سعادت نے ان کی راہ نمائی کی۔ وہ بولے: ''علم کیوں کہ علم ہی سے عمل کا راستہ ملتا ہے۔''

صبح بیدار ہوئے تو علم دین کا شوق دل میں موجیں مار رہا تھا۔ وہ علماء کے حلقوں سے وابستہ ہوگئے جہاں ان کے غیر معمولی حافظے اور ذکاوت وفطانت کے جوہر کھلے۔ بہت جلد وہ متعدد علوم وفنون کے ماہر ہوگئے۔ [1]

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ اور شیخ سیف الدین آمدی رحمہ اللہ جیسے محدثین ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ پھر جب انہوں نے درس دینا شروع کیا تو ان کے حلقے سے بڑے بڑے نامور علماء پیدا ہوئے جن میں ''کتاب الروضتین'' کے مؤلف علامہ ابوشامہ مقدسی رحمہ اللہ اور شارحِ حدیث علامہ ابن دقیق العید رحمہ اللہ جیسے جواہرِ گراں مایہ بھی تھے۔ [2]

علمی مقام اور معاشرے میں ان کی عظمت:

علامہ عز الدین ابن عبد السلام رحمہ اللہ جامع دمشق کے زاویہ غزالیہ میں مدرس تھے۔ [3] تفسیر، حدیث اور فقہ سمیت متعدد علوم پر حاوی تھے، لہٰذا ان کا حلقہ علوم کا بہتا دریا تھا۔ انہیں ''شیخ الاسلام'' اور ''سلطان العلماء'' کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ نیکی کی اشاعت اور گناہوں کے سدباب کا غیر معمولی ولولہ رکھتے تھے۔ شریعت کے مقاصد، دینی احکام کی مصلحتوں اور باریکیوں سے آگاہی میں وہ یکتائے روزگار تھے۔ علامہ سبکی رحمہ اللہ کے بقول: علم، تقویٰ، حق گوئی، شجاعت، دلیری اور قوتِ لسانی میں ان کے ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ [4] ان کے معاصر حافظ عبد العظیم المنذری رحمہ اللہ (مؤلف الترغیب والترہیب) کا کہنا تھا: ''جس شہر میں ابن عبد السلام ہوں وہاں کسی اور کے لیے فتویٰ دینا درست نہیں۔'' [5]

---

① طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی: ۸/۲۱۲، ۲۱۳، ط ھجر

② طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/۲۴۲

③ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/۲۰۹

④ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/۲۰۹

⑤ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/۲۱۱

بدعات اور رسومات کے خلاف جہاد:

وہ بدعات اور ناجائز رسومات کے خلاف ہمیشہ لسانی جہاد میں مصروف رہے۔ علامہ ابوشامہ مقدسی رحمہ اللہ بتاتے ہیں کہ ان کی کوششوں کی بدولت شام میں بہت سی بدعات ختم اور بہت سی سنتیں زندہ ہوئیں۔ ①

انہوں نے ایوبی خانوادے کے کئی سلاطین کا زمانہ دیکھا۔ الملک الکامل ان کا بہت معتقد تھا، اس نے علامہ کو دمشق کا منصبِ قضا پیش کیا تو انہوں نے اُمتِ مسلمہ کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کئی شرائط عائد کر کے اسے قبول کیا۔ وہ سلطان کی طرف سے خلیفۂ بغداد کی طرف سفیر بھی مقرر کیے گئے۔ الکامل نے جامع اموی میں امامت وخطابت بھی ان کے سپرد کر دی تھی ② جس پر لوگ بہت خوش تھے کیوں کہ ایک مدت سے دمشق کا یہ قدیم ترین علمی وایمانی مرکز کسی عبقری شخصیت کے فیوض سے محروم تھا۔ جب علامہ ابن عبدالسلام رحمہ اللہ نے منبر سنبھالا تو غیر شرعی رسوم وبدعات کی کھلے عام تردید کی اور عملاً بھی بہت سی رسوم اور بدعات ختم کر دیں۔ اس سے پہلے خطیب سبز قیمتی جُبہ (طیلسان) پہنا کرتے تھے، خطبے سے پہلے تین بار تلوار کو منبر پر ٹھوکتے تھے، مسجّع ومُقفّی خطبے دیتے تھے جن میں لفظی شوکت زیادہ اور معنوی تاثیر کم ہوتی تھی۔ خطبے میں سلاطین کی مبالغہ آمیز تعریف وتوصیف کا رواج بھی عام تھا۔ کئی مؤذن مل کر خطیب کے سامنے جمعہ کی دوسری اذان دیا کرتے تھے۔ علامہ ابن عبدالسلام رحمہ اللہ نے یہ تمام رسمیں بند کر دیں اور سنت کے مطابق تمام طریقے جاری کیے۔ اپنے سامنے جمعہ کی دوسری اذان کے لیے فقط ایک مؤذن مقرر کیا۔ وہ سادہ الفاظ میں خطبہ دیتے تھے۔ بادشاہوں کی تعریف کی جگہ انہوں نے ان کے لیے دعاؤں کا سلسلہ شروع کیا۔ ③

لوگ اس سے پہلے فرض نماز کے بعد آیت: ''إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ'' پڑھا کرتے تھے جبکہ یہ چیز سنتِ نبویہ سے ثابت نہیں۔ علامہ ابن عبدالسلام نے اسے بند کرا دیا اور اس کی جگہ: ''لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ'' کا معمول شروع کرایا ④ جو صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ⑤

سلاطین کی اصلاح وتربیت:

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ایوبی سلاطین اور ان کے بعد ممالیک کی حکومتوں میں پیدا ہونے والی سیاسی خرابیوں کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی اور ضرورت پڑنے پر حکمرانوں کے غلط فیصلوں سے کھل کر اختلاف کیا۔ بعض اوقات ان کی حق گوئی سے حکمران ناراض بھی ہوئے مگر انہوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ ⑥

---

① طبقات الشافعية الكبرى: ۸/ ۲۱۰　② طبقات الشافعية الكبرى: ۸/ ۲۴۲

③ طبقات الشافعيين لابن كثير، ص ۸۷۳؛ تاريخ الاسلام للذهبي، وفيات: سنة ۶۶۰ھ　④ بحوالۂ بالا

⑤ یہ ابتدائی جملہ ہے۔ پوری مسنون دعا اس طرح مذکور ہوئی ہے: لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اللّٰهُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلاَ مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلاَ يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ. (صحيح مسلم، ح: ۱۳۶۶، باب استحباب الذكر بعد الصلاة) بعض احادیث میں دعا اس طرح مذکور ہوئی ہے: لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ لاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللّٰهِ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَلاَ نَعْبُدُ إِلاَّ إِيَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ. (صحيح مسلم، ح: ۱۳۷۱، باب استحباب الذكر بعد الصلاة)　⑥ طبقات الشافعية الكبرى: ۸/ ۲۱۰

حاکم شام الملک الاشرف کو نصیحت:

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے تاتاری یورش کی ابتدا ہی میں عالم اسلام پر مرتب ہونے والے اس کے تباہ کن اثرات کو بھانپ لیا تھا اور اس بارے میں ایک اٹل اور دوٹوک موقف اختیار کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلم حکمرانوں کو باہمی اختلافات بھلا کر اس طوفان کے مقابلے میں متحد ہو جانا چاہیے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی یہ صدا عوامی مجلسوں سے لے کر حکمرانوں کے ایوانوں تک میں گونجتی رہی۔ وہ ہر جگہ جذبہ جہاد اور دینی حمیت کے اس پیغام کے نقیب رہے۔

ایک جلیل القدر عالم، مفتی اور خطیب ہونے کی حیثیت سے وہ شام کے عوام وخواص میں نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے مگر ان دنوں شام اور مصر کی حکومتیں عواقب سے بے پروا ہو کر باہمی محاذ آرائی میں مشغول تھیں اور تاتاریوں کے حملے، خوارزم کی تباہی اور سلطان جلال الدین کی بارہ سالہ جہادی سرگرمیوں کے دور میں شام کے بادشاہ الملک الاشرف نے تاتاریوں کے خلاف شمشیر اٹھانے سے بالکل گریز کیا۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ بادشاہ کی اس پالیسی سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ شام کی افواج تاتاریوں کے خلاف صف آراء ہوں مگر افسوس کہ الملک الاشرف نے اس ذمہ داری کو کبھی محسوس نہ کیا۔ اپنی وفات سے کچھ دن پہلے جب وہ بیمار پڑ کر زندگی سے مایوس ہو چلا تو اس نے شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی خدمت میں اپنے مقرب امیر کو بھیج کر درخواست کی کہ وہ عیادت اور دعا کے لیے تشریف لائیں۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ عیادت کی سنت ادا کرنے کی نیت سے تشریف لے گئے۔ الملک الاشرف نے ان کی دست بوسی کی اور رنجش کی معافی چاہتے ہوئے عرض کیا: ''میرے لیے دعا فرمائیں اور کچھ نصیحت بھی کریں۔''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس وقت تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جارہے ہیں۔ انہیں اس بات سے تقویت مل رہی ہے کہ آپ کو اللہ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کی فرصت نہیں۔ اس وقت بھی آپ اپنے بھائی الملک الکامل سے جنگ کے لیے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ میری عرض ہے کہ آپ اپنا رخ ادھر سے ہٹا کر اسلام کے دشمنوں کی طرف پھیر لیں۔ اگر آپ کو صحت ہوئی تو ہمیں امید ہے کہ اللہ آپ کو کفار پر غلبہ عطا کرے گا۔ اور اگر اللہ کا فیصلہ کچھ اور ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوں گے۔''

الملک الاشرف کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے اپنی اس فوج کو جو الملک الکامل کے مقابلے کے لیے جارہی تھی، تاتاریوں کے مقابلے کے لیے پیش قدمی کا حکم دے دیا۔[1]

الصالح اسماعیل کی بدسلوکی اور شیخ الاسلام گرفتاری:

افسوس کہ اس کے بعد جلد ہی ملک الاشرف کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹے صالح اسماعیل نے تاتاریوں سے جہاد کے اس حکم کو نافذ ہونے سے روک دیا۔ مزید یہ کہ وہ نصرانی حکمرانوں سے دوستی کی پینگیں بڑھانے لگا۔ ۶۳۸ھ میں اس نے ''صیدا'' اور ''شقیف ارنوم'' سمیت کئی مستحکم قلعے ان کے حوالے کر دیے۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/ ۲۴۰، ۲۴۱

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کو صالح اسماعیل کی اس بے حمیتی سے بڑا دکھ ہوا۔انہوں نے خطبے میں اس کے لیے دعا کرنا ترک دی۔اس کی جگہ وہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! اسلام اور اس کے محافظوں کی مدد فرما۔

صالح اسماعیل سے دوستی کے سبب فرنگی اتنے جری ہوگئے کہ دمشق آکر ہتھیار خریدا کرتے تھے۔شیخ الاسلام رحمہ اللہ کہاں برداشت کرسکتے تھے کہ فرنگی مسلمانوں سے اسلحہ خرید کرانہی کے خلاف استعمال کریں۔انہوں نے اسلحے کے سوداگروں کو فتویٰ دیا کہ فرنگیوں کو اسلحہ فروخت کرنا جائز نہیں کیوں کہ یہ مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوگا۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے ان اقدامات کے خلاف حکومت حرکت میں آئی اور سلطان صالح اسماعیل کے حکم سے انہیں گرفتار کرلیا گیا۔کچھ مدت وہ دمشق کے قید خانے میں رہے۔پھر بیت المقدس منتقل کردیے گئے۔

کچھ عرصے بعد صالح اسماعیل نے فرنگیوں کو ساتھ ملا کر مصر پر حملے کے لیے فوج کشی کی۔راستے میں بیت المقدس سے گزر ہوا۔صالح اسماعیل کو برابر دھڑکا لگا تھا کہ شیخ الاسلام کی گرفتاری اسے بدنام کررہی ہے،اس لیے اس نے ایک خاص مصاحب کو اپنا رومال دے کر کہا:

''اسے شیخ الاسلام کی خدمت میں پیش کرنا اور عاجزانہ طور پر کہنا کہ آپ چاہیں تو سابقہ عہدے پر واپس آسکتے ہیں۔اگر وہ مان جائیں تو انہیں میرے پاس لے آنا۔نہ مانیں تو میرے خیمے کے ساتھ قید کردینا۔''

مصاحب نے اسی طرح جاکر شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی منت سماجت کی اور کہا:''آپ ذرا بادشاہ سے جاکر مل لیں، دست بوسی کرلیں، یہ قضیہ ختم ہوجائے گا۔آپ سابقہ عہدے پر واپس آجائیں گے۔''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے بے نیازی کے ساتھ کہا:''اے مسکین! بادشاہ کی دست بوسی کرنا تو درکنار! میں تو اس پر بھی آمادہ نہیں کہ بادشاہ میری دست بوسی کرے،تم کسی اور دنیا میں ہو، میں کسی اور دنیا میں۔''

اب انہیں شاہی خیمے کے قریب دوسرے خیمے میں قید کردیا گیا۔شیخ الاسلام رحمہ اللہ وہاں تلاوت میں مصروف رہتے جس کی آواز شاہی خیمے میں آتی رہتی،ایک دن صالح اسماعیل نے اپنے ہمراہ آئے ہوئے فرنگی حکام کے سامنے دوستی میں خلوص جتانے کے لیے کہا:''تمہیں جس قیدی کی تلاوت کی آواز آتی ہے وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا عالم ہے۔ میں نے اسے اس لیے قید کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے قلعے تمہیں دینے پر احتجاج کرتا تھا، میں نے اسے دمشق کی خطابت سے معزول کیا، شہر بدر کیا اور تمہاری خاطر اسے قید کیا۔''

فرنگی حکام کہنے لگے:''ایسا شخص اگر ہمارے پاس ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھوکر پیتے۔''[①]

شیخ الاسلام کی مصر روانگی:

کچھ عرصہ بعد مصر کے حکمران نجم الدین الصالح ایوب نے صالح اسماعیل کو شکست دے کر شام پر قبضہ کرلیا اور شیخ الاسلام رحمہ اللہ کو قید سے رہائی دلائی۔یہ ۶۳۹ھ کا واقعہ ہے۔

---

① طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی: ۸/۲۴۰، ۲۴۱، ط ھجر

شاہ مصر نجم الدین ایوب شیخ الاسلام رحمہ اللہ سے اہلِ مصر کی دینی راہ نمائی چاہتا تھا، اس لیے شیخ الاسلام رحمہ اللہ قاہرہ تشریف لے گئے۔ راستے میں کرک سے گزر ہوا، وہاں کے حاکم الناصر داؤد نے وہیں رہائش اختیار کرنے کی درخواست کی تاکہ لوگ فائدہ اٹھائیں۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے جواب میں فرمایا:

''تمہارا چھوٹا سا شہر میرے علم کے لیے تنگ پڑ جائے گا۔''[1]

عہدۂ قضا پر تقرری۔ استعفیٰ دینے کی وجہ:

قاہرہ پہنچے تو الصالح ایوب نے قدردانی کرتے ہوئے انہیں قاضی القضاۃ اور جامع عمرو بن العاص کا خطیب مقرر کردیا۔ ان کی دینی غیرت کا یہ حال تھا کہ سلطنت کے ایک امیر فخر الدین نے کسی مسجد کی چھت پر طبل خانہ قائم کردیا۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کو اطلاع ملی تو طبل خانہ گرادیا، فخر الدین کی گواہی کو آئندہ کے لیے ناقابلِ قبول قرار دے دیا اور ساتھ ہی عہدۂ قضا سے استعفاء دے دیا۔ سلطان صالح ایوب نے منت سماجت کرکے انہیں یہ عہدہ دوبارہ قبول کرنے پر آمادہ کرلیا اور وہ مزید کچھ مدت تک قضا کی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ تاہم آخر میں انہیں یہی بہتر محسوس ہوا کہ عدلیہ کے شعبے سے یکسوئی اختیار کرلی جائے۔

عہدۂ قضا چھوڑنے کے بعد بھی ان کی قدر و منزلت کم نہ ہوئی۔ وہ ایک طویل عرصے تک جامع عمرو بن العاص میں خطیب اور مدرسہ صالحیہ میں معلّمِ فقہِ شافعی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔[2]

منکرات کے ازالے کا جذبہ:

ان کے مقام اور جرأت و حق گوئی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار انہیں معلوم ہوا کہ مصر کے کسی مقام پر شراب فروخت ہو رہی ہے۔ انہوں نے عید کے دن قلعے میں آراستہ کی گئی خاص محفل میں بھرے مجمعے کے سامنے سلطان کو نام لے کر سرزنش کی اور کہا: ''ایوب! اللہ کو کیا جواب دو گے جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی باشاہت اس لیے دی تھی کہ مے نوشی کی جائے۔''

سلطان نے حیران ہو کر کہا: ''کیا واقعی ایسا ہو رہا ہے؟''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے کہا: ''ہاں بالکل! فلاں جگہ شراب بک رہی ہے اور تم یہاں مزے کر رہے ہو۔''

سلطان اس فہمائش سے بڑا نادم ہوا اور اس مے خانے کی بندش کا حکم جاری کیا۔

بعد میں کسی شاگرد نے شیخ الاسلام رحمہ اللہ سے پوچھا: ''کیا آپ کو سلطان سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا؟''

فرمانے لگے: ''اس وقت اللہ کے جلال کے سامنے وہ مجھے ایک بلّے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔''[3]

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ سلطان الصالح ایوب کی ہیبت اس دور میں ضرب المثل تھی۔ اس کے سامنے اس

---

[1] طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۸/ ۲۱۰، ۲۴۴، ۲۴۵، ط ھجر

[2] طبقات الشافعیة الکبریٰ: ۸/ ۲۱۲، ط ھجر

کے مقرب ترین امراء بھی از خود کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ایسے مزاج کے حامل مطلق العنان بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی جرأت ایمانی اور دینی حمیت کا تابندہ نمونہ ہے۔

ساتویں صلیبی جنگ میں شرکت اور کرامت کا ظہور:

الصالح ایوب کے آخری ایام میں ساتویں صلیبی جنگ چھڑی اور اس دوران الصالح ایوب کی موت اور اس کے جانشین توران شاہ کی تخت نشینی ہوئی۔ادھر فرنگیوں نے پیش قدمی کر کے نہ صرف دمیاط پر قبضہ کرلیا بلکہ دریائے نیل میں آگے بڑھتے ہوئے منصورہ تک پہنچ گئے۔اس وقت شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے افواج کی ہمت بھی بندھائی اور سپاہیوں کے شانہ بشانہ کھڑے رہے۔ایک بار جب فرنگی سر پر آچکے تھے انہوں نے بڑے جوش سے فرنگیوں کے جہاز غرق ہونے کی دعا کی اور اللہ کی غیبی مدد کو پکارا۔دیکھتے ہی دیکھتے آندھی آئی اور فرنگیوں کے جہاز الٹ پلٹ ہو گئے۔ (1)

دورِ ممالیک میں شیخ الاسلام کا مقام......مملوک امراء کی نیلامی:

ایوبی خانوادے کی حکومت ختم ہوئی تو ممالیک میں سے عزالدین ترکمانی، الملک المظفر سیف الدین قطز اور الملک الظاہر رکن الدین بیبرس جیسے نامور بادشاہوں نے شیخ الاسلام رحمہ اللہ سے استفادہ کیا۔

دورِ ممالیک میں شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ممالیک کی حکومت قائم ہوئی تو شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا کہ مملوک امراء، غلاموں کے حکم میں ہیں اور جب تک وہ شرعی طریقے سے آزاد نہیں ہوں گے، ان کے معاملات قانونِ شرعی کے لحاظ سے درست نہیں ہوں گے۔

اس فتوے سے شاہی دربار میں ہل چل مچ گئی۔مملوک امراء نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا:''ہم ایک محفل میں بیت المال کی طرف سے آپ کو نیلام کریں گے، پھر شرعی طریقے سے آپ کو آزادی دی جائے گی۔''

مملوک امراء بھڑک گئے اور انہوں نے جا کر سلطان (2) سے شکایت کی کہ شیخ ہمیں سرِ بازار نیلام کر کے بے عزت کرنا چاہتے ہیں۔سلطان نے شیخ الاسلام رحمہ اللہ کو بلوایا اور کہا کہ انہیں اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

اس پر شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے احتجاجاً مصر کی شہریت ترک کر دینے کا فیصلہ کرلیا۔اپنا ساز و سامان لادا، گھر والوں کو بھی سوار کیا اور قاہرہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ابھی آدھی منزل تک گئے تھے کہ نہ صرف شہر کے علماء و مشائخ بلکہ تاجر، صنعت کار یہاں تک عورتیں اور بچے بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔سلطان کو مشیروں نے کہا:''شیخ کو روکیے ورنہ آپ کی حکومت جاتی رہے گی۔'' سلطان یہ سن کر خود سواری لے کر ان کے پیچھے گیا اور منت سماجت کر کے انہیں واپس بلوایا اور اجازت دی کہ وہ خود امرائے سلطنت کا نیلام کریں گے۔

جن امراء کی نیلامی ہونی تھی، ان میں خود مصر کا نائب حاکم بھی شامل تھا۔اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے شیخ

---

(1) طبقات الشافعية الكبرى: ٨/ ٢١٦

(2) ماخذ میں واضح نہیں کہ یہاں سلطان سے کون مراد ہے۔غالباً سلطان عزالدین ترکمانی یا سیف الدین قطز میں سے کوئی مراد ہے۔

کو عاجزانہ پیغام بھجوایا کہ وہ نیلامی نہ کریں مگر شیخ نہ مانے۔ نائب حاکم کو پتا چلا تو غصے سے بے قابو ہو کر بولا:

''یہ شیخ ہمیں سرِ عام کیسے نیلام کرے گا۔ ہم زمین کے مالک ہیں۔ اللہ کی قسم! میں اپنی تلوار سے ان کا خون کروں گا۔''

یہ کہہ کر وہ ننگی تلوار لہراتا ہوا کچھ سپاہیوں کے ساتھ سیدھا شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے دروازے پر جا پہنچا۔ شیخ کے بیٹے نے انہیں اطلاع دی کہ باہر نائب حاکم شمشیرِ بے نیام لیے کھڑا ہے۔ شیخ کے اطمینان میں ذرا بھی فرق نہ آیا، بولے:

''بیٹا! تیرے باپ کا یہ مقام کہاں کہ اسے اللہ کی راہ میں شہادت نصیب ہو۔''

یہ کہہ کر بڑے سکون سے باہر نکلے۔ انہیں دیکھتے ہی نائب حاکم پر ایسا رعب طاری ہوا کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی، جسم پر کپکپی طاری ہوگئی اور وہ زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگا کہ شیخ اس کے حق میں دعا کر دیں۔

پھر بولا: ''شیخ آپ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ بولے: ''بازار میں نیلام کروں گا۔''

نائب نے کہا: ''ہماری قیمت کہاں خرچ کریں گے؟''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ بولے: ''مسلمانوں کے رفاہی کاموں میں۔''

بولا: ''ہماری قیمت وصول کون کرے گا؟'' فرمایا: ''میں خود۔''

اس کے بعد مجلسِ نیلام لگی۔ امراء کی ایک ایک کر کے بولی لگائی گئی۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اعزاز کے طور پر ان کے دام بڑھا چڑھا کر لگائے۔ انہیں فروخت کر کے وہ قیمت رفاہی کاموں میں صرف کی اور امراء شرعی طریقے سے آزاد ہو کر اپنے گھروں کو گئے۔ [1]

اس دور میں کسی عالم کی عظمت، مقبولیت اور اثر و رسوخ کی اس سے بڑی مثال تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔

ہلاکو خان سے جنگ اور شیخ الاسلام کا فتویٰ:

شیخ الاسلام رحمہ اللہ مسلمانوں کو فتنۂ تاتار کے خلاف کمربستہ کرنا چاہتے تھے۔ جب ہلاکو خان نے بغداد کا محاصرہ کیا اور یہ خبر مصر پہنچی تو شیخ رحمہ اللہ نہایت متفکر ہوئے۔ انہوں نے مسلمانانِ بغداد کی فتح و نصرت کے لیے پانچوں نمازوں میں دعائے قنوتِ نازلہ کا اہتمام شروع کرایا۔ جب سقوطِ بغداد کی خبر آئی تو شیخ الاسلام رحمہ اللہ نہایت غم گین ہوئے۔ [2]

اسی تڑپ کے باعث انہوں نے مصر کے حکمرانوں، سالاروں، سپاہیوں اور عوام کو تاتاریوں کے خلاف جہاد کے لیے مستعد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کے ساتھ ان کی پوری کوشش رہی کہ اس موقع پر حکام کسی ظلم و زیادتی کے مرتکب نہ ہوں تاکہ اللہ کی مدد و نصرت اور عوام کی دعائیں ان کے شامل حال رہیں۔

سلطان سیف الدین قطز نے جب ہلاکو خان سے ٹکر لینے کا ارادہ کیا تو فوج کی تیاری کے لیے خطیر رقم کی ضرورت

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبری للسبکی: ۸/۲۱۷، ۲۱۸

[2] ذیل مرآۃ الزمان: ۱/۸۹، ط دار الکتاب الاسلامی

تھی۔ امرائے دولت کا خیال تھا کہ اس موقع پر عوام سے جبراً مال وصول کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ مگر جب شیخ الاسلام رحمہ اللہ سے فتویٰ لیا گیا تو انہوں نے ایک آدمی سے صرف ایک دینار لینے کی اجازت دی، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ پہلے بادشاہ، وزراء، امراء اور ارکانِ سلطنت اپنی ساری دولت جہاد کے لیے وقف کریں۔

چنانچہ امرائے سلطنت اور سرکاری افسران اپنے گھروں سے تمام نقدی اور زیورات لے کر حاضر ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک سے قسم لی گئی کہ اس نے گھر میں کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ اس عظیم دولت کو جہادی مصارف کے لیے مختص کرنے کے بعد شیخ الاسلام نے اجازت دی کہ اب عوام سے فی کس ایک دینار وصول کیا جا سکتا ہے۔[1] ان کی کوششوں کا ثمرہ یہ نکلا کہ مصری افواج منکرات کے اثرات سے پاک ہو کر اللہ کی مدد و نصرت کے سائے میں عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں سے جرأت مندانہ مقابلے کے قابل ہوئیں اور انہیں شکست فاش دے کر ہی لوٹیں۔

خلافت کا احیاء:

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مملوک سلاطین کی راہ نمائی کرتے ہوئے مصر میں عباسی خلافت کے دوبارہ احیاء میں اہم کردار ادا کیا۔ ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں بغداد کی تباہی کے ساتھ خلافت ختم ہو گئی تھی اور تقریباً تین سال اس طرح گزرے تھے کہ عالم اسلام کا کوئی خلیفہ نہ تھا۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس کمزوری کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ ان کی تحریک اور مشورے پر سلطان بیبرس نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کے چچا ابوالقاسم احمد مستنصر کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ قاہرہ بلایا اور یکم رجب ۶۵۹ھ (۱۲ جون ۱۲۶۰ء) بروز جمعرات کو ایک شاندار تقریب میں ان کی خلافت کا اعلان کیا، سب سے پہلے شیخ الاسلام رحمہ اللہ اور ان کے بعد سلطان رکن الدین بیبرس، قاضی القضاۃ اور دیگر اعیانِ سلطنت نے نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے اس عمل نے اس دورِ ابتلاء میں عالم اسلام کو مزید لامرکزیت کا شکار ہونے سے بچا لیا۔[2]

وفات:

شیخ الاسلام عزالدین ابن عبدالسلام رحمہ اللہ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۶۶۰ھ کو دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی عمر ۸۳ سال تھی۔ اس وقت الملک الظاہر بیبرس کی حکومت تھی جو ان کا بڑا احترام کرتا تھا، ان کے مشوروں اور فتاویٰ کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ اسے ان کی وفات کا اتنا صدمہ ہوا کہ بول اٹھا: ”لا الہ الا اللہ۔ ان کی وفات میرے ہی دور میں لکھی تھی۔“

بیبرس نے خود جنازے کو کندھا دیا۔ نمازِ جنازہ میں شاہی ارکین اور علماء و صلحاء سمیت عوام و خواص کا اس قدر رش تھا کہ سلطان بیبرس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا:

”میری حکومت اب قائم ہوئی ہے۔ ورنہ وہ تو جو چاہتے حکم دیتے اور لوگ اس کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔“[3]

---

① السلوک فی معرفة دول الملوک: ۲/ ۳۲۷، ط العلمية

② طبقات الشافعية الكبرى: ۸/ ۲۴۳ ③ البداية والنهاية: ۱۷/ ۴۴۲، طبقات الشافعية الكبرى: ۸/ ۲۴۴، ۲۴۵

تصانیف وتالیفات:

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی علمی یادگار اور ان کا بڑا صدقۂ جاریہ وہ کتب وتصانیف ہیں جو آج تک فقہاء ومحدثین سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔ چند شہرۂ آفاق تصانیف درج ذیل ہیں۔

- عقائد میں......الفرق بین الاسلام والایمان
- تفسیر میں......تفسیر العزبن عبدالسلام
- حدیث میں......صحیح مسلم کا اختصار ''مختصر صحیح مسلم''
- سیرتِ نبویہ میں: منیۃ السؤول فی تفضیل الرسول صلی اللہ علیہ وسلم
- اخلاق وآداب میں......مقاصد الرعایۃ لحقوق اللہ عزوجل
- فتاویٰ کے مجموعات: ''الفتاوی المصریہ''، ''الفتاویٰ الموصلیۃ''
- اصول فقہ میں: ''الامام فی بیان ادلۃ الاحکام''

اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں درج ذیل کتب کا ذکر بھی آتا ہے:

''القواعد الکبریٰ، مجاز القرآن، شجرۃ المعارف، الغایۃ فی اختصار النہایۃ، مختصر رعایۃ المحاسبی، بیان احوال الناس یوم القیامۃ، فوائد البلویٰ والمحن۔''[1]

مقاصدِ شریعت پر کام:

تاہم ان کا سب سے وقیع، وزنی اور گہرا کام اصول فقہ کے ایک خاص شعبے ''مقاصدِ شریعت'' پر ہے۔ امام غزالی کے بعد وہ پہلے مصلحِ قوم ہیں جنہوں نے ''مقاصدِ شریعت'' پر عمیق نگاہ ڈالی، ان کی مختلف شکلوں کو واضح کرتے ہوئے ان کی درجہ بندی کی اور ان کی اہمیت کو واضح اور اجاگر کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف رسائل لکھے جن میں ''مقاصد الصلوٰۃ'' کو بڑی پذیرائی ملی۔ سلطان مصر الملک الکامل کو یہ رسالہ انتہائی پسند تھا اور وہ اکثر اسے سنا کرتا تھا اور خاص مہمانوں کو سنوایا کرتا تھا۔

اس دور میں علامہ سبط ابن الجوزی شام کے نامور واعظ اور مؤرخ تھے جن کی مجلسِ وعظ میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی اور آہ وبکا کا ایک عجیب عالم ہوتا تھا۔ ایک بار وہ الملک الکامل کے دربار میں آئے تو الملک الکامل نے انہیں یہ رسالہ پڑھوایا۔ علامہ اسے پڑھ کر کہنے لگے: ''ایسی تحریر آج تک کسی نے نہیں لکھی۔''

چنانچہ وہ اس کی نقل اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی مجلس وعظ میں اسے پڑھ کر لوگوں کو نقل کراتے رہے۔[2]

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے دین کے دیگر موضوعات کے مقاصد اور حکمتوں پر بھی اسی طرح عمیق نگاہی کے ساتھ غور کر کے ایک جامع کام شروع کیا اور آخر کار اپنی تحقیقات ''قواعد الاحکام فی مصالح الانام'' کے نام سے پیش کیں۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/ ۲۴۸

[2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸/ ۲۴۰

لگ بھگ پانچ سو صفحات کی اس کتاب میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ احکام شریعت کے پیچھے معاشرے کی فلاح و بہبود، زندگی میں توازن و اعتدال، انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو جیسی اہم ترین چیزوں کی حفاظت سمیت بہت سی مصلحتیں کارفرما ہیں۔ اسی موضوع پر انہوں نے ایک مختصر کتاب ''الفوائد فی اختصار المقاصد'' بھی تحریر کی۔ [1]

ورع و تقویٰ۔ کمالات و کرامات:

علم دین کی خدمت کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت سے ان کا لگاؤ کم نہیں ہوا۔ تقویٰ اور پرہیزگاری میں ان کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ وہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کے مرید اور ان کی طرف سے مجازِ بیعت بھی تھے۔ اولیاء اور اتقیاء سے ان کا دلی تعلق رہتا تھا۔ ان کی کرامات اور مکاشفات بھی مشہور ہیں۔

ریف کے ایک صوفی بزرگ عبداللہ بلتاجی نے کسی خادم کو بہت سی چیزیں دے کر قاہرہ بھیجا کہ یہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کو ہدیے میں پیش کردے۔ ان چیزوں میں پنیر کا ایک مٹکا بھی تھا۔ قاہرہ میں داخل ہوتے وقت پنیر کا مٹکا گر کر ٹوٹ گیا اور پنیر ضائع ہوگیا۔ خادم نے ایک عیسائی دکاندار سے پنیر لے کر ساتھ رکھ لیا۔ جب یہ چیزیں شیخ رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کی گئیں تو انہوں نے باقی چیزیں قبول کرلیں مگر پنیر کا مٹکا واپس دروازے پر رکھوا دیا اور خادم سے فرمایا: ''بیٹا! یہ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ پنیر جس عورت نے بنایا ہے، اس کا ہاتھ خنزیر کو چھو جانے کی وجہ سے ناپاک تھا۔'' [2]

سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود وہ مالی لحاظ سے متوسط ہی رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو کچھ ہوتا، اس کا بڑا حصہ صدقہ کردیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ جیب میں کچھ نہ تھا اور کسی نے اپنی حاجت پیش کردی۔ ایسے میں اپنا عمامہ یا اس کا کوئی ٹکڑا پھاڑ کر اس کے حوالے کردیتے تھے۔

ایک بار دمشق میں شدید قحط پڑا۔ باغ اور کھیت ویران ہوکر کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگے۔ ان کی اہلیہ نے انہیں اپنے کڑے دیتے ہوئے کہا: ''یہ اچھا موقع ہے کہ آپ میرے کڑے بیچ کر ایک باغ خریدلیں۔''

انہوں نے کڑے بیچ دیے اور رقم غریبوں میں صدقہ کردی۔ گھر آئے تو اہلیہ نے پوچھا: ''باغ خریدا؟''

فرمایا: ''ہاں! کڑوں کے بدلے جنت کا باغ لے لیا ہے۔''

اہلیہ بھی انہی جیسی تھیں۔ فرمانے لگیں: ''اللہ آپ کو بہترین جزائے خیر دے۔'' [3]

ان خدمات کے باوجود احتیاط کا یہ حال تھا کہ ایک بار کسی کو زبانی فتویٰ دینے کے بعد یاد آیا کہ جواب میں کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ چنانچہ پورے قاہرہ میں منادی کرادی کہ یہ مسئلہ غلط بتایا گیا ہے، اس پر عمل نہ کیا جائے۔ [4]

❀❀❀

---

[1] ''قواعد الاحکام'' ''مكتبة الكليات الازهرية'' قاہرہ سے دو جلدوں میں اور ''الفوائد'' دار الفکر دمشق سے ایک جلد میں شایع ہوچکی ہے۔

[2] طبقات الشافعية الكبرىٰ: ۸/۲۱۳   [3] طبقات الشافعية الكبرىٰ: ۸/۲۱۴

[4] طبقات الشافعية الكبرىٰ: ۸/۲۱۴

امام شرف الدین النووی

۶۳۱ھ تا ۶۷۶ھ

اس دور کے ایک اور جلیل القدر عالم امام شرف الدین یحییٰ النووی رحمہ اللہ تھے۔ وہ ۶۳۱ھ میں دمشق کے نواحی دیہات ''نویٰ'' میں پیدا ہوئے تھے۔ علوم اسلامیہ کی تحصیل کے بعد وہ ایک مدت تک دمشق کے مدرسہ اشرفیہ میں پڑھاتے رہے۔ ۶۵۵ھ میں جب ان کی عمر ۲۴ سال تھی انہوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا اور بیس سال تک مسلسل اس میں منہمک رہے اور اس دوران گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کی۔ رات کا بیشتر حصہ عبادت کرتے۔ دن بھر روزہ رکھتے۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار سحر کے وقت پانی پیتے اور فقط رات کو کھانا کھاتے۔ عمر بھر کنوارے رہے اور کسب مال کا کبھی ارادہ نہ کیا۔ والدین انہیں گزارے کے لیے بعض اوقات جو بھیج دیتے تھے یہ اسی پر قناعت کرتے تھے۔ ①

شہرہ آفاق تصانیف:

ان کا زیادہ تر کام علم حدیث پر ہے۔ ان کی شرحِ صحیح مسلم اور صحیح احادیث کا انتخاب ''ریاض الصالحین'' سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ ان کے علاوہ ''الاذکار'' اور ''الاربعین النوویہ'' سے آج تک لوگ فائدہ اٹھارہے ہیں۔

ان کی مزید کچھ تصانیف درج ذیل ہیں:

- رجالِ حدیث میں: **تهذيب الاسماء واللغات**
- علوم القرآن میں: **التبيان**
- اصولِ حدیث میں: **التقريب والتيسير**
- اصولِ فقہ میں: **آداب الفتویٰ والمفتي والمستفتي، الاصول والضوابط**
- فقہ میں: **دقائق المنهاج ، خلاصة الاحكام ، روضة الطالبين**

انہوں نے فقہ شافعی میں ''المہذب'' کی شرح لکھنا شروع کی اور ''کتاب البیوع'' تک اس کی نو جلدیں مکمل کیں۔ اس کا تکملہ بعد میں علامہ تقی الدین سبکی الشافعی رحمہ اللہ نے لکھا۔ ''بستان العارفین'' ان کی ایک اور مفید تالیف ہے جس میں اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس پر زور دیا گیا ہے اور اولیائے کرام کے حالات اور ملفوظات نقل کیے گئے ہیں۔ ②

بے لاگ حق گوئی:

وہ یکسو ہونے کے باجود مرجعِ خلائق تھے۔ علماء وفقہاء ان کے علم وفضل کے قائل تھے۔ وہ حکام وسلاطین سے دور رہتے تھے مگر ضرورت کے موقع پر ان سے بڑھ کر حق گو کوئی نہ تھا۔ عسکری مہمات کی کثرت کے باعث حکومت نے عوام پر ٹیکس عائد کیا تو شام کے عوام اپنے ہاں قحط سالی کی وجہ سے اسے ادا کرنے سے قاصر رہے۔ بعض علماء نے اس بارے

① المنهل العذب الروی فی ترجمة قطب الأولياء النووی للسخاوی، ص ۳۰ ② المنهل العذب الروی للسخاوی، ص ۳۰، ۳۱

میں حکام کے نام ایک درخواست تحریر کی ۔ پھر امام نووی رحمہ اللہ نے شام کے ایک معزز امیر بدرالدین خازندار کو مکتوب لکھ کر بھیجا تا کہ وہ علماء کی درخواست قاہرہ میں سلطان بیبرس کے پاس لے جائے ۔ بدرالدین کے نام مکتوب میں عوام سے عسکری ٹیکس ہٹانے اور انہیں عدل وانصاف مہیا کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے تحریر کیا:

''آن جناب کو معلوم ہوگا کہ اس سال شام کے عوام بارشوں کی کمی، قیمتوں کی گرانی، اناج کی قلت اور مویشیوں کی ہلاکت کے سبب تنگ دستی اور بدحالی کا شکار ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ حاکم پر رعایا سے شفقت برتنا اور ان کی خیرخواہی کرنا واجب ہے کہ دین خیرخواہی کا نام ہے۔ علمائے شریعت جو سلطان کے خیرخواہ اور مداح ہیں، مکتوب بھیج چکے ہیں جس میں رعایا کی خبرگیری اور ان سے نرمی برتنے کا ذکر ہے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ یہ محض خیرخواہی، شفقت اور اہلِ خرد کے لیے نصیحت ہے۔ یہ خط جو علماء نے امیر کو بھیجا ہے، سلطان کے لیے امانت اور نصیحت ہے۔ آپ پر واجب ہے کہ اسے سلطان تک پہنچائیں کہ آپ سے اس بارے میں پوچھ ہوگی۔''

امیر بدرالدین یہ خطوط سلطان کے پاس لے گیا۔ وہاں اس نصیحت کو پسند نہ کیا گیا بلکہ اس کے جواب میں ایک عتاب آمیز مراسلہ بھیج دیا گیا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اسے پڑھ کر سلطان کے نام ایک مکتوب لکھا جس کا اسلوب اتنا عمدہ اور مؤثر ہے کہ اسے حکام کو نصیحت کرنے کے لیے بہترین نمونے اور شاہکار کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے لکھا:

''آں جناب کی خدمتِ عالیہ سے تنبیہ اور عتاب پر مبنی جواب آیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں جو لکھا ہے وہ شریعت کے خلاف ہے۔ اللہ نے ضرورت کے موقع پر مسئلے کی وضاحت واجب کی ہے اس لیے ہمارا سکوت اختیار کرنا حرام ہے۔ آپ نے جواب میں لکھا ہے: ''جہاد صرف فوج پر واجب نہیں۔'' ہم نے اس کا انکار نہیں کیا۔ لیکن جہاد فرضِ کفایہ ہے۔ جب سلطان نے اس کے لیے افواج مخصوص کر دی ہیں جنہیں واقعی بیت المال سے خرچہ مل رہا ہے تو باقی رعایا ان کاموں کے لیے فارغ ہو جاتی ہے جن میں ان کا اپنا، فوج کا اور سلطان کا فائدہ ہے یعنی کاشت کاری، صنعت وحرفت وغیرہ۔ یہ وہ کام ہیں جو سب کے لیے ضروری ہیں۔ فوج کے جہاد کے لیے بیت المال سے رقم مقرر ہے۔ پس عوام سے جہاد کے لیے کچھ لینا جائز نہیں جب تک کہ بیت المال میں کوئی نقد، جنس یا جائیداد موجود ہو جسے بیچ کر ضرورت پوری کی جا سکے۔ سلطانِ محترم کے شہروں کے علماء اس بات پر متفق ہیں۔ ہم نے پہلے اور اس دوسرے مکتوب میں جو کچھ لکھا وہ محض خیرخواہی کے طور پر ہے۔ ہم نے یہ اسی لیے لکھا کہ ہمارے علم کے مطابق سلطانِ عالی شریعت کے پابند ہیں اور رعایا سے شفقت ومہربانی برتنے میں اخلاقِ نبویہ پر عمل پیرا ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ ہم (علماء) کفار (کے گناہوں) پر اعتراض کیوں نہیں کرتے جو سلطنت میں جیسے چاہیں رہتے ہیں۔ تو جناب مسلم حکام اور اہلِ ایمان کا موازنہ بھلا ہم کفار سے کیوں کریں۔ ہم سرکش کفار کو کس چیز کا حوالہ دے کر روکیں جب کہ وہ ہمارے دین پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔

ہمیں سلطان کے عدل اور کرم سے توقع ہے کہ وہ ہماری اس پند ونصیحت سے (ناراض ہو کر شام کے) عوام یا

کسی گروہ کو عتاب کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے مجھے کوئی عتاب بلکہ اس سے زیادہ کوئی چیز بھی نہ تو ہراساں کرسکتی ہے اور نہ سلطان کی خیر خواہی سے باز رکھ سکتی ہے کیوں کہ میرا ایمان ہے کہ یہ مجھ پر اور دوسروں پر واجب ہے۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ہم جہاں بھی ہوں حق بات کریں۔ اللہ کے حق میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروانہ کریں۔''[1]

معلوم ہوتا ہے کہ سلطان بیبرس پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اپنے خاص درباری علماء کے زیر اثر وہ اسی بات کا قائل رہا کہ حکومت جہاد کے لیے جبراً مال لے سکتی ہے۔ چنانچہ اپنے آخری ایام میں اس نے علماء سے باقاعدہ فتویٰ لیا کہ سلطان جہاد کے لیے ضرورت پڑنے پر عوام سے جبراً مال وصول کرسکتا ہے۔ سب نے اس پر دستخط کردیے۔ اس فتوے کے دلائل یہ تھے کہ جہاد اور سرحدوں کی حفاظت سلطان کا ذاتی کام نہیں بلکہ اس کا نفع اُمّت کو ہے۔ اگر عوام سلطان کے کہنے پر اس ضرورت کو پورا نہیں کرتے تو خطرہ ہے کہ کفار زبردستی غالب آکر ان سے سب کچھ چھین لیں۔

تاہم امام نووی رحمہ اللہ اپنے سابقہ موقف پر قائم رہے اور اس پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر فتوے پر غیر مشروط دستخط کردیے گئے تو بعد والے جابر سلاطین کو ایک بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ سلطان بیبرس کو رقم کی ضرورت تھی، اس نے ناراضی کا اظہار کیا اور انہیں بلوا کر مخالفت کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے جواب دیا:

''میں نے سنا ہے کہ آپ کے ایک ہزار غلام ہیں جو سنہری پٹکے باندھتے ہیں اور دو سو باندیاں ہیں جن کے پاس زیورات کے صندوقچے ہیں۔ اگر آپ پہلے یہ دولت خرچ کردیں اور آپ کے غلام اونی پٹکے باندھنے لگیں اور باندیوں کے پاس کوئی زیور نہ بچے، تب میں رعایا کا مال لینے کی اجازت دے سکتا ہوں۔''

بیبرس اس بے باکانہ گفتگو پر ناراض ہوگیا اور بولا ''آپ شہر سے نکل جائیں۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جو آپ کا حکم!!'' یہ کہہ کر وہ اپنے گاؤں نویٰ چلے گئے۔ بعد میں علمائے دمشق نے آکر بیبرس کو امام نووی رحمہ اللہ کے مقام و مرتبے سے آگاہ کیا اور کہا: ''یہ ہمارے بڑے فقیہ اور عالم ہیں۔''

سلطان نے فوراً علماء کو ان کی طرف بھیجا کہ وہ انہیں اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس لے آئیں۔ مگر امام نووی رحمہ اللہ سلطان سے اس قدر رکبیدہ خاطر تھے کہ فرمایا: ''میں نے قسم کھائی ہے کہ بیبرس کی زندگی میں کبھی دمشق نہیں جاؤں گا۔''

ممکن تھا سلطان انہیں منانے کے لیے کچھ اور کرتا مگر زندگی نے اسے مہلت نہ دی اور چند دنوں بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد امام نووی رحمہ اللہ نے بھی زیادہ عمر نہ پائی اور اسی سال ۲۴ رجب ۶۷۶ھ کو وفات پا گئے۔ ان کی عمر صرف ۴۵ سال تھی مگر اس مختصر سی زندگی میں انہوں نے جو کام کیا وہ انہیں زندۂ جاوید بنا گیا۔[2]

❁❁❁

---

① المنهل العذب الروى فى ترجمة قطب الأولياء النووى للسخاوى، ص ۳۰ تا ۳۳؛ تحفة الطالبين لابن العطار، ص ۹۰۸

② البداية والنهاية: سنة ۶۷۶ھ؛ تاريخ الاسلام للذهبى سنة ۶۷۶ھ؛ الامام النووى از احمد فريد، ص ۱۱ تا ۱۵

مولانا جلال الدین رومی

۶۰۴ھ تا ۶۷۲ھ (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۲ء)

مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ خراسان (موجودہ افغانستان) کے شہر بلخ میں پیدا ہوئے تھے جو اس وقت سلطنت خوارزم کا ایک حصہ تھا۔ ان کی دادی ''ملکہ جہان'' خوارزم کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مولانا رومی رحمہ اللہ کے والد سلطان العلماء بہاء الدین، شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ کے خلیفہ اجل ہونے کے ساتھ ساتھ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کے بڑے مقرب تھے۔

جب خوارزم پر تاتاریوں کے حملے کے آثار ظاہر ہوئے تو شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ کے حکم پر ان کے خلفا مختلف ممالک کی طرف ہجرت کر گئے۔ شیخ بہاء الدین بھی اپنے بیٹے کو لے کر بغداد، مکہ معظمہ، دمشق اور دیگر شہروں سے ہوتے ہوئے ایشیائے کوچک چلے گئے۔ اسی دوران تاتاریوں نے عالم اسلام پر یورش کی اور اسلامی سلطنتوں کو تہ و بالا کر ڈالا۔ مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ نے ابتلاء و آزمائش کا سالہا سال پر محیط یہ طویل دور اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے صدمات اپنے قلب و جگر پر محسوس کیے۔ یہ مولانا رومی رحمہ اللہ کا دورِ شباب تھا۔ ان کٹھن اور صبر آزما حالات میں وہ حصول علم میں مصروف رہے اور اسلام کے اس ورثے کو جو طول و عرض میں پھیلے ہوئے کتنے ہی ممالک اسلامیہ سے ناپید ہوتا جا رہا تھا، اپنے سینے میں محفوظ کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک عرصہ انہوں نے درس و تدریس میں گزارا۔

پھر ان کی زندگی میں حضرت شمس الدین تبریزی رحمہ اللہ آئے جن کی صحبت کیمیا اثر میں رہ کر وہ کندن بن گئے۔ جب وہ اس مردِ خدا سے عشقِ الٰہی کا سوز جذب کر چکے تو بارگاہِ ربوبیت نے انہیں امت کی اصلاح و تربیت کے عظیم کام کے لیے منتخب کر لیا۔ مولانا رومی رحمہ اللہ کی بقیہ زندگی اسی جد و جہد اور تگ و دو میں صرف ہوئی کہ بندوں کو خدائے بزرگ و برتر کی معرفت سے آراستہ کیا جائے۔

انہوں نے علم کلام اور متکلمانہ ابحاث کا راستہ چھوڑ کر تزکیۂ نفس اور معرفتِ الٰہیہ کی دعوت دی اور لوگوں کو دین کی روح اور حقیقت سمجھائی۔ مولانا رومی رحمہ اللہ کا بنیادی موضوع ''عشق الٰہی'' اور ''اصلاحِ قلب'' تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو جو آباء و اجداد کی تقلید میں رسمی اسلام کو کافی سمجھتے تھے، ایمان کے اس بلند مرتبے سے آگاہ کیا جس میں محبت کی جلوہ نمائی اور عشق کی کرامات واضح نظر آتی ہیں۔ مولانا رومی رحمہ اللہ لوگوں کو خداوند تعالیٰ کی عظمت اور محبت کا ایسا درس دیتے کہ سامعین کے دل کبھی خشیت الٰہی سے لرزنے اور کبھی جوشِ محبت سے مچلنے لگتے۔ مولانا رومی رحمہ اللہ اس تصوف کی دعوت دیتے تھے جو عمل سے مربوط اور زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ وہ مسلمانوں کو ایمان کی طاقت کے ساتھ شریعتِ مطہرہ پر عمل پیرا ہو کر عمل کے میدان میں سبقت لے جانے کی تلقین کرتے تھے۔ [1]

---

[1] قصص المثنوی للحمدی (المقدمۃ): ۱/۷ تا ۱۴؛ تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/۳۳۵ تا ۳۹۰

مولانا رومی رحمہ اللہ کا لازوال کارنامہ ''مثنوی ومعنوی'' ہے جو درحقیقت ان کی زندگی بھر کی محنت کا نچوڑ اور حکمت ومعرفت کا بہت بڑا خزینہ ہے۔ مثنوی کو امت مسلمہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس میں اس دور کی شاید ہی کوئی کتاب اس کے ہم پلہ ہو۔ مثنوی کے اشعار میں سوزِ جگر کی وہ آمیزش ہے کہ سخت دل انسان بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس میں عام فہم مثالوں اور حکایتوں کے ذریعے شریعت اور طریقت کے رموز اور لطافتوں کو اس طرح کھول دیا گیا ہے کہ عام آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

مثنوی نے زبوں حال اور نیم جان امت میں عشق حقیقی کی ایک نئی روح پھونک دی۔ لاکھوں بندگانِ خدا نے اس سے استفادہ کیا اور مایوسی وحسرت کے گرداب سے نکل کر وہ یقین، توکل، عزیمت اور امید کے درخشاں راستوں پر گامزن ہو گئے۔ مثنوی کی بے مثال مقبولیت اور اس کے ہمہ گیر اثرات کے تحت یہ کہا جا سکتا ہے کہ امت کی نشاۃ ثانیہ میں مولانا رومی رحمہ اللہ اور ان کی مثنوی کو اہم مقام حاصل ہے۔[1]

❁❁❁

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس دور کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ اصل نام احمد تقی الدین تھا۔ ابن تیمیہ خاندانی کنیت تھی جو زیادہ مشہور ہو گئی۔ ان کی ولادت ۶۶۱ھ میں الجزیرہ کے شہر حران میں ہوئی۔ ان کا خاندان آٹھ پشتوں سے علوم اسلامیہ کی خدمت سے وابستہ تھا۔ ان کے دادا ابوالبرکات مجد الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ ان کی تالیف ''منتقی الاخبار'' فقہی ترتیب پر احادیث کا بہترین مجموعہ ہونے کے باعث فقہاء میں بہت مقبول تھی۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ابھی چھ سال کے تھے کہ ان کے والد علامہ عبدالحلیم ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو تاتاریوں کے مظالم سے بچنے کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر دمشق آنا پڑا۔ یہاں ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر عربی ادب اور فقہ وحدیث کی تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ بچپن ہی میں ان کے حافظے اور ذہانت کا یہ عالم تھا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ایک بار ایک عالم نے آکر ان کا امتحان لیا۔ ان کی تختی پر تیرہ احادیث لکھ دیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے انہیں ایک بار غور سے پڑھ لیا۔ عالم نے تختی اٹھالی اور کہا: سناؤ۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ساری لفظ بلفظ سنا دیں۔ عالم نے تختی پر حدیث کی چند اسناد لکھ دیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے انہیں ایک بار پڑھا اور پھر زبانی سنا دیا۔ وہ عالم یہ دیکھ کر کہنے لگے:

''یہ بچہ اگر جیتا رہا تو کوئی چیز بنے گا کیوں کہ اس زمانے میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔''[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بچپن سے نوجوانی تک علوم وفنون کی جملہ اقسام کو بڑی لگن سے سیکھا۔ حدیث میں ان کے

---

① قصص المثنوی للحمدی (المقدمة): ۱/۷ تا ۱۲؛ تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/۳۳۵ تا ۳۰۰

② العقود الدریة فی مناقب ابن تیمیة لابن عبدالهادی، ص ۲۰

اساتذہ کی تعداد دو سو سے زائد تھی۔ بخاری و مسلم انہیں زبانی یاد تھیں۔ تفسیر اور عقائد میں وہ ایک بحرِ ذخار تھے۔ وہ جس فن کی طرف متوجہ ہوتے اس میں یدِ طولیٰ حاصل کر لیتے۔ علمِ کلام، فلسفہ، منطق اور عقلی علوم ان کے لیے بچگانہ ابحاث تھیں جن کی اغلاط کو وہ طشت از بام کرتے رہتے تھے۔ انہیں جس قدر عبور فقہ و حدیث پر تھا، اتنی ہی مہارت نحو، لغت، سیرت اور تاریخ میں تھی۔ اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث میں وہ امام تھے۔

سترہ برس کی عمر میں وہ مسندِ افتاء پر بیٹھے تو دمشق میں ان کا شمار حنابلہ کے راسخ علماء میں ہونے لگا۔ اسی دوران انہوں نے تصانیف کا سلسلہ شروع کر دیا اور بہت جلد ان کے علوم کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

اپنے والد کی وفات کے بعد ۲۲ سال کی عمر میں وہ ان کی جگہ مدرسے میں درسِ حدیث اور جامع اموی میں درسِ تفسیر دینے لگے۔ ان کی علمی و فنی عبقریت نے علماء کو انگشت بدنداں کر دیا۔ وہ ۳۴ برس کے تھے کہ دمشق کے مدرسہ حنبلیہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ [1] الملک الناصر محمد بن قلاوون کے زمانے میں شام پر تاتاریوں کے حملے کے دوران امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تاریخ ساز کردار ادا کیا اور بادشاہ سمیت پوری قوم کو دشمن کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ اس کش مکش کے ابتدائی مرحلے میں اہلِ شام کو شکست ہوئی مگر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے عوام و حکام کا حوصلہ برقرار رکھا جس کے نتیجے میں رمضان ۷۰۲ھ میں مملوکوں نے تاتاریوں کے خلاف تاریخی فتح حاصل کی۔ [2]

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ہمہ جہتی علمی خدمات:

انہوں نے علوم اسلامیہ کی ہمہ جہتی خدمات اس طرح انجام دیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے۔ فلاسفہ کی فکر و نظر پر انہوں نے ایسی لاجواب جرح کی کہ عقل کے پجاریوں کے لیے اپنا دفاع مشکل ہو گیا۔ عقلیات پر تکیہ کرنے والے متکلمین کو بھی انہوں نے ہدفِ تنقید بنایا اور اس بات کو واضح کیا کہ فلسفے کے جواب میں ارسطو اور فارابی کی منطق کو معیارِ نقد بنا لینے سے کبھی بھی کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکتی بلکہ مسائل مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں وہی اسلوب بہتر اور ہر زمانے کے لیے کافی و شافی ہے جو کتاب و سنت کی نصوص پر مبنی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دور میں بہت سے لوگ تصوف میں مبالغہ کرتے ہوئے راہِ حق سے دور جا پڑے تھے۔ ان سے چند عشرے پہلے شیخ ابن العربی رحمہ اللہ (م ۶۳۸ھ) گزرے تھے جن کی ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحاتِ مکیہ'' بہت مشہور ہوئی تھیں۔ ان کی کتب میں بہت سے الحاقات اور اضافے بھی کر دیے گئے تھے، خاص کر فصوص کے بارے میں خود ابن العربی کے بعض مداحوں کا کہنا ہے کہ اس میں ایک تہائی حصہ بعد میں ملایا گیا ہے۔ بعض صوفیاء کا کلام حالتِ جذب کی پیداوار تھا جسے لوگوں نے بلا تاویل من و عن مان کر بدعقیدگی اختیار کر لی تھی۔ غرض اس قسم کی تصانیف نے کئی نئے عقائد و نظریات کو جنم دے دیا تھا جو قرآن و سنت کی نصوص سے متصادم تھے۔ صوفیاء کے بعض جعلی گروہوں

---

[1] العقود الدریة، ص ۱۸ تا ۲۷؛ البدایة والنهایة: سنة ۶۸۲ھ، ۶۹۵ھ

[2] البدایة والنهایة: سنة ۶۹۹ھ، ۷۰۲ھ

نے عجیب وغریب رسومات اپنالی تھیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ان کے ہاں قبروں کے احترام میں غلو کرنا اور اصحابِ قبور سے حاجت روائی چاہنا عام تھا۔امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے مبالغہ آمیز اور خلافِ شرع تصوف کے خلاف زبان وقلم سے جدوجہد کی اوراس کی خرابیاں واضح کیں۔ ① بہت سے لوگ ان کی کوششوں سے تائب ہوئے۔ ②

باطل فرقوں خصوصاً باطنیہ اور روافض نے اسلام کی جڑیں کاٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد رسائل اور تصانیف میں ان کے دجل اور مکروفریب کا پردہ چاک کیا اور یہ حقیقت واضح کی کہ ان کا اس اسلام سے کوئی واسطہ نہیں جو حضور ﷺ اور صحابہ کرام نے پھیلایا تھا۔ ③

تفردات اور آزمائشیں:

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے آباء واجداد حنبلی تھے اور خود ان کے اکثر فتاویٰ بھی فقہ حنبلی کے مطابق تھے مگر شریعت کی نصوص، فقہی مذاہب کے اصول اور روایات کے متون واسناد پر مجتہدانہ نگاہ کے ہوتے ہوئے ان کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ فقہ حنبلی کی من وعن پیروی کریں۔اس لیے وہ تمام ائمہ مجتہدین کے فتاویٰ سے استفادہ کرتے تھے اور بعض اوقات متنازعہ مسائل میں وہ جس مجتہد کے دلائل زیادہ مضبوط دیکھتے اس کا مسلک اختیار کر لیتے تھے۔ ④

اپنی غیر معمولی ذہانت کے باعث انہوں نے چند مسائل میں اسلاف کے دائرے سے باہر قدم بھی نکالا جس سے بارہا علمی حلقوں میں ان کے خلاف شور اٹھا۔بعض سرکردہ لوگ مروجہ تصوف کی خرابیوں پر ان کی تنقید سے نالاں تھے۔ مخالفین نے کئی بار حکام سے شکایات لگا کر انہیں جیل میں ڈلوایا مگر وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے، اس سے قطعاً منحرف نہ ہوئے۔صرف دلائل کی روشنی میں اپنے موقف کی غلطی دیکھ کر ہی وہ اپنی بات سے رجوع کرتے تھے۔ ⑤

آخری بار گرفتاری اور جیل میں وفات:

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر یہ فتویٰ دیا تھا کہ روضۂ اطہر سمیت کسی قبر کی زیارت کے لیے اہتمام کے ساتھ عزم کر کے جانا درست نہیں، کیوں کہ حدیث میں آتا ہے: ''تین مساجد: مسجدِ حرام، مسجد اقصیٰ اور میری مسجد (مسجدِ نبوی) کے سوا کسی جگہ کے لیے اہتمام سے سفر نہ کیا جائے۔'' ⑥ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے خیال میں اس طرح قبروں کی زیارت کے لیے جانے سے شرک وبدعات کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ان کی رائے تھی کہ اس حدیث کے مطابق

---

① ملاحظہ ہوں امام ابن تیمیہ کی کتب: الرد علی الشاذلی، الواسطة بین الحق والخلق، زیارة القبور الاستنجاد بالمقبور

② العقود الدریة لابن عبد الهادی، ص ۲۱۱

③ تاریخ دعوت وعزیمت: ۲/۱۴۱ تا ۱۴۴، ۳۱۳ تا ۳۱۸

④ تاریخ دعوت وعزیمت: ۲/۱۰۷ تا ۱۰۸ ...... یاد رہے کہ کسی ایک امام مجتہد کی تقلید کرنا نہ صرف عوام بلکہ غیر مجتہد علماء کے لیے بھی ضروری ہے تاکہ آزاد خیالی، کم علمی کی جہالتوں اور نت نئی فرقہ بندیوں سے حفاظت ہو سکے۔البتہ مجتہد پر یہ پابندی نہیں۔امام ابن تیمیہ خود کو جس علمی مقام پر محسوس کرتے تھے، اس کے پیشِ نظر اگر انہوں نے بعض مواقع پر دائرۂ تقلید سے باہر قدم نکالا تو یہ ان کا اجتہادی اقدام تھا جس پر وہ موردِ الزام نہیں ہو سکتے مگر کوئی دوسرا ان کی نقل کرنے کی کوشش کرے گا تو منہ کے بل زمین پر گرے گا کیوں کہ نصوص سے مسائل کا استنباط علوم کی جس جامعیت کا متقاضی ہے، وہ ہر کسی کو نصیب نہیں۔اس موضوع پر شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کی تصنیف ''تقلید کی شرعی حیثیت'' کا مطالعہ کیا جائے جس میں اس موضوع کے تمام تشنہ پہلوؤں پر بہت عمدہ بحث کی گئی ہے۔

⑤ تاریخ دعوت وعزیمت: ۲/۱۱۰ تا ۱۱۵

⑥ صحیح البخاری، ح: ۱۹۸۹، باب فضل الصلاة فی المسجد

روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے بھی قصد کر کے جانا مناسب نہیں بلکہ مسجد نبوی میں نماز کی نیت سے حاضری دی جائے اور پھر روضے پر سنت کے مطابق صلوٰۃ وسلام عرض کر دیں۔ مخالفین نے ان کی رائے کو اس طور پر لیا کہ وہ روضۂ اطہر کی زیارت کے منکر ہیں۔ اس بات سے عوام میں ایسا اشتعال پھیلا کہ سلطان الملک الناصر ان کا عقیدت مند ہوتے ہوئے بھی از راہِ مصلحت انہیں قید کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ ۷ شعبان ۷۲۶ھ کا واقعہ ہے۔ [1]

ان کی زندگی کے آخری دو سال دمشق کی جیل ہی میں گزرے۔ اس دوران ان کا زیادہ وقت تلاوت، مطالعے اور تصنیف وتالیف میں گزرتا۔ تلاوت کی کثرت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے جیل کے دو سالوں میں اپنے بھائی کے ساتھ قرآن مجید کے اسّی دور کیے۔ تصنیف وتالیف میں بھی زیادہ تر تفسیر قرآن پر زور رہا۔ اس کے علاوہ فقہی سوالات کے جوابات بھی تحریر کرتے رہے۔ ایک سال دس ماہ گزرنے پر ان سے لکھنے پڑھنے کا سامان ضبط کر لیا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ کوئلے سے کاغذ کے ٹکڑوں پر تحریری کام کرتے رہے۔ ذوالقعدہ ۷۲۸ھ میں وہ بیمار ہوئے اور اسی ماہ کی ۲۲ تاریخ کو ۶۷ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جنازہ جیل سے نکلا۔ اس دن شہر کے سارے بازار بند تھے۔ دمشق کی تاریخ میں صدیوں سے اتنا بڑا جنازہ کبھی نہ دیکھا گیا تھا۔ [2] ''مقابرِ صوفیہ'' نامی قبرستان میں تدفین ہوئی۔ [3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ اپنے ہم عصروں پر فائق تھے۔ حاضر دماغی، قوتِ قلبی اور علوم نقلیہ وعقلیہ پر عبور کے لحاظ سے وہ ایک عجیب انسان تھے۔'' [4]

تصانیف:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تصانیف کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ آج تک دنیا اس پر سر دُھن رہی ہے۔ ان کی تحریرات فکر کی گہرائی، وسعتِ مطالعہ، قوتِ حافظہ، اور علمی رسوخ کی دلیل ہیں۔ ان کے فتاویٰ ائمہ اربعہ کی فقہ پر ان کی مضبوط دسترس کا پتا دیتے ہیں۔ حدیث اور تاریخ میں وہ صحیح اور ضعیف روایات کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے استدلال کرتے ہیں۔ رجالِ حدیث اور راویانِ تاریخ سے وہ اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے قلم کی روانی انسانی ذہن کو ساتھ بہالے جاتی ہے۔ ان کا اندازِ سخن فصاحت وبلاغت کی انتہا کو جا پہنچتا ہے۔ ان کی گفتگو سے دردِ دل، حمیتِ ایمانی، عشقِ نبوی، شریعت سے والہانہ تعلق اور امت کی حالتِ زار پر کڑھن کا جابجا اظہار ہوتا ہے۔ باطل فرقوں کی تردید میں ان کا قلم دودھاری شمشیر بن جاتا ہے۔ ان کے طرزِ استدلال میں قرآن وسنت کی نصوص اس کثرت سے ملتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تاریخی حوالہ جات، عقلی شواہد، لغت اور نحو سے بھی مدد لے کر اپنا مدعا ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ان کی چند مشہور تصانیف کا تعارف درج ذیل ہے:

---

① العقود الدرية، ص ۳۴۳ تا ۳۷۷

② البداية والنهاية: سنة ۷۲۶ھ، ۷۲۸ھ

③ تاریخ دعوت وعزیمت: ۱۲۵/۲

④ الدرر الكامنة في اعيان المائة الثامنة: ۱/ ۴۶، ط دكن

❁العقيدة الواسطية: اہل سنت والجماعت کے متفقہ عقائد کا مشہور متن

❁شرح العقيدة الاصفهانيه: شیخ محمد بن اصفہانی کی ''العقیدۃ الاصفہانیہ'' کی بہترین شرح

❁التحفة العراقيه: ایمانیات کا عام فہم بیان

❁قاعدة عظيمة فى الفرق بين عبادات اهل الاسلام و عبادات اهل الشرك:
اس میں مسلمانوں اور کافروں کے اعتقاد اور عبادات کے مابین بنیادی اختلافات واضح کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ ایک مؤمن اور ایک مشرک کے اعتقاد اور عبادت میں کبھی کوئی درمیانی راہ نہیں نکل سکتی۔

❁الفتاوىٰ الحمويه الكبرىٰ: اللہ کی صفات کے بارے میں شیخ الاسلام سے کیے گئے بعض سوالات کے مفصل جوابات جن پر شیخ کو علمائے وقت کی مخالفت اور حکومت کی طرف سے سزا کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

❁درء تعارض العقل والنقل: ۱۰ جلدیں: تقریباً تین ہزار صفحات۔ عقل اور نصوصِ شرعیہ کے درمیان توازن کے اصول۔ ابن سینا، ابن رشد اور طوسی جیسے نامور فلسفیوں کے نظریات کی تردید

❁اقتضاء الصراط المستقيم: دو جلدوں اور لگ بھگ ایک ہزار صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت معرکۃ الآراء ہے، اس میں اس دور کی ان بدعات اور کفریہ وشرکیہ رسومات کی تردید کی گئی ہے جو مسلم معاشرے میں عام ہو گئی تھیں۔

❁الاستقامة: دو جلدیں۔ اللہ کی بعض صفات، اس کی محبت اور عقل کے صحیح دائرہ کار کے بارے میں نہایت باریک مباحث

❁الاكليل: اللہ کی ذات وصفات پر نصوص کے مطابق ایمان لانے اور عقلی توجیہات وتاویلات سے اجتناب کرنے کے بارے میں

❁الايمان: ایمان اور اسلام کی حقیقت کا بیان

❁التدمرية: اللہ کے اسماء وصفات کا ذکر، تقدیر کا بیان، تقدیر کے بارے میں گمراہ فرقوں کی تردید

❁الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح: ۵ جلدیں ...... نصرانیوں کے اعتراضات کا منہ توڑ جواب اور ان کے عقائدِ باطلہ کی پرزور تردید...... اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دین وہی ہے جس پر مسلمان عمل پیرا ہیں جبکہ نصرانی اس دین کو بدل کر کفر وشرک کے گورکھ دھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آج تک پادری صاحبان اس کتاب کا جواب نہیں دے سکے۔

❁العبودية: اللہ کی عبادت اور اس کے بارے میں دین کی سادہ اور صحیح تعلیمات، ایمان اور اسلام کی وضاحت، بندگی اور اطاعت کی حقیقت، اللہ کے بارے میں جاہل صوفیاء کے افکار کی تردید اور جہاد کی حقیقت

❁منهاج السنة النبوية: ۸ جلدیں، اہل سنت کے عقائد کے ثبوت اور روافض کی تردید میں ایک بحرِ ذخار

❁الفرقان بين اولياء الرحمن واولياء الشيطان: شریعت کے پابند حقیقی اولیاء اور صوفی کہلانے والے

شعبدہ باز عاملوں اور جادوگروں کے درمیان فرق ظاہر کرنے والی اپنے موضوع پر پہلی اور منفرد کتاب

⊛زيارة القبور والاستنجاد بالمقبور: قبروں کی زیارت کی ناجائز رسموں اور مدفون بزرگوں سے مدد طلب کرنے کی تردید میں نہایت عمدہ کتاب

⊛الرد على المنطقيين: منطق اور یونانی عقلیات کے بے وزن اور بے حیثیت ہونے پر لاجواب کتاب

⊛الصفدية: دو جلدیں۔ فلسفیوں اور باطنیوں کے عقائد باطلہ اور وحدۃ الوجود کے قائل صوفیا کی تردید، ارسطو اور ابن سینا کے افکار کی بنیادوں پر حملہ

⊛النصيرية: نصیری فرقے کی حقیقت طشت ازبام کرنے والی پہلی تصنیف

⊛بغية المرتاد: فلسفیوں، باطنیوں اور قرامطیوں کے عقائدِ باطلہ کی بنیادیں ڈھانے والی تصنیف

⊛مقدمة اصول التفسير: تفسیر کے اصول، ایک منفرد اور دلآویز انداز میں

⊛دقائق التفسير: تین جلدیں: نہایت عمدہ اور بے مثال تفسیری مباحث

⊛رفع الملام عن ائمة الاعلام: ائمہ اربعہ کی شان وعظمت پر لاجواب رسالہ

⊛رأس الحسين: واقعۂ کربلا، شہادتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے سر مبارک کی جائے تدفین پر تاریخی حوالوں سے بحث

⊛السياسة الشرعية فى اصلاح الراعي والرعية: اسلامی سیاست کے اصول اور حکمرانوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے بارے میں

⊛الحسبة في الاسلام: اسلامی ریاست کے ایک اہم شعبے محکمہ احتساب کی ضرورت واہمیت، اس کے فوائد اور ذمہ داریوں پر گفتگو

⊛الفتاوى الكبرىٰ: چھ جلدیں۔ زندگی کے ہر شعبے کو محیط وقیع اور مدلل فتاویٰ

⊛مسئلة المرابطة بالثغور: جہاد اور مجاہدین کی ہمت افزائی کے لیے رسالہ جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ سرحدوں پر پہرہ دینے والے سپاہی مکہ میں عبادت کے لیے زندگی گزارنے والوں سے افضل ہیں۔

⊛احاديث القصاص: ان روایات کی حقیقت جو منبر پر حدیثِ رسول کے طور پر بیان کی جاتی ہیں مگر یا تو اصل حدیث میں ردوبدل کر دیا ہے یا وہ بالکل من گھڑت ہیں۔

⊛الصارم المسلول على شاتم الرسول: حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کرنے والوں کی شرعی سزا کے بارے میں ایک مفصل اور بے نظیر بحث۔

⊛الزهد والورع والعبادة: ایمانی صفات، تزکیہ نفس اور اخلاق حسنہ کے بارے میں

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے رسائل کی تعداد تین سو کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ ایک سعودی محقق ڈاکٹر عبدالرحمٰن محمد

بن القاسم نے ان کے فقہی مقالات کا مجموعہ ''مجموع الفتاویٰ'' کے نام سے شائع کیا ہے جو ۳۵ جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہی محقق کی کوششوں سے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نادر فتاویٰ کا مجموعہ ''المستدرک علیٰ مجموع الفتاویٰ'' کے عنوان سے پانچ جلدوں میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس سے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی علمی عبقریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

❁❁❁

ہندوستان میں مشائخ چشت کے کارنامے

جس طرح شام اور مصر میں حکمران طبقے کو اسلام کے دفاع کے لیے بیدار کرنے میں شیخ الاسلام عزالدین بن عبد السلام اور علامہ ابن تیمیہ رحمہما اللہ جیسے علماء سرگرم عمل رہے، اسی طرح جنوب میں برصغیر کی مسلم سلطنت کی اسلامی حیثیت بچانے، اس کے عوام وخواص میں دینی روح پھونکنے اور اس کو عالم اسلام کے لاکھوں لٹے پٹے مہاجرین کے لیے آخری پناہ گاہ بنانے کے لیے چشتی سلسلے کے بزرگوں کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ ہندوستان کی مسلم سلطنت اس لحاظ سے باقی اسلامی دنیا سے مختلف تھی کہ یہاں آبادی میں مسلمانوں کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ اس صورتحال میں باہر سے تاتاریوں کی یورش اور ہندوستان کی سرحدات پر ان کی تاخت وتاراج نے نہ صرف دہلی کے ترک نژاد مسلم بادشاہوں کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا بلکہ مقامی مسلم آبادی بھی اضطراب اور بے چینی کا شکار تھی، اس نازک صورت حال میں چشتی سلسلے کے اکابر ومشائخ نے اس سرزمین کے عوام وخواص کو ایمان واخلاص، یقین ومعرفت اور اعتماد علی اللہ کی اعلیٰ صفات سے آراستہ کر کے اس قابل بنایا کہ وہ امت مسلمہ کی بقا کے لیے اپنی ذمہ داریاں نبھا سکیں۔

خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ:

چشتی سلسلے کے سرخیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ تاتاری یلغار سے کوئی ۳۰ سال قبل ہندوستان تشریف لاکر اجمیر کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا چکے تھے۔ تاتاریوں کے حملے کے دوران جب دور دراز کے تباہ شدہ اسلامی خطوں سے مہاجرین ہندوستان میں جمع ہونے لگے تو خواجہ صاحب رحمہ اللہ اور ان کے خلفاء نے نہایت اولوالعزمی اور دور اندیشی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ مستقبل میں ہندوستان کو عالم اسلام کی نظریاتی اور روحانی بقا کے لیے چشمۂ حیات کی شکل دینے کی غرض سے مضبوط اور وسیع بنیادوں پر کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ چنانچہ اللہ پر توکل کر کے یہ کام شروع کر دیا گیا۔ ۶۲۷ھ (۱۲۳۰ء) میں خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ وفات پاگئے مگر ان کے خلفاء ان کے نقشِ قدم پر گامزن رہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ

خواجہ معین الدین اجمیری رحمہ اللہ کی زندگی میں ہی ان کے خلیفہ اجل خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ دہلی میں رشد وہدایت کا مرکز قائم کر چکے تھے، مقامی اور مہاجر مسلمانوں کے علاوہ سلطنت کے اعیان بھی ان سے مستفید ہو

---

① تاریخ دعوت وعزیمت: ۳/ص ۲۳ تا ۳۱؛ نیز ملاحظہ ہو: تاریخ مشائخ چشت از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی

رہے تھے۔ سلطان شمس الدین التمش جو ۶۰۷ھ سے ۶۳۴ھ (۱۲۰۹ء تا ۱۲۳۶ء) تک ہندوستان کا بادشاہ رہا، ان کا مرید تھا اور ہفتے میں دو بار ان کی خانقاہ میں اصلاح اور استفادے کی غرض سے حاضری دیتا تھا۔ بادشاہ کے اس طرزِ عمل نے ساری رعایا کو خواجہ صاحب رحمہ اللہ کی عقیدت سے سرشار کر دیا تھا اور لوگ جوق در جوق عشق و معرفت کے اس چشمے سے سیراب ہونے چلے آتے تھے، روحانیت کی اس گرم بازاری نے پورے ہندوستان میں ایمانی ولولے، دینی شعور اور اسلامی اخوت کا ایسا سماں باندھا کہ دنیا بھر کے بے خانماں مسلمانوں کے لیے اس سرزمین کے دروازے کشادہ ہو گئے اور اس خطے میں ہر رنگ و نسل کے مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

۶۳۳ھ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ان کے سلسلے کے متعدد جلیل القدر مشائخ اس میدان میں کام کرتے رہے۔ خواجہ فرید الدین گنج شکر (م ۶۶۴ھ) شیخ علاؤ الدین صابر (م ۶۹۰ھ) اور خواجہ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ) رحمہم اللہ جیسے عظیم مصلحین دعوت الی اللہ اور اصلاحِ امت کے اس معرکے میں سرگرم رہے، خاص طور پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ نے برصغیر کے مسلم معاشرے کے ہر شعبے اور ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد پر گہرے اثرات چھوڑے۔ ان کی دعوتی اور اصلاحی کوششوں کے اثر سے سلاطین دہلی بھی محروم نہ رہے۔ [1]

مشائخ سہروردیہ کے کارنامے

چشتی سلسلے کے علاوہ دیگر سلاسل کے مشائخ بھی اس دور میں وسط ایشیا اور فارس و عراق سے ہندوستان آ چکے تھے اور تزکیہ و اصلاح کی خدمات میں مشغول تھے۔ ان میں سہروردی سلسلے کے گلِ سر سبد شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمہ اللہ کا نام قابل ذکر ہے جو شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ سے بغداد میں فیض یاب ہوئے اور پھر دعوت الی اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ ان کو ہندوستان لے آیا۔ پھر ان کے مرید شاہ رکن عالم سے نہ صرف برصغیر کے عوام بلکہ سلطان غیاث الدین تغلق، سلطان محمد تغلق اور علاؤ الدین خلجی جیسے نامور بادشاہوں تک نے فیض حاصل کیا۔ شاہ رکن عالم رحمہ اللہ کے خلیفہ حضرت جہانیاں جہاں گشت رحمہ اللہ کی خدمات بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ [2]

ان بزرگانِ دین کی ایک صدی کی سرگرم کاوشوں نے ایک طرف ہندوستان کی مسلم حکومت کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت بخشی جبکہ دوسری طرف ان کی کوششوں سے لاکھوں غیر مسلم اسلام میں داخل ہوئے اور سلطنتِ ہند کی بنیادیں اتنی مضبوط ہو گئیں کہ تاتاریوں کے پے در پے حملے بھی اس کو زیر و زبر نہ کر سکے۔

❁❁❁

---

① تاریخ دعوت و عزیمت: ۳/۳۱ تا ۱۰۱؛ نیز دیکھیے: تاریخ مشائخ چشت، حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ
نوٹ: خواجگانِ چشت کے تفصیلی حالات سلاطین برصغیر کے معاصر علماء و مشائخ کے ذیل میں آئیں گے۔

② آب کوثر از شیخ اکرام، ص ۶۰-۲۶۹؛ یادگار سہروردیہ از خاور سہروردی، ص ۱۰۷ تا ۲۰۶، ط نذیر سنز لاہور، ۱۹۹۹ء

سلسلۂ نقشبندیہ کی خدمات

مسلمانوں کی اصلاح اور نومسلم مغلوں کی دینی تربیت کا فریضہ انجام دینے والوں سلاسل میں "سلسلۂ نقشبندیہ" کے بانی حضرت خواجہ بہاؤالدین محمد بن محمد بخاری رحمہ اللہ (۷۱۷ھ-۷۹۲ھ) کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

خواجہ بہاؤالدین رحمہ اللہ کو ترکستان کے مسلم مغل حکمران خلیل سے خاص دلی وابستگی تھی جو ایک عابد و زاہد صوفی منش آدمی تھے اور ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) سے ۷۴۴ھ (۱۳۴۳ء) تک حکمران رہے۔ اس تعلق کے اثرات عام مغلوں پر بھی پڑے اور وہ خواجہ بہاؤالدین رحمہ اللہ کی تعلیمات سے فیض یاب ہونے لگے۔

خواجہ صاحب رحمہ اللہ کے طریق اصلاح میں ذکر و شغل مخفی طریقے سے جاری رکھا جاتا تھا اور گوشہ نشینی کی بجائے لوگوں سے گھلنے ملنے اور انہیں اسلام کی طرف راغب کرتے رہنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خواجہ صاحب رحمہ اللہ خود بھی صنعت و حرفت کے ذریعے روزی کماتے اور نگینوں پر مینا کاری کا کام کرتے تھے، اس لیے "نقشبند" کہلاتے تھے۔

ان کے سلسلے سے وابستہ سالکین کے نقشبندی کہلانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خواجہ صاحب رحمہ اللہ اور ان کے خلفاء کی صحبت سے اللہ کی محبت کا نقش دل پر جم جاتا تھا۔ عام زندگی میں اخلاق و شائستگی، کسب حلال اور جہاد فی سبیل اللہ میں جوق در جوق شرکت ان حضرات کی پہچان بن گیا تھا۔[1]

خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمہ اللہ کے خلفاء نے مغلوں، ترکوں، ہندوؤں اور بدھ متوں میں اسلام کی دعوت پھیلانے، مسلمانوں میں تصوف کو عام کرنے اور نومسلموں کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں حضرت خواجہ عبیداللہ احرار رحمہ اللہ (۸۰۶ھ تا ۸۹۴ھ مطابق ۱۴۰۳ تا ۱۴۸۹ء) کا نام بہت نمایاں ہے جن سے اس دور کے اکثر ترکستانی اور خراسانی حکام بہت متاثر تھے۔ بڑے بڑے علماء ان کے حلقے سے وابستہ تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمہ اللہ جیسے عالم ان کے فیض یافتہ تھے۔ پھر کابل کے خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ (۹۷۱ھ تا ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۵۶۳ء تا ۱۶۰۳ء) بھی اسی سلسلے کے ایک بزرگ تھے جو دولتِ معرفت لے کر دہلی وارد ہوئے اور یہاں سے ان کا فیض برصغیر میں پھیلا۔ غرض نقش بندی سلسلہ دو صدیوں میں ترکستان سے نکل کر ہندوستان، ایران اور ایشیائے کوچک تک کو محیط ہو گیا۔

✪✪✪

---

① تاریخ بخارا، از قامبری ارمینوس، ترجمہ احمد محمود ساداتی، ص ۲۸۷، ۲۸۸ : تاریخ الترک فی آسیا الوسطی، از پروفیسر بارتھولڈ، عربی ترجمہ احمد سعید سلیمان، ص ۱۹۰ تا ۲۲۰

② تاریخ دعوت و عزیمت: ۱/۱۳۳ تا ۱۳۶ : اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، مادہ: نقش بند؛ سلسلۂ نقشبندیہ کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں:
(۱) الانتباہ فی سلاسل الاولیاء، از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
(۲) ہمعات، از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
(۳) رود کوثر، از شیخ محمد اکرام

چوتھا محاذ: علمی ورثے کی حفاظت کا کام

چوتھا اہم محاذ جس پر امت کے خیرخواہوں نے اس نازک وقت میں اپنی توانائیاں صرف کیں وہ علمی ورثے کی حفاظت کا کام تھا۔ یہ ایک ایسی ضرورت تھی جس کو پورا کیے بغیر نہ اسلام محفوظ رہ سکتا تھا نہ مسلمان۔

نئے دینی مدارس کا قیام:

اس موقع پر امت کے بقیۃ السیف اہل علم نے مسلمانوں کے علمی ورثے کی حفاظت کی ضرورت کو تمام کاموں پر ترجیح دی اور خود کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے مصر، شام، ہندوستان اور اندلس جیسے آزاد مسلم ممالک میں بڑے بڑے دینی مدارس قائم کیے اور ان کے دروازے ہر کسی کے لیے کھول دیے۔ مسلمان بادشاہوں اور رئیسوں نے ان کی بھرپور سرپرستی کی اور ان کے اخراجات کے لیے اپنے خزانوں کا خطیر حصہ مختص کر دیا، چنانچہ کچھ ہی عرصے میں ان مدارس نے اتنی ترقی کی کہ وہ سمرقند، بخارا، ہرات، نیشاپور، بصرہ اور بغداد کے اجڑے ہوئے علمی مراکز کی کمی پوری کرنے لگے۔ علم کے پیاسوں نے دور دور سے ان اطراف کا رخ کیا اور اپنی علمی پیاس بجھانے لگے۔ تاتاریوں کے مقبوضہ مسلم ممالک میں بھی علماء دین نے اندرونِ خانہ درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور چراغ سے چراغ جلاتے رہے۔ بیس پچیس سال کے اندر ان کوششوں کے نتائج سامنے آنے لگے، اہل علم کی ایک نوجوان نسل تیار ہو گئی اور مسلمانوں کی راہنمائی کرنے والے علماء دین کے خاتمے کا خطرہ دور ہونے لگا۔ ①

نئی تصانیف کا سلسلہ:

تاتاری یورش نے جس طرح عالم اسلام کی افرادی قوت کو ملیامیٹ کر دیا تھا اسی طرح اس کے علمی وسائل اور صدیوں کے جمع شدہ کتابی ذخائر کو ضائع اور ہزاروں جامعات، مدارس اور مکاتب کو پیوند زمین کر دیا تھا، فقہاء، محدثین، مفسرین، واعظین، مدرسین اور طلبہ کی ایک پوری کھیپ جو گزشتہ نسل کی محنتوں کا نتیجہ اور آیندہ کے لیے دینی علوم کی وارث اور محافظ تھی، اس عالمگیر فتنے کے شعلوں میں بھسم ہو چکی تھی۔ تاتاریوں نے ہر شہر اور بستی کے کتب خانوں کو جلا ڈالا تھا اور صدیوں کی عرق ریزی سے جمع کردہ علمی سرمائے کو لمحوں میں نذر آتش کر دیا تھا۔ صرف بغداد میں ضائع کی جانے والی کتابیں اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی سیاہی اور راکھ سے دریائے دجلہ کا پانی کئی دنوں تک سیاہ نظر آتا رہا۔

چنانچہ تاتاریوں کے ہاتھوں وسط ایشیا اور ایران وعراق میں ضائع شدہ لاکھوں کتابوں کا نقصان پورا کرنے کے

---

① شیخ عبدالقادر نعیمی الدمشقی (م ۹۲۷ھ) نے اپنی تصنیف ''الدارس فی تاریخ المدارس'' میں اس زمانے میں قائم ہونے والے درجنوں مدارس کا ذکر کیا ہے۔

لیے اَن تھک محنت ہوئی۔ ان کتابوں کے وہ نسخے جو اندلس، مصر اور ہندوستان میں موجود تھے، ان کی بڑی تعداد میں نقول تیار کی گئیں، جن ضائع شدہ اہم کتب کا کوئی نسخہ دیگر ممالک میں بھی نہ ملا، ان کی کسر پوری کرنے کے لیے علماء کرام کے ایک طبقے نے نہایت جانفشانی، مستقل مزاجی اور ذمہ داری کے ساتھ تصنیف وتالیف کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔ زمانہ کی ضرورت اور حالات کے تقاضوں کا احساس ذمہ داری اور مقصد میں اخلاص کے باعث ان کے ہاتھوں بڑی ٹھوس، پرمغز، مدلل اور جامع کتابیں وجود میں آئیں۔ انہوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ جملہ علوم وفنون میں بہتر سے بہتر کتابیں تصنیف کیں۔ صرف ونحو اور دیگر فنون کی بہت سی کتابیں جو اب تک درسی نصاب میں شامل ہیں، اسی ہنگامہ خیز دور میں تصنیف کی گئیں۔

اگر ہم تاتاریوں کے حملے کے بعد سے ساتویں صدی ہجری کے آخر تک تصنیف ہونے والے اس علمی ذخیرے کا جائزہ لیں تو ہمیں واضح طور پر یہ محسوس ہوگا کہ اس دور کے راسخ العلم اور بالغ نظر علماء نے امت کو جو مضبوط علمی ڈھانچا فراہم کیا تھا، آج بھی اس کی پائیداری کم نہیں ہوئی اور امت میں اس کی نمایاں حیثیت آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے علماء کی علمی اور تصنیفی خدمات

اس پر آشوب زمانے میں کتاب اللہ کی بہترین تفاسیر تحریر کی گئیں، امام قرطبی رحمہ اللہ (م ۶۷۱ ھ) کے ہاتھوں بارہ جلدوں میں "الجامع لأحكام القرآن" جو تفسیر قرطبی کے نام سے مشہور ہے، اسی دور میں مکمل کی گئی۔ امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی (م ۷۱۰ھ) کی "مدارک التنزیل" جو تفسیر نسفی کے نام سے معروف ہے، اسی صدی کی یادگار ہے۔ پھر تفسیر "البحر المحيط" منظر عام پر آئی جو ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ (م ۷۴۵ھ) کا کارنامہ ہے۔

علمِ حدیث میں بھی نمایاں کام ہوا۔ امام یحییٰ بن شرف النووی رحمہ اللہ (م ۶۷۶ھ) نے صحیح مسلم کی شرح "المنهاج" تحریر کی جو آج بھی ہر عالم اور طالب علم کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کی "رياض الصالحين" آج بھی صحیح احادیث کے بہترین مجموعے کے طور پر عوام وخواص میں یکساں مقبول ہے۔

شیخ رضی الدین صاغانی رحمہ اللہ (م ۶۵۰ھ) کی "مشارق الانوار" آج تک کرنیں بکھیر رہی ہے۔ اس دور کے حافظ عبدالعظیم منذری رحمہ اللہ (م ۶۵۶ھ) کی "الترغيب والترهيب" آج بھی اپنے موضوع پر بے مثال کتاب مانی جاتی ہے۔ علامہ ابن دقیق العید رحمہ اللہ (۷۰۲ھ) جیسے شارحِ حدیث اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

حنفی فقہاء نے فقہ پر خوب کام کیا۔ تاج الشریعۃ علامہ محمود رحمہ اللہ نے فقہی متن "وقايه" لکھا اور علامہ ابوالبرکات نسفی رحمہ اللہ (م ۷۱۰ھ) نے فقہ میں "كنز الدقائق" اور اصول فقہ میں "منار الانوار" جیسے متون لکھے۔ اصول فقہ کا مشہور متن "حسامی" بھی اسی زمانے کے علامہ حسام الدین فرغانی رحمہ اللہ (م ۶۴۴ھ) کا تحریر کردہ ہے۔

انہی دنوں ابن صلاح رحمہ اللہ (م ۶۴۳) نے اصول حدیث پر اپنا مشہور "مقدمه" لکھا اور آداب افتاء میں "اصول

المفتی والمستفتی'' تالیف کی۔

علوم عربیت اور علوم عقلیہ پر بھی توجہ دی گئی۔ اسی صدی میں ابن مالک رحمہ اللہ (م ۶۷۲ھ) نے نحو کا مشہور منظوم متن ''الفیہ'' تحریر کیا۔ ''شافیہ'' اور ''کافیہ'' کے ماتن علامہ ابن حاجب رحمہ اللہ (م ۶۴۶ھ) بھی انہی ایام میں گزرے ہیں۔ علم بلاغت ومعانی میں ''مفتاح العلوم'' نامی بے نظیر کتاب کے مؤلف علامہ ابو یعقوب السکاکی رحمہ اللہ بھی اسی زمانے کے نامور علماء میں سے تھے۔[1] انہی ہنگامی ایام میں منطق وفلسفہ کے مشہور متون ''ایساغوجی'' اور ''ھدایۃ الحکمۃ'' علامہ اثیر الدین ابہری رحمہ اللہ (م ۶۶۱ھ) کے ہاتھوں تحریر ہوئے۔ مستند عربی لغت ''لسان العرب'' کے مؤلف ابن منظور رحمہ اللہ (م ۷۱۱ھ) کا تعلق بھی اسی زمانے سے تھا۔ ابن منظور رحمہ اللہ نے علامہ ابن عساکر رحمہ اللہ کی ''تاریخ دمشق'' کا اختصار بھی کیا جو بڑا مشہور ہوا۔

تاتاری فتنے نے عالم اسلام کی اکثر سابقہ یادگاروں اور تاریخی خزینوں کو بھی پامال کر ڈالا تھا، اس لیے اسلامی تاریخ کے مٹنے کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ تاہم فتنہ تاتار کے عین عروج کے دوران علامہ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ (م ۶۳۰ھ) نے ''الکامل فی التاریخ'' کو مکمل کر کے اس دور تک کی اسلامی تاریخ کو محفوظ کر دیا۔ انہی ایام میں یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) نے ''معجم البلدان'' میں ہزاروں شہروں اور بستیوں کے کوائف جمع کر دیے، نیز ''معجم الادباء'' میں اپنے دور تک کے تمام نامور ادباء، شعراء، نحویوں، صرفیوں اور ماہرین لغت کے حالات نقل کر کے ان کو تاریخ میں زندہ وجاوید بنا دیا۔ چند عشروں بعد ابن خلکان رحمہ اللہ (م ۶۸۱ھ) سامنے آئے اور ''وفیات الاعیان'' تالیف کر کے اسی کام کو آگے بڑھایا۔ آسمان علم کے بہت سے درخشندہ ستارے ہمیں اس تاریک صدی میں نور کی کرنیں بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں۔

آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں تصنیف وتالیف کا ولولہ:

یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ساتویں صدی ہجری کے محشر خیز دور میں غیر معمولی توجہ اور جہدِ مسلسل کے ساتھ اسلامی علوم کی حفاظت واشاعت کے لیے خود کو وقف کرنے والے اصحاب عزیمت علماء کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ آٹھویں صدی ہجری عالم اسلام کے لیے علمی ترقی کے لحاظ سے ایک مثالی دور ثابت ہوئی اور اس میں ایسے ایسے جبالِ علم نے جنم لیا جن میں سے ہر ایک نے عالم اسلام کو علمی میدانوں میں مستقل کتب خانہ فراہم کیا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (م ۷۲۸ھ) جیسے عبقری عالم، امام جمال الدین المزی رحمہ اللہ (م ۷۴۲ھ) جیسے رجالِ حدیث کے ماہر، علامہ علاؤ الدین الباجی رحمہ اللہ (۷۴۱ھ) جیسے متکلم اور ابو حیان النحوی (۶۵۴ھ تا ۷۴۵ھ) جیسے امام عربیت

---

[1] نوٹ: کتب طبقات میں علامہ کا سن وفات ۶۲۶ھ بتایا گیا ہے جو درست نہیں کیوں کہ کتب تواریخ سے علامہ موصوف کا ۶۲۷ھ میں سلطان جلال الدین کے دربار سے وابستہ ہونا اور ان کے حکم پر بغداد کا دورہ کرنا ثابت ہے، نیز سلطان جلال الدین کے بعد انہوں نے چغتائی خان کے دربار میں بھی ایک عرصہ گزارا تھا۔ ان روایات کو دیکھتے ہوئے ۶۲۶ھ میں ان کی وفات کا قول یقیناً تسامح پر مبنی ہے۔

نوٹ: ''مفتاح العلوم'' کی تلخیص علامہ عبدالرحمٰن قزوینی (م ۷۳۹ھ) نے ''تلخیص المفتاح'' کے نام سے کی اور شرح ''مختصر المعانی'' علامہ تفتازانی نے تحریر کی۔

اس زمانے میں پوری تندہی سے مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ [1]

ان ہستیوں میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ (م ۷۴۲ھ) نے رجال حدیث اور تاریخ میں بڑا کام کیا اور تذکرۃ الحفاظ، میزان الاعتدال، تاریخ الاسلام، العبر فی خبر من غبر، الاعلام بوفیات الاعلام اور سیر اعلام النبلاء جیسی عظیم الشان کتابیں تحریر کیں۔ حافظ ابن کثیر دمشقی رحمہ اللہ (۷۰۱ھ تا ۷۷۴ھ) نے عالمگیر شہرت کی حامل تفسیر لکھی جو تفسیر ابن کثیر کے نام سے مشہور ہے۔ نیز البدایہ والنہایہ جیسی جامع تاریخ اور جامع المسانید والسنن کے نام سے احادیث کا عظیم مجموعہ بھی انہی کے کارنامے ہیں۔ حافظ جمال الدین المزّی رحمہ اللہ (م ۷۴۲ھ) نے تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف اور تہذیب الکمال فی اسماء الرجال جیسی ضخیم اور شاہکار کتابیں لکھیں۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ (۶۹۱ھ تا ۷۵۱ھ) نے سیرت نبویہ پر اپنی بے نظیر تالیف زاد المعاد کے علاوہ دیگر موضوعات پر بہت سی اہم اور مفید کتب تصنیف کیں۔ اسی دور میں تفسیر کے موضوع پر امام بلنسی رحمہ اللہ (م ۷۸۲ھ) نے تفسیر مبہمات القرآن اور شیخ السمین حلبی (م ۷۵۶) نے الدر المصون نامی تفسیر تالیف کی۔

فقہ حنفی کی لاکھوں کتابیں احناف کے مرکز علم بغداد کی تباہی کے موقع پر تاتاریوں کے ہاتھوں ضائع ہو چکی تھیں۔ حافظ جمال الدین زیلعی رحمہ اللہ (م ۷۶۲ھ) نے نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ جیسا علمی شاہکار پیش کر کے احناف کے بیشتر دلائل کو محفوظ فرما دیا۔ انہی کے ہم عصر صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعود (م ۷۴۷ھ) نے فقہ حنفی کی مشہور شرح شرح وقایہ تصنیف کی، اس کے علاوہ اصولِ فقہ میں متن کے طور پر تنقیح اور پھر اس کی شرح توضیح بھی لکھی۔ یہ سب کتب آج تک علوم اسلامیہ کے نصاب کا حصہ ہیں۔

عقلی علوم پر بھی کام ہوا۔ علامہ قطب الدین رازی (۷۶۶ھ) نے منطق کے مشہور متن شمسیہ کی شرح لکھی جو قطبی کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی (م ۷۴۷ھ) نے معقولات، علم کلام اور علوم عربیت میں کتب کے انبار لگا دیے۔ شرح عقائدِ نسفی، المطول اور مختصر المعانی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ انہی کے معاصر سید شریف جرجانی رحمہ اللہ نے فنون کے میدان میں یادگار کتابیں تصنیف کیں۔ صرفِ میر اور نحوِ میر ان کے ہاتھوں وجود میں آنے والے سدا بہار فنی شہ پارے ہیں۔ ابن ہشام (م ۷۶۱ھ) نے مغنی اللبیب، ابن عقیل (م ۷۶۹ھ) نے شرح الفیہ اور اخی سراج اودھی (م ۷۵۸ھ) نے ہدایۃ النحو تالیف کی۔ [2] امام تاج الدین سبکی رحمہ اللہ (م ۷۷۱ھ) نے حدیث، اصولِ فقہ، اسماء الرجال، طبقات اور تاریخ کے میدان میں بھرپور کام کیا اور قابلِ قدر یادگاریں چھوڑیں جن میں معجم الشیوخ، الاشباہ والنظائر، رفع الحاجب عن مختصر ابن حاجب،

---

[1] ان اساطینِ امت کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے: وفیات الاعیان لابن خلکان؛ الاعلام للزرکلی؛ طبقات الحفاظ لابن حجر عسقلانی؛ کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، از کاتب چلپی (حاجی خلیفہ)

[2] ان علماء کے مزید حالات کے لیے دیکھیے: الاعلام للزرکلی؛ الوافی للوفیات للصفدی؛ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی؛ الوفیات لابن الرافع السلامی؛ الوفیات لابن قنفذ؛ کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، از کاتب چلپی (حاجی خلیفہ)

طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، قاعدۃ فی الجرح و التعدیل اور قاعدۃ فی المؤرخین مشہور ہیں۔

اگلے طبقے میں علامہ نورالدین ہیثمی رحمہ اللہ (م ۸۰۷ھ) نے جمع احادیث کے میدان میں بڑا کام کیا۔ ۹ جلدوں میں مجمع البحرین اور ۱۰ جلدوں میں مجمع الزوائد نامی احادیث کے مجموعے ان کی یادگار ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اپنی عبقری شخصیت کے ساتھ سامنے آئے اور نصف صدی سے زائد عرصے کی مسلسل محنت سے دنیائے اسلام کو علم حدیث، رجال حدیث اور تاریخ میں ایک پورا کتب خانہ دے گئے۔ فتح الباری، الاصابہ، تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب اور لسان المیزان جیسی گراں قدر تصانیف ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ (م ۸۵۵ھ) حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کے ہم عصر، ہم علاقہ اور علم و فضل میں ہم پلہ تھے۔ ان کی تحریر کردہ شرحِ بخاری **عمدۃ القاری** ایک عجیب علمی شاہکار ہے۔ اسی طرح انہوں نے علامہ مرغینانی رحمہ اللہ (م ۵۹۲ھ) کی ھدایہ پر البنایۃ کے نام سے ایسی عظیم الشان شرح لکھی جس سے کوئی حنفی فقیہ مستغنی نہیں۔ تین صدیوں کی تاریخ کا ایک معتبر مأخذ عقد الجمان بھی انہی کے قلم سے تحریر ہوا۔ [1]

اسی دور میں برصغیر کے محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) نے عربی لغت کی مایہ ناز کتاب القاموس المحیط پیش کی۔

ان علماء کے حالات اگر الگ الگ تحریر کیے جائیں تو اس کے لیے ایک مستقل جلد درکار ہوگی۔ ہم یہاں فقط چند جلیل القدر علماء کے حالات اختصار کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

حافظ شمس الدین الذہبی رحمہ اللہ: (۶۷۳ھ تا ۷۴۸ھ)

شمس الدین حافظ محمد بن احمد قائماز الذہبی رحمہ اللہ آٹھویں صدی ہجری کی ان نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ایک تھے جن کے علم و فن سے ان کے بعد والے آج تک مستفید ہو رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی ۷۵ سالہ زندگی میں ان تھک محنت کی اور تحقیقی، تالیفی اور تصنیفی کام کا ایسا ذخیرہ چھوڑ دیا جس کی بعد والے ہر محدث، محقق اور مؤرخ کو ضرورت رہی۔ وہ شاعر و ادیب بھی تھے۔ نظم و نثر پر دسترس کے باعث ان کا اندازِ تحریر بہت خوبصورت تھا۔

وہ ربیع الاوّل ۶۷۳ھ میں الجزیرہ کے شہر میافارقین میں پیدا ہوئے۔ [2] نسلاً ترکمانی تھے۔ ۱۸ سال کی عمر میں علمِ حدیث حاصل کرنا شروع کیا اور آخر فن کے امام بن گئے۔ ان کے شیوخ میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سب سے نمایاں تھے۔ [3]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے تلامذہ میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ سے زیادہ قوی الحافظ کوئی نہ تھا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے تھے:

---

① تفصیل کے لیے دیکھیے: کشف الظنون از کاتب چلپی؛ الفہرست لابن ندیم؛ الاعلام للزرکلی؛ معجم المؤلفین لعمر رضا کحالۃ؛ وفیات الاعیان لابن خلکان

② الاعلام للزرکلی: ۵/۳۲۶؛ فوات الوفیات: ۳/۳۱۷

③ الاعلام للزرکلی: ۵/۳۲۶، ط دار العلم للملایین؛ فوات الوفیات لابن شاکر صلاح الدین؛ ۳/ ۳۱۵ تا ۳۱۷، ط صادر

''میں نے آبِ زم زم اس نیت سے پیا تا کہ مجھے حافظ ذہبی رحمہ اللہ جیسا حافظہ نصیب ہو۔''[1]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا زیادہ کام رجالِ حدیث پر ہے جو اتنا وقیع ہے کہ تا قیامت اس سے کوئی عالم بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اس کے ساتھ انہوں نے تاریخ اور شخصیات کے حالات کو بھی بڑی احتیاط اور غیر جانبداری کے ساتھ جمع کیا اور اسناد کی حتی الامکان چھان بین کی۔ اگر کہا جائے کہ راویوں اور رجال کے حالات پر ان سے زیادہ گہری نگاہ رکھنے والا کوئی شخص گزشتہ آٹھ صدیوں میں نہیں گزرا تو یہ بالکل درست ہوگا۔ امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''محدثین فنِ رجال اور دیگر علوم حدیث میں چار شخصیات کے محتاج ہیں: المزی، الذہبی، العراقی اور ابن حجر۔''[2]

ان کے شاگرد رشید امام تاج الدین سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وہ بھلائی کے کاموں میں مشہور تھے، متواضع، خوش اخلاق، شیریں سخن اور عبادت گزار تھے۔ شب کو ان کے ذکر وعبادت کے معمولات تھے۔ وہ مرقدِ صالحیہ اور دار الحدیث ظاہریہ کے شیخ الحدیث تھے۔ ان کی کوئی نظیر نہ تھی۔ مشکل مسئلہ آپڑتا تو وہی حل کیا کرتے تھے، حافظے میں زمانے کے امام تھے، حدیث کے معانی اور الفاظ میں یکتائے روزگار تھے۔ جرح وتعدیل کے سرخیل تھے۔ ہر راہ کے رجال سے واقف تھے۔ گویا کہ اُمت کے لوگ ان کے سامنے ایک میدان میں ہیں اور وہ انہیں دیکھ کر ان کے حالات بیان کرتے جارہے ہیں۔''[3]

تذکرۃ الحفاظ، طبقات القراء، مختصر تہذیب الکمال، التجرید فی اسماء الصحابۃ، المیزان فی الضعفاء، میزان الاعتدال اور **المغنی فی الضعفاء** ان کی مشہور ومعروف تالیفات ہیں۔ **العبر فی خبر من غبر** اور **دُول الاسلام** ان کی تاریخ سے دلچسپی کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان میں سات صدیوں کی تاریخ اختصار سے بیان کردی گئی ہے۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ **سیر اعلام النبلاء** (۲۵ جلدیں) اور **تاریخ الاسلام** (۵۲ جلدیں) ہیں۔ یہ دو عظیم الشان دائرۃ المعارف ہیں۔ **سیر اعلام النبلاء** ہمارے پاس ہو تو شخصیات کے بارے میں اور **تاریخ الاسلام** زیرِ نگاہ ہو تو سات صدیوں کی اسلامی تاریخ کے متعلق پھر کسی اور کتاب کی ضرورت بہت کم پڑے گی۔ ان ''موسوعات'' میں انہوں نے جہاں ضروری سمجھا، اپنے تبصرے بھی پیش کیے ہیں جن سے اصولِ حدیث، فنِ رجال اور فنِ تاریخ کے بہت سے اہم اصول سامنے آتے ہیں جن سے فن کی باریکیاں سمجھ آتی ہیں اور اعتدال واحتیاط کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔[4]

❁❁❁

---

① طبقات الحفاظ، ص ۵۲۱، ۵۲۲، ط العلمیة

② طبقات الحفاظ، ص ۵۲۲، ط العلمیة

③ معجم شیوخ السبکی، ص ۳۵۴، ط دار الغرب

④ معجم شیوخ السبکی، ص ۳۵۵، ط دار الغرب

شیخ یوسف ابوالحجاج جمال الدین المزی رحمہ اللہ: (۶۵۴ھ تا ۷۴۲ھ)

شیخ یوسف بن عبدالرحمٰن جو جمال الدین المزی کے نام سے علمی کائنات میں مشہور ہیں، "خاتمۃ الحفاظ" کہلاتے تھے۔ احادیث کے الفاظ اور اسانید پر ان کی نگاہ نہایت وسیع اور گہری تھی۔ وہ ربیع الآخر ۶۵۴ھ میں حلب کے نواح میں پیدا ہوئے۔[1] پرورش دمشق کی مضافاتی بستی "مزہ" میں ہوئی، اس لحاظ سے وہ "مزی" کہلائے۔[2]

انہوں نے لڑکپن میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر ان کا رجحان علوم عربیت کی طرف ہو گیا، انہوں نے لغت اور صرف و نحو میں غیر معمولی مہارت حاصل کی۔[3] مگر اکیس سال کی عمر میں وہ ہمہ تن علم حدیث کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس فن کا ایسا چسکہ لگا کہ پھر آخر دم تک ان کا یہی شغل رہا۔ انہوں نے شام، حجاز اور مصر میں جگہ جگہ پھر کر امام نووی، احمد بن ابی الخیر اور مسلم بن علان سمیت درجنوں محدثین سے استفادہ کیا اور آخر صفِ اوّل کے محدثین میں شمار ہونے لگے۔[4]

وہ میانہ قامت، قدرے سرخی مائل رنگت والے اور مضبوط اعضاء کے مالک تھے۔ اپنے ذہن اور بدن سے آخر تک مستفید ہوتے رہے۔[5] بڑھاپے کے باوجود وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے تھے۔[6] ۹۰ سال کے لگ بھگ عمر میں (دمشق سے) صالحیہ تک پیدل چلے جاتے تھے۔[7] ان کی تحریر بڑی خوبصورت تھی۔ وہ حیادار، بردبار، قناعت پسند اور متواضع انسان تھے۔ لوگوں سے ملنساری برتتے مگر ان سے میل جول کم رکھتے تھے۔ بہت کم گو تھے۔ کچھ پوچھا جاتا تو جواب دے دیتے اور خوب دیتے۔ جواب میں سختی نہ برتتے۔ نہ اپنی خوبیاں بیان کرتے اور نہ کسی کی غیبت کرتے۔ اسلاف کے طریقے پر چلنا پسند کرتے تھے۔ ان میں کوئی چالاکی نہ تھی۔ بڑی سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔[8] تکلفات اور بننے سنورنے سے دور تھے۔[9] اس دور کے نامور امام ابن سید الناس رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے تھے:

> "میں نے دمشق میں ایک عظیم امام کو دیکھا جو ایسے حافظِ حدیث تھے کہ اپنے معاصرین میں سب پر چھا گئے تھے۔ یہ ابوالحجاج المزی تھے جو علمِ حدیث کے متلاطم سمندر تھے۔ وہ اسماء الرجال کے سب سے بڑے حافظ اور عرب و عجم کے راویوں کے سب سے بڑے عالم تھے۔"[10]

---

① فوات الوفیات: ۴/ ۳۵۳ ② الاعلام للزرکلی: ۸/ ۲۳۶

③ الدرر الکامنۃ: ۶/ ۲۲۹، ۲۳۲؛ الاعلام للزرکلی: ۸/ ۲۳۶

④ فوات الوفیات: ۴/ ۳۵۳؛ الدرر الکامنۃ: ۶/ ۲۲۹

⑤ الدرر الکامنۃ: ۶/ ۲۳۰

⑥ الدرر الکامنۃ: ۶/ ۲۳۰

⑦ الدرر الکامنۃ: ۶/ ۲۲۹ ...... صالحیہ نامی ایک بستی مصر میں قاہرہ کے قریب تھی مگر یہاں دمشق کی نواحی بستی مراد ہے جو قدیم شہر کے شمال میں کوہِ قاسیون کی ڈھلوان پر تھی اور وہاں سے دمشق کا نظارہ بخوبی ہوتا تھا۔ (مسالک الابصار: ۳/ ۵۱۹، ۲۷/ ۳۹۷؛ رحلۃ ابن بطوطۃ: ۱/ ۷۶، ط دار الشرق) اندازاً قدیم دمشق سے صالحیہ کا راستہ ایک ڈیڑھ کلومیٹر ضرور ہوگا اور یہ راستہ نشیب سے بتدریج بلندی کی طرف جاتا تھا۔ اب یہ بستی دمشق شہر میں شامل ہے۔

⑧ الدرر الکامنۃ: ۶/ ۲۲۹، ۲۳۲

⑨ اعیان العصر و اعوان النصر للصفدی (م ۷۶۴ھ): ۵/ ۶۳۸، ط دار الفکر المعاصر، بیروت

⑩ اعیان العصر و اعوان النصر للصفدی: ۵/ ۶۵۳، ط دار الفکر

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے جن لوگوں کو دیکھا ہے، ان میں چار سب سے قوی الحافظہ تھے: ابن دقیق العید، الدمیاطی[1]، ابن تیمیہ اور المزّی۔ ابن دقیق العید حدیث کے مفاہیم کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ الدمیاطی نسب کے سب سے زیادہ ماہر تھے۔ ابن تیمیہ متون کو یاد رکھنے میں سب سے بڑھ کر تھے اور المزّی کو رجال کی پہچان سب سے زیادہ تھی۔''[2]

امام مزّی کا سب سے بڑا کارنامہ **تھذیب الکمال فی اسماء الرجال** ہے جو ۳۵ جلدوں میں ہے اور آٹھ سال کی عرق ریزی کے بعد اس کی تکمیل ہوئی۔ اس سے قبل فنِ رجال میں ایسی جامع اور محققانہ تالیف وجود میں نہیں آئی تھی اور اس کے بعد علمِ رجال پر تحقیق کرنے والا کوئی عالم اس سے مستغنی نہیں رہ سکا۔[3]

تحفة الاشراف بمعرفة الاطراف ان کی ایک اور انوکھی تصنیف ہے جو تیرہ جلدوں میں ہے۔ اس میں صحاحِ ستہ کی احادیث کے اطراف (ابتدائی فقروں) کو لے کر احادیث کی تخریج کی گئی ہے اور ان کے طرق، علل اور اوہام پر بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ کتاب حدیث پر تخصص کرنے والوں کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے جس میں حدیث کے بہت سے علوم جمع ہو گئے ہیں۔ یہ کام انہوں نے ۲۶ سال میں مکمل کیا۔[4]

ان پر آزمائشیں بھی آئیں۔ ۷۰۵ھ میں انہیں بعض حاسدین نے الزامات لگا کر قید کرا دیا۔ آخر امام ابن تیمیہ نے کوشش کر کے انہیں رہا کرایا۔[5] وہ ہمیشہ تنگ دست رہے مگر کبھی شکوہ شکایت زبان پر نہ لائے۔ ایک بار نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ انہیں اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا **تھذیب الکمال** کا اصل نسخہ فروخت کرنا پڑا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کی۔[6] آخری ایام میں وہ طاعون کے موذی مرض کی لپیٹ میں آ گئے اور ۱۲ صفر ۷۴۲ھ کو ظہر سے عصر کے درمیان آیۃ الکرسی کی تلاوت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔[7] تدفین دمشق کے ''قبرستانِ صوفیہ'' میں امام ابنِ تیمیہ کے پہلو میں ہوئی۔[8]

❁❁❁

---

① الدمیاطی سے مراد عبد المؤمن بن خلف شرف الدین الدمیاطی ہیں، جو ۶۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۰۵ھ میں فوت ہوئے۔ حدیث کے علاوہ تاریخ اور انساب کے بھی ماہر تھے جس کا ثبوت ان کی کتب ''قبائل خزرج''، ''کتاب الخیل'' اور ''العقد الثمین فیمن اسمہ عبد المؤمن'' ہیں۔ (فوات الوفیات: ۲/ ۴۱۰، ۴۱۱) حافظ ذہبی ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ (طبقات النسابین، ص ۱۳۷، لابی زید بکر بن عبداللہ م ۱۴۲۹ھ، دار الرشد ریاض، ۱۹۸۷ء)
یاد رہے کہ حافظ ذہبی کے اساتذہ میں ایک اور محدث محمد بن عبد العزیز شمس الدین ابو عبداللہ الدمیاطی الدمشقی (۶۲۰ھ۔۶۹۳ھ) بھی ہیں جو ماہر قرأت بھی تھے۔ (تاریخ الاسلام للذھبی، وفیات سنة ۶۹۳ھ) مگر وہ نساب کے طور پر مشہور نہ تھے۔ اس لیے یہاں وہ مراد نہیں ہو سکتے۔

② الاعلام للزرکلی: ۸/ ۲۳۷

③ تھذیب الکمال فی اسماء الرجال: ۳۵/ ۴۰۲، ط الرسالة

④ تحفة الاشراف للمزی: ۱/ ۶، ط المکتب الاسلامی، ۱۹۸۳ء

⑤ الدرر الکامنة لابن حجر العسقلانی: ۶/ ۲۳۰

⑥ الدرر الکامنة: ۶/ ۲۲۹، ۲۳۲

⑦ الدرر الکامنة: ۶/ ۲۳۳

⑧ شذرات الذھب: ۸/ ۲۳۸

علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ: (۶۹۱ھ تا ۷۵۱ھ)

محمد بن ابوبکر الزرعی رحمہ اللہ جنہیں دنیا حافظ ابن قیم کہہ کر یاد کرتی ہے، صحیح معنوں میں اپنے شیخ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے جانشین اور ان کے مزاج اور منہج کے امین تھے۔ وہ ۲۲ سال کی عمر میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دامن سے وابستہ ہوئے اور پھر کبھی ساتھ نہ چھوڑا یہاں تک کہ قید کے دوران بھی ساتھ رہے اور استاد کی وفات کے بعد ہی رہا ہوئے۔ ①

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے رسائل اور کتب کو جمع، نقل اور عام کرنے میں ان کی لگن کا بڑا دخل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اپنے دور کے نادرِ روزگار عالم تھے۔ انہوں نے زمانے کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے درس وتدریس، اور خطابت کے ساتھ بہترین تصانیف وتالیفات پیش کیں۔ علم تفسیر میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ قرآن وسنت کی تشریح، اصلاحِ عقائد، اور تزکیۂ باطن کے بارے میں وہ اپنے تمام ہم عصروں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ②

ذاتی اخلاق واوصاف کے لحاظ سے بھی وہ قابلِ رشک تھے۔ رات کا بڑا حصہ عبادت میں گزارتے۔ اکثر اللہ کے ذکر میں مصروف رہتے۔ ان کا دل اللہ کی محبت اور حضور ﷺ کی عظمت وعقیدت سے لبریز تھا۔ وہ حسد، عیب جوئی اور مخلوق کی ایذا رسانی سے ہمیشہ دور رہے۔ ③ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ہمارے دور میں ان سے بڑھ کر عبادت گزار اور بکثرت نوافل پڑھنے والا اور کوئی نہ تھا۔ بڑی طویل نماز پڑھتے، رکوع وسجود بہت طویل کرتے۔'' ④

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مزاج میں بعض مسائل میں جو شدت محسوس ہوتی ہے، ابن قیم رحمہ اللہ نے اس سے گریز کیا اور مشہور متنازعہ مسائل میں جمہور علمائے اہلِ سنت سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے استاذ اپنے متفرد مسائل میں قابلِ تقلید نہیں ہیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے حقیقی تصوف، شریعت کے مطابق کام کرنے والی خانقاہوں، پابندِ سنت مشائخ، ان کے قائم کردہ اصلاح وتزکیہ کے مراکز اور ان کی اصلاحِ باطن سے متعلق تصانیف کی بھرپور تائید کی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے صوفیاء کی تردید میں جو شدت ظاہر ہوئی تھی، علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے خود تصوف پر قلم اٹھا کر اسے اعتدال میں تبدیل کر دیا۔ اس سلسلے میں ان کے قلم سے ''روضۃ المحبین'' اور ''رسالۃ ابن قیم الی احد اخوانہ'' جیسی تالیفات وجود میں آئیں۔ ''طریق الھجرتین'' بھی اسی سلسلے کی ایک منفرد کاوش ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا مفید ترین کام سیرتِ طیبہ پر ہے۔ ان کی تصنیف ''زاد المعاد'' آج بھی اس موضوع پر بے نظیر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں صرف سیرت کے حالات وواقعات ہی بیان نہیں کیے گئے بلکہ ہر جگہ اسلامی معاشرے کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر محققانہ ابحاث کی گئی ہیں جو حدیث، فقہ، لغت، تاریخ وسیر سمیت کئی علوم کو حاوی ہیں۔ ⑤

① الاعلام للزرکلی: ۶/ ۵۶، ط دار العلم للملایین
② ذیل طبقات الحنابلۃ لابن رجب الحنبلی: ۵/ ۱۷۱، ط العبیکان ریاض
③ البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۷۵۱ھ ④ البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۷۵۱ھ
⑤ التاج المکلل للقنوجی، ص ۴۰۹ تا ۴۱۲، ط وزارۃ اوقاف قطر؛ الاعلام للزرکلی: ۶/ ۵۶، ط دار العلم للملایین

صلوٰۃ وسلام کی فضیلت پر ان کی تالیف "جلاء الافهام" ان کے عشقِ رسالت کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ "الطب النبوی" اپنے موضوع کی منفرد کاوش ہے جو آج تک گھر گھر پڑھی جاتی ہے۔ وہ بہت بڑے فقیہ تھے۔ انہوں نے اصولِ فقہ اور قواعدِ فتویٰ نویسی پر "اعلام الموقعین" کے نام سے چار جلدوں میں ایسی تصنیف چھوڑی ہے جس کا مطالعہ آج تک ہر مفتی کے لیے لازمی سمجھا جاتا ہے۔

"الفروسیة" نامی ان کی کتاب نہایت عجیب ہے جو "فنونِ حرب" پر لکھی گئی ہے۔ اس میں گھڑ سواری اور تیر اندازی کی اہمیت، فوائد اور فضائل کے علاوہ ان فنون میں مہارت کے طریقے بیان کیے گئے ہیں اور ان میں نو آموز لوگوں سے سرزد ہونے والی غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

"حادی الارواح" نامی تصنیف میں انہوں نے جنت کی نعمتوں کے بارے میں وارد تمام نصوص کتاب وسنت کو نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ ۱۳ رجب ۷۵۱ھ کو دمشق میں فوت ہوئے۔[1]

❁❁❁

عماد الدین حافظ ابن کثیر دمشقی رحمہ اللہ: (۷۰۱ھ تا ۷۷۴ھ)

اسماعیل بن عمر ابن کثیر رحمہ اللہ شام کے دیہات مجدل (نزد بصریٰ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اس گاؤں کے خطیب تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ پانچ سال کے تھے کہ والد کی وفات ہوگئی۔ وہ اپنے گھرانے کے ساتھ دمشق آگئے۔ یہاں بڑی لگن اور محنت سے علوم اسلامیہ کی تحصیل کی۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حلقہ درس سے وہ چوٹی کے عالم اور محدث بن کر نکلے۔ ان کی تصانیف ان کی زندگی ہی میں دور دور تک پھیل گئیں۔ روایات چاہے حدیثی یا تفسیری ہوں یا تاریخی، ان پر ان کی نگاہ بڑی وسیع اور عمیق تھی، اسی لیے ان کا زیادہ کام روایات پر ہے۔

اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ "تفسیر ابنِ کثیر" ہے جس میں عقلی موشگافیوں سے احتراز کرتے ہوئے (جس کا اس دور میں عام مزاج بن گیا تھا) تفسیر سے متعلق احادیث کو بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ تفسیر کا مدار صحیح اور حسن احادیث پر رکھا گیا ہے تاہم ایسی ضعیف روایات کو بھی لے لیا گیا ہے جو اصولاً قابلِ قبول ہوں۔ البتہ منکر، شاذ اور موضوع روایات کو نہ صرف ترک کر دیا گیا ہے بلکہ ان کی قلعی بھی کھولی گئی ہے۔

ان کا دوسرا عظیم ترین کارنامہ البداية والنهاية نامی وہ شاہکار تاریخ ہے جسے آج تک مسلم مؤرخین کے ہاں سب سے قابلِ اعتماد مآخذ شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے دور (۷۶۸ھ) تک کے حالات سن وار جمع کر دیے گئے ہیں۔ انہوں نے حروف تہجی کے اعتبار سے صحابہ کرام کی درجہ بندی کر کے ان سے منقول احادیث کا ضخیم ترین مجموعہ بھی پیش کیا جو ۱۰ جلدوں میں ہے اور جامع المسانید والسنن کے نام سے مشہور ہے۔[1]

---

① التاج المكلل للقنوجي، ص۳۵۷؛ الاعلام للزركلي: ۱/۳۲۰؛ ذيل التقييد في رواة السنن والاسانيد لتقي الدين للفاسي: ۱/۳۷۱، ط العلمية

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ: (۷۳۲ھ تا ۸۰۸ھ)

عبدالرحمٰن بن محمد ابن خلدون رحمہ اللہ اس دور کے عظیم ترین مؤرخ، مفکر اور دانشور تھے۔ وہ اندلس کے شہر اشبیلیہ میں پیدا ہوئے، تیونس میں پرورش پائی اور علم وفن کے ہر گھاٹ سے سیراب ہوئے۔ وہ نہایت ذہین اور نکتہ رس انسان تھے۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ زبان اور قلم کے استعمال میں نہایت محتاط تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ سفر میں گزرا۔ انہیں بڑے بڑے بادشاہوں کا قرب نصیب رہا۔ تیس سال کی عمر میں وہ تلمسان کے حاکم ابوعنان کے مصاحب بن چکے تھے۔ اس کے بعد محلاتی سازشوں کا شکار ہو کر قید میں رہے اور دربار شاہی میں عروج وزوال کے مختلف مراحل سے گزرے۔ قید سے رہائی کے بعد ان کی سابقہ حیثیت بحال ہوگئی تھی مگر کچھ مدت بعد وہ اندلس چلے گئے، جہاں غرناطہ کے سلطان ابوعبداللہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ سلطان کے سفیر بن کر فرنگیوں کی مملکت قسطالیہ بھی گئے۔

چالیس برس کی عمر میں وہ واپس افریقہ آگئے اور یہاں مختلف درباروں سے وابستہ رہے۔ اسی دوران انہوں نے اپنی تاریخ لکھنا شروع کی۔ ۷۸۴ھ میں مصر میں ممالیک چراکسیہ کی حکومت قائم ہونے کے بعد وہ قاہرہ آگئے اور فقہ مالکی کا درس دینے لگے۔ سلطان الظاہر برقوق نے انہیں اپنا قریبی مصاحب بنالیا اور سلطنت میں قاضی مقرر کردیا۔

ان کے اہل وعیال تیونس میں تھے، ابن خلدون رحمہ اللہ نے انہیں قاہرہ بلوانے کی کوشش کی مگر وہ سب راستے میں سمندری طوفان کی نذر ہوگئے۔ اس حادثے نے ابن خلدون رحمہ اللہ کو گوشہ نشین بنادیا۔ وہ قضا کا عہدہ چھوڑ کر اپنی تاریخ دیوان المبتدأ والخبر کی تکمیل میں منہمک ہوگئے جس کی تکمیل ۷۹۷ھ میں ہوئی اور اس میں پندرہ برس صرف ہوئے۔ علم وفن کا یہ شاہکار جس نے پوری دنیا سے اپنا لوہا منوالیا ''تاریخ ابن خلدون'' کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے مقدمے میں انہوں نے علم تاریخ اور عمرانیات کے اصول پیش کیے ہیں اور ساتھ ہی تمدنِ انسانی پر ایسا محققانہ تبصرہ کیا ہے کہ آج تک اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکی۔ تقریباً ۵۰۰ صفحات کا یہ مقدمہ سیاسیات، جغرافیہ، معاشیات، فلسفۂ تاریخ اور قوموں کے عروج وزوال اور ترقی وتنزل کے مراحل کا نہایت باریک بینی سے تجزیہ کرتا ہے۔ اسی مقدمے کی بناء پر انہیں علم عمرانیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت اصولِ عمرانیات سب سے پہلے انہوں نے ہی بیان کیے تھے اور اس فن کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے مقدمے میں ان علوم پر تفصیلی روشنی ڈالی جنہیں اب معاشرتی یا اجتماعی علوم کہا جاتا ہے۔ ہیگل، میکاولی اور گبن جیسے مغربی دانشور علامہ ابنِ خلدون رحمہ اللہ کے خوشہ چین ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسا عظیم الشان مقدمہ انہوں نے فقط پانچ ماہ میں پورا کیا تھا جو ان کی غیر معمولی ذہانت وفطانت اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ہے۔ ۸۰۸ھ میں اس نادرِ روزگار عالم کی وفات ہوگئی۔[1]

❁❁❁

---

[1] الاعلام للزرکلی: ۳۰۹/۲؛ السلوک لمعرفۃ دول الملوک: سنۃ ۷۹۱ھ، ۸۰۸ھ؛ رفع الاصر عن قضاۃ مصر: ۱/ ۲۲۵ تا ۲۳۷

حافظ زین الدین عراقی رحمہ اللہ: (۷۲۵ھ تا ۸۰۶ھ)

حافظ زین الدین عراقی رحمہ اللہ کے آباء واجداد شمالی عراق کے شہر اربیل کے تھے۔ بعد میں وہ مصر منتقل ہو گئے جہاں حافظ عراقی رحمہ اللہ کی ولادت ہوئی۔ اصل نام عبدالرحیم بن الحسین تھا مگر زین الدین کے لقب سے مشہور ہوئے۔

اصولِ حدیث ان کا خاص میدان تھا۔ ان کی تالیفات میں مقدمہ ابن صلاح کی شرح ''التقیید و الایضاح''، ''الفیۃ العراقی''، ''ذیل میزان الاعتدال'' اور امام غزالی رحمہ اللہ کی ''احیاء العلوم'' کی تخریج بہت مشہور ہیں۔

ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا جن میں سے علامہ نور الدین ہیثمی رحمہ اللہ (۷۳۵ھ۔۸۰۷ھ) نے ۱۹ ہزار احادیث پر مشتمل مجموعہ ترتیب دیا جو مجمع الزوائد ومنبع الفوائد کے نام سے مشہور ہوا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسا متبحر عالم بھی حافظ عراقی رحمہ اللہ کے حلقۂ درس سے نکلا۔ حافظ عراقی رحمہ اللہ کی وفات اور تدفین قاہرہ میں ہوئی۔ [1]

❀❀❀

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: (۷۷۳ھ تا ۸۵۲ھ)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان مشاہیر علماء میں سے ایک ہیں جن کی کوششوں نے علم دین کی آبیاری میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ وہ ۱۲ شعبان ۷۷۳ھ کو فلسطین کے شہر عسقلان میں پیدا ہوئے۔ اصل نام احمد بن علی تھا۔ وہ ایک جلیل القدر محدث، فقیہ، ادیب اور مؤرخ تھے۔ حافظ عراقی رحمہ اللہ کے شاگردِ خاص اور اپنے دور کے سب بڑے محدث شمار ہوتے تھے۔ ابتداء میں وہ شعروادب کی طرف مائل تھے اور اصنافِ ادب میں اس قدر ماہر ہوئے کہ بڑے بڑے ادیب و شعراء ان کے آگے ماند پڑنے لگے۔ مگر پھر خوش قسمتی سے ان کا رخ علم حدیث کی طرف ہو گیا۔ انہوں نے حافظ زین الدین عراقی رحمہ اللہ کی شاگردی اختیار کی اور بہت جلد احادیث کے متون اور اسناد کے حافظ بن گئے۔ جرح وتعدیل، فنِ رجال اور معانیٔ حدیث میں انہوں نے وہ مقام پایا کہ حافظ عراقی کی وفات کے بعد ان کی مسند کے وارث بنے۔

وہ ایک بلند پایہ فقیہ بھی تھے، سراج الدین بلقینی اور سراج الدین ابن ملقن رحمہما اللہ جیسے فقہاء سے انہوں نے فقہ سیکھی۔

انہوں نے مختلف علوم کے لیے شام، حجاز اور یمن کے سفر کیے۔ صاحبِ قاموس علامہ مجد الدین شیرازی رحمہ اللہ کے حلقے سے بھی وابستہ رہے۔ آخر میں وہ واپس قاہرہ آگئے اور یہاں کے مختلف مدارس مثلاً بیبرسیہ، جمالیہ اور صالحیہ میں مدرس اور شیخ الشیوخ (شیخ الحدیث) کے منصب پر فائز رہے۔ ان کی باقی زندگی قاہرہ میں ہی گزری۔ کئی بار وہ قاضی بنائے گئے۔ تاہم آخری عشروں میں تدریس کے علاوہ ان کی مکمل توجہ تصنیف وتالیف کی طرف ہو گئی۔

ان کا سب سے بڑا علمی شاہکار ''صحیح بخاری'' کی شرح ''فتح الباری'' ہے جو قرآن وسنت کے علوم کا ایسا بے مثال خزینہ ہے جس سے ہر دور میں محدثین برابر استفادہ کرتے آئے ہیں۔

---

[1] طبقات الحفاظ للسیوطی، ص ۵۴۳، ط العلمیۃ؛ الاعلام للزرکلی: ۳/۳۴۴، ط دار العلم للملایین؛ حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر و قاهرة للسیوطی: ۱/۳۶۰

ان کا دوسرا مایہ ناز کارنامہ رجال حدیث اور جرح و تعدیل پر کی جانے والی اس محنت کی تکمیل ہے جو کئی صدیوں سے جاری تھی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس میدان میں جو عظیم الشان تصانیف پیش کیں ان سے بڑھ کر تحقیق و تفتیش، حسن و خوبی، ترتیب و تزئین، احتیاط و اعتدال اور توازن و تناسب کا تصور کرنا مشکل ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تھذیب التھذیب، تقریب التھذیب اور لسان المیزان جیسی شاہکار کتب تالیف کیں۔

انہوں نے تاریخ اسلام پر بھی کام کیا اور ''الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ'' لکھی جو اصحاب کرام کے حالات پر سب سے مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ انہوں نے ''انباء الغمر فی ابناء العمر'' اور ''الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ'' جیسی تاریخی کتب تصنیف کیں جن میں آٹھویں صدی ہجری کے واقعات اور علماء و مشاہیر کے حالات آگئے ہیں۔ اصولِ حدیث میں ان کے رسائل ''نخبۃ الفکر'' اور ''النکت علی کتاب ابن صلاح'' مشہور و معروف ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد اور مجموعی ضخامت اتنی ہے کہ یقین نہیں آتا کوئی شخص تنہا اتنا زیادہ علمی و تحقیقی کام کرسکتا ہے۔ ان کی وفات اور تدفین ۸۵۲ھ میں قاہرہ میں ہوئی۔ [1]

❀❀❀

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ: (۸۴۹ھ-۹۱۱ھ)

ان علمائے راسخین میں جنہوں نے تصنیفی و تحقیقی کام میں اپنی زندگی کھپادی، امام عبدالرحمٰن بن ابوبکر جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کا نام نامی ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ وہ اپنے دور کے بڑے جلیل القدر عالم شمار ہوتے تھے۔ عقائد، تفسیر، فقہ، حدیث، لغت، نحو، ادب اور تاریخ سمیت وہ ہر میدان کے شہ سوار تھے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ مصر کی بستی ''اسیوط'' سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے علم کی خاطر شام، حجاز اور یمن سے لے کر ہندوستان اور مَرّاکش تک کا سفر کیا۔ مصر واپس آکر وہ تدریس سمیت کئی اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ ان کے والد قاہرہ کے عباسی خلفاء کے مقرب تھے، اس لیے علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے لیے شروع سے سرکاری مناصب کے دروازے کھلے تھے تاہم انہوں نے ۴۰ برس کی عمر میں تصنیف و تالیف کو اوڑھنا بچھونا بنالیا اور ۲۲ سال اسی مشغلے میں منہمک رہے یہاں تک کہ ۹۱۱ھ میں قاہرہ ہی میں ان کی وفات ہوگئی۔ اس دوران انہوں نے جو کام کیا وہ حیرت انگیز ہے۔ علم و فن کا شاید ہی کوئی کوچہ ہو جس میں انہوں نے تصنیفی کام نہ چھوڑا ہو۔ علماء نے ان کی تصانیف کی تعداد چھ سو سے زائد شمار کی ہے۔ ان میں سے تقریباً ۹۰ کتب ایسی ہیں جو آج تک مشہور و معروف ہیں۔ ان کی مشہور ترین تصانیف کی ایک جھلک یہ ہے:

❀ متونِ حدیث: جامع الاحادیث (۴۰ جلدیں۔ ساڑھے ۴۵ ہزار احادیث کا مجموعہ)۔ الجامع الصغیر (ساڑھے چودہ ہزار احادیث کا مجموعہ)

❀ شروحِ حدیث: شرح مسلم، شرح سنن ابن ماجہ، قوت المغتذی علیٰ جامع الترمذی

[1] الاعلام للزرکلی: ۱/ ۱۷۸؛ ذیل التقیید فی رواۃ السنن والاسانید للفاسی: ۱/ ۳۵۲؛ التاج المکلل للقنوجی، ص ۳۵۴

* اصولِ حدیث: تدریب الراوی
* علل الحدیث: اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ
* رجالِ حدیث: اسعاف المبطا برجال المؤطا، اسماء المدلسین،
* فقہ: الحاوی للفتاوی (دو جلدیں)
* اصولِ فقہ: الاشباہ والنظائر
* تفسیر: الدر المنثور (۸ جلدیں)...... اصول تفسیر: الاتقان، الاکلیل،
* سیرت: الخصائص الکبری (دو جلدیں)، الشمائل الشریفہ،
* تاریخ وطبقات: تاریخ الخلفاء، الشماریخ فی علم التاریخ، حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاہرۃ، طبقات المفسرین، ذیل طبقات الحفاظ۔ ①

❁❁❁

امام شمس الدین سخاوی رحمہ اللہ: (۸۳۱ھ-۹۰۲ھ)

محمد بن عبدالرحمن شمس الدین سخاوی رحمہ اللہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ سے پورا پورا استفادہ کیا اور انہی کے مزاج اور ذوق کے سانچے میں ڈھل کر تصنیفی کام کیا۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے آباء واجداد کا تعلق مصر کے دیہات ''سخا'' سے تھا۔ وہ قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ علم کی تلاش میں مختلف ممالک کا سفر کیا اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے دامن سے وابستہ رہے جن کی صحبت نے انہیں علم کا پیکر بنا دیا۔ ان کی زیادہ زندگی مصر میں گزری مگر زہے نصیب کہ وفات مدینہ منورہ میں ہوئی۔

علومِ عربیت، حدیث، فقہ اور تاریخ میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کا زندہ رہنے والا زیادہ کام تاریخ پر ہے۔ ''الضوء اللامع لاھل القرن التاسع'' میں انہوں نے نویں صدی ہجری کے مشاہیر کے احوال محفوظ کر دیے ہیں۔ دیارِ رسول ﷺ کی تاریخ پر ان کی کتاب ''التحفۃ اللطیفۃ فی التاریخ المدینۃ الشریفۃ'' آج تک مقبول ہے۔ ''الذیل التام'' کی شکل میں انہوں نے حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی ''دول الاسلام'' کا تکملہ لکھا۔

حضور ﷺ سے ان کی محبت وعقیدت کا اظہار ان کی ایک اور مشہور ومعروف کتاب ''القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع'' سے ہوتا ہے جو درود شریف کے فضائل پر ہے۔ انہوں نے دنیا کے مشہور شہروں اور مقامات کا دائرۃ المعارف ''البلدانیات'' کے نام سے تیار کیا۔ فنِ تاریخ کی اہمیت، آداب اور اصول کے بارے میں ان کی تالیف ''الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ'' کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ ②

---

① الاعلام للزرکلی: ۳/ ۳۰۱؛ التاج المکلل للقنوجی، ص ۳۴۳؛ سلم الوصول الیٰ طبقات الفحول للکاتب چلپی: ۲/ ۲۳۸

② الاعلام للزرکلی: ۶/ ۱۹۴؛ التاج المکلل للقنوجی، ص ۴۳۳؛

نشأۃِ ثانیہ کی کہانی، ابن بطوطہ کی زبانی

گزشتہ اوراق میں ہم نے عالمِ اسلام کی جس نشأۃِ ثانیہ کا حال پڑھا ہے، مناسب ہوگا کہ اس کا چشم دید ذکر عظیم سیاح ابن بطوطہ کی زبانی سنیں جنھوں نے ۷۲۵ھ سے ۷۵۲ھ کے درمیان تقریباً تمام عالمِ اسلام کی سیاحت کی تھی۔

ابن بطوطہ مَرّاکش سے چلے اور ۷۵ ہزار میل کا سفر طے کر کے دنیا کے ۴۴ ممالک میں گھومے پھرے۔ انہیں جہاں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جیسے مقدس مقامات کی زیارت اور دہلی، قاہرہ اور دمشق جیسے پُر رونق شہروں کی سیر کا شوق تھا وہاں وہ یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ تاتاریوں کا سیلاب بلاخیز گزر جانے کے بعد عالمِ اسلام کا کیا حال ہے۔ اگرچہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان علاقوں میں اب پہلے کی طرح آبادی نہیں اور سمرقند و بخارا جیسے بڑے بڑے متمدن شہروں کی سابقہ رونق قصۂ پارینہ بن چکی ہے مگر وہ یہاں مسلم آبادیات کی نشأۃ ثانیہ کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے اور نوخیز بستیوں اور شہروں کے ارتقائی مرحلے کا بچشم خود جائزہ لینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ نومسلم مغل حکمرانوں کی شان وشوکت اور ان کی کارکردگی بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ عراق میں مسلمانوں کے سابقہ دارالخلافہ بغداد پہنچے جو ہلاکو کے ہاتھوں برباد ہونے کے بعد اس کی نومسلم اولاد کے ہاتھوں پھر سے آباد ہو گیا تھا۔ ابن بطوطہ بتاتے ہیں:

"یہاں دجلہ کے پلوں پر دن رات مردوں اور عورتوں کی آمد و رفت رہتی ہے جو یہاں تفریح کے لیے آتے ہیں۔ بغداد میں گیارہ مساجد ایسی ہیں جہاں نمازِ جمعہ پڑھی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور مساجد بھی ہیں۔ مدرسے بھی ہیں مگر ویران ہو گئے ہیں...... بغداد کا مغربی حصہ پہلے آباد ہوا کرتا تھا۔ اب اُجاڑ ہے۔ صرف تیرہ محلے باقی رہ گئے ہیں۔ ہر محلہ اپنی جگہ ایک شہر ہے۔ آٹھ محلوں میں جامع مساجد ہیں۔"[1]

بغداد سمیت پورے عراق پر نومسلم تاتاری حکمران سلطان ابوسعید کی حکومت تھی۔ ابن بطوطہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"جب میں بغداد پہنچا تو عراق کا سلطان ابوسعید بہادر خان یہیں تھا۔ یہ سلطان محمد خدابندہ کا بیٹا ہے جو مسلمان ہو گیا تھا۔ سلطان ابوسعید نوجوان ہے اور تمام لوگوں سے زیادہ خوبصورت ہے، اس کے رخساروں پر بال نہیں۔"[2]

وہ ایشیائے کوچک کی سلجوقی سلطنت کے شہر قونیہ پہنچے اور مولانا رومی رحمہ اللہ کے مزار پر حاضری دی۔ پھر سیواس، ارزن الروم اور سمرنا سے ہوتے ہوئے آخر نومسلم مغلوں کی سلطنت خاناتِ قبچاق کی طرف روانہ ہوئے جہاں اس وقت سلطان محمد اوزبک کی حکومت تھی۔ بحیرۂ اسود عبور کر کے وہ دشتِ قبچاق کے ساحل پر اترے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ مقام ایک سبزہ زار میدان تھا جس میں کوئی درخت تھا نہ کوئی پہاڑی اور آبادی۔ اس کی مسافت چھ مہینے

---

① رحلة ابن بطوطة: ۲ / ۶۱، ط اکادیمیة المغربیة الرباط ...... نوٹ: یہاں اور اس سے آگے تمام اقتباسات میں ہم نے ابن بطوطہ کے کلام کا لفظی ترجمہ نہیں کیا، بلکہ زائد از ضرورت الفاظ کو جن کا تعلق سیاق وسباق سے تھا، حذف کر کے تلخیص پیش کر دی ہے۔

② رحلة ابن بطوطة: ۲ / ۶۹، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

ہے۔ تین مہینے کی مسافت کا علاقہ سلطان محمد اوزبک کی سلطنت میں ہے اور باقی کسی اور کی.....اس دشت میں سوائے گاڑی کے کسی سواری پر سفر نہیں کیا جاتا.....گاڑیوں میں چار پہیے لگے ہوتے ہیں۔ کسی کو دو گھوڑے کھینچتے ہیں کسی کو زیادہ۔ بیل گاڑیاں اور اونٹ گاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ گاڑی پر لکڑیوں کا جال بن کر اوپر چمڑے یا کپڑے کا غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ اس میں جالی دار کھڑکیاں بھی بنی ہوتی ہیں جن سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ باہر دیکھ سکتے ہیں۔ گاڑی کے اندر مسافر آرام سے لیٹ سکتا ہے، سو سکتا ہے، کھا سکتا ہے، لکھ پڑھ سکتا ہے اور گاڑی چلتی رہتی ہے۔ جب میں نے سفر کا ارادہ کیا تو ایسی ایک اونٹ گاڑی کرائے پر لے لی۔''①

وہ سلطان محمد اوزبک کی سلطنت کے امن وامان کا حال یوں بتاتے ہیں:

''جہاں پڑاؤ ڈالتے ہیں وہاں گھوڑوں، اونٹوں اور بیلوں کو گاڑیوں سے کھول دیتے ہیں اور چرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان جانوروں کی رکھوالی کے لیے کوئی چوکیدار نہیں ہوتا۔ انہیں کوئی چوری نہیں کرتا، کیوں کہ یہاں چوری کی سزا بہت سخت ہے۔ اگر کسی کے پاس چوری کا ایک گھوڑا نکل آئے تو اسے جرمانے میں نو گھوڑے دینے پڑتے ہیں۔ گھوڑے نہ ہوں تو اپنی اولاد دینا پڑتی ہے، یہ بھی نہ ہو تو اسے ذبح کر دیا جاتا ہے۔''②

ابن بطوطہ رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق سلطان محمد اوزبک کی سلطنت دنیا کے شمال میں ہو کر بھی مشرق ومغرب سے تجارتی روابط قائم کیے ہوئے تھی۔ ابن بطوطہ رحمہ اللہ بتاتے ہیں کہ سلطان کی سلطنت میں جنیوا کے تاجر آتے جاتے ہیں اور گھوڑوں کی تجارت سندھ اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی ہے۔ سلطان کی سلطنت گھاس کے میدانوں پر مشتمل تھی اس لیے یہاں گھوڑے پالنے اور فروخت کرنے کا کام عروج پر تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں گھوڑے بہت ہوتے ہیں۔ ان کی قیمت کم ہوتی ہے۔ نہایت عمدہ گھوڑے پچاس ساٹھ درہم میں مل جاتے ہیں۔ ایک ایک کھیپ میں چھ چھ ہزار گھوڑے برآمد کیے جاتے ہیں۔ سستے سے سستا گھوڑا ہندوستان میں سو دینار میں فروخت ہوتا ہے۔''③

سلطان محمد اوزبک کی خیمہ گاہ میں پہنچ کر وہ چشم دید حال یوں بیان کرتے ہیں:

''سلطان کا لشکر جسے اُردو کہتے ہیں، ایک بڑے شہر کی طرح نظر آیا۔ اس میں مسجدیں بھی تھیں اور بازار بھی۔ باورچی خانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ سلطان بڑی شان وشوکت والا بادشاہ ہے۔ اس کا ملک وسیع اور شہر بڑے ہیں۔ یہ دنیا کے سات عظیم بادشاہوں میں سے ایک ہے۔ ایک ہمارے امیر مدظلہ (سلطانِ مراکش ابوعنان فارس المرینی)، دوسرے مصر وشام کا سلطان (الملک الناصر بن قلاوون)، تیسرا عراق کا سلطان (ابوسعید بہادر)، چوتھا یہ سلطان اوزبک، پانچواں ترکستان اور ماوراء النہر کا سلطان (طرمہ شیریں خان)،

---

① رحلة ابن بطوطة: ۲/۲۱۸، ط اکادیمیة المغربیة الرباط
② رحلة ابن بطوطة: ۲/۲۲۰، ط اکادیمیة المغربیة الرباط
③ رحلة ابن بطوطة: ۲/۲۲۳، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

چھٹا ہندوستان کا بادشاہ (محمد تغلق) اور ساتواں چین کا بادشاہ۔"[1]

سلطان کی لشکرگاہ سے صرف دس دن کی مسافت پر بلغاریہ کی سرحد تھی جہاں راتیں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ ابن بطوطہ ہزار دِقت اور تکلیف اٹھا کر یہ تماشا دیکھنے وہاں گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ بتاتے ہیں:

"ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اور افطار کیا۔ افطار کے دوران ہی عشاء کی اذان ہوگئی۔ تراویح اور وتر سے فارغ ہوئے۔ کچھ دیر بعد فجر کا وقت ہوگیا۔"[2]

ابن بطوطہ اس کے بعد اونٹ گاڑی میں بحیرۂ کیسپین کے شمالی میدانوں کا سفر کرتے ہوئے خوارزم روانہ ہوئے۔ وہ ملک جسے چنگیز خان نے تباہ و برباد کیا تھا، اب نومسلم تاتاریوں کے ذریعے ایک بار پھر آباد ہو چکا تھا۔ اس وقت یہاں کا امیر "قطلو دمور" تھا جس نے ابن بطوطہ کی بڑی عزت و تکریم کی۔ ابن بطوطہ یہاں قاضی عمر الکبریٰ نامی عالم کے ہاں مہمان بنے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہاں آبادی اتنی زیادہ ہے کہ دن کے وقت گلیوں سے گزرنے میں مہمانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ خوارزم کے پایۂ تخت کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"شہر خوارزم ترکوں کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ بہت بڑا، بہت خوبصورت ہے۔ اس کے بازار دلکش اور راستے وسیع ہیں۔ اس کی آبادی بڑی گنجان ہے...... خوارزم کے باشندوں جیسے شریف، نیک طبیعت اور مسافروں سے محبت کرنے والے لوگ میں نے کہیں نہیں دیکھے۔"[3]

وہ یہاں نماز کی پابندی کا ماحول دیکھ کر خوش ہوئے۔ لکھتے ہیں:

"یہ لوگ نماز کے بڑے پابند ہیں۔ ان کی ایک اچھی عادت یہ دیکھی کہ مؤذن خود آس پاس کے گھروں میں لوگوں کو نماز کے لیے بلانے جاتا ہے۔ جو شخص نماز میں شریک نہ ہو، امام مسجد سب کے سامنے اس کی پٹائی کرتا ہے، اس کام کے لیے مسجد میں ایک کوڑا لٹکا ہوتا ہے۔ نماز نہ پڑھنے والے پر پانچ دینار جرمانہ بھی ہوتا ہے۔ جرمانے کی رقم مسجد میں صرف کی جاتی ہے یا فقیروں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے پر خرچ ہوتی ہے۔"[4]

وسطِ ایشیا کے شہر بخارا و سمرقند سمیت خاصا علاقہ مغلوں کی چغتائی نسل کی سلطنت میں تھا۔ یہاں ان دنوں نومسلم طرمہ شیریں خان کی حکومت تھی جس کا عدل و انصاف مشہور ہے۔ ابن بطوطہ خوارزم سے رخصت ہو کر اس کے علاقے میں داخل ہوئے۔ بخارا ابھی تک پہلے جیسا آباد نہیں ہوسکا تھا۔ البتہ شہر سے متصل بستی "فتح آباد" میں شیخ سیف الدین باخرزی رحمہ اللہ کی خانقاہ تھی اور وہیں ان کا مزار تھا۔ ان کی اولاد میں سے شیخ یحییٰ باخرزی رحمہ اللہ اس خانقاہ کو چلا رہے تھے۔ ابن بطوطہ رحمہ اللہ وہاں چلے گئے۔ شیخ یحییٰ رحمہ اللہ نے ابن بطوطہ رحمہ اللہ کے لیے محفلِ حسنِ قرأت منعقد کی۔[5]

---

① رحلة ابن بطوطة: ۲/۲۲۸، ط اکادیمیة المغربیة الرباط
② رحلة ابن بطوطة: ۲/۲۳۵، ۲۳۶، ط اکادیمیة المغربیة الرباط
③ رحلة ابن بطوطة: ۳/۹، ۱۰، ط اکادیمیة المغربیة الرباط
④ رحلة ابن بطوطة: ۳/۱۰، ط اکادیمیة المغربیة الرباط
⑤ رحلة ابن بطوطة: ۳/۲۴، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

ابن بطوطہ رحمہ اللہ طرمہ شیریں خان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کی سلطنت دنیا کی چار بڑی سلطنتوں کے درمیان واقع ہے۔ یعنی سلطنتِ چین، سلطنتِ ہند، سلطنتِ عراق اور سلطنتِ اوزبک۔ ان تمام سلطنتوں کے حکمران طرمہ شیریں خان کا احترام کرتے ہیں اور اسے تحائف بھیجتے ہیں۔''[1]

وہ سمرقند، بخارا اور ترمذ کے علماء و مشائخ سے ملتے ہوئے آخر کار دریائے آمو عبور کر کے بلخ پہنچے۔ وہ بتاتے ہیں کہ خراسان میں چار بڑے شہر ہیں، جن میں سے دو آباد ہیں: ہرات اور نیشاپور۔ جبکہ دو تباہ حال ہیں: بلخ اور مرو۔

بلخ ان کے راستے میں آیا جس کے متعلق وہ تحریر کرتے ہیں:

''بلخ کی جامع مسجد دنیا کی تمام مساجد سے زیادہ عمدہ اور کشادہ ہے۔ اس کے ستون بلندی میں مَرّاکُش کے شہر رباط کی جامع مسجد کے مشابہ ہیں۔ یہ مسجد بنو عباس کے ایک امیر داؤد بن علی کی بیگم نے بنوائی تھی۔''[2]

بلخ سے ہرات کے راستے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ہم بلخ سے چلے اور قہستان کے پہاڑوں میں سفر کر کے سات دن بعد ہرات پہنچے۔ راستے میں ہمیں کئی آباد دیہات ملے جہاں پانی کے چشمے اور درخت کثرت سے تھے اور کئی خانقاہیں تھیں، جن میں اللہ کے نیک بندے دنیا کو ترک کر کے عبادت میں مصروف تھے۔''[3]

ہرات میں مساجد، مدارس، کتب خانوں اور خانقاہوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ بلخ اور مرو کی بجائے اب ہرات وسطِ ایشیا، ایران، چین اور ہندوستان کے درمیان تجارتی چوراہے کا کام دے رہا تھا اور روزانہ آنے جانے والے بے شمار تجارتی قافلوں کی بدولت اس کے بازار دنیا بھر کے سامانِ تجارت سے بھرے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ نے عالمِ اسلام کی سیر کرتے ہوئے بلخ کے بعد آخر کار ہرات میں قدم رکھا تھا۔ یہ ۷۳۱ھ (۱۳۳۰ء) اور ۷۳۳ھ (۱۳۳۲ء) کا درمیانی زمانہ تھا۔ ان دنوں خراسان شاہانِ کرت کے حکمران امیر معز الدین حسین کے زیرِ نگین تھا۔ یہاں علماء و فضلاء کی وہ کھیپ پناہ لیے ہوئے تھی جس نے تاتاریوں کی غارت گری کے بھیانک دور میں علم و ادب کی میراث کی حفاظت اور اسے اگلی نسلوں تک پہنچانے کے لیے انتھک جدوجہد کی تھی۔ خانوادۂ کرت ان کا محافظ اور کفیل تھا۔

ابن بطوطہ رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سلطانِ معظم حسین بن سلطان غیاث الدین غوری کی بہادری مشہور ہے اور اسے اللہ کی تائید حاصل ہے...... اس کا مقابلہ روافض سے ہوا جس میں وہ بکھر گئے اور ان کی حکومت چلی گئی۔''[4]

---

① رحلة ابن بطوطة: ۳/۲۷، ط اکادیمیة المغربیة الرباط ② رحلة ابن بطوطة: ۳/۳۲، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

③ رحلة ابن بطوطة: ۳/۳۴، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

④ رحلة ابن بطوطة: ۳/۳۶، ط اکادیمیة المغربیة الرباط ؛ اس کے بعد ابن بطوطہ نے اس لڑائی کی تفصیل بیان کی ہے جس میں سلطان حسین کے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کا مقابلہ طوس کے ایک رافضی سیاست دان حسن کے ڈیڑھ لاکھ سپاہیوں سے ہوا تھا جس میں روافض کو شکستِ فاش ہوئی۔

ہرات کے بارے میں ان کا بیان ہے:

''ہرات خراسان کے شہروں میں سب سے زیادہ آباد ہے۔ یہاں کے لوگ نیک اور دیانت دار ہیں۔ حنفی مسلک کے ہیں۔ فتنہ وفساد سے دور ہیں۔''[1]

نیشاپور جسے تاتاریوں نے اس طرح برباد کیا تھا کہ وہاں ہل چلائے گئے تھے، ایک بار پھر اسلام کا گہوارہ بن چکا تھا جس کے بارے میں ابن بطوطہ لکھتے ہیں:

''نیشاپور خراسان کے چار مرکزی شہروں میں سے ایک ہے۔ میوہ جات، باغات، قدرتی حسن اور چشموں کی کثرت کے باعث اسے دمشق صغیر کہا جاتا ہے۔ اس میں سے چار نہریں گزرتی ہیں۔ اس کے بازار خوبصورت اور کشادہ ہیں۔ اس کی مسجد منفرد قسم کی ہے جو بازار کے وسط میں ہے اور اس کے ساتھ چار مدارس قائم ہیں جن میں سے بکثرت پانی کے چشمے گزرتے ہیں۔ ان میں بہت سے طلبہ قرآن مجید اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ ان علاقوں کے سب سے خوبصورت مدارس ہیں۔''[2]

قندوز اور بغلان کے بارے میں لکھا:

''ان بستیوں میں اللہ والے بزرگ کثرت سے ہیں۔ باغات اور نہریں بھی ہیں۔ قندوز میں ہم ایک چشمے کے کنارے ایک خانقاہ میں رہے جو شہر کے ایک درویش کی تھی، انہیں شیر سیاہ یعنی کالا شیر کہا جاتا تھا۔ شہر کے والی نے جس کا تعلق موصل سے ہے، ہماری میزبانی کی۔ ہم قندوز کے باہر چالیس دن رہے تاکہ ہمارے اونٹ اور گھوڑے خوب چرلیں، یہاں کی چراگاہیں بہت عمدہ ہیں، گھاس بہت ہے۔ ترکوں (نومسلم تاتاریوں) کے سخت احکام کی وجہ سے یہاں گھوڑے چوری نہیں ہوتے۔ لوگ اپنے جانوروں کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔''[3]

غرض کہ تاتاری طوفان نے جس تیزی سے شش صد سالہ اسلامی تہذیب وتمدن کو ختم کیا تھا، علمائے دین، مشائخ کرام کی محنت اور مسلم حکمرانوں نے اسی مستعدی، تندہی اور سرگرمی سے اس عظیم نقصان کی تلافی کی اور اگلی صدی کے خاتمے تک عالم اسلام ایک بار پھر ترقی واستحکام کے بام عروج پر جا پہنچا۔

---

① رحلة ابن بطوطة: ۳/۴۵، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

② رحلة ابن بطوطة: ۳/۵۶، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

③ رحلة ابن بطوطة: ۳/۵۸،۵۹، ط اکادیمیة المغربیة الرباط

آٹھواں باب

تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ

دورِ تاسیس تا دورِ عروج

۶۹۹ھ تا ۹۱۸ھ

(۱۲۸۱ء تا ۱۵۱۲ء)

دولتِ عثمانیہ

اب ہم تاریخ کے مطالعے میں اس مقام پر پہنچ چکے ہیں، جہاں سے ترکی کی عظیم عثمانی سلطنت کا ذکر چھیڑا جائے۔
موجودہ ترکی جس علاقے پر مشتمل ہے، پہلے اسے ایشیائے کوچک (آسیا الصغری۔Asia minor) کہا جاتا تھا۔ یونانی اسے "اناطولیہ" جبکہ عرب اور ترک اسے "اناضول" کہتے ہیں۔

جغرافیائی حالت:

اناطولیہ کے مشرق میں ایران اور آرمینیا واقع ہیں۔ شمال مشرق میں گرجستان جبکہ جنوب مشرق میں عراق اور شام ہیں۔ شمال مغرب میں بلغاریہ اور مغرب میں بحیرۂ روم کے پار یونان واقع ہیں۔
یہ علاقہ ایک جزیرہ نما ہے جو چار سمندروں سے جا لگتا ہے۔ اس کے شمال میں بحیرۂ اسود، شمال مغرب میں بحیرۂ مرمرہ، جنوب میں بحیرۂ ایجیئن اور جنوب مغرب میں بحیرۂ روم واقع ہیں۔ یہ چاروں سمندر پتلی کھاڑیوں کے ذریعے باہم ملے ہوئے ہیں۔ بحیرۂ اسود، آبنائے باسفورس کے ذریعے بحیرۂ مرمرہ سے جا ملتا ہے اور بحیرۂ مرمرہ، درۂ دانیال کے ذریعے بحیرۂ ایجیئن سے متصل ہو جاتا ہے۔ بحیرۂ ایجیئن کے جنوب میں بحیرۂ روم ہے۔
آبنائے باسفورس کا پل اسے یورپ سے ملا دیتا ہے۔ یہ خلیج دنیا کے قابلِ دید مقامات میں سے ایک ہے۔ یہ تقریباً ۱۸ میل طویل ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی دو میل ہے جو بعض جگہ ایک میل سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ رومیلی حصار کے مقام پر یہ فقط ۷۵۰ میٹر چوڑی ہے۔ اس کے مغربی حصے میں واقع بازنطینی روما کا پایۂ تخت قُسطنطِینیّہ صدیوں تک مسلمانوں کو ہمت آزمائی کی دعوت دیتا رہا۔ اب خلیج کے دونوں طرف استنبول کی گنجان آبادی ہے۔ درۂ دانیال بھی دنیا کی مشہور ترین خلیج ہے جو تقریباً ۴۰ میل طویل اور ایک سے چار میل تک عریض ہے۔
اناطولیہ (اناضول) کا ساحلی علاقہ پانچ ہزار میل سے زائد ہے۔ جبکہ زمینی سرحد تقریباً ڈیڑھ ہزار میل ہے۔ انقرہ، ازمیر، بورصہ، قونیہ، اردنا، طرابزون، ارضِ روم (ارزن الروم)، مرسین، اِیکی شہر (ایسکی شہر) اور انطالیہ یہاں کے اہم شہر ہیں۔ یہ ملک ایشیا اور یورپ کے درمیان ایک پل کی مانند ہے۔ دونوں براعظموں کے مابین یہ تقسیم بحیرۂ اسود سے شروع ہوتی ہے اور آبنائے باسفورس، بحیرۂ مرمرہ اور درۂ دانیال سے ہوتے ہوئے بحیرۂ ایجیئن تک چلی جاتی ہے۔
اناطولیہ شمال، جنوب اور مغرب میں تنگ ساحلی پٹیوں پر مشتمل ہے۔ جنوب میں بڑی بڑی خلیجیں ہیں جبکہ مغربی ساحل بہت کٹا پھٹا ہے۔ وسطی علاقہ زیادہ تر خشک سطح مرتفع پر مشتمل ہے جہاں کہیں کہیں نمکین پانی کی جھیلیں ہیں۔ شمال

میں بحیرۂ اسود کے کوہستانی سلسلے ہیں جو سخت پتھریلا علاقہ ہے۔ جنوب میں کوہِ طوروس واقع ہے اور شمال میں کوہ پونٹک۔ یہ دونوں سلسلے مشرق کے بلندترین کوہستان سے جا ملتے ہیں جہاں سے دریائے دجلہ اور فرات نکلتے ہیں۔ سب سے بلند پہاڑ کوہِ ارارات ہے جو ۵ ہزار میٹر سے زیادہ بلند ہے۔

یہاں گرمیوں میں خشک گرمی پڑتی ہے جبکہ سردیوں میں نمی غالب رہتی ہے۔ مئی میں زیادہ بارشیں ہوتی ہیں جبکہ جولائی اور اگست بالکل خشک گزرتے ہیں۔ قونیہ اور ملطیہ کی سطح مرتفع ملک کے خشک ترین علاقے شمار ہوتے ہیں۔ مشرقی پہاڑی علاقوں میں موسم سرما شدید ترین ہوتا ہے اور درجہ حرارت منفی ۳۰ سینٹی گریڈ سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ ①

اناطولیہ کی تاریخ:

اناطولیہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ دور قبل از مسیح میں یہ یونانی تہذیب کے زیرِ اثر رہا۔ ۳۳۴ قبل از مسیح میں یہاں سکندرِ اعظم نے قبضہ کیا مگر اس کے وارث اس علاقے کو نہ سنبھال سکے۔ اس کے بعد اسے رومیوں نے فتح کیا۔ رومی دور میں ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ ان کے بعد نصرانیت نئی شکل میں ابھری تو اس کی دعوت یہاں عام ہوگئی۔ تیسری صدی عیسوی کے اواخر تک یہاں نصرانیت پھیل چکی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں صحرائے عرب سے اسلام کا ظہور ہوا اور چند عشروں میں صحابہ کرام نے فلسطین، شام اور مصر سے قیصر کی سلطنت کو مٹا دیا۔ اُموی دور میں مشرقی اناطولیہ کا خاصا حصہ فتح ہوگیا اور رومی سلطنت اناطولیہ کے شمالی اور مغربی علاقوں تک رہ گئی۔ اس کے بعد بنوعباس کے دور میں بازنطینی رومی سلطنت کے ساتھ مسلمانوں کی جنگیں جاری رہیں۔ تقریباً سات صدیوں تک یہ خطہ مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان سب سے بڑا محاذ بنا رہا۔ کبھی مسلمان رومیوں کو پسپا کرتے کرتے قُسطَنطِینِیَّہ کے سامنے پہنچ جاتے اور کبھی رومی دھاوا بول کر عراق اور شام کی سرحدوں تک آ جاتے۔

اناطولیہ کو مستقل طور پر فتح نہ کر پانے کی وجوہ:

مسلمانوں کی جانب سے اس خطے کو مستقل طور پر فتح نہ کر سکنے کی کئی وجوہ تھیں:

① سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کے وہ تنازعات تھے جن کے باعث وہ کبھی اس خطے کی فتح کے لیے پوری طرح یکسو نہ ہو سکے اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

② دوسری وجہ مسلمانوں میں پیدا ہونے والا ایمانی و اخلاقی انحطاط تھا جس کی وجہ سے یہاں قابض رہنے کے بعد بھی وہ رومیوں کے سامنے قرونِ اولیٰ کے مجاہدین جیسا اعلیٰ کردار پیش نہ کر پائے، نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے لوگوں کے قبولِ اسلام کی رفتار سست رہی اور بہت سے شہر فتح ہونے کے بعد بار بار رومیوں کے ہاتھوں میں واپس جاتے رہے۔

③ چونکہ یہ علاقہ تین طرف سے جزیرہ نما تھا اور یورپ کے ساتھ جا لگتا تھا، اس لیے یورپی حکومتیں بحری بیڑوں

---

① اردو دائرۃ المعارف پنجاب یونی ورسٹی: مقالہ ترکی۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ طبع ثانی: مقالہ ایشیائے کوچک۔ التاریخ و الجغرافیہ از مسعود خواند، باب اناطولیہ

کے ذریعے یہاں بہت جلد پہنچ جاتی تھیں جبکہ مسلمانوں کے مراکز سے لشکروں کے پہنچنے میں خاصا وقت لگ جاتا تھا۔

۲ پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں سلجوقی تقریباً پورے اناطولیہ کو فتح کر کے خلیج مرمرہ تک پہنچ چکے تھے مگر جب صلیبی جنگیں شروع ہوئیں اور یورپی لشکر اناطولیہ کو گزرگاہ بنا کر بیت المقدس جانے لگے تو اس دوران بعض یورپی اور رومی نوابوں اور شہزادوں نے اناطولیہ کے مختلف علاقوں پر قبضہ کر لیا اور یوں اناطولیہ کا خاصا حصہ ایک بار پھر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

عثمانی ترکوں نے ادھورے کام کو پورا کیا:

سات صدیوں بعد عثمانی ترکوں نے دنیا کے نقشے پر نمودار ہو کر اس ادھورے کام کو پورا کیا اور پورے ایشیائے کوچک (اناطولیہ) کو ایک پرچم تلے لا کر اسے اسلام کا مضبوط ترین مرکز بنا دیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے بلغاریہ، بلقان، البانیہ، بوسنیا اور کوسوو جیسے یورپی علاقوں کو بھی زیرِ نگین کیا اور وہاں اسلامی نظام نافذ کر کے عدل وانصاف اور اخلاق وکردار کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ وہاں ہر طرف کلمۂ توحید گونجنے لگا۔[1]

اناطولیہ کی حکومتیں:

اناطولیہ میں عثمانی ترکوں کی آمد کے وقت یہاں متعدد ریاستیں اور امارتیں قائم تھیں۔ غیر مسلم ریاستوں میں بیزانس (ازنیق) اور "طرابزون" سب سے نمایاں تھیں۔ یہ دونوں ریاستیں قُسطَنطِینِیّہ سے بے دخل کیے گئے بعض بازنطینی شہزادوں نے صلیبی جنگوں کے دوران قائم کی تھیں۔ مسلم ریاستوں میں دولتِ سلاجقۂ روم، امارتِ قرمانیہ، امارتِ بنو اشرف، امارتِ بنو حمید، امارتِ بنو منتشا، امارتِ کرمیانیان، امارتِ آلِ صاحب عطا، امارتِ دنیزلی (لادیق)، امارتِ بنو آیدین، امارتِ صاروخانی، امارتِ قراسی اور امارتِ بنو اسفندیار قابلِ ذکر ہیں۔[2]

عثمانی ترکوں کی خدمات:

عثمانی ترکوں نے ماضی کے تجربات سے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی ہمیشہ ان کی فتوحات کا راستہ روکتی رہی۔ اس لیے انہوں نے اپنی پوری توجہ یورپ کی طرف مرکوز رکھی اور ان کے سلاطین یورپ میں داخل ہو کر کئی صدیوں تک نصرانیوں سے مسلسل جہاد کرتے رہے۔ انہوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا، مسلم ممالک سے الجھنے سے اپنا دامن بچایا اور دشمنانِ اسلام کی سرکوبی اور اسلام کی اشاعت وحفاظت کو اپنا ہدف قرار دیے رکھا۔

نصرانی طاقتیں صدیوں سے شام اور مصر پر حملے کرتی آ رہی تھیں مگر عثمانیوں کی برق خیز یلغار سے خائف ہو کر ان کی ساری توجہ اپنے دفاع پر مرکوز ہو گئی اور عالم اسلام کے ساحلوں کی تسخیر کا خیال ان کے لیے خوابِ پریشاں بن گیا۔

ان خدمات کی وجہ سے سلطنتِ عثمانیہ کو عالم اسلام میں وہ مقبولیت نصیب ہوئی کہ اس کی مثال صرف قرونِ اولیٰ

---

① اردو دائرۃ المعارف پنجاب یونی ورسٹی: مقالہ ترکی۔ التاریخ و الجغرافیہ از مسعود خواند، باب اناطولیہ

② تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون، ص ۴۰ تا ۱۰۷، ان امارات کا مختصر تعارف اس باب کے آخر میں آ رہا ہے۔

کے حکمرانوں میں ملتی ہے۔ اسی نیک نامی کی وجہ سے مسلمانوں نے انہیں خلافت کا اہل سمجھا اور جب انہوں نے قاہرہ کے عباسی خلفاء سے خلافت اپنے نام کرائی تو عالم اسلام میں اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھی۔

مستشرقین اور باطل فرقوں کا عثمانی سلاطین سے بغض:

چونکہ عثمانی سلاطین یورپ کے حلق کا کانٹا بن گئے تھے اس لیے یورپی طاقتوں نے ہمیشہ ان کی کردارکشی پر زور رکھا۔ اکثر عثمانی سلاطین عالم فاضل، عادل، رعایا پرور، متقی، مجاہد اور دین دار تھے۔ وہ اہل سنت والجماعت کے عقائد و نظریات پر کاربند اور فقہ حنفی کے پیروکار تھے۔ صوفیاء اور مشائخ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر کسی نہ کسی شیخ کے مرید اور ذکر اذکار کے پابند تھے۔ یہ صفات بھلا سیکولر طبقے اور مستشرقین کو کیسے گوارا ہو سکتی ہیں۔

عثمانی سلاطین کے دینی جذبے اور مذہبی خدمات نے جہاں جمہور مسلمین میں انہیں محبوب بنادیا، وہاں باطل فرقے انہیں ہمیشہ نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے کیوں کہ عثمانیوں کے عروج نے فرقہ بندی کے نقیبوں کو سرنگوں کردیا تھا، اس لیے باطل فرقے عثمانیوں کی جڑیں کاٹنے میں مصروف رہے اور بار بار ان کی پشت میں خنجر گھونپتے رہے۔

ایسے عناصر کا سب سے بڑا مرکز ایران تھا جہاں صفویوں نے حکومت قائم کر کے عثمانیوں سے صدیوں تک محاذ آرائی کی۔ آج بھی سیکولر ادباء، مستشرقین اور ایرانی مؤرخین کی تحریروں میں عثمانی سلاطین کی کردارکشی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگلے اوراق میں ہم اسی عظیم عثمانی سلطنت کی تاریخ پیش کریں گے اور ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ہم تاریخی روایات کے انبار سے صاف ستھرا اور قابلِ اعتماد مواد چن کر قارئین کے سامنے پیش کریں۔

❁❁❁

اناطولیہ کی ریاستیں

سلطنتِ عثمانیہ کے گردو پیش کو سمجھنے کے لیے پہلے اناطولیہ کی ان اہم آزاد ریاستوں کا تعارف ضروری ہے جن کا ذکر آگے بار بار آتا رہے گا۔ ان میں سے کچھ ریاستیں مسلم تھیں اور کچھ غیر مسلم۔ ذیل میں ہم ان ریاستوں کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ پیش کررہے ہیں۔ پہلے مسلم ریاستوں کا ذکر ہوگا، پھر غیر مسلم ریاستوں کا۔

اگر قارئین درمیان میں اُکتاہٹ محسوس کریں تو ان ریاستوں کے تعارف کو چھوڑ کر سیدھا عثمانی سلاطین کے حالات کا مطالعہ شروع کردیں اور درمیان میں جہاں کسی ریاست کا ذکر آئے اور اس کے تعارف کی ضرورت محسوس کریں تو ان اوراق کی طرف مراجعت کرلیں۔

مسلم ریاستیں

اناطولیہ میں سلطنتِ عثمانیہ کی معاصر مسلم ریاستیں دو درجن کے لگ بھگ تھیں جن میں سے اہم ریاستوں کے نام یہ ہیں:

① ریاستِ بنو قراسی ② امارتِ آیدین ③ ریاستِ بنو ارتنا
④ ریاستِ بنو حمید ⑤ ریاستِ بنو اشرف ⑥ ریاستِ بنو صاروخان
⑦ ریاستِ بنو منتشا ⑧ ریاستِ بنو براونہ ⑨ ریاستِ بنو قرہ مان
⑩ ریاستِ بنو کرمیان (گرمیان، جرمیان) ⑪ ریاستِ بنو رمضان
⑫ ریاستِ بنو ذوالقادر ⑬ ریاستِ بنو جاندار (بنو اسفندیار، بنو چوپان)
⑭ ریاستِ بنو صاحب عطا ⑮ ریاستِ بنو تکہ ⑯ ریاستِ قاضی برہان الدین
⑰ ریاستِ بنو تاج الدین ⑱ ریاستِ بنو اینانج (امرائے دینزلی)
⑲ ریاستِ قوتلوشاہلر ⑳ ریاستِ اقیونیون ㉑ ریاستِ سلاجقہ روم

اب ان ریاستوں کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔[1]

---

① اناطولیہ کی ان تمام مسلم ریاستوں کے حالات درج ذیل مآخذ سے لیے گئے ہیں:
التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۴۸ تا ۵۷ ؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۷۵ تا ۷۷

① ریاستِ بنوقراسی: ۷۰۲ھ تا ۷۴۶ھ (۱۳۰۳ء تا ۱۳۴۵ء)

یہ چھوٹی سی ریاست بحیرۂ مرمرہ کے جنوبی اور بحیرہ ایجیئن کے مشرقی ساحل پر واقع تھی۔اس کی انتہائی وسعت چوبیس ہزار مربع کلومیٹر تک تھی۔اس ریاست کے اہم حکمرانوں کا تعارف درجِ ذیل ہے:

❶ قرہ سی: اس کا بانی ''قرہ سی'' سلجوقی سلطان مسعود ثانی کا افسرِ اعلیٰ تھا۔اناطولیہ سے سلجوقیوں کا اقتدار ختم ہوتے ہی اس نے ۷۰۰ھ میں ''میسیا'' کے علاقے میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی اور ''کیسر'' کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا جو ایک ساحلی شہر تھا۔یہ ریاست ایک بحری بیڑے سے بھی لیس تھی۔

❷ عجلان بیگ: ''قرہ سی'' کے بعد اس کا بیٹا عجلان بیگ اس کا جانشین ہوا جس کے دولتِ عثمانیہ کے بانی عثمان خان سے اچھے تعلقات تھے۔

❸ تیمور خان: عجلان کے بعد اس کا بیٹا تیمور خان یہاں کا حکمران بنا۔تیمور خان کے بعد اس کے دو بیٹوں میں تنازعہ کھڑا ہوگیا جس کے بعد عثمان خان کے جانشین اورخان نے ۷۳۷ھ میں اس ریاست کو اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا۔یہ اناطولیہ کی پہلی مسلم ریاست تھی جو دولتِ عثمانیہ میں ضم ہوئی۔

❁❁❁

② امارتِ آیدین: ۶۹۹ھ تا ۸۵۹ھ (۱۳۰۰ء تا ۱۴۵۵ء)

یہ اناطولیہ کے مغرب میں تھی۔آیدن (قدیم نام: قزل حصار)، برغی، اَیاسلوغ اورازمیر اس کے اہم شہر تھے۔اس کی انتہائی وسعت بیس ہزار مربع کلومیٹر تک تھی۔اس ریاست کے اہم حکمرانوں کا مختصر تعارف یہ ہے:

❶ آیدین: ریاست کا بانی ''آیدین'' تھا جس کا باپ محمد بیگ سلاجقۂ روم کا افسرِ اعلیٰ اور ساحلی محاذ کا نگران تھا۔اس کی وفات کے بعد آیدین اس کا جانشین ہوا۔وہ مغلوں کی بالادستی کو ناپسند کرتا تھا،لہٰذا سلاجقۂ روم کو مغلوں کا باج گزار دیکھ کر اس نے ۶۹۹ھ میں خودمختاری کا اعلان کردیا۔۷۳۴ھ تک اس نے حکومت چلائی۔پھر اس کی وفات ہوگئی۔

❷ محمد بن آیدین: اس کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔اس نے چھ سال حکومت کی۔

❸ عمر بیگ بن محمد بن آیدین: ۷۴۱ھ میں محمد بن آیدین کے بیٹے عمر بیگ نے حکومت سنبھالی،اس نے ایک مضبوط بحری بیڑا تیار کیا اور بحیرۂ ایجہ پر تسلط حاصل کرلیا۔اس کے بحری مجاہدین یونان،تھریس اور نصرانیوں کے دیگر عسکری جزیروں پر کامیاب حملے کرتے رہے۔بعض علاقوں پر وہ قابض بھی ہوئے۔

عمر بیگ نے ۷۴۵ھ میں صلیبیوں کے بحری بیڑے کو خاکستر کر کے شہرت پائی۔اس نے ازمیر میں ایک مضبوط قلعہ بنایا جو نصرانیوں کے لیے پریشانی کا باعث بنا رہا۔۷۴۹ھ میں وہ صلیبیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔

❹ عیسیٰ بن محمد بن آیدین: اس کے بعد اس کا بھائی عیسیٰ حکمران بنا۔اس نے عثمانی سلطان بایزید یلدرم کی ماتحتی قبول کرلی۔بایزید نے ازمیر اس کے لیے چھوڑ دیا اور گردونواح کے علاقے اپنے قبضے میں لے لیے۔عیسیٰ ۷۹۲ھ میں

وفات پا گیا جس کے بعد ازمیر بھی عثمانیوں کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

❺ **موسیٰ بن محمد بن آیدین:** ۸۰۵ھ میں تیمور لنگ کے حملے میں ازمیر عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور مغلوں نے یہاں عیسیٰ کے بیٹے موسیٰ کو باج گزار حاکم بنا دیا۔

❻ **مصطفیٰ بن موسیٰ:** چند برسوں بعد موسیٰ کا بیٹا مصطفیٰ یہاں کا حاکم ہوا، اس نے عثمانیوں کے ماتحت کی حیثیت قبول کر کے ۸۲۵ھ تک یہاں حکومت کی۔ اس کے بعد امارت آیدین سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہو گئی۔

❁❁❁

③ ریاستِ بنوارتنا: ۷۲۸ھ تا ۷۸۲ھ (۱۳۲۷ء تا ۱۳۸۰ء)

یہ ریاست اناطولیہ کے مشرق میں قائم تھی۔ اس کا دارالحکومت پہلے قیصریہ تھا اور پھر سیواس۔ انقرہ، توقات، ارزنجان، اماسیا، سینوب، صامسون اور قونیہ اس میں شامل رہے۔ یہ امارت تب قائم ہوئی جب سلاجقہ روم کا خاتمہ ہوا اور اناطولیہ کا اکثر علاقہ پوری طرح مغلوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ایسے میں ۷۱۷ھ میں ایل خانی بادشاہ ابوسعید بہادر خان نے مشہور مغل جرنیل چوپان کی اولاد میں سے تیمورتاش نامی ایک افسر کو یہاں کا حکمران بنا دیا۔

۷۲۸ھ میں تیمورتاش کو اناطولیہ سے فرار ہو کر مصر میں پناہ لینا پڑی۔ جاتے جاتے اس نے اپنی جگہ اپنے ایک معتمد افسر ''ارتنا'' کو یہ منصب سونپ دیا۔ ابوسعید بہادر نے ''ارتنا'' کو یہاں کا پروانۂ حکومت دے دیا۔

۷۳۶ھ میں ابوسعید بہادر خان کی وفات کے بعد ایل خانی مغل کمزور ہو گئے، چنانچہ موقع غنیمت جان کر ''ارتنا'' نے یہاں خود مختار حکومت قائم کر لی۔ رسمی طور پر اس نے پہلے تبریز کے مغل حکمران کوشک بن چوپان سے وابستگی ظاہر کی۔ پھر مصر کے مملوک تاجدار ناصر الدین محمد بن قلاوون سے وفاداری کا تعلق قائم کر لیا۔ ارتنا کے بعد حکومت اس کی اولاد میں چلی۔

❁❁❁

④ ریاستِ بنوحمید: ۷۰۰ھ تا ۷۹۳ھ (۱۳۰۱ء تا ۱۳۹۱ء)

ریاستِ بنوحمید قونیہ کے مغرب میں ''اکردیر'' شہر میں قائم تھی۔ اس کے اہم حکمران یہ تھے:

❶ **حمید بیگ:** ریاست کا بانی حمید بیگ نامی ایک ترکمانی امیر تھا۔ سلاجقۂ روم کے زوال کے بعد اس نے یہاں خودمختار ریاست قائم کر لی۔

❷ **دُندار فلک الدین:** اس کا بیٹا دُندار اس کا جانشین ہوا جس کا لقب ''فلک الدین'' تھا۔ اسی کے نام پر اس ریاست کے پایۂ تخت کا نام ''فلک آباد'' ہو گیا۔ تاہم دُندار کو مغل امیر تیمورتاش کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اس نے دندار کو گرفتار کر کے ۷۲۴ھ میں قتل کر دیا۔ یوں ریاست پر اس کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔

❸ **خضر بن دُندار:** ۷۲۸ھ میں تیمورتاش کو فرار ہو کر مصر جانا پڑا جس کے بعد دُندار کے بیٹے خضر نے اپنی ریاست

واپس لے لی۔

❺ **اسحاق بن خضر:** خضر کے بعد اس کے بیٹے اسحاق کی حکومت آئی۔

❻ **الیاس بن خضر:** پھر اسحاق کے بیٹے الیاس کو اقتدار ملا۔

❼ **کمال الدین حسین بن اسحاق:** پھر اسحٰق کے دوسرے بیٹے کمال الدین حسین نے حکومت کی۔۷۷۶ھ میں کمال الدین حسین نے بنو قرہ مان کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر سلطان مراد اوّل کی ماتحتی اختیار کر لی۔۷۹۳ھ میں اس کی وفات ہوگئی اور یہ ریاست سلطنتِ عثمانیہ میں ضم ہوگئی۔

❂❂❂

⑤ **ریاستِ بنو اشرف:** ۶۷۹ھ تا ۷۹۳ھ (۱۲۸۰ء تا ۱۳۹۱ء)

اس ریاست کی انتہائی وسعت سولہ ہزار مربع کلومیٹر تھی۔ اولو بورلو، اغریدر اور حامد آباد (اسبارطہ) اس کے اہم شہر تھے۔ اس میں درج ذیل حکمران آئے:

❶ **سلیمان بن اشرف:** اس ریاست کا بانی سلجوقی حکمران غیاث الدین مسعود ثانی کا ایک افسر سیف الدین سلیمان بن اشرف تھا مگر اس کے دور میں ریاست نیم خود مختار تھی۔

❷ **محمد مبارز الدین:** سیف الدین سلیمان ۷۰۱ھ میں فوت ہوا تو سلجوقیوں کا اقتدار بھی ختم ہو چکا تھا، چنانچہ اس کے بیٹے محمد نے مبارز الدین کا لقب اختیار کر کے مکمل خود مختار حکومت قائم کر لی۔

❸ **سلیمان شاہ بن محمد مبارز:** پھر اس کا بیٹا سلیمان شاہ اس کا جانشین ہوا۔ مغل امیر تیمور تاش نے ۷۲۸ھ میں اس ریاست پر قبضہ کر لیا مگر اس کے بعد جلد ہی اسے مصر بھاگنا پڑا اور اس ریاست پر بنو حمید کے خضر بن حمید نے قبضہ کر لیا۔

❂❂❂

⑥ **ریاستِ بنو صاروخان:** ۶۹۹ھ تا ۸۱۳ھ (۱۳۰۰ء تا ۱۴۱۰ء)

یہ ریاست اپنے دورِ عروج میں چودہ ہزار مربع کلومیٹر تک وسیع تھی۔ اس کے اہم حکام کا تعارف درجِ ذیل ہے:

❶ **صاروخان:** ریاست کا بانی صاروخان ایک ترکمانی امیر تھا جس نے سلاجقۂ روم کے زوال کے بعد ۷۰۰ھ میں ساحلی شہر ''لیڈیا'' (مانسیا) میں اپنی خود مختار ریاست قائم کر لی۔ اس نے ایک بحری بیڑا مرتب کر کے جنیوا کے نصرانی قزاقوں کو اناطولیہ کے ساحلوں سے مار بھگایا۔ اس نے اناطولیہ کی بعض آزاد ریاستوں سے دولتِ عثمانیہ کے خلاف اتحاد بھی کیا۔ اسی طرح اس نے بازنطینی رومیوں کے ساتھ بھی دوستانہ معاہدہ کیا تاہم بعد میں یہ معاہدہ ٹوٹ گیا۔ ۷۴۶ھ میں صاروخان کی وفات ہوگئی۔

❷ **فخر الدین الیاس بن صاروخان:** صاروخان کے بیٹے فخر الدین الیاس نے ۷۷۶ھ تک حکومت کی۔

❸ **مظفر الدین اسحاق بن فخر الدین:** فخر الدین کے بعد اس کے بیٹے مظفر الدین اسحاق چلپی نے مسندِ حکومت

سنبھالی۔ اس نے بنوقرہ مان کو ساتھ ملا لیا اور دونوں نے دولتِ عثمانیہ کے خلاف محاذ آرائی کی مگر انہیں شکست ہوئی اور سلطان بایزید نے سزا کے طور پر بنوصاروخان کی ریاست کا کچھ حصہ چھین لیا۔ اسحاق چلپی ۷۹۰ھ میں فوت ہو گیا۔

❹ **خضر شاہ بن مظفر:** مظفر کے بیٹے خضر شاہ نے ۷۹۲ھ تک حکومت کی۔ آخر بایزید نے اس پوری ریاست کو دولتِ عثمانیہ میں ضم کر لیا، تاہم تیمور لنگ نے بایزید کو شکست دے کر ۸۰۵ھ میں خضر شاہ کو اس کی ریاست لوٹا دی۔

❺ **محمد چلپی بن خضر:** خضر شاہ کے بعد اس کا بیٹا محمد چلپی حکمران بنا، مگر عثمانیوں نے ۸۱۳ھ میں اسے اخلاقی جرائم میں مبتلا ہونے کے باعث قتل کر دیا اور یہ ریاست سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہو گئی۔

❁❁❁

⑦ ریاستِ بنومنتشا: ۶۷۹ھ تا ۸۲۹ھ (۱۲۸۰ء تا ۱۴۲۶ء)

یہ ریاست ''قارہ''، ''مخین'' اور ''بالاط'' کے علاقے میں قائم ہوئی۔ اس کی انتہائی وسعت ۲۳ ہزار مربع کلومیٹر تک تھی۔ یہاں کے اہم حُکام کا تعارف درج ذیل ہے:

❶ یہاں کا پہلا حاکم سلاجقہ کا ایک ساحلی امیر ''حاجی'' تھا۔ اس کے دور میں ریاست نیم خودمختار تھی۔

❷ **منتشا:** حاجی کے بعد اس کے بیٹے ''منتشا'' نے سلاجقۂ روم کو کمزور پا کر یہاں آزاد حکومت قائم کر لی۔ ۷۳۰ھ میں اس کی وفات ہو گئی۔

❸ **اورخان شجاع الدین:** منتشا کے بعد اس کے بیٹے ''اورخان شجاع الدین'' نے مسندِ حکومت سنبھالی۔

❹ **ابراہیم بن اورخان:** پھر ابراہیم حکمران بنا جس سے مشہور سیاح ابن بطوطہ کی ملاقات ہوئی تھی۔

❺ **تاج الدین احمد غازی بن ابراہیم:** ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا تاج الدین احمد غازی حکمران ہوا۔

❻ **محمد بن ابراہیم:** احمد کے بعد اس کا بھائی محمد حکمران ہوا۔

❼ **الیاس بن محمد:** محمد بن ابراہیم کے بعد اس کے فرزند الیاس کو اقتدار ملا جس نے عثمانی فرمانروا بایزید یلدرم سے کش مکش میں شکست کھائی اور ۷۹۲ھ میں بھاگ کر ''سینوب'' چلا گیا۔ ۸۰۵ھ میں تیمور لنگ کے ہاتھوں عثمانیوں کی شکست کے بعد اس نے دوبارہ اپنی حکومت سنبھال لی۔

❽ **لیث بن الیاس:** ۸۲۴ھ میں الیاس کی وفات پر اس کا بیٹا لیث حکمران بنا۔ ۸۲۹ھ میں سلطان مراد ثانی نے اس ریاست پر قبضہ کر لیا اور بنومنتشا کو ''توقات'' میں قید کر دیا۔ اس طرح یہ حکمرانی اختتام پذیر ہو گئی۔

❁❁❁

⑧ ریاستِ بنوبراونہ: ۶۷۶ھ تا ۷۲۲ھ (۱۲۷۷ء تا ۱۳۲۲ء)

یہ ریاست بحیرۂ اسود کے ساحلی شہر ''سینوب'' میں قائم تھی۔ سلجوقی سلطان عزالدین کیکاؤس نے ۶۱۱ھ میں یہاں قبضہ کیا مگر کچھ عرصے بعد ''طرابزون'' کے بازنطینی حکمران نے اسے مسلمانوں سے چھین لیا۔ اس کے حکمرانوں کا

تعارف یہ ہے:

❶ **براونہ:** سلطان قلیج ارسلان چہارم کے دور میں ایک سلجوقی امیر معین الدین سلیمان براونہ نے اس کی بہت مدد کی جس پر سلطان نے اسے ''سینوب'' شہر کی حکومت سونپ دی مگر براونہ کو ڈر تھا کہ سلطان اسے قتل نہ کرا دے، لہٰذا اس نے اپنے بیٹے معین الدین محمد کو یہاں بطورِ نائب مقرر کر دیا۔ ۶۷۶ھ میں براونہ کو سزائے موت ہوگئی۔

❷ **معین الدین محمد:** اب اس کا بیٹا معین الدین محمد یہاں کا حکمران بن گیا۔ اس نے مغلوں سے صلح کر کے یہاں ۶۹۶ھ تک حکومت کی۔

❸ **مہذب الدین:** معین الدین کا بیٹا مہذب الدین مسعود اس کا جانشین ہوا۔ اس نے بھی باپ کی سیاست کے مطابق مغلوں کی باج گزاری اختیار کی۔ ۷۰۰ھ میں اس کی وفات پر اس خاندان کی حکومت ختم ہوگئی۔

✿✿✿

⑨ **ریاستِ بنو قرہ مان: ۶۴۸ھ تا ۸۹۲ھ (۱۲۵۰ء تا ۱۴۸۷ء)**

یہ ریاست اناطولیہ کے وسط میں قائم تھی۔ لارندہ (قرہ مان)، قونیہ، ارکلی اور ارمنک اس کے اہم شہر تھے۔ اس کے حکمرانوں کا تعارف پیشِ خدمت ہے:

❶ **کریم الدین قرہ مان:** اس کی تاسیس کا پسِ منظر یہ ہے کہ سلجوقی بادشاہ علاؤ الدین کیقباد نے شہر ''ارمناک'' فتح کرنے کے بعد وہاں کے نواح میں ترکمانوں کو بسایا۔ ۶۵۴ھ میں سلطان قلیج ارسلان چہارم نے ایک ترکمان سردار کریم الدین قرہ مان کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ ۶۶۰ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔

❷ **محمد بیگ بن قرہ مان:** قرہ مان کے بعد اس کا بیٹا محمد (اوغلو محمد بیگ اوّل) اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ''ارمناک'' شہر کو مرکز بنا کر مکمل خود مختاری حاصل کر لی۔ ۶۷۵ھ میں اس نے قونیہ پر قبضہ کر لیا تاہم ۶۷۶ھ میں وہ سلطان غیاث الدین کے خسرو سوئم سے مقابلے میں مارا گیا۔

❸ **محمود بن قرہ مان:** محمد کے بعد اس کا بھائی محمود حاکم بنا اور اس کی اولاد میں یہ حکومت چلتی رہی۔

❹ **علاؤ الدین:** ۷۷۳ھ میں عثمانی سلطان مراد اوّل نے یہاں کے حاکم علاؤ الدین قرہ مان کی بیٹی نفیسہ سے نکاح کر لیا، اس کے باوجود بنو قرہ مان اور عثمانیوں میں کشیدگی باقی رہی جس کے باعث فریقین میں جنگ ہوئی اور علاؤ الدین گرفتار ہوگیا۔ اس کی بیٹی نفیسہ کی سفارش پر اسے سالانہ خراج کے معاہدے پر آزاد کر دیا گیا۔

۷۹۳ھ میں اس نے پھر بغاوت کی اور سلطان بایزید یلدرم کے ایک جرنیل کے مقابلے میں مارا گیا۔ اس کا بیٹا محمد جیل میں ڈال دیا گیا اور اس کی اکثر ریاست دولتِ عثمانیہ میں شامل ہوگئی۔

❺ **محمد بن علاؤ الدین:** تیمور لنگ کے حملے کے بعد محمد بن علاؤ الدین رہا ہوگیا اور اس نے اپنی ریاست سنبھال کر وہاں تیمور لنگ کے نام کا سکہ جاری کر دیا۔ پھر اپنی ریاست کو وسعت دے کر وہ ۸۱۴ھ میں بنو کرمیان کی ریاست پر بھی

قابض ہوگیا۔ تاہم ۸۱۷ھ میں عثمانی تاجدار سلطان محمد چلپی نے اسے مار بھگایا جس کے بعد ایک اور جنگ میں وہ گرفتار ہوگیا۔ تاہم عثمانیوں نے درگزر کر کے اسے رہا کر دیا۔ محمد بن علاؤالدین مصر چلا گیا اور مملوکوں کی مدد لے کر ایک بار پھر اناطولیہ پر حملہ آور ہوا۔ مگر اسے شکست ہوئی اور وہ دوبارہ گرفتار ہوگیا۔ اسے قیدی کی حیثیت میں مصر بھیج دیا گیا جہاں سے وہ ایک بار پھر فرار ہوا اور ۸۲۴ھ میں اناطولیہ لوٹ کر انطالیہ کا محاصرہ کر لیا۔ سالہا سال کی ناکام مہم جوئی کے بعد یہ بد قسمت مہم جو ۸۲۷ھ میں وفات پا گیا۔

❻ **علاؤالدین علی:** اس کے بھائی علاؤالدین علی نے جو ممالیکِ مصر سے وابستہ تھا، اس کی گدی سنبھال لی، تاہم اس کے بھتیجے ابراہیم بن محمد اور عیسیٰ بن محمد اس کے خلاف ہوگئے اور سلطان مراد ثانی کے حلقہ بگوش بن گئے۔ سلطان نے اپنی دو بہنیں ان کے نکاح میں دے دیں اور عیسیٰ کو رومیلی کا حاکم بھی مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سلطان نے علاؤالدین علی سے قرہ مان کی مسند چھین لی اور اس کا نکاح اپنی تیسری بہن سے کرا دیا اور اسے صوفیا کا حاکم بنا دیا۔

❼ **ابراہیم بن محمد:** ریاست قرہ مان کی حکومت اب ابراہیم کو دے دی گئی مگر جب ابراہیم نے اپنے بیٹے اسحاق کو اپنا جانشین بنانا چاہا تو اس کے بھائی اس سے الجھ پڑے۔

❽ **پیراحمد:** اس کش مکش میں پیر احمد جو سلطان محمد چلپی کا نواسہ تھا، مسندِ حکومت پر غالب آ گیا۔ اسحاق نے بھاگ کر آذربائی جان کے حاکم اوزون حسن سے مدد لی اور قونیہ پر قابض ہوگیا۔ تاہم سلطان محمد فاتح نے اسے پسپا کر کے پیر احمد کو اس کی گدی لوٹا دی۔ پیر احمد نے ایک مدت بعد عثمانیوں سے بغاوت کر دی مگر ۸۷۱ھ میں اسے شکستِ فاش ہوئی اور قونیہ دولتِ عثمانیہ میں شامل ہوگیا جبکہ امارتِ قرہ مان کے باقی ماندہ علاقے پر پیر احمد اور اس کا بھائی قاسم ۸۷۴ھ تک مل جل کر حکومت کرتے رہے۔ آخر ان دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ۸۸۰ھ میں پیر احمد کی وفات ہوگئی۔

❾ **قاسم:** اسی سال قاسم نے عثمانیوں کے مقابلے میں شکست کھائی مگر وہ اپنی ریاست کو بچانے میں کامیاب رہا۔ عثمانی شہزادہ جمشید اپنے بھائی سلطان بایزید ثانی سے ناراض ہو کر قاسم کے پاس آ گیا اور اس کے ساتھ حکومت میں بھی شریک رہا، تاہم کچھ مدت بعد وہ اناطولیہ چھوڑ کر روڈس کے نصرانیوں کے ہاں پناہ لینے چلا گیا۔ قاسم نے سلطان بایزید ثانی سے صلح کا معاہدہ کر لیا اور ۸۸۸ھ میں اپنی وفات تک حکمران رہا۔

❿ **محمود بن طرغوث:** اس کی وفات کے وقت اس کے بیٹے دنیا سے گزر چکے تھے، اس لیے امرائے دربار نے ایک قرہ مانی امیر محمود بن طرغوث کو مسند پر بٹھا دیا تاہم قاسم کا نواسا اس کے مدِ مقابل کھڑا ہوگیا۔ عثمانی سلطان بایزید ثانی نے اس کی حمایت کی جس پر محمود بن طرغوث دولتِ عثمانیہ کے خلاف صف آرا ہوگیا اور ممالیکِ مصر سے وفاداری استوار کر لی۔ آخر عثمانیوں نے ۸۹۲ھ میں اس ریاست پر قبضہ کر لیا اور یوں بنو قرہ مان کی سیادت کا خاتمہ ہوگیا۔

امرائے قرہ مان سلاجقۂ روم کے اصل وارث ہونے کے دعوے دار تھے مگر اس کے باوجود وہ کبھی اناطولیہ پر مکمل قبضہ نہ کر سکے۔ تاہم اپنے دورِ عروج میں ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) کے قریب ان کی ریاست کا رقبہ ایک لاکھ مربع کلومیٹر تک

پہنچ چکا تھا۔ بنوقرہ مان اپنے سرکاری معاملات میں ترکی زبان استعمال کرتے تھے جبکہ سلاجقۂ روم نے فارسی کو رائج کر رکھا تھا۔

✪✪✪

⑩ ریاستِ بنوکرمیان (بنوجرمیان، بنوگرمیان): ۶۵۸ھ تا ۸۳۲ھ (۱۲۶۰ء تا ۱۴۲۹ء)

یہ ریاست سلاجقۂ روم کے زوال کے بعد ۷۰۰ھ میں قائم ہوئی۔ پہلے اس کا مرکز وسطی اناطولیہ کے جنوب مشرقی شہر ملطیہ کے قریب تھا، پھر یہ لوگ انقرہ کے قریب منتقل ہو گئے اور مغربی اناطولیہ کے جنوبی شہر کوتاہیہ کو اپنا مرکز بنالیا جو بازنطینی ریاستوں سے متصل تھا۔ اس ریاست کی انتہائی حدود چوالیس ہزار مربع کلومیٹر تک وسیع ہوئیں۔

۷۹۲ھ تک یہ حکومت باقی رہی، آخر میں بایزید یلدرم نے یہاں کے حاکم یعقوب ثانی سے ناراض ہو کر اسے قید کردیا۔ تاہم وہ فرار ہو کر تیمور لنگ سے جاملا۔ تیمور لنگ نے اناطولیہ پر یلغار کے بعد ۸۰۵ھ میں اسے اس کی ریاست لوٹادی۔ تیمور لنگ کی وفات کے بعد اس نے عثمانیوں سے اچھے تعلقات قائم کرلیے۔ اس کی اولاد نہیں تھی، لہٰذا ۸۳۲ھ میں اس نے وفات سے قبل اپنی وصیت میں ریاست عثمانی فرمانروا سلطان مراد ثانی کے نام کردی۔

✪✪✪

⑪ ریاستِ بنورمضان: ۷۵۳ھ تا ۱۰۱۷ھ (۱۳۵۲ء تا ۱۶۰۸ء)

یہ ممالیکِ شام ومصر اور عثمانیوں کے مابین ایک ''بفراسٹیٹ'' کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی انتہائی وسعت ۳۳ ہزار مربع کلومیٹر تک تھی۔ پہلے اس کا مرکز ''بستان'' تھا۔ بعد میں یہ شہر ''اضنہ'' (ادنہ) اس کا پایۂ تخت ہو گیا۔

۹۲۲ھ (۱۵۱۶ء) تک یہ ممالیک کے ماتحت رہی۔ اس کے بعد عثمانیوں کی باج گزار ہوگئی۔ یہاں کے اہم حُکام کا تعارف درج ذیل ہے:

❶ **میر احمد بن رمضان:** اس کی بنیاد ایک ترکمان امیر شہاب الدین احمد بن رمضان (میر احمد) نے ۷۷۹ھ میں رکھی تھی جس نے ممالیکِ مصر کا مقابلہ کر کے انہیں پسپا کیا تھا جس کے بعد مملوک سلطان فرج بن برقوق نے اپنی لڑکی اس کے نکاح میں دے دی تھی، یوں فریقین میں اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور دونوں نے مل کر تیمور لنگ کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ ۸۱۸ھ میں میر احمد نے بنوقرہ مان کے شہر طرطوس کو چھ ماہ کے محاصرے کے بعد فتح کرلیا۔ اس سے اگلے برس میر احمد کی وفات ہوگئی۔

❷ **ابراہیم بن میر احمد:** اس کے بیٹوں میں جانشینی کا خاصا اختلاف رہا تاہم آخرکار اس کا بیٹا ابراہیم جانشین مان لیا گیا۔ اس نے ابتداء میں سلطانِ مصر کی اطاعت کی مگر پھر ۸۳۰ھ میں مخالفت پر کمر باندھ لی جس کے نتیجے میں وہ گرفتار کر کے مصر بھیجا گیا جہاں اسے ۸۳۱ھ میں قتل کردیا گیا۔

❸ **عزالدین حمزہ بن ابراہیم:** اس کی جگہ اس کا بیٹا عزالدین حمزہ کچھ دنوں تک حکمران رہا۔ پھر اس کے دو چچا: محمد

اور علی، جو امارتِ اضنہ کے کچھ ماتحت شہروں کے عامل تھے، اس کے مخالف ہو گئے۔

④ **ارسلان بن داؤد بن ابراہیم:** اس کھینچا تانی کے نتیجے میں عز الدین کی جگہ اضنہ کی حکومت ارسلان داؤد بن ابراہیم کو دے دی گئی۔ ۸۸۵ھ میں ارسلان داؤد قتل ہو گیا۔

⑤ **خلیل بن ارسلان:** اب اس کا بیٹا غرس الدین خلیل مسند پر بیٹھا۔ اب تک اناطولیہ کی یہ ریاست ممالیکِ مصر کی وفادار چلی آرہی تھی۔ مگر خلیل کے دور میں یہ سلطنتِ عثمانیہ کی طرف مائل ہو گئی۔ خلیل ۹۱۶ھ تک حکمران رہا۔

⑥ **محمد بن ارسلان:** اس کے بعد اس کا بھائی محمد مسند نشین ہوا اور استنبول بھی گیا۔ وہ عثمانی سلطان سلیم اوّل کے ساتھ مصر پر حملے میں شریک ہوا اور ۹۲۳ھ میں قاہرہ کے باہر ''معرکۂ ریدانیہ'' میں قتل ہوا۔

بیری بیگ: اس کے بعد اس کا بھائی بیری بیگ ۹۷۶ھ تک ریاست کا والی رہا۔

⑦ **درویش بن بیری بیگ:** اس کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے درویش نے جو طرطوس کا امیر تھا، چھ ماہ تک حکومت کی۔

⑧ **ابراہیم بن بیری بیگ:** پھر بڑے بیٹے ابراہیم (حاکمِ عین تاب) نے غلبہ پالیا اور ۹۹۷ھ تک حکمران رہا۔

⑨ **محمد بن ابراہیم:** اس کے بعد اس کا بیٹا محمد مسند پر بیٹھا۔ آخر کار ۱۰۱۷ھ میں بنو رمضان کی حکومت ختم ہو گئی۔

❂❂❂

⑫ ریاستِ بنو ذوالقادر: ۷۷۹ھ تا ۹۲۸ھ (۱۳۷۷ء تا ۱۵۲۲ء)

یہ ریاست ''بستان'' اور نواحی شہروں پر مشتمل تھی۔ ممالیکِ شام و مصر اور دولتِ عثمانیہ کے مابین یہ ایک آڑ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ۱۳۹۹ء تک یہ ممالیک کے ماتحت رہی، اس کے بعد عثمانیوں کی باج گزار بن گئی۔ تاہم کبھی کبھی اس کی وفاداریاں تبدیل بھی ہوتی رہیں۔ یہ خاندان خود کو فارسیوں کے ساسانی خانوادے کی طرف منسوب کرتا تھا مگر محققین نے انہیں ترکمانی شمار کیا ہے۔ یہ لوگ چنگیز خان کے حملے کے وقت ہجرت کر کے اناطولیہ آئے تھے۔ یہاں کے اہم حکام کا تعارف درج ذیل ہے:

① **زین الدین بن ذوالقادر:** اس خاندان کا بانی امیر ذوالقادر تھا جس کے بیٹے زین الدین نے ضلع بستان میں جاگیر حاصل کی۔ ۷۴۰ھ میں اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور چالیس برس حکومت کر کے ۷۸۰ھ میں فوت ہوا۔

② **خلیل بن زین:** اس کے بیٹے خلیل نے مرعش اور ملطیہ کو بھی ریاست میں شامل کر لیا تاہم اس کے بھائی ابراہیم نے جو ''خربوت'' کا امیر اور ممالیکِ مصر کا حامی تھا، اسے قتل کر دیا۔

③ **صولی بن زین:** خالی گدی پر ان کا ایک اور بھائی ''صولی'' براجمان ہو گیا جو ایک عثمانی امیر محمد شلبی کا سسر تھا اور سلطنتِ عثمانیہ کی طرف مائل تھا مگر ابراہیم نے ۸۰۰ھ میں اسے بھی قتل کر دیا۔

④ **ناصر الدین بن زین:** تاہم دو بھائیوں کو قتل کرنے کے باوجود اسے حکومت نہ ملی اور اس بار مسندِ اقتدار اس

کے ایک اور بھائی ناصر الدین محمد کو مل گئی۔ وہ ایک آزمودہ سپاہی تھا جس نے اپنی ریاست کو مکمل خودمختاری دی اور اس حیثیت کے تحفظ کے لیے وہ بنوقرہ مان، عثمانیوں اور ممالیک تینوں سے لڑتا رہا۔ ۸۰۳ھ میں تیمور کے حملے کے مقابلے میں وہ پامردی سے جما رہا تاہم آخر میں اسے جھکنا ہی پڑا۔ تیمور کی واپسی کے بعد وہ دوبارہ خودمختار ہو گیا۔

جلد ہی عثمانی سلطان محمد چلپی سے اس کی جنگ چھڑ گئی۔ انقرہ کے قریب ۸۱۵ھ میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، ناصر الدین محمد اپنی ریاست کی طرف پسپا ہو گیا۔ اب اس نے ممالیکِ مصر سے اظہارِ وفاداری کر کے مدد مانگی۔ ممالیک نے اسے قیصریہ کا قلعہ دے دیا۔ تاہم جلد ہی عثمانیوں نے یہ قلعہ اس سے چھین لیا۔ ناصر الدین محمد نے یہ دیکھ کر ممالیک سے ناطہ توڑ کر عثمانیوں سے جوڑ لیا۔ سلطان مراد ثانی نے قیصریہ اسے واپس کر دیا۔ ناصر الدین محمد نے ایک بار پھر ممالیک سے وابستہ استوار کرنے کا فیصلہ کیا اور قاہرہ جا پہنچا۔ اپنے وطن واپس آ کر ۸۴۶ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔

❺ **سلیمان بن ناصر الدین:** اس کے بعد اس کا بیٹا سلیمان جو ملطیہ کا امیر تھا، مسند پر بیٹھا۔ اس نے اپنی بیٹی مکرمہ کو سلطان محمد فاتح کے نکاح میں دے کر، عثمانیوں سے اچھے روابط قائم کر لیے۔ ۸۵۸ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔

❻ **ارسلان بن سلیمان:** اب اس کا بیٹا ارسلان مسند نشین ہوا۔ آذربائی جان کے حکمران اوزون حسن نے اس کے خلاف چڑھائی کر کے ''خربوت'' پر قبضہ کر لیا۔ ارسلان ممالیکِ مصر سے مدد لینے قاہرہ چلا گیا جہاں ۸۷۰ھ میں اسے ایک مسجد میں اچانک قتل کر دیا گیا۔

❼ **شاہ سوار بن سلیمان:** اس کی خالی مسند پر عثمانیوں نے اس کے بھائی شاہ سوار کو جبکہ ممالیک نے اس کے دوسرے بھائی شاہ بودان کو بٹھانے کی کوشش کی۔ شاہ بودان مغلوب ہو کر مصر میں پناہ گزین ہو گیا۔ ممالیک نے اس کے چچا رستم بن ناصر الدین محمد کو مسند پر لانے کا فیصلہ کیا، یوں ایک نئی کش مکش شروع ہوگئی۔ ۸۷۲ھ میں شاہ سوار نے رستم اور ممالیک کی مشترکہ قوت کو شکست دے دی مگر ۸۷۶ھ میں عین تاب کے معرکے میں اسے شکست ہوئی، اسے قیدی بنا کر مصر میں قتل کر دیا گیا۔

❽ **شاہ بودان بن سلیمان:** اس کی جگہ شاہ بودان کو مسند پر بٹھا دیا گیا۔ عثمانی اس کے جواب میں اس کے بھائی بوز قورت علاؤالدولہ کو آگے لائے جس پر ۸۸۴ھ میں شاہ بودان ایک بار پھر بھاگ کر مصر چلا گیا۔

❾ **علاؤالدولہ:** علاؤالدولہ نے حکومت پا کر فریب کاری کے طور پر ممالیکِ مصر سے تعلق قائم کر لیا جس کے نتیجے میں اس نے ممالیک کو شاہ بودان کے قتل پر آمادہ کر لیا۔ شاہ بودان کے قتل کے بعد علاؤالدولہ دوبارہ عثمانیوں کے ساتھ ہو گیا۔ اس نے اپنی بیٹی عائشہ سلطان بایزید یلدرم کے نکاح میں دے دی جس سے سلطان سلیم اوّل پیدا ہوا۔

مگر کچھ مدت بعد علاؤالدولہ عثمانیوں کا مخالف ہو گیا، باہم جنگوں میں علاؤالدولہ کو شکست ہوئی اور ۹۲۱ھ میں وہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کا سر کاٹ کر اس کے نواسے سلطان سلیم اوّل کو پیش کیا گیا۔

❿ **علی بن شاہ سوار:** عثمانیوں نے اس کی جگہ علی بن شاہ سوار کو مسند پر بٹھایا اور ریاست میں عثمانی سلطان کا خطبہ

جاری کر دیا گیا۔ علی بن شاہ سوار نے سلطان سلیم اوّل کے مصر پر حملے میں بھی شرکت کی۔ مگر ۹۲۸ھ میں سلطان سلیمان قانونی کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہنو ذی القادر کی حکومت اختتام کو پہنچی۔

اس ریاست کی انتہائی وسعت ستر ہزار مربع کلو میٹر تھی۔

⚙⚙⚙

⑬ ریاستِ بنو جاندار (بنو اسفندیار، بنو چوپان): ۶۰۰ھ تا ۸۶۶ھ (۱۲۰۴ء تا ۱۴۶۱ء)

یہ ریاست اناطولیہ کے شمال مغربی ضلع ''قسطمونی'' میں قائم تھی جس کی سرحدیں بازنطینیوں سے جا ملتی تھیں۔ افلانی اور سینوب بھی اس کے اہم شہر تھے۔

اس کا بانی حسام الدین چوبان بیگ تھا جو خود کو بنو مخزوم کہلاتا تھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہونے کا دعوے دار تھا۔ اس کی اولاد یہاں کی حاکم رہی جسے بنو جاندار کہا جاتا تھا۔ ۷۹۵ھ میں یہاں بایزید یلدرم نے قبضہ کر لیا۔ تاہم تیمور لنگ سے شکست کھانے کے بعد یہ علاقہ بھی ہاتھ سے نکل گیا اور بنو جاندار کے ایک امیر اسفندیار نے یہاں غلبہ پا کر ۸۴۷ھ تک حکومت چلائی۔ سلطان مراد ثانی نے اس کی بیٹی سے نکاح کر لیا جس کے باعث فریقین میں اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔ اسفندیار کے بعد یہ ریاست ''بنو اسفندیار'' کہلانے لگی۔ سلطان محمد فاتح نے ۸۶۶ھ میں قسطمونی پر قبضہ کر لیا اور بنو اسفندیار کی حکومت ختم ہو گئی۔

⚙⚙⚙

⑭ ریاستِ بنو صاحب عطا: ۶۷۶ھ تا (۱۲۷۷ء)

فخر الدین علی بن حسین سلاجقۂ روم کے عظیم القدر وزراء میں سے ایک تھا۔ پایۂ تخت قونیہ میں اسے ''صاحب عطا'' کہا جاتا تھا۔ جب مغلوں نے سلاجقۂ روم پر غلبہ پایا تو صاحب عطا نے ایک گاؤں ''نادر'' میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے اموال کو قلعہ ''قرہ حصار'' میں محفوظ کر دیا۔ صاحب عطا ۶۸۴ھ میں وفات پا گیا جب کہ اس کے بیٹے اس سے چند سال قبل ۶۷۶ھ کی ایک جنگ میں مارے گئے تھے۔ صاحبِ عطا کی وفات کے بعد اس کے پوتوں نے ''قرہ حصار'' کی قلعہ داری سنبھال لی۔ آخر میں بنو قرہ مان نے یہ قلعہ ان سے چھین لیا۔

⚙⚙⚙

⑮ ریاستِ بنو تکہ: ۶۹۹ھ تا ۸۲۶ھ (۱۳۰۰ء تا ۱۴۲۳ء)

یہ ریاست اناطولیہ کے جنوبی شہر ''انطالیہ'' اور اس کے گرد و نواح میں قائم تھی۔ اس کا بانی ایک ترکمانی افسر تکہ پاشا تھا جو صلیبیوں کے خلاف جہاد میں مشہور تھا۔ سلاجقۂ روم کے مغلوں کے سامنے بے بس ہو جانے کے بعد اس نے ۷۰۰ھ میں خود مختاری اختیار کر لی۔ ۷۹۵ھ میں بایزید نے اس پر قبضہ کر لیا مگر چند برسوں بعد تیمور لنگ نے اسے ان سے چھین لیا۔ ۸۳۰ھ میں یہ دوبارہ سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بن گئی۔ اس کی انتہائی وسعت چودہ ہزار مربع کلو میٹر تک تھی۔

⚙⚙⚙

⑯ ریاستِ قاضی برہان الدین: ۷۸۲ھ تا ۸۰۱ھ (۱۳۸۰ء تا ۱۳۹۹ء)

یہ وسیع مشرقی اناطولیہ کے شہر سیواس میں قائم تھی جسے قاضی برہان الدین نے ''بنوارتنا'' سے حاصل کیا تھا۔ یہ کچھ مدت ممالیکِ مصر کی باج گزار رہی۔ آخر بایزید یلدرم نے اسے دولتِ عثمانیہ میں ضم کر لیا۔

⚙⚙⚙

⑰ ریاستِ بنوتاج الدین: ۷۰۷ھ تا ۸۱۸ھ (۱۳۰۸ء تا ۱۴۱۵ء)

اس کی وسعت بارہ ہزار مربع کلومیٹر تھی۔ اس کا مرکز ''نکسار'' تھا۔ محمد چلپی کے دور میں اس کی تسخیر ہوئی۔

⚙⚙⚙

⑱ ریاستِ بنواینانج ''امرائے دینزلی'': ۶۷۴ھ تا ۷۶۹ھ (۱۲۷۶ء تا ۱۳۶۸ء)

یہ بنوکرمیان کی ایک شاخ تھے۔ ان کا مرکزی شہر لادک (دینزلی) تھا۔ ان کی ریاست آٹھ ہزار مربع کلومیٹر وسیع تھی۔ اسے سلطان مراد ثانی نے ۸۳۲ھ میں دولتِ عثمانیہ کا حصہ بنالیا۔

⚙⚙⚙

⑲ ریاستِ قوتلوشاہلر: ۷۴۰ھ تا ۷۹۵ھ (۱۳۴۰ء تا ۱۳۹۳ء)

اس کی وسعت پانچ ہزار مربع کلومیٹر تھی۔ اس کا مرکز ''آماسیا'' تھا۔ بایزید یلدرم نے ۷۹۵ھ میں اسے مسخر کیا۔

⚙⚙⚙

⑳ ریاستِ اقیونیون:

یہ امارت دیارِ بکر میں آمد اور ماردین تک وسیع تھی۔ سلیم اوّل نے ۹۱۲ھ میں اسے فتح کیا۔[1]

⚙⚙⚙

㉑ ریاستِ سلاجقہ روم:

یہ اناطولیہ کی سب سے بڑی مسلم ریاست تھی۔ اہمیت کی بناء پر اس کا ذکر آگے تفصیل کے ساتھ آرہا ہے۔

غیر مسلم ریاستیں

اناطولیہ میں بازنطینی روما کے زیرِ اثر بعض نصرانی حکومتیں بھی قائم رہیں جن میں سے اہم ریاستیں دو تھیں:
① ازنیق (بیزانس) ② طرابزون ...... ان کا مختصر احوال یہ ہے:

---

① اناطولیہ کی ان تمام مسلم ریاستوں کے حالات درج ذیل مآخذ سے لیے گئے ہیں: التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۴۸ تا ۵۷؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۷۵ تا ۷۷

① ازنیق (بیزانس):

بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں بازنطینی روما کا مرکز استنبول شدید اندرونی و بیرونی سازشوں اور بغاوتوں کا نشانہ بن چکا تھا۔ آخر پوپ کی سرپرستی میں یورپی لشکر صلیبی جنگ کے عنوان سے نکلے اور ۶۰۰ھ (۱۲۰۴ء) میں استنبول پر حملہ آور ہو کر انہوں نے بازنطینیوں سے تخت چھین لیا اور وہاں ایک لاطینی شہزادے بوڈوئین ڈی فلانڈر کو بطورِ قیصر تخت پر بٹھا دیا۔ ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں قیصر بوڈوئین ڈی فلانڈر بلغاریہ سے جنگ میں قتل ہو گیا اور اس کا بھائی ہنری قیصر بن گیا۔

اُدھر مفرور بازنطینی شہزادوں میں سے ایک حوصلہ مند شخص تھیوڈور لاسکاریس نے خلیجِ استنبول پار کر کے اناطولیہ کے شمال مغربی شہر ازنیق پر قبضہ کر لیا اور وہاں نئی بازنطینی ریاست قائم کر دی جسے ''بیزانس'' یا ''ازنیق'' کہا جاتا تھا۔ یہ ریاست اناطولیہ کا سب سے مضبوط نصرانی گڑھ تھا جس کی سلاجقۂ روم سے کبھی جنگیں ہوتیں اور کبھی صلح ہو جاتی۔

تھیوڈور ۶۱۹ھ (۱۲۲۲ء) تک حکومت کر کے فوت ہوا اور اس کی جگہ ژان واتس سوئم نے ۶۵۲ھ (۱۲۵۴ء) تک حکومت کی۔ پھر اس کے بیٹے لاسکاریس سوئم نے چار سال حکومت کی اور عین جوانی میں فوت ہو گیا۔ چونکہ اس کا جانشین کم سن تھا لہٰذا نائبِ سلطنت میخائیل (میشل) نے جو اسی خاندان کا ایک ہوشیار شخص تھا، ۶۵۷ھ (۱۲۵۹ء) میں اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔[1] اگلے سال اس نے استنبول پر حملہ کر کے لاطینی قیصر کو شکست دے دی اور خود تختِ استنبول سنبھال کر قیصر بن گیا۔

۶۸۱ھ (۱۲۸۲ء) میں میخائیل کی وفات کے بعد ریاست بیزانس ہچکولے کھانے لگی۔ اسی زمانے میں عثمانیوں کا ظہور ہوا۔ چونکہ دولتِ عثمانیہ کے بانی ارطغرل کی جاگیر اسی علاقے میں تھی اس لیے عثمانیوں کو شروع ہی سے ریاستِ ازنیق سے پالا پڑا اور ان کے درمیان مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ میخائیل کی وفات کے بعد عثمانیوں نے تیزی سے بیزانس کے مختلف قلعے فتح کیے یہاں تک کہ سلطان اورخان کے دور میں ازنیق اپنے تمام شہروں سمیت مسخر ہو گیا۔[2]

② طرابزون:

۶۰۰ھ (۱۲۰۴ء) میں اطالویوں کے استنبول پر قبضے کے بعد ایک اور بازنطینی شہزادہ ''ایلکس کمنن'' اناطولیہ اور آرمینیا کے سنگم پر بحیرۂ اسود کے کنارے واقع مشہور شہر ''طرابزون'' پہنچا اور وہاں قابض ہو کر ایک نئی ریاست قائم کر لی جو ''باطوم'' سے ''ارگلی قرادنیز'' اور دریائے قزل ارماق کے ڈیلٹا تک وسیع تھی۔ تاہم جلد ہی اس سلطنت کی سلاجقۂ روم سے جنگیں شروع ہو گئیں اور عزالدین کیکاؤس نے ۶۱۱ھ (۱۲۱۴ء) میں اس کی مشہور بندرگاہ سینوپ سمیت متعدد

---

① تاریخ عثمانی از پروفیسر اسماعیل حقی اوزون: ۱/ ۳۹ تا ۴۳، ترجمہ فارسی از ڈکتور ایرج نوبخت، ط انتشاراتِ کیہان، سنۃ ۱۳۶۸ھ

② تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/ ۱۵۳، ۱۵۴

قلعوں پر قبضہ کر لیا جس کے بعد ریاستِ طرابزون سلاجقۂ روم کو خراج ادا کرنے لگی۔

سلاجقہ کے ساتھ طرابزون کی روش کبھی متابعانہ ہوتی اور کبھی مخالفانہ۔ سلاجقہ مضبوط ہوتے تو خراج ادا کرتے اور کبھی ان میں اضمحلال کے آثار دکھائی دیتے تو خود مختاری کا اعلان کر دیتے۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں تاتاریوں کا عروج ہوا تو سلاجقۂ روم کی طرح ریاست طرابزون بھی ایل خانی تاتاریوں کی باج گزار بن گئی۔

ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں جب ایل خانی تاتاری رُو بہ زوال ہوئے تو شاہِ طرابزون یوانیس دوئم (م ۶۹۶ھ۔۱۲۹۷ء) نے جنیوا کے نصرانی تاجروں سے روابط بڑھائے جس کے نتیجے میں یہ تاجر ریاست پر مسلط ہو گئے۔ ۷۳۲ھ (۱۳۳۲ء) میں طرابزون اور اناطولیہ کے ترکمان امراء کے مابین کشیدگی بڑھنے لگی جس کے نتیجے میں ۷۴۷ھ (۱۳۴۶ء) میں اس ریاست کے ایک اور اہم شہر "مانیسا" پر ترکمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ الیکسی سوئم (م ۷۹۲ھ۔ ۱۳۹۰ء) نے اپنی گرتی ہوئی حکومت کو بچانے کے لیے اپنی بہن شہزادی ماریا اور اپنی چار بیٹیاں ترکمان امراء کے نکاح میں دے کر کچھ عرصے کے لیے اپنی سلطنت کو بچائے رکھا مگر اس کے نتیجے میں ترکمان امراء طرابزون کے بیشتر علاقے پر مسلط ہو گئے۔ اب ریاستِ طرابزون شرقاً غرباً "باطوم" سے "گرسون" اور شمالاً جنوباً "ایبورد" سے پہاڑی علاقے تک محدود رہ گئی۔

عثمانیوں نے اس ریاست پر بہت دیر میں توجہ دی۔ سلطان مراد ثانی نے اس پر ایک حملہ کیا جو ناکام رہا۔ آخر ۸۶۶ھ (۱۴۶۲ھ) میں سلطان محمد فاتح نے اسے مسخر کیا۔ [1]

---

[1] تاریخ عثمانی از اسماعیل اوزون حقی: ۲/۵۱ تا ۵۶

سلاجقۂ روم پر ایک نظر

اس زمانے میں اناطولیہ کی اہم ترین مسلم ریاست سلاجقۂ روم کی تھی جس کا مرکز قونیہ تھا۔ چونکہ عثمانی ترکوں کی حکومت سلاجقۂ روم ہی کی نیابت میں قائم ہوئی تھی اس لیے ضروری ہے کہ یہاں سلاجقۂ روم کا تعارف کرا دیا جائے۔

یہ سلطنت بازنطینی رومن بادشاہت کے ان علاقوں پر مشتمل تھی جو خلفائے راشدین، بنوامیہ اور بنوعباس کے دور میں فتح کیے گئے تھے۔ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں یہ علاقے سلجوقیوں نے فتح کر لیے۔ صرف ان کا مغربی حصہ باقی رہ گیا جہاں سلجوقیوں سے شکست کھانے والے ارمنی نصرانیوں نے اپنی ریاست قائم کر لی، یہ علاقہ آج کل کیلیکیا کہلاتا ہے۔

قُتُلمِشؔ بن اسرائیل:

سلاجقۂ روم کا جدِ امجد سلجوقی خانوادے کا ایک سردار قُتُلمِشؔ (بن اسرائیل بن سلجوق) تھا جو "شہاب الدولہ" کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ سلجوقی بادشاہت کے بانی طغرل بیگ کے دور میں آذربائی جان کا حاکم بنا اور ترکمان قبائل کو منظم کر کے اس نے اناطولیہ پر حملے شروع کیے اور خاصا علاقہ فتح کر لیا۔

طغرل بیگ کی وفات کے بعد قُتُلمِشؔ نے ایران پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جس کے باعث نئے سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان سے اس کی کش مکش شروع ہوگئی۔ آخر کار قُتُلمِشؔ مارا گیا اور اس کے بیٹے گرفتار ہوگئے۔ یہ ۴۵۵ھ (۱۰۶۳ء) کا واقعہ ہے۔ بعد میں الپ ارسلان نے اپنے وزیر نظام الملک طوسی کے مشورے پر قُتُلمِشؔ کے بیٹوں کو آزاد کر کے اناطولیہ کے مفتوحہ علاقوں میں تعینات کر دیا۔[1]

① سلیمان بن قُتُلمِشؔ:

۴۶۴ھ (۱۰۷۱ء) میں ملاز کرد کے مقام پر الپ ارسلان کی قیصرِ روم ارمانوس سے تاریخی لڑائی ہوئی جس میں قیصر گرفتار ہو گیا۔ قُتُلمِشؔ کے بیٹوں: سلیمان شاہ اور منصور نے اس جنگ میں نہایت پامردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فتح میں اہم کردار ادا کیا تھا لہٰذا الپ ارسلان نے خوش ہو کر سلیمان شاہ کو اناطولیہ کے مفتوحہ علاقوں کا گورنر مقرر کر دیا اور اسے پورے اناطولیہ کی فتح کی ذمہ داری سونپ دی۔

---

① تاریخ الدولة العثمانية از سید محمد، ص ۴۷، ۴۸

الپ ارسلان کے بعد ملک شاہ کی حکومت میں بھی سلیمان کا یہ عہدہ برقرار رہا اور وہ اناطولیہ میں پے در پے فتوحات حاصل کرتا رہا۔ اس نے قونیہ کو فتح کر کے اپنا مرکز قرار دیا۔ ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) میں اس نے ملک شاہ سے الگ ہو کر یہاں خود مختار حکومت قائم کر لی اور ''نیقیہ'' کو اپنا مرکز بنالیا۔ ۴۷۱ھ (۱۰۷۸ء) میں اس نے بازنطینی شہر ''نیسیا'' (ازنیق) اور ''نکومیڈیا'' (ازمت) فتح کر لیے۔ آخر کار وہ شمال کی طرف بڑھتے بڑھتے بحیرۂ مرمرہ کے ساحل تک جا پہنچا جہاں سے قُسطنطِینیّہ کی فصیل صاف دکھائی دیتی تھی۔ یہ تمام مفتوحہ علاقے اس نے رومیوں سے چھینے تھے، اس لیے اس کا خاندان سلاجقۂ روم کہلایا۔

سلیمان کی فتوحات کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے ہجرت کر کے اناطولیہ آنے والے ترکمان قبائل میں جہاد کی رُوح پھونک دی تھی اور انہیں بازنطینی روما کے مقابلے میں کھڑا کر دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بازنطینی سلطنت اندرونی انتشار کا شکار تھی اس لیے وہ اناطولیہ میں اپنے مقبوضات کا بھرپور دفاع کرنے سے قاصر رہی۔

۴۷۷ھ میں سلیمان نے جنوب کا رُخ کیا اور انطاکیہ کو فتح کر لیا جس کے بعد وہ حلب کے محاصرے کی تیاری کرنے لگا۔ سلاجقۂ شام کا بانی تتش اوّل یہ دیکھ کر اپنے علاقے کے دفاع کے لیے میدان میں نکلا۔ ۴۷۸ھ (۱۰۸۶ء) میں سلیمان اور تتش کے مابین جنگ ہوئی جس میں سلیمان قتل ہو گیا۔ ملک شاہ نے اس کے ولی عہد قلیج ارسلان کی تخت نشینی قبول نہ کی بلکہ اسے ایران طلب کر کے قید میں ڈال دیا۔[1]

② قلیج ارسلان:

۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) میں ملک شاہ فوت ہوا تو اس کے جانشین برکیارُق نے قلیج ارسلان کو رہا کر کے اناطولیہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ قلیج ارسلان ایک اولوالعزم انسان تھا۔ اس نے قونیہ کو مرکز بنا کر اپنے باپ کی سلطنت کو ازسرِ نو قائم کرتے ہوئے تمام علاقوں کو دوبارہ فتح کیا۔ تاہم ۴۹۰ھ (۱۰۹۷ء) میں اسے پہلی صلیبی جنگ کے لیے آنے والے یورپی لشکروں سے پالا پڑا جو ایشیائے کوچک سے ہوتے ہوئے فلسطین جا رہے تھے۔ قلیج ارسلان نے انہیں روکنے کی پوری کوشش کی اور ان کی ابتدائی افواج کو تہ تیغ کر دیا تاہم لاکھوں کی افواج کے سامنے بند باندھنا اس کے لیے ممکن نہ ہوسکا اور صلیبی انطاکیہ سمیت اس کی ریاست کے کئی اہم شہروں کو پامال کرتے ہوئے شام میں گھس گئے اور بیت المقدس پہنچ گئے۔ صلیبیوں کے ہاتھوں شکست کے بعد اناطولیہ کا بیشتر علاقہ قلیج ارسلان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس کے باوجود اس نے قونیہ اور اس کے آس پاس اپنی حکومت قائم رکھی۔

صلیبی طوفان کچھ تھما تو قلیج ارسلان نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کے لیے کمر باندھی اور ۴۹۸ھ (۱۱۰۴ء) میں سلطان برکیارُق کی وفات کے بعد کامل خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے شمالی ایران پر قبضے کی کوشش شروع کر دی۔ ۵۰۰ھ (۱۱۰۷ء) میں اس نے الجزیرہ میں پیش قدمی کرتے ہوئے موصل اور دیار بکر کو فتح کر لیا مگر آخر میں اسے

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة از سید محمد، ص ۴۸ تا ۵۰

مقامی گورنر جاولی کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑا اور اسی دوران وہ خابور کے ایک دریا میں ڈوب کر راہی عدم ہوگیا۔[1]

③ ملک شاہ بن قلیج ارسلان:

قلیج ارسلان کا گیارہ سالہ لڑکا ملک شاہ بھی اس مہم میں ساتھ تھا۔ شکست کے بعد وہ موصل سے گرفتار ہو کر سلطان محمد بن ملک شاہ کی قید میں آ گیا اور سلاجقۂ روم کی حکومت معطل ہوگئی۔ آخر ۵۰۳ھ میں ملک شاہ قید سے فرار ہو کر اناطولیہ پہنچ گیا اور ''ملطیہ'' میں تخت لگا کر اپنی موروثی حکومت بحال کر لی۔ اس نے آٹھ سال تک حکومت کی۔[2]

④ رکن الدین مسعود:

اب قلیج ارسلان کا دوسرا بیٹا رکن الدین مسعود تخت نشین ہوا جس نے ۵۱۰ھ سے ۵۵۱ھ تک پورے چالیس سال حکومت کی اور اپنی سلطنت کی آن بان کو دوبارہ قائم کیا اور ساتھ ہی بازنطینی رومیوں کو بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ تاہم آخر میں اس نے نادانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلطنت کو تین حصوں میں بانٹ دیا: پایۂ تخت قونیہ کو اپنے بیٹے قلیج ارسلان ثانی کے سپرد کیا، انقرہ اور شمالی صوبوں کو اپنے دوسرے بیٹے شہنشاہ کے نام کر دیا جبکہ سیواس اور مشرقی علاقے اپنے داماد ''یاغی بصان'' کو سونپ دیے۔ اس فیصلے کے نتیجے میں شہزادوں میں اقتدار کی کش مکش شروع ہوگئی۔[3]

⑤ قلیج ارسلان ثانی:

آخر کئی سال کی خانہ جنگی کے بعد قلیج ارسلان ثانی اقتدار کے تمام دعوے داروں پر غالب آیا۔ ۵۵۹ھ (۱۱۶۴ء) میں ''یاغی بصان'' کی وفات کے بعد وہ سیواس اور مشرقی صوبوں پر قابض ہوگیا۔ ۵۷۲ھ (۱۱۷۶ء) میں اس نے اپنے بھائی شہنشاہ اور اس کے حلیف بازنطینی لشکر کو ''جیوریل'' کے نواح میں شکستِ فاش دی۔ یہ لڑائی ''جنگِ میریا کفالون'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد سلاجقۂ روم کی سلطنت دوبارہ مضبوط ہوگئی۔ اسی زمانے میں شام اور مصر میں صلاح الدین ایوبی کی حکومت قائم ہوئی، کچھ مدت دونوں حکومتوں میں سرحدی کش مکش چلتی رہی، آخر ۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں دونوں ریاستوں میں صلح ہوگئی۔

قلیج ارسلان ثانی نے لگ بھگ ۳۶ سال حکومت کی۔ اس دوران اس نے بھی یہ بھاری غلطی کی کہ اپنے بیٹے غیاث الدین کے خسرو کو پایۂ تخت میں جانشین بنا کر باقی سلطنت کو دیگر بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے نتیجے میں باپ کی زندگی ہی میں بھائیوں میں کشت و خون شروع ہوگیا اور سلطنت کی وحدت کو شدید نقصان پہنچا۔

اسی زمانے میں تیسری صلیبی جنگ کا نقارہ پیٹ دیا گیا اور ۵۸۶ھ (۱۱۹۰ء) میں جرمنی سے آنے والے صلیبی لشکر نے قلیج ارسلان ثانی کو شکست دے کر اناطولیہ پر تسلط حاصل کر لیا۔ قلیج ارسلان ثانی کے پاس قونیہ باقی رہا مگر اس کی

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۵۰ تا ۵۲؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۵۵۰ھ

② تاریخ دمشق لابن القلانسی، ص ۲۵۳؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ: ۵۰۰ھ؛ المختصر فی اخبار البشر: ۲/۲۲۲؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/۶۹

③ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۵۲، ۵۳؛ تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/۴

کی حیثیت اب ایک باج گزار حاکم کی سی تھی۔ دو سال بعد ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں قلیج ارسلان ثانی فوت ہوگیا۔ [1]

⑥ غیاث الدین کے خسرو اوّل:

قلیج ارسلان ثانی کی وصیت کے مطابق اس کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین کے خسرو اوّل تخت نشین ہوا۔ خوش قسمتی سے اس سے اگلے برس صلاح الدین ایوبی نے صلیبی حملہ آوروں کو شکستِ فاش دے دی اور حملہ آور یورپ واپس ہوگئے جس کے نتیجے میں اناطولیہ کو بھی غیر ملکی اجارہ داری سے نجات مل گئی تاہم شہزادوں میں باہم خانہ جنگی جاری تھی۔ آخر ۵۹۲ھ (۱۱۹۶ھ) میں شہزادہ رکن الدین سلیمان باقی بھائیوں پر غالب آ گیا۔ [2]

⑦ رکن الدین سلیمان:

رکن الدین سلیمان نے مشرقی اناطولیہ میں ارضِ روم سمیت خاصا علاقہ فتح کیا۔ ۶۰۰ھ میں اٹلی سے پوپ کی بھیجی ہوئی فوج نے قُسطَنطِینِیّہ پر قبضہ کر کے قیصرِ روم کو بے دخل کر دیا جس کے بعد بازنطینی شہزادوں نے ''ازنیق'' اور ''طرابزون'' میں دو الگ الگ مرکز قائم کر لیے۔ اس انتشار کے باعث سلاجقۂ روم کے لیے بازنطینی روما کو مزید پسپا کرنا آسان ہوگیا تاہم اس کے کچھ دنوں بعد رکن الدین سلیمان کی وفات ہوگئی۔ [3]

⑧ غیاث الدین کے خسرو اوّل، دوبارہ:

اب قلیج ارسلان ثانی کے دوسرے بیٹے غیاث الدین کے خسرو اوّل کا زمانہ شروع ہوا۔ وہ ایک بہادر، مہربان اور دوراندیش حکمران تھا۔ علم وفضل سے آراستہ اور بذاتِ خود شاعر وادیب تھا۔ اس وقت اناطولیہ کی سلجوقی سلطنت بدترین حالات سے دوچار تھی۔ اس خطے میں نصرانیوں کی دو حکومتیں قائم تھیں اور سلجوقی سلطنت ان کے رحم وکرم پر تھی۔ کوئی ساحلی شہر سلجوقیوں کے پاس نہ رہا تھا جس کے باعث ان کی معیشت وتجارت کی حالت دگرگوں تھی۔

ان حالات میں غیاث الدین کے خسرو نے حکومت سنبھالی اور ۶۰۱ھ (۱۲۰۵ء) میں قونیہ کو دوبارہ فتح کر کے اپنی خودمختار حیثیت بحال کر لی۔ کے خسرو اوّل کا دوسرا بڑا کارنامہ سلطنت کو ازسرِ نو متحد کرنا تھا۔ اس کا تیسرا کارنامہ ۶۰۳ھ (۱۲۰۷ء) میں بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع انطالیہ کی بندرگاہ پر قبضہ تھا جس کے باعث سلجوقیوں کا تجارتی راستہ دوبارہ کھل گیا۔ اگلے برس اس نے حلب کے حاکم الملک الظاہر بن صلاح الدین ایوبی کی مدد سے ''کیلیکیا'' کے ارمنی نصرانیوں کے خلاف یلغار کی اور ان کی سرکوبی کر کے یہ علاقہ بھی فتح کر لیا۔

اس کے بعد اس نے بازنطینی رومیوں کے نئے مرکز ''ازنیق'' کا رُخ کیا اور ''آنتی یوخ'' کے میدان میں رومی بادشاہ ''لاسقاریس'' کو پسپا کر دیا۔ حریف کی پسپائی کے بعد غیاث الدین نے احتیاط کو مدنظر نہ رکھا اور بذاتِ خود رومی

---

① تاریخ الدولة العثمانية از سید محمد، ص ۵۳،۵۲ ؛ تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/ ۵،۴
② تاریخ الدولة العثمانية از سید محمد، ص ۵۳؛ تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/ ۶،۵
③ تاریخ الدولة العثمانية از سید محمد، ص ۵۳ ؛ تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/ ۶

بادشاہ کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا، رومی بادشاہ نے جو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا، غیاث الدین کو سر پر دیکھا تو پلٹ کر حملہ کر دیا جس میں غیاث الدین شہید ہو گیا۔ یہ ۶۰۸ھ (۱۲۱۱ء) کا واقعہ ہے۔[1]

⑨ عزالدین کیکاؤس:

غیاث الدین کے خسرو اوّل کے بعد اس کے بڑے بیٹے عزالدین کیکاؤس کو اقتدار ملا۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی علاؤالدین کیقباد کی بغاوت کا سامنا بھی کرنا پڑا تاہم اس نے ۶۰۸ھ سے ۶۱۷ھ تک (۱۲۱۱ء تا ۱۲۱۹ء) حکومت کی۔ ۶۱۱ھ میں اس نے بحیرۂ اسود کے ساحلی شہر ''سینوپ'' کو فتح کر کے اپنی سلطنت کو مزید وسعت دے دی۔

کیکاؤس ایک اچھا ادیب اور شاعر تھا اور فارسی میں اشعار کہتا تھا۔ وہ عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔[2]

⑩ علاؤالدین کیقباد:

اب اس کا چھوٹا بھائی علاؤالدین کیقباد اوّل تخت نشین ہوا۔ اس نے ۶۱۶ھ سے ۶۳۴ھ (۱۲۱۹ء تا ۱۲۳۷ء) تک اٹھارہ برس حکومت کی۔ ۶۱۷ھ (۱۲۲۱ء) سے ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) کے درمیان اس نے بحیرۂ روم کے ساحلوں پر بازنطینیوں کے خلاف مسلسل جہاد کیا اور ان سے بہت سے قلعے چھین لیے۔ ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) میں اس نے بحیرۂ اسود کے پار کریمیا کی سمت بھی ایک مہم بھیجی اور فتح پائی۔ اس کے دور میں سلاجقۂ روم کی سلطنت تہذیب وتمدن، علمی وتعمیری سرگرمیوں اور دولت وثروت کے لحاظ سے اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ جہاز سازی کی صنعت میں سلجوقی سب سے آگے شمار ہونے لگے۔ مگر علاؤالدین کیقباد کے دور میں جہاں اناطولیہ صنعت وحرفت سے آباد ہو رہا تھا، وہاں عین انہی ایام میں وسطِ ایشیا، خراسان، ایران، عراق اور الجزیرہ چنگیز خان کی یلغار سے زیر وزبر ہو رہے تھے۔ تاتاریوں کے مقابلے میں خوارزمی سلطنت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور اس کا فرمانروا علاؤالدین خوارزم شاہ فرار ہو کر گم نامی کی موت مر چکا تھا۔

ایسے میں تختِ خوارزم کے وارث سلطان جلال الدین نے خراسان و ہندوستان میں جہادی مورچے بنانے میں ناکامی کے بعد ایران اور آذربائی جان میں حکومت قائم کر کے کوشش کی کہ شام اور اناطولیہ کے مسلم حکمران اس فتنے کے مقابلے میں متحد ہو جائیں۔ علاؤالدین کیقباد نے اس دعوت پر لبیک کہا مگر افسوس کہ یہ اتحاد پائیدار ثابت نہ ہوا اور سرحدی تنازعات کے باعث باہمی تعلقات دشمنی میں بدل گئے۔ آخر علاؤالدین کیقباد نے ۶۲۷ھ (۱۲۳۰ء) میں شام کے حکام کے ساتھ اتحاد کر کے سیواس کے قریب سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی طاقت کو توڑ ڈالا۔[3]

مگر سلطان جلال الدین کی شکست کے بعد ۶۲۹ھ میں تاتاری سلاجقۂ روم کی سرحدوں تک پہنچ گئے اور انہوں نے سیواس اور ارزنجان تک لوٹ مار کر کے بڑی دہشت پھیلا دی۔[4] علاؤالدین کیقباد نے ان کے مقابلے کی خاطر

---

① تاریخ الدولة العثمانية از سید محمد، ص ۵۳ ؛ تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/ ۶،۷

② تاریخ الدولة العثمانية از سید محمد، ص ۵۳ ؛ تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/ ۷

③ سیرة سلطان جلال الدین از شهاب الدین النسوی، ص ۳۲۲ تا ۳۲۹

④ تاریخ عثمانی از حقی اوزون: ۱/ ۹

دولتِ ایوبیہ کا سرحدی شہر اخلاط اپنے قبضے میں لے لیا جس کے باعث ۶۳۰ھ میں ایوبیوں اور سلاجقۂ روم کے مابین ایک طویل محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ پہلی جنگ میں ایوبیوں کو پسپائی ہوئی۔ دوسری میں رُہا، حران اور رقہ ان کے ہاتھ سے نکل گئے، تاہم تیسری جنگ میں انہوں نے سلجوقیوں سے یہ علاقے واپس لے لیے۔ آخر محرم ۶۳۴ھ میں عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے بیچ میں پڑ کر فریقین میں جنگ بندی کرائی۔ ①

اس دوران تاتاریوں کا خطرہ مزید بڑھ چکا تھا۔ کیقباد نے مقابلہ مشکل تصور کرتے ہوئے ان سے صلح کا معاہدہ کرنا چاہا۔ تاتاریوں نے جواب دیا کہ وہ اس کے لیے منگولیا جا کر دربارِ قراقرم میں حاضری دے، تبھی اسے سلطنتِ تاتار کا وفادار سمجھا جائے گا۔ اس جواب پر علاؤالدین کیقباد کو بڑی مایوسی ہوئی۔ آخر علاؤالدین کیقباد اپنی وفات سے کچھ دن پہلے ان کی باج گزاری قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس کے بعد شوال ۶۳۴ھ (۱۲۳۶ء) میں کیقباد کی وفات ہوگئی۔ ②

⑪ غیاث الدین کےخسرو ثانی

علاؤالدین کیقباد کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین کےخسرو ثانی تخت نشین ہوا جس کے دور میں تاتاریوں کے باقاعدہ حملے شروع ہوگئے۔ ۶۴۰ھ میں تاتاری سردار باجی نویان نے ارضِ روم پر حملہ کیا اور معمولی مزاحمت کا سامنا کرنے کے بعد اسے مسخر کر لیا۔ وہاں مردوں کا قتلِ عام کیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ غیاث الدین نے یہ خبر سن کر تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ تاتاریوں کے خلاف لشکر کشی کی۔ گیارہ محرم ۶۴۱ھ کو سیواس کے شمالی قصبے کوسوداغ میں گھمسان کا معرکہ ہوا جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی، سیواس پر تاتاریوں کا قبضہ ہوگیا اور غیاث الدین فرار ہوکر بازنطینی شہزادوں کے شہر ازنیق میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ آخر اس کے وزیر مہذب الدین نے باجی نویان کے ساتھ مذاکرات کیے اور سالانہ بھاری خراج دینا منظور کر کے اس آفت کو وقتی طور پر ٹالا۔ جب باجی نویان اپنے لشکر سمیت آذربائی جان واپس گیا تو سلاجقۂ روم پوری طرح تاتاریوں کے باج گزار بن چکے اور ان کی حیثیت علامتی حکمرانوں کی سی رہ گئی تھی۔ اس کمزوری میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب شہزادوں میں خانہ جنگی ہوئی اور رکن الدین قلیج ارسلان چہارم اور عزالدین کیکاؤس دوئم نے الگ الگ علاقوں پر قابض ہوکر اناطولیہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ③

سلاجقۂ روم کا دورِ زوال:

سلاجقۂ روم کو رُو بہ زوال دیکھ کر سلطنتِ روما بھی یہاں مداخلت کرنے لگی۔ ساتھ ہی ترکمان امراء کی بغاوتوں نے سلاجقۂ روم کی سلطنت کو مزید کمزور کر دیا۔ ایران پر قابض ایل خانی تاتاریوں کا تسلط رفتہ رفتہ ایشیائے کوچک پر بڑھتا گیا یہاں تک کہ اس ملک میں انہیں غالب اختیارات حاصل ہوگئے۔ انہوں نے سلجوقی بادشاہ سے وزیر کے تقرر کا اختیار بھی سلب کر لیا۔ مملکت کے کلیدی عہدے داروں کی تعیناتی ایل خانی حکمران خود کرنے لگے۔

① تاریخ عثمانی از حقی اوزون: ۱/ ۱۰ ؛ مرآۃ الزمان لابن الجوزی: سنۃ ۶۳۱ھ۔
② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۵۴ ؛ تاریخ عثمانی از حقی اوزون: ۱/ ۸۰۷ ؛ مرآۃ الزمان: سنۃ ۶۳۴ھ
③ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۵۳، ۵۴، ۵۵

سلاجقۂ روم کے پاس اب صرف قونیہ رہ گیا تھا جبکہ مختلف صوبوں کے امرا سلاجقۂ روم کی اطاعت سے بالکل آزاد ہو چکے تھے اور انہوں نے مرکز سے برائے نام اطاعت بھی ختم کر دیا تھا۔ ہر سال یہ امرا اپنے خزانوں سے ایک خطیر مالیت ایل خانی تاتاریوں کو ادا کرتے تھے تاکہ ان کی امارتیں برقرار رہ سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تاتاریوں کی جانب سے عوام پر بھی بھاری ٹیکس عائد تھے جن کی ادائیگی بہت مشکل تھی چنانچہ یہ خوشحال ملک تباہ حال ہو گیا۔

۶۹۴ھ میں غیاث الدین مسعود تاتاریوں سے نبرد آزما ہوا مگر اسے شکست فاش ہوئی۔ اسے ہمدان میں قید کر دیا گیا اور کچھ مدت کے لیے اناطولیہ میں کسی سلجوقی حکمران کی رسمی بادشاہت بھی نہ رہی۔ مغلوں نے ۶۹۵ھ (۱۲۹۶ء) میں اناطولیہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ایک رئیس مجیر الدین امیر شاہ کو اس علاقے کا نگران بنا دیا۔ ①

تاہم یہ صورتحال زیادہ عرصہ برقرار نہ رہی اور جب ایل خانیوں کے تخت پر غازان براجمان ہوا تو اس نے یہ دیکھ کر اناطولیہ کے لوگ سلجوقی خانوادے کے سوا کسی کی بادشاہت پر راضی نہیں، ۶۹۵ھ (۱۲۹۶ء) کے اواخر میں قونیہ کا تخت آلِ سلجوق کو واپس کرتے ہوئے وہاں عز الدین کیکاؤس ثانی کے پوتے علاؤ الدین کیقباد ثالث کو بٹھا دیا جس کی شادی غازان کی بھتیجی سے ہوئی تھی۔ مگر کیقباد ثالث اناطولیہ کو نہ سنبھال سکا اور وہاں ۶۹۷ھ میں غازان کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی۔ غازان کی فوجوں نے پہلے بغاوت کو کچلا ② اور پھر ۶۹۹ھ میں کیقباد کے خلاف فوج کشی کی۔ ③ وہ فرار ہو کر دیار بکر میں جا چھپا مگر آخر کار پکڑا گیا۔ غازان اسے قتل کرنا چاہتا تھا مگر پھر رحم کھا کر معزول کرنے پر اکتفا کیا۔

۷۰۱ھ (۱۳۰۲ء) میں اناطولیہ کا تاجِ شاہی ایک بار پھر غیاث الدین مسعود کے سر پر رکھ دیا گیا۔ سلاجقۂ روم کے اس آخری سلطان نے برائے نام بادشاہت کے ساتھ باقی زندگی ''قیصری'' میں گزاری، ۷۰۸ھ میں وہ پچاس سال کی عمر میں فالج کا شکار ہو کر وفات پا گیا اور ایل خانیوں نے اس کی جگہ کسی اور کا تقرر نہ کیا۔ اس کے فوراً بعد قرہ مانی نوابوں نے خود مختاری حاصل کر کے قونیہ پر قبضہ کر لیا اور یوں اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ④

سلاجقۂ روم کا حکومتی نظام

سلاجقۂ روم کا نظام حکومت ترکوں کی دیگر قدیم حکومتوں کی مانند تھا جس میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا۔ صوبے کو ''ایالت'' کہا جاتا تھا۔ ہر صوبہ مرکز کے ''ادارۂ ایالیات'' کے تحت ہوتا تھا۔ گورنر ''سوباشی'' کہلاتے تھے۔ ⑤

صاحبِ دیوان کے اختیارات:

بادشاہ کے بعد سب سے بڑا عہدہ ''صاحبِ دیوان'' کا ہوتا تھا جسے ''صاحبِ اعظم'' بھی کہا جاتا تھا۔ سلطنت کے

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۵۵، ۵۶
② تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۲۵، ۲۶؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/۷۳
③ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۳۳، ۳۴
④ تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۲۵، ۲۶؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/۷۳
⑤ تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۳۵

زیادہ تر امور کی دیکھ بھال وہی کرتا تھا۔اس کی حیثیت وہی تھی جو دولتِ عباسیہ میں ''وزیر'' کی۔

صاحبِ دیوان کے تحت درج ذیل شعبے کام کرتے تھے:

① ''دیوانِ طغرا'' (نشانجی):

یہ شاہی فرامین کے اجراء کا دفتر تھا۔شاہی فرامین کو''پروانہ'' کہا جاتا تھا۔

② ''دیوانِ استیفاء'':

اس سے مراد''شعبۂ محصولات'' تھا اور اس کے مسئول کو''مستوفی'' کہا جاتا تھا۔خزانے کی ساری آمدن اور تمام سرکاری اخراجات کا دار و مدار اسی دفتر کی کارکردگی پر تھا۔

③ ''دیوانِ مظالم'':

یہ محکمۂ انصاف کا نام تھا جس کے تحت عدالتیں قائم ہوتی تھیں اور قاضیوں کا تقرر ہوتا تھا۔فریادیوں کی درخواستیں سنی جاتی تھیں اور ان کی دادرسی کی جاتی تھی۔[1]

فوجی نظام:

فوجی امراء''اتابک'' (اتابیگ) کہلاتے تھے جو جنگ کے علاوہ بھی مختلف کلیدی خدمات انجام دیتے تھے۔

فوج کی دو قسمیں ہوتی تھیں: پیشہ ور۔رضا کار

پیشہ ور فوج گھڑ سواروں اور پیادوں کے الگ الگ دستوں پر مشتمل ہوتی تھی اور براہِ راست بادشاہ کی کمان میں رہا کرتی تھی۔اسے ہر تین ماہ بعد تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں۔

رضا کار فوج کی بھی دو قسمیں تھیں: ایک قسم وہ تھی جو مخصوص علاقوں میں رہا کرتی تھی۔دوسری قسم وہ تھی جو مخصوص امراء کی کمان میں ہوا کرتی تھی۔رضا کار فوج کو حسبِ ضرورت طلب کیا جاتا تھا۔

فوج کے انتظامات کا مرکز پایۂ تخت میں ہوتا تھا جسے''دیوانِ عرض'' کہا جاتا تھا۔[2]

بحریہ:

سلاجقۂ روم کے نظامِ حکومت میں بحری فوج کی بے حد اہمیت تھی۔ساحلی علاقوں کا ایک الگ نگران ہوتا تھا جسے''ملک السواحل'' کہا جاتا تھا۔بحری فوج اسی کے ماتحت ہوتی تھی۔نیز جہاز سازی کے کارخانوں کی نگرانی بھی وہی کرتا تھا جو مختلف ساحلی شہروں میں لگائے گئے تھے۔

بحری بیڑے کا امیر''رئیس البحر'' کہلاتا تھا اور وہ''ملک السواحل'' کی ہدایات کے تحت کام کرتا تھا۔[3]

بعد میں عثمانی سلاطین نے بھی بحری فوج کی ان خصوصیات کو برقرار رکھا جنہیں سلاجقۂ روم نے پروان چڑھایا تھا۔

---

① تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۳۶،۳۵/۱
② تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۳۷/۱
③ تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۳۷،۳۶/۱

سلاجقۂ روم کی کچھ دینی وثقافتی شخصیات:

سلاجقۂ روم نے دینی، علمی وادبی روایات کو پروان چڑھایا۔ اس دور میں تصوف کا خاص طور پر عروج ہوا۔ اناطولیہ میں بڑے بڑے صوفیاء، شعراء اور ادباء ظاہر ہوئے، چند مشہور ترین ہستیاں یہ تھیں:

مولانا جلال الدین رومی: ۶۰۴ھ تا ۶۷۲ھ (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء) مولانا جلال الدین رومی بڑے جید عالم اور اعلیٰ پائے کے فارسی شاعر تھے۔ خواجہ شمس تبریز سے فیض پایا اور تصوف کی دنیا کے بادشاہ ہوئے۔ ان کے منظوم کلام ''مثنوی معنوی'' نے تصوف، اخلاق اور روحانی اقدار کی تعلیم کے حوالے سے بے نظیر شہرت حاصل کی ہے۔

حاجی بکتاش ولی: ۶۰۵ھ تا ۶۶۹ھ (۱۲۰۹ء تا ۱۲۷۱ء) حاجی بکتاش کا حلقہ ''سلسلۂ شعبیہ'' کہلاتا تھا۔ اناطولیہ میں اس سے وابستہ لوگ بے شمار تھے۔

سلطان ولد: ۶۲۳ھ تا ۷۱۲ھ (۱۲۲۶ء تا ۱۳۱۲ء) سلطان ولد ایک نامور صوفی تھے۔ اناطولیہ میں ان کا سلسلہ بہت پھیلا جسے ''سلسلۂ مولویہ'' کہا جاتا تھا۔

یونس امرہ: ۶۳۷ھ تا ۷۲۰ھ (۱۲۴۰ء تا ۱۳۲۰ء) یونس امرہ ایک صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ترکی زبان کے سحر البیان شاعر بھی تھے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے بڑے خوبصورت اسلوب میں تصوف کی تعلیم دیتے تھے۔

احمدی: ۷۳۴ھ تا ۸۳۶ھ (۱۳۳۴ء تا ۱۴۳۳ء) احمدی غزل اور مثنوی کی صنف کے شاعر تھے۔ ترکوں کی روایتی شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔[1]

خواجہ نصر الدین: ۶۰۴ھ تا ۶۸۳ھ (۱۲۰۸ء تا ۱۲۸۴ء) اپنے لطائف وظرائف سے دنیا کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دینے والی یہ شخصیت بھی سلاجقۂ روم کے دور سے منسوب کی جاتی ہے۔

خواجہ کی ولادت شہر ''سیورے حصار'' میں ہوئی۔ آق شہر اور قونیہ میں تعلیم حاصل کی۔ ایک مسجد میں امام اور پھر مدرس مقرر ہوئے۔ وعظ وخطابت میں خوب شہرت پائی۔ قونیہ کے نواح میں ایک مدت تک منصبِ قضا پر بھی فائز رہے۔ ۶۸۳ھ میں وفات ہوئی۔ عمر ساٹھ برس کے قریب تھی۔ وہ نہایت ذہین اور عقل مند انسان تھے۔ ان کے واقعات میں بلند پایہ ادبی لطافت ہے۔ اس میں گھٹیا پن کا نام ونشان تک نہیں۔ تاہم ہر شخص ان کے واقعات کو اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بچے انہیں ایک ایسا ظریف بوڑھا تصور کر کے جو لاٹھی لیے اپنے گدھے کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے، خوش ہوتے ہیں۔ جاہل لوگ انہیں ایک بے وقوف اور پاگل آدمی خیال کرتے ہیں جبکہ اہلِ دانش کو ان کے طنز ومزاح کے پیچھے حکمت اور اخلاقی تعلیم کا جلوہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔[2]

---

① تاریخ عثمانی از یلماز: ۱/۷۷، ۷۸ ② مجلۃ الرسالۃ: جولائی ۱۹۵۲ء، مقال استاذ عطاء اللہ ترزی باشی

اگرچہ ایک قول کے مطابق خواجہ کا تعلق عثمانی سلاطین کے دور سے تھا کیونکہ اس کی تیمور لنگ سے ملاقات کے قصے بھی مشہور ہیں مگر عین ممکن ہے کہ یہ قصے الحاقی ہوں۔ یاد رہے کہ خواجہ نصر الدین کو ''جحا'' بھی کہا جاتا ہے مگر یہ وہ ''جحا'' نہیں جس کے عربی لطائف مشہور ہیں۔ دونوں میں فرق کے لیے خواجہ کو ''جحا الرومی'' اور عرب مسخرے کو ''جحا الکوفی'' کہا جاتا ہے جو لگ بھگ ۱۳۰ھ میں فوت ہوا تھا۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ دونوں فرضی کردار ہیں۔

سلاجقۂ روم کی سلطنت ۲۲۸ سال تک چلی۔ اس میں درج ذیل حکمران گزرے:

نمبر	حکمران	دور	خاص بات
۱	سلیمان بن قتلمش بن سلجوق	۴۶۹ھ تا ۴۷۹ھ (۱۰۷۷ تا ۱۰۸۶)	بانی سلطنت
	سلاجقۂ خراسان نے اناطولیہ کو اپنے ماتحت کرلیا	۴۷۹ھ تا ۴۸۵ھ (۱۰۸۶ء تا ۱۰۹۲ء)	الپ ارسلان نے نیقیہ میں الگ نائب مقرر کردیا۔ سلاجقۂ روم معطل
۲	قلیچ ارسلان اوّل (داؤد بن سلیمان)	۴۸۵ھ تا ۵۰۰ھ (۱۰۹۲ء تا ۱۱۰۷ء)	ازسرِ نو حکومت بنائی۔ پہلی صلیبی جنگ
	کوئی حکمران نہ تھا۔ افراتفری	۵۰۰ھ تا ۵۰۲ھ (۱۱۰۷ء تا ۱۱۰۹ء)	
۳	ملک شاہ بن قلیچ ارسلان اوّل	۵۰۲ھ تا ۵۱۰ھ (۱۱۰۹ء تا ۱۰۱۶ء)	ملطیہ کو مرکز بنا کر حکومت شروع کی
۴	رکن الدین مسعود بن قلیچ ارسلان	۵۱۰ھ تا ۵۵۱ھ (۱۱۱۶ء تا ۱۱۵۶ء)	قونیہ کو مرکز بنایا۔ طویل ترین دور
۵	قلیچ ارسلان ثانی بن مسعود	۵۵۱ھ تا ۵۸۸ھ (۱۱۵۶ء تا ۱۱۹۲ء)	طویل دور۔ تیسری صلیبی جنگ میں جرمنوں کی یلغار کا سامنا کیا۔ سلطنت بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔
۶	غیاث الدین کے خسرو اوّل بن قلیچ ارسلان ثانی	۵۸۸ھ تا ۵۹۲ھ (۱۱۹۲ء تا ۱۱۹۶ء)	
۷	سلیمان شاہ ثانی بن قلیچ ارسلان ثانی	۵۹۲ھ تا ۶۰۰ھ (۱۲۹۶ء تا ۱۳۰۴ء)	
۸	قلیچ ارسلان ثالث بن سلیمان شاہ	۶۰۰ھ تا ۶۰۱ھ (۱۲۰۴ء تا ۱۲۰۵ء)	
۹	غیاث الدین کے خسرو اوّل۔ دوبارہ	۶۰۱ھ تا ۶۰۸ھ (۱۲۰۵ء تا ۱۲۱۱ء)	منقسم سلطنت کو دوبارہ متحد کردیا
۱۰	عزالدین کیکاؤس اوّل بن کے خسرو	۶۰۸ھ تا ۶۱۶ھ (۱۲۱۱ء تا ۱۲۱۹ء)	
۱۱	علاؤالدین کیقباد اوّل بن کے خسرو	۶۱۶ھ ۶۳۴ (۱۲۱۹ء تا ۱۲۳۷ء)	حکومت کا عروج
۱۲	غیاث الدین کے خسرو ثانی بن کیقباد	۶۳۴ھ تا ۶۴۴ھ (۱۲۳۷ء تا ۱۲۴۶ء)	تاتاریوں سے شکست
۱۳	عزالدین کیکاؤس ثانی بن کے خسرو ثانی	۶۴۴ھ تا ۶۴۶ھ (۱۲۴۶ء تا ۱۲۴۸ء)	
۱۴	عزالدین کیکاؤس ثانی بن کے خسرو ثانی مع: قلیچ ارسلان چہارم بن کے خسرو ثانی	۶۴۶ھ تا ۶۴۸ھ (۱۲۴۸ء تا ۱۲۴۹ء)	دونوں بھائی مل کر حکومت کرتے رہے

۱۵	عزالدین کیکاؤس ثانی بن کے خسرو ثانی مع: قلیج ارسلان چہارم بن کے خسرو ثانی مع: کیقباد ثانی بن کے خسرو ثانی	۶۴۸ھ تا ۶۵۶ھ (۱۲۴۹ء تا ۱۲۵۷ء)	تینوں بھائی مل کر حکومت کرتے رہے
۱۶	قلیج ارسلان چہارم بن کے خسرو ثانی مع: کیقباد ثانی بن کے خسرو ثانی	۶۵۶ھ تا ۶۵۸ھ (۱۲۵۷ء تا ۱۲۵۹ء)	دونوں مل کر حکومت کرتے رہے
۱۷	قلیج ارسلان چہارم بن کے خسرو ثانی	۶۵۸ھ تا ۶۶۴ھ (۱۱۲۵۹ء تا ۱۲۶۵ء)	
۱۸	کے خسرو ثالث بن قلیج ارسلان چہارم	۶۶۳ھ تا ۶۸۱ھ (۱۲۶۵ء، ۱۲۸۲ء)	دو سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا
۱۹	غیاث الدین مسعود ثانی بن کیکاؤس ثانی	۶۸۱ھ تا ۶۸۳ھ (۱۲۸۲ء تا ۱۲۸۴ء)	
۲۰	کیقباد ثالث بن فرامرز بن کیکاؤس ثانی	۶۸۳ھ (۱۲۸۴ء)	
۲۱	غیاث الدین مسعود ثانی۔ دوسری بار	۶۸۳ھ تا ۶۹۵ھ (۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۶ء)	
	مجیرالدین امیر شاہ۔ مغلوں کی طرف سے اناطولیہ کا نائب	۶۹۵ھ (۱۲۹۶ء)	سلاجقۂ روم معطل۔ مغلوں کی حکومت
۲۲	کیقباد ثالث۔ دوسری بار	۶۹۵ھ تا ۷۰۰ھ (۱۲۹۶ء تا ۱۳۰۱ء)	
۲۳	غیاث الدین مسعود ثانی۔ تیسری بار	۷۰۱ھ تا ۷۰۷ھ (۱۳۰۲ء تا ۱۳۰۷ء)	آخری حکمران

عثمانیوں کے اجداد کی اناطولیہ آمد

عثمانی ترکوں کے آباء واجداد کون تھے؟ اور وہ کب اور کن حالات میں اناطولیہ آئے؟ یہ سوالات بڑی تحقیق کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس پر مؤرخین متفق ہیں کہ یہ تُرکمان قبیلہ تھا جو وسطِ ایشیا میں بسنے والے تُرکانِ غُز کی ایک شاخ ''قائی'' سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا اصل وطن ''مرو'' تھا۔[1]

۶۲۱ھ میں ''قائی'' کے سردار سلیمان شاہ نے قبیلے کو لے کر ہجرت کی اور آرمینیا پہنچ گیا۔[2] پھر اس نے اناطولیہ کا رُخ کیا[3] اور اس کے جنوب مشرقی ضلعے ''اخلاط'' میں آباد ہوگیا۔[4] ۶۲۸ھ میں سلیمان شاہ کے قبیلے نے ایک بار

---

① التاریخ الاسلامی: ۸ ص ۵۹ ...... عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قبائل غیر مسلم تھے اور انہوں نے ایشیائے کوچک میں رہائش کے بعد اسلام قبول کیا تھا مگر یہ ایک کمزور خیال ہے۔ تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دور میں یہ لوگ ترکستان سے ہجرت کر کے آئے تھے، اس سے بہت پہلے وہاں اسلام عام ہو چکا تھا۔ خود قبیلے کے بانی کا نام ''سلیمان'' اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ مسلمان تھے، کیوں کہ غیر مسلم ترک ایسے نام نہیں رکھتے تھے۔

② تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۳۲...... قدیم مآخذ اس کی وضاحت نہیں کرتے کہ یہ لوگ اناطولیہ میں کب اور کیوں وارد ہوئے تھے؟ عثمانیوں کے دورِ سلطنت میں تحریر کردہ بعض کتب اس پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں مگر بہت مختصر الفاظ میں۔ مشہور روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ عالم اسلام پر تاتاریوں کے حملے کے وقت وسطِ ایشیا سے فرار ہو کر اناطولیہ پہنچے تھے۔ مگر گزشتہ ایک صدی میں ترکی کے متعدد محققین نے عثمانیوں کی تاریخ کو کھنگال کر بہت سے تاریخی توہمات کی نفی کی ہے۔ ان کے مطابق عثمانیوں کا ساتویں صدی ہجری میں ترکستان سے ہجرت کرنا بھی ایک تاریخی افسانہ ہے جس کا قدیم مآخذ میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ان محققین کا خیال ہے کہ یہ قبیلہ پانچویں صدی ہجری میں سلجوقی افواج کے ساتھ نقل مکانی کر کے ایران میں بس چکا تھا اور ساتویں صدی ہجری میں اس قبیلے نے ترکستان سے نہیں، ایران سے ہجرت کی تھی۔ (تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/۱۱۸)

یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ یہ نقل مکانی کتنے افراد نے کی تھی؟ ایک قول کے مطابق سلیمان شاہ کے ساتھ پچاس ہزار گھرانے تھے۔ (نصرۃ اہل الایمان بدولۃ آل عثمان، ص ۵۱) مگر یہ قول بعید معلوم ہوتا ہے کیوں کہ پچاس ہزار گھرانوں کا مطلب لگ بھگ تین چار لاکھ مرد وزن ہے جن میں لڑنے والے کم از کم ایک لاکھ ضرور ہوتے۔ اتنی بڑی قوت تو تنہا پورے اناطولیہ پر قابض ہو سکتی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ (سلیمان شاہ کے قبیلے کے دو حصوں میں بٹ جانے کے بعد ایک حصے کے سردار) ارطغرل کے ساتھ تین سو چالیس افراد تھے۔ (سمط النجوم العوالی: ۳/۷۰) یعنی ہجرت کرنے والے دونوں حصوں میں ایک ہزار کے لگ بھگ افراد ہوں گے۔ محقق یلماز نے غور وفکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تقریباً چار سو گھرانے تھے جن کے افراد زیادہ سے زیادہ چار ہزار تھے۔ (تاریخ الدولۃ العثمانیۃ: ۱/۸۸)

③ نزھۃ الانظار: ۲/۶

④ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/۵۹ ...... بعض محققین کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ لوگ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی فوج میں شامل ہو کر آرمینیا اور مشرقی اناطولیہ پہنچے تھے۔ (تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/۱۱۸، حاشیہ نمبر ۷) یہ خیال قوی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ سلیمان شاہ کی اناطولیہ نقل مکانی کا سال ۶۲۱ھ بتایا جاتا ہے۔ (تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۳۲) یہی سال تھا جب سلطان جلال الدین نے ہندوستان سے آکر ایران میں حکومت قائم کی تھی۔ اگلے برس سلطان نے آذربائی جان کو فتح کر کے سلاجقۂ روم سے اتحاد کر لیا تھا۔ سلطان کے لشکر میں ترکستان سے ہجرت کرنے والے ترکمانوں کی بہت بڑی تعداد تھی جن کے ساتھ سلطان نے کئی برس تک آرمینیا اور گرجستان کے نصرانیوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور یہی لوگ آخر تک سلطان کے وفادار رہے تھے۔ عجب نہیں کہ انہی میں قبیلہ قائی کے جوان بھی ہوں اور ان مہمات کے دوران انہوں نے اخلاط کے گرد ونواح کو اپنا مسکن بنا لیا ہو۔ سلیمان شاہ کا مسکن ''ماہان'' بتایا جاتا ہے اور ماہان نامی علاقہ اب بھی مشرقی اناطولیہ میں موجود ہے۔ (تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/۱۱۸، ۱۱۹ حاشیہ نمبر ۷) سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے بھی ماہان میں قیام کیا تھا اور یہاں کے ترکمانوں نے سلطان کی بہت مدد کی تھی۔ (سیرت سلطان جلال الدین از نسوی، ص ۳۵۶، ۳۶۱)

پھر نقل مکانی کی اور جنوب مغرب کا رُخ کیا۔ ①

سفر کے دوران حلب کے قریب دریائے فرات عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر جاں بحق ہوگیا۔ اسے دریا کے کنارے قلعۂ جعبر (جعبر) کے سامنے دفن کر دیا گیا۔ یہ جگہ آج بھی 'ترک مزار' کہلاتی ہے۔ ②

سلیمان شاہ کی وفات کے بعد قافلے میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا۔ اکثریت سفر جاری رکھنے پر مصر تھی جبکہ کچھ لوگ واپسی چاہتے تھے۔ سلیمان شاہ کے چار بیٹے تھے۔ دو بیٹوں: ''سنقر'' اور ''دوندار'' نے قبیلے کی اکثریت کے ساتھ مشرق کی طرف کوچ کر دیا۔ جب کہ دو بیٹے: ''ارطغرل'' اور ''کون دغدی'' لگ بھگ چار سو گھرانوں کے ساتھ ایشیائے کوچک کے شمال مغربی اضلاع کی طرف روانہ ہوگئے۔ ارطغرل کی عمر اس وقت لگ بھگ ۳۹ سال تھی۔ اس نے اپنے قبیلے کو لے کر کچھ عرصہ مختلف زرخیز وادیوں میں گزارا۔ ③

---

① التاریخ الاسلامی: ۸/۵۹ ؛ تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/ ۸۳، ۸۵......

تنبیہات مفیدہ:

(۱) ترکی تلفظ میں عموماً ''غ'' ساکت ہوتا ہے، اس لیے اَرطغرل کو ''اَرطُرل'' پڑھا جاتا ہے۔

(۲) مشہور یہ ہے کہ یہ نقل مکانی اناطولیہ سے ترکستان کی جانب تھی مگر مؤرخین یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اگر یہ لوگ ترکستان جا رہے تھے تو کیوں؟ بعض مؤرخین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس وقت تاتاری یلغار رک چکی تھی اس لیے یہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ (التاریخ الاسلامی از شاکر: ۸/ص ۵۹) مگر یہ بات بالکل غلط ہے کیوں کہ اس وقت بھی ترکستان پر تاتاریوں کا قبضہ تھا اور وہاں قتل عام سے بچ جانے والے مسلمان بہت تنگی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس لیے وہاں رہنا کسی کے لیے محفوظ نہیں ہوسکتا تھا۔ نیز ۶۲۸ھ میں تو تاتاری یلغار ایک بار پھر شروع ہوچکی تھی اور وہ لوگ بڑی سرگرمی سے سلطان جلال الدین کو تلاش کر رہے تھے۔ حقی اوزون نے لکھا ہے کہ تاتاری سردار جرماغون (جو سلطان جلال الدین کے تعاقب کے لیے آیا تھا) ۶۲۹ھ (۱۲۳۱ء) میں اناطولیہ کے مشرقی علاقوں: ارزنجان اور سیواس تک تاخت وتاراج کر کے واپس گیا تھا۔ (تاریخ عثمانی از حقی اوزون: ۱/۹) ایسے میں کسی قافلے کا ترکستان جانا موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔

اسی لیے محقق یلماز نے غالب احتمال یہی نقل کیا ہے کہ مشرقی اناطولیہ پر تاتاریوں کا حملہ اس کی نقل مکانی کی وجہ بنا۔ (تاریخ الدولة العثمانیه : ۱/ ۸۳)

پھر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ سلیمان شاہ نے جس راستے پر سفر کیا تھا، وہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ شام جا رہے تھے۔ اس کی قرینِ قیاس وجہ نئی چراگاہوں کی تلاش ہوسکتی ہے اور اکثر و بیشتر خانہ بدوش قبائل کی نقل مکانی کا سبب یہی مسئلہ رہا ہے۔ مگر چراگاہوں کی تلاش میں شام کو ترجیح کیوں دی گئی؟ اس کی وجہ یہ سمجھ آتی ہے کہ سلیمان شاہ نے سلطان جلال الدین کی گمشدگی یا شہادت کی خبر سننے کے بعد مشرقی اناطولیہ کو بالکل غیر محفوظ تصور کر کے تاتاریوں کے خطرے کے پیش نظر وہاں سے نکل کر شام میں جا بسنا محفوظ تصور کیا ہوگا۔ تاہم آگے چل کر قبیلے میں اختلاف ہوگیا جس کی وجہ تاریخ میں مذکور نہیں مگر قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبیلے کے ایک طبقے کو یہ اُمید ہوگئی تھی کہ علاؤ الدین کیقباد انہیں اپنے ہاں جگہ فراہم کر دے گا کیوں کہ سلطان جلال الدین کی گمشدگی کے بعد اس کے بہت سے سپاہیوں کو علاؤ الدین کیقباد نے اپنی فوج میں شامل کر لیا تھا۔ (تاریخ ابن خلدون: ۵/ ۱۶۷) اور انہیں اناطولیہ کے مشرقی علاقوں میں سکونت دے دی تھی۔ (تاریخ عثمانی از حقی اوزون: ۱/۹) عین ممکن ہے کہ ارطغرل نے یہ معلوم ہونے پر وسطی اناطولیہ جانا پسند کیا ہو۔

② ترکوں کی تاریخ لکھنے والے اکثر مؤرخین نے ارطغرل کے والد کا نام سلیمان شاہ ہی لکھا ہے اور اس کے ڈوبنے کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے تاہم بعض جدید محققین کی تحقیق کے مطابق ارطغرل کے والد کا نام ''گوندوز الپ'' تھا۔ (تاریخ عثمانی از اسماعیل حقی اوزون: ۱/ ۱۲۰، ۱۲۱، حاشیہ)

یلماز نے ارطغرل کا نسب یوں بیان کیا ہے: ارطغرل بن گندوز الپ بن قایا الپ بن کوک الپ بن صارقوق الپ بن قایی الپ۔ مگر ساتھ ہی مصنف نے کہا ہے کہ یہ ایک فرضی نسب نامہ ہے۔ (تاریخ الدولة العثمانیه : ۱/ ۸۳)

③ تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز: ۱/ ۸۵،۸۶ ؛ نصرة اهل الایمان بدولة آل عثمان از شیخ بکری، ص ۵۱، ۵۲ ؛ سمط النجوم العوالی: ۲/ ۳۱۲ تا ۳۲۲

اَرطغرل

۶۲۹ھ تا ۶۸۰ھ

(۱۲۳۲ء تا ۱۲۸۱ء)

اُرطغرل اناطولیہ پہنچا اور اپنے بیٹے ''ساؤجی'' کو سلجوقی حکمران سلطان علاؤالدین کیقباد کے پاس اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ ان کے قبیلے کو ''قونیہ'' کی تحصیل ''قرامان'' میں سکونت کی اجازت دی جائے مگر ''ساؤجی'' راستے میں فوت ہو گیا۔ کچھ مدت بعد یہ قبیلہ شمال مغربی صوبوں کی طرف کوچ کر گیا۔ ① اس دوران ایک مقام پر اچانک دو لشکر برسرِ پیکار دکھائی دیے: ایک طرف بازنطینی رومی تھے اور دوسری طرف مسلمان۔ رومیوں کا پلہ بھاری تھا اور مسلمان پسپا ہونے کو تھے۔ ایسے میں ارطغرل نے فوری طور پر مسلمانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے جانبازوں سمیت جنگ میں کود گیا۔ اس کی شجاعت نے رومیوں کو ہراساں کر دیا جبکہ مسلمانوں کی ہمت دوبارہ بندھ گئی۔ آخر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور رومی بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ②

اسماعیل حقی اوزون نے عثمانی تاریخ کے قدیم نوشتوں کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ ۶۲۹ھ کا ہے اور یہ لڑائی ریاست ''ازنیق'' کے بازنطینی نصرانیوں سے ہو رہی تھی کیوں کہ انہوں نے سرحدی حدود کی خلاف ورزی کی تھی۔ ③

---

① تاریخ میں اس سفر کی وجہ مذکور نہیں ملی مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارطغرل سلجوقی سلطان سے ملنا ضروری سمجھتا تھا، جب بیٹے کی سفارت لاحاصل رہی تو اس نے یہ معلوم کر کے کہ سلطان شمال مغرب کی مہم میں مصروف ہے، وہیں جا کر سلطان سے ملنے کا عزم کیا۔ تقدیر کی بات کہ یہ ملاقات عین میدانِ جنگ میں ہوئی۔

② نزھۃ الانظار: ۲/۷؛ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/۶۰ ③ تاریخ عثمانی: ۱/۱۲۲

بعض غلط روایات پر تبصرہ:

(۱) مشہور ہے کہ ارطغرل نے جب میدانِ جنگ میں دو فوجوں کو لڑتے دیکھا تو اس نے اپنی شجاعت دکھانے کے لیے کمزور فریق کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور جب جنگ کا ہنگامہ تھما تب اسے معلوم ہوا کہ اس نے جس جماعت کا ساتھ دیا ہے وہ سلاجقۂ روم کی فوج ہے۔ یہ روایت قابلِ قبول نہیں کیوں کہ: ❶ اس دور کی تواریخ میں ایسی کوئی روایت کہیں مذکور نہیں۔ ❷ کوئی کم عقل لیڈر ہی ایسا کر سکتا ہے کہ بغیر دیکھے بھالے کسی کے لیے اپنے قبیلے کی جان خطرے میں ڈال دے۔ ارطغرل کی پوری زندگی گواہ ہے کہ وہ نہایت ہوشیار اور عقل مند انسان تھا۔ ❸ ان سرحدوں پر مسلمانوں اور کفار کی لڑائیاں عموماً ہوتی رہتی تھیں، اس لیے کوئی سپاہی ایک نظر میں پہچان سکتا تھا کہ یہ کس قسم کی جنگ ہو رہی ہے۔ ❹ جنگیں ہمیشہ پرچموں اور واضح نشانات کے ساتھ لڑی جاتی تھیں۔ سلاجقۂ روم سرخ ہلالی پرچموں کے ساتھ جہاد کیا کرتے تھے۔ ارطغرل اور اس کا قبیلہ کئی سال سلاجقۂ روم کے علاقے میں گزار چکے تھے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ یہ لوگ اس ملک کی فوج کو نہ پہچان پاتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ انہوں نے اس ملک کے دفاع کے لیے اس جنگ میں شرکت کی تھی جس کے مشرق میں وہ پہلے رہتے تھے اور جس کے مغرب میں بسنے وہ اب آ رہے تھے۔

(۲) مشہور ہے کہ یہ جنگ تاتاریوں اور سلجوقیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ متعدد مؤرخین نے اسے نقل کیا ہے مگر گزشتہ صدی میں عثمانی ترکوں کی تاریخ پر ہونے والے تحقیقی کام کے نتیجے میں یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ لڑائی بازنطینی رومیوں اور سلجوقیوں کے درمیان تھی۔ (بقیہ اگلے صفحے کے حاشیہ پر)

ارطغرل سلجوقی جاگیردار کی حیثیت سے:

سلجوقی حکمران علاؤالدین کیقباد نے ارطغرل کی طرف سے ناگہانی امداد مل جانے پر بڑی مسرت کا اظہار کیا، اس کی عزت افزائی کی اور اس کے قبیلے کو اعزاز کے طور پر ''مقدمۃ السلطان'' کا نام دیا۔ ارطغرل نے کچھ ہی مدت میں ''قرچہ حصار'' اور ''سکوت'' پر یلغار کر کے انہیں سلجوقی عمل داری میں شامل کر دیا۔ نیز ''بلیجک'' کے حاکم کو سرنگوں کر کے خراج کی ادائیگی پر مجبور کر دیا۔ ان کارناموں پر سلطان علاؤالدین نے اسے ''سکوت'' کا جاگیردار بنا دیا جہاں اناطولیہ کی بازنطینی ریاستوں کے حملوں کا خطرہ رہتا تھا۔ مؤرخ قرمانی کے بیان کے مطابق یہ جگہ ''طومانچ'' اور ''ارمناک'' کے پہاڑوں کے درمیان واقع تھی جہاں ارطغرل اپنے قبیلے کے چار سو گھرانوں کے ساتھ جا کر آباد ہوا۔ اس جاگیر کی وسعت تقریباً دو ہزار مربع کلومیٹر تھی۔ ۶۳۴ھ (۱۲۳۷ء) میں کیقباد اول کی وفات ہوگئی۔ اس کے جانشین کے خسرو ثانی کے دور سے اس سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ ۶۳۶ھ (۱۲۳۹ء) میں کے خسرو ثانی کے خلاف بغاوت ہوئی جس کی وجہ سے کریمیا ہاتھ سے نکل گیا، تین سال کے اندر اندر حکومتی انتظامات ابتر ہوگئے، ریاست کمزور ہوگئی اور فوج منتشر۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ سرحدوں پر تاتاریوں کے حملے شروع ہوگئے۔ ان کے مقابلے میں پے در پے شکستیں کھا کر ۶۴۱ھ میں کے خسرو ثانی نے انہیں خراج دینا منظور کر لیا۔ تاہم سلطنتِ قونیہ کے تاتاریوں کے باج گزار بننے سے ارطغرل پر کوئی اثر نہ پڑا، اس لیے وہ جس صوبے کا جاگیردار تھا وہ تاتاریوں کی زد سے خاصا دور تھا۔

۶۴۴ھ (۱۲۴۶ء) میں کے خسرو ثانی کا انتقال ہوگیا۔ اس کی سلطنت کے کئی حصوں پر مغلوں کے ماتحت کٹھ پتلی حکام مسلط ہوگئے۔ یوں سلجوقیوں کی حکومت مزید سمٹ گئی تاہم اس دوران ارطغرل برابر اپنے عہدے پر رہا۔ اس نے نہ صرف اپنی سرحدوں کی بخوبی حفاظت کی بلکہ گردونواح کے کئی علاقے بھی فتح کر لیے۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)......اگرچہ بعض روایات میں یہ بھی منقول ہے کہ یہ جنگ سلاجقۂ روم اور سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے درمیان لڑی گئی تھی مگر یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جو مستشرقین نے قیاس در قیاس کر کے پھیلائی ہے۔ تاریخ کے متون میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ تاریخی شواہد ان دو جنگوں کو ایک ماننے کی نفی کرتے ہیں۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ ارطغرل کے والد سلیمان شاہ کی وفات ۶۲۸ھ میں ہوئی اور ارطغرل اس کے بعد سلاجقۂ روم کی حمایت میں لڑا تھا۔ دوسری طرف یاسی چمن کا معرکہ رمضان ۶۲۷ھ میں (یعنی ایک سال پہلے) لڑا جا چکا تھا۔ پس سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ارطغرل کو اس میں شریک سمجھا جائے اور اسی کو سلاجقۂ روم اور ترکانِ عثمان میں تعلق کی پہلی کڑی مانا جائے۔

یاد رہے کہ سلاجقۂ روم اور سلطان جلال الدین کے درمیان یاسی چمن کے مقام پر برپا ہونے والے معرکے کا تذکرہ پوری تفصیل کے ساتھ کتب تاریخ میں محفوظ ہے جن میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ کسی گروہ نے اچانک آکر سلاجقۂ روم کی مدد کی ہو۔ اس جنگ کی روداد میں وضاحت سے لکھا ہے کہ سلاجقۂ روم نے شام کی افواج کو ساتھ ملا کر سلطان جلال الدین کا سامنا کیا تھا اور ان کی متحدہ افواج کی تعداد سلطان جلال الدین کے لشکر سے زیادہ تھی۔ متحدہ افواج کا پلہ ابتداء سے بھاری رہا اور سلطان جلال الدین کی بیماری کے سبب خوارزمی سپاہی جم کر نہ لڑ سکے اور جلد پسپا ہوگئے۔ (: سلجوق نامہ از ابن بی بی، ص ۱۵۶ تا ۱۶۶؛ سیرۃ جلال الدین منکوبرتی، ص ۳۱۵ تا ۳۳۲؛ ابن خلدون: ۵/ ۱۳۵ تا ۱۳۸) اس کے برخلاف ارطغرل نے جس فوج کی مدد کی وہ تعداد میں کم اور شکست کھانے کے قریب تھی۔ پس ان دونوں جنگوں کی آپس میں کوئی مشابہت نہیں۔ یاسی چمن کی جنگ الگ تھی جس میں سلطان جلال الدین اور سلجوقی وشامی حکام باہم مقابل تھے اور یہ جنگ الگ تھی جس میں ارطغرل نے رومیوں کے مقابلے میں سلاجقۂ روم کا ساتھ دیا تھا۔

[1] اخبار الدول وآثار الاول از قرمانی: ۳/ ۶،۷؛ الدولۃ العثمانیہ فی التاریخ الحدیث از اسماعیل یاغی، ص ۸ تا ۱۴؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۸۵ تا ۸۷؛ تاریخ سلاطین بنی عثمان از یوسف بیگ آصاف، ص ۳۰ تا ۳۵

دولتِ عثمانیہ کی ترقی میں اسلامی تنظیموں کا کردار:

اس زمانے میں ایشیائے کوچک میں بعض تنظیمیں احیائے اسلام اور جذبۂ جہاد اجاگر کرنے کا کام کر رہی تھیں۔ اگرچہ یہ تنظیمیں بہت زیادہ منظم نہ تھیں مگر عوام پر ان کے اثرات بہت گہرے تھے۔ دولتِ عثمانیہ کی تاسیس سے پہلے ہی یہ تنظیمیں شمال مغربی ایشیائے کوچک میں سرگرم تھیں۔ خوش قسمتی سے عثمانیوں کی حکومت کی بنیاد اسی علاقے میں پڑی اور انہیں یہاں جہاد کے لیے تازہ خون مسلسل میسر آتا رہا۔

ان میں سے ایک تنظیم ''غزاۃ'' کے نام سے مشہور تھی۔ یہ واضح نہیں کہ اس کی تشکیل کب ہوئی تھی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ علاقے اکثر بازنطینیوں کی زد میں رہتے تھے اور ان کی تاخت وتاراج سے مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں اور دیہات اکثر متاثر ہوتے رہتے تھے، نیز یہاں چوری ڈاکے کی وارداتیں بھی عام تھیں، اس لیے مقامی مسلمان سرکاری افواج یا پولیس کے رحم وکرم پر رہنے کی بجائے اپنا ضروری دفاع خود کرنے کے لیے اس قسم کے انتظامات پر مجبور ہوئے۔

غازی ایک مخصوص لباس پہنتے تھے جس میں سر پر سفید ٹوپی لازمی تھی۔ اسی طرح ایک تنظیم ''فُتُوَّۃ'' کے نام سے بھی کام کرتی تھی۔ سب سے مشہور تنظیم ''الاَخِیَۃ'' تھی جس میں زیادہ تر مزدور، کاریگر اور کسان شامل تھے۔ اس کی شاخیں بستی بستی میں تھیں اور ہر شاخ کے نگران کو ''اَخی'' کہا جاتا تھا۔ ان تنظیموں کے اہم ترین اہداف یہ تھے:

نوجوانوں کو امورِ حرب وضرب کی تربیت دینا، ان کی دینی راہنمائی کرنا، لوگوں کو ظالموں کے ظلم وستم سے بچانا اور انصاف دلوانا، چوروں اور رہزنوں کی بیخ کنی کرنا اور نوجوانوں کو جہاد کے لیے تیار رکھنا

علماء، صوفیاء اور مشائخ ان سب تنظیموں کی سرپرستی کرتے تھے اور انہیں ہمت وحوصلہ دلاتے رہتے تھے۔[1]

اناطولیہ میں ترکمانوں کی زندگی پر ایک نظر:

ارطغرل کے ساتھ آئے ہوئے جنگجو ترکمان رومیوں کے خلاف سلجوقی سلطنت کے ہراول دستے کا کردار ادا کرنے لگے۔ وہ اناطولیہ کے بڑے شہروں میں آباد ان تُرکوں سے کہیں زیادہ فعال تھے جو عرب اور ایرانی تہذیب وثقافت سے متاثر ہو چکے تھے۔ یہ تُرکمان بہترین مجاہد تھے۔ جہاد اور جنگ کے شیدائی تھے۔ اناطولیہ کے مشائخ اور درویش ان ترکمانوں کی دینی تربیت کی ذمہ داری انجام دینے لگے۔ ان میں سے ہر شخص کسی نہ کسی شیخ اور خانقاہ سے وابستہ ہو گیا۔ یہ مشائخ انہیں جہاد کے فضائل بھی بتاتے تھے جس کے باعث ان مجاہدین میں اسلام کی توسیع کے لیے نئی زمینیں حاصل کرنے کا جذبہ عام ہو گیا۔

ان مجاہدین کی قوت کا دار ومدار گھڑ سواری پر تھا۔ وہ تیز رفتاری سے سفر کرتے اور راتوں رات دشمن پر ٹوٹ پڑتے

---

[1] فی اصول التاریخ العثمانی، ص ۲۴ تا ۲۸ ...... ان تنظیموں کو صلیبی جنگوں کے دور کے ''ٹیمپلرز'' کے مشابہ کہا جا سکتا ہے جو ایک مستقل حربی نظام رکھتے تھے اور جنگوں میں مذہبی جوش وجذبے کے ساتھ بھرپور شرکت کرتے تھے۔

تھے۔ نئے فتح ہونے والے علاقوں میں ترکمانوں کی مزید آباد کاری کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور اناطولیہ ترکوں کا نیا اسلامی وطن بن گیا۔ ان لوگوں میں ایک نئی زندگی کی امنگ دکھائی دیتی تھی۔ شجاعت و بسالت سے آراستہ ان جوانوں کی اکثریت دنیا کی آخری حدود تک اسلام کا پرچم لہرانے کی خواہش مند تھی۔ وادیوں، دیہاتوں اور قصبات میں آباد ان لوگوں کی زندگیاں بڑی سادہ تھیں۔ ان کی حیاتِ اجتماعی کا مرکز مسجد تھی جس کے تین اہم ذیلی ادارے: مکتب (ابتدائی تعلیم کی درسگاہ)، مدرسہ (متوسط درجات کی درسگاہ) اور تکیہ (خانقاہ) تھے۔ ان کی عام ہم نشینی کے مقام وہ چشمے یا حوض تھے جہاں وہ وضو اور غسل کرتے تھے۔ یہ لوگ سلجوقیوں کے سکے استعمال کرتے تھے۔ ان کے بادشاہوں کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے اور سلجوقی پایۂ تخت کو سالانہ ٹیکس دیا کرتے تھے۔ [①]

صاحب ''نزہۃ الانظار'' کے مطابق ابتدائی زمانے میں اُرطغرل اور اس کے قبیلے کو جو جاگیر ملی تھی وہ قرہ حصار (ضلع افیون، نزد قونیہ) اور بیلیجک کے درمیان تھی اور اس علاقے کو ''سکوتجک'' کہا جاتا تھا، اسی علاقے میں ایک پہاڑ ''ایلاتچ'' بھی اُرطغرل کی جاگیر میں شامل تھا۔ [②] بعد میں اُرطغرل نے اپنے مقبوضہ علاقے کو خاصا بڑھا لیا۔

۶۸۵ھ میں ارطغرل نے ضلع کوتاہیہ فتح کیا۔ اس طرح اس کی جاگیر کا رقبہ ۴۸۰۰ مربع کلومیٹر تک پہنچ گیا۔ اس نے سلجوقیوں کی نیابت میں جس ریاست کی بنیاد ڈالی وہ تین ضلعوں: کوتاہیہ، بیلہ جک اور ایسکی شہر کے قصبات و دیہی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ کوتاہیہ تقریباً پورا اس جاگیر میں شامل تھا۔ ضلع بیلہ جک کے دو شہر ''سوغت'' اور ''بوزیوک'' اس میں شامل تھے۔ جبکہ ضلع ایسکی شہر کا شمالی حصہ اور اسی ضلعے کی دو نہروں: بورسک اور سقاریا کا درمیانی علاقہ اس کی جاگیر میں شامل تھا۔ یہی چھوٹی سی ریاست آگے چل کر عظیم الشان عثمانی سلطنت بنی۔ [③]

ارطغرل نے بڑی طویل عمر پائی اور زندگی کی ۹۳ بہاریں دیکھنے کے بعد ۶۸۰ھ (۱۲۸۱ء) میں فوت ہوا۔ [④]

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۸۹/۱
② نزہۃ الانظار فی عجائب التاریخ والاخبار: ۷/۲
③ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۸۷/۱
④ تاریخ سلاطین بنی عثمان از یوسف بیگ آصاف، ص ۳۰ تا ۳۵

ارطغرل کی عمر: ارطغرل کی ولادت ۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں ہوئی تھی۔ (تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۸۶/۱) اس لحاظ سے وفات کے وقت اس کی عمر شمسی اعتبار سے ۹۰ اور قمری اعتبار سے ۹۳ برس ہو چکی تھی۔ ارطغرل کی وفات کے بارے میں دیگر اقوال بھی ہیں۔ ایک قول کے مطابق وہ ۶۸۷ھ میں فوت ہوا۔ (تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۱۶) اس کے مطابق ارطغرل کی عمر پوری ایک قمری صدی ہوگی۔ ایک قول کے مطابق سن وفات ۶۸۹ھ تھا۔ (نزہۃ الانظار: ۷/۲) اس کے مطابق ارطغرل کی عمر ایک سو دو قمری سال ہوگی۔

نوٹ:
''ایسکی شہر'' مغربی ترکی کا ایک شہر ہے۔ آج کل یہ ایک صنعتی شہر اور ریلوے جنکشن ہے۔
''بیلیجک'' (بیلہ جک) انقرہ کے مغرب میں ایسکی شہر کے قریب اس کے شمال مغرب میں واقع ہے۔
''کوتاہیہ'' ایسکی شہر کے جنوب مغرب میں ایک صوبائی دار الحکومت ہے جو دریائے پُرسق کے کنارے واقع ہے۔ یہ علاقہ گرم پانی کے چشموں کے لیے مشہور ہے۔

عثمان خان غازی بانیِ سلطنتِ عثمانیہ

۶۹۹ھ تا ۷۲۶ھ

(۱۲۸۱ء تا ۱۳۲۶ء)

عثمان خان ارطغرل کا بڑا بیٹا تھا۔ وہ ۶۵۶ھ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہی سال تھا جب بغداد میں خلافتِ عباسیہ ختم ہوئی تھی۔ مشیتِ الٰہیہ اسی وقت عثمانی خلفاء کے جدِ امجد کو وجود میں لے آئی تھی۔ عثمان خان نہایت دلیر، ذہین اور حوصلہ مند نوجوان تھا۔ اس کی پرورش جہاد فی سبیل اللہ کے ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ علماء، صلحاء اور اولیاء کا بڑا عقیدت مند تھا۔ عارف باللہ شیخ بالی قرمانی کی خانقاہ میں اکثر جاتا اور کبھی کبھی رات بھی وہیں گزارتا تھا۔ شیخ قرمانی کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی تھی۔ باپ کی وفات کے وقت وہ ۲۴ سال کا تھا۔ اس وقت قونیہ میں سلاجقۂ روم کا حکمران سلطان غیاث الدین مسعود حکمران تھا، اس کی بچی کھچی سلطنت کی شمالی سرحدیں ارطغرل کے قبیلے کی وفاداری ہی کی وجہ سے محفوظ تھیں، اس لیے اس نے پورے اعتماد کے ساتھ عثمان خان کا اس کے باپ کے عہدے پر تقرر کر دیا۔

عثمان خان نے خود کو اس عہدے کا صحیح حق دار ثابت کر دکھایا اور صوبے کا نظام اچھی طرح سنبھالا۔ ۶۸۸ھ میں اس نے قونیہ کے نواح میں قرا حصار (قراچہ حصار) کا مضبوط قلعہ فتح کر دکھایا اور اسے اپنا پایہ تخت بنالیا۔

سلطان غیاث الدین مسعود نے عثمان خان کے اعزاز میں اضافہ کرتے ہوئے اسے ''بیگ'' کا لقب دیا، اپنا خاص پرچم اور شاہی نشانات بھی اس کے حوالے کر دیے اور خطبے میں اس کا نام شامل کر لیا۔ یوں عثمان خان عہدے کے لحاظ سے نائب السلطنت اور عملی طور پر بااختیار حکمران بن گیا۔[1]

سلاجقۂ روم کا زوال:

اس زمانے میں سلاجقۂ روم مغلوں کے باج گزار بن چکے تھے جن کی زیادتیوں سے تنگ آکر ۶۹۴ھ میں سلجوقی بادشاہ غیاث الدین مسعود نے بغاوت کر دی مگر ناکام ہو کر وہ ان کا قیدی بن گیا۔ مغلوں نے اگلے برس علاؤ الدین کیقباد ثالث کو گدی پر بٹھایا مگر وہ بھی تاتاریوں کو مطمئن نہ رکھ سکا چنانچہ تاتاری حکمران غازان نے اسے قید کر دیا۔[2]

---

① اخبار الدول و آثار الاول: ۳/۷، نزہۃ الانظار: ۲/۷، ۸؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/۷۳؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۱۸ ...... قرا کا مطلب سیاہ، حصار کا معنیٰ قلعہ۔ ترکی میں قرا حصار نامی کئی قلعے ہیں۔ یہاں مراد ضلع افیون کا قلعہ ہے جسے قراچہ حصار بھی کہا جاتا تھا۔

② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۵۵، ۵۶؛ تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۲۵، ۲۶؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/۷۳

عثمان خان آزاد حکمران کی حیثیت سے:

اب اناطولیہ شدید لامرکزیت کی جانب جا رہا تھا۔ ایسے میں بہت سے لوگ عثمان خان کے زیرِ سایہ رہنے کو ترجیح دینے لگے۔ قونیہ کی اکثر فوج بھی عثمان خان کے پرچم تلے آگئی۔ چنانچہ ۶۹۹ھ میں عثمان خان نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ سلجوقی بادشاہ علاؤالدین کیقباد ثالث نے اسے خودمختاری کی اجازت دے کر علاماتِ شاہی ارسال کیں۔ یوں اناطولیہ کے وسطی علاقوں میں عثمان خان کا خطبہ رائج ہوگیا۔ اس سے پہلے اس کے نام کے ساتھ بیگ (امیر) لگایا جاتا تھا مگر اب اس نے اپنے لیے ''بادشاہ'' کا لقب اختیار کر لیا۔ ①

عثمان خان کی خارجہ پالیسی:

کئی عشروں سے سلاجقۂ روم کی عظیم سلطنت کئی ٹکڑوں میں بٹتی چلی جارہی تھی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ عثمان خان کی بادشاہت شروع ہوتے وقت اناطولیہ میں ترکمانوں کی بہت سی الگ الگ حکومتیں تھیں۔ ازمیر میں آیدین خاندان، جنوبی شہر انطالیہ میں بنوتکہ، مشرقی علاقوں میں بنوارتنا، شمالی علاقوں: ملطیہ، کوتاہیہ اور انقرہ میں بنوکرمیان، قونیہ کے مغربی ضلع 'اکردر' میں بنوحمید، میسیا میں بنوقراسی اور لیڈیا میں بنوصاروخان قابض تھے۔ ②

عثمان خان کے سامنے توسیعِ سلطنت کے لیے دو راستے تھے: آسان راستہ یہ تھا کہ وہ ان درجن بھر چھوٹی چھوٹی آزاد امارتوں سے زور آزمائی کرتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ شمال کی طرف متوجہ رہ کر بازنطینیوں سے جہاد کرتا۔ عثمان خان نے دوسری صورت کو ترجیح دی اور ہمسایہ مسلم ریاستوں کے ساتھ ہاتھاپائی سے حتی الامکان دامن بچا کے رکھا۔

اس نے قونیہ کے علامتی سلجوقی حکمرانوں کا ادب و احترام بھی ہمیشہ برقرار رکھا اور ان کے ساتھ سابقہ رسوم و القاب کے مطابق معاملہ کیا۔ تاتاریوں نے ۷۰۱ھ غیاث الدین مسعود کو تاجِ شاہی پہنا دیا جو آخری سلجوقی بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کی عملاً کوئی حیثیت نہ تھی۔ بہرکیف عثمان خان نے اپنے ان مخدوموں سے الجھنے کی نازیبا کوشش کبھی نہیں کی۔

دولتِ عثمانیہ کی حیرت انگیز ترقی کی وجوہ:

عثمان خان کی نوخیز ریاست بڑی تیزی سے ابھری۔ اس کی دو وجوہ تھیں: ایک یہ کہ یہ نئی ریاست بحیرۂ مرمرہ کے کنارے بازنطینیوں کے سب سے زیادہ قریب اور پُرخطر ترین مقام پر واقع تھی جس کے باعث اسے قدرتی طور پر جہاد فی سبیل اللہ کے مواقع زیادہ میسر آئے اور اسی جہاد نے آلِ عثمان کا نام سورج کی طرح چمکا دیا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس خاندان کے لوگ جسمانی قوت، شجاعت، سیاسی سمجھ بوجھ، دین داری اور عدل و مہربانی میں ممتاز تھے۔ ان وجوہ سے طوائف الملوکی کے اس دور میں عثمان خان ہی ایک ایسا مردِ مجاہد ثابت ہوا جس نے مغلوں اور بازنطینیوں کے مقابلے میں ایک مضبوط ریاست قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ③

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۹۰ تا ۹۲؛ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۶۲؛ نزھۃ الانظار: ۶/۲؛ اخبار الدول و آثار الاول: ۵/۳

② التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۶۰ تا ۶۲ ③ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۹۰

ریاست کی توسیع:

خود مختاری کے اعلان کے بعد عثمان خان نے ان علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا جو سلجوقیوں کے قبضے سے کچھ مدت پہلے نکل کر آزاد ہو گئے تھے۔ وہ ساحلی علاقوں تک پہنچنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس کی ریاست اناطولیہ کے درمیان تھی اور کوئی ساحل اس کے ساتھ نہیں لگتا تھا۔ اس نے ۷۰۱ھ میں ازنیق سے بیلجک جانے والی شاہراہ پر واقع ''ینی شہر'' (یار حصار) فتح کر لیا جہاں سے بازنطینیوں کے ساحلی شہر ''بورصہ'' پر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ عثمان خان نے ''ینی شہر'' کے قلعے اور فصیل کو خوب مستحکم کر لیا اور اسے اپنا عارضی پایۂ تخت قرار دیا۔ ۷۰۸ھ میں اس نے آق حصار کو فتح کیا۔ قونیہ کا مشرقی ضلع بیلجک، اینہ کول اور ایکی شہر (ایسکی شہر) بھی اس کی عملداری میں شامل ہو گئے۔ اس دوران ۷۰۸ھ میں آخری سلجوقی سلطان غیاث الدین مسعود فوت ہو گیا اور یوں سلاجقۂ روم کا دور اختتام پذیر ہو گیا۔ [1]

عثمان خان نے گرد و نواح میں آباد آرمینی عیسائیوں کو تنبیہ کی کہ وہ اسلام لے آئیں یا جزیہ ادا کریں ورنہ ان سے جہاد کیا جائے گا۔ آرمینی حکام میں سے کچھ نے اسلام قبول کر لیا۔ کچھ نے جزیہ دینا پسند کیا۔ باقی جنگ پر آمادہ ہو گئے اور مغلوں کو مدد کے لیے بلا لیا۔ عثمان خان نے مغلوں اور ارمنوں کے اتحاد کی ذرا پروانہ کی اور اپنے بیٹے اُورخان کو لشکر دے کر مقابلے پر بھیج دیا۔ اُورخان نے نہایت بے جگری سے حریف کا سامنا کیا اور اسے شکستِ فاش دے کر بھگا دیا۔

۷۰۱ھ (۱۳۰۱ء) میں عثمان خان نے ''ازمیت'' اور ''ازنیق'' (نیسیا) کے درمیانی میدانوں میں پیش قدمی کی اور قلعہ ''افیون حصار'' کے پاس رومی سپہ سالار موزایون کو شکستِ فاش دی۔ کچھ مدت بعد اس نے بورصہ اور نیقیہ کے درمیان قلعہ ''تریکوکا'' بھی فتح کر لیا جو ''ازنیق'' اور ''ازمیت'' کو ملانے والی شاہراہ پر واقع تھا۔ اس طرح شمالی ساحلوں تک اس کی رسائی آسان ہو گئی۔ عثمان خان کا ابتدائی ہدف یہ تھا کہ ایشیائے کوچک کی مشرقی اور مغربی رومی ریاستوں کے درمیان زمینی راستہ ختم کر دیا جائے اور یوں انہیں جدا کر کے رفتہ رفتہ زیر کیا جائے۔ سمندر پار یورپ پر چڑھائی کا وقت ابھی بہت دور تھا۔

کچھ مدت تک وہ ملکی انتظامات کو بہتر بنانے میں مصروف رہا۔ ۷۰۷ھ میں اس نے بحیرۂ مرمرہ کے ساحل تک یلغار کی اور کچھ علاقہ فتح کر کے اپنی ریاست کو سمندر سے ملا دیا۔ یوں مشرق اور مغرب کی رومی ریاستیں ایک دوسرے کی مدد کے قابل نہ رہیں اور ترکوں کی فتوحات کی رفتار تیز ہو گئی۔ اسی سال ترک افواج نے کتہ، لفکہ، آق حصار اور قوج حصار کے مضبوط قلعوں پر قبضہ کیا۔ ۷۱۲ھ میں یہ فوجیں ''کیوہ''، ''طراقلو یکیجہ'' اور ''تکور بیکاری'' کے قلعے بھی فتح کر چکی تھیں۔ کچھ ہی مدت بعد ''کبری حصار'' جیسا قلعہ بھی اسلامی پرچم تلے آ گیا۔ [2]

---

① ارطغرل کے دور میں ضلع بیلجک اور ضلع ایسکی شہر کی اراضی اور دیہات و قصبات فتح ہوئے تھے مگر ضلعی مراکز یعنی شہر قبضے میں نہیں آئے تھے۔

② تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۹۰ تا ۹۲؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۵۵، ۵۶

③ اخبار الدول و آثار الاول: ۳/۸، ۹

بورصہ کی مہم:

بورصہ [1] کے رومی حاکم نے عثمان خان کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے سامنے بند باندھنے کے لیے ''اطرہ نوس''، ''ادربانوس''، ''کسٹل'' اور ''کتہ'' کے نوابوں کو ساتھ ملایا اور عثمان خان کے مرکز ''ایکی شہر'' پر دھاوا بول دیا۔ مگر عثمان خان پوری طرح تیار تھا۔ اس نے خود فوج کی کمان کرتے ہوئے ان کا مقابلہ کیا۔ ''قیون حصار'' کے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں رومیوں کو شکست ہوئی اور وہ پسپائی پر مجبور ہوگئے مگر عثمان خان نے انہیں جانے نہ دیا اور تعاقب کرتے ہوئے ''دیمبوز'' کے میدان میں انہیں دوبارہ للکارا۔ یہاں رومیوں کی بچی کھچی نفری بھی کٹ گئی۔ کسٹل کا نواب مارا گیا جب کہ اطرہ نوس اور بورصہ کے حکام بمشکل جان بچا کر بھاگ سکے۔ [2]

اس جنگ کے بعد عثمان خان نے بورصہ پر حملے کی تیاری شروع کردی۔ بورصہ اپنی خوشنمائی، قدرتی مناظر اور قلعہ و شہر پناہ کی مضبوطی کے لحاظ سے بے مثال سمجھا جاتا تھا اور بحیرۂ مرمرہ کے ساحل سے صرف ۱۰ کلومیٹر دور تھا۔ یہاں کے قدرتی چشمے، میوے اور پھل انسان کو اپنا گرویدہ بنالیتے تھے۔ سرد ترین آب و ہوا والے اس علاقے میں گرم پانی کے اُبلتے چشمے اللہ کی قدرت یاد دلاتے تھے۔

عثمان خان نے ۷۱۷ھ میں بورصہ کے دونوں اطراف میں دو قلعے تعمیر کرانا شروع کیے تاکہ محاصرہ کتنا بھی طویل ہو، افواج کی ہمت نہ ٹوٹے۔ قلعوں کی تعمیر مکمل ہونے پر عثمان خان نے ۷۲۲ھ میں افواج لے کر بورصہ کا سختی سے محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ طویل تر ہوتا گیا۔ عثمان خان نے یہ مہم اپنے جانشین اُورخان کے سپرد کردی اور خود دوسرے شہروں کا رخ کیا۔ اس نے ''یکیجہ حصار''، ''آق حصار'' اور ''تکفور بکاری'' کو جنگ کے بغیر لے لیا۔

مسلسل مہمات نے اسے بیمار کردیا تھا، لہٰذا وہ اپنے مرکز لوٹ آیا۔ اس کی فوجیں اس کے نائبین کی کمان میں لڑتی رہیں۔ ''قرہ تکیہ''، ''قرہ جیش'' اور ''طوز بازاری'' سمیت کئی علاقے اسی دوران فتح ہوئے۔ ''ازمیت'' اور ''ازنیق'' کی کئی بستیاں بھی زیرِ نگین آئیں۔ [3]

آخرکار چار سال کے محاصرے کے بعد بورصہ ۲۰ ربیع الآخر ۷۲۶ھ (۶ اپریل ۱۳۲۷ء) کو فتح کرلیا گیا۔ [4]

اورخان نے بورصہ کے شہریوں سے بہت اچھا سلوک کیا۔ اس کے اخلاق دیکھ کر شہر کا نصرانی حاکم ''افرینوس'' مشرف بااسلام ہوگیا۔ دربارِ عثمانی سے اسے 'بیگ' کا خطاب دیا گیا اور وہ سلطنتِ عثمانیہ کا مایہ ناز سالار ثابت ہوا۔ [5]

---

① اسے ''بروصہ'' اور ''بورسہ'' بھی کہا جاتا تھا۔ ② تاریخ سلاطین بنی عثمان از یوسف بیگ آصاف، ص ۳۵

③ اخبار الدول: ۳/ ۹،۸..... بعض مؤرخین کے بقول شہر کا محاصرہ دس سال تک جاری رہا۔ غالباً انہوں نے قلعوں کی تعمیر کے آغاز سے محاصرے کی مدت شمار کی ہے۔ مگر درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ محاصرہ ۷۲۲ھ میں شروع ہوا تھا جیسا کہ مؤرخ قرمانی نے لکھا ہے۔ بورصہ کی فتح کب ہوئی؟ اس بارے میں بھی اختلاف ہے، ایک رائے کے مطابق یہ شہر عثمان خان کی زندگی میں اور دوسرے قول کے مطابق اس کی وفات کے بعد اُورخان کے دور میں فتح ہوا۔ قرمانی نے دوسرا قول نقل کیا ہے، لیکن اگر عثمان خان کی تاریخ وفات رمضان ۷۲۶ھ مان لی جائے جیسا کہ فرید بک محامی نے لکھا ہے تو پھر پہلے قول کی ترجیح ثابت ہوجاتی ہے۔

④ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۹۳ ⑤ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۲۰

عثمان خان کی وصیتیں:

ادھر عثمان خان کی طبیعت بھی بگڑتی چلی گئی۔ اور خان کو بورصہ کی فتح کے فوراً بعد یہ خبر ملی اور وہ تیزی سے مرکز چلا آیا۔ باپ کو بسترِ مرگ پر دیکھ کر اس کی آنکھیں نم ہوگئیں، وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا:

''حضور والا! آپ نے کتنے طاقتور دشمنوں کو زیر کیا! کتنے ملک فتح کیے۔ آج آپ کی یہ حالت!!''

باپ نے اکھڑتی سانسوں کے درمیان اپنے قابل بیٹے کو جواب دیا:

''بیٹا! میں اپنے رب کے پاس جانے والا ہوں۔ میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ تم رعایا کے حق میں عدل کرنے والے اور اسلام کی اشاعت کے لیے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہو۔[1]

میرے بچے! تم جانتے ہو کہ ہمارا اصل مقصد اللہ رب العالمین کو راضی کرنا ہے، تم یہ بھی جانتے ہو کہ اللہ کے دین کا نور جہاد کے ذریعے ہر طرف پھیلتا ہے، پس تم اللہ کی رضامندی کے کام میں لگے رہو۔ بیٹا! ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو ملک گیری کی ہوس یا لوگوں پر حکم چلانے کی خاطر جنگیں کرتے ہیں۔ ہم تو اسلام کے لیے جیتے ہیں اور اسلام ہی کے لیے مرتے ہیں۔ اور میرے بیٹے! تم اس کام کے پوری طرح اہل ہو۔

اسلام کی اشاعت، لوگوں کی اس کی جانب راہنمائی اور مسلمانوں کی عزت و ناموس اور جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری تمہارے سر آچکی ہے۔ اللہ عن قریب تم سے اس کے بارے میں باز پرس کرے گا۔''[2]

پھر اسے آخری وصیتیں کرتے ہوئے کہا:

''بیٹے! خبردار! ایسی باتوں سے ہمیشہ بچتے رہنا جن کا حکم اللہ رب العالمین نے نہ دیا ہو۔

میرے بیٹے! اپنے تابع داروں کی عزت اور تعظیم کر کے انہیں ساتھ ملائے رکھنا۔ فوج کو انعام واکرام سے نوازتے رہنا۔ دیکھو! ایسا نہ ہونے پائے کہ شیطان تمہیں دولت اور فوج پر غرور میں مبتلا کر دے۔

بیٹا! میں تمہیں علمائے دین کا ہمیشہ لحاظ رکھنے، ان کی زیادہ سے زیادہ عزت کرنے اور ان کے مشوروں پر چلنے کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ تمہیں بھلائی کے سوا کسی بات کا نہیں کہیں گے۔ جب کوئی مشکل معاملہ آپڑے تو علماء سے مشورہ لینا۔ شریعت کے ماہرین سے کبھی دوری اختیار نہ کرنا۔ بیٹا! اچھی طرح جان لو کہ اس دنیا میں ہمارا واحد راستہ اللہ کا راستہ ہے، اور ہماری واحد منزل اللہ کے دین کی تبلیغ ہے۔ ہم دنیا اور عہدوں کے طالب نہیں۔[3] اپنے بیٹوں اور اپنے دوستوں کے لیے میری وصیت یہ ہے کہ دین کی سربلندی کے لیے اللہ کی راہ میں جہاد ہمیشہ جاری رکھیں، اسلام کی ہمیشہ خدمت کرتے رہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے کلمۂ توحید کو دنیا کے آخری کونے تک پہنچا دینا۔

---

① تاریخ سلاطین بنی عثمان از یوسف بیگ آصاف، ص ۳۵. جوانب مضیئة فی تاریخ العثمانیین، ص ۲۱

② جوانب مضیئة فی تاریخ العثمانیین، ص ۲۱

③ جوانب مضیئة فی تاریخ العثمانیین، ص ۵ ؛ العثمانیون فی التاریخ والحضارة از ڈاکٹر محمد حرب، ص ۱۶

میری اولاد میں سے جو بھی حق اور انصاف سے برگشتہ ہوگا، وہ قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے محروم ہوگا۔ بیٹا! دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس کی گردن موت نے جھکا نہ دی ہو۔ اللہ کے حکم سے میرا وقتِ اجل آن پہنچا ہے۔ میں یہ حکومت تمہیں سونپتا ہوں اور تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ ہر چیز میں عدل کا خیال رکھنا۔''[1]

یہ وہ وصیتیں تھیں جو عثمان خان کے بیٹوں اور پوتوں نے اپنی گرہ سے باندھ لیں اور انہیں اس سلطنت کے دستورِ اساسی کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جب تک عثمانی سلاطین ان پر کاربند رہے، کامیابیاں ان کے قدم چومتی رہیں۔

عثمان خان کی وفات:

ان وصیتوں کے بعد ۲۱ رمضان ۷۲۶ھ کو عثمان خان دنیائے فانی سے رخصت ہوگیا۔ اس کی عمر ۷۰ سال تھی۔ اس کی وصیت کے مطابق نعش کو بورصہ میں دفن کر دیا گیا۔[2] اس نے ۲۷ سال حکومت کی اور اپنے باپ سے حاصل کردہ چار ہزار آٹھ سو مربع کلومیٹر کی جاگیر کو ۱۶ ہزار مربع کلومیٹر پر محیط ایک زبردست ریاست بنا دیا۔

اس ریاست میں میں درج ذیل شہر اور ضلعے شامل تھے:

① بیلہ چک ② ایسکی شہر ③ کیفہ ④ آق غازی ⑤ سقاریا

⑥ کوتاہیہ ⑦ مودانیہ ⑧ ینی شہر ⑨ اینہ کول (بورصہ کا نواحی علاقہ)[3]

عثمان کی سیاست پر ایک نگاہ:

عثمان خان کی سیاست میں چند چیزوں کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی حریف ریاست سے جنگ چھیڑتا تھا۔ نہایت طویل دورانیے کے محاصروں کو صبر و تحمل کے ساتھ جاری رکھنا اور ان مہمات کی تمام صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اس کی اولوالعزمی کا پتا دیتا ہے۔ اس کی جنگی حکمت عملی میں خونریزی کم سے کم ہوتی اور دشمن تھک ہار کر خود کو حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ بغاوتوں کے انسداد کے لیے نو مفتوحہ علاقوں کا انتظام بہت مضبوطی اور باریک بینی سے کرتا، وہاں ترقیاتی کام کراتا، لوگوں سے مہربانی برتتا، انہیں زبان اور کردار سے اسلام کی دعوت دیتا۔ اس کے انصاف، حسنِ سلوک اور اسلام کی اشاعت میں اس کی سیرت کی اثر پذیری کے ثبوت کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ ایک بار اس کے دربار میں ایک ترک مسلمان اور ایک بازنطینی عیسائی اپنا مقدمہ لے کر آئے۔ عثمان خان نے معاملے پر غور کرنے کے بعد عیسائی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ عیسائی حیران رہ گیا اور اس نے کہا:

''آپ نے میرے حق میں کیسے فیصلہ دیا جبکہ میں مسلمان نہیں ہوں۔''

عثمان خان نے کہا: ''میں تمہارے حق میں فیصلہ کیوں نہ دیتا جب کہ اللہ کا فرمان ہے:

---

① السلاطين العثمانيون، ص ۳۳

② تاريخ الدولة العلية، ص ۱۲۲

③ تاريخ الدولة العثمانية از يلماز: ۱/۹۲، ۹۳

"اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ
(بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں لوٹایا کرو ان کے حق داروں کو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو......)[1]

یہ دیکھ کر عیسائی اسی وقت مسلمان ہوگیا۔[2]

عثمان خان عدل وانصاف اور لطف ومہربانی کے ساتھ ساتھ ہر صوبے میں اچھی خاصی مستقل فوج تعینات رکھتا تھا، اس کی سیاست کی کامیابی اس سے ظاہر ہے کہ اتنے طویل دورِ حکومت میں اس کے خلاف کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔

عثمان خان ایک نہایت دلیر، جنگ آزما، صائب الرائے، دوراندیش، بلند ہمت، مہربان اور خوددار انسان تھا۔ وہ رعایا کے ساتھ ہمیشہ احسان کا برتاؤ کیا کرتا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی بڑی درویشانہ تھی۔ اس نے اپنی میراث میں چند اونی جوڑوں، ایک عمامے اور ایک عمدہ پوشاک کے سوا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔[3] تاریخ میں اسے زندہ رکھنے کے لیے یہی بات کافی تھی کہ وہ چھ صدیوں تک قائم رہنے والی "سلطنتِ عثمانیہ" کا بانی تھا۔

عثمانیوں کے دو دشمن:

عثمانیوں کی نوخیز ریاست کے بڑے دشمن دو تھے: ایک مغل اور دوسرے بازنطینی۔ عثمان خان کی خوش قسمتی تھی کہ اس دور میں مصر اور شام پر ممالیک کی حکومت تھی جو مغلوں کے سخت ترین حریف تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے مغلوں کی زیادہ توجہ شام کی طرف مبذول رہی اور ایشیائے کوچک پر ان کے حملوں کا زور کم ہوگیا۔ دوسری طرف مغلوں میں اسلام بھی پھیلتا چلا گیا اور یوں عثمان خان کی وفات سے پہلے ہی ایشیائے کوچک ان کے خطرے سے محفوظ ہو چکا تھا۔

عثمانی کا مطلب:

دولتِ عثمانیہ کے تمام چھوٹے بڑے ارکان "عثمانی" کہلاتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ سب عثمان خان کی نسل سے تھے۔ بلکہ "عثمانی" ایک "حزب" اور ایک سیاسی جماعت تھے جیسا کہ اموی اور عباسی تھے جو اگرچہ ایک نسبی اور نسلی حیثیت بھی رکھتے تھے مگر عموماً ان کے ہر وفادار کو اموی یا عباسی کہا جاتا تھا۔

---

1. سورۃ النساء، آیت نمبر: ۵۸
2. الدولة العثمانية للصلابي، ص ۴۸ بحوالہ جوانب مضیئة فی تاریخ العثمانیین، ص ۳۳
3. تاریخ سلاطین بنی عثمان از یوسف بک آصاف، ص ۳۴

اُورخان

۷۲۶ھ تا ۷۶۱ھ
(۱۳۲۶ء تا ۱۳۶۰ء)

عثمان خان کا جانشین ''اُورخان'' باپ کی زندگی میں ہی اپنی حربی صلاحیتوں اور سیاسی قابلیت کا لوہا منوا چکا تھا۔ وہ ۶۷۸ھ میں پیدا ہوا تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۴۸ سال تھی۔ ①

سرحدوں پر دارالحکومت:

اُورخان کا ہدف سمندر کے پار یورپی ریاستیں تھیں جن پر حملے کے لیے بورصہ بہترین مرکز بن سکتا تھا، اس لیے اس نے ''بورصہ'' کو اپنا پایۂ تخت بنالیا۔ بعض مؤرخین کے مطابق خود عثمان خان نے اس کی تاکید کی تھی۔ یہ ایک ہمت آفرین اور حیرت انگیز تدبیر تھی کہ اپنا مرکزِ حکومت دشمن کی سرحدوں پر بنایا جائے۔ عام طور پر حکمران ریاست کے کسی درمیانی شہر کو مرکز بناتے ہیں تاکہ سلطنت کے تمام شہروں سے رابطہ رہے اور مرکز دشمن کے حملے کی زد سے بھی دور رہے۔ مگر عثمانی سلاطین نے اس کے بالکل برعکس یہ سوچا کہ مرکز بازنطینیوں کی سرحد پر ہونا چاہیے، اسی لیے اُورخان نے بورصہ کو دارالحکومت بنایا۔ اس کے بعد جب بحیرۂ مرمرہ کے پار علاقے فتح ہوئے تو آلِ عثمان نے ''ادرنہ'' (ایڈریانوپول) کو مرکز بنالیا۔ اگرچہ اس طرح جنگ کے دوران پایۂ تخت کے دشمنوں کے نرغے میں آجانے کا خطرہ موجود تھا مگر جہاد کے ولولے سے معمور عثمانیوں کے نزدیک ایسے اندیشے کوئی وزن نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کے اصل ہدف یعنی بازنطینی ریاستوں سے جہاد پر پوری توجہ تب ہی دی جاسکتی تھی جب حکمران خود محاذ پر یا اس کے قریب تر ہو۔

اس کے علاوہ عثمانیوں کے سامنے سابقہ تاریخ تھی کہ صدیوں تک مسلمان ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر آباد ہو کر بھی اس کا مکمل دفاع نہیں کر سکے۔ یہاں رومیوں کو تاخت وتاراج کا موقع ہمیشہ ملتا رہا جس کی وجہ سے وہ کبھی اس خطے کی بازیابی کا خیال دل سے نہ نکال سکے۔ اس کا علاج یہی ہو سکتا تھا کہ اسلامی حکومت کا مرکز رومیوں کی سرحد پر ہو اور ان کے علاقوں میں پیش قدمی برابر جاری رہے تاکہ یورپی ممالک اپنی آخری حدود کی حفاظت کی فکر میں رہیں اور عالم اسلام کی طرف آنے کا خیال ان کے ذہنوں سے نکل جائے۔ اس حکمتِ عملی کی بنیاد اگرچہ عثمان خان نے ڈالی تھی مگر

---

① اخبار الدول: ۳/۰ر!

اس پر عمل کا موقع اُورخان کو ملا۔ اس نے بورصہ کو مرکز بنایا اور اپنی افواج ہر طرف پھیلا کر اناطولیہ میں بازنطینیوں کے باقی قلعوں اور شہروں کو فتح کرنے میں دیر نہ لگائی۔[1]

اناطولیہ میں فتوحات:

تخت نشینی کا ایک سال پورا ہونے سے پہلے اُورخان نے ایشیائے کوچک کا شمال مغربی شہر نیقومیدیا (ازمیر) فتح کرلیا۔ ۷۳۱ھ میں اس نے ''قیون حصاری'' اور نصرانیوں کے تاریخی و مذہبی شہر ''نیقیہ'' پر بھی قبضہ کرلیا جہاں بڑے بڑے پادری اور راہب آباد تھے۔ اب ایشیا میں بازنطینیوں کا آخری شہر ''ازنیق'' رہ گیا تھا۔ دو سال کے محاصرے کے بعد یہ شہر بھی فتح کرلیا گیا اور ایشیا سے بازنطینی بادشاہت کا یہ نشان بھی مٹ گیا۔ ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) میں اُورخان نے بحیرۂ مرمرہ کے جنوب میں واقع مغربی اناطولیہ کی ریاست ''قرہ سی'' کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔[2]

تعمیراتی کام اور نظام مملکت کی تشکیل نو

ان فتوحات کے بعد اُورخان تقریباً بیس برس تک کسی جنگ میں مشغول ہوئے بغیر پوری یکسوئی سے مملکت کی تعمیر و ترقی میں مصروف رہا۔ اس نے بورصہ اور ازنیق میں دو عالی شان جامعات قائم کیں۔ نیز تمام مفتوحہ شہروں میں درسگاہیں اور خانقاہیں کھلوائیں تاکہ اسلام کی دعوت اور تعلیم عام ہو۔ اس نے فتح کے بعد ہر جگہ مقامی نصرانیوں سے مہربانی کا برتاؤ کیا، انہیں مذہبی آزادی دی اور نقل مکانی پسند کرنے والوں کو اجازت دی کہ وہ اپنی جائیدادیں فروخت کر کے تمام دولت اور ساز و سامان کے ساتھ جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔[3]

نئے سکے کا اجراء:

اُورخان کے والد عثمان خان نے فقط اپنے نام کا خطبہ جاری کرنے پر اکتفا کیا تھا اور اپنے نام کا سکہ جاری نہیں کیا تھا۔ اُورخان کی تخت نشینی کے وقت بھی اناطولیہ میں سلجوقی دور کے سکے رائج تھے۔ اُورخان نے بادشاہت کے اس امتیاز کو بھی اپنایا اور ممالکِ محروسہ میں اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔[4]

علاؤالدین علی بیگ اور علاؤالدین پاشا، ایک غلط فہمی کا ازالہ:

عثمان خان کے چھ لڑکے تھے: (۱) اُورخان (۲) علاؤالدین علی بیگ (۳) پازارلی (۴) چوپان (۵) ملک (۶) حمید
ان میں اُورخان سب سے بڑا تھا۔ اس کے بعد علاؤالدین علی بیگ تھا۔ عام غلط فہمی ہے کہ علاؤالدین علی بیگ بڑا بھائی تھا۔ اسی غلط فہمی کی بناء پر قیاس در قیاس کر کے تاریخ میں یہ اضافہ بھی کرلیا گیا ہے کہ اُورخان کو جب چھوٹا ہونے

---

(۱) تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۲۲، ۱۲۳؛ تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز: ۹۳/۱، ۹۴
(۲) اخبار الدول: ۱۰/۳؛ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۲۴
(۳) اخبار الدول: ۳/ ۹ تا ۱۱؛ تاریخ الدولة العلیة: ۱۲۴ تا ۱۲۸
(۴) دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیر: ۲۷/۱، ط دار المصنفین اعظم گڑھ بھارت

کے باوجود ولی عہد بنادیا گیا تو بڑے بھائی علاؤالدین نے صبر سے کام لیا اور اتفاق واتحاد کے ساتھ بھائی کا وزیر بن کر سلطنت کی خدمت کرتا رہا۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

محققین کے مطابق جو علاؤالدین وزیر کے منصب پر تھا اور ''پاشا'' کہلاتا تھا، وہ الگ شخص تھا۔ وہ غازی عثمان خان کے دور سے منصبِ وزارت پر تھا۔ جبکہ علاؤالدین علی بیگ بن عثمان خان اُورخان سے چھوٹا تھا۔ وہ کبھی منصبِ وزارت پر نہیں رہا البتہ اُورخان کے دورِ حکومت میں اسے بیگلر بیگ یعنی سپہ سالار بنایا گیا تھا۔ ایک مدت تک یہ ذمہ داری نبھانے کے بعد اُورخان کے دور میں اس کی وفات ہوگئی اور وہ اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہوا۔ [1]

منصبِ وزارت:

دولتِ عثمانیہ میں منصبِ وزارت کی بڑی اہمیت تھی۔ [2] عثمان خان کے زمانے سے دستور تھا کہ اس منصب کے لیے سرکاری افسران کے دائرے سے باہر کے کسی جید عالم کا تقرر کیا جاتا تھا۔ طویل زمانے تک عثمانیوں میں یہ رواج باقی رہا جس کے باعث دولتِ عثمانیہ کو بڑے اعلیٰ پائے کے وزراء نصیب ہوئے جن میں علاؤالدین پاشا بن حاجی کمال الدین کا نام سرفہرست ہے۔ وہ عثمان خان کے بعد اُورخان کے دور میں بھی وزیر رہا۔ [3]

پاشا کا خطاب:

علاؤالدین دولتِ عثمانیہ کا پہلا عہدے دار تھا جسے پاشا کا خطاب ملا۔ اس کے بعد اُورخان کے بڑے فرزند سلیمان شاہ کو اس خطاب سے نوازا گیا۔ مراد اوّل کے دور میں پاشا کا خطاب قرا خلیل کو دے دیا گیا۔ بعد میں بیک وقت متعدد اعلیٰ افسران اس خطاب سے نوازے جاتے رہے۔ [4]

علاؤالدین پاشا کے کارنامے:

علاؤالدین پاشا نہایت عالم فاضل اور عابد وزاہد اور صوفیائے کرام کا خادم تھا۔ وہ عالم اسلام کا ایسا جوہرِ تابندہ تھا جو فکر کی گہرائی، خیال کی بلندی اور منصوبہ بندی کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ اس نے نوخیز سلطنتِ عثمانیہ کے لیے ایسے اصول وضوابط مقرر کیے کہ وہ شروع سے ترقی اور استحکام کی راہ پر چل پڑی۔ اس نے فوج، عدلیہ اور پولیس میں ایسی اصلاحات کیں کہ زمانہ دراز تک ان میں ترمیم کی ضرورت نہ پڑی۔ اس دور کی معاصر سلطنتیں نظم وضبط اور قوانین سازی کے لحاظ سے جمود کا شکار ہو چکی تھیں۔ علاؤالدین نے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے جدت کا ایسا مؤثر ماحول پیدا کیا کہ سلطنتِ عثمانیہ باقی دنیا سے بہت آگے نکل گئی۔ [5]

---

[1] تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۱۳۶، ۱۳۷

[2] اس منصب کو بعد میں ''صدارتِ عظمیٰ'' اور منصب دار کو ''صدر اعظم'' کہا جانے لگا۔

[3] تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۱۳۹

[4] دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیر: ۱/۳۱، بحوالہ ہربرٹ گبنس

[5] تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۲۲

جاگیردارانہ نظام سے پیدا شدہ مسائل:

صدیوں سے دنیا کی تمام بادشاہتوں میں بادشاہ کی طاقت کا انحصار جاگیرداروں کی اطاعت اور فرمانبرداری پر ہوا کرتا تھا۔ قلعے اور سپاہی بھی انہی کے پاس ہوا کرتے تھے۔ جاگیردار زمین کی پیداوار سے فائدہ اٹھاتے اور اس کے بدلے مرکز کو حسبِ ضرورت افرادی قوت فراہم کرتے۔ مگر یہ نظام کئی مسائل کا باعث بن رہا تھا:

① جاگیروں پر کام کرنے والے افراد اور مزارع ہی عموماً سپاہی بن کر جنگوں میں جایا کرتے تھے، اس لیے چھاؤنیوں میں مستقل قیام کرنے والے سپاہی کم ہوا کرتے تھے۔ اکثریت جنگ کے بعد اپنے دیہاتوں، بستیوں اور جاگیروں کو لوٹ جاتی اور معمول کے کاموں میں مشغول ہو جاتی تھی۔ جاگیرداروں میں سے جو زیادہ قوت پکڑ جاتے وہ بعض اوقات بغاوت کر کے خود مختار بھی ہو جاتے تھے۔ اس لیے کوئی حکمران جاگیرداروں کی طرف سے مکمل طور پر بے فکر نہیں رہ سکتا تھا۔ علاؤ الدین کسی طرح اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔

② دوسرا اہم مسئلہ آبائی مذاہب ترک کر کے مشرف با اسلام ہونے والے لوگوں کا تھا کہ کس طرح ان کی وفاداریوں کو پختہ تر کیا جائے۔ ان کی حیثیت ”مؤلفۃ القلوب“ کی سی تھی۔ اگر ان سے اکرام و اعزاز کا معاملہ نہ کیا جاتا تو خدشہ تھا کہ وہ اسلامی ریاست سے بددل ہو جائیں گے اور ملت کے لیے ایک مفید عنصر بننے کے بجائے ایک الگ گروہ بن جائیں گے یا اپنے سابقہ دین کی طرف لوٹنے کی کوشش کریں گے۔

③ تیسرا مسئلہ مملکت کے ذمی نصرانیوں کا تھا جو بار بار مسلمانوں کے خلاف بغاوتیں کرتے تھے۔ انہیں اسلام سے مانوس کرنا بہت ضروری تھا۔ اول تو اس لیے کہ دعوتِ اسلام کا فریضہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں پر عائد تھا۔ دوسرے اس لیے کہ اگر یہ لوگ اسلام سے دور رہتے تو یہاں طاقت کے بل پر کسی مسلمان کا اقتدار ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

④ چوتھا مسئلہ جنگوں میں مرنے یا لاپتہ ہونے والے نصرانیوں کے لاوارث بچوں کا تھا جو اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کی سرپرستی اور تربیت نہ کی جاتی تو وہ معاشرے کے لیے ایک داغ بن جاتے۔

مسائل کا حل۔ افواج کی ازسرِ نو تشکیل:

ان مسائل کے حل کے لیے علاؤ الدین پاشا نے فوج کی ازسرِ نو تشکیل ضروری سمجھی اور اس شعبے کو خاص ترقی دی۔ عثمان خان پاشا کے دور میں فوج کا نظام قبائلی طرز کا تھا۔ بادشاہ کی طلب پر فوج آتی اور جنگ کے بعد واپس کر دی جاتی۔ علاؤ الدین پاشا نے باقاعدہ عسکری نظام ترتیب دیا جس کے مطابق تمام افواج کی اعلیٰ کمان خود بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بادشاہ کے ماتحت صوبے دار ”سوباشی“ کہلاتے تھے جبکہ سپہ سالار کو ”بیگلر بیگی“ کہا جاتا تھا۔ یہ عہدہ عام طور پر کسی شہزادے کو دیا جاتا تھا۔ اُورخان کے دور میں پہلے شہزادہ سلیمان پاشا اور پھر شہزادہ مراد خان بیگلر بیگی مقرر ہوئے تھے۔

عثمان خان کے دور سے تمام شہروں اور قصبات میں قاضی مقرر کر دیے گئے تھے۔ یہ نظام بدستور برقرار رہا۔

اہم امورِ مملکت گورنروں اور امرائے فوج کے ذریعے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے جاتے تھے اور وہاں سے احکام کا اجراء ہوتا تھا۔

جدید اصلاحات کے مطابق فوج کی تین قسمیں کی گئیں: ① تنخواہ دار ② جاگیردار ③ بے ضابطہ

پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں تھیں: ① گھڑ سوار ② پیادے۔

باضابطہ افواج میں سے پیادوں کو ''یایا'' اور گھڑ سواروں کو ''مسلم'' کہا جاتا تھا۔ گھڑ سوار فوج اناطولیہ کے ترک نوجوانوں سے مرتب کی جاتی تھی۔ پیادہ فوج دس دس، سو سو اور ہزار ہزار کے چھوٹے بڑے دستوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ دس سپاہیوں کا افسر ''اون باشی''، سو سپاہیوں کا افسر ''یوز باشی'' اور ہزار کا ''مین باشی'' کہلاتا تھا۔ گھڑ سوار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں مرتب ہوتے تھے اور ہر چھ ٹولیوں (تیس سواروں) پر مشتمل ایک چھوٹا دستہ ہوتا تھا۔

پیادہ اور گھڑ سوار فوج امن کے ایام میں حکومت کی طرف سے مقرر شدہ اراضی سے تنخواہ پاتی تھی اور تمام ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھی۔ جنگ کے دنوں میں ان میں سے ہر سپاہی کو یومیہ دو طلائی سکے دیے جاتے تھے۔ ریاست کی اصل طاقت یہی باقاعدہ افواج تھیں۔[1]

مجموعی طور پر مستقل فوج میں ۹۰ ہزار سپاہی ہوتے تھے۔ ۴۰ ہزار گھڑ سوار اور ۵۰ ہزار پیادے۔[2]

جاگیردار افواج کو نو مفتوحہ علاقوں میں تعینات کیا گیا اور وہاں کی جاگیروں کی آمدن ان کے لیے مخصوص کر دی گئی، وہاں کی سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قلعوں اور سڑکوں کی تعمیر و مرمت، سامان کی نقل و حمل اور کان کنی جیسے کام بھی ان کی ذمہ داری تھے۔ بڑی جاگیر کو ''زعامت'' اور چھوٹی جاگیر کو ''تیمار'' کہا جاتا تھا۔

بے ضابطہ فوج (رضا کار) ''اَکنجی'' کہلاتی تھی جسے مالِ غنیمت سے حصہ ملتا تھا۔ ان میں ''اخیانِ روم''، ''غازیانِ روم'' اور ''ابدالیانِ روم'' کے نام سے مجاہدین کے لگ الگ گروہ تھے جو حسبِ ضرورت کام آتے تھے۔ جنگ کے سوا عام دنوں میں وہ زندگی کے مختلف مشاغل اپنائے رہتے تھے۔ اکثر لڑائی کے دوران یہی رضا کار سب سے آگے ہوتے تھے اور پہلا دھاوا یہی بولتے تھے۔ جب دشمن ان سے لڑ کر تھک جاتا تو پھر باقاعدہ افواج منظم حملہ کرتی تھیں۔[3]

یورپی مؤرخین کی زبانی عثمانی فوج کی تعریف:

ان نئی تشکیلات اور اصلاحات کی بدولت عثمانی افواج بہت جلد ایک ناقابلِ شکست قوت بن گئیں۔ ایک یورپی سیاح ''بروگئے'' ان افواج کی کارکردگی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

① تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۱۵۱، ۱۵۲، ۵۷۱ تا ۵۸۳؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/۲۷ تا ۳۰، ط دارالمصنفین اعظم گڑھ بھارت؛ فی اصول التاریخ العثمانی از احمد عبدالرحیم مصطفیٰ، ص ۴۳ تا ۴۵، ط دار الشروق

② تاریخ الدولۃ العثمانیہ ازیلماز، ص ۹۷

③ تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۵۷۱ تا ۵۸۳؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/۲۷ تا ۳۰، ط دارالمصنفین اعظم گڑھ بھارت؛ فی اصول التاریخ العثمانی از احمد عبدالرحیم مصطفیٰ، ص ۴۳ تا ۴۵، ط دار الشروق

''عثمانیوں کو پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ عیسائی فوجیں کب آ رہی ہیں اور کہاں ان سے مقابلہ کرنا مفید ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ عثمانی جنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ان کے چاؤش (ریکی کرنے والے دستے) اور جاسوس صحیح راہنمائی کرتے ہیں۔''

یہی سیاح لکھتا ہے:

''عثمانی دفعۃً روانہ ہو سکتے ہیں۔ سو عیسائی سپاہی دس ہزار عثمانیوں کی بہ نسبت زیادہ شور کرتے ہیں۔ طبل بجتے ہی عثمانی کوچ کر دیتے ہیں اور جب تک حکم نہ ملے، اپنے قدم ہرگز نہیں روکتے۔ ہلکے اسلحہ سے مسلح ہونے کے باعث وہ ایک رات میں اتنی مسافت طے کر لیتے ہیں جتنی عیسائی تین دنوں میں طے کرتے ہیں۔''[1]

ایک صدی تک یورپ ایسی منظم افواج تیار کرنے سے قاصر رہا۔ شاہ فرانس چارلس ہشتم کے پندرہ فوجی دستے جو عہدِ جدید کی پہلی پیشہ ور فوج سمجھے جاتے ہیں، اُورخان کی فوجی اصلاحات کے ایک صدی بعد وجود میں آئے تھے۔[2]

بحیرۂ مرمرہ کے پار:

اللہ کے کلمے کو ہر خطے میں بلند کرنا اُورخان کا مقصد تھا۔ بورصہ جیسے مضبوط ساحلی شہر کو مرکز بنانے، آس پاس کے تمام قلعے اور شہر فتح کرنے کے بعد بھی اس نے یورپ پر حملہ کرنے میں جلدی نہیں کی۔ وہ نہایت محتاط اور دور اندیش انسان تھا اور جانتا تھا کہ جب تک اپنی سلطنت مضبوط نہ ہو، کوئی بڑی جنگ چھیڑنا خودکشی کے مترادف ہوتا ہے۔ پھر یہ جنگ کسی ایک ملک سے نہیں تھی بلکہ مقابلے میں یورپ کی درجنوں چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں۔

اُورخان مناسب وقت کا انتظار کرتا رہا، ایشیائے کوچک کے مفتوحہ شہروں کو خوشحال اور مستحکم بنانے اور ینی چری جیسی جانثار فوج کو تربیت دینے میں کئی سال گزر گئے۔ اس فوج کی تیاری کے بعد اورخان محسوس کر رہا تھا کہ اب تاریخ کا ایک نیا باب کھولنے کا وقت آ گیا ہے، مسلمانوں کو اب یورپ میں قدم رکھ کر ایک نئی دنیا بسانے کا کام شروع کر دینا چاہیے۔ ایسے میں مشیتِ الٰہیہ نے اس اقدام کے لیے ایک نادر موقع فراہم کر دیا۔

۷۴۲ھ (۱۳۴۱ء) میں قُسطَنطِینِیّہ کے بادشاہ اینڈرونیکس سوئم کی موت کے بعد شاہی خاندان میں پھوٹ پڑ چکی تھی، اس کا بیٹا جان پلیولوگس صرف ۹ سال کا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیر سلطنت کنٹا کوزین نے حکومت پر حاوی ہونے کی کوشش کی۔ ملکہ نے اس کی مخالفت کی، یوں ملکہ اور کنٹا کوزین کے درمیان کش مکش شروع ہو گئی۔ چھ سال تک سلطنت میں انتشار رہا۔ کانٹا کوزین قُسطَنطِینِیّہ میں گھسنے کی کوشش کرتا رہا مگر بے سود۔ آخر اس نے محسوس کیا کہ اس لڑائی میں اسی کا پلہ بھاری رہے گا جسے سمندر پار کے مسلم بادشاہ کی حمایت حاصل ہو گی۔ اس نے اُورخان کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کی عسکری مدد کرکے اسے جتوا دے تو دوستی کے اظہار کے لیے اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دے گا۔ اورخان کو اس طرح یورپ میں قدم رکھنے کا موقع مل رہا تھا، لہٰذا اس نے فوراً چھ ہزار سپاہی مدد کے لیے

---

(1) دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/ ۳۰، ۳۱ بحوالہ ہربرٹ گبنس (2) دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/ ۳۰

بھیج دیے، کنٹا کوزین ان کے تعاون اور دربار کے بعض امراء کی حمایت کے باعث قُسطَنطِینِیّہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ ملکہ کو اس سے صلح کرنی پڑی۔ طے یہ ہوا کہ بادشاہت ایک پینل پر مشتمل ہوگی جس میں پانچ افراد یعنی: ملکہ، شہزادہ جان پلیو لوگس، کنٹا کوزین، اس کی بیوی اور بیٹی شامل ہوں گے۔ کنٹا کوزین نے معاہدے کے مطابق اپنی ایک بیٹی کو (جو پینل کی رکن تھی) شہزادہ جان پلیو سے بیاہ دیا۔ دوسری بیٹی اُورخان کے نکاح میں دے دی۔

۷۵۶ھ (۱۳۵۵ء) میں قُسطَنطِینِیّہ کو ایک نئے خطرے کا سامنا پڑا۔ سربیا کا حاکم اسٹیفن ڈوسن بلغاریہ پر قابض ہوکر اپنی قوت بہت بڑھا چکا تھا۔ اس نے بازنطینی بادشاہت کو کمزور دیکھ کر اس کی ریاست سالونیکا پر قبضہ کرلیا اور پھر قُسطَنطِینِیّہ پر حملے کے لیے پر تولنے لگا۔ قُسطَنطِینِیّہ کے شاہی ارکان نے یہ دیکھ کر ایک بار پھر مسلمانوں سے مدد مانگی۔ اُورخان نے فوج بھیج دی جس نے اسٹیفن ڈوسن کو قُسطَنطِینِیّہ پہنچنے سے پہلے روکنے کی تیاری کرلی۔ تاہم لڑائی کی نوبت نہ آئی بلکہ اسٹیفن راستے میں مرگیا اور اس کی فوج منتشر ہوگئی۔ خطرہ ٹل جانے کے بعد مسلمان واپس آگئے۔

اُورخان کو سمندر پار جانے والے سپہ سالاروں سے یورپ کی ساحلی ریاستوں کے احوال معلوم ہوتے رہتے تھے۔ یہ مناسب ترین وقت تھا کہ اہلِ یورپ کے انتشار اور کمزوری کو غنیمت سمجھ کر وہاں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی جائے۔ چنانچہ اُورخان نے افواج کو تیار کرلیا اور بحیرۂ مرمرہ کی بحری پٹی درۂ دانیال پر ایسی چوکیاں قائم کردیں جہاں سے حکم ملتے ہی مسلمان سمندر عبور کرسکتے تھے۔ آخر کچھ مدت بعد آلِ عثمان کو یورپ میں باقاعدہ قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ ہوا یوں کہ قُسطَنطِینِیّہ میں کنٹا کوزین نے تمام شاہی اختیارات پر حاوی ہونے کی کوشش کی۔ ملکہ اور شہزادہ جان پلیو نے مزاحمت کی۔ ان کا پلہ بھاری دیکھ کر کنٹا کوزین نے پھر سلطنتِ عثمانیہ سے مدد مانگی اور بدلے میں یہ اجازت دی کہ مسلمان ساحل کے کسی بھی قلعے پر قابض ہوجائیں، اس کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔

اُورخان نے اس مہم کے لیے اپنے دلیر بیٹے ۳۸ سالہ سلیمان پاشا کو چنا جو سلطنت کا بیگلر بیگی (سپہ سالارِ اعلیٰ) تھا۔ اس وقت تک عثمانیوں کی سلطنت ابتدائی مراحل میں تھی اور اس کا سمندر میں زیادہ عمل دخل نہ تھا لہٰذا ان کے پاس کشتیوں یا بحری جہازوں کی تعداد اتنی نہ تھی کہ کوئی بڑی فوج ان پر سوار ہوسکتی۔ سلیمان پاشا نے اس کمی کو یوں دور کیا کہ لکڑیوں کے تختے جوڑ کر سادہ کشتیاں بنوائیں اور ان پر ۴۰ جانبازوں کے ساتھ ''کمر'' کے ساحل سے رات کی تاریکی میں ''درۂ دانیال'' کو عبور کرلیا۔ دوسری سمت اتر کر ان مجاہدین نے بازنطینیوں کی کشتیوں پر قبضہ کیا اور انہیں کھینچتے ہوئے واپس آگئے۔ ان کشتیوں سے اسلامی فوج پار اترتی رہی۔ یہ ۳۰ ہزار سپاہی تھے جنہیں لے کر سلیمان قُسطَنطِینِیّہ کی طرف بڑھا اور شہزادہ جان پلیو کو مغلوب کرکے کنٹا کوزین کی بادشاہت مستحکم کردی۔ اس مہم کے ساتھ ہی سلیمان پاشا نے ساحلی قلعے ''جمنی'' پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد مضافات میں اور بھی کئی قلعے فتح کرلیے گئے۔ [1]

---

[1] اخبار الدول: ۳ / ۱۱؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۲۴ تا ۱۲۷؛ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۶۶، ۶۷؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۹۵، ۹۶؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۹۱، ۹۲

گیلی پولی کی فتح:

یہاں سے نزدیک ترین بڑا شہر ''گیلی پولی'' تھا۔ وہاں کے حاکم 'تکور' نے مسلمانوں کی پیش قدمی کا جواب دینے کے لیے ایک بڑی فوج لے کر حملہ کیا۔ سلیمان کے ساتھ تھوڑے سے جانباز تھے مگر اس نے نہایت پامردی کے ساتھ حریف کا مقابلہ کیا اور اسے شکستِ فاش دے دی۔ اس دوران اچانک ایسا زلزلہ آیا کہ ''گیلی پولی'' کی فصیل منہدم ہوگئی۔ مسلمانوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور سیدھے شہر میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرلیا۔ یہ بہت بڑا اور مستحکم شہر تھا اور قُسطَنطِینِیّہ سے اس کا فاصلہ ۸۶ میل تھا۔ یہ شہر آئندہ کے لیے یورپ میں سلطنتِ عثمانیہ کا مرکز بن گیا۔ ①

رومیلی:

گیلی پولی کی فتح ترکانِ عثمان کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، کیوں کہ اب وہ فاتح کی حیثیت سے یورپ میں داخل ہو چکے تھے اور یہیں سے ان کے لیے فتح کی نئی راہیں کھلنے والی تھیں۔ مسلمانوں نے یورپ میں قدم رکھ کر تاریخ کو ایک نئی کروٹ دے دی تھی اور کفر و شرک میں ڈوبے اس براعظم میں ایک مسلم ریاست کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ بحیرۂ مرمرہ کے پار عثمانیوں کے فتح کردہ علاقے ان کی اصطلاح میں ''رومیلی'' کہلانے لگے۔ اگلے عشروں میں نئی فتوحات کے باعث ''رومیلی'' کے رقبے میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ یوں مجموعی طور پر دولتِ عثمانیہ کے دو یونٹ بن گئے:

❶ اناطولیہ: یعنی ایشیائے کوچک کے مقبوضات۔ ❷ رومیلی: یعنی سمندر پار کے مقبوضات ②

سلیمان پاشا کی مزید فتوحات اور وفات:

گیلی پولی کے فاتح سلیمان پاشا نے اپنے حسنِ سلوک، شائستگی و نرم دلی، مہربانی، عدل و انصاف اور وجاہت کی وجہ سے مفتوحہ علاقے کے شہریوں کے دل جیت لیے تھے۔ اس نے درۂ دانیال کے ساحل پر ترنب، جنا قلعہ، ابسالا، رودستو، قلعہ خیرہ پولی، ویزہ، تکفور اور طاغی جیسے مقامات بھی فتح کر لیے۔ یوں قُسطَنطِینِیّہ مغرب کی جانب سے بھی اسلامی عملداری کے حصار میں آگیا۔ دو سال بعد ۷۶۰ھ میں سلیمان شکار کے دوران اچانک گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہوگیا۔ اس کی عمر ۴۳ برس تھی۔ نہ صرف اورخان بلکہ تمام مسلمانوں کو اس کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔ عام خیال یہ تھا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو اپنے باپ اور دادا کی طرح ایک بڑا فاتح ثابت ہوتا۔ اسے بحیرۂ مرمرہ کے یورپی ساحل پر دفن کیا گیا تاکہ مسلمان کبھی یہاں سے پیچھے ہٹنے کا خیال دل میں نہ لائیں۔ ③

---

① اخبار الدول: ۳ / ۱۱؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از سید محمد، ص ۹۱، ۹۲؛ تاریخ الدّولۃ العلیۃ، ۱۲۳ تا ۱۲۷؛ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۶۶، ۶۷؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۹۵، ۹۶

② رومیلی: تطلق ھذہ التسمیۃ علی الولایات الترکیۃ التی کانت تضم (تراقیا) و (مقدونیا) و (بلغاریا) و (الصرب) و (البانیا) وجمیع جزائر (بحر إیجہ) ای علی البقاع الأوربیۃ التی کانت تخضع للدولۃ العثمانیۃ (تعریف بالاماکن الواردہ فی البدایۃ والنہایۃ: ۲/ ۲۲، ط مکتبۃ شاملہ)
قارئین ''رومیلی'' کی اصطلاح کو اچھی طرح ذہن میں رکھیں تاکہ اگلی ابحاث میں کوئی الجھن نہ ہو۔

③ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۳۶؛ تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/ ۱۸۳؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۹۶

شہزادہ مراد خان:

سلیمان کی وفات کے بعد اُورخان نے اس کے مفتوحہ علاقے اپنے دوسرے بیٹے مراد خان کی تحویل میں دے دیے اور اسے رومیوں سے جہاد جاری رکھنے کا حکم دیا۔ مراد اس حکم پر بحیرۂ مرمرہ عبور کر کے گیلی پولی پہنچا اور افواج تیار کر کے ''جورلی'' پر حملہ کیا جو قُسطنطینیہ سے تین دن (۲۴ء۷ کلومیٹر) کی مسافت پر تھا۔ اس کی فتح کے بعد اس نے 'دیمو قہ' سمیت کئی اور قلعے بھی سر کر لیے۔ سلطنتِ عثمانیہ نے حسبِ وعدہ شاہِ قُسطنطینیہ کے خلاف کوئی مہم جوئی نہیں کی اور وہاں کی اندرونی سیاست میں کوئی دخل نہیں دیا۔ مگر کچھ مدت بعد خود قُسطنطینیہ کے عوام کنتا کوزین کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ مسلمانوں کو یورپ میں لانے کا سبب بنا ہے۔ بغاوت کامیاب ہوئی۔ کنتا کوزین کو تخت چھوڑ کر گوشہ نشین ہونا پڑا۔ اس کی جگہ شہزادہ جان پلیولوگس چہارم (یوحنا خامس) بادشاہ بن گیا۔ اس نے یورپی ساحل پر آلِ عثمان کی مزید فتوحات سے بچنے کے لیے ان سے صلح کر لی اور مفتوحہ شہروں پر ان کا قبضہ تسلیم کر لیا۔ مسلمانوں نے جان پلیولوگس سے معاہدے کا پورا احترام کیا اور وہ ۵۱ سال حکومت کر کے ۷۶۳ھ میں فوت ہوا۔ [1]

اُورخان کی وفات...... سیرت اور کارناموں پر ایک نگاہ:

اُورخان کو اپنے جیالے بیٹے سلیمان پاشا کی ناگہانی موت کا سخت صدمہ تھا جس کے باعث وہ بیمار پڑ گیا اور بیٹے کی وفات کے فقط ایک سال بعد ۷۶۱ھ میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسے پایۂ تخت بورصہ میں دفن کیا گیا۔ اس کی عمر ۸۳ سال تھی۔ اس نے ۳۵ سال حکومت کی اور سلطنتِ عثمانیہ کو نہایت مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ اس نے اپنے باپ کی دی ہوئی ریاست میں چھ گنا اضافہ کر کے اسے ۹۵ ہزار مربع کلومیٹر تک پہنچا دیا تھا۔ [2]

وہ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت سے مالا مال تھا۔ نہایت سخی، فیاض، عادل اور سادگی پسند تھا۔ سلطنت کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود عبادت و ریاضت کے لیے خاصا وقت نکالتا تھا۔ اس کے نانا شیخ قرمانی ایک صوفی بزرگ تھے، اورخان ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ وہ علماء اور درویشوں کی صحبت کو غنیمت سمجھتا تھا۔ نامور علمائے دین اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ خانقاہوں، مدارس اور مساجد کی تعمیر اس کی زندگی کا خاص مشغلہ تھے۔ بازنطینیوں کے ایشیائی مرکز ''ازنیق'' میں پہلی جامع مسجد اور ایک عظیم درس گاہ اسی کے صدقاتِ جاریہ میں شامل تھیں۔ [3]

---

① التاریخ الاسلامی محمود شاکر: ۸/۲۳،۶۴

② تاریخ الدولۃ العثمانیہ ازیلماز، ص ۹۷

③ اخبار الدول: ۳/ ۱۱، ۱۲؛ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۳۶

مرادخان اوّل

۷۶۱ھ تا ۷۹۱ھ

(۱۳۶۰ء تا ۱۳۸۹ء)

اُورخان کے بعد اس کا ولی عہد مرادخان تخت نشین ہوا۔ وہ ۷۲۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ حکومت سنبھالتے وقت اس کی عمر ۳۴ سال تھی۔[۱] وہ ایک اولوالعزم، ہوشیار، جنگجو، دوراندیش اور مہربان انسان تھا۔[۲]

ابتدائی مہمات

اگرچہ اُورخان نے اپنی ریاست کی حدود میں خاصا اضافہ کیا مگر اب بھی اناطولیہ کا زیادہ حصہ دیگر ریاستوں پر مشتمل تھا۔ مرادخان کی تخت نشینی کے وقت دولتِ عثمانیہ اناطولیہ کے شمال مغربی حصے پر قائم تھی۔ اس کے علاوہ یورپ میں گیلی پولی اور تھریس کا کچھ حصہ اس کے قبضے میں تھا جہاں کچھ مسلمان آباد ہو گئے تھے۔

انگورہ کی فتح:

مرادخان نے بڑی تیزی سے اپنی حدودِ سلطنت کو وسعت دی۔ اس نے اپنے اقتدار کے پہلے سال ۷۶۱ھ میں ایشیائے کوچک کے وسطی شہر "انگورہ" (انقرہ) پر فوج کشی کی جو دنیا کے مضبوط ترین شہروں میں سے ایک تھا۔ اس کے گردونواح میں وسیع چراگاہیں تھیں جہاں بھیڑ بکریوں کے ہزاروں ریوڑ چرتے تھے۔ ان مویشیوں سے حاصل شدہ اون پوری دنیا میں برآمد کی جاتی تھی۔ یہاں کے حکام قرامانیوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث عثمانی سلاطین کے مخالف بن چکے تھے۔ مرادخان نے انہیں مہلت نہ دی اور بہت جلد یہ شہر فتح کر لیا۔ لارندہ کے حاکم ابن قرمان کو انگورہ کی فتح سے سخت تشویش ہوئی۔ اس نے تاتاریوں اور ترکمانوں کے کئی قبائل کو ملا کر مرادخان کے خلاف چڑھائی کر دی مگر مرادخان نے حملہ آوروں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا اور آخر کار متحدہ افواج پسپائی پر مجبور ہو گئیں۔[۳]

ادرنہ (ایڈریانوپل) کی فتح:

مرادخان قُسطَنطِینِیَّہ فتح کرنے کا خواہش مند تھا مگر وہ بخوبی جانتا تھا کہ دنیا کے اس مستحکم ترین شہر پر مشرق سے

---

① اخبارالدول: ۱۳/۳ ② تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۳۹ ③ اخبارالدول: ۱۳/۳؛ تاریخ عثمانی از ازون: ۱۸۷/۱

کیا گیا ہر حملہ ہمیشہ ناکام ہوا ہے۔اس کی فتح کا زیادہ امکان مغرب کی طرف سے ہے۔اس نے قسطنطنیہ سے معاہدے کا احترام کرتے ہوئے فی الحال اسے بالکل نہ چھیڑا، البتہ اس کے مغرب اور شمال میں مہمات جاری رکھیں۔

۷۶۱ھ میں اس نے اپنے سپہ سالار اتابک لالہ شاہین کو ''ادرنہ'' (ایڈریانوپل) کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ گلستانوں، چشموں اور نہروں سے مالا مال یہ شہر قسطنطنیہ سے ۹۵ میل دور تھا اور یورپ کے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہاں شاہین لالہ کا حملہ ناکام رہا۔آخر مراد خان خود درہ دانیال عبور کر کے محاذ پر آیا اور گھمسان کی جنگ کے بعد شہر فتح کر لیا۔اب بلقان میں تھریس (تراقیا) اور مقدونیہ سمیت جنوبی بلغاریہ کے تمام شہر اس کی زد میں تھے۔[1]

ینی چری فوج کی تشکیل

اپنی تخت نشینی کے تیسرے سال سلطان مراد اوّل نے اپنے زیر کمان جانثاروں کی ایک خصوصی فوج تیار کرانا شروع کی جو ''ینی چری'' کہلائی۔اس فوج کا مشورہ اسے اس کے وزیر قرہ خلیل (خیر الدین پاشا) نے دیا تھا۔اس کا حاصل یہ تھا کہ جنگوں میں یتیم یا لاوارث ہو جانے والے لڑکوں، نومسلموں کے بچوں اور کم عمر نصرانی قیدیوں کے لیے خصوصی تربیتی مراکز کھولے جائیں تاکہ نومسلم خاندانوں کو حکومت کی نوازشوں سے خصوصی حصہ ملے اور قیدیوں یا لاوارث بچوں جیسے معطل عنصر کو مروجہ علوم اور حربی فنون سکھا کر ملک وقوم کے لیے باعثِ فخر بنا دیا جائے۔

طے پایا کہ اس طرح تشکیل پانے والی فوج خاص بادشاہ کی کمان میں ہوگی جن کا کسی قبیلے، کسی خاندان یا سلطنت کے کسی اور عہدے دار سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔اس کے سپاہیوں کو اعزاز کے طور پر بادشاہ کی اولاد قرار دیا جائے گا، وہ بادشاہ کو اپنا باپ کہیں گے، اسلامی ماحول میں نشوونما اور تعلیم کے باعث وہ پختہ اور باکردار مسلمان ثابت ہوں گے اور بادشاہ کی خصوصی توجہ اور عنایات کی وجہ سے وہ ہمیشہ تاج وتخت کے وفادار رہیں گے۔چنانچہ کچھ لڑکے لے کر اس مہم کا آغاز کیا گیا۔درسگاہ کا ماحول ایسا رکھا گیا کہ طلبہ مروجہ علوم اور فنون حربیہ سیکھتے ہوئے اسلامی اقدار سے مانوس، ایمانی تعلیمات پر عمل پیرا، اخلاق وکردار میں یکتا اور سرکاری اعزازات سے آراستہ ہو کر تمام شہریوں کے لیے رشک کا سبب بننے لگے۔اس تدبیر سے رفتہ رفتہ مقامی نصرانی اسلام کے قریب آنے لگے یہاں تک کہ اگلی صدیوں میں یہاں سو فیصد آبادی مسلمانوں کی دکھائی دینے لگی۔[2] جب اس درسگاہ کی پہلی کھیپ فارغ ہوئی تو اسے دعائے خیر کے لیے ایک صوفی بزرگ حاجی بکتاش کی خانقاہ میں بھیجا گیا۔حاجی بکتاش نے ان جوانوں کے لیے فتح ونصرت کی دعا کی اور اپنے کرتے کی آستین پھاڑ کر ان کے افسر کے سر پر باندھ دی اور اس فوج کا نام ''ینی چری'' تجویز کیا، یعنی جدید فوج۔[3]

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۲۸ تا ۱۳۰

② نصرۃ اهل الایمان، ص۵۷؛ اخبار الدول: ۳/۴؛ الدولۃ العثمانیہ از الصلابی، ص ۵۲؛ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/۶۴

③ اخبار الدول: ۳/۴، اس کا عربی تلفظ ''ینی تشاری'' تھا جو بعد میں ''انکشاری'' ہوگیا۔

ینی چری کی خصوصیات:

ینی چری سپاہی چمڑے کی سفید ٹوپیاں پہنتے تھے۔[1] باقی وردی میں بھی سفید رنگ غالب تھا۔ وردی میں کاندھوں اور پشت کے کچھ حصے پر ایک امتیازی پارچہ سلا ہوتا تھا جسے ''پاتر تما'' کہتے تھے۔ سپاہی اپنی ٹوپیاں ترچھی رکھتے تھے جبکہ افسر کی ٹوپی سیدھی ہوتی تھی جسے ''اسکوف'' کہا جاتا تھا۔ اس پر سیاہ امتیازی دھاری ہوتی تھی۔[2]

فوج کا پرچم سرخ ہلالی تھا اور ہلال کے نیچے ایک تلوار تھی جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کی طرف منسوب کر کے ''ذوالفقار'' کہا جاتا تھا۔[3] ینی چری کو تیغ زنی، نیزہ بازی اور شہ سواری کے علاوہ مورچے اور فصیلیں توڑنے اور تیر چلانے کی خصوصی تربیت دی جاتی تھی۔ بعد میں بندوق اور توپ چلانا بھی تربیت میں شامل ہوگیا۔[4]

ینی چری کے افسرِ اعلیٰ کو ''آقاسی'' نائب سپہ سالار کو ''سکبان باشی'' اور علمبردار کو ''بیرقدار'' کہا جاتا تھا۔[5] نیز شوربجی باشی (افسرِ مطبخ) سقا آغاسی (افسرِ آب رسانی)، اودہ باشی (افسرِ خیمہ شاہی) بھی اہم عہدیدار تھے۔[6]

ینی چری فوج عثمانی سلاطین کا بازوئے شمشیر زن تھی۔ اس نے بے شمار جنگوں اور معرکوں میں شجاعت و بسالت کے ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔ ان نوجوانوں میں نومسلموں جیسا جوش وجذبہ اور قربانی کا ولولہ تھا۔ پھر انہیں بادشاہ کا جو قرب اور اعتماد نصیب تھا، اس کے لیے وہ دنیا کی ہر چیز نچھاور کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔

ینی چری فوج کے مدارس دنیا میں قائم ہونے والے پہلے ''کیڈٹ کالجز'' تھے۔ ان میں داخل ہونے والے طلبہ کو ایسی سہولیات اور مراعات دی جاتی تھیں کہ وہ معاشرے میں فخر سے سر اونچا کر کے چلتے تھے۔ ان کے لیے اعلیٰ عہدوں کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عثمانی فوج کے برّی و بحری جرنیلوں میں یورپی نسلوں سے تعلق رکھنے والے بکثرت تھے۔ ینی چری میں داخلے کے لیے کبھی نصرانی شہریوں پر دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ اس فوج کا اکثر حصہ نومسلم یورپیوں کی اولاد یا جنگوں میں یتیم ہوجانے والے یورپی بچوں پر مشتمل تھا۔ ایسے بچے بھی تھے جو نصرانی شہریوں کی اولاد تھے جنہیں سرپرستوں نے سرکاری مراعات کے حصول کے لیے بخوشی ان درس گاہوں میں بھرتی کرایا تھا۔ ایسے بچوں کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا جنہیں والدین سے چھین کر جبراً تربیت دی گئی ہو۔[7]

سلطان مراد رابع کے دور (گیارہویں صدی ہجری مطابق سترہویں صدی عیسوی) میں اس فوج سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد اتنی ہوگئی کہ انہی کی آل اولاد کو ''ینی چری'' میں بھرتی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔[8]

---

① تاریخ عثمانی از اوزون: ۵۷٦/۱
② نصرہ اهل الایمان، ص ۵۷ ؛تاریخ عثمانی از اوزون: ۵۷٦/۱، ۵۷۷
③ الدولة العثمانیه از الصلابی، ص ۵۵
④ تاریخ عثمانی از اوزون: ۵۷۷/۱
⑤ تاریخ عثمانی: ۵۷٦/۱
⑥ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۲۳
⑦ دولتِ عثمانیه از ڈاکٹر محمد عزیر: ۲۸/۱
⑧ فی اصول التاریخ العثمانی از احمد عبدالرحیم مصطفیٰ، ص ۴۳، ۴۴ ؛ دولتِ عثمانیه از ڈاکٹر عزیز: ۲۸/۱

ملحوظہ: راقم نے جہاں تک دیکھا ہے، زیادہ تر قدیم مآخذ میں ینی چری کی تشکیل مراد خان اوّل کے دور کا واقعہ بتائی گئی ہے۔ (نصرۃ اہل الایمان، ص ۵۷؛ اخبار الدول: ۱۴/۳) جبکہ بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق یہ اورخان اوّل کے دور کا واقعہ تھا اور اکثر جدید مؤرخین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۲۲، ۱۲۳؛ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۶۴/۸؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر محمد عزیر: ۲۸/۱)

کیا عثمانیوں کی فتوحات کا انحصار ینی چری پر تھا؟

مشہور ہے کہ ینی چری فوج شروع سے عثمانیوں کا سب سے غالب عنصر تھی اور دولتِ عثمانیہ کی فتوحات کا انحصار انہی پر تھا۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ ینی چری کے فعال ہونے میں شک نہیں مگر اس میں چنیدہ نوجوان رکھے جاتے تھے جس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سلطان مراد اوّل اور بایزید یلدرم کے دور میں ''ینی چری'' دستے میں ایک ہزار یا اس سے بھی کم سپاہی تھے۔ سلطان محمد (فاتحِ قُسطَنطِینِیّہ) کے دور میں ینی چری جوان فقط بارہ سو تھے۔ البتہ سلیم اوّل کے دور میں ینی چری دستے میں نمایاں اضافہ دکھائی دیتا ہے، تب یہ فوج دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ سلیمان قانونی کے زمانے میں یہ تعداد بارہ ہزار تک چلی گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود اسے فوج کا غالب عنصر نہیں کہا جاسکتا تھا کیوں کہ عثمانی لشکر کے مجموعی سپاہی ایک لاکھ سے زیادہ تھے۔

قُسطَنطِینِیّہ کی فتح کے بعد ایک صدی تک ینی چری فوج اپنی سابقہ ہیئت پر باقی رہی۔ اس کے بعد اس نے ایک مراعات پسند اور لاڈلے گروہ کی حیثیت اختیار کرلی جس سے کام لینا سلاطین کے لیے مشکل ثابت ہوتا رہا۔ اسے کارآمد بنائے رکھنے کے لیے سلاطین نے اس کی ترتیب وتنظیم میں مختلف تبدیلیاں کیں جس کے باعث یہ اپنی قدیم ہیئت پر باقی نہ رہی۔ غیر مسلم یا نو مسلم خاندانوں کے بچوں کو لے کر تربیت دینے کا سلسلہ ختم ہوگیا اور سترہویں صدی عیسوی میں سلطان مراد رابع کے حکم سے ینی چری سپاہیوں ہی کی آل اولاد اور مقامی ترکوں کو ''ینی چری'' میں بھرتی کیا جانے لگا۔ یوں چنیدہ جوانوں کی جگہ ہر معیار کے افراد فوج کا حصہ بننے لگے جس سے تعداد بڑھ گئی مگر نظم وضبط بگڑ گیا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے عثمانی فرمانروا سلطان محمود ثانی کے دور میں ینی چری کی تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار تھی۔ درحقیقت ینی چری کی تعداد میں اضافہ اس کے زوال کا سبب بن گیا تھا۔

اس سارے جائزے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ینی چری فوج عثمانیوں کے دورِ آغاز اور دورِ عروج میں فوج کا غالب حصہ ہرگز نہ تھی بلکہ وہ منتخب نوجوانوں پر مشتمل دستہ تھا جس کا کام سلطان کی حفاظت کرنا اور اس کی کمان میں لڑنا تھا۔[1]

بچوں کی جبری بھرتی کا پروپیگنڈا اور اس کا جواب:

مغربی مؤرخین سلطنتِ عثمانیہ کو بدنام کرنے کے لیے یہ بے بنیاد اور بے سند پروپیگنڈا کرتے آئے ہیں کہ عثمانی سلاطین نے عیسائی شہریوں پر لازم کردیا تھا کہ وہ ہر گاؤں، بستی اور آبادی سے ایک خاص تعداد میں اپنے بچوں کو اس درسگاہ میں بھیجیں۔ یعنی یہ ایک جبری بھرتی تھی جو انسانی حقوق کے خلاف تھی۔ اس طرح کا پروپیگنڈا کرکے مستشرقین نے عثمانی سلاطین کی جی بھر کے کردارکشی کی ہے۔ حالاں کہ اس الزام کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ دولتِ عثمانیہ کے دورِ عروج تک ینی چری میں اتنے جوان بھرتی کیے ہی نہیں گئے کہ ہر گاؤں اور بستی سے بچے لینے کی ضرورت ہوتی۔ اور بعد میں جب بھرتی کا دائرہ بڑھایا گیا تو اس میں ینی چری کی اولاد یا عام ترک شہری لیے جانے لگے تھے۔

---

① فی اصول التاریخ العثمانی از احمد عبدالرحیم مصطفی، ص ۴۳،۴۴ ؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۸/۱

اس سے پہلے ینی چری میں لیے گئے لڑکے چنیدہ اور منتخب ہوتے تھے جو یا تو مسلم والدین کی اولاد تھے یا جنگوں میں قتل ہونے والے نصرانیوں کے لاوارث بچے تھے جن کی کفالت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ان کے لیے محفوظ اور بہتر مستقبل کا انتظام کرنا ویسے بھی سلطنت کی ذمہ داری تھی۔ عثمانی سلاطین نے اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دیا اور ایسے بہت سے بچوں کو ینی چری بنا کر ملک وملت کی خدمت کا موقع دیتے ہوئے ایسا محفوظ اور روشن مستقبل فراہم کیا جسے آج بھی ہر شخص اپنی اولاد کے لیے حاصل کرنا پسند کرے گا۔ عثمانی سلاطین پر نصرانی بچوں کی فوج میں جبری بھرتی کا الزام ڈاکٹر گب اور کارل بروکلمان جیسے مستشرقین نے عائد کیا تھا۔ اس کے بعد مستشرقین سے مواد لینے کے عادی کئی مسلم مؤرخین نے اسے من وعن نقل کر دیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ بات گویا ایک مسلمہ سچائی قرار دے دی گئی ہے، جبکہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ①

مرادخان کا بازنطینیوں اور یورپی طاقتوں کے خلاف جہاد

ایڈریانوپل (ادرنہ) کی فتح کے بعد بازنطینیوں کے پاس شمالی تھریس، مقدونیا اور موریا کے کچھ علاقے بچ گئے تھے جنہیں ترک کسی بھی وقت فتح کر سکتے تھے۔ درحقیقت بازنطینیوں کی حالت بڑی ابتر تھی جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس وقت انہیں یورپ کی کسی سلطنت کی جانب سے مدد میسر نہیں تھی۔ لہٰذا بازنطینیوں پر حملے کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔

تھریس کی فتح:

تاہم سلطان مراد نے قُسطَنطِینیّہ سے کیے گئے معاہدے کا احترام برقرار رکھتے ہوئے وہاں حملے سے گریز کرتے ہوئے گردونواح کے قلعوں اور شہروں پر فوج کشی کی۔ پہلے قُسطَنطِینیّہ سے پانچ میل دور واقع قلعہ شورلو اور پھر قلعہ ''کرک کلیسے'' مسخر کیا گیا۔ بازنطینی اس صورتحال سے گھبرا کر خود مقابلے پر نکل آئے مگر ''اسکی بابا'' کے مقام پر گھمسان کی جنگ میں انہیں سلطان کے ہاتھوں شکستِ فاش ہوئی۔ ترکوں کی پیش قدمی جاری رہی۔ ۷۶۳ھ (۱۳۶۲ء) میں ''مقدونیا'' فتح کر لیا گیا۔ اگلے سال عثمانی جرنیل اورنوس بیگ نے ''وردار'' اور ''گمولجینہ'' فتح کر لیے۔

اُدھر سلطان کے سپہ سالار لالہ شاہین نے آگے بڑھ کر کوہِ بلقان کے جنوب میں واقع فلپہ (فلپو پولس) بھی بازنطینیوں سے چھین لیا۔ یوں تقریباً سارا تھریس عثمانیوں کے قبضے میں آگیا۔ یہ فتوحات ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) میں ہوئیں۔ ② بازنطینی بادشاہ کو اس شکست کے فوراً بعد مجبور ہو کر عثمانیوں سے صلح کرنا پڑی جس کی شرائط یہ تھیں:

① بازنطینی عثمانیوں کا فتح کیا ہوا تھریس کا علاقہ واپس لینے کی کوشش نہ کریں گے۔

---

① الدولة العثمانیہ از صلابی، ص ۵۲ تا ۵۵

② دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیر: ۱/ ۳۰، ۳۱؛ تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز: ۱/ ۹۸؛ تاریخ عثمانی: ۱/ ۱۹۱، ۱۹۲؛ الدولة العلیة، ص ۱۳۰

ملحوظہ: فلپو پولس شہر بلغاریہ کے موجودہ دارالحکومت صوفیہ اور ''ایڈریانوپل'' کے مابین نصف مسافت پر واقع ہے۔

۳ بازنطینی عثمانیوں کے خلاف یورپی طاقتوں کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔

۴ عثمانیوں کی ترکی کی آزاد ریاستوں سے لڑائی کی صورت میں بازنطینی دولتِ عثمانیہ کی مدد کریں گے۔ [1]

یورپ کی عثمانیوں کے خلاف صف آرائی اور اس کی وجہ:

یورپ میں قدم رکھنے کے باوجود اب تک عثمانیوں کا مقابلہ فقط بازنطینیوں سے تھا۔ یورپ کی باقی طاقتوں نے اس محاذ آرائی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ دنیائے نصرانیت دوصد سالہ صلیبی جنگوں سے تھک ہار چکی تھی اور اب سستانے، اپنی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرنے یا باہم اکھاڑ پچھاڑ میں مصروف تھی۔ دوسری وجہ یونانی اور اطالوی کلیساؤں کی کش مکش تھی جس کے باعث یورپی طاقتیں قُسطَنطِینِیَّہ سے فاصلہ رکھے ہوئے تھیں۔ تاہم عثمانیوں کے فلیو پولس فتح کرنے کے بعد صورتحال تبدیل ہوچکی تھی۔ اگرچہ عثمانیوں نے یہ شہر بازنطینیوں سے چھینا تھا مگر یہ جغرافیائی لحاظ سے بلغاریہ میں واقع تھا۔ اس کی فتح نے مسلمانوں کے لیے وسطی یورپ کی شاہراہ کھول دی تھی۔ یہ دیکھ کر یورپی حکام بے چین ہوگئے۔ ان کے اتفاقِ رائے سے پوپ اربن پنجم نے ایک نئی صلیبی جنگ کا اعلان کردیا اور ہنگری، رومانیہ اور سربیا اور بوسنیا کے بادشاہوں کو حکم دے دیا کہ وہ مل کر مراد خان کی سرکوبی کریں۔ [2]

جنگِ مارٹیزا:

آخر ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) میں ساٹھ ہزار نصرانیوں کا لشکر سلطنت عثمانیہ کے نئے مقبوضات کی طرف بڑھا۔ مراد خان یہ خبر سنتے ہی دار الحکومت بورصہ سے نکلا اور سمندر پار کرکے حریف کی طرف روانہ ہوا۔ تاہم اس سے پہلے اس کا بیگلر بیگ لالہ شاہین ''ادرنہ'' سے اپنے سپاہیوں کو لے کر محاذ کا رخ کر چکا تھا۔ اتحادی افواج دریائے مارٹیزا عبور کر رہی تھیں جو بلغاریہ کے پہاڑوں سے نکل کر جنوب مشرق کی طرف بہتے ہوئے بحیرۂ ایجئین میں جا گرتا ہے۔ لالہ شاہین کا دستِ راست حاجی ایل بیگ تیزی سے یلغار کرتا ہوا اتحادیوں پر حملہ آور ہوگیا جو دریا کے کنارے خیمہ زن تھے۔ اس خونریز تصادم میں تقریباً پوری حملہ آور فوج ماری گئی۔ سربیا کا حاکم فرار ہوتے ہوئے دریائے مارٹیزا میں غرق ہوگیا۔ شاہِ ہنگری کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور اپنے ملک پہنچ کر ایک گرجا تعمیر کرا کے جان بچنے کا شکرانہ ادا کیا۔ [3]

جنگِ مارٹیزا کے اثرات:

جنگِ مارٹیزا کے اثرات بڑے دوررس نکلے۔ اہم ترین اثرات درجِ ذیل ہیں:

۱ اس جنگ نے یہ ثابت کردیا کہ ترک یورپ کی ہر طاقت کو شکست دے سکتے ہیں۔

۲ اس فتح کے بعد کوہِ بلقان کے جنوب کا اکثر علاقہ سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہوگیا۔

---

[1] دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/۳۰، ۳۱؛ تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز: ۱/۹۸؛ تاریخ عثمانی: ۱/۱۹۱، ۱۹۲

[2] الدولة العثمانیة از الصلابی، ص ۵۸، ۵۹؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/۴۱، ۴۲؛ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۳۱

[3] الدولة العثمانیہ از صلابی، ص ۵۸، ۵۹؛ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۳۱؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز، ص ۴۱؛ تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۱۹۳، ۱۹۴؛ تاریخ الدولة العثمانیہ از یلماز: ۱/۹۸

③ قُسطَنطِینِیَّہ تقریباً ہر طرف سے عثمانی مفتوحات سے گھر گیا اور یورپ سے اس کا زمینی رابطہ تقریباً ختم ہوگیا۔
④ عثمانیوں کی سرحدیں بلغاریہ کے جنوب اور سربیا کے مشرق سے جالگیں۔
⑤ شاہِ قُسطَنطِینِیَّہ سے بھی معاملات ازسرنو طے کیے گئے، اس نے عثمانیوں کی باج گزاری قبول کرکے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ جنگوں میں انہیں فوجی مدد دیا کرے گا۔[1]

پایۂ تخت بورصہ سے ادرنہ منتقل:

جنگِ ماریٹزا کے بعد مراد خان نے یورپ میں مزید پیش قدمی کا فیصلہ کرلیا اور اس مقصد کے لیے ''بورصہ'' کی بجائے یورپ کے نومفتوحہ علاقے ''تھریس'' کے شہر ''ڈیموٹیکا'' کو اپنا پایۂ تخت بنالیا۔ دو سال بعد ۷۶۶ھ (۱۳۶۵ء) میں اس نے پایۂ تخت ''ادرنہ'' منتقل کرلیا جو قُسطَنطِینِیَّہ کی فتح تک عثمانیوں کا مرکزِ سلطنت رہا۔[2]

بلقان میں فتوحات:

جنوب مشرقی یورپ میں جبلِ اسود، رومانیا، بوسنیا، ہرزگوینا، سربیا، کروشیا، یوگوسلاویہ اور مقدونیہ کا مجموعی علاقہ جو چار لاکھ ۶۶ ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے، ''بلقان'' کہلاتا ہے۔ ۷۶۸ھ (۱۳۶۷ء) میں سلطان مراد کی فوجیں بلقان کی منتشر ریاستوں میں داخل ہوگئیں جو باہمی انتشار کے باعث کوئی متحدہ دفاعی محاذ بنانے سے قاصر تھیں۔

اب ان کے سامنے بلغاریہ تھا۔ شاہِ بلغاریہ یووان شیشمان عثمانیوں کے لیے ایک سخت جان حریف تھا جو بلغاریہ کے جنوبی صوبوں، تھریس کے کچھ حصے اور بلقان میں ''طونہ'' سے دریائے روڈوب تک کے وسیع علاقے کا مالک تھا۔

سب سے پہلے سلطان کے افسر تیمور تاش پاشا نے شمال کی طرف بڑھ کر بلغاریہ کے شہر ''یانبولی'' (دیام پولس) پر قبضہ کیا جبکہ لالہ شاہین نے بلغاریہ کے پایۂ تخت ''صوفیہ'' کے جنوب میں واقع ''اختمان'' (سامان کوف) کو مسخر کرلیا۔

اگلے سال ۷۶۹ھ (۱۳۶۸ء) میں سلطان مراد نے خود فوج کشی کی اور کوہِ بلقان کے جنوب میں واقع ''آیڈوس'' پر قبضہ کرلیا۔ پھر ''سوزہ پولی'' اور ''خیرہ پولی'' بھی فتح کرلیے۔ ۷۷۰ھ (۱۳۶۹ء) میں، ''پنار حصار''، ''ویزہ'' اور ''قرق کلیسا'' مسخر ہوگئے۔ یوں بلغاریہ کے جنوبی اضلاع میں کوہِ روڈوپ تک کا علاقہ فتح ہوگیا۔

شاہِ بلغاریہ شیشمان نے ہمت ہار کر خراج ادا کرنے کا معاہدہ کیا اور اپنی بہن سلطان کے حرم میں داخل کرکے صلح کرلی جس کے نتیجے میں کوہِ بلقان کے شمال میں واقع بلغاریہ کے شہر اس کے پاس رہنے دیے گئے۔[3]

جنگِ سماکوف:

تاہم شیشمان نے یہ معاہدہ دفع الوقتی کے لیے کیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ بلغاریہ تنہا عثمانیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

---

① الدولة العثمانیه از صلابی، ص ۵۹، ۶۰؛ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۳۱، ۱۳۲؛ تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/ ۹۹، دولتِ عثمانیه ازڈاکٹر عزیر، ص ۳۲؛ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۶۸، ۶۹

② دولتِ عثمانیه ازڈاکٹر عزیر، ص ۳۲

③ تاریخ عثمانی: ۱/ ۱۹۷

چنانچہ معاہدے کے ذریعے خود کو مکمل شکست سے بچا کر اس نے وقت حاصل کیا اور شاہ سربیا ''لازار'' کو جواب تک ان جنگوں میں حصہ دار نہیں بنا تھا، اپنے ساتھ ملا لیا جس کے نتیجے میں ۷۷۲ھ (۱۳۷۱ء) سربوں اور بلغاریوں کی متحدہ افواج نے عثمانیوں کے خلاف پیش قدمی کی۔ اُدھر سے عثمانی جرنیل لالہ شاہین اپنی افواج لے کر اٹھا۔ ''صوفیہ'' کے قریب ساکوف کے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں نصرانی اتحاد کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ کے نتیجے میں کوہ بلقان تک بلغاریہ کا تمام علاقہ سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہو گیا۔ [1]

سربیا پر حملہ:

اب سربیا کو بلغاریوں سے اتحاد کا مزہ چکھانا ضروری تھا لہٰذا سلطان مراد خان نے کسی توقف کے بغیر اُدھر افواج بھیج دیں۔ پہلے یہ افواج ''مقدونیہ'' اور ''گومولجینہ'' کی طرف بڑھیں۔ ''مقدونیہ'' اسٹیفن ڈوشن کے زمانے سے سربیا کا حصہ چلا آرہا تھا۔ عثمانیوں نے ۷۶۳ھ (۱۳۶۲ء) میں مقدونیا اور ۷۶۴ھ (۱۳۶۲ء) میں ''گمولجینہ'' فتح کر لیے تھے مگر بلغاریوں سے اتحاد کے بعد سربیا نے بغاوت کر کے یہ علاقے واپس لے لیے تھے۔ اب عثمانیوں نے یہ دونوں شہر دوبارہ فتح کیے۔

اس کے بعد ''ایسکہ چہ''، ''مورولیہ''، ''قوالہ''، ''درمہ''، ''زخنہ'' اور ''سریز'' کے شہر سرنگوں ہوئے۔ آخر میں عثمانی افواج دریائے وروار کو عبور کر کے قدیم سربیا، البانیا اور بوسنیا میں داخل ہو گئیں۔ سلطان مراد کے جرنیل اورنوس بیگ اور وزیرِ سلطنت قرہ خلیل (خیر الدین پاشا) نے ان فتوحات میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ جنگیں تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہیں جن کے نتیجے میں دریائے دورار کے مشرق کا تمام علاقہ فتح ہو گیا جبکہ اس کے مغرب میں عثمانیوں کے حملے جاری تھے۔ ان حالات میں سربیا کے بادشاہ لازار نے شکست قبول کر کے صلح کی درخواست کی اور خراج دینا منظور کر لیا۔

اس دوران بلغاریہ میں بھی پیش قدمی جاری تھی۔ ۷۷۳ھ (۱۳۷۲ء) میں لوہے کی صنعت کے لیے مشہور شہر ''کوسٹنڈیل'' بھی فتح ہو گیا۔ آخر شاہِ بلغاریہ نے مجبور ہو کر عثمانیوں کی باج گزاری اختیار کر لی۔ [2]

الغرض ۷۶۸ھ (۱۳۶۷ء) سے ۷۷۲ھ (۱۳۷۱ء) تک جاری ان جنگوں کا اہم ترین اثر یہ ہوا کہ پہلی بار یورپی ممالک سلطنتِ عثمانیہ سے معاہدوں پر مجبور ہو گئے۔ [3]

جنگِ چرمن:

مگر بلغاریہ نے زیادہ مدت تک عہد و پیمان باقی نہ رکھا۔ اس نے سربیا اور رومانیہ کے ساتھ مل کر ایک بڑا اتحاد بنا لیا اور دونوں مل کر ترکوں کی سرحدوں پر حملہ آور ہوئے۔ ۳ صفر ۷۷۳ھ (۲۶ ستمبر ۱۳۷۱ء) کو ''چرمن'' کی وادی میں لڑی

---

① تاریخ عثمانی: ۱/ ۱۹۷، ۱۹۸

② تاریخ عثمانی: ۱/ ۱۹۸، ۱۹۹؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیر، ص ۴۳، ۴۴

③ تاریخ الدولة العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۹۸، ۹۹

جانے والی اس جنگ میں نصرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ شاہ سربیا وکاشین اور اس کا بھائی جو اوگلیسا (Uglesa) کا حاکم تھا، جان سے مارے گئے۔ (یہ دونوں سربیا کے سابق بادشاہ سلطان دوشن کے بیٹے تھے)۔ اس جنگ کے بعد عثمانی افواج بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحل تک پہنچ گئیں۔[1]

یورپ میں فتوحات کا دھارا:

عثمانی افواج مغربی بلقان میں وقفے وقفے سے پیش قدمی کرتی رہیں۔ جنوب مغربی کروشیا میں بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحلی شہر ڈلمیشیا (ڈلمیشیا)، مقدونیہ کے جنوبی شہر مناسٹر (Bitola)، البانیہ کے قریب واقع برلیہ اور اسلیب فتح کر لیے گئے۔ بعض شہر طویل محاصرے کے بعد سر ہوئے۔

بلغاریہ کے موجودہ دار الحکومت 'صوفیہ' کا محاصرہ تین سال تک جاری رہا۔ آخر ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں اسے فتح کیا گیا۔ اسی دوران مشرقی بلغاریہ کے کئی شہروں میں بھی اسلامی پرچم لہرا دیا گیا۔

۷۸۸ھ (۱۳۸۶ء) میں سربیا کا اہم ترین دفاعی مرکز 'نیش' بھی سرنگوں ہو گیا۔ اگلے سال عثمانیوں کے سپہ سالار خیر الدین پاشا نے گیلی پولی سے یلغار کر کے مقدونیہ کا اہم شہر سالونیکا فتح کر لیا۔ اس کے بیٹے علی پاشا نے شاہ بلغاریہ شیشمان کو پسپا کر دیا اور وہ فرار ہو کر نیکو پولس میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں علی پاشا نے نکوپولس کا محاصرہ کر لیا۔ آخر شاہ بلغاریہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ بلغاریہ کا نصف علاقہ سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہو گیا جبکہ باقی نصف پر شاہِ بلغاریہ کی حکومت باقی رہی۔ اس طرح عثمانیوں کی حدود مغرب میں البانیا اور شمال مغرب میں بوسنیا تک پہنچ گئیں۔[2]

قیصر اور اس کے بیٹے کی ریشہ دوانیاں:

اس دوران قیصر جان پلیو، بظاہر مراد خان کا وفادار بن کر خفیہ طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھا۔ اس نے ۷۷۰ھ (۱۳۶۹ء) میں اٹلی کا سفر کیا تھا اور پاپائے روم سے التجا کی تھی کہ وہ پورے یورپ کو مراد خان کے خلاف جمع کرے۔ پوپ کی ہمدردی جیتنے کی خاطر اس نے ہر طرح کی تذلیل برداشت کی یہاں تک کہ مذہبی عقائد میں کلیسائے روم کی برتری تسلیم کر لی اور کیتھولک مذہب اختیار کر لیا۔ اس پر پوپ نے اس کی مدد کا وعدہ کر لیا۔

قیصر کو واپسی کے سفر میں وینس کے بعض ساہوکاروں نے محبوس کر لیا جن سے اس نے روم کے سفر کے لیے قرضہ لیا تھا۔ یہ اطلاع اس کے بڑے بیٹے اینڈرونیکس کو ملی جو ولی عہد تھا اور اس وقت نائب کے طور پر قسطنطینیہ میں تھا۔ مگر وہ نالائق، جاہ پسند اور من چلا نوجوان تھا اور تازہ تازہ حکومت کا مزہ چکھ کر بدمست ہو چکا تھا، لہٰذا اس نے باپ کی کوئی مدد نہ کی۔ آخر قیصر کے دوسرے بیٹے منوئیل نے جو سالونیکا کا حاکم تھا، اپنی جائیدادیں بیچ کر باپ کا قرض ادا کیا

---

① تاریخ الدولة العثمانیه ازیلماز: ۹۹/۱

② تاریخ الدولة العثمانیه ازیلماز: ۱۰۰/۱ ، دولتِ عثمانیه از ڈاکٹر عزیر، ص ۴۴، ۴۵

اور اسے آزاد کرایا۔

قیصر نے واپس آکر اینڈرونیکس کی ولی عہدی ختم کردی اور اس کی جگہ چھوٹے بیٹے منوئیل کو جس نے مشکل وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا، نیا ولی عہد مقرر کردیا جس پر اینڈرونیکس سخت پیچ وتاب کھانے لگا۔

قیصر ایک مدت تک یورپ کی طرف سے مدد کا انتظار کرتا رہا مگر پوپ کے وعدے سراب ثابت ہوئے۔ ۷۷۴ھ (۱۳۷۳ء) میں اس نے پوپ کے پاس نمائندہ بھیج کر دوبارہ مدد کی درخواست کی مگر یہ کوشش بھی بے سود رہی اور سفیر کو بے نیلِ مرام واپس آنا پڑا۔ تب قیصر نے مایوس ہوکر سلطنتِ عثمانیہ کی باج گزاری قبول کرلی اور اپنی وفاداری کی ضمانت کے طور پر اپنے بیٹے تھیوڈروس کو مراد خان کے ہاں بھیج دیا۔

کچھ مدت بعد جب مراد خان ایشیائے کوچک کی مہمات میں مصروف تھا، قیصر کا بڑا بیٹا اینڈرونیکس، مراد خان کے چھوٹے بیٹے شہزادہ صاوُجی سے ملنے عثمانیوں کے پایۂ تخت ایڈریانوپل (ادرنہ) آگیا۔ دونوں ہم مزاج تھے اس لیے جلد ہی باہم گاڑھی چھننے لگی۔ شہزادہ اینڈرونیکس نے صاوُجی کے سامنے اپنے باپ کی زیادتیوں کا دفتر کھول دیا، ساتھ ہی اسے احساس دلایا کہ وہ بھی تو اپنے باپ کی بے اعتنائی کا شکار ہے، کیوں نہ دونوں اپنی اپنی افواج کو ساتھ ملا کر بغاوت کردیں اور اپنے اپنے ملکوں کے بادشاہ بن جائیں۔ صاوُجی اس جھانسے میں آگیا۔ اس نے ایڈریانوپل کی عثمانی فوج کو بازنطینی شہزادے کی فوجوں کے ساتھ ملا کر قُسطَنطِینِیّہ کا محاصرہ کرلیا۔

مراد خان کو جوں ہی یہ اطلاع ملی وہ ایشیا سے یورپی ساحل پر آگیا۔ ساتھ ہی اس نے قیصر کو مراسلہ بھیج کر سخت سرزنش کی اور مطالبہ کیا کہ وہ بغاوت میں شریک دونوں شہزادوں کے لیے سخت ترین سزا کی حمایت کرے۔ قیصر نے اس جرم سے اپنی مکمل برأت ظاہر کی اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے ہر قسم کا تعاون فراہم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ ساتھ ہی اس نے سلطان کی یہ تجویز بھی منظور کرلی کہ دونوں باغی شہزادے گرفتاری کے بعد بینائی سے محروم کردیے جائیں۔

قیصر کو دبانے کے بعد مراد خان نے شہزادوں کی خیمہ گاہ کا رخ کیا اور اعلان کیا کہ باغیوں کا ساتھ چھوڑ دینے والے سپاہیوں کو معاف کردیا جائے گا۔ اس اعلان پر چند ایک کے سوا سب باغی سپاہی شہزادوں سے الگ ہوگئے۔ مراد خان نے دونوں شہزادوں کو گرفتار کرلیا۔ اس نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر اسے بینائی سے محروم کیا اور پھر قتل کرادیا۔ بغاوت میں شریک بازنطینی امراء کو دریائے مارٹیزا میں غرق کردیا گیا۔ جبکہ قیصر کے بیٹے کو زنجیروں میں جکڑ کر قُسطَنطِینِیّہ بھیج دیا گیا تاکہ وہ خود اسے سزا دے۔ قیصر نے سلطان کے غضب سے بچنے کے لیے بظاہر تو اپنے بیٹے پر بینائی سے محرومی کی سزا جاری کی مگر درحقیقت اس نے بڑی نرمی سے کام لیا اور اس انداز میں سزا دلوائی کہ شہزادے کی فقط ایک آنکھ متاثر ہوئی جبکہ دوسری آنکھ کی بینائی بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ گئی۔ الغرض قیصر نے مراد خان کو مطمئن کرکے قُسطَنطِینِیّہ کے محاصرے کا خطرہ ٹال دیا۔ یہ واقعہ ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) کا ہے۔

اس واقعے کے بعد قیصر کو سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ ازسرِنو باج گزاری کا معاہدہ کرنا پڑا اور نئی شرائط کے مطابق وہ

عثمانی لشکر میں فوجی خدمات انجام دینے کا پابند قرار پایا جس کی ضمانت کے طور پر اس نے اپنے بیٹے منوئیل کو سلطان مراد کی خدمت میں بھیج دیا۔ ①

اصلاحات کا دور

۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) تا ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء)

یورپ کی طاقتوں کو سبق سکھانے کے بعد سلطان مراد نے ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) سے ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) تک تقریباً پانچ سال ایسے گزارے جس میں اس کی توجہ فتوحات سے زیادہ ملکی نظام کو بہتر بنانے، تعمیری و ترقیاتی کام کرانے اور انتظامی اصلاحات متعارف کرانے پر مبذول رہی۔

اس نے پیشہ ور فوج اور جاگیروں کے سپاہیوں کے نظام کی تشکیلات کو مکمل کیا، سرکاری زمینیں الگ کیں، مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے لیے زمینیں وقف کیں۔ اس نے فوج کی معمولی خدمات کے لیے ذمّی شہریوں کی ایک جماعت تشکیل دی جو خیمے نصب کرنے اور اکھاڑنے، بار برداری کے جانوروں اور گاڑیوں کی دیکھ بھال کرنے، اصطبل صاف کرنے اور دیگر معمولی کاموں پر مامور تھی۔

اسی زمانے میں فوجی پرچموں کے لیے ''سرخ'' رنگ طے ہوا جو بعد میں سلطنتِ عثمانیہ کا قومی رنگ ہو گیا۔ ②

اناطولیہ کی مہمات۔ شہزادہ بایزید کا امیرِ قرہ مان کی بیٹی سے نکاح:

مراد خان کی زیادہ توجہ یورپی علاقوں پر تھی مگر اس کے باوجود وہ اناطولیہ میں اپنی سرحدوں کی توسیع کی اہمیت کو بھولا نہیں تھا۔ تاہم وہ چاہتا تھا کہ یہ عمل کسی خونریزی کے بغیر صلح وصفائی سے انجام پانا چاہیے۔ ایشیائے کوچک میں اس کے اردگرد ترکمان امراء کی کئی خودمختار ریاستیں تھیں جنہیں وہ جب چاہتا زیر کر سکتا تھا۔ دوسری طرف یورپ میں اس کا بڑھتا ہوا ہر قدم ہمسایہ مسلم ریاستوں کو اس کا ممنون بناتا جاتا تھا اور خودمختار امراء اس کی سیادت وعظمت کو سلام پیش کرتے جاتے تھے۔ تاہم تین ریاستیں: ریاست کرمیان، ریاست قرہ مان اور ریاست حمید یہ اس کی ٹکر کی تھیں۔ خصوصاً امرائے قرہ مان خود کو دولتِ عثمانیہ کے ہم پلہ سمجھتے تھے کیوں کہ سلاجقۂ روم کا مرکز قونیہ ان کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ یہ دونوں ریاستیں اناطولیہ میں سلجوقیوں کی اصل وارث اور خطے کا سرپرست ہونے کی دعوے دار تھیں۔

مراد خان نے کشیدگی کی اس فضا کو کم کرنے کے لیے ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ھ) میں اپنے بیٹے شہزادہ بایزید کا نکاح امیرِ قرہ مان کی بیٹی سے کر دیا۔ دلہن جہیز میں قلعۂ کوتاہیہ سمیت ریاست قرہ مان کے کئی قلعوں کی چابیاں ساتھ لائی تھی۔ بروصہ میں شادی کی تقریب نہایت دھوم دھام سے انجام پائی جس میں اناطولیہ کی تمام ریاستوں کے نمائندے اور

---

① تاریخ عثمانی: ۱/ ۱۶۷، ۱۶۸؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/ ۴۲، ۴۳، ۴۴

② دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/ ۴۵

سلطانِ مصر کے سفیر شریک ہوئے۔ یہ مہمان اپنے ساتھ یونانی کنیزیں، عربی گھوڑے، اسکندریہ کے ریشمی کپڑے، طلائی سکوں سے بھرے ہوئے سونے چاندی کے ظروف اور جواہرات سے مرصع پیالے اور طشت لائے تھے۔ سلطان مرادخان نے یہ تمام تحائف حاضرین میں تقسیم کر دیے۔ البتہ جب دلہن نے قرہ مان کے قلعوں کی چابیاں پیش کیں تو سلطان نے انہیں اپنے پاس رکھا۔ اس طرح کسی جنگ کے بغیر یہ قلعے سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بن گئے۔ [1]

حمید یہ کے قلعے خرید لیے گئے:

۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) میں سلطان مرادخان کو ایک اور بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے ریاستِ حمیدیہ کے والی کو آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی ریاست کا ایک بڑا حصہ اس کے ہاتھ فروخت کر دے۔ ان قلعوں میں ''آق شہر''، ''یلواج''، ''یکی شہر''، ''سیدی شہر'' اور ''قرہ آغاج'' شامل تھے۔ [2]

قرہ مانیوں سے کش مکش اور قونیہ کی فتح:

دولتِ عثمانیہ کو ریاستِ حمیدیہ کا یہ علاقہ مل جانے کے باعث ریاست قرہ مان کا ریاستِ حمیدیہ سے اتصال ختم ہو گیا اور ریاست قرہ مان شمال اور مغرب سے بالکل متصل ہو گئیں، چونکہ ان دونوں ریاستوں میں شروع سے رنجش چلی آ رہی تھی، اس لیے امرائے قرہ مان نے سرحدی اتصال کو خطرے کی نگاہ سے دیکھا۔ اُدھر ۷۸۴ھ (۱۳۸۲ء) میں بنوحمید، ۷۸۵ھ (۱۳۸۳ء) میں بنوجاندار اور ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں امیرِ آماسیا نے مرادخان کی ماتحتی قبول کر لی۔ پھر بنوقرہ مان نے جو قونیہ کے حاکم تھے، اس سے رشتہ قائم کر لیا، وہ اس طرح کہ مرادخان نے اپنی بیٹی، نوابِ قونیہ علاؤالدین کے نکاح میں دے دی۔ مگر ۷۸۷ھ میں علاؤالدین نے رشتہ داری کو نظر انداز کر کے بغاوت کر دی جس کی وجہ یہ تھی کہ اس سال مصر کی عباسی خلافت کی جانب سے مرادخان کو اناطولیہ کی سیادت کا پروانہ دے دیا گیا تھا جبکہ پہلے یہ اعزاز بنوقرہ مان کو حاصل تھا۔ اس محرومی پر علاؤالدین نے مشتعل ہو کر سلطنتِ عثمانیہ کی حدود پر دھاوا بول دیا۔

مرادخان نے اطلاع ملتے ہی ۷۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ قونیہ کا رخ کیا۔ لشکر کی کمان اس کے ولی عہد بایزید کے ہاتھ میں تھی جس نے اچانک حملہ کر کے قرہ مانی فوج کو تتر بتر کر دیا۔ مرادخان نے شہزادے کو اس کارنامے پر 'یلدرم' (آسمانی بجلی) کا لقب دیا۔ شکست کے بعد امیرِ قونیہ علاؤالدین نے اپنی بیگم نفیسہ (سلطان کی بیٹی) کو سفارشی بنا کر بھیجا اور مرادخان نے سفارش قبول کر کے امیر کو معاف کر دیا۔ اس فتح میں سربیا کے نصرانی بھی عثمانیوں کے ہم رکاب تھے، مرادخان نے فتح کے بعد حکم دیا تھا کہ شہریوں کے جان و مال پر دست درازی نہ ہو۔ مگر سرب عیسائیوں نے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس پر مرادخان نے غضب ناک ہو کر ایسی حرکات میں ملوث افراد کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ یہ اطلاعات سربیا والوں کو ملیں تو وہ اپنے ہم قوموں کا بدلہ لینے کے لیے مشتعل ہو گئے۔ [3]

---

① دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/ ۴۶ ② اخبار الدول: ۳/ ۱۴

③ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۹۹، ۱۰۰

جب صلیبی جنگ برپا ہوئی

اہلِ یورپ پہلے ہی عثمانیوں سے جلے بھنے بیٹھے تھے۔ شاہ سربیا نے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کی آواز لگائی تو پادریوں کا ایک جم غفیر اس کا ہمنوا بن گیا۔ پورے یورپ میں ایک ہل چل مچ گئی۔ وہاں اسی قسم کا جوش و خروش ابھرا جیسا چھٹی صدی ہجری کی صلیبی جنگوں میں صلاح الدین ایوبی کے خلاف پیدا کیا گیا تھا۔ ۷۸۹ھ (۱۳۸۸ء) میں سربیا، بوسنیا، بلغاریہ اور البانیہ، ہنگری، گلیشیا، پولینڈ، آسٹریا، جرمنی اور اٹلی کی افواج جمع ہو کر ایک سیلاب کی طرح عثمانی مقبوضات کی طرف بڑھنے لگیں۔

لالہ شاہین پاشا نے ۲۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ بوسنیا کی سرحد میں پلوشن کے مقام پر ان کا سامنا کیا مگر اس کی پیش نہ گئی۔ اتحادیوں نے عثمانیوں کو گھیر لیا۔ اس معرکے میں ترکوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ فقط پانچ ہزار سپاہی صحیح سلامت واپس آسکے۔ یہ ان کی پہلی شکست تھی جس نے یورپی طاقتوں کو ان کے خلاف ایک بڑی فتح کی امید دلادی۔[1]

صلیبی جنگ۔ معرکۂ کوسوو:

مرادخان کو یہ اطلاع بورصہ میں ملی۔ وہ افواج مرتب کر کے اپنے ایشیائی اور یورپی باج گزاروں کی جمعیتوں سمیت نہایت تیزی سے محاذ تک پہنچا۔ قصووا (کوسوو) کے قریب افواج کا آمنا سامنا ہوا۔ سلطان کی افواج دریائے کوسوو کے مشرق میں تھیں اور نصرانیوں کا لشکر مغربی کنارے پر۔ حریف افواج کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مسلمانوں کو پہلی بار اپنی فتح مشکل دکھائی دینے لگی۔ ایسے میں مرادخان اللہ سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ رات کو وہ خیمے میں مصلے پر بیٹھا ہاتھ پھیلائے کہہ رہا تھا:

"یا اللہ! اے رحیم! اے آسمانوں کے مالک! اے دعائیں قبول کرنے والے! اس فقیر کی دعا قبول کر لے! ہم تیرے گناہ گار بندے ہیں۔ تو عطا کرنے والا ہے، ہم بھکاری ہیں۔ تو دلوں کی بات جاننے والا ہے۔ مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے، میں مالِ غنیمت حاصل کرنے نہیں آیا۔ میں تو بس تیری رضا کا طالب ہوں۔ اے اللہ! میں اپنی جان تجھ پر قربان کرنا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کو دشمنوں کے سامنے رسوا نہ کرنا۔ مجھے ان کی ہلاکت کا ذریعہ نہ بنانا۔ انہیں فتح مند کر دے۔ بادشاہت بھی تیری ہے اور طاقت بھی۔ تو جسے چاہتا ہے اسے نواز دیتا ہے۔ میں تیری عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے جہاد سے دنیائے فانی مطلوب نہیں۔ میں ہمیشہ شہادت کی طلب میں لڑتا رہا۔ اے اللہ! اس بار مجھے شہادت کا شرف عطا فرما دے۔"[2]

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۰۰

② الجواب المضیئۃ، ص ۳۰، ۳۱، ۱۹۰

قرآن مجید کی بشارت:

اس دوران اس نے قرآن مجید کھولا تو یکدم اس آیت پر نگاہ پڑی:

يَاۤيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ.

''اے نبی! آپ اہل ایمان کو جنگ کی ترغیب دیتے رہیں۔ اگر تم میں بیس ہوں گے ثابت قدم رہنے والے تو وہ غالب آجائیں گے دو سو پر۔ اگر تم میں سے سو ہوں گے تو وہ غالب آئیں گے ایک ہزار (کافروں) پر۔''[1]

یہ آیات پڑھ کر مراد خان کو اطمینان ہوا اور اس کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ صبح میدانِ جنگ میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ قلبِ لشکر میں ادھر مراد خان تھا اور اُدھر شاہِ سربیا۔ دونوں طرف سے بہادروں نے جان کی بازی لگادی۔ فنا و بقا کا یہ معرکہ طویل تر ہوتا گیا اور ہزاروں لاشیں گر جانے سے زمین پر خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ لڑائی کے آخری مرحلے میں ترکوں کے قدم اکھڑ رہے تھے کہ مراد خان کا ولی عہد بایزید یلدرم اپنے دستے کے ساتھ حریف کے قلب میں گھس گیا اور اس طرح شجاعت کے جوہر دکھائے کہ دشمن کی صفیں الٹ کر رہ گئیں۔ اس کی دلیری نے ترکوں کے حوصلے بلند کر دیے اور وہ یک بارگی حریف پر ٹوٹ پڑے۔ آٹھ گھنٹوں کا یہ معرکہ اس طرح اختتام پذیر ہوا کہ شاہِ سربیا ''لازار'' حملے میں مارا جا چکا تھا اور نصرانی جو مسلمانوں کو شکست دینے کا یقین کر چکے تھے، افراتفری کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ یہ لڑائی ۷۹۰ھ (۱۳۸۹ء) میں لڑی گئی۔ عیسائی اسے اپنی تاریخ کی بدترین شکست شمار کرتے ہیں۔

اس جنگ نے آئندہ کئی صدیوں کے لیے یورپ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ان علاقوں پر بھی ترکوں کی فتح کے امکانات روشن ہو گئے جو ان کے قبضے میں نہیں تھے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ پورا یورپ مل کر بھی عثمانیوں کو یورپ سے نہیں نکال سکتا۔ اس جنگ نے ترکوں کے سب سے بڑے حریف سربیا کی آزادی ختم کر دی۔ یورپ میں اس کے بعد صرف ہنگری ایک ایسا ملک رہ گیا تھا جو سلطنتِ عثمانیہ سے لڑ سکتا تھا۔[2]

واقعہ شہادت:

مراد خان کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ جنگ کے بعد وہ میدان میں لاشوں اور قیدیوں کا معاینہ کر رہا تھا کہ لاشوں کے بیچ میں سے ایک سرب افسر میلوش قابیلوچ اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ ترک سپاہیوں نے اسے پکڑ کر نہتا کر دیا مگر اس نے بتایا کہ وہ بادشاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ مراد خان کے حکم سے سپاہیوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھ کر مراد خان کی دست بوسی کرنے لگا۔ اس دوران اس نے یکدم اپنی آستین میں چھپا زہر آلود خنجر نکال کر ایسا کاری وار کیا کہ بادشاہ جانبر نہ ہو سکا۔[3]

---

① سورۃ الانفال، آیت نمبر ۶۵ ② اخبار الدول: ۳/ ۱۵، عثمانی ترک، ص ۳۸، ۳۹، الدولۃ العثمانیہ از صلابی، ص ۶۰
③ الدولۃ العثمانیہ از صلابی، ص ۶۰

مرادخان کے آخری کلمات:

مرادخان کے آخری کلمات یہ تھے:

''میں رخصت ہوتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھ فقیر کی دعا قبول کی۔ میرے بیٹے بایزید کی اطاعت کرنا۔ قیدیوں کو سزائیں مت دینا، اذیت نہ پہنچانا، ان سے کوئی چیز مت چھیننا۔ اَشْھَدُاَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ.....''

کچھ ہی دیر میں اپنے دور کا یہ رجلِ جری رتبۂ شہادت سے ہم کنار ہوا۔ یہ واقعہ ۱۵ شعبان ۷۹۱ھ (۸، اکتوبر ۱۳۸۸ء) کا ہے۔ قاتل کو مار ڈالا گیا اور شہید کی نعش بورصہ لے جا کر دفن کی گئی۔

اس واقعے کے بعد عثمانی مملکت میں یہ ضابطہ بنا دیا گیا کہ جب بھی کوئی ملاقاتی بادشاہ سے ملتا، تو دو سپاہی دائیں بائیں سے اس کی آستینیں تھامے رہتے تاکہ پھر کسی سانحے کا اعادہ نہ ہو۔ ①

مرادخان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ اس نے ۳۱ سال حکومت کی اور ساری زندگی جہاد میں گزاری۔ وہ اپنے باپ دادا کی طرح نیک سیرت، متقی، بہادر اور فیاض تھا۔ البتہ وہ سادگی اور درویشی کی جگہ حکومتی رعب داب قائم رکھنے کے لیے شاہانہ جاہ وجلال کا اظہار ضروری سمجھتا تھا۔ ②

مرادخان کی اصلاحات

مرادخان نے فوج، عدلیہ اور انتظامیہ کے شعبوں میں کئی اصلاحات کیں۔ اس سے پہلے فوج میں الگ سے عدالت نہیں ہوتی تھی۔ مرادخان نے 'قاضی عسکر' کے نام سے فوج کی الگ عدالتیں قائم کیں۔ قاضی قرۃ خلیل کو پہلی بار اس منصب پر فائز کیا گیا۔

اس سے پہلے ''بیگلر بیگی'' (سپہ سالارِ اعلیٰ) کا عہدہ صرف آلِ عثمان کے لیے تھا۔ مگر مرادخان نے پہلی بار خاندان سے باہر کے ایک معزز رکن لالہ شاہین کو اس پر مقرر کیا۔ اس کے بعد تیمور تاش کو یہ عہدہ ملا۔

مرادخان سے پہلے گھڑ سوار فوج خود اپنے گھوڑوں کی حفاظت کرتی تھی۔ اس نے ایک الگ شعبہ ''ویٔوق'' (سائیس) قائم کیا جس کے ارکان گھوڑوں کی رکھوالی کرتے اور فوج کی پوری توجہ جنگ پر رہتی۔

زرعی نظام کو بھی ترقی ہوئی اور مفتوحہ وسیع وعریض زمینوں کو فوج پر تقسیم کر دیا گیا۔ ہر سپاہی کو جاگیر سے حصہ دیا جاتا تاکہ فوجی خدمات سے سبک دوشی کے بعد وہ فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا رہے۔

مرادخان نے دوسری اسلامی مملکتوں سے اچھے تعلقات رکھے۔ اس کے دور میں پہلی بار سلطنتِ عثمانیہ کے مصر کی خلافتِ عباسیہ اور ممالیک سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ خلیفہ متوکل، خلیفہ واثق اور ممالیکِ چراکسیہ کا بانی سلطان

---

① الدولة العثمانیه از صلابی، ص ۶۰

② اخبار الدول: ۳ / ۱۵. عثمانی ترک، ص ۳۴ تا ۳۶

الظاہر برقوق سلطان مراد کے معاصر تھے۔ الظاہر برقوق مراد خان کی فتوحات کا قدر دان تھا۔اس نے ترکانِ عثمان کو ایشیائے کوچک میں اپنا حامی قرار دیا جس سے اناطولیہ کی دیگر ترکمان ریاستوں کی حیثیت مزید کمزور ہوگئی۔

مراد خان حتی الامکان مسلم حکمرانوں سے لڑائی سے گریز کرتا تھا۔اس کے بجائے وہ مصالحت کے ساتھ مسلم امارتوں کو ساتھ ملانے کے لیے کوشاں رہا۔جیسا کہ ۷۸۳ھ میں اس نے ریاست حمید کے والی سے اس کے پانچ قلعے: یلواج، ویکی شہر، آق شہر، سیدی شہر اور قرہ اغاج بھاری قیمت دے کر خرید ے۔ ①

تعمیر و ترقی، مذہبی رواداری، سلطنت کی وسعت:

اپنے والد اور دادا کی طرح سلطان مراد نے بھی کئی مساجد، درسگاہیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔اس نے غیر مسلم شہریوں کو ان کے مذاہب پر عمل کی مکمل آزادی دی۔ ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو ایک مکتوب میں وضاحت سے لکھا کہ مراد خان نے کلیسا کو مکمل آزادی بخشی ہے اور اس کے ہاں عیسائیوں سے بدسلوکی کی کوئی شکایت نہیں ملتی۔

مراد خان کی شہادت تک اس کی سلطنت کا دائرہ پانچ لاکھ مربع کلومیٹر میں پھیل چکا تھا۔اس میں سے دو لاکھ ۸۰ ہزار کلومیٹر اناطولیہ میں اور دو لاکھ ۲۰ ہزار کلومیٹر ''رومیلی'' (یورپی علاقوں) میں تھا۔اس طرح اس نے اپنے باپ 'اورخان' کی عملداری میں پانچ گنا اضافہ کیا۔اس دوران اس نے ۳۷ جنگوں میں بذاتِ خود حصہ لیا اور ہر بار کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ ②

یورپی مؤرخین سلطان مراد کی خوبیوں کے معترف:

یورپی مؤرخین سلطان کی خوبیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔اس دور کا ایک معاصر یورپی مؤرخ لکھتا ہے:

''اس نے بذاتِ خود ۳۷ جنگوں میں حصہ لیا اور سب میں فتح مند ہوا۔اس کی شہرت ایک ایسے قائد کی سی تھی جو کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں بھی اس کی قدرت اور گرفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔'' ③

ایک اور مؤرخ کہتا ہے:

''ممکن نہیں کہ اس دور کے معاصر یورپی حکمرانوں میں اس جیسا کوئی حکمران ڈھونڈا جاسکے۔ وہ فقط ایک ہوشیار سپہ سالار اور حکمتِ عملی کا ماہر ہی نہ تھا، بلکہ اپنی ذات میں ایک ترقی پسند سیاست دان بھی تھا۔ وہ فطری طور پر قائد تھا۔اس نے عثمانیوں کو ایک یکجا اور مثالی قوم بنادیا۔اس کی وفات کے وقت اس قوم کا مستقبل پانچ صدیوں کے لیے محفوظ ہو چکا تھا۔'' ④

---

① اخبار الدول: ۱۴/۳

② تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۰۰

③ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۰۲

④ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۰۲

ایک فرانسیسی مؤرخ لکھتا ہے:

''وہ ایک بہادر، بلند ہمت اور فعال انسان تھا۔ بڑھاپے میں بھی ویسا ہی تیز اور چست تھا جیسا جوانی میں۔ وہ ایک مدبر آدمی تھا۔ کوئی مہم اس وقت تک شروع نہیں کرتا تھا جب تک کہ اس کا پورا نقشہ طے نہ کر لیتا۔ وہ تابع داری اور فرمان برداری اختیار کرنے والے ممالک اور لوگوں سے بھلائی، نرمی اور احسان کا معاملہ کرتا چاہے ان کا مذہب کچھ بھی ہو۔ اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا چاہے اس کا نتیجہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ نکلتا۔ اس کی امانت و دیانت پر سب کو بھروسہ تھا چاہے وہ اپنے ہوں یا غیر۔[1]

ڈاکٹر گبن لکھتا ہے:

''وہ اپنے دور کے تمام حکمرانوں اور دنیا کی تمام سلطنتوں کے رجالِ کار پر فائق تھا۔ وہ ان حدود سے آگے نکل گیا جن کا تصور اس کے والد نے کیا تھا۔ اس نے قیصرِ روم کا اعتماد حاصل کر لیا اور کسی حد تک اس کی محبت بھی۔ اس نے آرتھوڈکس چرچ کے ساتھ اس سے کئی گنا بہتر سلوک کیا جو کیتھولک چرچ والوں نے اس کے ساتھ کیا۔''[2]

---

① History of the Othman Turk Khalkokondylas:p.29

② The History of the Decline and Fall of the Roman Empire. by Edward Gibbons:p.52)

بایزید یلدرم

۷۹۱ھ تا ۸۰۵ھ

(۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۳ء)

مرادخان کی شہادت کے بعد اس کا ۲۹ سالہ ولی عہد بایزید شعبان ۷۹۱ھ میں مسندِ اقتدار پر بیٹھا۔ وہ ایک شریف، خوش اخلاق، دوراندیش اور انتظامی صلاحیتوں سے مالا مال نوجوان تھا۔ نہایت آزمودہ کار سپاہی اور بہترین منصوبہ ساز تھا۔ اس کی فوج کشی اتنی تیز اور حملے اتنے اچانک ہوتے تھے کہ دنیا اسے ''یلدرم'' (آسمانی بجلی) کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ ایک دن اناطولیہ میں ہوتا تو دوسرے دن سمندر پار یلغار کرتا دکھائی دیتا۔[1]

بھائی کو سزائے موت:

بایزید نے تخت نشینی کے فوراً بعد اپنے بھائی یعقوب کو کسی بہانے سے پاس بُلوایا جہاں گرفتار کر کے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ دراصل بایزید کو شک تھا کہ کہیں وہ بغاوت نہ کر دے۔ آلِ عثمان میں شک وشبے کی بنیاد پر اپنے عزیزوں کو قتل کرنے کی یہ پہلی مثال تھی۔ اس کے بعد متعدد عثمانی تاجداروں نے اس کا ارتکاب کیا۔[2]

بایزید کا دور اس لحاظ سے تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اس دوران ایک طرف عثمانیوں کی فتوحات کا دائرہ یونان تک جا پہنچا۔ دوسری طرف اسی دوران نامور مغل حکمران تیمور نے ہندوستان کی فتح سے فارغ ہو کر شمال مغرب کا رخ کیا۔ یوں دنیا کے دو نامور فاتح ایک دوسرے کے بالمقابل آ گئے۔ بایزید اور تیمور لنگ کی کش مکش کا ذکر ہم تفصیل سے کریں گے مگر پہلے تیمور کی ان مہمات کا تذکرہ ہو جائے جو بایزید کی تخت نشینی سے پہلے ہو چکی تھیں۔

تیمور لنگ کا ظہور

مرادخان کے زمانے میں ایک بہت بڑا خطرہ مشرق کی طرف سے ظاہر ہو چکا تھا۔ یہ مغل حکمران تیمور لنگ تھا جس نے چند سالوں میں وسطِ ایشیا اور خراسان کو زیرِ نگین کر کے ساری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اگرچہ نو مسلم تاتاریوں کی اولاد تھا مگر اس کی عادات اپنے غیر مسلم آباء واجداد کے مشابہ تھیں۔ مہم جوئی، سخت گیری اور جفاکشی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تیمور کے معنی فولاد کے ہیں اور وہ سچ مچ فولادی شخصیت تھا۔ ۷۶۶ھ (۱۳۶۴ء) میں جنوبی خراسان کے

---

① الدولۃ العثمانیہ فی التاریخ الحدیث، ص ۴۰ ② اخبار الدول: ۳/ ۱۵

قبائلیوں سے ایک معرکے کے دوران لگنے والے ایک تیر کے زخم کے باعث سے وہ تھوڑا سا لنگڑا کر چلتا تھا، اس لیے مخالفین اسے 'تیمور لنگ' (لنگڑا تیمور) کہہ کر یاد کرتے تھے۔ [1] اس کے دربار میں علما وفقہاء بھی تھے۔ وہ ان کی باتیں سنتا تھا مگر عمل اپنی مرضی کے مطابق کرتا تھا۔ دراصل وہ ایک آزاد مشرب شخص تھا۔ اس کے مذہبی رجحانات میں تشیع کا میلان نظر آتا ہے۔ تاہم اس کے دربار میں سنی اور شیعہ دونوں قسم کے علماء موجود رہتے تھے۔ وہ ۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء) میں سمرقند میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ''امیر ترغی'' برلاس قبیلے کا سردار اور سمرقند کا حاکم تھا۔ [2]

تیمور کی فتوحات:

باپ کی موت کے بعد تیمور قبیلے کا سردار بن گیا، وہ بچپن سے چنگیز خان کی فتوحات سے بے حد متاثر تھا اس لیے بے پناہ خونریزی اور فتوحات کا جنون اس کے سر پر سوار ہو گیا۔ نوجوانی ہی میں وہ حصولِ اقتدار کے لیے سرگرم ہو گیا۔ اس نے وسطِ ایشیا کے تاتاری حکمران تغلق تیمور کی فوج میں شامل ہو کر افغانستان میں کئی علاقے فتح کیے۔ تغلق تیمور نے اسے سمرقند کا گورنر بھی مقرر کیا۔

۷۷۰ھ (۱۳۶۸ء) میں بلخ کی فتح کے بعد تیمور نے خودمختار حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ چند سالوں کے اندر اندر اس نے سمرقند و بخارا سمیت وسطِ ایشیا کے اکثر شہروں پر قبضہ کر کے اپنے آقا تغلق تیمور کے خاندان کو بے دخل کر دیا۔ اس نے سمرقند کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور نئی فتوحات کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ اس کے پاس دنیا کی سب سے بڑی فوج تھی جس کے باقاعدہ سپاہیوں کی تعداد آٹھ لاکھ تک تھی۔ [3]

تیمور کے مظالم:

۷۸۱ھ (۱۳۷۹ء) تک تیمور وسط ایشیا سمیت خوارزم پر بھی قبضہ کر چکا تھا۔ ۷۸۲ھ (۱۳۸۰ء) سے ۷۸۵ھ (۱۳۸۳ء) تک وہ دریائے آمو کے پار خراسان میں مہم جوئی کرتا رہا اور آخر کار شدید ترین مزاحمتوں کا زور توڑ کر اس نے یہ سارا علاقہ (موجودہ افغانستان) زیرِ نگین کر لیا۔ اسی دوران اس کی افواج ایران میں بھی داخل ہو چکی تھیں۔ ۷۸۳ھ سے ۷۸۸ھ کے درمیان وہ ایران کے طول وعرض پر قابض ہو چکا تھا۔ شیراز کے حاکم شاہ منصور نے اس کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا مگر اس کی پیش نہ گئی اور وہ مارا گیا۔

تیمور نے ان مہمات کے دوران عوام پر وہ مظالم توڑے کہ لوگ چنگیز خان اور ہلاکو خان کی داستانوں کو بھول گئے۔ ہر مفتوحہ شہر میں لاشوں کے انبار لگا دیے گئے۔ جب اس نے ہرات فتح کیا تو ایک مؤرخ کے بقول:

---

① تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۳۴۳

② مغلوں کا جدِ امجد تومنہ خان تھا، اس کے دو بیٹے تھے: قبل خان اور قاچولی بہادر۔ قبل خان کی اولاد سے چوتھی پشت میں چنگیز خان پیدا ہوا۔ جبکہ قاچولی بہادر کی اولاد میں آٹھویں پشت سے تیمور لنگ نے جنم لیا۔ تیمور کا دستیاب شجرۂ نسب یہ ہے: تیمور بن ترغی بن ابغائی بن قاچار بن برشام بن برلاس بن قاچولی بہادر بن تومنہ خان۔ چنگیز خان کا نسب یہ ہے: چنگیز بن یسوکائی بن برتان بن قویلہ بن قبل خان بن تومنہ خان

③ عجائب المقدور، ص ۵ تا ۱۰، ۱۸۵

''شہر میں ایک دُکان بھی کھلی نہ رہ سکی۔شہر کی گلیوں اور بازاروں میں لاشوں کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔''

اصفہان میں چھ لاکھ افراد کو تہہ تیغ کیا گیا۔ایک جگہ فتح کے بعد دو ہزار افراد کو مٹی میں پھینک کر اس طرح کچلا گیا کہ ان کی ہڈیاں، خون اور اعضاء مٹی میں یکجان ہو گئے۔اس کے بعد اسی خون میں گندھی ہوئی مٹی سے فتح کا یادگاری مینار تعمیر کیا گیا۔اکثر شہروں میں عمارتوں، میناروں، فصیلوں اور برجوں کو پیوندِ خاک کر دیا گیا۔

تیمور کی ان فتوحات کا اثر براہِ راست اناطولیہ کی سیاست پر پڑ رہا تھا۔مراد خان نے اناطولیہ کے جن ترکمان امراء کو زیر کر کے باج گزار بنایا تھا، تیمور کا ستارۂ اقبال بلندی پر دیکھ کر وہ اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔آخر کار جب مراد خان کوسوو میں اپنی آخری جنگ لڑنے گیا تو اناطولیہ کی ترکمان ریاستوں: صاروخان، آیدن، تکہ، جرمیان اور حمید یہ نے عہد شکنی کر کے عثمانیوں کی ماتحتی سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ [1]

بایزید کی فتوحات

اُدھر بایزید نے اپنے باپ کی شہادت کے بعد سربیا سے جنگ جاری رکھی اور شمال مشرقی بلغاریہ میں دریائے ڈینوب کے کنارے 'ویدین' شہر تک پیش قدمی کی۔آخر مقتول شاہِ سربیا 'لازار' کے بیٹے اسٹیفن لازاروچ نے جو سربیا کا نیا حکمران بن چکا تھا،۷۹۲ھ (۱۳۸۹ء) میں صلح کی التجا کر دی۔

بایزید یورپی اتحاد کو توڑنا چاہتا تھا اس لیے اس نے صلح کی درخواست مان لی اور اسٹیفن لازاروچ اور اس کے بھائی کو سربیا میں اپنا نائب مقرر کر کے انہیں اجازت دی کہ وہ اپنے دین و مذہب کے مطابق وہاں کا نظام چلا سکتے ہیں البتہ رعایا سے جزیہ وصول کر کے مرکز کو دینا اور ضرورت پڑنے پر فوج مہیا کرنا ان کے ذمے ہوگا۔بایزید نے لازار کی بیٹی سے نکاح کر کے اس تعلق کو مزید پختہ کر لیا۔اس طرح آئندہ جنگوں میں بلغاریہ اور سربیا کے اتحاد کا خطرہ نہ رہا۔ [2]

ایشیائے کوچک کی فتوحات:

یورپ میں جہاد کے بعد ایشیائے کوچک کی ریاستوں کو مسخر کر کے ''متحدہ اناطولیہ'' قائم کرنا بایزید کی دوسری ترجیح تھی۔اسے خدشہ تھا کہ اگر تیمور نے سلطنتِ عثمانیہ پر حملہ کیا تو ایشیائے کوچک کی باغی ریاستیں اس کی حلیف ثابت ہوں گی۔لہٰذا بایزید نے ایشیائے کوچک میں تیز ترین مہمات شروع کیں۔اس نے ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) سے ۸۰۳ھ (۱۴۰۱ء) تک کئی مرحلوں میں ایشیائے کوچک کی اکثر امارات کو زیرنگین کر لیا۔۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) میں ''آیدین'' اور ۷۹۳ھ (۱۳۹۱ء) میں ''صاروخان'' پر قبضہ کیا۔اسی سال ''تکہ'' بھی فتح کیا۔۷۹۴ھ (۱۳۹۲ء) میں ''قرہ مان'' کے باغی امیر علاؤالدین کو شکست دے کر قونیہ فتح کیا۔علاؤالدین کو بار بار غداری کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔

---

① عجائب المقدور فی اخبار تیمور، ص ۱۱۰ تا ۱۵۷؛ ہندوستان میں تیمور نے جو تباہی مچائی اس کی جھلک دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ از شفیق خواجہ: ۳۲۸/۱ تا ۳۳۲، ط المیزان لاہور)

② الدولۃ العثمانیہ فی التاریخ الحدیث، ص ۴۱

اب بایزید نے مشرقی اناطولیہ کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں ''اماسیہ''، ''توقات''، ''نکسار'' اور ''جانیک'' مسخر ہوئے۔ ۷۹۷ھ (۱۳۹۵ء) میں اس نے شمالی اناطولیہ کی ترک ریاستوں: ''سینوپ'' اور ''قسطونی'' پر قبضہ کیا۔ ۸۰۰ھ میں شمال میں بحیرۂ اسود کے کنارے واقع ''صمصون'' فتح کیا۔ ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں جنوبی اناطولیہ کی ریاست ''ذوالقدر'' اور ۸۰۲ھ میں ملطیہ کو (جسے ممالیکِ شام ومصر اپنی ماتحت ریاست قرار دیتے تھے۔) فتح کرلیا۔ چونکہ ان سالوں میں تیمور ایران اور ہندوستان کی تسخیر میں مصروف تھا اس لیے بایزید کو اپنی مہم کی تکمیل کا موقع مل گیا۔ ان میں سے بعض مہمات کی قیادت بایزید نے خود کی اور بعض علاقے اس کے سالاروں نے فتح کیے۔ [1] اس طرح تیمور سے تصادم کی نوبت آنے سے پہلے بایزید پورا ایشیائے کوچک فتح کر چکا تھا۔

بلغاریہ کی فتح:

اُدھر بایزید کی افواج یورپ میں بھی برابر پیش قدمی کرتی رہیں۔ یورپ میں عثمانی سلطنت کا سخت ترین حریف بلغاریہ تھا۔ اس کا جنوبی علاقہ مرادخان کے دور میں ہی فتح کیا جاچکا تھا۔ تاہم اب بایزید نے بلغاریہ کو مکمل طور پر فتح کرنے کے لیے کمر باندھی۔ سربیا کو باج گزار بنانے کے بعد ۷۹۷ھ (۱۳۹۳ء) میں بایزید نے اپنے بیٹے سلیمان پاشا کو افواج دے کر بلغاریہ کی طرف روانہ کیا۔ وہاں کے بادشاہ نے سخت مزاحمت کی مگر سلیمان پاشا نے اس کا پایۂ تخت ''ترتوا'' فتح کیے بغیر دم نہ لیا۔ اس کے بعد ترک افواج شمالی بلغاریہ کی طرف بڑھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے بھی قبضے میں لے لیا۔ بلغاریہ جیسے وسیع ملک پر قبضے کی مہم ایک سال کے اندر مکمل ہوگئی۔ یہ اس صدی کا ایک تاریخی واقعہ تھا جس نے پورے یورپ کو حیران کردیا۔ [2]

صلیبی جنگ...... معرکہ نیکوپولس:

بلغاریہ کے بعد یورپ کے ہر حکمران کو عثمانیوں سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ ہنگری اس وقت یورپ کا سب سے طاقتور ملک تھا اور بلغاریہ کی فتح کے بعد عثمانی افواج اس کی سرحدوں تک پہنچ چکی تھیں۔ یہاں کے بادشاہ سگیسمنڈ نے روم کے پوپ بونی فیس نہم کو احساس دلایا کہ اگر یورپ صلیب کے نام پر اکھٹا نہ ہوا تو کچھ ہی مدت میں پورے یورپ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوجائے گا۔ پوپ نے شاہِ ہنگری سے اتفاق کرتے ہوئے یورپی ممالک کو بایزید کے مقابلے میں متحد ہونے کی دعوت دی۔ یورپ میں ایک بار پھر صلیبی جنگ کا بگل بجادیا گیا۔ قُسطَنطِینِیّہ کا قیصر عثمانیوں کے نرغے میں ہونے کی وجہ سے اعلانیہ طور پر اس اتحاد میں شریک نہیں تھا مگر خفیہ طور پر وہ ہر ایسی سازش کا حصہ بنتا تھا۔

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۰۰؛ اخبار الدول: ۳/۱۵،۱۶؛ تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/۳۴۰، ۳۴۳
۸۰۱ھ میں ہی بایزید نے سیواس کے حاکم قاضی برہان الدین کی موت کے بعد اس ریاست کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ نیز ۸۰۳ھ (۱۴۰۱ء) میں اس نے مشرقی اناطولیہ کی ریاست ارزنجان کو زیرنگین کیا، وہاں کا حاکم طہرتن جس نے تیمور کی اطاعت اختیار کرلی تھی، بھاگ کر تیمور کے پاس چلا گیا۔ (عجائب المقدور، ص ۱۳۰، ۱۳۱؛ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از سید محمد: ص ۱۲۷) تفصیل آگے آرہی ہے۔

② الدولۃ العثمانیہ فی التاریخ الحدیث، ص ۳۱

بایزید ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) سے لے کر ۷۹۹ھ (۱۳۹۷ء) تک تقریباً پانچ سال ایشیائے کوچک کی مہمات میں مصروف رہا۔ اس دوران اتحادیوں نے پورے اطمینان سے ایک بڑی جنگ کی بھرپور تیاری کرلی۔ فرانس اور انگلینڈ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی مگر پوپ کے سمجھانے پر آخر وہ بایزید کے مقابلے میں متحد ہو گئے۔

ہنگری، برطانیہ اور فرانس کے علاوہ آسٹریا، ولاچیا، پولینڈ، اسکاٹ لینڈ، کسٹالیہ (شمالی اندلس) سوئزرلینڈ، یونان، اٹلی اور دیگر یورپی ممالک کی افواج عثمانیوں کے مقابلے میں جمع ہوئیں جن کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے متجاوز تھی۔ یورپ کے صفِ اول کے شہزادے اور نواب اس فوج کی قیادت کررہے تھے۔ شاہِ فرانس کے تین چچیرے بھائی: جیمز، ہنری اور فلپس فرنچ افواج کے قائد تھے۔ ڈیوک آف برگنڈی (کاؤنٹ دی نیورس) بھی اپنی فوج لے کر پہنچا۔ آسٹریا کی افواج ہرمین اور کاؤنٹ اوف دی لی کی کمان میں تھیں۔ القدس سے بھاگ کر یورپ میں پناہ لینے والے ٹیمپلرز بھی جو کہ اپنی سفاکی میں مشہور تھے، اس فوج کا حصہ تھے۔ گزشتہ دو صدیوں میں یہ یورپی ممالک کی سب سے بڑی متحدہ فوج کشی تھی جسے قرونِ وسطیٰ کی آخری صلیبی جنگ کہا جاتا ہے۔ بوڈاپسٹ میں تمام اتحادی حکمرانوں کی کونسل نے بیٹھ کر جنگ کی منصوبہ بندی کی اور شاہِ ہنگری کو اپنا قائد چن لیا۔

اپنے ساتھ اتحادیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر شاہِ ہنگری نے لاف زنی کرتے ہوئے کہا: ''اگر ہم پر آسمان بھی ٹوٹ پڑے تو ہم اسے بھی اپنے نیزوں پر روک لیں گے۔''

آخرکار یہ لشکر ''رومیلی'' میں داخل ہوا۔ اتحادیوں کو معلوم تھا کہ بایزید اپنی فوج کے ساتھ ایشیائے کوچک کی مہمات میں مصروف ہے، اس لیے وہ آبادیوں کو لوٹتے، کھیتوں کو اجاڑتے اور انسانوں کا قتل عام کرتے آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے پہلے عثمانیوں کی باج گزار ریاست سربیا کو تاراج کیا۔ پھر دریائے ڈینوب کے کنارے شمالی بلقان تک بڑھتے چلے گئے اور یہاں عثمانیوں کے سرحدی شہر 'نیکوپولس' کا محاصرہ کرلیا۔ نیکوپولس کے قلعہ دار بوغلن بیگ نے اتنی بڑی فوج کو دیکھ کر بھی ہمت نہ ہاری اور شہر حوالے کرنے سے انکار کردیا۔ اگر وہ ہتھیار ڈال دیتا تو اتحادی پیش قدمی کرتے ہوئے پورے بلقان پر قابض ہوجاتے اور بایزید کے آنے سے پہلے اس کے پایۂ تخت 'ایڈریانوپل' تک پہنچ جاتے۔ تب صورتحال سخت تشویش ناک ہوجاتی مگر بوغلن بیگ کی دلیری اور معرکہ آزمائی نے کچھ دنوں کے لیے اتحادیوں کی پیش قدمی روک دی۔ اس کے باوجود اتحادیوں کا خیال تھا کہ ان کی قوت اور کثرت کا حال سن کر بایزید سمندر عبور کرنے کی ہمت نہیں کرسکے گا اور وہ آسانی سے درۂ دانیال عبور کرکے اناطولیہ کو فتح کرلیں گے۔ انہیں یہ بھی امید تھی کہ وہ شام پہنچ کر بیت المقدس پر بھی قابض ہوسکیں گے۔

بایزید اس وقت اناطولیہ میں تھا۔ اسے جوں ہی اتحادیوں کے نیکوپولس پہنچنے کی اطلاع ملی، وہ درۂ دانیال عبور کرکے خاموشی سے ایڈریانوپل پہنچا اور افواج مرتب کرکے بڑی سرعت سے محاذ کی طرف لپکا۔ اس کی کمان میں ستر ہزار سپاہی تھے۔ وہ تعداد میں اتحادیوں سے کم مگر تربیت، نظم وضبط اور جدید اسلحے کی مہارت میں آگے تھے۔

نیکو پولس کا محاصرہ کرنے والے اتحادی بادشاہوں کو جب جاسوسوں نے اطلاع دی کہ چھ گھنٹے میں بایزید محاذ پر پہنچنے والا ہے تو اتحادیوں نے اسے ایک جھوٹی افواہ سمجھ کر زوردار قہقہے لگائے۔ مگر کچھ دیر بعد اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ پھر جب یکا یک بایزید افق پر نمودار ہوا تو سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بایزید نے پڑاؤ کے لیے نیکو پولس سے چند میل دور ایسی جگہ منتخب کی جہاں سامنے ٹیلوں کا سلسلہ تھا اور صلیبی لشکر اس کی فوج کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ادھر اتحادیوں کو ابھی تک اپنی کثرت کا غرہ تھا۔ وہ بایزید کو جلد ایک عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ڈیوک اوف برگنڈی نے شاہِ ہنگری سگیسمنڈ سے درخواست کی کہ اس کی فوج کو ہراول دستہ بنا کر ترکوں پر حملے میں پہل کا موقع دیا جائے۔

شاہِ ہنگری ترکوں کے جنگی حربوں سے واقف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ترکوں کے حملے کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس نے کہا: ''پہلے ترکوں کے رضا کار دستے آگے بڑھیں گے۔ اصل باقاعدہ فوج بعد میں حملہ کرے گی۔ اس لیے آپ ان کی باقاعدہ فوج کے حملے کا انتظار کریں۔''

مگر فرانسیسی عثمانیوں کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ انہوں نے راستے میں گرفتار کیے گئے ترک قیدیوں کو قتل کر دیا اور فتح یابی کی امنگ میں نعرے بلند کیے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسے انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔

بایزید نے حملے کی تیاری کر لی تھی۔ جنگ کی کمان وہ خود کر رہا تھا۔ اس نے باقاعدہ فوج کے چالیس ہزار سپاہیوں کو میدان میں صف بستہ کیا اور رضا کار لشکر کو چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں پیش قدمی کے لیے تیار کیا۔

آخر معرکہ شروع ہوا۔ فرانسیسی گھڑسواروں نے ہراول بن کر یلغار کی۔ اس کے پیچھے شاہ ہنگری پوری فوج کے ساتھ آرہا تھا۔ بایزید کی رضا کار ٹولیاں طے شدہ منصوبے کے مطابق فرانسیسیوں سے مڈبھیڑ کے بعد جلد منتشر ہوگئیں اور اتحادی پیش قدمی کرتے کرتے ان ٹیلوں تک پہنچ گئے جو بایزید کی خیمہ گاہ کے سامنے تھے۔

یہاں ان کا بایزید کے دستوں سے سامنا ہوا۔ ادھر مسلم رضا کار جو منتشر ہو گئے تھے، منظم ہو کر ان کے عقب سے حملہ آور ہوئے۔ فرانسیسی دونوں طرف سے گھر کر بری طرح پھنس گئے۔ ان میں سے بمشکل چند افراد واپس پہنچ سکے اور شاہِ ہنگری کو اس بربادی کی اطلاع دی۔ یہ سن کر اتحادیوں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ ابھی وہ سنبھلنے نہ پائے تھے کہ بایزید نے باقاعدہ فوج کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا۔ بعض یورپی شہزادوں نے سخت مزاحمت کی، فرانس کا پرچم چھ بار گرا، ہر بار کسی نہ کسی افسر نے اسے اٹھا لیا۔ جنگ کے سخت مرحلے میں ہزاروں مسلمان بھی شہید ہوئے تاہم ایک قہر انگیز لڑائی کے بعد یورپی سورماؤں کے قدم اکھڑ گئے۔ مگر دریائے ڈینوب ان کی پشت پر تھا اس لیے ہزاروں سپاہی غرق ہوگئے۔

مجموعی طور پر ایک لاکھ تیس ہزار نصرانیوں میں سے صرف بیس ہزار بچ سکے۔ ایک لاکھ مسلمانوں کی شمشیروں یا دریا کی موجوں کا شکار ہوگئے۔ دس ہزار قیدی بنے جن میں درجنوں شہزادے، نواب اور افسران شامل تھے۔ شاہ ہنگری اور برطانوی ولی عہد ہنری چہارم بچ نکلے۔ ۳۰ ہزار مسلمان سپاہی شہید ہوئے۔ یہ ۲۲ ذوالحجہ ۷۹۸ھ (۲۵ ستمبر ۱۳۹۶ء) کا

واقعہ ہے۔ جنگ کے اختتام پر بایزید نے میدان کا چکر لگایا تو جگہ جگہ شہداء کی نعشیں دکھائی دیں۔ اس کے منہ سے نکلا:

''یہ فتح بہت مہنگی پڑی۔ میں ہنگری سے ان جانبازوں کے خون کا بدلہ لے کر رہوں گا۔''

بایزید نے قیدیوں کا معاینہ کر کے ان میں سے کچھ کو قتل کرا دیا۔ کچھ کو غلام بنالیا۔ کچھ قیدی افسران کو مختلف شہروں میں اس فتح مبین کی خوشخبری کے ساتھ نمائش کے لیے روانہ کر دیا۔

ان کے بعد بایزید نے یورپی بادشاہوں، شہزادوں اور نوابوں کو بلوایا جن کی تعداد ستائیس تھی۔ ان میں ڈیوک اوف برگنڈی (جین سونس)، فلپ ڈی کوپٹ، کاؤنٹ ہنری ڈی لورین اور مارشل بوسی کالٹ جیسے نامور حکمران افراد شامل تھے۔ بایزید نے انہیں مخاطب کر کے کہا:

> ''تم نے بلاوجہ میری مملکت پر حملے کی زحمت کی۔ میں خود ہنگری، آسٹریا، فرانس، جرمنی اور اٹلی کو فتح کرنے پر تلا ہوا ہوں۔ میرا عزم ہے کہ اٹلی کے شہر روم میں سینٹ پیٹر کی قربان گاہ پر جا کر اپنے گھوڑے کو دانہ کھلاؤں گا۔ اب تم سے وہیں ملاقات ہوگی۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تم زیادہ تیاری کے ساتھ مقابلے پر آؤ۔ اگر مجھے تمہارا ذرا بھی ڈر ہوتا تو میں تم سے یہ وعدہ لیتا کہ تم آئندہ میرے خلاف جنگ نہیں کرو گے۔ مگر میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ اپنے وطن پہنچ کر فوراً جنگ کی تیاری شروع کر دو۔''

اس جنگ نے یہ واضح کر دیا کہ ترکوں کو یورپ سے نکالنے کا دعویٰ محض ایک خام خیالی ہے۔ اس فتح کے بعد عالم اسلام میں عثمانی سلطنت کی عزت وسطوت کو چار چاند لگ گئے۔ نیز قاہرہ کے عباسی خلیفہ القائم نے بایزید کو سلطان کا خطاب دیا جس سے اس کے مقام اور نیک نامی میں نمایاں اضافہ ہوا۔ مملوک سلطان الظاہر برقوق سے بھی سلطنتِ عثمانیہ سے تعلقات مزید پختہ ہو گئے۔ اس جنگ کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ مشرقی یورپ کے ساتھ مغربی یورپ پر بھی ترکوں کی ہیبت بیٹھ گئی۔ ہنگری کا رعب داب جاتا رہا اور اس کی عسکری قوت بکھر گئی۔ دور دور تک اب یورپ میں کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی جو عثمانیوں کی یلغار کا مزید چند سال بھی مقابلہ کر پاتی۔ [1]

قُسطَنطِینِیّہ پر بایزید کے حملے

یورپ اور ایشیائے کوچک کی ان فتوحات کے دوران بایزید کو تین بار قُسطَنطِینِیّہ کا محاصرہ بھی کرنا پڑا۔ مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ بایزید معاہدوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے، فقط قیصر کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قُسطَنطِینِیّہ پر قبضے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ خود قیصر نے بار بار عہد شکنی کر کے بایزید کو ان مہمات پر مجبور کیا تھا۔ پس

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیہ ازیلماز: ۱/۱۰۷، ۱۰۸؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۴۳، ۱۴۴؛ الدولۃ العثمانیہ فی التاریخ الحدیث، ص ۳۲

...... مشہور ہے کہ بایزید سے پہلے ترکانِ عثمان کا ہر حکمران امیر کہلاتا تھا مگر یہ درست نہیں، لین پول لکھتا ہے کہ برٹش میوزیم میں محفوظ ابتدائی عثمانی حکمرانوں کے سکوں پر بھی ''سلطان'' کے الفاظ کندہ ملتے ہیں۔ البتہ بایزید کی خصوصیت اتنی تھی کہ وہ پہلا عثمانی حکمران تھا جسے سلطان کا لقب خلیفہ کی جانب سے ملا تھا۔ (دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیر: ۱/۵۷، بحوالہ لین پول، ص ۵۰، فٹ نوٹ)

قُسطنطینیہ پر بایزید کے حملوں کے ذکر سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان حملوں کے پسِ منظر اور اصل عوامل کا جائزہ لیں۔

قیصر جان پلیو کے ساتھ معاملات:

قیصر جان پلیو لوگس سلطان مراد کے دور میں خفیہ طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف سازشیں کرتا رہا، تاہم اس کی ہوشیاری کی وجہ سے سلطنتِ عثمانیہ اور قُسطنطینیہ کے درمیان جنگ کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ جان پلیو، بایزید کے دور تک زندہ تھا۔ اس نے ۵۱ سال حکومت کی۔ بایزید نے اس کے ساتھ طے شدہ معاہدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی۔

جان پلیو کو مدتِ دراز سے اپنے بیٹے اینڈرونیکس کی جانب سے تکالیف برداشت کرنا پڑ رہی تھیں کیوں کہ وہ باپ سے حکومت چھیننا چاہتا تھا۔ آخر جان پلیو نے اس نالائق شہزادے کو قید کر دیا۔ آخر شہزادے کی درخواست پر باپ بیٹے کے تنازعے میں سلطنتِ عثمانیہ کو منصف کا کردار ادا کرنا پڑا جس کا انجامِ کار یہ ہوا کہ جان پلیو کو تخت پر برقرار رکھا گیا اور اینڈرونیکس کو ایک جزیرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ [1] قیصر کے ساتھ اب ایک نیا معاہدہ ہوا۔ بازنطینیوں پر جزیہ عائد کر دیا گیا جس کے تحت ہر سال قیصر تیس ہزار طلائی سکے ادا کرنے کا پابند قرار پایا۔ نیز اسے حسبِ طلب سلطنتِ عثمانیہ کو فوج مہیا کرنے کا پابند کر دیا گیا۔ ایشیائے کوچک میں بازنطینیوں کے قلعوں میں سے فقط ایک قلعہ ''فلاڈلفیا'' باقی رہ گیا تھا۔ اس معاہدے میں یہ بھی عثمانیوں کے نام کر دیا گیا اور جب قلعہ دار نے قیصر کے حکم پر قلعہ خالی کرنے سے انکار کیا تو قیصر کے یونانی سپاہیوں نے اسے بزورِ قوت لے کر عثمانیوں کے حوالے کر دیا۔

کچھ مدت تک معاہدے پر عمل ہوتا رہا۔ اس دوران بایزید ایشیائے کوچک کی ریاستوں کے خلاف مہمات میں مشغول ہوا تو معاہدے کے مطابق قیصر کا بیٹا منوئیل اوّل کچھ امدادی فوج کے ساتھ اس کے ہم رکاب رہا۔ [2]

اسی زمانے میں عثمانی افواج نے کچھ بحری فتوحات حاصل کیں اور روڈس سمیت چند جزائر پر قبضہ کر لیا۔ قیصر جان پلیو نے یہ دیکھ کر خطرہ محسوس کیا اور قُسطنطینیہ میں دفاعی تیاریاں شروع کر دیں۔ بایزید کو یہ علم ہوا تو اس نے قیصر کو کہلوایا:

> ''شہر کی فصلیں مسمار کر دو، ورنہ میں تمہاری آنکھوں کا نور (یعنی تمہارا فرزند) چھین لوں گا۔''

قیصر نے مرعوب ہو کر جنگی تیاریاں ختم کر دیں، اس کے چند دنوں بعد قیصر جان پلیو کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) کا واقعہ ہے۔ [3]

منوئیل کی بادشاہت اور قُسطنطینیہ کا محاصرہ:

باپ کی موت کی خبر سنتے ہی منوئیل اوّل سلطان بایزید سے اجازت لیے بغیر راتوں رات فرار ہو گیا اور قُسطنطینیہ پہنچ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ بایزید نے اس حرکت پر اسے ایک تہدید آمیز خط لکھا جس پر منوئیل مزید بھڑ گیا اور ہنگری کے بادشاہ کو خط و کتابت کے ذریعے بایزید کے خلاف اُکسانے لگا۔ اس کا ایسا ایک خط بایزید کے جاسوسوں کے ہاتھ بھی

---

[1] تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۴۲، ۴۳
[2] دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیر، ص ۵۳
[3] تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/ ۳۱۰
[4] تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/ ۳۱۰

لگ گیا تھا۔ بایزید نے اس کے باوجود چشم پوشی کی اور منوئیل کو مراسلہ بھیج کر کہا کہ اسے ہنگری کے خلاف جنگ درپیش ہے، لہٰذا حسبِ معاہدہ امدادی دستے بھیجے جائیں۔ منوئیل نے اس پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔

یہ دیکھ کر بایزید نے پہلی بار ۷۹۳ھ (۱۳۹۱ء) میں قُسطَنطِینِیَّہ کا محاصرہ کیا، تاہم اس نے شہر پر براہِ راست کوئی حملہ نہ کیا بلکہ فقط ناکہ بندی پر اکتفا کیا جس کے باعث شہر کا رابطہ بیرونی دنیا سے منقطع ہوگیا اور وہاں قحط کی سی صورتحال پیدا ہوگئی۔ منوئیل نے یہ دیکھ کر شاہِ ہنگری اور پوپ کو خفیہ پیغامات بھیجے جن میں مذہب کی دہائی دے کر کہا گیا تھا کہ وہ فوراً بایزید کے خلاف فوج کشی کریں ورنہ نصرانیوں کا یہ قدیم مرکز مسلمانوں کے قبضے میں چلا جائے گا، تاہم اس وقت یورپی طاقتیں کچھ نہ کر پائیں۔[1]

صلح کی شرائط:

آخر کار بایزید نے چند شرائط منوا کر محاصرہ ختم کیا۔ ان شرائط کے مطابق:

1. بازنطینی سلطنت پر عائد جزیہ کی مقدار بڑھادی گئی۔
2. شہر کے باہر کھیتوں اور باغوں کی پیداوار پر ٹیکس عائد کردیا گیا۔
3. طے پایا کہ قیصر قُسطَنطِینِیَّہ میں مسلمانوں کو آباد کرے گا جن کے لیے سات سو گھر مخصوص کیے جائیں گے۔
4. طے پایا کہ شہر میں ایک مسجد اور ایک شرعی عدالت قائم کی جائے گی۔ عدالت میں مسلمان قاضی کا تقرر ہوگا۔

معاہدے کے مطابق منوئیل نے وہاں مسلمانوں کو آباد کیا، شرعی عدالت جاری کی اور ایک مسجد بھی تعمیر کرادی۔ تاہم کچھ مدت بعد منوئیل نے عہد شکنی کرتے ہوئے مسجد مسمار کرادی اور مسلمانوں کو شہر سے نکال دیا۔[2]

قُسطَنطِینِیَّہ کا دوسرا محاصرہ:

بایزید کچھ مدت تک اناطولیہ کی فتوحات میں مصروف رہا۔ پھر اسی دوران کچھ وقفہ لے کر وہ ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں دوبارہ اناطولیہ سے رومیلی آیا اور قُسطَنطِینِیَّہ کو فتح کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ اس نے سالونیکا کو فتح کرکے وہاں چھاؤنی قائم کی اور قُسطَنطِینِیَّہ کو گھیر لیا۔ دوسری طرف اس کی افواج بلغاریہ کے شمالی علاقوں کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔[3]

بایزید یہ رعایت دینے پر تیار تھا کہ قیصر کی رسمی حکومت اپنی جگہ برقرار رہے مگر اس کے نزدیک یورپ کی فتح کے لیے ضروری تھا کہ درۂ دانیال کے ساتھ ساتھ آبنائے باسفورس بھی مسلمانوں کے پاس ہوتا کہ وہ آزادی سے یورپ کے ہر حصے تک جاسکیں۔ اس آبنائے پر تسلط تب ہی ممکن تھا جب قُسطَنطِینِیَّہ مسلمانوں کے پاس ہو یا مسلمانوں کی آبادی وہاں ہو۔ یہ دوسرا محاصرہ بھی کسی نتیجے کے بغیر ختم ہوگیا کیوں کہ یورپی طاقتیں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف جمع ہوگئی

---

① تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/ ۳۱۰ تا ۳۱۲ مع حواشی

② اخبار الدول: ۳/ ۱۷، فی اصول التاریخ العثمانی، ص ۵۳، تاریخ سلاطین بنی عثمان: ص ۴۳

③ تاریخ سلاطین بنی عثمان: ص ۴۳ ...... بلغاریہ کی اس مہم کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں جس میں جنگِ نیکوپولس بھی شامل ہے۔

تھیں جس کے نتیجے میں بایزید کو جنگِ نیکو پولس لڑنا پڑی۔

قُسطنطِینِیَّہ کا تیسرا محاصرہ:

''جنگِ نیکو پولس'' سے فارغ ہو کر بایزید نے ایک بار پھر نئی تیاری کے ساتھ ۷۹۹ھ (۱۳۹۷ء) میں تیسری بار قُسطنطِینِیَّہ کا محاصرہ کیا۔ اس نے خونریزی کے بغیر قیصر منوئیل سے معاملات طے کرنے کی کوشش کی اور مطالبہ کیا کہ قیصر شہر اس کے سپرد کر دے مگر منوئیل نہ مانا۔ اس دوران محاصرے کی سختی نے اہلِ شہر کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ مزاحمت کا حامی گروہ منوئیل کے ساتھ تھا۔ جبکہ صلح پسند گروہ اس کے بھتیجے ''یوانیس'' کے گرد جمع تھا۔ یہ شہزادہ ''سیلیوری'' کا حاکم تھا اور اس کی اپنے چچا کے ساتھ سخت کشیدگی چل رہی تھی۔ اس کے بایزید سے بھی روابط تھے اور توقع تھی کہ وہ شہر کو مسلمانوں کے حوالے کرانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

یہ خطرہ منوئیل کو بھی تھا۔ اس نے یوانیس کے ساتھ صلح کر لی اور اسے قُسطنطِینِیَّہ کی حکومت میں اپنا شریک بنا لیا۔ اس کے فوراً بعد منوئیل نے یوانیس کو قُسطنطِینِیَّہ میں نائب مقرر کر دیا اور خود خفیہ طور پر یورپ کا دورہ کرنے نکل کھڑا ہوا تا کہ عثمانیوں کے خلاف مغرب سے دوبارہ محاذ کھولا جائے۔ یہ واقعہ (۱۳۹۹ء) کا ہے۔[1] ساتھ ہی اس نے مغل فاتح تیمور لنگ کو جس کی حدِ عمل داری اناطولیہ سے آملی تھی، مراسلہ بھیج کر سلطنتِ عثمانیہ پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔[2]

بایزید کی یورپ میں یونان تک پیش قدمی اور اچانک واپسی۔ قُسطنطِینِیَّہ کا چوتھا محاصرہ:

اُدھر بایزید مسلسل نصرانیوں سے جہاد میں مشغول تھا۔ جنگِ نیکو پولس کے دو سال بعد ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) میں اس نے منصوبے کے مطابق یورپ میں مزید پیش قدمی کی۔ اس نے پہلے یونان کا رخ کیا کیوں کہ یہاں کی فوج نیکو پولس کی جنگ میں اس کے خلاف شامل تھی۔ اس نے یونان کے تاریخی شہروں: ''تھسلی'' اور ''ایتھنز'' کو فتح کیا اور یہاں سے ۳۰ ہزار افراد کو اناطولیہ منتقل کر دیا۔ اس کے سپہ سالار آسٹریا اور ہنگری کی طرف بڑھے۔ ابھی یہ مہم جاری تھی کہ اسے قیصر کے اس اشتعال انگیز مراسلے کی اطلاع ملی جو اس نے تیمور کو بھیجا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد اسے اطلاع ملی کہ تیمور ہندوستان سے واپس شمالی ایران پہنچ گیا ہے۔ ایسے میں بایزید نے ضروری سمجھا کہ آگے بڑھنے سے پہلے قیصر کے مرکز کو فتح کرے اور پھر اناطولیہ کا دفاع مضبوط کرے۔ لہٰذا بایزید کو یورپ کی مہم ادھوری چھوڑ کر قُسطنطِینِیَّہ کی طرف متوجہ ہونا پڑا جہاں اس وقت قیصر کا بھتیجا یوانیس حاکم تھا۔ بایزید نے پیغام بھیج کر مطالبہ کیا کہ وہ قُسطنطِینِیَّہ ترکوں کے حوالے کر دے مگر یوانیس نے انکار کر دیا۔ آخر ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں بایزید نے چوتھی بار اس شہر کا محاصرہ کر لیا جو چار ماہ تک جاری رہا۔ فتح قریب تھی کہ اچانک اناطولیہ پر تیمور لنگ کے حملے نے فتح کے امکانات پر پانی پھیر دیا۔[3]

---

① تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۳۰ تا ۳۳۲
② تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۴۳
③ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۴۳، ۴۴

تیمور کی یلغار

بایزید کی تخت نشینی سے اب تک تیمور مزید کئی مہمات سر کر چکا تھا۔ ایران کی فتح کے بعد اس کا اگلا قدم عراق میں تھا۔ ۷۹۵ھ میں وہ عراق فتح کر چکا تھا اور بغداد کا مسند نشین احمد خان جلائر بن اویس تیموری لشکر کی ہلاکت خیزیوں سے عاجز آ کر شاہِ مصر الظاہر برقوق کے ہاں پناہ لے چکا تھا۔ ۸۹۶ھ میں تیمور نے موصل، دیار بکر، رہا اور تکریت پر بھی قبضہ کر لیا۔[1] تیمور نے آرمینیا کی فتح کے بعد دربند کے کہساروں سے گزر کر دشتِ قپچاق میں قدم رکھا اور مغلوں کی سب سے بڑی سلطنت شاخ زریں کو شکست دے ڈالی۔[2]

تیمور مشرقی اناطولیہ میں:

تیمور کے سامنے اب فقط دو طاقتور سلطنتیں باقی رہ گئیں تھیں: ایک سلطنتِ ممالیک، دوسری سلطنتِ عثمانیہ۔ تیمور چاہتا تھا کہ ان دونوں سلطنتوں کو بھی اپنا باج گزار بنا لے۔ تاہم اس نے مزید یلغار کو مؤخر کرتے ہوئے اپنے پایۂ تخت سمرقند کا رُخ کیا[3] اور گزشتہ چند سالہ مہمات میں لوٹے گئے عظیم ذخائر اور بے شمار خزانے وہاں محفوظ کیے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے پلٹا۔ خراسان اور آذربائی جان سے گزر کر وہ اناطولیہ کی مشرقی سرحدوں پر آ دھمکا۔ سرحدی صوبے ارزنجان کا حاکم "طہرتن" خائف ہو کر اس کا تابع دار بن گیا۔[4] انہی دنوں تیمور نے سلطانِ مصر الظاہر برقوق کو لکھ بھیجا:

> "ہم اللہ کے غضب سے پیدا کردہ لشکر ہیں۔ ہم اللہ کے غضب کا شکار بننے والوں پر مسلط ہوتے ہیں۔ ہم کسی کی فریاد سے نرم دل نہیں ہوتے۔ کسی رونے والے کے آنسو سے متاثر نہیں ہوتے۔ اللہ نے ہمارے دل سے رحم نوچ لیا ہے۔ ہمارے پاس اس کے لیے ہلاکت ہی ہلاکت ہے جو ہماری تابع داری نہ کرے۔"

الظاہر برقوق نے جواب میں لکھوایا:

> "اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحم چھین لیا ہے تو یہ سب سے بڑا عیب ہے جسے تم خود قبول کر چکے ہو۔ کیا تم مسلح شہ سواروں کو بھیڑ بکریوں سے ڈراتے ہو۔ اگر ہم نے تمہیں قتل کیا تو یہ بڑا انعام ہوگا۔ اگر ہم قتل ہوئے تو جنت ہم سے ایک گھڑی دور ہوگی۔"[5]

تیمور اس وقت ممالیک یا عثمانیوں کی طرف پیش قدمی نہ کر سکا بلکہ فارس کی فتوحات کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔[6]

---

① عجائب المقدور فی اخبار تیمور لابن عربشاہ، ص ۸۱ تا ۸۷، ۹۷، ط کلکتہ

② عجائب المقدور، ص ۱۱۸ تا ۱۲۹

③ مقریزی نے تیمور کی سمرقند واپسی کی توقیت ۷۹۶ھ بیان کی ہے۔ (السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۳۵۶/۵)

④ عجائب المقدور، ص ۱۳۰، ۱۳۱؛ مقریزی کے مطابق تیمور کا ارزنجان پہنچنا ۷۹۶ھ کا واقعہ ہے۔ (السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۳۰۱/۵)

⑤ عجائب المقدور فی اخبار تیمور، ص ۱۲۷، ۱۲۸، اس مراسلے کی توقیت مقریزی نے ۷۹۶ھ کی ہے۔ (السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۳۵۰/۵)

⑥ ظفر نامہ تیمور جہانگشا: فصل ۱۸ تا فصل ۲۳، ط اصفہان

وہ بایزید کی یورپ میں فتوحات کی خبریں سنتا اور اپنی سلطنت کا رقبہ بڑھاتا رہا۔ اس کی راجدھانی کی سرحدیں آرمینیا اور آذربائی جان تک پہنچ چکی تھیں جن کے حکام کبھی تیمور کا ساتھ دیتے، کبھی بایزید کا۔ جب وہ سلطنتِ عثمانیہ سے ناراض ہوتے تو تیمور سے مدد مانگتے۔ جب تیمور سے تنگ آتے تو بایزید سے رابطہ کرتے۔ [1]

قاضی برہان الدین کے دربار میں تیمور کے سفیروں کا قتل:

۸۰۰ھ کے آغاز میں تیمور ایک بار پھر اناطولیہ کی سرحدوں پر پہنچا اور اس نے حاکمِ سیواس قاضی برہان الدین کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کا حلقہ بگوش بن جائے۔ [2] قاضی برہان الدین کو ایک عالم فاضل آدمی اور دلیر حاکم کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ترک مؤرخ اسماعیل اوزون حقی لکھتا ہے:

"اناطولیہ کے دیگر حکام کے برعکس جو کہ سست ارادہ اور متردد تھے، یہ ایک دلاور اور جوشیلا مرد تھا۔" [3]

قاضی برہان الدین نے تیمور کے سفیروں کے سر قلم کرا دیے اور ساتھ ہی بایزید یلدرم اور سلطانِ مصر الظاہر برقوق کی خدمت میں مراسلہ بھیجا اور انہیں تیموری خطرے کے سامنے متحد ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہا:

"میں نے تیمور کے سفیروں کے ساتھ یہ سلوک ان مظالم کے ردِّعمل میں کیا ہے جو اس نے اللہ کی زمین پر اللہ کے بندوں کے ساتھ روا رکھے ہیں۔ یہ سلوک میں نے آپ کی پشت پناہی کے بھروسے پر کیا ہے، ورنہ میری کہاں یہ طاقت کہ میں اس کے عظیم لشکروں کا مقابلہ کرسکوں جن کے سامنے کوئی بادشاہ اور کوئی قلعہ نہیں ٹھہر سکا۔ میں آپ دونوں (ممالیک اور عثمانیوں) کی سرحدوں کا محافظ، آپ دونوں کا جانثار اور آپ دونوں کا ہراول دستہ ہوں۔ اگر آپ مجھے تنہا چھوڑیں گے تو حوادث سے دوسرے اور تیسرے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ آگ کی چنگاری کو ابتداء میں نہ بجھا دیا جائے تو بسا اوقات بعد میں سب مل کر بھی اس پر قابو نہیں پا سکتے۔"

بایزید یلدرم نے قاضی برہان الدین کے اس فعل کی بڑی تعریف کی اور ایک حوصلہ افزا جوابی مراسلے میں کہا:

"اس جرأت سے تیمور ڈر جائے گا، بصورتِ دیگر ہم مقابلے میں ناقابلِ تسخیر لشکر لے آئیں گے۔" [4]

زمین پر ایک بادشاہ کی حکمرانی ہوگی:

اُدھر قاضی برہان الدین کی اس حرکت پر تیمور سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا، ان حالات میں اس نے طے کرلیا کہ دنیا کے حکمرانِ اعظم کے طور پر وہی باقی رہے گا اور بایزید کی سلطنت کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دے گا۔ وہ کہتا تھا:

---

① فی اصول التاریخ العثمانی، ص ۵۶، ۵۷

② السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۵/ ۴۰۷

③ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۱۷

④ عجائب المقدور، ص ۱۳۰، ۱۳۱

قاضی برہان الدین نے تیمور کے سفیر کو کب قتل کرایا تھا؟ اس کی توقیت مشتبہ ہے۔ مقریزی کے بیان کے مطابق تیمور محرم ۸۰۰ھ میں سیواس پہنچا تھا۔ (السلوک لمعرفۃ دول الملوک: ۵/ ۴۰۷) ممکن ہے اس سے مراد سیواس کے قریب پہنچنا ہو، کیوں کہ بالاتفاق تیمور نے سیواس کو اس وقت فتح نہیں کیا تھا۔ غالباً اس وقت تیمور نے ڈرانے دھمکانے کے لیے سفیر بھیجنے پر اکتفا کیا ہوگا اور قاضی برہان الدین کے حکم سے سفیر کا قتل انہی ایام میں ہوا ہوگا۔

''جس طرح آسمان پر ایک خدا ہے، اسی طرح زمین پر ایک بادشاہ کی حکمرانی ہوگی۔''[1]

تاہم اس نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا اور حملے میں کوئی جلدی نہ کی [2] بلکہ اس نے ممالیک کی طرف بھی ایک سفیر بھیج دیا جس نے حلب پہنچ کر تیمور کا مراسلہ دیا۔ مراسلے میں سلطنتِ تیموریہ کی اطاعت کی تاکید اور ساتھ ہی تیموری سکے اور خطبے کے اجراء کا حکم تھا۔ تیمور کے سفیر کا کہنا تھا:

''ہمارے آقا حکمرانی کے زیادہ حق دار ہیں۔ جسے وہ مقرر کریں وہی خلیفہ اور حکمران ہوگا۔ وہی قابلِ اتباع ہیں، باقی سب بادشاہ ان کے خادم ہیں۔ کسی دوسرے کو ریاست چلانے کا کوئی حق نہیں۔ ممالیک چرا کسیہ بھلا سیاست کہاں جانتے ہیں۔''

غالباً ایسا تحکمانہ پیغام بھیج کر تیمور خود جنگ کا دروازہ کھولنا چاہتا تھا۔ [3] ایسا ہی ہوا۔ یہ پیغام سلطانِ مصر کے نائب حاکمِ حلب نے وصول کیا اور مشتعل ہو کر تیمور کے قاصد کو مار ڈالا۔ مطلب ظاہر تھا کہ ممالیک جھکنے کے لیے تیار نہیں۔ [4]

ہندوستان پر تیمور کا حملہ:

تیمور ایک طرف مشرقی اناطولیہ پر یلغار کے لیے پر تول رہا تھا اور دوسری جانب حلب میں اپنے قاصد کے قتل کے بعد وہ ممالیک کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہ تھا۔ قریب تھا کہ اس کی افواج حلب پر ٹوٹ پڑتیں کہ اچانک اسے ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد سے پیدا شدہ سیاسی بحران کے شدید ہونے کی خبر ملی۔ [5]

تیمور ایک مدت سے ہندوستان کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور عراق وایران کے نومفتوحہ علاقوں پر اپنے بیٹے میران شاہ کو نائب مقرر کر کے خود ۸۰۰ھ میں تیزی سے سمرقند پہنچا اور کچھ دن وہاں گزار کر درّۂ خیبر کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوگیا۔ اس کی بے پناہ طاقت کے سامنے سب زیر ہوتے چلے گئے۔ [6]

صفر ۸۰۱ھ میں وہ پنجاب کے مختلف شہر فتح کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کی افواج پانی پت سے ہو کر دریائے جمنا کے پار اتر گئیں۔ چند ہفتوں میں وہ دہلی کے سامنے تھیں۔ جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ میں تیمور نے دہلی کو مسخر کر لیا جس کے بعد وہاں تین دن تک قتل وغارت کا بازار گرم رہا۔ [7]

---

① فی اصول التاریخ العثمانی، ص ۵۶

② عجائب المقدور، ص ۱۳۹

③ عجائب المقدور، ص ۱۷۶، ۱۷۷

④ نیل الامل فی ذیل الدول لزین الدین ابن شاھین الملطی: ۳/ ۳۸

⑤ عجائب المقدور، ص ۱۳۹، ۱۳۰

ابن عربشاہ نے یہ بات اس انداز میں لکھی ہے جیسے فیروز شاہ تغلق کی وفات انہی دنوں ہوئی تھی اور تیمور یہ سنتے ہی ہندوستان روانہ ہوگیا تھا، حالانکہ ایسا نہیں تھا، فیروز شاہ کئی برس پہلے ۳ رمضان ۷۹۰ھ کو وفات پا چکا تھا، کئی سالوں سے ہندوستان میں اس کے بیٹے اور پوتے حکومت کر رہے تھے اور اب ان میں شدید خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور سلطنت تقسیم ہو چکی تھی۔ (تاریخ فرشتہ: ۱/ ۳۳۸ تا ۳۴۱)

⑥ تیمور اپنی خودنوشت میں لکھتا ہے: ''سال ورود من بهندوستان مائة هشتم هجری را خاتمه داد'' (منم تیمور جهانگشا، ص ۲۸۹، ط اصفهان)

⑦ تاریخ فرشتہ: ۱/ ۳۳۸ تا ۳۴۲

تیمور دوسری بار مشرقی اناطولیہ میں:

دہلی کی فتح سے فارغ ہو کر تیمور دیگر ہندوستانی ریاستوں کی تسخیر میں مشغول تھا کہ اسے شام و مصر کے سلطان الظاہر برقوق کی رحلت کا پتا چلا۔ [1] ساتھ ہی اسے تیموری سفیروں کے قتل کے مرتکب سیواس کے حاکم قاضی برہان الدین کے قتل کی خبر ملی۔ [2] اس کے فوراً بعد اسے شمالی ایران میں اپنے نائب شہزادہ میران شاہ کا مکتوب ملا جس میں رائے دی گئی تھی کہ وہ بڑھاپے کے باعث حکمرانی کی مزید زحمت نہ کرے بلکہ گوشہ نشینی اختیار کر کے سلطنت بیٹوں کے حوالے کر دے۔ اس مراسلے نے تیمور کو ایسا فکر مند کیا کہ وہ ہندوستان کو اسی حال میں چھوڑ کر نہایت سرعت سے تبریز کی طرف لپکا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ۱۷ ربیع الاوّل ۸۰۲ھ کو وہ شمالی ایران پہنچ چکا تھا۔ تاہم اس نے خلاف توقع میران شاہ کو فقط سمجھانے پر اکتفا کیا۔ [3]

تیمور کے مطلوب امراء عثمانیوں کی پناہ میں:

تیمور کی ہندوستان میں مصروفیت کے دوران بغداد کا مفرور حکمران سلطان احمد بن اویس شاہِ مصر کی مدد سے واپس آکر بغداد سے تیمور کے گورنر امیر مسعود کو نکال چکا تھا مگر اب تیمور کے واپس آتے ہی وہ ایک بار پھر فرار ہو کر آذربائی جان کے حاکم قرا یوسف کے پاس پناہ گزیں ہو گیا۔ تیمور نے اسے سزا دینے کے لیے بلا تاخیر آذربائی جان پر یلغار کی اور مخالفین کا قلع قمع کر دیا۔ ۲ جمادی الآخرہ کو اس نے گرجستان کا مرکز تفلیس بھی فتح کر ڈالا۔ ان حالات میں قرا یوسف ترکمانی اور سلطان احمد بن اویس کے پاس سلطنتِ عثمانیہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ اس لیے دونوں بایزید کے پاس چلے گئے۔ تیمور ان دونوں کو عبرتناک سزا دینا چاہتا تھا۔ ان کے عثمانیوں کے ہاں پناہ لینے پر اسے سخت طیش آیا۔ [4]

بایزید کے باغی امراء تیمور کے مددگار:

تیمور کے غیظ و غضب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اناطولیہ کی مشرقی ریاست 'سیواس' کو اپنی تحویل میں لینے کے ارادے سے آیا تھا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے 'سیواس' کے عمائد نے ریاست بایزید کے حوالے کر دی تھی اور بایزید کا بیٹا

---

[1] عجائب المقدور، ص ۱۴۷ ...... الظاہر برقوق کی وفات شوال ۸۰۱ھ میں ہوئی تھی۔

[2] عجائب المقدور، ص ۱۴۷

قاضی ابوالعباس برہان الدین حنفی کا اصل نام احمد بن عبداللہ تھا۔ مؤرخین نے اسے ایک عالم فاضل، ادیب و سخن پرور، خوش اخلاق اور سخی شخصیت قرار دیا ہے۔ اس کے والد بنوارتنا (حکام قیصریہ) کے ہاں قاضی تھے۔ برہان الدین نے حلب اور قاہرہ میں علم حاصل کیا۔ ایک روایت کے مطابق مصر میں سر راہ بیٹھے کسی فقیر سے ملاقات ہوئی، قاضی برہان الدین نے اسے کھانا کھلایا۔ اس دوران فقیر کو کشف ہوا کہ یہ اناطولیہ میں حکمران بنے گا۔ اس نے کہا: تم یہاں مت رہو، تم تو سلطان روم ہو۔ چنانچہ قاضی برہان الدین نے اپنے وطن سیواس واپس آکر درس و تدریس کے ساتھ اعیان و اشراف کی مجالست شروع کی اور آخر وہاں کے حاکم کا داماد بننے میں کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں اختلاف کی بناء پر سسر کو قتل کر کے سیواس کا اقتدار سنبھال لیا۔ توقات، قیصریہ اور ملطیہ بھی اسی ریاست میں شامل تھے۔ ۷۸۹ھ میں ریاست سیواس نے ایک معاہدے کے تحت ممالیک مصر سے تعلق قائم کیا۔ ۷۹۹ھ میں آذربائی جان کے مغلوں نے سیواس پر حملہ کیا تو ممالیک کی فوج نے جا کر سیواس کو ان سے بچایا۔ ۸۰۰ھ کے اواخر میں ایک باغی سردار قرایلک عثمان ترکمانی نے بغاوت کی اور قاضی برہان الدین کو قتل کر دیا۔ (انباء الغمر: ۲/ ۵۹، سنۃ ۸۰۱ھ) مقریزی کی عبارت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی کا قتل ذوالقعدہ ۸۰۱ھ میں ہوا تھا۔ (السلوک للمقریزی: ۵/ ۴۱۹)

[3] عجائب المقدور، ص ۱۴۹ تا ۱۵۶ [4] عجائب المقدور، ص ۱۵۶، ۱۵۷؛ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۴۴

سلیمان صوبے دار کے طور پر وہاں کا انتظام سنبھال چکا تھا۔[1] اُدھر ایشیائے کوچک کے وہ ترکمان امراء جن کی ریاستوں پر بایزید نے حال ہی میں قبضہ کیا تھا، تیمور کے پاس حاضر ہو چکے تھے اور اسے بایزید کے خلاف مزید بھڑکا رہے تھے۔ ان امراء میں بنو کرمیان، بنو منتشا، بنو آیدین اور بنو اسفندیار نمایاں تھے۔[2] یہ امراء تیمور کو یلغار کے مناسب ترین راستوں اور حریف کے کمزور پہلوؤں سے بھی آگاہ کرتے رہے۔[3]

ممالیک اور عثمانی متحد کیوں نہ ہو سکے؟

اس وقت صورتحال یہ تھی کہ ممالیک اور عثمانی دونوں کے سروں پر تیموری قہر کی شمشیر لٹک رہی تھی اور دونوں اس سے دفاع کی تیاری کر رہے تھے۔ مگر اس مشترکہ خطرے کے باوجود وہ تیمور کے مقابلے میں کوئی مشترکہ حکمتِ عملی مرتب نہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بنی کہ محرم ۸۰۲ھ میں بایزید نے ملطیہ پر قبضہ کر لیا تھا جو ممالیک سے وابستہ ریاستوں میں شمار ہوتا تھا۔ ملطیہ پر حملے سے قبل بایزید نے مصر کے نئے سلطان فرج بن برقوق کو متحدہ محاذ بنانے کی دعوت کے لیے سفارت بھیجی تھی جس نے یہ موقف بھی پیش کیا تھا کہ ملطیہ ریاست سیواس میں شامل تھا اور چونکہ سیواس قاضی برہان الدین کی وفات کے بعد سے عثمانیوں کے پاس ہے لہٰذا اس کا یہ شہر بھی عثمانیوں کے پاس رہنا چاہیے۔ فرج بن برقوق نے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا۔[4]

اگر دیکھا جائے تو بایزید کا یہ مطالبہ غیر معقول تھا کیوں کہ قاضی برہان الدین اپنی حیات میں ممالیکِ مصر سے وابستہ تھا اور ملطیہ بھی ممالیک ہی کی عمل داری میں آتا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایسے وقت میں بایزید کو اگر اپنے ایک دو قلعے ممالیک کے حوالے کر کے بھی ان سے اتحاد کرنا پڑتا تو وہ گریز نہ کرتا۔ مگر اس کی بجائے اس نے ان سے وابستہ ریاست کو دبا لیا اور اتحاد کی دعوت میں یہ فرمائش رکھ دی کہ یہ ریاست عثمانیوں کے نام کر دی جائے۔ ایسی سفارت کا نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ممالیک نے اتحاد کی دعوت کو مسترد کر دیا جس کے بعد بایزید نے بلا تامل لشکر کشی کر کے ملطیہ پر قبضہ کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گرد و نواح کے قلعے: ''کاختہ''، ''بہنسا'' اور ''درندہ'' جو ممالیک کے وفادار قلعہ داروں کے پاس تھے، ان سے چھین لیے، نیز ضلع ''بستان'' پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح عثمانیوں کی سرحدیں دریائے فرات سے متصل ہو گئیں۔[5]

چنانچہ دونوں ملکوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور مل کر تیمور کا مقابلہ کرنے کا سوال ختم ہو گیا۔ ایک دو شہروں کے معاملے پر ضد اور اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ملکوں نے نہ صرف وہ شہر بلکہ اپنے کئی بہترین صوبے بھی گنوا دیے۔

---

① عجائب المقدور، ص ۱۶۶، ۱۶۷

② اخبار الدول و آثار الاول: ۱۸/۳

③ تاریخ عثمانی از اوزون: ۳۴۶/۱

④ تاریخ عثمانی از اوزون: ۳۴۲/۱

⑤ تاریخ عثمانی از اوزون: ۳۴۲/۱، ۳۴۳

تیمور دوسری بار اناطولیہ کی سرحد پر۔ سیواس کا حشر:

ہندوستان سے واپسی پر تیمور پانچ لاکھ کے لشکرِ جرار کے ساتھ پیش قدمی کرتا ہوا آذربائی جان کی سمت سے اناطولیہ کی مشرقی سرحدوں پر پہنچ گیا۔ یہاں کے والی شہزادہ سلیمان پاشا نے اپنی مختصر فوج کے ساتھ مقابلہ ناممکن دیکھا تو قلعہ داروں کو ڈٹے رہنے کی تاکید کر کے اپنے باپ کے پاس قُسطَنطِنِیَہ چلا گیا۔ ۱۷ ذوالحجہ ۸۰۲ھ کو سرحدی شہر سیواس پر تیمور کا پہلا حملہ ہوا۔ یہاں بایزید کا بیٹا ارطغرل بڑی پامردی سے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتا رہا۔ مگر دشمن فصیل شکنی کے سارے انتظامات کر کے آیا تھا۔ اس نے فصیل کی بنیادیں کھدوا کر سرنگیں بنوائیں اور ان میں درختوں کے تنے ڈال کر انہیں نذرِ آتش کر دیا۔ آتش زدگی سے فصیل جگہ جگہ سے تڑق کر گر گئی اور اٹھارہ دن کے محاصرے کے بعد ۵ محرم ۸۰۳ھ کو تیموری افواج اندر داخل ہو گئیں۔ اگرچہ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ عثمانی فوج سمیت سب کو جان و مال کی امان دی جائے گی مگر قلعہ فتح کرنے کے بعد شہر کو لوٹ لیا گیا۔ تیمور نے ارطغرل سمیت تمام سپاہیوں کو قیدی بنالیا۔ اس نے ان کے ہم مذہب اور ہم نسل ہونے کا لحاظ کیے بغیر ان سے رونگٹے کھڑے کر دینے والا بہیمانہ سلوک کیا۔ تین ہزار قیدیوں کو جکڑ کر گٹھڑیوں کی مانند بنا دیا گیا۔ پھر انہیں قلعے کی خندق میں پھینک کر زندہ دفن کر دیا گیا۔ شہزادہ ارطغرل کا سر قلم کر دیا گیا۔

بایزید کو جب اس روح فرسا سلوک کی خبر ملی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ غالباً تیمور نے سیواس میں حد سے زیادہ درندگی کا مظاہرہ اسی لیے کیا تھا کہ بایزید اناطولیہ آنے پر مجبور ہو جائے اور قیصر کی سلطنت بچ جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ بایزید اس وقت قُسطَنطِنِیَہ کے چوتھے محاصرے میں مشغول تھا۔ اسے تلملا کر محاصرہ چھوڑنا پڑا۔ وہ پایۂ تخت ایڈریانوپل میں شہزادہ سلیمان پاشا کو نائب بنا کر خود اناطولیہ پہنچ گیا۔ [1] بایزید یہ تصور کر کے کہ تیمور اپنی پوری طاقت کے ساتھ سیواس سے آگے پیش قدمی کرے گا، قیصریہ میں افواج مرتب کرتا رہا مگر تیمور نے کوئی جلدی نہ کی۔ [2]

تیمور کی منصوبہ بندی:

درحقیقت تیمور سیواس کی فتح میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنے کے بعد سمجھ گیا کہ اناطولیہ کے قلعے یکے بعد دیگرے اسی انداز میں فتح کرنا مشکل اور دیر طلب کام ہے۔ چنانچہ اس نے طے کیا کہ ایک ہی فیصلہ کن جنگ لڑی جائے اور وہ بھی اس وقت جب بایزید اپنا تمام لشکر لے کر کھلے میدان میں نکل آئے۔ [3]

چنانچہ سیواس پر قبضے کے بعد تیمور نے مزید قلعوں کا محاصرہ کرنے میں وقت نہیں لگایا بلکہ ممالیک کو دبانے کے لیے یکدم شام کی طرف روانہ ہو گیا اور بایزید سے جنگ مزید دو سال کے لیے ٹل گئی۔ [4]

❁❁❁

---

(1) عجائب المقدور، ص ۱۷۱ تا ۱۷۳؛ تاریخ عثمانی از اوزون: ۳۳۶/۱؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۳۶

(2) تاریخ عثمانی از اوزون: ۳۳۹/۱

(3) تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱۰۹/۱

(4) تاریخ عثمانی از اوزون: ۳۴۷/۱ ؛ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از سید محمد، ص ۱۲۷

تیمور شام میں

تیمور پہلے ممالیک کو زیر کرنا اس لیے ضروری سمجھ رہا تھا کہ مملوکوں نے اس کے سفیر کو قتل کیا تھا جو اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ مملوک سلطان فرج بن برقوق، وقت پڑنے پر بایزید کی مدد کو آ سکتا ہے اور دونوں کی مشترکہ فوج کشی اسے دو اطراف سے گھیر کر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ۸۰۳ھ میں تیمور نے جنوب کا رخ کیا۔ وہ اناطولیہ کے جنوبی شہروں بہنسا اور ملطیہ میں خون کی ہولی کھیلتے ہوئے شام کی طرف نکل گیا۔ ①

تیمور کے حملے کا خوف اور ایک عالم دین کی حق گوئی:

تیمور نے سرحدی شہر عین تاب میں پڑاؤ ڈال کر حلب کے حاکم کی طرف قاصد بھیجا۔ پیغام میں کہا گیا تھا:

"ہم گزشتہ سال اپنے سفیر کا بدلہ لینے حلب کی سرحد تک آئے تھے۔ مگر ہمیں ہندوستان کے فساد کا پتا چلا، ہم وہاں گئے اور اللہ نے ہمیں فتح یاب کیا۔ پھر ہم گرجستان گئے اور اللہ نے فتح نصیب کی۔ پھر عثمان کے بچے (بایزید) کی بے ادبی کا حال معلوم ہوا تو ہم نے اس کی گوشمالی کی اور سیواس اور دوسرے شہروں میں جو کیا وہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ ہم نے مصر والوں کو خطوط بھیجے ہیں مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اگر اطاعت نہیں کرو گے تو مسلمانوں کا لہو تمہاری گردن پر ہوگا۔ والسلام۔"

حاکم حلب نے یہ مراسلہ سلطانِ قاہرہ فرج بن برقوق کے پاس بھیج دیا۔ وہاں سلطان اور خلیفہ کی موجودگی میں جنگ کی تیاریوں کے لیے مجلسِ مشاورت منعقد کی گئی۔ اس دوران یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا عسکری تیاریوں کے لیے تاجروں سے آدھا یا تہائی مال لینا درست ہوگا۔ اس پر قاضی جمال الدین حنفی نے کہا:

"اگر آپ زبردستی ایسا کرنا چاہیں تو آپ کے پاس اس کی طاقت ہے لیکن اگر آپ ہم سے پوچھیں گے تو ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ کوئی بھی اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دے گا۔ فوج کو اس وقت عوام کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ ایسا کام نہ کیا جائے کہ ان کی بد دعائیں ملیں۔"

دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ اوقاف کے اموال کو فوجی مصارف میں خرچ کر دیا جائے۔ قاضی جمال الدین نے اس سے بھی منع کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ جو اس دور کے نہایت جلیل القدر عالم اور محدث تھے، فرماتے ہیں کہ بعد میں وہی کیا گیا جس سے قاضی جمال الدین نے منع کیا تھا اور اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔ ②

شام پر تیمور کی چڑھائی کا حال...... حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی زبانی:

آخر تیموری لشکر شام میں داخل ہو گیا۔ پہلے شام کا شمالی صوبہ حلب اور پھر دمشق اس کی تباہ کاریوں کا نشانہ بنے۔

---

① انباء الغمر: سنة ۸۰۳ھ؛ روض المناظر قلمی نسخه، ص ۱۶۶

② انباء الغمر: سنة ۸۰۳ھ

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اپنے وطن پر تیمور کے حملے کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

''تیمور ربیع الاوّل (۸۰۳ھ) کے پہلے عشرے میں حلب کے سامنے پہنچا۔ امرائے شہر نے مشورہ کیا، بعض نے کھلے میدان میں مقابلے کی رائے دی اور کچھ نے مصر سے کمک آنے تک قلعہ بند ہو کر فصیل پر لڑنے کی۔ آخر پہلی رائے طے ہوگئی اور شہر کے باہر خیمے لگا دیے گئے۔

ہفتہ ۱۱ ربیع الاول کو فریقین کا تصادم ہوا۔ تیمور نے ہاتھیوں سمیت حملہ کیا۔ اکثر لوگ پشت پھیر کر بھاگ نکلے۔ تاہم طرابلس کے حاکم اور بعض امراء نے جم کر مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارے گئے۔ لشکرِ اسلام کو شکستِ فاش ہوئی۔ لوگ حلب کے دروازوں کی طرف بھاگے۔ اس بھگدڑ میں بے شمار افراد کچلے گئے۔ امرائے فوج قلعے میں محصور ہوگئے۔ تیموری فوج نے جو تعاقب میں تھی، شہر میں گھس کر آگ لگا دی۔ عورتیں اور بچے قید کر لیے گئے۔ مردوں اور لڑکوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ جامع مسجد قصاب خانے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ مساجد میں گھوڑے باندھ دیے گئے اور عورتوں کی عصمتیں ان کے گھر والوں کے سامنے لوٹی گئیں کہ تیمور کے سپاہی کھلم کھلا زنا کرنے میں بھی شرم نہیں کرتے تھے۔ پھر قلعے کو گھیر کر اس کی خندق کو پاٹ دیا گیا۔ دو تین دن بعد قلعہ دار نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے امان طلب کی اور قلعہ حوالے کر دیا۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ تیمور نے قلعے کا معاینہ کیا۔ شہریوں نے جو مال و اسباب حفاظت کے لیے قلعے میں رکھوایا تھا وہ سب لوٹ لیا گیا۔ تیمور کے سامنے قیدی لڑکے اور کنواری لڑکیاں پیش کی گئیں۔ اس نے ان سب کو امراء میں بانٹ دیا۔

پھر تیمور کے سپاہیوں نے شہر کی مضافاتی آبادیوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کی۔ حالت یہ ہوئی کہ ان بستیوں میں سے کوئی گزرتا تو اس کا پاؤں کسی نہ کسی لاش پر پڑتا۔ تیمور نے کٹے ہوئے سروں کے مینار بنوا دیے جن میں سے تین مینار ''رابیہ بن جاجا'' (نامی ٹیلے) پر تھے۔ قیدیوں میں سے معصوم بچے بھوک سے مارے گئے جن کی تعداد قتل کیے جانے والوں سے بھی زیادہ تھی۔

کہا جاتا ہے کہ تیمور جب قلعے میں بیٹھا اور علماء کو طلب کیا کہ ان سے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں سوال کرے تو اس کے پوچھنے پر قاضی قفصی مالکی نے کہا: ''یہ سب حضرات مجتہد تھے۔''

یہ سن کر تیمور غضب ناک ہو گیا اور بولا:

''تم بھی شام والوں کے پیروکار ہو۔ تم سب یزیدی ہو، حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل ہو۔''[1]

تیمور کی علامہ ابن شحنہ رحمہ اللہ سے گفتگو:

تیمور علماء کو ساتھ رکھتا تھا مگر مسائل پوچھنے میں سختی برتتا اور اس میں علماء کے قتل یا سزا کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ تیمور کی علماء سے گفتگو کا تذکرہ حلب کے ایک حنفی عالم محب الدین ابن شحنہ رحمہ اللہ نے تفصیل سے کیا ہے۔

---

① انباء الغمر فی انباء العمر: ۱۳۴/۲ تا ۱۳۶

ان کے چشم دید بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ حلب کا قلعہ فتح کرنے کے اگلے دن تیمور نے سوال و جواب کی مجلس آراستہ کی۔ علمائے شہر کو طلب کیا۔ اپنے ترجمان عبدالجبار سمرقندی کے ذریعے انہیں کہلوایا:

''میں ان سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں جو میں نے سمرقند، بخارا، ہرات اور تمام مفتوحہ ممالک کے علماء سے پوچھا ہے مگر کسی نے واضح جواب نہیں دیا۔ تم ان جیسے مت بننا۔ تم میں سے جو سب سے بڑا عالم اور افضل آدمی ہے وہی جواب دے۔ وہ یہ جان لے کہ میں علماء کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا رہا ہوں۔ مجھے ان سے خاص تعلق اور الفت ہے۔ میں بہت مدت سے تحصیل علم میں مشغول ہوں۔''

علماء نے محب الدین ابن شحنہ رحمہ اللہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''یہ یہاں کے مفتی ہیں۔ ان سے پوچھ لیں۔''

تیمور نے پوچھا: ''کل ہمارے اور تمہارے آدمی قتل ہوئے۔ ان میں شہید کون ہیں، ہمارے مقتول یا تمہارے؟''

محفل میں سناٹا چھا گیا۔ ایسے میں اللہ نے علامہ ابن شحنہ رحمہ اللہ کے دل میں ایک مناسب جواب ڈال دیا۔ وہ بولے:

''یہ وہی سوال ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دے دیا تھا۔ میں بھی وہی جواب دوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔''

تیمور نے علامہ کی بات سن کر ان پر نگاہ جمادی اور ترجمان سے کہنے لگا: ''یہ صاحب مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال بھلا کیسے پوچھا جا سکتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے اس کا جواب دے سکتے ہیں۔''

ابن شحنہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ایک دیہاتی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا: آدمی غیرت کے سبب لڑتا ہے، شجاعت کی وجہ سے لڑتا ہے، اپنا مقام دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ان میں سے اللہ کے راستے میں لڑنے والا کون ہے؟' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اس لیے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، وہی شہید ہے۔''[1]

تیمور یہ سن کر جھوم اٹھا اور بولا: ''خوب! خوب''

اس کے بعد تیمور بے تکلف ہو گیا، ہندوستان سے عراق تک اپنی فتوحات کے تذکرے کرنے لگا۔

ابن شحنہ رحمہ اللہ نے کہا: ''اس نعمت کے شکریے میں اس امت سے درگزر کا معاملہ کریں اور کسی کو قتل نہ کریں۔''

تیمور کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! میں نے جان بوجھ کر تو کسی کو قتل نہیں کیا۔ تم نے خود شہر کے دروازوں پر اپنی جانیں دیں۔ اللہ کی قسم میں تم میں سے کسی کو قتل نہیں کروں گا۔ تمہاری جانیں اور مال مامون ہیں۔''

اس کے بعد تیمور یکے بعد دیگرے سوالات کرنے لگا اور علماء میں سے ہر کوئی جواب دینے کی کوشش کرنے لگا۔ قاضی شرف الدین نے انہیں سمجھایا اور کہا:

''اللہ کے واسطے! اس شخص (ابن شحنہ) کو جواب دینے دو کہ یہ جانتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔''

---

[1] مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا، فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ. (صحیح البخاری، ح: ۲۸۱۰، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا؛ صحیح مسلم، ح: ۱۹۰۳، ۱۹۰۴) صحیحین کی روایات کا مفہوم وہی ہے، مگر ان میں ''شہید'' کا لفظ مذکور نہیں۔

آخر میں تیمور نے پوچھا: ''تم علی، معاویہ اور یزید کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

ابن شحنہ رحمہ اللہ نے قاضی شرف الدین سے سرگوشی کی: ''سوچ سمجھ کر جواب دینا کہ یہ شخص (تیمور) شیعہ ہے۔''

تاہم ان سے پہلے ہی قاضی علم الدین قفصی مالکی نے بلا توقف کہہ دیا: ''یہ تمام حضرات مجتہد تھے۔''

یہ سن کر تیمور غضب ناک ہو گیا اور اس نے دھاڑ کر کہا:

''حلب والو اتم اہلِ دمشق کے تابع ہو جو یزیدی ہیں۔ انہوں ہی نے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔''

یہ حالت دیکھ کر علامہ ابن شحنہ رحمہ اللہ نے معاملے کو سنبھالا اور قاضی مالکی کی صفائی میں فرمایا:

''ان صاحب نے بس وہ جواب دیا ہے جو کسی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا ہے اور اس کا معنی نہیں سمجھا۔''

یہ سن کر تیمور کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ اس نے ابن شحنہ رحمہ اللہ کے بارے میں کہا: ''یہ دلچسپ آدمی ہے۔'' اور قاضی شرف الدین کے متعلق کہا: ''یہ فصیح و بلیغ شخص ہے۔'' پھر تیمور نے ابن شحنہ رحمہ اللہ کی عمر پوچھی۔ انہوں نے ۵۴ برس بتائی۔ پھر قاضی شرف الدین سے یہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا: ''میں ابن شحنہ سے ایک سال بڑا ہوں۔''

تیمور نے کہا: ''تم میرے بچوں کی طرح ہو۔ میری عمر ۷۵ سال ہے۔'' اس کے بعد مجلس برخاست ہو گئی۔

تیمور کی جانب سے امان کے وعدے سراب ثابت ہوئے اور علماء سے ملاقات کے بعد تین ہفتوں تک حلب میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ ربیع الاوّل کے آخر میں تیمور نے علامہ ابن شحنہ رحمہ اللہ اور قاضی شرف الدین کو دوبارہ بلوایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کا عقیدہ پوچھا۔ قاضی ابن شحنہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلفاء (یعنی خلفائے راشدین) میں سے نہیں تھے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ثابت ہے کہ: میرے بعد خلافت تیس سال تک ہوگی۔ اور یہ تیس برس حضرت علی رضی اللہ عنہ پر مکمل ہو گئے تھے۔''

یکم ربیع الآخر کو تیمور دمشق روانہ ہوا تو ایک امیر کو بھیج کر علامہ ابن شحنہ رحمہ اللہ سے پوچھا:

''دمشق کے حاکم کو جس نے مغل سفیر کو قتل کیا تھا، قتل کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟''

ابن شحنہ رحمہ اللہ نے امیر کو جواب دیا: ''یہاں مسلمانوں کے سر کاٹ کر تیمور کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں، اس بارے میں کوئی استفتاء نہیں کیا جا رہا حالانکہ تیمور نے قسم کھائی تھی کہ وہ ہم میں سے کسی کو قتل نہیں کرے گا۔''

امیر یہ جواب لے کر تیمور کے پاس گیا اور کچھ دیر بعد یہ جواب لے کر آیا:

''سلطان نے مسلمانوں کے سر لانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ انہوں نے مقتولین کے سر کاٹنے کا کہا تھا تا کہ حسبِ روایت اس کا مینار بنایا جائے مگر سپاہیوں نے اس کا غلط مطلب لے لیا۔''[1]

اس عجیب جواب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ظالم حکمران اپنی سفاکیوں کو کس طرح جواز کا جامہ پہناتے ہیں۔

---

[1] روض المناظر از ابن شحنہ: قلمی نسخہ، ص ۱۶۸، ۱۶۹؛ عجائب المقدور، ص ۱۹۰ تا ۱۹۲

دمشق کی تباہی:

تیموری افواج حلب سے دمشق کی طرف بڑھیں تو قاہرہ سے سلطان فرج بن برقوق اور عباسی خلیفہ مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ ۶ جمادی الاولیٰ کو وہ دمشق پہنچے۔ [1] اس کے بعد فریقین میں چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ [2] مگر کسی فیصلہ کن معرکے سے پہلے ممالیک میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ بددل ہو کر منتشر ہو گئے۔ سلطان مصر اور عباسی خلیفہ بدحالی کے عالم میں مصر کی طرف نکل گئے اور پانچ جمادی الآخرہ کو قاہرہ پہنچ گئے۔ ادھر اہل دمشق نے مایوس ہو کر ۱۵ جمادی الآخرہ ۸۰۳ھ کو شہر کے دروازے کھول دیے۔ [3]

دمشق میں جو کچھ ہوا اس کے متعلق بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے زیادہ معتبر بیان کسی کا نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

"دس لاکھ دینار کی ادائیگی پر صلح ہوئی اور اہل شہر کو اس ادائیگی میں شریک قرار دیا گیا۔ مگر پھر تیمور نے کہا کہ اس کی مراد ایک ہزار تومان تھی۔ ایک تومان دس ہزار دینار کا ہوتا ہے۔ (یعنی رقم بڑھا کر ایک کروڑ دینار کر دی گئی۔ موجودہ حساب سے تقریباً پچیس ارب روپے)۔ یہ سن کر شہریوں کی مصیبت دوگنی چوگنی ہو گئی۔ وہ پچھتانے لگے مگر اب ندامت بے سود تھی۔ تیمور نے سب سے پہلا ظلم یہ کیا کہ جامع مسجد اُموی کو خالی کرا دیا۔ وہاں اس کا نائب شاہ ملک اپنے کنبے اور گھوڑوں سمیت رہائش پذیر ہو گیا۔ مساجد میں نماز اور بازاروں میں تجارت بند ہو گئی۔ تیمور نے شہر کے عمائد سے دمشق کے محلوں کے نام لکھوائے اور ایک ایک محلّہ اپنے امراء کے نام کر دیا۔ ہر امیر اپنے محلے میں گیا اور وہاں کے باشندوں سے مال طلب کیا۔ ہر شخص بدترین حالت میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوتا۔ اس سے بھاری مقدار میں مال طلب کیا جاتا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو اس کا مال و اسباب لوٹ لیا جاتا۔ جب گھر میں کچھ نہ بچتا تو اس کی عورتوں کو پکڑا جاتا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ان سے بدکاری کی جاتی تاکہ اس کی زیادہ رسوائی ہو۔ اس کے بعد لوگوں کو شدید زدوکوب کیا جاتا تاکہ وہ مال و دولت پیش کریں۔ ۱۷ دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران بے شمار لوگ تشدد کی تاب نہ لا کر مارے گئے۔

آخر مغل امراء شہر سے نکلے اور پھر یکم رجب کو پیادہ اور گھڑ سوار فوج کے ساتھ شہر پر حملہ آور ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بے نیام تلواریں تھیں۔ انہوں نے جو کچھ باقی بچا تھا، لوٹ لیا۔ نوزائیدہ بچوں کو پیروں تلے روندتے ہوئے وہ ان کے والدین کو قیدی بنا کر لے گئے۔ شہر میں جگہ جگہ آگ لگا دی گئی جس سے شہر کا اکثر حصہ سوختہ ہو گیا۔ خاص کر جامع اُموی اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ متاثر ہوا۔ حالت یہ تھی کہ کوئی بھی مغل سپاہی کسی بھی گھر میں گھس جاتا اور لوٹ مار، قتل، آتش زنی یا بدکاری جو بھی چاہتا کرتا۔ نہ کوئی ہاتھ اٹھتا نہ کسی کی آواز نکلتی کہ دلوں پر خوف و ہراس چھا چکا تھا۔

---

① انباء الغمر: ۱۳۶/۲
② السلوک للمقریزی: ۴۷/۶؛ عجائب المقدور، ص ۲۰۵
③ انباء الغمر: ۱۳۷/۲

تین شعبان کو تیموری افواج واپس ہوئیں۔ تو شہر میں بکثرت ٹڈیاں اتر آئیں۔ اس ماہ (شعبان میں) شہر میں اس قدر لوگ ہلاک ہوئے کہ ان کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کچھ جل کر، کچھ فرار ہونے سے عاجز ہو کر بھوک سے، کچھ فرار ہوتے ہوئے راستے میں تھک ہار کر جاں بحق ہوئے۔ کچھ کمزور و لاچار پڑے پڑے مر گئے۔ ایک مُد (تقریباً ایک سیر) گندم کی قیمت چالیس درہم (تقریباً دس ہزار روپے) تک پہنچ گئی۔ لوگ ٹڈیاں جمع کر کے کھانے اور بیچنے لگے اور یہی ان کی عمومی خوراک بن گئی۔ ایک رطل (تقریباً آدھ سیر) ٹڈی ساڑھے چار درہم کی مل رہی تھی۔ شہر کے لوگ ننگے پاؤں ننگے بدن تھے۔ ان کے بہترین افراد کرتے پہنے یا کھالیں اوڑھے ہوئے تھے اور آوازیں لگا کر ٹڈیاں بیچ رہے تھے۔ عوام بچا کھچا سامان ڈھونڈ رہے تھے تاکہ اسے بیچ کر ٹڈیاں خریدیں۔ شہر میں لگی آگ بجھانے والا کوئی نہ تھا اس لیے آگ پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔'' ①

مختصر یہ کہ دمشق جیسا تاریخی شہر تیمور کے ہاتھوں مکمل طور پر سوختہ اور تباہ ہو گیا۔

علمائے دمشق سے گفتگو:

دمشق میں بھی تیمور علماء سے سوال و جواب کرتا رہا۔ اس کی طرف سے اس کے ترجمان علامہ عبدالجبار حنفی اور اہلِ شام کی جانب سے قاضی القضاۃ تقی الدین حنبلی مناظرہ کرتے رہے۔ اس دوران حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے اختلافات، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور یزید کے کردار پر بھی گفتگو ہوئی۔

آخر ایک عالم نے یہ کہہ کر اس بحث کا خاتمہ کیا کہ ''وہ لوگ گزر گئے ہیں۔ ان فتنوں سے اللہ نے ہماری حفاظت فرمائی اور ہماری تلواروں کو اس خونریزی سے پاک رکھا۔ ہمارا عقیدہ وہی ہے جو اہل سنت والجماعت کا ہے۔''

تیمور نے اس کے بعد خلفائے راشدین کے مراتب کے بارے میں پوچھا۔ قاضی شمس الدین نابلسی نے فرمایا:

''علم کی فضیلت نسب سے زیادہ ہے، اسی لیے کم نسب عالم، عالی نسب جاہل سے زیادہ معزز ہوتا ہے۔ صحابہ کا اتفاق تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فوقیت ہے کیوں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں صحابہ متفق تھے کہ وہ سب سے بڑے عالم، اسلام میں سب سے مضبوط اور پہل کرنے والے ہیں۔ صحابہ کے اتفاق کی تائید خود اس حدیث سے ہوتی ہے کہ لاتجتمع امتی علی الضلالۃ..... میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو گی۔''

یہ کہہ کر قاضی نابلسی نے اپنا کرتا اتار دیا۔ تیمور نے حیران ہو کر وجہ پوچھی تو قاضی صاحب بولے:

''آپ کے لشکر میں مختلف فرقوں کے لوگ ہیں، اس مجلس کی باتیں ان تک ضرور پہنچیں گی اور ان میں سے کوئی بھی شخص مجھے سرِ عام قتل کر دے گا۔ لہٰذا میں شہادت کی اس سعادت کے لیے پہلے سے تیار ہوں۔''

تیمور شاباش دیتے ہوئے کہہ اٹھا: ''یہ قاضی تو بہت ہی فصیح و بلیغ اور جری آدمی ہے۔''

پھر یہ کہہ کر مجلس برخاست کر دی کہ آئندہ یہ قاضی میرے پاس نہ آنے پائے۔'' ②

---

① انباء الغمر بابناء العمر: ۲/۱۳۷ تا ۱۳۹ ② عجائب المقدور، ص ۲۱۹، ۲۲۰

بغداد کی بربادی:

موسم سرما گزرنے تک تیمور شام میں رہا اور آغازِ بہار میں جب برف پگھلنے سے راستے کھلے تو اس نے کوچ کیا[1] اور شام سے لوٹے ہوئے اموال کے بے پناہ ذخائر سمرقند روانہ کر کے تیمور نے تیسری بار عراق کا رُخ کیا جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو چکی تھی۔ تیمور بغداد پہنچا تو یہاں کے مفرور حاکم احمد بن اویس کے نائب فرج نے مزاحمت کی۔ تیمور اسے شکست دے کر عین عیدالاضحیٰ کے دن شہر میں گھسا اور اسے مذبح خانہ بنا ڈالا، بغداد کی تقریباً تمام عمارات کو گرا کر ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ عیدالاضحیٰ کے دن تیمور کی اس خونریزی پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

''اس نے مسلمانوں کو ذبح کر کے قربانی کی یہاں تک کہ ان کا خون دریائے دجلہ میں بہنے لگا۔ یہاں کھوپڑیوں کے کئی مینار بنا دیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مقتولین کی تعداد ۹۰ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔''[3]

تیمور کا اناطولیہ پر تیسرا حملہ

تیمور کی غیر موجودگی میں بایزید اناطولیہ کی ایک اور مشرقی ریاست ''ارزنجان'' کو بھی مسخر کر چکا تھا جس کا امیر ''طہر تن'' تیمور کا تابع دار تھا۔ ''طہرتن'' بھاگ کر تیمور کے پاس چلا گیا اور اسے بایزید کے خلاف معلومات دینے لگا۔[4]

تیمور دوبارہ اناطولیہ پہنچا اور کچھ دن قونیہ میں گزارے۔[5] تیمور کے متعدد امراء اور اس کے شہزادے اپنے ہم مذہب، ہم زبان، سُنی حنفی بادشاہ سے لڑنے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ خصوصاً اس لیے کہ اس وقت یہ بادشاہ نصرانیوں سے جہاد میں مصروف تھا۔ تاہم تیمور نے ان کی رائے مسترد کر دی اور یہ کہہ کر انہیں اپنا ہم خیال بنایا:

''ہم نے جہاد کر کے چین کو فتح کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ اگر ہم نے عثمانیوں کو یوں ہی چھوڑ دیا تو وہ چین کی مہم کے دوران ہماری پشت پر حملہ کر دیں گے۔''[6]

تیمور کا دھمکی آمیز مراسلہ اور مطالبات:

اس کے بعد اس نے بایزید کو ایک دھمکی آمیز مراسلہ بھیجا جس میں کہا گیا تھا:

''خبردار! ہماری نافرمانی سے بچتے رہنا، ورنہ تم ہمارے قہر کی زد میں آ جاؤ گے، تم ہمارے مخالفین کے انجام کے بارے میں سن ہی چکے ہو۔ پس قیل وقال اور جنگ وجدال چھوڑ دو۔''[7]

عثمانیوں پر جنگ مسلط نہ کرنے کے لیے تیمور کے مطالبات درج ذیل تھے:

1. اناطولیہ کے امراء کو وہ تمام علاقے واپس کیے جائیں جو ان سے چھینے گئے ہیں۔

---

① منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۱، ط اصفہان

② انباء الغمر بابناء العمر: ۲/۲۰۸؛ عجائب المقدور، ص ۲۴۷ تا ۲۴۹؛ نیل الامل فی ذیل الدول لابن شاہین الملطی: ۳/۶۲

③ انباء الغمر بابناء العمر: ۲/۲۰۸ ④ عجائب المقدور، ص ۱۷۰ ⑤ منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۲

⑥ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۱۰ ⑦ عجائب المقدور، ص ۲۵۰، ۲۵۱

③ عثمانی سلاطین تیموری طرز کے عمامے اور کمر بند پہنا کریں تا کہ سلطنتِ تیموریہ کی ماتحتی کا اظہار ہو۔
④ بایزید کا ایک بیٹا یرغمال کے طور پر تیمور کے پاس رہے۔
⑤ ارزنجان کے حاکم ''طہرتن'' کے گرفتار خاندان کو رہا کر دیا جائے اور قلعہ ''کماخ'' انہیں واپس کیا جائے۔ ①
⑥ قرا یوسف ترکمانی اور سلطان احمد بن اویس جلائری کو تیمور کے سپرد کیا جائے۔ ②

بایزید کا جواب:

بایزید یہ مطالبات اور دھمکیاں سن کر غصے سے کانپ اٹھا اور بولا:

''کیا مجھے ایسی خرافات سے مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ کیا تیمور نے مجھے عجمی بادشاہوں کی مانند گمان کر رکھا ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ اس نے کس طرح بادشاہوں کو دھوکے کے ساتھ قتل کیا اور کس طرح وہ انہیں دباتا جا رہا ہے۔ وہ ظالم، خوں خوار، عہد شکن اور غدار ہے۔ اب اس قضیے کا فیصلہ میں کروں گا۔ غازیانِ اسلام میرے ماتحت ہیں، جنگ ہمارا پیشہ اور جہاد ہمارا مشغلہ ہے۔ ہم اللہ کے راستے میں اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑتے رہے ہیں اور ہمارے ساتھ وہ لوگ ہیں جو اپنی جان و مال اللہ کو جنت کے بدلے بیچ چکے ہیں۔''

اس نے تیمور کو ترکی بترکی جواب دیتے ہوئے اس کا مطالبہ ماننے سے یکسر انکار کر دیا اور مراسلے کے آخر میں یہاں تک لکھ ڈالا: ''اگر میں مقابلے میں فرار ہوا تو میری بیویوں کو تین طلاق۔''

تیمور نے بایزید کا جواب پڑھ کر اس کی تیز مزاجی کا اندازہ لگا لیا اور اس کے بعد اسی کمزوری کو ابھار کر اسے اپنی فتح کا سب سے بڑا ذریعہ بنایا۔ ③

تیمور کے جاسوسوں کی سرگرمیاں:

تیمور نے حملے سے پہلے جاسوسوں اور مخبروں کو اناطولیہ میں داخل کر دیا تھا تا کہ حریف سلطنت کی مکمل خبریں پل پل ملتی رہیں۔ اس کے علاوہ اس نے خفیہ نمائندے بھیج کر اناطولیہ میں مقیم مغل قبائل کے سرداروں کو ایک قوم اور ایک نسل ہونے کا حوالہ دے کر اپنی حمایت پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس کے گماشتوں نے بایزید کے بہت سے افسران کو یہ تاثر دیا کہ تیمور سخی اور فیاض ہے اور اس کا لشکر خوشحال۔ بایزید بخیل ہے اور فوج تنگ دست۔ اس قسم کی باتوں سے بایزید کے لشکر میں بددلی پھیلائی جاتی رہی اور افسران کی وفاداریاں خریدی جاتی رہیں۔ ④

تیمور کا فریب پر مبنی پیغام:

اُدھر بایزید لشکر کشی شروع کر چکا تھا۔ تیمور مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھا تاہم اس نے اسے الجھانے کے لیے

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیہ از سید محمد، ص ۱۲۸
② انباء الغمر: ۲۲۸/۲
③ اخبار الدول: ۱۸/۳
④ انباء الغمر: ۲۲۸/۲

بعض صلح آمیز مراسلے بھیجے۔ مثلاً ایک مکتوب میں اس نے بایزید کو لکھا:

''تم اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے جواں مرد ہو۔ میں تم سے جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ تم اپنے باپ دادا کی سلطنت پر قناعت کرو۔ باقی شہر میرے حوالے کردو۔''[①]

اس وقت بایزید پندرہ دن کی مسافت طے کر چکا تھا تاہم یہ پہلا موقع تھا کہ اسے تیمور کے موقف میں قدرے نرمی محسوس ہوئی، چنانچہ وہ صلح کی کسی شکل پر غور وفکر کرنے لگا۔[②] بایزید کے وزیر اعظم جاندار علی پاشا نے بھی کسی نہ کسی طرح جنگ ٹالنے کا مشورہ دیا جسے مان کر بایزید نے تیمور کو کچھ تحائف ارسال کردیے مگر کشیدگی بدستور باقی رہی۔ تیمور نے بایزید کے تحائف کو یہ کہہ کر ناپسند کیا کہ ''ان کی تعداد دس کیوں ہے؟ نو کیوں نہیں، تُرکوں کے نزدیک پسندیدہ عدد نو ہے اور سنت بھی یہ ہے کہ طاق عدد اختیار کیا جائے۔''[③] اس قسم کے بہانے یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھے کہ تیمور بایزید کو ذہنی طور پر پراگندہ کررہا ہے۔ بایزید بھی سمجھ گیا کہ تیمور اس کا وقت ضایع کررہا ہے۔[④]

دونوں افواج کی پیش قدمی:

اب جنگ ناگزیر تھی۔ موسمِ گرما شروع ہو چکا تھا۔ فصلیں اور باغات پک رہے تھے۔ بایزید نہیں چاہتا تھا کہ تیمور انہیں اجاڑے یا عوام کو مزید نقصان پہنچائے۔[⑤] تیمور اس وقت جنوبی مغربی شہر قونیہ میں تھا۔[⑥]

بایزید کی افواج دوسمت سے پیش قدمی کر کے ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے قونیہ کے شمال میں واقع اناطولیہ کے وسطی شہر انقرہ میں جمع ہونے لگیں[⑦] جس کی وسعت کے باعث وہاں ایک بڑی فوج کو ٹھہرانے کی گنجائش تھی اور گرد ونواح کی چٹیل سطح مرتفع پر دو بڑی فوجوں کے لڑنے کے لیے بہت بڑا میدان تھا۔

اگر بایزید وہیں ٹھہر کر تیمور کا انتظار کرتا اور اپنے دفاعی انتظامات مکمل کر کے رکھتا تو اس کے لیے بہتر تھا۔ تیمور کی طرف پیش قدمی کر کے اسے مزید علاقے تباہ کرنے سے روکنے کا خیال عجلت پسندی پر مبنی تھا کیوں کہ اگر تیمور شمال مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے مزید ایک دو شہروں کو تباہ کر بھی دیتا تو عثمانیوں کی اصل فوج محفوظ رہتی جو ان نقصانات کا بہت جلد بدلہ لے سکتی تھی۔ بایزید نے یہ نکتہ نظر انداز کردیا اور تیمور نے اسے پیشِ نظر رکھا۔ اس نے بایزید کی سمت پیش قدمی نہ کی بلکہ اس کی افواج کو تھکانے کی حکمتِ عملی اپنائی اور بار بار اپنا مقام تبدیل کرتا رہا۔ اس نے ہر جگہ پہلے سے راستے کے دریاؤں، ندی نالوں، پلوں اور پہاڑوں کے بارے میں پوری معلومات رکھیں اور کہیں ایسا موقع نہ آنے دیا کہ حریف کا لشکر اس پر عقب یا دائیں بائیں سے حملہ کرسکے۔[⑧]

---

① انباء الغمر: ۲۲۵/۲؛ اخبار الدول: ۱۸/۳
② انباء الغمر: ۲ص ۲۲۵
③ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۱
④ انباء الغمر: ۲۲۵/۲
⑤ عجائب المقدور، ص۲۶۶
⑥ منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۱
⑦ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۱
⑧ منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۳

کماخ پر تیمور کا قبضہ:

قونیہ سے انقرہ کا رُخ کرنے کی بجائے تیمور اناطولیہ کے جنوب اور مشرق کے ان اضلاع سے گزر کر جنہیں وہ اپنی گزشتہ یلغار میں مسخر کر چکا تھا، شوال ۸۰۴ھ (مئی ۱۴۰۲ء) میں ارزنجان سے آدھی منزل دور دریائے فرات کے کنارے واقع قلعے ''کماخ'' تک جا پہنچا[1] جو اپنے گرد نہایت گہری کھائیوں کے باعث ناقابلِ تسخیر مانا جاتا تھا۔ تیمور کے ٹڈی دَل لشکر نے پتھروں اور چٹانوں سے کھائیاں بھر دیں اور بارہ دن کے محاصرے کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔[2]

بایزید کا انقرہ سے مشرقی اناطولیہ کی سمت کوچ اور تیمور کی چال:

بایزید کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے آگے بڑھ کر ''آلا داغ'' کے کوہستانی علاقے میں جا کر صفیں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ پہاڑی علاقے میں پیادے گھڑسواروں سے بہتر لڑ سکتے تھے اور عثمانی لشکر زیادہ تر پیادہ تھا جبکہ تیمور کے پاس زیادہ تر گھڑسوار تھے۔ بعض کہنہ مشق امراء نے اسے فی الحال آگے بڑھنے سے منع کیا اور مشورہ دیا کہ پہلے تیمور کے معسکر کی ناکہ بندی کر کے اسے اس کے مددگاروں سے منقطع کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس پر حملہ کیا جائے۔

تاہم بایزید نے اپنی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس مشورے کو کوئی اہمیت نہ دی اور بھاری مال و متاع کو انقرہ میں چھوڑ کر اناطولیہ کے مشرق کی طرف کوچ کر دیا جہاں تیمور ''سیواس'' اور ''توقات'' کے درمیان خیمہ زن تھا۔ اگر تیمور یہاں سے مغرب کی سمت کچھ آگے بڑھتا تو ایسے علاقے میں آ جاتا جہاں گرد و نواح میں عثمانیوں کے متعدد قلعے تھے اور وہاں اس کی ناکہ بندی کی جا سکتی تھی۔ تیمور نے اسے تاڑ لیا اور مزید آگے بڑھنے کی غلطی نہیں کی۔ وہ بایزید کا انتظار کرتا رہا۔ جب اسے اطلاع ملی کہ بایزید کا لشکر چند دنوں کی مسافت پر ہے تو وہ یکدم اپنے لاؤ لشکر سمیت میدان خالی چھوڑ کر جنوب مغرب کی طرف نکل گیا۔ بایزید نے سیواس پہنچ کر دیکھا کہ دشمن میدان چھوڑ چکا ہے۔

اس دوران تیمور قیصریہ پہنچ گیا جہاں سے اس نے شمال مغرب کا رُخ کر کے انقرہ کی طرف یلغار شروع کر دی۔[3] مگر تیمور کو اب یہ فکر لاحق ہوگئی کہ نہ تو پیچھے بایزید کی فوج کا کوئی نام و نشان نظر آ رہا ہے نہ سامنے سے عثمانیوں کی کوئی اور فوج حائل ہو رہی ہے۔ آخر کیوں؟ کہیں بایزید اسے گھات لگا کر گھیر تو نہیں رہا۔ تیمور کو دائیں جانب سے بایزید کے حملے کا خطرہ نہیں تھا کیوں کہ اس سمت دریائے قزل ایرماق تھا جس کے کنارے کنارے وہ سفر کر رہا تھا۔ تاہم جب لشکر کسی پہاڑی علاقے سے گزرتا تو تیمور اپنی فوج کو نہایت چوکنا کر دیتا اور خود بھی ہر طرف نگاہ رکھتا۔[4] یہ سارا راستہ سرسبز و شاداب تھا اور پانی کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس لیے تیمور کی فوج بڑی سہولت سے اپنے ہدف تک پہنچ گئی۔[5]

---

① عجائب المقدور، ص ۲۵۶ تا ۲۵۸
② تاریخ عثمانی: ۱/۳۵۲
③ تاریخ عثمانی: ۱/۳۵۲، ۳۵۳
④ تاریخ عثمانی: ۱/۳۵۳
⑤ عجائب المقدور، ص ۲۶۸

انقرہ کا میدانِ جنگ

اُدھر بایزید کو اطلاع مل چکی تھی کہ دشمن انقرہ کی سمت رواں دواں ہے۔اس موقع پر مناسب یہ تھا کہ بایزید تیمور کا تعاقب کرنے کی بجائے ،اپنی تمام سرحدی افواج کو مختلف سمتوں سے انقرہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیتا اور تیمور کی کمک اور رسد کے راستے بند کرا کے اس کی فوج کو کمزور کرتا۔مگر بایزید انقرہ کو خطرے کی زد میں دیکھ کر بے تاب ہو گیا۔اسے ڈر تھا کہ انقرہ میں بھی دیگر شہروں کی طرح قتل عام کیا جائے گا اور لوگوں پر قیامتِ صغریٰ ٹوٹ پڑے گی۔اس نے بلا تاخیر انقرہ کی طرف کوچ کر دیا۔

اُدھر تیمور انقرہ پہنچ کر پوری شدت سے فصیل پر حملے کرنے لگا جبکہ قلعہ دار یعقوب بیگ مردانہ وار مدافعت کر رہا تھا۔تیمور نے شہر کی شمال مغربی سمت پر قابض ہو کر شہر کے راستے بند کرنے کی کوشش شروع کر دی تا کہ بایزید کے پہنچنے سے پہلے وہ انقرہ پر قبضہ کر لے۔اس کا خیال تھا کہ بایزید اس کے پیچھے پیچھے اسی شاہراہ سے انقرہ پہنچے گا جس سے مغلوں نے سفر کیا ہے پس بایزید کو انقرہ پہنچنے میں مزید کئی دن لگیں گے۔

مگر بایزید ایک غیر معروف راستہ اختیار کر کے جو''قلعہ چک'' اور''روالی'' سے ہو کر آتا تھا، ناقابلِ یقین سرعت کے ساتھ پیش قدمی کر رہا تھا۔ایک شام وہ یکا یک انقرہ کی شمال مشرقی سمت سے نمودار ہوا اور وادیٔ چوبوق کے''قصبہ ملک شاہ'' کے سامنے خیمے لگا لیے۔بایزید کو یوں اچانک نمودار ہوتا دیکھ کر لشکرِ تیموری میں ہل چل مچ گئی۔تیمور نے فوراً فوج کو شہر سے پرے ہٹا لیا۔بایزید کے افسران نے مشورہ دیا کہ دشمن کے سنبھلنے سے پہلے اسی وقت اس پر شب خون مارا جائے مگر بایزید نے ایک باوقار مدِ مقابل کی طرح فریقِ مخالف کو تیاری کا پورا موقع دیا۔یوں اس نے دشمن کے سر پر یکدم پہنچ کر جو نفسیاتی برتری حاصل کی تھی، وہ کم ہو گئی اور تیمور کو جنگی تیاری کی تکمیل کے لیے خاصا وقت مل گیا۔[1]

تیمور نے اپنے لشکر کے گرد پہرے داروں کے تین گروہ یکے بعد دیگرے مقرر کر دیے۔افسران سے کہا کہ وہ چوکس اور ہوشیار رہیں کیوں کہ دشمن رات کو شبِ خون مار سکتا ہے۔سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً سو جائیں تا کہ مکمل آرام کر لیں اور اگلے دن کسی تھکن کے احساس کے بغیر نیند سے بیدار ہوں۔[2]

تیمور کو ابھی تک یہ معلوم نہ تھا کہ بایزید کے پاس کتنی فوج ہے اور اس کی عسکری تیاریاں کیسی ہیں۔اس نے ایک دستے کو حکم دیا کہ وہ خاموشی سے جا کر عثمانی فوج کے کچھ گشتی سپاہیوں کو پکڑ لائے تا کہ ان سے کچھ اگلوا لیا جا سکے۔تاہم کچھ دیر بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ دستہ اپنے کئی سپاہی ہلاک کروا کے ناکام واپس آ گیا ہے۔تیمور نے اندازہ لگا لیا کہ حریف پوری طرح چوکنا ہے۔وہ اپنی سوانح حیات میں لکھتا ہے:

---

① تاریخ عثمانی: ۱/۳۵۳،۳۵۴

② منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۴

''اس شب میں چند بار اپنے خیمے سے باہر آیا اور کان لگا دیے مگر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ہر طرف تاریکی تھی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں ستاروں کو مخاطب کر کے کہا: ممکن ہے کہ کل تم اسی میدان میں میری لاش کو دیکھو۔ تاہم میرے دل میں موت کا ذرا بھی ڈر نہ تھا۔''[1]

تیمور رات بھر جاگتا رہا اور تمام شب عبادت اور فتح کی دعائیں مانگنے میں گزار دی۔[2]

اُدھر بایزید کی فوج کی حالت کچھ اتنی اچھی نہ تھی۔ وہ غیر معروف دشوار گزار پہاڑی راستے پر نہایت تیزی سے مسلسل سفر کر کے آنے کے باعث بُری طرح تھک چکی تھی۔ نیز وہ پیاسی بھی تھی کیوں کہ اس راستے میں پانی کی خاصی کمی تھی۔ جبکہ ادھر تیمور کی فوج بالکل تازہ دم تھی اور پانی کے ذخائر بھی تیموری افواج کے قبضے میں تھے۔[3]

دونوں فوجوں کا تقابل اور پہلے دن کی لڑائی:

۱۵ ذوالحجہ ۸۰۴ھ (۲۸ جولائی ۱۴۰۲ء) کو دونوں لشکر آمنے سامنے تھے۔[4]

یہ میدان شرقاً غرباً پھیلا ہوا تھا۔ تیمور کی فوج میدان کے مشرقی حصے میں تھی اور بایزید کا لشکر مغربی جانب۔[5]

تاریخ کی اس ناقابلِ فراموش جنگ کے وقت بایزید کی عمر ۴۳ سال تھی، اس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ اس کے نوجوان بیٹے اس کے ساتھ تھے۔[6] ادھر ۶۷ سال کا گرگِ باراں دیدہ تیمور لنگ، تین لاکھ سپاہی لے کر میدان میں موجود تھا۔ عددی لحاظ سے تیمور کی فوج بایزید کے لشکر پر کھلی فوقیت رکھتی تھی۔[7]

تیمور جنگ سے پہلے اس وسیع میدان کا معاینہ کرتے ہوئے بایزید کو کم عقل تصور کر رہا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''میں بایزید کی غلطی پر حیران تھا کہ اس نے کیسے اس ہموار میدان میں جنگ لڑنا طے کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ

---

① منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۴

② تاریخ عثمانی: ۱/۳۵۴ کا حاشیہ بحوالہ ظفر نامہ

③ انباء الغمر: ۲/۲۲۸؛ عجائب المقدور، ص ۲۶۹

بعض روایات کے مطابق بایزید اپنی بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی خاطر جنگ سے پہلے ایک دن فوج کو شکار پر لے گیا جہاں پانی بہت کم تھا، چنانچہ پیاس کے باعث پانچ ہزار عثمانی سپاہی مر گئے اور جو باقی بچے، ان کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ پھر شکار سے واپسی پر اس نے دیکھا کہ تیمور اس کی لشکر گاہ پر قابض ہو چکا ہے اور جس چشمے سے اس کی فوج پانی لے سکتی تھی، تیمور نے اس کا رُخ بھی پھیر دیا ہے۔ اس لیے بایزید کو اضطراری طور پر تھکی ماندی اور پیاس سے بے حال فوج لے کر تیمور سے لڑنا پڑا۔ (تاریخ دولت عثمانیہ: ۱/۶۹، اکبر شاہ نجیب آبادی نے بھی اپنی ''تاریخ اسلام'' میں یہی نقل کیا ہے۔) یہ روایت بعید معلوم ہوتی ہے۔ بایزید میں عجلت پسندی ضرور تھی مگر وہ ایسا نادان بھی نہ تھا کہ عین حالت جنگ میں خیمہ گاہ اور پانی کے ذرائع کو دشمن کے سامنے کھلا چھوڑ کر شکار کے لیے نکل جاتا۔ پھر یہ روایت سنداً بھی سخت مشکوک ہے۔ مجھے تلاش بسیار کے باوجود عرب، فارسی اور ترک مؤرخین میں سے کسی کے ہاں ایسی کوئی روایت نہیں ملی۔ بظاہر یہ روایت مستشرقین نے لی گئی ہے اور غالباً وضعی ہے۔ ہاں عثمانی لشکر کے تھکے ماندے اور پیاسے ہونے کا ذکر خود عرب اور ترک مؤرخین نے بھی کیا ہے اور وجہ یہ بتائی ہے کہ بایزید نے بے آب و گیاہ بیابان راستہ اختیار کیا تھا اور ادھر انقرہ میں تیمور پانی کے وسائل پر قابض ہو چکا تھا۔ پس اس حال میں کہ عثمانی لشکر پہلے ہی تھکا ماندہ اور پیاسا تھا اور سامنے دشمن تیار کھڑا تھا، یہ نہایت بعید ہے کہ بایزید اپنے سپاہیوں کی حالت کو یکسر نظر انداز کر کے انہیں شکار کی فضول بھاگ دوڑ میں تھکا کر مزید بے حال کرتا۔

④ تاریخ عثمانی: ۱/۳۵۴

⑤ منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۵

⑥ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۱۰

⑦ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۱۰ ...... بعض روایات میں یہ تعداد پانچ اور بعض میں آٹھ لاکھ تک بتائی گئی ہے۔

میرا لشکر گھڑ سوار ہے۔ گھڑ سوار کے لڑنے کے لیے ہموار میدان بہترین ہوتا ہے۔ گھڑ سوار فوج پہاڑی علاقے میں بے اثر ہو جاتی ہے اور آزادی سے نہیں لڑ سکتی۔ ہاں ہموار میدان میں گھڑ سوار ہر طرف جا سکتے ہیں اور دشمن کا سر کچل سکتے ہیں۔ ''①

تاہم بایزید کم عقل نہ تھا۔ وہ اس میدان کو دشمن کا قبرستان بنانے کے لیے ایک عجیب تدبیر پر عمل پیرا تھا۔ اس نے سینکڑوں ایسے رَتھ تیار کر لیے تھے جن کے آگے ایک درانتی نما پنکھا لگا ہوا تھا۔ جب رَتھ چلتا تو یہ تیز دھار پنکھا گردش میں آکر سامنے آنے والی ہر چیز کو کاٹ دیتا تھا۔ ہر گاڑی پر کئی سپاہی بھی سوار تھے جو ایک مضبوط اوٹ کے پیچھے چھپے ہوتے تھے اور اسپرنگوں والی جدید فولادی کمانوں سے مسلح تھے جن سے تین تین انچ لمبے پھلوں والے تیر چلتے تھے۔

جنگ شروع ہوتے ہی بایزید کی فوج نے ایک بہت بڑی کمان کی شکل اختیار کر لی۔ اس کمان کے دونوں سروں پر یہ مہلک رَتھ اس طرح آگے بڑھ رہے تھے کہ جیسے وہ تیمور کی فوج کے دونوں کناروں پر پھیل کر عقب میں جا کر باہم ملنا چاہتے ہوں۔ ان رَتھوں کے سامنے گھڑ سوار ٹھہر سکتے تھے نہ پیادے۔ وہ تیمور کی فوج کو اس طرح کاٹ رہے تھے جیسے درانتی فصل کو کاٹ رہی ہو۔ رتھ سوار تیر اندازوں کی اسپرنگ دار دُور مار کمانوں کے تیر اس قدر قوت سے چل رہے تھے کہ جسے چھوتے اسے چیر پھاڑ کر پار ہو جاتے۔ ②

تیمور نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ ششدر رہ گیا۔ وہ لکھتا ہے:

''جب جنگ شروع ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ بایزید نہیں بلکہ میں خود کم عقل ہوں۔ مجھے معلوم ہوا کہ جس گھات سے میں ڈر رہا تھا، وہ یہی گھات ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاہِ روم مجھے کسی پہاڑی علاقے یا تنگ گھاٹیوں والی جگہ میں لے جا کر گھات کا نشانہ بنائے گا تاکہ میری فوج کو تباہ کر سکے مگر اس نے مجھے انقرہ کے وسیع میدان میں گھیر لیا تاکہ اپنے رَتھوں کو بخوبی استعمال کر سکے۔'' ③

تیمور کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا کہ اگر کمان کی طرح پھیلی ہوئی عثمانی افواج ان کے عقب میں بھی پہنچ گئیں تو وہ مکمل محاصرے کی حالت میں آکر شکست کھا جائے گا۔ اس نے اپنے افسران کو حکم دیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر بایزید کی فوج کو عقب میں آنے سے روکیں۔ اس مقصد کے لیے تیمور کی ہدایت پر عقب کی طرف سے آنے والے رَتھوں کو روکنے کے لیے ان پر منجنیقوں کے ذریعے بارُود کی ہانڈیاں پھینک کر انہیں جلا دیا گیا جبکہ سامنے کی طرف سے حملہ کرنے والے رَتھوں کے سامنے زنجیروں، تختوں، میخوں اور کھونٹوں سے بندھے رَسّوں سے رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ اس کے علاوہ

---

① منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۵

② منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۵ ...... ظاہر ہے کہ یہ رتھ راتوں رات تیار نہیں کر لیے گئے تھے، یقیناً کئی ماہ پہلے سے ان کی صنعت جاری ہوگی اور بایزید نے انہیں کہیں پوشیدہ رکھا ہوگا۔ تیمور کے جاسوس یقیناً بہت فعال تھے مگر بایزید کی بعض چالوں سے وہ بھی آگاہ نہ ہو سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بایزید کے بارے میں یہ تاثر علی الاطلاق درست نہیں کہ وہ ناتجربہ کار اور عاقبت نااندیش تھا۔ ہاں کچھ غلطیاں اس سے ضرور ہوئی تھیں اور وہی اس کی شکست کا سبب تھیں۔

③ منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۵

رَتھوں کو ناکارہ بنانے میں کمند اندازوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ وہ رتھوں کے آگے لگے پنکھے پر کمندیں ڈال کر اس کی گردش روک دیتے تھے۔ اس کے باوجود بایزید کے رَتھ تیمور کی فوج کو سخت نقصانات پہنچانے میں کامیاب رہے۔[1]

اس دن کی لڑائی میں تیمور کی حکمت عملی دفائی تھی۔ اس کی پوری توجہ ان رَتھوں سے بچنے اور انہیں ناکارہ بنانے پر مرکوز رہی۔ اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ عثمانی لشکر کی اصل طاقت یہی رَتھ ہیں۔ اگر انہیں تباہ کر دیا جائے تو فتح جلد قدم چومے گی۔ اس دن تیمور خود لڑائی میں شریک نہ ہوا بلکہ ایک جانب رہ کر فوج کو ہدایات دیتا رہا۔ شام ہوتے ہی اس نے فوج کو پیچھے ہٹا کر پڑاؤ میں داخل کر لیا جس کے حفاظتی اقدامات خندقوں، پشتوں اور سنگروں کے ذریعے مستحکم بنا لیے گئے تھے۔ تاہم تیمور کو شدید خطرہ تھا کہ بایزید رَتھوں کے ذریعے رات کو پھر حملہ کرے گا۔ اگر ایسا ہوتا تو تیمور کی شکست لازمی تھی کیوں کہ اس کا وہ تیار شدہ بارود ختم ہو چکا تھا جس سے رَتھوں کو جلایا گیا تھا۔ تیمور کی قسمت کہ بایزید نے شب خون مارنے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ ایک ایلچی کے ذریعے تیمور کو تنبیہی مراسلہ بھیجنے پر اکتفا کیا جس میں کہا گیا تھا:

''تمہارے لیے بہتر ہے کہ صبح واپس چلے جاؤ، ورنہ کل ہم اس سے کہیں زیادہ جنگی رَتھ مقابلے پر لائیں گے۔''[2]

بات چیت اور وقت گزاری:

دوسرے دن شدید بارش شروع ہوگئی، تیمور کی فوج کے عقب میں دریائے قزل ارماق بہہ رہا تھا اس میں سیلاب کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ تیمور کو ایک بار پھر خطرہ لاحق ہوا کہ اگر بایزید نے اس حالت میں حملہ کر دیا تو اس کی فوج سیلاب کی نذر نہ ہو جائے، تاہم عثمانی لشکر بارش سے بچنے کے لیے اپنی خیمہ گاہ میں رہا جو نسبتاً محفوظ تھی۔

تیسرے دن موسم خوشگوار ہو گیا اور سورج چمکنے لگا۔ مگر اس دن بھی بایزید نے حملہ نہ کیا کیوں کہ وہ مزید رَتھوں کا انتظار کر رہا تھا جو کارخانوں سے تیار ہو کر بہت جلد اس کے پاس پہنچنے والے تھے۔ اس نے ایک بار پھر ایلچی بھیج کر تیمور کو پیش کش کی کہ وہ مکمل تباہی سے بچنے کے لیے واپس چلا جائے، اسے محفوظ راستہ دے دیا جائے گا۔

تیمور کو بارود کی تیاری کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا، اس لیے اس نے بات چیت کا سلسلہ دراز کر کے دو دن گزار دیے۔ اس دوران اس کے کاریگروں نے بہت بڑی مقدار میں بارود تیار کر لیا جو عثمانی رتھوں کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس تیاری کے بعد تیمور ایک بار پھر میدان میں نکلا۔ اس نے افواج کو بتا دیا کہ آج حتمی فیصلے تک حملہ جاری رہے گا، پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔[3]

فیصلہ کن جنگ کا دن:

یہ ۱۹ ذوالحجہ ۸۰۴ھ (یکم اگست ۱۴۰۲ء) تھا۔ فیصلہ کن جنگ کا دن۔[4] بایزید بھی پوری طرح تیار تھا۔ اس نے دائیں بازو پر اناطولیہ کے دستوں کو رکھا جن کے ساتھ تاتاری سپاہی بھی تھے۔ ان صفوں کے سرے پر تیر اندازوں کے

---

[1] منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۶، ۳۸۷

[2] منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۶ تا ۳۸۹

[3] منم تیمور جہانگشا، ص ۳۸۹ تا ۳۹۲

[4] تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۴

غول تھے۔ بایزید کا سالا سرب شہزادہ اسٹیفن بھی دائیں بازو میں تھا جس کی قیادت میں یورپ کی باج گزار ریاستوں کے بیس ہزار سپاہی تھے۔ بائیں بازو کی قیادت شہزادہ سلیمان پاشا کو دی گئی تھی جس کے پاس صاروخان، قرہ سی اور صوبہ رومیلی کی فوجیں تھیں، ان فوجوں کی پشت پر تاتاری سپاہیوں کے دستے تھے۔

قلب میں وزیراعظم جاندار علی پاشا کے ساتھ بایزید کے بیٹوں: عیسیٰ، موسیٰ اور مصطفیٰ کی فوجیں تھیں جبکہ شہزادہ محمد (حاکمِ اماسیا) اپنے دستوں کے ساتھ عقب میں رسد کے ذخائر کے پاس تھا۔

بایزید خود قصبہ ملک شاہ کے ایک بلند ٹیلے پر تھا اور ینی چری جوانوں نے اسے اپنے حفاظتی گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ینی چری کے سامنے سریع الحرکت پیادہ سپاہیوں کے دستے تھے جنہیں ''عزب'' کہا جاتا تھا۔ [1]

اُدھر تیمور کا دایاں بازو شہزادہ میران شاہ اور امیر محمد سلطان کی کمان میں تھا۔ بائیں بازو پر شہزادہ شاہ رُخ، خلیل سلطان اور بعض امراء تعینات تھے۔ تیمور نے نہایت جنگ آزمودہ سپاہیوں کے چالیس دستے خاص اپنی کمان میں رکھے تھے۔ لشکر کے اگلے حصے میں ۳۲ ہاتھی تھے۔ [2]

سورج طلوع ہوتے ہی جنگ کے نقارے پر چوٹ پڑی اور عالم اسلام کے دو عظیم ترین لشکر ایک دوسرے پر پل پڑے۔ یہ مشرق و مغرب کے عظیم ترین بادشاہوں کے مابین جنگ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دو پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ فریقین نے سر دھڑ کی بازی لگانے میں انتہاء کر دی۔ سرتنوں سے جدا ہوتے چلے گئے، لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، فضا میں لہو کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور دوپہر تک خاکی زمین سرخ ہو چکی تھی۔

آج بایزید کے رَتھ کام نہ آسکے کیوں کہ تیمور کے آتش زنوں نے بھاری مقدار میں بارود کی بارش کر کے انہیں جلا ڈالا۔ [3] اب روایتی ہتھیاروں ہی سے جنگ کا فیصلہ ہونا تھا چنانچہ دونوں فوجیں بُری طرح آپس میں گتھ گئیں۔ صبح سے دوپہر تک جنگ پوری شدت کے ساتھ جاری رہی۔ بایزید اپنے ینی چری دستوں کے ساتھ تیموری قلب کے جارحانہ حملوں کو بُری طرح ناکام بناتا رہا اور ہر بار یہاں دشمن کو منہ کی کھانا پڑی۔

ایسے میں تیمور نے طے کیا کہ پہلے حریف کے دائیں اور بائیں بازو کو قلب سے الگ کیا جائے۔ تیمور کا اپنا دایاں بازو بہت مضبوط تھا اور دریا کی اوٹ کے باعث بالکل محفوظ تھا۔ اس کے مقابلے میں عثمانیوں کا بایاں بازو تھا جس کی کمان شہزادہ سلیمان کر رہا تھا، اس کی اگلی صفوں میں رومیلی اور پچھلی صفوں میں تاتاری تیر انداز تھے۔ تیمور نے اپنی زیادہ طاقت اسی طرف لگا دی، اس کے باوجود دیر تک مغلوں کی کوئی پیش نہ گئی۔

تاہم اس دوران سلیمان کے تاتاری دستے جو تیمور کے ساتھ ساز باز کر چکے تھے، اچانک اس کے رومیلی دستوں کی پشت پر تیروں کی بوچھاڑ کرنے لگے۔ یوں شہزادہ سلیمان دوطرفہ حملے کی زد میں آکر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔

---

(1) تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۵، ۳۵۶

(2) تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۶

(3) منم تیمور جهانگشا، ص ۳۹۲

اُدھر بایزید کا دائیں بازو جس میں بیس ہزار سرب سپاہی تھے، زوردار حملے کر کے تیمور کے بائیں بازو کو پیچھے ہٹا چکا تھا۔ مغلوں کی پچھلی صفوں نے اپنے پسپا ہوتے دستوں کو تقویت دینے کی بڑی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی اور مغلوں کا میسرہ درہم برہم ہوتا چلا گیا۔ تیمور اس صورتحال سے سخت پریشان تھا تاہم اس وقت اس کی تشویش جاتی رہی جب یہاں بھی تاتاری دستوں نے غداری کی اور اناطولیہ کے دستوں کو تنہا چھوڑ کر تیمور کی فوج سے آملے۔ اس بدحالی کے باوجود سرب سپاہی دیر تک مردانہ وار لڑتے رہے یہاں تک کہ تیمور بھی ان کی تعریف پر مجبور ہو گیا۔ بہر کیف اس بدحالی کے عالم میں آخر کار عثمانیوں کے دائیں بازو کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ [1]

یہ حالت دیکھ کر بایزید کے وزیر اعظم علی پاشا اور دیگر امرائے نے اسے مشورہ دیا کہ معاملہ ہاتھ سے نکلنے سے پہلے ہمیں عقب نشینی اختیار کر لینی چاہیے۔ تاہم بایزید کا کہنا تھا کہ میں شریفانہ موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتا ہوں۔ [2]

بایزید نرغے میں:

بایزید شیر ببر کی طرح مسلسل لڑتا رہا اور ینی چری سپاہی اس کے دائیں بائیں اپنی جانیں نثار کرتے رہے۔ ان کے ہر حملے میں مغلوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے تاہم فوراً ان کی جگہ متبادل سپاہی آجاتے کیوں کہ تیمور کے پاس افرادی قوت بہت زیادہ تھی۔ اس دوران تیموری افواج کا قلب کمان کی شکل میں عثمانی قلب کے اردگرد پھیل کر بایزید کو اس کے دائیں اور بائیں بازو سے الگ کر چکا تھا۔ بایزید اب مدافعانہ جنگ لڑنے پر مجبور تھا، چنانچہ اس نے "چاتال تپہ" کی سطح مرتفع کا رُخ کیا اور وہاں پہنچ کر دشمن کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ دس ہزار ینی چری سپاہی اس کے گرد ایک آہنی حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ تیمور نے یہ دیکھ کر اپنے تیس ہزار سپاہیوں کو اس ٹیلے پر آخری دھاوا بولنے کا حکم دے دیا۔ اب مغل چیونٹیوں کی مانند ہر سمت سے "چاتال تپہ" پر چڑھنے لگے۔ [3] اس حملے میں تیمور خود شریک تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں کلہاڑا لیے بڑھ چڑھ کر وار کر رہا تھا جس سے اس کی فوج کا جوش دوچند ہو گیا تھا۔ تاہم ینی چری کی مزاحمت کا جواب نہ تھا۔ تیمور اس وقت چونکا جب ایک عثمانی نے حملہ کر کے اس کے گھوڑے کا پیٹ تلوار سے چیر ڈالا۔ تیمور نے نیچے گرتے گرتے اس سپاہی کو کلہاڑے کا نشانہ بنا دیا اور گھوڑا تبدیل کر کے جنگ میں شریک رہا۔ [4]

تیمور زخمی ہو گیا:

اس ہولناک معرکے میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب تیمور اور بایزید لڑتے لڑتے آمنے سامنے آن پہنچے اور دونوں کے محافظ باہم گتھ گئے۔ [5] یہاں تیمور کو زندگی کے سخت ترین لمحات کا سامنا ہوا۔ بایزید کے جانثار اسپرنگ دار کمانوں سے خوفناک تیر برسا کر دشمن کو سخت نقصان پہنچا رہے تھے، ایسے ہی ایک تیر سے تیمور کا گال زخمی ہو گیا۔ اُدھر سے بایزید

---

① تاریخ عثمانی: ۱/۳۵۶، ۳۵۷، مع حواشی

② تاریخ عثمانی: ۱/۳۵۷...... بایزید اس وقت پیچھے ہٹ کر انقرہ شہر میں قلعہ بند ہو سکتا تھا کیوں کہ تیمور انقرہ کو فتح کرنے میں ناکام رہا تھا مگر بایزید کا عقب نشینی سے گریز غالباً اس وجہ سے بھی تھا کہ اس نے میدان سے بھاگنے پر بیویوں کو طلاق ہو جانے کی قسم کھائی تھی۔

③ تاریخ عثمانی، ص ۳۵۷ مع حاشیہ ④ منم تیمور جہانگشا، ص ۳۹۲، ۳۹۳ ⑤ نزہۃ الانظار: ۲/۱۱

کے ایک سپاہی نے تیمور کی پنڈلی میں نیزہ دے مارا۔ تیمور نے فوراً کلہاڑا چلا کر نیزہ باز کا کندھا توڑ دیا اور برابر لڑتا رہا مگر کچھ ہی دیر بعد ایک عثمانی سپاہی کا گرز تیمور کے سر پر پڑا اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ محافظوں نے اسے بمشکل بچایا اور خیمہ گاہ میں لے گئے۔ ① اُدھر بایزید کے سپاہی کٹتے جا رہے تھے اور اب دو تین ہزار ینی چری جوان اس کے ساتھ رہ گئے تھے، جو پوری مستعدی سے اس کا دفاع کر رہے تھے۔ اس دوران بایزید دشمن کا گھیرا توڑ کر اپنے دائیں یا بائیں بازو کے ان دستوں سے جا ملنے کا سوچ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے تک اس وسیع میدان کے شمالی اور جنوبی سروں پر دشمن سے برسرِ پیکار تھے مگر اب صورتحال بدل چکی تھی۔ شکست کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر عثمانیوں کے دائیں بازو کے کماندار شہزادہ سلیمان اور شہزادہ محمد چلپی اپنے افسران سمیت میدان سے فرار ہو رہے تھے۔ بائیں بازو کے سرب سپاہیوں نے دیر تک جان توڑ مقابلہ کیا تھا مگر مزاحمت بے سود دیکھ کر کچھ دیر پہلے وہ بھی میدان سے ہٹنا شروع ہو گئے تھے۔

بایزید شام ہونے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ تاریکی میں گھیرا توڑنا آسان ہو کہ اچانک ایک ینی چری افسر نے بڑے جذباتی انداز میں شہزادوں کے فرار کی افسوس ناک اطلاع بایزید تک پہنچائی اور کہا:

''سلطان! آپ کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ سارا لشکر غداری کر کے میدان سے بھاگ چکا ہے۔''

بایزید یہ سنتے ہی غصے سے بے حال ہو گیا اور اپنے شہزادوں کو روکنے کے لیے بلا تأمل گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ ایک ینی چری افسر نے گھبرا کر کہا: ''اے سلطان! ہمارے گھیرے سے باہر نہ جائیے۔''

مگر بایزید نے سنی اَن سُنی کر دی اور حریف کا گھیرا چیر کر مفرور شہزادوں کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ ینی چری افسران افسوس کرتے رہ گئے۔ اُدھر مغل شہ سوار باگیں اٹھا کر بایزید کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ ②

بایزید کی گرفتاری:

بایزید ایک برقِ آسمانی تھا جو شاید اپنی تیز رفتاری کے باعث کسی کے ہاتھ نہ آتا مگر کمند اندازوں نے پھندے پھینک کر اس مایہ ناز شمشیر زن کو جکڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ بایزید نے ان کی ایک نہ چلنے دی مگر بدقسمتی سے اس کے گھوڑے کو ٹھوکر لگ گئی۔ بایزید نیچے گرتے ہی دوسرے گھوڑے پر سوار ہونے لگا مگر اسی دوران وہ مغلوں کی کمندوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ مغل سپاہی اسے گرفتار کر کے اپنے پڑاؤ میں لے گئے ③ جہاں زخمی تیمور کو ہوش آ چکا تھا۔ اسے فتح کی خوشی میں اپنے زخموں کی پروا نہ رہی۔ ④ اس واقعے کے چشم دید راوی ایک ینی چری سپاہی کا کہنا تھا:

''ہم نے دیکھا کہ مغل بایزید کو گرفتار کر کے تیمور کے پاس لے جا رہے ہیں۔ اگر سلطان ہماری بات پر توجہ دے کر ہمارے حلقے سے باہر نہ نکلتا تو غالباً گرفتاری سے بچ جاتا، اندھیرا پھیلتے ہی ہم اسے محفوظ جگہ تک لے جاتے۔'' ⑤

---

① منم تیمور جہانگشا، ص ۳۹۳ ② تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۷، ۳۵۸ مع حواشی

③ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۷ ④ منم تیمور جہانگشا، ص ۳۹۳، ۳۹۴

⑤ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۷، ۳۵۸ مع حواشی بحوالہ "تواریخ آل عثمان"

ایک روایت یہ ہے کہ مغلوں نے ایک بڑا قالین پھینک کر بایزید کو اس میں لپیٹ لیا تھا۔ (نزهة الانظار: ۲/ ۱۱)

مگر انجام کار قسمت کا لکھا ہو کر رہا اور یہ مہیب کش مکش بایزید کی گرفتاری جیسے حسرت ناک انجام پر اختتام پذیر ہوئی۔ جنگ میں تیمور کے چالیس ہزار سپاہی مارے گئے تھے۔ لشکر کا ایسا نقصان اس نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ [1]

جنگِ انقرہ کے اثرات:

معرکۂ انقرہ مسلمانوں کے درمیان تاریخ کی سب سے بڑی لڑائی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور اس کے زخموں کی ٹیسیں ہمیشہ محسوس ہوتی رہیں گی۔ تیمور نے عالم اسلام پر اس سے پہلے جو ظلم ڈھائے، وہ بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے مگر بایزید کی قوت توڑ کر اس نے جو جرم کیا وہ قطعاً ناقابلِ معافی اور ناقابلِ تلافی ہے۔ اگر بایزید پر یہ جنگ مسلط نہ کی جاتی تو کوئی بعید نہ تھا کہ نویں صدی ہجری کے وسط تک پورا یورپ اسلام کے زیرِ نگیں ہو جاتا۔ مگر اس کے برعکس اس شکست نے سلطنتِ عثمانیہ سے نصف صدی کے مفتوحہ علاقے چھین لیے۔ قُسطَنطِینِیَہ کی دم توڑتی قیصریت کو مزید پچاس برس مل گئے۔ متحدہ اناطولیہ کے خواب کی تعبیر ۷۰ سال مؤخر ہو گئی۔ بایزید نے صرف تیرہ سال میں ۴ لاکھ ۴۱ ہزار مربع کلو میٹر کا رقبہ فتح کر کے مجموعی طور پر سلطنت کو ۹ لاکھ ۴۲ ہزار مربع کلو میٹر تک پھیلا دیا تھا۔ ان تمام علاقوں کی بازیافت میں اس کے جانشینوں کو ۱۱۵ سال گزر گئے۔ [2]

بایزید کی شکست درحقیقت پورے عالم اسلام کی شکست تھی اور تیمور کی فتح یورپ کی فتح تھی۔ اس انجام پر ایک طرف اسلامی دنیا میں رنج و الم کی ایسی شدید لہر دوڑ گئی کہ اس کی ٹیسیں آج کئی صدیاں گزر جانے پر بھی محسوس کی جا رہی ہیں۔ اُدھر یورپ میں فرحت و شادمانی کا وہ سماں بندھا کہ اس جنگ کی یاد آج بھی انہیں تر و تازہ کر دیتی ہے۔

یورپ کے اسلامی پرچم تلے آنے کا یہ دوسرا بڑا موقع تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پہلی بار دوسری صدی ہجری میں فرانس کے معرکہ بلاط الشہداء میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اس نے یورپ میں اسلام کی پیش قدمی روک دی۔ سات صدیوں بعد بایزید کے دور میں مسلمانوں کو دوسری بار ایسا موقع ملا تھا۔ مگر اس بار بھی بازی ہاتھ سے نکل گئی۔ بلاط الشہداء میں مسلمانوں کی راہ مسدود کرنے والا ایک غیر مسلم جنرل تھا۔ مگر یہاں خود ایک کلمہ گو حکمران نے اسلام کی اشاعت کے راستے بند کر دیے۔ اگر اس لڑائی میں تیمور کو شکست ہوتی بلکہ وہ مارا بھی جاتا تو مسلمانوں کا کچھ نہ بگڑتا بلکہ انہیں ایک جابر و قاہر حکمران سے نجات مل جاتی اور بایزید یورپ میں مزید پیش قدمی کے لیے پابہ رکاب ہو جاتا۔ مگر اس کی شکست نے تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا اور عالم اسلام آج تک اس کی تلافی نہ کر پایا۔ اگرچہ بایزید کے جانشینوں نے قُسطَنطِینِیَہ فتح کر لیا اور یورپ میں ان کی مزید فتوحات بھی جاری رہیں مگر جنگِ نیکوپولس میں یورپ کے درجن بھر ممالک کو شکستِ فاش دے کر بایزید نے فتوحات کا جو طوفانی سماں باندھا تھا، اس کا اعادہ پھر کبھی نہ ہو سکا۔

بایزید کی شکست کی وجوہ:

ہم بایزید کی شکست کی وجوہ سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس شکست کی اہم وجوہ یہ تھیں:

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۱۰ [2] بحوالہ بالا

❶ بایزید تیمور کے مظالم دیکھ کر نہایت مشتعل ہوگیا تھا۔ اس کیفیت نے اسے جلد بازی پر مجبور کیا۔

❷ یورپ میں مسلسل فتوحات کی وجہ سے وہ غیر معمولی خود اعتمادی میں مبتلا تھا۔ لہٰذا اس نے طویل منصوبہ بندی کیے بغیر جنگ شروع کردی چنانچہ اسے فیصلہ کن معرکہ بہترین نقشۂ جنگ کے بغیر اضطراری حالت میں لڑنا پڑا۔

❸ بایزید کا لشکر تھکا ماندہ تھا۔ اس کی تعداد بھی کم تھی۔ تیمور کے پاس بایزید سے دوگنی چوگنی تازہ دم فوج تھی۔

❹ بایزید کے لشکر میں سرب سپاہیوں کی موجودگی عثمانی ترک امراء کی حوصلہ شکنی کا سبب بنی کیوں کہ وہ عیسائیوں کی مدد سے جنگ لڑنے کو قومی غیرت کے منافی سمجھتے تھے۔

❺ عثمانی لشکر کی اکثریت ہمیشہ نصرانیوں سے نبرد آزما رہی تھی۔ انہیں مسلمانوں سے لڑنے کا کوئی شوق تھا نہ تجربہ۔ اسی لیے ان کی خاصی تعداد مسلمانوں کے خلاف بھرپور جذبے سے نہ لڑسکی۔

❻ شکست کی فوری وجہ عثمانی لشکر کے ان تاتاری امراء کی غداری تھی جن کی کمان میں فوج کا بہت بڑا حصہ تھا۔

شکست کے بعد اناطولیہ اور عثمانی شہزادوں کا حال:

جنگ کے بعد تیمور نے ایشیائے کوچک میں افواج پھیلا کر جگہ جگہ شام اور عراق جیسے تباہ کن مناظر کو دہرایا۔ بایزید نے بنوقرامان، بنومنتشا، بنوآیدین، بنوصاروخان اور بنوحمید سمیت متعدد خاندانوں سے جو علاقے چھینے تھے، تیمور نے انہیں واپس کر کے اپنے باج گزار حکام کی حیثیت دے دی۔ شعبان ۸۰۵ھ میں وہ واپس روانہ ہوا تو بایزید کو اس کی خواتین اور باندیوں سمیت ساتھ لے گیا۔ بایزید کے چھ بیٹے تھے: سلیمان، عیسیٰ، محمد، موسیٰ، مصطفیٰ، قاسم۔ ان میں سے قاسم بہت چھوٹا تھا۔ باقی پانچوں اپنے باپ کے ساتھ جنگِ انقرہ میں شریک ہوئے تھے۔

شکست کے بعد بڑا بیٹا سلیمان فرار ہو کر بورصہ پہنچ گیا تھا، وہاں سے اہل وعیال کو لے کر اس نے سمندر پار پایۂ تخت ایڈریانوپل میں پناہ لی۔ شہزادہ محمد اپنے قلعے اماسیا میں مورچہ بند ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ لاپتا ہوگیا، غالباً وہ لڑائی میں کام آگیا تھا۔ شہزادہ عیسیٰ بھی بچ کر نکل گیا تھا جبکہ شہزادہ موسیٰ بایزید کے ساتھ ہی قید تھا۔ ①

عثمانیوں کے علمی خزانوں اور سرکاری ریکارڈ کی بربادی:

اناطولیہ پر تیمور کے قبضے کا سب سے بڑا نقصان، علمی ذخائر کی وہ تباہی تھی جس کی کبھی تلافی نہیں ہوسکتی۔ تیموری افواج نے بورصہ سے عثمانیوں کے خزانے لوٹ لیے، کتب خانوں اور سرکاری ریکارڈ کے دفاتر نذرِ آتش کردیے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگِ انقرہ تک عثمانیوں کی تاریخ بہت مختصر ملتی ہے کیوں کہ وقائع نگاروں کی قلمی کاوشیں جلادی گئی تھیں۔ ②

تیمور اور بایزید کی باہم گفتگو:

بایزید نے گرفتاری کے بعد تیمور کے سامنے پیش ہونے سے پہلے اسے درجِ ذیل مکتوب بھیجا:

① انباء الغمر: ۲/۲۲۶؛ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۸ تا ۳۶۰، ۳۷۰، ۳۷۱؛ تاریخ الدولة العثمانية از یلماز: ۱/ ۱۱۰؛ اخبار الدول: ۳ ص ۲۰

② تاریخ الدولة العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۱۲

’’گردشِ افلاک اس کا سبب بنی کہ میں شکست کھا گیا اور اے عظیم امیر تم فاتح ٹھہرے۔ اب میری جان اور مال تمہارے قبضے میں ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تم میرے ساتھ اپنی عظمت کے شایانِ شان سلوک کرو گے۔‘‘

تین دن بعد بایزید کو تیمور کے سامنے پیش کیا گیا۔ تیمور نے اسے پاس بٹھایا اور کہا:

’’مجھے تمہارا خط ملا جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ تم اپنے غرور کے پہاڑ سے نیچے اتر آئے ہو۔ تم نے جان لیا ہے کہ تیمور سے پنجہ آزمائی کر کے تم نے غلطی کی ہے۔‘‘

بایزید نے جواب دیا: ’’اے امیر! اگر کوئی بادشاہ باہر سے آ کر تمہارے ملک پر حملہ کرتا تو کیا تم اس سے جنگ نہ کرتے؟ اگر میں تمہارے ملک پر حملہ کرتا تب تو تمہیں مجھ پر غصہ کرنے کا حق تھا۔ مگر میں نے جو کچھ کیا محض اپنے دفاع میں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا اور میں شکست کھا گیا۔‘‘

تیمور نے لاجواب ہو کر کہا: ’’میں تمہارا یہ عذر قبول کرتا ہوں کہ تم مجھ سے جنگ پر مجبور تھے۔‘‘ ①

بایزید اپنی رعایا اور ملک کا بے حد خیر خواہ اور ہمدرد تھا۔ اسی فکر کے باعث اس نے ایک موقع پر تیمور کو کہا:

’’میری تین وصیتیں یاد رکھنا: روم (اناطولیہ) کے لوگوں کو قتل نہ کرنا کیوں کہ وہ اسلام کا حصار ہیں۔ دین کی نصرت کرنے کی ذمہ داری تم پر سب سے پہلے عائد ہوتی کہ تم بھی مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔

ان شہروں میں تاتاریوں کو آباد نہ ہونے دینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ یہاں کے قبائل کو (فساد کی) آگ سے بھر دیں گے۔ وہ مسلمانوں کے لیے نصرانیوں سے بھی زیادہ نقصان دہ ہیں۔

مسلمانوں کے قلعوں اور شہروں کو مسمار نہ کرنا۔ انہیں ان کے علاقوں سے نہ نکالنا۔ یہ لوگ دین کے محافظ ہیں۔ یہ مجاہدین اور غازیوں کی پناہ گاہ ہیں۔ یہ ملک امانت ہے جو میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔‘‘ ②

کچھ دنوں بعد تیمور ایک باغی سردار ’’توگول‘‘ کے تعاقب میں آذربائی جان کی طرف روانہ ہو گیا جس کی فوج بنو صاروخان، کردستانیوں اور تاتاری سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ دیارِ بکر کی گھاٹیوں میں تیمور نے حریف کو جا لیا۔ توگول کے سپاہی گرز اور خنجر کے علاوہ ایک منفرد ہتھیار ’’چماق‘‘ چلانے کے ماہر تھے، تیمور کی فوج اس سے ناواقف تھی لہٰذا سخت نقصانات اٹھا کر بمشکل فتح یاب ہو سکی۔ اس دن نمازِ مغرب کے بعد تیمور نے بایزید کو طلب کر کے پوچھا: ’’تمہارے ہاں ایسے سخت جان سپاہی موجود تھے، تم نے ان سے فائدہ اٹھا کر ایک ناقابلِ شکست فوج کیوں نہ تیار کر لی۔‘‘

بایزید نے کہا: ’’نعمت کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب وہ ہاتھ سے نکل جائے۔ واقعی میں ان لوگوں سے بہت فائدہ اٹھا سکتا تھا مگر نہ اٹھا سکا۔‘‘ ③

بایزید کے فرار کی کوشش:

شہزادہ محمد اپنے باپ کے لیے سب سے زیادہ فکر مند تھا۔ اس نے والد کو قید سے نکالنے کے لیے کچھ چنیدہ جوان بھیج

---

① منم تیمور جہانگشا، ص ۳۹۵، ۳۹۶ ② نزھۃ الانظار: ۱۱/۲ ③ منم تیمور جہانگشا، ص ۴۰۶ تا ۴۰۸

دیے۔ان دنوں تیمور سیورے حصار کے قریب خیمہ زن تھا۔شہزادہ محمد کے جوانوں نے نقب لگا کر بایزید اوراس کے بیگلر بیگی فیروز پاشا کو کوٹھڑی سے نکال لیا مگر بدقسمتی سے عین وقت پر پہرے دار سر پر پہنچ گئے اورانہوں نے بایزید کو دوبارہ گرفتار کرلیا۔تیمور نے بایزید کی سخت تذلیل کی اوراس پر پہرہ مزید سخت کردیا۔جبکہ فیروز پاشا کو قتل کرادیا۔ ①

تیمور کے بیان کے مطابق بایزید کے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا تھا مگر دیگر مؤرخین کے بیانات سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔درحقیقت تیمور کا سلوک عجیب وغریب تھا۔اگرچہ تیمور نے بایزید پر کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا بلکہ اسے کھانے پینے اور رہن سہن کی مناسب سہولیات فراہم کیں مگر وہ ذہنی طور پر اسے چرکے دیتا رہا۔وہ اسے پاس بلاتا، اپنے سامنے کھانا کھلاتا، کبھی نرمی کی باتیں کرتا، کبھی اس پر ترس کھاتا، کبھی اس کا مذاق اڑاتا اوراس پر قہقہے لگاتا۔

ایک دن اس نے مجلسِ طرب جمائی اور بایزید کو بھی بلایا۔بایزید نے مجلس میں بیٹھ کر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ اس کی گھر کی عورتیں اور باندیاں حاضرین کو مشروب پیش کررہی ہیں۔اپنے گھر کی عزت کو یوں تماشا بنے دیکھ کر بایزید جیتے جی مرگیا۔زندگی کا ہر لحہ اس کے لیے موت سے بدتر ہوگیا۔وہ جس کے اشارے پر یورپی تاجدار اپنا سر جھکادیتے تھے، حزن وملال کی تصویر اورعبرت کی جیتی جاگتی تمثیل بن کر رہ گیا۔ ② ابن عرب شاہ کے بقول تیمور نے بایزید کے ساتھ ایسا سلوک اس انتقامی جذبے کے تحت کیا تھا کہ بایزید نے اپنے مراسلے میں عورتوں کا ذکر کیا تھا اوران کی طلاق کی قسم کھائی تھی۔مغلوں کے ہاں مردوں کی گفتگو میں خواتین کا ذکر بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ ④

بایزید کی وفات:

اپنی حالت پر کڑھتے کڑھتے بایزید سخت بیمار ہوگیا اور سفر کے قابل نہ رہا۔ایک دن جبکہ وہ خود بیماری کے سبب تیمور کے پاس حاضر ہونے سے قاصر تھا، اس نے تیمور کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں تحریر تھا:

> ''میں سخت بیمار ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ میں بہت جلد مرجاؤں گا۔قدیم زمانے سے یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ جو بادشاہ بھی قید ہوا، وہ دورانِ اسیری ہی مرگیا۔بس اگر میں بیماری سے نہ مرا تو قید مجھے ماڈالے گی۔لیکن اے محترم امیر! تم اس بات کو قبول نہ کرنا کہ میرے مرنے کے بعد روم کی سلطنت آلِ عثمان کے ہاں سے نکل جائے۔میری تم سے فقط یہ درخواست ہے کہ تم میرے بیٹے کو میرا جانشین بنادو تاکہ ہمارے خاندان کا جو چراغ صدیوں سے جل رہا ہے، وہ بجھنے نہ پائے۔میں یقین دلاتا ہوں کہ میرا بیٹا تمہارا باج گزار اور فرماں بردار رہے گا۔''

تیمور نے اس مراسلے کے جواب میں لکھوایا:

> ''میں تمہارے بیٹے کو روم کا فرمانروا بنادوں گا بشرطیکہ وہ میرا باج گزار رہے۔'' ⑤

---

① تاریخ عثمانی: ۱ر ۳۵۹ مع حواشی ...... فرید بیگ کے مطابق بایزید نے تین بار قید سے فرار کی کوشش کی تھی۔(تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۴۶)

② تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۳۶ ③ عجائب المقدور، ص ۲۷۸، ۲۷۹

④ عجائب المقدور، ص ۲۷۹

⑤ منم تیمور جہانگشا، ص ۴۱۰

بایزید کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ وہ دمے اور خناق میں مبتلا ہو چکا تھا۔ آخر گرفتاری کے سات ماہ بعد ۱۴ شعبان ۸۰۵ھ (۲۶ فروری ۱۴۰۳ء) کو اس نے قید کی حالت میں ہی جان جاں آفرین کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اس وقت تیمور کا قافلہ تبریز کے قریب آق شہر پہنچا تھا۔ یہ حادثۂ مرگ ایسا دلگداز تھا کہ وہ جہاں سوز فاتح جس نے لاکھوں انسانوں کو بے دریغ قتل کرا کے بھی اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس نہ کیا تھا، اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ آلِ عثمان کے اس عظیم شہسوار کی مرگِ یاس انگیز پر اس کے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے بایزید کی لاش اس کے قیدی بیٹے موسیٰ کے حوالے کی، اسے اپنی نیابت میں حکمرانی کی علامت کے طور پر خلعت، شمشیر اور ایک سو گھوڑے دیے اور تاکید کی کہ باپ کی نعش کو شاہی اعزازات کے ساتھ دفن کر دینا۔ نعش کو عملِ مومیائی کے ذریعے محفوظ بنا کر ایک تابوت میں رکھا گیا جسے لے کر موسیٰ امراء کی معیت میں بورصہ روانہ ہوا تاکہ لاش کو وہاں دفن کیا جائے۔ [1]

بایزید کے حالات پر ایک نظر:

بایزید نے چودہ سال تین ماہ حکومت کی۔ اس کی ولادت ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کی عمر تقریباً ۴۴ سال تھی۔ [2] اس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے درج ذیل توصیف آمیز کلمات لکھے ہیں:

> ”وہ بہترین حکمرانوں میں سے تھا۔ بارعب تھا۔ علم اور علماء سے محبت کرتا تھا۔ اہلِ قرآن کا اکرام کرتا تھا۔“ [3]

> ”بایزید یلدرم کفار سے جہاد میں مشہور ہوا، اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ سلطان الظاہر برقوق نے اسے مراسلے بھیجے اور یکے بعد دیگرے سفیر روانہ کیے۔ دنیا میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں رہا جس نے بایزید کو ہدیے نہ بھیجے ہوں اور اس سے خط و کتابت نہ کی ہو۔“ [4]

> ”بایزید مسلمانوں کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، (شہروں کی) حفاظت کے لحاظ سے سب سے زیادہ امن و امان قائم رکھنے والا تھا۔ کفار سے جہاد میں سب سے بڑھ کر تھا۔ وہ اپنے معاصر بادشاہوں کی کفار سے جہاد میں سستی اور عوام سے ٹیکس کی وصولی پر تنقید کیا کرتا تھا۔“ [5]

بایزید تعمیراتی اور ترقیاتی کام کرانے پر پوری توجہ دیتا تھا۔ اس نے متعدد مساجد، خانقاہیں، حمامات اور شفاخانے بنوائے۔ شفاخانوں کے لیے مصر سے ماہر طبیب منگوائے۔ [6] بورصہ کی عظیم الشان جامع مسجد (جامع مسجد یلدرم) اس کے تعمیری ذوق کی گواہ ہے جو اندر اور باہر سے سنگِ مرمر کی تھی اور چشموں کا آبِ شیریں اس سے ہو کر گزرتا تھا۔ [7]

---

① اخبار الدول: ۲۱/۳؛ نزهة الانظار: ۱۱/۲؛ تاریخ عثمانی: ۳۶۶/۱
بعض مؤرخین نے بایزید کو دمے اور خناق کا مریض بتایا ہے جبکہ مؤرخ اوزون نے عثمانیوں کے بعض قدیم مآخذ مثلاً تاریخ عاشق زادہ، تاریخ لطفی پاشا اور مؤرخ اورج بیگ کے حوالوں سے نقل کیا ہے کہ بایزید اپنی شکست، اسارت اور تذلیل پر نہایت دل گرفتہ تھا، چنانچہ اس نے اپنی انگشتری میں پوشیدہ زہر پھانک لیا جس سے اس کی حالت بگڑ گئی اور وہ چند دن بعد فوت ہو گیا۔ (تاریخ عثمانی: ۳۴۲/۱، ۳۴۳، مع حواشی) مگر بایزید کے مزاج کو دیکھتے ہوئے ایسا ہونا بعید نہیں۔

② تاریخ الدولة العلية، ص ۱۳۷

③ انباء الغمر: ۲۲۷/۲

④ انباء الغمر: ۴۹۲/۱

⑤ انباء الغمر فی ابناء العمر: ۲۲۵/۲ سنة ۸۰۵ھ

⑥ تاریخ عثمانی: ۳۶۸/۱

⑦ انباء الغمر: ۴۹۲/۱

اس کے عدل وانصاف کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

”وہ صبح سویرے ایک کھلی مجلس میں بیٹھتا۔ لوگ اتنے فاصلے پر اس کے سامنے کھڑے ہوتے کہ وہ انہیں دیکھ سکتا۔ جس پر کوئی زیادتی ہوئی ہوتی وہ فریاد پیش کرتا اور بایزید اسی وقت اس کا ازالہ کر دیتا۔ اس کی مملکت میں امن وامان کا یہ حال تھا کہ کوئی اپنا سامان کہیں بھی رکھ کر چلا جاتا، اسے کوئی نہیں چھیڑتا تھا۔“[①]

ایک عجیب واقعہ:

اس سلسلے میں ابن عرب شاہ نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک جنگی سفر میں بایزید کے کسی مقرب افسر کو پیاس لگی، پانی نہ ملا تو قریبی بستی کی ایک عورت سے پانی مانگا۔ اس نے بتایا کہ پانی نہیں ہے۔ افسر نے دیکھا کہ عورت کے پاس ایک برتن میں دودھ رکھا ہے۔ اس نے جلدی سے وہ دودھ پی لیا۔ عورت نے شور مچا دیا اور کہا کہ یہ دودھ بچوں کے لیے تھا۔ وہ سیدھی بایزید کے پاس آئی اور فریاد کی۔ بایزید نے اس افسر کو بلا کر باز پرس کی۔ وہ مکر گیا اور کہا کہ بڑھیا جھوٹ بولتی ہے۔ بایزید نے عورت سے کہا: ”میں اس افسر کا پیٹ چیر کر دیکھتا ہوں۔ اگر دودھ نکلا تو تجھے اس کی قیمت ادا کر دوں گا، نہ نکلا تو اس کے بدلے تجھے قتل کروں گا۔“

عورت کہنے لگی: ’اللہ کی قسم! میں جھوٹی نہیں۔ مگر میں اسے قتل نہیں کرانا چاہتی۔ میں مقدمہ واپس لیتی ہوں۔‘

بایزید بولا: ”انصاف تو ہو کر رہے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے تلوار سے افسر کا پیٹ چیر دیا۔ خون کے ساتھ ساتھ معدے سے دودھ کے قطرے بھی نکلے۔ اس نے بڑھیا کو دودھ کی قیمت دے کر واپس بھیجا اور لشکر میں اعلان کرا دیا کہ جو میری مملکت میں بغیر اجازت کے کسی کی چیز لے گا، اسے یہی سزا دی جائے گی۔“[②]

تیمور کا انجام:

بایزید کی موت کے بعد تیمور زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ وہ اپنے پایۂ تخت سمرقند لوٹ گیا۔ بایزید کے خلاف لشکر کشی نے اسے عالم اسلام میں بہت بدنام کر دیا تھا۔ نیک نامی حاصل کرنے کے لیے اس نے سمرقند میں ایک نہایت شاندار جامع مسجد تعمیر کرانا شروع کی۔ اس کے بعد زندگی میں پہلی بار کسی غیر مسلم مملکت پر چڑھائی کی تیاریاں کیں اور چین کا رخ کیا۔ مگر اس کے نصیب میں یہ سعادت نہیں تھی۔ دریائے سیحون کے کنارے اس کے لشکر کو شدید برف باری کا سامنا کرنا پڑا۔ مجبوراً لشکر کشی روک دی گئی۔ کچھ دنوں بعد ۷ اشعبان ۸۰۷ھ کو تیمور اس مہم کو ادھورا چھوڑ کر فوت ہو گیا۔[③]

---

① انباء الغمر: ۲/ ۷/ ۲۲ سنۃ ۸۰۵ھ

② عجائب المقدور، ص ۲۶۶، ۲۶۷

نوٹ: یہ واقعہ نقل کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ ہم بایزید کے اس فیصلے کو شرعاً جائز قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ بھی ایک انتہا تھی کہ خیانت کی سزا موت کی صورت میں دی جائے۔ مقصد فقط یہ بتانا ہے کہ بایزید عوام پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی قطعاً برداشت نہیں کرتا تھا۔

③ عجائب المقدور، ص ۳۴۸

تیمور نے بایزید کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ اس کی شخصیت کو مزید داغ دار بنا دیتا ہے۔ اگر اس میں ذرا وسعتِ ظرفی ہوتی تو اس عظیم فتح کے شکرانے میں وہ اسے آزاد کر دیتا۔ مسلم فاتحین غیر مسلم بادشاہوں کو بھی احسان کر کے آزاد کرتے رہے ہیں جیسا کہ سلطان الپ ارسلان نے قیصر ارمانوس دیو جانس سمیت کئی رومی شہزادوں کو گرفتاری کے بعد باعزت طور پر واپس بھیجا تھا اور جیسا کہ خود بایزید نے جنگِ نکوپولس کے بعد ۲۷ غیر مسلم حکمرانوں اور نوابوں کو رہا کر دیا تھا۔ صد افسوس کہ تیمور نے ایک معاصر مسلم بادشاہ کے ساتھ بھی ایسا سلوک نہیں کیا۔

کیا بایزید کو پنجرے میں رکھا گیا تھا؟

مختلف روایات میں منقول ہے کہ تیمور نے بایزید کو پنجرے میں رکھا تھا۔ جبکہ بعض جدید مؤرخین جو تیمور کی بایزید سے بدسلوکی کی روایات کو مسترد کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ بایزید کو پنجرے میں نہیں فقط حراست میں رکھا گیا تھا۔ پنجرے کا ذکر فقط افسانہ ہے۔ تاہم تاریخ میں بایزید کو پنجرے میں رکھنے کا ذکر موجود ہے۔ مؤرخ قرمانی لکھتا ہے:

"ووقع السلطان فی القفص."[1]

(سلطان پنجرے میں قید ہو گیا۔)

بعض حضرات "قفص" کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ بایزید کو پنجرے میں نہیں بلکہ پالکی میں رکھا جاتا تھا جس پر حفاظتی سلاخیں یا لوہے کی حفاظتی جالی لگی ہوتی تھی مگر تیمور کے مخالفین نے تعصب کی بناء پر اسے پنجرے سے تعبیر کر دیا۔

اس توجیہ کی کمزوری کسی سے مخفی نہیں۔ بھلا پنجرہ اور کس چیز کا نام ہے؟ پنجرے کی ماہیت من وعن یہاں موجود ہے تو اسے پنجرے سے تعبیر نہ کیا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ وہ عام پنجروں سے ذرا بہتر اور باسہولت پنجرہ تھا مگر تھا تو پنجرہ ہی۔ اسے کیا تیمور کے احسانات میں شمار کیا جائے گا؟

بعض لوگ یہاں تاویل کر کے "قفص" سے مجازی مطلب یعنی قید مراد لینے لگے ہیں۔ اگر یہ تاویل مان لی جائے تب بھی تیمور بے قصور نہیں ٹھہرتا۔ آخر یورپ سے نبرد آزما مجاہد بادشاہ کو خواتین سمیت قیدی بنانا کونسا کارِ ثواب تھا؟

تیمور کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ وہ بایزید کو باعزت طور پر آزاد کر دیتا۔ بایزید سے کبھی بھی یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ یورپ کی مہمات چھوڑ کر مغل سلطنت پر چڑھائی کرتا۔ بایزید پہلے بھی کبھی تیمور کے علاقے پر حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ تیمور سلطنتِ عثمانیہ میں گھسا تھا۔ اگر تیمور شرافت برتتے ہوئے بایزید کو چھوڑ دیتا تو تاریخ اسے وسیع الظرف حکمرانوں میں شمار کرتی۔ مگر افسوس کہ اسے اس خیر کی توفیق نہ ہوئی۔

ہاں تیمور نے اتنا ضرور کیا کہ بایزید کے بیٹوں کو اپنا باج گزار بنا کر اناطولیہ کے کچھ حصے پر باقی رہنے دیا۔[2] یوں سلطنتِ عثمانیہ بالکل مٹنے سے بچ گئی اور اسی باقی ماندہ اقتدار کے بل پر اس نے از سرِ نو عروج حاصل کیا۔

---

① اخبار الدول: ۳ر۲۰

② تاریخ عثمانی: ۱ر۳۶۱

بایزید کے کردار پر چند سوالات:

بایزید یلدرم کے بارے میں یورپی مؤرخین اور مستشرقین نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ شرابی اور بدکار انسان تھا مگر یہ محض پروپیگنڈا ہے۔ اس دور کی کسی تاریخ میں اس کا ثبوت نہیں۔ اس کے برعکس اس کے معاصر مؤرخ ابن عرب شاہ (۷۹۱ھ۔۸۵۴ھ) کا کہنا ہے:

"انه کان من الملوک العادلین و عنده تقویٰ و صلابة فی الدین."

(بلاشبہ وہ عادل حکمرانوں میں شامل تھا۔ وہ پرہیزگار اور دین داری میں پختہ تھا۔) [1]

ہاں اس میں بعض خامیاں تھیں مثلاً یہ کہ طبیعت میں تیزی اور جلد بازی تھی جیسا کہ ابن عرب شاہ نے لکھا ہے:

"اس میں گھڑی بھر صبر نہ تھا، وہ گفتگو کرتے ہوئے دربار کے درمیان سے کنارے تک تیز تیز چلتا رہتا۔" [2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اناطولیہ جانے والے ایک مصری سفیر کے حوالے سے نقل کیا ہے:

"کان یصنع من الشهوات ما اراد."

(بایزید جو چاہے خواہشات پوری کرتا تھا۔) [3]

تاہم یہاں واضح طور پر مے نوشی یا بدکاری کا ذکر نہیں۔ شہوات پوری کرنا مباح دائرے میں بھی ہو سکتا ہے۔ ہاں بعض شواہد سے یہ پتا چلتا ہے کہ بایزید کے رہن سہن میں کچھ خلافِ شرع چیزیں شامل تھیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ بایزید کے ہاں حمام کا حوض اور کھانے پینے کے برتن چاندی کے تھے۔ [4]

اگر یہ بیان درست ہے تو یقیناً ایسا کرنا شرعاً غلط تھا اور بلاشبہ ایسی غلطیاں نصرتِ الٰہیہ سے محرومی کا سبب بن جاتی ہیں۔ تاہم اس سے مے نوشی اور حرام کاری تک بات بڑھا دینے کی گنجائش نہیں دکھائی دیتی جسے یورپی مؤرخین شہرت دیتے رہے ہیں اور مستشرقین سے نقل کردہ مواد کے ذریعے یہ بات گزشتہ دو صدیوں کے اسلامی لٹریچر کا بھی حصہ بن گئی ہے۔ اسی طرح بایزید کی بیگمات میں یورپی شہزادیوں کی موجودگی اور جنگِ انقرہ میں اس کی منصوبہ بندی میں بعض کمزوریاں نکل آنے سے بھی اس کا شرابی کبابی ہونا ثابت نہیں ہو جاتا۔ [5]

❁❁❁

---

① عجائب المقدور، ص ۲۵۱

② عجائب المقدور، ص ۲۵۱

③ انباء الغمر: ۲/ ۲۲۶

④ انباء الغمر: ۲/ ۲۲۶

⑤ یاد رہے کہ ہم ثبوت کی نفی کر رہے ہیں، امکان کی نہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس کے گناہوں میں مبتلا ہونے کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ تاہم جب تک پختہ تاریخی حوالے یا مضبوط قرائن نہ ملیں، کسی تاریخی شخصیت کے بارے میں ایسی رائے قائم کر لینا درست نہیں۔ ہمارے نزدیک مسلم حکمرانوں کی برائیوں کے ثبوت کا کم از کم معیار یہ ہے کہ ان کے معاصر یا قریبی دور کے مسلمان راویوں نے انہیں نقل کیا ہو اور ان سے معارض کوئی زیادہ قوی روایت موجود نہ ہو۔ بایزید کے بارے میں ہمیں ایسی کوئی شہادت نہیں ملی۔ اس لیے ہم اس الزام کو قبول نہیں کر سکتے۔

خانہ جنگی کا زمانہ

۸۰۵ھ تا ۸۱۶ھ

(۱۴۰۳ء تا ۱۴۱۳ء)

جنگِ انقرہ میں بایزید یلدرم کی گرفتاری کے بعد بایزید کا قائم کردہ متحدہ اناطولیہ کئی ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا۔ کچھ حصے تیمور کی سخاوت کی نذر ہوگئے کہ اس نے بہت سے علاقے ان سلجوقی اور ترکمان امراء کو واپس کردیے جو پہلے اناطولیہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مالک تھے۔ قرہ مانی جنہیں بایزید نے اقتدار سے بے دخل کرکے بورصہ میں قید کر رکھا تھا، تیمور کے حکم سے آزاد کردیے گئے اور انہیں ان کا علاقہ لوٹا دیا گیا۔ بنو کرمیان، بنو صاروخان، بنو منتشا، بنو اسفندیار اور بنو حمید دوبارہ اپنے آبائی علاقوں میں تیمور کے باج گزار حاکم بن گئے۔ کچھ علاقوں میں تیمور نے نئی ریاستیں قائم کردیں۔ یوں اس خطے میں متعدد ریاستیں، کئی حکمران اور درجنوں امراء سامنے ابھر آئے۔[1] اناطولیہ میں عثمانیوں کی اس تباہ حالی کو دیکھ کر ''رومیلی'' میں بھی بعض مقامات پر بغاوت ہوگئی[2] جن میں ہنگری، بلغاریہ، پولینڈ اور البانیہ نمایاں ہیں۔ البتہ یونان، جنیوا اور وینس کے نصرانی حسبِ سابق ان کے وفادار رہے[3] کیوں کہ عثمانیوں کا سلوک غیر مسلم رعایا کے ساتھ بہت بہتر تھا۔ ان علاقوں کے نصرانی جو آرتھوڈکس چرچ سے وابستہ تھے، کیتھولک چرچ کے پیروکار بادشاہوں اور پادریوں کی طرف سے ماضی میں ہمیشہ بدسلوکی کے شکار رہے تھے۔ مگر عثمانیوں نے مذہبی معاملات کے حوالے سے ان کے ساتھ احترام کا رویہ رکھا تھا، اس لیے وہ عثمانی سلطنت سے بہت خوش تھے اور یورپی بادشاہوں پر عثمانیوں کو ترجیح دیتے تھے۔[4] چنانچہ اتنے بدتر حالات میں بھی اکثر یورپی مقبوضات دولتِ عثمانیہ میں شامل رہے۔

عثمانی شہزادے تیمور کے باج گزار:

بایزید کا تیمور سے مطالبہ یہ تھا کہ وہ اس کے ولی عہد سلیمان پاشا کو اپنا نائب سلطنت مقرر کرے جبکہ تیمور نے اس کے تین بیٹوں کو نائب بنا کر ان کے مابین خانہ جنگی کا بیج بو دیا۔ بعد میں چوتھا بیٹا بھی اس کش مکش کا حصہ بن گیا۔

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۱۳، تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۵۹، ۳۶۰

② تاریخ الدولۃ العلیہ، ص ۱۴۷ ...... بتایا جا چکا ہے کہ رومیلی کا اطلاق سلطنتِ عثمانیہ کے یورپی مقبوضات پر ہوتا ہے۔

③ فی اصول التاریخ العثمانی، ص ۵۹

④ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۷۰

یوں تیمور مستقبل میں عثمانیوں کے جوابی حملے سے بے خوف ہو گیا۔

بایزید کے ان بیٹوں کا حال بالترتیب یہ ہے:

① **سلیمان پاشا:** سلیمان پاشا سب سے بڑا تھا جسے بایزید نے ''رومیلی'' میں اپنا پایۂ تخت ایڈریانوپل سونپا ہوا تھا۔ وہ باپ کی مدد کے لیے جنگِ انقرہ میں شامل ہوا مگر آخر میں فرار ہو گیا اور ایڈریانوپل جا کر دم لیا۔ تیمور نے اسے اپنا حلقہ بگوش بننے کی دعوت دی جسے سلیمان پاشا نے قبول کر لیا۔ ①

سلیمان پاشا ایڈریانوپل میں سلطان کے طور پر حکومت کرنے لگا۔ اس کے باقی بھائی اپنی خودمختاری کے اعلان کے باوجود اسی کو سلطان مانتے تھے مگر ان کی کوشش تھی کہ اس کی حدودِ سلطنت مزید پھیلنے نہ پائیں، اس لیے باہم تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے۔ ②

جنگِ انقرہ کے دوران قُسطَنطِینِیَّہ کا تاجدار قیصر منوئیل دوئم نصرانی بادشاہوں سے بایزید کے خلاف مدد لینے یورپ گیا ہوا تھا۔ بایزید کی شکست کی خبر سنتے ہی وہ واپس روانہ ہو گیا۔ اس کی واپسی تک عثمانیوں کے پایۂ تخت ایڈریانوپل میں سلیمان پاشا تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس وقت قیصر اور سلیمان دونوں کمزور تھے اور اپنی اپنی حکومت بچانا چاہتے تھے چنانچہ دونوں کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت سلانیک اور بحیرۂ اسود کے ساحلی مقبوضات قیصر کو دے دیے گئے اور طے پایا کہ اس کے بدلے قیصر سلیمان پاشا کو اس کے بھائیوں کے خلاف مدد فراہم کرے گا۔ ③

سلیمان کے کہنہ مشق امراء اس معاہدے کے خلاف تھے مگر ان کی ایک نہ چلی۔ دراصل سلیمان ایک عالم فاضل آدمی ہونے کے باوجود عیش و تنعم کا عادی اور قوتِ ارادی سے عاری تھا۔ اس کا وزیرِ اعظم جاندار علی پاشا ایک جہاندیدہ شخص تھا اور سلطنت کو متحد و مستحکم کرنے کے حوالے سے نہایت فکر مند تھا مگر سلیمان اس صائب الرائے شخص سے قطعاً کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ ④

② **عیسیٰ:** جنگِ انقرہ کے بعد بایزید کا منجھلا لڑکا عیسیٰ اناطولیہ کے شہر بالکیسری میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ بعد میں وہ بورصہ پر بھی قابض ہو گیا تھا جو گزشتہ صدی میں عثمانیوں کا پایۂ تخت تھا۔ اس نے بھی تیمور کی سرپرستی قبول کر لی چنانچہ تیمور نے سمرقند واپس جاتے ہوئے اسے حکومت کا پروانہ بھیج دیا۔ ⑤

---

① تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۷۰

② تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۱۳

③ معاہدے میں قیصر کا پلہ بھاری تھا اس لیے اس کی خواہش پر سلیمان نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی قاسم کو جو ابھی بچہ تھا، یرغمالی کے طور پر قیصر کے حوالے کر دیا۔ مستشرق شارل دیل نے مغربی مؤرخ دوکاس کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ قاسم کو قیصر نے اپنے انداز سے تعلیم و تربیت دلوائی جس کے نتیجے میں وہ یونانی زبان کا ماہر بن گیا اور اس زبان و ادب کے اثرات کے باعث وہ نصرانی ہو گیا۔ ۱۴۱۷ء میں اس کی وفات ہوئی اور اسے ایک گرجے کے احاطے میں دفنایا گیا۔ (تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۷۳، ۳۷۴ کے حواشی) مگر ضروری نہیں کہ یہ بات قابلِ وثوق ہو کیوں کہ دوکاس کی تاریخ میں متعدد واقعات وضعی ہیں۔

④ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۷۰

⑤ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۶۱، ۳۶۲

③ **موسیٰ:** انہی دنوں بایزید کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا موسیٰ جو اس کے ساتھ قید تھا، تیمور کی اجازت سے باپ کی لاش کو لے کر روانہ ہوا تاکہ بورصہ میں اس کی تدفین کی جائے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی اس کی اپنے بھائی عیسیٰ کے ساتھ (جو بورصہ کا حکمران تھا) کش مکش شروع ہوگئی۔ ابتداء میں موسیٰ نے عیسیٰ کو بورصہ سے بھگانے میں کامیابی حاصل کرلی مگر عیسیٰ نچلا بیٹھنے والا نہ تھا۔ اس نے بورصہ کی بازیابی کے لیے ایک لشکر مرتب کر کے یلغار کی، موسیٰ اس کی تاب نہ لاسکا اور فرار ہوکر کوتاہیہ میں بنو کرمیان کے پاس پناہ گزین ہوگیا جہاں کا امیر یعقوب بیگ اس کا ماموں تھا۔ کچھ دنوں بعد وہ بنو قرہ مان کے ہاں چلا گیا۔ باپ کی حنوط شدہ نعش اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ [1]

④ **محمد چلپی:** چھوٹا لڑکا محمد چلپی اناطولیہ کے شمال مشرقی شہر ''اماسیا'' میں تھا۔ اس نے بڑی حکمت، تدبیر اور ہوشیاری کے ساتھ توقات، سیواس اور جانیک بھی اپنی عمل داری میں شامل کرلیے۔ یوں ایک اچھا خاصا علاقہ اس کے قبضے میں آگیا۔ تیمور نے اسے بھی حکمرانی کی سند بھیج دی۔ [2] بنو آیدین اور بنو کرمیان نے بھی اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ [3]

خانہ جنگی کا نوسالہ دور: ۸۰۵ھ تا ۸۱۶ھ (۱۴۰۲ء سے ۱۴۱۳ء)

تیمور عثمانی سلطنت کو جس طرح محدود اور منقسم کر کے گیا تھا، اس کا فطری نتیجہ سلطنت کی بدحالی اور کمزوری تھا، چنانچہ اس باقی ماندہ علاقے پر کئی دشمنوں کی نگاہیں تھیں اور وہ عثمانیوں کو بالکل نیست و نابود کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ پھر تقسیم سلطنت نے خود بایزید کے بیٹوں کو آپس میں آمادۂ پیکار کردیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ وہ باقی ماندہ پوری سلطنت کا حاکم بن جائے۔ یہ کام وہ اپنے سب سے بڑے دشمن تیمور کی سرپرستی میں کر رہے تھے۔ خطرہ تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ ان بھائیوں کی خانہ جنگی کے سبب چند سالوں میں ختم ہوجائے گی۔ مگر ایسے میں محمد چلپی (جسے محمد اوّل کہا جاتا ہے) ایک اولوالعزم شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا اور اس نے گیارہ سال کی جدوجہد کے بعد عثمانی سلطنت کو دوبارہ متحد کردیا۔

عیسیٰ اور محمد چلپی کی کش مکش:

اناطولیہ میں ایک طرف عیسیٰ تھا، دوسری طرف محمد۔ عیسیٰ کے پاس بورصہ اور بالکیسری تھے جبکہ محمد چلپی کے پاس اماسیا اور سیواس۔ دونوں میں کش مکش شروع ہوگئی۔ محمد چلپی نے عیسیٰ کو صلح کی پیش کش بھی کی اور تجویز دی کہ ہم ایشیائی مقبوضات باہم تقسیم کرلیتے ہیں، مگر عیسیٰ سارا علاقہ لیے بغیر راضی ہونے والا نہ تھا۔ آخر ''اولوباد'' کے میدان میں دونوں کی جنگ ہوئی جس میں عیسیٰ شکست کھا کر فرار ہوگیا۔

---

① تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۷۳
② تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۷۵
③ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۱۴

محمد چلپی نے فتح کے بعد بورصہ پر قبضہ کرلیا، ازنیق بھی اس کی عملداری میں آ گیا۔ اس کا دوسرا بھائی موسیٰ اب تک یعقوب بیگ کے ہاں پناہ گزین تھا۔ محمد چلپی نے یعقوب بیگ کو پیغام بھیجا کہ تم موسیٰ کو میرے باپ کی نعش کے ساتھ بھیج دو۔ چنانچہ موسیٰ بایزید یلدرم کی نعش کا تابوت لیے بورصہ پہنچا جہاں محمد چلپی نے جامع مسجد کے قریب سرکاری شفاخانے کے سامنے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کی تدفین کی۔ [1]

عیسیٰ اور سلیمان کا اتحاد۔ عیسیٰ کی شکست اور موت:

اس دوران عیسیٰ بھاگ کر بڑے بھائی سلیمان کے پاس ایڈریانوپل پہنچ چکا تھا اور اسے محمد چلپی کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ اس کی کوشش کامیاب رہی اور کچھ عرصے بعد وہ سلیمان پاشا کی مدد سے اچھی خاصی فوج تیار کر کے دوبارہ اناطولیہ میں داخل ہوگیا۔ ایک بار پھر محمد چلپی اور عیسیٰ میں جنگیں شروع ہوئیں۔ کئی معرکوں میں یکے بعد دیگرے شکست کھانے کے بعد عیسیٰ ایسکی شہر میں روپوش ہوگیا مگر محمد چلپی کے کارندوں نے اس کا کھوج لگالیا اور اسے قتل کر کے لاش بورصہ پہنچادی جہاں اسے اس کے اجداد کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ [2]

محمد چلپی اور سلیمان پاشا کی محاذ آرائی۔ سلیمان پاشا کی اناطولیہ پر یلغار:

اب سلطنتِ عثمانیہ کے دو دعوے دار رہ گئے: اناطولیہ میں محمد چلپی تھا اور یورپ کے ساحل پر سلیمان پاشا۔ مناسب تھا کہ ایک بھائی اناطولیہ کو سنبھالتا اور دوسرا ''رومیلی'' کو۔ مگر سلیمان پاشا نے محمد چلپی کی سرکوبی ضروری سمجھی اور لشکر لے کر اناطولیہ پہنچ گیا۔ محمد چلپی اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے بورصہ چھوڑ دیا اور پسپا ہو کر اماسیہ میں مورچہ بند ہوگیا۔ سلیمان پاشا نے پیش قدمی کر کے بورصہ پر قبضہ کرلیا۔ [3]

سلیمان پاشا کا انقرہ پر قبضہ:

سلیمان پاشا نے جلد ہی انقرہ پر یلغار کی اور کسی مزاحمت کے بغیر اسے بھی فتح کرلیا۔ یہاں وہ موسمِ گرما گزارنے لگا اور حسبِ عادت عیش و آرام میں منہمک ہوگیا۔ محمد چلپی نے موقع غنیمت جانا اور لشکر لے کر بورصہ کی طرف کوچ کر دیا۔ یہ اطلاع سلیمان پاشا کو ملی تو وہ گھبرا گیا اور اناطولیہ سے بھاگنے کی سوچنے لگا۔ تاہم وزیراعظم جاندار علی پاشا نے اسے حوصلہ دلایا جس پر وہ بھی لشکر لے کر نکل پڑا۔ آخر بورصہ کے قریب دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے۔ علی پاشا خونریزی کے بغیر مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے محمد چلپی کو مراسلہ بھیج کر اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا اور کہا کہ آپ کے بعض افسران سلیمان سے ملے ہوئے ہیں، جنگ ہوتے ہی وہ آپ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے، اس لیے صلح کر لیجیے۔ محمد چلپی نے اس پیغام کی کوئی پروا نہ کی۔ تاہم جلد ہی اس کا ایک افسر غداری کر کے سلیمان پاشا کے پاس چلا گیا جس

---

[1] تاریخ عثمانی: ۱/۳۷۵، ۳۷۶

[2] تاریخ عثمانی: ۱/۳۷۹، ۳۷۷، ۳۷۸

[3] تاریخ عثمانی: ۱/۳۷۸

سے علی پاشا کے پیغام کی سچائی ثابت ہوگئی۔ آخر محمد چلپی اپنا لشکر لے کر اماسیا واپس چلا گیا اور جنگ ٹل گئی۔ ①

سلیمان کی بے تدبیری اور بنوقرہ مان کا محمد چلپی سے اتحاد:

سلیمان پاشا بظاہر اناطولیہ میں غالب طاقت کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اسی زعم میں اس نے بلا تاخیر آس پاس کی ریاستوں کو دبانے کی کوشش شروع کر دی جن میں بنوقرہ مان سرِفہرست تھے۔ یہ دیکھ کر امرائے بنوقرہ مان محمد چلپی سے ملے اور اس کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ ②

موسیٰ کا رومیلی پر حملہ اور سلیمان پاشا کی واپسی:

محمد چلپی نے اس معاہدے کے ذریعے شہزادہ موسیٰ کو جو بنوقرہ مان کے ہاں یرغمال تھا، آزاد کرا لیا اور اسے ایک لشکر کا سپہ سالار مقرر کر کے رومیلی پر یلغار کی ذمہ داری سونپ دی تاکہ سلیمان پاشا یہ دیکھ کر واپسی پر مجبور ہو جائے اور اناطولیہ کو اس سے نجات مل جائے۔ چنانچہ موسیٰ امیر بنوقرہ مان کے چھوٹے بھائی کو ہمراہ لے کر محمد چلپی کی فوج کی قیادت کرتے ہوئے ''سینوپ'' کے ساحل سے کشتیوں پر بیٹھا اور یورپ کے ساحل پر اتر گیا۔ سلیمان پاشا کو جونہی یہ اطلاع ملی، وہ اپنے پایۂ تخت ایڈریانوپل کو خطرے میں سمجھ کر تیزی سے سمندر عبور کر کے رومیلی واپس چلا گیا۔ یوں اناطولیہ میں محمد چلپی کا راستہ صاف ہو گیا۔ ③ اناطولیہ میں سلیمان پاشا کا قیام فقط چار ماہ رہا۔ ④ اس دوران (۸۰۹ھ میں) اس نے رسم کے مطابق وہاں اپنے باپ کی قبر پر ایک مزار تعمیر کرا دیا۔ ⑤ اناطولیہ میں قیام کے آخری دنوں میں سلیمان پاشا کے وزیر جاندار علی پاشا کی وفات ہو گئی اور وہ ایک بہترین مشیر سے محروم ہو گیا۔ ⑥

موسیٰ کے مقابلے میں سلیمان پاشا کی شکست:

موسیٰ نے ''رومیلی'' پہنچ کر افلاق (رومانیا)، سربیا اور بلغاریہ کے نصرانی امراء کو بھی ساتھ ملا لیا کیوں کہ اس کا سلیمان سے ٹکراؤ ناگزیر تھا۔ اُدھر سلیمان نے بھی بھرپور تیاری کر لی اور قیصر کی فوج کی کمک لے کر مقابلے پر نکلا۔ آخر دونوں میں جنگ چھڑ گئی جس کے دوران سربیا کا سپہ سالار ''ووگ'' جو شاہِ سربیا ڈسپوٹ کا بھائی تھا، غداری کر کے سلیمان پاشا سے جا ملا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ موسیٰ کو میدان چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ سلیمان نے فتح کے غرور میں دور اندیشی نہ برتی اور موسیٰ کے دوبارہ حملے سے بے خبر ہو کر حسبِ عادت عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔

اُدھر موسیٰ نے پہلے سے بڑھ چڑھ کر تیاری کی اور دوبارہ چڑھائی کی۔ صوفیہ کے قریب اس نے سلیمان کی فوج کو شکست دی اور تیزی سے پایۂ تخت ایڈریانوپل کی طرف بڑھا۔ اُدھر سے پایۂ تخت کی فوج بھی دفاع کے لیے باہر نکل آئی۔ قسطنطینیہ اور ایڈریانوپل کے درمیان ایک وادی میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا اور جھڑپیں شروع

① تاریخ عثمانی: ۳۷۹،۳۷۸/۱
② تاریخ عثمانی: ۳۷۹/۱
③ تاریخ عثمانی: ۳۸۰،۳۷۹/۱؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ: ص ۱۴۸
④ تاریخ عثمانی: ۳۸۰/۱
⑤ تاریخ عثمانی: ۳۷۶/۱
⑥ تاریخ عثمانی: ۳۸۰،۳۷۹/۱

ہو گئیں۔ سلیمان اس وقت نہایت غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسباب تعیش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب
اسے صورتحال کی تشویش ناکی سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی تو اس نے طیش میں آ کر ینی چری افسرِ اعلیٰ حسن آقا کی
ڈاڑھی منڈوا دی۔ اس بدسلوکی سے اس کے افسران بھی خفا ہو گئے۔ حسن آقا ینی چری جوانوں کو لے کر موسیٰ سے آملا۔
جب سلیمان نے یہ صورتحال دیکھی تو مزاحمت بے سود سمجھ کر قیصر کے پاس پناہ لینے قُسطَنطِینیّہ روانہ ہو گیا مگر
راستے میں بعض دیہاتیوں نے اسے پکڑ کر قتل کر دیا۔ یہ واقعہ یکم محرم ۸۱۳ھ (۱۸ مئی ۱۴۱۰ء) کا ہے۔ اس کی نعش کی
تدفین بورصہ میں اس کے آبائی قبرستان میں کی گئی۔ اس کی عمر ۳۵ سال تھی اور مدتِ حکومت آٹھ سال۔ ①

چونکہ وہ بڑا بھائی تھا لہٰذا خود کو تخت کا جائز وارث سمجھتا تھا مگر اس کا سلوک اپنی فوج سے اچھا نہیں تھا۔ اس کی ناکامی
کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ وہ کسی کا مشورہ نہیں مانتا تھا اور ماتحتوں کی تحقیر کا عادی تھا۔ اس لیے اس کے اپنے وفادار اس
سے بددل ہو گئے تھے۔ ②

موسیٰ کی خودمختاری۔ سربیا اور قُسطَنطِینیّہ پر حملے:

موسیٰ، محمد کا نائب تھا مگر ایڈریانوپل پر قابض ہونے کے بعد اس نے خودمختاری کا اعلان کر دیا اور بادشاہ بن کر اپنے
نام کا سکہ جاری کر دیا۔ اس نے جلد ہی سربیا پر فوج کشی کی کیوں کہ اس کی فوج نے غداری کر کے سلیمان پاشا کا ساتھ
دیا تھا۔ اس حملے میں موسیٰ نے سربوں کو شکستِ فاش دی اور شاہِ سربیا کے بھائی ''ووگ'' کو غداری کی پاداش میں قتل
کر دیا۔ تاہم شاہِ ہنگری نے موسیٰ کو سربیا سے نکالنے کے لیے حملہ کر دیا۔ موسیٰ کو مہم ادھوری چھوڑ کر واپس ہونا پڑا۔

موسیٰ ان مہمات کے بعد حد سے زیادہ خود اعتمادی میں مبتلا ہو گیا تھا، اس لیے اس نے ایڈریانوپل کو پایۂ تخت بنا
کر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ موسیٰ کہتا تھا کہ تیمور کو میرے باپ کے خلاف فوج کشی پر اکسانے کا بڑا مجرم قیصر
ہے۔ چنانچہ اس نے جلد ہی قُسطَنطِینیّہ کو گھیر لیا۔ یہاں چڑھائی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قیصر منوئیل سلیمان پاشا کا
اتحادی تھا اور اس نے سلیمان پاشا کی حمایت کے بدلے اس سے عثمانیوں کے کئی اہم مقبوضات ہتھیائے تھے اور اب وہ
عثمانیوں کو خراج دینے سے انکاری تھا۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر موسیٰ نے قُسطَنطِینیّہ کو گھیر لیا۔ ③

محمد اور موسیٰ کی جنگیں۔ موسیٰ کی شکست:

محمد اوّل استحکامِ ریاست کو بیرونی مہمات پر فوقیت دیتا تھا، اس کے خیال میں قیصر سے لڑنا ابھی سلطنتِ عثمانیہ کے
حق میں نقصان دہ تھا، اس لیے وہ موسیٰ کی فوج کشی کا مخالف رہا۔ مزید یہ کہ قیصر نے محمد اوّل سے خط و کتابت کر کے
اسے اپنی مدد پر آمادہ کر لیا۔ محمد اوّل قُسطَنطِینیّہ پہنچا اور موسیٰ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ یہ تاریخ کا بڑا عجیب منظر تھا کہ
وہ بایزید جس نے قُسطَنطِینیّہ کو سر کرنے کے لیے چار حملے کیے تھے، آج اس کے بیٹے اس شہر کے حوالے سے آمنے

---

① تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۸۲، ۳۸۳، مع حواشی؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۴۸
② دولتِ عثمانیہ: ۱/ ۷۴، ۷۵
③ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۸۴، ۳۸۵

سامنے تھے۔ ایک شہر پر قبضہ کرنے کے لیے کوشاں تھا اور دوسرا قیصر کا حامی بن کر شہر کو بچانا چاہتا تھا۔

یوں دونوں بھائیوں کی لڑائی سے قُسطنطینیہ کا محاصرہ کمزور پڑ گیا۔ آخر موسیٰ نے اناطولیہ کے ایک سردار کو محمد کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ اس بغاوت کی خبر سن کر محمد اوّل کو اناطولیہ واپس جانا پڑا۔ مگر اس نے زیادہ وقت نہ لگایا اور کچھ دنوں میں بغاوت کی سرکوبی کر کے پھر قُسطنطینیہ پہنچ گیا اور سربیا کے حاکم کو ساتھ حلیف بنا کر اسے موسیٰ کے خلاف فوج کشی پر آمادہ کر لیا۔ سربیا کو حملہ آور دیکھ کر موسیٰ قُسطنطینیہ کا محاصرہ ترک کر کے سربوں سے لڑنے سرحد پر پہنچ گیا۔ ادھر سے محمد نے بھی اس پر عقب سے حملہ کر دیا۔ صوفیہ کی جنوب مشرقی وادی 'ساما کوف' میں جنگ برپا ہوئی جس میں موسیٰ شکست کھا کر مارا گیا۔ اب محمد اوّل کے لیے میدان صاف تھا۔ اس نے ایڈریانوپل پر قبضہ کر لیا۔ یوں گیارہ سالہ خانہ جنگی اختتام کو پہنچی اور محمد اوّل بلا شرکتِ غیرے حکمران بن گیا۔ [1]

ان خانہ جنگیوں پر ایک تبصرہ:

عثمانی شہزادوں کی یہ باہمی لڑائیاں ہوسِ ملک گیری کا ایک عجیب نمونہ تھیں۔ بایزید کے بیٹے اتنی بڑی تباہی کے بعد بھی متحد نہ ہوئے، جبکہ وقت کا تقاضا تھا کہ وہ یک جان ہو کر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرتے۔ اس گیارہ سالہ کش مکش کا آغاز ایسی حالت میں ہوا تھا کہ ان کا باپ تیمور کی قید میں ذلت و نکبت کی زندگی گزار رہا تھا۔ ایسے میں بیٹوں کا باہم دست و گریباں ہونا انتہائی افسوس ناک تھا۔ اگر وہ متحد ہو جاتے تو ان گیارہ سالوں میں اپنی سلطنت کو غیر معمولی استحکام اور ترقی دے سکتے تھے۔ مگر حرصِ اقتدار نے انہیں خانہ جنگی پر آمادہ کیے رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ ۸۰۷ھ میں جب تیمور ایک بہت بڑی سلطنت چھوڑ کر دنیا سے جا رہا تھا تو اسے اطمینان تھا کہ اس کا کوئی دشمن باقی نہیں بچا۔

مگر اس صورتحال کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ تیمور نے یہ عظیم سلطنت جبر و تشدد اور قتلِ عام کے ذریعے حاصل کی تھی۔ وہ جہانگیر ضرور تھا مگر جہانبان نہ تھا۔ پس اس کے دنیا سے رخصت ہونے کے دس بارہ سالوں کے اندر اندر عظیم تیموری سلطنت جو چین کی سرحدوں سے ترکی اور بحیرۂ ارال سے گنگا جمنا کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی تھی، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس کے برخلاف پارہ پارہ و شکستہ سلطنتِ عثمانیہ دس بارہ سال بعد ایک بار پھر اپنے قدموں پر استوار ہو کر نہایت تیزی کے ساتھ عروج کی طرف گامزن ہو گئی۔ عدل و انصاف اور ظلم و ستم کی حکمرانی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ عدل ایک زرخیز زمین میں بیج بونے کی مانند ہے اور ظلم صحرا میں ہل چلانے کی طرح ہے۔ اِدھر ابرِ کرم کے چند چھینٹے پڑیں تو زمین ہری بھری ہو جاتی ہے اور اُدھر موسلا دھار بارش بھی رائیگاں جاتی ہے۔

---

[1] تاریخ عثمانی: ۱/۳۸۶ تا ۳۹۰؛ تاریخ الدولة العلية، ص ۱۳۸؛ تاریخ الدولة العثمانيه: ۱/۱۱۵

محمد چلبی (محمد اوّل)

۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ

(۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۱ء)

محمد اوّل ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) میں بورصہ کو مرکز قرار دے کر باقاعدہ تخت نشین ہوا۔ وہ ۷۸۱ھ (۱۳۷۹ء) میں پیدا ہوا تھا۔ اقتدار سنبھالتے وقت اس کی عمر ۳۵ سال تھی۔ اس سے پہلے اس کا بھائی سلیمان پاشا ۷ سال تک ایڈریانوپل پر حکومت کر چکا تھا مگر یہ زمانہ خانہ جنگی میں گزرا تھا اس لیے اکثر مؤرخین سلیمان کو عثمانی سلاطین میں شمار نہیں کرتے اور محمد اوّل کو پانچواں عثمانی حکمران قرار دیتے ہیں۔ محمد اوّل کے سامنے ایک مردہ سلطنت کو زندہ کرنے کا چیلنج تھا۔ یہ کام بظاہر ناممکن لگتا تھا مگر محمد اوّل نے نہایت دور اندیشی اور منصوبہ بندی سے اس کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ اس کی سیاسی پالیسی کئی مرحلوں پر مشتمل تھی۔ پہلا کام سلطنتِ عثمانیہ کی باقیات کو ایک پرچم تلے لانا تھا جو وہ کر چکا تھا۔ دوسرا قدم اناطولیہ کے کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس لینا تھا۔ اس کے بعد وہ سلطنت کے استحکام پر توجہ دینا چاہتا تھا۔ لازم تھا کہ اس کمزوری کی حالت میں نئے دشمن نہ پیدا کیے جاتے بلکہ سابقہ حریفوں سے بھی باوقار صلح رکھی جاتی۔ چنانچہ اس نے قریبی یورپی ہمسایوں اور سمندر سے ملحقہ ریاستوں سے دوستانہ تعلقات میں کامیابی حاصل کی۔ [1]

اناطولیہ کی فتح:

محمد چلبی چند سال تک اناطولیہ کی ترکمان ریاستوں کو یکے بعد دیگرے اپنی سلطنت میں شامل کرتا رہا۔ اس نے ازمیر، امارتِ آیدن اور ریاستِ بنو جاندار کو سرنگوں کیا۔ پھر بنو جاندار اور بنو جرمیان کے جوانوں کو اپنی فوج میں شامل کر کے ریاست قرہ مان کی طرف بڑھا اور اسے مسخر کر کے وہاں کے حاکم محمد بیگ اوغلو دوئم کو جو اس کا پھوپھی زاد تھا، گرفتار کر لیا، تاہم وفاداری کا عہد لے کر اُسے آزاد کر دیا۔ تیمور نے قرہ مانیوں کو سیورے حصار اور آق شہر سمیت کئی بڑے شہروں کا مالک بنا دیا تھا۔ محمد چلبی نے یہ تمام علاقے دوبارہ سلطنتِ عثمانیہ سے ملحق کر لیے۔ اس نے مشرقی اناطولیہ کی بعض ایسی ریاستوں سے صلح کر لی جو تیمور کی سرپرستی میں قائم ہوئی تھیں۔

محمد چلبی کی ان کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے امرائے جرمیان، بنو تکہ اور بنو منتشا اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ یورپی

---

(1) تاریخ الدولة العلية، ص ۱۴۹

ریاستوں میں سے روڈس کے استادِ اعظم اور جنیوا کے رئیسوں نے بھی اس سے حلیفانہ تعلقات قائم کر لیے۔ [1]

الغرض محمد چلپی کے تدبر، سیاسی مہارت اور مستقل مزاجی کے باعث کسی بڑی خونریزی کے بغیر اناطولیہ کا بڑا حصہ دوبارہ عثمانیوں کے زیرِ سایہ آ گیا۔

بغاوتوں کا انسداد:

محمد چلپی کو قرہ مانیوں کی ریشہ دوانیوں سے دوبار سابقہ پڑا۔ ۸۱۸ھ (۱۴۱۵ء) میں امیر قرہ مان نے اس کے خلاف فوج کشی کی مگر شکست کھائی۔ محمد اوّل نے حلیف رہنے کے وعدے پر اسے معاف کر دیا۔ کچھ مدت بعد امیر قرہ مان نے دوبارہ بغاوت کی۔ اس بار بھی محمد اوّل نے اسے شکست دی اور حسبِ معمول معاف کر کے اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔

عثمانیوں کے ایک نامور امیر قرہ جنید نے بغاوت کر کے سمرنا (ازمیر) سمیت کچھ شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنی مستقل سلطنت قائم کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ محمد اوّل نے اُسے بھی زیر کر لیا۔ پھر حسنِ سلوک کرتے ہوئے اسے نائیکو پولی کا گورنر بنا دیا۔ [2]

شیخ بدرالدین کا فتنہ:

آلِ عثمان کے حکمران اور امراء تصوّف سے وابستہ تھے۔ وہ اولیائے کرام سے عقیدت رکھتے اور ان سے روحانی فیض حاصل کرنے کے مشتاق رہتے تھے۔ ان کی دینی تربیت میں مولانا روم رحمہ اللہ جیسے بزرگوں کے خانقاہی سلسلوں کا بڑا دخل تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض جعلی صوفی، عثمانیوں کی خوش عقیدگی سے فائدہ اٹھا کر بدعقیدگی پر مبنی تحریکیں چلانے میں کامیاب رہے۔ ایسی ایک تحریک شیخ بدرالدین کی تھی جسے ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء) میں بڑا عروج حاصل ہوا۔

بدرالدین کے افکار ملحدانہ تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام انسان چاہے وہ کسی بھی مذہب کے ہوں، بھائی بھائی ہیں اور مال و دولت میں سب کا حصہ برابر ہے۔ اس کے خیالات بڑی حد تک آج کل کی اشتراکیت یا قدیم ایرانی مزدکیت سے ملتے جلتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ حضور ﷺ کو دیگر انبیاء پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور ایمان کے لحاظ سے مسلمان اور یہودی برابر ہیں۔ اس تحریک سے لوگ تیزی سے متاثر ہو رہے تھے۔ خاص کر عیسائی، یہودی اور نومسلم اس کا شکار بن رہے تھے۔ ایک یہودی النسل شخص طورلاق کمال، بدرالدین کا خاص داعی تھا جس کی وجہ سے یہودی اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

محمد اوّل نے شاہِ بلغاریہ کے نومسلم بیٹے سمسان کو، اس فتنے کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ بدرالدین نے مقابلے میں اپنے نائب پیر قلیجہ مصطفیٰ کو روانہ کیا جس نے عثمانی افواج کو شکست دے دی۔ محمد اوّل کو اطلاع ملی تو دوسرا لشکر صدرِ اعظم بایزید پاشا کی قیادت میں بھیجا۔ ازمیر کے قریب جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں پیر قلیجہ گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ اس کے اکثر حامی تتر بتر گئے۔ فتنے کا سرغنہ بدرالدین مقدونیہ میں صف بندی کر رہا تھا۔ ایک زبردست جنگ کے بعد اُسے

---

(1) تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/۱۱۶، ۱۱۷؛ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۴۷ (2) تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۴۹

بھی شکست ہوئی۔ وہ خود پکڑا گیا اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔[1]

فضل اللہ تبریزی کا فتنہ:

فضل اللہ تبریزی بھی ایسا ہی ایک صوفی تھا جس نے زیادہ ہوشیاری سے اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ اس کا گروہ فرقہ حروفیہ کہلاتا تھا۔ فضل اللہ تبریزی کا ایک کفریہ عقیدہ یہ تھا کہ اللہ کسی برگزیدہ انسان میں حلول کر کے کائنات کا نظام چلاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے خاص مریدوں میں یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ اللہ اس میں حلول کر چکا ہے۔ یوں اس کے مرید اسے خدا ماننے لگے تھے۔ تبریزی کو تیمور لنگ کے بیٹے شہزادہ میران شاہ نے ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں قتل کرا دیا تھا تاہم اس کے خلفاء زیرِ زمین کام کر رہے تھے۔

ایسا ہی ایک خلیفہ سلطنتِ عثمانیہ کے امراء اور عام لوگوں کے سامنے عشق و معرفت کی باتیں کر کے انہیں متاثر کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے سلطان محمد چلپی کو بھی اپنا معتقد بنا لیا تھا۔ سلطان اسے خدا رسیدہ مانتا اور اس کی بڑی عزت کرتا تھا، اب تک اسے اس عقیدے کی خبر نہیں تھی مگر اس کا وزیر محمود پاشا حقیقت جانتا تھا اور سخت پریشان تھا کہ سلطان ایک بدعقیدہ پیر کا حلقہ بگوش بن چکا ہے۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ اگر پختہ ثبوت کے بغیر سلطان کے سامنے شکایت کی گئی تو سلطان ناراض ہو جائے گا۔

آخر ایک دن محمود پاشا نے پیر کی اپنے ہاں دعوت کی اور اس دوران اس سے بے حد عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر پیر سمجھا کہ اس کا جادو چل چکا ہے، لہٰذا اس نے محمود پاشا کو اپنے کفریہ عقائد تلقین کرنا شروع کر دیے۔ یوں اس کا کفر ثابت ہو گیا۔ سلطان کے بعض خاص امراء جو گواہی کے لیے پسِ پردہ بیٹھے تھے، سامنے آ گئے اور اس کی زبان کو لگام دی۔ اب پیر نے بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا اور سلطان کی اجازت سے اسے اس کے کئی ہم عقیدہ ساتھیوں سمیت قتل کر دیا گیا۔[2]

شہزادہ مصطفیٰ کا ظہور:

کچھ مدت بعد محمد کو ایک اور فتنے سے واسطہ پڑا۔ جنگِ انقرہ میں اس کا ایک بھائی مصطفیٰ لاپتا ہو گیا تھا۔ ۸۱۵ھ (۱۴۱۸ء) میں اُس نے اچانک ظاہر ہو کر دعویٰ کیا کہ بڑا بھائی ہونے کے ناطے باپ کا اصل وارث وہی ہے۔ نائیکوپولی کے گورنر قرہ جنید نے جسے محمد اول نے معاف کر کے گورنری بخشی تھی، اس کا ساتھ دیا اور قیصر منوئیل نے بھی اس کی مدد کی۔ یوں اس کے گرد ایک مضبوط فوج اکٹھی ہو گئی جس کی مدد سے اس نے ۸۲۲ھ میں درۂ دانیال کے پار گیلی پولی پر قبضہ کر لیا۔

محمد اول کو اطلاع ملی تو فوج لے کر مقابلے پر پہنچ گیا۔ سالونیکا کے قریب جنگ میں مصطفیٰ کو شکست ہوئی اور وہ قیصر منوئیل کے پاس جا کر پناہ گزین ہوا۔ محمد اول نے قیصر سے مطالبہ کیا کہ باغی کو اس کے حوالے کیا جائے مگر قیصر نے

---

① تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۴۹، ۱۵۰؛ تاریخ الدولة العثمانیه : ۱ / ۱۱۸

② نصرة اهل الایمان بدولة عثمان از شیخ محمد بن ابی السرور البکری م ۱۰۷۱ هـ، ص ۶۸، ۶۹

انکار کر دیا البتہ یہ وعدہ کیا کہ اسے نظر بند رکھا جائے گا بشرطیکہ اس کا خرچہ دیا جائے۔ محمد نے اسے قبول کر لیا۔ ①

بعض مؤرخین کے خیال میں یہ باغی کوئی بہروپیا تھا جس نے مصطفیٰ سے ملتی جلتی شکل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے طالع آزمائی کی تھی مگر یہ خیال کمزور ہے کیوں کہ اگر وہ جعلی شہزادہ ہوتا تو قرہ جنید جیسا پرانا ترک جرنیل اسے پہچان لیتا۔ محمد اوّل کا قیصر کو مصطفیٰ کی کفالت کا خرچ ادا کرتے رہنا بھی اس کا ثبوت ہے کہ وہ واقعی اس کا بھائی تھا ورنہ محمد اوّل ایک جعل ساز کا خرچہ اٹھانے کی زحمت ہرگز مول نہ لیتا۔

رومانیہ کے شہزادے سے کشیدگی اور صلح:

محمد چلپی کو نوآموز اور کمزور سمجھ کر ہنگری کا بادشاہ سیگسمنڈ جو اس زمانے میں جرمنی کا حکمران بھی بن چکا تھا، عثمانیوں سے جنگ کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ ویسے بھی ایک مدت سے سربیا، بوسنیا اور آسٹریا کے مختلف علاقوں کی تولیت پر ہنگری اور سلطنتِ عثمانیہ میں تنازعہ چلا آرہا تھا۔ نیز کچھ مدت قبل ایک نیا قضیہ یہ پیش آیا تھا کہ شاہِ ہنگری کے وفادار رومانیہ (افلاق) کے بادشاہ ''میرشا'' نے محمد چلپی کے باغی بھائی مصطفیٰ سے حلیفانہ معاہدہ کر لیا تھا جس کے ردِعمل میں اُس کا سخت مخالف رئیس ڈان محمد چلپی کا حلیف بن گیا تھا۔ سیگسمنڈ نے محمد سے مطالبہ کیا کہ ڈان سے تعلق ختم کیا جائے۔

ہرچند کہ محمد چلپی ان حالات میں یورپی طاقتوں سے کشیدگی نہیں چاہتا تھا مگر اس نامعقول مطالبے کو قبول کرنا بھی قومی وقار کے خلاف تھا۔ چنانچہ محمد چلپی نے انکار کر دیا۔ الغرض ہنگری نے میرشا کی اور دولتِ عثمانیہ نے ڈان کی حمایت جاری رکھی اور یوں کشیدگی بڑھ گئی

آخر میرشا اور ڈان میں ایک سخت جھڑپ ہوئی جس میں ڈان مارا گیا مگر میرچا کے لشکر کا سپہ سالار بھی قتل ہو گیا۔ میرشا نے دیکھا کہ بات بڑھ رہی ہے تو اپنے بیٹے کو محمد چلپی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا اور اس سے صلح کر لی۔ ②

شاہِ ہنگری سے جھڑپ:

۸۱۸ھ (۱۴۱۵ء) میں شاہِ ہنگری خود فوج لے کر نکلا مگر ''خرواتیا'' کی وادی ''ڈوبوج'' میں عثمانی جرنیل غازی اسحاق بیگ نے اسے روکا اور پسپا کر دیا۔ شاہِ ہنگری کو واپس ہوتا دیکھ کر بلقان میں عثمانیوں کے دشمن دب گئے اور ڈیوک ہرسک نامی نواب نے دولتِ عثمانیہ کی اطاعت قبول کر لی۔ ③

سراجیو کی تعمیر

غازی اسحاق بیگ نے اس سازگار ماحول میں بوسنیا کے صوبے سلوفینیا تک پیش قدمی کی۔ یہاں اس نے ایک چھوٹا قصبہ ''سرائے بوسنہ'' بھی فتح کیا جس کا محلِ وقوع اطراف سے پہاڑوں میں گھرے ہونے کے باعث بہت خوبصورت اور محفوظ تھا۔ عثمانی جرنیلوں نے طے کیا کہ بوسنیا کا مرکز یہی قصبہ ہونا چاہیے، چنانچہ وہاں بڑے پیمانے پر

---

① تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۵۱، ۱۵۲؛ تاریخ عثمانی از اوزون حقی: ۱/ ۳۱۵ تا ۳۱۷

② تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/ ۳۰۱ ③ تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/ ۱۱۷

تعمیرات شروع کرادی گئیں، جس کے نتیجے میں یہی قصبہ بوسنیا کا موجودہ دارالحکومت ''سرائیوو'' بنا۔ ①

سرحدی قلعوں کی تعمیر۔ رومانیہ اور ہنگری پر حملے۔ اسحاق بیگ کی شہادت:

محمد اوّل نے ہنگری اور رومانیہ سے کشیدگی کے بعد سرحدوں کی حفاظت پر زیادہ توجہ دینا ضروری سمجھا اور ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء) میں رُومانیہ کی سرحدوں پر دو مضبوط قلعے: ''تورنو'' اور ''یرکوئی'' تعمیر کرائے۔ محمد اوّل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شاہ ہنگری کو مرعوب کرنے کے لیے ٹرانسلفانیا پر ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء)، ۸۱۹ھ (۱۴۲۳ء) اور ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں یکے بعد دیگرے تین حملے کرائے۔ ان حملوں کی قیادت اس کا جرنیل غازی اسحاق بیگ کر رہا تھا۔

آخری حملے میں وہ ''سٹیریا'' تک پہنچ گیا جہاں ہنگری اور جرمنی کی مشترکہ فوج اُس جزیرہ نما کی حفاظت کے لیے متعین تھی جس پر ''ٹریسٹ'' کی مشہور بندرگاہ ہے۔ اس جنگ میں حریف کے بارہ ہزار پیادے، سات ہزار چار سو گھڑ سوار اور تین سپہ سالار قتل ہوئے۔ فتح کے بعد اسحاق بیگ ٹرانسلفانیا میں مزید پیش قدمی کرنے لگا مگر آگے چل کر وہ ایک معرکے میں شہید ہوگیا۔ عثمانی لشکر ''سارابیا'' کے علاقے تک پہنچ گیا جہاں اس نے قلعہ ''اکیرمان'' (Cetatea Alba) کا محاصرہ کرلیا مگر قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ ②

وینس سے بحری جھڑپیں:

بحیرۂ مرمرہ دُنیا کی مشہور ترین تجارتی گزرگاہ تھی اور وینس کے تاجر اپنے بہترین جہازوں اور مضبوط بحریہ کی بدولت اس پر چھائے ہوئے تھے۔ بایزید یلدرم نے عثمانی بحریہ کو ان کے ہم پلہ بنانے کے لیے جہاز سازی کے کارخانے قائم کیے تھے جس کے بعد عثمانیوں کے بحری جہاز بھی یورپی بندرگاہوں پر جانے لگے تھے اور اس دوران وہ بحیرۂ میڈیٹرانہ سے بھی گزرتے تھے جہاں وینس کا تسلط تھا اور اس کے مجمع الجزائر ''سیکلاڈ'' کے جزیرے ''آنڈروس'' پر وینس کا ایک شہزادہ پیٹروزنو حاکم تھا۔ اس نے عثمانیوں کے جہازوں پر قبضے کوشش کی جس کے باعث وینس اور دولتِ عثمانیہ کے مابین تعلقات خراب ہوگئے اور ۸۱۸ھ میں دولتِ عثمانیہ کا جرنیل چاولی بیگ تیس جنگی جہاز لے کر ان جزیروں پر حملہ آور ہوا اور وہاں کے بہت سے جہازوں کو تباہ کرکے واپس ہوگیا۔

اس کے انتقام میں پیٹروزنو نے صفر ۸۱۹ء (مئی ۱۴۱۶ء) میں بحری بیڑے لے کر گیلی پولی پر حملہ کیا اور ساحل پر واقع چنا قلعہ کو نشانہ بنایا۔ چالی بیگ ان کے مقابلے پر نکلا۔ یہاں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں چالی بیگ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ بہرکیف عثمانی اپنی بحری سرحدوں کی حفاظت اور وینس کے حملے کو پسپا کرنے میں کامیاب رہے۔ اس کے بعد قیصر کی وساطت سے دونوں میں مذاکرات ہوئے اور صلح ہوگئی۔ ③

---

① تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/۱۱۷

② تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/۱۱۷

③ تاریخ عثمانی: ۱/۳۹۸ تا ۴۰۰؛ تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/۱۱۷؛ تاریخ الدولة العثمانیه از سید محمد، ص ۱۴۱ مع حاشیه

محمد اوّل کا سیاسی تدبر:

محمد نے سیاسی تدبر سے کام لیتے ہوئے یورپ میں اپنے اتحادی پیدا کیے۔ البانیہ اور بوسینا کے بعض صوبے جنگِ انقرہ کے بعد خود مختار ہو گئے تھے، خدشہ محسوس کر رہے تھے کہ عثمانی کہیں دوبارہ ان پر حملہ نہ کر دیں۔ انہوں نے محمد اوّل کی تخت نشینی پر تہنیتی وفود بھیجے تو محمد اول نے ان کا خیر مقدم کیا اور مخالفین کو امن کا پیام دیا۔ [①]

سربیا کے حاکم کو اس نے شروع ہی میں اپنا حلیف بنالیا تھا۔ [②] وینس کی جمہوری سلطنت نے ایک دو جھڑپوں کے بعد تعلقات کی بحالی کو ترجیح دی اور صلح کا ہاتھ بڑھایا اور محمد نے اس کا مثبت جواب دیا۔ [③]

قیصر سے اس کی پہلے ہی دوستی تھی اور اس نے بحیرۂ اسود کے کئی قلعے دے کر اسے مزید مطمئن کر دیا تھا۔ [④]

وہ زندگی کے آخری سال قُسطَنطِینیّہ کے دورے پر بھی گیا جہاں اس کا شاندار خیر مقدم ہوا اور واپسی پر قیصر منوئیل ثانی اسے دولتِ عثمانی کی سرحد تک چھوڑنے خود آیا۔ [⑤]

اپنے آباء واجداد کی بہ نسبت محمد اوّل کی یورپ سے جنگیں بہت معمولی ہوئی تھیں جن میں کوئی خاص شہر ہاتھ نہ آسکا تھا مگر عثمانیوں نے اپنا کوئی علاقہ بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ نیز ان جنگوں سے یہ فائدہ ہوا کہ مشرقی یورپ کی ریاستوں نے عثمانیوں کو کمزور سمجھنا چھوڑ دیا اور سلطنتِ عثمانیہ پر فوری فوج کشی کا خیال ان کے دلوں سے نکل گیا۔

وفات:

قُسطَنطِینیّہ کے سفر سے واپسی کے بعد محمد اوّل اسہال کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور کسی طرح افاقہ نہ ہوا۔ آخر یہ عظیم بادشاہ ربیع الآخر ۸۲۴ھ (مارچ ۱۴۲۱ء) میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی عمر ۴۸ سال تھی۔

اس کی موت کی خبر چالیس دن تک پوشیدہ رکھی گئی کیوں کہ اس کا ولی عہد مراد خان اناطولیہ کے شہر آماسیا میں تھا اور خطرہ تھا کہ یہ خبر قُسطَنطِینیّہ پہنچ گئی تو باغی شہزادہ مصطفیٰ وہاں سے فوج لے کر پایۂ تخت پر چڑھ دوڑے گا۔ [⑥]

کارنامے:

محمد اوّل نے سات سال نو ماہ تک حکومت کی۔ اس کے دور میں عثمانیوں کی سلطنت زیادہ نہیں پھیلی مگر یہی کچھ کم نہ تھا کہ اس نے عثمانیوں کی کھوئی ہوئی سلطنت کا خاصا علاقہ دوبارہ حاصل کرنے اور اسے مستحکم بنانے میں کامیابی حاصل کر لی اور اناطولیہ کو بیرونی حملوں سے محفوظ کر دیا۔ اس نے کسی صوبے کو دشمنوں کے ہاتھ نہ لگنے دیا۔ درۂ دانیال اس کے قبضے میں تھا اس لیے اس کی سیاسی وتجارتی اہمیت بہت زیادہ تھی اور کوئی بھی ملک اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

---

① تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۹۳ ② الدولة العثمانیة من النشوء الی الانحدار، ص ۳۲

③ تاریخ عثمانی: ۱/ ۴۰۰ ؛الدولة العثمانیه از صلابی، ص ۷۳

④ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۳۹ ؛ اخبار الدول للقرمانی: ۳ص ۲۳ ؛ تاریخ عثمانی: ۱/ ۳۹۳

⑤ تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/ ۱۱۹

⑥ اخبار الدول للقرمانی: ۳/ ۲۳ ؛تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/ ۱۱۹

وہ مخالفین کے ساتھ حزم واحتیاط اور تحمل کا معاملہ کرتا تھا۔ باغیوں پر قابو پانے کے بعد انہیں اصلاحِ احوال کا موقع دیا کرتا تھا۔ امیر قرہ مان نے بغاوت کی تو اسے زیر کرنے کے بعد محمد نے فقط قرآن مجید پر آئندہ وفاداری کی قسم لے کر اسے معاف کر دیا۔ اس نے دوبارہ غداری کی مگر محمد نے دوبارہ درگزر کا معاملہ کیا۔ ①

اس مدبر بادشاہ نے سلطنت کو اندرونی طور پر اتنا مضبوط کر دیا کہ لوگ پہلے کی طرح خوشحال ہو گئے، تجارت چمک اٹھی، صنعت وحرفت کا بازار گرم ہوا، علمی مجالس، مدارس اور خانقاہوں کی رونقیں بڑھ گئیں۔ اس نے ہر مذہب اور فرقے کے لوگوں سے یکساں انصاف اور مہربانی کا سلوک کیا۔

اس نے کئی مدارس اور مساجد کی تعمیر کیں۔ بورصہ کی اس عظیم الشان مسجد کو مکمل کرایا جس کا آغاز سلطان مراد اوّل نے کیا تھا۔ یہ اسلامی طرزِ تعمیر اور سنگ تراشی کا بہترین نمونہ مانی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک بڑی درس گاہ بھی بنوائی اور لنگر خانہ بھی جاری کیا جہاں غریبوں کو مفت کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔

وہ آلِ عثمان کا پہلا حکمران تھا جس نے خانہ کعبہ، مسجد الحرام اور اہلِ مکہ کے لیے ایک خطیر سالانہ رقم جاری کی جو ''سنویہ'' یا ''صُرّہ'' کہلاتی تھی۔ اس کا سلسلہ عثمانی سلاطین میں باقی رہا۔ یہ رقم حرمین شریفین کی خدمت، نگرانی، تعمیر و مرمت، غریبوں کی امداد اور دیگر رفاہی وترقیاتی کاموں میں خرچ کی جاتی تھی۔ ان کارناموں کی وجہ سے محمد اوّل کو ''خادم الحرمین الشریفین'' اور ''محمد چلبی'' کہہ کر یاد کیا گیا۔ چلبی کا مطلب ہے ''بہادر اور سنجیدہ انسان''۔ ②

اس کی امن پسندانہ پالیسی کی وجہ سے جنگوں کا خاتمہ ہو گیا۔ پورے اناطولیہ اور یورپ میں امن کا دور دورہ ہو گیا اور سلطنتِ عثمانیہ دوبارہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو گئی۔

۸۰۴ھ (۱۴۰۲ء) میں جب بایزید یلدرم تیمور سے نبرد آزما ہوا تھا تو اس وقت دولتِ عثمانیہ کا رقبہ نو لاکھ بیالیس ہزار مربع کلومیٹر تھا۔ بیس برس بعد ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں جب محمد اوّل کی وفات ہوئی تو یہ رقبہ آٹھ لاکھ ستر ہزار مربع کلومیٹر تھا۔ ③ یعنی بایزید کے دور میں سلطنت وسعت کی جس انتہا پر پہنچ گئی تھی، محمد اوّل کے زمانے میں دوبارہ اس کے قریب قریب آ چکی تھی۔ صرف ۷۲ ہزار مربع کلومیٹر کا فرق تھا۔ مگر محمد اوّل نے جس تحت الثریٰ سے سلطنت کو اٹھایا تھا، اُسے دیکھتے ہوئے یہ کمی کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اسی حیران کُن کارنامے کی وجہ سے محمد اوّل کو سلطنتِ عثمانیہ کا دوسرا بانی کہا جاتا ہے۔

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۳۹

② اخبار الدول، ص ۲۳ ؛ نزہۃ الانظار از محمود مقدیش تونسی م ۱۲۲۸ھ: ۲/ ۱۲ ؛ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۴۷

③ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۱۹

سلطان مراد ثانی

۸۲۴ھ تا ۸۵۵ھ

(۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء)

سلطان مراد ثانی، سلطان محمد اوّل کا بڑا بیٹا اور ولی عہد تھا۔ محمد اوّل کی زندگی میں وہ اناطولیہ کا گورنر تھا، اس کی وفات کے بعد وہ ایڈریانوپل پہنچا جہاں اس کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔
سلطان مراد ثانی کا دورِ حکومت یورپی طاقتوں سے اپنی مملکت کے دفاع میں گزرا۔ [1]

قیصر کی سازش، مصطفیٰ بن بایزید کی بغاوت:

مراد کی تخت نشینی کی خبر سن کر قیصر منوئیل ثانی نے اسے کم سن اور ناتجربہ کار سمجھتے ہوئے پیغام بھیجا کہ وہ اپنی طرف سے کسی جنگ میں پہل نہ کرنے کا عہد کرے اور اس کی ضمانت کے طور پر اپنے دو بھائی قُسطَنطِینِیَّہ بھیج دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے چچا مصطفیٰ بن بایزید کو جو نظر بندی کی زندگی گزار رہا ہے، آزاد کر دیا جائے گا۔ مراد ثانی نے اس غیر معقول مطالبے پر کوئی توجہ نہ دی۔ تب قیصر نے مصطفیٰ کو نہ صرف بغاوت پر اکسایا بلکہ اسے دس بحری جہازوں اور سپاہیوں کی بھرپور امداد فراہم کی اور بدلے میں وعدہ لیا کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کا تاجدار بن کر گیلی پولی اور بحیرۂ اسود کے تمام بازنطینی مقبوضات قُسطَنطِینِیَّہ کو لوٹا دے گا۔ مصطفیٰ اس جھانسے میں آ گیا، اس نے قیصر کی بخشی ہوئی فوجی طاقت کے ساتھ گیلی پولی پر حملہ کیا اور قلعے کو چھوڑ کر باقی شہر لے لیا۔ اس کے بعد وہ پایۂ تخت ایڈریانوپل کی طرف بڑھا۔
مراد نے سپہ سالار بایزید پاشا کو مقابلے کے لیے بھیجا مگر مصطفیٰ نے اس کی فوج کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سلطنت کا اصل وارث میں ہوں، میرے ہوتے ہوئے میرے کم سن بھتیجے کی حکومت کا کوئی جواز نہیں۔ بہت سے ترک سپاہی اس کے موقف سے متفق ہو کر اس کے ساتھ ہو گئے اور انہوں نے خود بایزید پاشا کو قتل کر دیا۔
مصطفیٰ کا حوصلہ بہت بڑھ گیا اور وہ مراد ثانی سے ٹکر لینے آگے روانہ ہوا۔ مراد ثانی ایک نہر کے پیچھے مورچہ بندی کیے اس کا منتظر تھا۔ لڑائی سے پہلے مصطفیٰ کے سپاہیوں نے اس سے غداری کی اور سلطان مراد سے جا ملے۔ مصطفیٰ فرار ہو کر گیلی پولی پہنچا مگر آخر گرفتار کر لیا گیا اور مراد نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔ [2]

---

[1] تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۵۳

[2] تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۵۳

شہزادہ مصطفیٰ بن محمد کی بغاوت:

مراد ثانی جانتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا قیصر کا ہے۔ اس لیے جواب میں اس نے قُسطَنطِینیّہ پر فوج کشی کردی۔ گھمسان کی جنگ کے بعد ۳ رمضان ۸۲۴ھ (۲۱ اگست ۱۴۲۲ء) کو شہر فتح ہونے کے قریب تھا کہ قیصر کی سازشی سیاست نے بازی الٹ دی۔

مراد ثانی کا ایک چھوٹا بھائی مصطفیٰ بن محمد اناطولیہ میں گورنر تھا۔ قیصر محاصرہ شروع ہوتے ہی اس سے خفیہ خط و کتابت کرکے اسے بہکانے لگا تھا۔ قیصر کا کہنا تھا کہ اگر وہ بادشاہت کا دعویٰ کردے تو قُسطَنطِینیّہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی قیصر نے اناطولیہ کے دیگر ترکمان امراء کو بھی مصطفیٰ بن محمد کی امداد پر آمادہ کرلیا تھا۔ خاص کر قرامانی امراء جو عثمانیوں سے پرانی دشمنی رکھتے تھے، بدلہ لینے اور انہیں باہم لڑانے کے لیے مصطفیٰ کے حامی ہوگئے۔

عین ان ایام میں جب کہ قُسطَنطِینیّہ فتح ہونے والا تھا، مصطفیٰ نے اپنی حکومت کا اعلان کردیا اور سلطنت کے کئی شہروں پر قبضہ کرکے آخر میں بورصہ جیسے مضبوط سیاسی مرکز کو گھیر لیا۔

مراد ثانی کو قُسطَنطِینیّہ کا محاصرہ ترک کرکے اس کے مقابلے میں نکلنا پڑا۔ وہ اناطولیہ پہنچا جہاں دونوں بھائیوں کا آمنا سامنا ہوا۔ سلطان مراد کو میدان میں دیکھ کر مصطفیٰ کی اکثر فوج اس کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہوگئی۔ مصطفیٰ کو گرفتار کرکے قتل کردیا گیا۔ [1]

ترکمان ریاستوں پر فوج کشی:

اس فتنے کو فرو کرتے ہی سلطان مراد نے اناطولیہ کی ان ترکمان ریاستوں پر دھاوا بول دیا جو بغاوت کی اس آگ کو بھڑکانے میں ملوث تھیں۔ اس نے قرامانی امیر کو شکست دے کر قتل کردیا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے کو امیر مقرر کردیا۔

قرہ مان کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی جگہ اس نے صرف باج گزار بنانے پر اکتفا کیا۔ اس کے بعد صاروخان اور حمید یہ کی ریاستوں کو زیرِ نگین کیا گیا۔ قسطمونی کا امیر بھی سرنگوں ہوگیا اور اس نے آدھی ریاست کے ساتھ اپنی بیٹی بھی سلطان مراد کے نکاح میں دے دی۔ ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں امیر قرہ مان فوت ہوگیا تو سلطان مراد نے اس کی ریاست کو اپنی سلطنت میں ضم کرلیا۔ اس طرح چند سالوں میں وہ اکثر علاقے دوبارہ عثمانیوں کی تحویل میں آگئے جو جنگِ انقرہ کے بعد آزاد ہوگئے تھے۔ [2]

نئے قیصر کی سازشیں۔ یورپی مقبوضات میں بغاوتیں:

قُسطَنطِینیّہ کا محاصرہ ختم ہوگیا اور اس دم توڑتی سلطنت کو مزید تیس سال مل گئے مگر مراد ثانی کا رعب داب قائم ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد (۱۴۲۵ء میں) قیصر منوئیل فوت ہوگیا اور اس کے جانشین قیصر جان پلیہ لوگس دوئم نے مراد ثانی

---

① تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۵۴
② تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۵۵

کو خراج دینا منظور کر لیا۔ صلح نامے کی رو سے اسٹرانیا اور بحیرۂ احمر کے ساحل پر قیصر کے باقی ماندہ مقبوضات بھی عثمانیوں کے حوالے کر دیے گئے۔

نیا قیصر جانتا تھا کہ عثمانیوں کا اگلا حملہ اس کی سلطنت کو ختم کر سکتا ہے، وہ یورپی حکام کو عثمانیوں کے خلاف بھڑکانے لگا۔ ۸۳۱ھ میں شاہِ سربیا اسٹیفن جو سلطنتِ عثمانیہ کا باج گزار تھا، فوت ہو گیا اور اس کی جگہ تیز مزاج جارج برنیکویچ برسرِ اقتدار آ گیا۔ قیصر نے اسے بغاوت پر آمادہ کر لیا۔

اُدھر مراد ثانی یورپ میں اپنی عمل داری کو وسعت دے رہا تھا۔ ۸۳۴ھ (۱۴۳۰ء) میں اس نے وینس کے بحری بیڑے کو شکست دے کر سالونیکا، جزیرۂ زانتی اور جنوبی یونان کا خاصا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ وینس نے سخت شرائط پر صلح کر کے خود کو بچایا۔ وینس، قُسطنطِینیّہ کا اتحادی تھا۔ اس کی شکست سے قیصر کو مزید چوٹ لگی اور وہ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف نئی سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کی دعوت پر یورپی حکمران عثمانی سلطنت کے خلاف کھڑے ہونے لگے۔ پولینڈ کا بادشاہ لاڈسلاس جو ۱۴۴۰ء میں ہنگری پر قبضہ کر کے ایک بڑی طاقت کا مالک بن چکا تھا، قیصر کا ہم نوا بن گیا۔ اس نے ترکوں کے خلاف یورپی طاقتوں کو اکٹھا کر لیا۔ جرمنی، البانیہ اور بوسنیا کے نواب بھی اس کے حامی بن گئے۔ سلطنتِ عثمانیہ کی باج گزار ریاست ولاچیا بھی ان کے ساتھ مل گئی۔

اُدھر یورپی ممالک کے اشارے پر سلطنتِ عثمانیہ کے نومفتوحہ یورپی شہروں میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ باغیوں نے ترک حکام کو صوبہ ٹرانسلونیا سے بے دخل کر دیا۔

یورپی طاقتوں کے عزائم کا اندازہ لگا کر سلطان مراد ثانی نے بلغاریہ میں پیش قدمی کی اور بلغراد کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر اس کے سپہ سالار فرید پاشا نے ٹرانسلونیا کے قلعے ہرمان اسٹارٹ کو گھیرے میں لے لیا۔ ان مہمات کے دوران اچانک اناطولیہ میں قرامانیوں نے بغاوت کر دی اور سلطان مراد کو مہم چھوڑ کر وہاں جانا پڑا۔ یہ ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) کا واقعہ ہے۔

سلطان مراد نے اناطولیہ پہنچ کر قرامانیوں کی بغاوت کو کچل دیا۔ امیر ابراہیم گرفتار ہو گیا۔ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا کہ اگر وہ توبہ نہ کرے تو سزائے موت کا حق دار ہے کیوں کہ اس نے جہاد میں مشغول سلطان کے خلاف بغاوت کی ہے۔ ابراہیم نے معافی تلافی کر کے سلطان مراد سے صلح کر لی۔ سلطان نے اسے معاف کر دیا۔[1]

ہونیاڈے سے معرکے۔ معاہدۂ صلح:

انھی دنوں مغربی یورپ کا ایک سپہ سالار ہونیاڈے جانس (Hunyadi Janos) عثمانی ترکوں سے لڑنے ہنگری پہنچا۔ وہ سابق شاہ ہنگری کی ناجائز اولاد تھا۔ جنگی تجربے، مکاری اور ہوشیاری میں اس کی بڑی شہرت تھی۔

اس نے آتے ہی ٹرانسلونیا کا محاصرہ کرنے والے فرید پاشا کے خلاف فوج کشی کی اور اسے شکست دے کر شہر کا محاصرہ ناکام بنا دیا۔ اس جنگ میں فرید پاشا اور اس کا بیٹا گرفتار ہو گئے تھے۔ ہونیاڈے نے ان دونوں کے ٹکڑے

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱۲۲/۱ تا ۱۲۵

ٹکڑے کرادیے۔ ہونیاڈے مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کی خوں خواری کا عالم یہ تھا کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے روزانہ ترک قیدیوں کو طلب کرتا اوران کے سر قلم کراتا۔

مراد ثانی کو اس شکست اور ہونیاڈے کی خوں ریزیوں کا پتا چلا تو اس نے شہاب الدین پاشا کو ۸۰ ہزار سپاہی دے کر مقابلے میں بھیجا۔ واژگ کے میدان میں معرکہ ہوا۔ اس بار بھی ہونیاڈے کو فتح ہوئی۔

ان فتوحات نے یورپی طاقتوں میں ایک زبردست جوش وخروش پیدا کردیا جسے دیکھتے ہوئے روم کے پوپ جان چہارم نے صلیبی جنگ کا اعلان کرکے مراد ثانی کے خلاف جنگ میں شرکت کو مذہبی فریضہ بنادیا۔ شاہ ہنگری کے علاوہ، ولاچیا، بوسنیا، فرانس اور جرمنی تک کی افواج مراد ثانی کے خلاف اتحاد میں شامل ہوگئیں۔ وینس اور جنیوا کے بحری بیڑے بھی صلیبیوں کی مدد کے لیے آن پہنچے۔ ہونیاڈے کو اس متحدہ لشکر کا قائد چن لیا گیا۔

لشکرِ صلیب مسلسل پیش قدمی کرتے ہوئے دریائے ڈینوب کے پار آگیا اور ترکوں کی سرحدی چوکیوں اور قلعوں کو فتح کرتا چلا گیا۔ ۱۴۴۳ء میں نیش کے مقام پر ایک خونریز معرکہ ہوا۔ ترک افواج نے یہاں بھی شکست کھائی، چار ہزار مسلمان شہید اور گرفتار ہوئے۔ ہونیاڈے صوفیہ پر قابض ہوگیا۔ پھر اس نے فلپو پولس کو بھی ترکوں سے خالی کرالیا۔ کوہِ بلقان کی وادیوں میں ترکوں نے ایک بار پھر صف بندی کی مگر اس بار بھی صلیبی فتح یاب ہوئے۔ ہونیاڈے کھل کر رومیلیا میں تاخت وتاراج کرتا رہا۔ ترکوں کا پایۂ تخت ایڈریانوپل اس کے سامنے تھا مگر اس نے احتیاط کی بناء پر مزید پیش قدمی نہ کی۔ سلطان مراد قرامانیوں کی بغاوت کچلنے میں مصروف تھا اس لیے یورپی محاذ پر نہ پہنچ سکا جہاں مسلسل فتوحات نے صلیبیوں کے حوصلے بڑھادیے تھے جبکہ ترکوں کی ہمت ٹوٹ رہی تھی۔ مراد جب اناطولیہ کی مہم انجام دے کر ایڈریانوپل روانہ ہوا تو صلیبی بلقان کا وسیع رقبہ فتح کر چکے تھے۔ تاہم مراد کی آمد کی خبر سن کر صلیبیوں نے مزید پیش قدمی ترک کردی۔ ہونیاڈے بے حساب مالِ غنیمت اور قیدیوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔

سلطان مراد نے محاذ پر پہنچ کر اپنی فوج کے حوصلے پست دیکھے تو فی الحال صلح جوئی بہتر سمجھی۔ اس جنگ میں اس کا بہنوئی محمد چلپی بھی قید ہو چکا تھا اور خاندان کی طرف سے دباؤ تھا کہ کسی بھی طرح اسے رہا کرایا جائے۔ ''زیجیڈین'' کے مقام پر اتحادیوں سے مذاکرات ہوئے۔ عیسائیوں نے انجیل اور مسلمانوں نے قرآن پر حلف اٹھا کر ۸۴۸ھ (۱۲ جولائی ۱۴۴۴ء) کو باہم معاہدہ کیا جس کے مطابق:

1. دس سال کے لیے جنگ بندی ہوگئی۔
2. سربیا آزاد قرار پایا۔ اس کے بادشاہ جارج بیکوچ کو آزاد مان کر خراج کی وصولی ختم کردی گئی۔
3. ولاچیا ہنگری کو دے دیا گیا۔
4. امیرِ لشکر محمد چلپی کو جو جنگ میں گرفتار ہوا تھا، خطیر زرِفدیہ دے کر آزاد کرالیا گیا۔ [1]

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز، ص۱۲۲ تا ۱۲۴؛ تاریخ عثمانی از اوزون: ۱/ ۳۷۴ تا ۳۸۲

سلطان کی عزلت نشینی۔ نصرانیوں کی عہد شکنی:

سلطان مراد ۲۲ سالہ جنگوں اور خانہ جنگیوں سے تھک چکا تھا۔ یورپ سے حالیہ شکست نے اسے ذہنی طور پر سخت متاثر کیا تھا، البتہ معاہدۂ صلح کے باعث اسے اطمینان تھا کہ اب دس سال امن سے گزریں گے۔ وہ ایک عابد وزاہد انسان اور مزاج کے لحاظ سے درویش تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بقیہ زندگی عبادت اور ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے۔ اسی دوران اس کے ولی عہد علاؤالدین کا انتقال ہوگیا جس سے اس کی رنجیدگی اور بڑھ گئی۔ اس نے دوسرے بیٹے محمد خان کو جو اس وقت ۱۴ سال کا تھا، تخت پر بٹھادیا اور خود اناطولیہ جاکر خلوت نشینی اختیار کرلی اور خانقاہوں میں وقت گزارنے لگا۔

شہزادہ محمد خان کی تخت نشینی کے کچھ ہی دنوں بعد اِدھر قرامانیوں نے اناطولیہ میں بغاوت کردی۔ اُدھر سلطان مراد کی عزلت نشینی اور قرامانیوں کی بغاوت نے یورپی طاقتوں کو فوری عہد شکنی پر ابھارا حالانکہ ابھی معاہدے کو ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا۔ پوپ کا نمائندہ کارڈینل جولین جو شروع سے صلح کے خلاف تھا، یورپی حکمرانوں سے ملا اور پوپ کی مکمل حمایت کے ساتھ عہد شکنی پر اصرار کیا۔ اس نے یقین دلایا کہ مسلمانوں کے ساتھ ایفائے عہد گناہ ہے اور یہ عہد شکنی باعثِ اجر ہے۔ آخر صلیبی صلح نامے کو توڑ کر جنگ پر کمربستہ ہوگئے۔ ہونیاڈے نے شروع میں معاہدہ توڑنے کی مخالفت کی مگر جب اسے لالچ دیا گیا کہ فتح کے بعد اسی کو بلغاریہ کا بادشاہ بنایا جائے گا تو وہ بھی راضی ہوگیا۔ ہنگری میں نصرانی ریاستوں کا قومی اجلاس ہوا جس میں معاہدہ توڑنے کا اعلان کردیا گیا۔ تاہم طے یہ ہوا کہ حملہ یکم ستمبر ۱۴۴۴ء تک ملتوی رکھا جائے گا تاکہ اس وقت تک معاہدے کے مطابق سرحدی قلعے ترکوں سے خالی کرالیے جائیں۔

ترکوں نے جو اس سازش سے بالکل لاعلم تھے، حسبِ معاہدہ قلعے خالی کردیے۔ یہ اطلاع ملتے ہی شاہِ ہنگری و پولینڈ لاڈیسلاس سوئم، اس کے نائب جنرل ہونیاڈے اور کارڈینل جولین نے اتحادی افواج کے ساتھ کوچ کردیا۔ پاپائے اعظم کا پرچم اس فوج کے ساتھ تھا۔ ۲ ستمبر کو صلیبی ترک سرحدوں میں گھس گئے۔ انہوں نے راستے میں آنے والے دیہاتوں کو نذرِ آتش کردیا، اس تباہ کاری میں بہت سے گرجے بھی سوختہ ہوگئے مگر حملہ آوروں نے کوئی پروا نہ کی۔ آخر یہ بے لگام طاقت ترکوں کے قلعے فتح کرتے ہوئے 'وارنا' تک آپہنچی اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اس دوران وینس، برگنڈی اور جنیوا کے بحری بیڑے درۂ دانیال میں داخل ہوگئے تاکہ ترک سمندر پار کرکے یورپی سرحدوں پر کمک نہ پہنچا سکیں۔

ان حالات میں سلطنت کے امراء سلطان مراد کے پاس پہنچے اور درخواست کی کہ وہ امورِ سلطنت دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے کر حریف کا مقابلہ کرے ورنہ ملک کا بچنا مشکل ہے۔ سلطان مراد نے حالات کی نزاکت دیکھی تو دوبارہ تخت پر آبیٹھا۔ اس نے فوری طور پر چالیس ہزار فوج تیار کی اور محاذ کی طرف روانہ ہوگیا۔ درۂ دانیال پر جنیوا کے بحری بیڑے کو رشوت دے کر وہ یورپ کے ساحل پر اتر گیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر وارنا سے چار میل دور پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں صفیں ترتیب دی گئیں۔ دائیں بازو کی کمان اناطولیہ کے بیگلر بیگ قراجہ بیگ کو اور بائیں بازو کی رومیلی کے بیگلر بیگ

شہاب الدین پاشا کو سونپی گئی۔ قلب کی قیادت سلطان نے خود سنبھالی اور ینی چری کو حسب دستور ساتھ رکھا۔ ینی چری دستوں نے اپنے سامنے خندقیں کھود لیں تاکہ بوقتِ ضرورت ان کی آڑ میں مدافعت کی جا سکے۔

صلیبیوں کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ سلطان مراد خود فوج لے کر آن پہنچے گا مگر ہونیاڈے گزشتہ فتوحات کے باعث نہایت غرور میں مبتلا تھا۔ اس نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھتے ہوئے یکم شعبان ۸۴۸ھ (۲۴ نومبر ۱۴۴۴ء) کو عثمانیوں پر جارحانہ حملہ کر دیا۔ دن بھر نہایت قہر انگیز لڑائی ہوتی رہی۔ عصر کے قریب دشمن کے شدید دباؤ سے مسلمانوں کی صفیں تتر بتر ہو رہی تھیں۔ ایک طرف ہونیاڈے جو اتحادیوں کے بائیں بازو کا کمانڈر تھا، عثمانیوں کے دائیں بازو کو پسپا کر چکا تھا۔ جبکہ دوسری جانب رومانیہ کے دستے اپنا تمام زور عثمانیوں کے بائیں بازو پر مرکوز کر کے اسے پیچھے ہٹا چکے تھے۔ مسلمانوں کے دونوں بازوؤں کو پسپا ہوتا دیکھ کر شاہِ ہنگری لاڈیسلاس کو یقین ہو گیا کہ اب عثمانیوں کا دم خم ختم ہو چکا ہے۔ وہ جوش میں آ کر اپنے خاص دستوں کے ساتھ آگے بڑھا اور پوری قوت سے اسلامی قلب پر یک بارگی ٹوٹ پڑا جہاں سلطان مراد میدان میں جما ہوا تھا اور اللہ سے فتح و نصرت کی دعا مانگ رہا تھا۔ شاہِ ہنگری اپنے دستے سمیت سلطان مراد کی خاصہ فوج تک آن پہنچا۔ سلطان مراد نے اپنے دستوں کو جوش دلایا اور دونوں اطراف کے سپاہی گڈمڈ ہو گئے۔ اس دوران ینی چری کا ایک افسر تیمور تاش شاہِ ہنگری تک جا پہنچا اور کلہاڑے سے اس کے گھوڑے کی ٹانگوں پر ایسا کاری وار کیا کہ گھوڑے کے ساتھ شاہِ ہنگری بھی زمین پر گر پڑا۔ ینی چری سپہ سالار خواجہ خضر یہ دیکھتے ہی اُدھر جھپٹا اور بے دریغ شاہِ ہنگری کا سر قلم کر کے اسے نیزے پر ٹانگ دیا اور آواز لگائی: ''یہ رہا بدبخت شاہِ ہنگری کا سر۔''

یہ دیکھ کر ہنگری اور پولینڈ کی فوج میں افراتفری پھیل گئی اور ترک جری ہو کر ان کی لاشیں گرانے لگے۔ اسی دار و گیر میں کارڈینل جولین جو اس جنگ کی آگ بھڑکانے کا اصل مجرم تھا، مارا گیا۔ ہونیاڈے کچھ دیر تک اپنے دستوں کے ساتھ قدم جما کر لڑتا رہا۔ اس نے شاہِ ہنگری کا سر واپس لینے کی بڑی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ چنانچہ ہونیاڈے نے بھی راہِ فرار اختیار کی۔ ترکوں نے تعاقب کیا اور اتحادیوں کے دو تہائی سپاہیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ جنگ کا دورانیہ صبح سے عصر تک تھا۔ ۹۰ ہزار نصرانی قید ہوئے۔ ترکوں کے لگ بھگ دس ہزار جانباز شہید ہوئے جن میں سلطان کا بہنوئی اور بیگلر بیگ قراجہ پاشا بھی تھا۔[①]

عثمانیوں کی مذہبی رواداری کا سربوں پر اثر:

اس جنگ نے یورپی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا اور ترکوں کا رعب ایک بار پھر قائم ہو گیا۔ ہونیاڈے اس کے بعد دوبارہ حملے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس کی اپنی مذہبی سخت گیری بھی اس کی بدنامی کا باعث ہوئی اور اس کے کئی اتحادی مراد سے جا ملے۔ ہونیاڈے کیتھولک رومن چرچ کا پیروکار تھا جب کہ سربیا اور بوسنیا کے نصرانی یونانی کلیسا کے مقلد تھے۔ ہونیاڈے یونانی کلیسا کا سخت مخالف تھا۔ مغربی مؤرخین کی نقل کردہ روایت کے مطابق

① اخبار الدول: ۲۶/۳ ؛ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۲/ ۱۲۶، ۱۲۷؛ تاریخ عثمانی: ۱/ ۴۹۰ تا ۴۹۳

بوسنیائی سردار برنیکووچ نے جب ہونیاڈے سے پوچھا کہ فتح کے بعد تم سربیا اور بوسنیا کے باشندوں سے کیا سلوک کرو گے؟ تو اس نے جواب دیا: ''میں انہیں زبردستی رومن کلیسا میں داخل کروں گا۔''

جنگِ وارنا میں ہونیاڈے کی شکست کے بعد اس سردار نے جب یہی سوال سلطان مراد سے کیا تو جواب ملا:

''میں عیسائیوں کو ان کی مرضی کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت دوں گا۔''

سلطان کی اس فراخ دلی کی وجہ سے سربیا اور بوسنیا ایک بار پھر سلطنت عثمانیہ کے تابع دار ہو گئے اور ان میں سے بہت سے سرداروں نے بخوشی اسلام قبول کرلیا۔[1]

سلطان مراد کی گوشہ نشینی......سہ بارہ حکومت:

سلطان مراد نے اس فتح کے بعد مطمئن ہو کر ایک بار پھر گوشہ نشینی اختیار کر لی اور شہزادہ محمد خان کو تخت پر بٹھا دیا۔ کچھ عرصے تک حالات معمول پر رہے اور سلطان مراد ''آیدین'' میں یکسوئی سے مشغولِ عبادت رہا مگر اس وقت اسے یہ فیصلہ واپس لینا پڑا جب ینی چری فوج نے تنخواہوں اور مراعات میں اضافے کا مطالبہ کر کے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ عثمانی افواج کا یہ سب سے وفادار بازو اس قدر خودسر ہو چکا تھا کہ عام امراء اسے سنبھالنے سے عاجز ہو گئے۔

ایسے میں امرائے سلطنت نے سلطان مراد سے دوبارہ زمام حکومت سنبھالنے کی درخواست کی۔ سلطان سمجھ چکا تھا کہ اس کے نصیب میں آرام سے بیٹھنا نہیں ہے اور اس کا امورِ حکومت سے الگ رہنا، ملک وقوم کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ وہ دوبارہ ایڈریانوپل پہنچا اور تاج وتخت کو سنبھالا۔ اس کی آمد پر رعایا اور فوج نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ ینی چری فوج نے بھی سرکشی ترک کر دی۔ سلطان نے باقی زندگی ملک کی دیکھ بھال میں گزاری اور اپنے بیٹے محمد خان کو سیاسی تجربے کے لیے ایشیائے کوچک کا گورنر بنا دیا۔[2] یہی محمد خان بعد میں سلطان محمد فاتح کے نام سے مشہور ہوا۔

ہونیاڈے سے آخری جنگ......سربیا کا انضمام:

کچھ مدت بعد سلطان مراد کو قیصر کی الحاقی ریاست 'موریا' پر چڑھائی کرنا پڑی۔ اس ریاست کے ایک حصے پر قیصر کا ایک بھائی تھامس اور دوسرے پر اس کا دوسرا بھائی قُسطَنطِین حکومت کرتا تھا۔ قُسطَنطِین نے سلطان مراد کی حدود میں پیش قدمی کر کے کچھ علاقہ چھین لیا تھا۔ سلطان مراد نے خاکنائے کورنتھ پار کر کے جوابی کارروائی کی۔ اس جنگ میں عثمانی افواج نے پہلی بار توپ خانہ استعمال کیا۔ توپوں کی گھن گرج نے قیصر کے بھائیوں کے دل دہلا دیے اور انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ یوں موریا، عثمانیوں کی باج گزار ریاست بن گئی۔

اُدھر وارنا میں شکست نے ہونیاڈے کو جو عملاً ہنگری کا حکمران بن چکا تھا، اس قدر مضطرب کر رکھا تھا کہ اس نے واپس جا کر ایک نئی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ ہر قیمت پر شکست کا داغ مٹانا اور اپنی ساکھ بحال کرنا چاہتا

---

① دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/ ۸۸، بحوالہ کریسی: ۱/ ۱۱۴

② اخبار الدول: ۳/ ۲۶

تھا۔ وہ کئی سال تک بوسنیا اور سربیا کے حکام کو عثمانیوں سے ہمیشہ کی آزادی کا لالچ دے کر ساتھ ملانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی طرح دیگر یورپی ممالک کو بھی وہ عثمانیوں کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ آخر اس نے ایک لاکھ سپاہی جمع کر لیے جن میں ہنگرین، جرمن، پولینڈی، سرب اور بوسینائی قبائل شامل تھے۔ مجموعی طور پر یہ چھوٹی بڑی ۳۸ فوجیں تھیں اور مختلف النسل ہونے کے باعث ایک فوج کے سپاہی دوسری فوج کی زبان تک نہیں سمجھتے تھے۔ ہونیاڈے ان اتحادیوں کو لے کر 'کسووو' پہنچا۔ اُدھر سے سلطان نے فوج کی قیادت کرتے ہوئے جوابی یلغار کی۔ ۱۷ اکتوبر ۱۴۴۸ کو''کسووو'' کے اسی تاریخی میدان میں جنگ شروع ہوئی جہاں ۵۹ سال پہلے یورپی لشکروں کو سلطان مراد اوّل کے مقابلے میں عبرتناک ہزیمت ہوئی تھی۔ تین دن اور تین راتوں تک جنگ جاری رہی۔ کشتوں کے پشتے لگتے رہے۔ تیسرے دن سلطان کے جرنیل تورخان پاشا نے اپنے دستوں کے ساتھ عقب میں جا کر دشمن کی راہِ فرار مسدود کر دی جبکہ دائیں بائیں سے سلطان انہیں گھیرے میں لے چکا تھا۔ آخر اتحادی شکستِ فاش کھا کر بھاگے۔ ان کے سترہ ہزار سپاہی میدانِ جنگ میں مارے گئے جبکہ عثمانیوں کے چار ہزار سپاہی شہید ہوئے۔ اس جنگ نے یورپی طاقتوں کو نہایت مرعوب کر دیا۔ وہ دوبارہ ہونیاڈے کے ساتھ کھڑی ہونے کی ہمت نہ کر سکیں۔ ہونیاڈے اس شکست کے بعد اپنی شہرت و مقبولیت کھو بیٹھا۔ سربیا کی آزادی ختم ہوگئی اور اسے ترک سلطنت میں ضم کر لیا گیا اور بوسنیا ترکوں کا باج گزار بن گیا۔[1]

البانوی شہزادے سکندر بیگ کی بغاوت:

مراد ثانی کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں البانیہ کے امیر جان کسٹرائیٹ نے اپنے چار بیٹے سلطان مراد کی خدمت میں بھیجے تاکہ انہیں ینی چری فوج میں بھرتی کیا جائے۔ قسمت کی بات کہ ان میں سے تین شہزادے تربیت کے دوران مر گئے۔ جان کسٹرائیٹ کو شک ہوا کہ انہیں زہر دیا گیا ہے۔ اس نے سلطان کو بھی اپنے شبہے سے آگاہ کر دیا اور چوتھے شہزادے جارج کسٹرائٹ کی خاص حفاظت کی درخواست کی۔ سلطان نے اس کے مطابق جارج کسٹرائٹ کو خصوصی نگرانی میں تربیت دلوائی اور اسلامی تعلیمات سے آشنا کیا۔ وہ اٹھارہ سال کا ہوا تو اسے ایک فوجی دستے کا سالار بنا دیا گیا۔ کچھ مدت بعد اسے سکندر بیگ کا خطاب دے کر ایک علاقے کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔

۸۳۶ھ میں جان کسٹرائیٹ کی وفات ہوئی تو سلطان نے البانیہ کو سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ سکندر بیگ سے یہ برداشت نہ ہوا۔ یہ وہ دن تھے جب ہونیاڈے ترکوں سے جنگ چھیڑ کر مسلسل کامیابیاں حاصل کر رہا تھا۔ سکندر بیگ نے اسے البانیہ کی ترکوں سے آزادی کا سنہرا موقع تصور کیا اور ایک دن سلطان کے کاتب اعلیٰ کے کمرے میں گھس کر خنجر کی نوک پر اس سے البانیہ کے ایک اہم سرحدی قلعے آق حصار کی دستاویز اپنے نام لکھوائی اور فرار ہو کر البانیہ پہنچ گیا۔ آق حصار کے نگران کو وہ دستاویز دکھا کر اس نے قلعہ ہتھیا لیا۔ اس کے بعد اس نے مرتد ہونے کا اعلان کر کے

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیہ: ۱/ ۱۲۷، ۱۲۸

پورے البانیہ سے ترکوں کو بے دخل کرنے کی مہم شروع کردی۔ اس کے ہم وطن جوق در جوق اس کے گرد جمع ہوگئے۔ اس نے پورے البانیہ میں ترکوں کا قتلِ عام کیا۔ بقیۃ السیف مسلمان ہجرت پر مجبور ہوگئے۔ سلطان مراد نے اس فتنے کے خاتمے کی بہت کوشش کی مگر آخر تک وہ البانیہ پر تسلط حاصل نہ کر سکا۔ ①

سلطان مراد ثانی کی وفات:

سلطان مراد ثانی کی باقی زندگی امن وسکون کے ساتھ بسر ہوئی۔ وہ اپنی سلطنت کو ترقی دینے اور عدل وانصاف قائم رکھنے میں مشغول رہا۔ ۲۹ سال دس ماہ کا طویل دورِ اقتدار گزار کر وہ بیمار ہوا اور چار دن کی مختصر علالت کے بعد ۵ محرم ۸۵۵ھ (۹ فروری ۱۴۵۱ء) کو دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کی عمر چھیالیس سال تھی۔ اس کی تدفین بورصہ میں ہوئی۔ یہ آخری عثمانی بادشاہ تھا جو اس شہر میں پیوندِ خاک ہوا۔ ②

سلطان مراد ثانی کے کردار کی ایک جھلک:

سلطان مراد ثانی ایک سادہ مزاج، درویش صفت اور مجاہد حکمران تھا۔ علم وفضل سے پوری طرح آراستہ تھا۔ ابن عرب شاہ جیسے علماء اس کے اساتذہ میں شامل تھے۔ وہ حافظِ قرآن تھا، ۱۸ سال کی عمر سے تہجد کا عادی تھا۔ نفلی روزے بکثرت رکھتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت محل کی آسائشوں کے بجائے مساجد، مدارس یا خانقاہوں میں گزرتا تھا۔ صوفیائے کرام سے اس کا بہت قریبی تعلق تھا۔ اس نے اپنی قبر پر کوئی گنبد نہ بنوانے کی وصیت کی تھی۔

وہ تعمیرات کا شوقین تھا۔ بورصہ میں جامع مساجد اور تعلیم گاہیں قائم کیں جو آج تک موجود ہیں۔ ایڈریانوپل میں ایک دارالحدیث، کئی درسگاہیں اور تین میناروں والی عظیم الشان مسجد اس کی یادگار ہیں۔ دریائے ارکنہ پر اس نے "اوزون کبریٰ" کے نام سے تقریباً چار سو میٹر طویل عظیم پل تعمیر کرایا جو سولہ سال میں مکمل ہوا۔ اس کا عدل وانصاف شک وشبہے سے بالا تھا۔ ③

اس نے ہمیشہ جہاد پر توجہ مرکوز رکھی۔ وہ مسلمان بادشاہوں سے تعلقات بہتر رکھنے کا قائل تھا، اسی لیے حتی الامکان ان سے جنگ کا بہانہ پیدا نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس حوالے سے وہ اپنے والد محمد چلپی کا ہم خیال تھا۔ تیمور لنگ نے عثمانی بادشاہت کو اپنا باج گزار بنایا تھا۔ محمد چلپی نے اس تعلق کو نبھائے رکھا۔ مراد ثانی کے دور میں تیموری سلطنت کمزور ہو چکی تھی اور عثمانی سلطنت دوبارہ عروج کی طرف گامزن تھی۔ ایسے میں مغلوں سے رسمِ وفاداری قائم رکھنا کوئی ضروری نہ تھا مگر سلطان مراد ثانی نے رسماً ہی سہی، تیمور لنگ کے جانشین شاہ رُخ کی برتری تسلیم کیے رکھی، تاکہ بلاوجہ کشت وخون کی نوبت نہ آنے پائے۔ ④

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۵۸، ۱۵۹ ② تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۵۹؛ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۲۹

③ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۵۵ تا ۱۵۹؛ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۵۰ تا ۵۲؛ اخبار الدول: ۳/ ۲۷؛ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۳۰

④ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۳۰

سلطان مراد ثانی غیر مسلم مؤرخین کی نگاہ میں:

غیر مسلم مؤرخین بھی سلطان مراد کی منصف مزاجی اور اعلیٰ اخلاق کی تعریف کرتے ہیں۔ بازنطینی مؤرخ پرنس ڈوکاس (Prens Dukas) لکھتا ہے:

''وہ عوام سے محبت کرتا تھا۔ کمزوروں پر مہربان تھا۔ اس بارے میں مسلمان یا مسیحی رعایا کا کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں سے یکساں معاملہ کرتا تھا۔ وہ دشمنوں سے ایفائے عہد کا پابند تھا۔ جس نے بھی اس سے عہد شکنی کی وہ خدا کے عذاب کا شکار ہوا۔ وہ جنگوں کے لیے خود نکلتا تھا مگر امن وسلامتی کے سائے میں علوم وفنون اور تعمیراتی کاموں میں مشغولیت کو ترجیح دیتا تھا۔ اس نے ہر جنگ شدید ضرورت کی بناء پر کی۔ جب وہ دشمنوں پر قابو پالیتا تو انہیں فنا کے گھاٹ اتارنے کی حد تک نہ جاتا بلکہ صلح کا دروازہ کھلا رکھتا تھا۔''[1]

جرمن مؤرخ وین ہیمر (Van Hammer) لکھتا ہے:

''سلطان مراد نے عدل اور شرافت کے ساتھ ۳۰ سال حکومت کی۔ وہ رعایا کے لیے مذہبی تفریق کے بغیر منصف مزاج اور نیک نیت تھا۔ وہ امن کی طرح جنگ میں بھی وعدے کا پابند تھا۔ صلح کو ترجیح دیتا تھا لیکن جب جنگ کی ضرورت پڑتی تو اس میں تردّد نہیں کرتا تھا اور عہد شکنی کرنے والوں کو سخت سزا دیتا تھا۔''[2]

---

① تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/۱۳۰

② تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/۱۳۰

محمد خان (محمد ثانی)......فاتحِ قُسطَنطِینِیّہ

۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ

(۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء)

سلطان مراد ثانی کے بعد اس کا بیٹا محمد خان تخت نشین ہوا جس کی عمر اس وقت صرف ۲۲ سال تھی۔ یہی وہ محمد خان ہے جو قُسطَنطِینِیّہ کی فتح کے ناقابلِ فراموش کارنامے کی وجہ سے ''سلطان محمد خان فاتح'' کے نام سے مشہور ہوا۔

محمد خان نہایت ذہین، ہوشیار، بہادر اور جنگجو شہزادہ تھا۔ طویل قد و قامت، بھرے ہوئے بارعب چہرے اور گھنی سرخی مائل ڈاڑھی کے ساتھ وہ بڑا باوقار دکھائی دیتا تھا۔ شجاعت، صبر و استقلال اور اولوالعزمی جیسی صلاحیتیں اس میں کامل طور پر موجود تھیں۔ اسے بہترین علماء اور دانش وروں نے تعلیم دی تھی۔

سلطان مراد نے اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تجربے کے لیے اسے لڑکپن ہی میں 'مانیسا' کا گورنر بنا دیا تھا اور تعلیم کے لیے کئی ماہر اساتذہ اس کے ساتھ کر دیے تھے۔ مگر ولی عہد کو پڑھائی سے زیادہ مہمات میں دلچسپی تھی۔ پڑھائی سے اس کی لاپرواہی دیکھ کر اساتذہ عاجز آ گئے تھے۔ سلطان مراد کو معلوم ہوا تو بڑا پریشان ہوا اور اپنے مشیروں سے پوچھا کہ آیا کوئی ایسا استاد ہے جو ولی عہد کو قابو کر سکے۔ مشیروں نے شیخ شہاب الدین کورانی کا نام لیا جو تجوید اور تفسیر کے نامور مدرس تھے۔ سلطان مراد نے فوراً انہیں ایک خطیر معاوضے پر شہزادے کا اتالیق مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی ایک بید دے کر کہا: ''اگر شہزادہ نافرمانی کرے تو اس بید سے کام لیجیے گا۔'' شیخ شہاب الدین کورانی، شہزادے کے پاس پہنچے اور کہا: ''مجھے تمہارے والد نے بھیجا ہے تاکہ تمہیں پڑھاؤں۔ اگر تم نافرمانی کرو تو تمہاری پٹائی کروں۔''

محمد خان نے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں اس لیے اسے مذاق تصور کر کے ہنس پڑا۔ شیخ نے فوراً بید اٹھایا اور کھینچ کھینچ کر کئی ضربیں لگائیں۔ اس کے بعد محمد خان بالکل سدھر گیا۔ اس نے دل لگا کر پڑھائی شروع کی اور کچھ ہی مدت میں قرآن مجید کی تعلیم مکمل کر لی۔ سلطان مراد نے بیٹے میں یہ تبدیلی دیکھ کر استاد کو گراں قدر انعامات سے مالا مال کر دیا۔ اس کے بعد محمد خان کا سینہ علوم و فنون کے لیے ایسا کھلا کہ اپنے زمانے کے بڑے علماء میں شمار ہونے لگا۔ [1]

مؤرخین کا کہنا ہے کہ وہ حدیث، تاریخ اور جغرافیے کا ماہر تھا۔ اپنی مادری زبان ترکی کے علاوہ عربی، فارسی، عبرانی،

---

① نصرة اهل الایمان بدولة آل عثمان، ص ۷۳، ۷۴

یونانی اور لاطینی زبانیں بھی جانتا تھا۔ شعروادب میں اس کا پایہ اتنا بلند تھا کہ ترک شاعری میں اپنا ایک دیوان چھوڑ گیا۔
فوجی قابلیت میں اُس دور کا کوئی شخص اس کے ہم پلہ نہ تھا۔ وہ رحم دل اور مہربان مگر کسی قدر سخت گیر تھا۔ فوجی یا سیاسی معاملات میں جرم ثابت ہو جاتا تو سخت سزا دیا کرتا تھا۔ اسے شاہی رعب داب کا اتنا لحاظ رہتا تھا کہ بلا ضرورت کبھی دربار یا محفل آراستہ کر کے نہیں بیٹھا۔ نہایت سنجیدہ مزاج تھا۔ شاید ہی اسے کبھی ہنستے دیکھا گیا ہو۔ کبھی بلا ضرورت بات نہیں کی۔ مذہبی اقدار کا پابند تھا۔ نماز باجماعت کا پورا اہتمام کرتا تھا۔ دیانت دار اور عادل تھا۔ کبھی انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ خطا کاروں سے درگزر کرتا۔ وہ نہ صرف ایک عظیم سلطنت کا وارث اور نامور فاتح تھا بلکہ علم و دانش کا پیکر اور علوم و فنون کا بہترین سرپرست بھی تھا۔ اپنے والد کی عزلت نشینی کے باعث ان کی زندگی میں وہ دو بار تخت شاہی پر بیٹھا تھا، اگرچہ اس وقت وہ پندرہ سولہ سال کا تھا اور ایک حکمران کی حیثیت سے کوئی خاص کارکردگی نہ دکھا سکا مگر اس کے بعد اسے سیاسی و عسکری تربیت کے مزید پانچ چھ سال ملے اور وہ ایشیائے کوچک کی گورنری پر مامور رہا۔ اس دوران اس کی صلاحیتوں میں حیرت انگیز طور پر ترقی ہوئی۔ چنانچہ تخت نشینی سے پہلے وہ حکمرانی کے تمام اوصاف سے بہرہ ور ہو چکا تھا۔ [1]

شیر خوار بھائی کے قتل کا الزام اور اس کی حقیقت:

محمد خان ثانی والد کی وفات کے وقت ایشیائے کوچک میں تھا۔ وہ درۂ دانیال پار کر کے ایڈریانوپل پہنچا اور امور حکومت سنبھال لیے۔ چونکہ ولی عہدی کے دور میں اس نے باپ کے حکم پر دو بار حکومت سنبھالی تھی مگر دونوں بار ناکام رہا تھا، اس لیے یہ تاثر عام تھا کہ وہ ایک کمزور حکمران ثابت ہوگا، لہٰذا افسرانِ فوج اس پر حاوی ہو کر اپنے اختیارات بڑھانا چاہتے تھے۔ نیز اسے نااہل تصور کر کے مختلف قیاس آرائیاں اور افواہیں بھی زوروں پر تھیں۔ اس فضا کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان کے بارے میں ایک عجیب افسانہ مشہور ہوا جو مغربی تاریخ کا حصہ بن گیا اور پھر ہماری تاریخوں میں بھی نقل ہونے لگا۔ اس افسانے کے مطابق سلطان محمد فاتح نے تخت نشینی کے فوراً بعد اپنے ایک شیر خوار بھائی احمد چلپی کو جس کی والدہ سربیا کی شہزادی تھی، قتل کرا دیا۔ یہ قتل بھی ایسے موقع پر ہوا تھا جب بچے کی والدہ یعنی سربیا کی شہزادی نئے سلطان کو تخت نشینی کی مبارکباد دینے آئی ہوئی تھی۔ اس دوران سلطان کے حکم سے اس کا ایک افسر ''علی بیگ بن اورہ نوس'' اس معصوم بچے کو قتل کرنے پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی دائی اسے غسل کرا رہی تھی۔ افسر نے دائی کے ہاتھ سے بچے کو چھین کر اسے حوض میں ڈبو کر مار دیا۔ [2] مؤرخین اس پر یہ تبصرہ بھی کرتے ہیں کہ یوں سلطان محمد فاتح نے اقتدار کے تحفظ اور بغاوتوں کے انسداد کے لیے محض شک کی بناء پر بھائیوں کے قتل کی رسم شروع کی تھی۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطان نے سیاسی مصلحت کی خاطر اپنے بھائیوں کو قتل کرانا قانون کے طور پر شاہی اختیارات میں شامل کر دیا تھا۔

---

(1) فاتح القسطنطينية السلطان محمد الفاتح للصلابی، ص ۸۳، ۸۴؛ تاریخ الدولة العثمانیه ازیلماز: ۱/ ۱۴۳ تا ۱۴۵؛ دولت عثمانیہ از ڈاکٹر عزیر: ۱/ ۹۵

(2) Histoire de l.Empire Ottoman by Hammer

درحقیقت اس واقعے پر یقین کرنے کا لازمی اثر یہی ہوسکتا ہے کہ سلطان محمد فاتح کو ایک ایسے سنگین جرم کا مرتکب سمجھا جائے جس کی کوئی صفائی پیش کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین نے اس واقعے کو بڑے افسوس کے ساتھ نقل کیا ہے مگر کیا یہ واقعہ ثابت بھی ہے؟ اس بارے میں محققین کے دو طبقے ہیں:

ایک کے نزدیک اس واقعے کی کچھ اصل ضرور ہے مگر جس طرح واقعہ مشہور ہے، وہ حقیقت کے خلاف ہے۔ دوسرے طبقے کے نزدیک یہ واقعہ محض من گھڑت ہے۔ پہلے طبقے کے حضرات اس امکان کو تسلیم کرتے ہوئے کہ سلطان محمد فاتح کی تخت نشینی کے بعد اس کے چھوٹے بھائی کی موت ہوئی تھی، یہاں دو قسم کی توجیہات پیش کرتے ہیں:

① سابق بادشاہ مراد ثانی کا ایک آٹھ ماہ کا لڑکا تھا جس کی والدہ سربیا کی شہزادی تھی۔ ینی چری فوج کے بعض افسران کا گمان تھا کہ یہ بچہ آگے چل کر اپنی والدہ کے بہکاوے میں آکر بغاوت کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لیے محمد خان ثانی کی تخت نشینی کی تقریب کے دوران، ینی چری فوج کے کسی افسر نے اس بچے کو مار ڈالا۔ اس نے اپنے طور پر یہ حرکت بادشاہ کا قرب اور بڑا عہدہ پانے کے لیے کی تھی۔ اس دور میں ینی چری افسران حکمرانوں کی جانب سے مسلسل ناز برداریاں دیکھ کر اس قدر خودسر ہو چکے تھے کہ بہت سے کام از خود انجام دے ڈالتے تھے جن کا خمیازہ حکومت کو بھگتنا پڑتا تھا۔ یہ حرکت بھی ایسے ہی ماحول میں ہوئی۔ بہر حال سلطان محمد خان نے اس افسوس ناک واقعے پر سخت ناراضی کا اظہار کیا اور اس حرکت کے مرتکب افسر کو کسی رعایت کے بغیر قصاصاً سزائے موت دے دی۔ یورپی مؤرخین نے اس واقعے کو یوں پیش کیا ہے کہ گویا یہ سب سلطان کے حکم سے ہوا تھا۔ حالانکہ ایسا ہوتا تو سزائے موت سے پہلے وہ افسر سلطان کا نام لے سکتا تھا۔ یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مقتول شہزادے کی والدہ سربین شہزادی محمد خان ثانی کو تخت نشینی کی مبارک باد دینے آئی تھی۔ اگر یہ قتل محمد خان کے حکم سے ہوا ہوتا تو شہزادی اس کا منہ بھی نہ دیکھتی۔ ویسے بھی سلطان محمد خان ثانی کو اس شیر خوار بھائی سے کیا اندیشہ ہوسکتا تھا!![1]

② دوسری توجیہ یہ ہے کہ بچے کی دائی اسے حوض کے کنارے غسل کرا رہی تھی کہ اچانک اسے کسی اضطراری بنا پر اٹھنا پڑا۔ اُدھر بچہ کروٹ بدل کر حوض میں جا گرا اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے نکالتا، اس نے دم توڑ دیا۔ انہی دنوں سلطان کے افسر علی بیگ سے کوئی سخت جرم سرزد ہوگیا جس کی بناء پر اسے سزائے موت دے دی گئی۔ اس سے عوام میں یہ بات پھیل گئی یا مخالفین نے قصداً اسے مشہور کر دیا کہ شیر خوار بھائی کو سلطان نے خود قتل کرایا تھا اور علی بیگ کو اس لیے ختم کر دیا گیا کہ بچے کو اسی کے ہاتھوں قتل کرایا گیا تھا لہٰذا اپنے خلاف ثبوت کو مٹانے کے لیے علی بیگ کو بھی نمٹا دیا گیا ہے۔ یوں ایک افواہ پھیل کر تاریخی روایت کی شکل اختیار کر گئی جبکہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔[2]

دوسری طرف ترکی کی تاریخ پر کام کرنے والے بعض حضرات اس واقعے کو سرے سے بے اصل قرار دیتے ہیں جن

---

① تاریخ اسلام از اکبر شاہ نجیب آبادی: ۲/ ۹۰۵

② الدلیل فی تاریخ الدولۃ الاسلامیۃ العثمانیۃ لدکتور نائل سید احمد: ارشیف منتدی الفصیح، ط المکتبۃ الشاملۃ

میں دکتور محمد سالم رشیدی نمایاں ہیں۔ وہ اس مسئلے پر سنداً ومتناً خالص علمی انداز میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہیمر نے یہ روایت بازنطینی مؤرخ ڈوکاس سے نقل کی ہے اور بعد میں آنے والے مغربی اور مشرقی مؤرخین نے اس سے یکساں طور پر اسے نقل کیا ہے یہاں تک کہ یہ قضیہ ایسا ہوگیا کہ گویا اس کی تحقیق سے فراغت ہو چکی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سلطان کی طرف اپنے شیر خوار بھائی کے قتل کا واقعہ من گھڑت ہے جس کی فی الواقع کوئی سند نہیں۔''[1]

پھر چند سطروں بعد فاضل مؤرخ تحریر کرتے ہیں:

''اگر سلطان محمد فاتح کی طرف منسوب اس واقعے میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو فرانسیسی مؤرخ ''فرانتزتس'' اسے ضرور نقل کرتا جو قیصر قسطنطین کا رازدار اور دوست تھا۔ وہ قیصر اور دربارِ عثمانی کے مابین متعدد بار سفارتی ذمہ داریاں بھی انجام دے چکا تھا۔ پس وہ دیگر رومی مؤرخین کی بہ نسبت ان واقعات کا قریب ترین شاہد تھا۔ اس کے بعد فرانتزتس کو سب سے زیادہ حق تھا کہ وہ اس واقعہ کو ذکر کرتا، اسے اچھالتا اور نشر کرتا کیوں کہ وہ سلطان سے بغض رکھتا تھا، اسے سلطان سے شدید نفرت اور اندھی دشمنی تھی۔ وہ سلطان پر طعن وتنقید کرنے اور ایسی باتوں کو شہرت دینے کا عادی تھا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس نے سلطان کی طرف منسوب مذکورہ قصے کو ذکر نہیں کیا بلکہ اس نے شہنشاہ طرابزون کے ذکر کے ضمن میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جب سلطان محمد فاتح تخت نشین ہوا تو اس کا کوئی بھائی قطعاً نہیں تھا۔ یہ فرانسیسی مؤرخ دل کی گہرائی سے چاہتا تھا کہ محمد فاتح مر کر اپنے باپ سے جا ملتا تو سلطنتِ عثمانیہ وارث کے بغیر انتشار واضطراب اور طالع آزماؤں کی جنگوں کی آماجگاہ بن جاتی۔''[2]

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''سلطان محمد فاتح کے چار بھائی تھے جو سب کے سب اپنے والد مراد ثانی کی زندگی میں فوت ہوگئے تھے۔ اسی لیے مستشرق مورگا ڈاسن نے ان عثمانی سلاطین کا ذکر کرتے ہوئے جنہوں نے اپنے بھائیوں کو قتل کرایا تھا، سلطان محمد فاتح کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ پس سلطان محمد فاتح کی جانب منسوب شیر خوار بھائی کے قتل کا واقعہ محض من گھڑت روایت ہے جسے بازنطینی مؤرخ ''ڈوکاس'' نے وضع کیا اور اس سے آسٹریائی مؤرخ ہیمر نے یہ روایت نقل کی۔ پھر بعد میں آنے والے مؤرخین اسے نقل کرتے چلے گئے۔ اس طرح نقل ہونے اور پھیل جانے کے باعث روایت نے صحیح روایت کی حیثیت اختیار کر لی جب کہ اس کا حقیقت اور اصلیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔''[3]

اس تفصیل کے بعد دکتور رشیدی نے بتایا ہے کہ بعض مستشرقین مذکورہ واقعے کے ساتھ مزید اضافے بھی کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ گبن نے یہ اضافہ کر دیا کہ سلطان نے اپنے متعدد بھائیوں کو قتل کیا تھا۔ بعض مستشرقین نے اس پر

---

① السلطان محمد الفاتح، ص ۳۶۰، ط دار البشیر
② السلطان محمد الفاتح، ص ۳۶۱
③ السلطان محمد الفاتح، ص ۳۶۱

یہ حاشیہ لگا دیا کہ ان میں سے ایک بھائی بچ کر یورپ چلا گیا اور نصرانی بن کر "کالستوس عثمانی" کے نام سے مشہور ہوا۔ کنگ فریڈرک نے اسے آسٹریا میں ایک جاگیر دے دی۔ وہاں ایک شہزادی اس پر عاشق ہوگئی اور جب یہ شہزادہ فوت ہوا تو وہ شہزادی اس کے غم میں راہبہ بن گئی۔ [1] یہ سب من گھڑت افسانے ہیں۔ جب نفسِ واقعہ ہی کوئی تاریخی ثبوت نہیں رکھتا تو اس پر اضافوں اور تبصروں کی کوئی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ [2]

قیصر سے کش مکش کا آغاز:

سلطان نے تاج وتخت سنبھالنے کے بعد دو اہم کام کیے: ایک یہ کہ شاہِ ہنگری سے تین سال کے لیے صلح کرلی تاکہ قیصر سے مقابلے کی نوبت آئے تو افواج کسی اور محاذ پر مصروف نہ ہوں۔ دوسرے اس نے ینی چری فوج کو بھی لگام دی اور سرکش افسران کے خلاف کارروائی کر کے انہیں قابو میں کرلیا۔

سلطان محمد ثانی کی تخت نشینی کی خبر قُسطَنطِینِیَّہ پہنچی جہاں ۸۵۲ھ سے قیصر قسطنطین دوازدہم (Constantine th12) تخت نشین تھا۔ اس کے ہاں 'اُورخان' نامی ایک باغی ترک شہزادہ قید تھا جس کی دیکھ بھال کا خرچہ عثمانی حکومت بھیجتی تھی۔ قیصر نے بھی سلطان محمد خان ثانی کی کم عمری دیکھتے ہوئے اسے ایک بزدل حکمران سمجھنے کی غلطی کی اور فوری طور پر اسے پیغام بھیجا کہ وہ 'اُورخان' کی دیکھ بھال کی مد میں بھیجی جانے والی رقم میں اضافہ کردے، ورنہ اسے آزاد کردیا جائے گا اور وہ عثمانی سلطنت کی وراثت کا دعویٰ کر کے تخت پر قابض ہوجائے گا۔

قیصر کو توقع تھی کہ سلطان اس پیغام سے گھبرا جائے گا مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوا۔ سلطان نے اس مطالبے کو کوئی وقعت نہ دی۔ قیصر نے دوبارہ سفیر بھیج کر اس پر اصرار کیا۔ جواب میں سلطان نے 'اُورخان' کا خرچہ بالکل بند کردیا اور قیصر کے سفیروں کو دربار سے نکال دیا۔ اس کے بعد اس نے قیصر کے مطالبے کو ایک ناروا حرکت قرار دیتے ہوئے قُسطَنطِینِیَّہ پر فیصلہ کن حملے کی تیاری شروع کردی۔ [3]

قُسطَنطِینِیَّہ...... تاریخ کے آئینے میں:

یہ شہر بازنطینی بادشاہ قُسطَنطِین اوّل نے ۳۲۷ء میں آبنائے باسفورس اور شاخِ زریں کی تکون پر آباد کیا تھا۔ اس نے شہر کا نام "جدید روم" رکھا تھا مگر یہ اپنے بانی کے نام پر قُسطَنطِینِیَّہ مشہور ہوگیا۔ یہی وہ بادشاہ تھا جس نے دینِ عیسوی کی تحریف شدہ شکل کو فروغ دے کر یورپ اور ایشیا میں پھیلایا۔ اس سے پہلے عیسائیت کا دائرہ بہت محدود تھا۔

پانچویں صدی عیسوی میں جب بازنطینی رومی سلطنت سیاسی اور مذہبی اختلافات کے باعث ایشیائی اور یورپی دو

---

① السلطان محمد الفاتح، ص ۳۶۱، ط دار البشیر

② راقم کو تاحال مسلمانوں کے قدیم مآخذ میں یہ واقعہ منقول نہیں ملا۔ ہاں دکتور سالم رشیدی نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ تاریخ ترک کے بعض قدیم مآخذ میں سلطان کے بھائی کے قتل کا واقعہ منقول ہے۔ مگر دکتور موصوف لکھتے ہیں کہ ان مآخذ میں بھائی کے قتل کا واقعہ غلط اور اضطراب سے خالی نہیں۔ (السلطان محمد الفاتح، ص ۳۶۱، ط دار البشیر)

③ فی اصول التاریخ العثمانی، ص ۶۸۔ تاریخ اسلام نجیب آبادی: ۳/ ۵۴۹

حصوں میں بٹ گئی تو اس کے ساتھ ساتھ کلیسا بھی دو حصوں میں منقسم ہو گیا: مشرق میں عیسائیت کا مرکز ''قسطنطنیہ'' رہا جبکہ مغرب میں یہ اعزاز ''روم'' نے چھین لیا۔ دونوں کے پیشوائے اعظم بھی الگ الگ ہو گئے۔ اب قسطنطنیہ کا کلیسا یونانیوں کا تھا جو آرتھوڈکس چرچ کہلاتا تھا اور اس کے پیشوا کو ''بطریق'' (Patrick) کہا جاتا تھا۔ روم کا کلیسا کیتھولک چرچ کے نام سے موسوم تھا جس کے پیشوا کو پوپ کہا جاتا تھا۔

قسطنطنیہ اپنی مستحکم ترین فصیل کے باعث صدیوں تک ہر حملہ آور کے لیے ناقابل تسخیر رہا۔ ۲۱ محاصران جنگوں میں اس نے ناقابل شکست ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ یہ شہر سوا گیارہ صدیوں سے بازنطینی رومیوں کا پایۂ تخت چلا آرہا تھا۔ درمیان میں ۶۰۰ھ میں وینس کے ایک طالع آزمانے یہاں قبضہ کر کے قیصریت اپنے خاندان میں منتقل کر لی اور یہاں لاطینی سلطنت قائم کی جو روم کے پوپ کی وفادار تھی۔ تاہم ۶۰ سال بعد بازنطینیوں نے یونانیوں کی مدد سے یہاں قبضہ کر کے قیصریت کو روم کے پنجے سے آزاد کرا لیا اور یہاں آرتھوڈکس چرچ کی اجارہ داری دوبارہ قائم کر دی۔

یہ شہر نہ صرف قیصر کا پایۂ تخت اور یونانی کلیسا کا مرکز ہونے کی وجہ سے دنیائے نصرانیت کی جان تھا بلکہ تجارتی، تمدنی اور اقتصادی لحاظ سے بھی پوری دنیا میں ممتاز تھا۔ اس کی فتح کی صورت میں نہ صرف نصرانیت کے پرچم سرنگوں ہو جاتے اور قیصریت مٹ جاتی بلکہ نواحی یورپی ریاستوں کی فتح کے بعد پورے یورپ پر قبضے کا وہ خواب جو بایزید یلدرم نے دیکھا تھا، بہت جلد پورا ہو سکتا تھا۔[1] خلفائے راشدین کے زمانے ہی سے مسلمان حکمران یہ شہر فتح کرنے کے لیے کوشاں رہے تھے۔ اس بارے میں صحیح حدیث موجود تھی:

''اَوّلُ جیش من اُمتي یغزون مدینة قیصر مغفورٌ لھم.''

''قیصر کے شہر پر سب سے پہلے جہاد کرنے والے میرے امتیوں کے لیے مغفرت کی بشارت ہے۔''[2]

اگرچہ حدیث کا مصداق بظاہر وہ لوگ تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہاں جہاد کیا مگر اس کا ایک امکانی مطلب یہ بھی تھا کہ اس شہر کو سب سے پہلے فتح کرنے والوں کے لیے یہ بشارت ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے آٹھ صدیوں میں اس بشارت کے حصول کے لیے کئی بار اس شہر کا محاصرہ کیا مگر کبھی کامیابی نہ ہو سکی۔ آخری کوشش محمد خان ثانی کے پر دادا بایزید یلدرم نے کی تھی جو تیمور لنگ کے حملے کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی۔

قیصر کی کوششیں:

قیصر نے جب دیکھا کہ اب محمد خان ثانی قُسطَنطِینیہ کو فتح کیے بغیر نہیں رہے گا تو اس نے قُسطَنطِینیہ کے باشندوں کو جن کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، جوش دلایا کہ وہ شہر کی مدافعت کے لیے پوری طرح تیار رہیں۔ ان سے جنگی

---

① نزھة الانظار: ۱۹/۲، ۲۰؛ تاریخ سلاطین بنی عثمان از یوسف بیگ آصاف، ص ۲۲ تا ۲۳؛ السلطان محمد الفاتح لدکتور عبدالسلام فھمی، ص ۵۵ تا ۵۹

② صحیح البخاری، ح: ۲۹۲۴، باب قتال الروم

اخراجات کے لیے خطیر رقم وصول کی گئی۔ ساتھ ہی قیصر نے روم میں اپنے سفیر بھیج کر کیتھولک مذہب قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور مذہبی حمیت کا واسطہ دے کر درخواست کی اسے مسلمانوں کے حملے سے بچانے کے لیے صلیبی جنگ کا اعلان کیا جائے۔ اس التجا کے جواب میں پوپ نکلسن پنجم نے یورپی ممالک کو ترکوں کے خلاف مہم جوئی کا حکم دے دیا۔ اسپین، وینس اور جنیوا کی فوجیں اس حکم کے مطابق قُسطَنطِینِیَّہ پہنچ گئیں۔ خود پوپ نے ایک مشہور کارڈینل 'ایسوڈور' کو ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نے قُسطَنطِینِیَّہ پہنچ کر قدیم آرتھوڈکس چرچ ''آیاصوفیہ'' میں کیتھولک رسوم کے مطابق عبادت کی۔

قیصر کا یونانی وزیر لوکس نوٹراس کیتھولک چرچ سے اتحاد کا مخالف تھا۔ اسے وہ بہیمانہ مظالم یاد تھے جو روم نے ۶۰۱ھ (۱۲۰۴ء) کی مہم جوئی میں اہلِ قُسطَنطِینِیَّہ پر ڈھائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یونان نے قیصر کی مدد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا بلکہ اہلِ یونان صاف کہتے تھے کہ قیصر کا آرتھوڈکس چرچ کو چھوڑ کر کیتھولک چرچ کی طرف میلان خدا کے غضب اور قُسطَنطِینِیَّہ سے قیصریت کے خاتمے کی علامت ہے۔

قیصر کا یونانی وزیر اعظم قُسطَنطِینِیَّہ کی سڑکوں پر چیختا پھرتا تھا کہ مجھے یہاں لاطینی ٹوپ کی جگہ سلطان محمد خان کا تاج اور ترکوں کے عمامے دیکھنا زیادہ پسند ہے۔ جب وزیر کی چیخ وپکار بے سود ثابت ہوئی تو وہ شہر میں مقیم یونانی باشندوں سمیت نقل مکانی کر کے یونان چلا گیا۔[1]

توپ خانے کا ابتدائی دور:

قیصر نے یونانیوں کی مخالفت کی کوئی پروانہ کرتے ہوئے شہر میں خوراک ورسد اور اسلحے کے بے پناہ ذخائر جمع کر لیے تھے۔ قلعے اور فصیل کے پرانے حصوں کو مرمت کر کے مزید مضبوط بنایا جارہا تھا۔ یورپی ممالک سے بڑے بڑے امراء، جرنیل، ماہرینِ اسلحہ سازی و تعمیرات اور سپاہی برابر قُسطَنطِینِیَّہ پہنچ رہے تھے۔ ان کے بیڑے درہ دانیال سے داخل ہو کر قُسطَنطِینِیَّہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو جاتے تھے۔

اس وقت دنیا میں توپ خانہ نیا نیا ایجاد ہوا تھا۔ رومیوں کے پاس بھی توپیں تھیں اور ترکوں کے پاس بھی، مگر یہ توپیں بالکل ابتدائی شکل کی تھیں۔ بڑے بڑے پائپوں میں نہایت وزنی گولے ڈالے جاتے اور انہیں بارود کے ذریعے اُڑا کر حریف کو نشانہ بنایا جاتا۔ اس عمل میں توپوں کے دہانے پھٹ جانے کا خدشہ رہتا۔ اس لیے ایک بار گولہ پھینکنے کے بعد توپ کو پوری طرح ٹھنڈا ہونے دیا جاتا۔ یوں دن بھر میں ایک توپ آٹھ دس گولے ہی پھینک سکتی تھی۔ توپوں کا کام وہی تھا جو منجنیق کا، یعنی قلعے اور فصیل کو توڑنا۔ اس کام میں بھی اس وقت تک توپ اور منجنیق کی کارکردگی میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔[1]

---

① تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۵۲، ۵۳

② تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۳۱، ۱۳۲؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ: ص ۱۶۲

شہر کی دفاعی نوعیت:

قُسطنطینیہ کی شکل مثلث نما تھی۔ایک سمت خشکی تھی اور دو جانب سمندر۔مغرب کی سمت جہاں خشکی تھی، دنیا کی محفوظ ترین فصیل تھی جسے پانچویں صدی عیسوی میں شاہ تھیوڈوسس ثانی نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ کئی کئی گز چوڑی تین دیواروں پر مشتمل تھی۔اندرونی دو دیواروں کے مابین ساٹھ فٹ چوڑی اور سو فٹ گہری خندق تھی جسے عبور کرنا ناممکن تھا۔اندرونی حصے کی آخری دیوار سب سے زیادہ بلند تھی جس کے ساتھ فلک بوس برج قائم تھے۔

سمندری رخ پر جنوب میں بحیرۂ مرمرہ (مارمورا) تھا اور شمال میں آبنائے باسفورس، جس کے مشرقی کنارے پر ترکوں کے قلعے تھے اور مغربی سمت میں قیصر کے۔باسفورس کی ایک آبی پٹی سینگ کی طرح مڑتے ہوئے خشکی میں کئی میل اندر گھس کر قُسطنطینیہ کے شمال مشرق کو پوری طرح محفوظ بنا دیتی تھی۔اس سمندری پٹی کو "گولڈن ہارن" یا شاخِ زرّیں کہا جاتا تھا۔شہر کی بندرگاہ اسی آبی پٹی کے کنارے تھی۔

قُسطنطینیہ کی سمندری سمتیں بھی محفوظ تھیں، بحیرۂ مرمرہ میں رومی بحری بیڑہ تعینات تھا جبکہ گولڈن ہارن میں رومیوں کے بحری جہاز بھی تھے اور اس کے علاوہ بندرگاہ سے دور آبنائے باسفورس کے دہانے پر لوہے کی ایک بھاری زنجیر تان دی گئی تھی جس کی وجہ سے کسی حریف کی کشتی یا جہاز کا بندرگاہ کے قریب پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ہاں جب اہلِ شہر کسی کشتی یا جہاز کو بندرگاہ میں داخل ہونے کی اجازت دیتے تو ایک چرخی گھما کر اس زنجیر کو سمندر کی گہرائی میں اتار دیتے، یوں راستہ کھل جاتا تھا۔[1]

رومیلی حصار کی تعمیر:

بایزید یلدرم نے قُسطنطینیہ پر حملہ کرنے کے لیے آبنائے باسفورس کے مشرقی کنارے پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا جسے اناضولی حصار کہا جاتا تھا۔محمد خان ثانی نے اپنی مہم سے پہلے آبنائے باسفورس کو مکمل طور پر کنٹرول کرنے کے لیے آبنائے کے مغربی کنارے پر اپنے ہاتھ سے نقشہ بنا کر چار ماہ کی مختصر مدت میں مثلث شکل کا ایک چھوٹا مگر مضبوط ترین قلعہ تعمیر کرالیا جسے رومیلی حصار کا نام دیا گیا۔اس کی دیواریں شمالاً جنوباً ۸۲۰ فٹ اور شرقاً غرباً ۴۱۰ فٹ طویل تھیں۔ان کی موٹائی ۲۳ فٹ تھی۔قلعہ سطحِ سمندر سے ۸۲ میٹر بلند تھا اور اس کے برجوں کی اونچائی ۹۲ فٹ تھی۔

یہ قلعہ قیصر سے زمین لے کر بنایا گیا تھا۔مؤرخین کے مطابق جب سلطان نے اس کی تعمیر کا عزم کیا تو قیصر کو پیغام بھیجا کہ خلیج کے دوسرے کنارے پر صرف ایک بیل کی کھال کے برابر زمین درکار ہے۔قیصر نے اسے مذاق سمجھا اور اجازت دے دی۔سلطان نے ایک بڑے بیل کی کھال کی پرتوں کو باریکی سے علیحدہ کرکے اس کے دھاگے بنوائے اور انہیں خلیج کے تنگ ترین حصے کے کنارے پھیلانے کا حکم دیا۔جو جگہ ملی اسی پر قلعہ تعمیر کیا گیا۔

اب اناضولی اور رومیلی قلعوں پر توپیں نصب کرادی گئیں، درمیان میں فقط ۶۶۰ میٹر چوڑی خلیج تھی، یوں

[1] تاریخ سلاطین بنی عثمان از یوسف بیگ آصاف، ص ۲۶ تا ۲۸

آبنائے باسفورس کے دونوں سروں پر ترکوں کا قبضہ ہوگیا اور رومیوں کے لیے ناممکن ہوگیا کہ وہ ترکوں سے اجازت لیے بغیر ان کی گولہ باری سے بچ کر اپنے جہاز بحیرۂ اسود میں لے جائیں۔ تاہم اس کے باوجود ان کے لیے بحیرۂ مارمورا کھلا تھا۔ یورپی بیڑے درۂ دانیال سے بحیرۂ مارمورا میں آتے اور گولڈن ہارن میں داخل ہو کر بندرگاہ سے آلگتے۔ [1]

سلطان کی پیش قدمی...... قیصری پایۂ تخت پر دھاوا:

سلطان محمد خان ثانی ۲۳ مارچ کو پچاس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اپنے پایۂ تخت ایڈریانوپل سے قُسطَنطِینیَہ کی طرف روانہ ہوا اور تیرہ دن خشکی کے راستے سے سفر کے بعد ۲۱ ربیع الاوّل (۵ اپریل ۱۴۵۳ء) کو قیصری پایۂ تخت کی مغربی سمت میں نمودار ہوا اور اپنا خیمہ شہر کے دروازے سینٹ رومانوس کے سامنے نصب کرایا۔ [2]

اس نے یلغار سے پہلے اپنے صدرِ اعظم احمد پاشا کو بھیج کر ملک کے بڑے بڑے علماء و مشائخ سے اس جہاد میں شرکت کی درخواست کی تھی۔ یہ سب حضرات اس وقت سلطان کی خیمہ گاہ میں تھے۔ ان میں شیخ شمس الدین محمد بن حمزہ اور شیخ آق بیق بھی شامل تھے۔ شیخ شمس الدین نے احمد پاشا کو کہہ دیا تھا:

''ان شاء اللہ یہ شہر اسی سال ۲۰ جمادی الاولی کو دوپہر کے وقت فتح ہو جائے گا۔'' [3]

اسلامی لشکر نے پوری تیاری کے ساتھ اس ناقابل تسخیر فصیل پر حملے شروع کر دیے۔ اس دوران نقب لگانے کے ماہر فصیل کی بنیادوں میں سرنگیں بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

قُسطَنطِینیَہ کی فوج پورے جوش و خروش سے مقابلہ کرتی رہی۔ قیصر قُسطَنطِین خود مزاحمتی کارروائیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ پادری سپاہیوں کی ہمت ابھار کر انہیں ثابت قدم رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ پوپ نکلسن پنجم کی طرف سے متعین کارڈینل اپنے جیالوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونکتا چلا جا رہا تھا۔ یونانی نواب ڈیوک نوٹرس اور جنیوا کے سالار جان آگسٹس نے بھی شہر کی مدافعت میں پوری جان لڑا دی تھی۔ اس دوران ہنگری نے بھی ترکوں سے معاہدہ توڑ کر قیصر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور ایک فوج اس کی مدد کے لیے بھیج دی۔ اس طرح قُسطَنطِینیَہ کا دفاع اور مضبوط ہوگیا۔

شروع میں نصرانی شہر سے نکل کر مسلمانوں پر دھاوے بولتے رہے مگر ان حملوں میں انہی کا زیادہ نقصان ہوا۔ اس کے بعد شہر کی دیواروں سے سنگ باری اور تیر اندازی کے علاوہ منجنیق اور توپ خانے کے ذریعے مسلمانوں پر جوابی حملے جاری رہے۔ ادھر سے عثمانیوں کا توپ خانہ بھی گرج رہا تھا۔ اس میں دو سو توپیں تھیں جن میں سے زیادہ تر ہنگری کے ایک توپ ساز ''اربن'' نے بنا کر دی تھیں۔ یہ توپیں پتھر کے تین سو کلوگرام وزنی گولے ایک میل کے فاصلے تک پھینکتی تھیں۔ ایک توپ نصب کرنے اور چلانے کے لیے سات سو افراد کا عملہ تھا۔ نال بھرنے اور ایک فائر کرنے میں دو گھنٹے

---

① اخبار الدول: ۳/ ۲۸؛ تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/ ۱۳۱؛ نزهة الأنظار: ۲/ ۲٦

② تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/ ۱۳۳

③ البدر الطالع از علامه شوکانی: ۲/ ٦٧

لگتے تھے۔قدیم وضع کے اس توپ خانے نے کئی دن کی نشانہ بازی کے بعد شہر کی فصیل کو چند مقامات سے توڑ پھوڑ دیا تاہم رومیوں نے بلاتاخیر مرمت کر کے فصیل کو دوبارہ مضبوط کرلیا۔

سلطان نے یہ دیکھ کر فصیل پر براہِ راست حملوں کا حکم دیا۔مجاہدین خندق کو کئی جگہوں سے پاٹ کر فصیل تک جا پہنچے مگر اسے سر کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔اوپر سے محصورین نے جلتا ہوا تیل پھینکنا شروع کر دیا جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان ہوا۔سلطان نے اس کوشش کی ناکامی کے بعد پہیوں پر حرکت کرنے والے بلند وبالا چوبی مینار بنوائے جنہیں ''دبابہ'' کہا جاتا تھا۔مجاہدین دبابوں کے ذریعے فصیل کی طرف بڑھتے اور تیراندازی وسنگ باری کر کے حریف کو نشانہ بناتے رہے۔دبابوں کی چوٹی پر متحرک پُل لگائے گئے تھے تا کہ ان کے ذریعے فصیل پر پہنچا جاسکے۔مگر جب بھی دبابے فصیل کے قریب پہنچتے ،محصورین آتشیں گولے پھینک کر انہیں جلا دیتے۔

محاصرہ شروع ہوئے ۹ دن گزر گئے مگر فتح کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔اس دوران ترک بحریہ جو بیس ہزار سپاہیوں اور تین سو کے لگ بھگ چھوٹے جہازوں پر مشتمل تھی ،سمندر کی سمت سے قُسطَنطِینِیّہ کی بندرگاہ گولڈن ہارن کے دھانے پر لنگرانداز تھی۔تاہم لوہے کی زنجیر اور اس کے پار رومی بحری بیڑے نے انہیں مزید آگے نہ بڑھنے دیا۔

۱۵ اُپریل کو جنیوا کے پانچ بحری جہاز خوراک ورسد اور گولہ بارود لیے ہوئے مغرب سے نمودار ہوئے ،وہ بحیرۂ مرمرہ میں داخل ہوئے اور سیدھے گولڈن ہارن کا رخ کیا۔عثمانی بحریہ نے ان کا راستہ روکنے کی بھرپور کوشش کی مگر ان کے جہاز یورپی جہازوں کے مقابلے میں چھوٹے تھے ،اس لیے یورپی جہاز انہیں دھکیل کر راستہ صاف کرتے ہوئے گولڈن ہارن تک پہنچ گئے۔بندرگاہ کے عملے نے لوہے کی زنجیر گرا کر انہیں اندر داخل کرلیا اور زنجیر دوبارہ چڑھادی۔[1]

جب بحری جہاز خشکی پر چلائے گئے:

سلطان محمد خان ثانی نے محصورین کو تازہ کمک پہنچنے اور اپنی بحریہ کی ناکامی کا یہ منظر بذاتِ خود دیکھا۔ہر تدبیر رائیگاں دیکھ کر وہ بے چین ہوگیا اور کسی نئے منصوبے پر غور کرنے لگا۔اس وقت رومیوں کی زیادہ طاقت خشکی کی فصیل پر جمع تھی جہاں مسلمانوں کے حملوں کا زور تھا۔بحیرۂ مارمورا میں ان کا بحری بیڑا کھڑا تھا جو مسلمانوں پر فوقیت رکھتا تھا۔گولڈن ہارن کی بندرگاہ ،فولادی زنجیر کی وجہ سے مسلمانوں کے بیڑے کی پہنچ سے بالکل محفوظ تھی۔حریف کے کئی بحری جہاز زنجیر کے پاس پہرہ دے رہے تھے ،تاہم گولڈن ہارن کے کنارے شہر کی فصیل زیادہ اونچی نہیں تھی ،کیوں کہ اس خلیج کا دہانہ عبور کر کے شہر تک رسائی ویسے ہی ناممکن سمجھی جاتی تھی۔

سلطان نے سوچا اگر کسی طرح اس آبی پٹی میں بحری بیڑہ پہنچا دیا جائے تو شہر ہر طرف سے گھر جائے گا اور فتح آسان ہوجائے گی۔مگر فولادی زنجیر اور رومی جہازوں کی موجودگی میں یہ کام کس طرح ممکن تھا؟

سوچتے سوچتے اسے ایک عجیب ترین تدبیر سوجھی۔اس نے فیصلہ کیا کہ آبنائے باسفورس پر تعینات اپنا بحری بیڑہ

[1] تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/ ۱۳۲ تا ۱۳۴ ، الدولة العثمانیه از صلابی: ۱/ ۱۰۰، ۱۰۱

خشکی پر چڑھا دیا جائے اور بحری ناکہ بندی کا علاقہ خشکی کا چکر کاٹ کر عبور کرلیا جائے۔ اس کے بعد رومی بحریہ کی پشت پر آکر جہازوں کو شہر کی بندرگاہ کے سامنے لا کر پانی میں اتار دیا جائے اور بندرگاہ پر یک بارگی حملہ کر دیا جائے۔

سلطان نے خشکی پر جہاز کھینچنے کے لیے فوری طور پر منصوبہ سازی کی۔ آبنائے باسفورس کے کنارے سے لے کر شاخِ زرّیں تک خشکی کا ایک دس میل طویل قطعہ تھا۔ اس پر لکڑی کے بڑے بڑے مضبوط تختے بچھا دیے گئے اور انہیں چربی اور تیل کے ذریعے خوب چکنا کر لیا گیا۔ ۱۴ جمادی الاولیٰ کی مکمل چاندنی میں ہزاروں سپاہیوں نے ۸۰ چھوٹے جہازوں کو ان تختوں پر چڑھا کر دھکیلنا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے ہوا کا رُخ اسی جانب تھا، اس لیے بادبان کھول دیے گئے، یوں جہازوں کو مطلوبہ سمت میں لے جانے کی مشقت کچھ کم ہوگئی۔

رات بھر جہازوں کو شاخِ زرّیں میں اتارنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس شوروغل کی آوازیں رومیوں کے کانوں میں پڑتی رہیں مگر وہ کچھ نہ سمجھ پائے کہ کیا ہو رہا ہے۔ مغرب کی جانب سے ترکوں کا توپ خانہ پوری رات گولے برساتا رہا، اس لیے نصرانیوں کی توجہ اسی طرف مبذول رہی اور گولڈن ہارن کی بندرگاہ کے پار ہونے والی نقل وحرکت کو وہ بالکل نہ سمجھ پائے۔ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ترکوں نے اپنے جہاز گولڈن ہارن میں اتار لیے اور پھر انہیں ایک قطار میں اس طرح کھڑا کیا کہ خلیج کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک پل بن گیا۔ ترک فوج اس کے ذریعے شہر کی بندرگاہ اور فصیل تک پہنچ گئی۔ صبح کی روشنی میں جب اہلِ شہر نے یہ منظر دیکھا تو وہ ششدر رہ گئے۔ [1]

یورپی مؤرخ ڈوکاس سلطان کے اس حیرت انگیز کارنامے پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ”ہم نے اس سے پہلے ایسے کرشمے کے بارے میں کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ محمد خان ثانی خشکی عبور کر کے سمندر تک جا پہنچا اور اس کا بحری بیڑا سمندر کی موجوں کی جگہ پہاڑوں کی چوٹیوں کو پار کر گیا۔ محمد خان ثانی اس کارنامے کی وجہ سے سکندرِ اعظم سے بھی بڑھ گیا۔“ [2]

قیصر کو آخری بار امان کی پیش کش:

قیصر نے آخری کوشش کے طور پر بحیرۂ مارمورا میں موجود اپنے بحری بیڑے کو شاخِ زریں میں آنے کا حکم دیا مگر جب یہ بحری بیڑا آبنائے باسفورس پہنچا تو دونوں سمتوں میں موجود ترک قلعوں سے ان پر گولے داغے گئے۔ کئی جہازوں کے غرق ہونے کے بعد رومی بیڑا پسپا ہوگیا۔ اسی دن (۲۴ مئی کو) قیصر نے شکست سامنے دیکھ کر سلطان کو پیغام بھیجا کہ اگر ایک باج گزار حاکم کے طور پر قُسطَنطِینِیَّہ اسی کے پاس رہنے دیا جائے تو وہ منہ مانگا خراج ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ مگر سلطان محمد خان ثانی فتنوں کے اس مرکز کو ہر قیمت پر فتح کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا، اس لیے جواباً کہلوایا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے تو اسے جنوبی یونان دیا جا سکتا ہے۔ قیصر نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور مقابلے پر بضد رہا۔

---

[1] اخبار الدول: ۲۸/۳ ؛ تاریخ الدولة العلية، ص ۱۶۳

[2] تاريخ الدولة العثمانية ازيلماز: ۱/ ۱۳۵

سلطان نے قیصر کو ایک بار پھر پیغام دیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے متعلقین، خزانوں اور مال و متاع کے ساتھ کہیں بھی چلا جائے مگر قیصر نے پھر بھی مثبت جواب نہ دیا۔[1]

فیصلہ کن حملہ...... شیخ شمس الدین کی دعا...... فتح مبین:

آخر ۱۹ جمادی الاولیٰ (۲۸ مئی) کو بوقتِ شب سلطان نے افواج کو حکم دیا کہ وہ صبح سویرے آخری فیصلہ کن حملے کے لیے تیار ہو جائیں۔ رات بھر فوج نئے ولولے کے ساتھ تیار ہوتی رہی۔ ۲۰ جمادی الاولیٰ (۲۹ مئی) کو نمازِ فجر کے بعد سلطان نے دس ہزار منتخب سپاہی لے کر شہر کی مغربی فصیل پر دھاوا بول دیا۔ توپیں گرج گرج کر گولے پھینک رہی تھیں اور شہر کی دیوار شکستہ ہوتی جا رہی تھی۔ رومیوں نے بھی پورے قومی جوش و خروش کے ساتھ مزاحمت کی۔ سلطان شہر کی فصیل کے سامنے خیمہ لگا کر مسلسل دعاؤں میں مصروف تھا اور علماء و مشائخ سے بھی دعائیں کرا رہا تھا مگر فتح میں دیر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر دوپہر ہوگئی، مسلمان اپنی پوری طاقت لڑائی میں جھونک چکے تھے مگر فتح کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تب سلطان کا ایک امیر بے قرار ہو کر شیخ شمس الدین کے خیمے کی طرف لپکا۔ دیکھا کہ وہ سجدے میں سر رکھے زار و قطار روتے ہوئے فتح و نصرت کی دعائیں کر رہے ہیں۔ یکایک وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور تکبیر کا نعرہ بلند کر کے بولے:

''الحمدللہ! شہر فتح ہو گیا۔'' امیر نے پلٹ کر شہر کی طرف دیکھا تو ترک توپوں نے فصیل کا ایک حصہ گرا دیا تھا۔

سلطان نے فوج کو شہر میں گھسنے کا حکم دیا۔ عثمانی سپاہیوں نے تین مرحلوں میں یلغار کی: پہلے جانباز دستے خندقیں عبور کر کے منہدم شدہ فصیل سے شہر میں گھسنے لگے۔ امیر ولی الدین سلیمان نے فصیل پر تعینات دشمنوں سے لڑ بھڑ کر ترکوں کا سرخ ہلالی پرچم نصب کر دیا اور اسی کش مکش میں جان دے دی۔ اس سے پہلے کہ دشمن پرچم کو گراتا، یکے بعد دیگرے اٹھارہ عثمانی سپاہی وہاں پہنچے، ہر ایک پرچم کی حفاظت کرتے ہوئے کٹتا چلا گیا۔ اس دوران سپاہیوں کا دوسرا ریلا، توپوں سے پیدا ہونے والے شگافوں اور سیڑھیوں کے ذریعے شہر میں گھس کر دروازوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ دروازے کھلتے ہی تیسرا ریلا اندر آیا اور شہر میں پھیل گیا۔ آخر میں ینی چری فوج اندر داخل ہوئی اور شہر کو کنٹرول میں لینے لگی۔ قیصر آخری لمحات میں اپنی محفوظ فوج اور محافظ دستوں سمیت شہر کے دفاع کے لیے پھاٹک پر پہنچ گیا تھا۔ اس کی منت سماجت کے باوجود کئی نواب اور امراء میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ تاہم قیصر ڈٹا رہا۔ اس کی قیادت میں رومیوں نے مزاحمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر فاتحین کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ ادھر ترک بحریہ نے خلیج کے دھانے پر قبضہ کر کے زنجیر گرا دی تھی اور پورا عثمانی بیڑہ گولڈن ہارن کی بندرگاہ تک پہنچ چکا تھا۔ ان سپاہیوں نے آناً فاناً بندرگاہ پر قبضہ کر کے مشرقی فصیل بھی سر کر لی۔ یوں اللہ کی مدد و نصرت سے بازنطینی پایہ تخت فتح ہو گیا۔[2]

---

① الدولة العثمانیه از صلابی: ۱/۱۰۰، ۱۰۱؛ تاریخ الدولة العلية، ص ۱۶۳، ۱۶۴؛ تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/۱۳۵، ۱۳۶

② اخبار الدول: ۳/۲۹؛ تاریخ الدولة العثمانیه از یلماز: ۱/۱۳۷؛ البدر الطالع: ۲/۱۶۷

سلطان محمد خان فاتح آیا صوفیہ اور قیصر کے محل میں:

سلطان گھوڑے پر سوار فصیل کے منہدم حصے سے شہر میں داخل ہوا اور سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس نے دعا کی کہ اللہ شہداء پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ اس نے شہر کی فتح کے بارے میں وارد حدیث رسول پڑھی اور غازیوں کو مغفرت کی بشارت دی۔ ظہر کا وقت ہو چکا تھا، اس نے چرچ ''آیا صوفیہ'' میں اذان دی اور باجماعت نماز ادا کی۔ اس کے حکم سے چرچ کو مسجد کی حیثیت دے دی گئی، تاہم تعمیر میں فقط اتنا تغیر کیا گیا جو شرعاً واجب تھا اور اس کے بغیر نماز جائز نہ تھی۔

سلطان قیصر کے شاہی محل میں داخل ہوا۔ یہ قصرِ بے مثال جو تین براعظموں پر مشتمل بازنطینی سلطنت کا مرکز تھا اور دنیا بھر کے حکام، نواب اور سفیر اس دہلیز پر آنا فخر سمجھتے تھے، آج مکینوں سے خالی ہو چکا تھا۔ قیصر لڑتا ہوا، شہر کے دروازے سینٹ ارمانوس کے قریب مارا گیا تھا۔ اس کا سر کاٹ کر سلطان کو پیش کر دیا گیا تھا۔ قیصر کا ایک پوتا مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس کے سوا، اس خاندان کا کوئی نام ونشان نہ رہا۔ ①

یوں نبی اکرم ﷺ کی وہ پیش گوئی بھی حرف بحرف پوری ہو گئی کہ:

''اِذَا هَلَکَ قَیْصَرُ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَهٗ'' (جب قیصر مارا جائے گا تو پھر کوئی اور قیصر نہیں ہوگا۔) ②

شیخ شمس الدین کی نصیحت:

فتح کے اگلے دن سلطان محمد فاتح شیخ شمس الدین کے خیمے میں حاضر ہوا۔ شیخ اپنی جگہ لیٹے رہے۔ سلطان نے دست بوسی کر کے درخواست کی کہ اسے کچھ دن خلوت میں ساتھ رکھ کر ذکر وشغل میں انہماک کی اجازت دی جائے۔

شیخ نے منع کر دیا اور فرمایا: ''اگر تم خلوت میں ذکر وشغل میں مصروف ہوئے تو ایسی لذت ملے گی کہ سلطنت سے جی اچاٹ ہو جائے گا اور ملکی انتظام ابتر ہونے لگے گا۔ ایسا ہوا تو اللہ ہم سے ناراض ہوگا۔ خلوت میں ذکر وشغل کا مقصد یہی ہے کہ انسان عادل بن جائے۔ اس کے لیے تم چند باتوں کا لحاظ رکھو۔''

یہ کہہ کر شیخ نے سلطان کو عدل، تقویٰ اور اصلاحِ نفس کے متعلق کچھ نصیحتیں کیں۔ ③

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی گم شدہ قبر دریافت:

سلطان کو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر کی تلاش تھی جو صدیوں میں گم شدہ ہو چکی تھی۔ اتنا معلوم تھا کہ وہ شہر کی فصیل کے پاس ہے۔ شیخ شمس الدین کو یہ خدمت سونپی گئی۔ وہ شہر کی فصیل کے پاس گئے اور کشف ووجدان کے ذریعے انہیں قبر کی صحیح جگہ کا تعین کر دیا۔ سلطان کو معلوم ہوا تو شیخ سے کہا:

''کوئی ایسی علامت بیان فرمائیے کہ یقین ہو جائے یہ انہی کا مدفن ہے۔''

---

① تاریخ الدولة العثمانية: ۱/۱۳۸، ۱۳۹

② صحيح البخاری، ح: ۳۱۲۰، کتاب الجهاد

③ البدر الطالع للشوکانی: ۲/۱۶۷

شیخ نے کہا: ’’یہاں کھدائی کریں گے تو دو ہاتھ نیچے سنگِ مرمر کی ایک تختی ملے گی جس سے یہ دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔‘‘ کھدائی کی گئی تو واقعی دو ہاتھ بعد سنگ مرمر کا ایک تختہ نکلا جس پر لاطینی زبان میں تحریر تھا کہ یہ ابوایوب انصاری کی آخری آرام گاہ ہے۔ سلطان محمد فاتح حیرت ومسرت سے ازخود رفتہ ہو گیا۔ حالت سنبھلنے پر اس نے قبر کی مرمت کرائی اور وہاں ایک گنبد تعمیر کرا دیا۔ [1]

قُسطَنطِینِیّہ پر مسلمانوں کے گیارہ حملے ایک نظر میں:

قسطنطینیہ کی تاریخی فتح ۲۰ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ (۲۹ مئی ۱۴۵۳ء) کو ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے یہاں گیارہ مرتبہ لشکر کشی کی۔ پہلی لشکر کشی ۳۲ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کی۔ [2] دوسری ۴۹ھ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے یزید نے کی۔ [3] تیسری ۹۷ھ میں سلیمان بن عبدالملک کے حکم سے مسلمہ بن عبدالملک نے کی۔ [4] چوتھی ۱۶۵ھ میں مہدی عباسی کے حکم سے اس کے ولی عہد ہارون الرشید نے کی۔ [5] پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں بار بایزید یلدرم نے چڑھائی کی۔ نویں لشکر کشی موسیٰ بن بایزید اور دسویں مراد ثانی نے کی۔ گیارہواں اور آخری حملہ سلطان محمد خان ثانی نے کیا۔ اس فتح کی یادگار میں اسے فاتح کا لقب ملا اور وہ سلطان محمد خان فاتح کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۵ برس تھی۔ [6]

فتح کے بعد سلطان کا عوام سے حسنِ سلوک:

قُسطَنطِینِیّہ کی جنگ میں چالیس ہزار عیسائی قتل اور ساٹھ ہزار گرفتار ہوئے تھے۔ سلطان نے قیدیوں سے بہت اچھا سلوک کیا اور انہیں آزاد کر کے ایک الگ محلے میں آباد کر دیا۔ سلطان نے اعلان کیا کہ عیسائیوں کے مذہبی معاملات اور پادریوں کے مذہبی اختیارات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ اس نے اس وعدے پر پوری طرح عمل کیا۔ عیسائیوں کو مذہبی آزادی دی، ان کے گرجوں کو امان دی اور انہیں اپنا بطریق (بڑا پادری) چننے کا اختیار دیا۔ چنانچہ عیسائیوں نے جمع ہو کر ’جنادیوس‘ کو اپنا بطریق چن لیا۔ سلطان نے اس انتخاب پر اظہارِ اعتماد کرتے ہوئے نئے بطریق کو رومیوں کا رئیس مقرر کر دیا اور اس کی حفاظت کے لیے ینی چری فوج کا ایک دستہ مخصوص کر دیا۔ کلیسا کے بڑے عہدوں کے لیے ایک مجلس تشکیل دی گئی۔ [7]

فتح نامے:

اس عظیم فتح کے بشارت نامے پورے عالم اسلام میں بھیجے گئے۔ مصر کے مملوک حکمران اینال شاہ کو لکھا گیا:

---

① البدر الطالع فی محاسن من بعد القرن السابع، للشوکانی: ۲/۱۶۸

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۶۷؛ تاریخ الطبری: ۳/۳۰۳ ③ تاریخ الطبری: ۵/۲۳۲

④ بحوالہ بالا ⑤ المعرفة والتاریخ: ۱/۱۵۳؛ تاریخ الطبری: ۸/۱۵۲

⑥ السلطان محمد الفاتح از عبد السلام عبدالعزیز الفهمی، ص ۶۳ تا ۶۹، ط دارالقلم دمشق؛ فاتح القسطنطینیة للصلابی، ص ۸۵

⑦ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۵۳،۵۴؛ تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/۱۳۹ تا ۱۴۱

''ہمارے اسلاف کا طریقہ بہترین ہے جو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے تھے۔ہم پیغمبر ﷺ کے اس ارشاد پر عمل پیرا ہیں کہ جس شخص کے پاؤں اللہ کے راستے میں گرد آلود ہوئے،اللہ نے ان پر جہنم کی آگ حرام کردی ہے۔اسی لیے ہم نے اس سال قسطنطینیہ کی فتح کا عزم کیا۔اللہ نے اسے ہمارے لیے آسان فرمادیا۔ ۵۴ دن کی جنگ کے بعد اللہ نے ہمیں فتح سے نوازا۔''①

اسی طرح حاکمِ حجاز کو مالِ غنیمت کے بہترین تحائف کے ساتھ یہ مراسلہ ارسال کیا گیا:

''اس سال اللہ نے ہمیں وہ فتح عنایت کی جو کسی آنکھ نے دیکھی نہ کان نے سنی۔ہم مشہور شہر قسطنطینیہ کی فتح کی خوشخبری دیتے ہوئے یہ مراسلہ بھیج رہے ہیں۔امید ہے کہ آپ حرمین کے تمام سادات،علماء،اولیاء،بیت اللہ کے زائرین اور روضۂ رسول پر حاضری دینے والوں کو اللہ کی عطا کردہ اس فتح عظیم کی بشارت پہنچادیں گے۔انہی کی دعاؤں کی بدولت اللہ نے اس فتح سے ہم کنار کیا۔ہم سفیر کے ہاتھ خالص سونے کے سات ہزار فلورے بھیج رہے ہیں،ان میں سے دو ہزار ساداتِ کرام،ایک ہزار حرمین کے خدام اور باقی حرمین کے فقراء کے لیے ہیں۔''②

قُسْطَنْطِیْنِیَّہ......اسلام بول......استنبول:

سلطان محمد فاتح نے قیصریت کے مرکز کو فتح کرکے،عثمانی سلطنت کا دارالحکومت بنادیا تھا۔اس کا ایک قدیم نام ''استانبول'' بھی تھا جیسا کہ قدیم مؤرخ یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) نے لکھا ہے۔چونکہ قسطنطینیہ کا تلفظ ذرا مشکل تھا،اس لیے بہت سے لوگ اسے ''استانبول'' کہا کرتے تھے۔محمد فاتح نے اسے دارالحکومت بنانے کے بعد اس کا نام تبدیل کردیا اور اسے ''استانبول'' سے ملتے جلتے نئے نام ''اسلام بول'' (یعنی اسلام آباد) سے موسوم کیا۔مگر بہت سے لوگ اسے ''استانبول'' ہی کہتے رہے۔رفتہ رفتہ ''اسلام بول'' کا لفظ متروک ہوگیا اور یہ شہر ''استنبول'' کہلانے لگا۔

پونے پانچ صدیوں تک یہ عثمانیوں کا پایۂ تخت رہا۔گزشتہ صدی میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ''انقرہ'' (انگورہ) ترکی کا دارالحکومت بن گیا اور استنبول کی سیاسی مرکزیت کا لگ بھگ دو ہزار سالہ دور اختتام کو پہنچا۔③

قُسْطَنْطِیْنِیَّہ کی فتح نے سلطنتِ عثمانیہ کو ایک عالمگیر طاقت کا مقام دلاکر پورے یورپ میں ہل چل مچادی۔ بازنطینیوں کی ۱۱۲۵ سالہ سلطنت کا سقوط عالمی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز تھا۔ایک مغربی مؤرخ لکھتا ہے:

''استنبول کی فتح دنیا کی تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک ہے۔یورپ کے مستقبل پر اس کا گہرا اثر پڑا۔اس واقعے نے دنیا کی تاریخ کو یکسر بدل ڈالا۔قرونِ وسطیٰ کا خاتمہ ہوا اور قرونِ جدیدہ کا ورق کھل گیا۔''④

---

① سلطان ۵ اپریل کو محاذ پر پہنچا تھا اور ۲۹ مئی کو شہر فتح کرلیا تھا۔یوں ۵۴ دن ہی بنتے ہیں۔

② الدولۃ العثمانیہ از صلابی: ۱/ ۱۰۶، ۱۱۱؛ اطلس الفتوحات الإسلامیۃ: ۳/ ۳۴۴ تا ۳۴۶

③ فی اصول التاریخ العثمانی، ص ۲۹

④ تاریخ الدولۃ العثمانیہ: ۱/ ۱۳۳

سلطان محمد خان فاتح کی یورپی مہمات

فتح قسطنطنیہ کے بعد یورپ میں سلطان محمد فاتح کا رعب داب ہر طرف پھیل گیا۔ کسی فوری حملے سے بچنے کے لیے ہنگری نے ایک بار پھر سلطنتِ عثمانیہ کی ماتحتی قبول کرلی۔ برانکووتش، ولاچیا، رومانیا (افلاق) اور مولڈیویا (بغدان) کے امراء نے بھی اظہارِ اطاعت کردیا۔ موریہ کے حکام ڈیمٹریس اور تومس نے جو بازنطینی حکمرانوں کے بھائی تھے، اپنے علاقے سلطنتِ عثمانیہ میں ضم کردیے۔ جنیوا کے جزائر خیوس اور لسبوس کے علاوہ بحیرۂ ایجین کے دیگر کئی جزائر نے بھی عثمانیوں کی باج گزاری اختیار کرلی۔ تاہم بہت سے حکمرانوں کا یہ عمل دفع الوقتی کے لیے تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد سربیا، ہنگری، رومانیہ اور وینس نے عثمانیوں کے خلاف گٹھ جوڑ شروع کردیا۔ ①

صلیبی جنگ:

اس فساد کے پیچھے سب سے زیادہ ہاتھ ہونیاڈے کا تھا جو جنگِ وارنا میں لاڈیسلاس سوم کے قتل کے بعد ہنگری کا حکمران بن چکا تھا۔ اس نے حاکمِ سربیا جارج برنکوفیتش کو عثمانیوں کے خلاف اپنے ساتھ ملالیا۔ سربیا کی سرزمین اس وقت دو حصوں میں منقسم تھی: مغربی علاقہ ہنگری کے اور مشرقی حصہ عثمانیوں کے ماتحت تھا۔ سربیا کے حکام کو جب ہنگری سے خطرہ ہوتا تو وہ عثمانیوں سے جاملتے اور جب انہیں عثمانیوں سے خطرہ محسوس ہوتا تو ہنگری سے اتحاد کرلیتے۔ سربیا کا موجودہ حاکم جارج برنکوفیتش بظاہر سلطنتِ عثمانیہ کی حمایت کا دم بھرتا تھا مگر اندر سے وہ مسلمانوں کا دشمن تھا۔ سلطان محمد فاتح بھی اس کی حالت سے بے خبر نہ تھا، اس لیے کہا کرتا تھا: ''وہ دوستی ظاہر کرتا ہے مگر حقیقت میں دشمن ہے۔''

جارج نے ہونیاڈے کی پیش کش قبول کرنے کے بعد سربیا کے جنگجوؤں کو قلعوں میں مورچہ بند ہونے کا حکم دیا اور خود ہونیاڈے سے کمک لینے ہنگری چلا گیا۔ اُدھر سلطان محمد فاتح کے جاسوس جارج کی حرکات پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ سلطان کو بروقت اس سازش کی خبر ہوگئی اور اس نے سربیا کی طرف لشکر کشی شروع کردی۔ تاہم موسم سرما شروع ہونے کے باعث وہ زیادہ آگے نہ جاسکا اور پایۂ تخت واپس لوٹ گیا۔ اس کی فوج امیر فیروز بیگ کی کمان میں دریائے مورافا کے کنارے واقع شہر کرسوفاز میں تعینات رہی۔ اس دوران یکا یک ہونیاڈے اور جارج اپنی فوجیں لیے وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے نہ صرف عثمانیوں کو شکست دے دی بلکہ فیروز بیگ کو بھی گرفتار کرکے ساتھ لے گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے سرحدی شہروں ''بیروتا'' اور ''ودین'' کو بھی نذرِ آتش کردیا۔ ②

بلغراد کا محاصرہ:

اب سربیا اور ہنگری کی سرکشی کا زور توڑنا ضروری ہوگیا تھا۔ سلطان محمد فاتح پوری تیاری کے ساتھ ۸۵۹ھ (۱۴۵۵ء) کے موسمِ بہار میں سربیا پر حملہ آور ہوا اور اس کے مشرقی حصوں کو از سرِ نو زیرِ نگین کرنے کے بعد مغربی علاقے

① تاریخ عثمانی از اوزون: ۲/ ۵،۴
② محمد الفاتح، ص ۱۵۹ تا ۱۶۱

میں داخل ہو گیا جو ہنگری کے قبضے میں تھا۔

اُدھر سلطان کی پیش قدمی سے پہلے ہی پورے یورپ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ "کابسترانو" نامی ایک جنونی راہب نے اسپین، پولینڈ، ہنگری، جرمنی اور فرانس کا دورہ کر کے شاہانِ یورپ کو عثمانیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی۔ پوپ کالیکسٹ سوئم نے تمام گرجوں میں ترکوں کے خلاف خصوصی دعائیں کرنا لازم کر دیا۔ آخر اٹلی، فرانس، جرمنی، برگنڈی، وینس، جنیوا، روڈس، پولینڈ اور سربیا کی افواج سلطان کے مقابلے کے لیے بلغراد میں جمع ہو گئیں جن کی مجموعی تعداد تین لاکھ تھی۔ شاہانِ یورپ نے شاہِ ہنگری ہونیاڈے کو اتحادی افواج کا کمانڈر طے کر دیا اور پوپ نے اپنے خصوصی مندوب جان اینجلو کو اس کی معاونت کے لیے بھیج دیا۔

سلطان محمد فاتح بھی اپنی افواج مرتب کرتا رہا۔ آخر شعبان ۸۶۰ھ (جولائی ۱۴۵۶ء) کو سلطان ڈیڑھ لاکھ کے لشکر کے ساتھ بلغراد کے سامنے پہنچ گیا جو دریائے ڈینوب اور اس کے ایک معاون دریا کے سنگم پر واقع ہونے کے باعث نہایت محفوظ اور مستحکم سمجھا جاتا تھا۔ سلطان نے اپنا بحری بیڑا بھی بلا لیا تھا جس نے دریاؤں کی سمت سے شہر کو گھیر لیا جبکہ خشکی کی جانب سے بھی محاصرہ کر لیا گیا۔ کئی دنوں تک محصورانہ جنگ جاری رہی۔ دونوں طرف سے توپیں چلتی رہیں۔ حریف کی گولہ باری سے سلطان کا بہترین جرنیل قرہ پاشا شہید ہو گیا جس سے عثمانیوں کو سخت زک پہنچی۔ دریا میں بحری جہازوں اور کشتیوں کے مابین گھمسان کی جنگ ہوتی رہی جس میں مسلمان پیش قدمی نہ کر سکے۔

آخر سلطان نے ساری توجہ خشکی کی جانب سے حملوں پر مرکوز کر دی۔ اُدھر ہونیاڈے پوری ہوشیاری سے شہر کی مدافعت کر رہا تھا جبکہ راہب "کابسترانو" اتحادی افواج کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ بہر کیف دشمن کو شدید نقصانات پہنچانے کے بعد آخر ۱۷ شعبان ۸۶۰ھ (۲۱ جولائی ۱۴۵۶ء) کو سلطان نے فوج کو شہر پر فیصلہ کن حملے کا حکم دیا۔ اس دن نہایت قہر انگیز جنگ ہوئی۔ مسلمان شہر کے ایک حصے پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ تاہم عیسائیوں کے بھرپور جوابی حملوں کی وجہ سے چھ گھنٹے کی جنگ کے بعد مسلمانوں کو شام کا اندھیرا پھیلنے پر واپس نکلنا پڑا۔

چھ اگست کو سلطان محمد فاتح خود فوج کی کمان ہاتھ میں لے کر حملے میں شریک ہوا۔ اس دن عثمانی افواج ایک بار پھر حریف کو دھکیل کر ایک بار پھر شہر میں گھس گئیں۔ تاہم راہب کے جوش دلانے پر نصرانیوں نے نہایت زوردار جوابی حملہ کیا اور ہونیاڈے نے تازہ دم دستوں کے ساتھ عثمانیوں کو شہر کے اندر گھیر لیا۔ سلطان محمد فاتح نے شہر کی فصیل پر دست بدست لڑتے ہوئے ران پر گہرا زخم کھایا اور گھوڑے سے نیچے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ ینی چری دستوں نے اسے حفاظتی نرغے میں لے لیا جبکہ نصرانیوں نے سلطان کو قتل یا قید کرنے کے لیے پورا زور اسی طرف لگا دیا۔ یوں اس مقام پر جنگ کا شدید ترین معرکہ ہوا۔ ینی چری افسرِ اعلیٰ حسن بیگ نے دشمنوں پر جان توڑ حملہ کیا اور ان کے کشتوں کے پشتے لگاتے ہوئے خود بھی رتبۂ شہادت سے ہمکنار ہوا۔ اسی کش مکش میں ہونیاڈے بُری طرح گھائل ہو گیا۔ آخر کار عثمانی بحفاظت شہر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلطان کو پالکی پر ڈال کر خیمہ گاہ میں لے جایا گیا اور اسلامی فوج کو مجبوراً

واپسی اختیار کرنا پڑی۔ یوں بلغراد فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔[1] اس پسپائی کو فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے لیے ایک اہم سبق تھا۔ مؤرخ سالم رشیدی لکھتے ہیں:

''اس جنگ میں عثمانی سپاہی دشمن کو ویسے ہی حقیر سمجھ رہے تھے جیسا کہ فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین میں۔ انہیں اپنی کثرت اور قوت پر عجب ہو رہا تھا اور وہ آپس میں کہہ رہے تھے: ہم نے کل قسطنطنیہ فتح کیا تھا جو شرق میں نصرانیت کا سب سے بڑا گڑھ اور سب سے محفوظ مرکز تھا۔ پس بلغراد کیا چیز ہے؟ حالانکہ کسی لشکر کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نقصان دہ نہیں کہ وہ دشمن کو حقیر اور کمزور سمجھے چاہے اس کی حالت کیسی بھی ہو۔''[2]

پورے یورپ میں عیسائیوں نے اپنی اس فتح پر جشن منایا۔ پوپ کالیکسٹ سوئم کے حکم سے چھ اگست عثمانیوں کی پسپائی کے حوالے سے ''تہوارِ نجات'' قرار پایا۔ شاہ ہنگری ہونیاڈے جو ''معرکۂ وارنا'' اور ''جنگِ کسوووِدوئم'' میں شکستوں کے باعث اپنی ساکھ کھو چکا تھا، ایک بار پھر ''قومی ہیرو'' بن گیا تاہم وہ لڑائی میں لگنے والے زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور فتح کے چند دن بعد گیارہ اگست ۱۴۵۶ء کو فوت ہو گیا۔ ادھر سلطان محمد فاتح کو اللہ نے صحت یاب کر دیا اور اس نے عزم مصمم کے ساتھ کہا: ''بلغراد جلد یا بدیر سرنگوں ضرور ہوگا۔ اگر میں نہیں تو میری اولاد اسے ضرور فتح کرے گی۔''[3]

رومانیا کا درندہ صفت بادشاہ ڈریکولا:

رومانیا (افلاق) کے بادشاہ میرشا اوّل نے بایزید یلدرم کے دور میں سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ باج گزاری کا معاہدہ کیا تھا مگر اس کے بعد حکومت اس کے بیٹے والڈٹیپس سوئم (Wald - Tapes) کے ہاتھ میں آ گئی جو نہایت ظالم انسان تھا۔ وہ اپنی رعایا پر بھی ظلم وستم کرتا تھا اور ساتھ ہی سلطنتِ عثمانیہ کے تاجروں کو بھی ایذائیں دیتا تھا۔ اس کی سنگ دلی اور خون آشامی کے باعث اہلِ یورپ اسے ''ڈریکولا'' کہہ کر یاد کرتے تھے جبکہ ترک اسے ''میخوں والا بادشاہ'' کہا کرتے تھے کیوں کہ وہ اپنے مخالفین کے جسم میں میخیں ٹھونک کر انہیں قتل کرتا تھا۔ تاریخ میں اس قدر بے رحم حکمران کی مثال شاید ہی دستیاب ہو۔ اسے مظلوموں کی آہ وبکا اور سسکیاں سننے ہی میں لطف آتا تھا۔ اس کی محفلِ عیش وطرب اور مجلسِ طعام وشراب ایسے دردناک مناظر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔

وہ تشدد کے عجیب وغریب طریقے ایجاد کرتا تھا اور اس مقصد کے لیے طرح طرح کے اوزار اور آلات بنواتا تھا۔ وہ زندہ انسانوں کی کھال اتروا تا، قیدیوں کے زخموں میں نمک بھرتا اور نمک بھرے زخموں کو نیزوں سے کریدتا تھا۔ کبھی وہ لوگوں کو پکڑ کر کسی جگہ بٹھاتا، انہیں خوب کھلاتا اور شراب پلاتا اور جب وہ نشے میں بدمست ہو جاتے تو آگ لگوا کر انہیں سوختہ کر دیتا۔ کبھی وہ ماؤں کے سامنے ان کے بچوں کے سر قلم کر دیتا اور کبھی بچوں کے سامنے ان کی ماؤں کو بھون کر بچوں کو مجبور کرتا کہ اپنی ماؤں کا گوشت کھائیں۔

---

① محمد الفاتح از دکتور سالم رشیدی، ص ۱۵۹ تا ۱۶۳؛ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۵۴؛ اخبار الدول: ۳/ ۳۲؛ تاریخ عثمانی: ۲/ ۱۶ تا ۱۸؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۶۹، ۱۷۰؛ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۵۴

② محمد الفاتح از دکتور سالم رشیدی، ص ۱۶۲ ③ محمد الفاتح از دکتور سالم رشیدی، ص ۱۶۴

اس سے جس قدر معافی یا رحم کی درخواست کی جاتی، اس کا ظلم وستم اسی قدر بڑھ جاتا تھا۔ ایک بار ایک تاتاری کو اس کے ہاں پھانسی دی جانے والی تھی کہ کچھ تاتاری اس کی سفارش کرنے آگئے۔ مگر رحم کی اپیل کے جواب میں ڈریکولا نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے ہم قوم کو خود پھانسی دیں۔ جب انہوں نے انکار کیا تو ڈریکولا نے قیدی کو بھون کر کباب کر دیا اور تاتاریوں کو اسے کھانے کا حکم دیا۔ جب وہ نہ مانے تو انہیں بھی قتل کرا دیا۔

ڈریکولا کا یہ لرزہ خیز سلوک ایسے لوگوں کے ساتھ تھا جو بے قصور تھے اور اس کی اپنی رعایا تھے۔ تصور کریں کہ وہ اغیار پر کیسے کیسے مظالم ڈھاتا ہوگا۔ چنانچہ آئے دن ترک تاجر اس کے مظالم کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ [1]

ڈریکولا کے خلاف یلغار۔ رومانیہ پر قبضہ:

اس فتنے کے سدباب کے لیے سلطان محمد فاتح نے ضروری سمجھا کہ رومانیا کو پابند کیا جائے چنانچہ اس نے سفیر بھیج کر ڈریکولا کو ایک معاہدے پر مجبور کیا جس کے مطابق ڈریکولا نے سلطنتِ عثمانیہ سے باج گزاری کے معاہدے کی تجدید کر دی۔ یہ واقعہ ۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) کا ہے۔ مگر ڈریکولا نے یہ وعدہ صرف اس لیے کیا تھا تا کہ جنگ کی تیاری کا وقت مل جائے۔ چنانچہ جلد ہی اس نے ہنگری کے نئے بادشاہ "ماتیاس" کے خاندان میں رشتہ کر کے اس سے تعلق کو بڑھایا اور اس کے ساتھ عثمانیوں کے خلاف جنگی معاہدہ کر لیا۔

سلطان کو یہ بھنک پڑی تو اس مکار اور سفاک انسان سے نجات پانے کے لیے حمزہ پاشا اور یونس بیگ نامی دو ہوشیار افراد کو سفارتی وفد کے طور پر ڈریکولا کے پاس بھیجا۔ ان کے ذمے لگایا گیا تھا کہ وہ خصوصی ملاقات کے بہانے تنہائی میں ڈریکولا سے ملیں اور اسے قتل کر دیں۔ مگر اس بھیڑیے نے خطرے کی بُو سونگھ لی اور دونوں سفیروں کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر انہیں میخ نما کھمبوں پر ٹانگ دیا۔ اس کے بعد وہ فوج لے کر سلطنتِ عثمانیہ کے بلغاری مقبوضات میں گھس گیا اور ۲۵ ہزار افراد کو گرفتار کر لایا جن میں عورتیں، بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔

سلطان نے آخری تنبیہ کے طور پر ایک اور وفد ڈریکولا کے پاس بھیجا تا کہ قیدیوں کو بازیاب کرایا جائے۔ جب ترک سفیر دربارِ رومانیا میں پہنچے تو ڈریکولا نے انہیں حکم دیا کہ وہ عمامے اتار کر اس کی تعظیم بجالائیں۔ وفد نے اس توہین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر ڈریکولا نے کہا: "اچھا! تو اب ہمیشہ یہ عمامے تمہارے سروں پر رہیں گے۔" اس نے حکم دیا کہ ہر سفیر کے عمامے پر ایک ایک میخ رکھ کر سر میں ٹھونک دی جائے۔

سفیروں کے اس بے رحمانہ قتل کے بعد سلطان کے لیے خاموش بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے پچاس ہزار کا لشکر تیار کر کے بری اور بحری دونوں اطراف سے رومانیہ پر چڑھائی کر دی۔ بری فوج محمود پاشا کی قیادت میں روانہ ہوئی جبکہ سلطان بحری فوج لے کر بحیرۂ اسود میں داخل ہوا اور وہاں سے دریائے ڈینوب میں سفر کرتا ہوا رومانیہ پہنچ گیا۔ عثمانی لشکر کے قریب آنے پر ڈریکولا نے اپنے اہل وعیال اور خاندان کو دور دراز کے محفوظ علاقے میں بھیج دیا اور خود جنگلات

---

① محمد الفاتح لدکتور رشیدی، ص ۲۰۲، ۲۰۳ مع حاشیۃ

میں جا چھپا۔ وہ تُرکی خوب جانتا تھا، بعض اوقات تُرک بن کر سلطان کی لشکر گاہ کے پاس آنکلتا تھا اور معلومات لے کر واپس چلا جاتا۔ سلطان کی لشکر گاہ کا اچھی طرح معاینہ کرنے کے بعد ایک رات اس نے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اچانک شب خون مارا اور سلطان محمد فاتح کے خیمے تک جا پہنچا مگر ینی چری سپاہیوں نے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس کے ایک ہزار سپاہی قیدی بن گئے جنہیں سلطان نے قتل کرا دیا تاہم ڈریکولا بھوت کی طرح جنگلات میں غائب ہو گیا۔

سلطان نے یلغار جاری رکھی جبکہ ڈریکولا کھلے میدان میں مقابلہ ناممکن دیکھ کر چھاپہ مار حملے کرتا رہا، آخر اسلامی فوج رومانیا کے مختلف شہروں کو فتح کرتے ہوئے پایۂ تخت ''بخارست'' (Bucharest) تک پہنچ گئی۔ یہاں شہر کے باہر نوکدار کھمبوں میں ہزاروں لاشیں پروئی ہوئی دکھائی دیں۔ یہ وہ ۲۵ ہزار قیدی تھے جن کی بازیابی کے لیے مسلمان یہاں آئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سلطان کو سخت افسوس ہوا۔

اس مہم سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد ۸۶۶ھ (۱۴۶۲ء) میں سلطان نے ڈریکولا کے چھوٹے بھائی راڈول کو جو ڈریکولا کے خوف سے سلطان کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھا، رومانیا کا باج گزار حاکم بنا دیا۔ اُدھر شاہِ ہنگری نے ڈریکولا کو جو کہ اب تک اس کے ہاں پناہ گزین تھا، جیل میں ڈال دیا۔ ۸۸۱ھ (۱۴۷۶ء) میں راڈول ہنگری سے جنگ میں قتل ہو گیا جس کے بعد شاہِ ہنگری نے ڈریکولا کو آزاد کر دیا۔ وہ واپس اپنے ملک پہنچا اور پھر فساد پھیلانے لگا۔ تاہم ۸۸۴ھ میں وہ اپنے ہی ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا سر قلم کر کے شہروں اور دیہاتوں میں گھمایا گیا اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ یوں ظلم کی ایک بھیانک داستان اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچی۔[1]

سربیا، جنوبی یونان اور بوسینا کی فتوحات:

ان ایام میں سرب نواب برانکووتش شاہِ ہنگری کے ساتھ ساز باز کر کے سلطنتِ عثمانیہ کی سرحدوں پر چھاپہ مار کارروائیاں کر رہا تھا۔ سربیا وہ علاقہ تھا جسے عثمانیوں نے کئی بار فتح کیا تھا مگر ہر بار یہاں بغاوتیں ہوئیں اور یہ علاقہ بار بار ہاتھ سے نکلتا رہا۔ برانکووتش کی چھاپہ مار کارروائیوں سے عثمانیوں کو ایک بار پھر فوج کشی کا جواز مل گیا۔ چنانچہ صدرِ اعظم محمود پاشا کی قیادت میں سربیا پر حملوں کا آغاز ہوا۔ ۸۶۳ھ سے ۸۶۵ھ (۱۴۵۸ء تا ۱۴۶۱ء) تک یہ مہم جاری رہی آخر کار پورا سربیا فتح ہو گیا۔

جنوبی یونان کے صوبے موریا پر بازنطینی حکمران خاندان کے دو بھائی ٹومس اور ڈیمٹرس کی حکومت تھی جو وقتی طور پر عثمانیوں کے باج گزار بن گئے تھے۔ تاہم یہ دونوں آپس میں اتحاد نہ کر سکے اور خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے البانیہ کو جنوبی یونان میں مداخلت کا موقع مل گیا۔ جنوبی یونان پر البانیہ کے خدشے کے پیشِ نظر سلطان نے خود موریا پر چڑھائی کر دی۔ البانوی فرار ہو گئے۔ یوں ۸۶۳ھ (۱۴۵۸ء) میں مشرقی موریا سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

کچھ مدت بعد ٹومس اور اس کے بھائی نے سلطان کی دیگر محاذوں پر مصروفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موریا پر

---

[1] تاریخ عثمانی: ۲/ ۷۶ تا ۷۸؛ محمد الفاتح لدکتور رشیدی، ص ۲۰۴ تا ۲۰۷

دوبارہ قبضہ کرنا چاہا مگر سلطان نے یہ کوشش ناکام بنادی اور ۸۶۵ھ (۱۴۶۰ء) میں فوج کشی کر کے نہ صرف موریا بلکہ ''ایتھنز'' بھی فتح کر لیا۔ یوں وینس اور چند شہروں کے سوا سارا یونان فتح ہو گیا۔ ۸۶۹ھ (۱۴۶۴ء) میں بحیرۂ ایجین کے جزائر بھی فتح کر لیے گئے۔ اسی دوران ۸۶۷ھ (۱۴۶۲ء) میں ولاچیا (افلاق) پر بھی ترک پرچم لہرانے لگا۔

سربیا کی فتح کے بعد سلطان محمد فاتح نے یورپی اتحاد کے خلاف فوج کشی جاری رکھی اور بوسنیا کے حاکم کو اطاعت کی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا۔ آخر کار سلطان نے ۸۶۸ھ (۱۴۶۳ء) میں یہاں افواج بھیجیں۔ بوسینا اپنے مستحکم قلعوں کی وجہ سے مشہور تھا مگر عثمانیوں کی فتوحات کے سامنے تمام قلعے ریت کی دیواریں ثابت ہوئے۔ ①

البانیہ کی فتح۔ سکندر بیگ کی سرکوبی:

اس دوران البانیہ پر بھی فوج کشی ہو چکی تھی۔ یہاں کے البانوی النسل حاکم جارج کسترائٹ (سابق سکندر بیگ) نے سلطان مراد ثانی کے زمانے میں مرتد ہو کر بغاوت کر دی تھی۔ مراد ثانی اس فتنے پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ سلطان محمد فاتح نے دیگر محاذوں پر کامیابی کے بعد البانیہ میں جارج کسترائٹ کے خلاف کارروائی شروع کی۔ یہاں کے فلک بوس پہاڑ جارج کسترائٹ کے لیے نہایت محفوظ پناہ گاہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ خود بڑا دلیر، تجربہ کار اور اپنے عوام میں مقبول تھا۔ نیز اس کی تربیت عثمانی فوجی درسگاہوں میں ہوئی تھی اس لیے وہ ترکوں کی جنگی چالوں اور کمزوریوں کو اچھی طرح جانتا تھا، اس لیے جارج کسترائٹ کے مقابلے میں عثمانی افواج کو بار بار شکستیں ہوئیں، تاہم طویل کشت و خون کے بعد ۸۶۶ھ (۱۴۶۱ء) میں جارج کسترائٹ نے خود اظہارِ اطاعت کیا۔ سلطان نے مثبت جواب دیتے ہوئے فوجیں واپس بلا لیں۔ کچھ ہی مدت بعد جارج کسترائٹ نے پھر بغاوت کر دی۔ اب عثمانی افواج ایک سیلاب کی طرح البانیہ میں داخل ہوئیں اور ایک طویل مہم جوئی کے بعد آخر ۸۷۲ھ (۱۴۶۷ء) میں پورا البانیہ مسلمانوں کے زیرِ سایہ آ گیا۔ جارج بھاگ کر وینس میں پناہ گزیں ہوا اور کچھ دنوں بعد وہیں فوت ہو گیا۔ ②

اوزون حسن کی سازش۔ وینس کی فتوحات:

جمہوریہ وینس (جسے عرب تواریخ میں البندقیہ کہا جاتا ہے) عثمانی سلاطین کے خلاف سازشوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اہلِ وینس نے پوپ کی حمایت حاصل کر کے یورپی ممالک کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف اکسایا۔ پورے یورپ میں سلطان کے خلاف ایک مہم شروع ہو گئی اور سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے لشکر تیار ہونے لگے۔

انہی دنوں اہلِ وینس کو ایشیا میں بھی ایک مضبوط حلیف میسر آ گیا۔ یہ تیمور لنگ کا جانشین ایران کا حاکم اوزون حسن تھا جس کی بیوی ڈسپنا کترینہ نامی ایک عیسائی تھی۔ اوزون حسن نے شاہِ ایران حسن علی اور شاہِ خراسان ابوسعید تیموری کو الگ الگ محاذوں پر شکست دے کر فارس، خوزستان، کردستان اور شمالی ایران کے وسیع و عریض علاقے کو زیرِ نگیں کر لیا تھا اور اس کی سرحدیں سلطنتِ عثمانیہ سے جا ملی تھیں جسے وہ ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا آیا تھا۔

---

① تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/ ۱۴۸ تا ۱۵۰ ② تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/ ۱۵۱ تا ۱۵۵

اگر چہ اوزون حسن سُنی تھا مگر اس کے شیعوں سے گہرے تعلقات تھے۔اس نے صفوی سلسلے کے پیر، شیخ جنید کو جو شیعہ اثنا عشری تھا، نہ صرف اپنے ساتھ ملا لیا بلکہ اپنی بہن بھی اس کے نکاح میں دے دی تاکہ اس کے مرید سیاسی لحاظ سے اس کے حامی بن جائیں۔ آگے چل کر اس کا یہ فیصلہ اہلِ سنت کے حق میں نہایت تباہ کن ثابت ہوا۔

اہلِ وینس نے اوزون حسن کو چھ بڑی توپیں اور بڑی مقدار میں گولہ بارود بھیجا اور اس کی بیوی کے ایک نصرانی رشتہ دار کو ایران بھیج کر اس سے بات چیت کی اور اسے اپنا اتحادی بنالیا۔ طے ہوا کہ ایک طرف سے اوزون حسن حملہ کرکے ایشیائے کوچک کے عثمانی مقبوضات چھین لے گا اور دوسری طرف سے یورپی ممالک یلغار کرکے ترکوں کو یورپ سے نکال دیں گے۔ عثمانیوں کو اس سازش کا بروقت علم ہوگیا جس کے نتیجے میں شعبان ۸۶۸ھ (اپریل ۱۴۶۳ء) میں یورپی محاذ پر شدید جنگ چھڑ گئی۔ خوش قسمتی سے اہلِ یورپ کا جوش وخروش بہت جلد ٹھنڈا ہوگیا کیوں کہ انہی دنوں پوپ جس کی سرپرستی میں یہ مہم شروع کی گئی تھی، فوت ہوگیا اور نئے پوپ نے جنگ کی مخالفت کردی۔

اہلِ وینس اس سازش کے بانی ہونے کی وجہ سے بہرحال سزا کے مستحق تھے،اس لیے سلطان محمد فاتح نے موقع پاتے ہی وینس پر فوج کشی کی اور ۸۷۵ھ (۱۴۷۰ء) میں اس کا اہم جزیرہ ''اکریبوز'' فتح کرلیا۔ پھر یہ افواج مشرقی یونان کے شہروں: ''تھسلی'' اور ''اتیکا'' پر بھی قابض ہوگئیں۔ وینس کے ساحل کے بعد یہ افواج مشرقی اٹلی میں پیش قدمی کرنے لگیں۔ عثمانی افواج کا ایک حصہ دریائے ڈینوب کے ساتھ ساتھ یلغار کرتا ہوا ہنگری میں داخل ہوگیا، اور زغرب پر اسلامی پرچم لہرا کر آسٹریا تک جا پہنچا۔

یہ جنگیں تقریباً نو سال تک جاری رہیں۔ ۸۸۲ھ میں سلطان کا سپہ سالار عمر پاشا وینس کے پایۂ تخت تک پہنچ گیا۔ ایک طویل کش مکش کے بعد تھک ہار کر اہلِ وینس کی پارلیمان نے عثمانیوں سے مذاکرات شروع کیے۔ شوال ۸۸۴ھ (۱۴۷۹ء) میں سخت شرائط پر وینس سے صلح قبول کی گئی جس کے نتیجے میں اہلِ وینس نے بھاری جنگی تاوان اور سالانہ جزیے کی ادائیگی قبول کی۔ یہ وعدہ بھی کیا کہ ضرورت کے وقت وینس سو جہازوں کے بیڑے کے ساتھ عثمانی سلطنت کی مدد کرے گا۔ صلح نامے کی رو سے اہلِ وینس کو آرگوس اور البانیہ کے وہ علاقے خالی کرنا پڑے جن پر وہ ایک مدت سے قابض چلے آرہے تھے۔ یوں بلقان کا کچھ ساحلی حصہ ہی ان کے پاس رہ گیا۔[1]

جزیرہ روڈس پر حملہ:

۸۸۵ھ میں سلطان کی ایک فوج نے بحیرۂ روم کے مشہور جزیرے روڈس کا رخ کیا جہاں قزاق پیشہ نصرانیوں کی آزاد حکومت قائم تھی۔ یہ لوگ سمندر میں ڈاکے ڈالتے اور مسلمانوں کی ساحلی بستیوں پر حملے کرتے تھے۔ سلطان نے انہیں سزا دینے کے لیے یہاں دوبار فوج کشی کی مگر ہر کوشش ناکام رہی۔ کچھ مدت بعد سلطان نے ایک دوسری فوج بھیجی۔اس بار سپہ سالار جزیرے کے چھوٹے چھوٹے شہروں کو فتح کرتے ہوئے پایۂ تخت تک پہنچ گیا۔

[1] تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/ ۱۶۶ تا ۱۶۸؛ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۷۱ تا ۱۷۳

آخر یہ شہر بھی فتح ہوگیا، صرف قلعہ باقی تھا کہ فوج اور سپہ سالار میں باہمی اعتماد کی کمی نے جیتی ہوئی بازی الٹ دی۔ سپہ سالار نے شہر میں داخلے کے وقت تاکید کی تھی کہ کوئی سپاہی شہر میں لوٹ مار نہ کرے مگر فوج نے اصرار کیا کہ لوٹ مار کی اجازت دی جائے۔ سپہ سالار اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ یہ دیکھ کر فوج میں سرکشی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس بدنظمی کی حالت میں سپہ سالار کو واپسی اختیار کرنا پڑی اور یہ جزیرہ فتح ہو کر بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ (1)

مشرقی مہمات

طرابزون کی فتح:

آرمینیا اور اناطولیہ کے مابین بحیرۂ اسود کے کنارے واقع آزاد بازنطینی ریاست طرابزون جو ۱۲۰۴ء میں قائم ہوئی تھی، ابھی تک پوری طرح عثمانیوں کی فتوحات کے دائرے سے باہر تھی۔ سلطان مراد ثانی نے خشکی اور سمندر کی جانب سے اس پر ایک حملہ کیا تھا مگر سمندری طوفان آجانے کے باعث یہ حملہ کامیاب نہ ہو سکا۔ سلطان محمد فاتح کے دور میں اماسیا کے عثمانی گورنر خضر بیگ نے یہاں ایک اور حملہ کیا جس کے بعد شاہِ طرابزون یوانیس چہارم نے سلطنتِ عثمانیہ کو خراج دینا قبول کر لیا۔ ساتھ ہی اس نے ایران اور آرمینیا کے حکمران اوزون حسن سے تعلقات بڑھائے اور اپنی بیٹی کا تولینا اس کے نکاح میں دے دی۔ یہ رشتہ بعد میں عثمانیوں پر خاصا بھاری ثابت ہوا کیوں کہ اوزون حسن اس کے بعد طرابزون کی سیاست پر مسلط ہو کر سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف محاذ آراء ہوگیا۔

۱۴۵۸ء میں یوانیس چہارم کی وفات پر اس کا بھائی ڈیوڈ کمنن تخت نشین ہوا، اس دوران اوزون حسن نے اس سے تعلقات بہت بڑھا لیے اور اسے اُکسایا کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کو خراج ادا نہ کرے بلکہ پہلے سے ادا شدہ خراج کی واپسی پر اصرار کرے۔ ڈیوڈ کمنن اس بہکاوے میں آگیا اور ۱۴۶۰ء میں اس نے ایک وفد بھیج کر سلطان محمد فاتح سے یہ احمقانہ مطالبہ کر ڈالا۔ سلطان نے وفد کو جواب دیا: ''آپ جائیے۔ میں اپنا قرضہ ادا کرنے خود آؤں گا۔''

اس دھمکی کے بعد ریاست طرابزون اور سلطنت عثمانیہ کے مابین کشیدگی کی فضا قائم ہوگئی۔ اوزون حسن نے اس میں مزید ایندھن ڈالا اور ڈیوڈ کمنن نے اس کے مشورے پر پوپ اور دیگر یورپی حکومتوں سے مدد مانگ لی۔

یہ خبریں سلطان محمد فاتح تک پہنچیں تو اس نے فساد کے اس مرکز کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے حکم پر سینوپ کا والی یعقوب بیگ ایک سو جنگی کشتیاں لے کر سمندر سے پیش قدمی کرنے لگا۔ اِدھر سلطان خود اناطولیہ پہنچ کر سیواس کی شاہراہ سے طرابزون کی طرف بڑھا۔ راستے میں اوزون حسن کا سپہ سالار خورشید بیگ اپنی فوج لے کر آڑے آیا مگر سلطان کے بیگلر بیگ احمد پاشا نے اسے مار بھگایا۔

سلطان یاسی چمن پہنچا تھا کہ ایک کرد امیر شیخ حسین اپنے ساتھ اوزون حسن کی والدہ سارا خاتون کو لے کر حاضر

(1) تاریخ الدولۃ العثمانیۃ: ۱/ ۱۷۳، ۱۷۴۔

ہوا۔ سلطان محمد فاتح بڑی عزت کے ساتھ اس ضعیفہ سے ملا اور اسے ''ماں'' کہہ کر پکارتا رہا۔ یہ بڑھیا کئی دنوں تک سلطان کی مہمان رہی۔ اس دوران اس نے میٹھی میٹھی باتیں کر کے سلطان کو لشکر کشی سے روکنے کی بڑی کوشش کی مگر سلطان پر جو ایسے حربوں سے واقف تھا، کوئی اثر نہ ہوا۔

سلطان کو سب سے زیادہ خدشہ یہ تھا کہ کہیں ڈیوڈ کمنن فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ فرار کا ممکنہ راستہ وہ دشوار ترین پہاڑی علاقہ تھا جو سیواس اور طرابزون کے مابین تھا۔ سلطان نے محمود پاشا کو معروف شاہراہ پر روانہ کر کے اس پہاڑی علاقے پر خود پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ یہ راستہ ایسا کٹھن تھا کہ سواریاں استعمال کرنا ممکن نہ رہا۔ سلطان خود سپاہیوں کے ساتھ پاپیادہ مشکل چوٹیاں اور ٹیلے عبور کرتا گیا یہاں تک کہ طرابزون سامنے دکھائی دینے لگا۔ ڈیوڈ کمنن نے دیکھا کہ وہ بیک وقت تین سمت سے عثمانی افواج کے گھیرے میں ہے۔ وہ نادم ہو کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی طلب کی۔ سلطان نے اس کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کیا۔ ۲۱ محرم ۸۶۶ھ کو ''دریائے استرو ماکاراسو'' کے کنارے ڈیوڈ نے ریاست سلطان کے حوالے کرنے کا معاہدہ لکھ دیا۔ ①

اوزون حسن کو شکست:

اُدھر ایشیا میں عثمانی سلطنت کی مشرقی سرحدوں پر اوزون حسن حملے کر رہا تھا، اس نے ریاست قرمانیہ پر قبضہ بھی کر لیا تھا تاہم سلطان محمد فاتح نے اس محاذ پر اپنے بیٹے بایزید ثانی کو مقرر کر دیا تھا اور اس کی قیادت میں عثمانی افواج وہاں بھی پورے استقلال سے لڑ رہی تھیں۔

ربیع الاول ۸۷۸ھ (اگست ۱۴۷۳ء) کی جنگ میں اوزون حسن کی افواج نے عثمانیوں سے شکست فاش کھائی۔ اس کا بیٹا زین العابدین اور اس کا عیسائی سپہ سالار اسحٰق مارے گئے۔ چار سال بعد ۸۸۲ھ میں اوزون حسن انتقال کر گیا۔ اس کی اولاد میں حکومت مزید اٹھارہ سال چل سکی اور ۱۵۰۱ء میں اس پر صفویوں نے قبضہ کر لیا۔ ②

بحیرۂ اسود اور کریمیا کی مہمات:

اس زمانے میں مشرقی یورپ تک پھیلی ہوئی اہم مغل ریاست ''زرّیں خیل'' زوال کا شکار ہو کر بکھر چکی تھی، اس کی شکست وریخت سے جن ریاستوں نے جنم لیا، ان میں ریاستِ کریمیا بہت اہم تھی جو شمالی قفقاز اور روس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساحل پر کئی قلعے تھے جہاں اہلِ جنیوا نے نوآبادیات بنالی تھیں۔ کریمیا کا مسلمان مغل حاکم جو خانِ کریمیا کہلاتا تھا، اہلِ جنیوا کے تسلط سے بہت تنگ تھا۔ اہلِ جنیوا نے اس کی بندرگاہوں پر تسلط کے ذریعے بحیرۂ اسود کی ساری تجارت اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی اور درآمد، برآمد پر ٹیکس وصول کر کے وہ بھاری نفع حاصل کر رہے تھے۔

ایسے حالات میں خانِ کریمیا نے سلطان محمد فاتح کو لکھا کہ وہ اہلِ جنیوا کو نکال باہر کرے اور کریمیا کی ریاست کو

---

① تاریخ عثمانی: ۲/۱۵۱ تا ۱۵۶

② تاریخ الدولۃ العثمانیہ: ۱/۱۵۵ تا ۱۵۷، ۱۶۰ تا ۱۶۵

اپنی سرپرستی میں لے لے۔ سلطان کو خود بھی بحیرۂ اسود پر یورپیوں کا تسلط برداشت نہیں تھا۔ اس کی پالیسی یہ تھی کہ سلطنت کو بحیرۂ اسود کے اطراف میں پھیلا کر پورے سمندر کو اسلامی عمل داری کا حصہ بنادیا جائے۔

سلطان نے اپنے اقتدار کے آغاز میں ہی اس پالیسی پر عمل شروع کر دیا تھا۔ ۸۵۶ھ (۱۴۵۱ء) میں اس نے اپنے امیرالبحر سلیمان بیگ کو ۵۰ جنگی جہاز دے کر بحیرۂ اسود میں بھیجا جس نے جنوب میں ساحلی شہر باطوم (Batumi) فتح کر کے گرجستان کے ضلعوں ''آجار'' اور ''سوخوم'' کے علاوہ ریاست ''ابخاز'' پر بھی تسلط حاصل کرلیا۔ یوں گرجستان کا سارا ساحل سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہوگیا۔

سلطان محمد فاتح نے قُسطَنطِینِیّہ فتح کرنے کے کچھ عرصے بعد گولڈن ہارن سے متصل بازنطینی سلطنت کا ملحقہ علاقہ ''غلطہ'' (Galate) قبضے میں لے کر اہلِ جنیوا کو بے دخل کر دیا۔ پھر اس نے غیر ملکی طاقتوں کے لیے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کو بند کر دیا۔ مجبوراً اہلِ جنیوا کو یورپ اور کریمیا میں واقع اپنی نوآبادیات میں تجارتی رابطے اور نقل و حمل کے لیے سلطنتِ عثمانیہ کو ٹیکس ادا کرنے پر آمادہ ہونا پڑا۔ شعبان ۸۵۹ھ (جولائی ۱۴۵۴ء) میں سلطان نے ایک بحری بیڑا بحیرۂ اسود میں اتار دیا جس نے کریمیا پر تسلط حاصل کر کے وہاں اہلِ جنیوا کی سب سے بڑی بندرگاہ 'تھیوڈیشیا' (Theodiosia) کو ٹیکس کی ادائیگی کا پابند بنایا۔ قدیم دور میں اس بندرگاہ کو ''یافا'' یا ''کفہ'' کہا جاتا تھا۔

۸۷۸ھ میں سلطان نے اپنے سالار احمد پاشا کو صدرِ اعظم مقرر کر دیا اور ساتھ ہی اسے بحری مہمات سپرد کر دیں۔ محرم ۸۸۰ھ (مئی ۱۴۷۵ء) میں عثمانی امیرالبحر احمد پاشا ۱۸۳ جنگی اور ۲۹۰ تجارتی جہازوں کا بیڑا لے کر بحیرۂ اسود میں نکلا۔ اس سمندر میں اس سے پہلے اتنا بڑا بحری قافلہ کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس بیڑے نے کریمیا کے ساحل پر واقع جنیوا کی بندرگاہوں پر اتر کر اہلِ جنیوا سے جنگ چھیڑ دی۔ چار دن کی لڑائی کے بعد جنیوا کو شکست ہوئی اور ان کے چالیس ہزار سپاہی گرفتار ہوگئے۔ یہاں سے بے پناہ مالِ غنیمت کے علاوہ بکثرت اعلیٰ معیار کے بحری جہاز بھی ہاتھ آئے۔ کفہ (Theodiosia) کو قبضے میں لے لیا گیا۔ قُسطَنطِینِیّہ کے بعد یہ شہر ایشیا اور یورپ کے سنگم پر سب سے بڑا تجارتی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک نئے صنعتی و تجارتی شہر کی بنیاد ڈالی گئی جس کی آبادی بہت جلد سات لاکھ تک پہنچ گئی۔ خانِ کریمیا نے جو چنگیز خان کے بیٹے جوجی کی اولاد میں سے تھا، بخوشی دولتِ عثمانیہ کی اطاعت قبول کرلی۔ یہ معاہدہ طے پا گیا کہ عثمانی سلطنت کریمیا کا کوئی بھی حاکم مقرر کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ چنگیز خان کی نسل سے ہو۔ یہ معاہدہ آئندہ تین صدیوں تک برقرار رہا اور کریمیا میں عثمانیوں کے باج گزار مسلم تاتاریوں کی حکومت قائم رہی۔

تاتاری حکمرانوں کے اس خاندان کا جدِ امجد، حاجی گرائی بن غیاث الدین بن تاش تیمور تھا۔ اس کے ایک بیٹے منگلی نے ''گرائی'' کو بطورِ لقب اختیار کرلیا تھا جس کے بعد اس خاندان کا ہر حاکم گرائی کہلانے لگا۔ حاجی گرائی، نور دولت گرائی اور منگلی گرائی خود کو ''سلطان'' بھی کہلواتے تھے مگر ۸۸۰ھ (۱۴۴۵ء) میں ترکوں کے ماتحت آجانے کے بعد انہیں ''سلطان'' کا لقب چھوڑنا پڑا اور وہ صرف ''خان'' کہلانے لگے۔ غرض پندرہویں سے اٹھارہویں صدی

عیسوی تک جزیرہ نما کریمیا اور یوکرائن کے بڑے حصے پر یہ خاندان کسی نہ کسی شکل میں حکومت کرتا رہا۔

احمد پاشا نے بحیرۂ اسود کے جنوبی ساحل پر باقی ماندہ چھوٹی چھوٹی بازنطینی ریاستوں کو بھی فتح کر لیا۔ پھر یہ بیڑا خلیجِ جار جیا سے بحیرۂ ازوف میں داخل ہو گیا اور یہاں دریائے ڈون کے ڈیلٹا میں واقع دریائی بندرگاہ پر قابض ہو گیا۔ ازوف میں ایک مستحکم قلعہ تعمیر کر کے اسے محفوظ بنا دیا گیا۔ یہ فتوحات ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) میں ہوئیں۔ یہی وہ سال تھا جب روس میں ''زار'' خاندان کی بادشاہت قائم ہوئی۔ اگلی صدیوں میں زارانِ روس عثمانی سلاطین کے سب سے بڑے حریف ثابت ہوئے۔ ان کی بادشاہت بیسویں صدی عیسوی کے کمیونسٹ انقلاب تک باقی رہی۔[1]

اٹلی پر حملہ

قُسطَنطِینِیَہ کی فتح کے بعد سلطان محمد فاتح نصرانیت کے دوسرے مرکز اٹلی کے شہر روم پر قبضہ کر کے اپنے پردادا بایزید یلدرم کا عزم پورا کرنا چاہتا تھا جس نے کہا تھا کہ روم میں سینٹ پیٹر کی قربان گاہ پر جا کر اپنے گھوڑے کو دانہ کھلاؤں گا۔ سلطان کے لیے اٹلی پر قبضہ زیادہ مشکل نہ تھا کیوں کہ اس وقت بھی اٹلی کی بعض ریاستوں نے سلطنتِ عثمانیہ کی بالادستی قبول کر رکھی تھی اور بعض ریاستوں میں باضابطہ طور پر سلطنتِ عثمانیہ کا سکہ رائج تھا۔ اٹلی کے نصف جنوبی حصے پر پاپائے روم کی حکومت تھی مگر اس میں بھی عثمانیوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی۔

سلطان محمد فاتح نے جمادی الاولیٰ ۸۸۵ھ (جولائی ۱۴۸۰ء) میں اٹلی کے لیے بحری لشکر روانہ کیا جس کا سربراہ احمد پاشا تھا۔ اس مہم سے قبل اسے صدرِ اعظم کی جگہ سپہ سالارِ اعلیٰ کا عہدہ دیا گیا اور صدارتِ عظمیٰ محمد پاشا کو دے دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ احمد پاشا اس طویل مہم کے لیے یکسو ہو جائے اور اس کی غیر موجودگی میں سیاسی مسائل کا انتظام ہوتا رہے۔ احمد پاشا کے بیڑے میں ۴۰ بڑے اور ۵۲ چھوٹے جنگی جہاز شامل تھے۔ ان کے علاوہ ۴۰ مزید جہاز نقل وحمل کے لیے تھے۔ پہلا حملہ اٹلی کے ساحلی شہر ''اوٹرانٹو'' پر ہوا۔ یہاں چودہ دن کی جنگ میں حریف کے ۲۲ ہزار میں سے ۱۲ ہزار سپاہی مارے گئے۔ آخر گیارہ اگست ۱۴۸۰ء کو اہلِ شہر نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہاں ساڑھے چھ ہزار ترک سپاہی تعینات کر کے بحری بیڑہ آگے روانہ ہو گیا۔ ''اوٹرانٹو'' اٹلی کا دروازہ اور ''باب الفتح'' کہلاتا تھا۔ اس کے بعد اٹلی میں کوئی شہر نہ تھا جہاں زیادہ عرصے مزاحمت ہو سکتی۔ پاپائے روم سکٹس چہارم اس کے ہاتھ سے نکل جانے کی خبر سن کر روما سے رخصتی کی تیاری کر رہا تھا جبکہ سلطان محمد فاتح نے اس فتح کی اطلاع سن کر آبنائے باسفورس پر عثمانی علم نصب کرا دیے تھے جو اس بات کی علامت تھے کہ سلطان خود اپنے خاص لشکر کے ساتھ محاذ پر روانہ ہونے والا ہے۔[2]

① تاریخ الدولۃ العثمانیہ: ۱/ ۱۶۸ تا ۱۷۲

۱۷۷۱ء میں روسیوں نے کریمیا کو فتح کیا اور ۱۷۸۳ء میں اسے باضابطہ طور پر روس کا حصہ بنا لیا، یوں نہ صرف گرائی خاندان کی چار صد سالہ حکومت ختم ہوئی بلکہ یہاں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج بھی غروب ہو گیا۔

② تاریخ الدولۃ العثمانیہ: ۱/ ۱۷۳ تا ۱۷۶

سلطان محمد خان فاتح کی وفات:

مگر اس سے پہلے کہ روم کی فتح کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا، سلطان محمد فاتح اچانک شدید پیچش میں مبتلا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ۳ ربیع الاول ۸۸۶ھ (۳ مئی ۱۴۸۱ء) کو انتقال کر گیا۔

بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ کارستانی سلطان کے طبیب ''لاکوبو'' کی تھی۔ وینس کا یہ طبیب بظاہر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو چکا تھا۔ وہ یعقوب پاشا کے نام سے موسوم تھا اور سلطان کا مکمل اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ اس نے سلطان کی دوا میں ایسا زہر ملا دیا تھا جو آہستہ آہستہ اثر کرتا تھا۔

اسی طبیب نے سلطان کی موت کی فوری خبر ان الفاظ میں یورپ روانہ کی۔ ''بڑا گدھ مر گیا ہے۔''

سولہ دن میں یہ اطلاع وینس پہنچی۔ یورپ میں اس پر جشن منایا گیا۔ پوپ کے حکم سے تین دن تک شکرانے کی عبادات ادا کی گئیں۔ ①

سلطان محمد فاتح کی فتوحات کا ایک جائزہ:

سلطان محمد فاتح کی عمر ۵۲ سال تھی۔ اس نے ۳۱ سال حکومت کی۔ اس کا پورا دورِ اقتدار جنگوں میں گزرا جن میں آٹھ لاکھ کے لگ بھگ سپاہی شہید ہوئے تاہم جو فتوحات حاصل ہوئیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ خونِ شہیداں ضایع نہیں گیا۔ اس دور میں بارہ ریاستیں اور دو سو سے زائد شہر فتح ہوئے۔

سلطان کے اقتدار کے ابتداء میں فتح قُسطَنطِینِیَّہ کے وقت سلطنتِ عثمانیہ کا رقبہ ۹ لاکھ ۶۴ ہزار مربع کلومیٹر تھا۔ ایشیا میں ۴ لاکھ ۸۰ ہزار اور یورپ میں ۴ لاکھ ۸۴ ہزار مربع کلومیٹر۔ ۲۸ سال بعد جب سلطان کی وفات ہوئی تو یہ رقبہ بڑھ کر ۲۲ لاکھ ۱۴ ہزار مربع کلومیٹر ہو چکا تھا۔ ۵ لاکھ ۱۱ ہزار مربع کلومیٹر ایشیا میں اور ۱۷ لاکھ ۳ ہزار مربع کلومیٹر یورپ میں۔ اس سے سلطان کی فتوحات کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ②

علم دوستی اور رفاہی کارنامے:

سلطان جنگی مہمات میں اس قدر مصروفیت کے باوجود حیرت انگیز طور پر تعمیراتی اور رفاہی کاموں میں اپنے آباء و اجداد سے کم نہیں تھا۔ اس نے تمام شہروں اور دیہاتوں میں تعلیم گاہیں قائم کیں جن میں وہ تمام دینی و عصری مضامین پڑھائے جاتے تھے جن کی دنیا میں ضرورت پڑتی ہو۔ ان کا نصاب بھی سلطان نے طے کیا تھا اور ان کے لیے خزانے سے بھاری رقم مختص تھی۔ ان تعلیم گاہوں میں باقاعدہ امتحانات ہوتے تھے۔ کامیاب طلبہ میں اسناد تقسیم ہوتیں۔ انہی اسناد کی بنیاد پر قابلیت کے مطابق سرکاری ملازمتیں ملتی تھیں۔ ③

---

① تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/ ۱۷۷ تا ۱۷۹؛ تاریخ الدولة العلية، ص ۱۷۶

② اطلس فتوحات الاسلامیه: ۳/ ۳۶۲

③ نزهة الانظار: ۲/ ۱۸، ۱۹

سلطان کی علم دوستی کا یہ حال تھا کہ اسے جس بھی راسخ عالم کا پتا چلتا، کوشش کر کے اسے اپنے ہاں مدعو کرتا اور ہر ممکن سہولت مہیا کرتا۔ غیر معمولی مقام کے حامل علماء سے خود استفادہ کرتا اور طالب علم بن کر ان سے کتابیں پڑھتا۔ دیگر شہروں اور ممالک کے علماء علم کی قدر دانی کا یہ حال سن کر جوق در جوق استنبول کا رخ کرتے تھے۔ یوں یہ شہر علوم وفنون کے ماہرین سے آباد ہوتا جاتا تھا۔

اس بارے میں مولانا خواجہ زادہ کا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ وہ بورصہ کے ایک مفلس عالم تھے۔ مدرسۃ الاسدیہ میں صرف ونحو پڑھاتے تھے۔ سلطان کی علم دوستی کا حال سن کر وہ استنبول جانا چاہتے تھے مگر سفر کے لیے رقم نہ تھی۔ آخر قرض لے کر ایک گھوڑا خریدا اور استنبول کا رخ کیا۔ راستے میں دیکھا کہ سلطان لشکر سمیت استنبول جا رہا ہے۔ وزیر محمود پاشا کو ان کی آمد کا پتا چلا تو انہیں سلطان کے خیمے تک پہنچا دیا۔ وہاں کسی صرفی یا نحوی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ مولانا خواجہ زادہ نے بھی اپنی رائے پیش کر دی۔ 'زیرک' نامی ایک درباری نے اس پر اعتراض کیا تو اسے ایسے وزنی جوابات دیے کہ سلطان کو کہنا پڑا: ''زیرک! تمہاری بات کی کوئی حیثیت نہیں۔''

مجلس ختم ہوئی تو سب علماء اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے اور سرکاری خادم ان کی خاطر تواضع میں لگ گئے۔ مولانا خواجہ زادہ کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ وہ اسی درخت کے نیچے لیٹ گئے جس کے ساتھ ان کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ انہیں افسوس تھا کہ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ رات کے کسی پہر تین خادم وہاں سے گزرے۔ وہ ہر کسی سے پوچھ رہے تھے:

''مولانا خواجہ زادہ کا خیمہ کہاں ہے؟''

کسی جاننے والے نے کہا: ''وہ درخت کے نیچے لیٹا ہوا آدمی، خواجہ زادہ ہے۔''

خدام کو یقین نہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بھی دیگر مہمان علماء کی طرح کسی خیمے میں قیام پذیر ہوں گے۔ وہ مولانا کے قریب آئے اور پوچھا: ''خواجہ زادہ آپ ہیں؟؟''

انہوں نے اثبات میں جواب دیا تب بھی خدام کا شک دور نہ ہوا، بولے: ''آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں؟''

جواب دیا: ''ہاں بالکل۔'' خدام نے کہا: ''آپ مدرسہ الاسدیہ میں استاد ہیں؟'' بولے: ''جی ہاں۔''

خدام نے کہا: ''زیرک کو آپ ہی نے لاجواب کیا تھا؟'' فرمایا: ''ایسا ہی ہوا تھا۔''

خدام نے آگے بڑھ کر ان کی دست بوسی کی اور کہا: ''سلطان نے آپ کو اپنا استاد مقرر کر لیا ہے۔''

مولانا سمجھے کہ ان سے مذاق کیا جا رہا ہے مگر کچھ ہی دیر میں جب خدام نے ان کے لیے خیمہ گاڑ کر قالین، بستر، کھانے پینے کا سامان اور تمام ضروریات مہیا کر دیں تب انہیں کچھ کچھ یقین آیا۔

سلطان نے واقعی انہیں اپنا استاد بنا لیا اور ان سے ''علم الصرف'' میں ''متن عز الدین ترکمانی'' پڑھنے لگا۔ بعد میں انہیں ایڈریا نوپل کا قاضی مقرر کر دیا۔ خواجہ زادہ کے بوڑھے والد کو بیٹے کے اس مقام ومرتبے کا علم ہوا تو انہیں یقین نہ آیا۔ آخر وہ خود ایڈریا نوپل روانہ ہوئے۔ خواجہ زادہ کو خبر ہوئی تو ماتحت افسران اور علماء کے ایک ہجوم کے ساتھ شہر کے

دروازے پران کے خیر مقدم کے لیے آئے۔

باپ نے یہ جمِ غفیر دیکھا تو پوچھا: ''یہ کون آرہا ہے؟''

کہا گیا: ''یہ آپ کے صاحبزادے تشریف لارہے ہیں۔''

باپ نے حیران ہوکر کہا: ''کیا میرا بیٹا اس مقام تک پہنچ گیا ہے؟''

چند لمحوں بعد باپ بیٹے کی ملاقات ہوئی تو بیٹے نے دست بوسی کرتے ہوئے باپ سے کہا:

''ابا جان! اگر آپ مجھے مال کمانے میں لگاتے تو میں کبھی اس مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔''[1]

یہ تھی علم کی وہ قدر دانی جس نے محمد فاتح کے دور میں سلطنتِ عثمانیہ کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔

قانون سازی:

علماء کی شاگردی اور مطالعے کی مستقل دھن نے سلطان میں ایسی عبقری صلاحیت پیدا کردی تھی کہ اس نے پہلی بار اپنی عظیم الشان ریاست کے نظم وضبط کے لیے مفصل قانون سازی کی اور یوں صدیوں تک اس سلطنت کو نہایت مضبوط بنیادوں پر کھڑا کردیا۔ یہ ایک مفصل اور منضبط آئین تھا جسے ''قانون نامہ'' کہا جاتا تھا۔

قانون نامے کے مطابق قانون سازی کا اصل مأخذ قرآن مجید تھا، اس کے بعد احادیثِ صحیحہ کا درجہ تھا۔ پھر ائمہ اربعہ کی فقہ کی پیروی تھی۔ ان کے بعد سلطان کے حکم کی حیثیت تھی۔ اگر سلطان کا حکم شریعت کے خلاف ہوتو علماء کو اختیار تھا کہ اس کا خلافِ شرع ہونا ثابت کرکے اسے منسوخ کرادیں۔ سلطنت کے سیاسی، عدالتی و عسکری قوانین طے کیے جانے سے قبل علماء اور مفتیانِ کرام کے سامنے تصدیق کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔[2]

سلطنت کے شعبے:

قانون نامے میں سلطنت کو ایک خیمے سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اس خیمے کے دروازے کو ''بابِ عالی'' کا نام دیا گیا جس سے مراد ایوانِ شاہی ہے۔ قانون نامے میں کہا گیا تھا کہ سلطنت کا خیمہ چار ستونوں پر قائم ہے:

① وزارئے سلطنت (کابینہ)

② قاضی (عدلیہ)

③ دفتر دار (مالیات)

④ نشانچی (سرکاری دستاویزات تیار کرنے کا شعبہ)

وزیرِ اعظم کو صدرِ اعظم کہا جاتا تھا۔ سلطنت کی مُہر اسی کے پاس ہوتی تھی۔ حکومت کے تمام معاملات اور مسائل حل کرنے کی مجلسِ مشاورت دیوان کہلاتی تھی۔ اس کا صدرِ مجلس خود سلطان ہوتا تھا مگر سلطان کی غیر موجودگی یا مصروفیت

---

① نصرة اهل الايمان بدولة آل عثمان، ص ٧٦ تا ٧٩

② الاسلام والدستور از شیخ توفیق بن عبدالعزیز السدیری، ص ١٦٠

کے وقت صدرِ اعظم اس کی صدارت کرتا تھا۔ صدرِ اعظم کو وزراء کی مجلس طلب کرنے اور الگ دربار منعقد کرنے کا بھی حق حاصل تھا۔ سرکاری مشینری کا سارا دارومدار صدرِ اعظم کی قابلیت اور کارکردگی پر ہوتا تھا۔

عدلیہ آزاد تھی مگر اس کا انتظام صدرِ اعظم کے ذمے تھا۔ سلطنت کے تمام قاضیوں کا تقرر وہی کرتا تھا۔ یورپ اور ایشیا کی عثمانی عدالتوں کے لیے الگ الگ قاضی القضاۃ تھے۔ قاضی عسکر کا شعبہ بھی بڑا اہم تھا۔ فوج کے ساتھ ایک قاضی ہمیشہ رہتا تھا۔ ان قاضیوں کا انتخاب اعلیٰ صلاحیت کے علماء میں سے ہوتا تھا۔ فقہ کے ماہر دو سو علماء کی ایک جماعت کا کام صرف فتاویٰ جاری کرنا تھا۔ یہ حضرات مفتی کہلاتے تھے اور ان کا رتبہ اعلیٰ افسران سے بھی زیادہ تھا۔

دفتر دار کے ذمے مالیات کا سارا انتظام تھا۔ سلطنت کو صوبوں، کمشنریوں اور اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ صوبہ دار ''پاشا'' اور ضلعی تحصیل دار (کلکٹر) 'بیگلر بیگ' کہلاتا تھا۔ کمشنر کو ''سنجق بیگ'' کہا جاتا تھا۔ ترکی میں پرچم کو سنجق کہتے ہیں، چونکہ ہر کمشنری کا پرچم الگ ہوتا تھا اس لیے ان کے سرداروں کو ''سنجق بیگ'' کہا جاتا تھا۔ محمد فاتح کے دور میں صرف یورپی مقبوضات میں ۳۶ سنجق تھے۔

سلطنت کے اہم عہدے دار 'آغا' کہلاتے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں: داخلی اور خارجی۔ داخلی آغا دربار میں حاضر رہتے تھے جبکہ خارجی آغا صوبوں میں اہم مناصب پر بھیجے جاتے تھے۔[1]

سلطان محمد خان فاتح کا دور..... عثمانیوں کا عروج:

محمد فاتح ایک خوش قسمت حکمران تھا جس نے پندرہویں صدی عیسوی میں سلطنتِ عثمانیہ کو دنیا کی سب سے طاقتور اور وسیع حکومت بنا دیا تھا جو ایشیائے کوچک سے لے کر دریائے ڈینوب اور کریمیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے قُسطَنطِینِیَّہ فتح کر کے حضور اکرم ﷺ کی پیش گوئی اور مسلمانوں کی آٹھ صد سالہ قدیم آرزو کو پورا کر دکھایا اور احادیث مبارکہ میں منقول بشارتوں کا حق دار بن گیا۔ بلغاریہ کے دارالحکومت بلغراد کی جنگ کے سوا اسے کہیں شکست نہیں ہوئی۔ ایک فاتح کی حیثیت سے وہ اپنے باپ دادا سے سبقت لے گیا تھا۔ محمد پاشا اور احمد قیدوق پاشا اس کے بہترین سپہ سالار تھے جو اس کی فتوحات میں پیش پیش رہے۔ احمد پاشا خاص طور پر قابلِ تعریف ہے جو فوج میں ہر دل عزیز تھا۔ محمد فاتح کی فتوحات میں احمد کی قابلیت، تجربے، دور اندیشی اور مشوروں کا بڑا دخل تھا۔

سلطان کی وفات سے یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب رک گیا۔ سلطان کا دور مسلمانوں کی اُس نشأۃِ ثانیہ کا عروج تھا جو صلیبی جنگوں اور تاتاری تباہ کاریوں کے بعد شروع ہوئی۔ اس کی وفات سے یہ دور انتہاء کو پہنچا۔ اگرچہ عالم اسلام کی عظیم الشان عمارت یکدم زوال کا شکار نہیں ہوئی اور اس کے بعد بھی کئی عشروں تک فتوحات کا سلسلہ جاری رہا مگر حقیقت یہ ہے کہ سلطان کے رخصت ہوتے ہی ایک طرف اُس کی اولاد میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور دوسری طرف صرف گیارہ سال بعد اندلس میں مسلمانوں کی آخری ریاست غرناطہ کا خاتمہ ہوگیا۔

---

[1] تاریخ الدولة العلية، ص ۱۷۷

اگر سلطان کو چند برس اور مل جاتے اور ''روما'' فتح ہو جاتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ سلطان کی افواج اس کے بعد مغربی یورپ فتح کرتے ہوئے اندلس تک بھی پہنچ جاتیں اور وہاں کی دم توڑتی ہوئی اسلامی سلطنت پھر سے جی اٹھتی۔ ایسے میں یہ بھی بعید نہ تھا کہ یورپ دو تین صدیوں میں مکمل مسلمان براعظم بن جاتا۔

مگر اس وقت اہلِ یورپ کا اسلام تقدیر میں نہیں لکھا تھا۔ اللہ اپنے تکوینی فیصلوں کی اصل حکمتیں خود ہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ نے دنیا کو امتحان گاہ بنایا ہے، پس ہم انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے ہر دور میں امتحانات سے گزرے ہیں اور گزرتے رہیں گے۔ اگر ساری دنیا ایمان لے آئے اور سب ہی مؤمن مسلمان بن جائیں تو شاید اس دنیا میں آزمائش اور امتحان کا وہ ماحول ہی ختم ہو جائے گا جس کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے۔

سلطان محمد فاتح...... سخت گیری اور تلافی:

سلطان کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ نہایت سخت گیر اور بے رحم تھا۔ حالانکہ یہ بات مبالغہ آمیز ہے۔ وہ انتظامی اعتبار سے بے لچک ضرور تھا اور اس میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا تھا، لیکن اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا تو تلافی کر کے حسنِ سلوک میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ ایک واقعے سے اس کی طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شیخ شہاب الدین کورانی، سلطان محمد فاتح کے وہ محسن استاد تھے جن کی بدولت اسے علم سے مناسبت نصیب ہوئی۔ سلطان محمد خان نے تخت نشینی کے بعد ان کی مزید عزت افزائی کی اور انہیں سلطنت کا عہدہ وزارت پیش کیا۔ شیخ نے معذرت کر لی اور کہا: ''آپ کے ماتحتوں میں ایسے لوگ بکثرت ہیں جو آپ کی خدمت اس لیے کر رہے ہیں کہ شاید انہیں کبھی وزارت مل جائے۔ اگر ان کے سوا کسی کو یہ عہدہ دیا گیا تو وہ مایوس ہو کر آپ سے بددل ہو جائیں گے۔''

سلطان محمد فاتح نے یہ عذر قبول کر لیا اور انہیں فوجی عدالتوں کے قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا۔ انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ مگر کچھ دنوں بعد سلطانِ محمد فاتح اور شیخ کے درمیان ناچاقی ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ شیخ ماتحت قاضیوں کا تقرر سلطان کے مشورے کے بغیر کرنے لگے تھے جبکہ ضابطے کے لحاظ سے اس بارے میں ان کا سلطان یا صدرِ اعظم سے مشورہ ضروری تھا۔ سلطان محمد فاتح اس پر ناراض تو تھا مگر انہیں صاف صاف منع کرتے ہوئے اسے حیا آتی تھی۔ کچھ مدت بعد سلطان نے انہیں بورصہ میں اوقاف کا نگران بننے کی پیش کش کی۔ شیخ نے بلا پس و پیش اسے بھی قبول کر لیا۔

کچھ عرصے بعد سلطان کی طرف سے شیخ کے نام ایک حکم نامہ آیا۔ شیخ نے غور کیا تو اسے شریعت کے خلاف پایا۔ فوراً وہ حکم نامہ جلا کر راکھ کر دیا۔ سلطان کو پتا چلا تو اتنا غضب ناک ہوا کہ انہیں فوراً معزول کر دیا۔

شیخ بددل ہو کر سلطنت سے نکل گئے اور مصر جا کر سلطان قائتبائی کے پاس رہنے لگے۔ سلطان قائتبائی نے ان کی بے حد عزت کی اور خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

کچھ عرصے بعد سلطان محمد فاتح کو اپنے کیے پر ندامت ہوئی۔ اس نے مراسلہ بھیج کر سلطان قائتبائی سے درخواست کی کہ وہ شیخ کو واپس بھیج دے تاکہ وہ دوبارہ سلطنتِ عثمانیہ کو رونق بخشیں۔ سلطان قائتبائی نے شیخ کو وہ مراسلہ دکھایا اور

ساتھ ہی کہا: ''آپ وہاں ہرگز نہ جائیں۔ ہم ان سے بڑھ کر آپ کی خدمت کر رہے ہیں۔''

شیخ نے کہا: ''آپ درست کہتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ میرے اور سلطان محمد خان کے مابین ایسی طبعی محبت ہے جیسی بیٹے اور باپ میں ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان جو رنجش ہوئی وہ الگ بات ہے۔ سلطان کو بھی معلوم ہے کہ میں اس سے ولی محبت کرتا ہوں۔ اب اگر اس کے کہنے کے باوجود میں نہ گیا تو وہ سمجھے گا کہ آپ نے مجھے منع کیا ہے۔ اس سے دونوں سلطنتوں کے درمیان نفرت و عداوت پیدا ہوگی۔''

سلطان قائتبائی نے ان کی بات کا وزن محسوس کرتے ہوئے انہیں واپس بھیج دیا۔ سلطان محمد خان نے ان کی آمد پر بے حد مسرت ظاہر کی۔ سلطان نے انہیں بورصہ کا قاضی اور مفتی مقرر کر دیا۔ ان کے لیے یومیہ دوسو، ماہانہ بیس ہزار اور سالانہ ساٹھ ہزار دراہم کا خطیر وظیفہ مقرر کیا۔ اس کے علاوہ موقع بموقع گراں قدر تحائف اور انعامات کا سلسلہ جاری رکھا۔ شیخ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً سلطان کو پند و نصیحت کرتے رہتے، سلطان نے کبھی برا نہیں منایا۔ شیخ نے سلطان کی ملازمت کے دوران ''غایة الامانی فی تفسیر سبع المثانی'' جیسا تفسیری رسالہ لکھا جو چہار سو مشہور ہوا۔[1]

---

[1] نصرة اهل الایمان بدولة آل عثمان للشیخ الاسلام محمد بن ابی سرور البکری الصدیقی (م ۱۰۷۱ھ)، ص ۷۴، ۷۵

نوٹ: مصنف نے یہاں اس واقعے کو سنہ ۸۶۲ھ کا بتایا ہے مگر یہ تسامح معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس وقت تک سلطان قائتبائی مصر کا حکمران نہیں بنا تھا۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ سلطان قائتبائی کا دورِ حکومت رجب ۸۷۲ھ سے شروع ہوا تھا۔ جب کہ اس واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ جب شیخ مصر گئے تھے تو اس وقت سلطان قائتبائی حکمران تھا۔

سلطان بایزید ثانی

۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ

(۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء)

سلطان محمد فاتح کی وفات کے وقت، ان کا سپہ سالار اعلیٰ احمد پاشا اٹلی کے دروازے ''اوٹرانٹو'' پر قبضہ کر چکا تھا اور آئندہ موسم بہار میں روم پر لشکر کشی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے شہر کے دفاعی انتظامات کو نہایت مستحکم کر کے اگلی لڑائیوں کے لیے اسے ایک مضبوط چھاؤنی بنا دیا تھا۔ ایسے میں سلطان محمد فاتح کی موت سے اسے شدید صدمہ ہوا۔ اس نے ایک امیر کو اپنا نائب بنا کر شہر کی حفاظت کا حکم دیا اور خود تیزی سے استنبول روانہ ہوا تا کہ نئے سلطان سے روم کی فتح کی اجازت حاصل کرے۔

مگر اس دوران محمد فاتح کی عظیم سلطنت میں افتراق کی لکیر پڑ چکی تھی۔ اس نامور سلطان کے دو بیٹے تھے: بڑا بیٹا بایزید جو ۳۶ سال کا تھا، صلح جو، امن پسند، نرم مزاج اور دھیما تھا۔ اس کی یکسوئی، پرہیز گاری اور عبادت گزاری کی وجہ سے مؤرخین اسے ''بایزید صوفی'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ چھوٹا لڑکا جمشید جو ۲۲ برس کا تھا، باپ کی طرح جنگجو اور دلیر تھا اس لیے بعض ارکانِ سلطنت کا خیال تھا کہ جمشید ہی کو بادشاہ بنایا جائے مگر بایزید کے حامی امراء غالب آئے اور سلطان محمد فاتح کے بعد بایزید نے حکومت سنبھالی۔ وہ ۲۲ ربیع الاوّل ۸۸۶ھ (۲۳ مئی ۱۴۸۱ء) کو تخت نشین ہوا۔

احمد پاشا جب استنبول پہنچا تو بایزید تخت نشین ہو چکا تھا۔ احمد پاشا نے بلا پس و پیش بایزید سے بیعت کر لی اور روم کی مہم کے بارے میں اس سے اجازت کے لیے موقعے کا منتظر رہا مگر بایزید ابتدائی دنوں ہی میں ایک ایسے مسئلے میں پھنس گیا کہ روم کی فتح کا منصوبہ خواب و خیال ہو گیا۔[1]

شہزادہ جمشید کی بغاوت:

یہ مسئلہ اس کے بھائی شہزادہ جمشید کا تھا۔ سلطان محمد فاتح کی وفات کے وقت وہ کریمیا کا گورنر تھا۔ چونکہ بعض ارکانِ سلطنت اسے بادشاہ دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے ان کی حمایت کے ساتھ جمشید نے مطالبہ کر دیا کہ سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایشیائی مقبوضات اسے دے دیے جائیں۔ مگر بایزید نے اس مطالبے کو مسترد کر دیا۔ مصالحت

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/۱۸۵؛ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۷۹۔۱۸۰

کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں اور آخر کار ۸۸۶ھ (۲ جون ۱۴۸۱ء) کو دونوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں جمشید کو ناکام ہوکر بھاگنا پڑا۔

اٹلی کا دروازہ ہاتھ سے نکل گیا:

مسلمانوں میں اس خانہ جنگی کی وجہ سے روم کی اکھڑتی ہوئی سانسیں بحال ہوگئیں۔ پوپ نے یورپی طاقتوں کو اپنے مذہبی مرکز کی حفاظت کی دہائی دی تو اسپین، فرانس اور آسٹریا سمیت کئی ممالک اس کے ساتھ ہوگئے۔ ان کی متحدہ افواج نے پیش قدمی کر کے ''اوٹرانٹو'' کا محاصرہ کرلیا۔ وہاں تعینات ترک فوج نے حملہ آوروں سے مذاکرات کیے اور طے کرایا کہ انہیں جان کی امان دے کر استنبول واپسی کا راستہ دیا جائے گا۔ اس معاہدے کے تحت شہر کے دروازے کھول دیے گئے۔ مگر یورپی لشکر نے شہر میں داخل ہونے کے بعد ترکوں سے بدعہدی کی اور ان کا قتل عام کر کے تقریباً سب کو اس طرح تہ تیغ کیا کہ شہر کی گلیاں ان کے خون سے رنگین ہوگئیں۔

یوں دوسری صدی ہجری میں معرکہ بلاط الشہداء اور آٹھویں صدی ہجری میں بایزید یلدرم کی یورپ سے واپسی کے بعد، بایزید ثانی کے دور میں مسلمانوں کو تیسری مرتبہ یورپ کے قلب سے پسپا ہونا پڑا۔[1]

سلطان محمد فاتح کا بیٹا، یورپی طاقتوں کا یرغمال:

اُدھر شہزادہ جمشید تاج و تخت کے حصول میں ناکامی کے بعد اپنے اہل وعیال اور والدہ کے ساتھ مصر چلا گیا اور وہاں کے مملوک سلطان کے پاس پناہ لی۔ کچھ عرصے بعد اس نے ازسرِ نو تیاری کر کے ۸۸۷ھ (جون ۱۴۸۲ء) میں ایک بار پھر اپنے بڑے بھائی بایزید ثانی کے خلاف فوج کشی کی۔ اس بار بھی اسے بدترین شکست ہوئی اور وہ تیس چالیس ساتھیوں کے ساتھ بمشکل جان بچا کر نکل سکا۔ پریشانی کے عالم میں اس نے مصر جانے کی بجائے، جہاں اس کا کنبہ اور والدہ قیام پذیر تھے، یورپ کے جزیرے روڈس کا رخ کیا۔

جزیرۂ روڈس کے حاکم ڈابسن نے عثمانی شہزادے کی آمد کی خبر سنی تو موقع غنیمت جانا اور اسے لکھ بھیجا کہ ہم آپ کو سلطنتِ عثمانیہ کا وارث مانتے ہیں اور ہر خدمت کے لیے تیار ہیں۔ جمشید مطمئن ہوکر روڈس پہنچ گیا۔

یہاں اس کا شاندار استقبال ہوا اور کچھ دنوں تک ٹھیک ٹھاک خاطر تواضع کی گئی تاہم حقیقت میں عیسائی میزبانی اور خدمت کے لبادے میں اسے یرغمال بنا چکے تھے اور اس کے ذریعے سلطنتِ عثمانیہ سے منہ مانگی دولت وصول کرنے کا منصوبہ طے کر چکے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد حاکمِ روڈس نے پہلے جمشید سے اقرار نامہ لکھوایا کہ اگر وہ سلطان بنا تو اہلِ روڈس کو تمام ممکنہ مراعات دے گا۔ اس کے بعد بایزید ثانی کو مراسلہ بھیجا کہ اہلِ روڈس کے لیے سلطنتِ عثمانیہ کی تمام بندرگاہیں کھول دی جائیں۔ اور ان سے کسی قسم کا ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ روڈس کو سالانہ ۴۵ ہزار ڈاکٹ (عثمانی سکے) ادا کیے جائیں۔ بصورتِ دیگر جمشید کو فوجی مدد کے ساتھ آزاد کر کے سلطنتِ عثمانیہ میں بغاوت

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ: ۱۸۵/۱؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۸۰

برپا کردی جائے گی۔ بایزید نے بغاوت سے بچنے کے لیے حاکم روڈس کی ہر شرط منظور کر لی۔

دوسری طرف حاکم روڈس نے مصر میں جمشید کی والدہ کو مراسلہ بھیج کر اس سے بھی سالانہ ڈیڑھ لاکھ ڈاکٹ کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں جمشید کو بایزید کے حوالے کر دیا جائے گا جہاں اسے سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔ جمشید کی والدہ نے بھی مجبوراً یہ شرط منظور کر لی۔ اس طرح روڈس کے عیسائی مسلمانوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگے۔

چونکہ روڈس ایک چھوٹی ریاست تھی اس لیے کچھ مدت بعد حاکم روڈس کو خطرہ محسوس ہوا کہ عثمانی فوجیں کسی بھی وقت جمشید کو بازیاب کرانے کے لیے جزیرے پر حملہ آور ہو سکتی ہیں، لہٰذا جمشید کو پہلے اٹلی کے شہر نیس اور پھر فرانس کے شہر روسلیون بھیج دیا گیا اور یکے بعد دیگرے اسے مختلف قلعوں میں رکھا جانے لگا۔ اس کے ساتھی بھی کم کیے جاتے رہے یہاں تک کہ وہ آخر میں تنہا رہ گیا۔

۸۹۵ھ تک جمشید حاکم روڈس کی امانت کے طور پر فرانس میں رہا اور حاکم روڈس حسب معمول سلطنت عثمانیہ اور جمشید کی والدہ دونوں سے دولت اینٹھتا رہا۔ اس دوران جمشید کی قدر و قیمت دیکھ کر یورپ کے متعدد حکمران اور خود روم کا پوپ، جمشید کو بطور یرغمال اپنی تحویل میں لینے کی کوششیں شروع کر چکے تھے، ان میں شاہ فرانس پیش پیش تھا کیوں کہ جمشید اسی کی مملکت میں قیام پذیر تھا۔

حاکم روڈس نے یہ صورتحال دیکھ کر جمشید کی والدہ کو مکتوب بھیجا اور وعدہ کیا کہ اگر سفری اخراجات کے ڈیڑھ لاکھ ڈاکٹ ارسال کر دیے جائیں تو جمشید کو گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ جمشید کی والدہ نے یہ رقم ارسال کر دی مگر حاکم روڈس نے وعدے کا بالکل لحاظ نہ کیا۔ شاہ فرانس کی للچائی ہوئی نظروں سے بچانے کے لیے اس نے جمشید کو اٹلی میں پوپ معصوس کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ پوپ کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ اس سلطان محمد فاتح کی اولاد اس کی گرفت میں رہے جو چند سال پہلے روم فتح کرنے کے قریب تھا۔

حاکم روڈس کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں جمشید کے اٹلی جانے کے بعد، روڈس کو ملنے والی دولت کا سلسلہ بند نہ ہو جائے، اس لیے اس نے پوپ سے عہد لیا کہ جمشید کی اٹلی میں نظر بندی کے باوجود روڈس عثمانی سلطنت سے سالانہ رقم وصول کرتا رہے گا۔ پوپ نے اسے قبول کر لیا۔ اُدھر شاہ فرانس جمشید کو اپنے ملک میں ہی رکھنا چاہتا تھا مگر پوپ کے اصرار پر اس نے اسے روم بھیجنا منظور کر لیا تاہم یہ وعدہ لیا کہ جمشید کو اٹلی سے باہر کہیں نہیں بھیجا جائے گا۔ اس وعدے کی پختگی کے لیے پوپ سے دس ہزار پونڈ بطور زر ضمانت وصول کیے گئے۔

جمشید روم پہنچا تو اس کا شاندار استقبال ہوا۔ جمشید نے پوپ سے درخواست کی کہ اسے گھر واپس جانے دیا جائے۔ پوپ نے جواب میں اسے عیسائی مذہب قبول کرنے کی ترغیب دی اور وعدہ کیا کہ اس صورت میں پورا یورپ اس کے ساتھ کھڑا ہو کر اسے عثمانی سلطنت کا تاج و تخت واپس دلوا دے گا۔ جمشید نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اس کے

بعد جمشید کو عام قیدیوں کی طرح ایک عمارت میں بند کر دیا گیا۔

کچھ مدت بعد شاہِ مصر نے جمشید کی بازیابی کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے جمشید کو اپنی مملکت کا شہری اور خاص مہمان قرار دے کر پوپ سے درخواست کی کہ اسے مصر بھیج دیا جائے مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ دوسری طرف بایزید اور پوپ کے مابین سفارتی رابطہ ہوا اور یہ معاملہ طے کر لیا گیا کہ جمشید کو قید رکھنے کی سالانہ قیمت، اہلِ روڈس کی بجائے اب پوپ کو ادا کی جائے گی۔

تین سال بعد پوپ شیئوس کا انتقال ہو گیا اور نئے پوپ الیگزنڈر نے بایزید کو پیغام بھیجا کہ اگر تین لاکھ ڈاکٹ یک مشت بھیجے جائیں تو جمشید کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے گا۔ بایزید نے یہ رقم بھیج دی مگر اس سے پہلے کہ پوپ جمشید کو قتل کراتا، ۹۰۱ھ میں فرانس کے بادشاہ چارلس ہشتم نے جمشید کو چھیننے کے لیے اٹلی پر حملہ کر دیا۔ پوپ نے روم سے بھاگ کر سینٹ انجلو کے قلعے میں پناہ لی، جمشید اسی کے ساتھ تھا۔ فرانس کی فوجوں نے محاصرے کے بعد قلعہ سر کر لیا۔ یوں جمشید فرانس کے قبضے میں آ گیا۔ شاہِ فرانس اسے ساتھ لے گیا اور اپنے ہاں نیپلز کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ پوپ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اب اس کے پاس دو راستے تھے: بایزید کو جمشید کے سر کی قیمت تین لاکھ ڈاکٹ واپس کر دے یا کسی طرح جمشید کو مروا دے۔ پوپ نے دوسرا راستہ پسند کر کے بایزید کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کر رہے گا۔ اس نے ایک حجام کو فرانس بھیجا جس نے نیپلز کے قلعے تک رسائی حاصل کر لی۔ ایک دن موقع پا کر اس نے جمشید کے کھانے میں دھیرے دھیرے اثر کرنے والا زہر ملا دیا اور زہر آلود اُسترے سے اس کی حجامت بھی بنائی۔

اندرونی اور بیرونی سمی اثرات نے جمشید کو بسترِ مرگ پر ڈال دیا۔ آخری لمحات میں اس کے پاس اس کی والدہ کا خط پہنچا مگر وہ اتنا نحیف ہو چکا تھا کہ خط بھی نہ پڑھ سکا اور فقط یہ دعا کی:

”الٰہی! اگر یہ کفار میرے ذریعے مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں تو مجھے آج ہی اٹھا لے۔“ کچھ دیر بعد جمشید کی روح پرواز کر گئی۔ اس کی عمر ۳۶ برس تھی۔ اس کی لاش بایزید کے پاس بھیج دی گئی جسے بورصہ میں دفن کیا گیا۔ [1]

مقامِ عبرت:

جمشید کی قید و بند کا یہ واقعہ کئی پہلوؤں سے نہایت عبرت ناک ہے۔ ایک طرف یہ مسلم شہزادوں اور حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی کا مرقع ہے کہ وہ سلطان محمد فاتح کے مقصد کو بھول کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو گئے جس کی وجہ سے روم کی فتح کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ شہزادہ جمشید کا بایزید کے مقابلے میں کھڑا ہونا اور ناکامی در ناکامی کے بعد اہلِ یورپ پر اعتماد کرنا، بہت بڑی حماقت تھی جس کا خمیازہ اسے تیرہ سال کی قید و بند اور مسلمانوں کو لاکھوں روپے کی ادائیگی کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ اسی طرح بایزید کا اپنے بھائی کو کفار کے ہاتھوں مروانے کا اقدام بھی افسوس ناک تھا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ یورپ مسلمانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں لگاتے تھے اور

[1] تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/۱۸۶، ۱۸۸؛ تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۸۱، ۱۸۲؛ تاریخ سلاطین بنی عثمان، ص ۵۶، ۵۷

موقع ملنے پر مکروفریب اور مذموم دسیسہ کاریوں کے ذریعے انہیں ہر طرح نقصان پہنچاتے تھے اور اخلاق ومروّت کی تمام اقدار فراموش کردیتے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے لیے بھی یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ آخر وہ کیوں قرآن کے احکام اور سیرتِ نبویہ کے اسباق کو بھول کر عارضی فوائد کے لیے دشمنوں کے ہاتھوں میں استعمال ہوتے ہیں؟

بایزید ثانی کی فتوحات:

جمشید کی جلاوطنی کے دوران بایزید ثانی نے فتوحات کا سلسلہ پھر سے شروع کردیا تھا۔ اگرچہ روم کی فتح کا خواب پورا نہ ہوسکا مگر دیگر محاذوں پر فوجیں آگے بڑھتی رہیں۔ بایزید نے بحری فوج کو خاص طور پر طاقتور بنایا کیوں کہ اسے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اہلِ یورپ شہزادہ جمشید کو لے کر کسی وقت بھی سمندری راستوں سے حملہ آور ہوسکتے ہیں۔

بایزید ۸۸۸ھ (۱۴۸۳ء) میں ہنگری کے مقابلے میں فتح یاب ہوا۔ اگلے سال عثمانی افواج بغدان (مالیڈیویا) کی طرف بڑھیں۔ یہ علاقہ موجودہ رومانیہ اور یوکرائن کے درمیان ہے۔ عثمانی افواج نے اس خطے کے کئی شہر فتح کیے جن میں قلعہ کیلی بہت اہم تھا جو ۲۰ جمادی الآخرہ ۸۸۹ھ (۱۵ جولائی ۱۴۸۴ء) کو فتح ہوا۔

دریائے ڈینسٹر کے دھانے کے بائیں کنارے پر واقع قلعہ ''اکرمان'' (آق کرمان) جو جنیوا کے ساتھ لگتا ہے، اس لیے اہم تھا کہ اس سے کریمیا کی طرف راستہ نکلتا تھا۔ اس ناقابلِ تسخیر قلعے پر ۸۲۲ھ، ۸۵۸ھ اور ۸۷۹ھ میں عثمانی افواج نے تین حملے کیے تھے مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ دریائے ڈینوب اور دریائے ڈنیسٹر کے دہانوں پر قابض ہونے کے بعد عثمانیوں کے لیے اس پر حملہ آسان ہوگیا، چنانچہ بایزید ثانی کے دور میں رجب ۸۸۹ھ (جولائی ۱۴۸۴ء) میں یہ قلعہ بھی سر کرلیا گیا۔ اس طرح ترک کریمیا کی طرف جانے والی تمام شاہراہوں پر قابض ہوگئے۔ مالیڈیویا کے پاس بحیرۂ اسود کا کوئی ساحل نہ رہا اور بحیرۂ اسود ہر سمت سے سلطنتِ عثمانیہ کے قبضے میں آگیا۔

۸۹۸ھ (۱۴۹۲ء) کے اواخر میں بوسنیا کے گورنر یعقوب پاشا نے جنوب مشرقی یورپ کی ریاست سلاوینیا پر چڑھائی کی اور اسے فتح کرکے بسٹیریا بھی زیرِ نگیں کرلیا جو جنوب مشرقی آسٹریا کی پہاڑی ریاست ہے۔

اس لشکر کی واپسی کے موقع پر کروشیا میں عیسائیوں نے زوردار حملہ کیا مگر یعقوب پاشا نے منہ توڑ جواب دے کر عیسائیوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلادیا۔ ساڑھے پانچ ہزار عیسائی مارے گئے اور ۲۵ ہزار گرفتار ہوئے۔ یہ فتح ۲۷ ذی قعدہ ۸۹۸ھ (۹ ستمبر ۱۴۹۳ء) کو حاصل ہوئی۔

ہنگری اور پولینڈ سے بھی جھڑپیں ہوئیں۔ آخر میں پولینڈ سے صلح ہوگئی اور معاہدے کے مطابق پولینڈ کے بعض سرحدی قلعے ترکوں کو مل گئے۔ ہنگری سے سرحدی لڑائیاں ایک مدت تک جاری رہیں، پھر صلح ہوگئی۔[1]

وینس کے ساحلوں کی فتوحات:

۹۰۲ھ سے ۹۰۹ھ (۱۴۹۶ء تا ۱۵۰۳ء) کے درمیان وینس پر متعدد حملے ہوئے جن میں ''لیپانٹو''، ''کورون''،

---

(1) تاريخ الدولة العثمانية: ۱۸۷/۱، ۱۸۸؛ تاريخ الدولة العلية، ص ۱۸۳ تا ۱۸۵

''نوارین'' اور ''دُرازو'' جیسے شہر مفتوح ہوئے۔ ان جنگوں میں ۹۰۵ھ کا معرکہ بہت اہم ہے جس میں ترک بحریہ نے وینس کی بحریہ کو شکستِ فاش دے کر متعدد جزائر فتح کیے۔

۹۰۶ھ کی بحری جنگ بھی یادگار تھی جس میں وینس، اٹلی، فرانس اور اسپین کے مشترکہ بیڑے سے پالا پڑا۔ یورپی طاقتیں طے کر کے آئی تھیں کہ اس بار عثمانیوں کو بحیرۂ روم سے نکال باہر کریں گی مگر ترکوں کے امیر البحر کمال نے جو بایزید کا غلام تھا، اس جنگ میں ایسی مہارت اور شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ یورپ کی طاقت سمندر میں غرق ہو گئی۔ [1]

اندلس کے مسلمانوں کی مدد:

انہی ایام میں اندلس پر عیسائیوں کا مکمل قبضہ ہوا جس کے بعد شاہِ قسطالیہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا نے وہاں کے مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانے کی مہم شروع کی۔ لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور لاکھوں کو زبردستی بپتسمہ [2] دینے کے لیے عقوبت خانوں میں ٹھونس دیا گیا۔ ان گنت مسلمان اندلس سے نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔

امیر البحر کمال نے اس دوران بحری بیڑوں کے ذریعے اندلس کے ساحلوں پر چھاپے مارے اور بہت سے مسلمانوں کو بحفاظت عیسائیوں کے چنگل سے نکال کر شمالی افریقہ کے ساحلوں تک پہنچایا۔ [3]

احمد پاشا کا قتل:

احمد پاشا سلطنت کے تجربہ کار اور قابل ترین افسران میں سے ایک تھا۔ وہ ینی چری افسر سے ترقی پا کر جرنیل بنا تھا۔ ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں اسے بیگلر بیگی یعنی سپہ سالاری کا عہدہ ملا۔ ۱۴۷۲ء میں محمود پاشا کی وفات کے بعد سلطان محمد فاتح نے اسے صدارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز کر دیا۔ چھ سال بعد سلطان محمد فاتح نے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے معزول کر دیا اور چھ ماہ معطل رکھنے کے بعد معافی دے کر اسے رومیلی کا گورنر بنا دیا۔

بایزید شہزادگی کے دور ہی سے اسے ناپسند کرتا تھا۔ پھر جب وہ تخت نشین ہوا تو احمد پاشا کی ہمدردیاں شہزادہ جمشید کے ساتھ تھیں۔ احمد پاشا کے مقام کو دیکھتے ہوئے بایزید اس پر ہاتھ ڈالنے سے کتراتا رہا مگر جب شہزادہ جمشید کی جلاوطنی کے بعد اسے ایک گونہ یکسوئی نصیب ہوئی تو اس نے احمد پاشا کو قتل کرنے کی ٹھان لی۔ یہ کام اس نے پایۂ تخت سے باہر کرنا بہتر سمجھا اور کچھ ارکانِ سلطنت اور ینی چری سپاہیوں کو لے کر استنبول سے ایڈریانوپل پہنچا۔

چھ شوال ۸۸۷ھ کی شب وہاں ایک تقریب میں احمد پاشا کو خلعت پہنائی گئی۔ پھر اچانک سلطان کے اشارے پر سپاہی جھپٹے اور اس کا سر قلم کر دیا۔ ینی چری سپاہیوں نے اس پر خاصا ہنگامہ کیا مگر پھر ٹھنڈے پڑ گئے۔ [4]

---

① فی اصول التاریخ العثمانی از احمد عبدالرحیم مصطفیٰ، ص ۷۵، ۷۶، ط دار الشروق قاہرہ؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ، ص ۱۷۹۔ ۱۸۰؛ تاریخ الدولۃ العثمانیہ از یلماز: ۱/ ۱۹۷ تا ۲۰۰

② بپتسمہ یا اصطباغ: سر پر پانی چھڑک کر کسی کو عیسائیت میں داخل کرنے کی رسم جو چرچ میں پادریوں کے ہاتھوں ادا کی جاتی ہے۔

③ تاریخ الدولۃ العثمانیہ: ۱/ ۱۹۶، ۱۹۷

④ تاریخ عثمانی: ۲/ ۱۸۸

مصر کے مملوکوں سے کش مکش اور صلح:

بایزید کے دور میں جمشید کی بغاوت کی وجہ سے جو کمزوری آئی، اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ مصر کے مملوکوں نے سلطنتِ عثمانیہ کی سرحدوں پر حملہ کر کے بعض اضلاع اور قلعے چھین لیے۔ بایزید انہیں واپس نہ لے سکا۔ بعد میں فریقین میں یہ طے پا گیا کہ قلعے مملوکوں کے پاس رہیں گے مگر ان کی آمدن حرمین شریفین کی خدمت کے لیے خرچ ہوگی۔ ①

مملوکوں کی مدد...... اتحادِ اسلامی کا شاندار مظاہرہ:

تاہم بایزید عالم اسلام کے مشترکہ مفادات کے لیے مملوکوں کی مدد سے کبھی نہ ہچکچایا۔ اس دور میں پرتگالی بحریہ نے بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر پر قبضہ کر کے مسلم ممالک کی تجارتی ناکہ بندی کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ممالیک کی بحری فوج ان قزاقوں پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی۔

بایزید نے مصری بحریہ کو پرتگالیوں کے مقابلے میں مضبوط بنانے میں خاص دلچسپی لی۔ نامور ترک بحری کمانڈر حسین رئیس مصر نے جا کر مملوک سلطان قانصوہ غوری کے ہاں امارتِ بحریہ سنبھال لی اور ۱۵۰۷ء میں بحری بیڑہ بحیرہ احمر میں لے جا کر یمن کو مملوکوں کے لیے فتح کیا۔

بایزید ثانی نے ایک اور بہترین بحری جرنیل کمال رئیس کو ۳۰۰ توپوں، ۸ بحری جہازوں اور دیگر جنگی ساز و سامان سمیت مصر بھیج کر وہاں کی بحری فوج کو مزید طاقت ور بنایا۔ بعد میں مصری بحریہ کی تربیت کے لیے احمد اوغلو اور حامد رئیس جیسے تجربہ کار کمانڈروں کو قاہرہ بھیجا۔ جب قانصوہ غوری نے ان خدمات کا معاوضہ بھیجنا چاہا تو بایزید ثانی نے اسے قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے کہا:

"یہ کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے۔" ②

بایزید کی دست برداری اور سلیم اوّل کی جانشینی:

بایزید ثانی کے آخری سالوں میں اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ بڑا شہزادہ قیدوق اور چھوٹا لڑکا سلیم اقتدار کے امیدوار تھے۔ سلیم اس وقت یورپی علاقوں کا گورنر تھا اور اپنی خوبیوں کی بدولت فوج میں زیادہ مقبول تھا۔ سلطان خود منجھلے شہزادے احمد کو جانشین بنانا چاہتا تھا۔

اس صورتحال میں تینوں لڑکے اپنے اپنے طور پر باپ کی اجازت کے بغیر نہ صرف ایک دوسرے کے علاقوں پر چڑھائی کرنے لگے بلکہ باپ کے منظورِ نظر منجھلے شہزادے احمد نے خود استنبول کا محاصرہ کر لیا تاکہ باپ کو معزول کر کے خود تخت پر بیٹھ جائے۔ بایزید، لاڈلے بیٹے کے مقابل آنے سے کترا رہا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ معطل دیکھ کر امرائے فوج نے سلیم کو تخت پر بٹھا دینے کا فیصلہ کر لیا اور دربار میں جمع ہو کر مطالبہ کیا کہ سلطان خود دست بردار ہو کر اقتدار سلیم

---

① تاریخ الدولة العثمانية: ۱/ ۱۸۹ تا ۱۹۱؛ تاریخ الدولة العلية، ص ۱۷۹، ۱۸۰

② تاریخ الدولة العثمانية، ص ۳۲۳، ۳۲۴

کے حوالے کر دے۔ بایزید نے یہ مطالبہ منظور کر لیا اور ۲۶ محرم ۹۱۸ھ (۲۵ اپریل ۱۵۱۲ء) کو حکومت چھوڑ کر عزلت نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ تاہم وہ زیادہ دن نہ جی سکا اور یکم ربیع الاوّل (۲۹ مئی) کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔[1]

بایزید ثانی کی سیرت:

سلطان بایزید ثانی کی سیرت و کردار کے بارے میں یوسف بیگ آصاف لکھتے ہیں:

''وہ ۶۷ سال زندہ رہا۔ وہ مضبوط جسم کا مالک تھا۔ ناک خم دار تھی اور بال سیاہ۔ نرم مزاج، علم دوست اور علمی مجالس کا پابند تھا۔ شاعر اور ادیب تھا۔ متقی اور پرہیزگار انسان تھا۔ رمضان کا آخری عشرہ خلوت میں گزارتا یا شیخ محی الدین یازوری کے پاس مصروفِ عبادت رہتا تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں بہت سی درسگاہیں اور جامع مساجد تعمیر کرائیں۔ وہ ہر سال کعبہ کے لیے گراں قدر مال بھیجتا تھا۔ وہ تیر اندازی کا ماہر تھا اور جنگوں میں خود حصہ لیتا تھا۔ جہاد سے واپس آ کر اپنے جسم اور کپڑوں کا گرد و غبار جمع کر لیتا تھا یہاں تک کہ اس گرد و غبار سے ایک کچی اینٹ تیار ہو گئی۔ اس کی وصیت تھی کہ اس کی موت کے بعد یہ اینٹ اس کے سر کے نیچے رکھ کر تدفین کی جائے کیوں کہ حدیث میں آتا ہے: 'جس شخص کے پیر اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے اسے آخرت میں آگ نہیں چھو سکے گی۔'''[2]

وہ اپنے آباء و اجداد کی طرح علم و فضل میں بھی ایک مقام رکھتا تھا۔ بہترین شاعر اور عمدہ خوش نویس تھا۔ اسے کمان سازی کی صنعت میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس کی خوبیوں کا اعتراف اغیار کو بھی تھا۔ اسے قریب سے دیکھنے والا ایک یورپی سفیر اپنے مکتوب میں لکھتا ہے:

''بایزید کا قد درمیانے سے کچھ زیادہ ہے...... شراب بالکل نہیں پیتا...... کھانا کم کھاتا ہے...... گھڑ سواری کا ماہر ہے...... شکار اور شہ سواری اس کے پسندیدہ مشاغل ہیں...... دینی شعائر کی بڑی تعظیم کرتا ہے...... صدقہ خیرات نکالتا ہے...... فلسفے اور فلکیات میں بہت دلچسپی لیتا ہے...... مملکت سے باخبر رہنے کے ضروری امور کے بعد وقت کا خاصا حصہ فوج کی تنظیم و ترتیب پر صرف کرتا ہے...... اس نے فوج کو جدید اسلحے اور بارودی ہتھیاروں سے لیس کر دیا ہے......''[3]

بایزید کے دور میں رونما ہونے والے بین الاقوامی انقلابات:

بایزید ثانی کے دور میں دنیا بھر میں کئی سیاسی انقلابات آئے۔ یہ اسلامی مملکتوں کے سقوط و انحطاط اور باطل طاقتوں کے ابھرنے کا زمانہ تھا۔ اگرچہ اس انقلاب کو پوری طرح عیاں ہوتے ہوتے دو تین صدیاں مزید بیت گئیں مگر آج ہم اس دور کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یورپ کے عروج اور مسلمانوں کے زوال کی ابتداء اسی دور سے ہو گئی تھی۔

---

① تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/۲۰۶ تا ۲۱۱. تاریخ الدولة العلیة، ص ۱۸۶، ۱۸۷

② تاریخ سلاطین بنی عثمان: ۵۹ ...... حدیث کے الفاظ یہ ہیں: مَنِ اغْبَرَّتْ قَدَمَاهُ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ. (صحیح البخاری، ح: ۹۰۷) مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ. (صحیح البخاری، ح: ۲۸۱۱)

③ تاریخ الدولة العثمانیه: ۱/۲۱۱، ۲۱۲.

بایزید کے دَور میں رونما ہونے والے ایسے چند اہم واقعات درج ذیل ہیں:

① دولتِ اسلامیہ اندلس کے آخری مورچے غرناطہ کا سقوط ہوگیا۔ پورے اندلس پر عیسائی قابض ہوگئے۔

② کولمبس نئی دنیا امریکا جا پہنچا اور وہاں یورپی اقوام کی نوآبادیات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

③ واسکوڈی گاما، ہندوستان کے ساحلوں تک پہنچ گیا اور استعماری طاقتوں کو ایک نئی شکارگاہ نظر آگئی۔

④ ایران میں شاہ اسماعیل نے شیعہ مملکت ''دولتِ صفویہ'' کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر عثمانیوں کی سخت ترین حریف ثابت ہوئی۔

⑤ ترکستان میں شیبانی خان کا عروج ہوا جو آخر اسماعیل صفوی کے مقابلے میں شکست کھا کر قتل ہوگیا۔

⑥ وسطِ ایشیا میں بابر کا ظہور ہوا جس نے چند سالوں بعد ہندوستان آکر مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بایزید ثانی کے دور پر ایک تبصرہ:

بایزید ثانی کے دور کو ہم نہ ہی ہر لحاظ سے کامیاب کہہ سکتے ہیں نہ بالکل ناکام۔ اس دور میں انتشار و افتراق بھی ہوا اور فتوحات بھی۔ بایزید کو سلطان محمد فاتح کے مایہ ناز سپہ سالار احمد قیدوق پاشا کی شکل میں ایک بہت بڑی نعمت ملی تھی مگر اس نے اتنے عظیم جرنیل سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر وہ اس کی قدر دانی کرتے ہوئے اسے محاذوں پر مصروف رکھتا یا کم از کم اس کی نصیحتوں پر کان دھرتا تو اس کی فتوحات کا دائرہ بہت بڑھ سکتا تھا۔ احمد پاشا کا قتل بایزید کی سیاسی غلطیوں کا ایک نمونہ تھا۔ ایسی غلطیوں کے ارتکاب نے سلطنتِ عثمانیہ کے عروج کے ایام کو محدود کردیا۔

اسی دَور میں سلطنتِ عثمانیہ کی کمزوری کا آغاز ہوا۔ بایزید کو تخت نشین ہوتے ہی اپنے بھائی جمشید کی بغاوت سے پالا پڑا اور بڑھاپے میں اسے اپنے بیٹوں کی سرکشی اور خانہ جنگی کی تلخیاں برداشت کرنا پڑیں۔

ترکانِ عثمان۔خلافت سے پہلے

دورِ اوّل: آغاز سے تیمور لنگ کے حملے تک

نمبر	حکمران	حکومت	کردار	خاص انقلاب
۱	عثمان خان	۶۸۰ھ تا ۷۲۶ھ (۱۲۸۱ء تا ۱۳۲۶ء)	نیک سیرت	بانی سلطنت
۲	اُورخان	۷۲۶ھ تا ۷۶۱ھ (۱۳۲۶ء تا ۱۳۶۰ء)	نیک سیرت	سلطنت کو استحکام بخشا
۳	مرادخان اول	۷۶۱ھ تا ۷۹۱ھ (۱۳۶۰ء تا ۱۳۸۹ء)	نیک اور بہادر	سلطنت کو وسعت دی
۴	بایزید یلدرم	۷۹۱ھ تا ۸۰۵ھ (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۳ء)	عیش پسند، بہادر، تیز مزاج	سلطنت کو وسیع کیا مگر تیمور سے شکست کھا کر سلطنت کھو دی
	دورِ خانہ جنگی اور طوائف الملوکی	۸۰۵ھ تا ۸۱۶ھ (۱۴۰۳ء تا ۱۴۱۳ء)		

دورِ نشاۃِ ثانیہ: تیموری حملے کے بعد

نمبر	حکمران	حکومت	کردار	خاص انقلاب
۱	محمد چلپی (محمد اوّل)	۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ (۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۱ء)	قابل حکمران	بھائیوں سے خانہ جنگی۔سلطنت کی ازسرِ نو شیرازہ بندی
۲	مرادخان ثانی	۸۲۴ھ تا ۸۵۵ھ (۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء)	نیک سیرت	سلطنت کا ازسرِ نو استحکام

۳	محمد فاتح (محمد ثانی)	۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء)	شجاع اور مدبر	قسطنطنیہ کی فتح
۴	بایزید ثانی	۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء)	قابل حکمران	انحطاط کے آثار

کتابیات

جلد اول تا جلد سوم

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	حرف الف	
1	الاعلام	خیر الدین الزرکلی
2	الاعلاق الخطیرۃ فی ذکر امراء الشام والجزیرۃ	عز الدین ابن شداد الحلبی
3	اغاثۃ اللہفان من مصاید الشیطان	ابن قیم الجوزیۃ
4	الاعلام العلیۃ فی مناقب ابن تیمیۃ	ابو حفص بزار
5	الالمام بالاعلام	محمد بن قاسم النوری الاسکندری
6	انباء الغمر بابناء العمر	حافظ ابن حجر عسقلانی
7	الانس الجلیل بتاریخ القدس والخلیل	ابو الیمن العلیمی
8	انتشار الاسلام بین المغول	دکتور رجب محمد عبد الحلیم
9	اسباب النزول	ابو الحسن علی بن محمد الواحدی النیسابوری
10	اعیان العصر واعوان النصر	صلاح الدین الصفدی
11	الانوار الساطعۃ فی المائۃ السابعۃ	الشیخ آغا بزرگ تہرانی
12	آب کوثر	شیخ محمد اکرام
13	الانتباہ فی سلاسل الاولیاء شامل شدہ در رسائل شاہ ولی اللہ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
14	اخبار الدول وآثار الاول فی التاریخ	احمد بن یوسف قرمانی
15	اطلس الفتوحات الاسلامیہ	احمد عادل کمال
16	الاسلام والدستور	شیخ توفیق بن عبد العزیز الدیری
17	اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ	جماعت مؤلفین
	حرف ب	
18	البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب	ابن عذاری المراکشی
19	البدایہ والنہایہ	حافظ اسماعیل بن کثیر الدمشقی
20	بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب	کمال الدین ابن العدیم
21	البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع	محمد بن علی الشوکانی
	حرف ت	
22	تاریخ مشائخ چشت	مولانا زکریا مہاجر مدنی
23	تاریخ بخارا	آرمینوس وامبری، ترجمہ: احمد محمود ساداتی
24	تاریخ الترک فی آسیا الوسطی	پروفیسر بارتھولڈ، عربی ترجمہ: احمد سعید سلیمان
25	تحفۃ الاشراف	جمال الدین یوسف المزی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۳۹۶ھ	۸	دار العلم للملایین	۲۰۰۲ء
۶۸۴ھ	۳	منشورات وزارۃ الثقافۃ، سوریا	۱۹۹۲ء
۷۵۱ھ	۲	مکتبۃ المعارف، ریاض	مذکور نہیں
۷۴۹ھ	۱	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۰۰ھ
۷۷۵ھ	۳	دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، دکن	۱۳۸۸ھ-۱۹۶۸ء
۸۵۲ھ	۴	لجنۃ احیاء التراث	۱۳۸۹ھ-۱۹۶۹ء
۹۲۸ھ	۲	مکتبہ زندیس، عمان	مذکور نہیں
	۱	دار النہضۃ العربیۃ، قاہرہ	۱۹۹۶ء
۴۶۸ھ	۱	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۱۱ھ
۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸ء	۵	دار الفکر المعاصر، بیروت	۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸ء
۱۹۷۰ء	۱	مکتبہ شاملہ غیر موافق للمطبوع	مذکور نہیں
۱۹۷۳ء	۱	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۲۰۰۶ء
۱۱۷۶ھ	۶	شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	۲۰۰۵ء
۱۰۱۹ھ	۳	عالم الکتب، بیروت	۱۹۹۲ء
مذکور نہیں	۱	دار السلام، لاہور	مذکور نہیں
مذکور نہیں	۱	وزارۃ اوقاف	۱۴۲۵ھ
	۲۴	دانش گاہ، پنجاب	۱۹۶۴ء تا ۱۹۹۳ء
۶۹۶ھ	۲	دار الثقافۃ، بیروت	۱۹۸۳ء
۷۷۴ھ	۱۵	دار ہجر	۱۴۰۷ھ-۱۹۸۶ء
۶۶۰ھ	۱۲	دار الفکر	مذکور نہیں
۱۲۵۰ھ	۲	دار المعرفۃ	مذکور نہیں
۱۴۰۲ھ-۱۹۸۲	۱	مکتبۃ الشیخ، کراچی	
۱۹۱۳ء	۱	سروش، ایران	۱۳۹۴ھ
۱۹۳۰ء	۱	الہیئۃ المصریۃ العامۃ	۱۹۹۶ء
۷۴۲ھ	۱۳	المکتب الاسلامی	۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
26	تہذیب الکمال فی اسماء الرجال	ابو الحجاج یوسف المزی
27	التاج المکلل من جواہر مآثر الطراز الآخر والاول	محمد صدیق خان القنوجی
28	تاریخ الدولۃ العثمانیۃ	سید احمد
29	التاریخ الاسلامی	دکتور محمود شاکر
30	تاریخ الدولۃ العثمانیۃ	یلماز اوزتونا، مترجم: عدنان محمود سلمان
31	تاریخ عثمانی فارسی، ترجمہ: ایرج تو بخت چارشی لی	پروفیسر اسماعیل حقی اوزان
32	تاریخ سلاطین بنی عثمان	عزتلو یوسف بک آصاف
33	تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ	محمد فرید بک بن احمد فرید پاشا
34	التدلیس فی تاریخ الدولۃ العثمانیۃ	دکتور نائل سید احمد
35	التاریخ الاسلامی	دکتور احمد شلبی
36	تاریخ صقلیہ	مولانا ریاست علی ندوی
37	تاریخ خلیفہ بن خیاط	ابو عمرو خلیفہ بن خیاط الشیبانی
38	تاریخ ابن خلدون	عبدالرحمان ابن خلدون
39	تاریخ الاسلام	شمس الدین الذہبی
40	تاریخ اسلام	شاہ معین الدین ندوی
41	تاریخ یورپ، ترجمہ: مولوی حمید احمد انصاری	اے جے گرانٹ
42	تاریخ طبری (تاریخ الرسل والملوک)	ابن جریر الطبری
43	تاریخ مختصر الدول	ابو الفرج ابن العبری
44	تاریخ جہاں کشاں (یہ ایڈیشن لیڈن (ہالینڈ) کے نسخے کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا جو تین جلدوں میں ہے اور ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا)	عطا ملک جوینی
45	تاریخ گزیدہ	احمد اللہ مستوفی
46	تاریخ بیہقی	محمد بن حسین بیہقی
47	التاریخ السیاسی للدولۃ الخوارزمیۃ	دکتور عفاف سید صبرہ
48	تاریخ خوارزم شاہی	غلام ربانی عزیز
49	تاریخ دعوت وعزیمت	سید ابو الحسن علی ندوی
50	تاریخ حبیب السیر فی اخبار افراد البشر	غیاث الدین میر خواند
51	تاریخ وصاف الحضرۃ	عبداللہ بن فضل اللہ وصاف
52	تاریخ ادبیات ایران	ڈاکٹر ایڈورڈ جی براؤن، ترجمہ فارسی از غلام حسین صدری

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۴۲ھ	۳۵	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۰ھ-۱۹۸۰ء
۱۳۰۷ھ	۱	وزارۃ اوقاف، قطر	۱۴۲۸ھ-۲۰۰۷ء
	۱		
۲۰۱۴ء	۲۲	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۵ھ-۱۹۹۵ء
۲۰۱۲ء	۲	منشورات موسسۃ الفیصل، ترکی	۱۹۸۸ء
۱۹۷۵ء	۵	ترک تاریخ کرومو باسی	۱۹۷۲ء
	۱	موسسۃ ہنداوی للتعلیم والثقافۃ	۲۰۱۴ء
۱۳۳۸ھ	۱	دار النفائس بیروت	۱۴۰۱ھ-۱۹۸۱ء
		بصورت ڈیجیٹل: ارشیف منتدی الفصیح، شاملہ	
۲۰۰۰ء	۱۰	مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، قاہرہ	۱۹۸۷ء
مذکور نہیں	۱	دار المصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۳۳ء
۲۴۰ھ	۱	دار القلم، موسسۃ الرسالۃ، دمشق	۱۳۹۷ھ
۸۰۸	۸	دار الفکر، بیروت	۱۴۰۸ھ-۱۹۹۵ء
۷۴۸ھ	۱۵	دار الغرب الاسلامی	۲۰۰۳ء
۱۹۷۴ء	۲	دار الاشاعت، کراچی	مذکور نہیں
۱۹۴۸ء	۱	جامع عثمانیہ، دکن	۱۹۳۱ء
۳۱۰ھ	۱۱	دار المعارف، مصر، دار التراث، بیروت	۱۳۸۷ھ
۶۸۵ھ	۱	دار الشرق، بیروت	۱۹۹۲ء
۶۸۳ھ	۳	ہرمس	۱۳۸۷ء
۷۵۰ھ	۱	انتشارات امیر کبیر، ایران	مذکور نہیں
۴۷۰ھ	۱	دانشگاہ فردوسی، مشہد	۱۳۵۰ء
معاصر	۱	دار الکتاب الجامعی، قاہرہ	۱۹۸۷ء
	۱	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۷۷ء
۱۴۱۹ھ	۸	مجلس نشریات اسلام، کراچی	مذکور نہیں
۹۴۲ھ	۳	انتشارات خیام	مذکور نہیں
۷۳۰ھ	۴	بمبئی	۱۲۶۹ء
۱۹۲۶ء	۱	مطبع مروارید، مرکز تحقیقات، اصفہان	

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
53	تاریخ الخلفاء	جلال الدین سیوطی
54	تاریخ ابن الوردی	زین الدین ابن الوردی المعری الکندی
55	تاریخ فتوحات مغول	جے جے سارنڈرز، ترجمہ فارسی از ابوالقاسم حالت
56	تاریخ المکۃ المشرفۃ والمدینۃ الشریفۃ	ابن ضیاء المکی الحنفی
57	تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) محمد قاسم فرشتہ	اردو ترجمہ از مشفق خواجہ
58	تاریخ الدولۃ المغولیۃ فی ایران	دکتور عبدالعزیز عبدالسلام فہمی
59	تاریخ اسلام	اکبر شاہ نجیب آبادی
60	تحفۃ الطالبین فی ترجمۃ الامام النووی	ابوالحسن علاء الدین ابن العطار
61	تاریخ الملک الظاہر	عز الدین محمد ابن شداد
62	تاریخ الدولۃ العثمانیۃ من النشوء الی الانحدار	ڈاکٹر خلیل اینالجیک، ترجمہ: دکتور محمد۔م۔الارناؤوط
	حرف ج	
63	جامع التواریخ (عربی)	رشید الدین فضل اللہ، تعریب: محمد صادق نشات، فواد عبدالمعطی
64	الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیہ	ابو محمد محی الدین الحنفی
65	جوانب مضیۃ فی تاریخ العثمانیین الاتراک	زیاد محمود ابوغنیمۃ
66	جامع التواریخ (فارسی)	رشید الدین فضل اللہ
	حرف چ	
67	چنگیز خان (اردو ترجمہ عزیز احمد)	ہیرلڈ لیمب (Harold Lamb)
	حرف ح	
68	الحروب الصلیبیہ	محمد عروسی المطوی
69	الحوادث الجامعۃ والتجارب النافعۃ فی المائۃ السابعۃ	کمال الدین ابوالفضل ابن الفوطی
70	الحکومۃ الاسلامیۃ	سید روح اللہ خمینی
71	حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاہرۃ	جلال الدین سیوطی
72	حیات صلاح الدین	منشی محمد سراج الدین احمد
	حرف خ	
73	الخطوط العریضۃ للاسس التی قام علیہا دین الشیعۃ الامامیۃ الاثنی عشریۃ	محب الدین بن ابی الفتح
74	خواجہ طوسی یا وروحی وعقل	عبدالوحید وفائی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۹۱۱ھ	۱	مکتبہ نزار	۱۴۲۵ھ-۲۰۰۴ء
۷۴۹ھ	۲	دارالکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۶ء
	۱	موسسہ انتشارات، تہران	مذکور نہیں
۸۵۴ھ	۱	دارالکتب العلمیہ	۱۴۲۴ھ-۲۰۰۴ء
۱۶۲۰ء	۴	المیزان، لاہور	۲۰۰۸ء
	۱	دارالمعارف، مصر	
۱۰ مئی ۱۹۳۸ء	۳	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۷۷ء
۷۴۴ھ	۱	الدارالاثریہ، عمان	۱۴۲۸ھ-۲۰۰۷ء
۶۸۴ھ	۱		
	۱	دارالمدارالاسلامی	
۱۳۱۸ء	۳	داراحیاء الکتب العربیۃ، مصر	مذکور نہیں
۷۷۵ھ	۲	میر محمد کتب خانہ، کراچی	مذکور نہیں
	۱	دارالفرقان للنشر والتوزیع	۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء
۷۰۴ھ	۳	ادارہ گاہ بلوشۂ فرنسوی بریل لیڈن (ہالینڈ)	۱۹۱۱ء
۱۹۶۲ء	۱	گوہر پبلی پبلیکیشنز	مذکور نہیں
معاصر	۱	دارالغرب الاسلامی	۱۹۸۰ء
۷۲۳ھ	۱	شاملۃ	مذکور نہیں
۱۹۸۹ء	۱		
۹۱۱ھ	۲	داراحیاء الکتب العربیۃ	۱۳۸۷ھ-۱۹۶۷ء
	۱	الفیصل، لاہور	۲۰۰۹ء
۱۳۸۹ھ	۱	المکتبۃ الشاملۃ	مذکور نہیں
	۱	موسسہ انتشارات، امیر کبیر	۱۳۹۲ء

نمبر شمار	نام کتاب	مولف
	حرف د	
75	دول الاسلام مع الذیل	شمس الدین الذہبی
76	الدارس فی تاریخ المدارس	عبدالقادر النعیمی
77	الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنۃ	حافظ ابن حجر عسقلانی
78	دعوت اسلام	ٹی ڈبلیو آرنلڈ، ترجمہ: شیخ محمد عنایت اللہ
79	الدولۃ الخوارزمیۃ والمغول	حافظ احمد حمدی
80	کیف اسلم المغول؟ (دور ترکستان فی اسلام المغول)	دکتور محمد علی البار
81	الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث	اسماعیل احمد یاغی
82	الدولۃ العثمانیۃ عوامل النہوض واسباب السقوط	علی محمد الصلابی
83	دولت عثمانیہ	ڈاکٹر محمد عزیز
	حرف ذ	
84	ذیل مرآۃ الزمان	ابوالفتح قطب الدین الیونینی
85	الذیل التام علی دول الاسلام	شمس الدین سخاوی
86	ذیل طبقات الحنابلۃ	زین الدین بن رجب حنبلی
87	ذیل التقیید فی رواۃ السنن والاسانید	تقی الدین الفاسی
	حرف ر	
88	رسالۃ الی السلطان الملک الناصر فی شان التتار (فی "جامع مسائل ابن تیمیہ")	ابن تیمیہ، مرتب: عزیر شمس
89	رحلۃ ابن جبیر	ابن جبیر الاندلسی
90	الروض الزاہر فی سیرۃ الملک الظاہر	علامہ محی الدین عبدالظاہر
91	روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء	میر خواند (محمد بن امیر خاوند شاہ ہروی)
92	روضات الجنان	محمد باقر الموسوی
93	رحلۃ ابن بطوطہ	ابوعبداللہ ابن بطوطہ
94	رفع الاصر عن قضاۃ مصر	حافظ ابن حجر عسقلانی
95	روضۃ المناظر فی علم الأوائل والاواخر	محب الدین ابوالولید محمد ابن شحنہ
	حرف س	
96	سیر اعلام النبلاء	شمس الدین الذہبی
97	سنن الترمذی	محمد بن عیسیٰ الترمذی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۴۸ھ	۳	دارصادر، بیروت	۱۹۹۹ء
۹۲۷ھ	۱	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء
۸۵۲ھ	۲	مجلس دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد، انڈیا	۱۳۹۲ھ-۱۹۷۲ء
۱۹۳۰ء	۱	محکمہ اوقاف حکومت پنجاب، لاہور	
	۱	دارالفکر العربی، قاہرہ	۱۹۴۹ء
معاصر	۱	دارالفتح للدراسات والنشر	۱۴۲۹ھ-۲۰۰۸ء
۲۰۰۹ء	۱	مکتبۃ العبیکان، ریاض	۱۴۱۶ھ-۱۹۹۶ء
معاصر	۱	دارالتوزیع والنشر الاسلامیہ، مصر	۱۴۲۱ھ-۲۰۰۱ء
	۲	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، بھارت	۲۰۰۹ء
۷۴۶ھ	۴	دارالکتاب الاسلامی، القاہرہ	۱۴۱۳ھ-۱۹۹۲ء
۹۰۲ھ	۳	دارابن العماد، بیروت	۱۴۱۲ء
۷۹۵ھ	۵	مکتبۃ العبیکان	۱۴۲۵ھ-۲۰۰۵ء
۸۳۲ھ	۲	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء
۷۴۸ھ	۱	دارعالم الفوائد للنشر والتوزیع	۱۴۲۲ھ
۶۱۴ھ	۱	دار، بیروت	مذکورنہیں
۶۹۲ھ	۱	الریاض	مذکورنہیں
۹۰۳ھ	۵	نول کشور	مذکورنہیں
		موسسہ دارالنشر، تہران	
۷۷۹ھ	۵	اکادیمیۃ المملکۃ المغربیۃ، الرباط	۱۴۱۷ھ
۸۵۲ھ	۱	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸ء
۸۱۲ھ	۱	قلمی نسخہ	
۷۴۸ھ	۲۵	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۵-۱۹۸۵ء
۲۷۹ھ	۵	مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر	۱۹۷۵ء-۱۳۹۵ء

مؤلف	نام کتاب	نمبر شمار
تقی الدین المقریزی	السلوک لمعرفۃ دول الملوک	98
شہاب الدین محمد بن احمد النسوی	سیرۃ سلطان جلال الدین منکبرنی	99
ابن بی بی (اردو ترجمہ از محمد زکریا مائل)	سلجوق نامہ	100
عبدالملک العصابی المکی	سمط النجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی	101
کاتب چلپی (حاجی خلیفہ)	سلم الوصول الی طبقات الفحول	102
دکتور محمد سالم الرشیدی	السلطان محمد الفاتح	103
	حرف ش	
امام شرف النووی	شرح النووی علی صحیح مسلم	104
ابوالطیب محمد بن احمد الفاسی	شفاء الغرام باخبار البلد الحرام	105
ابن عماد الحنبلی	شذرات الذہب فی اخبار من ذہب	106
	حرف ص	
مسلم بن الحجاج القشیری	صحیح مسلم	107
محمد بن اسماعیل البخاری	صحیح البخاری	108
	حرف ط	
قاضی منہاج السراج	طبقات ناصری	109
تاج الدین عبدالوہاب السبکی	طبقات الشافعیۃ الکبری	110
بکر بن عبداللہ ابوزید بن محمد	طبقات النسابین	111
دکتور صلاح الدین محمد نور	الطوائف المغولیۃ فی مصر	112
ابوبغدادا ابن کثیر الدمشقی	طبقات الشافعین	113
جلال الدین سیوطی	طبقات الحفاظ	114
	حرف ع	
دکتور احسان عباس	العرب فی صقلیہ	115
حافظ شمس الدین الذہبی	العبر فی خبر من غبر	116
بدرالدین عینی حنفی	عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری	117
شمس الدین محمد بن احمد الدمشقی	العقود الدریۃ من مناقب ابن تیمیہ	118
الملک الاشرف الغسانی	العسجد المسبوک والجوہر المحکوک فی طبقات الخلفاء والملوک	119
بدرالدین العینی	عقد الجمان فی تاریخ اہل الزمان	120
ابن عبدالہادی الدمشقی	العقود الدریۃ فی مناقب ابن تیمیہ	121

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۸۴۵ھ	۸	دارالکتب، بیروت	۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء
۶۴۲ھ	۱	دارالفکر العربی، قاہرہ	۱۹۵۲ء
۶۸۰ھ	۱	مرکزی اردو بورڈ، لاہور	۱۹۷۵ء
۱۱۱۱ھ	۴	دارالکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۱۹ھ-۱۹۹۸ء
۱۰۶۷ھ	۶	مکتبہ ارسیکا، استنبول، ترکی	۲۰۱۰ء
	۱	دارالبشیر، مصر	۱۴۳۴ھ-۲۰۱۴ء
۶۷۶ھ	۲	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۱۳۹۲ھ
۸۳۲ھ	۲	دارالکتب العلمیہ	۱۴۲۱ھ-۲۰۰۰ء
۱۰۸۹ھ	۱۱	دارابن کثیر، دمشق	۱۴۰۶-۱۹۸۶ء
۲۶۱ھ	۵	دارالجیل	۱۳۷۴ھ-۱۹۵۴ء
۲۵۶ھ	۹	دارطوق النجاۃ	۱۴۲۲ھ
۶۵۸ھ	۲	انجمن تاریخ افغانستا، کابل	۱۳۴۳ھ
۷۷۱ھ	۱۰	ہجر للطباعۃ والنشر	۱۴۱۳ھ
۱۴۲۹ھ	۱	دارالرشد، ریاض	۱۴۰۷ھ-۱۹۸۷ھ
معاصر	۱	منشا المعارف اسکندریہ	
۷۷۴ھ	۱	مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ	۱۴۱۴ھ-۱۹۹۳ھ
۹۱۱ھ	۱	دارالکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۰۳ھ
۱۴۲۴ھ	۱	دارالثقافۃ، بیروت، لبنان	۱۹۷۵ء
م۷۴۸ھ	۴	دارالکتاب العمایہ	مذکورنہیں
۸۵۵ھ	۲۵	داراحیاء التراث العربی	مذکورنہیں
۷۴۴ھ	۱	دارالکاتب العربی، بیروت	مذکورنہیں
۸۰۳ھ	۱	دارالبیان، بغداد	۱۹۷۵ء
۸۵۵ھ	۵	دارالکتب والوثائق	مذکورنہیں
م۷۴۴	۱	دارالکتب العربی، بیروت	مذکورنہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
122	عجائب المقدور فی اخبار تیمور	ابن عرب شاہ
123	العثمانیون فی التاریخ والحضارۃ	ڈاکٹر محمد حرب
	حرف ف	
124	فوات الوفیات	ابن شاکر صلاح الدین
125	فیروز اللغات جامع	مقبول بدخشانی
126	الفہرست	ابن ندیم بغدادی
127	فاتح القسطنطینیہ السلطان محمد الفاتح	علی محمد الصلابی
128	فی اصول التاریخ العثمانی	احمد عبدالرحیم مصطفیٰ
	حرف ق	
129	قصۃ التتار من البدایۃ الی عین جالوت	دکتور الراغب السرجانی
130	قصص المثنوی	محمد الحمدی
	حرف ک	
131	الکامل فی التاریخ	ابن اثیر الجزری
132	کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین (عیون الروضتین)	ابوشامہ المقدسیؒ
133	کشف الاسرار	آیت اللہ روح اللہ خمینی
134	کلیات سعدی، تحقیق: محمد علی فروغی	مصلح الدین سعدی شیرازی
135	کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون	کاتب چلپی (حاجی خلیفہ)
	حرف ل	
136	لسان المیزان	حافظ ابن حجر عسقلانی
	حرف م	
137	موسوعۃ العربیۃ العالمیۃ	جماعۃ من العلماء
138	المسلمون فی صقلیۃ	احمد توفیق المدنی
139	معجم متن اللغۃ	احمد رضا العاملی بہاؤالدین
140	مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب	ابن واصل الاصبہانی
141	المنتظم فی تاریخ الملوک والامم	عبدالرحمان ابن الجوزی
142	مصنف ابن ابی شیبہ	ابوبکر ابن ابی شیبہ
143	المواعظ بذکر الخطط والآثار (الخطط المقریزی)	تقی الدین المقریزی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۸۵۴ھ	۱	کلکتہ	۱۸۱۷ء
معاصر	۱	المرکز المصری للدراسات العثمانیۃ، قاہرہ	۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴ء
۷۶۴ھ	۴	دار صادر، بیروت	۱۹۷۳-۱۹۷۴ء
	۱	فیروز سنز، لاہور	
۴۳۸ھ	۱	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷ء
معاصر	۱	دار النشر والتوزیع، قاہرہ، مصر	۱۴۲۷ھ-۲۰۰۶ء
۲۰۰۲	۱	دار الشروق	۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶ء
معاصر	۱	موسسہ اقرأ، قاہرہ	۱۴۲۷ء
		دار المحجۃ البیضاء، بیروت	۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸ء
۴۳۰ھ	۱۰	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷ء
۶۶۵ھ	۴	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۹۹۷ء
۱۹۸۹ء	۱	تہران	۱۹۶۳ء
۶۹۱ھ	۱	ہرمس، ایران	
۱۰۶۷ھ	۶	دار الکتب العلمیہ	۱۹۴۱ء
۸۵۲ھ	۷	مطبعہ نظامیہ، حیدرآباد دکن	۱۳۹۰ھ-۱۹۷۱ء
		سافٹ ویئر	
۱۳۶۵ھ	۱	المطبعۃ العربیۃ الجزائر	
۱۳۷۲ھ	۵	دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت	۱۳۷۷ھ
۶۹۷ھ	۵	دار الکتب والوثائق القومیۃ، مصر	۱۳۷۷ھ-۱۹۵۷ھ
۵۹۷ھ	۱۹	دار الکتب العلمیہ	۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء
۲۳۵ھ	۷	مکتبہ الرشد، ریاض	۱۴۰۹ھ
۸۳۵ھ	۴	دار الکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۱۸ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
144	مرقاۃ المفاتیح فی شرح مشکوۃ المصابیح	ملا علی قاری الہروی
145	معجم الادباء	یاقوت الحموی
146	معجم البلدان	یاقوت الحموی
147	المختصر فی اخبار البشر	ابوالفداء
148	مرصاد العباد من المبدأ الی المعاد (فارسی) قلمی نسخہ	نجم الدین رازی
149	مورد اللطافۃ فی من ولی السلطنۃ والخلافۃ	یوسف بن تغری بردی
150	المنہل الصافی والمستوفی بعد الوافی	یوسف بن تغری بردی
151	المقصد الارشد فی ذکر اصحاب الامام احمد	برہان الدین ابن مفلح
152	مجالس المومنین	قاضی نوراللہ شوستری
153	مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان	عبداللہ بن اسعد الیافعی
154	مسالک الابصار فی ممالک الامصار	احمد بن یحییٰ العدوی العمری
155	مختار الاخبار	بیبرس منصوری
156	مجموع الفتاوی	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ الحرانی
157	مفاکہۃ الخلان فی حوادث الزمان	ابن طولون حنفی
158	مجالس السلطان الغوری، صفحات من تاریخ مصر فی القرن العاشر الھجری	دکتور عبدالوہاب عزام
159	مجمع الاداب فی معجم الالقاب	ابوالفضل کمال الدین ابن الفوطی
160	معجم المؤلفین	عمر بن رضا کحالۃ الدمشق
161	المنہل العذب الروی فی ترجمۃ قطب الاولیاء النووی	شمس الدین ابوالخیر السخاوی
162	معجم الشیوخ	تاج الدین عبدالوہاب السبکی
163	مجلۃ الرسالۃ جولائی ۱۹۵۲ء مقالہ استاذ عطاء اللہ ترزی باشی	ایڈیٹر احمد زیات پاشا
164	منم تیمور جہانگشا	تیمور لنگ
165	المعرفۃ والتاریخ	یعقوب بن سفیان الفسوی
	حرف ن	
166	نہایۃ الارب فی فنون الادب	شہاب الدین النویری
167	النجوم الظاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ	جمال الدین یوسف بن تغری بردی
168	النوادر السلطانیۃ والمحاسن الیوسفیہ	بہاء الدین ابن شداد
169	النساء الحاکمات فی المغول	دکتور علاء محمود خلیل

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۰۱۴ھ	۹	دار الفکر، بیروت	۱۴۲۲ھ-۲۰۰۲ء
۶۲۶ھ	۷	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ-۱۹۹۳ء
۶۲۶ھ	۷	دار صادر، بیروت	۱۹۹۵ء
۷۳۲ھ	۴	المطبعۃ الحسینیۃ، مصر	مذکور نہیں
۶۵۴ھ	۱	کتب خانہ آستانہ قم، ایران	
۸۷۴ھ	۲	دار الکتب المصریۃ، قاہرہ	مذکور نہیں
۸۷۴ھ	۷	الہیئۃ المصریۃ	مذکور نہیں
۸۸۴ھ	۳	مکتبۃ الرشد، ریاض	۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء
۱۰۱۹ھ	۱	کتاب فروشی اسلامیہ، تہران	
۷۶۸ھ	۴	دار الکتب العلمیہ	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷
۷۴۹ھ	۲۷	المجمع الثقافی، ابوظبی	۱۴۲۳ھ
۷۲۵ھ	۱	الدار المصریۃ اللبنانیہ	۱۹۹۳ء
۷۲۸ھ	۳۵	مجمع الملک فہد	۱۴۱۶ھ-۱۹۹۸ء
۹۵۳ھ	۱	دار الکتب العلمیہ	۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸
۱۹۵۹ء	۱	مکتبۃ الثقافۃ الدینیہ، قاہرہ	۱۴۳۱ھ-۲۰۱۰ء
۷۲۳ھ	۶	وزارۃ الثقافۃ، ایران	۱۴۱۶ھ
۱۴۰۸ھ	۱۳	مکتبۃ المثنی، بیروت	مذکور نہیں
۹۰۲ھ		مکتبہ شاملہ	
۷۷۱ھ	۱	دار الغرب الاسلامی	۲۰۰۴ء
۱۳۸۸ھ	۱	مکتبہ شاملہ	
۸۰۷ھ	۱	مستوفی، مرکز تحقیقات راعیانہ، اصفہان	
۲۷۷ھ	۳	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۱ء-۱۹۸۱ء
۷۳۳ھ	۳۳	دار الکتب والوثائق القومیہ	۱۴۲۳ھ
۷۴۴ھ	۱۶	دار الکتب، مصر	مذکور نہیں
۶۳۲ھ	۱	مکتبۃ الخانجی، القاہرۃ	۱۴۱۵ھ-۱۹۹۴ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
170	نصرۃ اہل الایمان بدولۃ آل عثمان	شیخ الاسلام محمد بن ابی السرور البکری
171	نزہۃ الانظار فی عجائب التاریخ والاخبار	محمود مقدیش
172	نیل الامل فی ذیل الدول	زین الدین ابن شاہین الملطی
173	نزہۃ الانام فی تاریخ الاسلام	صارم الدین ابن دقماق
	حرف و	
174	وفیات الاعیان	ابن خلکان
175	وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ	علی بن عبد اللہ السمہودی
176	الوافی بالوفیات	صلاح الدین الصفدی
177	الوفیات	تقی الدین ابن الرافع السلامی
178	الوفیات	ابن قنفذ
	حرف ی	
179	یادگار سہروردیہ	خاور سہروردی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۰۷۱ھ	۱	مجمع القاسمی للغۃ العربیۃ اکادیمیۃ القاسمی	۱۴۳۳ھ-۲۰۱۲ء
۱۲۲۸ھ	۲	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۹۸۸ء
۹۲۰ھ	۹	المکتبۃ العصریۃ للطباعۃ والنشر، بیروت	۱۴۲۲ھ-۲۰۰۲ء
۸۰۹ھ	۱	المکتبۃ العصریۃ، بیروت	۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹
۶۸۱ھ	۷	دار صادر	۱۹۹۴ء
۹۱۱ھ	۴	دار الکتب العلمیہ	۱۴۱۹ھ
۷۶۴ھ	۲۹	دار احیاء التراث	۱۴۲۰ھ-۲۰۰۰ء
۷۷۴ھ	۲	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۲ھ
۸۱۰ھ	۱	دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت	۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء
معاصر	۱	نذیر سنز، لاہور	۱۹۹۹ء

Year of death	Volumes	Publisher	Publication
,1913	1	Archibald Constable & Co	
,1962	1	Robert Hale Limited, Londaon	,1941
,1794	2	George bell and sons, London	,1884
	2	London. Bradbury and Evans	,1856
,1931	1		
,1839	3	G P Patna mz sonz bread food street, london	,1898
	30	Encyclopaedia britannica	,1980

NO	Name Of Book	Writer
180	The Preching of Islam	T.W.Arnold
181	The March of the barbarians	Harold lamb
182	The history of the decline and fall of the Roman Empire	Edward Gibbon
183	History of the othman Turks (Compiled E.S.Creasy M.A)	Von Hammer
184	Salahuddin	stanley lin paul
185	The History of the crusades	Joseph Francois Michaud (translator: W.Robson)
186	Encyclopaedia britannica: 15th	

تاریخ اُمتِ مُسلمہ

جلدِ پنجم

تحقیق

مورخِ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

زیرِ طبع

المنہل پبلشرز
بلاک A-1، گلستانِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
0321-3135009 | 0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

تاریخِ اُمتِ مسلمہ

جلدِ ششم

تحقیق

مورخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

زیر طبع

المنہل پبلشرز

بلاک A-1، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

0321-3135009|0321-2000870

www.almanhalpublisher.com

almanhalpublisher@gmail.com